فاران
کراچی
پاکستان
ماہرالقادری

جلد ۱۱ — شمارہ ۱

ماہنامہ **فاران** کراچی

سالانہ چندہ چھ روپے — فی پرچہ آٹھ آنے

ماہ اپریل ۵۹ء

ایڈیٹر ماہر القادری

ترتیب

مقام اشاعت:۔ دفتر "فاران" کیمبل اسٹریٹ کراچی نمبر ۱

پرنٹر پبلشر:۔ مسرور حسین، مطبع سعیدی قرآن محل، کراچی

M. SAEED.

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نقشِ اوّل

کوئی شخص اپنے منصب یا عہدے کے اعتبار سے کتنا ہی بلند و بالا اور صاحبِ اختیار کیوں نہ ہو، دین میں اس کی حیثیت اللہ کے بندے، نبی صلعم کے خادم اور اسلام کے فرمانبردار سے زیادہ نہیں ہے، دنیا کا سردار اور حاکم، دین کا چاکر اور خدمت گزار ہے! تمام جہان کی فوجیں خواہ کسی کو سلامی دیتی ہوں اور ساری دنیا اس کے رُو برو سرِ عقیدت خم کرتی ہو مگر اُسے یہ بہرحال طوعاً و کرہاً اور بہر عنوان چار و ناچار اللہ اور رسول صلعم کے حکم کے سامنے جھکنا ہوگا، یہ وہ بارگاہِ عالی ہے جہاں سرکشوں کو عاجزی، بلند بانگوں کو پستی اور صاحبانِ تخت و تاج کو فروتنی اور اطاعت اختیار کرنی پڑتی ہے! یہاں ہفت اقلیم کے شہنشاہ کو بھی اپنے ذاتی ذوق اور شخصی رجحان کو پیش کرنے کا حق حاصل نہیں ہے، یہاں کے کسی فرمان، حکم اور قانون میں "انا قول" کے لئے ذرہ برابر گنجائش نہیں رکھی گئی، سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا کے سوا ہر قسم کے حیلے، معذرت اور رائے زنی کو یہاں ذلت کے ساتھ رد کر دیا جاتا ہے!

اللہ تعالیٰ کے دربار میں شہنشاہانِ باجبروت چپراسی اور پیادے سے بھی زیادہ کمتر حیثیت رکھتے ہیں اور جو کوئی اپنے کو مسلمان کہتا ہے وہ چاہے چپراسی ہو یا کسی حکومت کا حاکمِ اعلیٰ، اسلام کے احکام کی اطاعت اس کا فرض ہے، اللہ اور رسول صلعم کی غلامی اور دین کی فرمانبرداری کا قلادہ ہر مسلمان کی گردن میں پڑا ہوا ہے اور کوئی پیشانی ایسی نہیں ہے، جو اللہ تعالیٰ کی بندگی کا داغ نہ رکھتی ہو، اللہ تبارک و تعالیٰ کے دربارِ اقدس میں جو کوئی جتنی عاجزی ذلت اور بے چارگی پیش کرتا ہے، دُنیا میں اتنی ہی اُسے عزت نصیب ہوتی ہے!

اسلام کے معنی ہی "گردن بر طاعت نہادن" کے ہیں، اس دین میں جو داخل ہو گیا اس کا فرض ہے کہ اپنی تمام خواہشات کو اللہ اور رسول صلعم کے حکم کے تابع کر دے اور اپنے ذوق کو، رجحان کو، فکر و مزاج اور طبیعت کو زیادہ سے زیادہ اسلام کی اسپرٹ کے مطابق بنائے یہاں تک کہ دین کی کوئی پابندی اس کی طبیعت پر شاق اور اس کے مزاج پر گراں نہ گزرے اور اللہ رسول صلعم کا حکم سُن کر اس کا دل بغاوت محسوس نہ کرے، کامل اطاعت انشراحِ قلب کے ساتھ، پوری فرمانبرداری دلی اطمینان کے ساتھ! اگر کسی بدبخت مسلمان کے اندر اس قسم کا ذوق و رجحان جس سے اسلام مطابقت نہیں کرتا پایا جاتا ہے، تو اس کا فرض ہے کہ اپنی اس کوتاہی، نفس کی کمزوری اور غلط بینی و بے راہ روی پر ندامت و افسوس محسوس کرتے ہوئے، اللہ تعالیٰ سے اصلاحِ حال کی توفیق طلب کرے اور اپنے فکر و مزاج کو اسلام کے مطابق بنانے کے لئے جد و جہد شروع کر دے، ایسا کرنے سے انشاء اللہ وہ اپنے اندر تدریجی انقلاب محسوس کرے گا اور چند دن کے مجاہدۂ نفس کے بعد اس کی یہ کھوٹ جاتی رہے گی، اور اگر خدا ناکردہ اس کے اندر یہ خناس پیدا ہو گیا کہ میرا یہ ذوق اور یہ رجحانات آزاد خیالی اور تنویرِ فکر کے مظہر و ترجمان ہیں، تو پھر اس مزاج و ذہنیت کا شخص خود بھی گمراہ ہوگا اور دوسروں کو بھی گمراہ کرے گا۔ اس جہالت سے کروڑ بار اللہ کی پناہ! جزو علم ہمہ دانی اور غرورِ علم و معرفت رکھتی ہو؟ زمین و آسمان اُس احمق پر ملامت کرتے ہیں جو بے راہ ہو مگر اس زعم میں مبتلا ہو کہ ساری دنیا کو میری پیروی

کرنی چاہیئے کہ میں خضرِ راہ ہوں! اعوذ باللہ ان اکون من الجاہلین!

شہنشاہ اکبر کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ دین میں تجدید و اصلاح اور آگے چل کر خود نیا دین نکالنے کا سودا اُس جاہل کے سر میں سما گیا تھا، چونکہ اس کے پاس اقتدار، جاہ و منصب اور خزانوں کی کنجیاں تھیں، اس لئے کچھ ضمیر فروش لوگ اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگے تھے، مگر حکومت کی تمام طاقتوں کے باوجود اُسے ناکامی ہوئی، یہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ آخرت میں اس کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا مگر تاریخ میں وہ بُرا نام چھوڑ گیا۔

"خلق قرآن" کے فتنہ کو خانوادۂ عباسیہ کے ایک خود پسند فرمانروا نے بہت کچھ شہ دی تھی، حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اس فتنہ کا مقابلہ کیا اور حق گوئی کے جرم میں تازیانوں سے لے کر قید خانہ کی عقوبتیں تک برداشت کیں، جب امام موصوف قید خانے میں تھے تو کچھ ان کے ہمدرد اور کچھ سلطان کے صلح پسند قسم کے ہوا خواہ اُن کے پاس پہنچے اور امام سے اس مسئلہ پر گفتگو کی، امام نے فرمایا کہ "کتاب و سنّت کی دلیل کے سوا اور کسی چیز کے سامنے میں نہیں جُھک سکتا!"

شہنشاہ جہانگیر اور حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی کش مکش ہمارے سامنے ہے اور دنیا جانتی ہے کہ وقت کا دھارا اُسی طرف مُڑ کر رہا جس طرف "مجدد صاحب" موڑنا چاہتے تھے، اور قلعہ گوالیار کے ایک مجبور قیدی کو نصرت نصیب ہوئی۔ اور ایک فقیر بے نوا نے فوجوں اور ہتھیاروں کے بغیر اپنی سیرت و کردار کی قوت سے تاج و تخت کو شکست دے دی۔

عبرت! عبرت!!

دور کیوں جائیے، خود پاکستان کی مثال ہمارے سامنے ہے اور ہم سب اس کے شاہد اور دیکھنے والے ہیں کہ یہاں پچھلے سیاست دانوں اور حاکموں نے علماء کرام کو "ملا" کہا اور دین پر "مُلّائیت" کی پھبتیاں چُست کیں، اسلامی دستور کے خلاف کیسی کیسی چالیں چلی گئی ہیں اور کیا کیا دھاندلی کی گئی ہے، اسلام پسندوں کے لئے قدم قدم پر مشکلات! اقامتِ دین کی ہر جدوجہد کو بے اثر کرنے اور ناکام بنانے کی تدبیریں! مگر اُن کے وار خود انہی پر الٹ کر پڑے دستور بنا اور کتاب و سنّت کو اس میں اساس قرار دیا گیا! پاکستان کا سابقہ دستور حکمراں طبقہ کی کھلی ہوئی شکست تھا، اور اس شکست کا انتقام انھوں نے اس طرح لیا کہ دستور کو نافذ ہی نہیں ہونے دیا، دستور کے نفاذ کو روکنے کے لئے طرح طرح کے فتنے کھڑے کئے جاتے رہے!

سابق حکمراں مسلمان تھے کافر نہ تھے، وہ سیرۃ النبی کے جلسوں کی صدارتیں بھی کرتے تھے اور مذہبی اداروں کا افتتاح بھی فرماتے تھے۔ "یوم قرآن" منایا جاتا ہو تو اُس کے لئے پیغام بھی بھیجتے تھے اور "اقبال ڈے" پر خطبے بھی پڑھتے تھے مگر یہ نہیں چاہتے تھے کہ پاکستان میں اللہ کا دین۔۔۔ عملی اور دستوری طور پر نافذ ہو، اس میں انہیں اپنے اقتدار کی موت نظر آتی تھی، پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اُن کی تمام تدبیریں دھری کی دھری رہ گئیں اپنے اقتدار کی جس موت سے وہ لرزہ براندام تھے اسلامی نظام کے نفاذ کے بغیر ہی وہ موت اُن پر واقع ہو کر رہی، چشم زدن میں تخت نشین، خاک نشین ہو گئے، رات کی رات میں منصب و اقتدار کے تمام دفتر لپیٹ دیئے گئے اور اختیار و اقتدار کی ساری کنجیاں چھن گئیں، دل حساس اور آنکھیں بیدار ہوں، تو یہ انقلاب ایک مُرقع عبرت ہے، اس سے بہت کچھ سبق حاصل کیا جا سکتا ہے ———— یہ کہ دنیا کے عروج و زوال میں بس زیادہ سے زیادہ ایک دو قدم کا فاصلہ ہے، یہاں کی عزتیں اور ذلتیں دھوپ چھاؤں کی مانند ہیں، نہ خوشی کو ثبات اور نہ غم کو دوام کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی راتیں! اللہ تعالیٰ کے حکم و قدرت کے سامنے دنیا کی مضبوط سے مضبوط شاہنشاہیاں بھی مٹی کے گھروندے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ مکڑی کے جالے! اُدھر سے جب حکم ہو جاتا ہے تو پھر اس حکم کو کوئی طاقت ٹال نہیں سکتی،

آن کی آن میں پسند بلند اور بلند پست ہو جاتے ہیں، جن کے پاس سب کچھ ہوتا ہے، پلک جھپکاتے اُن کے پاس کچھ بھی نہیں رہتا اللہ جسے چاہے تاج پہنادے اور جس کے سر پر چاہے مٹی کا ٹوکرا رکھدے، گدائی اور بادشاہی، عزت و دولت، فقر و دولت یہ سب اللہ تعالیٰ کے دربار سے ملتی ہیں!

عبرت و نصیحت کے بہت سے رُخ اور پہلو ہیں، سب سے زیادہ عبرت آموز بات یہ ہے کہ وہ لوگ جو صاحبانِ اختیار و اقتدار کے ہوا خواہ اور مدح خواں ہوتے ہیں۔ زوالِ نعمت کے ساتھ ہی اُن کی ہوا خواہی، وفاداری اور عقیدت مندی بھی ہوا ہوجاتی ہے، آن کی آن میں فوٹوگرافروں کے کیمرے اور اخبار نویسوں کے قلم اپنا رُخ بدل دیتے ہیں۔ شاعروں کے مدح و ثنا کے موضوع تک بدل جاتے ہیں، اور یہ حقیقت دنیا کے سامنے کھل کر آجاتی ہے کہ :- ع

کتنی دنیا دار ہے دنیا

لوگ ہوا کا رُخ دیکھتے رہیں اور اسی کے ساتھی ہوتے ہیں، مدح و مناقب کے پھول برسانے والی زبانوں اور تعریف و ثنا کے موتی لٹانے والے قلموں کا کوئی اعتبار نہیں، یہ تو جاہ و منصب کی کرسیوں کے اردگرد گھومتے ہیں، سیاست و اقتدار کی دُنیا میں سپاسنامے شخصیتوں کو نہیں کرسیوں کو پیش کئے جاتے ہیں، جس کسی نے اعزاز و احترام کے ان مظاہر سے اپنی شخصیت کو تولا اور ناپا، اس نے بڑا دھوکا کھایا، آہ! یہ پانی کے بلبلے، اوس کی بوندیں، کاغذ کے پھول، جھوٹی موتی کی پتیاں!

ابھی سب کچھ، ابھی کچھ بھی نہیں ہم

یہ نہیں ہے کہ انسانیت کی پوری تاریخ سیاہ و تاریک ہے، اس دنیا میں خدا ترس لوگوں کے ہاتھوں میں بھی اختیار و اقتدار کی باگیں آئی ہیں، اور ایسے جسموں نے بھی حکومت کی قبائیں پہنی ہیں جو اپنے اندر خدا کے خوف سے لبریز قلوب رکھتے تھے، جو تخت نشین تھے مگر راتوں کی تنہائیوں میں اللہ تعالیٰ کے حضور سربسجدہ رہتے تھے مگر تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ دولت و حکومت کے نشے نے لوگوں کو زیادہ تر مست بنایا ہے، اعتدال کم ہی قائم رہ سکا ہے، اور جب بھی اور جہاں بھی اعتدال قائم رہا ہے، وہ حکومت انسانی کے لئے باعثِ رحمت بن گئی ہے، لیکن حکومت کا نشہ جب بھی جتنا تیز ہوتا گیا ہے، دنیا نے لوٹ مار اور سفاکی کے ایسے مناظر آنکھوں سے دیکھے ہیں کہ اُن کے صرف تصور سے پسینہ آجاتا ہے، اسی دنیا میں ظالم بادشاہوں نے انسانی کھوپڑیوں کے چبوترے لگا کر اور مینار بنوا کر ان کے نظارے سے لُطف حاصل کیا ہے، زندہ انسانوں کو قبروں میں دفن کیا گیا اور دیواروں میں چنوایا گیا ہے انسانوں کے جسموں میں آگ لگوا کر جلتی ہوئی ہڈیوں سے شمع و چراغ کا کام لیا گیا ہے۔ قوم کی معصوم دوشیزائیں شبستانوں اور عشرت خانوں میں زبردستی بلوائی گئی ہیں، معمولی معمولی خطاؤں پر لوگوں کے دانت تڑوائے اور بازو اکھڑوائے گئے ہیں، فرعون ہو یا ہامان، سابور ذوالاکتاف ہو یا حجاج، نیرو ہو یا چنگیز ہر ظالم نے مسندِ حکومت پر بیٹھ کر اسی غلط اندیشی نادانی اور حماقت کا ثبوت دیا ہے کہ نہ اس کو موت آئے گی نہ کوئی زوال اُسے چھوئے گا۔ اس کا حکم سچ مچ تقدیرِ قدرت ہے، اُس کی حکومت ابدمدت ہے اور وہ خود مالکِ رقاب اُمم ہے، اُسے ہر طرح کی آزادی بلکہ حق حاصل ہے کہ رعایا کے جان و مال اور عزت و آبرو سے جس طرح چاہے کھیلے اور بھیڑوں کے اس گلہ کو جس طرف چاہے لے جائے!

یہ تو خیر تاریخوں میں لکھے ہوئے واقعات ہیں، جن میں بہت ممکن ہے کہ لکھنے والوں نے کہیں کہیں مبالغہ کا رنگ بھی پیدا کردیا ہو مگر چھوٹے پیمانہ پر زوالِ عظمت کا نقشہ خود ہم نے اسی پاکستان میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، مسٹر غلام محمد کا کیا طنطنہ کیا دور دورہ تھا، اور کیسا رعب داب تھا، معتبر لوگوں کی زبانی سنا ہے کہ گورنروں اور وزیروں تک سے یہ مفلوج شخص بری طرح پیش آتا تھا

اور بڑے بڑے لوگ گورنر جنرل ہاؤس میں جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ آنے والے مورخ نہ جانے ہمارے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے جب وہ یہ پڑھیں گے کہ ایک مفلوج بدن اور سانس لیتی ہوئی لاش نے پوری قہرمانی کے ساتھ ہم پر حکومت کی ہے، مگر جب قدرت کی طرف سے دی ہوئی ڈھیل کی مدت ختم ہو گئی، تو اس نے اپنے زوال کا منظر بھی دیکھ لیا، یہاں تک کہ موت نے اُسے عیسائی گوروں کے قبرستان کے قریب پہنچا دیا اور جسے فوجیں سلامیاں دیتی تھیں، اس کا جنازہ چند کاندھوں پر لاوارثوں کے جنازے کی طرح جاتا ہوا دیکھا گیا!

سکندر مرزا صاحب اگر اپنے پیش رو کے انجام سے عبرت حاصل کرتے تو اُن کی حکمرانی کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا مگر یہ حضرت نشۂ حکومت میں اتنے بہکے کہ ان سے پچھلے غافل حکمران بھی اتنے مست و سرشار نہ ہوئے تھے۔ اپنے اقتدار کو زوال کے تمام خطروں اور اندیشوں سے محفوظ رکھنے کے لئے وہ توڑ جوڑ کئے، ایسی ایسی چالیں چلیں کہ حکومت کا پورا نظام ابتر ہو کر رہ گیا، اسے اتارا اسے بٹھایا، کسی کو ساتھ لیا کسی کو بڑھایا، ایک پارٹی کو گرایا اور دوسری کو چڑھایا، چور کو چوری کے لئے ابھارا اور ساہوکار سے کہا کہ جاگتے رہنا، اپنے شاہانہ ٹھاٹ باٹ کے لئے، حکومت کے خزانہ کو بے دریغ خرچ کیا۔ آج اسپین کو سواری باد بہاری جا رہی ہے کل انگلستان کو تختِ رواں پر سفر ہو رہا ہے، غضب خدا کا "دولتِ اسلامیہ" کا حاکم اعلیٰ اور مقتدر صدر، مگر خاص بیت الحکومت اور ایوانِ امارت میں شراب نوشی کی وہ کثرت کہ ایام جاہلیت کے قدح خواروں کی میخواری کے ریکارڈ توڑ دیئے! ساری کوشش اسی کام کے لئے کہ پاکستان میں اسلامی نظام نافذ نہ ہونے پائے، اسلام کے داخلہ کی ایک ایک راہ، ایک ایک منفذ، ایک ایک دروازہ اور دریچہ کو بند کرنے کی سعی فرمائی گئی، غلط اندیشی یہ کہ:–

"میں ابھی جوان ہوں"

کم سے کم نصف صدی تک تو میرے اقتدار پر آنچ نہیں آسکتی! سیر و سفر میں اعزاز و پذیرائی کا یہ عالم کہ شہنشاہ ایران انہیں لے کر مشہد مقدس گئے بلکہ یوں کہیئے کہ اُن کے جلو میں رہے! پاکستان کی کتنی فرمیں اور تجارتی ادارے ہیں جنھوں نے اپنے کیلنڈروں کو مرزا صاحب کی تصویروں سے مزین کیا، سُنا ہے بعض بڑے آدمیوں کی بیگمات، ناہید مرزا کو سلام کرنے کے لئے ایوانِ صدر میں حاضری دیا کرتی تھیں اور ایسی کیفیت پیدا ہو چلی تھی۔۔۔ ؎

اُس کی پیشانیٔ نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ
جا کے بن جاتی تھی اوراقِ حکومت پہ شکن

یہ رسی زیادہ دن تک دراز نہ رہ سکی، اللہ کی طرف سے امتحان اور اصلاح حال کی جو مدت دی گئی تھی وہ ختم ہو گئی اور ایک ہی رات میں حکومت کے سب سے بڑے "عزت مآب" "ذلت مآب" بن کر رہ گئے، اخباروں سے لے کر فٹ پاتھ پر سونے والوں تک سب نے "خس کم جہاں پاک" کہہ کر اپنی خوشی اور نفرت کا اظہار کیا، خوشی اس کی کہ نئے لوگ اچھے ارادوں اور اصلاح حال کے وعدوں کے ساتھ اوپر آگئے، اور نفرت اس جانے والے اور "اتراشحنہ مردک نام" سے، جو اگر کچھ دن اور رہ جاتا، تو سیاسی پارٹیوں کی طرح فوج میں پارٹیاں بنوا کر پھوٹ ڈال دیتا۔

سکندر مرزا جب مشرقی پاکستان کے گورنر بنے تھے، اور اخباروں میں انہیں "مرد آہن" کے خطاب سے یاد کیا جاتا تھا، اُس وقت انھوں نے علماء پر طنز کرتے ہوئے دھمکی دی تھی کہ ان مُلاؤں کو کشتی میں بٹھا کر پاکستان سے باہر بھیج دیا جائے گا، پھر جب وہ گورنر جنرل اور بعد میں صدر ہوئے تو اسلامی نظام کے روکنے کے لئے جدّ و جہد کرتے رہے، مگر پاکستان سے اُن کا بستر تو گول ہو گیا

علمار کرام اللہ کے فضل سے اسی عزت و احترام کے ساتھ جی و قائم ہیں، اور مسلمانان پاکستان کے دلوں میں اسلامی نظام برپا کرنے کا جذبہ بھی موجود ہے، اور وہ قلم اور زبانیں بھی سلامت ہیں جو غلط کاروں کو ٹوک سکتی ہیں اور حق گوئی جن کا شعار ہے!

مخلص مشیر!

عبرت کے یہ مُرقع اور زوالِ نعمت کے یہ مناظر جو ہماری نگاہوں سے گزرے ہیں! خواص و عوام اور کمتر و بہتر سبھی کے لئے عبرت آموز ہیں ——— یہ کہ عزت و دولت کا سر رشتہ اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہے، آدمی کو ہر وقت اللہ سے ڈرتے رہنا..... اور توبہ و استغفار کرتے رہنا چاہیئے نہ معلوم کب کیا ہوجائے اور جس کسی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اختیار و اقتدار ملے، اُسے چاہئیے کہ اللہ کی امانت سمجھتے ہوئے، اس کی حفاظت کرے، نیکی کو پھیلائے، برائیوں کو مٹائے، خوشامدی لوگوں کی تواضع اور نیاز مندی سے کسی دھوکے میں مبتلا نہ ہو، اپنے کو عوام کا مخدوم نہیں خادم سمجھے، اسلام جن باتوں سے روکتا ہے، اُن سے خود رُکے اور دوسروں کو روکے، اور منکرات کے مٹانے میں طاقت بھی استعمال کرنی پڑے تو اس سے گریز نہ کرے، حکومت کی ذمہ داری کا سنبھالنا اور اس بارِگراں کو اٹھانا، کوئی خوشی کی بات نہیں ہے، جس نے اس ذمہ داری کو قبول کیا، اس نے اپنی ذات کو بہت ہی نازک اور پُرخطر امتحان میں ڈالا، امکانی کوشش و تدبیر کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرنی چاہیئے کہ بارالٰہا تو اس منزل کو آسان فرما، ذمہ داریوں کے اس پل صراط سے خیر و خوبی کے ساتھ گزار دے، تیری رضا ہر قدم پر پیشِ نظر ہے اور آخرت میں عادل اور نیک حاکموں کے ساتھ ہمارا حشر ہو، اُن کے ساتھ جن کی تیرے سچے اور برگزیدہ نبی نے تعریف فرمائی ہے۔

اس کو نصیحت سمجھئے یا پُرخلوص گزارش اور نیک مشورت، یہ باتیں انہی زبانوں سے سُنی جا سکتی ہیں اور انہی قلموں سے نکل سکتی ہیں، جو اپنے رب کے سوا نہ تو کسی سے ڈرتے ہیں اور نہ کسی سے طمع رکھتے ہیں، جن کا ایمان ہے کہ رزق کی کنجیاں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں، اور عزت و ذلت اور موت و حیات کا بھی وہی مالک ہے! جو قصر و ایوان میں کسی قسم کا رسوخ نہیں چاہتے جو حکومت سے کسی رحمت کے خواستگار نہیں ہیں، جن کے سامنے اسلام، ملت اور پاکستان کے مستقبل کے سوا اپنا کوئی مستقبل نہیں ہے، جنھوں نے اُس پچھلے دورِ غلط بخش میں بھی کسی لائسنس یا پرمٹ کے لئے ایک قدم نہیں اٹھایا، اور آج بھی جو اپنے حالات میں قانع ہیں، جو اپنی بے سروسامانی پر نہ ملول ہوتے ہیں اور نہ شرماتے ہیں!

قوم کیا چاہتی ہے؟

پچھلے سیاست دانوں اور حکمرانوں نے کوئی شک نہیں کہ حکومت کے ہر شعبہ میں ابتری پھیلا دی تھی، اور اُن خرابیوں کی اصلاح تو ہونی ہی چاہئیے، جس کا آغاز موجودہ حکومت نے کر بھی دیا ہے، مگر سب سے بڑی بلکہ یوں کہئیے بنیادی خرابی جو گزشتہ حکمرانوں نے پیدا کی تھی، وہ یہ تھی کہ انھوں نے "اسلام" کو عملی طور پر قائم نہیں ہونے دیا، ایک "اسلام" کے برپا نہ ہونے سے پاکستان کا پورا نظام درہم برہم ہوگیا! پاکستان کی اصل قوت "اسلام" ہے، اسی کے لئے پاکستان وجود میں آیا ہے! بس یہاں اسلامی نظام کو قائم کر کے ہی کامل تطہیر اور پوری اصلاح کا کارنامہ انجام دیا جا سکتا ہے!

"اسلام" ہے پاکستان کی اصلاح و تعمیر کا محور، اسی محور کے ارد گرد تمام دوسری اصلاحات کو حرکت میں آنا چاہئیے" اسلام" ہم سب کی آخرت ہی کا ضامن نہیں ہے مادی دنیا کی بھی بہتری کا ضامن ہے، اسی کی برکت اور معجز نمائی سے ہمارے سارے کام بنیں گے اور فلاح و نجات کے امکانات ہماری توقعات سے کہیں بڑھ چڑھ کر غیب سے پیدا ہوں گے!

قوم کے سامنے جب ملک کے سربراہ کاروں کی اس قسم کی تقریریں آتی ہیں کہ "پاکستان جس نظریہ کی بنیاد پر وجود

میں آیا ہے، اُسی نظریہ کو یہاں متشکل کیا جائے گا" تو قوم خوش ہو جاتی ہے کہ یہ اسلامی نظام کے قیام کی بشارت دی جا رہی ہے، لوگوں کے دلوں سے بے ساختہ دُعائیں نکلتی ہیں کہ یا اللہ! اس کارِ عظیم و مقدس میں ان اہل سیف کی مدد فرما اور وہ صبح پاکستان کے افق پر طلوع فرما جسے دیکھ کر دنیا پکار اُٹھے کہ یہ تو اسلام کی بہارِ رفتہ پاکستان میں واپس آگئی!

پچھلے غلط کار حکمرانوں نے "اسلام" کی راہ روکنے کے لئے یہ چالیں اختیار کی تھیں کہ وہ کرایہ کے مضمون نگاروں اور صحافیوں سے اخبارات میں اس قسم کے مضامین لکھواتے تھے، جن میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ اسلام میں بہتر فرقے ہیں، تمام فرقے کسی ایک دستور پر کس طرح متفق ہو سکیں گے ——— فرقے کے جزئی اختلافات کو نمک مرچ لگا کر طرح طرح سے اچھالا جاتا تھا، ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی کہ لوگ "اسلامی نظام" کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگیں، یہاں تک کہ اس کو ناقابل عمل سمجھ کر، اس مطالبہ ہی سے دست بردار ہو جائیں! "منیر رپورٹ" اُسی دور میں لکھی گئی تھی، اور اسلامی مفکرین نے اس رپورٹ کا جائزہ لے کر ہاتھ کے ہاتھ مفصل تبصرہ بھی کر دیا تھا، اسلامی مسائل کے سلسلہ میں اس رپورٹ کا کوئی جزء بھی سند اور حجت نہیں ہے!

تعمیر و اصلاح کے اس دور میں قوم پچھلی تمام خرابیوں کی اصلاح کی توقع رکھتی ہے،

"ہر ترقی اور اصلاح

اسلام کے سایہ میں"

یہ ہے قوم کی تمناؤں کا خلاصہ اور اُن کی امیدوں کا اصل محور!

اہل ایمان اور اربابِ کفر و باطل کے درمیان یہی چیز تو وجہ امتیاز ہے کہ اہل کفر کی "اصلاح و ترقی" اخلاقی قیود سے آزاد ہوتی ہے اُن کے یہاں ہر چیز کی افادیت کا معیار صرف "مادی فائدہ" ہوتا ہے مگر اہل ایمان کی "اصلاح و ترقی" اور تعمیر و انقلاب کی ہر کوشش اللہ اور رسول کے احکام کے تحت ہوتی ہے، ایک ایک قدم پر اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت کی اطاعت، اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کی جدوجہد، دنیا کی ترقی یہ سمجھ کر:-

"دنیا آخرت کی کھیتی ہے"

یہاں جو کچھ بویا جائے گا، وہی آخرت میں کاٹا جائے گا، اس عقیدہ و تصور اور عملی کوشش کے بعد عمل میں اخلاص کے ساتھ پاکیزگی بھی پیدا ہوگی، اور ملت کے تمام بگڑے ہوئے کام سنبھل جائیں گے، دنیا اور دین کا یہی توازن اور ربط و تعلق مسلمانوں کے حال و مستقبل کو روشن اور کامیاب بنا سکتا ہے۔

ماہر القادری

———

۱۷ رمضان المبارک ۱۳۷۸ھ ——— ۲۷ مارچ ۱۹۵۹ء

مولانا امین احسن اصلاحی

نبی صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت ایک مدبر اور ماہر سیاست

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے دنیا کے لئے جو دین بھیجا وہ جس طرح ہماری انفرادی زندگی کا دین ہے اسی طرح ہماری اجتماعی زندگی کا بھی دین ہے۔ جس طرح وہ عبادت کے طریقے بتاتا ہے اسی طرح وہ سیاست کے آئین بھی سکھاتا ہے اور جتنا تعلق اس کا مسجد سے ہے اتنا ہی تعلق اس کا حکومت سے بھی ہے۔ اس دین کو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بتایا اور سکھایا بھی اور ایک وسیع ملک کے اندر اس کو عملاً جاری و نافذ بھی کر دیا اس وجہ سے حضور اکرم صلعم کی زندگی جس طرح بحیثیت ایک مزکی نفوس اور ایک معلم اخلاق کے ہمارے لئے اسوہ اور نمونہ ہے اسی طرح بحیثیت ایک ماہر سیاست اور ایک مدبر کامل کے بھی اسوہ اور مثال ہے اور آج کی صحبت میں اس کانفرنس کے محترم داعیوں کی ارشاد کی تعمیل میں حضور صلعم کی زندگی کے اس پہلو سے متعلق چند باتیں عرض کرنی چاہتا ہوں

اس امر واقعی سے آپ میں سے ہر شخص واقف ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب قوم سیاسی اعتبار سے ایک نہایت پست حال قوم تھی مشہور مؤرخ علامہ ابن خلدون نے تو ان کو ان کے مزاج کے اعتبار سے بھی ایک بالکل غیر سیاسی قوم قرار دیا ہے۔ ممکن ہے کہ ہم میں سے بعض لوگوں کو اس رائے سے پورا پورا اتفاق نہ ہو تاہم اس حقیقت سے تو کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا کہ اہل عرب اسلام سے پہلے اپنی پوری تاریخ میں کبھی وحدت اور مرکزیت سے آشنا نہ ہوئے، بلکہ ہمیشہ ان پر نراج اور انارکی کا تسلط رہا۔ پوری قوم جنگجو اور باہم برسر پیکار قبائل کا ایک مجموعہ تھی جس کی ساری قوت و صلاحیت خانہ جنگیوں اور آپس کی لوٹ مار میں برباد ہوتی تھی۔ اتحاد، تنظیم، شعور، قومیت اور حکم و اطاعت وغیرہ جیسی چیزیں جن پر اجتماعی اور سیاسی زندگی کی بنیادیں قائم ہوتی ہیں، ان کے اندر یکسر مفقود تھیں۔ ایک خاص بدویانہ حالت پر صدیوں تک زندگی گزارتے گزارتے ان کا مزاج نراج پسندی کے لئے اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ ان کے اندر وحدت و مرکزیت پیدا کرنا ایک امر محال بن چکا تھا۔ خود قرآن نے ان کو قوماً لدّا کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جس کے معنی جھگڑالو قوم کے ہیں۔ اور ان کی وحدت و تنظیم کے بارے میں فرمایا ہے کہ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِھِمْ اگر تم زمین کے سارے خزانے بھی خرچ کر ڈالتے جب بھی ان کے دلوں کو آپس میں جوڑ نہیں سکتے تھے۔

لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ سال کی قلیل مدت میں اپنی تعلیم و تبلیغ سے اس قوم کے مختلف عناصر کو اس طرح جوڑ دیا کہ یہ پوری قوم ایک بنیان مرصوص بن گئی۔ یہ صرف متحد اور منظم ہی نہیں ہو گئی بلکہ ان کے اندر سے صدیوں کے پرورش پائے ہوئے اسباب نزاع و اختلاف بھی ایک ایک کر کے دور ہو گئے۔ یہ صرف اپنے ظاہر ہی میں متحد و مربوط نہیں ہو گئی بلکہ اپنے باطنی عقائد و نظریات میں بھی بالکل ہم آہنگ و ہم رنگ ہو گئی، یہ صرف خود ہی منظم نہیں ہو گئی بلکہ اس نے پوری انسانیت کو بھی اتحاد و تنظیم کا پیغام دیا۔ اور اس کے اندر حکم و اطاعت دونوں چیزوں کی ایسی اعلیٰ صلاحیتیں ابھر آئیں کہ صرف استعارے کی زبان میں نہیں بلکہ واقعات کی زبان میں یہ قوم شتربانی کے مقام سے جہانبانی کے مقام پر پہنچ گئی۔ اور اس نے بلا استثنا دنیا کی ساری قوموں کو سیاست اور جہانبانی کا درس دیا۔

اس تنظیم و تالیف کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک بالکل اصولی اور انسانی تنظیم تھی۔ اس کے پیدا کرنے میں حضورؐ نے نہ تو قومی، نسلی، لسانی اور جغرافیائی تعصبات سے کوئی فائدہ اٹھایا نہ قومی حوصلوں کی انگیخت سے کوئی کام لیا، نہ دنیوی مفادات کا کوئی لالچ دلایا،

نہ کسی دشمن کے ہونے سے لوگوں کو ڈرایا۔ دنیا میں جتنے بھی چھوٹے بڑے مدبر اور سیاست دان گزرے ہیں انھوں نے ہمیشہ اپنے سیاسی منصوبوں کی تکمیل میں انھیں محرکات سے کام لیا ہے۔ اگر حضورؐ بھی ان چیزوں سے فائدہ اٹھاتے تو یہ بات آپ کے قوم کے مزاج کے بالکل مطابق ہوتی لیکن آپ نے نہ صرف یہ کہ ان چیزوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ ان میں سے ہر چیز کو ایک فتنہ قرار دیا۔ اور ہر فتنہ کی خود اپنے ہاتھوں سے بیخ کنی فرمائی۔ آپ نے اپنی قوم کو صرف خدا کی بندگی اور اطاعت عالمگیر انسانی اخوت، ہمہ گیر عدل و انصاف، اعلائے کلمۃ اللہ اور خوف آخرت کے محرکات سے جگایا۔ یہ سارے محرکات نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ تھے اس وجہ سے آپ کی مساعی سے دنیا کی قوموں میں صرف ایک قوم کا اضافہ نہیں ہوا بلکہ ایک بہترین امت ظہور میں آئی جس کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے :۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (تم دنیا کی بہترین امت ہو جو لوگوں کو نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کے لئے اٹھائے گئے ہو۔)

حضورؐ کی سیاست اور حضورؐ کے تدبر کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ آپ جن اصولوں کے داعی بن کر اٹھے اگرچہ وہ جیسا کہ میں نے عرض کیا فرد معاشرہ اور قوم کی ساری زندگی پر حاوی تھے۔ اور انفرادی و اجتماعی زندگی کا ہر گوشہ ان کے احاطہ میں آتا تھا لیکن آپ نے اپنے کسی اصول کے معاملہ میں کبھی کوئی لچک قبول نہیں فرمائی۔ نہ دشمن کے مقابل میں نہ دوست کے مقابل میں۔ آپ کو سخت سے سخت حالات سے سابقہ پیش آیا ایسے سخت حالات سے کہ لوہا بھی ہوتا تو ان کے مقابل میں نرم پڑ جاتا۔ لیکن آپ کی پوری زندگی گواہ ہے کہ آپ نے کسی سختی سے دب کر کسی اصول کے معاملہ میں کوئی سمجھوتہ گوارا نہیں فرمایا۔ اسی طرح آپ کے سامنے پیشکشیں بھی کی گئیں اور آپ کو مختلف قسم کی دینی اور دنیوی مصلحتیں بھی .... سمجھانے کی کوشش کی گئی آپ جب دنیا سے تشریف لے گئے تو اس حال میں تشریف لے گئے کہ آپ کی زبان مبارک سے نکلی ہوئی ہر بات اپنی جگہ پر پتھر کی لکیر کی طرح ثابت و قائم تھی۔ دنیا کے مدبروں اور سیاست دانوں میں سے کسی ایسے مدبر اور سیاست دان کا نشان آپ نہیں دے سکتے جو اپنے دو چار اصولوں کو بھی دنیا میں برپا کرنے میں اتنا مضبوط ثابت ہو سکا ہو۔ کہ اس کی نسبت یہ دعویٰ کیا جا سکے کہ اس نے اپنے کسی .. اصول کے معاملہ میں کمزوری نہیں دکھائی یا کوئی ٹھوکر نہیں کھائی۔ لیکن حضورؐ نے ایک پورا نظام زندگی کھڑا کر دیا جو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے زمانہ کے مذاق اور رجحان سے اتنا بے جوڑ تھا کہ وقت کے مدبرین اور ماہرین سیاست اس انوکھے نظام کے پیش کرنے کے سبب سے حضور صلعم کو نعوذ باللہ دیوانہ کہتے تھے لیکن حضورؐ نے اس نظام زندگی کو عملاً دنیا میں برپا کر کے ثابت کر دیا کہ جو لوگ آپؐ کو دیوانہ سمجھتے تھے ..... وہ خود دیوانے تھے۔

صرف یہی نہیں کہ حضورؐ نے کسی ذاتی مفاد یا مصلحت کی خاطر اپنے کسی اصول میں کوئی ترمیم نہیں فرمائی بلکہ اپنے پیش کردہ اصولوں کے لئے بھی اپنے اصولوں کی قربانی نہیں دی۔ اصولوں کے لئے جان اور مال اور دوسری تمام محبوبات کی قربانی دی گئی۔ ہر طرح کے خطرات برداشت کئے گئے اور ہر طرح کے نقصانات گوارا کئے گئے لیکن اصولوں کی ہر حال میں حفاظت کی گئی۔ اگر کوئی بات صرف کسی خاص مدت تک کے لئے تھی تو اسکا معاملہ اور تھا وہ اپنی مدت پوری کر چکنے کے بعد ختم ہو گئی یا اس کی جگہ اس سے بہتر کسی دوسری چیز نے لے لی۔ لیکن باقی رہنے والی چیزیں ہر حال میں اور ہر قیمت پر باقی رکھی گئیں۔ آپ کو اپنی پوری زندگی میں یہ کہنے کی نوبت کبھی نہیں آئی کہ میں نے دعوت تو دی تھی فلاں اصول کی لیکن اب حکمت عملی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو چھوڑ کر اس کی جگہ پر فلاں بات بالکل اس کے خلاف اختیار کر لی جائے۔

حضورؐ کی سیاست اس اعتبار سے بھی دنیا کے لئے ایک نمونہ اور مثال ہے کہ آپ نے سیاست کو عبادت کی طرح ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک رکھا۔ آپ جانتے ہیں کہ سیاست میں وہ بہت سی چیزیں مباح بلکہ بعض صورتوں میں مستحسن سمجھی جاتی ہیں جو شخصی زندگی کے کردار میں مکروہ اور حرام قرار دی جاتی ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنی کسی ذاتی غرض کے لئے جھوٹ بولے، چالبازیاں کرے، عہد شکنیاں کرے، لوگوں کو فریب

دے یا ان کے حقوق غصب کرے تو اگرچہ اس زمانہ میں اقدار او پیمانے بہت کچھ بدل چکے ہیں تاہم اخلاق بھی ان چیزوں کو معیوب ٹھیراتا ہے، اور قانون بھی ان باتوں کو جرم قرار دیتا ہے۔ لیکن اگر ایک سیاست دان اور ایک مدبر یہی سارے کام اپنی سیاسی میں اپنی قوم یا اپنے ملک کے لئے کرے تو یہی سارے کام اس کے فضائل و کمالات میں شمار ہوتے ہیں۔ اس کی زندگی میں بھی اس کے اس طرح کے کارناموں پر اس کی تعریفیں ہوتی ہیں اور مرنے کے بعد بھی اپنے انہی کمالات کی بنا پر وہ اپنی قوم کا ہیرو سمجھا جاتا ہے۔ سیاست کے لئے یہی اوصاف و کمالات عرب جاہلیت میں بھی ضروری سمجھے جاتے تھے اور اسکا نتیجہ یہ تھا جو لوگ ان باتوں میں شاطر ہوتے تھے وہی لوگ ابھر کر قیادت کے مقام پر آتے تھے۔

لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سیاسی زندگی سے دنیا کو یہ درس دیا کہ ایمانداری اور سچائی جس طرح انفرادی زندگی کی بنیادی اخلاقیات میں سے ہے اس طرح اجتماعی اور سیاسی زندگی کے لوازم میں سے بھی ہے بلکہ آپؐ نے ایک عام شخص کے جھوٹ کے مقابلہ میں ... ایک صاحب اقتدار اور ایک بادشاہ کے جھوٹ کو جیسا کہ حدیث میں وارد ہے کہیں زیادہ سنگین قرار دیا ہے۔ آپؐ کی پوری سیاسی زندگی ہمارے سامنے ہے اس سیاسی زندگی میں وہ تمام مراحل آپؐ کو پیش آئے جن کے پیش آنے کی ایک سیاسی زندگی میں توقع کی جا سکتی ہے۔ آپ نے ایک طویل عرصہ نہایت مظلومیت کی حالت میں گزارا اور کم و بیش اتنا ہی عرصہ آپ نے اقتدار اور سلطنت کا گزارا۔ اس دوران میں آپ کو حریفوں اور حلیفوں... دونوں سے مختلف قسم کے سیاسی اور تجارتی معاہدے کرنے پڑے۔ دشمنوں سے متعدد جنگیں کرنی پڑیں، عہد شکنی کرنے والوں کے خلاف جوابی اقدامات کرنے پڑے، قبائل کے وفود سے معاملے کرنے پڑے۔ آس پاس کی حکومتوں کے وفود سے سیاسی گفتگوئیں کرنی پڑیں، اور سیاسی گفتگوؤں کے لئے اپنے وفود ان کے پاس بھیجنے پڑے بعض بیرونی طاقتوں کے خلاف فوجی اقدامات کرنے پڑے یہ سارے کام آپ نے انجام دیئے لیکن دوست اور دشمن ہر شخص کو اس بات کا اعتراف ہے کہ آپ نے کبھی کوئی جھوٹا وعدہ نہیں کیا۔ اپنی کسی بات کی غلط تاویل کرنے کی کوشش نہیں فرمائی۔ کوئی بات کہہ چکنے کے بعد اس سے انکار نہیں کیا کسی معاہدہ کی کبھی خلاف ورزی نہیں کی۔ حلیفوں کا نازک سے نازک حالات میں بھی ساتھ دیا۔ اور دشمنوں کے ساتھ بدتر سے بدتر حالت میں بھی انصاف کیا۔ اگر آپ دنیا کے مدبرین اور اہل سیاست کو اس کسوٹی پر جانچیں تو میں پورے اعتقاد کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو بھی آپ اس کسوٹی پر کھرا نہ پائیں گے۔ پھر یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ سیاست میں عبادت کی سی دیانت اور سچائی قائم رکھنے کے باوجود حضورؐ کو اپنی سیاست میں کبھی کسی ناکامی کا تجربہ نہیں کرنا پڑا۔ اب آپ اس چیز کو چاہے تدبر سے تعبیر کیجئے یا حکمت نبوت سے۔

حضورؐ کی سیاست اور حضورؐ کے تدبر کا یہ بھی ایک معجزہ ہے کہ آپ نے عرب جیسے ملک کے ایک ایک گوشہ میں امن و عدل کی حکومت قائم کر دی۔ کفار و مشرکین کا زور آپ نے اس طرح توڑ دیا کہ فتح مکہ کے موقع پر فی الواقع انھوں نے گھٹنے ٹیک دیئے۔ یہود کی سیاسی سازشوں کا بھی آپ نے خاتمہ کر دیا۔ رومیوں کی سرکوبی کے لئے بھی آپ نے انتظامات فرمائے۔ یہ سارے کام آپ نے کر ڈالے لیکن پھر بھی انسانی خون بہت کم بہا۔ نبی کریم صلعم سے پہلے کی تاریخ بھی شہادت دیتی ہے اور آج کے واقعات بھی شہادت دے رہے ہیں کہ دنیا کے چھوٹے چھوٹے انقلابات میں بھی ہزاروں لاکھوں جانیں ختم ہو جاتی ہیں اور مال و اسباب کی بربادی کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں سے جو انقلاب برپا ہوا اس کی عظمت اور وسعت کے باوجود شاید ان نفوس کی تعداد چند سو سے زیادہ نہیں ہوگی، جو اس ساری جدوجہد کے دوران میں حضورؐ کے ساتھیوں میں سے شہید ہوئے یا مخالف گروہ کے آدمیوں میں سے قتل ہوئے۔

پھر یہ بات بھی غایت درجہ اہمیت رکھتی ہے۔ کہ دنیا کے معمولی معمولی انقلابات میں بھی ہزاروں لاکھوں آبروئیں فاتح فوجوں کی ہوس کا شکار ہو جاتی ہیں، اس تہذیب و تمدن کے زمانہ میں بھی ہم نے دیکھا ہے کہ فاتح ملک کی فوجوں نے مفتوح ملک کی سڑکیں اور گلیاں حرام کی نسلوں سے بھر دی ہیں۔ اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ ارباب سیاست اس صورت حال پر شرمندگی اور ندامت کا اظہار کرنے کی بجائے اس کو ہر انقلاب کا ایک ناگزیر

تیمہ قرار دیتے ہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں دنیا میں جو انقلاب رونما ہوا اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ کوئی ایک واقعہ بھی ہم کو ایسا نہیں ملتا کہ کسی نے کسی کے ناموس پر دست درازی کی ہو۔

اہل سیاست کے لئے طمطراق بھی سیاست کے لوازم میں سے سمجھا جاتا ہے۔ جو لوگ عوام کو ایک نظام میں پرونے اور ایک نظم قاہرہ کے تحت منظم کرنے کے لئے اٹھتے ہیں وہ بہت سی باتیں اپنوں اور بیگانوں پر اپنی سطوت جمانے اور اپنی ہیبت قائم کرنے کے لئے اختیار کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ساری باتیں ان کی سیاسی زندگی کے لازمی تقاضوں میں سے ہیں اگر وہ یہ باتیں نہ اختیار کریں گے تو سیاست کے جو تقاضے ہیں وہ انکے پورے کرنے سے قاصر رہ جائیں گے۔ اسی طرح کے مقاصد کے پیش نظر جب وہ نکلتے ہیں تو بہت سے لوگ ان کے جلو میں چلتے ہیں، جہاں وہ ظاہر ہوتے ہیں ان کے نعرے بلند کرائے جاتے ہیں، جہاں وہ اترتے ہیں ان کے جلوس نکالے جاتے ہیں جلسوں میں ان کے حضور میں ایڈریس پیش کئے جاتے ہیں اور ان کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ جب وہ مزید ترقی کر جاتے ہیں تو ان کے لئے قصر و ایوان آراستہ کئے جاتے ہیں۔ ان کو سلامیاں دی جاتی ہیں، ان کے لئے بری و بحری اور ہوائی خاص سواریوں کے انتظامات کئے جاتے ہیں۔ جب کبھی وہ کسی سڑک پر نکلنے والے ہوتے ہیں تو وہ سڑک دوسروں کے لئے بند کر دی جاتی ہے۔ اس زمانہ میں ان چیزوں کے بغیر کسی صاحب سیاست کا تصور دوسرے لوگ ہی کرتے ہیں اور نہ کوئی ... صاحب سیاست ان لوازم سے الگ خود اپنا کوئی تصور کرتا ہے۔ لیکن ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس اعتبار سے بھی دنیا کے تمام اہل سیاست سے الگ ہیں۔ جب آپ اپنے صحابہ میں چلتے تو کوشش فرماتے کہ سب کے پیچھے چلیں مجلس میں تشریف رکھتے تو اس طرح گھل مل کر بیٹھتے کہ یہ امتیاز کرنا مشکل ہوتا کہ محمد رسول اللہ کون ہیں۔ کھانا کھانے کے لئے بیٹھتے تو دو زانو ہو کر بیٹھتے اور فرماتے کہ میں اپنے رب کا غلام ہوں اور جس طرح ایک غلام کھانا کھاتا ہے اسی طرح میں بھی کھانا کھاتا ہوں۔ ایک مرتبہ ایک بدو اپنے اس تصور کی بنا پر جو حضورؐ کے بارے میں اسکے ذہن میں رہا ہوگا، سامنے آیا تو حضورؐ کو دیکھ کر کانپ گیا۔ آپ نے اسے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ ڈرو نہیں میری ماں بھی سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی یعنی جس طرح تم نے اپنی ماں کو بدویانہ زندگی میں سوکھا گوشت کھاتے دیکھا ہوگا اسی طرح کا سوکھا گوشت کھانے والی ایک ماں کا بیٹا میں بھی ہوں۔ نہ آپ کے لئے کوئی خاص سواری تھی، نہ کوئی خاص قصر و ایوان تھا، نہ کوئی خاص باڈی گارڈ تھا۔ آپ جو لباس دن میں پہنتے اسی میں شب میں استراحت فرماتے اور تمام اہم سیاسی امور کے فیصلے فرماتے۔

یہ خیال نہ فرمایئے کہ اس زمانہ کی بدویانہ زندگی میں سیاست اس طمطراق اور اس ٹھاٹ باٹ سے آشنا نہیں ہوئی تھی جس طمطراق اور جس ٹھاٹ باٹ کی وہ اب عادی ہوگئی ہے۔ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں ان کا خیال بالکل غلط ہے، سیاست اور اہل سیاست کی تانا شاہی ہمیشہ سے یہی رہی۔ فرق اگر ہوا ہے تو محض بعض ظاہری باتوں میں ہوا ہے۔ البتہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نئے طرز کی سیاسی زندگی کا نمونہ دنیا کے سامنے رکھا جس میں دنیوی کر و فر کے بجائے خلافت الٰہی کا جلال اور ظاہری ٹھاٹ باٹ کی جگہ خدمت اور محبت کا جمال تھا۔ لیکن اس سادگی ... اور فقر و درویشی کے باوجود اس کے دبدبے اور اس کے شکوہ کا یہ عالم تھا کہ روم و شام کے بادشاہوں پر اس کے تصور سے لرزہ طاری ہوتا تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست اور آپ کے تدبر کا ایک اور پہلو بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ آپ نے اپنی حیات مبارکہ میں ہی ایسے لوگوں کی ایک بہت بڑی جماعت بھی تربیت کر کے تیار کر دی جو آپ کے پیدا کردہ انقلاب کو اس کے اصلی مزاج کے مطابق آگے بڑھانے، اس کو مستحکم کرنے اور اجتماعی و سیاسی زندگی میں اسکے تمام مقتضیات کو بروئے کار لانے کے لئے پوری طرح اہل تھے۔ چنانچہ اس تاریخی حقیقت سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا کہ حضورؐ کی وفات کے بعد اس انقلاب نے عرب سے نکل کر آس پاس کے دوسرے ممالک میں قدم رکھ دیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کرۂ ارض کے تین براعظموں میں اس نے اپنی جڑیں جمالیں اور اسکی اس وسعت کے باوجود اس کی قیادت کے لئے موزوں اشخاص و رجال کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ میں نے جن تین براعظموں کی طرف اشارہ کیا ہے ان کے متعلق یہ حقیقت بھی ہر شخص جانتا ہے کہ ان کے اندر وحشی قبائل آباد نہیں تھے بلکہ وقت کی نہایت ترقی یافتہ جبار و قہار شاہنشاہیتیں تھیں۔ لیکن اسلامی انقلاب کی موجوں نے جزیرۂ عرب سے

انہوں نے ان کو ان کی جڑوں سے اس طرح اکھاڑ پھینکا گویا زمین میں ان کی کوئی بنیاد ہی نہیں تھی۔ اور ان کے ظلم و جور کی جگہ ہر گوشے میں اسلامی تہذیب تمدن کی برکتیں پھیلا دیں۔ جن سے دنیا صدیوں تک متمتع ہوتی رہی۔

دنیا کے تمام مدبرین اور اہل سیاست کی پوری فہرست پر نگاہ ڈال کر غور کیجئے کہ ان میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نظر آتا ہے جس نے اپنے دو چار ساتھی بھی ایسے بنانے میں کامیابی حاصل کی ہو جو اس کے فکر و فلسفہ اور اس کی سیاست کے ان معنوں میں عالم اور عامل رہے ہوں جن معنوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقہ کے عالم و عامل ہزاروں صحابی تھے۔

آخر میں ایک بات بطور تنبیہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی مرتبہ اور مقام یہ ہے کہ آپ نبی خاتم اور پیغمبر عالم ہیں۔ سیاست اور تدبر اس مرتبہ بلند کا ایک ادنیٰ شعبہ ہے۔ جس طرح ایک حکمراں کی زندگی پر ایک تحصیلدار کی زندگی کے زاویہ سے غور کرنا ایک بالکل ناموزوں بات ہے اس سے زیادہ ناموزوں بات شاید یہ ہے کہ ہم سید کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر ایک ماہر سیاست یا ایک مدبر کی زندگی کی حیثیت سے غور کریں۔ نبوت اور رسالت ایک عظیم عطیہ الٰہی ہے جب یہ عطیہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو بخشتا ہے تو وہ سب کچھ اس کو بخش دیتا ہے، جو اس دنیا میں بخشا جا سکتا ہے۔ پھر حضورؐ تو صرف نبی ہی نہیں تھے بلکہ خاتم الانبیاء تھے، صرف رسول ہی نہیں تھے بلکہ سید الرسل تھے..... صرف اہل عرب ہی کے لئے نہیں بلکہ تمام عالم کے لئے مبعوث ہوئے تھے اور آپ کی تعلیم و ہدایت صرف کسی خاص مدت تک ہی کے لئے نہیں تھی، بلکہ ہمیشہ باقی رہنے والی تھی اور یہ بھی ہر شخص جانتا ہے کہ حضور کسی دین رہبانیت کے داعی بن کر نہیں آئے تھے بلکہ ایک ایسے دین کے داعی تھے جو روح اور جسم دونوں پر حاوی اور دنیا و آخرت دونوں کی حسنات کا ضامن تھا جس میں عبادت کے ساتھ سیاست اور درویشی کے ساتھ حکمرانی کا جوڑ... محض اتفاق سے نہیں پیدا ہو گیا تھا بلکہ یہ عین اس کی فطرت کا تقاضا تھا۔ جب صورت حال یہ ہے تو ظاہر ہے کہ حضورؐ سے بڑا سیاست دان اور مدبر کون ہو سکتا ہے لیکن یہ چیز آپؐ کا اصلی کمال نہیں بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا آپ کے فضائل و کمالات کا محض ایک ادنیٰ شعبہ ہے۔

(بین الاقوامی سیرت کانفرنس کراچی میں پڑھا گیا)

مُلّا محمد واحدی

اِسلام اور اخلاقِ حسنہ

(مُلّا واحدی دہلوی کی زیرِ ترتیب کتاب "حیات سرورِ کائنات" حصہ سوم کا ایک مضمون)

اللہ جلّ شانہ کے اوصاف کی برابری کوئی نہیں کر سکتا، برابری کا خیال لانا بھی شرک ہے۔ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ لیکن اللہ کے اوصاف کی جھلک انسان پر قطعی پڑ سکتی ہے۔ چنانچہ اخلاق حسنہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ (اللہ کی صفات) کا پرتو کہلاتے ہیں جن الخلق ــــ خلق اللہ الاعظم خلق حسنہ وہی ہے جس میں پیروی اخلاق اللہ کی جھلک پائی جائے۔ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ خواہ پیروی کی حیثیت سمندر کے آگے قطرے جیسی ہو۔ بلکہ یہ نسبت غلط ہے۔ قطرہ جیسی بھی نہ ہو۔

اللہ اپنی مخلوق سے جتنا تعلق رکھتا ہے ویسا تعلق دوسروں کے ساتھ رکھنا انسان کے لئے محال ہے، ماں باپ کا سا تعلق ماں باپ کے علاوہ کہیں نہیں ملتا، اللہ کا سا تعلق کیا ملے گا۔ لیکن بہر حال دوسروں کے ساتھ اچھا تعلق رکھنے اور اچھا برتاؤ کرنے اور دوسروں کے حقوق سے سبک دوش ہونے کا نام اخلاق حسنہ ہے۔ اللہ میں تو بعض وصف ایسے ہیں جو انسان میں آ ہی نہیں سکتے۔ مثلاً واحد ہونا، خالق ہونا اور کبریائی۔ لہٰذا نسبت کا تصور چھوڑیئے۔ بس اس نسبت سے اخلاق حسنہ کی اہمیت کا تصور کیجئے۔

اسلام اخلاق حسنہ کو بڑی اہمیت دیتا ہے، عادات کی درستی کو ایمان کی نشانی اور عبادت کا معیار ٹھہراتا ہے۔

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ .... میں بھیجا ہی واسطے گیا ہوں کہ اخلاق حسنہ کی تکمیل کر دوں۔

جس طرح حضورؐ نے دین کی اور تمام باتوں کی تکمیل کی ہے اسی طرح اخلاق حسنہ کی تکمیل کی ہے۔

حضورؐ اخلاق کے سلسلے میں اپنی ہدایت کی دعا مانگا کرتے تھے۔ وَاھْدِنِیْ لِاَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ اے اللہ! بہتر سے بہتر اخلاق کی مجھے ہدایت فرما۔

ایک حدیث ہے، خِیَارُکُمْ اَحْسَنُکُمْ اَخْلَاقًا تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

ایک اور حدیث ہے۔ مَا مِنْ شَیْءٍ یُوْضَعُ فِی الْمِیْزَانِ اَثْقَلَ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ .... (قیامت کی) ترازو میں حُسنِ خلق سے زیادہ وزنی چیز کوئی نہیں ہو گی۔

اللہ تعالیٰ کہتا ہے:۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا جس نے نفس کو مزکّیٰ کر لیا وہ فلاح یاب ہو گیا۔

حضورؐ کی بابت ارشاد ہے۔ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ... آپ کو خلق عظیم عطا ہوا ہے، اور حضورؐ کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے۔ وَیُزَکِّیْھِمْ یہ پیغمبر انہیں اخلاق سکھاتا ہے (اور ہر قسم کی نجاستوں اور آلودگیوں سے پاک کر کے صاف ستھرا بناتا ہے)

نہ کبریائی جیسی صفات کا اکتساب مقابل کی صفت پیدا کر کے کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً کبریائی کے مقابلے میں فروتنی اور خاکساری پیدا کی جائے۔

حضورؐ نے ماں، باپ۔ اہل دعیال، زن وشوہر، اعزا د قربا۔ دوست واحباب، مسلم وغیر مسلم۔ اہل محلہ، اہل وطن یہاں تک کہ حیوانات، نباتات اور جمادات سب کے حقوق کی ادائگی کی تعلیم دی ہے۔ انسان اُن کی اگر پابندی کرتا ہے اور ڈگمگاتے نہیں تو زمین پر جنت اتر آئے۔

ایمان اور عمل والے مضمون میں معاملات کے متعلق مختصراً میں کچھ لکھ چکا ہوں۔ اخلاق معاملات سے اوپر کی شے ہیں۔ جیسے اخلاق ویسے معاملات۔ مخلوق کے حقوق کی ادائگی وعدم ادائگی اخلاق کے تحت ہوتی ہے۔

ایمان لانے کے بعد مسلمان کو دو کام کرنے پڑتے ہیں۔ یا اسلام اِن دو کاموں کا مجموعہ ہے۔ ایک حقوق اللہ کی ادائگی، دوسرے حقوق العباد کی ادائگی۔

ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ:-

بُرے اعمال تین فردوں میں تیار کئے جاتے ہیں۔ ایک فرد شرک کی ہوگی۔ اس کی معافی نہیں دی جائے گی۔ دوسری فرد دوسرے گناہوں کی۔ اللہ اس فرد کی پرواہ نہیں کرے گا۔ جس گناہ کو چاہے گا بخش دے گا۔ یہ صرف وہ گناہ ہوں گے جن کا تعلق اللہ سے ہے یا یہ وہ ستم ہوں گے جو انسان نے خود اپنے اوپر توڑے ہیں۔ تیسری فرد بھی گناہوں کی ہوگی۔ لیکن اس کی ایک ایک بات پکڑی جائے گی، یہ وہ ستم ہوں گے جو انسان نے اپنے دوسرے انسانوں پر ڈھائے ہیں۔

جب تک انسان اہل دعیال کے حقوق سے عہدہ برآ نہیں ہو جاتا اُس وقت تک اللہ تعالےٰ کے حقوق کی ادائگی بھی اس کی اس کوتاہی کو پورا نہیں کر سکتی۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں نماز کی بابت فرماتا ہے کہ نماز بری حرکتوں سے بچاتی ہے، روزے کی بابت ارشاد ہے کہ روزہ تقویٰ سکھاتا ہے، اور زکوٰۃ تو یکسر انسانی ہمدردی اور غمخواری کا سبق ہے۔ علیٰ ہٰذا حج مختلف طریقوں سے دوسروں کی امداد کا ذریعہ ہے۔ گویا عبادات کے مقاصد میں بھی اخلاق حسنہ کی تربیت شامل ہے، اگر کسی عابد کے اخلاق صحیح نہیں ہیں تو اُس کی عبادت بے خوشبو کا پھول اور بے پھل کا درخت ہے۔ حضرت امام غزالیؒ اگلی کتابوں کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ "اللہ فرماتا ہے، میں ہر شخص کی نماز قبول نہیں کرتا۔ میں اس کی نماز قبول کرتا ہوں جو میری بڑائی کے سامنے سرنگوں ہو جو میرے بندوں پر اپنی بڑائی نہ جتائے۔ ایک اور روایت ہے کہ جس کو اس کی نماز برائی اور بدی سے نہ روکے اُس کی نماز، نماز نہیں ہے۔" اسی قسم کے الفاظ روزہ کی بابت ہیں کہ جو شخص روزے میں بھی جھوٹ اور فریب سے باز نہیں آتا، اللہ کو اُسے محض بھوکا پیاسا رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

مشہور آیت لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ ....' میں ارشاد ہے کہ صرف نماز پڑھ لینے ہی کو نیکی مت جانو۔ (فیاضی، ایفائے عہد اور صبر وثبات وغیرہ اوصاف بھی نیکی ہیں)۔

سورہ فرقان وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ سے وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ...... تک پڑھ جایئے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ رحم والے اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم رفتار سے چلتے ہیں (اینٹھتے اور اکڑتے اور زمین کو کچلتے ہوئے نہیں چلتے) اور جب ناسمجھ لوگ اُن سے (نا سمجھی کی) باتیں کرتے ہیں، تو وہ (جھگڑا نہیں بڑھاتے) سلام کہتے ہیں (اور رخصت ہو جاتے ہیں) اور جو خرچ کے وقت نہ فضول خرچی برتتے ہیں اور نہ کنجوسی اختیار کرتے ہیں بلکہ ان دونوں کے بیچ سے سیدھے نکل جاتے ہیں........ اور جو کسی انسان کا بغیر جرم کے خون نہیں بہاتے (انسان کی جان لے لینا ایسی بری بات ہے کہ) جسے اللہ نے (خاص طور سے) منع فرمایا ہے........ اور نہ بدکاری کرتے ہیں، کہ جو بدکاری کرے گا وہ گناہ سے پیوستہ ہو جائے گا، اور جو مکر اور دھوکے کے کاموں میں شامل نہیں ہوتے اور کہیں لغویات کا مظاہرہ دیکھتے ہیں تو (وہاں سے) سنجیدگی اور وقار کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ اور جب اللہ کی آیتیں انہیں سنائی جاتی ہیں تو وہ اندھے اور بہرے نہیں ہو جاتے

اور (جو) دعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں ہمارے بیوی بچوں سے آنکھوں کی ٹھنڈک بخش، اور ہمیں پرہیزگاروں کا پیشوا کر دے
سورۂ شوریٰ میں ہے۔ جو بے حیائی کی حرکتوں سے بچتے ہیں، اور جو غصے کی حالت میں معاف کر دیتے ہیں .... اور ہم نے انہیں جو کچھ دیا ہے اس میں سے راہ مولیٰ میں خرچ کرتے ہیں۔ اور جب ان پر حملہ ہو تب ہی وہ بدلہ لے لیتے ہیں۔ اور (یاد رکھو) برائی کا بدلہ برابر کی برائی ہے۔ (زیادتی مت کر بیٹھنا) اور جو معاف کر دے اور (برے کے ساتھ) نیکی کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔ اللہ ظلم کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔ (مگر خیر) کوئی مظلوم ہو کر (ظلم کے برابر) بدلہ لے لے تو اس پر ملامت نہیں کی جائے گی۔ ملامت اُن پر ہے جو از خود ظلم کرتے ہیں (اور ظلم کرنے میں، پہل کرتے ہیں) اور زمین میں خواہ مخواہ فساد و فتنہ پھیلاتے ہیں۔ انہیں دردناک عذاب ملے گا۔ ہاں جو مظلوم ہونے کے باوجود ظالم کو معاف کر دے اور (ظلم) سہہ لے تو بے شبہ یہ ہمت کا کام ہے۔ (اس کے جگر کا کیا کہنا)

سورۂ دہر میں ہے:۔ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا اور وہ کھانے کے خود ضرورت مند ہوتے ہوئے اپنا کھانا، مسکین، یتیم اور اسیر کو کھلا دیتے ہیں۔

اس قسم کی قرآن مجید میں بہت سی آیتیں ہیں۔ اور حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم نے ان آیتوں کے مطابق جیسا عمل کیا اور کرایا تھا اور عمل کی جیسی تاکید فرمائی ہے اس سے کتبِ احادیث پُر ہیں۔

حضورؐ نے حیا کو اور راستے میں سے تکلیف دہ چیزیں ہٹا دینے کو ایمان کی شاخ کہا ہے۔

حضورؐ فرماتے ہیں:۔ جس میں یہ تین باتیں پیدا ہو جائیں اُسے ایمان کا مزہ آنے لگے گا۔

۱:۔ حق پر ہونے کے باوجود جھگڑے نہیں ۔۔۔ ۲۔ مزاحمت کے باوجود جھوٹ نہ بولے ۔۔ ۳:۔ یقین رکھے کہ جو کچھ پیش آیا ہے وہ ضرور پیش آنا تھا۔ رُک نہیں سکتا تھا۔

حضورؐ فرماتے ہیں:۔ تین باتیں ایمان کا جز ہیں:۔

۱:۔ مفلسی میں خیرات دینا ۔۔۔ ۲:۔ دنیا میں امن پھیلانا ۔۔۔ ۳:۔ اپنے مقابلہ میں بھی انصاف سے منہ نہ موڑنا

حضورؐ فرماتے ہیں:۔ تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے بھائی کے لئے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

حضورؐ فرماتے ہیں:۔ مومن وہ ہے جس پر لوگ اتنا بھروسہ کریں کہ اپنی جان اور اپنا مال اس کی امانت میں دے دیں۔

حضورؐ فرماتے ہیں:۔ جو دوسروں سے محبت نہیں کرتا اور دوسرے اس سے محبت نہیں کرتے وہ اچھا انسان نہیں ہے۔

حضورؐ فرماتے ہیں:۔ مومن طعن و تشنیع، بددعا، گالی اور ہر بدزبانی سے دور رہتا ہے۔

حضورؐ فرماتے ہیں:۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، کوئی شخص اس وقت تک جنت میں نہیں جا سکتا جب تک اُس کا پڑوسی اس کے غصے سے محفوظ نہ رہا ہو۔

آپ دیکھتے ہیں، اسلام کا اخلاقی تخیل کتنا اونچا اور کتنا بلند ہے۔ اب تو ہم فقط سیدھے[1] منہ بول لینے کو خلق سمجھتے ہیں، مگر کبھی قومیں کی قومیں اسلام کی اخلاقی تعلیم و تلقین سے متاثر تھیں۔ حکما نے بھی اخلاق کا سبق دیا ہے، لیکن اُسے پڑھ کر کوئی صاحب اخلاق نہ بن سکا۔ انبیا کی تعلیم و تلقین میں چونکہ للہیت تھی۔ اس نے لوگوں کو اخلاق کے بڑے بڑے مدارج پر پہنچایا۔ آج زمین کے کسی حصے میں حُسنِ اخلاق کی تھوڑی بہت کرن نظر آتی ہے تو وہ نبوت ہی کا فیضان ہے

---

[1] سیدھے منہ بولنا بھی خوش اخلاقی ہے۔ ترش روئی برتنے کو منع کیا گیا ہے وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ لوگوں سے ترش روئی مت برتو۔ قرآن کا حکم ہے لیکن خوش اخلاقی سیدھے منہ بولنے پر ختم نہیں ہو جاتی۔ خوش اخلاقی بڑی وسیع چیز ہے۔ خوش اخلاقی مکمل اسلام ہے

حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا ہر پہلو کتبِ احادیث میں محفوظ ہے اور اس طرح محفوظ ہے، جیسے حضور سامنے موجود ہیں اور ہمیں اپنے عمل کے ذریعہ اخلاق سکھا رہے ہیں۔ حضورؐ کے سوانحِ حیات ملاحظہ فرمایئے۔ محدثینؒ نے حضورؐ کے فرمان کہ میرے ہر قول وعمل کو ایک دوسرے تک پہنچا دو۔ جو مجھے خلوت میں کرتے دیکھو اسے جلوت میں کہہ دو اور جو حجرے میں کہتے سنو اس کو چھت پر چڑھ کر پکار دو اور الا فلیبلغ الشاھد الغائب کی پوری پوری تعمیل کی ہے اور بقول مؤرخ باسورتھ سمتھ حضورؐ کی زندگی کو روزِ روشن کے مانند نمایاں کر دیا ہے۔

ایک شخص نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے پوچھا کہ حضورؐ کے اخلاق کیا تھے۔ ام المومنین نے فرمایا:- کان خلقہ القرآن جو قرآن میں بصورت الفاظ ہے وہ حضورؐ کی سیرۃ میں بصورت عمل تھا۔

حضورؐ نے اہل حاجت کی مدد کے لئے دوسروں ہی سے نہیں کہا پہلے خود اس فرض کو ادا کیا۔ دشمنوں اور قاتلوں کو معافی دے دینے کی ہدایت فرمائی تو پہلے اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معافی دے دی۔ کھانے میں زہر ملانے والوں سے درگزر کی۔ اپنی ذات کا انتقام کبھی نہیں لیا جنھوں نے انتہائی تکلیفیں پہنچائی تھیں اُن پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔

پیغمبری کے زمانے سے قبل کی زندگی کے متعلق بھی قرآن مجید حضورؐ کی طرف سے چیلنج کر رہا ہے:- فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (اے منکرو!) میں اب سے قبل تمہارے درمیان عمر گزار چکا ہوں۔ کیا تم (میری گزشتہ زندگی کو جاننے کے باوجود مجھے سچا) نہیں سمجھتے۔

حضورؐ نے آپ ہی قرآنی تعلیمات کا اسوۂ حسنہ بن کر دکھایا اور اپنے زمانے کے مسلمانوں کو بھی اُسی رنگ میں رنگ دیا۔ انہیں اللہ کے احکام ہی نہیں سُنائے، اُن کو مصفّٰی اور مزکّٰی کر دیا۔ یتلوا علیھم اٰیٰتہ ویزکیھم (وہ انہیں اللہ کی آیتیں سناتے ہیں اور ان کا تزکیہ کرتے ہیں) حضورؐ نے وفات کے وقت کم از کم ایک لاکھ انسان چھوڑے تھے جن کے اخلاق کی بلندی کا جواب دنیا نہ ماضی میں پیش کر سکی تھی، اور نہ مستقبل میں پیش کر سکی۔ پھر یہ جماعت محض مرتاض درویشوں کی جماعت نہیں تھی۔ اس جماعت میں انسانی ترقی کی جملہ قوتوں کی نشو ونما ہوئی۔ مسجد نبوی بالتشبیہ یونیورسٹی تھی، جس میں علم وفن کے جملہ شعبے قائم تھے۔ وہاں ہر ذوق اور جنس کے طالب آتے تھے اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق کمال حاصل کرتے تھے۔

علیؓ، عائشہؓ، ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ، اور زید بن ثابتؓ فقیہہ، محدث کی ڈگری لے کر نکلے۔ خالدؓ، ابو عبیدہؓ، سعد بن ابی وقاصؓ اور عمرو بن العاصؓ سپہ سالار بن کر۔

طلحہؓ، زبیرؓ، معاویہؓ، سعد بن معاذؓ اور سعد بن جبیرؓ نے تدبر سیکھا اور ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، اور علیؓ نے فرماں روائی کا سبق لیا۔ ابوذرؓ، سلمانؓ اور ابو دردؓا کی طبیعت خرقہ پوشی سے مناسبت رکھتی تھی، وہ زہد و تقویٰ میں ڈھل گئے۔ اہل صفہ کو طلب علم کا شوق تھا وہ علم میں مستغرق ہو گئے۔ کوئی قانون، قضاءت اور گورنری کا اہل تھا۔ کوئی دن بھر روزے رکھنے اور رات بھر نمازیں پڑھنے کا۔ جیسی جس کی فطرت تھی اور جیسی جس میں صلاحیت تھی اُسے حضورؐ کے فیضانِ صحبت نے بیدار کر دیا۔

حضورؐ کے صحابہؓ میں امیر بھی نظر آتے ہیں اور غریب بھی، آقا بھی نظر آتے ہیں اور غلام بھی۔ لیکن اعزاز کی ترازو امیری اور آقائی نہیں، ہے۔ جو اللہ کے احکام کا زیادہ پابند ہے وہی زیادہ معزز ہے۔

اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اسلام ہر کام اللہ کی خوشنودی کے لئے کراتا ہے۔ اخلاق برتنے کا مقصود بھی اسلام میں خوشنودی باری تعالیٰ ہے۔ اسی خوشنودی سے مرنے کے بعد جنت ملے گی اور اسی خوشنودی سے موجودہ زندگی جنت بن سکتی ہے۔ اللہ خوش ہوتا ہے

اس زندگی کو بھی جنت بنا دیتا ہے اور اللہ خوش ہوگا تو دوسری زندگی کو جنت بنائے گا۔ بلکہ یوں کہئے کہ اللہ کی خوشنودی ہی جنت ہے
اللہ کی خوشنودی اور اللہ کی نعمتیں الگ الگ شے نہیں ہیں۔ اللہ کی خوشنودی چاہنے والا اپنے ذوق اور اپنی پرواز کے مطابق انعامات پائیگا
حکمائے قدیم نے اخلاق کی بنا تو بیان کی ہے، اگر چہ بنا کے معاملے میں بھی وہ اختلاف رکھتے ہیں، لیکن اخلاق کی غرض و غایت
یہ کہ بالکل مطلق نہیں بتاتے۔ اب البتہ جدید حکیم کینٹ کے قلم سے ایک فقرہ نکل گیا ہے کہ "بغیر اچھے ارادے کے کسی کام پر بھلائی کا لیبل نہیں لگا
سکتا"۔ سے پہلے اُمی آقا چودہ سو برس قبل ان صاف الفاظ میں فرما گئے ہیں۔ انما الاعمال بالنیات انسان کے اعمال کی
نیت سے جانچے جائیں گے۔ پھر اس کی مزید تصریح ان الفاظ سے کر دی۔ ہر شخص کے واسطے وہی ہے جو اس کے دل میں ہو۔ جس کی ہجرت
اللہ اور اس کے رسول کی خاطر ہے تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہے اور جس کی ہجرت کا مقصد دنیا کمانا ہے یا کسی عورت
سے نکاح کرنا ہے تو اس کی ہجرت ان باتوں کے لئے ہے۔

المختصر حسن نیت نہ ہو تو اخلاق کا بڑے سے بڑا عمل بھی حسن خلق کے دائرے سے خارج ہے۔

اب میں بطور نمونہ قرآن پاک کی چند آیتیں پیش کرتا ہوں جن سے اندازہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کس قسم کے اخلاق برتنے کو فرمایا ہے
وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ ...... ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرتے رہنا اور قرابتداروں
اور یتیموں اور اہل حاجت کے ساتھ (بھی)

ماں باپ کے متعلق ایک اور آیت ہے۔ فَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا
جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا (ماں باپ تمہارے دست نگر ہو جائیں تو) اُن سے سخت
کلامی مت کرنا، نہیں جھڑکنا نہیں، بلکہ (ہمیشہ) اُن سے ادب کے ساتھ بات کرنا۔ اور محبت سے اُن کے سامنے عجز و (انکسار) کے ساتھ
بات کرنا۔ اور ان کے لئے دعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار! (میرے ان) دونوں (بزرگوں) پر مہربانی کر (اور) جیسا انھوں نے (پیار و
محبت) سے مجھ کو بچپن میں پالا تھا ایسا ہی آج تو ان کی بے کسی کے وقت ان کے حال پر رحم فرما۔

ماں باپ کے بعد قرابت داروں، یتیموں اور اہل حاجت کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم ہے، ایک دوسری آیت ملاحظہ ہو۔
وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ ......
(اپنا) مال اللہ کی محبت کی خاطر قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سائلوں (کی ضروریات) اور (غلامی وغیرہ سے
مظلوموں کی) گردنوں (کے چھڑانے) میں لگائیں۔

مسکین اور اہل حاجت تو ایک شے ہے۔ یہاں مسافر اور سائل کا اضافہ ہوا۔

ایک اور روایت میں ماں، باپ، قرابت دار، یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کے علاوہ ہمسایوں اور پڑوسیوں، پاس بیٹھنے
والوں (یعنی دوست احباب) اور (لونڈی غلام رہتے کہ حیوانات) جو تمہارے قبضے میں ہوں۔ سب کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے
کا ذکر ہے۔ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ .... وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ
لونڈی غلام کی جگہ اب ماما اور خدمت گار اور ماتحتوں کو سمجھ لیجئے۔ اور وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ کے آگے ارشاد کیا۔ إِنَّ اللَّهَ
لَا يُحِبُّ مَن كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا ۝ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُونَ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ
.... اللہ (ان بیٹھنے اور) اترانے والوں (اور) اپنے تئیں بڑا خیال کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا، جو خود بخل
کرتے ہیں اور (دوسرے) لوگوں کو (بھی اپنے قول اور عمل سے) بخل کی ترغیب دیتے ہیں اور جو (نعمت) اللہ نے انہیں اپنی عنایت سے دی ہے

لئے چھپائے رکھتے ہیں۔

مسکینوں، یعنی حاجتمندوں اور یتیموں، یعنی جن کا کوئی پرسان حال نہ ہے۔ اُن سے صرف اچھا سلوک اور اُن کی صرف خبرگی
نہیں ہے بلکہ یتیموں کے متعلق فرمایا: كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ نہیں، تباہی تم پر اس لئے نازل ہوئی کہ تم یتیموں کی عزت و تکر
کیا کرتے تھے۔ اور ایک جگہ ہے:۔ فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ ۔یتیم کو کبھی نفرت کی نگاہ سے مت دیکھو اسے کبھی نہ جھڑکو (یتیم
تکریم کرنی چاہیئے) اور مسکینوں کے متعلق کہا:۔ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ اور (خود تو کیا کھلاتے، دوسروں کو ترغیب
دیتے کہ حاجتمندوں کو کھانا کھلائیں۔ اسے بھی نزول تباہی کا سبب بتایا۔ وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ... اُن
میں حصہ تھا اس کا جو (منہ سے) مانگتا تھا اور اس کا جو صورت سوال تھا (منہ سے نہیں مانگتا تھا) منہ سے مانگنے والے کو بھی جھ
ممنوع ہے۔ وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ سائل کو جھڑکا نہیں۔

ضرورتمندی میں کسی قسم کی قید نہیں لگائی۔ مقیم ہو یا مسافر سب کی ضرورت پوری کرنا مسلمان کا فرض ہے۔ اسلام نے ساری
انسانوں کو ایک برادری قرار دیا ہے۔ انسانیت میں سب شریک ہیں۔ جو پیرو اسلام ہے وہ ضرورت مندی میں صوبہ، ملک، مسلم
اپنا، بیگانہ کچھ نہیں دیکھے گا۔ ہر ضرورتمند کی مدد کرے گا اور مدد احسان سمجھ کر نہیں کرے گا ضرورتمند کا حق سمجھ کر کرے گا۔ وَفِي أَمْوَ
حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ایک دوسری جگہ ہے وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ قرابتدار کا اور ہر ضرور
اور مسافروں کا حق ادا کرو۔

اللہ نے کسی کو دینے کے لائق بنا دیا ہے اور کسی کو لینے کے لائق۔ دے سکنے والے کا فرض ہے کہ دے اور لینے والے کا فرض ہے کہ اگر
ضرورت ہے تو اللہ کا شکر کر کے لے لے۔ تکلف نہ برتے۔ وہ دینے والے کو اللہ کی خوشنودی جیسی نعمت دلواتا ہے، جو دینے والے کی مدد
افضل ہے۔ مال اسلام میں عزت نہیں ہے، تقوی وجہ عزت ہے۔ بعض اوقات لینے والا اللہ کے نزدیک دینے والے سے زیادہ مع
دینے والا، یا کسی کے ساتھ کوئی اور بھلائی کرنے والا اپنا مقصد نمائش ہرگز نہ رکھے۔ شکریہ کا طالب نہ ہو، کبھی یاد نہ دلائے۔ کچھ
نہ جتائے۔ ان باتوں سے نیکی اور بھلائی برباد چلی جاتی ہے۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہلی وحی کے بعد دوسر
سی مضمون کی تھی کہ وَلَا تَمْنُن تَسْتَكْثِرُ کسی پر اس طرح احسان نہ کرو کہ (احسان کرنے کے بعد اس سے) زیادہ بدلہ چاہو۔

اپنے لئے اور بیوی بچوں کے لئے رزق اور ضروریات کی چیزیں مہیا کرنا مسلمان پر فرض ہے۔ جو ہاتھ پاؤں توڑ کر نکھٹو بنا بیٹھا
اور اولاد تک کی پرواہ نہ کرے، انہیں کھانے کو نہ دے۔ بیمار ہوں تو ان کا علاج نہ کرائے، وہ گویا اولاد کا جان لیوا ہے۔ اور جو بھی اولاد
لے لیتے ہیں انہیں سخت تباہی سے سابقہ پڑے گا۔ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوا أَوْلَادَهُمْ مسلمانوں کو یہ دعا سکھائی گئی ہے
رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ اے ہمارے پروردگار ہمیں ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کی طر
آنکھوں کی ٹھنڈک (اور دل کا چین) عطا فرما۔ لیکن بیوی بچوں کی محبت میں جائز و ناجائز سے دست بردار نہ ہونا چاہیئے۔ ایسے بیوی
کی بابت جن کے لئے ناجائز طریقے حصول دولت کے اختیار کئے جائیں ارشاد ہے:۔ إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ
عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ تمہاری بعض بیویاں اور تمہارے بعض بچے تمہارے دشمن ہیں (کہ تم ان کی محبت میں اللہ اور اللہ
سے غافل ہو جاتے ہو) لہٰذا ایسے بیوی بچوں (کی اس خرابی) سے بچو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَن تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُو
إِلَّا أَن يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِن كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَ

خَیْرًا کَثِیْرًا ..... اے مسلمانو! سوائے اس (صورت) کے کہ تمہاری بیویوں میں کھلی ہوئی بے حیائی آجائے تمہیں (ہر وقت) جائز نہیں ہے کہ بیویوں کو میراث تصور کر کے زبردستی اُن پر قبضہ سا جما لو۔ یا دگر انہیں نباہ نہیں سکتے تو) اس نیت سے کہ تم نے جو کچھ انہیں دے دیا ہے اس میں سے تھوڑا (بہت) چھین لو۔ (انہیں اپنے گھروں میں) مت مقید رکھو۔ بیویوں کے ساتھ سلوک سے رہو۔ اگر وہ تمہیں نہ بھائیں تو (بھی کیا مضائقہ ہے) عجب نہیں کہ ایک شے تم کو ناپسند ہو اور اللہ نے اس میں بہت سی بھلائی رکھی ہو۔ (لہٰذا ذرا ضبط سے کام لو پھر دیکھو) فرمایا:۔ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ مرد عورتوں کے سردھرے ہیں (مردوں کی بڑی ذمہ داری ہے اور ان کو عورتوں کے مقابلے میں زیادہ بُردبار اور بھاری بھرکم ہونا چاہیئے)

مرد گھر کی سلطنت کا بادشاہ بتایا گیا ہے۔ اُسے اس سلطنت کو ہر نوع کی تباہی اور بربادی سے بچانا ہے۔ وہ جس طرح اپنی ذات کی فکر کرے اسی طرح سارے گھر کی فکر کرے حکم ہے:۔ قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا اپنے آپ کو اور اپنے بیوی بچوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔

ارشاد ہے:۔ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى اپنے متعلق یہ کبھی مت سمجھو کہ میرا تزکیہ ہو گیا (اور میں کامل بن گیا) جو (واقعی) متقی ہیں انہیں اللہ ہی خوب جانتا ہے۔

ارشاد ہے:۔ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ تم ایسی بات زبان سے کیوں نکالتے ہو جسے خود کر کے نہیں دکھاتے۔

ارشاد ہے:۔ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (کیا تماشہ ہے کہ) تم لوگوں کو نیکی کی تلقین (وتاکید) کرتے رہتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔

ارشاد ہے:۔ اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ معاہدوں کی پابندی کرو۔ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ۔ (جو عہد وعدہ کرو اس) کو (ہمیشہ) پورا کرو۔ عہد (شکنی اور وعدہ شکنی) کے متعلق (تم سے) باز پرس کی جائے گی۔

ارشاد ہے:۔ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ اُن لوگوں کی دشمنی جو (ایک زمانے میں) تمہیں مسجد الحرام (جانے اور عبادت کرنے) سے روکتے تھے تم کو (اس بات پر) نہ اُبھارے کہ (اُن کے ساتھ کوئی) زیادتی کر بیٹھو۔ آپس میں (ایک دوسرے کی) نیکی اور پرہیزگاری ہی (کے معاملوں میں) مدد کیا کرو۔ گناہ اور ظلم (کے کاموں) میں (کبھی ایک دوسرے کی) مدد نہ کرو۔

جو کام انسانوں کے فائدے کا ہو اور اللہ کے قانون اور منشاء کے خلاف نہ ہو اس میں غیر مسلم سے بھی تعاون کیا جائے اور جس کام سے انسانی ترقی کی رفتار سُست پڑے تو وہ اللہ کے قانون اور منشاء کے ضرور خلاف ہو گا اس میں مسلم سے بھی تعاون نہ کرنا چاہیئے۔

اور ارشاد ہے:۔ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى .... کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہاتھ سے مت دو۔ (سب کے ساتھ) انصاف کرو۔ یہی بات اللہ کے قانون اور منشاء سے قریب ہے۔ اللہ سے ڈرتے رہو۔ (اللہ کے قانون اور منشاء کا برابر خیال رکھو)

اور ارشاد ہے:۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ ..... اے ایمان والو! انصاف کو ہر حال میں قائم رکھو کبھی گواہی دینے آؤ تو شُهَدَاءَ لِلّٰهِ (اللہ کی طرف سے گواہ) بن کر آؤ (اور خدا لگتی گواہی دو) سچی گواہی خواہ خود اپنے خلاف پڑے (وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ) یا تمہارے ماں باپ اور قرابتداروں کے خلاف جائے (اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ) معاملہ میں کوئی مالدار ہو یا فقیر ہو۔ (پاس داری کسی کی نہ کرو) اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا اللہ (کی پاس داری) ان دونوں اہل قرابت اور اہل دولت کی پاس داری) سے افضل ہے (فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا) لہٰذا خواہشات نفسانی کی پیروی مت کرو۔

(حق سے) منحرف ہو جاؤ۔ (وَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَنْ تَعْدِلُوا ...)
اور ارشاد ہے:۔ وَإِنْ تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا اور اگر گواہی میں ایچ پیچ سے کام لوگے۔ یا (سر
سے گواہی دینے ہی سے) گریز کروگے تو (یاد رکھو) اللہ (تمہاری تمام باتوں اور) تمہاری تمام حرکتوں سے واقف ہے۔ (تمہاری نیت
کو جانتا ہے)
لَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ گواہی کو چھپاؤ نہیں۔ جس نے گواہی کو چھپایا اُس کا دل
سیاہ ہے۔

یک نہایت مکروہ عادت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ کم انسان اس عادت سے بچتے ہیں۔ عادت یہ ہے کہ اِدھر کوئی بات سنی اُدھر بغیر
تحقیق کئے اُسے پھیلانا شروع کردیا، ذرا سی بات کو گھر گھر پہنچا دیا۔ ارشاد ہے، وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ
كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا .... جس بات کا تمہیں (ٹھیک ٹھیک) علم نہ ہو (محض پچی) اس کے پیچھے نہ ہو لیا
کرو (بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو ظاہری اور باطنی حواس تم کو عنایت فرما رکھے ہیں اُن سے کام لیا کرو۔ کیونکہ قیامت کے دن، کان اور آنکھ اور دل
سب سے پوچھا جائے گا کہ تم نے کیوں اپنے فرض کی ادائگی میں کوتاہی کی۔ کرنا یہ چاہیے کہ وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ
جب کوئی لغویات سنیں اُس سے کنارہ کش ہو جائیں۔

ہاں ایک اور ہدایت۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ ۖ وَلَا تَجَسَّسُوا
وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۚ أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ ۔
ے مسلمانو! (لوگوں کی نسبت) بہت زیادہ شک کرنے سے اجتناب کرو۔ بعض شک گناہ (کا درجہ رکھتے) ہیں۔ اور ایک دوسرے
کی ٹٹول میں بھی نہ رہو، اور ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے بُرا نہ کہو۔ (غیبت کرنا گویا مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا ہے) کیا تم میں سے کوئی
پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے۔ یہ تو تمہیں (کبھی) گوارا نہیں ہوگا (لہٰذا غیبت بھی گوارا نہیں ہونی چاہیے)
اس سے پہلے فرمایا:۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ
مِنْ نِسَاءٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُنَّ خَيْرًا مِنْهُنَّ ۖ وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ اے مسلمانو۔ مرد مردوں کا تمسخر نہ کریں۔ ممکن ہے (جن کا تمسخر کیا
جائے، وہ تمسخر کرنے والوں سے بہتر ہوں اور عورتیں عورتوں کا تمسخر نہ کریں۔ ممکن ہے تمسخر کی جانے والی عورتیں تمسخر کرنے والی عورتوں سے
بہتر ہوں، اور ایک دوسرے کو طعنہ بھی مت دو اور ایک دوسرے کو بُرے لقب (اور بُرے نام) سے مت پکارو۔
ارشاد ہے، إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لُعِنُوا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ
جو لوگ پاک دامن (اور مکروہات دنیہ سے) بے خبر (اور) با ایمان عورتوں پر (بدترین گناہ کی) تہمت لگاتے ہیں۔ (وہ بدترین خلائق ہیں)
وہ دنیا اور عقبیٰ (دونوں جہان) میں ملعون ہوگئے اور اُن کے واسطے بڑا (سخت) عذاب (تیار ہے)
اور ارشاد ہے:۔ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا
(نیز) زمین پر (اتراتے ہوئے اور) اکڑتے ہوئے مت چلا کرو۔ کیونکہ تم نہ تو (زور زور سے قدم مار کر) زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور
نہ گردن کو اوپر کھینچ کر پہاڑ کی اونچان کو پہنچ سکتے ہو۔
ارشاد ہے:۔ وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ اپنی رفتار میں میانہ روی رکھو (نہ بالکل گر کر چلو اور نہ اکڑ کر)
ارشاد ہے:۔ قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ اے رسول! مسلمان مردوں سے کہہ دو کہ نظریں نیچی رکھ کر چلا کریں

(اور ادھر اُدھر نہ تکا کریں۔ خصوصاً راہ چلتی عورتوں سے اپنی آنکھوں کو بچائیں)

اور ارشاد ہے :۔ قُل لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ (اے رسول!) مسلمان عورتوں سے (بھی) کہہ دو کہ نظریں نیچی رکھا کریں (اور نامحرم مردوں کو نہ دیکھا کریں)۔ ارشاد ہے :۔ يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ (اللہ) آنکھوں کی خیانت اور سینوں میں چھپے ہوئے رازوں سے باخبر ہے۔ ارشاد ہے لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ بے حیائی کی بوں کے نزدیک مت جاؤ۔ خواہ وہ بے حیائی کی باتیں علانیہ ہوں خواہ پوشیدہ۔

ارشاد ہے :۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ...... جو لوگ اسے پسند کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں بے حیائی (کی باتوں) کی اشاعت ہو وہ دنیا میں بھی دردناک سزا کے مستحق ہیں اور آخرت میں بھی)

ارشاد ہے :۔ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ .... (مسلمانوں کی تعریف یہ ہے کہ وہ (ہر) لغو حرکت (اور ہر لغویات) سے اعراض (اور نفرت) کرتے ہیں۔

اور ارشاد ہے :۔ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (مسلمانوں کی تعریف یہ ہے کہ لغو باتوں اور بے ہودہ کھیل تماشوں میں حصہ نہیں لیتے اور اگر (اتفاق سے) وہ (کبھی) لغویات کے پاس سے گزرتے ہیں تو شریفوں (اور بردبار لوگوں) کی طرح گزر جاتے ہیں۔

ارشاد ہے :۔ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ (مسلمانو! ہمیشہ) صحیح (اور پکی) بات کہا کرو۔ (غلط اور ڈھکوسلے کی بات زبان سے نہ نکالو) تاکہ اللہ تمہارے عملوں کو سنوار دے (اور تمہاری اخلاقی حالت کو درست فرما دے)

اور ارشاد ہے :۔ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (جن سے بات کرنی ہو) ان سے ایسی زبان بولو جو معقول (لوگوں کی زبان) ہے

اور ارشاد ہے :۔ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (غیر مسلموں کے کسی قول یا فعل سے مشتعل ہو کر بھی کوئی غیر مہذب کلمہ زبان پر مت لاؤ۔ بلکہ ان سے گفتگو ہو تو مسلمان) وہ بات کہیں جو (اخلاقاً مناسب اور) بہتر ہو۔

اور ارشاد ہے :۔ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ .... سچائی میں جھوٹ کی آمیزش نہ کرو اور جان بوجھ کر حق کو نہ چھپاؤ۔

اور ارشاد ہے :۔ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ مکر و فریب کی باتیں کرنے سے پرہیز کرو۔

اور ارشاد ہے :۔ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا جب بولو انصاف کی بات بولو۔

اور ارشاد ہے :۔ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ (بات کرتے وقت) اپنی آواز نرم (اور دھیمی) رکھو۔ چیخ کر اور چنگھاڑ کر مت بولو گدھے کی آواز بہت ناپسندیدہ (آواز) ہے۔

ارشاد ہے :۔ لَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ .. ایک دوسرے کا مال (چوری کر کے۔ خیانت کر کے۔ دغابازی کر کے۔ رشوت لے کر۔ جوا کھیل کر، فریب دے کر، غرض کسی) ناحق (طریقے سے) نہ کھاؤ۔

اور ارشاد ہے :۔ فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ رزق تم اللہ سے مانگو۔ محنت کرو۔ سرگرم عمل رہو۔ انسان اس شے کو پا سکتا ہے جس کے لئے وہ جدوجہد کرے، مگر بغیر جدوجہد کے انسان کو کچھ نہیں ملتا۔ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى اور ملتا ہے ناجائز ملتا ہے۔ جیسے کسان کی کمائی زمیندار کھاتا ہے۔ اللہ کے قانون کے مطابق جدوجہد کرو گے تو اللہ جائز رزق دے گا۔ اللہ کا قانون یہ ہے کہ (قیامت کے دن) انسان کو اپنی (ذاتی سعی اور) کوشش ہی کا ثمرہ ملے گا۔

وَ فِی اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ مسلمانوں کی دولت میں مُنہ سے مانگنے والے (ضرورت مند) اور مُنہ سے نہ مانگنے والے (صورتِ سوال) کا حصہ ہے۔ یعنی دولت پر سانپ بن کر نہ بیٹھنا چاہیئے۔ اسے اہلِ ضرورت کو دینا چاہیئے۔ تمہاری ضروریات سے جس قدر بچے، وہ غرباء کا حق ہے اور ملک و ملت کا حق ہے۔ یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ اے رسول! (مسلمان) تم سے پوچھتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) کس قدر مال خرچ کیا کریں (تم انہیں بتا دو کہ جتنا (تمہاری) ذاتی ضرورتوں سے زائد ہو۔ اور تمہاری ضرورتیں کیا ہیں۔ کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا کھاؤ پیو لیکن (کھانے پینے اور رہن سہن میں) فضول خرچی نہ کرو۔ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا اور (مال و دولت کو فضول (اور بے موقع) مت خرچ کیا کرو۔

ارشاد ہے۔ اَوْفُوا الْکَیْلَ اِذَا کِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ۔ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا (داد و ستد میں بد دیانتی نہ کیا کرو) جب (کوئی شے) ناپو تو پوری ناپو اور (جب تولو تو) ٹھیک ترازو سے تولو۔ (مصالح تمدن و معاشرت کے لحاظ سے) یہی (تم سب کے حق میں) بہتر ہے اور نتیجے کے اعتبار سے (خاص تمہاری ذات کے لئے) بہت اچھا ہے۔ (کم ناپنے اور کم تولنے میں بظاہر نفع معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقتاً نفع نہیں رہتا۔

ارشاد ہے:۔ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْیُؤَدِّ الَّذِی اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ اگر ایک انسان دوسرے انسان کا اعتبار کرتا ہے تو جس کا اعتبار کیا گیا ہے اُسے چاہیئے کہ (اعتبار کو نباہے اور) امانت ادا کرے۔

آیتیں کہاں تک نقل کئے جاؤں۔ قرآن مجید ایسی آیتوں سے بھرا ہوا ہے۔ جن جن اخلاق کی قرآن میں اور احادیث میں تلقین کی گئی ہے اُن کی دو الگ الگ فہرستیں علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے مرتب فرمائی ہیں۔

مکمل فہرستیں یہ بھی نہیں ہیں، کم از کم احادیث کی فہرست نامکمل ہے۔ بہر حال انہیں درج کرتا ہوں۔ ان فہرستوں سے اندازہ کیجئے کہ انسان کو اخلاق کی اتنی گہرائیوں میں اسلام کے سوا کوئی بھی لے جا سکا ہے۔ کہنے والے کہا کرتے ہیں کہ اچھی باتیں کون سا مذہب نہیں سکھاتا۔ پھر اچھی باتوں کو اسلام کے ساتھ کیوں مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ بے شک دوسرے مذاہب اچھی باتیں اور اچھے اخلاق ہی سکھاتے تھے۔ اسے ماننا تو مسلمان کا فرض ہے۔ لیکن اچھی باتوں اور اچھے اخلاق کو انتہا پر آخری دین اور آخری نبی ہی نے پہنچایا ہے ؎

دونوں جہان آئینہ دکھلا کے رہ گئے لانا پڑا تجھی کو تمہاری مثال میں

آخری نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے انسانوں ہی کے ساتھ خلق برتنا نہیں سکھایا بلکہ جمادات، نباتات اور حیوانات کے بھی حقوق قائم کئے ہیں۔ اُن کے حقوق کی ادائگی اُن کے ساتھ اخلاق برتنا ہے۔ جمادات کا حق یہ ہے کہ انہیں بے موقع نہ صرف کیا جائے۔ نباتات کا حق یہ کہ انہیں نشو و نما دی جائے۔ حیوانات کا حق یہ ہے کہ اُن سے وہی کام لیا جائے جس کے لئے وہ پیدا ہوئے ہیں۔ حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اسے تمثیلی حکایت بیان کر کے واضح کیا ہے۔ فرمایا:۔

"کوئی شخص بیل پر بیٹھا چلا جا رہا تھا۔ بیل نے منہ موڑ کر اُس سے کہا۔ میں تو کھیتی باڑی کے لئے پیدا کیا گیا ہوں۔ سواری کے لئے نہیں پیدا کیا گیا۔"

نباتات کے متعلق حضورؐ نے فرمایا:۔

"پرندے اور مویشی جس درخت کے پھل یا پتے کھاتے ہیں اُس درخت کے لگانے کا ثواب ملتا ہے۔ پھل دار درخت بے سبب کاٹنے کی حضورؐ نے ممانعت کی ہے۔"

حیوانات کے متعلق حضورؐ نے فرمایا:۔

اللہ تعالیٰ نے ایک شخص کو محض اس وجہ سے بخش دیا کہ اس نے کتے کی جان بچائی تھی اور ایک شخص کو دوزخ میں ڈال دیا، اس وجہ سے کہ اس نے بلی کی جان لے لی تھی۔"

خیر اب فہرستیں پڑھئے:۔

قرآنی اخلاق کی فہرست

حضور سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کسی خاص قوم یا کسی خاص زمانے کے لئے مخصوص نہیں تھی۔ لہٰذا حضورؐ کو تعلیمات کا جو صحیفہ عنایت ہوا اُسے صرف ایک قوم اور زمانے کی اخلاقی اصلاح تک محدود نہیں رکھا گیا۔ بلکہ تمام قوموں اور زمانوں تک وسیع کر دیا گیا چونکہ تمام قوموں اور زمانوں میں جو برائیاں پائی جانے والی تھیں ان کی ممانعت قرآن مجید کے اندر موجود ہے، اور اسی طرح جملہ انسانی محاسن اخلاق بھی کھول کھول بیان فرمائے ہیں۔ گزشتہ صحیفوں میں جن برائیوں سے روکا گیا تھا، یا جن نیکیوں کی تعلیم دی گئی تھی حضورؐ کی وحی مبارک نے اُن کی جزئیات کا استقصا کیا ہے اور ان کے سب گوشے روشن کردیئے ہیں۔ خیر اب قرآنی اخلاق کی فہرست ملاحظہ کیجئے۔

توکل، صبر، شکر، حق پر استقامت، اللہ کی راہ میں جان دینا، سخاوت اور خیرات، بخل اور فضول خرچی دونوں کی ممانعت اور میانہ روی کی ہدایت۔ عزیزوں، قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں کے ساتھ بھلائی۔ مسافروں، سائلوں اور حاجتمندوں کی امداد غلاموں اور قیدیوں کے ساتھ سلوک۔ امانت داری، ایفائے وعدہ۔ عہد کا پورا کرنا، معاہدوں کو ردی کی ٹوکری میں نہ ڈالنا۔ بلکہ نباہنا۔ صدقہ دینا۔ نیکی کے کام اور بھلائی کی بات کرنا۔ کسی کو برا بھلا نہ کہنا۔ نہ کسی کو چڑانا۔ اور نہ کسی کو بُرے نام یا لقب سے یاد کرنا آپس میں محبت بڑھانا۔ والدین کی خدمت اور اطاعت۔ ملاقات کے وقت ایک دوسرے کو اچھائی اور سلامتی کی دعا دینا۔ حق گوئی انصاف پسندی، سچی گواہی۔ گواہی کا نہ چھپانا۔ جھوٹی گواہی کی خطرناکی، نرمی سے بات کرنا، اکڑ کر نہ چلنا۔ صلح جوئی۔ اتحاد و اتفاق ایمانی برادری، انسانی برادری۔ اکل حلال۔ روزی خود کمانا۔ تجارت کی تعریف۔ گداگری کی کراہیت۔ لوگوں کو اچھی باتیں سکھانا اور بُری باتوں سے باز رکھنا۔ اولاد کشی، خودکشی اور کسی کی ناحق جان لینے کی مذمت۔ یتیم کی کفالت اور اس کے مال و جائداد کی حفاظت ناپ تول میں ایمان نہ بگاڑنا۔ فساد نہ پھیلانا۔ بے شرمی کی حرکات سے روکنا۔ زنا کی حرمت۔ مردوں اور عورتوں کا ایک دوسرے کو نہ تکنا اور نگاہیں نیچی رکھنا۔ کسی کے گھر میں بے اجازت داخل نہ ہونا۔ ستر اور حجاب کی اچھائی۔ خیانت، جھوٹ، غصہ اور فخر و غرور کی برائی۔ سچ بولنے کی تاکید۔ آنکھ، کان اور دل کی باز پرس کا اعلان۔ لغو سے اعراض۔ ایثار۔ تحمل۔ دشمنوں کے ساتھ انصاف برتنا۔ دشمنوں کو معافی دینا۔ بدی کے جواب میں نیکی کرنا، مخالفوں سے گفتگو کرتے وقت آداب کا خیال رکھنا۔ مشرکوں کے بتوں تک کو بُرا نہ کہنا۔ صدقہ و خیرات کر کے احسان جتانے کی مذمت۔ اُلٹے لینے کی مذمت۔ علم بے عمل کی مذمت۔ عفو و درگزر۔ فسق و فجور سے نفرت، چوری، ڈاکہ زنی، اور دوسرے کا مال بے ایمانی سے کھا جانے کی ممانعت۔ دل کا تقویٰ اور پاکیزگی۔ اس پاکیزگی کا اظہار کرنے کی ممانعت۔ رفتار میں وقار اور متانت، مجالس میں حسنِ اخلاق۔ ضعیفوں، مزدوروں اور عورتوں کے ساتھ نیکی، شوہر کی اطاعت۔ بیوی کے حقوق، خواہ مخواہ قسمیں کھانے اور چغلخوری۔ تہمت تراشی اور طعنہ زنی کی برائی۔ جسم و روح اور کپڑوں کی پاکیزگی۔ سائل کو نہ جھڑکنا یتیم کو نہ دبانا۔ غیبت نہ کرنا۔ بدگمانی نہ کرنا۔ سب پر رحم، اللہ کی نعمت کا اظہار لیکن ریا اور نمائش کی ناپسندیدگی۔ قرض دینا۔ قرض معاف کر دینا۔ سود اور رشوت کی ممانعت۔ ثبات۔ استقلال اور شجاعت کی تعریف۔ میدان جنگ سے بھاگنے کی مذمت۔ شراب پینے اور جوا کھیلنے کی ممانعت۔ بھوکوں کو کھانا کھلانا۔ لوگوں سے بے غرض بھلائی کرنا۔ لوگوں سے بے رخی نہ کرنا۔ ظاہری اور باطنی ہر قسم

کی بے شرمی کی باتوں سے بچنا۔ معاملات میں سچائی اور دیانت داری برتنا۔ مال و دولت سے محبت نہ رکھنا۔ ایک دوسرے کو حق پر قائم رہنے کی فہمائش کرنا۔ ظلم کرنے سے منع کرنا۔ اللہ کی خوشنودی اور رضامندی کا خیال رکھنا۔

احادیث کے اخلاقیات کی فہرست

قرآن مجید کی تفسیر و تشریح میں حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کچھ کہا اور کیا اُس کا ذخیرہ اتنا ہے کہ علامہ سلیمان مختصر کرکے بھی اُسے اپنی فہرست میں نہیں لکھ سکے۔

قرآن مجیدسے، خود فہرست میں کمی ہوگی تو بھول چوک سے ہوگی۔ مثلاً "لوگوں کے عیبوں کی ٹوہ میں مت رہا کرو" کا عنوان رہ گیا لیکن احادیث کے اخلاقیات کی پوری فہرست کا مرتب کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ ممدوح خود تحریر فرماتے ہیں:۔ کنز العمال میں جو ہر قسم کی حدیثوں کا سب سے بڑا مجموعہ ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات باریک ٹائپ کی بڑی تقطیع کے ایک سو ستاسی صفحوں میں ہیں ہر صفحے میں سینتیس سطریں ہیں، اور تعداد کے اعتبار سے یہ تین ہزار نو سو چھ حدیثیں ہیں جو ڈھائی سو کے قریب مختلف اخلاقی ابواب و عنوانات میں منقسم ہیں۔ ان میں بعض مکرر باتیں بھی ہیں۔ تاہم ان سے اندازہ ہوگا کہ انسان کی اخلاقی اور نفسانی کیفیات و حالات کا کوئی ایک جُز نہیں ہے جو داعیٔ اسلام علیہ السلام کی تلقینات سے رہ گیا ہو، اور جس پر دنیا کے اس سب سے بڑے اور سب سے آخری اخلاقی معلم کی نگاہ نہ گئی ہو۔ ہم ذیل میں حضورؐ کی اخلاقی تعلیمات کے صرف وہ عنوان لکھتے ہیں، جو صحیح بخاری، جامع ترمذی اور سُنن ابو داؤد میں مذکور ہیں ——— وہ یہ ہیں:۔

صلہ رحمی، ماں باپ کے ساتھ سلوک۔ بچوں سے محبت۔ چھوٹوں کی محبت اور بڑوں کی عزت۔ اپنے بھائی کو اپنے مانند سمجھنا۔ ہمسایوں کے ساتھ سلوک۔ غلاموں کے ساتھ سلوک۔ غلاموں کا قصور معاف کرنا۔ اہل و عیال کی پرورش۔ بیوہ کی خبر گیری۔ حاجتمندوں کی مدد۔ اندھوں کی دست گیری۔ عام انسانوں سے ہمدردی۔ قرضداروں پر احسان۔ فریادیوں کی فریادرسی۔ خلق کو نفع پہنچانا۔ مسلمانوں کی خیرخواہی۔ جانوروں پر شفقت اور رحم۔ محسنوں کی شکر گزاری۔ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق۔ بیماروں کی خدمت و عیادت۔ رشک و حسد کی ممانعت۔ دوسروں کی مصیبت پر خوش ہونے کی ممانعت۔ شجاعت و بہادری۔ میدانِ جنگ سے بھاگنے کی بُرائی۔ امیر اور امام کی اطاعت۔ مذمتِ عمل۔ اپنے ہاتھ سے کام کرنا۔ شیریں کلامی۔ خوش خلقی۔ فیاضی۔ بدزبانی سے اجتناب۔ مہمان نوازی۔ شرم و حیا۔ حلم و وقار۔ غصے کو ضبط کرنا۔ عفو و درگزر۔ صبر و تحمل۔ حسب و نسب پر فخر کرنے کی مذمت۔ بدگمانی کی برائی۔ کسی کے گھر میں بغیر اجازت نہ داخل ہونا۔ دوسروں کے گھر جا کر ادھر اُدھر نہ دیکھنا۔ لوگوں کے لئے اُن کے پیٹھ پیچھے دُعا کرنا۔ نرمی۔ قناعت اور استغنا۔ گداگری کی ممانعت۔ ملے گناہوں کی پردہ پوشی، انہیں کہتے نہ پھرنا۔ دوسروں کے عیوب کا ڈھنڈورا نہ پیٹنا۔ انہیں چھپانا۔ چغلخوری کی ممانعت۔ تہمت تراشی کی ممانعت۔ غیبت کرنے کی ممانعت۔ بغض و کینہ رکھنے کی ممانعت۔ دوسروں کی ٹوہ لگانے کی ممانعت۔ رازداری۔ تواضع و خاکساری۔ امانت داری۔ گالی دینے کی ممانعت۔ منہ پر مدح و ستائش کرنے کی ممانعت۔ بخل کی ممانعت۔ فضول گوئی کی ممانعت۔ فضول خرچی کی ممانعت۔ کبر و غرور کی مذمت۔ ہنسی مذاق کرنے کی بُرائی۔ نفسِ انسانی کا احترام۔ ظلم کی ممانعت۔ عدل و انصاف۔ تعصب کی ممانعت۔ سخت گیری کی ممانعت۔ لالچ کی بُرائی۔ غمخواری و غمگساری۔ توکل۔ رضا بالقضا۔ ماتم کرنے کی ممانعت۔ قماربازی کی ممانعت۔ سچائی کی ہدایت اور جھوٹ کی ممانعت۔ جھوٹی گواہی کی ممانعت۔ جھگڑے فساد کی ممانعت۔ باہم مصالحت کرنے کرانے کی تعریف۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے تین دن سے زیادہ ناراض نہ رہے۔ منافقت برتنے اور دو چالیں چلنے کی مذمت۔

عدہ خلافی کی ممانعت۔ خیانت اور فریب کاری کی ممانعت۔ شراب خواری، زنا، اور چوری کی ممانعت۔ طہارت اور صفائی کی ہدایت۔ دوست احباب سے ملنے کی ہدایت۔ سلام و تحیت۔ مصافحہ و معانقہ اور دیگر آداب ملاقات۔ آداب مجلس۔ آداب طعام۔ آداب لباس۔ آداب نشست و خاست۔ خانہ داری کے آداب۔ سونے جاگنے کے آداب۔ عورتوں سے سلوک کرنے کے خاص آداب و احکام۔

ان تفصیلات سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ حضور سرور کائنات صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ اخلاقیات کا کتنا عظیم الشان ذخیرہ انسانوں کو عطا کر دیا گیا ہے۔

اخلاقی جزئیات کا استقصا

انسان بہانہ جو اور حیلہ طلب واقع ہوا ہے۔ اُس کے لئے اخلاقیات کے فقط اصول کافی نہیں ہیں۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ ہر خوش اخلاقی اور بداخلاقی کا استقصا کیا جائے اور اخلاق کے ایک ایک پہلو کو کھولا جائے اور احکام واضح طور پر دیئے جائیں۔ حضور سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ نکتہ پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔

مثال سے سمجھئے:۔ صدقہ و خیرات تمام مذاہب کے نزدیک ثواب کا کام ہے۔ لیکن توراۃ نے اسے عشر اور زکوٰۃ تک محدود کر دیا ہے۔ کسی اور قسم کے صدقہ و خیرات کا توراۃ میں نہیں ذکر نہیں ملتا۔ انجیل کہتی ہے، سب کچھ دے دو اور خود غریب بن جاؤ۔ حضور سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم دونوں کو سموتی ہے۔ اور پھر دونوں کے ایک ایک جزو کی تفصیل کرتی ہے۔ توراۃ میں یہ مبہم تھا کہ کتنے غلے یا سونے چاندی کے مالک پر عشر یا زکوٰۃ فرض ہے اور کن کن چیزوں میں فرض ہے۔ شریعت محمدیؐ نے مقدار۔ تعداد۔ اجناس کس چیز پر عشر لیا جائے اور کس چیز پر زکوٰۃ۔ اُن کی تحصیل کا طریقہ۔ اُن کے اخراجات اور مصارف سب کی تعیین کر دی ہے۔

امداد کے اول مستحق وہ ہیں، جن کی کفالت تمہارے ذمے ہے۔ یعنی اہل و عیال۔ پھر حاجتمند اعزا و اقربا۔ پھر دوسرے محتاج و مسکین اور یتیم و مسافر۔

حضورؐ نے ایک دفعہ فرمایا: "صدقہ ہر مسلمان پر واجب ہے" صحابہ بولے۔ اگر کسی میں اتنی مقدرت نہ ہو۔ فرمایا۔ وہ مزدوری کرے اور جو کمائے کچھ خود کھائے، اور کچھ محتاجوں کو کھلائے۔ صحابہ نے عرض کیا۔ اگر کوئی مزدوری نہ کر سکتا ہو۔ فرمایا۔ وہ غم رسیدہ حاجتمندوں کی جسمانی خدمت انجام دے اور یہ نہ کر سکے تو نیکی کی تعلیم دے۔ اور یہ بھی نہ کر سکے تو خود برائی سے بچے۔ یہ بھی صدقہ ہے۔ اچھی بات کی تبلیغ کرنا اور بری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے اور بھولے بھٹکے مسافر کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے۔ اندھے کی دست گیری بھی صدقہ ہے۔ راستے سے تکلیف دہ چیزوں کا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے، اپنے ڈول کا پانی اپنے بھائی کے ڈول میں ڈال دینا بھی صدقہ ہے۔

ملاحظہ کیا آپ نے۔ صدقہ اور خیرات کا مفہوم اسلام میں کتنا وسیع ہے۔

جامعیت کی ایک اور مثال

نشہ آور چیزوں کو کسی مذہب نے اچھا نہیں کہا لیکن صاف صاف حرام بھی کوئی مذہب نہیں کہتا۔ اسلام پہلا مذہب ہے جو نشہ آور چیزوں کو قطعی حرام قرار دیتا ہے۔ قرآن مجید نے شراب کے لئے خمر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حضور سرور کائنات صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تشریح کر دی۔ فرمایا:۔ شراب انگور منقّیٰ۔ کھجور۔ جو۔ جوار۔ گیہوں۔ شہد اور ہر چیز کے نچوڑنے سے بنتی ہے اور میں تمہیں ہر نشہ آور چیز سے منع کرتا ہوں۔ قرآن مجید نے شراب کی حرمت کا اعلان کیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا:۔ اللہ شراب پر، اس کے پینے والے پر، اس کے پلانے والے پر، اس کے بیچنے والے پر۔

اس کے خریدنے والے پر، اس کے نچوڑنے والے پر، اُس کے (تنہا) اپنے لئے نچوڑنے والے پر، اس کے لے جانے والے پر، اور اس پر جس کے پاس وہ لے جائی جائے لعنت کرتا ہے۔

عرب سے باہر ممکن تھا کہ اور چیزوں سے بھی شراب بنتی ہو، لہٰذا حضورؐ نے فرمادیا:۔ ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ یہ ممکن تھا کہ ایسی شراب بننے لگے جس کی کم مقدار انسان کو بدمست نہ کرے۔ لہٰذا فرمایا۔ جو چیز زیادہ مقدار میں نشہ لائے اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔

حضورؐ نے مُنشّی ہی نہیں مُخدّر چیزوں سے بھی منع کیا۔ اعصاب میں خدر کی کیفیت نشہ کا ابتدائی مقدمہ ہوتی ہے۔

حضورؐ نے فرمایا:۔ میری امت میں کچھ لوگ نام بدل کر شراب کا استعمال کریں گے۔

جن برتنوں میں شراب پی جاتی تھی یا رکھی جاتی تھی، عارضی طور پر حضورؐ نے ان تک کا استعمال بند کرا دیا تھا، تاکہ برتنوں کو دیکھ کر شراب کی ہڑک نہ اٹھے۔

تیسری مثال

سُود کو توراۃ نے بھی حرام کہا ہے اور انجیل نے "ناروا نفع" لینے سے منع کیا ہے۔ لیکن یہ ممانعت مجمل ہے۔ اسلام نے اسے حرام قرار دے کر اس کی حقیقت، اس کی قسمیں، کن کن چیزوں پر کس کس قسم کا سُود ناجائز ہے سب کچھ پوری تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔ سُود کے مشابہ معاملات سے بھی باز رکھا ہے۔ اس ظلم کی معمولی سی شرکت سے بھی روکا ہے۔ حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم نے سود لینے والے اور سود دینے والے۔ سود کے معاملے میں گواہی دینے والے اور سود کا کاغذ لکھنے والے سب پر لعنت بھیجی ہے۔

تمام اخلاقی تعلیمات میں اسلام نے اسی طرح جُزئیات کا احاطہ کیا ہے۔ جتنی خراب صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں ان کو ایک ایک کر کے مٹایا ہے اور خرابی کا قلع قمع کر ڈالا ہے۔

اسلام خرابی کے ہر پہلو کو دیکھتا ہے۔ تواضع و خاکساری کی جگہ تواضع و خاکساری سکھاتا ہے اور عزت نفس و خودداری کی جگہ عزت نفس و خودداری۔ اسلام کے نزدیک عفو و درگزر بلند ہمتی کا کام ہے لیکن عدل اور قانونی کارروائی بھی کم درجے کی چیز نہیں ہے۔ اسلام نے اخلاق کا وہ معتدل نظام پیش کیا ہے کہ اس کے پیرو دس سال کی قلیل مدت میں کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ اسلام نے اخلاق کے ایسے نسخے تجویز کر دیئے ہیں جن سے ہر طبیعت کا انسان ہر زمانے میں صحت و تندرستی حاصل کر سکتا ہے۔ اسلام اچھی قوتوں کو نشو و نما دیتا ہے اور بُری قوتوں کا رُخ اچھے مقاصد کی طرف پھیر کر ان کی برائی کو دور کر دیتا ہے۔ جس میں کوئی عنصر زیادہ ہے اُسے گھٹاتا ہے اور جس میں کوئی عنصر کم ہے اسے بڑھاتا ہے۔ غرض انسان کی نفسانی کیفیت کو اعتدال پر لاتا ہے۔ اخلاق کے چشمے قوت غضب اور قوت شہوت سے پھوٹا کرتے ہیں۔ غضب کی قوت اگر معتدل ہے اور عقل کی تابع، تو اس کا نام شجاعت ہے، جو مختلف پیکروں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ مثلاً دلیری آزادی۔ خودداری۔ وقار۔ حق گوئی۔ بلند ہمتی۔ استقلال، ثبات۔ صبر و سکون۔ مطالبہ حق۔ جد و جہد، سعی و محنت، جہاد ——— اور غضب کی قوت افراط کی طرف مائل ہو جائے تو اس کا ثمرہ غرور، نخوت، خود پرستی، تکبر، ترفع، دوسروں کی تحقیر، ظلم ہیں اور تفریط کی طرف جھک جائے تو اس کا ثمرہ کم حوصلگی۔ خوف۔ دنارت۔ ذلت پسندی۔

علیٰ ہذا شہوت کی قوت میں جب اعتدال ہوتا ہے تو یہ عفت کہلاتی ہے۔ اور جب اعتدال جاتا رہتا ہے تو اس سے حرص، طمع، بے شرمی، بے غیرتی۔ تملق۔ حسد۔ رشک۔ ریا۔ بخل۔ فضول خرچی اور اوباشی جیسے عیوب جنم لیتے ہیں۔ دوسرے مذاہب کا منشا ہے کہ ان دونوں

...توں یعنی غضب اور شہوت کا استیصال کردیا جائے۔ اسلام ان کا استیصال نہیں چاہتا۔ ان کو افراط و تفریط سے بچانا چاہتا ہے۔
...ول امام غزالی علیہ الرحمۃ قرآن مجید نے غصہ دبانے والے کی تعریف کی ہے، غصہ مٹانے والے کی تعریف نہیں کی۔ وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ
...یا ہے، وَالْفَاقِدِیْنَ الْغَیْظَ نہیں کہا۔

یہ دونوں قوتیں مٹ جائیں تو عدل کا وجود نہ رہے اور امن و امان کا نشان نہ ملے۔ نیکی، سعادت اور خوش بختی کی آدھی دنیا
...جائے۔ بلکہ دنیا ایسا ویرانہ بن جائے جس میں حرکت و جنبش نہ ہو۔ غصہ اور خواہش بُری چیزیں نہیں ہیں۔ غصہ کا بے جا استعمال
...ور ناجائز خواہش کرنا بُرا ہے۔ حضور سرور کائنات صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:۔ اللہ معالی امور (یعنی عالی حوصلگی کے بڑے
...م) پسند کرتا ہے اور محقرات (یعنی گھٹیا اور ذلیل کام) ناپسند کرتا ہے۔ کمزور مسلمان سے قوی مسلمان بہتر ہوتا ہے۔ قوی مسلمان اللہ کو
...ی ہے۔ وہ چیز جو تمہیں نفع دے اس کی پوری خواہش کرو اور اس کے حصول کے لئے اللہ سے مدد مانگو۔ اسلام نشتر بھی لگاتا ہے۔ کہ فاسد
...واد نکل جائے اور مرہم بھی دھرتا ہے تاکہ باقی گوشت اور کھال کی پرورش ہو۔ کام دونوں ہی چیزوں سے چلتا ہے۔ اکیلا نشتر اور اکیلا
...رہم تندرست نہیں کرسکتا۔ ع

قاہری با دلبری پیغمبری است

اسلام تمام مرضوں کے واسطے نسخے تجویز کرتا ہے۔ مرض بے شمار ہیں۔ لہٰذا اسلام کے مجوزہ نسخے بھی بے شمار ہیں۔ جیسا مرض،
...یسا نسخہ

ایک صحابی نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! مجھے کچھ نصیحت کیجئے۔ فرمایا، غصہ نہ کرو۔ انھوں نے کئی بار درخواست کو دوہرایا،
...ر بار یہی جواب پایا کہ غصہ نہ کرو۔

ایک اور صحابیؓ نے عرض کیا۔ یارسول اللہ! مجھے کچھ نصیحت کیجئے۔ فرمایا، چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی حقیر مت جانو (یعنی اُسے
...کئے جاؤ) کسی سے بات کرو تو تمہارا چہرہ شگفتہ رہے۔ یہ بھی نیکی ہے۔ تمہیں کوئی برا بھلا کہے اور تمہاری برائی جتاکر عار دلائے تو اس
...کا وبال اُسی کی گردن پر رہنے دو۔ تم اسے برا بھلا نہ کہو اور اس کی برائی جتاکر عار نہ دلاؤ۔ اور اپنا تہہ بند آدھی پنڈلی تک اونچی رکھو۔
...ر یہ نہ ہوسکے تو ٹخنے سے اونچا ضرور رکھو۔ کیونکہ تہہ بند کو نیچے تک لٹکانا غرور کی علامت ہے۔ اللہ غرور پسند نہیں کرتا۔

پہلے صحابی غالباً مغلوب الغضب تھے۔ انہیں حضورؐ نے غضب پر غالب آنے کا نسخہ دیا۔ دوسرے صحابی غالباً مغرور تھے۔ بات
...ر تے میں چہرہ ناشگفتہ رکھتے تھے اور تہہ بند اُس زمانے کے اُمرا کی تقلید میں زمین تک لٹکاتے تھے۔ حضورؐ نے انہیں ان کے مرض کے مطابق
...نسخہ بتایا کہ چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی حقیر نہ سمجھو (گویا چھوٹی سے چھوٹی خرابی کا بھی خیال رکھو)

خلیفۂ راشد امیر المومنین سیّدنا علی ابنِ ابی طالب کرم اللہ وجہہ

سیّد ابو الحسن علی ندوی

سب کے ذمہ جو چند کام یا فرض باقی ہیں ان میں سے ایک امیر المومنین سیدنا علی ابن ابی طالب کی شایانِ شان تاریخ یا تذکرہ ہے۔ میرے محدود علم و مطالعہ میں کسی اسلامی زبان میں کوئی ایسی منصفانہ و محققانہ کتاب نہیں، جو اس امامِ برحق اور خلیفۂ راشد کی سیرت اور تاریخ کہی جا سکے، جس میں ان کی عظیم شخصیت کو صحیح اور متوازن طریقہ پر پیش کیا گیا ہو اور افراط و تفریط اور غلو و عصبیت سے محفوظ رہتے ہوئے ان کے علمی و عملی کمالات اور ان کے عظیم الشان کارناموں کا جائزہ لیا گیا اور خلفائے راشدین کی شہ نشین میں ان کا مقام معین کیا گیا ہو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ کام بڑا مشکل و نازک ہے، اور اس پل صراط سے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے، بسلامت گزر جانا ہر تیز رفتار کا کام نہیں۔ لیکن اس راہ اعتدال کو قائم رکھنے کے لئے جو اہلِ سنت کا امتیاز ہے اور اس دورِ فتن کے لئے جس کی رہنمائی کا سامان شاید سب سے زیادہ اس خلیفۂ راشد کی زندگی میں ہے اس کام کا پورا ہو جانا ضروری ہے۔ معلوم نہیں یہ سعادت کس وقت اور کس شخص کے لئے مقدر ہے، اس موقع پر کسی سوانحِ حیات یا تاریخ و تذکرہ کی تحریر کا ارادہ اور محل نہیں، اجمالی طور پر ایک نقطۂ نظر کا اظہار ہے جو ایک مفصل سوانح یا تالیف کی بنیاد بن سکتا ہے۔

میرے نزدیک خلافتِ راشدہ اور اس کے ارکانِ اربعہ کی یہ تعبیر صحیح نہیں کہ وہ چند مختلف المزاج، مختلف الغرض متباین الاساس اشخاص کے اتفاقی مجموعہ کا نام ہے۔ اور یہ چاروں حضرات چار مختلف سیاستوں اور رجحانات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ بخت و اتفاق نے ان کو ایک زنجیر (خلافت و قیادتِ اسلامی) میں جوڑ دیا ان میں سوائے ایمان و خلوص اور صداقت اور حقانیت کے کوئی مشترک عنصر نہیں، جو لوگ زیادہ تاریخی بصیرت اور دقتِ نظر کا اظہار کرنا چاہتے ہیں وہ خلافتِ راشدہ کو دو حصوں اور خلفائے راشدین کو دو گروہوں پر تقسیم کرتے ہیں۔ خلافتِ راشدہ کے پہلے حصے یا دور کو اسلام کی ترقی و پیشقدمی اور دوسرے دور کو اسلام کے تنزل و زوال یا ردّ و بدل سے تعبیر کرتے ہیں پہلے دور کا امام صدیقِ اکبر اور فاروقِ اعظم (رضی اللہ عنہما) کو مانتے ہیں، اور دوسرے دور کا امام عثمانِ غنی اور علی مرتضیٰ (رضی اللہ عنہما) کو کہتے ہیں)۔ میرے نزدیک یہ تقسیم جسارت سے خالی نہیں۔ میرے نزدیک یہ چاروں حضرات فرداً فرداً خلافتِ نبوی کا مظہرِ اتم اور مصداقِ کامل تھے ذاتی فضائل و مناقب اور اسی بنا پر تفاوتِ درجات کو الگ کر کے خلافتِ راشدہ کا مزاج اور اس کی روح انہیں سے ہر ایک میں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔ خلافتِ راشدہ کیا ہے؟ خلافتِ راشدہ نہ اسلامی مملکت کی وسعت کا نام ہے نہ کثرتِ فتوحات کا نہ کامیابیوں کے تسلسل کا، اگر معیار یہی ہو تو پھر ولید بن عبد الملک اور ہارون الرشید کو سب سے بڑا خلیفۂ راشد ماننا پڑے گا۔ خلافت

۱؎ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہاجِ سنت اور اسوہ کی کامل اتباع کے ساتھ ساتھ خلافتِ راشدہ میں ملکی فتوحات بھی ہوئیں، اور اسلامی مملکت کو وسعت بھی نصیب ہوئی! خلافتِ راشدہ میں اسلامی لشکر کا جنگوں میں فتح پانا اور اسلامی مملکت کا وسیع ہونا یقیناً اس دورِ مسعود کا ایک فضل و شرف ہے، جس کے اعتراف میں "معذرت" کا انداز اختیار کرنا نہیں چاہئیے!

اگر کوئی اس خیال کو اس طرح ادا کرے کہ لڑائیوں میں فتح پانا اگر کوئی شرف کی بات ہے تو قسطنطین اور سکندر کو بھی یہ شرف حاصل ہے

[ر]اشدہ نام ہے نبی کے مزاج، اور طرزِ زندگی میں نیابت کا مگر نبوت کا امتیازی مزاج کیا ہے؟ ایمان بالغیب کی قوت، اطاعتِ الٰہی کا جذبۂ صادق و کامل، غیب پر شہود۔ احکام پر مصالح و فوائد کو قربان کرنا۔ دنیا پر آخرت اور غنا پر فقر و زہد کو ترجیح دینا۔ اسبابِ دنیا سے کم سے کم متمتع ہونا اور دوسروں کو زیادہ سے زیادہ متمتع کرنے کی کوشش کرنا۔ یہ وہ اجمال ہے جس کی تفصیل پوری سیرت محمدی ہے۔ ا[س] کے مظاہر بدر و خندق کے معرکے، تبوک کا سفر، حدیبیہ کی صلح، مکہ کی فتح اور ۲۳ برس کی وہ زاہدانہ زندگی ہے جس کا دور شعب بنی ہاشم کی اسیری اور جس کا آخری زندگی کی وہ آخری شب ہے جس میں گھر میں چراغ بھی نہ تھا۔ اور زرہ نبوی تیس صاع جو کے عوض میں ایک یہودی کے یہاں رہن تھی۔

اس معیار سے ان خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم وارضاہم کی زندگی، اور دورِ خلافت، خلافتِ راشدہ کا مکمل نمونہ تھا جس میں نبی کے مزاج اور طرزِ زندگی کی پوری نمائندگی تھی۔ دورِ فتنۂ ارتداد میں حضرت ابوبکر صدیق رضی کی بے نظیر عزیمت و استقامت، اس فتنۂ عالم آشوب میں مٹھی بھر جماعتِ صحابہ کے ساتھ پورے ملک عرب سے جنگ کرنے کا عزم اور فیصلہ، پھر عین اس نازک وقت میں جبکہ ملک کے سپاہی — جیش کا قائم مقام تھا۔ اور اسلام کا مرکز نقل (مدینہ طیبہ) دشمنوں کے نرغہ میں تھا جیش اسامہ کو شام کی جانب روانہ کردینے اور منشاءِ نبوی کی تکمیل پر (حالات و تغیرات کا لحاظ کئے بغیر) اصرار، پھر مسلمانوں کی موت و حیات کی اسی فیصلہ کن گھڑی میں دنیا کی دو عظیم ترین شہنشاہیتوں (رومۃ الکبریٰ اور فارس عظمیٰ) میں جنگ کا سلسلہ چھیڑ دینا "ایمان و اطاعت" کا وہ واقعہ ہے جس کی نظیر صرف انبیاء اور ان کے خلفائے اولو العزم کی تاریخ میں مل سکتی ہے، اسی کے ساتھ زمانۂ خلافت و فتوحات میں ایسی زاہدانہ زندگی گزارنا جس میں بیت المال کے روزینہ سے منہ کا ذائقہ تبدیل کرنے اور بچوں کا منہ میٹھا کرنے کی بھی گنجائش نہ تھی۔ اور پھر انتقال کے وقت آپ پوری رقم جو زمانۂ خلافت میں (مسلمانوں کے فیصلے سے) بیت المال سے اپنی گزر اوقات کے لئے لی تھی ذاتی زمین فروخت کر کے بیت المال کو واپس
ں، بدر، احد، خیبر، اور تبوک کے معرکے نبوت کا حقیقی شرف نہیں ہیں ——— تو اس خیال کی ہرگز تحسین نہیں کی جائے گی قسطنطین و سکندر کی جنگوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں مقصد، نیت، نتیجہ اور پاکیزگی کے اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق ہے لہٰذا خلافتِ راشدہ اور بنو امیہ اور بنو عباس کی داستانیں فتح و نصرت اور حکومت کی وسعت کے اعتبار سے ایک دوسرے کے مماثل نہیں ہیں۔

آخرت کی فکر، زخارفِ دنیوی سے بے رغبتی، خشیتِ الٰہی اور توجہ الی اللہ اسلام اور ایمان کے حقیقی مظاہر اور اصل بنیادیں ہیں خلفائے راشدین اس کا مظہرِ اتم تھے ——— مگر تصویر کا یہ پہلو بھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونا چاہئے کہ فقر و زہد کے ان قدسی صفت پیکروں نے قیصر و کسریٰ کے تخت بھی الٹ دیئے تھے اور اللہ کے دین، قانون اور دستورِ اخلاق کو عملاً نافذ کر کے دکھایا تھا۔ ان مقدس زندگیوں میں دعائے نیم شبی اور آہِ سحر گاہی، تواضع و خشیت، بوریا نشینی اور فقر و زہد کے ساتھ کشور کشائی کا جلال بھی تو ملتا ہے ان کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی اور ان کے ہاتھ میں قرآن، تلوار سے "رفع نزاع" کرتے تھے اور قرآن "بسطِ امن" کا فریضہ انجام دیتا تھا۔ جو ڈاکٹر زخموں پر صرف مرہم رکھنا جانتا ہے اور فاسد عضو پر نشتر زنی کے فن سے واقف نہیں ہے۔ وہ محافظِ جان ہونے کے ساتھ "خطرہ جان" بھی بن سکتا ہے!

خلفاء راشدین اور صحابہ کرام کے فقر و زہد میں بے پناہ عزیمت پائی جاتی تھی، باطل سے ٹکرانے کی ہمت اور اللہ کے دین کو غالب کرنے کا جذبہ، خلافتِ راشدہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جس قرآن کو وہ نمازوں میں پڑھتے تھے اور جس سنت کا وہ قدم قدم پر اپنی انفرادی زندگی میں اتباع کرتے تھے، اس کو انھوں نے سیاست، معاشرت، تجارت اور تہذیب و تمدن کی کارگاہوں میں عملاً برپا اور نافذ کر کے دکھا دیا تھا۔

خلافتِ راشدہ میں رکوع و سجود، صوم و زکوٰۃ، فقر و زہد، خشیتِ الٰہی، دنیا سے بے رغبتی، آخرت کی فکر جس طرح باعثِ شرف و افتخار ہیں اسی طرح جنگوں میں اسلام کی فتوحات اور اسلامی حکومت کی وسعت بھی وجہ شرف ہیں، ہم اس تصویر کے دونوں رخوں کو روشن سمجھتے ہیں، اور حکومت کی جلوتوں سے لیکر تہجد کی خلوتوں تک اس پورے سلسلہ کے "سلسلۃ الذہب" ہونے پر ایمان رکھتے ہیں۔

(م ۔ ق)

کردیئے اور اس پورے سامان کو جس کا خلافت کے دور میں اضافہ ہوا تھا بیت المال میں منتقل کردینے کی وصیت زہد و ایثار کے ایسے واقعات ہیں جنکی نظیر شاید انبیاء علیہم السلام کی زندگی کے علاوہ کہیں اور نہ مل سکے، اور جو اسی اصل کا "ظل" ہے جسکی خلافت اولیٰ کا شرف ان کو حاصل تھا۔

اسی طرح حضرت عمر فاروق رضؓ کا روم و شام کی جنگوں اور یرموک و قادسیہ کے معرکوں میں افواج کی تعداد و اسلحہ کے بجائے اللہ کی فتح و نصرت اور اسلامی افواج کے اعمال و اخلاق اور تعلق باللہ پر اعتماد، یرموک کے معرکہ کے موقع پر (جس سے سخت معرکہ تاریخ اسلام میں کم پیش آیا ہوگا) اسلام کے مظفر و منصور قائد اور اسلامی افواج کے محبوب و معتمد سپہ سالار خالد بن الولید کو اسلامی افواج کی قیادت علیا سے معزول کردینا اور ابو عبیدہ جیسے نرم خو و نرم مزاج کو قائد مقرر کرنا، عظیم ترین عمال حکومت کا بے لاگ احتساب، جبلہ بن الایہم جیسے سردار قوم اور بادشاہ پر ایک غریب فزاری کے مقابلہ و معاملہ میں قصاص جاری کرنا۔ ایسی ایمان و اطاعت کی مثالیں ہیں جو نبوت کا مزاج اور خلافت راشدہ کا نمونۂ امتیاز رہے۔ پھر ان کا وہ زہد و تقشف جس نے عام الرمادہ (قحط عام) میں ان کو ہر اس غذا سے باز رکھا جو عام مسلمانوں اور انکی وسیع مملکت کی عام آبادی کو میسر نہیں تھی یہاں تک کہ لوگوں کو یہ اندیشہ ہوا کہ اگر اس قحط نے طول کھینچا تو وہ بچ نہیں سکیں گے، اور انکی زاہدانہ زندگی اور تقشف جس نے ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرلی ہے، اسی زاہدانہ زندگی کا پرتو ہے جسکی اصل و ظل (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلیفہ اول) کی نیابت انکے حصہ میں آئی تھی۔

اسی طرح وہ ثبات و استقامت اور وہ عزم و یقین جس کا اظہار حضرت عثمان نے بلوائیوں کی شورش اور تحریک خلافت کے مقابلہ کے موقع پر کیا، اور بالآخر مظلومانہ شہادت پائی۔ باوجود اسباب غنا کی فراوانی و موجودگی میں اپنی ذاتی زندگی میں اس زہد و ایثار کا اظہار جو ان کے تین نامور پیشرووں کی میراث تھی، حکومت کے مہمانوں اور عام مسلمانوں کو امیرانہ و پر تکلف کھانا کھلانا اور خود گھر میں جاکر زیتون کے تیل سے روٹی کھانا وہ صحیح خلافت ہے جسکی خلعت رسول اللہؐ نے ان کو پہنائی و جسکے اتارنے سے انھوں نے صاف انکار کردیا۔ خلافت نبوت کا یہی مزاج اور زندگی کا یہی نمونہ اسی سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی اور ابن عم رسولؐ کی زندگی میں پورے طور پر نمایاں و روشن ہے۔ اس خلیفۂ خاص اور اس جوہر اصلی پر جمل اور صفین کی جنگوں کا جو عارضی غبار پڑ گیا ہے اگر اس کو آپ ہٹادیں۔ تو اس گوہر آبدار کی چمک دمک نگاہوں کو خیرہ کرے، اور خلافت نبوت کے وہ تمام خصائص نظر آجائیں جو اس کے تین پیشرووں اور زندگی کے رفیقوں میں مشترک ہیں جیسے اور اصول پر مصلحت و سیاست کو قربان کرنا۔ خلافت کے بقا و استحکام کے لئے ان تمام طریقوں اور تدبیروں کے اختیار کرنے سے انکار کردینا جو اہل حکومت اختیار کرتے ہیں لیکن خلافت نبوت کے امین کے لئے ان کی گنجائش نہیں۔ عمال حکومت اور ارکان مملکت میں سے ایسے اصحاب کو ان کے عہدوں سے سبکدوش کردینے میں تامل نہ کرنا جو اس کی نظر میں ورع و تقوی کے اس بلند معیار پر نہیں جس پر رسولؐ اور اس کے خلفاء چھوڑ کر گئے ہیں، اور جو اس نظام خلافت کے شایان شان ہے۔ اصول و عقیدہ کی خاطر اور خلافت کو "منہاج نبوت" پر باقی رکھنے کے لئے ان تمام ناخوشگوار فرائض کو انجام دینا جو اس کے لئے سوہان روح تھے لیکن عقیدہ اور مومن کے یقین کا تقاضہ اور وقت کا مقابلہ تھا۔ خلافت کی پوری مدت کو ایک مسلسل مجاہدہ، ایک مسلسل کش مکش، ایک مسلسل سفر میں گزارنا لیکن نہ تھکنا نہ مایوس ہونا، نہ بیدل ہونا، نہ شکایت کرنا، نہ راحت کی طلب، نہ محنت کا شکوہ، نہ دوستوں کا گلہ، نہ دشمنوں کی بدگوئی، مدح و ذم سے بے پرواہ، جان سے بے پروا، انجام سے بے پروا، نہ ماضی کا غم۔ نہ مستقبل کا اندیشہ، فرض کا ایک احساس مسلسل اور ستی کا ایک سلسلۂ غیر منقطع، دریا کا سا صبر، سورج اور چاند کی سی پابندی، ہواؤں اور بادلوں کی سی فرض شناسی، معلوم ہوتا ہے جس طرح ذوالفقار انکے ہاتھ میں سرگرم و بے زبان ہے اسی طرح وہ کسی اور ہستی کے دست قدرت میں سرگرم عمل اور شکوہ و شکایت سے ناآشنا ہیں۔ ایمان و اطاعت کا وہ مقام ہے جو "صدیقین" کو حاصل ہوتا ہے لیکن اس کا پہچاننا اور اس نزاکتوں اور مشکلات سے واقف ہونا بڑے صاحب نظر اور صاحب ذوق کا کام ہے۔ اس لئے انکی زندگی اور انکی عظیم شخصیت کا پہچاننا ایک بڑا امتحان ہے

اور اہل سنت کا ایک امتیاز ہے اس ایمان بالغیب اور اس جذبۂ اطاعت کا ظہور جس ماحول اور جن ناخوشگوار واقعات کی شکل میں ہوا، وہ اس ماحول اور ان واقعات سے بہت مختلف تھے جن میں ان کے پیشرو خلفاء کے ایمان بالغیب اور جذبۂ اطاعت کا اظہار ہوا تھا۔ اس لئے بہت سے مورخین اور اہل قلم اور مدعیان فکر و نظر بھی اس کی حقیقت سمجھنے سے قاصر رہے۔ وہ جس کو داخلی فتنے اور مسلمانوں کی خانہ جنگی کہتے ہیں۔ ہم ان میں حضرت علی کو نہ صرف معذور بلکہ ماجور پاتے ہیں۔ ہم اگرچہ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ فریق مقابل (اہل شام) ایک اجتہادی غلطی کا مرتکب تھا۔ اس لئے اس کی تضلیل و تفسیق ہرگز درست نہیں لیکن ہم یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت علی رضؓ نے اپنی خلافت میں جو کچھ کیا وہ ایمان و اطاعت کے جذبہ، اور ادائے فرض کی روح کے ساتھ کیا اس لئے یہ عمل ان کے لئے تقرب و رفع درجات کا باعث تھا

پھر انکی زاہدانہ زندگی خلافت نبوت کا پر تو کامل اور خلافت صدیقی و خلافت فاروقی کا نتیجہ تھی۔ یہ فقر و زہد، تقشف و قناعت کی ایسی زندگی تھی۔ کہ اس زمانہ کے بڑے بڑے زہاد اس میں انکی ہمسری نہیں کرسکتے تھے۔ اور بادشاہ کے منتخب عمال حکومت اور ان کے قریب ترین عزیز بلکہ حقیقی بھائی عقیل بن ابی طالب بھی ان کا ساتھ نہ دے سکے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی فرمائش و اصرار سے ان کے ایک رفیق قدیم ضرار بن ضمرہ نے اس کی جو دل آویز تصویر کھینچی ہے وہ نہ صرف تاریخ میں بلکہ دنیا کے ادب اور انسانی مرقع میں ایک حسن کا اضافہ کرتی ہے وہ فرماتے ہیں:۔

"بڑے بلند نظر بڑے عالی ہمت، بڑے طاقتور، جچی تلی گفتگو فرماتے۔ حق و انصاف کے مطابق فیصلہ کرتے۔ زبان و دہن سے علم کا چشمہ ابلتا۔ ہر ہر ادا سے حکمت ٹپکتی دنیا اور بہار دنیا سے وحشت تھی۔ رات اور رات کی تاریکی میں خوش رہتے آنکھیں پُر آب، ہر وقت فکر و غم میں ڈوبے ہوئے، رفتار زمانہ پر متعجب، نفس سے ہر وقت مخاطب، کپڑا وہ مرغوب تھا جو معمولی اور موٹا جھوٹا ہو غذا وہ مرغوب تھی جو غریبانہ اور سادہ ہو کوئی امتیازی نشان پسند نہیں کرتے تھے۔ جماعت کے ایک فرد معلوم ہوتے تھے۔ ہم سوال کرتے تو جواب دیتے۔ ہم حاضر خدمت ہوتے تو سلام اور مزاج پرسی میں پہل کرتے۔ ہم مدعو کرتے تو دعوت قبول فرماتے۔ لیکن اس قرب و مساوات کے باوجود رعب کا یہ عالم تھا کہ بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی اور سلسلۂ سخن کا آغاز کرنا مشکل ہوتا۔ اگر کبھی مسکراتے تو دانت موتی کی لڑی معلوم ہوتے دینداروں کی عزت اور مسکین سے محبت کرتے تھے لیکن (اس تواضع و مسکنت کے باوجود) کسی طاقتور اور دولت مند کی یہ مجال نہ تھی کہ ان سے غلط فیصلہ کرالے یا ان سے کوئی رعایت حاصل کرلے، اور کمزور کو ہر وقت ان کے عدل و انصاف کا بھروسہ تھا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے ایک شب ان کو ایسی حالت میں دیکھا کہ رات نے اپنی ظلمت کے پردے ڈال دیئے تھے، اور ستارے ڈھل چلے تھے، آپ اپنی مسجد کے محراب میں کھڑے تھے۔ ڈاڑھی مٹھی میں تھی۔ اس طرح تڑپ رہے تھے جیسے سانپ نے ڈس لیا ہو، اس طرح رو رہے تھے جیسے دل پر کوئی چوٹ لگی ہو۔ اس وقت میرے کانوں میں ان کے یہ الفاظ گونج رہے ہیں "اے دنیا! اے دنیا! کیا تو میرا امتحان لینے چلی ہے اور مجھے بہکانے کی ہمت کی ہے، مایوس ہو جا! کسی اور کو فریب دے! میں نے تو تجھے ایسی تین طلاقیں دی ہیں جن کے بعد رجعت کا کوئی سوال نہیں۔ تیری عمر کوتاہ، تیرا عیش بے حقیقت۔ تیرا خطرہ زبردست، ہائے زادِ راہ کس قدر کم ہے، سفر کتنا طویل اور راستہ کتنا وحشت ناک ہے[1]

درحقیقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام میں جو ایمان بالغیب اور ایمان بالآخرۃ، پیدا کیا ہے اس نے ان کے ذہن و دل، سیرت و اخلاق، زندگی اور کردار و معیشت و سیاست کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ عسر و یسر، کامیابی و ناکامی۔ فقر و فاقہ۔ اور امارت و حکومت میں اسی کا بے تکلف اظہار ہوتا تھا۔ اس ایمان کے سلسلۂ معجزات کا سب سے طاقتور اور سب سے نمایاں و ممتاز گروہ خلفائے راشدین ہیں، وہ اسی معنی میں خلفائے راشدین ہیں کہ نبوت کا یہ مزاج اور نبی کی یہ میراث انکی طرف منتقل ہوئی اور انھوں نے اس مزاج و منہاج میں نبی کی کامل نیابت کی، نافہم یہ سمجھے کہ یہ بھی کسی بادشاہ وقت یا حاکم شہر کی نیابت کا مسئلہ ہے اور سوال ان فوائد سے کسی شخص اور اس کے خاندان اور

[1] صفۃ الصفوۃ ابن جوزی ج ۱

متقین کے متمتع و منتفع ہونے کا ہے۔ جو اس کی مسند پر بیٹھے گا، اور ساری کش مکش اسی بات کی تھی۔ حالانکہ سوال نبی ﷺ کے فرائض انجام
دینے اور اس کی سی زہد و تقشف اور ایثار و قربانی کی زندگی گزارنے، خلق خدا کو زیادہ سے زیادہ دینے اور حظوظ دنیا اور سامانِ معیشت میں سے
کم سے کم لینے، زیادہ سے زیادہ محنت کرنے اور کم سے کم راحت و فراغت حاصل کرنے کا سوال تھا، اور اس میں کیا شبہ ہے کہ خلفائے راشدین
نے یکے بعد دیگرے اس حق کو ادا کر کے دکھا دیا۔ نبوت خلافت الٰہی ہے اور خلافت راشدہ خلافت نبوی ہے۔ اخلاق و صفات الٰہی میں سب
درجہ "صمدیت" کا ہے اور خدا کی شان "یُطعِمُ ولا یُطعَمُ" کی ہے۔ انسان اس مقام تک تو کیا پہنچ سکتا ہے، اس کی معراج یہی ہے کہ وہ
دوسروں کو زیادہ سے زیادہ فیض پہنچائے اور ان سے کم سے کم فیض اٹھائے۔ جہاں تک یُطعِم (دوسروں کو کھلانے کا) تعلق ہے اس کا ہاتھ
کشادہ، اس کی ہمت بلند اور جہاں تک یُطعَمُ (دوسروں کا کھانے) کا تعلق ہے اس کا ہاتھ کشیدہ اور اس کی نظر بلند رہے۔

علو ہمت ما قیست فطرت عرفی — کہ حاتم دگران و گدائے خویشتن است

میرے نزدیک اسلام کی زندگی میں پیش آنے والے تمام ادوار و مراحل کی نمائندگی خلافت راشدہ کے اس مختصر سے دور میں (جو
تیس سال سے متجاوز نہیں) کر دی گئی ہے، اور ہر آنے والے ناگزیر دور کے لئے اس میں رہنمائی کا سامان ہے، آغاز کار اور اقبال و ترقی کے زمانہ میں کس
استقامت اور ایمان و یقین کا مظاہرہ کرنا چاہیئے۔ اس کی رہنمائی ہم کو ابوبکر صدیق رضؓ کی حیات طیبہ اور خلافت راشدہ سے حاصل ہوتی ہے
عروج و شباب اور امن و نظام کے زمانہ میں کس استقامت اور ایمان و یقین کا مظاہرہ کرنا چاہیئے، اس کی رہنمائی ہم کو فاروق اعظم رضؓ کے
دور خلافت سے ملتی ہے۔ مخالفتوں، شورشوں اور فتنوں اور بے نظمی اور انتشار کے وقت کس ثبات و استقامت، کس پامردی اور دلیری
اور کس ایمان و یقین کی ضرورت ہے، اس کا نمونہ ہم کو حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی زندگی میں ملتا ہے، اگر اسلامی تاریخ کے ذخیرہ میں
صرف خلافت راشدہ کے دو باب (جو در اصل ایک ہی باب کی دو فصلیں ہیں) اور صرف خلافت صدیقی اور خلافت فاروقی کا نمونہ ہوتا
تو یہ رہنمائی نا تمام ہوتی اور دور انتشار اور دور فتن کے لئے مسلمانوں کے پاس تقلید و اتباع کے لئے کوئی امام اور پیشوا نہ ہوتا جس امت
کے لئے قیامت تک باقی رہنا اور تمام انسانی ادوار اور تاریخ کے نشیب و فراز سے گزرنا مقدر تھا اس کے لئے دونوں طرح کے نمونوں کی ضرورت
تھی اور خلافت راشدہ نے اپنے پورے اجزاء کے ساتھ ان نمونوں کو فراہم اور اس رہنمائی کو مکمل کر دیا۔ رضی اللہ تعالیٰ عن ابی بکر و عمر و عثمان
و علی وارضاہم و اکرمہم و جزاہم عن الاسلام و عن ہذہ الامۃ خیر الجزاء۔

حکیم مولانا عبدالواحد صاحب ہمدرد

روزہ اور روزہ داروں کی غذائی ضرورتیں

روزہ ارکان اسلام میں سے ایک اہم رکن ہے اگرچہ عام طور پر بھوکا پیاسا رہنے کو ہی روزہ سمجھا جاتا ہے لیکن درحقیقت روزہ ایک خاص وقت تک کھانے پینے پر پابندیاں لگانے کا ہی نام نہیں ہے بلکہ یہ بہت سی اخلاقی پابندیوں سے مشروط ہے۔ روزہ اس وقت تک صحیح اور مکمل روزہ نہیں کہا جاسکتا جب تک کہ حواس خمسہ (آنکھ، ناک، کان وغیرہ) کا بھی روزہ نہ رکھا جائے۔ مثلاً جس طرح کھانے پینے کی چیزوں کے مزے سے زبان کو محروم رکھا جاتا ہے اسی طرح جھوٹ بولنا اور ناشائستہ الفاظ نکالنا روزہ کے منافی ہے۔ آنکھوں سے کسی کو برے خیال سے دیکھنا روزہ میں خلل ڈالتا ہے، کانوں سے بری باتیں سننا، ہاتھوں سے برا کام کرنا اور پاؤں سے برے کام کی تکمیل میں مدد لینا روزہ کے خلاف ہے۔ ان تمام اعتبارات سے روزہ انسان کے خیالات میں پاکیزگی پیدا کرتا اور اس کے اخلاق و عادات کو سنوارتا ہے۔ اسے عادت کا غلام ہونے سے بچاتا، صبر و سکون دیتا اور خود اعتمادی پیدا کرتا ہے۔ عام طور پر ہر شخص دن میں تین مرتبہ کھاتا پیتا ہے۔ یہ عادت اتنی پختہ ہوتی ہے کہ اگر ایک وقت کسی وجہ سے کھانا نہ ملے یا کم از کم کھانا ملنے میں ایک دو گھنٹہ ہی کی تاخیر ہو جائے تو وہ بے چین ہو جاتا ہے! اسکے برخلاف جو شخص روزہ رکھنے کا عادی ہوتا ہے وہ اتفاقی حالات میں بھوک پیاس کو نہایت صبر و سکون کے ساتھ برداشت کرسکتا ہے۔ روزہ سے تزکیہ نفس اور پاکیزگی اخلاق کے علاوہ، انسان کی صحت پر بھی نہایت خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ انسان تمام دن کام کاج میں مصروف رہنے کی وجہ سے تھک جاتا ہے اور اس تھکن کو دور کرنے کے لئے رات کو سونے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے اس طرح تمام انسانی اعضاء متواتر کام میں مصروف رہنے کے باعث تھک جاتے ہیں اور انکے لئے کچھ دیر آرام کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہی حال ہمارے اعضائے ہضم (معدہ اور آنتوں وغیرہ) کا بھی ہے۔ صبح ہی ناشتہ کیا جاتا ہے اس کو ہضم کرنے کے بعد دوپہر کے کھانے کو ہضم کرنیکا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے ابھی اس سے فراغت حاصل ہوتی ہے کہ رات کا کھانا کھا لیا جاتا ہے اس طرح چوبیس گھنٹے میں معدہ کو برابر اپنے کام میں مصروف رہنا پڑتا ہے اسکے علاوہ ایسی غذائیں بھی کھائی جاتی ہیں جن کا ہضم کرنا معدہ کے لئے دشوار ہو جاتا ہے اور آنتیں ان کے فضلات کو پوری طرح خارج نہیں کرسکتیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معدہ کا فعل کمزور ہو جاتا ہے، آنتیں سست پڑ جاتی ہیں ان میں فضلات سڑنے لگتے ہیں دوسرے الفاظ میں معدہ اور آنتیں وغیرہ اعضائے ہضم مسلسل کام کرنے کی وجہ سے تھک جاتے ہیں اور وہ آرام کے محتاج ہوتے ہیں۔

اب اگر روزہ مقررہ احکام کے مطابق رکھا جائے تو اس سے معدہ اور آنتوں کو آرام ملتا ہے۔ ان کی تھکن اور سستی دور ہو کر قوت رفتہ لوٹ آتی ہے، اور جسمانی قوتیں از سر نو تازگی محسوس کرنے لگتی ہیں۔

مقررہ احکام یہ ہیں کہ سحری میں سادہ اور زود ہضم غذا کھائی جائے اور صرف اتنی کھائی جائے کہ معدہ اس کو تھوڑی مدت میں اچھی طرح ہضم کرسکے۔ پھر افطاری میں بھی سادگی سے کام لیا جائے اور کھانا سادہ زود ہضم کھایا جائے۔ لیکن اسکے برخلاف ہوتا یہ ہے کہ سحری کے وقت پراٹھا، فینیاں، کھجلہ اور دوسری دیر ہضم غذائیں کھائی جاتی ہیں جس سے خراب ڈکاریں نہ آئیں تو کم از کم تمام دن طبیعت پر بوجھ رہتا ہے شگفتگی نہیں آتی یہاں تک کہ افطار کا وقت آپہنچتا ہے افطار میں غیر معمولی تکلفات سے کام لیا جاتا ہے، چنے کی دال چنے کی پھلکیاں اور

مٹھائیاں تو ایک عام بات ہے پھر ان کے بعد شربت پیا جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے بعد کھانا کھا لیا جاتا ہے، ان حالات میں روزہ کے طبی فائدے
جن کے متعلق اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے فوت ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور روزہ سے فائدہ کے بجائے نقصان پہنچتا ہے۔

روزہ کے دنوں میں سادہ اور متوازن غذائیں کھانے کی ضرورت ہوتی ہے جن کو معدہ جلد ہضم کر سکے اور ان سے مطلوبہ فائدے بھی جس
کو پہنچ سکیں۔۔۔۔۔۔

ہمارے جسم کو ایسی غذاؤں کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے گوشت پوست اور رگ پٹھوں کی تعمیر میں کام آئیں۔ یہ ضرورت عموماً گوشت
انڈے، دودھ، دہی، پنیر اور مچھلی وغیرہ حیوانی غذاؤں اور گیہوں چنا مٹر، دال ماش، دال مونگ وغیرہ نباتاتی غذاؤں سے پوری ہو جاتی
تعمیر بدن کے لئے صرف اسی قسم کی چیزیں کافی نہیں ہوتیں بلکہ اس میں قوت و حرارت پیدا کرنے کے لئے شکر اور روغنی چیزوں (گھی، تیل، چربی
کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ بدن انسان کی ترکیب میں مختلف قسم کے نمکیات مثلاً چونا، فولاد اور فاسفورس وغیرہ بھی شامل ہیں اور یہ بدنی حرکتوں
باعث برابر تحلیل ہوتے رہتے ہیں۔ اسلئے ان کی کمی کو پورا کرنے کے لئے انسان ساگ پات اور پھل کھانے کا محتاج ہے کیونکہ ان میں یہ نمکیات کافی مقدار
موجود ہوتے ہیں یہ بھی واضح رہے کہ مذکورہ بالا غذائی اجزا کا تغذیہ اس وقت تک نامکمل رہتا ہے جب تک ان کے ساتھ پانی نہ پیا جائے اور ان
وہ غذائی جوہر موجود نہ ہوں جن کو حیاتین (وٹامنز) کہتے ہیں

یہ حیاتین کئی قسم کے ہوتے ہیں اور ہر ایک اپنے الگ الگ فوائد رکھتا ہے۔ مثلاً حیاتین الف (وٹامن "اے") انسان کی نشو و نما میں کام آ
ہیں۔ بچے تو ان کے بغیر نشو و نما نہیں پا سکتے۔ ان میں مرض کساح (رکیٹس) پیدا ہو جاتا ہے۔ بڑوں میں آنکھوں کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں یہ حیا
دودھ، مکھن، بالائی، پنیر، انڈے کی زردی، سبز ترکاریوں، مچھلی اور مچھلی کے تیل (کوڈ لیور آئل) میں پائے جاتے ہیں۔

حیاتین "ب" (وٹامن "بی") بھی انسانی حیات کے لئے ضروری ہیں ان کی غیر موجودگی سے ایک خاص قسم کا مہلک مرض پیدا ہو جاتا ہے
"بیری بیری" کہتے ہیں۔ اور ان کے نہ ہونے کی وجہ سے بچوں کی پرورش میں فوراً خلل پڑ جاتا ہے یہ حیاتین انڈوں، سبز ترکاریوں، آلوؤں، گوشت
دودھ، مچھلی، انڈے کی زردی، مکھن اور پنیر میں پائے جاتے ہیں۔

حیاتین "ج" (وٹامن "سی") کی غیر موجودگی سے مرض سکروی پیدا ہو جاتا ہے یہ تازہ سبزیوں، ترکاریوں اور پھلوں خصوصاً لیموں،
اور آملہ میں پایا جاتا ہے۔

حیاتین "د" (وٹامن "ڈی") حیاتین "الف" کے مانند ہے یہ دودھ، مکھن، گھی، مچھلی کے تیل وغیرہ میں پائے جاتے ہیں اور ان کے نہ
سے بدنی نشو و نما میں خلل پڑتا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی کئی قسم کے حیاتین دریافت کئے گئے ہیں جو بدن انسان کے لئے ضروری ہیں اور ان کے نہ ہونے سے انسان مختلف
بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

جو غذائیں ہم کھاتے ہیں اگر ان میں مذکورہ غذائی اجزا مناسب مقدار میں موجود ہوں۔ اور وہ مناسب طریقہ سے پکا کر مناسب مقدار میں
ضرورت کے مطابق کھائی جائیں تو وہ بھی متوازن غذا ہوتی ہیں۔ اور ان ہی سے ہمارے بدن کی تعمیر ہوتی اور اس میں قوت و حرارت پیدا ہوتی ہے۔۔۔۔
سبز ترکاریوں کو ابال کر پانی پھینک دیا جائے تو اس کے کارآمد نمکیات چونا، فولاد، فاسفورس اور ان میں موجود حیاتین ضائع ہو جاتے ہیں۔ ا
وہ ایک ناقص غذا ہو جاتی ہے کیونکہ چونا اور فاسفورس ہڈیوں کو بناتے اور ان کو طاقت دینے کے کام آتا ہے۔ فولاد خون کی پیدائش کو بڑھاتا ہے
بھی نمکیات ہیں جو بدن انسان میں مختلف کام انجام دیتے ہیں۔ شدید ضرورت ہے کہ روزہ کے دنوں میں سادہ اور متوازن غذائیں کھائی جائیں ا
مناسب مقدار میں کھائی جائیں، روغنی چیزیں قلیل مقدار میں استعمال کی جائیں۔ لیکن اگر ان سب احتیاط کے باوجود کوئی تکلیف ستائے تو اس کا ازا

اسب دوا سے کیا جائے۔ مثلاً اگر عام جسمانی کمزوری لاحق ہو طبیعت میں چڑچڑا پن پیدا ہو جائے تو غذائی اصلاح کے علاوہ الائچی، دھنیا، گلاب اور
یاتین "ب"، حیاتین "ج" یا ان کے مرکبات استعمال کیے جائیں۔ پیاس کی شدت اور جسمانی خشکی کو دور کرنے کے لئے الائچی، دھنیا گلاب، تلسی اور
ندل سفید اور حیاتین "الف" و "ب" وغیرہ کا استعمال مفید ہے۔ اگر کسی روز بدہضمی ہو جائے تو کھانے میں احتیاط سے کام لیا جائے اور بطور
وا الائچی، تیزپات، ناگرموتھا، دارچینی وغیرہ کا کوئی مناسب مرکب کھایا پیا جائے۔ متلی اور قے کی صورت میں الائچی، گلاب، کپور کچری اور
ی جیسی دواؤں کا کوئی مفید مرکب استعمال کرنا مناسب ہے۔

ماہر القادری

منشورِ ربّانی

زہے! یہ محفلِ روحانیاں، یہ بزمِ قرآنی
خزف ریزوں سے کمتر ہیں جہاں لعلِ بدخشانی

اُدھر یہ حکم آیا "وَرَتِّلِ القُرآنَ تَرتِیلاً"
اِدھر کچھ اور پاکیزہ ہوا، شوقِ حُدی خوانی

صدائے "جاہدوا" نے بجلیاں سینوں میں چمکا دیں
دلوں میں جاگ اٹھا جذبۂ ایثار و قربانی

"سمعنا" اور "اطعنا" ہی کمالِ آدمیت ہے
یہی تکمیلِ دانش ہے یہی معراجِ انسانی

کتاب اللہ کے "نورِ مبیں" سے روشنی پا کر
شتربانوں پہ روشن ہو گئے اسرارِ سلطانی

خدا کے پوجنے والے جو پہنچے بدر و خیبر میں
برائے خیر مقدم خود بڑھی تائیدِ یزدانی

عبادت نام ہے اس کا، شجاعت اس کو کہتے ہیں
انھی ہاتھوں میں تلواریں، انھی سجدے میں پیشانی

یہ ایجادات کی دھن، بے یقینی کی فراوانی
مبارک؟ اہلِ مغرب کو نگاہ و دل کی ویرانی

خشیت کی جھلک جن میں نہ ایماں کی چمک جن میں
تو ایسی کوششوں کا صرف حاصل ہے پشیمانی

یہ قزاقی، یہ سفاکی، یہ صیادی یہ جلّادی
اسی کا نام رکھ چھوڑا ہے آئینِ جہاں بانی

وہ شبنم، آہ! جس کے "آگ کے شعلے" نگہباں ہوں
وہ گل، ہائے! جس کی بھیڑیے کرتے ہوں چوپانی

تباہی نسلِ انسانی کی اب دیکھی نہیں جاتی
ضرورت ہے کہ پھر سے عام ہوں افکارِ قرآنی

اسی تہذیب کی شیشہ گری کو ختم کرنا ہے
کہ جس تہذیب میں ہو "آرٹ" کی معراج عریانی

بجھا دو ہاں! بجھا دو ہر چراغِ محفلِ عشرت
الٹ دو، ہاں الٹ دو ہر بساطِ عیش سامانی

جہاں کو پھر اسی انداز سے ترتیب دینا ہے
عمرؓ کا جوش ہو، بوذرؓ کا ایماں، فقرِ سلمانیؓ

عملِ صالح یقیں محکم، نظر پاکیزہ، دل روشن
کیا جائے گا نافذ دہر میں منشورِ ربّانی

روحِ انتخاب

یقیناً ہم میں کمزوریاں ہیں، ہم میں قوی بھی ہیں اور ہم میں ضعیف بھی۔ ہم میں آگے چلنے والے بھی ہیں اور پیچھے چلنے والے بھی۔ مگر اس سے گھبرانے اور مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ ایک ایسی ناگزیر حقیقت ہے جس سے کوئی ایسی تحریک بچ نہیں سکتی جو انسانوں کے اندر کام کرنے کے لئے اٹھی ہو۔ آپ میں جو طاقتور ہیں وہ اپنے کمزوروں کے لئے سہارا بنیں گے اور جو ضعیف ہیں وہ جب طاقتوروں کو دیکھیں گے تو ان کی ہمت بڑھے گی اور اس طرح سب مل کر ساتھ چلتے رہیں گے۔ سورۂ عصر میں تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا جو حکم دیا گیا ہے، اس کا یہی مطلب ہے۔ تواصی بالحق سے مراد حق کے معاملے میں ایک دوسرے کا ناصح بننا اور تواصی بالصبر سے مراد ایک دوسرے کو قوت پہنچانا ہے۔ کچھ لوگ خدا پر ایمان لانے اور صالح زندگی اختیار کرنے کے بعد جب باہم مل کر اجتماعیت اختیار کرتے ہیں تو وہ دراصل باہمی نصیحت کا ایک نظام بناتے ہیں اور ایک دوسرے کی تقویت کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ اجتماعیت اپنی خارجی حیثیت میں تبلیغ ہے اور اپنی داخلی حیثیت میں کارکنوں کے لئے نصیحت اور تقویت کا ذریعہ ہے۔

مومن بھی دنیا میں مشغول ہوتا ہے اور کافر بھی۔ کوئی اس دنیا سے باہر نہیں چلا جاتا۔ دونوں اسی دنیا کے ہنگاموں میں زندگی گزارتے ہیں۔ مگر کافر کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ جس دنیا میں رہتا ہے اسی سے اس کی ساری دلچسپیاں بھی وابستہ ہو جاتی ہیں۔ وہ دنیا ہی کو اپنی منزل سمجھتا ہے اور اسی میں سب کچھ پالینا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس مومن، دنیا میں ایک اجنبی مسافر کی طرح رہتا ہے، وہ زندگی کا فرض ادا کرنے کے لئے تو بظاہر دنیا کے بہت سے کاموں میں مصروف نظر آتا ہے مگر حقیقتاً اس کا دل اپنے رب میں لگا رہتا ہے۔ وہ خواہ کسی بھی کام میں ہو مگر اس کا دل ہر وقت خدا کی یاد میں غرق ہوتا ہے اور اس کی زبان کبھی اپنی خطاؤں کی معافی مانگنے میں اور کبھی اپنے رب کے احسانات کا شکر ادا کرنے میں مصروف رہتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں کافر دنیا میں اس طرح رہتا ہے گویا وہ اسی دنیا کی مخلوق ہے اور مومن دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کی مخلوق بن جاتا ہے۔

جس طرح تیاری کے دنوں میں ایک طالب علم کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ آنے والے امتحان سے پہلے اس میں بیٹھنے کے لئے تیار ہو جائے اسی طرح موت کی حقیقت سمجھنے والے کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ موت کے آنے سے پہلے موت کے دن کی تیاری کرے۔

اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ تَصْدَأُ كَمَا يَصْدَأُ الْحَدِيْدُ اِذَا اَصَابَهُ الْمَاءُ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا جَلَاءُهَا قَالَ كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةُ الْقُرْاٰنِ

جس طرح لوہے پر پانی پڑنے سے زنگ لگتا ہے، اسی طرح دلوں کو بھی زنگ لگتا ہے۔ پوچھا گیا اے خدا کے رسول! دل کے زنگ کو دور کرنے کا طریقہ کیا ہے فرمایا۔ موت کو بہت زیادہ یاد کرنا اور قرآن کو پڑھنا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایمان کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ایک مرتبہ کسی کے دل میں پیدا ہو جائے تو خود بخود اپنی حالت میں پڑی رہے بلکہ وہ ایک ۔۔۔ چیز ہے اور اس کو زندہ رکھنے کے لئے باقاعدہ اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے اس اہتمام کے دو طریقے بتائے گئے ہیں۔ ایک

موت کے بارے میں سوچتا رہنا اور دوسرے قرآن کا مطالعہ کرنا۔

موت کیا ہے۔ وہ ہماری موجودہ زندگی کی آخری سرحد ہے۔ کسی شخص کی موت آنا گویا اس پر خدا کا یہ فیصلہ نافذ ہونا ہے کہ اب تمہاری مدت عمل ختم کر دی گئی۔ اب تم اس دنیا میں پہنچائے جا رہے ہو جہاں ہر پیدا ہونے والے کو اپنے کیے کا انجام بھگتنا ہے۔ پھر موت آنے کا کوئی وقت نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی بچپن کی عمر میں مر جاتا ہے، کوئی جوان ہو کر مرتا ہے، کوئی بڑھاپے کو پہنچ کر مرتا ہے۔ پھر کسی کی موت بیماری کا الارم دے کر آتی ہے اور کسی کی اچانک آ جاتی ہے۔ کوئی ایسی حالت میں مرتا ہے کہ اس کو توبہ کرنے اور خدا کی طرف پلٹنے کا موقع رہتا ہے اور کسی کی زبان یکایک بند ہو جاتی ہے۔ کوئی بھی شخص نہیں جانتا کہ ان میں کون سی موت اس کے لئے مقدر ہے۔ اور آخرت کا متحن کب اور کس حال میں اس سے زندگی کا پرچہ چھین لے گا اور فرشتے اس کو پکڑ کر خدا کی عدالت میں لے جانے کے لئے کس وقت آ جائیں گے۔ ایسی حالت میں موت کی یاد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی فی الفور چوکنا ہو جائے۔ اس کا یہ حال ہو جائے گویا کسی بھی وقت اس کی موت آ سکتی ہے۔ موت کا کوئی وقت نہیں اس لئے اس کے بارے میں سوچنے کی بھی کوئی میعاد نہیں ہو سکتی۔ موت ہر آن آ سکتی ہے اس لئے وہ ہر آن کے لئے آدمی کو فکر مند بنا دیتی ہے۔ موت کا خیال اس بات کی ضمانت ہے کہ آدمی ہر وقت اپنے انجام پر غور کرتا رہے گا، اور اس کا دل کسی بھی حال میں غافل نہیں ہونے پائے گا۔

دوسری چیز جو دل کے زنگ کو دور کرتی ہے اور اس کو غافل ہونے سے بچاتی ہے وہ قرآن سے تعلق ہے۔ قرآن کیا ہے۔ وہ زندگی کی حقیقت کا صحیح ترین اظہار ہے۔ وہ ہمارے آغاز و انجام کو بتاتا ہے۔ موت سے پہلے ہمیں کیا کرنا چاہئے اور موت کے بعد ہمارے ساتھ کیا پیش آئے گا۔ یہ تمام چیزیں اس میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ وہ خدا کی خدائی کا علم دیتا ہے۔ وہ انسان کی حیثیت متعین کرتا ہے، وہ کائنات کا مقصد واضح کرتا ہے، ہم کو کس طرح رہنا چاہئے ہم کو کیسے سوچنا چاہئے، ہماری کامیابی کس چیز میں ہے اور ہماری ناکامی کس چیز میں۔ ان سب کی تفصیل اس کے اندر موجود ہے۔ قرآن ہم کو وہ نظر دیتا ہے جس نظر سے تمام چیزوں کو دیکھیں وہ ہم کو وہ احساس دیتا ہے جس کے مطابق ہم مختلف چیزوں سے اپنا تعلق قائم کریں۔ غرض وہ تمام باتیں جن کا تعلق ہمارے نفع یا نقصان سے ہے، اس میں نہایت وضاحت کے ساتھ اور بے حد مؤثر انداز میں بیان کر دی گئی ہیں۔ قرآن کو پڑھنا دوسرے لفظوں میں زندگی اور کائنات کی حقیقت کو بار بار اپنے ذہن میں دہرانا ہے۔

ایسی ایک کتاب کا مطالعہ اگر آدمی کو بیدار نہ کرے تو دوسری کون سی کتاب ہوگی جو اس کے دل کے زنگ کو دور کرے گی۔ قرآن کا مطالعہ خدا کے بارے میں ہمارے یقین کو بڑھاتا ہے۔ وہ آخرت کے تصور کو ہمارے ذہن سے نکلنے نہیں دیتا، وہ ہمارے دشمن شیطان سے ہم کو آگاہ کرتا ہے جو ہر وقت ہماری گھات میں لگا ہوا ہے۔ وہ اپنی پُراثر تقریروں سے ہمیں رلاتا ہے، وہ اپنے زبردست استدلال سے ہمارے ذہن کو مطمئن کرتا ہے، وہ اپنے یقین سے بھرے ہوئے کلمات کے ذریعے مایوس دلوں میں جان ڈالتا ہے، وہ اپنے آسمانی انداز کلام سے ہم کو مفتوح کر لیتا ہے، اس کے حقیقت سے عین مطابق بیانات ہماری نفسیات میں اتر کر ہم کو جھنجھوڑتے ہیں، اس کی ڈانٹ ہم کو خدا کے عذاب سے ڈراتی ہے اور اس کی بشارتیں ہم کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔

اس طرح موت کی یاد اور قرآن کی تلاوت آدمی کو مستقل طور پر خدا سے جوڑے رہتی ہے اور اس کو کبھی اپنے رب کی یاد سے غافل نہیں ہونے دیتیں۔

(وحیدالدین خاں)

ہماری نظر میں

سورۂ نور ترجمہ و تفسیر:۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، ضخامت ۱۷۰ صفحات، قسم اول مجلد اعلیٰ، ہدیہ چھ روپیہ، قسم دوم مجلد چار روپے آٹھ آنہ، قسم سوم تین روپے چار آنہ،
ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ تعمیر انسانیت موچی دروازہ، لاہور۔

"تفہیم القرآن" مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا اتنا بڑا دینی کارنامہ ہے، جو انشاء اللہ آخرت میں اُن کے لئے سبب نجات و وجہ مغفرت ثابت ہوگا، اور اس دنیا میں اُن کے نام کو زندہ رکھے گا: آنے والی نسلیں فخر اور حیرت کریں گی کہ دینی انحطاط کے اس دور میں اتنا عظیم اسلامی مفکر کیسے پیدا ہو گیا؟

تفہیم القرآن کی دو جلدیں چھپ کر منظرِ عام پر آ چکی ہیں، جن کی مقبولیت کی کوئی حد و نہایت نہیں، بلا مبالغہ لاکھوں انسانوں نے ان سے استفادہ کیا ہے، تیسری جلد کا کچھ حصہ کتابت ہو چکا ہے، اس سے آگے کی تفسیر مولانا مودودی لکھ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی عمر و صحت میں برکت عطا فرمائے کہ اس کام کو وہ پورا کر جائیں!

سورۂ نور کی تفسیر تیسری جلد ہی کا ایک حصہ ہے، اس سُورے میں اللہ تعالیٰ نے اسلامی نظام معاشرت کے اتنے اہم احکام بیان فرمائے ہیں کہ اُن کی شرح و ترجمانی کے لئے چند اشارے کافی نہ تھے۔ مولانا مودودی نے ان احکام کی اہمیت محسوس کی، تو آیات قرآنی کی تفسیر پھیلتی ہی چلی گئی، اور ایک خاصی کتاب کے برابر ہو گئی۔ تیسری جلد کی اشاعت میں ابھی دیر لگے گی، اس لئے سورۂ نور کی تفسیر کو افادۂ عام کی خاطر علیحدہ کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے، جس کے لئے مفسر اور ناشر دونوں تبریک و تحسین کے مستحق ہیں سید ابوالاعلیٰ مودودی کو اللہ تعالیٰ نے دین میں خاص بصیرت عطا فرمائی ہے "مزاج شناسی" کی اصطلاح چاہے کسی کے مزاج نازک پر کتنی ہی گراں کیوں نہ ہو، مگر یہ واقعہ ہے مولانا مودودی دینی احکام کے مزاج کو پہچانتے اور شریعت کی اسپرٹ کو سمجھتے ہیں۔ اور یہ تو اللہ تعالیٰ کا ان پر خاص کرم ہے کہ اُن کی کتابوں نے ہزاروں لاکھوں انسانوں کی زندگیوں میں دینی انقلاب پیدا کیا ہے، ایک زمانہ آئے گا جب فتنۂ معاصرت کا یہ غبار چھٹ جائے گا، اُس وقت اُن کے جوہر کمال کی تابناکی کھل کر نظر آئے گی!

سورۂ نور کی تفسیر میں مودودی صاحب نے فقہی مسائل کا جس دقتِ نظر کے ساتھ تجزیہ کیا ہے، وہ اس کی شہادت دیتا ہے کہ صاحب موصوف فقہ میں کتنی گہری نظر، عالمانہ تبحر اور بصیرت رکھتے ہیں، ائمہ فقہ کے اجتہادات و آراء کے مابین انھوں نے کس قدر حزم و احتیاط کے ساتھ محاکمہ کیا ہے، اور جس کا مسلک کتاب و سنّت سے قریب تر نظر آیا ہے، اس کے ظاہر کرنے میں جھجک محسوس نہیں کی، اس قسم کا "محاکمہ" اُن علماء پر یقیناً گراں گزرے گا جو "تقلید جامد" کو دین کا رکن سمجھے ہوئے ہیں، مولانا کے ان "فقہی محاکموں" کے رد میں کیا عجب ہو کہ کتابیں لکھی جائیں!

زنا بعد احصان کی سزا کیا ہونی چاہیئے؟ صرف رجم، یا تازیانے اور رجم، اور جلا وطنی بھی: ہس میں فقہا کا اختلاف رہا ہے مولانا مودودی نے فقہی اختلافات سے بحث کرنے کے بعد یہ رائے دی ہے:۔

"ان تمام روایات پر مجموعی نظر ڈالنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب کا مسلک ہی صحیح ہے، یعنی زنا بعد احصان کی حد صرف رجم ہے اور محض زنا کی حد سو کوڑے۔"

حد قذف کی توریث کے بارے میں امام شافعیؒ کے اجتہاد پر مودودی صاحب کس قدر مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ جرح فرماتے ہیں:

"البتہ یہ عجیب بات ہے کہ امام شافعیؒ بیوی اور شوہر کو اس سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں اور دلیل یہ ہے کہ موت کے ساتھ رشتہ زوجیت ختم ہو جاتا ہے، اور بیوی یا شوہر میں سے کسی ایک پر الزام آنے سے دوسرے کے نسب پر کوئی حرف نہیں آتا۔ حالانکہ یہ دونوں ہی دلیلیں کمزور ہیں، مطالبہ حد کو قابل توریث ماننے کے بعد یہ کہنا کہ یہ حق بیوی اور شوہر کو اس لئے نہیں پہونچتا کہ موت کے ساتھ رشتہ زوجیت ختم ہو جاتا ہے، خود قرآن کے خلاف ہے، کیوں کہ قرآن نے ایک کے مرنے کے بعد دوسرے کو اس کا وارث قرار دیا ہے، رہی یہ بات کہ زوجین میں سے کسی ایک پر الزام آنے سے دوسرے کے نسب پر حرف نہیں آتا، تو یہ شوہر کے معاملہ میں چاہے صحیح ہو مگر بیوی کے معاملہ میں تو قطعاً غلط ہے۔ جس کی بیوی پر الزام رکھ جائے، اس کی تو پوری اولاد کا نسب مشتبہ ہو جاتا ہے، علاوہ بریں یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ حد قذف صرف نسب پر حرف آنے کی وجہ سے واجب قرار دی گئی ہے، نسب کے ساتھ عزت پر حرف آنا بھی اس کی ایک اہم وجہ ہے اور ایک شریف مرد یا عورت کے لئے یہ کچھ کم بے عزتی نہیں ہے کہ اس کی بیوی یا اس کے شوہر کو بدکار قرار دیا جائے، لہٰذا حد قذف کا مطالبہ قابل توریث ہو تو زوجین کو اس سے مستثنیٰ کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں۔"

قذف کے گواہوں کے مسئلہ میں مولانا مودودی نے حنفیہ کے مسلک کے مقابلہ میں امام شافعی اور عثمان البتی کے مسلک کو صحیح سمجھا ہے، لکھتے ہیں:۔

"یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ ایک شخص نے قذف کا ارتکاب کیا ہے، جو چیز سے حد سے بچا سکتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ وہ چار گواہ ایسے لائے، جو عدالت میں شہادت دیں کہ انھوں نے مقذوف کو فلاں مرد یا عورت کے ساتھ بالفعل زنا کرتے دیکھا ہے، حنفیہ کے نزدیک یہ چاروں گواہ بیک وقت عدالت میں آنے چاہئیں اور انہیں بیک وقت شہادت دینی چاہئیے۔ کیوں اگر وہ یکے بعد دیگرے آئیں تو ان میں سے ہر ایک قاذف ہوتا چلا جائے گا اور اس کے لئے پھر چار گواہوں کی ضرورت ہو گی۔ لیکن یہ ایک کمزور بات ہے، صحیح بات وہی ہے جو امام شافعی اور عثمان البتی نے کہی ہے کہ گواہوں کے بیک وقت آنے اور یکے بعد دیگرے آنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، بلکہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ دوسرے مقدمات کی طرح گواہ ایک کے بعد ایک آئے اور شہادت دے۔"

وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ

(اور جب تمہارے بچے عقل کی حد کو پہونچ جائیں)

اس کی آیت کی تفسیر میں مولانا مودودی لکھتے ہیں:۔

"یعنی بالغ ہو جائیں جیسا کہ اوپر حاشیہ نمبر ۸۰ میں بیان کیا جا چکا ہے، لڑکوں کے معاملہ میں احتلام اور لڑکیوں کے معاملہ میں ایام ماہواری کا آغاز علامت بلوغ ہے، لیکن جو لڑکے اور لڑکیاں کسی وجہ سے دیر تک ان جسمانی تغیرات سے خالی رہ جائیں، ان کے معاملہ میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے، امام شافعی، امام ابو یوسف امام

محمد اور امام احمد کے نزدیک اس صورت میں ۱۵ برس کے لڑکے اور لڑکی کو بالغ سمجھا جائے گا۔ اور امام ابوحنیفہؒ کا بھی ایک قول اس کی تائید میں ہے۔ لیکن امام اعظم کا مشہور قول یہ ہے کہ اس صورت میں ۱۷ برس کی لڑکی اور ۱۸ برس کے لڑکے کو بالغ قرار دیا جائے گا، یہ دونوں قول کسی نص پر نہیں بلکہ فقہاء کے اجتہاد پر مبنی ہیں۔ لہٰذا ضروری نہیں ہے کہ تمام دنیا میں ہمیشہ ۱۵ یا ۱۸ برس کی عمر ہی کو غیر محتلم لڑکوں اور غیر حائضہ لڑکیوں کے معاملے میں حد بلوغ مانا جائے۔ دنیا کے مختلف ملکوں میں اور مختلف زمانوں میں جسمانی نشو و نما کے حالات مختلف ہوا کرتے ہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ عموماً کسی ملک میں جن عمروں کے لڑکوں اور لڑکیوں کو احتلام یا ایام ماہواری ہونے شروع ہوتے ہیں، ان کا اوسط فرق نکال لیا جائے۔ اور پھر جن لڑکوں اور لڑکیوں میں کسی غیر معمولی وجہ سے یہ علامات اپنے معتاد وقت پر ظاہر نہ ہوں، ان کے لئے زیادہ سے زیادہ معتاد عمر پر اس اوسط کا اضافہ کرکے، اُسے بلوغ کی عمر قرار دیا جائے۔ مثلاً کسی ملک میں بالعموم کم سے کم ۱۲ اور زیادہ سے زیادہ ۱۵ برس کے لڑکے کو احتلام ہوا کرتا ہو۔ تو اوسط فرق ڈیڑھ سال ہوگا اور غیر معمولی قسم کے لڑکوں کے لئے ہم ساڑھے سولہ سال کی عمر کو سن بلوغ قرار دے سکیں گے۔ اس قاعدے پر مختلف ممالک کے اہل قانون اپنے ہاں کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے، ایک حد مقرر کر سکتے ہیں۔"

ان چند اقتباسات سے مولانا مودودی کے تفقہ فی الدین کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، ائمہ فقہ کے اجتہادات و قیاس کے مابین محاکمہ کرنا، ان کی غیر معمولی ذکاوت و ذہانت کی دلیل ہے، اختلافی مسائل میں اس قسم کے فقیہانہ محاکمہ کے لئے آسمان سے فرشتے نہیں اتریں گے۔ یہ کار نازک عظیم انسانوں ہی کو انجام دینا ہے!

اللہ اور رسولؐ نے جو حدود مقرر فرمائے ہیں، ان کے معاملہ میں مولانا مودودی ذرا سی بھی ڈھیل برتنے یا تاویل اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں:۔

"زانی کو وہی سزا دی جائے جو اللہ نے تجویز فرمائی ہے، اسے کسی اور سزا سے نہ بدل دیا جائے، کوڑوں کے بجائے کوئی اور سزا دینا اگر رحم اور شفقت کی بنا پر ہو تو معصیت ہے، اور اگر اس خیال کی بنا پر ہو کہ کوڑوں کی سزا ایک وحشیانہ سزا ہے تو یہ قطعی کفر ہے، جو ایک لمحہ کے لئے ایمان کے ساتھ ایک سینے میں جمع نہیں ہو سکتا، خدا کو خدا بھی ماننا اور اس کو معاذ اللہ وحشی بھی کہنا، صرف انہی لوگوں کے لئے ممکن ہے، جو ذلیل ترین قسم کے منافق ہیں۔"

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُم مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ وَالَّذِي تَوَلَّىٰ مِنْهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ۔

(جس نے اس میں جتنا حصہ لیا، اس نے اتنا ہی گناہ سمیٹا، اور جس شخص نے اس کی ذمہ داری کا بڑا حصہ اپنے سر لیا، اس کے لئے تو عذاب عظیم ہے)

اس آیت کی تفسیر میں مودودی صاحب نے بعض راویوں کی غلط فہمی کو رفع کیا ہے اور دوسری طرف حضرت حسان ثابت رضی اللہ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی پوزیشن صاف کی ہے:۔

"یعنی عبداللہ بن اُبی جو اس الزام کا اصل مصنف اور فتنہ کا اصل بانی تھا، بعض روایات میں غلطی سے حضرت حسان بن ثابت کو اس آیت کا مصداق بتایا گیا ہے، مگر یہ راویوں کی اپنی ہی غلط فہمی ہے، ورنہ حضرت حسانؓ کی کمزوری اس سے زیادہ کچھ نہ تھی کہ وہ منافقوں کے پھیلائے ہوئے اس فتنے میں مبتلا ہو گئے، حافظ ابن کثیر نے صحیح کہا ہے کہ اگر یہ روایت بخاری میں نہ ہوتی تو قابل ذکر تک نہ تھی۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑا جھوٹ بلکہ بہتان یہ ہے کہ بنی اُمیہ نے

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس آیت کا مصداق قرار دیا، بخاری، طبرانی اور بیہقی میں ہشام بن عبدالملک اموی کا یہ قول منقول ہے کہ اَلَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَہٗ .... کے مصداق علی بن ابی طالب ہیں، حالانکہ حضرت علی رضؓ کا سرے سے اس فتنہ میں کوئی حصہ ہی نہ تھا، بات صرف اتنی تھی کہ انھوں نے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت پریشان دیکھا تو حضورؐ کے مشورہ لینے پر عرض کردیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ میں آپ پر کوئی تنگی تو نہیں رکھی ہے، عورتیں بہت ہیں، آپ چاہیں تو عائشہؓ کو طلاق دے کر دوسرا نکاح کر سکتے ہیں، اس کے معنی یہ ہرگز نہ تھے کہ حضرت علیؓ نے اس الزام کی تصدیق فرمائی تھی۔ جو حضرت عائشہ رضؓ پر لگایا جا رہا تھا، ان کا مقصد صرف آنحضرتؐ کی پریشانی کو رفع کرنا تھا۔

اِلَّا مَا ظَهَرَ ..... کی تفسیر میں مولانا مودودی نے فقہا، حنفیہ کی بڑی تعداد سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"ہم یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں کہ مَا ظَهَرَ کے معنی مَا يُظْهِرُهُنَّ عربی زبان کے کس قاعدے سے ہو سکتے ہیں "ظاہر ہونے" اور "ظاہر کرنے" میں کھلا ہوا فرق ہے، اور ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن صریح طور پر ظاہر کرنے سے روک کر ظاہر ہونے کے معاملے میں رخصت دے رہا ہے، اس رخصت کو "ظاہر کرنے" کی حد تک وسیع کرنا، قرآن کے بھی خلاف ہے، اور ان روایات کے بھی خلاف ہے، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں حکم حجاب آ جانے کے بعد عورتیں کھلے منہ نہیں پھرتی تھیں، اور حکم حجاب میں منہ کا پردہ شامل بھی تھا۔ اور احرام کے سوا دوسری تمام حالتوں میں نقاب کو عورتوں کے لباس کا ایک جزء بنا دیا گیا، پھر اس سے بھی زیادہ قابل تعجب بات یہ ہے کہ اس رخصت کے حق میں دلیل کے طور پر یہ بات پیش کی جاتی ہے کہ منہ اور ہاتھ عورت کے ستر میں داخل نہیں ہیں، حالانکہ ستر اور حجاب میں زمین آسمان کا فرق ہے، ستر تو وہ چیز ہے جسے محرم مردوں کے سامنے کھولنا بھی ناجائز ہے، رہا حجاب تو وہ ستر سے زائد ایک چیز ہے، جسے عورتوں اور مردوں کے درمیان حائل کیا گیا ہے، اور یہاں بحث ستر کی نہیں بلکہ احکام حجاب کی ہے۔"

لفظ "نِسَاءِهِنَّ" کی تفسیر میں امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے پر مولانا مودودی تنقید کرتے ہیں:۔

"دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اس سے مراد تمام عورتیں ہیں۔ امام رازی کے نزدیک یہی صحیح مذہب ہے، لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر فی الواقع اللہ تعالیٰ کا منشاء یہی تھا تو پھر نِسَاءِهِنَّ کا کیا مطلب، اس صورت میں تو "النساء" کہنا چاہیے تھا۔"

اَوِ التَّابِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ .... کی تفسیر میں مودودی صاحب نے کتنی سچی بات کہی ہے جو متفرنجین اور تجدد پسندوں کے نظریات پر ضرب لگاتی ہے:۔

"آج کل کے بیرے، خانسامے، شوفر اور دوسرے جوان جوان نوکر تو بہرحال اس تعریف میں نہیں آتے۔"

"وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى" کا ترجمہ مولانا مودودی نے "بیوہ" نہیں "مجرد" کیا ہے:۔

"تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں ..... اُن کے نکاح کرو۔"

اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

"اصل میں لفظ "ایامیٰ" استعمال ہوا ہے جسے عام طور پر لوگ محض بیوہ عورتوں کے معنی میں لیتے ہیں، حالانکہ دراصل

اس کا اطلاق ایسے تمام مردوں اور عورتوں پر ہوتا ہے، جو بے زوج ہوں، "ایامیٰ" جمع ہے۔ "ایم" کی اور "ایم" ہر اُس مرد کو کہتے ہیں، جس کی کوئی بیوی نہ ہو، اور ہر اُس عورت کو کہتے ہیں جس کا کوئی شوہر نہ ہو۔ اس لئے ہم نے اس کا ترجمہ مجرد کیا ہے"۔

"اللہ نور السمٰوٰت والارض" میں "نور" کی تفسیر یوں کی ہے :۔

"نور سے مراد وہ چیز ہے، جس کی بدولت اشیاء کا ظہور ہوتا ہے، یعنی جو آپ سے آپ ظاہر ہو، اور دوسری چیزوں کو ظاہر کرنے۔ انسان کے ذہن میں نور اور روشنی کا اصل مفہوم یہی ہے، کچھ نہ سوجھنے کی کیفیت کو انسان نے اندھیر اور تاریکی و ظلمت رکھا ہے، اور اس کے برعکس جب کچھ سجھائی دینے لگے اور ہر چیز ظاہر ہو جائے تو آدمی کہتا ہے کہ روشنی ہوگئی، اللہ تعالیٰ کے لئے لفظ "نور" کا استعمال اسی بنیادی مفہوم کے لحاظ سے کیا گیا ہے نہ اس معنی میں کہ معاذ اللہ وہ کوئی شعاع ہے جو ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چلتی ہے، اور ہماری آنکھ کے پردے پر پڑ کر دماغ کے مرکز بینائی کو متاثر کرتی ہے...... اللہ تعالیٰ اس کا مصداق اس محدود معنی میں نہیں ہے بلکہ مطلق معنی میں ہے، یعنی اس کائنات میں وہی ایک اصل "سبب ظہور" ہے۔ باقی یہاں تاریکی اور ظلمت کے سوا کچھ نہیں ہے، دوسری روشنی دینے والی چیزیں بھی، اسی کی بخشی ہوئی روشنی سے روشن اور روشن گر ہیں...۔

نور کا لفظ علم کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کے برعکس جہل کو تاریکی اور ظلمت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس معنی میں بھی کائنات کا نور ہے کہ یہاں حقائق کا علم اور راہِ راست کا علم اگر مل سکتا ہے تو اسی سے مل سکتا ہے اس سے فیض حاصل کئے بغیر جہالت کی تاریکی اور نتیجتاً ضلالت و گمراہی کے سوا اور کچھ ممکن نہیں ہے"۔

"اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کو "نور" کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معاذ اللہ اس کی حقیقت ہی بس "نور" ہے، حقیقت میں تو وہ ایک ذاتِ کامل و اکمل ہے، جو صاحب علم، صاحب قدرت اور صاحب حکمت (وغیرہ) ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب نور بھی ہے۔ لیکن خود اس کو نورِ محض اس کے کمال نورانیت کی وجہ سے کہا گیا ہے، جیسے کسی کے کمال فیاضی کا حال بیان کرنے کے لئے اس کو خود "فیض" کہہ دیا جائے، یا اس کے کمالِ خوب صورتی کا وصف بیان کرنے کے لئے خود اس کو "حسن" کے لفظ سے تعبیر کر دیا جائے"۔

صفحہ ۴۳ پر "فحش لفظ" کی جگہ "برہنہ لفظ" لکھنا چاہیئے تھا۔ حیرت ہے کہ "زنا" جو بالاتفاق مذکر ہے اسے مؤنث استعمال کیا گیا ہے (ہاتھ پاؤں کی زنا ــــ صفحہ ۹۹)

یا ایہا الذین امنوا لا تدخلوا بیوتا ...... (الخ) کی یہ تفسیر بھی کھٹکی کہ :۔

"زوجہ رسولؐ جیسی بلند شخصیت پر ایک صریح بہتان کا اس طرح معاشرے کے اندر نفوذ کر جانا، درحصل ایک شہوانی ماحول کی موجودگی کا نتیجہ تھا"۔

اس قسم کی آیتیں جو متعین طور پر کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ نہ کرتی ہوں۔ ان کے شانِ نزول کو عام ہی رکھنا چاہیئے...... پھر سنہ ہجری میں مدینہ کے ماحول کو "شہوانی ماحول" کہہ دینے سے ذہنوں میں خاصہ التباس پیدا ہو سکتا ہے جس طرح صفحہ ۱۲۹ پر کہا گیا ہے کہ رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی کا مدینہ میں خوب صورت لڑکیوں کا باقاعدہ چکلہ موجود تھا۔ تو اس صراحت اور حوالے کے ساتھ بات کہی تھی کہ ماحول مکمل طور پر مطہر و پاکیزہ نہ ہو پایا تھا، بعض اوقات الفاظ کی تنگی کے سبب بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے، اور لکھنے والے کی نیک نیتی کے باوجود معاندین کو فتنہ اٹھانے کا موقعہ ہاتھ آجاتا ہے۔

انبیائے کرام کے سوا خطاؤں سے کون محفوظ ہے، غلطیاں کس سے نہیں ہوتیں، مولانا مودودی بھی ہماری طرح ایک انسان ہیں، ان سے بھی لکھنے میں بھول چوک ہو جاتی ہے، اور اہل علم کو ان کی غلطیوں پر احتساب کرنے کا حق حاصل ہے، مگر اس معاندانہ جذبہ کے ساتھ نہیں کہ ان کی تمام دینی خدمات کو یکسر نظرانداز کرکے، ان کی کسی ایک یا چند غلطیوں پر انہیں "دین کے ستونوں کا گرانے والا" ثابت کیا جائے۔

نبوت کا منصب ختم ہو گیا۔ صحابیت اور تابعیت کا شرف بھی اب کسی کو نہیں مل سکتا، باقی دوسرے علمی اور دینی کمالات کسی کی میراث نہیں۔ نہ ان کا کسی خاص زمانہ سے تعلق ہے، ورنہ کسی ایک ذات یا چند شخصیتوں پر وہ ختم ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا جب بھی جس پر فضل ہو جائے، یہ عقیدت بڑی سطحی قسم کی ہے کہ چند صدی قبل جن علماء نے جو کچھ لکھ دیا ہے، وہ تو یقینی طور پر معیاری اور اعلیٰ ہے، اس کے بعد کے زمانہ میں جس نے جو کچھ کہا ہے، اُن سے گھٹ کر ہی کہا ہے!

مولانا مودودی کی تفسیر کو اگر بعض دوسری تفاسیر سے مقابلہ کرکے کوئی دیکھے تو اس کو ان کی دینی بصیرت، فہم و ذہانت اور دقتِ نظر کا اندازہ ہوگا، پھر تحریر میں جو سادگی، سلجھاؤ، روانی، کشش اور قلب و ضمیر کو مطمئن کر دینے والی کیفیت پائی جاتی ہے، اس پر اُن کے لئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ ———— اور ———— یہ بھی

مباش منکر غالب کہ در زمانہ تست

لغات القرآن تالیف۔ مولانا سید عبدالدائم الجلالی، ضخامت ۳۲۴ صفحات، بڑا سائز (مجلد گرد پوش کے ساتھ) کتابت طباعت اور کاغذ خوشنما، قیمت:۔ پانچ روپے آٹھ آنے۔ قیمت غیر مجلد چار روپے آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ برہان اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔

ندوۃ المصنفین (دہلی) نے دین و اخلاق اور علم و ادب کی جو شاندار خدمات انجام دی ہیں، اُن کے سبب سے علمی ادارے کی پاک و ہند میں ساکھ قائم ہو گئی ہے، ندوۃ المصنفین نے مختلف موضوعات پر اب تک ستر کے قریب کتابیں شائع کی ہیں۔

"لغات القرآن" کی تدوین و تالیف" ندوۃ المصنفین کا، اتنا بڑا کارنامہ ہے، کہ تنہا اسی کتاب پر اس کو جتنا سراہا جائے کم ہے، شروع کی چار جلدیں مولانا عبدالرشید نعمانی کی تالیف کردہ ہیں، اور یہ چھٹی جلد، جو اس سلسلہ کی آخری کتاب ہے، مولانا سید عبدالدائم الجلالی نے مدون کی ہے! کاش۔ "لغات القرآن" کی تمام جلدیں مولانا عبدالرشید نعمانی ہی مرتب فرماتے لیکن ان کے پاکستان چلے آنے کے بعد یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا، تاہم مولانا عبدالدائم صاحب نے بھی بڑی حد تک پہلی جلدوں کے رنگ کو قائم رکھا ہے، اور خاصی تحقیق و کاوش کے ساتھ الفاظ کی شرح کی ہے ایک نمونہ:۔

هباءٌ:۔ اسم مفرد، باریک خاک، گرد و غبار، یا باریک ذرات خاک جو سورج کے رُخ پر کھڑکی[1] کے سوراخوں میں سے دکھتے[2] ہیں۔ اهباءٌ۔ جمع ۱۹/۲، ۱۲/۱۔ هبوةٌ تاریکی، ریت مٹی، هابیٌ، قبر کی مٹی وہ مٹی جو غبار کی طرح[3] ہو۔ نجوم هُبْثٌ چھپے ہوئے ستارے۔ هَبْوٌ مصدر (نصر) غبار اُٹھنا، بھاگنا، مرنا، اهباءٌ (افعال) غبار اٹھانا، تهبّیٌ (تفعل) ہاتھ جھاڑنا، کسی کام سے فارغ ہونا۔

---

[1] "ہی" کی کیا ضرورت تھی، مستعمل و معروف املا "کواڑ" ہے [2] "نظر آتے ہیں" لکھنا چاہیے تھا۔ [3] "طرح" کی بجائے "مانند" ہوتا تو بہتر تھا۔

"لغات القرآن" کی تکمیل پر ندوۃ المصنفین کے ارباب حل وعقد کی خدمت میں ہم ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں، اردو جاننے
الوں کے لئے یہ لغت نعمت غیر مترقبہ ہے۔

رجال السند والهند الی القرن السابع	تالیف:۔ مولانا قاضی ابوالمعالی اطہر مبارکپوری ضخامت ۳۲۸ صفحات۔ (بڑا سائز، خوشنما ٹائپ) قیمت :۔ دس روپیہ۔

ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ ابلاغ، کرناک اسٹریٹ، بمبئی۔

جناب مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کثیر المطالعہ اور صاحب نظر عالم ہیں۔ صاحب موصوف نے یہ کتاب بڑی محنت اور
دش کے ساتھ جمع و تالیف کی ہے اور تاریخی واقعات کو اپنی معلومات کی حد تک، پرکھ کر اور تحقیق کر کے جمع کیا ہے، اس کتاب کی
لیف کے لئے انھوں نے عربی کی درجنوں کتابوں کا مطالعہ کیا ہے، اور بلاذری کی فتوح البلدان سے لے کر مولانا سید سلیمان ندوی
ی "عرب و ہند کے تعلقات" تک سے فائدہ اٹھایا ہے۔

عربی زبان کے اس تذکرے پر ازہر، حجاز، دمشق، اور بحرین کے علمائے تقریظیں لکھی ہیں اور فاضل مولف کی کوششوں
سراہا ہے، حرم مکہ کے مدرس علامہ محمود بن عبد النذیر الطرازی کا قصیدہ، اس کا شاہد ہے کہ اس کتاب کو عرب علماء قدر کی نگاہ
ے دیکھتے ہیں۔

اس کتاب میں ساتویں صدی ہجری تک کے ان علماء محدثین، فقہا، مشائخ، ادبا، شعراء، اطبا، اہل فلسفہ وکلام ارباب
صنعت وغیرہ کا تذکرہ ہے، جو ہندوستان اور سندھ میں پیدا ہو کر، یہیں پلے بڑھے ہیں، یا ان کے آبا و اجداد کا اس سرزمین
ے وطنی تعلق رہا ہے، مگر ان کی نشو و نما ہند و سندھ سے باہر ہوئی ہے! ان مشاہیر میں امام اوزاعی سے لے کر کنکہ طبیب اور
ندھ کا راجہ ددداپسر بھونگر سومرہ بھی شامل ہیں۔

فاضل مولف کی تحقیق کے باوجود ایسی روایتیں بھی اس کتاب میں آگئی ہیں کہ شیخ اسماعیل ملتانی جن کا فقراء اور زہاد میں
مار ہوتا تھا، سستی و چتوں کی قبر کی زیارت کے لئے گئے۔ انھوں نے اپنی سواری راستہ میں چھوڑی، اور قبر پر آ کر قسم کھائی کہ
ب تک وہ سستی و چتوں کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لیں گے، اس وقت تک نہ کچھ کھائیں گے اور نہ پئیں گے، اسی حال میں ان پر
ین دن گزر گئے، یہاں تک کہ اس قبر سے ایک بڑھیا برآمد ہوئی، جس کے ساتھ کچھ روٹیاں اور تھوڑا سا پانی تھا، اس نے شیخ
ے کھانے پینے کے لئے کہا، شیخ نے جواب دیا کہ جب تک میں سستی و چتوں کو نہ دیکھ لوں گا، کھاؤں گا پیوں گا نہیں! اس بڑھیا
ڑھیا نے کہا "میں ہی تو سستی ہوں!"

اس قسم کی روایتیں "شعر و افسانہ" کی کتابوں میں تو پائی جا سکتی ہیں مگر تاریخی تذکروں کو زیب نہیں دیتیں!

مشارق الانوار کے مصنف علامہ محمد صغانی کو اس کتاب میں بھی "لاہوری" لکھا ہے، حضرت نظام الدین اولیا محبوب
ہی رحمۃ اللہ علیہ نے جن "صغانی بدایونی" فرمایا ہے، وہ کوئی اور بزرگ ہوں گے، صاحب مشارق الانوار، لاہوری تھے،
دایونی نہ تھے۔

اس تذکرے (رجال السند والهند) کی تدوین و تالیف پر مولانا اطہر مبارکپوری علمی دنیا کی طرف سے بجا طور پر مبارکباد
کے مستحق ہیں۔

سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات

تالیف :- پروفیسر خلیق احمد نظامی، ضخامت ۴۸۵ صفحات (مجلد، گردپو ش کے ساتھ) قیمت نو روپے - قیمت غیر مجلد آٹھ روپے،

ملنے کا پتہ :- ندوۃ المصنفین اردو بازار، جامع مسجد، دہلی!

یہ ایک مستند، دقیع، اور بلند پایہ تاریخی کتاب ہے جس میں سلطان قطب الدین ایبک سے لے کر سلطان ابر
لودی تک تمام سلاطین دہلی کے مذہبی افکار و عقائد، نظام حکومت پر اس کے اثرات اور تاریخ اسلام میں سلطنت دہلی
حیثیت پر مکمل اور محققانہ بحث کی گئی ہے!

اس موضوع پر یہ پہلی کتاب لکھی گئی ہے اور کوئی شک نہیں کہ فاضل مورخ نے واقعات کی تحقیق اور استنتاج کا حق
کر دیا ہے، تحریر کی شگفتگی نے کتاب کو اور زیادہ دلچسپ اور موثر بنا دیا ہے، کہیں کہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شبلی نعما
قلم گلکاری کر رہا ہے،

اس کتاب کو پڑھ کر زمانہ کے نشیب و فراز اور عروج و زوال کے کتنے مرقعے نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں اور کتنے کتنے بڑ
آدمیوں کی سیرتوں کے متضاد پہلو ابھر کر، دل و نگاہ کو درس عبرت دیتے ہیں، یہ بھی کہ علم دین نے درباداری بھی کی ہے او
محتسب کا فرض بھی انجام دیا ہے، اہل علم اور ارباب باطن نے جاہ و دولت کو ٹھکرایا ہے اور اُن کا پیچھا بھی کیا ہے، تاریخ
کتنے صفحات ہیں جو بادشاہوں، شاہزادوں اور امیروں کے خون سے رنگین ہیں!

جناب خلیق احمد نظامی تصوف سے خاص شغف رکھتے ہیں، اُن کا یہ ذوق اس کتاب میں بھی نمایاں ہے مگر صوفیہ
سے والہانہ عقیدت کے باوجود، انھوں نے دیانت دار مورخ کا فرض بھی ادا کیا ہے :-

> "امیر خسرو، شیخ نظام الدین اولیاء کے محبوب ترین مرید تھے، اور مبارک خلجی، شیخ المشائخ کا سخت ترین دشمن تھا
> عجیب بات ہے کہ انھوں نے نہ شیخ کا دامن چھوڑا اور نہ سلطان کا دربار، اور اپنی زندگی کے ان متضاد تقاضوں
> کو اس طرح پورا کیا کہ نہ کبھی حضرت شیخ نے اُن سے درباری زندگی ترک کرنے کی خواہش کی اور نہ کبھی سلطان نے
> شیخ سے قطع تعلق کرنے کا مطالبہ کیا، اگر ایک طرف یہ بات تعجب خیز ہے کہ جس دربار میں شیخ نظام الدین اولیا
> پر دشنام کی بارش ہو رہی تھی، وہاں امیر خسرو کے یہ قصیدے گونج رہے تھے :-
>
> شہا گنج بخشا کرم گسترا   معانی شناسا، سخن پرورا

تو دوسری طرف یہ بات بھی کچھ کم تعجب خیز نہیں ہے کہ خسرو نے مثنوی نہ سپہر میں اپنے اصول کے مطابق بادشاہ کی تعریف سے پہلے
شیخ کی تعریف کی ہے"

شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے سکندر لودی کو ایک طویل خط تحریر فرمایا تھا، اس خط میں انھوں نے سلط
"حضرت ظل اللہ فی الارض" جیسے القاب سے مخاطب کیا، اس پر خلیق احمد نظامی نے گرفت کی ہے، لکھتے ہیں :-

> "شیخ فرید الدین گنج شکر کے زمانہ سے، اب تک تصوف اور صوفیہ کے افکار و کردار میں جو فرق پیدا ہو گیا تھا، وہ اس
> خط کے ایک ایک حرف سے ظاہر ہے"

اس کتاب کو پڑھ کر یہ حقیقت اور زیادہ کھل کر سامنے آتی ہے کہ ایک طرف تخت و تاج کی دلچسپیاں اور رنگینیاں تھیں
دوسری طرف خانقاہی تعلیم کا ذوق شوق، خلائق سے قطع و ترک، دنیا سے فرار و گریز کا جذبہ تھا، ان دو انتہاؤں کے درمیان

ے دین کو قائم و برپا کرنے کی تحریک نہ ابھر سکی، اگر یہ ہو جاتا تو ہندوستان کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔
اس کتاب میں "ایلتمش" کو "ایتمش" جگہ جگہ لکھ کر، اس غلطی کی تصحیح کی گئی ہے، مگر یہ نام "ایلتمش" یا "التمش"، اردو زبان
، میں قدر رواج پا چکا ہے کہ "ایلتمش" وجدان کو عجیب سا لگتا ہے۔
سی طرح "ٹھٹھہ" کو "تتہ" لکھنا "صحتِ املا" کی غیر ضروری کوشش ہے۔
صفحہ ۲۸۴ پر "سہسوان" نظر آیا، سہسوان تو ضلع بدایوں کا ایک قصبہ ہے، جس کا مومن نے اپنی غزل میں ذکر کیا ہے:-

چھوڑ دلّی کو سہسوان آیا　　ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں

غالباً "سیون یا سیہوان" ہوگا، جو صوبہ سندھ کا مشہور تاریخی مقام ہے!
فاضل مؤلف نے "ملفوظات قطب عالم" کے حوالے سے لکھا ہے:-

"چودھویں صدی کے نصف آخر میں تصوف نے ہندوستان میں نہایت ہی بدنما شکل اختیار کر لی
تھی اور صدہا مخرب اخلاق رسمیں اور گمراہ کن بدعات عام ہو گئی تھیں"

ان "بدعات" کا سلسلہ آج تک جاری ہے، بلکہ اُن میں کچھ اور اضافہ ہی ہو گیا ہے، کوئی خدا کا بندہ ان بدعات کو ٹوکتا ہے، تو اس
ہابیت کی پھبتی چست کر کے، اس کی بات چٹکیوں میں اڑا دی جاتی ہے، فیروز شاہ پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوں کہ اس نے قانون
ذریعہ عورتوں کو مزاروں پر جانے سے روک دیا۔
اس کتاب پر "پیش لفظ" کرنل سید بشیر حسین زیدی نے اور "تعارف" پروفیسر محمد حبیب (صدر شعبہ سیاسیات مسلم یونیورسٹی
گڑھ) نے لکھا ہے۔ یہ "تعارف" خاصہ وزنی اور جاندار ہے، معارف نگار دنیا کی قدیم تاریخ پر عبور رکھتے ہیں، ان کی یہ عبارت
ں کی شاہد ہے:-

"ایرانی یادداشت، روایات کے سلسلہ میں چونکہ اردشیر بابکان تک جا کر رُک جاتی ہے، اس لئے فردوسی اور
دوسرے مصنفین کے یہاں سکندر سے قبل کے جن اکابرِ ایران کا ذکر ملتا ہے، وہ اُن کے تصور کی پیداوار ہے،
تاریخ ہرگز نہیں ہے"

جناب خلیق احمد نظامی نے اس کتاب کو لکھ کر، پاک و ہند کے صفِ اول کے مورخین میں اپنی جگہ پیدا کر لی ہے، ہم دُعا کرتے
ہیں کہ اس "شعلۂ خوش درخشندہ" کو سن و سال اور صحت و تندرستی کی زیادہ سے زیادہ فرصت میسر آئے (آمین)

مینائے غزل از:- بشیر فاروق، ضخامت ۱۹۲ صفحات، قیمت:- تین روپے۔ (مجلد، گرد پوش اور شاعر کی تصویر
کے ساتھ) ملنے کا پتہ:- مکتبہ لالہ زار حبیب جون بلڈنگ، الفنسٹن اسٹریٹ، کراچی۔

یہ جناب بشیر فاروق کا مجموعہ کلام ہے، جس پر "تجزیہ" کے عنوان سے حضرت جگر مرادآبادی نے ایک صفحہ تحریر فرمایا ہے، اور
بشیر فاروق کے:-

"مستقبل قریب میں ایک معیاری شاعر ثابت ہونگے"

پیش گوئی کی ہے نیز "اُن کے کلام میں شعری محاسن بدرجۂ اتم محسوس کئے ہیں!"
پیش لفظ جناب رئیس امروہوی نے اور "تعارف" ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی نے لکھا ہے۔ "پیش لفظ" میں رئیس
کہ دوسرے ایڈیشن میں کتاب کا سرورق ضرور بدل دینا چاہیئے کہ کتاب جتنی سنجیدہ ہے، اتنا ہی سرورق شوخ ہے۔

امروہوی نے اردو زبان میں غزل گوئی کا تاریخی تجزیہ کیا ہے، جس میں قدیم شعراء سے لے کر آج تک کے ترقی پسند شعراء تک آگئے ہیں اس سلسلہ میں فیض احمد فیض کے بارے میں ان کی یہ رائے ہے:

"فیض احمد فیض دلکش ہلکی پھلکی غزلیں (جو اُردو میں بے شمار ہیں) تو کہہ سکتے ہیں لیکن ان سے عام طور پر تغزل کے میدان میں کسی عظیم کارنامے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔"

مینائے غزل کا "ابتدائیہ" جناب سید محمد تقی مدیر اعلیٰ روزنامہ "جنگ" نے تحریر فرمایا ہے، جو صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فلسفی بھی ہیں، وہ لکھتے ہیں:-

"فاروقی صاحب شعر کو مفید مقاصد کے لئے استعمال کرنے کا فن جانتے ہیں اور وہ فن کے لئے جو کچھ سوچتے ہیں اسے موزوں ترانداز میں اپنے موثر شعروں میں ظاہر کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتے ہیں۔"

بشیر فاروقی کی غزلوں کی سب سے بڑی خصوصیت روانی اور جوش ہے، ان کی محبت باوقار اور سنجیدہ ہے، جس نے شعر کے قالب میں ڈھل کر ہوس سے اس قدر احتیاط کے ساتھ دامن بچایا ہے کہ ان کا تغزل "غم جاناں" سے زیادہ "غم دوراں" کا ترجمان نظر آتا ہے۔ ان چند منتخب شعروں سے شاعر کے کلام کے محاسن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:-

دُعائیں صبح بہاراں کی مانگنے والو   نہ راس آئیں بہاریں اگر تو کیا ہوگا
دلیل صبح سہی ڈوبتے ہوئے تارے   ہوئی نہ پھر بھی نمودِ سحر تو کیا ہوگا
خزاں قبول بقائے گل و سمن کے لئے   مٹیں گے شوق سے رعنائی چمن کے لئے
ہمارا ذکرِ وفا بھی اُس انجمن میں نہیں   جلے ہیں شمع کی صورت جس انجمن کے لئے
وہ انجم کہ نہ شرمندۂ احساں ہونگے   ہم تو خود اپنی تجلّی سے درخشاں ہونگے
بے نیازی پہ کسی کی مجھے آتی ہے ہنسی   خود فریبی پہ کسی کی مجھے پیار آتا ہے
تری محفل سے پہلے بھی پریشانی مقدر تھی   تری محفل میں آکر بھی پریشانی نہیں جاتی
دن کہاں گزرا ہے تیرا اے خورشید جمال   رات تیری مرے مہتاب کہاں گزری ہے
جس سے اسرار چمن فاش ہوئے جاتے تھے   طبع صیاد پہ وہ بات گراں گزری ہے
تجھ کو معلوم بھی ہے جانِ وفا تیرے بغیر   زندگی کتنی سبک، کتنی گراں گزری ہے
اس واسطے ہر اک کو نیا غم دیا گیا   کوئی کسی کے درد کا درماں نہ کر سکے
ذروں کو حریف مہ و خورشید بنا دو   انساں کی راہوں میں ستاروں کو بچھا دو
اس نقش کو فطرت بھی ابھرنے نہیں دیتی   جس نقش کو مٹ مٹ کے ابھرنا نہیں آتا
اے لیلیٰ ایام تجھے یاد تو ہوگا!   کس کس نے ترے گیسوئے برہم کو سنوارا
ہم عہد خزاں میں بھی رہے پھول شگفتہ   دیکھے تو کوئی ربط بہاروں سے ہمارا
رات پیمانہ مہتاب چرا لائی ہے   اب مناسب ہے مرا بادہ گسار آ جائے
پریشاں ابر کی صورت رہے ہیں   غبار کارواں بن کر جئے ہیں
بغیر سوز محبت فسون و افسانہ   فغانِ نیم شبی ہو کہ نالۂ سحری

اُن کے اندازِ کرم میں ہو تغافل کی جھلک ۔۔۔ بے نیازی پہ توجہ کا گماں ہوتا ہے
چراغِ ماہ و انجم بجھ رہے ہیں ۔۔۔ مگر شمعِ تمنا جل رہی ہے
فقیہ شہر پہ رشوت حرام ہے لیکن ۔۔۔ یہ اور بات پسند آگئے ہیں نذرانے
چراغ بن کے چلے ہیں رہِ تمنا میں ۔۔۔ بہار بن کے ترے گلستاں سے گزرے ہیں
کب تک غمِ دوراں میں گرفتار ہو تنہا ۔۔۔ لے زلفِ گرہ گیر بنا اپنا ارادہ
پہنا ہے کہیں جبہ و دستار ہوس نے ۔۔۔ اوڑھا ہے کہیں زہد و تقدس کا لبادہ
ان کے ہاتھ آگئی جہانداری ۔۔۔ وہ جو قابل نہ تھے گدائی کے
تمام عمر اسی انتظار میں گزری ۔۔۔ میں اُن سے حرفِ تمنا ابھی کہوں نہ کہوں
دنیا کو رہی غنچۂ تازہ کی تمنا ۔۔۔ گل ہائے فسردہ کے خریدار رہے ہم
اہلِ ہمت نے پہاڑوں کے جگر چیر دیئے ۔۔۔ آپ ہیں منتظرِ تیشۂ فرہاد ابھی
صبا کیا جانیے، کیا کہہ کے گزری ۔۔۔ گریباں چاک کر ڈالا کلی نے

ابھی تک دھندلے دھندلے ہیں چراغِ صبح کے جلوے
ابھی ہے گیسوئے لیلائے شب منت کشِ شانہ

اگر مالکِ بہاراں سے باخبر ہوتے ۔۔۔ تو ہم کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے
اپنی ہی انجمنِ شوق میں ہوں نغمہ سرا ۔۔۔ ننگ ہے غیر کی محفل میں غزلخواں ہونا
چمن والے مرے رنگِ طلب کو پا نہیں سکتے ۔۔۔ وہ کہتے ہیں خزاں آئی، میں کہتا ہوں بہار آئی
لائے نہ اپنے لب پہ شکایت کا ایک حرف ۔۔۔ گو دل میں تھے ہزار تلاطم لئے ہوئے
یہ کیسی صبحِ درخشاں وطن میں آئی ہے ۔۔۔ ترس گئے ہیں سویرے کرن کرن کے لئے

دوسرا رُخ :-

میں اس کو صبحِ بہاراں کا نام دوں کیونکر ۔۔۔ ترس رہا ہے، جنوں آج پیرہن کے لئے (صفحہ ۵۵)

شاعر اپنے جسم پر پیرہن نہ ہونے کا گلہ کر رہا ہے کہ بہار آئی ہے تو میرے جنوں کو پیرہن سے الجھنا چاہئیے تھا مگر "جسم پر پیرہن" نہ ہونے سے "صبحِ بہاراں" کی نفی بڑی تکلف آمیز بات ہے۔

عروسِ لالہ و گل سے سلام لینا ہے ۔۔۔ روش روش کی زباں سے پیام لینا ہے (صفحہ ۵۹)

آخر بات کیا نکلی؟ عروسِ لالہ و گل کا "سلام کرنا" یہ چمن کی کیا کوئی رسم ہے؟ مصرعہ ثانی میں "روش روش" کی جگہ "کلی کلی" ہونا چاہئیے تھا!

چمن میں آگ لگائیں گے آتشِ گل سے ۔۔۔ کلی سے شعلۂ سوزاں کا کام لینا ہے (صفحہ ۵۹)

اس برہمی کا آخر سبب کیا ہے؟ آتشِ گل اور کلی کے شعلۂ سوزاں سے چمن کو جلا کر خاکستر کر دینے کا ارادہ کیوں ہے؟ حالانکہ اسی غزل کے مطلع میں لالہ و گل اور باغ کی روشوں سے شاعر نے بڑے لگاؤ کا اظہار کیا ہے۔

یہ عارفانِ حقیقت، یہ دہشتِ باطل ۔۔۔ یہ زور بھی کی ادائیں خدا کے شیروں میں (صفحہ ۷۵)

مصرعہ ثانی کس قدر جاندار ہے، مگر "دہشتِ باطن" نے شعریت کو غارت کر دیا! "عارفانِ حقیقت" بھی یہاں بے جوڑ نظر آتا ہے

یہی آرزو ہے یارب مرے جذبۂ دروں کی — مری ذات پر مدارِ غمِ روزگار ہوتا (صفحہ ۸۸)

ہمارے تو کچھ پلے پڑا نہیں کہ شاعر آخر کیا کہنا چاہتا ہے؟ شاید یہ کہ سارے جہاں کا غم درد میرے جگر میں سما جاتا۔ مگر "مدار" کو کیسے لگا؟

گلشن سے محبت ہے تو اے اہلِ گلستاں — تفریقِ گل ولالۂ گلستاں سے مٹا دو (صفحہ ۹۱)

"گل وخار" کہنا چاہیے تھا!

جہاں مسکرا دیئے وہ، وہیں مسکرا دیئے ہم
جہاں وہ ٹھہر گئے ہیں، وہیں رک گیا زمانہ (صفحہ ۹۵)

"جہاں" کا الف دونوں مصرعوں میں کس بری طرح دب رہا ہے، یوں بھی شعر سپاٹ ہے اور مصرعہ اولیٰ تو تو شعروں کا سا

زلف ورخسار ولبِ یار کا ذکر آیا ہے — کاش! وہ عربدہ شعبدہ کار آ جائے (صفحہ ۱۰۳)

یہ "عربدہ شعبدہ کار" کیا ترکیب ہے؟ "عربدہ" تو لڑائی دنگے کو کہتے ہیں، صحیح ترکیب "بتِ عربدہ جو" ہے، یعنی ایسا محبوب جو جنگ فساد کا حیلہ ڈھونڈتا ہو، پھر دوست کے زلف ورخسار ولب کا ذکر آ جانے پر، وہ کونسا "شعبدہ کار" ہے، جس کے بلانے کی تمنا کی جا رہی ہے، شعر میں ابہام نہیں اہمال پایا جاتا ہے۔

جب کہیں تذکرۂ دورِ خزاں ہوتا ہے — غنچہ وگل کا تبسم بھی گراں ہوتا ہے (صفحہ ۱۰۶)

مصرعہ ثانی میں تبسم کی جگہ "تصور" ہوتا، تو مفہوم واضح ہو جاتا۔

روئے گل کو قطرۂ شبنم سے دھو لیتے ہیں ہم — آنسوؤں سے اپنے دامن کو بھگو لیتے ہیں ہم (صفحہ ۱۱۲)

شاعر نے "خود اپنے دامن کو" روئے گل قرار دے کر، ایک عجیب سی بات کہی ہے!

تیرا جمال ماہ وستارہ سے بھی جمیل — تیری نگاہ گردشِ دوراں سے کم نہیں (صفحہ ۱۳۰)

ایسے بھرتی کے شعر مجموعہ کلام سے چھانٹ دینے چاہئیے تھے۔

باتوں میں رس امرت جیسا — ناروں میں انداز کنول کے (صفحہ ۱۶۰)

نار کی جمع "ناروں"۔ توبہ! وجدان تلملا اٹھا۔

جو ڈوبے تھے تلاطم خیزیوں میں — وہی ابھرے ہیں ساحل سے سفینے (صفحہ ۱۷۱)

"تلاطم خیزیوں" نے شعر کو کمزور کر دیا۔

ہر چند نہیں لب پہ ترا ذکرِ جنوں خیز — دل پھر بھی تری یاد سے بیگانہ نہیں ہے (صفحہ ۱۷۸)

"جنوں خیز" شعر کا وزن پورا کرنے کے لئے بھرتی کی ترکیب لائی گئی ہے!

جن کی خاطر ہم نے دامِ قید کو ترجیح دی — وہ بھی کہتے ہیں کہ کوئی زیرِ دام آیا تو کیا (صفحہ ۱۹۱)

کاش! اس قسم کے سطحی اشعار مجموعے میں شامل نہ ہوتے!

کمزوریاں کس ادیب وشاعر کے یہاں نہیں پائی جاتیں، مجموعی طور پر "مینائے غزل" پڑھنے والوں کے ذوق کو سیراب کرنے کا جوہر اپنے اندر رکھتی ہے۔

۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ

مرتبہ:- خلیق احمد نظامی، ضخامت ۲۱۴ صفحات، مجلد گرد پوش کے ساتھ قیمت چار روپے پچاس پیسے، قیمت غیر مجلد، تین روپے پچاس پیسے،

ملنے کا پتہ:- ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ غدر کے عینی شاہد عبد اللطیف نے فارسی زبان میں روزنامچہ لکھا تھا، جسے اُس دور کی معتبر و مستند تاریخی دستاویز سمجھنا چاہئیے، اسی روزنامچہ کا اردو ترجمہ، ایک بسیط مقدمہ کے ساتھ جناب خلیق احمد نظامی نے پیش کیا ہے، ترجمہ نہایت شستہ اور سلیس ہے اور مقدمہ محققانہ۔

اس روزنامچہ سے پتہ لگتا ہے کہ مغلیہ سلطنت پر یوں ہی ناگہانی طور پر زوال نہیں آگیا تھا، خانوادہ شاہی کے حالات اس قدر پست ہوگئے تھے کہ شاہزادہ مرزا ابوبکر ایک بازاری عورت کے یہاں شراب میں دھت رہتا تھا، خدا بخش نائب کوتوال نے اُسے ٹوکا، تو شاہزادہ نے تلوار کا وار کرکے کوتوال صاحب کو زخمی کردیا اگرچہ

"اس اطلاع سے بادشاہ کا چہرہ غصہ میں سُرخ ہوگیا، اور مرزا ابوبکر پر قہر و عتاب ہوا۔" (صفحہ ۱۴۶)

جنرل بخت خاں اس جنگ آزادی کا ہیرو تھا، اُس کے ہاتھ میں جنگ آزادی کے سرفروشوں کی کمان تھی، مگر خود بادشاہ اور خوشامدی درباریوں کا یہ حال تھا کہ:-

"بخت خاں نے چند بار شاہ سے سرگوشی کی، یہ بات بادشاہ کو پسند نہ آئی، اور اُمرا کو بھی ناگوار ہوئی، نواب امیر الامرا احتشام الدولہ امین الرحمٰن خاں بہادر نے اُن سے ادب آموز کلمات کہے، اور (تنبیہہ کی) کہ اے بے ادب! تم نہیں جانتے کہ یہ بادشاہوں کی بارگاہ اور سلاطین کی ادب گاہ ہے، ظاہر ہے کہ تمہیں بادشاہ کے ساتھ سرگوشی سے کیا نسبت، اور خسرو کے ساتھ خلوت سے کیا واسطہ

آدمی را آدمیت لازم است عُود را گر بُو نباشد ہیزم است

"بخت خاں کو یہ بات بُری معلوم ہوئی۔ جواب میں گفتگو کو طول دیا——"

اس قدر نازک موقعہ پر جب کہ جان مال، عزت آبرو اور حکومت سب کچھ خطرے میں تھی، اتنی سی بات پر بگڑنا اور فوج کے سب سے بڑے جنرل کو بُرا بھلا کہنا کسی عنوان بھی مصلحت و دانائی کی بات تھی؟

"غالب در علم پارسی غالب بود، تصنیف فراواں از دست، ہندی نژاد بود، ولے از پارس زاداں گوئے سبقت ربود۔" (صفحہ ۹۳)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کی عظمت کا اُس کے معاصرین اس کو کیا کچھ سمجھتے تھے۔

اس روزنامچہ سے پہلی بار یہ بات معلوم ہوئی کہ نواب کلب علی خاں والئ رامپور نے دلّی کی جامع مسجد کی مرمت کے لئے ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپیہ کا عطیہ دیا تھا، روزنامچہ نگار نے اُن کو:-

"بہ علم آراستہ، و بہ حلم سرشتہ"

لکھا ہے۔ اور یہ بھی کہ نواب کلب علیخاں نے اعلیٰ و ادنیٰ سب کے ٹھکانے کی (دست خیر بہر کہ دم کشود) انگریزی فوج نے قلعہ معلّی پر توپوں سے گولے برسائے ہیں، تو:-

چند گولے یکے بعد دیگرے "لال پردہ" کے قریب آگرے، اور قلعہ کے صحن میں ہنگامہ برپا ہوگیا، سلاطین اور چوبدار شاہی ان سے مرگئے۔ بادشاہ کو تشویش ہوئی، فرمایا نہیں معلوم آسمان کو مجھ سے کیا دشمنی ہے، کہ وہ ہمارے خلاف کمربستہ رہتا ہے، درہمے گوشۂ عزلت کو بھی پسند نہیں کرتا"

اس واقعہ کے اوپر روزنامچہ میں ۲۲ راگست ۱۸۵۷ء تاریخ درج ہے۔

سراج الدین شاہ ظفر کی بدزبانی اس حد تک پہنچ گئی تھی۔

"ایک موقعہ پر بادشاہ نے نواب حامد علی خاں سے کہا کہ اگر دس ہزار روپیہ نذرانہ پیش کرو تو تمہیں مختاری کے عہدہ پر سرفراز کیا جاسکتا ہے، انھوں نے عرض کیا کہ اگر اس عہدہ پر کسی اور کو مقرر کیا جائے یا نذرانہ معاف فرمایا جائے تو اچھا ہے، ورنہ حکم عالی کی تعمیل میں نذرانہ پیش کرنے اور منصب پر سرفراز ہونے کا افتخار حاصل کرنے کی کوشش کروں گا"

(احسن الاخبار، مورخہ ۹ راکتوبر ۱۸۴۲ء)

فاضل مترجم اور مقدمہ نگار نے بڑی سچی بات کہی ہے:-

"بہادر شاہ کے متعلق یہ تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ ایک انقلابی تحریک کی رہنمائی کی قطعاً صلاحیت نہیں رکھتا تھا، انہوں نے ۱۸۵۷ء کی تحریک میں جو کچھ بھی حصہ لیا، وہ حالات کی مجبوری کی بنا پر تھا کسی شورش انگیز مقصد کی بنا پر نہیں تھا"

اس کتاب کا مقدمہ بڑے معرکہ کی چیز ہے۔ فارسی متن کے بعد ڈھائی صفحہ کی فرہنگ ہے۔ چند الفاظ!

اشتلم	ظلم وتعدی	انگارہ	افسانہ وسرگزشت	چشم دریدہ	بے حیا
وشخوار	مشکل	رازبان	صاحب راز	میاں جی	ایلچی
زن راہ کارہ	زن فاحشہ	چکامہ	غزل وقصیدہ	ستم	ہمراہ رفیق

کتاب کا آخری حصہ "اشخاص" پر مشتمل ہے، یہ خاصی کاوش وتحقیق کے بعد مرتب کیا گیا ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کے بانی مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا حجاز میں کب انتقال ہوا اور یہ بھی کہ کلے خاں (گولا انداز) کون تھا اور اس نے کیا کام انجام دیا۔

"۱۸۵۷ء کا یہ تاریخی روزنامچہ" ہر اعتبار سے قابل قدر ہے، جناب خلیق احمد نظامی نے مقدمہ فرہنگ ترجمہ حواشی اور ہنگامۂ غدر سے متعلق اشخاص کے حالات لکھ کر، اصل روزنامچہ کی علمی اور تاریخی حیثیت کو بلند تر کردیا ہے۔

فتاویٰ رشیدیہ کامل، مُبوّب

از:- حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، ضخامت ۵۰۴ صفحات، مجلد رنگین گردپوش کے ساتھ، قیمت آٹھ روپیہ،

ملنے کا پتہ: محمد سعید اینڈ سنز قرآن محل، مقابل مولوی مسافرخانہ، کراچی۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، آپ کے علمی کمالات آفتاب کی طرح روشن ہیں، آپ کا شمار اکابر علماء اور صلحاء امت میں ہوتا ہے! مولانا قدس سرہٗ کی حیات میں ہندوستان کے مختلف گوشوں سے فقہی استفسارات آتے رہتے تھے، ان کے جوابات کو تین حصوں میں جمع کرکے چھپوایا گیا تھا، مطبع سعیدی نے ان فتاویٰ کو

ب جلد میں از سرِ نو ترتیب دے کر اور فقہی ابواب قائم کر کے شائع کیا ہے، اور اس طرح دین کی قابل قدر خدمت انجام دی ہے
اہل علم اور عوام سبھی کو ان فتاویٰ سے روشنی مل سکتی ہے۔ بڑے بڑے نازک اور پیچیدہ مسائل کو صاحب مسائل نے سلجھا کر
یان فرمایا ہے اور بڑی کام کی باتیں اس کتاب میں پائی جاتی ہیں!

ہماری تھوڑی بہت معلومات اور شد بد کو صاحب فتاویٰ رحمۃ اللہ علیہ کے علم بے پایاں سے کوئی نسبت نہیں ہے مگر جو
تیں ہمیں کھٹکی ہیں، اُن کا اظہار بھی دین کی ضرورت اور شریعت کے تقاضوں کے پیشِ نظر ہی کیا جا رہا ہے۔

(صفحہ ۶۹) سوال:۔ نواب مولوی قطب الدین خاں صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل عالمگیری سے کیا ہے کہ ایک شخص
ے کہا کہ قیاس امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا حق نہیں کافر ہوا۔ اس کا کیا مطلب ہے، اور یہ قول صحیح ہے یا غیر صحیح[1]؟......
جواب:۔ علماء کی توہین و تحقیر کو چونکہ علماء نے کفر لکھا ہے، جو بوجہ امر علم کے اور دین کے ہو، لہٰذا جب قیاس مجتہد کو ناحق
ہا تو اہانت اس عالم کی کی۔ امر دین و علم میں لہٰذا کفر ہوا۔

فاران:۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تو تابعی تھے، کسی صحابی کے قیاس، رائے یا قول کو بھی کوئی غلط کہہ دے، تو ایسا کہہ دینے
ے کفر ہرگز ثابت نہیں ہوتا، فقہی کتابوں میں اسکی بکثرت مثالیں ملتی ہیں کہ دینی مسائل میں کسی ایک صحابی کے قول کو دوسرے
حابی کے قول پر ترجیح دی ہے اور بعض حالات میں ایک صحابی کے قول کو دوسرے صحابی کے قول کے مقابلہ میں قابلِ حجت اور درست
ہیں سمجھا گیا ______ اور علماء کی توہین و تحقیر تو ہرگز کفر نہیں ہے، رہی یہ شرط کہ "بوجہ امر علم اور دین کے عالم کی
وہین کفر ہے" تو اس شرط میں بڑا تکلف پایا جاتا ہے، اس طرح تو ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی تحقیر اُس کے اسلام کے سبب کرے، تو وہ
بھی کفر قرار پائے گی مگر کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کی تحقیر، یا کسی عالم کی توہین اس کے دین کے سبب نہیں کرتا، جو کوئی یہ کہتا ہے کہ فلاں
مجتہد کا قیاس حق نہیں ہے، وہ دین کی توہین نہیں بلکہ دین کی عظمت کے سبب ہی ایسا حکم لگاتا ہے، اور ایسا کرنے سے نہ ایمان جاتا ہے
ور نہ کفر کا ارتکاب ہوتا ہے۔

(صفحہ ۶۹) سوال:۔ اور ایک عبارت نواب صاحب نے اسی رسالہ عالمگیری سے یہ نقل کی ہے، یعنی ایک شخص نے نظم کیا قرآن کو
فارسی میں قتل کیا جاوے، اس لئے کہ وہ کافر ہے۔

جواب:۔ علیٰ ہٰذا قرآن کو نظم کرنا اور فارسی کرنا تغیر کتاب اللہ تعالیٰ کی اور نظم منزل کو بدلنا اہانت و بے تعظیمی قرآن کی کی ہوئی
سو کفر ہو گیا!

فاران:۔ جب قرآن کا دوسری زبان کی نثر میں ترجمہ کیا جا سکتا ہے اور اس سے کتاب اللہ کی "تغیر" لازم نہیں آتی، تو اُسی
نثر کے ترجمہ کو نظم کر دینے کو "تغیر کتاب" سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، اور اسے کفر کہنا تو بہت بڑی زیادتی ہے! گزشتہ دس
پندرہ برس کے اندر قرآن پاک کے منظوم تراجم کو خود بعض دیوبندی علماء اور صاحبان افتاء نے سراہا ہے، کہنا یوں چاہیے تھا کہ قرآن
کا منظوم ترجمہ کسی اعتبار سے بھی مستحق اور پسندیدہ نہیں ہے؟ اور اس سے سختی کے ساتھ اجتناب کرنا چاہیے۔

(صفحہ ۶۹) ایک صاحب نے مولانا رشید احمد گنگوہی سے سوال کیا ہے کہ اس قسم کے اشعار:۔ ؎

یارسول اللہ انظر حالنا　　یارسول اللہ اسمع قالنا

کو کوئی ورد وظیفے کے طور پر پڑھتا ہے، تو اس کا کیا حکم ہے۔ اس کے جواب میں مولانا مرحوم کا یہ کہنا کہ ایسے کلمات نظم ہوں یا نثر

[1] کتابت میں ایک دو لفظ غالباً چھوٹ گئے ہیں جن کو پورا کر دیا گیا۔

ورد کرنا مکروہ تنزیہی ہے" شدید حیرت اور سخت خلجان و اضطراب کا موجب ہے، غیر اللہ سے جن اشعار میں استغاثہ و فریاد کی جائے، اُن کو وظیفہ بنانا کسی طرح جائز نہیں ہے۔

(صفحہ ۸۴) سوال :- عدم سوال قبر مخصوص شہدائے مقتولین سے ہی ہے، یا ہر قسم شہداء سے اور اولیاء اللہ بھی بہ مرتبہ شہداء در داخل تحت آیت بل احیاءٌ عند ربھم ہیں، یا نہیں۔ کیونکہ وہ مجاہد فی النفس ہیں کہ یہ جہاد اکبر ہے۔

جواب :- اولیاء کرام بھی بحکم شہداء ہیں اور مشمول آیت بل احیاءٌ عند ربھم کے ہیں۔

فاران :- شہداء جو کفار سے جنگ کر کے قتل و ہلاک ہوتے ہیں، قرآن کی یہ آیت صرف انہی کی شان میں نازل ہوئی ہے اولیاء اللہ پر اس آیت کا اطلاق کرنا ایک ایسی وسعت ہے جس سے "قتال فی سبیل اللہ" کا امتیاز مجروح ہوتا ہے۔

(صفحہ ۹۵) سوال :- منصور جن کو دار پر چڑھایا گیا، یہ آپ کے نزدیک ولی ہیں، یا نہیں اور اگر ولی ہیں تو کونسی منزل پر تھے

جواب :- بندہ کے نزدیک وہ ولی تھے، در منازلِ ولایت سے بندہ کو توقف ہے۔

فاران :- منصور حلاج کے حالات و کیفیات سخت مشتبہ ہیں، پھر اس کا "انا الحق" کہنا عقیدۂ توحید کے منافی ہے، ایسے غیر ذمہ دار آدمی کو "ولی" کہنا، شریعت میں بے تکی باتوں کے لئے وجہ جواز پیدا کرنا ہے!

(صفحہ ۱۰۰) سوال :- مزارات اولیاء رحمہم اللہ تعالیٰ سے فیض حاصل ہوتا ہے یا نہیں اگر ہوتا ہے تو کس صورت سے ہوتا ہے

جواب :- مزاراتِ اولیاء سے کاملین کو فیض ہوتا ہے مگر عوام کو اس کی اجازت دینی ہرگز جائز نہیں اور تحصیل فیض کا طریقہ کوئی خاص نہیں ہے جب جانے والا اہل ہوتا ہے تو اس طرف سے حسب استعداد فیضان ہوتا ہے مگر عوام میں ان امور کا بیان کرنا کفر و شرک کا دروازہ کھولنا ہے۔

فاران :- جن صاحب پر اس مسئلہ کی حقیقت واضح کی گئی ہے کیا وہ "خواص" میں شامل تھے، اور پھر مستفتی کا یہ جواب کو کتاب میں چھپوانا کہ ہر عامی اسے پڑھ سکتا ہے، کس قدر بے احتیاطی کی دلیل ہے، اور عوام میں اس کا مشہور کیا جانا کیا کفر و شرک کے دروازے کو نہ کھول دے گا ——— پھر کتاب و سنت میں کیا اس کی کوئی دلیل ملتی ہے کہ قبور سے فیض حاصل ہوتا ہے حدیث شریف میں تو زیارت قبور کی اجازت اس غرض سے دی گئی کہ زائر کو موت اور آخرت کی یاد آئے!

(صفحہ ۱۹۸) سوال :- بعض بعض صوفی قبور اولیاء پر چشم بند کر کے بیٹھتے ہیں اور سورۂ الم نشرح پڑھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہمارا سینہ کھلتا ہے اور ہم کو بزرگوں سے فیض ہوتا ہے، اس بات کی کچھ اصل بھی ہے یا نہیں ہے۔

جواب :- اس کی بھی اصل ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔ اگر بہ نیت خیر ہے۔

فاران :- کتاب و سنت میں تو اس کے جواز کے لئے کوئی دلیل نہیں ملتی اور نہ صحابہ کرام کا یہ معمول رہا ہے اور نہ تابعین صحابہ کرام کی قبروں پر اس طرح مراقبہ کیا کرتے تھے۔

سوال :- آدمی شجرہ خاندان کا ہر صبح و شام پڑھتے ہیں، یہ کیسا ہے؟

جواب :- شجرہ پڑھنا درست ہے، کیونکہ اس میں بتوسل اولیاء کے حق تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

فاران :- شادی، بیاہ اور وراثت کے معاملہ میں کفو اور نسب کا تو ضرور اعتبار ہے، اور فقہ اس خصوص میں ہماری رہنمائی کرتا ہے، اس کے علاوہ دین میں اور کوئی "خاندان" نہیں ہے۔ پھر یہ بات بھی دیکھنی ہے کہ طریقت کے خاندانوں کے شجرے

ٹ بھیجنے کا رواج مسلمانوں میں کب سے ہوا۔ تابعین اور ائمہ فقہ وحدیث تو ایسا نہیں کرتے تھے۔ حالانکہ وہ طلب خیر اور دعا کرنے کے
طریقے بعد کے لوگوں سے بہتر طور پر جانتے تھے، جس عمل کی کتاب وسنت اور آثار صحابہ میں سند نہ ملتی ہو۔ اس کے کرنے کی ترغیب نہیں
دینی چاہیئے۔

(صفحہ ۳۲۹) ایک فتویٰ کے جواب میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی فرماتے ہیں:۔

"جس موضع میں دو ہزار آدمی ہندو مسلمان ہوں، اس جگہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک جمعہ ادا نہیں ہوتا ہے، وہاں ظہر کی نماز
جماعت سے پڑھنی چاہیئے اور جمعہ نہ پڑھنا چاہیئے .... اور امام شافعی صاحب کے یہاں گاؤں میں جمعہ ہو جاتا ہے"۔

فاران:۔ مگر پاکستان اور ہندوستان میں خود احناف کا عمل امام شافعی کے مسلک پر ہے، اور ایسے ایسے قریوں میں بھی جمعہ
کی نماز ہوتی ہے۔ جہاں کی آبادی دو سو ڈھائی سو زائد نہیں ہے؛ امام شافعی کے یہاں اس مسئلہ میں توسع پایا جاتا ہے۔

(صفحہ ۴۰۳) سوال:۔ اس زمانہ میں جو منی آرڈر بھیجنے کا رواج ہو رہا ہے، اس کے جواز کے لئے بھی کوئی حیلہ شرعی ہے
یا نہیں کہ اس میں عام وخاص مبتلا ہو رہے ہیں۔

جواب:۔ حیلہ بندہ کو معلوم نہیں۔

سوال:۔ منی آرڈر میں کچھ روپے ہوں اور کچھ پیسے۔ تو جواز کے لئے یہ حیلہ کافی ہے یا نہیں۔

جواب:۔ منی آرڈر درست نہیں، جیسا ہنڈی درست نہیں، دونوں میں معاملہ سود کا ہے۔

فاران:۔ منی آرڈر پر "سود" کا حکم لگانا، توبہ! دل لرز گیا۔ دنیا کے ہر خطہ کے عوام نہیں کروڑوں علماء نے عملاً اس فتویٰ کو رد کر دیا
علماء دیوبند پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے اکابر کی کتابوں کا بغور مطالعہ فرما کر، اس قسم کے تسامحات کو یا تو یک قلم کتابوں
سے خارج کردیں، اور انھوں نے جو کچھ لکھ دیا ہے، اس کا حرف بہ حرف باقی رہنا ضروری سمجھا جائے۔ تو اس قسم کی غلطیوں کی حاشیہ میں
تصحیح کردیں۔ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ریڈیو کو آلہ لہو قرار دیا تھا، لاوڈ اسپیکر کے استعمال کو وہ نماز میں جائز نہیں سمجھتے
تھے۔ انگریزی جوتہ پہننے کو انھوں نے حرام لکھا ہے، پرامیسری نوٹوں کے ذریعے زکوٰۃ ادا کرنے کو وہ نادرست سمجھتے تھے، اسی طرح بہشتی زیور
بلاشک نہیں بڑے کام کی کتاب ہے، مگر اس میں سے بعض ایسے ضمنی مسائل نکال دینے چاہئیں۔ جن کا اگر ذکر نہ آتا تو کنواری لڑکیوں کی
دینی معلومات میں کوئی خامی کمی نہ رہ جاتی۔

یہ باتیں اللہ تعالیٰ دلوں کا حال جانتا ہے پوری نیاز مندی کے ساتھ اخلاص وخیر خواہی کے جذبہ کے تحت کہی جا رہی ہیں، ڈ
حدیث شریف میں آیا ہے کہ (بعض باتوں) کو شاہد کے مقابلہ میں غائب زیادہ اچھی طرح یاد رکھتا ہے، اسی طرح ایسا بھی ہوتا ہے کہ
اللہ تعالیٰ کے محض فضل وکرم سے ایسی باتیں بھی بہت ہی کم علم کے آدمیوں کو سوجھ جاتی ہیں، جو اہل علم کی نگاہوں سے اوجھل
رہ جاتی ہیں!

دردِ سر دوسرے ہر قسم کے درد اور
نزلہ و بخار کیلئے
انالجین ٹکیاں
Ipal
ہر قسم کی کھانسی
سے فوری
نجات
کیلئے
COUGHSOL
COUGH SYRUP
کفنسول شربت
صحت اور
توانائی
کیلئے
LAXSAL
فروٹ سیلائن
لیکسال
اوپل لیباریٹریز لمیٹڈ ۔ کراچی

چمکدار لیکن

سکون بخش

جی سنز کے لیمپ قلیل مدت میں تمام پاکستان میں پھیل گئے
آپ انہیں مکانوں، آفسوں اور فیکٹریوں میں ہر جگہ پائیں گے درحقیقت
ایک اعلیٰ درجہ کی چیز عوام کی خدمت کیلئے پیش کی گئی ہے آپ
جی سنز ہی استعمال کیجئے اس لئے کہ یہ بہترین ہیں

پاکستان میں بنے ہوئے

جی سنز الیکٹرک کمپنی لمیٹڈ

زنزیبٹ کراچی

ماہر القادری

سالانہ چندہ
چھ روپے

فی پرچہ
آٹھ آنے

ماہ
مئی ۱۹۵۹ء

ایڈیٹر
ماہر القادری

شمارہ ۲
جلد ۱۱

فاران
کراچی

ترتیب

مقام اشاعت :- دفتر فاران، کیمبل اسٹریٹ، کراچی ۲

پرنٹر پبلشر :- مسرور حسین
مطبع سعیدی قرآن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقش اول

کراچی میں، رویت ہلال ماہ رمضان کے سلسلے میں امسال جو صورت حال پیش آئی ہے، اس نے مغرب زدہ دل، مادہ پرستوں
خاص طور سے کمیونسٹوں کو علماء کی تحقیر اور اس پردے میں دین کے استہزاء کا ایک موقعہ فراہم کر دیا ہے! رویت ہلال کا مسئلہ صاف
سادہ ہے، اس میں کوئی الجھن اور پیچیدگی نہیں ہے، انتیس تاریخ کا دن گزر کر، غروب آفتاب کے بعد کسی بستی میں چاند نظر آجا
دوسرے دن سے وہاں ماہ صیام کا آغاز ہو جاتا ہے، چاند نظر نہ آئے تو مہینہ پورے تیس دن کا ہوگا! دوسری بستیوں میں ۲۹ دن
کو چاند ہو جائے اور وہاں کے آنے والے شریعت کی مطلوب شہادت فراہم کر دیں، تو جہاں انتیس کا چاند نہیں ہوا، وہاں بھی شعـ
کا مہینہ انتیس دن کا مان کر، دوسرے دن رمضان کی پہلی تاریخ تسلیم کی جائے گی۔

چاند دیکھنے کے لئے ہر بستی کے مسلمانوں کو امکانی جد و جہد کرنی چاہئے یعنی مکانوں کی چھتوں، درختوں اور اونچے سے اونچے ٹیلوں
چڑھ کر رویت ہلال کی کوشش کی جائے۔ مگر ہوائی جہازوں میں سوار ہو کر، ہزاروں فٹ کی بلندی سے چاند دیکھنے کی زحمت اٹھانا
میں مطلوب نہیں ہے!

جو لوگ شمسی تقویم کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور قمری مہینوں پر دبی زبان سے نکتہ چینی کرتے ہیں، کاش! وہ اللہ تعالیٰ کی
حکمت کو سمجھ سکتے کہ ماہ صیام کا سال کے ہر مہینہ اور ہر موسم میں گردش کرتے رہنا، کس قدر مطابق فطرت ہے! اور ساتھ ہی چاند
انتیس اور تیس کے ہونے میں جو فطری تجسس اور دلی ذوق شوق پایا جاتا ہے، وہ اس صورت میں کہاں باقی رہتا کہ دائمی تاریخوں کی
ایسی تقویم بنا دی جائے، جس میں تمام قمری مہینوں میں رویت ہلال کا پہلے سے قطعی طور پر تعین کر دیا جائے اور رویت ہلال سے کـ
سروکار ہی نہ رہے، ہلالی تاریخوں میں اس طرح یکسانی پیدا کرنے کی کوشش بھی دین میں پسندیدہ نہیں ہے ورنہ کتاب و سنت میں
کے لئے واضح حکم نہ سہی، کوئی اشارہ تو وارد ہوتا!

ماہ صیام کی رویت ہلال میں اصل چیز روزہ کی فرضیت اور عبادت کا اہتمام ہے، مگر وہ لوگ جو روزے سے کوئی سروکـ
نہیں رکھتے۔ ماہ صیام کے دنوں میں جن کے اکل و شرب کے معمول میں کوئی فرق پیدا نہیں کرتے۔ ان کا دل چاہتا ہے تو اللہ کے دین
کرم ضرور فرماتے ہیں کہ رمضان کے جمعہ کے دنوں میں روزہ رکھ لیں، کسی بچہ کی روزہ کشائی کی تقریب دھوم دھام سے منا
اس مزاج اور کردار کے "مذہبی لوگ" (؟) خاص طور سے رویت ہلال کے مسئلے میں بڑی شدومد سے رائے زنی فرماتے ہیں ا
اپنی آزاد خیالی، روشن فکری اور فلکیات میں اپنی معلومات کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں، اور فن تقویم پر محمود فلکی بن کر گفتگو فرماتے ہیں
ساری دنیا کے ملکوں، شہروں، اور بستیوں میں ایک ہی دن روزہ کا آغاز و اختتام ہوتا، شریعت میں سرے سے مطلـ
نہیں ہے، جو لوگ یکسانی کے اس نقطۂ نگاہ سے سوچتے ہیں، وہ شریعت کی اسپرٹ سے دور ہٹ کر سوچتے ہیں.....
واقعہ ہے کہ ٹیلیفون، تار اور خاص طور سے ریڈیو اور رصدگاہوں کے نازک و حساس آلات کی ایجاد نے "رویت

ستلہ کو قابل غور بنا دیا ہے۔

رصدگاہوں کے آلات" رویت ہلال" کے مسئلہ میں شرعی اعتبار سے کہاں تک معتبر ہو سکتے ہیں؟ ریڈیو کی کیا شرعی حیثیت
؟ عام طور پر دنیا کی نشرگاہیں اس قسم کی خبریں صحیح نشر کرتی ہیں یا غلط؟ ایک تو وہ نشرگاہیں ہیں جو غیر مسلم حکومتوں کے تصرف
ہیں، اور دوسرے وہ ریڈیو اسٹیشن ہیں جن پر مسلم حکومتوں کا تسلط ہے۔ ان کی پوزیشن میں کیا فرق ہے؟ ٹیلیفون پر کسی کی آواز
کو واضح طور پر پہچانی جاتی ہے، کیا شرعی درجہ رکھتی ہے؟ پھر اس پر بھی غور کرنا ہے اور علماء کو اس شق پر غور کرنے کے لئے جدید
فلاک کی روشنی میں "اختلاف مطالع" کی ضروری معلومات حاصل کرنی ہیں ـــــ یہ کہ کتنی مسافت پر جا کر "مطلع" میں چاند
ب وظہور اور عروج و محاق کا کیا فرق واقع ہوتا ہے؟

ان تمام نزاکتوں اور پیچیدگیوں پر پوری طرح غور و خوض کرنے کے بعد، اس طرح کہ شریعت کا کوئی اصول مجروح نہ ہوتا ہو،
ں کی ایجادات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، رویت ہلال کے بارے میں "اجتہاد" وقت کی ناگزیر ضرورت ہے، علماء کرام کو اس طرف
ے جلد توجہ کرنی چاہیئے!

ـتِ رسولؐ

یہ تو ایک خاص مسئلہ تھا جس پر خاصی وضاحت کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے مگر ہم نے اس مسئلہ میں اپنی کوئی رائے
نہیں دی، اس لئے کہ ہم خود کو منصب افتاء و اجتہاد کا اہل نہیں سمجھتے اور دین کے مسئلہ میں قیاس و اجتہاد کا
ی حضرات رکھتے ہیں، جن کی زندگیاں اس بحر کی شناوری میں گزری ہوں اور علم و خبر کے ساتھ جو صاحب تقویٰ بھی ہوں!

مگر اس گفتگو کے بعد ہم ایک اصولی بات اور بہت ضروری بات عرض کرنی چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ دلوں کا حال جانتا ہے کہ
جو کچھ ہم کہیں گے اس سے سو فیصدی دین کی خیر خواہی مقصود ہے، کسی پر تنقید بھی ہے تو وہ بھی دین و شریعت کی بھلائی کے لئے
سائل کو جب بھی ممتنع کیا جاتا ہے تو اس قسم کی تعمیری تنقید ضروری ہو جاتی ہے، آپ ہمارے لب و لہجہ کو دیکھئے اور اس اسپرٹ
جو اس مضمون کی تہ میں کارفرما ہے، کوئی اتنا تنگ مزاج ہو کہ اپنے کسی مسلک پر گفتگو کرنا ہی اُسے پسند نہ ہو اور اس قسم کی گفتگو
سق و گناہ بلکہ بے دینی سمجھتا ہو، تو اس مزاج و ذہنیت کے حضرات سے نہ ہمارا خطاب ہے اور نہ اُن کی خفگی و برہمی کے ڈر
م اظہارِ حق سے باز رہ سکتے ہیں!

جو حضرات باقاعدگی کے ساتھ "فاران" پڑھتے رہے ہیں، وہ ہمارے دینی مسلک کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ "فاران" کے ہزاروں
ت اس کے شاہد ہیں کہ ہم نے کسی گمراہی کی طرف لوگوں کو دعوت نہیں دی اور نہ کسی دینی مسئلہ کو محض زور بیان سے الجھایا ہے
پرستی کے خلاف تو ہم نے قلمی جہاد کیا ہے اور ہمارے نزدیک استنجے کے ڈھیلوں کی تعداد بھی کسی تمسخر کی نہیں بلکہ احترام کی مستحق
ہم تین گھونٹ میں پانی پینے کو بھی خیر و فلاح کا سبب سمجھتے ہیں۔

اللہ کا دین "کتاب و سنت" کے دو ستونوں پر قائم ہے، ان میں سے کسی ایک ستون کو بھی نہیں چھوڑا جا سکتا، جو کوئی رسول اللہ
علیہ وسلم کی سنت مطہرہ کو پس پشت ڈال کر "تنہا" کتاب اللہ کی طرف دعوت دیتا ہے، وہ منافق ہے۔ اور اس کی اس دعوت کا
کتاب اللہ کے احکام کی حفاظت نہیں بلکہ کثرت تعبیر و تاویل سے ان احکام کی عملی حیثیت کو پریشان کر دینا ہے، کوئی شک نہیں
تاب ہر جہت اور ہر حیثیت سے مکمل اور کسی دوسری کتاب کی محتاج نہیں ہے مگر اس کے مفہوم و منشاء اور احکام کی تفصیل
لئے ہم اُس انسانِ کامل کی سنت کے محتاج ہیں جس پر کتاب نازل کی گئی ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو بندوں کی
ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا ہے، اور اُن کی بعثت سے اللہ تعالیٰ کی شانِ کمال و صفت بے نیازی اور قدرت و حکمت پر

کوئی حرف نہیں آتا، اسی طرح سنّتِ رسولؐ سے کتاب اللہ کے کامل ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا، جس طرح انبیاء کی بعثت ہماری ضرورت اور احتیاج کے لئے ہے، اسی طرح سُنّتِ رسولؐ کا تعلق ہماری احتیاج سے ہے! اور یہ بات ہم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ خود قرآن کریم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو دنیا کے لئے معیار اور نمونہ قرار دیا ہے اور حضورؐ کی بعثت کی غرض، تلاوتِ قرآن، تزکیۂ نفوس، اور تعلیم کتاب و حکمت بتائی ہے، کتاب و حکمت کی یہی تعلیم جس پر قرآن گواہ ہے، "سنّتِ رسولؐ" ہے۔ اس لئے جس کتاب کے ساتھ اس کی تعلیم کو بھی دنیا میں باقی رہنا چاہیئے تھا، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی خود حفاظت کی اور سُنّتِ رسولؐ کو اُن نفوس قدسیہ نے محفوظ رکھا، جو وحی کے مخاطبین اولین اور حاملین قرآن تھے!

کتاب اللہ کے بعد سنّتِ رسولؐ کو دین میں حُجّت و ماخذ اور سند ماننے کے بعد اس کا اظہار بھی ضروری ہے کہ احادیث کے جتنے مجموعے کتابی صورتوں میں دنیا میں پائے جاتے ہیں، ان میں سے کوئی کتاب بھی کتاب اللہ کی طرح "لاریب فیہ" نہیں ہے، صحاح ستہ کی صحت پر ہم مجموعی طور پر یقین رکھتے ہیں لیکن جہاں تک کمال صحت کی اُس مُنتہا کا تعلق ہے کہ جہاں سہو و نسیان کا امکان ہی نہیں ہے، کتاب اللہ کے مقابلہ میں صحاح ستہ کو بھی اس درجہ میں نہیں رکھ سکتے، احادیث پر درایت و روایت کے اعتبار سے آج بھی گفتگو کی جاسکتی ہے، یہ گفتگو "سنّتِ رسولؐ" سے فرار و گریز کے لئے نہیں ہوگی بلکہ سنّتِ رسولؐ کی تاکید اور صحت کے لئے ہوگی کہ حضورؐ سے کوئی ایسی بات منسوب نہ ہو جائے، جو شایانِ نبوت نہ ہو!

فقہی اختلافات

"کتاب و سُنّت" کے بعد فقہ کا نمبر آتا ہے، "فقہ" عبادات و معاملات کی جُزئیات و تفصیلات سے بحث کرتا ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دور میں "فقہی مسائل" کی بنیاد پڑ گئی تھی اگرچہ اُس دور میں "تفقہ" کا لفظ قرآن فہمی اور دینی بصیرت کے معنی میں استعمال ہوتا تھا!

صحابۂ کرام اور تابعین کے دور میں فقہی مسائل پھیلتے چلے گئے، یہاں تک کہ دوسری صدی ہجری کے وسط سے لے کر اب تک فقہی مسائل کی کثرت کی کوئی حد ہی نہیں رہی، صرف تنہا ایک عالم دین کے فتاویٰ کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے، اسلامی لٹریچر میں "فقہ" پر جتنا کام ہوا ہے، اتنا کام کسی دوسرے فن اور شعبۂ علم میں نہیں ہوا، اور وہ اس لئے کہ اس تیرہ سو سال کی مدت میں مختلف نوعیتوں کے لاکھوں قسم کے مسائل پیدا ہوئے ہیں اور مجتہدین اور ائمہ فقہ نے ان کے حل تلاش کئے ہیں اور ان کی حلت و حرمت اور کراہت و اباحت کے فتوے دیئے ہیں۔ مثلاً "بیع و شراء" کے مسائل ہیں، ان کو کسی بندھی چند صورتوں میں محدود و متعین نہیں کیا جاسکتا یہ مسائل پھیل کر ہزاروں تک پہنچ گئے ہیں اور ہر بائع، مشتری، کاتب، راہن اور مُرتہن کو نئی نئی صورتوں سے سابقہ پڑا ہے، فقہاء پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو، انھوں نے ان نئی نئی صورتوں کے لئے کتاب و سُنّت سے، آثارِ صحابہ سے، اور جہاں ان کا حل نہیں ملا، تو اپنے اجتہادات سے ان کے حل ڈھونڈے ہیں، اسی لئے ہر دور میں فقہی کتابوں میں برابر اضافہ ہوتا چلا گیا ہے۔

فقہائے اُمت کی یہ تمام کوششیں طنز و اعتراض نہیں بلکہ تحسین و تبریک کی مستحق ہیں، اسلامی فقہ کو ہم دنیا کے متمدن قوانین کے مقابلہ میں فخر و مباہات کے ساتھ پیش کرسکتے ہیں ــــــــ رہے فقہاء کے اختلافات تو یہ اختلافات اصل دین میں نہیں بلکہ فروع میں ہیں۔ اور فروعی اختلافات سے دنیا کا کوئی فن محفوظ نہیں رہ سکتا اور نہ رہا ہے، فلسفہ و تاریخ، علم کلام، شعر و ادب ان میں سے کوئی صنف ایسی نہیں ہے، جس میں ناقدین اور ماہرینِ فن کے درمیان اختلافات نہ پائے جاتے ہوں، کسی شاعر کے دیوان کی کوئی شرح ایسی نہیں ہے، جو بالکل ایک جیسی ہو اور اُس میں اختلاف نہ ملتا ہو؟ مگر ان اختلافات میں ایک قدرِ مشترک بھی ضرور ہوتی ہے، مثلاً صلوٰۃ کی فرضیت کا کوئی فقیہ منکر نہیں ہے، اور اس کے بھی سب قائل ہیں کہ کوئی نماز، قیام، رکوع، سجدہ اور

تلاوتِ قرآن سے خالی نہیں ہونی چاہیئے، قبلہ کی سمت تمام فقہا کے نزدیک یکساں تسلیم کر لی گئی ہے، اختلافات صلوٰۃ کی فروعی تفصیل میں پائے جاتے ہیں۔

کسی عمل کی فروع و تفصیل اور شرح واطناب میں اختلافات کا پایا جانا فطری امر ہے، اگر اختلافات فروع میں نہ پائے جائیں تو یہ مصنوعی ہم آہنگی اور بناوٹی یکسانی ہوگی۔ جس طرح کسی واقعہ کی تفصیل میں اگر تمام گواہ لفظ بہ لفظ متفق ہوں اور ان کی بیان کی ہوئی تفصیلات میں سرمو فرق نہ ہو، تو ایسے گواہ مصنوعی اور سکھائے پڑھائے سمجھے جائیں گے۔

تقلید کیا ہے؟

اُمتِ مسلمہ پر کم و بیش ڈیڑھ سو سال ایسے گزرے ہیں کہ اُمت کسی متعین فقہی مذہب یا مذاہب پر عمل نہیں کرتی تھی۔ اور مسلمان فقہی مذاہب میں بٹے ہوئے نہ تھے، صحابہ کرامؓ نے براہِ راست کتاب و سنت سے مسائل اخذ کئے اور ان پر عمل کیا، تابعین نے کتاب و سنت کے بعد صحابۂ کرامؓ کے مجموعی تعامل کو بھی فقہی مسائل میں پیشِ نظر رکھا۔ اُن میں یہ صلاحیت اور تحریر فکر موجود تھی کہ وہ صحابہ کرامؓ کے اختلافات کو بھی کتاب و سنت کی کسوٹی پر کس کر اور پرکھ کر دیکھتے تھے اور جس کے قول و عمل کو کتاب و سنت سے قریب تر پاتے تھے اُسے اختیار کرتے تھے۔ کتاب و سنت سے براہِ راست اخذِ مسائل کا یہ نتیجہ ہوا کہ تابعین میں، علیؓ، عمرؓ، عائشہؓ، عبداللہ ابن عمرؓ، عبداللہ ابن عباسؓ، اور عبداللہ ابن مسعود (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) جیسے اکابر صحابہ بلکہ یوں کہنا چاہیئے، اس دور کے ائمہ فقہ کے نام سے امت میں فقہی مذاہب وجود میں نہیں آئے، دین و اخلاق، خشیتِ الٰہی اور اتباعِ رسولؐ کے لحاظ سے یہ بڑا با برکت دور تھا، جس میں اُمت کے لئے یقیناً بڑی اچھی مثالیں اور نمونے ملتے ہیں۔

کوئی فرد یا جماعت اُسی دور کے نمونہ پر کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ سے براہِ راست فقہی مسائل اخذ و استنباط کرنے کی ذمہ داری قبول کرے، اور کسی فقہی مذہب کا اپنے کو پابند نہ بنائے، تو اس فرد یا جماعت کا یہ فعل دینی نقطۂ نگاہ سے گناہ تو کیا ذرہ برابر ناپسندیدہ بھی نہیں ہے، اس مسلک پر جو کوئی طنز کرتا ہے اُسے سمجھنا چاہیئے کہ اس طنز کی زد صحابہ اور تابعین پر جا کر پڑ رہی ہے! صدیوں سے اُمت کی اکثریت چونکہ فقہی مذاہب سے منسوب رہی ہے، اس لئے یہ مسلک جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، عام مسلمانوں کو "اجنبی" معلوم ہوتا ہے اور اس مسلک کے تصور سے انہیں وحشت سی ہوتی ہے، حالانکہ قرنِ اولیٰ میں یہ مسلک معروف رہا ہے۔ لہٰذا یہ مسلک وحشت کئے جانے کا مستحق نہیں ہے، اس کے حق میں ہونے میں کسی قسم کا شبہ نہیں کرنا چاہیئے!

تصویر کا ایک رُخ یہ ہے جو ابھی پیش کیا گیا ہے، دوسرا رُخ یہ ہے کہ اُمت کی اکثریت صدیوں سے فقہی مذہب سے منسلک رہی ہے اور آج بھی ہے اور اس انتساب و انسلاک بلکہ یوں کہیئے تقلید نے ان کے ایمان و اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا، جس طرح اہلِ حدیث اور غیر مقلدین مسلمان ہیں، اُسی طرح مقلدین بھی مسلمان ہیں، تقلید کا انکار کر کے نہ تو کوئی گروہ دین کے دائرے سے باہر جاتا ہے، اور تقلید کو مان کر، نہ کوئی جماعت کفر و شرک کی مرتکب ہوتی ہے۔

ائمہ فقہ کی حیثیت قرآنِ پاک کے بتلائے ہوئے "راسخون فی العلم" اور "اہلِ ذکر" جیسی ہے، جن کے قیاس و اجتہاد اور بیان کئے ہوئے مسئلوں پر اعتماد کیا جاتا ہے، اسی اعتماد کو تقلید کہتے ہیں! ائمہ فقہ کتاب و سنت کا علم رکھتے تھے، پاکیزگی و تقویٰ کے اعتبار سے بھی ان کا مقام بہت اونچا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو وہ اپنے لئے ذریعہ نجات و مغفرت سمجھتے تھے، فقہی مذاہب کتاب و سنت کی اتباع اور پیروی میں دینی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے وجود میں آئے ہیں۔ فقہی مذاہب نے مجموعی طور پر دین کی خدمت ہی کی ہے۔ دین سے انحراف نہیں کیا، جس طرح سُنتِ رسولؐ، کتاب اللہ کی تفسیر و تشریح ہے، اسی طرح فقہ، کتاب اللہ سنتِ رسولؐ اور آثارِ صحابہ کی تفصیل ہے، فقہاء کی دینی خدمات کا اعتراف نہ کرنا، حقیقت میں کفرانِ نعمت ہے!

ائمہ فقہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح مُطاع کوئی نہیں سمجھتا، در جو کوئی تقلید کے غلو کا شکار ہو کر ان کے اقوال کو نصوص سے ملا دیتا ہے، وہ خود فقہی مسلک کی مخالفت کرتا ہے، حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قابل فخر تلامذہ نے اپنے استاد کے متعدد اجتہادات اور قیاس و رائے سے اختلاف کر کے، تقلید جامد کے بُت کو پاش پاش کر دیا اور فقہ حنفی کے آغاز ہی میں یہ بات ظاہر کر دی کہ لوگ تقلید میں غلو نہ کریں، اور فقہی مذہب کے بانی اور سب سے بڑے امام تک کے اجتہاد و رائے کو سہو و خطا سے پاک نہ سمجھیں۔ اور کسی امام کے اجتہاد و رائے سے اختلاف کرنا کوئی شرعی گناہ نہیں ہے۔

تقلید کے سیدھے سادے مسئلہ کو افسوس ہے کہ "شرک و وجوب" کی دو انتہاؤں میں الجھا دیا گیا ہے تقلید حقیقت میں اُس اعتماد کا نام ہے جو کسی شخص کے علم و تجربہ اور اجتہاد و قیاس پر ہوتا ہے، اور اس سے کسی عنوان بڑے سے بڑے آزادیٔ فکر کے مدعی کو بھی مفر نہیں ہے، اگر یہ اعتماد جاتا رہے تو دنیا کا کاروبار چلنا مشکل ہو جائے۔ دنیا میں ہر شخص کے بس کی یہ بات نہیں ہے وہ کسی فن کے مطالعہ میں ساری عمر گزار دے اور اس کے بعد اس میں خود مجتہدانہ بصیرت پیدا ہو جائے، ہوتا یہ چلا آیا ہے اور ایسا ہونا عقل و فطرت کے عین مطابق ہے کہ کسی فن میں چند افراد مہارت اور بصیرت حاصل کرتے ہیں اور دوسرے لوگ ان کے تجربہ، مہارت، حذاقت، بصیرت اور تفقہ پر اعتماد کر لیتے ہیں، تقلید کا اس سے زیادہ شریعت میں اور کوئی درجہ نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہ ہوں یا امام مالک، امام شافعی ہوں یا امام احمد بن حنبل ان میں سے کسی نے نہ تو یہ دعویٰ کیا تھا کہ حق ہمارے ہی فقہی مذاہب میں سمٹ کر اور محدود ہو کر رہ گیا ہے، اور نہ یہ کہا تھا کہ ہم پر اعتماد اور ہماری تقلید کرنے کی یہ شرعی حیثیت ہے کہ جو کوئی ہماری تقلید کے دائرے سے باہر ہو جائے، اُسے نفاق و فسق کا مرتکب قرار دیا جائے۔

اس تمہید کے بعد "تقلید" کی ہمہ گیری اور اس کی اصل نوعیت کو سمجھئے۔ ایک بچہ جو کسی اہل حدیث کے یہاں پیدا ہوتا ہے، وہ کیا کرتا ہے؟ کیا نماز کے ایک ایک رُکن کے بارے میں کتاب و سنت سے تحقیق کرنے کے بعد نماز کی ہیئت متعین کرتا ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے والدین اور اعزاء کو دیکھ کر نماز پڑھتا ہے، یہ تقلید نہیں تو اور کیا ہے؟

اردو کی ایک کتاب ہے جو کسی سلفی المذہب عالم نے مرتب کی ہے، اس میں نماز کے اوقات لکھے ہیں، نماز کی رکعتوں کی تعداد لکھی ہے۔ رفع یدین کرنے اور آمین بالجہر کہنے کا ذکر درج ہے، نماز میں ہاتھ سینے پر کہاں باندھے جائیں، نماز میں کس ہیئت کے ساتھ کھڑا ہوا جائے۔ یہ تمام تفصیل اس کتاب میں ملتی ہے، کوئی شخص جو عربی سے قطعاً نابلد ہے اس کتاب کو پڑھ کر اور اُس کے مرتب کرنے والے پر اعتماد کر کے، اُسی ہیئت سے نماز ادا کرتا ہے، جو ہیئت اس کتاب میں درج ہے، اس اعتماد کو تقلید نہ کہا جائے گا تو اور کیا کہا جائے گا!

اُس شخص نے نماز کے کسی رکن کے بارے میں خود کوئی تحقیق نہیں کی، وہ یہ کتاب جسے پڑھ کر اس نے نماز سیکھی ہے، ظاہر ہے کہ اللہ اور رسول ؐ کی لکھی ہوئی، بھیجی ہوئی، وحی والقاء کی ہوئی یا بتائی ہوئی نہیں ہے اور جس انداز میں مجموعی طور پر اس کتاب میں نماز کے مسائل جمع کئے گئے ہیں، کتاب و سنت میں یہ مسائل اس طرح کہیں ایک جگہ جمع نہیں ہیں۔ اس عالم نے کتاب و سنت سے مسائل لے کر ایک کتاب میں مرتب کئے ہیں! اور اس شخص نے اس کتاب کے مرتب کرنے والے پر اعتماد کر کے اس عالم کی تقلید کی ہے!

اہل حدیث میں ہزاروں لاکھوں عوام ایسے ہیں، جنھوں نے کسی ایک مسئلہ کی بھی ساری عمر تحقیق نہیں کی، ان کے علماء نے جیسا اُن کو بتا دیا ہے یا اُن کے اسلاف سے ہوتا آیا ہے، اُسی کی وہ تقلید کرتے ہیں تو اہل حدیث کے عوام ہوں یا احناف کے عوام تقلید کے معاملہ میں دونوں کی ایک ہی پوزیشن ہے، عوام کی اکثریت نہ محقق ہوا کرتی ہے اور نہ مجتہد وہ نرے مقلد ہی ہوتے ہیں!

یہ بھی واقعہ ہے کہ جن اکابر پر کسی فرد یا جماعت کا اعتماد ہوتا ہے، ان کی طرف طبیعت کا میلان بھی زیادہ ہوتا ہے مثلاً ایک اہل حدیث کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے قول و عمل کی جتنی اہمیت ہوگی، اتنی اہمیت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول و عمل کی نہیں ہو سکتی

طبیعت کا یہ میلان جائز حدود میں رہے تو یہ کوئی گناہ کی بات نہیں ہے

ایک اور زیادہ واضح مثال :- امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے احادیث کو جانچ کر، پرکھ کر اور روایت و درایت کی کسوٹی پر کس کر، احادیث کا جو انتخاب کیا ہے، تو جو کوئی بھی صحیح بخاری کی صحت کا قائل ہے، وہ دراصل امام بخاری کے کمالِ انتخاب پر اعتماد رکھتا ہے، اور اس نے اپنی فکر و رائے کو احادیث کے انتخاب کے معاملہ میں امام بخاری کی مہارتِ نقد و انتخاب کا پابند اور مقلد بنا دیا ہے، یہ اعتماد اس بنا پر ہے کہ امام بخاری قدس سرہٗ احادیث کے پرکھنے میں کمال درجہ کی بصیرت رکھتے تھے وہ معصوم نہ تھے مگر عام طور پر احادیث کے انتخاب میں ان کے فیصلے صائب ہی ہوتے تھے، اُن میں اخلاص و تقویٰ بھی پایا جاتا تھا......

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر بھی احناف کے اعتماد کی یہی نوعیت ہے، یا بہت ہی محتاط لفظوں میں یوں کہئے کہ قریب یہی نوعیت ہے۔ "کسی پر اعتماد کر کے اس کی بات کو ماننا یا یوں کہیئے اس کی تقلید کرنا"۔۔۔۔۔۔۔۔ زندگی میں اس سے مفر ہے ہی نہیں اگر یہ کوئی جرم ہے تو یہ جرم سدا سے ہوتا آرہا ہے اور اس سے دامن بچایا ہی نہیں جا سکتا۔

فقہی مذاہب کی اس بحث کو دوسرے اہل فکر نے بھی چھیڑا ہے، اور ہم نے بھی دین کی خیر خواہی کے جذبہ کے تحت اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے، مقصد یہ ہے کہ فقہی مسائل میں جو نزاع برپا ہے۔ اس کی شدت کم ہو جائے اور ہر فقہی مسلک کے مقلد اپنے موقف اور اختلاف کی نوعیت کو سمجھ لیں، تمام فقہی مذاہب اور اہل حدیث بھی دین کے ایک ہی شجرِ طیبہ کی شاخیں ہیں، ان شاخوں میں یہ تو ہو سکتا ہے کہ کسی شاخ میں نرمی اور لچک زیادہ پائی جاتی ہو اور کسی میں صلابت زیادہ ہو مگر ان میں سے کوئی شاخ بھی دوسری شاخ کو اگر اُس درخت کی اصل سے جدا سمجھتی ہے۔ تو یہ رائے واقعہ کے خلاف ہے ان تمام فروع کی اصل ایک ہے۔

ممکن ہے کہ کوئی صاحب ہماری اس کوشش مصالحت و آشتی پر یہ طنز فرمائیں کہ ہم نے حق و باطل کے درمیان سمجھوتہ کرانے کی سعی کی ہے۔ جسے سعیٔ مشکور نہیں کہا جا سکتا، یہ اگر کسی کی رائے ہے تو سو فیصدی غلط رائے ہے، ایسی بات وہی شخص کہہ سکتا ہے، جو جارحانہ ذہنیت رکھتا ہو اور گروہی تعصب کی پٹیاں اس کی آنکھوں پر بندھی ہوئی ہوں، خیر پسند طبقہ کی طرف سے تو ہماری ان گزارشوں کا خیر مقدم کیا جانا چاہیئے!

کوئی برہم ہوتا ہے تو ہو جائے مگر جب فقہی مذاہب اور تقلید کا ذکر چھڑا ہے تو ہم اس حقیقت کو نہیں چھپا سکتے اور ان واقعات سے اغماض نہیں برت سکتے کہ فقہی مذاہب پر جتنا زیادہ زمانہ گزرتا گیا ہے۔ تقلید میں جمود اور شدت پیدا ہوتی چلی گئی ہے، تقلید میں یہ شدت نہ ائمہ فقہ کے نزدیک پسندیدہ تھی اور نہ ان کے تلامذہ نے اس پر عمل کیا تھا۔ بلکہ انھوں نے اپنے قول و عمل سے اس شدت جمود کی نفی کی تھی ایک طرف حق پسندی و روآزادیٔ فکر کا یہ عالم کہ امام ابوحنیفہؒ کے تلامذہ اپنے عالی مرتبت اُستاد اور امام کے اجتہاد سے کھُل کر اختلاف کرتے ہیں، دوسری طرف متاخرین علماء کی مرعوبیت کی یہ کیفیت رہی ہو کہ کسی مسئلہ میں ان کے استاد یا پیر و مُرشد سے فتویٰ دینے میں بھول چوک ہو گئی ہے، تو اس سہو و خطا کی سو سو طرح سے تاویلیں کی گئی ہیں، اور کھُلے دل سے اس غلطی کا اعتراف نہیں کیا گیا، تقلید کا یہی وہ جمود ہے جو فقہی مذاہب کے بانیوں کو مطلوب نہ تھا اور اُن کے شاگردوں نے تو عملاً اس جمود کی نفی کی ہے۔

یہ قول :-

"مرا از حدیث چہ کار، قول ابی حنیفہ بیار"

کس قدر جاہلانہ ہے، مگر ایک حنفی عالم کے سامنے جب ہم نے اس قول کو دُہرایا تو یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ وہ اس

لغویت سے اظہارِ بیزاری کرنے کے بجائے اس کی تائید میں فرمانے لگے۔

کون سا مسلک راجح ہے اور کون سا مرجوح ہے، یہ الگ بات ہے مگر "رفع یدین" اور "قرأت سورۂ فاتحہ خلف الامام" کوئی بے بنیاد مسئلے نہیں ہیں۔ احادیث میں ان کا ذکر ملتا ہے کسی کو نماز میں رفع یدین کرتے اور امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھتے دیکھ کر احناف کس قدر گھٹن، اجنبیت اور وحشت محسوس کرتے ہیں! "تقلید" کی یہ وہ کمزوریاں ہیں جن سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

اجتہاد کی ضرورت

گفتگو کا آغاز "رویتِ ہلال" سے ہوا تھا ہم "آغاز" ہی کی طرف لوٹ کر پھر عرض کرتے ہیں کہ تمدن و تہذیب کی ترقی نے بہت سے ایسے مسئلے پیدا کر دیئے، جن میں علماء کرام کو اجتہاد سے کام لینا ہوگا اور کام لینا چاہیے جو کوئی "اجتہاد" کا منکر ہے یا یہ سمجھتا ہے کہ اجتہاد کا دروازہ ہی سرے سے بند ہو گیا، جن کو اجتہاد کرنے کا حق تھا وہ پیدا ہو کر اجتہاد کر چکے اب اگر "اجتہاد" کی اجازت دے دی گئی تو اس سے دین میں طرح طرح کے فتنے اٹھ کھڑے ہوں گے ——— یہ شدتِ احتیاط شریعت کے منشاء کے خلاف ہے، جس کی کسی عنوان تحسین نہیں کی جا سکتی۔ "اجتہاد" کی ضرورت ہر زمانہ میں رہی ہے آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

اس سے بھی ہمیں سو فیصدی اتفاق ہے کہ اجتہاد کا حق ہر کس و ناکس کو نہیں دیا جا سکتا، اجتہاد انہی اربابِ فکر کو زیب دیتا ہے جو تقویٰ اور پاکیزگی کے ساتھ دین میں مجتہدانہ بصیرت بھی رکھتے ہوں، اجتہاد کا منصب نبوت کی طرح ہرگز ہرگز نہیں ہے، پچھلے مجتہدین نے وحی والہام کی بنا پر اس ذمہ داری کو قبول نہیں کیا تھا بلکہ انھوں نے اللہ کا خوف اور اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے اس منصبِ عظیم کا اپنے کو اہل سمجھا، اور اللہ کا نام لے کر اس کا آغاز فرما دیا۔ اُن کے اجتہادات امت کے سامنے آئے، تو ان کی دینی بصیرت اور مجتہدانہ فکر کو دیکھتے ہوئے، اُمت نے انہیں مجتہد مان بھی لیا۔

مثال کے طور پر آج "بینکنگ" کے نظام نے کتنی بہت سی ایسی صورتیں پیدا کر دی ہیں، جو فقہا کی توجہ کی محتاج ہیں اور جو صاحبانِ اجتہاد و افتاء کو پکار رہی ہیں کہ خدا کے لئے ہمارے بارے میں کوئی فیصلہ کرو، اس نوبت پر ہم اس بات کو واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ سارے دنیا کے مجتہدین اور علماء مل کر بھی، دین کے اصول میں کمی بیشی نہیں کر سکتے، اجتہاد اصول میں نہیں فروع میں ہوتا ہے، اُن مسائل میں جن کی واضح مثال کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ میں نہیں ملتی، اور اجتہاد دین کے کسی اصول کو توڑنے کے لئے نہیں بلکہ دین کے اصول کی حفاظت کے لئے کیا جاتا ہے، مجتہد سے بڑھ کر حدود اللہ کا محافظ و نگہبان اور کوئی نہیں ہو سکتا اب رہے بے راہ رو اور غلط کار لوگ تو وہ ہر دور میں فتنے اٹھاتے رہے ہیں، ان کی بے راہ روی، اور شر انگیزی کا سبب شریعت میں "اجتہاد" کی اجازت ہرگز نہیں ہے، شیطان نے جب فریب دیا ہے تو لوگوں نے نبوت کے جھوٹے دعوے کئے ہیں۔

ہاں! "بینکنگ" کی بات تو رہی جاتی ہے، بنک کے کاروبار میں اجتہاد کرنے سے کسی کو یہ دھوکا نہ ہو کہ معاذ اللہ "سود" لے لئے قیاس و اجتہاد کے ذریعے کوئی گنجائش نکالی جائے گی، جس چیز کو اللہ رسول نے حرام قرار دیدیا، اُس کو حلال و جائز سمجھنا اور اس کی حلت و جواز کے لئے حیلے تلاش کرنا کفر ہے! اگر ساری امت مسلمہ کے ایک ایک فرد کو "جوازِ سود" کے بعد مالی فراغت نصیب ہو جائے، تو بھی اُمت کے اس مادی فائدے کی خاطر "سود" کو حلال قرار دے کر، اللہ اور رسول سے لڑائی نہیں مول لی جا سکتی ——— ہم تصور سے کر دو بار اللہ کی پناہ! ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ "بنک کاری" (Banking) میں جو صورتیں ایسی ہوں، جن پر "ربوٰ" کا اطلاق نہیں ہوتا، یا جن ناجائز صورتوں کو جائز ہیئتوں میں تبدیل کیا جانا ممکن ہے ——— اُن پر کام ہونا چاہیے۔

حرفِ آخر

اجتہاد کا کام بڑی ذمہ داری کا کام ہے اور یہ منصب جتنا اہم ہے، ذمہ دارانہ اور عظیم ہے، اتنا ہی نازک بھی ہے۔ قرآن و سنت اور خاص طور سے فقہ اسلامی پر مجتہد کو عبور ہونا چاہیئے۔ شخصیتوں کا احترام لازمی ہے مگر حق کے معاملہ میں کوئی چیز صرف اس وجہ سے قبول نہیں کی جا سکتی کہ اس کو فلاں شخصیت سے نسبت حاصل ہے، بعض نسبتیں غلط بھی ہوتی ہیں!

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے سامنے جب وہ فیصلے اور احکام لائے گئے، جن کو حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے منسوب کیا گیا تھا۔ تو حضرت ابن عباس رض نے بہت سے فیصلے اور احکام قلمزد کر دیئے اور تھوڑے سے باقی بچے آپ ان احکام اور فیصلوں کو دیکھ کر کہتے جاتے تھے۔

"قسم خدا کی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کبھی ایسا نہیں کیا ہوگا۔ اور کیا تو انھوں نے غلطی کی۔"

فقہ میں مسائل کی جو فرضی صورتیں پائی جاتی ہیں، وہ کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے، وہب بن عمرو نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "کسی کام کے واقع ہونے سے پہلے اس کے احکام معلوم کرنے میں جلدی نہ کرو۔"

حضرت عبداللہ ابن عمر رض سے کسی شخص نے کوئی مسئلہ پوچھا، اس کے جواب میں آپ نے کہا۔

"مجھ سے وہ بات نہ پوچھ جو ابھی وقوع ہی میں نہیں آئی، میں نے اپنے والد عمر رض بن خطاب سے سنا ہے، وہ اس شخص کو ملامت کرتے تھے، جو ایسی بات کے متعلق سوال کرے جو ابھی واقع نہیں ہوئی۔"

فقہ میں جہاں اس قسم کے حیلے بھی پائے جاتے ہیں کہ شوہر اپنے مال و دولت پر حولِ کامل گزرنے سے پہلے اپنا مال و دولت بیوی کو ہبہ کر دے وہ زکوٰۃ سے بچ جائے گا، اس قسم کے حیلوں سے بچنا چاہیئے!

پھر اس حقیقت کو بھی سامنے رکھنے کی ضرورت ہے کہ فنِ حدیث کی طرح فقہ کی جانچ پڑتال نہیں ہوئی، حدیث میں جس طرح راویوں کا ضعف اور روایتوں کی علتیں ظاہر کی گئی ہیں اور صحت و ضعف کے اعتبار سے حدیث کی کتابوں کے درجے مقرر کئے گئے ہیں، فقہ کی کتابوں پر یہ کام نہیں کیا گیا، اس لئے علماء کے فتاوی پر ناقدانہ نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔

فقہ حنفی میں، شوہر کے مفقود الخبر ہونے کی صورت میں فقہ شافعی کے مسلک پر عمل کیا جاتا ہے، یہ چیز بتاتی ہے کہ دوسرے فقہی مذاہب کے مسائل کہ جن میں سہولت اور توسع پایا جاتا ہو حنفی فقہ میں قبول کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا "اجتہاد" میں بھی یہی مسلک اور فکر کار فرما رہنی چاہیئے۔ جب تمام فقہی مذاہب حق میں، تو پھر حلِ مشکل اور سہولت کار کے لئے "حق" ہر جگہ سے لیا جا سکتا ہے۔

آج سے چالیس برس قبل ہندوستان کے اکثر علماء، ولایت کی بنی ہوئی روشنائی، نب اور سفید چکنے کاغذ کی جگہ، واسطی قلم، سیاہی اور بادامی کاغذ استعمال فرماتے تھے۔ حالانکہ صحابہ کرام رض نہ واسطی قلم سے لکھتے تھے، نہ چینی کی دواتیں ان کے پاس تھیں اور نہ مصطفائی روشنائی وہ استعمال فرماتے تھے ——— مگر اس روش کو علماء زیادہ دن تک نہ نباہ سکے، اب تو وہ ہولڈر نہیں فاؤنٹین پین کسی کراہت کے بغیر استعمال کرتے ہیں۔

جس واقعہ کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ اگرچہ سامنے کی چھوٹی سی بات ہے مگر ایجادات اور نئی چیزوں کے معاملہ میں اسی ذہنیت نے نماز میں لاؤڈ اسپیکر کو ناجائز قرار دیا۔ ریڈیو کو آلہ لہو بتایا، انگریزی جوتہ کی حرمت کا فتویٰ دیا اور منی آرڈر کو سود بتا کر، اس کو بھی ناجائز ٹھہرا دیا۔

یہ چند اشارے اس غرض سے کئے گئے ہیں کہ مجتہدین کے سامنے فقہی کتابوں اور فقہا کی عظمت و مرتبت کے ساتھ اُن کے یہ عادات اور مزاج و ذہنیت بھی پیش نظر رہنے چاہئیں۔ ارباب فکر و تحقیق اور صاحبان اجتہاد کے لئے یہ امر لازمی ہے کہ ارباب فن کے

کمزوری و محاسن کے ساتھ ان کی کمزوریوں پر بھی نگاہ ہے!

اس حقیقت، ذمہ داری، خشیت و تقویٰ، تجربہ و بصیرت اور فہم و دانش کے بعد مسائل کی تطبیق، تشکیل اور قیاس واجتہاد
جو نتائج برآمد ہوں گے، وہ ایک طرف اُمتِ مسلمہ کو آسانیاں اور سہولتیں بہم پہنچائیں گے اور دوسری طرف دنیا کی دوسری قومیں اس
اعتراف لینے پر مجبور ہوں گی کہ اسلام سے بڑھ کر حرکت و نمو اور کسی مذہب میں نہیں پائی جاتی، اور یہ دین زندگی کی قدروں کا ہر د
میں محافظ و امین رہے اور یہی دین فطرت اور دین کامل کے سایہ میں انسانیت کو امن و عافیت میسر آسکتی ہے اور انسانیت پروان
چڑھ سکتی ہے۔

ماہرالقادری
۱۵ اپریل ۵۹ء

فاران کے معرکہ آرا "توحید نمبر"

کا

نقشِ اوّل

کتابی صورت میں "نقشِ توحید" کے نام سے چھپ گیا ہے

شرک وبدعت

کے رد میں یہ کتاب عظیم الشان بُرہان ہے

قیمت مجلد ایک روپیہ چھ آنے

غیر مجلد ایک روپیہ، علاوہ محصول ڈاک

مکتبہ فاران کراچی سے طلب فرمایئے

طاہر القادری

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

کتنا ہی ثقہ اور قابلِ اعتماد مصنف کیوں نہ ہو اس کی لکھی ہوئی کتاب پڑھتے وقت ذہن و فکر میں کچھ شکوک اور سوالات ضرور ابھرتے ہیں۔ جن میں بعض شکوک غور و فکر کے بعد دور ہو جاتے ہیں اور کچھ سوالات کھٹکتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات قاری کا ذہن یہ فیصلہ کرتا ہے کہ کوئی آدمی بھول چوک، نسیان اور سہو و خطا سے محفوظ نہیں ہے مصنف سے بھی کوتاہی ہو گئی ہوگی۔

قاری اگر کثیر المطالعہ ہے، مسائل میں گہری نظر رکھتا ہے اور اس کے فیصلہ کی قوت بھی محکم و مستقیم ہے تو بعض اوقات کتاب پڑھتے ہوئے وہ مصنف کی غلطیوں پر احتساب کرتا جاتا ہے۔

دنیا کے کسی مصنف، انشاء پرداز اور قلمکار نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس کی لکھی ہوئی کتاب کا حرف حرف سہو و خطا سے پاک ہے اور اس میں ذرہ برابر بھول چوک نہیں ہوئی......... ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ کا دعویٰ صرف "کتاب اللہ" یعنی قرآن کریم کے نازل کرنے والے نے کیا ہے کہ اس کتاب میں کسی قسم کے شک و شبہ کا شائبہ بھی موجود نہیں ہے، اس میں جو بات بیان کی گئی ہے وہ سو فیصدی درست ہے۔ رائی کی نوک کے برابر بھی کہیں جھول نہیں ہے۔ تاریخی قصص ہوں، محکمات اور متشابہات ہوں، بشارتیں اور ڈراوے ہوں، ارض و سموات کی تخلیق کا ذکر ہو، جنت و دوزخ، حور و غلمان اور کوثر و تسنیم کی تفصیل ہو، اوامر ہوں یا نواہی ہوں، غرض کتاب اللہ کی ہر بات، ہر آیت، ہر لفظ اور ہر حرف اپنی جگہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ جس میں شک و شبہ کی ذرہ برابر گنجائش نہیں ہے۔

دنیا میں کروڑوں کتابیں پائی جاتی ہیں۔ انبیاء کرام پر صحیفے اور کتابیں بھی نازل ہوئی ہیں۔ جن پر ہم ایمان رکھتے ہیں مگر یہ سب کتابیں "ہیں" الکتاب (THE BOOK) صرف قرآن کریم ہے جو محمد عربی (علیہ الصلوٰۃ والتسلیم) پر نازل ہوا۔ یہی وہ "الکتاب" ہے جو لاکھوں سینوں میں حرف بحرف محفوظ ہے اور جس کے ایک شوشے نے بھی کسی تحریف، کمی بیشی اور آمیزش کو گوارا نہیں کیا۔ اور وقت کا کوئی لمحہ نہیں گزرتا جس میں دنیا کے پردے پر کہیں نہ کہیں یہ کتاب "تلاوت" نہ کی جاتی ہو۔

اس "الکتاب" میں کوئی بات ظن و تخمین سے نہیں کی گئی، اس میں ذرہ برابر ہیر پھیر نہیں، کوئی قیاس اور گمان نہیں، جس طرح دو اور دو چار (۲ + ۲ = ۴) ہی ہو سکتے ہیں اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتے، اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کی ہوئی کتاب کا کوئی لفظ بھی حق و صداقت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس کتاب میں بال برابر بھی سہو و خطا کا امکان نہیں۔ جو کوئی اس کتاب کو پڑھنا چاہے وہ بے یقینی، تردد، شک و شبہ اور بدگمانی سے دل کو پاک کر کے اس کتاب کو پڑھے۔ اگر اس کتاب کو پڑھتے ہوئے ذہن میں کوئی شبہ ابھرتا ہے تو پڑھنے والے کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ کی کتاب میں ذرہ برابر شک و ریب کی گنجائش نہیں ہے، یہ خود میرے نفس کی خامی، ذہن کی نارسی اور فکر کی کوتاہی ہے جو شک و شبہ بن کر ابھر رہی ہے.......

اگر کوئی قاری دل کے شبہ اور ذہن کے خطرے کو دور کرنے کے لئے یہ ترکیب اختیار کرے گا تو اس کے اندر یقین کی کیفیت پیدا ہو گی۔ اس کی فکر اللہ کے کلام سے ہم آہنگ ہوتی چلی جائے گی۔ یہاں تک کہ نہ روح کے بارے میں وہ کسی شک میں مبتلا ہو گا، نہ عرش و کرسی اور سدرۃ المنتہیٰ کا تصور اسے الجھن میں ڈالے گا، نہ آخرت کے بارے میں وہ شک کرے گا۔ نہ ملائکہ اور ابلیس کا وجود لئے گھومے گا، نہ غیبی

پر سے حیرت ہوگی اور نہ اصحاب کہف کا واقعہ اس کو مضطرب بنائے گا

قرآن کریم اپنے پڑھنے والے سے اسی قسم کے یقین و ایمان کا مطالبہ کرتا ہے۔ مبارک ہے وہ قلب جس کو قرآن کریم کے بارے میں اطمینان کامل اور یقین جازم نصیب ہو۔

اس احتیاط اور اہتمام کے باوجود اگر قرآن کریم کی کسی آیت پر ذہن میں کوئی کھٹک اور شبہ پیدا ہو تو قاری کو چاہیے کہ وہ اہل ذکر و راسخون فی العلم سے دریافت کرے۔ انشاء اللہ علماء حق اس کی تشفی اور تسلی کر دیں گے۔ اور اگر اس پر بھی کھٹک دور نہ ہو تو وہ اس کھٹک کو اپنے ہی ذہن کی خامی سمجھتے ہوئے قرآن پاک کی تلاوت کو جاری رکھے۔ انشاء اللہ قرآن ہی کی کسی آیت سے اس کے ذہن کی یہ کھٹک دور ہو جائیگی۔

شک کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ شک ہے کہ جس کے ذہن میں ابھرتے ہی دل اس میں لطف لینے لگتا ہے۔ اور اس ایک "شک" سے نہ جانے کتنے "شبہات" پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور ذہن شکوک و شبہات کا جال بنتا چلا جاتا ہے۔ اس قسم کا شک دراصل شیطان کا ڈالا ہوا وسوسہ ہے جو آدمی کو کفر و الحاد کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ تشکیک کے تسلسل کا انجام بے یقینی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ذہن و فکر کو اس بیماری سے محفوظ رکھے۔

دوسری قسم کا "شک" وہ ہے کہ ذہن میں اس کے ابھرتے ہی قاری سخت وحشت، اذیت، گھبراہٹ اور بے چینی محسوس کرتا ہے۔ اس کے دل میں جونک سی لگتی ہے۔ کہ یہ شبہ آخر پیدا کیسے ہوا ۔۔۔ کہیں اس شک کے ابھرنے اور اسکی کھٹک کے پیدا ہو جانے سے میرا ایمان غارت نہ ہو جائے۔ جس طرح ایک حاملہ عورت درد زہ سے بے چین ہو کر بچہ جننے کے لئے بیتاب رہتی ہے اور بچہ کی ولادت کے بعد سے سکون حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کا قاری بھی اپنے دل کی کھٹک دور ہو جانے کے لئے بیتاب و بے چین رہتا ہے۔ وہ اس کے لئے تفاسیر دیکھتا ہے، علماء سے پوچھتا پھرتا ہے۔ خود اپنے ذہن سے کسی ایسی تاویل کی کوشش کرتا ہے جس سے اسکو اطمینان و یقین حاصل ہو۔ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں کرتا ہے کہ میں یہ کس خلجان میں مبتلا ہو گیا۔ یا اللہ! میرے دل کی کھٹک کو اپنے کرم سے دور فرمائیے۔ جانتا ہوں کہ یہ میری عقل کی خامی کا قصور ہے اور میرے ذہن کی کوتاہی اس کا سبب ہے، مگر میں کیا کروں، یہ کھٹک تو میرے دل کو اندر ہی اندر کچھ کھائے جا رہی ہے۔ اس کوشش کے بعد ایک وقت وہ آتا ہے کہ اسکے دل کی یہ کھٹک دور ہو جاتی ہے اور اسکا یقین اور زیادہ مضبوط و محکم ہو جاتا ہے۔

قرآن کے جس پڑھنے والے نے "شک" کو غذا دی اور "کھٹک" کو پروان چڑھایا وہ ہلاک ہو گیا۔ جس نے اس سپولئے (شک) کا پیدا ہوتے ہی سر کچل دیا، اس نے فلاح پائی۔

قرآن پاک کی تلاوت کا یہ معجزہ ہے کہ وہ ذہن و فکر کو ہموار بناتی ہے اور الجھنوں کو دور کرتی ہے۔ میں اپنا ایک ذاتی واقعہ بیان کرتا ہوں، جب میں نے یہ حدیث پڑھی کہ: "مجھے یونس بن متی پر فضیلت نہ دو" تو دل میں یہ الجھن پیدا ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام جیسے اولو العزم پیغمبروں کو چھوڑ کر تنہا حضرت یونس علیہ السلام کے لئے یہ کیوں فرمایا۔ اس میں کیا مصلحت اور کیا حکمت ہے؟ اللہ کا فضل شامل حال رہا کہ ذہن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کے اعتبار و استناد میں کسی قسم کا شک نہیں کیا مگر ذہن میں ایک الجھن سی ضرور رہی۔ اب سے پانچ سال قبل مجھے زیارت حرمین شریفین کی سعادت نصیب ہوئی۔ ایک دن میں مسجد نبوی میں قرآن پڑھ رہا تھا، اس دوران میں جب وہ آیت آئی، جسکا مفہوم یہ ہے کہ "صاحب حوت کی طرح نہ ہو جانا" تو فوراً دل کی وہ کھٹک دور ہو گئی یعنی یہ کہ اس آیت کو پڑھ کر جس میں حضرت یونس علیہ السلام کا اضطراب ظاہر کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ قرآن کے کسی پڑھنے والے کے ذہن میں حضرت یونس علیہ السلام کی شخصیت کے بارے میں کوئی "کھٹک" پیدا ہو جائے، اس سے بچانے کے

لئے ضبط وحی و قرآن علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انتباہ فرمایا کہ "مجھے یونس بن متی پر فضیلت نہ دو"۔

آدمی صبر و اطمینان اور ایمان و عقیدت کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرتا رہے اور اسے زندگی کا معمول بنالے، اور قرآن کی حدود میں رہ کر غور و فکر کی مشق کو بھی جاری رکھے تو ذہن و فکر کی الجھنیں دور ہوتی رہیں گی، اور اس کی فکر کتاب اللہ کی روح سے ہم آہنگ ہو جائے گی۔

اللہ تعالیٰ کے کلام کی دعوت، اس میں غور و فکر اور عمل کرنے کا سارا معاملہ ہی عقیدت، محبت، نیازمندی، عبودیت اور یقین و ایمان سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ کیفیت دل میں نہ ہو تو قرآن پڑھنے والا، بلکہ اس کی ریسرچ کرنے والا بھی، رٹنے اور پڑھنے کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ قرآن تو اپنے ایسے پڑھنے والوں کو چاہتا ہے کہ قرآن پڑھ کر اور سن کر جن کے دل ہل جائیں اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگیں ؎

صدائے کہ رخشد بہ ویرانہ خوشتر

ز چشمے کہ پیرایۂ نم نہ دارد!

ہر بڑے سے بڑے شاعر سے "اظہار و بیان" میں کہیں نہ کہیں غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ غالبؔ سے بھی بھول چوک ہوئی ہے اور اس کے بعض شعروں میں خاصا اغلاق بلکہ اہمال پایا جاتا ہے، مگر جو لوگ غالبؔ سے عقیدت رکھتے ہیں وہ غالبؔ کے متعلق سے مغلق شعر کی تاویلیں بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ان کا دل یہ چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح غالبؔ کا یہ شعر، جس پر لوگ اعتراض وارد کر رہے ہیں، درست اور بامعنی تسلیم کر لیا جائے۔ جب غالبؔ کے ساتھ عقیدت ایک آدمی کو اس حد تک لے جاتی ہے تو وہ خدا جس کی ذات ہر قسم کی کمزوری اور عیب سے پاک ہے کیا اس کا کلام اس کا مستحق نہیں کہ اس کے بارے میں صحت و اصابت اور حق و صداقت ہی کا عقیدہ رکھا جائے۔ اور ذہن میں کوئی الجھن پیدا ہو تو اسے اپنی عقل کی کوتاہی اور فہم کے نقص پر محمول کیا جائے۔ اور اس الجھن اور کھٹک میں لطف آنے کے بجائے اس سے وحشت ہو، بلکہ اذیت محسوس ہو، یہاں تک کہ یہ کھٹک دور ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ نے "الکتاب" (قرآن کریم) کی حفاظت فرمائی۔ اور اس کے ایک شوشہ کو بھی ادھر سے ادھر نہ ہونے دیا۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی حکمت ہے کہ جو نفوس قدسیہ قرآن کریم کے حاملین تھے انہی نے حیطۂ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مطہرہ کی حفاظت کی، اسے یاد رکھا، اس پر عمل کیا، اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ امت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لہجہ (قرأت) تک کو محفوظ رکھا۔ کوئی شک نہیں "الکتاب" اور وہ جس پر "الکتاب" نازل ہوئی اس کی سنت، یہ دونوں چیزیں (کتاب و سنت) جو دین کا ماخذ ہیں، محفوظ ہی رکھنے کے قابل تھیں۔ کہ انہی دونوں ستونوں (کتاب و سنت) پر دین کی عمارت قائم ہے، اور کوئی مسلمان ان میں سے کسی ایک کا بھی نسخ کسی قیمت پر گوارا نہیں کر سکتا۔

آؤ پورے اطمینان، وثوق اور یقین کے ساتھ پڑھیں:- الٓمٓ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ بیشک اللہ کی کتاب میں ذرہ برابر شک نہیں ہے ——— یا اللہ! اس یقین میں کبھی کوئی فرق نہ آنے دیجیو۔ اسی عالم میں موت آئے کہ تیری "کتاب" کی صداقت سے دل کا گوشہ گوشہ معمور ہو ——— (آمین) ٭

ڈاکٹر جاوید اقبال

ادب - قوم پرستی اور لادینیت

۳۱ جنوری سنہ ۵۸ء کو آل پاکستان رائٹرس کونشن کراچی میں منعقد ہوا تھا، یہ مقالہ اس کے آخری اجلاس میں جناب جنرل محمد ایوب خاں صدر مملکت پاکستان کی موجودگی میں فاضل مقالہ نگار نے پڑھا تھا۔ علامہ اقبال مرحوم کے فرزند سے علمی دنیا اسی قسم کے اسلامی تصورات اور دینی افکار کی توقع رکھتی ہے۔

اسلام گزشتہ تاریخ میں اپنی دینی عظمت کے دنیوی اظہار کے لئے بارہا اپنا مخصوص معاشرتی نظام معرض وجود میں لایا ہے۔ پاکستان بھی اسی لئے منصۂ شہود پر آیا کہ اسلام کو برصغیر ہند میں اپنے مخصوص معاشرتی نظام کے قیام کے لئے ایک ریاست درکار تھی۔ پاکستان اس لئے معرض وجود میں نہیں آیا کہ ایک ریاست اسلامی نظام زندگی کی خواہاں تھی۔ پاکستان کے قیام کے لئے عملی جدوجہد کا آغاز سنہ ۱۹۴۰ء سے ہوا لیکن کیا آپ نے کبھی یہ سوچا ہے کہ اس جدوجہد میں ملت کے ادیبوں نے بحیثیت ایک گروہ کیا خدمات انجام دیں؟ ادیب کے بیشتر فرائض میں سے ایک فرض یہ بھی ہے کہ جس ملت میں وہ پیدا ہوا ہو اس سے وفاداری کا دم بھرے۔ اسے اس کے مسائل سلجھانے میں مدد دے یا اسے ایسے جامع نظریے پیش کرتا ہے جن کے اطلاق سے وہ اپنی اجتماعی زندگی کی مشکلات کا حل تلاش کر سکے لیکن بدقسمتی سے ہمارے ادیبوں نے اس سلسلہ میں کوئی نمایاں خدمت تاحال انجام نہیں دی۔ لہٰذا پاکستان کو نظریات کے فقدان کی وجہ سے بیحد نقصان پہنچا ہے۔

عموماً ملکوں کی تباہی کا باعث حوادث قرار دیئے جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں گزشتہ دس برس کے عرصہ میں یہ حوادث سیاستدانوں کی صورت میں رونما ہوئے۔ اس دور میں اصطلاح "سیاست" کے معنی سازش، عیاری یا جعلسازی ٹھہرے اور "نصب العین" سے مراد اپنے حریف کو کرسی اقتدار سے گرانا یا اسے نیچا دکھانا لیا گیا۔ نتیجتاً ملت مایوسی، ناامیدی، بے بسی اور لاچاری محسوس کرنے لگی۔ اور پاکستان بے یقینی، بے اطمینانی، بے اعتمادی اور بے چینی کے تاریک دور سے گزرا۔ بہرحال حالیہ انقلاب نے ہمیں گرنے سے بچا لیا ہے، اور ہم ایک بار پھر اس مقام پر آکھڑے ہوئے ہیں جہاں سے ہم نے ابتدا کی تھی۔ اب ناامید اور مایوس بن کر بیٹھ رہنے کی بجائے ہمیں چاہیئے کہ اپنی تخلیقی اور تعمیری صلاحیتوں کو بیدار کریں۔ اور اپنے فن کو ملت کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دیں۔ تاکہ پاکستان ایک درخشاں مستقبل کی توقع رکھ سکے۔

اسلام کے لئے ملت کی اہمیت کیا ہے؟ اندازہ لگایئے کہ سنہ اسلامی کی ابتدا تب ہوتی ہے جب کہ پیغمبر اسلام چند مسلمانوں کی معیت میں مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ پہنچتے ہیں اور وہاں ایک ایسا معاشرتی نظام قائم کرتے ہیں جو سیاسی لحاظ سے قطعی آزاد اور خود مختار ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں سنہ ہجری اس وقت شروع ہوا یا اسلامی تاریخ کی ابتدا تب ہوئی جبکہ اسلام نے اپنے مخصوص معاشرتی نظام کے قیام کے لئے ایک ریاست حاصل کر لی تھی۔ سنہ ہجری، سنہ عیسوی کے برعکس، پیغمبر اسلام کے یوم پیدائش سے شروع نہیں ہوتا۔ نہ ان کے یوم وفات سے شروع ہوتا ہے۔ نہ اس وقت سے جبکہ پیغمبر اسلام پر قرآن مجید نازل ہونا شروع ہوا۔ یہ تاریخی حقیقت اس امر کی شاہد ہے کہ ہر مسلمان کی انفرادیت اسکے ایک بے مثل جماعت کے رکن ہونے میں مضمر ہے۔ کسی بھی مسلمان کو اگر ملت اسلامیہ سے منقطع کرکے دیکھا جائے تو اس کی کوئی انفرادی

حیثیت نہیں رہتی۔ شاعر، ادیب یا فنکار اگر ملت سے وفاداری کا دم بھرنے کی بجائے اپنے فن سے وفاداری کا دم بھرے تو ملت اسکے فن سے مستفید نہ ہو سکے گی۔ اور جس فن سے ملت مستفید نہیں ہو سکتی وہ فن دیرپا نہیں ہو سکتا۔ وقت اسے آپ معدوم کر دے گا۔ مسلم نے جس تمدن کی تخلیق و تعمیر کی۔ اسکی امتیازی خصوصیت اسکا اسلامی ہونا ہے۔ اسلامی ادب، اسلامی فنون لطیفہ، اسلامی تاریخ، اسلامی فلسفہ اسلامی اخلاقیات، اسلامی تصوف، اسلامی دینیات غرضیکہ ہر وہ فن جس نے دنیائے اسلام میں نشوونما پائی، اسلام سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

وہ شاعر یا ادیب جو اپنے فن سے وفاداری کا دم بھرتے ہوئے ملت سے لاتعلق ہو جائیں ان کے لئے یا ان کے فن کے لئے اسلام میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید کی سورۃ شعراء میں ایسے شاعروں اور ادیبوں کی مذمت اور تذلیل کی ہے۔ لیکن وہ شاعر اور ادیب خدا کو عزیز ہیں جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے: "اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَکَرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا" پیغمبر اسلام نے اپنی زندگی میں ادبی تنقید کا ایک معیار قائم کیا اور ہر وہ شاعر یا ادیب جس نے اپنا فن ملت کی خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا اسے تحسین کی نگاہ سے دیکھا۔

اٹھارہویں صدی کے اختتام پر داخلی کمزوریوں کی وجہ سے دنیائے اسلام کے بیشتر حصوں پر مغربی نوآبادیاتی طاقتیں مسلط ہو گئیں مغرب سے براہ راست تعلق کے باعث جو نئے نظریات دنیائے اسلام میں در آئے ان میں سب سے زیادہ نمایاں "قوم پرستی" "نیشنلزم" اور "لادینیت" (سیکولرازم) کے غیر اسلامی نظریئے تھے۔ اسلام چونکہ بجائے خود جامد نہ تھا، اس نے ان خارجی نظریات کو ایک منفعل قبول کنندہ کی حیثیت سے قبول نہ کیا۔ بلکہ جدید نظریے صرف اس حد تک قبول کئے گئے جس حد تک اسلام ایک زندہ اور متحرک قوت کے اعتبار سے انھیں اپنے اندر جذب کر سکتا تھا۔ انیسویں صدی کے اسلامی ہند کے شاعروں، ور ادیبوں نے اس سلسلہ میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ انھوں نے اسلامی ہند کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اپنا فن ملت کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دیا۔ انیسویں صدی کے اسلامی ہند میں مولانا حالی کو ممتاز مقام اسی لئے حاصل ہے کہ انھوں نے ملی ادب کی بنیاد رکھی۔ یہی ملی ادب بیسویں صدی کے اوائل میں علامہ اقبالؒ کے ہاتھوں ایک ایسے مقام پر پہنچی جس کی مثال کم از کم اسلامی ہند کی تاریخ میں ملنا محال ہے۔

بیسویں صدی کے مسلمان کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ مغربی نظریات کی پیداوار ہے سراسر غلط ہے۔ جدید مسلمان نے خارجی اثرات صرف اس حد تک قبول کئے ہیں جس حد تک اسلام نے انھیں اپنے اندر جذب کیا، اس سے زائد نہیں، کیونکہ جدید مسلمان مغرب سے کہیں زیادہ اسلام سے متاثر ہوا ہے۔ اور وقت کے نئے تقاضوں کے پیش نظر دن بدن مزید متاثر ہو رہا ہے۔

جہاں تک مغربی تصور "لادینیت" یا سیکولرازم کا تعلق ہے اسے جدید مسلمان قبول نہیں کر سکا۔ کیونکہ یہ اصول مسیحیت میں روح اور مادہ کی بنیادی دوئی کے باعث ظہور میں آیا۔ اور اسی کی وجہ سے مغربی ممالک کے باشندے کی اجتماعی زندگی یعنی ان کی ریاست سے دین بالکل خارج ہو گیا۔ البتہ محض نظم و نسق کی سہولتوں کی خاطر اسلامی ریاست میں شعبۂ دینیات کو دوسرے شعبوں سے الگ رکھنا جدید مسلمانوں کے لئے کوئی نیا تصور نہیں کیونکہ اس کی مثالیں تاریخ اسلام میں موجود ہیں۔ جدید مسلمان ایسے کسی اصول کو قبول کرنے کا خیال تک بھی نہیں کر سکتا کہ جسکا مقصد ملت کی اجتماعی زندگی سے اسلام کو خارج کرنا ہو۔

اسی طرح جدید مسلمان نے "قوم پرستی" کے نظریے یا نیشنلزم کو بھی اسکی مغربی ہیئت میں قبول نہیں کیا۔ کیونکہ اسلام ایسے اصول کے خلاف ہے، جو انسانی اتحاد کی بنیاد خالصتہً نسل، رنگ، ذات پات، زبان یا علاقائی حدود پر رکھے۔ دراصل یہ اصول سیاسی مسلک کی حیثیت سے جو دعویٰ کرتا ہے۔ وہ اسلامی تعلیمات کے سراسر برعکس ہیں۔ البتہ حب وطن، یعنی اپنے وطن، اعتقادات، تاریخی روایات یا

تمدن کی خاطر جان تک قربان کر دینے کا جذبہ جدید مسلمان کے "ایمان" کا لازمی جزو ہے۔ اسلام کا بنیادی اصول توحید ہے، جو مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک توحیدی کیفیت پیدا کر دینا چاہتا ہے۔ پس جدید اسلامی ممالک کو "قوم پرستی" کی بجائے "مسلم قوم پرستی" کے اصول نے متاثر کیا۔ اس اصول سے مراد ان لاتعداد قوموں کی سیاسی آزادی لی گئی جو مختلف زبانیں بولنے کے باوجود اسلام پر ایمان رکھتی ہیں۔ اور ان علاقوں میں آباد ہیں جو بحیثیت مجموعی دنیائے اسلام کہلاتی ہے مگر اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ یہ سیاسی آزادی مساوات اور اخوت کے اسلامی اصولوں سے متصادم نہ ہونے پائے۔ کیونکہ یہ دونوں اصول مسلمانوں کے دین اور تمدن کی روح ہیں۔ آج ایرانی "قوم پرستی" خالصتاً شیعہ مسلم قوم پرستی ہے عربی "قوم پرستی" کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ عربیت ان کی تحریک کو اسلام سے جدا کر دینا ناممکن ہے۔ .. انڈونیشیائی قومیت کا رتبہ صرف انڈونیشین مسلمان کو حاصل ہے، ترکیہ میں بھی ترکی قومیت کا رتبہ صرف ترکی مسلمان کو حاصل ہے، یہودی اور عیسائی ترکوں کو وہ رتبہ حاصل نہیں۔ سنہ ۱۹۵۵ء میں استنبول کے بلوؤں نے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں کر دی ہے کہ ترک مسلمان غیر اسلامی عناصر کو ترک "قوم پرستی" یا نیشنلزم کے اصول کے ماتحت اپنے اندر جذب کرنے پر تیار نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ جدید دنیا کے ہر اسلامی ملک میں "قوم پرستی" کا اصول اپنی مغربی حیثیت میں نہیں بلکہ "مسلم قوم پرستی" کے اصولوں کی صورت میں نمودار ہوا ہے

آج ایک طرف تو انسان تسخیر کائنات کے لئے عملی منصوبے بنانے میں مصروف ہے اور کوئی عجب نہیں کہ اس صدی کے اختتام تک وہ قمر، مریخ، مشتری یا زہرہ ایسے کسی سیارے تک جا پہنچے۔ دوسری طرف اسی انسان نے اپنی تباہی اور ہلاکت کے لئے ایسے آلے بھی ایجاد کر لئے ہیں کہ ہر کوئی لرزہ براندام ہے۔ غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ انسانی تاریخ کے اس ہولناک دور میں جس میں سے ہم سب گزر رہے ہیں۔ کیا مغربی قومیں "قوم پرستی" اور "لادینیت" کے اصولوں پر قائم رہ سکیں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اصول جو پچھلی دو صدیوں میں یورپ سے ایشیا میں پھیلا ہے، آج یورپ خود انہی اصولوں سے خوفزدہ و ہراساں ہے۔ یورپی قوموں کو احساس ہو چکا ہے کہ نسلی، لسانی اور علاقائی حدود پر انسانیت کی تقسیم تباہ کن ہے۔ اسی بنا پر وہ ایک دوسرے سے رابطۂ اتحاد قائم کرنے کی فکر میں ہیں۔ اور اس غرض کے لئے مسیحیت کا احیاء عمل میں لانے کی کوشش کر رہی ہیں۔

پاکستان کے تخیل کی بنیاد "مسلم قوم پرستی" کے اصول پر رکھی گئی اور اسی اصول کی تشریح کے لئے برصغیر ہند میں "دو قوموں کا نظریہ" پیش کیا گیا۔ بیشتر معترضین الزام لگاتے ہیں کہ یہ نظریہ قائد اعظم محمد علی جناح کے ذہن کی اختراع تھی۔ اور اس کا مسلمانان ہند کی تاریخ میں کوئی وجود نہیں ہے حالانکہ یہ مسئلہ اسی وقت پیدا ہو گیا تھا جبکہ مسلمان محمد بن قاسم کی زیر قیادت بحیثیت فاتح ہندوستان میں وارد ہوئے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کی ایک دوسرے سے بے تعلقی کے سلسلہ میں آپ کے سامنے البیرونی کی مشہور و معروف تصنیف "کتاب الہند" میں سے چند اقتباسات پڑھ کر سنانا چاہتا ہوں۔ البیرونی سلطان محمود کی معیت میں نویں صدی کے اختتام پر ہندوستان آئے۔ اپنی تصنیف میں ہندوؤں کی عادات اور رواجات کا مسلمانوں کی عادات اور رواجات سے مقابلہ کرتے ہوئے وہ تحریر کرتے ہیں:-

> "کوئی شخص یہ بھی خیال کر سکتا ہے کہ انھوں نے (ہندوؤں نے) سمجھ بوجھ کر اپنے اندر مخالفانہ تبدیلی پیدا کی کیونکہ ہمارے رسم و رواج ان کے رسوم و رواج سے میل نہیں کھاتے بلکہ ان کے برعکس ہیں، اور اگر کہیں کوئی رسم ہماری رسم سے مطابقت رکھتی ہے تو معنوی اعتبار سے اس کے معنی ہماری رسم کے معنی کی ضد ہے۔"

پھر البیرونی ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک دوسرے سے علیحدگی اور بے تعلقی کی وجوہات بیان کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:-

"ان کی ساری قدامت پرستی اور دقیانوسیت کا ہدف صرف وہ لوگ ہیں جو ان کے اپنے نہیں

ہیں یعنی تمام غیر ملکی۔ وہ انھیں ملیچھ کہتے ہیں یعنی نجس۔ اوران سے ہر قسم کا تعلق رکھنے سے روکتے ہیں۔
چاہے وہ شادی بیاہ کا ہو، یا کسی دوسرے رشتے کا، یا اٹھنے بیٹھنے کھانے پینے کا، کیونکہ ان کا خیال ہے
کہ اس طرح وہ بھی نجس ہو جائیں گے۔ جس چیز سے کسی غیر ملکی کی آگ یا پانی چھو جائے اسے وہ نجس سمجھتے ہیں۔
اور ظاہر ہے کہ ان دو چیزوں کے بغیر گھر کا وجود ناممکن ہے۔ جو شخص ان میں کا نہ ہو وہ اس کو قبول کرنے کو
تیار نہیں ہوتے خواہ وہ خود ہی کیوں نہ خواہش کرے یا ان کے مذہب کی طرف مائل ہو۔ یہ چیز ان سے
ہر قسم کے تعلق کو ناممکن بنا دیتی ہے۔ اور ہمارے اور ان کے درمیان وسیع ترین خلیج حائل کر دیتی ہے۔"

ان خیالات کا اظہار آج سے قریب قریب ایک ہزار سال پیشتر کیا گیا۔ برصغیر ہند کی تاریخ میں کئی مرتبہ اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوششیں بھی کی گئیں مگر یہ کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ سولہویں صدی میں اسی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے شہنشاہ اکبر نے اسلام کو خیر باد کہا اور ہندو اور مسلم دونوں قوموں کو ایک دوسرے میں خلط ملط کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ کوشش ناکام رہی۔ پھر سترھویں صدی میں شہنشاہ اورنگ زیب نے اس مسئلہ کو حل کرنا چاہا اور حکمران مسلمان اقلیت کو پوری شدت کے ساتھ ہندوؤں پر حاوی کر دیا۔ جس کی وجہ سے محکوم ہندو اکثریت شہنشاہ اورنگ زیب سے ناراض ہوگئی۔ لہذا یہ کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ مغل سلطنت کے زوال کے بعد انیسویں صدی میں ہندوستان پر انگریزی تسلط کے دور میں سر سید احمد خاں کو بھی اسی مسئلہ کی موجودگی کا احساس ہوا۔ بعد میں بیسویں صدی کے اوائل میں مولانا محمد علی نے بھی محسوس کیا کہ ہندوستان میں دو قومیں آباد ہیں۔ علامہ اقبال کو چونکہ علم تھا کہ اپنی دینی عظمت کے دنیوی اظہار کے لئے اسلام گزشتہ تاریخ میں بار بار اپنا مخصوص معاشرتی نظام وجود میں لاتا رہا ہے۔ اسلئے انھوں نے اعلانیہ کہدیا کہ مسلم قوم کے لئے ایک جدا ریاست کی ضرورت ہے مگر برصغیر ہند کی تاریخ کو یہ علم کیونکر ہو سکتا تھا کہ وہ مسئلہ جو محمد بن قاسم کے ہندوستان میں وارد ہونے سے پیدا ہوا اور جسے اکبر اور اورنگ زیب جیسے مطلق العنان شہنشاہ حل کرنے میں ناکام رہے اس مسئلہ کو کامیابی کے ساتھ حل کرنے کا سہرا خداوند تعالی نے قائداعظم محمد علی جناح کے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔ قائداعظم نے فرمایا۔ ———

"ہندو اور مسلمان دو مختلف مذہبی فلسفے، معاشرتی رسم و رواج اور ادب رکھتے ہیں۔ وہ نہ تو
ایک دوسرے میں شادی بیاہ کرتے ہیں اور نہ ساتھ کھاتے پیتے ہیں۔ در اصل یہ دونوں مختلف تمدن رکھتے
ہیں جو متضاد نظریات اور متصادم تصورات پر مبنی ہے۔ ہندو مذہب اور فلسفے کے مطابق مسلمان
غیر ذات ہے اور وہ ملیچھ ہو جاتا ہے۔ اور ہندو اس سے معاشرتی، مذہبی، تہذیبی یا کسی قسم کے بھی
تعلقات روا رکھنا چھوڑ دیتے ہیں۔ اسلئے وہ ایک مختلف نظم رکھتا ہے۔ صرف مذہبی بلکہ معاشرتی
بھی اور اسی متصادم اور متضاد معاشرتی نظم کے اندر اپنے جداگانہ تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے اس نے
اپنی زندگی گزاری ہے۔ اور اب ایک ہزار سال سے بھی زیادہ گزر گئے ہیں کہ مسلمان اس جداگانہ عالم
میں زندہ ہے۔ جداگانہ معاشرے میں بس رہا ہے۔ جداگانہ فلسفہ میں اور جداگانہ عقیدہ میں زندہ ہے۔"

البیرونی کے مشاہدات جو میں نے آپ کے سامنے پیش کیے، اور قائداعظم کے ارشادات میں ایک ہزار سال کا وقفہ ہے اب آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ برصغیر ہند میں جب ہندو اور مسلمان ایک ہزار سال سے زائد عرصہ گزرنے پر بھی ایک دوسرے کے قریب نہ آسکے تو "دو قوموں کا نظریہ" قائداعظم کے ذہن کی اختراع کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے۔

میری آپ سے مؤدبانہ التماس ہے کہ مسلم قوم پرستی کے بنیادی اصول کو ہمیشہ اپنے ذہن کی آنکھ کے سامنے رکھئے۔ کیونکہ اسی اصول کی

بہرحال پاکستان اس مقصد کے تحت وجود میں آیا ہے، آج اگر ہم نے اس اصول کو خیرباد کہہ دیا، یا اس کی بجائے ہم نے کسی اور اصول پر بیعت کر لی۔ تو وہ عمارت جسے لاکھوں قربانیوں کے بعد ہم نے تعمیر کیا ہے منہدم ہو جائے گی۔ پاکستان، جیسے میں نے ابھی عرض کیا ہے، اسلئے معرض وجود میں آیا کہ اسلام کو برصغیر میں اپنے مخصوص معاشرتی نظام کے قیام کے لئے ایک ریاست درکار تھی۔ اسی بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ۱۲ مارچ سنہ ۱۹۴۹ء کے روز قرارداد مقاصد پیش کی گئی جسے ساری ملت کی تائید حاصل ہوئی آج چونکہ ایک بار پھر ہم اس مقام پر آکھڑے ہوئے ہیں جہاں سے ہم ہٹ گئے تھے اسلئے آگے قدم بڑھانے کی خاطر قرارداد مقاصد کو از سر نو ہماری تائید کی ضرورت ہے۔

میں آخر میں آپ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جس طرح ہمارے مسائل نئے ہیں اسی طرح ہمارے خوف اور خدشے بھی نئے ہیں۔ ہماری منزلیں نئی ہیں اور ہمارے خواب بھی نئے ہیں۔ اب ان مسائل کو حل کرنے کے لئے روشن دماغی تنہا کافی نہیں، محض خود اعتمادی الگ سے اعلیٰ ہے۔ اپنے قلم سے یقین و ایمان کی شمعیں فروزاں کیجئے۔ اور اپنا فن ملت کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دیجئے۔ ایسے موضوع تلاش کیجئے جو پاکستان کے باشندوں میں فرقہ وارانہ نفرت و حقارت یا صوبائی تعصب پھیلانے کی بجائے ان میں باہمی محبت اور یگانگت کے جذبات پیدا کریں۔ مسلمانوں نے جس ہمت اور حوصلہ سے گزشتہ دور کے مصائب کا سامنا کیا ہے۔ اسکی بیسیوں زندہ مثالیں موجود ہیں۔ کیا ان مثالوں کے ذریعہ ملکی استقلال بلند نہیں کیا جا سکتا؟ ایسے موضوع تلاش کیجئے جو ہماری قلبی کدورت کا قلع قمع کر سکیں۔ ایسے موضوع تلاش کیجئے جن سے پاکستان بحیثیت ایک ریاست ہر لحاظ سے مستحکم ہو سکے۔ چونکہ ہم ایک مخصوص تمدن رکھتے ہیں اسلئے ادیبوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وقت کی جدید ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہماری اس مخصوص تمدنی اور معاشرتی زندگی کی قدروں کا تعین کریں۔ جو موضوع تعمیری ادب کے لئے مناسب ہیں وہی موضوع ہر تعمیری فن خواہ وہ مصوری ہو، نقاشی ہو یا سنگ تراشی ہو، کے لئے بھی منتخب کئے جا سکتے ہیں، ہم نے پاکستان اس لئے حاصل کیا ہے کہ ہم مسلمان ہیں، اسلئے ہمارا ادب تعمیری ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی بھی ہونا چاہیئے۔ ادیب کا اصل مقصد جیسے میں عرض کر چکا ہوں، زندہ ملت کے اجتماعی ارتقار کے لئے اسباب بہم پہنچانا ہے۔ جب ہمارے ادیب یہ سمجھ جائیں گے تو پاکستان میں نظریات کا فقدان نہیں بلکہ نظریات کی فراوانی ہوگی۔

محمد منیف کیلانی

مطالعہ کیوں اور کس طرح ؟

بعض حضرات کو یہ عنوان شاید کچھ عجیب و غریب معلوم ہو، مگر پڑھے لکھے طبقے کے حالات خصوصاً پڑھے لکھے طبقے کی زندگی کا اگر ہم جائزہ لیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ایسے عنوانات کے تحت اس طرح کی بحثوں کی بہت شدید ضرورت ہے، جن میں یہ بتایا جائے کہ فی الواقع ان عنوانوں کا مطالعہ مطلوب و مقصد ہے۔ اور ہماری عملی زندگی پر ہمارے مطالعہ کرنے کی عادت کے اثرات کن کن صورتوں میں مترتب ہوتے ہیں۔ ہمارے پڑھے لکھے طبقے کی موجودہ حالت کو دیکھ کر ہی ایک معروف ادیب نے ایک دفعہ لکھا تھا کہ اس کی ایک عظیم اکثریت ذہنی فاقہ مستی میں مبتلا ہے جو نہ تو مطالعہ کرنے کی ضرورت محسوس کرتی ہے اور نہ تعلیمی زندگی کے دور سے نکل جانے کے بعد اپنے ذہنی ارتقاء کی خاطر کوئی مطالعہ کا پروگرام رکھتی ہے۔ کالجوں میں لگے بندھے نصاب کے مطابق چند ایک کتب مجبوراً پڑھ لیں تو خیر ورنہ ...... وہاں بھی اکثر اوقات شہروں کے "مربی علم" ناشر حضرات کے چھاپے ہوئے اور گمنام افراد کے مرتب کردہ اور دو نمبروں کے خلاصوں کی مدد سے اپنا کام نکال لیا کرتے ہیں۔ جامعات میں تعلیمی کرم فرما صاحب دل ناشر حضرات کی اس علمی سرپرستی کا نتیجہ اگر دیکھنا ہو تو یونیورسٹی اور سیکنڈری بورڈ کے نتائج پر ایک نظر ڈال لینا کافی ہوگا۔ مگر معاملہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ ان کی بنائی ہوئی "شاہی روڈ" پر جو خوش قسمت گامزن ہونے کی سعادت سے بہرہ ور ہوتے ہیں وہ عمر بھر میں شاید کبھی بھی سنجیدگی سے کسی چیز کی طرف راغب نہیں ہو سکتے، کیونکہ وہ سنجیدگی سے کسی چیز کی شکل اور دقیق مضمون کا مطالعہ کرنے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے پڑھے لکھے تعلیم یافتہ حضرات باوجود اپنی بڑی بڑی ڈگریوں کے آخری عمر تک اس قابل نہیں ہو پاتے کہ مطالعہ کی عادت اپنے اندر پیدا کر سکیں اور ذہنی طور پر وہ "لڑکپن" کے دور سے اوپر نہیں اٹھ پاتے اسکی وجہ سے ان کی [illegible] اور عادات سے ایک قسم کی معذرت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ذہنی بلوغت کی منزل تک ایسے حضرات میں سے بہت کم حضرات کی رسائی ہوتی ہے۔ اسی قسم کے ایک وکیل صاحب سے جو بی اے ایل ایل بی (علیگ) تھے۔ جب میں نے پوچھا کہ آپ ان دنوں کیا پڑھ رہے ہیں تو فرمانے لگے "اب تو گریجویٹ تو ہم ہیں ہی، کوئی ہمیں ان پڑھ نہیں کہہ سکتا۔ تو پھر ہم مطالعہ آخر کاہے کے لئے کریں؟" ان کا جواب اتنا مسکت تھا کہ میں چپ ہو گیا۔

ایک اور ہونہار طالب علم بی اے کے امتحان میں تین چار بار گائڈز، نوٹس بکس اور خلاصوں کی مدد سے تیاری کر کے بیٹھے، مگر ہر بار ناکام ہوتے رہے۔ آخر ایک مرتبہ انہیں خیال آیا کہ کیوں نہ بائرن کی اصل کتاب کو پڑھ دیکھیں، جس سے اب تک ان کو خلاصے کی بدولت [illegible] تعارف حاصل ہو سکا تھا۔ چنانچہ اصل کتاب پڑھ کر انہوں نے ایک بار پھر امتحان دیا اب کے وہ پاس بھی ہو گئے۔ اس واقعہ کے متعلق احباب کی ایک محفل میں انہوں نے سنایا کہ "میں سمجھتا تھا کہ یہ بائرن بس یونہی سا ہے۔ خلاصے سے ایسا ہی معلوم ہوتا تھا۔ مگر اب اس کی اصل نظموں کو پڑھ کر تو معلوم ہوا کہ وہ تو حقیقی عظیم شاعر تھا، جس کی نظموں میں بڑا جوش ہے، درد ہے، سوز ہے .... اپنے اس انکشاف کا وہ بڑے زور شور سے اظہار کئے جا رہے تھے۔ اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ نہ معلوم کتنے طلباء کو ان خلاصوں اور گائڈز نے علم کی سچی طلب، ذوق اور اس کی نفسی لذت سے محروم کر رکھا ہے۔ اس قسم کی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن کو دیکھ کر اس چیز کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قوم کے ذہنی سرمائے کے اس نقصان اور ضیاع کو روکنے کے لئے کیا تدابیر سوچی جائیں، جن کے نتیجہ میں ذہنی فاقہ مستی کی اس حالت کا خاتمہ ہو، ذہنوں میں حرکت و گرمی کی لہریں ابھریں اور ہماری تعلیمی زندگی میں اس صحیح قسم کے صحت مند رجحانات کی نشوونما ہو سکے، اور ملی حیات اجتماعی کے قیام

استحکام کے لئے ہمیں صحیح اور پائدار بنیادیں فراہم ہو سکیں۔ زیر نظر مضمون اسی قسم کی ایک کوشش ہے، جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ مطالعہ ہمارے لئے اور ہماری ذہنی زندگی کی صحت کے لئے کیوں ضروری ہے اور یہ کہ اس سے پورا پورا فائدہ ہم کس طرح اٹھا سکتے ہیں۔

ہم مطالعہ کیوں کریں؟

یہ ایک ایسا سوال ہے، جس پر غور کرنے سے چند اہم امور ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسانی زندگی نے مختلف شعبوں میں جس قدر ترقی کی ہے، خواہ وہ زبان کے سلسلے میں ہو، ادب کے میدان میں ہو یا مختلف علوم وفنون کے میدان میں۔ وہ کوئی ایک دو دن میں نہیں ہوتی ہے اور نہ چند گنے چنے افراد کی بدولت ہوئی ہے بلکہ یہ انسانی ترقی، انسان کی صدیوں کی کوشش اور جدوجہد کا ثمرہ ہے، در اس میں لاکھوں افراد انسانی کی محنتوں اور سعی مسلسل کا حاصل ملتا ہے اس حقیقت کو سامنے رکھکر دیکھیں تو مطالعہ ہی ہمارے پاس ایک ایسا ذریعہ اور وسیلہ رہ جاتا ہے، جس کی مدد سے ہم نہ صرف یہ کہ اپنے سے پہلے کے انسانوں کی زندگیوں سے آگاہی حاصل کر سکتے ہیں، ان کے تمدن وتہذیب، معاشرت اور معیشت سے واقف ہوتے ہیں، نہ صرف یہ کہ اُن کی کمزوریوں اور خامیوں، اُن کی زندگی کے اچھے اور بُرے تجربات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں بلکہ علوم وفنون کے مختلف شعبوں میں اُن کی کارگزاری کو معلوم کرکے ان علوم وفنون کو اپنی موجودہ زندگی کے سنوارنے اور نکھارنے کے لئے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ کیونکہ علمی ترقی جس چیز کا نام ہے، در جس چیز پر اقوام عالم کے بڑھنے اور پھلنے پھولنے کا تمام تر دارومدار ہوتا ہے۔ وہ یہی ہے کہ انھوں نے علمی میدان میں جو کچھ سرمایہ چھوڑا ہے، اس سے آگاہ ہو کر ہم اپنے اندر اچھی طرح جذب کر لیں اور اپنے اس علم اور اپنے تجربات کی روشنی میں نئے نئے تجربات کی مدد سے اُن کے چھوڑے ہوئے علمی ورثے میں مزید اضافہ کریں۔ پھر یہ علمی سرمایہ کسی ایک خاص گروہ یا قوم کے اندر ہی نہیں پایا جاتا، بلکہ اس دنیا کی قریب قریب ہر قوم نے اپنی اپنی استطاعت کے مطابق اس میں اضافہ کرنے اور اس کو ترقی دینے کی کوشش کی ہے، کبھی یونانی اور چینی اس کے وارث قرار پاتے ہیں، کبھی ہندوستان، کبھی مسلمانوں کے ہاتھوں میں شمع علم روشن نظر آتی ہے اور یورپ سمیت تمام دنیا گھٹاٹوپ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مارتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، اور ایک وقت وہ بھی آتا ہے جب یورپ کی وحشی اور غیر مہذب قومیں پروانہ وار شمع علم پر گری پڑتی ہیں اور دنیائے اسلام خواب خرگوش میں غافل نظر آتی ہے۔ مگر اس بین الاقوامی اکھاڑ پچھاڑ میں ایک چیز ہمیں صاف طور پر محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ مختلف قوموں کے مٹنے اور زوال پذیر ہونے کے ساتھ علمی ترقی رکتی نہیں ورنہ علم ہی مٹتا ہے بلکہ یہ مختلف قوموں کے پاس منتقل ہوتا رہتا ہے، اس کے مراکز بدل جاتے ہیں، اس کی غور وپرداخت کرنے والے ہاتھ اور دماغ تبدیل ہو جاتے ہیں۔ سرزمین بھی بدل جاتی ہے، مگر ہر بار یہ قافلہ علم نئی آن بان اور شان کے ساتھ نئے نئے ہاتھوں اور دماغوں کے ذریعے نئی نئی سرزمینوں میں آگے بڑھتا ہی دکھائی دیتا ہے۔۔

ٹھیک یہی حال علم انسانی کا ہے۔ اس کی گزشتہ منازل کیا رہی ہیں، کن کن وادیوں سے گزر کر یہ قافلہ علم ہم تک پہنچا اور اپنے ساتھ ہمارے لئے کیا کچھ لایا ہے؟؟۔ یہ ہیں وہ سوالات جن کا جواب ہم کو انسانی تجربات ومشاہدات اور احساسات کے مطالعہ ہی سے مل سکتا ہے؟

لیکن مطالعہ کتب کا یہ صرف ایک پہلو ہے اس کا دوسرا اور اہم تر پہلو انسانی سیرت وکردار کی تشکیل سے تعلق رکھتا ہے، اور دراصل یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے پاکستان کے عوام خصوصاً نوجوانوں کی تربیت ذہنی اور سیرت وکردار کی تعمیر میں اس کو اہمیت حاصل ہے، کیونکہ مطالعہ کے صحیح ہونے یا نہ ہونے پر ہی چیز کا انحصار ہے کہ پاکستان کی ریاست اسلامی کے مختلف شعبوں کے لئے ہمیں ایسے موزوں افراد میسر آ سکتے ہیں، یا نہیں، جو دل ودماغ کی یکسوئی کے ساتھ نظریہ اسلامی کو اپنا کر اُسے عملاً برتنے کا عزم بھی رکھتے ہوں ۔۔۔۔ جن کا کعبہ واشنگٹن یا ماسکو نہیں بلکہ اپنے ملک وملت کی وفاداری ہو، انسانی سیرت وکردار کی تعمیر وتشکیل کے قوانین پر اگر ہم غور کریں، تو معلوم

کی اس اہمیت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ انسانی سیرت جس بیج سے پھوٹتی اور پروان چڑھتی ہے، وہ نظریۂ فکر اور خیال کا بیج ہے۔ یہیں سے اعمالِ انسانی کی مختلف کونپلیں نکلتی ہیں اور انسانی عادات کا قالب اختیار کرتی ہیں، جو مل جل کر انسانی کردار کا ہیولیٰ تیار کرتی ہیں۔ انسانی خیال ہی انسان کے تمام افعال و حرکات کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ اس لئے یہ سرچشمہ اگر صاف و شفاف اور پاکیزہ ہے تو اس سے پاکیزہ اور اعلیٰ اخلاق انسانی پیدا ہوں گے اور ایک بے لاگ اور پاک دل و پاکباز اور اعلیٰ درجے کی پرکشش انسانی شخصیت متشکل ہو گی۔ لیکن اگر خیالات گندے ہیں، اگر یہ سرچشمہ ہی کثافت اور غلاظت اور کوڑے کرکٹ سے اَٹ چکا ہے۔ اور اگر خیال کی اس جڑ کے اندر ہی کوئی زہریلا مادہ پایا جاتا ہے، تو پھر اس گندے اور کثافت آلود سرچشمے سے انسانی افعال و اعمال کی جس طرح کی شاخیں پھوٹیں گی۔ اس بس کی جڑ سے جو خار دار جھاڑیاں پیدا ہوں گی اور جو کڑوے کسیلے پھل ایسا درخت دے گا۔ وہ سب اپنے ارد گرد کی جاندار مخلوق پر زندگی تو اجیرن بنا سکتے ہیں مگر انہیں کچھ دے نہیں سکتے اس طرح کے فکر و خیال کے بیج سے جو انسانی شخصیت بنتی ہے۔ وہ انسانیت کے جسم پر ایک رِستا ہوا ناسور بن کر رہتی ہے۔ جس میں سے حیات انسانی قطرہ قطرہ ٹپک کر ہر لحظہ ضائع ہوتی رہتی ہے ——— بہرحال کہنا یہ تھا کہ انسانی سیرت و کردار کی تشکیل میں خیالات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ سوال کہ مطالعۂ کتب کس طرح ہمارے ان خیالات کو بگاڑتا یا سنوارتا ہے، اس کا جواب اوپر کی اس بحث کو ذہن میں رکھ کر کچھ زیادہ مشکل نہیں رہ جاتا۔ پھر بھی ذرا زیادہ اچھی طرح سمجھنے کے لئے آیئے ہم پہلے یہ دیکھیں کہ کتابیں آخر ہیں کیا، اور ہمیں یہ کیا دیتی ہیں

تصنیف اور مصنّف

دنیا کی ہر بڑی کتاب کسی نہ کسی عظیم ذہن انسانی کی تخلیق ہوتی ہے، جس میں وہ اپنی زندگی بھر کے تجربے، مشاہدے اور مطالعہ کا نچوڑ نکال کر ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے، ایسی ہر بڑی کتاب، مصنف کا حاصلِ زندگی ہوتی ہے، اس کے تجربات کا جوہر اور اُس کے فکر و تدبر کی بہترین عکاسی ہوتی ہے، جس میں نہ صرف اس کی ذاتی و انفرادی زندگی بلکہ اس وقت کی اجتماعی زندگی اور ماحول کی جھلکیاں بھی واضح طور پر موجود ہوتی ہیں۔ دنیا کو اس نے جس نقطۂ نظر سے دیکھا، جانچا، اور سمجھا، یہاں کے نشیب و فراز، دُکھ، اور سُکھ، رنج و الم، ہنسی اور خوشی، یہاں کے تفکرات و اندیشے اور یہاں کی مسرت و شادمانی سے وہ جس جس طرح لطف اندوز ہوا اور ان کی وجہ سے اس کو جن تلخ کامیوں سے واسطہ پڑتا رہا۔ یہ سب کی سب اُس مصنف کی لکھی ہوئی کتاب میں صاف طور پر پڑھی اور دیکھی جا سکتی ہیں اس میں آپ کو اس کی کامرانیاں بھی ملیں گی و اس کی ناکامیاں اور نامرادیاں بھی ——— اور پھر ان سب نے مل جل کر اس کی ذہنی ساخت پر جو اثرات چھوڑے، زندگی کے متعلق اس کائنات اور انسانوں کے متعلق اس کے جو نظریات بنے اور قائم ہوئے اپنے ماحول اور اس کے مسائل کے متعلق اُس نے جو کچھ سوچا۔ وہ سب کچھ اس کی ہر تحریر میں ملے گا۔ اس کے نظریۂ زندگی کی چھاپ اس کے ہر ناول، ڈرامے، افسانے، نظم یا غزل اور ٹھوس علمی مضامین تک پر ثبت نظر آئے گی۔ ——— اس سے معلوم ہوا کہ ادیب یا لکھنے والے کی شخصیت ہی وہ ذریعہ ہوتی ہے اور وہ واسطہ بنتی ہے، جس کے ذریعے اور واسطے سے ہم اس دنیا کے متعلق آگاہی حاصل کرتے ہیں۔ اس کی نظر ہوتی ہے، جس سے ہم دنیا اور اپنے گرد و پیش پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ اسی لئے مطالعۂ کتب کے سلسلے میں اولین قدم پر جس چیز سے ہر قاری کو آگاہ ہونے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ وہ مصنف کا نقطۂ نظر و کتاب کا موضوع ہے۔ کیونکہ اس کے سمجھنے یا نہ سمجھنے پر ہی اس کا تمام تر سمجھنا منحصر ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کتابیں ہم کو دیتی کیا ہیں؟ کچھ باتیں تو اوپر آ چکی ہیں مگر ایک اور بھی ہے جو سیرت و کردار کی تعمیر کے نقطۂ نظر سے بہت اہمیت رکھتی ہے، اور یہ چیز ہے ایک خاص قسم کی ذہنی فضا، جو ان کتابوں کے مطالعہ کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے، اور جو اگر صحت مند اور زہریلے اور مضر اثرات سے پاک ہو تو اس سے پڑھنے والے کے اندر ایک پاکیزہ ذہنی فضا اور اعلیٰ جذبات ابھرتے ہیں جن کے متعلق ہم

اوپر عرض کر چکے ہیں کہ وہی تمام تر سیرت انسانی کی بنیاد ہوا کرتی ہے۔ کتابوں کے مطالعہ کے ذریعے ہم دنیا کے عظیم المرتبت مفکرین، فوق جنرلوں، خلاقی معلموں، اور اعلیٰ درجے کے سیاستدانوں سے متعارف ہوتے ہیں۔ ہم اُن سے بات چیت کرتے ہیں، تبادلۂ خیالات ہوتا ہے بسا اوقات ان میں سے بہت سے عمر بھر کے لئے ہمارے بہترین ساتھی اور رفیق بن جاتے ہیں۔ مگر ان میں اور ہمارے دوسرے ساتھیوں میں فرق صرف اتنا ہی ہوتا ہے کہ وہ اپنی زبان سے ہمارے ساتھ گفتگو کرتے ہیں مگر یہ صرف کتابوں میں، اور حروف و الفاظ کے آلات کے ساتھ ہی ہمارے ساتھ بات چیت اور گفتگو کر سکتے ہیں۔ مگر یک خاص طرح کی ذہنی صحبت اور رفاقت یہ بھی ہم کو بالکل زندہ انسانوں کی طرح بن دیتے ہیں۔ بشرطیکہ ہم ان کی کتابوں اور ان کے حروف و الفاظ کی علامتوں کو سمجھنے کی اہلیت اپنے اندر پیدا کر سکیں، اس ذہنی صحبت و رفاقت سے ہمارے ذہنوں کے اندر مختلف طرح کے خیالات ابھرتے ہیں، اور اگر یہ صحبت اچھی، نیک اور صحت مند بنیادوں پر استوار ہو، تو ہمارے اندر اچھے اور نیک خیالات پیدا ہوں گے، اور اگر بُرے دوستوں کی طرح مضر اور مخرب اخلاق کتابوں کے زہریلے اثرات ہمارے اندر سرایت کر گئے تو پھر پاکیزہ اور صحت مند انسانی سیرت وجود میں نہ آسکے گی، فارسی کا ایک قدیم شعر ہے ؎

صحبت صالح ترا صالح کند
صحبت طالح ترا طالح کند

چنانچہ جس طرح بُرے، بدخلق اور لچے لفنگے دوستوں کی صحبت تباہ کن ہوتی ہے، اُسی طرح بُری اور فحش کتابوں کا مطالعہ بھی ذہن انسانی پر ہو کر ذہن کر اس کے اندر سے ابھرنے والے نیکی اور شرافت کے سرچشمے کو گدلا اور گندا کر دیتا ہے۔ اس سلسلے میں سر فرانسس بیکن کا یہ مقولہ ہمیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ "بعض کتابیں دیکھنے کے لئے ہوتی ہیں، بعض سونگھنے کے لئے اور بہت کم ایسی ہوتی ہیں جو ہضم کرنے کے قابل ہوتی ہیں" .... ہم سب بُرے دوستوں اور ان کی صحبت کے مضرات کو بھی طرح جانتے ہیں، اور یہ جان کر ہی ان سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں، اسی طرح ہم کو اپنے لئے اچھی اور بُری کتابوں کے پرکھنے اور جانچنے کے لئے بھی ایک معیار مقرر کر لینا چاہئے تاکہ اس کے ذریعے ہم بُری کتابوں سے بچ کر اچھی کتابوں سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں۔ کیونکہ جو شخص کسی معیار اور انتخاب کے بغیر ہر قسم کی رطب و یابس کو اپنے اندر ذہن کی کوٹھری میں ڈالتا رہتا ہے، اس کی مثال اُس شخص کی سی ہے، جو گندگی کے ڈھیر اور غلاظت کے انبار کیں سے گندگی اور غلاظت لا لا کر اپنے مکان کے کمروں، دالانوں اور صحن میں بکھیرتا پھرتا ہے۔

اب تک مطالعہ کے سلسلے میں جن دو عوامل پر ہم نے بحث کی ہے، اُن میں سے ایک تو یہ کہ صرف مطالعہ ہی کے ذریعے ہم گزشتہ اور موجودہ علوم و فنون سے آگاہ ہو سکتے ہیں، اور دوسری یہ کہ ہماری سیرت و کردار کی تعمیر میں ہمارا مطالعہ ایک بنیادی اہمیت رکھتا ہے ———— یہ دو وجوہ ہیں جن کی بنا پر ہر سوچنے سمجھنے والا انسان خود غور کر کے فیصلہ کر سکتا ہے کہ آیا وہ مطالعہ اس کی ذہنی و علمی زندگی کے لئے ضروری ہے یا نہیں ... مگر ان دو اہم اور بنیادی عوامل کے علاوہ مطالعہ کا ایک اور پہلو بھی ہے، اور وہ ہے تفریح: بعض لوگ تو تفریح کو اس سلسلے میں اس قدر اہمیت دیتے ہیں کہ وہ اس کو پہلے نمبر پر رکھتے ہیں اور ان کے نزدیک مطالعہ کا تمام تر مقصد ہی تفریح کا حصول ہے، اور بس، ان کے نزدیک ادب کا مقصد انسان کو زندگی کے معمولی اور تلخ حقائق سے کچھ لمحوں کے لئے چھٹکارا دے کر ایک خاص تصوراتی مگر دلکش دنیا میں لے جانا ہے، تاکہ دکھوں اور مصیبتوں کا مارا ہوا یہ انسان کچھ لمحوں کے لئے آرام لے سکے، یہ لوگ زندگی سے فرار کے قائل ہیں۔ تفریح کے پردے میں ان کے نزدیک ادب کا مقصد محض انسان کو اس فرار میں، وہیں پہنچانا ہی رہ جاتا ہے۔ مگر ان کے انتہا پسندوں سے قطع نظر کر کے جب ہم دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تفریح بھی مطالعہ کا ایک اہم فائدہ تو ضرور ہے مگر اس کا مقصد ہرگز نہیں۔ ہر اچھے اور کامیاب قاری کو کتاب کے مطالعہ میں ایک خاص لذت محسوس ہو کرتی ہے ——— اپنے مصنف کے پیش کردہ مسائل پر غور و فکر کر کے ہی وہ ایک کامیاب انبساط و مسرت پاتا ہے، اور اس کے انداز نگارش کی خوب صورتی اور اسلوب

بیان کی ندرت سے وہ لطف اندوز ہوتا ہے۔ اگر مطالعۂ تفریح کا مفہوم اس طرح کی لطف اندوزی و کیف و انبساط ہے تو اس میں کسی درجہ کی بھی قباحت نہیں ہے، بلکہ یہی ہر قاری کا مطلوب و مقصود ہونا چاہیئے، جو اگر نہیں ہے تو اسے فکر کرنی چاہیئے کہ اُس کے مطالعہ کی عادت میں ابھی باقاعدگی نہیں آئی ہے، اور نہ اسے پختگی حاصل ہو سکی ہے۔ مگر سستے اور آسان ناولوں، قصوں کہانیوں اور فحش ادب کے ذریعے جو لوگ تفریح کا حصول جانتے ہیں، انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اُن کی یہ سہل پسندی، بالآخر اُن کے ذہن کو مفلوج اور ان کی عقل و فکر کو تباہ کر کے رکھ دے گی۔ اور ان کی سوچ کُند ہو کر رہ جائے گی، اس کے متعلق ایک مصنف کہتا ہے۔

" اس قسم کے آسان مطالعہ کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ قاری کی نگاہیں بے نور، اس کے قوائے ذہنی پژمردہ اور اس کی ذوقی حسیں ختم کر دی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس جو شخص ایسی کتابوں کے مطالعہ میں لطف محسوس کر سکتا ہے، جو اس کے خیالات میں تحریک پیدا کر سکے، اس کی ذہنی نشوونما اور ارتقاء کا سامان بہم پہنچاتی ہیں۔ وہی فی الحقیقت ان کے صحیح لطف و مسرت کو پا سکتا ہے ـــــ امریکہ کا مشہور ماہر نفسیات ولیم جیمز اس طرح کے قارئین کو مشورہ دیتے ہوئے کہتا ہے۔ "اپنے ذہن کو مختلف خیالات و افکار کی آماجگاہ بننے دو۔ پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔" یعنی صرف اسی طریقے سے انسانی شخصیت ان بلندیوں تک پہنچ سکتی ہے، جہاں پر پہنچ کر خود بخود وہ کچھ سوچنے لگتی ہے۔ اس طرح کے ایک قاری کا نقشہ کھینچتے ہوئے ایک مصنف لکھتا ہے :-

> وہ نہ صرف سطحی مفہوم کو پا لیتا ہے۔ بلکہ مصنف کے ذہن میں پوشیدہ مفہوم کو بھی ڈھونڈ نکالتا ہے، خاص علمی سطح سے گذر کر وہ کتاب کے دل تک جا پہنچتا ہے، اور اس کی دھڑکنوں کو سنتا ہے ــــــ وہ خیالات اور احساسات جو مصنف کتاب میں بیان کرتا ہے، اور وہ جن کا اظہار نہیں کرتا۔ ان سب کو وہ سمجھتا ہے اور جانتا ہے، خیال اور احساس کی ایک ہلکی سی ہلکی لہر تک بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں رہتی، کتاب کے مصنف کے دل کی گہرائیوں میں پیدا ہونے والے نرم سے نرم اور دھیمے سے دھیمے نغمے کے آہنگ تک سے وہ لطف اندوز ہوتا ہے۔"

اب ہم اس مضمون کے دوسرے حصے کی طرف آتے ہیں یعنی یہ کہ ہم مطالعہ کس طرح کریں؟ مگر اس سے بھی پہلے یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ پہلے ہم یہ اچھی طرح جان لیں کہ مطالعہ کرنے کے لوازم کیا ہیں، تاکہ ان کی مدد سے ہم مؤثر طور پر مطالعہ کرنے کے قابل ہو سکیں، اس سلسلے میں چند ایک بنیادی امور ہمیشہ ہمارے پیشِ نظر رہنے چاہئیں،

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر وہ کتاب جس کو اپنے مطالعہ کے لئے ہم منتخب کرتے ہیں، اپنا ایک مخصوص موضوع رکھتی ہے جسے صحیح اور حق بجانب ثابت کرنے کے لئے یہ لکھی گئی ہے۔ یا پھر اگر یہ کوئی مخصوص موضوع نہیں رکھتی تو کوئی اور مقصد ایسا ہوگا، جس کے پیش نظر اسے لکھا گیا ہے۔ چنانچہ اس راہ کی پہلی ضرورت یہی ہے کہ ہم کتاب کے موضوع اور مقصد کو سمجھ کر ان کا تعین کریں۔

اس سے ذرا اور آگے بڑھیں تو ہم دیکھیں گے کہ تمام کتابوں کو ہم دو اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں، ایک تو وہ جو ہم کو ہماری اس زندگی کے متعلق یا ہمارے ماحول کی تفصیلات سے ہماری معلومات میں کوئی اضافہ کرتی ہیں۔ مثلاً ریاضی، کیمیا، طبیعیات، علم الابدان و التشریح، اور علم طبقات الارض وغیرہ، یہ کتابیں ہماری معلومات کو بڑھاتی ہیں مگر اس کے زیادہ سے زیادہ علم اور وسیع سے وسیع مطالعہ کے بعد بھی ہم اسی زمین پر رہتے ہیں، اور ہمارے پیر اور قدم اسی مادی اور محسوس زمین پر جمے رہتے ہیں۔ یہ ہم کو اس مادی ماحول اور زندگی سے مربوط رکھتی ہیں ــــــ مگر کتابوں کی دوسری قسم وہ ہے، جن کے مطالعہ سے مادی دنیا میں ماحول کے متعلق ہماری معلومات میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوتا، مگر جن کے مطالعہ سے ہم اپنے آپ کو مختلف قسم کا انسان پاتے ہیں، اور صاف طور پر محسوس کرتے ہیں، یہ کتابیں ہمیں اوپر کی طرف اٹھاتی ہیں، ہمیں بلند فضاؤں میں پرواز کرنا سکھاتی ہیں اور ہمارے اندر نئے نئے جذبات، ولولے اور افکار بھر دیتی ہیں، شیکسپیئر کے ڈرامے، ارسطو و افلاطون کے مکالمات

اقبال و غالب کا کلام اور مولانا مودودی — — اور ابوالکلام کی نگارشات ——— اور والٹیر کی طنزیہ تحریریں، ٹالسٹائی اور وکٹر ہیوگو کے افسانے و ڈرامے، ڈیما، شیکسپیئر کے خطبات اور سقراط کے مکالمے، ہمارے اندر نئے خیالات و افکار کو جنم دیتے ہیں، اپنے اندر نئی قوتیں ابھرتی ہم محسوس کرتے ہیں اور پہلے سے ہم اپنے آپ کو مختلف اور بہر بہر قسم کا انسان پاتے ہیں۔ مادی دنیا میں ایسی کتابوں و تحریروں کی پہلی قسم کی کتابوں کے مقابلے میں شاید کوئی وقعت ہے اور نہ کوئی قیمت اور قدر، مگر ہماری روحانی اور اخلاقی زندگی کی بہتری اور فلاح کے لئے یہ کتابیں جزو لاینفک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کتابوں کی اسی دوسری قسم کی مکمل ترین اور اعلیٰ ترین صنف ہمارے پاس الہامی کتب کی صورت میں موجود ہے، تمام تر تحریفات کے باوجود بائبل کے اسلوب بیان، حسن و کشش اور خوب صورتی کی آج بھی ایک دنیا اسیر ہے، اور حسن ازل اور حسن بیان کی صاف شفاف جھلک دیکھنی ہو تو قرآن حکیم اور احادیث نبوی کو دیکھئے جو حقیقت سے کچھ اس طرح کا ربط اپنے اندر رکھتے ہیں کہ ٹھوس مادی حقائق کے بیان میں ہمیں کبھی زمینی پستیوں کا احساس تک نہیں ہونے پاتا۔ بلکہ ہماری نظروں کو یہ اوپر اٹھا کر فوق سے بھی پرے اور آسمانوں سے بھی بلند تر اس منزل کی طرف جا دیتے ہیں کہ جہاں تک کسی اعلیٰ سے اعلیٰ ذہن انسانی کی رسائی الہامی ہدایت کی رہنمائی کے بغیر تصور میں بھی نہیں آسکتی۔ کتابوں کے مطالعے کے سلسلے میں اس تقسیم کو ہمیں اپنے ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ سہولت کی خاطر پہلی قسم کو ہم معلوماتی ادب اور دوسری قسم کی کتب کو ادب عالیہ کے نام سے پکار سکتے ہیں۔

تیسری چیز جس کی طرف اس سلسلے میں توجہ دلانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ جب دو ایسے اشخاص مطالعہ کے لئے کسی کتاب کو منتخب کرتے ہیں، جن میں سے ایک شخص تو زندگی کے متعلق ایک واضح نقطۂ نظر رکھتا ہے، مگر دوسرا بالکل خالی الذہن ہوتا ہے اور اس کے پاس اپنا کوئی نظریۂ زندگی موجود نہیں ہوتا۔ تو ان کے دونوں کے طریق مطالعہ اور اثرات مطالعہ بھی ہمیشہ بالکل مختلف نوعیتوں کے ہوا کرتے ہیں۔ جس ذہن میں کوئی نظریۂ زندگی متمکن نہ ہو، مطالعۂ کتب سے اس کے اندر منتشر معلومات کا ایک عظیم الشان کباڑ خانہ تو جمع ہو سکتا ہے، مگر ان معلومات میں کسی ترتیب و تنظیم اور ربط کی تلاش ایک سعی بے سود سے زیادہ کچھ نہیں ہوگی۔ مگر جب ایک مخصوص زاویۂ نظر اور نظریۂ حیات کی روشنی میں مطالعہ کیا جاتا ہے تو ذہن انسانی ان تمام چیزوں کو اس طرح سے خذ کرتا چلا جاتا ہے کہ وہ سب کی سب ایک ترتیب، ایک نظم، اور ایک لڑی میں پروئی جاتی ہیں۔ چنانچہ اسی وجہ سے مفید اور نتیجہ خیز مطالعہ کے لئے ایک مخصوص نقطۂ نظر بھی ایک اہم لازمہ ہے، مگر بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص زندگی کا مخصوص نظریہ رکھنے کے باوجود اتنا شعور نہیں رکھتا کہ وہ اس کے مقتضیات کو زندگی کے مختلف گوشوں میں، ادب میں، سیاست، معیشت اور معاشرت میں سمو سکے، اور ماحول کے رنگ میں رنگنے کے بجائے ماحول کو اپنے اصول حیات کے رنگ میں رنگ دے۔

اس سلسلے کی آخری چیز زندگی کے متعلق نقطۂ نظر رکھ کر مطالعہ کرنے ہی کا ایک ناگزیر منطقی نتیجہ ہے، جو اس نظریۂ زندگی سے ہم آہنگ ایک مخصوص معیار خوب و ناخوب کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ ایک ادبی تخلیق اگر ادب کے تمام معیاروں پر بھی پوری اترتی ہے، وہ ہر لحاظ سے بہترین ادبی کاوش ہے مگر ہمارے نظریۂ زندگی سے ٹکراتی ہے، انسانیت کے لئے مضر ہے، اور تباہ کن اثرات رکھتی ہے۔ تو اس امر کا فیصلہ کون کرے گا کہ فی الحقیقت آیا یہ اس قابل ہے کہ اس کو ٹھکرا دیا جائے یا بہترین ادبی پیش کش ہونے کی بنا پر دوسروں تک بھی اس کو پہنچایا جائے۔ ظاہر ہے کہ خالص ادبی معیار پر آپ جانچیں گے تو کچھ پلے نہ پڑے گا اور نہ آپ انسانوں کی زندگی پر اثرات کے لحاظ سے اس کے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ مجرد ادبی کسوٹی کو پیش نظر رکھ کر کر سکتے ہیں۔ اس طرح کی صورت حال جب کبھی پیش آتی ہے، اخلاق و اعلیٰ انسانی اقدار و تصورات اس میں لازماً کار فرما آتے ہیں، اور اسی جگہ سے نظریۂ زندگی کا عمل دخل ہماری زندگی کے مختلف ادبی، سیاسی، سماجی، انفرادی اور معاشرتی گوشوں میں شروع ہوتا ہے ——— اس لحاظ سے مطالعہ کے دوران میں کتابوں کے برے یا اچھے ہونے، پسندیدہ اور ناپسندیدہ مصنفوں کا فیصلہ کرنے، اور اس چیز کا فیصلہ کرنے کے لئے کہ ہم کیا کیا کچھ پڑھیں اور کیا چھوڑ دیں، ہر حالت میں ہمارا بنیادی نظریۂ زندگی ہی

ہماری رہنمائی کرسکتی ہے اور فی الحقیقت یہی ایک کسوٹی ہے، جس پر کھوٹے اور کھرے کی پرکھ ہوتی ہے، اسی چیز کے پیش نظر موجودہ دور میں انگریزی ادب کے مایۂ ناز ادیب ٹی، ایس ایلیٹ نے ایک بار لکھا تھا کہ "عیسائیوں کے سامنے ادبی تخلیقات کے جانچنے اور پرکھنے کے لئے خالص اور مجرد ادبی معیار کے علاوہ، اور اس سے، علیٰ تر معیار خود ان کا مذہب ہے، جس کی کسوٹی پر رکھکر نہیں کسی ادبی تخلیق کا ادبی حیثیت سے جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنا چاہئیے کہ بحیثیت مجموعی یہ انسانیت کے لئے کہاں تک خیر و برکت ہے" ــــــــــــ یہی بات اشتراکیت کے علمبردار اپنے ساتھیوں کو سکھاتے ہیں نظر آتے ہیں اور یہی چیز پاکستان میں اسلام کے علمبرداروں کے پیش نظر بھی لازماً رہنی چاہیے

ان ابتدائی گزارشوں کے بعد اب ہمارے لئے یہ بتانا بڑا آسان ہوجاتا ہے کہ مطالعہ کس طرح کیا جائے اس رو میں تین باتیں ہمیں ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہئیں :-

۱۔ ــــــــ پہلی چیز یہ ہو کہ جس مصنف کا ہم مطالعہ کررہے ہیں، اس کا مقصد کیا ہی؟

۲۔ ــــــــ دوسری چیز یہ ہے کہ وہ ہمارے سامنے کیا بات اور کیا نظریہ پیش کرتا ہے؟

۳۔ ــــــــ اور تیسری یہ کہ اپنی اس بات کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے اس کے دلائل کیا ہیں ــــــــ؟ اور یہ کہ فی الحقیقت کیا یہ دلائل اس قابل ہیں کہ ..... ان کو ہم قبول کرلیں ــ؟

یہی وہ تین اہم بنیادی امور ہیں جن سے ہم کو اپنے مطالعہ کا آغاز کرنا چاہئیے۔ ان کی مدد سے زیر مطالعہ کتاب کی روح و اصل جوہر تک ہماری رسائی ہوسکے گی، یہیں سے زندگی کے متعلق مصنف کا نقطۂ نظر اور دلائل اس کی خوبیوں اور خامیوں کا بھی پتہ چل سکے گا۔

ان بنیادی امور کے علاوہ مطالعہ کے سلسلے میں کچھ اور اہم چیزیں بھی ہیں۔

ان میں سب سے اہم مصنف کا انداز نگارش یا اسلوب بیان ہے، جسے انگریزی میں اسٹائل کہتے ہیں، ہر مصنف کا انداز تحریر ہر دوسرے لکھنے والے سے جدا اور منفرد ہوتا ہے، کیونکہ ہر خیال اپنے ساتھ الفاظ بھی لے کر آتا ہے، اور ہر مصنف مختلف شخصیت رکھتا ہے اور مختلف قسم کے تاریخی ماحول و پس منظر میں پروان چڑھتا ہے۔ گویا کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر مصنف کی شخصیت اس کے انداز تحریر اور اسلوب بیان میں منعکس نظر آتی ہے۔ اس کی افتاد طبع، اس کی ذہنی ساخت، اس کی طبعی و فطری صلاحیتیں۔ یہ تمام کی تمام اس کے اسٹائل کے بننے میں حصہ لیتی ہیں۔ مثال کے طور پر تھامس کارلائل کا پُرشکوہ و پُرجلال انداز بیان، اسی دور کے جوزف ایڈیسن کے سیدھے سادے طنزیہ انداز بیان سے کس قدر مختلف ہے؟ خود ہندوستان میں ہمارے سامنے غالب، حالی، شبلی، اقبال، ابوالکلام اور مودودی موجود ہیں جن میں سے ہر ایک کا اسلوب بیان جدا ہے، اپنا ہے اور منفرد ہے ابوالکلام کے انداز بیان میں بادل کی گھن گرج ہے اور بجلی کی چمک ہے، تو مودودی کی تحریر میں جوئے نغمہ خواں کا سا قرینہ اور بحر خاموش کی سی گہرائی و گیرائی پائی جاتی ہے، ایک میں حشر کا شور و غوغا ہے، تو دوسرے میں متانت، وقار اور سنجیدگی؛ اور ان دونوں کے اسٹائل کی خوبی یہ ہو کہ ان کے طبعی مزاج کی گہری چھاپ بھی صاف طور پر اپنے اندر لئے ہوئے ہے چنانچہ مطالعۂ کتب کے دوران میں صحیح طور پر لطف اندوز ہونے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم لکھنے والے کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی کو بھی اچھی طرح جانتے ہوں، کیونکہ یہی کی عکاسی مصنف کا اسٹائل کرتا ہے اور صرف اسی طرح ہم مطالعہ کتب کے صحیح لذت آشنا ہوسکتے ہیں

مطالعہ کرنے بعد اس سے صحیح طور پر لطف اندوز ہونے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ادب یا فن کی کسی تخلیق کی اصل حقیقت اور معیار سے بھی ہم بخوبی آگاہ ہوں فن خواہ وہ نقاش کی چابکدستی کا رہین منت ہو، یا ادیب یا شاعر کی زبان و قلم کا خواہ وہ رنگوں کے حسین امتزاج کی صورت میں ہمارے سامنے جلوہ گر ہو، یا حرف و صورت کے نغمہ ہائے شیریں کی شکل میں ــ بہرحال وہ فن ہی کا ایک اہم پہلو اور رُخ ہونے کے لحاظ سے اصل قدر و قیمت رکھتا ہے ــ ــ ــ جو فنکار ــــ ادیب، شاعر اور نقاش ــ کے خون جگر سے صورت

پذیر ہوتا ہے خونِ جگر کے بغیر اقبال کے الفاظ میں نغمہ سودائے خام ہے اور نقش سب کے سب ناتمام رہ جاتے ہیں۔

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے، خونِ جگر سے نمود

چنانچہ جس طرح فنکار، ادیب یا شاعر نے اپنے خونِ جگر سے اپنے تخلیقی کارنامے کو وجود بخشا تھا۔ اگر اتنی محنت سے نہیں تو کم از کم فن کے اہم اصولوں کو سامنے رکھکر ہی اس کا ہم کو مطالعہ کرنا چاہئیے ۔ اس کے لئے ایک طرف تو ضرورت ہو کہ ہم ادبی معیار اور اصولوں کو اچھی طرح جانتے ہوں۔ دوسری ضرورت اس سلسلے میں زبان کو زیادہ اچھی سے اچھی طرح سیکھنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ الفاظ دراصل ہی ہمارے اور مصنف کے مابین تعلقات کا واحد ذریعہ ہیں ان کے صحیح علم اور فہم کے بغیر ہم مصنف کے نہ تو مفہوم کو پا سکتے ہیں اور نہ اس کی کاوش کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہی کر سکنے کے قابل ہو سکتے ہیں ———— اس لئے ضرورت ہے کہ ہم مطالعہ سے لطف اندوز ہونے کے لئے اپنے ذخیرۂ الفاظ میں بھی جہاں تک ہو سکے، اضافہ کرتے رہیں۔

فن کے سلسلے میں ہم کو یہ بات بھی ہمیشہ یاد رکھنی چاہئیے کہ ہر فن پارہ، خواہ وہ ادبی نگارش ہو، یا نغمۂ دلآویز۔ بہر حال اپنی جگہ ایک وحدت ہوتا ہے اور اپنی اسی حیثیت میں ہم کو متاثر کرتا ہے۔ اس کے اجزائے ترکیبی کا تجزیہ کرنے پر اس کا سارا لطف جاتا رہتا ہے۔ چنانچہ کسی نظم، غزل، ڈرامے، افسانے، پھول اور خوب صورت منظر کے اجزاء سے نہیں، بلکہ بحیثیت مجموعی، اس کے تمام اجزا ایک وحدت کی صورت میں ہم پر، ہماری پوری شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لئے مطالعہ کا لطف دوگنا ہو جائے گا، اگر ہم غزل، نظم، افسانے اور ڈرامے کی طرح کی وحدت اور یکسانی ہر ادیب اور لکھنے والے کی نگارش میں تلاش کر سکیں، خصوصاً جبکہ ہم اس کو پالیں۔

مصنف اور قاری کے باہمی تعلقات کے سلسلے میں جو چیز اہم مقام رکھتی ہے وہ مصنف کے ساتھ قاری کی جذباتی ہمدردی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مصنف جس چیز کا اظہار کرنا چاہتا ہو وہ ہمیں پسند نہ ہو، یا اس سے ہمیں اختلاف ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مصنف نے بات جس طرح کہی ہے، ہم کو اس سے بھی اختلاف ہو اور وہ ہمارے نزدیک پسندیدہ نہ ہو۔ مگر ان تمام باتوں کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی صحیح اور کامیاب مطالعہ کے لئے ضروری ہے کہ مطالعہ کے دوران میں ہم مصنف کے مخالف اور نکتہ چیں بن کر سامنے نہ آئیں بلکہ ہماری کوشش۔ مخلصانہ کوشش اس کی تمام خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود اس کی بات کو سمجھنے کی ہونی چاہئیے۔ اس سے نہ صرف ہم اُس کے نقطۂ نظر کو سمجھ سکیں گے، بلکہ اس سے ہمارے مطالعہ کا لطف بھی دوبالا ہو جائے گا۔

آخری چیز یہ کہ یہ ہے کہ اچھے یا بڑے مصنف کو جانچنے اور پرکھنے کی اصلی کسوٹی اور حقیقی معیار ہمارا ذاتی وجدان اور ذوق ہے، جو مطالعہ کی وسعت کے ساتھ زیادہ نکھرتا اور سنورتا چلا جاتا ہے۔ وسیع مطالعہ اس قسم کے ذوق کی تعمیر میں سنگِ بنیاد بنتا ہے۔ اس لئے اس کی اہمیت سے ہمیں کبھی بھی غافل نہیں رہنا چاہئیے، بلکہ اپنی امکانی حد تک اپنے مطالعہ کو زیادہ سے زیادہ وسیع کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہئیے۔ اس سلسلہ میں امریکہ کے مشہور نقاد رابرٹ بیڈرٹ نے کیا خوب لکھا تھا کہ "لوگ کہتے ہیں کہ ہم کیا پڑھیں جبکہ کتابیں اتنی کثرت سے شائع ہو رہی ہیں اور ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ —— —— ایسے لوگوں کو یاد رکھنا چاہئیے کہ دنیا میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں یوں تو ان گنت ہیں مگر ماؤنٹ ایورسٹ جیسی بلند و بالا تر پہاڑی چوٹیاں چند ایک ہی تو ہیں" کہنا یہ ہے کہ ہر موضوع کا مطالعہ کم سے کم وقت اور زیادہ سے زیادہ موثر طریقے پر کرنے کا راز صرف یہی ہے کہ ہر موضوع پر پہلے صرف ان لوگوں کو پڑھا جائے جو ان میں سند اور اتھارٹی کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ پھر اگر وقت اور فرصت ہو تو دوسروں کی طرف بھی توجہ کی جا سکتی ہے۔

محسن انصاری

آتش

آتش کی شخصیت

اردو شاعری کا گل سر سبد غزل ہے اور عموماً غزل کے مضامین محدود ہوتے اور طرزِ بیان میں یکسانی اور انفرادیت کم پائی جاتی ہے۔ مگر غزل گو شعراء میں بھی ایسے خلاق ذہن کے ملک شاعر ہیں جن کا ایک خاص اسلوب، لہجہ اور اپنی صاف و غیر مبہم آواز ہے۔ جو ایسی بے پناہ شخصیت رکھتے ہیں کہ وہ روایات و قدامت پرستی سے بالاتر ہو کر اپنے اظہار کے لئے مناسب طرز و رنگ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور جس کا عکس ان کے کلام کو تازگی، زندگی اور دوام بخشتا ہے۔ ایسے ہی منفرد شعراء میں آتش بھی ہیں۔ بلند نظری اور عالی حوصلگی سے کوئی زمانہ خالی نہیں رہتا۔ ایجاد و اختراع کا ذوق طبیعتوں سے کبھی بالکل مفقود نہیں ہو جاتا۔ کبھی بھڑکتی ہوئی آگ بجھ جاتی ہے اور کبھی ایک دبی ہوئی چنگاری سے آگ لگ جاتی ہے۔ جوہرِ قابل اپنی فطرت میں کچھ نہیں بلکہ شعلہ ہوتا ہے۔ وہ خس و خاشاک میں دب نہیں سکتا بلکہ اس کو جلا ڈالتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ماحول کی فرسودگی، لذت ایجاد کی کمی، عام انحطاط و زوال کی فضا اور غزل گوئی کے رواج نے بہت کم اس بات کی گنجائش باقی رکھی تھی کہ کوئی شاعر برسوں کی مشقِ سخن کے بعد بھی اپنے آپ کو پا سکے، اپنی شخصیت اور فن کو ترقی دے کہ اپنے پیچھے ایسا کارنامہ چھوڑ جائے جو اس کی معنوی زندگی کا خلاصہ، اسی کے بیش قیمت تجربات بہترین افکار و احساسات اور اس کے بلند تر ذہنی و تہذیبی شعور کا آئینہ دار ہو۔ اگر ماحول میں یہ قوت ہے کہ وہ فرد کو ملی، قومی کسی خاص جہت میں آگے بڑھنے سے روک سکتا اور ان کے پاؤں میں بیڑیاں پہنا سکتا ہے، ان کو بے موت مار بھی سکتا ہے تو فرد کے اندر بھی ایک ایسی طاقت ہے جو اسے دبنے نہیں دیتی۔ وہ گرتا ہے، اٹھتا ہے، پھر گرتا ہے اور پھر اٹھ کر یا تو ماحول ہی کو بدل دیتا ہے یا پھر اپنے خون سے اس بات کی شہادت لکھتا ہے کہ فرد کا ایمان و یقین کبھی فنا نہیں ہو سکتا۔

ماحول بناتا بھی ہے اور بگاڑتا بھی۔ مگر بناتا کم ہے اور بگاڑتا زیادہ۔ ماحول میں افراد ہی کی کارفرمائی ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ عام طور پر آدمی کاہل اور غور و فکر سے دور رہنے والا ہوتا ہے۔ یہ دو باتیں ایسی ہیں کہ اگر افراد میں عام طور پر پائی جانے لگیں تو رفتارِ حیات سست اور بلند مقاصد آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ روزانہ زندگی کی تگ و دو، طبائع اور ذوق کا اختلاف، ذرائع معاش کا فرق، ذاتی اغراض و خواہشات، آرام طلبی و کاہلی اور ایک ڈگر پر چلتے رہنے کی عادت بالعموم ماحول کو ایسا بنا دیتی ہے کہ ایک خاص سطح سے اونچے ہو کر کسی کام کو کرنے کے لئے غیر معمولی شخصیت، ولولہ و عزم کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاعری جو زندگی کے بہترین تجربات و جذبات کی ترجمانی کرتی ہے اپنے مقصد کے لئے ایسے اشخاص کا مطالبہ کرتی ہے جو قلب و دماغ اور ذوق و شعور کے لحاظ سے غیر معمولی ہوں۔ لیکن شعر و ادب میں بھی روایات ہوتی ہیں۔ موروثی امراض کی طرح ایسے ادبی اور شعری نقائص ہوتے ہیں جو شعراء کو اپنے پیش رووں سے ملتے ہیں، ان نقائص کو دور کرنا، اپنے فن کو مزید ترقی دینا اور اپنے اسلوب کو نکھارنے اور اس کی حفاظت میں کوشاں ہونا دوسری زبردست کوشش ہے جو ایک حقیقی اور عظیم شاعر کو کرنی پڑتی ہے۔

کسی شاعر کے کارنامے کی قدر و قیمت متعین کرنے میں ماحول کا لحاظ بھی ضروری ہے اور اس کی فطری افتادِ طبع اور اس کے تصورات و معتقدات کا بھی کہ جس کے بل پر یا وہ ماحول کے خلاف چل سکا یا ماحول میں موجود رنگ کا اور چمکایا۔ ذکر آتش کا ہے تو ضروری ہے کہ ان کی حیات

اور ان کے ماحول سے اتنی واقفیت حاصل کر لی جائے جس سے ان کے کلام کی خصوصیات سمجھ میں آسکیں۔ آدمی کو ہمیشہ ہی مختلف واقعات واشخاص متاثر کرتے رہتے ہیں اور اس لئے وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ ایک خاص ذہنیت کے بنانے میں کن کن باتوں کا ٹھیک ٹھیک کتنا حصہ ہے۔ شاعر تو غیر معمولی طور پر تیز حس اور نازک طبیعت رکھتا ہے ہی لئے اس کے معاملے میں اس کا اندازہ کرنا اور مشکل ہے البتہ کم و بیش امکان کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ قطعیت ناممکن ہے۔ آتش کے آباؤ اجداد دہلی کے رہنے والے تھے جو فیض آباد میں آکر آباد ہو گئے تھے آزاد کا بیان ہے کہ خواجہ زادوں کا خاندان تھا جس میں مسند فقر بھی قائم تھی۔ آتش کی پیدائش فیض آباد میں ہوئی اور ابھی جوان بھی نہ ہوئے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ یہ فوج کے لڑکوں کے ساتھ بانکے اور شوریدہ پشت ہو گئے۔ اسی وجہ سے آتش کی باقاعدہ تعلیم جیسی ہونی چاہئے تھی نہ ہوئی۔ میر محمد تقی ان کو نوکر رکھ کر لکھنؤ لے گئے اور پھر وہ وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی اور عربی کی ضروری استعداد انھوں نے بہم پہنچا لی تھی۔ اس وقت باوجود یہ کہ عام انحطاط کا دور تھا شاہ اودھ اور چھوٹے بڑے جاگیرداروں اور رئیسوں کے جاہ و تمول کی نمائش کی کثرت کے ساتھ ایک مخصوص تہذیبی فضا بنا دی تھی۔ جس وقت آتش لکھنؤ آئے ہیں جرأت، انشا، مصحفی اور ناسخ کے کلام کی دھوم تھی۔ شاعری کا گھر گھر چرچا تھا۔ نوجوان آتش کے دل کو ایسی فضا نے ضرور گرمایا ہوگا۔ وہاں کی شاہد بازی اور شاعری کے رنگ سے ان کو بخوبی واقفیت ہوئی ہوگی۔ دہلی کے آسمان شاعری کے ٹوٹے ہوئے ستارے لکھنؤ کے آسمان شاعری پر مہ پارہ اگر چمکے مثلاً میر، میر حسن مصحفی انشا وغیرہ۔ زمانہ زیر بحث میں دبستان لکھنؤ کی شاعری کی خصوصیات یہ نظر آتی ہیں۔ ادنیٰ احساسات و جذبات کا بیان، ابتذال و سوقیانہ پن، لباس کی طرح مزاج میں زنانہ پن۔ بیباکی اور ہوس انگیزی۔ آتش اگرچہ بانکے اور شوریدہ مزاج تھے لیکن شاگردی اختیار کی تو مصحفی کی۔ ایسا انھوں نے موروثی اثرات اور اپنے ذوق کی بنا پر کیا ہوگا ورنہ مصحفی کے پاس کہ جو شاعری میں درویشی کی روایت کو ضروری سمجھتے تھے اور دوسری کون سی چیز لے جا سکتی تھی۔ یقیناً آتش نے انشا اور مصحفی کے معرکے دیکھے ہونگے اور ان سے اثر بھی قبول کیا ہوگا۔ شاید انھوں نے یہ سبق عمر بھر کے لئے سیکھا ہو کہ شاعری میں رکاکت اور پست مذاقی سے اپنا دامن کبھی آلودہ نہ کرنا چاہئیے۔ پھر آئندہ چل کر شیخ امام بخش ناسخ سے جو چشمکیں ہونے لگیں اور لوگوں نے ایک کو دوسرے کا حریف بنا دیا ان باتوں نے آتش کو ضرور متاثر کیا ہوگا کیونکہ ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر شرافتِ نفس اور ذوقِ سلیم کو کبھی پس پشت نہیں ڈال سکتا۔ ان کے یہاں ایک ایسی سنجیدگی پائی جاتی ہے جو زندگی کے مسائل کو ذاتی خواہشات سے اونچا اٹھا کر غور و فکر کرنا سکھاتی ہے۔ گو آتش پر ان کے خاندان کی پیری مریدی کا سلسلہ ختم ہو گیا مگر فقر و توکل کا امتیاز زندگی بھر قائم رہا۔ جب فقر کی مستی سپاہیانہ بانکپن سے مل گئی تو طبیعت کا انداز کیا ہو گیا ہوگا۔ پھر بھنگ پینے کا چسکا اس پر مستزاد۔ حلیہ یہ کہ گیرداستہ بند، ہاتھ میں ڈنڈا۔ ڈنڈے میں ایک سونے کا چھلہ، پاؤں میں پیچے کام کا سلیم شاہی جوتا۔ پچاس یا اسی روپے مہینہ بادشاہ کے یہاں سے ملتے تھے مگر بچپن سے تو بانکپن اور شوریدہ پشتی کی تعلیم ہی تھی تو پھر کیا تعجب ہے کہ دوسرے تیسرے فاقہ ہے اور وہی ڈنڈے میں لگا ہوا سونے کا چھلہ رہن رکھ کر فاقہ شکنی کی جائے۔ اور پھر کیا اس عالی دماغی کا اور وہ بھی پیری میں کوئی جواب ہے کہ ایک ٹوٹے کھنڈر لے پڑے بیٹھے ہیں۔ سامنے بچھا حقہ رکھا ہوا ہے جو امیر یا غریب آئے وہی حقہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس وضع قطع اور شخصیت کو چشم خیال کے سامنے رکھئے اور پھر ان کے اشعار کو دیکھئے وہ کس قدر سچے اور انہیں کی طرح ہیں۔

غزل اپنی ہیئت کے لحاظ سے یہ گنجائش نہیں رکھتی کہ شخصیت کا مکمل اظہار اس میں ہو سکے۔ مگر یہاں پھول کے پیارا رنگ کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے تو یقیناً خوشبو تو ضرور سونگھ سکتے ہیں۔ غزل میں ایسے اشعار کا کھوج لگانا جس میں شاعر کی اپنی ظاہر اور اس کی شخصیت منعکس ہو رہی ہو بہت مشکل ہے۔ مگر بڑے غزل گو شعرا نے پھر بھی اپنا مخصوص اسلوب پیدا کیا اور اس شان کے ساتھ

کہ ہے

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما۔

کسی شاعر کے کلام کی مجموعی قدر و قیمت متعین کرتے وقت یہ ضروری ہے کہ اس کا منتخب کلام سامنے رکھا جائے ورنہ اندیشہ ہے کہ ناقد یا تو کسی نتیجے پر پہنچ ہی نہ سکے اور یا بالکل غلط نتیجے پر پہنچے۔ یہ کسی خاص شاعر ہی کے حق میں صحیح نہیں کہ اعلیٰ تو بہت اعلیٰ اور پست تو بہت پست۔ میرؔ، سوداؔ، غالبؔ، مومنؔ اور دوسرے قابل ذکر شعرا کے یہاں بھی کثرت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جو ان کی مسلمہ حیثیت سے کسی طرح میل نہیں کھاتے۔ غزل تو غزل مثنویوں میں ایسا ابتذال پایا جاتا ہے کہ ذوق سلیم پناہ مانگتا ہے۔

نظیر اکبر آبادی وہ واحد شاعر ہے جس نے شاعری میں "خارجیت" کو راہ دی، جس نے اپنے جذبے اور خیال کے اظہار کے لئے ڈھلائے سانچوں کو رد کر دیا اور اپنی طباعی، ذہانت اور جذبۂ دل کو زیادہ اہمیت دی۔ وہ مکمل طور پر کامیاب نہ ہوئے ان کے کسی سبب سے آتشؔ نے بھی اپنے مزاج سے مجبور ہو کر غزل میں دوسرے مضامین شامل کر کے اور التزام سے شامل کر کے کچھ غزل میں وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لکھنؤ والوں نے بالعموم ایسے خارجی عناصر کو غزل میں راہ دی۔ (۱) سامان آرائش۔ جوڑا۔ کنگھی۔ چوٹی کے علاوہ سرمہ، مسی، غازہ۔ مہندی، فندق، افشاں، پھول، سیندور، پان، عطر وغیرہ (۲) زیورات (ا) سر کے زیور۔ تعویذ۔ جھومر، چھپکا، چاند، سورج، سرپیچ، موتی کی لڑی یا سلک گہر وغیرہ (ب) کان کے زیورات میں بجلیاں۔ بندے، بالی، پتا، انتی، پتی، کرن پھول، جھمکا، بالا، پارے کی مچھلی، جھالا، مچھلی، سبزہ، چھلا اور گوہر وغیرہ (ج) ناک کے زیور میں نقش، نتھ، بلاق، کیل، سونے کی ہیرے کی جڑاؤ وغیرہ (د) گلے کے زیور میں زنجیر، ہیکل، طوق، دھگدگی، جگنی، چمپاکلی وغیرہ (ہ) ہاتھوں کے زیورات میں کنگن، پچھیلا، پہنچی، پٹری، جہانگیری، چھلا، آرسی، اکا، نورتن، جوشن، حسین بند۔ علی بند، شوق بند، انگوٹھیاں اور چوڑی (و) پاؤں کے زیور میں بچھوے، چھلے، انوٹ، کڑے، گھنگھرو، گل چھڑے، خلخال، بیڑی، چھڑ گل اور پازیب (زیورات کی اس تفصیل کا مدعا یہ ہے کہ اس زمانے کے لکھنوی شعرا کا ان سے دلچسپی کا حال کھلے۔ پروفیسر عندلیب شادانی کو افسوس ہے کہ یہ فہرست مکمل نہیں (۳) زنانہ لباس (۴) معشوق کے اعضائے بدن کا تذکرہ۔ (۵) طوائفیں اور رقص و سرود (۶) مقامی ہندوانہ رسم و رواج و روایات والفاظ (۷) توسل بہ حضرت علی و امام حسن حسین وغیرہ۔ (ماخوذ از لکھنوی شاعری کی چند خصوصیتیں۔ از پروفیسر عندلیب شادانی۔ مطبوعہ "نگار" لکھنؤ، جون ۱۹۵۱ء)

تو یہ تھا لکھنؤ کی شاعری میں خارجیت کا حال۔ آتشؔ نے ایسے زمانے میں شاعری کی اور آفریں ہے ان پر کہ انھوں نے شاعری کی مذکورہ بالا خصوصیات سے حتی الوسع سروکار نہ رکھا۔ اس طرح وہ اپنی شاعری کو اس انجام سے بچانے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے جس پر صحیم، ادنیٰ اور شائستہ مذاق کے منافی چیزوں کا ہوتا ہے۔ آتشؔ کی زندگی سے مختصر واقفیت کی بنا پر بھی بآسانی نظر آتا ہے کہ ان کا سپاہیانہ بانکپن شاعری میں بھی قائم ہے اور فی الحقیقت درویشی کی روایات کو انھوں نے جزو شاعری بنا دیا۔ ان کی شاعری میں شرف انسانیت کا تصور، بے نیازی، مردانگی، شجاعت، آزادہ روی، حفظ آبرو اور فقر کے جو تصورات ملتے ہیں اور کثرت سے ملتے ہیں، ان کی بنا پر ان کے کلام کے معتد بہ حصہ کو اخلاقی شاعری کے عام عنوان کے تحت انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ مگر ایسا کرنا ایک فرسودہ سی بات ہوگی اور ان اشعار کی جو واقعی قدر و قیمت ہے وہ آنکھوں سے اوجھل رہ سکتی ہے۔ ویسے اشعار محض اخلاقی نہیں ہیں بلکہ ان میں زندگی کا بہترین تجربہ اور شاعر کا دلی جذبہ شامل ہے۔ وہ کوئی خشک وعظ نہیں بلکہ وہ شاعری کی شخصیت کے زور، اور محسوسات و جذبات کی اصلیت کی بنا پر پُر تاثیر اور دلکش ہیں۔ ان میں آتشؔ کے تصور حیات کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

فقر و توکل

آتش یہی دعا ہے خدائے کریم سے | محتاج اے کریم نہ کیجو بخیل کا
سختی ایام ہے میرے لئے سامان عیش | خشت زانو کو سمجھتا ہوں میں زانو حور کا
بسر ہو جائے گی کمل کے سائے میں فقیروں کی | مبارک اہل دولت کو ہو نمگیرہ تمامی کا
دو نعمتیں یہ میری ہیں میں ہوں فقیر مست | اک نان خشک ایک پیالہ شراب کا
ہے سزاوار اہل دولت سے فقیروں کا غرور | ہاتھ کو جو کھینچ لے گا پاؤں کو پھیلائے گا
یہ حال ہوا اس کے فقیروں سے ہویدا | آلودۂ دنیا جو ہے بیگانہ ہے اس کا
لگی ہے آگ جو کمل کبھی اوڑھا یا ہے | ترے برہنہ سے گرمی دوشالہ کیا کرتا
مرد درویش ہوں تکیہ ہے توکل میرا | خرچ ہر روز ہے یاں آمد بالائی کا
فروغ ظاہری کو داغ روشن دل سمجھتے ہیں | چراغ بادہ اے آتش نہ ہو محتاج روغن کا
مرد فقیر حق کی کرتے ہیں بوریئے پر | شیر اپنے نیستاں میں آتش ڈکارتے ہیں
ہمت مردانہ نے آتش کیا ہے بے نیاز | جانتا ہوں میں گدا سلطان ہفت اقلیم کو
تمنا دولت دنیا کی اے آتش نہیں رہتی | قناعت سے غنی اللہ کر دیتا ہے انساں کو
باغ جہاں میں گل کی قناعت پہ جائیے رشک | عمر دو روزہ ایک قبا میں تمام کی
کوئی اکسیر غنی دل ہو رکھتے ایسی | خاکساری نہیں دی ہے مجھے دولت دی ہے
خدا پر رکھ نظر طالب اگر ہے دین و دنیا کا | یقیں ہے دولت کونین حاصل ہو توکل سے
دولت دنیا سے آتش ہم نے جب پھیری نگاہ | جس طرف آنکھ اٹھا گئی تودے لگے اکسیر کے
آتش جو چاہے پائے توکل کو مکھی | جو صبح کو ملے نہ رکھے شام کے لئے
کام بنتے کا نہیں بندا اپنا | بندہ پرور ہے خداوند اپنا
در بستہ خاطری نے کیا داخل بہشت | صحرائے بے تعلقی باغ ارم ہوا
شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ | قناعت بھی بہار بے خزاں ہے

دیکھئے ان اشعار میں مجبوراً نہ بے کسی۔ مریضانہ ذہنیت اور شکست خوردگی نہیں ملتی۔ ان میں کوئی خیر نہیں جو کوئی غیر متعلق شخص دے رہا ہو۔ خود نگری اور خودداری کی یہ تلقین معمولی دل و دماغ کا آدمی نہیں دے سکتا۔ اس فقر کے آگے میری و سلطانی کو پسینہ آجائے ؎ ہے سزاوار اہل دنیا سے فقیروں کو غرور ؎ ہاتھ کو جو کھینچ لے گا پاؤں کو پھیلائے گا۔ مسرت کا لازوال خزانہ کیسے ہاتھ آتا ہے ؎ شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ ؎ قناعت بھی بہار بے خزاں ہے۔ شاعر نے ان اشعار میں ایک اعلیٰ نقطۂ نظر اور راسخ اعتقاد کی ترجمانی کی ہے۔ ان کی نظر کاروبار دنیا پر گہری ہے اور ان سے علیحدگی اختیار کر کے اس نے مسائل پر غور کیا ہے۔ وہ ایک خدا پر اعتقاد رکھتا ہے جو خالق، مالک اور رازق ہے سپنے سود و زیاں کو اس نے اسی کے حوالے کر دیا ہے اور دعا یہ کرتا ہے ؎

آتش یہی دعا ہے خدائے کریم سے | محتاج اے کریم نہ کیجو بخیل کا

شاعر سمجھانا یہ چاہتا ہے کہ محض شکم کے لئے نہیں جینا چاہئے اور نہ اپنی انسانیت کو شکم پرستی کی راہ میں ذلیل کرنا چاہئے۔ میری سلطان سے بے نیاز ہو کر اپنی خودی کی حفاظت کرنی چاہئے۔ دنیا پرستی سے یہ نفرت تعصب، تنگ نظری اور شکست خوردگی کا نتیجہ نہیں بلکہ

عزم بلندی کی دلیل ہے۔ مزید اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

ہمت و مردانگی

بغل میں لے کے یوسف کو اکیلا واں سے گزرا ہیں   قدم رکھتے ہوئے جس راستے میں کارواں ٹھٹکا
جانے دے آتش اگر اہل جہاں تجھ سے پھریں   مرد پیچھا نہ کریں بھاگتے ہوئے لشکر کا
جبں و علم ہے پاس ہی اپنے نہ ملک و مال   ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا
دور اتنا بھی بس اے منزل مقصود نہ کھینچ   تھک گیا لاکھ میں ہمت تو نہیں ہاری ہے
خواہاں کوئی نہیں تو کچھ اس کا عجب نہیں   جنس گراں بہا ہیں فلک کی دکاں میں ہم
گنج پنہاں ہیں [illegible] میں بنی آدم کے   کان سے لعل یہ دریا سے گہر لیتا ہے
طلب دنیا کو کرکے زن مریدی ہو نہیں سکتی   خیال آبرو دے ہمت مردانہ آتا ہے
بلند و پست سبکدوش کو برابر ہے   نسیم بے سر و پا کا کہاں مقام نہیں

ان اشعار سے آتش کی شخصیت کا وہ پہلو سامنے آتا ہے جس کی خصوصیت "سپاہیانہ بانکپن" کے لفظ سے عموماً ظاہر کی جاتی ہے۔ ان اشعار میں بلند آہنگی ضرور پائی جاتی ہے مگر اصلیت اور جوش کے ساتھ۔ یہ شاعرانہ تعلی کی قسم کی کوئی چیز نہیں۔ ان میں گہرا غور و فکر و انفرادیت ملتی ہے۔ ذہنی بلندی بھی ہے اور فلسفیانہ انداز۔ بلند و پست سبکدوش کو برابر ہے، نسیم بے سر و پا کا کہاں مقام نہیں۔ اس لکھنؤ میں جہاں دوسرے "رقص بسمل" کا تماشا دکھا رہے تھے آتش کا یہ انداز تھا۔

سر کاٹ کے کر دیجئے قاتل کے حوالے   ہمت مری کہتی ہے کہ احسان بلا لے

خودداری ملاحظہ ہو:

نہ کھایا میں نے کڑے پن سے زخم تیغ کرم   میں اپنے جوہر ذاتی سے غرق آہن تھا

اس رنگ کے کچھ اشعار اور پیش کئے جاتے ہیں جس میں فکر کی پختگی، تجربات کی بوقلمونی اور مشاہدہ کی باریکی اور نتیجہ نکالنے کی مہارت نمایاں ہے۔

غبار راہ ہو کر چشم مردم میں محل پایا   نہال خاکساری کو لگا کر ہم نے پھل پایا
غضب ہے منزل ہستی میں آسائش طلب ہونا   ہجوم خواب سے رہرو نے ہے آخر خلل پایا
کافر ہے منکر اس کی کریمی کی شان کا   خالی پیالہ کب کف سائل میں رہ گیا
ناقص ہے دوست داری میں کامل نہیں ہے تو   دشمن سے بھی غبار اگر دل میں رہ گیا
پست فطرت سے سوائے رنج کچھ حاصل نہیں   پا بگل کشتی کو کر دیتا ہے پانی چاہ کا
عہد طفلی ہی سے ہو مشق   حلقہ آسانی سے بن جاتا ہے چوب تر کا
چمن سے بلبل و قمری کا عشق حیرت ہے   ثبات گل کو نہیں سرو کو قیام نہیں

دنیا فانی ہے مگر انسان کا عمل فنا نہیں ہوتا۔ نہ زندگی کی قدر کم ہو جاتی ہے۔ شاعر کو اس بات کا پورا احساس ہے کہ زندگی کو یونہی نہ کاٹ دینا چاہیئے۔ بلند مقاصد کے اندر اندر دوام تلاش کرنا چاہیئے۔

کسی کا ہو رہے آتش کسی کو کر رکھے   دو روزہ عمر کو انساں رائگاں نہ کرے
باراں کی طرح لطف و کرم عام کئے جا   آیا ہے جو دنیا میں تو کچھ نام کئے جا

خیال تن پرستی چھوڑ فکر حق پرستی کر — نشاں رہتا نہیں ہے نام رہ جاتا ہے انساں کا
حیف ہے راہ خدا میں نہ ہو انساں سے کوشش — دست قدرت نے بنائے نہیں بیکار قدم
کٹ جائے وہ زباں نہ ہو جس سے دعائے خیر — پھوٹے وہ آنکھ جو کہ نہ وقت سحر کھلے

ان دو اشعار کو دیکھئے ان میں آتش کی انفرادیت بدرجۂ اتم واضح ہو رہی ہے۔

کریمی میں تری شکوہ ہے جیسے وہ کافر — مجھے ملول تو دشمن کو میرے شاد کیا
یہ دل لگنے میں میں نے مزا اٹھایا کہ — ملا نہ دوست نہ دشمن سے اتحاد کیا

پہلے شعر میں جو بے لوثی، عالی ظرفی اور ذات خدا پر مکمل سپردگی کی کیفیت پائی جاتی ہے وہ زمانے کا رونا رونے والوں کے یہاں مفقود ہے۔ اپنے غم کو نظر انداز کرکے اور دشمن کو شاد دیکھکر قسام ازل کی کریمی کی بے اختیار تصدیق کرنا کسی عالی ظرف اور حقیقت آشنا انسان ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ دوسرا شعر بھی آتش کی شخصیت سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ غالب نے راہ سلوک کی ایک منزل میں کہا تھا

ہاں اہل طلب کون سنے طعنۂ نایافت — دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

آتش اپنے کو کھونے پر تیار نہیں۔ وہ عین کارزار حیات میں عملاً اپنے عشق میں فداکاری کا ثبوت دیتا ہے۔ حالانکہ راہ دشوار ہے سفر دراز ہے، بیچ میں گھاٹیاں، پہاڑ اور خارزار ہیں مگر بڑھنا اسی سمت ہے۔ چونکہ وہ راہ عشق کی صعوبتوں کا لذت شناس ہے اس لئے وہ مایوس نہیں ہوتا۔ اور نہ اس پر ہراس طاری ہوتا ہے۔ ایک نصب العین اختیار کرنے کے بعد جو آزمائشیں آتی ہیں۔ جب اپنی ہی دنیا میں انسان اجنبی بن جاتا ہے۔ جب مختلف قوتیں مزاحم ہوتی اور افراد و ادارات ہر کے ایمان و قوت برداشت کو چیلنج کرتے ہیں جب منزل دور نظر آتی ہے تو شاعر مایوس نہیں ہوتا۔ اس کا ایمان حق پر سے اٹھ نہیں جاتا۔ حق اور باطل کی معرکہ آرائی میں وہ اپنے عمل اور قول سے حق ہی کی مدد کرتا ہے۔ دوست نہ ملا نہ سہی مگر دشمن سے اتحاد نہ کریں گے۔ اس عزم کا اظہار معمولی دل و دماغ کا آدمی نہیں کر سکتا۔ ایسا وہی کر سکتا ہے جس کی آنکھ میں بصیرت کا نور اور سینے میں شیر کا دل ہوگا۔ جو زمانے کو خلاف دیکھ کر اپنے عقیدے کے اظہار سے ڈرے گا نہیں۔ جو اپنے مددگاروں کی کمی دیکھ کر ظالموں اور جابروں سے دبے گا نہیں۔ جو حق و باطل کی عالمگیر معرکہ آرائی میں ہرگز انفعالی حیثیت نہ اختیار کرے گا۔

آتش کی طبیعت کا یہی رنگ اور عمل کی یہی روح تھی جس نے مروجہ تصوف سے انہیں دور رکھا، راہ سلوک کے مقامات و واردات کا بیان بہتیرے شاعروں کے یہاں ملتا ہے مگر کم ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اپنے اشعار کو اس سے دو آتشہ بنایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص عملاً ان امور کا رمز شناس نہ ہو اس کی طبیعت میں وہ سوز و گداز اور نظر میں وہ بصیرت و وسعت نہیں پیدا ہو سکتی جو شاعری کو نشۂ دیگر بنا سکے۔ تصوف کے اثر سے شاعری میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ نظر کے شوق جام کے ساتھ دل بھی طور بن چکا ہے۔ یہ تو ہوئی ایک بات اس کے مقابل ایک دوسری بات ہے جو سادہ، موثر، واضح اور زیادہ زندگی بخش ہے۔ وہ ہے عملی زندگی میں اخلاقی قوانین کی پابندی کے ذریعہ تزکیۂ نفس۔ اپنی شخصیت کے ارتقا اور اپنی خودی کی حفاظت میں زندگی کے کاروبار انجام دیتے ہوئے کرنا۔ آتش نہ جوگ کے قائل ہیں اور نہ رہبانیت کے۔ ان کے سامنے عام آدمی کا یہ سادہ سوال ہے کہ آخر اس زندگی کو جو ہمیں مل گئی ہے کیا کیا جائے؟ آتش، دقیق اور پیچیدہ جواب نہیں دیتے۔ وہ فلسفہ کی بھول بھلیوں میں نہیں بھٹکتے۔ ان کی سلامتیٔ طبع نے حقیقت تک ان کو پہنچا دیا ہے اور اس حقیقت پر ان کا ایمان مستحکم ہے۔ یقین تمام دھندلکوں کو مٹا دیتا ہے اور صبح کے اجالے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے تاریکی کبھی تھی ہی نہیں۔ آتش کو مسائل تصوف سے زیادہ دلچسپی

انہیں دل چسپی زندگی سے ہے کہ وہ باوقار گذرے، عزت و آبرو سے گذرے، آزادی اور خودداری کے ساتھ گذرے۔ چنانچہ تقیین ہے خوبی، وبے نیازی کی وہ خاص تلقین کرتے ہیں۔ یہی وہ روح ہے جو فکر و خیال کو تابندگی اور عمل کو رنگ و دوام عطا کرتی ہے جو ہر تہذیب کو صحیح رنگ اور ہر لغات کا صحیح مفہوم متعین کرتی ہے۔ آتش کے کلام میں یہ روح گو ہر شب چراغ بن کر رواں دواں ہے۔

چشم بینا بھی عطا کی، دل آگہ بھی دیا	میرے اللہ نے مجھ پہ کئے احساں کیا کیا
دی ہے جو تو نے نشہ عزت کو آبرو	کوثر کا پانی ایسا ہے سلسبیں کا
یہ حال ہوا اس کے فقیروں سے ہویدا	آلودہ دنیا جو ہے بیگانہ ہے اس کا
دین و دنیا کا طلب گار ہنوز آتش ہے	یہ گدا اس تل نقد دو جہاں ہے کہ جو تھا

ملا واحدی صاحب کی دو قابل قدر کتابیں!

حیات سرور کائنات ؐ

ماہر القادری — ماہنامہ فاران میں لکھتے ہیں

"حیات سرور کائنات ؐ میں واحدی صاحب نے واقعات کو جس سہل اور سلیس انداز میں پیش کیا ہے وہ بلاشبہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے، دلی کی ٹکسالی زبان، تکلف، آورد اور تصنع سے دور۔ بعض مقامات، جن میں ارباب سیر کے درمیان اختلاف رائے رہا ہے اُن سے واحدی صاحب نہایت اعتدال اور توازن کے ساتھ گزرے ہیں اور کہیں کہیں تو ان کے دو جملوں سے دل کی کھٹک جاتی رہتی ہے۔ خلوص اور عشق رسول ایک ایک سطر سے جھلکتا ہے۔ ملا واحدی صاحب سلجھی ہوئی فکر متوازن دماغ، پاک صاف زندگی اور درد مند دل رکھتے ہیں۔ اُن کی تحریر میں بھی ان اوصاف کی جھلک موجود ہے"۔

"حیات سرور کائنات" کے دو حصے چھپ چکے ہیں۔ پہلے حصے کی ضخامت ۳۰۴ صفحے ہے قیمت سوا چار روپے۔ دوسرے حصے کی ضخامت ۲۵۰ صفحے ہے قیمت ساڑھے تین روپے۔ دونوں حصے الگ الگ مجلد ہیں۔

میرے زمانے کی دلّی

انجمن ترقی اُردو پاکستان کے ترجمان اخبار قومی زبان کی رائے۔

ملا واحدی صاحب دلی سے پرانا تو خالی ہاتھ آئے تھے لیکن ان کے ذہن میں اس "دیار رنگ و بو" کی بے شمار یادیں تھیں، اَن گنت تصویریں تھیں، لاتعداد رعنائیاں تھیں، جنہیں کوئی نہ چھین سکا اور جنہیں وہ خود بھی فراموش نہ کرسکے میرے زمانے کی دلی اُنہیں یادوں، تصویروں اور رعنائیوں کا ایک دل کش مُرقع ہے۔ واحدی صاحب نے اپنے زمانے کی دلی کی تصویر کچھ اس طرح کھینچی ہے کہ یہ کتاب بہترین ثقافتی اور تہذیبی تاریخ بن گئی ہے، جس میں دلی ہے، دلی والے ہیں اور وہ سب کچھ ہے جس کی بنا پر دلی کبھی "عالم میں انتخاب" شہر تھا۔

کتاب مجلد ہے

ضخامت ۳۲۴ صفحے

قیمت، ساڑھے تین روپے

حافظ محمد عالمگیر خاں کیف ٹونکی

کیفِ تغزّل

افسوس ہے کہ ہم اُن اربابِ کمال کو بھلاتے چلے جا رہے ہیں، جن کے افکار نے شعر و ادب کے سرمایہ میں اضافہ کیا ہے اور گیسوئے اردو کو سنوارا ہے، آج کی صحبت میں ایسی ہی ایک یاد کو تازہ کیا جا رہا ہے۔

محمد عالمگیر خاں نام، کیفؔ تخلص، ریاست ٹونک مولد و منشا، ۱۳۰۹ ہجری (۱۸۹۱ء) میں پیدا ہوئے، والد کا نام جہانگیر خاں تھا، بچپن ہی میں والد کے سایۂ شفقت سے محروم ہو گئے، بارہ سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کیا، اور مکتب میں اُردو و فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ریاست ٹونک اس زمانہ میں شعر و ادب اور علم و فن کا گہوارہ بنی ہوئی تھی، کیفؔ نے اسی علمی ماحول اور شعر و سخن کی فضا میں، تربیت پائی؛ چودہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا، اور مقامِ حیرت ہے کہ اُن کی سب سے پہلی غزل کا مطلع یہ تھا۔ ؎

ضبطِ اُلفت فغاں نہ ہو جائے
آگ دب کر دھواں نہ ہو جائے

نواب بیباں خاں استد لکھنؤ کے ایک باکمال اُستاد تھے، کچھ دنوں اُن کا قیام ٹونک میں رہا، کیفؔ نے انہی کو اپنا کلام دکھانا شروع کیا، کیفؔ نے طبیعت خداداد اور ہمہ گیر پائی تھی، مشق و مطالعہ اور تجربہ و مشاہدہ کے ساتھ ساتھ کلام نکھرتا گیا، یہاں تک کہ تمام اصنافِ سخن میں قدرتِ تام اور یدِ طولیٰ حاصل ہو گیا، حضرت کیفؔ عشقِ رسولؐ میں سرشار تھے، اس لئے نعت و منقبت کا رنگ عاشقانہ کلام پر غالب رہا۔ نعتیہ کلام کا مجموعہ "وسیلۂ شفاعت" کے نام سے چھپا اور مقبولِ عام ہوا، کیفؔ کی نعتیہ غزلیں اُن کے نام کو زندہ رکھیں گی۔ فنِ عروض سے جنابِ کیفؔ کو خاص لگاؤ تھا، اس فن کو بڑی کاوشوں سے حاصل کیا، اور قدرتِ کلام کے ساتھ فنِ عروض میں مہارت کے سبب اپنے زمانہ کے معروف اساتذہ سے "امام الشعراء" کا خطاب حاصل کیا۔

کیفؔ ٹونکی کو بدیہہ گوئی میں کمال حاصل تھا، ایک بار مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم نے داغؔ کی مشہور غزل:-

بھرے راہ سے وہ یہاں آتے آتے　　　اجل مر رہی تو کہاں آتے آتے

پر غزل کہنے کی فرمائش کی، حضرت کیفؔ نے حسبِ عادت ٹہلتے ہوئے ذرا سی دیر میں غزل کہہ دی۔ مطلع تھا ؎

لگی دیر اتنی کہاں آتے آتے
کہاں رہ گئے تھے یہاں آتے آتے

غزل پڑھنے کا انداز بہت دلکش تھا، شعر کیا پڑھتے تھے یوں کہئے کہ شعر کی تصویر کھینچ دیا کرتے تھے، اور مترنم شعراء کی موجودگی میں مشاعرے پر چھا جاتے۔

شری مہاراجہ بھوانی سنگھ والی ریاست جھالرہ پاٹن نے کیفؔ ٹونکی کی بڑی قدردانی کی، اور داد و دہش سے انہیں نہال کر دیا، فرطِ محبت و عقیدت کا یہ عالم کہ مہاراجہ بہادر انہیں "کیفِ بھگوان" کہہ کر پکارتے تھے، مہاراجہ بھوانی سنگھ کے انتقال کے بعد کیفؔ جھالرہ پاٹن سے ٹونک چلے آئے۔ کچھ دنوں کے بعد ان کے جانشین مہاراجہ راجندر سنگھ کرکٹ ٹورنامنٹ دیکھنے کے لئے ٹونک تشریف لائے اور

جب انہیں حضرت کیفؔ کی علالت کا پتہ چلا، تو ٹونک کی تنگ گلیوں سے گزر کر، کیفؔ کے گھر پہ جا کر مزاج پرسی کی اور اصرار کر کے اپنے پاس لے گئے۔ ہز ہائی نس نے اُن کے علاج میں کوئی کسر اٹھا کر نہیں رکھی مگر موت ایک لاعلاج مرض ہے۔ جس کی کوئی دوا نہیں ہے، آخر وہ دن بھی آگیا، جو ہر نفس کے لئے مقدر کر دیا گیا ہے، ۲۰ رمئی ۱۹۴۳ء کو جے پور ہی میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا!

مرحوم کے فرزند جناب سبحت ٹونکی بھی قادر الکلام شاعر تھے، وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اُن کے پوتے جناب محمد عمر صیفی اس خاندان کی یادگار ہیں۔ شعر بھی کہتے ہیں اور شعر گوئی سے زیادہ زبان و ادب کی ناقدانہ بصیرت رکھتے ہیں۔

اس مختصر تذکرے کے بعد، کیفؔ ٹونکی کے چند منتخب اشعار پیش کئے جاتے ہیں، تاکہ پڑھنے والوں کا ذوق خوب سیر ہو کر کیف اندوز ہو سکے۔ ؎

تعلق کیوں نہ ہو منزل ہوا ہر جسم سے جاں کا
کہ ہر ذی روح ہے اک بلبلہ دریائے امکاں کا

تو دن کو تڑپتا مرا دیکھے تو تڑپ جائے
تو نے ابھی کچھ اے شب ہجراں نہیں دیکھا

تم سامنے آؤ یہ سمجھنا کہ ہے پردہ
ہم دیکھ کے کہہ دیں گے کہ ہاں ہاں نہیں دیکھا

آپ کو سر پہ بٹھائے کہ بٹھائے آنکھوں پر
آئیے آپ کا آنا ہے سر آنکھوں پر

لب بند، گم حواس، تحیر نگاہ میں
تصویر بن گیا ہوں تری جلوہ گاہ میں

مانوس رنگ حسن سے کھٹکے فغاں کے ہیں
پھولوں میں تل رہے ہیں یہ کانٹے کہاں کے ہیں

جو دشواری کے خوگر ہیں انہیں مشکل بھی آساں ہے
جو آسانی کے خوگر ہیں وہی مشکل میں پڑتے ہیں

درد وہ نقش قدم جو کبھی جم کر نہ ہٹے
دم وہ زہر دگر جو دن رات رواں ملتے

دل ٹھہرنے کی کوئی بات تری ہاں میں نہیں
اب تو کہنے کو بھی تسکیں ترے پیماں میں نہیں

ہر بشر دل میں ترا داغ لئے پھرتا ہے
گل کھلائے ہیں وہ تو نے جو گلستاں میں نہیں

گلوں کے سر پہ چڑھا ہے پکارنے کیلئے
خزاں کا خون ہے یہ موسم بہار نہیں

قتل میں ہاتھ پاؤں مرے کیوں نہ پھول جائیں
وہ اکھڑ گئے ہیں پاؤں فلک کے دیکھے ہاتھ

کشش الفت کی تربت پر انہیں بعد فنا لائی
یہ جب لاتی تو کیا ہوتا یہ اب لائی تو کیا لائی

رشک اس بزم میں پھر شمع بنا دے گا مجھے
آج پھر شام سے جلنا ہے سحر ہونے تک

بجا ہے دوسری موت اک ہے لئے ادا تیری
کہ ایک موت مقرر ہے دو جہاں کے لئے

وفا پسند طبیعت ستم نواز وہ شوخ
بس اب تڑپتے رہیں گے سکون پا چکے

لطف غربت میں وہ پایا کہ وطن چھوڑ دیا
جب سے جنگل کی ہوا کھائی چمن چھوڑ دیا

منتظر ہی نہ کہیں عاشق ناشاد رہے
شب کا وعدہ تمہیں اللہ کرے یاد رہے

عہد سمجھو تو کسی عہد کے پابند رہو
یاد رکھو تو کوئی بات تمہیں یاد رہے

آبرو کے لئے ہے ایک زمانہ درکار
مدتیں چاہئیں قطرے کو گہر ہونے تک

آج شب بھر ترے اقرار نے رکھا بے چین
کروٹیں شام سے بدلی ہیں سحر ہونے تک

میں اور کروں کسی سے تمہارا گلہ دروغ
بہتان۔ لغو۔ جھوٹ۔ غلط۔ افترا۔ دروغ

مدت درد نمک ہو تو چکھا دیں تم کو
دل بھی کیا کوئی تماشہ ہے دکھائیں کیوں کر

خود ہی تم یاد محبت سے کیا کرتے تھے
خود ہی تم بھول گئے عاشق ناشاد کی یاد

سنتے ہیں دیکھ کے مجھے دربان کہتے ہیں
در پہ کھڑا ہے کون یہ دیوانے کی طرح

تم سے لینے کے لئے کس نے دیا ہے دل کو
تم نے ٹھوکر نہیں کھائی ہے سنبھلنے کے لئے

صیاد گلشن میں ہے بے بال و پر بلبل
کیوں کر چمن سے نکلے، کیوں کر رہے چمن میں

گلہائے تازہ

عروج زیدی

ہم خسیسی ہیں تو چل سکتے ہیں انگاروں پہ
اور یہ وقت اگر آئے جفاکاروں پہ؟

آئے دن بڑھتی رہی گردش دوراں پر نہ جا
دھوپ ڈھلنے کے لئے چڑھتی پھر دیواروں پر

نارسائی کا سبب آئینہ ہو جائے گا
تبصرہ کون کرے قافلہ سالاروں پر

لن ترانی سے ملا میری گزارش کا جواب
یہ بھی احسان تجلی ہے نظاروں پر

کون ہے تیرے سوا جس کو پکاروں اے دوست
ہر مصیبت میں نظر جاتی ہے غمخواروں پر

شفقت کاظمی

جفائے دوست باندازۂ محبت تھی
ہمارے حال میں اُن کی بڑی عنایت تھی

مرے خلوص کا بھی ذکر تھا ضرور وہاں
جہاں جہاں تری بیداد کی حکایت تھی

اُٹھی جو مجھ پہ بعنوانِ بے رُخی اکثر
وہی نگاہ مرے شوق سے عبارت تھی

خوشا وہ اپنی محبت کی ناپذیرائی
تری نگاہ کو جس پر بڑی ندامت تھی

حمدان بیتاب

ان کی کوشش سے بھی نہ بہلے ہم
کھل گیا سب تسلیوں کا بھرم

بزم عالم کی ہے نئی تشکیل
اک بہانہ تھی لغزشِ آدم

بُت میں اب دلبری ستم میں نہیں — الاماں ارتقائے اہلِ حرم
دل گنہگار رہ کے بھی معصوم — پاک دامانیٔ نظر کی قسم
سوئے دل چشمِ التفات نہ کر — لُٹ چکے ہم بہت فریبِ کرم
مسکراتے ہی آنکھ بھر آئی — دل کو کتنا ہے پاسِ عصمتِ غم
اور روشن ہوئے مٹنے سے — مرحبا اہلِ دل کے نقشِ قدم

پھر کوئی غم ملے کہ ملے عنوان
پھر ہوئی دل کو آرزوئے کرم

حسنین کاظمی

آسمان پر چراغ جلتے نہیں — یہ مرے دل کے داغ جلتے ہیں
کس کے ماتم میں گم ہیں سینہ فگار — کیا ہوا ہے جو [illegible]
بزمِ الفت میں آج اندھیرا ہے — [illegible] سر پر اغ جلتے ہیں
شاد دنیا سے اُٹھ گیا [illegible] — [illegible] ہاں خوشی میں چراغ جلتے ہیں

مجید سرور انصاری

الٰہی بیرویٔ رہ ہی فرزانگی تو کیا ہوگا — نہ کام آئی جو خود آگہی تو کیا ہوگا
ابھی تو برہمیٔ زلف ہی قیامت ہے — کچھ اور ہوگئی مشاطگی تو کیا ہوگا
میں باغِ دہر میں ناکام آرزو ہی سہی — کھلی نہ ان کے بھی دل کی کلی تو کیا ہوگا

شفقت کاظمی

کتنے شکوے تھے جو کبھی حضور — خیر گزری کہ یاد آ نہ سکے
ہائے مجبوریاں محبت کی — تجھ سے مل کر بھی تجھ کو پا نہ سکے
دل میں وہ آگ تم نے بھڑکائی — جس کو رو رو کر بھی ہم بجھا نہ سکے
ایسے الجھے غمِ حیات میں ہم — زندگی بھر فراغ پا نہ سکے

رشید کوثر فاروقی۔

یہ قدم قدم تامل یہ جھجک جھجک ارادے — کوئی میرِ کارواں سے کہو جلدی کی لے بڑھا دے
سرِ بزم اے مغنی مجھے تو نہ دے سکے گا — وہ سکوت کا ترنم جو ضمیر کو جگا دے

یہی فتحِ آرزو ہے کہ شکستِ آرزو دے
تگ و تازِ آرزو کے نئے سلسلے ملا دے

میں وطن کی ناشناسی اسی بے زباں سے پوچھوں
جو کچل گئی ہے، لی وہ کلی مجھے اٹھا دے

مرے ہم جلیس جب تو مرا ہمسفر نہیں ہے
میں چلا، خدا تجھے بھی دلِ دردآشنا دے

یہ کمالِ زندگی ہے کہ جب آفتاب ڈوبے
تو فلک کو نور دے کر نئی انجمن سجا دے

عجب امتحاں ہے کہ تمیزِ خیر و شر بھی
وہی آگ دے اجالا، وہی بستیاں جلا دے

زکی کاکانی

نہ ہے نصیب کہ تاروں کی قربتیں ہیں نصیب
اب آشیانہ بنائیں گے آسماں کے قریب

امیرِ شہر کی باتوں میں لطف آتا ہے
جب اپنے آپ کو کہتا ہے صبحِ نو کا نقیب

[illegible] رہ کر ہیں آسماں سے بلند
جنہیں بلندیِ فکر و نظر ملی ہے نصیب

وہ بستیوں میں [illegible]
دل و نگاہ رہیں ایک دوسرے کے رقیب

ملے گا لطفِ تمنا ہی کشاکش [illegible]
وہ ایک شخص اٹھائے پھرتا ہے اپنی صلیب

زمانہ کیا ہے بس اک کاروانِ مرگ و حیات
تمام عمر رہے تذکرے محبت کے
میں سوچتا رہا آخر یہ حادثہ تھا کتنا عجیب

انور ڈیروی

اٹھاؤ کوئی قدم ربطِ باہمی کے لئے
ترس رہا ہے جہاں صلح و آشتی کے لئے

بھٹک رہے ہیں اندھیرے میں سینکڑوں انساں
جلاؤ شمعِ محبت کی روشنی کے لئے

فریب راہنما نے ڈرا دیا ہے ہمیں
اب انتخاب کریں کس کو رہبری کے لئے

ماہر القادری

سوزِ غم ہر کسی سے چھپانا پڑا
دل لہو تھا مگر مسکرانا پڑا

تلے کرنے پڑے، حشر اٹھانا پڑا
سو رہا تھا زمانہ جگانا پڑا

شعلۂ گل کی وہ تاب کیا لائیں گے
جن کو شبنم سے دامن بچانا پڑا

اتنی شاید کشش دردِ دل میں نہ تھی
جس قدر ان کو نزدیک آنا پڑا

مسکراہٹ لبوں پر جبیں بے شکن
کوہِ غم اس طرح بھی اٹھانا پڑا

بجلیوں کا تو رخ تھا قفس کی طرف
راستے میں مرا آشیانہ پڑا

کھوئی کھوئی اچٹتی اچٹتی نظر
کس قدر ٹھیک دل پر نشانہ پڑا

شعر سننے کو چاہا کبھی ان کا دل
ماہر القادری کو بلانا پڑا

راز یزدانی

دیکھے ہیں ماہتاب میں، داغ آفتاب میں
اب اور کس کو ڈھونڈیں تمہارے حجاب میں

کچھ لفظ میں نے کہہ تو دیئے اضطراب میں
عاجز ہیں اب زمان و مکاں سب جواب میں

آخر کو موت نے یہ بتایا کہ آج تک
سوئے بھی ہم تو خواب میں جاگے بھی خواب میں

خوابِ سکوں کی زیست میں تعبیر کیلئے
سچ ہے کہ خواب دیکھتے ہی جلتے ہیں خواب میں

گو رات جھیلتا ہوں مصائب تو کیا گلہ!
گستاخیٔ نگاہ ہوا ان کی جناب میں

سجدوں سے تھا بلند بہت نقشِ پائے دوست
مجھ سے بڑا قصور ہوا اضطراب میں

بے شک دعا قبول ہوئی رازؔ کی مگر
آئے ہے گھر کے ابر شبِ ماہتاب میں

سراج حیدرآبادی

شبِ غم جب مرے لب پر تمہارا نام آتا ہے
تصور میں طلوعِ صبح کا ہنگام آتا ہے

شبِ فرقت گزر جاتی ہے تاریکی نہیں جاتی
سحر کے ساتھ ہی دل میں خیالِ شام آتا ہے

غرورِ آگہی بھی تیری راہوں میں ہے گمراہی
جو تم چاہو تو لغزش کا سہارا کام آتا ہے

پہنچ کر تیری منزل سے کوئی واپس نہیں آتا
وہی مشہور ہو جاتا ہے جو ناکام آتا ہے

ترے چھپنے سے ہے ذوقِ نظر کی آبرو باقی
حجاب اٹھے تو تابِ دید پہ الزام آتا ہے

سراجؔ ان کی وفاؤں پر تمہیں کیوں بدگمانی ہے
کہ اب بھی اُن کی محفل میں تمہارا نام آتا ہے

لقدری

قطرۂ خوں نوکِ مژگاں پر نمایاں کیوں نہ ہو
ایک ہی جگنو سہی لیکن فروزاں کیوں نہ ہو

تھی یہی مرضی زمانے کی یہی منشائے دوست
عشق اپنی خانہ ویرانی پہ نازاں کیوں نہ ہو

جب یہی دستور ہے، اوّل فنا، آخر فنا
زندگی خود موت سے دست و گریباں کیوں نہ ہو

چٹکیاں لیتی ہے فطرت، چیخ اٹھتا ہے ضمیر
کوئی کتنا ہی حقیقت سے گریزاں کیوں نہ ہو

دل یہ کہتا ہے کہ اُن سے بیوفائی کفر ہے
عقل کہتی ہے شکستِ عہد و پیماں کیوں نہ ہو

کچھ نہ کچھ تو چاہیئے تفریح رندوں کے لئے
چاہے اب وہ عصمتِ صبحِ بہاراں کیوں نہ ہو

بے یقینی موت ہے، قلب و نظر کی موت ہے
زندگی، تا ہر د نورِ ایماں کیوں نہ ہو

روحِ انتخاب

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

شب برات

شب برات کو عموماً مسلمانوں کا ایک تہوار سمجھا جاتا ہے۔ اس کے کچھ مراسم بھی مقرر کر لئے گئے ہیں جن کی شدت سے پابندی کی جاتی ہے۔ دھوم دھام کے لحاظ سے تو گویا محرم کے بعد اسی کا نمبر ہے۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ یہ خواہ مخواہ کا بناوٹی تہوار ہے۔ قرآن میں اس کی کوئی حیثیت ہے، نہ حدیث میں۔ نہ صحابہ کرام کے دور کی تاریخ ہی میں اس کا کوئی پتہ نشان ملتا ہے، ورنہ ابتدائی زمانہ کے بزرگان دین ہی میں کسی نے اس کو اسلام کا تہوار قرار دیا ہے۔

دراصل اسلام رسموں اور تہواروں کا مذہب ہے ہی نہیں۔ یہ تو ایک سیدھا اور معقول مذہب ہے، جو انسان کو رسموں کی جکڑ بندیوں سے، کھیل تماشے کی بے فائدہ مشغولیتوں سے اور فضول کاموں میں وقت، محنت اور دولت کی بربادیوں سے بچا کر زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی طرف توجہ دلاتا ہے اور ان کاموں میں آدمی کو مشغول کرنا چاہتا ہے جو دنیا اور آخرت کی فلاح و بہبود کا ذریعہ ہوں۔ ایسے مذہب کی فطرت سے یہ بالکل بعید ہے کہ وہ سال میں ایک دن حلوہ پکانے اور آتش بازیاں چھوڑنے کے لئے مخصوص کرے اور آدمی سے کہے کہ تو مستقل طور پر ہر سال اپنی زندگی کے چند قیمتی گھنٹے اور اپنی محنت سے کمائے ہوئے بہت سے پیسے ضائع کرتا رہ کر۔ اور اس سے بھی زیادہ بعید یہ ہے کہ وہ کسی ایسی رسم کا انسان کو پابند بنائے جو صرف وقت اور روپیہ ہی برباد نہیں کرتی بلکہ بعض اوقات جانوں کو بھی ضائع کرتی ہے اور گھر تک پھونک ڈالتی ہے۔ اس قسم کی فضولیات کا حکم دینا تو درکنار، اگر ایسی کوئی رسم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود ہوتی تو یقیناً اس کو حکماً روک دیا جاتا، اور جو ایسی رسمیں اس زمانہ میں موجود تھیں ان کو روکا ہی گیا۔

حلوے اور آتش بازی کا معاملہ تو خیر اس قدر کھلا ہوا ہے کہ جو شخص کچھ بھی اسلام کے متعلق جانتا ہے وہ پہلی نظر ہی میں کہہ دے گا کہ ان چیزوں کی پابندی اس مذہب کی روح کے خلاف ہے مگر جب ہم تلاش کرتے ہیں کہ شعبان کے مہینہ میں اس خاص دن کے ساتھ کوئی مستند مذہبی عقیدہ وابستہ ہے، یا کوئی لازمی عبادت مقرر ہے تو ہم کو اس کا بھی کوئی نشان نہیں ملتا۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی چیز اسلامی لٹریچر میں ملتی ہے تو وہ یہ ہے کہ ایک دفعہ شعبان کی پندرھویں شب کو حضرت عائشہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بستر پر نہ پایا اور وہ آپ کو تلاش کرنے کے لئے نکلیں۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے بقیع کے قبرستان پہنچیں۔ وہاں آپ کو موجود پایا۔ وجہ دریافت کرنے پر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اس رات کو اللہ تعالیٰ آسمانِ دنیا کی طرف توجہ فرماتا ہے اور قبیلۂ کلب کی بھیڑوں کے جس قدر بال ہیں اس قدر انسانوں کے گناہ معاف فرماتا ہے۔ لیکن حدیث کے مشہور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے اور اپنی یہ تحقیق بیان کی ہے کہ اس کی سند صحیح طور پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تک نہیں پہنچتی۔ بعض دوسری روایات میں جو کم درجہ کی کتب حدیث میں ملتی ہیں، اس رات کی یہ فضیلت بیان کی گئی ہے کہ اس میں قسمتوں کے فیصلے کئے جاتے ہیں اور پیدائش اور موت کے معاملات طے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سب روایات ضعیف ہیں۔ ہر ایک کی سند میں کوئی نہ کوئی کمزوری موجود ہے اس لئے حدیث کی قدیم تر اور زیادہ معتبر کتابوں میں کہیں ان کا ذکر نہیں ملتا۔ تاہم اگر انکی کوئی اہمیت تسلیم بھی کر لی جائے تو

حدیث اتنا ہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس رات میں عبادت کرنا اور مغفرت کی دعا کرنا ایک اچھا فعل ہے جسے انفرادی طور پر لوگ کریں تو ثواب پائیں گے۔ اس سے بڑھ کر کوئی ایسی چیز ان روایتوں سے ثابت نہیں ہوتی جس سے یہ سمجھا جائے کہ چودھویں تاریخ گویا پندرھویں شب کو اسلام میں عید قرار دیا گیا ہے یا کوئی اجتماعی عبادت مقرر کی گئی ہے۔

حدیث کی زیادہ معتبر کتابوں سے جو بات ثابت ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر رمضان کی آمد سے پہلے ہی شعبان کے مہینہ میں ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ رمضان کا مہینہ وہ مہینہ ہے جس میں آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغمبری جیسے عظیم الشان منصب پر مامور کیا گیا اور قرآن جیسی لازوال کتاب کے نزول کا آغاز ہوا۔ اس وجہ سے نہ صرف رمضان میں آپ غیر معمولی طور پر عبادت فرمایا کرتے تھے بلکہ اس سے پہلے ہی آپ کی لَو خدا سے لگ جاتی تھی۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ رمضان کے سوا سال کے باقی گیارہ مہینوں میں صرف شعبان ہی ایسا مہینہ تھا جس میں آپ سب سے زیادہ روزے رکھتے تھے بلکہ تقریباً پورا مہینہ ہی روزے رکھتے گزر جاتا تھا۔ لیکن آپ کا یہ طرز عمل اپنی ذات کے لئے خاص تھا۔ وہ اس گہرے روحانی تعلق کی بنا پر تھا جو نزولِ قرآن کے مہینے سے آپ کو تھا۔ سب مسلمانوں کو آپؐ نے ہدایت فرما دی تھی کہ وہ شعبان کے آخری پندرہ ...... دنوں میں روزے نہ رکھا کریں، کیونکہ اس میں یہ اندیشہ تھا کہ اگر لوگ عادتاً لوگ اس مہینہ کے آخری دنوں میں روزے رکھنے لگے تو رفتہ رفتہ یہ ایک لازمی رسم بن جائے گی اور رمضان کے فرض روزوں پر خواہ مخواہ مزید روزوں کا اضافہ ہو جائے گا۔ وہ اس طرح لوگوں پر وہ بار پڑ جائے گا جو خدا نے ان پر نہیں رکھا۔

اسلام میں خاص طور پر یہ بات ملحوظ رکھی گئی ہے، کہ جو کچھ خدا نے اپنے بندوں کے لئے لازم کیا ہے، اس کے سوا کوئی دوسری چیز بندے خود اپنے اوپر لازم نہ کر لیں، کوئی خود ساختہ رسم، کوئی مصنوعی قاعدہ کوئی اجتماعی عمل ایسا نہ ہو کہ جس کی پابندی لوگوں کے لئے فرض کی طرح بن جائے۔ خدا زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اس کے بندوں کی بھلائی کن چیزوں کی پابندی میں ہے اور کس چیز کی کتنی پابندی میں ہے۔ اس کی قائم کی ہوئی حدوں سے تجاوز کر کے اگر بندے بطور خود کچھ رسمیں مقرر کر لیں گے اور فرض کی طرح ان کی پابندی کریں گے تو اپنی زندگی کو آپ تنگ کر لیں گے۔ پچھلی قوموں نے یہی غلطی کی تھی کہ نئی نئی رسمیں ایجاد کر کے اپنے اوپر فرائض و واجبات کے رقبے پر رقبے چڑھاتی چلی گئیں اور رفتہ رفتہ رسمیات کا ایک ایسا تانا بانا اپنے گرد بُن ڈالا جس کے جال نے آخرکار ان کے ہاتھ پاؤں جکڑ کر رکھ دیئے۔ قرآن ان رسموں کو زنجیروں سے تشبیہہ دیتا ہے، اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کا ایک بڑا کام یہ بتاتا ہے کہ اُن زنجیروں کو کاٹ پھینکیں جن میں انسان نے اپنے آپ کو خود کس رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت محمدیؐ میں فرائض کا ایک نہایت ہلکا اور سادہ ضابطہ تجویز کر کے باقی تمام رسموں کا خاتمہ کر دیا گیا، عید اور بقرعید کے سوا کوئی تہوار نہ رکھا گیا، حج کے سوا کوئی جاترا نہ رکھی گئی۔ زکوٰۃ کے سوا کسی نذر نیاز یا دان پُن کو فرض نہ کیا گیا، اور ہمیشہ کے لئے یہ اصول طے کر دیا گیا کہ انسان کو جس طرح خدائی فرض میں کوئی چیز کم کرنے کا حق نہیں ہے، اسی طرح کوئی چیز بڑھانے کا حق بھی نہیں ہے۔

ابتدائی زمانہ میں جو لوگ شریعت محمدیؐ کی روح کو سمجھتے تھے وہ سختی کے ساتھ اس اصول کے پابند رہے۔ انھوں نے نئی رسمیں ایجاد کرنے سے انتہائی پرہیز کیا اور جو چیز ذرا سی رسم بنتی نظر آئی اس کی فوراً جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ انہیں معلوم تھا کہ ایک چیز جس کو نیکی اور ثواب کا کام سمجھ کر ابتدا میں بڑی نیک نیتی کے ساتھ شروع کیا جاتا ہے وہ رفتہ رفتہ کس طرح سنت، پھر واجب، پھر فرض، اور آخرکار فرضوں سے بھی زیادہ اہم بنتی چلی جاتی ہے۔ اور جہالت کی بنا پر لوگ اس نیکی کے ساتھ کس طرح بہت سی برائیاں ملا جُلا کر ایک قبیح سی رسم بنا ڈالتے ہیں۔ اور اس قسم کی رسمیں جمع ہو کر کس طرح انسانی زندگی کے لئے ایک وبال اور انسان ترقی کی راہ میں ایک بھاری روک بن جاتی

ہیں۔ اس لئے ابتدائی دور کے علماء اور امام اس بات کی سخت احتیاط ملحوظ رکھتے تھے کہ شریعت میں کسی نئی چیز کا اضافہ نہ ہونے پائے۔ ان کا یہ مستقل عقیدہ تھا کہ جو چیز شریعت میں نہیں ہے اسے شرعی حیثیت دینا، یا جس چیز کی شریعت میں جو حیثیت ہے اس سے زیادہ اہمیت اس کو دینا بدعت ہے، اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ بعد کی صدیوں میں اس طرف سے انتہائی غفلت برتی گئی اور بتدریج مسلمان بھی خود ساختہ رسموں کے جال میں اسی طرح پھنستے چلے گئے جس طرح دنیا کی دوسری قومیں پھنسی ہوئی تھیں۔ اس خرابی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ بعد کے زمانے میں جو قومیں اسلام کے دائرے میں داخل ہوئیں ان کو صحیح اسلامی تعلیم و تربیت نہ مل سکی۔ وہ اپنے ساتھ پرانے جاہلیت کے بہت سے خیالات و رسوم بہت سے طور طریقے لئے ہوئے اسلام میں آگئیں۔ ان کو صدہا برس سے رسمیات اور تہواروں اور میلوں ٹھیلوں اور جاتراؤں کی عادت پڑی ہوئی تھی۔ اس کے بغیر ان کے لئے مذہبی زندگی میں گویا کوئی لطف ہی نہ تھا۔ اسلام کی سادہ شریعت میں آکر بجائے اس کے کہ وہ پرانی رسموں کا بوجھ اترنے اور پرانی زنجیروں کے بند کٹنے سے اطمینان محسوس کرتیں، انہیں یہاں آتے ہی یہ فکر لاحق ہو گئی کہ کسی طرح وہی بوجھ پھر اپنے اوپر لاد لیں جنہیں اسلام نے اتارا تھا اور پھر وہی بیڑیاں پھر پہن لیں جنہیں اسلام نے کاٹا تھا۔ چنانچہ انہوں نے کچھ تو پرانی جاہلیت کی رسمیں ذرا سی ظاہری صورت بدل کر باقی رکھیں، اور کچھ نئی رسمیں خود ایجاد کیں۔ یہاں تک کہ اسلام کو بھی ویسا ہی رسموں اور تہواروں کا مذہب بنا کر رکھ دیا جیسے ان کے پرانے مذہب تھے۔ ان نئی رسموں کی ایجاد میں ماشاءاللہ خاصی باریک بینی سے کام لیا گیا۔ قرآن اور حدیث کو اس لئے تو نہ چھانا گیا کہ اسلام نے انسانی زندگی کے لئے جو نظام مرتب کیا ہے اس کے اصول معلوم کئے جائیں، بلکہ ساری چھان بین اس لئے کی گئی ہے کہ کہیں ایک نئی رسم ایجاد کرنے کے لئے یا پرانی جاہلانہ رسموں کو جاری رکھنے کے لئے کوئی بہانہ مل سکتا ہے پھر اگر کسی ایک جگہ ایک بال کی نوک کے برابر بھی کوئی اشارہ مل گیا تو اس پر ایک پہاڑ برابر عمارت تعمیر کر ڈالی گئی۔ لوگ اپنی جگہ خوش ہیں کہ اسلام میں تہواروں اور رسموں کی جو کمی تھی اس کو انہوں نے پورا کر لیا ہے۔ حالانکہ دراصل انہوں نے اپنی جہالت سے وہ ساری بیڑیاں پھر پہن لی ہیں جو اللہ نے اپنے نبی کے ہاتھوں سے کٹوا دی تھیں، اور اپنے آپ کو پھر اس جال میں پھانس لیا ہے جس میں پھنس کر دنیا کی قوم کبھی نہ ابھر سکی۔

ہماری نظر میں

صحیح بخاری شریف (جلد اول) مترجم | ترجمہ و فوائد از مولانا محمد داؤد راز ۔ تشریحات ۔ مولانا محمد العلی، مولانا ابوالحسن محمد سعید ۔ محمود ومولانا قاری احمد ۔ ضخامت ۹۴۴ صفحات (مجلد رنگین گردپوش کے ساتھ) قیمت :۔ مجلد پندرہ روپے ۔ ملنے کا پتہ :۔ مطبع سعیدی، قرآن محل، کراچی ۔

محمد سعید اینڈ سنز ناشران و تاجران کتب نے دینی کتابوں کی اشاعت کے لئے اپنے دائرے کو وقف کر دیا ہے ۔ صحیح بخاری شریف کی پہلی جلد کا اردو ترجمہ انھوں نے خاص اہتمام سے چھاپا ہے، اور اردو جاننے والوں کے لئے بڑی سہولت پیدا کی ہے کہ جو لوگ عربی نہیں جانتے وہ صحیح بخاری شریف کے اردو ترجمے سے استفادہ کر سکتے ہیں ۔

کتاب کے آغاز میں ۶۰ صفحے ابواب کی فہرست کے ہیں، اس کے بعد خواجہ عبدالوحید صاحب مدیر ماہنامہ "پیام حق" کا مقدمہ ہے، پھر :۔

"تدوین حدیث، قرون ثلاثہ، اقسام حدیث اور حالات امام بخاری"

جیسے معلومات آفریں مضامین ہیں ۔ خاص طور سے "اقسام حدیث" نہایت ہی اہم مضمون ہے جس میں درایت و روایت اور راویوں کے حالات اور سند کے لحاظ سے احادیث کی قسمیں بتائی گئی ہیں، محدثین کرام پر اعتراض کی حقیقت ۔۔۔ ہوں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کی صحت کو جانچنے کے لئے کس قدر وقت نظر اور باریک بینی سے کام لیا ہے ۔

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا احسان مسلم بلکہ ساری انسانیت پر احسان عظیم ہے، انھوں نے لاکھوں حدیثوں کو طرق و اسناد اور روایت و درایت کے اعتبار سے پرکھ کر اور جانچ کر صحیح احادیث کا انتخاب پیش فرمایا کتاب اللہ کے بعد اسی کتاب کو سب سے زیادہ صحیح اور مستند تسلیم کیا جاتا ہے، "رواہ البخاری" سننے کے بعد کسی حدیث کی صحت پر اعتماد قائم ہو جاتا ہے ۔

صحیح بخاری کی یہ پہلی جلد اردو ترجمے کے ساتھ آئی ہے، متن (اصل عربی عبارت) کے سامنے اردو ترجمہ درج کیا گیا ہے ۔ ترجمہ آسان اور عام فہم ہے :۔ ایک نمونہ :۔

عَنْ عائشۃ قالت ان کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیصلی الصبح فینصرف النساء متلفعات بمروطھن ما یعرفن من الغلس	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم جب صبح کی نماز پڑھ چکتے تھے، تو عورتیں اپنی چادروں میں لپٹی ہوئی لوٹتی تھیں، اندھیرے کے سبب سے پہچانی نہ جاتی تھیں ۔

صحیح بخاری کی اس پہلی جلد میں سات ہزار دو سو پچھتر احادیث آگئی ہیں، محمد سعید اینڈ سنز نے اس کتاب کو چھاپ کر بہت بڑی دینی خدمت انجام دی ہے ۔ فجزاہم اللہ خیر الجزاء ۔

ملا صفحہ ۱۲۱ پر حدیث نمبر ۱۷ میں "وانا ابن خمس سنین" کا ترجمہ چھوٹ گیا ۔

ازالۃ الخفا

از :- حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ، ترجمہ :- مولانا عبد الشکور اور مولانا ثناء اللہ۔
تزئین :- مولانا حامد الرحمن صدیقی ، پہلی جلد (گرد پوش کے ساتھ مجلد) ضخامت ۶۳۸ صفحات ، قیمت :- دس روپے
دوسری جلد (گرد پوش کے ساتھ مجلد) ضخامت :- ۵۵۰ صفحات ، قیمت دس روپے ،
ملنے کا پتہ :- مطبع سعیدی ، قرآن محل ، کراچی۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا نام اور ان کے علمی و دینی کمالات آفتاب و ماہتاب کی طرح روشن ہیں ، ان کی ذات عجم و عرب کے مسلمانوں کے لئے باعث فخر ہے ، شاہ صاحب کے خانوادے نے کم و بیش دو سو سال تک دینی علوم کی شمع کو اپنے نفس گرم اور سوز دل سے روشن رکھا ہے ، ہندوستان کے مسلمانوں پر اس خانوادے کا بہت بڑا احسان ہے ! شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی ذات علوم کا مجموعہ اور کمالات کا گنجینہ تھی ۔ علامہ شبلی نعمانی نے ان کی بارگاہ میں ان لفظوں میں خراج عقیدت پیش کیا ہے :-

"لیکن قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھانا تھا کہ اخیر زمانہ میں جبکہ اسلام کا نفس باز پسیں تھا ، "شاہ ولی اللہ" جیسا نامور شخص پیدا ہوا جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی ، رازی اور ابن رشد کے کارنامے بھی ماند پڑ گئے (تاریخ علم الکلام)

حضرت شاہ صاحب کے یہ کمالات و صفات اپنی جگہ مسلم ہیں مگر اس تصویر کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ کہیں ان کے صریر خامہ سے علامہ ابن تیمیہ کے خیالات کی بازگشت سنائی دیتی ہے اور کہیں وہ شیخ محی الدین ابن عربی کی لے میں لے ملا دیتے ہیں ، خیالات کی اس رنگا رنگی بلکہ تضاد کے سبب شاہ صاحب کے مسلک کا تعین بعض اوقات دشوار ہو جاتا ہے ، دوسری بات جو ان کے یہاں کھٹکتی ہے ، وہ ان کے اس قسم کے دعوے ہیں :-

"اس سلسلہ میں جو کام مجھ سے لئے گئے ہیں وہ یہ ہیں کہ فقہ میں جو رضی (؟) ہے اس کو جمع کیا گیا ہے اور فقہ و حدیث کی از سر نو بنیاد رکھ کر اس فن کی پوری عمارت تیار کی گئی ہے ، اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام تر احکام و ترغیب بلکہ تمام تعلیمات کے اسرار و مصالح کو اس طرح منضبط کیا گیا کہ اس فقیر سے پہلے کسی نے یہ کام اس طرح نہیں کیا تھا۔ علاوہ ازیں کمالات اربعہ ابداع ، خلق ، تدبیر اور تدلی کی حقیقت اور نفوس انسانیہ کی استعدادات کا علم مجھے عطا فرمایا گیا ، اور یہ دونوں علم ایسے ہیں کہ اس فقیر سے پہلے کسی نے ان کے کوچہ میں قدم ہی نہیں رکھا " (اردو ترجمہ)

اور ایک جگہ تو شیخ عز الدین بن عبد السلام رحمۃ اللہ علیہ کا نام لے کر ان سے اپنی سابقت کا دعویٰ فرماتے ہیں :-

"اس فقیر سے پہلے جتنی پختہ بات میں نے کہی ہے ، کسی سے بن نہ آیا ، اس فن کی بنائی مقام کے باوجود اگر کسی کو میرے بیان میں شبہ ہو تو چاہیئے کہ کتاب "قواعد" کو دیکھے ، شیخ عز الدین بن عبد السلام" نے اس میں کیا کچھ کوشش نہیں فرمائی ہے ، مگر اس فن کے عشر عشیر تک ان کی رسائی نہ ہو سکی :

شرعی نقطہ نگاہ سے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے [illegible] دعووں پر کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا مگر ہم ان کے عقیدت مندوں اور خوشہ چینوں کا دل یہ چاہتا ہے کہ کاش ! ان کا صحیفۂ مناقب اس قسم کے دعووں سے ساد[illegible] ہوتا !

ازالۃ الخفا کی پہلی جلد کا یہ اردو ترجمہ پڑھ کر جو چیز ہمارے سامنے آئی ہے ، وہ یہ ہے کہ شاہ صاحب قدس سرہ نے اس کتاب میں جو انداز تحریر اختیار فرمایا ہے ، اور جو قرآنی آیات اور احادیث نقل کی ہیں ان کا مجموعی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خلفاء ثلاثہ (ابوبکر ، عمر ، عثمان رضی اللہ عنہم) کے مقابلہ میں سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی شخصیت ابھر نہیں سکی بلکہ دبی ہوئی نظر آتی ہے ، حالانکہ حضرت علی ابن ابی طالب کی شخصیت معدن صحابہ کے تمام لعل و جواہر کے درمیان گوہر شب چراغ کی مانند صاف دکھائی دیتی ہے ، اور وجدان بے ساختہ پکار اٹھتا ہے :-

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں است

خلافت کے بارے میں حضرت شاہ صاحب کا یہ رجحان ہے کہ یہ "منصوص" ہے اس بارے میں حضرات شاعرہ کی یہ رائے اقرب الی الصواب ہے کہ :-

"خلفائے راشدین کی خلافت پر کسی قسم کی نص نہیں ہے (نہ جلی، نہ خفی، یا نص (تو ہے) مگر جلی نہیں ہے، بلکہ ان کی خلافتیں امر اجتہادی ہیں کہ اس زمانہ کے لوگوں نے اپنے اجتہاد سے ان پر اتفاق کر لیا ہو"

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ "محدث" کے لقب سے مشہور ہیں اور علم حدیث کا ان کو بہت بڑا عالم و مبصر سمجھا جاتا ہے مگر اس کتاب کو پڑھ کر حیرت ہوئی کہ انھوں نے ہر قسم کی حدیثوں کا ایک جنگل اپنی کتاب میں جمع کر دیا ہے، شاہ صاحب کی ذات سے علمی دنیا اس کی توقع رکھتی تھی کہ وہ جانچ کر اور پرکھ کر احادیث نقل فرمائیں گے، مگر حال یہ ہے کہ :-

"غنیۃ الطالبین میں مذکور ہے، بروایت ابی ہریرہ رض، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے، آپ نے فرمایا جب مجھے معراج ہوئی تو میں نے اپنے پروردگار سے درخواست کی کہ میرے بعد خلیفہ علی ابن ابی طالب کو کر دے، فرشتوں نے کہا کہ اے محمد، جو اللہ چاہے کرے گا (اور اللہ کی مشیت یہ ہے کہ) خلیفہ آپ کے بعد ابو بکر رض ہیں" (صفحہ ۸۲)

اس کو قول رسول ہو کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ ——————— اور سنئے :-

"اور ابو القاسم بغوی نے سعید بن عبد العزیز سے روایت کی ہے وہ کہتے تھے کہ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو ذی قربات حمیدی سے (جو یہود کے بڑے عالموں میں سے تھا) پوچھا گیا کہ اے ذی قربات! حضرت کے بعد کون (خلیفہ) ہوگا؟ اس نے کہا امین (یعنی ابو بکر رض) پھر ان کے بعد کون؟ تو اس نے کہا روئیں تن (یعنی عمر رض) پوچھا پھر ان کے بعد کون؟ اس نے کہا ایک سخی آدمی (یعنی عثمان رض) پوچھا گیا، پھر ان کے بعد کون؟ اس نے کہا ایک گورے رنگ کا نجمند آدمی (یعنی معاویہ رض)! (صفحہ ۸۰)

یہ قول جو بنو امیہ کے دور حکومت کا صاف طور سے وضع کیا ہوا معلوم ہوتا ہے، بھلا نقل کرنے کے قابل تھا؟

صفحہ ۸۹ پر ابن عساکر، طبرانی اور دارقطنی کے حوالہ سے لکھا گیا ہے کہ :-

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج میں عرش پر سفید نور سے یہ لکھا ہوا دیکھا :-

"لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، ابو بکر الصدیق، عمر فاروق، عثمان ذو النورین"

ان اقوال کو ذات رسالت مآب سے نسبت دیتے ہوئے دل لرزتا ہے! روایت کے تیور بتاتے ہیں کہ شیعی روایات کے جواب میں ایسے اقوال تراشے گئے ہیں!

اور اسی صفحہ پر یہ عبارت پڑھ کر تو اور زیادہ حیرت ہوئی کہ علی بن عبد اللہ ہاشمی نے ہندوستان کے بعض شہروں میں سیاہ گلاب کا درخت دیکھا جس کے پھول پر :-

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ابو بکر الصدیق، عمر الفاروق۔

لکھا ہوا تھا، حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی مدح و مناقب کے لئے اس قسم کی افسانوی روایتوں کا سہارا لینے کی قطعاً ضرورت نہ تھی!

"سورۂ یٰسین کا پڑھنا دس حج کرنے کے برابر ہے . . . ." (صفحہ ۲۶۲)

"سورۂ یٰسین شریف کے فضائل و برکات تسلیم! مگر محدثین کی یہ تحقیق بھی تو پیشِ نظر رہنی چاہیئے تھی کہ تھوڑے سے ثواب کے کام پر، غیر معمولی اور مبالغہ آمیز اجر و ثواب کا جن روایتوں میں ذکر پایا جائے، وہ صحت و ثقاہت کے درجہ سے گری ہوئی ہیں!

صحابہ کرامؓ کے مختصر حالات شاہ صاحب نے اپنی کتاب میں درج فرمائے ہیں، اُن میں صفحہ ۲۸۶ پر حضرت سلمان فارسی رحمۃ اللہ علیہ کی عمر ڈھائی سو سال بتائی گئی ہے اور صفحہ ۲۹۰ پر یزدگرد شاہ ایران کی بیٹی شہربانو کو حضرت زین العابدین بن حسین (رضی اللہ عنہما) کی ماں تسلیم کیا گیا ہے ——— شاہ ولی اللہ جیسے محقق سے ہم مشہور حکایتوں کے مقابلہ میں تحقیق کی توقع رکھتے تھے

اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیہم .... (صفحہ ۳۶۴)

کی تفسیر میں ابو العالیہ اور حسن کی جو روایت درج کی گئی ہے کہ . .

"اے پروردگار ہمیں سیدھی راہ چلا۔ یعنی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دونوں مصاحبوں (حضرت صدیق، حضرت عمر فاروق) کی راہ پر"

یہ تکلف سے خالی نہیں ہے، پھر اس میں حضرت علیؓ کا نام آخر کیوں چھوڑ دیا۔ وہ بھی تو حضورؐ کے ہدایت یافتہ صحابی ہیں اور اُن ابرار و اتقیاء میں شامل ہیں جو "انعمت علیہم" کا مصداق کہے جا سکتے ہیں! حق یہ ہے کہ اس آیت کا قطعیت کے ساتھ مصداق انبیاء علیہم السلام ہیں! صحابہ کرام و اہل بیت کو بھی مجموعی طور پر "انعمت علیہم" کا مصداق قرار دیا جا سکتا ہے مگر چند مخصوص صحابہ کو اس آیت کا مصداق ٹھہرانا، خاصہ محلِ نظر ہے:-

صفحہ (۳۸۰) "حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آیت کریمہ "وشاورھم فی الامر" سے حضرت صدیق رضؓ اور حضرت عمر رضؓ مراد ہیں" حالانکہ اگر اس آیت سے واقعی حضرت صدیق رضؓ و حضرت عمر رضؓ ہی مراد ہوتے تو آیت میں "ھم" کی جگہ "ھما" ہونا چاہیئے تھا

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے قرآنی آیات سے خلافتِ راشدہ اور خاص طور سے شیخین (صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما) کے لئے اشارے، رموز، بشارتیں اور پیش گوئیاں نکالی ہیں، کوئی شک نہیں کہ اس قسم کے اشارے اور بشارتیں بعض آیات میں ملتی ہیں مگر اُن کے مترجم نے متعدد آیتوں کی تفسیر و تاویل میں خاصی "آورد" اور تکلف پیدا کر دیا ہے! البتہ ایک فرقہ کے مفسرین کی تفاسیر میں یہ چیز ضرور ملتی ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں مومنین، اتقیاء، صلحا اور اہل جنت کی تعریف آئی ہے، وہاں انھوں نے ان آیات کا مصداق "اہل بیت" کو قرار دیا ہے! اور جہاں منافقین، ریاکاروں، اور اہل دوزخ کا ذکر وارد ہوا ہے، وہاں ان کم بختوں نے "صحابہ کرام" کو مصداق ٹھیرایا ہے! —— (استغفر اللہ)

صفحہ (۲۷۰) . . . . "اور خارج میں اب بھی دیکھا گیا کہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ تک اسلام ترقی پر رہا، اور اس کے بعد کم ہوتا دیکھا گیا، معلوم ہوا کہ ان تینوں خلفاء کی خلافت، خلافت راشدہ ہے"

—— اور ——

(صفحہ ۴۳۶) . . . . "اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض حدیثوں میں صاف صاف ایسے الفاظ فرمائے ہیں، جن سے بعد شہادت حضرت عثمان، خلافت پر منہاج نبوت کا ختم ہونا مفہوم ہوتا ہے ..... (صفحہ ۴۳۷)

خلافت خاصہ حضرت عثمان کے بعد نہ رہی"

مگر جمہور اُمت کی یہ رائے ہے کہ حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ ہر اعتبار سے خلیفہ راشد تھے۔ خلیفہ برحق تھے، آپ کی حکومت "علیٰ منہاج نبوت" تھی۔ جمل و صفین میں حق علیؓ کے ساتھ تھا۔ اور امیر معاویہؓ کی پوزیشن علیؓ کے مقابلہ میں ہر لحاظ سے کمزور تھی!

ازالۃ الخفا کی دوسری جلد میں خلفائے راشدین کے مناقب و محامد بیان کئے گئے ہیں، جن میں مناقب علیؓ بھی شامل ہیں اور یہ دیکھ کر جی باغ باغ ہو گیا کہ مناقب علی رض بیان کرنے میں شاہ صاحب نے کسی تنگی کو روا نہیں رکھا بلکہ بڑی محبت و عقیدت اور انشراح قلب کے ساتھ علی کرم اللہ وجہہ کے مناقب و محامد بیان کئے ہیں ———— یہاں تک کہ "رد شمس" کی حدیث جسے علامہ ابن جوزی نے موضوع بنایا ہے، اسے شاہ صاحب نے "ابن جوزی کی زیادتی" سے تعبیر کیا ہے، اور اس حدیث کو صحیح ثابت کرنے کے لئے دلیلیں پیش فرمائی ہیں۔

ازالۃ الخفا کوئی شک نہیں اپنے موضوع پر بڑے معرکہ کی کتاب ہے۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دین و سنت اور فہم و دانش کے بڑے بڑے نکتے بیان کئے ہیں، شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا "تحفہ" اس سے زیادہ مدلل سہی مگر یہ ازالۃ الخفا ہی کا تو "نقش ثانی" ہے، اس موضوع پر جب بھی کوئی شخص قلم اٹھائے گا، ازالۃ الخفا سے وہ بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ جس نقد کی اس کتاب کی کمزوریوں پر بھی نظر رہے گی، وہ حرف ریز وں کو چھوڑے گا اور سلسلہ و گوہر کو چننے گا، مرعوبیت کا برا ہو کہ بعضوں کی غلطیوں کو یہ توجیہوں کا توں مان لیا گیا ہے، یا پھر زبانِ عقیدت کو ان کی نشاندہی اور حرف گیری کے لئے جنبش نہیں ہوئی۔

مذہب و تمدن از:- مولانا ابوالحسن علی ندوی، ضخامت ۱۲۸ صفحات، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

ملنے کا پتہ:- ادارہ نشریات رحیم یار خان!

جناب میر عالم لغاری ایک خیر پسند دولت مند شخص ہیں۔ جو دین و اخلاق کی ترویج اور ترقی کے لئے کچھ نہ کچھ سوچتے اور کرتے ہی رہتے ہیں، انہی کی کوششوں سے اور غالباً ذاتی مصارف سے رحیم یار خاں میں "ادارہ نشریات اسلام" قائم ہوا ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی یہ کتاب اسی ادارہ کی جانب سے شائع ہوئی ہے۔

۱۹۴۱ء میں یہ مقالہ علی میاں مدظلہ نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی ایک علمی مجلس میں پڑھا تھا، پھر ۱۹۴۳ء میں جامعہ ملیہ کی طرف سے اسے کتابی صورت میں شائع بھی کیا گیا، اور ہاتھوں ہاتھ نکل گیا، اب مصنف کی نظر ثانی کے بعد ادارہ نشریات اسلام نے اسے چھاپا ہے۔

یہ مقالہ اپنے ہر موضوع پر ہر اعتبار سے مفید و کار آمد بلکہ یقین افروز ہے، فاضل مصنف نے حواس، عقل، اور فلسفہ اور مذہب اشراق جیسے علمی موضوعات، پر بحث کر کے عقلی دلائل بلکہ تجربہ و مشاہدہ سے ثابت کیا ہے کہ انبیاء کرام کی تعلیمات کے نتائج ہی انسانیت کے لئے ہر دور میں فائدہ مند ثابت ہوئے ہیں، اور آج بھی انسانیت کے دکھ درد کی دوا اسلام کے شفاخانہ سے ملے گی!

لائق مقالہ نگار نے کتنی سچی بات کہی ہے:-

> "خلافت راشدہ کے بعد اس درخت (اسلامی تمدن) میں کبھی جاہلیت عرب کا، کبھی ملوکیت عجم کا، اور کبھی یونانی اور ایرانی اشرافیت کا اور کبھی، مادہ پرستانہ حسی زندگی کا قلم باندھا گیا، اسی مرکب درخت کو عام طور پر اسلامی تمدن اور اسلامی تہذیب کہا جاتا ہے اور اسی پھلوں پر ہمارے بعض مسلمان مصنف و مورخ فخر کرتے ہیں۔"

یہ کتاب زیادہ سے زیادہ اشاعت کی مستحق ہے!

شرح دیوانِ غالب

از:- پروفیسر یوسف سلیم چشتی، ضخامت ۹۵۲ صفحات (مجلد، گرد پوش کے ساتھ)
قیمت:- آٹھ روپیہ:-

ملنے کا پتہ:- عشرت پبلشنگ ہاؤس، ہسپتال روڈ، انارکلی لاہور۔

جناب پروفیسر یوسف سلیم چشتی اُن خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں، جن کی ساری عمر مطالعہ اور تحصیل علم میں گزری ہے، انھوں نے سچ مچ لوہے کے چنے چبا کر علم حاصل کیا ہے۔ فلسفہ اور تصوف کا وہ خاص ذوق رکھتے ہیں، اور ان علوم کو انھوں نے سبقاً سبقاً پڑھا ہے!

جناب یوسف سلیم چشتی علامہ اقبال کے کلام کے مشہور شارح ہیں، صاحب موصوف کی متعدد کتابیں چھپ کر مقبول ہوچکی ہیں، اب دیوان غالب کی مبسوط شرح منظر عام پر آئی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بڑا اچھا شاعرانہ ذوق رکھتے ہیں اور اُن کی طبیعت کو شعر و سخن سے خاص مناسبت ہے۔

اپنی اس شرح پر دو سو صفحہ کا بسیط مقدمہ انھوں نے خود لکھا ہے اور غالب کے سوانح حیات سے لے کر غالب کی مقبولیت کے اسباب تک، ہر چیز وضاحت سے بیان کی ہے، یہ مقدمہ نہ صرف یہ کہ معلومات آفریں ہے بلکہ عالمانہ اور ناقدانہ ہے۔ پروفیسر سلیم چشتی کو تصوف سے طبعی لگاؤ اور فطری مناسبت ہے، اپنے مقدمہ میں انھوں نے وحدت الوجود کی کس قدر سہل و دل نشین شرح کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ مسلک وحدت الوجود، شریعت کا مخالف نہیں ہے، مباحث کے لئے کتنے نازک اور الجھے ہوئے تھے مگر انھوں نے کس خوبصورتی کے ساتھ ان گتھیوں کو سلجھایا ہے!

مسلک شہود و وجود کے بارے میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے ہم خیال ہیں کہ "بات ایک ہی ہے محض تعبیر کا اختلاف ہے"۔ تعبیر کے اس اختلاف اور مفہوم کی ہم آہنگی کو انھوں نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ واضح کیا ہے۔ "فانی فی اللہ" اور "باقی باللہ" کی صوفیانہ اصطلاحات پر شدید اعتراضات وارد کئے گئے ہیں، مگر پروفیسر صاحب موصوف کس ایقان کے ساتھ فرماتے ہیں:-

> "چونکہ یہ لوگ (معترضین) خود تصوف کی اصطلاحات سے واقف نہیں ہوتے، اس لئے جب لفظ فنا دیکھتے ہیں تو ان کا ذہن بودھ دھرم کے "نروان" کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور اپنی نادانی سے سمجھ لیتے ہیں کہ اسلامی تصوف نے بھی بودھ دھرم کی طرح فنائے ذات کی تعلیم دی ہے، حالانکہ اسلامی تصوف اس کے برعکس تعلیم دیتا ہے، یعنی فنا سے مراد ہے فانی فی اللہ ہو کر باقی باللہ ہو جانا ———— فنا سے مراد یہ ہے کہ نفس امارہ کی خواہشات کو فنا کر دو (نہ یہ کہ اپنی ذات کو فنا کر دو) اور ان خواہشات یا میلانات کے ازالہ کے بعد اپنے اندر خدا کی صفات پیدا کرو، جب تم اپنے نفس کے اعتبار سے فانی ہو جاؤگے، تو ذات کے اعتبار سے باقی ہو جاؤگے"۔

علامہ شبلی نعمانی نے شعر العجم میں وحدت الوجود کی جو تعبیر کی ہے، اُسے یوسف سلیم چشتی نے ان کی ناواقفیت پر محمول کیا ہے، اور کئی دلائل ان کی اس تعبیر کی تردید میں صرف کئے ہیں۔ کوئی شک نہیں دلائل خاصے وزنی اور معقول ہیں۔

فاضل شارح نے لکھا ہے کہ "وحدت الوجود" سے مراد اتحاد و حلول ہرگز ہرگز نہیں ہے، کہ "اتحاد و حلول" تو سراسر

ہیں اور "وحدت الوجود" کا عقیدہ عبد اور معبود کے امتیاز کو مٹاتا نہیں! پروفیسر سلیم چشتی کی یہ شرح و توضیح مرآنکھوں پر، اور تصوف کے نظریات کو دین سے مطابقت دینے کا جذبہ بھی قابل تعریف ——— ہمیں اس سلسلہ میں اختلاف رکھنے کے ساتھ یہ عرض کرنا ہے کہ کتاب و سنّت سے جو چیز سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے مخلوق کا خالق سے "خلق و ربوبیت" کا تعلق ہے، اس نسبت تعلق اور اضافت میں کوئی خلجان نہیں، "واجب اور ممکن" کی بحثیں اور "وجود و ذات" کی نزاکتیں، فہم انسانی کو اُس "تکلیف" میں مبتلا کرنے کے مترادف ہیں، جس کا اللہ اور رسول ﷺ نے اہل ایمان سے مطالبہ ہی نہیں کیا، "عرش" کی ماہیت کے بارے میں حضرت امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی اصولی بات فرمائی ہے:-

"الفاظ معدوم، کیفیت مجہول، سوال کرنے والا بدعتی"

مخلوق و خالق کے درمیان "وجود و ذات" کے تعلق پر صحابہ کرام نے کوئی گفتگو نہیں فرمائی اور نہ ائمہ فقہ و حدیث نے اس خطرناک وادی میں قدم رکھا، ان نازک مباحث نے جو الجھنیں پیدا کی ہیں ان کا سبب معترضین کی نادانستگی یا کم علمی نہیں ہے بلکہ ان افکار میں اور ان کے اسلوب اظہار میں ان الجھنوں اور پیچیدگیوں کے لئے گنجائشیں اور مواقع بہم پہنچتے ہیں۔

پروفیسر سلیم چشتی نے فرمایا ہے:-

"واجب، و ممکن میں ذات کے اعتبار سے مغائرت ہے اور وجود کے اعتبار سے عینیت ہے" اب کوئی شخص اپنے کو "انا اللہ" کہہ دے، اور اس پر اہل شریعت، اعتراض کریں کہ تم نے یہ کیا لغویات زبان سے نکال دی؟ اور اس کا جواب وہ یوں دے کہ:

"میں نے "انا اللہ" یا "انا الحق" بہ اعتبار وجود اور عینیت کے لحاظ سے کہا ہے، "ذات" کے اعتبار سے نہیں کہا۔"

تو تصوف کے نقطۂ نگاہ سے "مجذوب کی اس بڑ" کی تحسین و تصویب ہی کی جائے گی، منصور حلاج کے "انا الحق" کہنے کا مسئلہ بھی سامنے ہے کہ وہ تصوف کا ہیرو بنا ہوا ہے! رشتۂ تصوف میں جو یہ پیچ پڑے ہوئے ہیں، ان کو کوئی کہاں تک سلجھائے گا، سیدھی سی یہی ہے کہ کتاب و سنّت اور آثار صحابہ کو ہر مسئلہ میں دلیل راہ بنایا جائے، اور صحابۂ کرام کا وجدانی ذوق اور احوال و واردات ہی کو مستند سمجھا جائے، ورنہ بعد کے لوگوں کے ذوق و وجدان، کیفیات و واردات اور وجد و حال کی بات بہت دور پہنچتی ہے اور .... !

غالب کے کلام کی مقبولیت کے اسباب بیان کرتے ہوئے فاضل شارح لکھتے ہیں:-

"میخوار ہو یا محتسب، عاشق مزاج ہو یا فلسفی، ظرافت کا دلدادہ ہو یا غمزدہ دلدادۂ فن ہو یا جاں دادۂ معنی پرستار حسن و شباب ہو یا جویائے حقیقت، زاہد شب زندہ دار ہو یا رند بادہ خوار، لاہوتی ہو یا ناسوتی، اُن (غالب) کے کلام میں ہر شخص کی دل چسپی کا سامان موجود ہے، اس تنوع کا بھی کوئی ٹھکانا ہے کہ جو شخص حق پرستوں کا ہمنوا ہو کر یہ نکتۂ معرفت بیان کر رہا ہو:-

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں　　ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

وہی شخص بادہ پرستوں کا ہم مشرب ہو کر اپنی پیش دستی کا یوں اعتراف کر رہا ہو؟"

دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں　　ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

فاضل شارح غالب کے بیحد مداح بلکہ عقیدت مند ہیں مگر جہاں شعروں میں اغلاق اور اہمال پیدا ہو گیا ہے، وہاں کھل کر تنقید بھی کی ہے لکھتے ہیں:-

"چونکہ غالب نے ابتدائے مشق سخن میں ناسخ کا تتبع کیا تھا، اس لئے وہ ساری عمر" ناسخیت" کے طلسم سے ... شرح کا ایک نمونہ :- ؎

پھر بیخودی میں بھول گیا راہ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

" یہ شعر شاعرانہ تخیل کا کرشمہ ہے، اگر اسے منطق کی عینک لگا کر پڑھیں تو بالکل مہمل معلوم ہوگا کیونکہ کوئی شخص اپنی خبر لینے نہیں جا سکتا، یہ بات سراسر عقل کے خلاف ہے، لیکن اگر شاعرانہ نازک خیالی کو ملحوظ رکھ کر اس شعر کو پڑھیں تو عالم وجد طاری ہو جاتا ہے، اور جو لطف اس شعر میں آتا ہے، اس کا بیان لفظوں میں نہیں ہو سکتا

مطلب :-

" میں ایک دن کوئے یار میں گیا تھا، وہاں کی دلکشی سے ایسا بیخود ہوا کہ اپنے آپ کو وہیں چھوڑ آیا۔ اب چونکہ مجھ پر عالم بیخودی طاری ہے، اس لئے کوئے یار کا راستہ یاد نہیں، اگر راستہ یاد آجاتا تو میں اپنی خبر لینے وہاں ضرور جاتا۔"

لائق شارح نے ہر شعر کی تشریح و تفہیم کے بعد اس کا "بنیادی تصور" متعین کیا ہے، مثلاً ابھی ابھی جس شعر کی شرح درج کی گئی ہے، اس کا بنیادی تصور ہے :-

"اظہار کیفیت عالم بے خودی"

کسی شاعر کے ہر شعر کا "بنیادی تصور" اور "مرکزی خیال" متعین کرنا بہت مشکل ہے، اور وہ بھی اس التزام کے ساتھ کہ چند لفظوں میں اُسے بیان کر دیا جائے، پروفیسر سلیم چشتی نے کوئی شک نہیں کہ اس کار عظیم کے انجام دینے میں بڑی دماغ سوزی کی ہے مگر اس ذمہ داری کو وہ اپنے سر نہ لیتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔ غالب کے اس شعر :-

سادگی ہائے تمنا، یعنی   پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا   (صفحہ ۳۶)

کا یہ بنیادی تصور ——— "خام خیالی بشر" ——— ایک مضحکہ سا معلوم ہوتا ہے، اسی طرح :-

"استعجاب بر حجاب" (صفحہ ۵۷۹) ——— "آرزوئے رنگ اختصاص" (صفحہ ۵۸۹) ——— "عدم ضرورت آرزو" (۶۱۶) "بیان قدر و قیمت و مدعا" (صفحہ ۶۸۲) ——— "ماتم تضیع اوقات" (صفحہ ۳۴۴) جیسے "بنیادی تصورات" شعار کے مفہوم سے ایک تو بے جوڑ سے ہیں۔ پھر "آرزوئے رنگ اختصاص" جیسی ترکیبوں میں خاصہ تکلف پایا جاتا ہے۔

بے در شوریدۂ غالب جسم ہیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

اس شعر کا بنیادی تصور ——— "بیان قدر و قیمت مدعا" متعین کیا ہے، حالانکہ "مکر عاشقانہ" ہونا چاہیئے! یعنی عاشق مکر و حیلہ سے تو معشوق کو اپنی جانب کرم پر آمادہ کرنا چاہتا ہے! مقصود تو یہ ہے کہ معشوق عاشق کے حال زار پر رحم کرے مگر مکر و حیلہ یہ اختیار کیا گیا کہ تم اپنی تمنا پر ترس کھا کر اسے اس مشکل سے نکال دو۔"

اے ساکنان کوچۂ دلدار دیکھنا   تم کو کہیں جو غالب آشفتہ سر ملے   (صفحہ ۶۸۹)

اس کا بنیادی تصور "ماتم بدنصیبی عاشق" شعر کے مرکزی مفہوم سے کس قدر بعید ہے،

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا   بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا   (صفحہ ۳۶۰)

شعر کو "موسیٰ اور کوہِ طور" کے واقعہ سے متعلق کرنا کتنا عجیب لگتا ہے ——— پھر حضرت موسیٰ "لب تشنۂ تقریر" کہاں
، ان سے تو اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا تھا۔ اس سیدھے سادے شعر میں حضرت موسیٰؑ کی طرف سے "شکوہ" کا پہلو نکالنے کی زحمت
ی ہی گوارا فرمائی گئی ہے۔

صفحہ ۲۷۵ پر "مردِ من" کا ترجمہ "دامن کا پلہ" کیا گیا ہے، حالانکہ صحیح ترجمہ "دامن کی کور" یا "دامن کا کنارہ" ہے!

کیا کہوں بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں — جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا — (صفحہ ۳۷۷)

تا ہے کہ فاضل شارح نے اس شعر کو مضمون آفرینی کی عمدہ مثال سے تعبیر کیا ہے۔ حالانکہ یہ غزل کا شعر ہی نہیں ہے، یہ شعر غالب
دیوان میں رہنا ہی نہیں چاہیئے تھا۔ "کیموس" جس شعر کا قافیہ ہو، اس میں شعریت کہاں مل سکتی ہے ——— "جو کہ
یا خونِ دل" اس ٹکڑے نے شعریت کو اور زیادہ غارت کر دیا ——— قصیدہ اور مثنوی میں تو اس قسم کے مسائل
ے گنجائش نکل سکتی ہے مگر غزل میں کہیں غذا کے ہضم کے درجے (کیلوس و کیموس) بیان کئے جاتے ہیں!

نہ لڑ ناصح سے غالب، کیا ہوا گر اس نے شدت کی — ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر — (صفحہ ۴۳۷)

"دنیا کا عام قاعدہ ہے کہ طاقتور لوگ کمزوروں کو ستایا کرتے ہیں (ان پر شدت کیا کرتے ہیں) تو اپنے طرزِ عمل پر غور کر اگر ناصح تجھ
شدت کرتا ہے، حالانکہ تو بے قصور ہے، تو تو بھی گریباں چاک کرتا ہے حالانکہ وہ بے قصور ہے۔" اس شعر کی
رح وجدان کو خاصی کھٹکتی ہے، "طاقتور لوگوں کے کمزوروں کو ستانے" کا مفہوم شعر میں کہیں سے بھی نہیں نکلتا، شاعر تو یہ کہہ رہا
ہ ناصح نے ہم پر سختی برتی ہے، ہم اس کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتے مگر اپنا گریبان چاک کر کے اپنی دل کی بھڑاس تو نکال سکتے ہیں!

دیکھو تو دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی — (صفحہ ۶۸۴)

کا یہ مطلب پڑھ کر:-

"معشوق کے خرامِ ناز نے اچھا شگوفہ چھوڑا، یعنی اس کے پاؤں کے نقوش میں اس درجہ دلفریبی کی شان پیدا کر دی کہ جب عشاق نے وہ نقوشِ قدم دیکھے تو آپس میں سر پھٹول ہو گئی، وہ اس طرح کہ ہر عاشق دوسروں سے یہ کہتا تھا کہ میرے سوا اور کوئی اس نقشِ پا کو آنکھوں سے نہیں لگا سکتا۔"

ختہ ہنسی آگئی! "عاشقوں کی سر پھٹول" کی بھی ایک ہی کہی! شعر کے مفہوم میں کوئی پیچیدگی نہیں، سامنے کی بات ہے مگر غالب
ے دلکش اور رنگین پیرایہ میں بیان کی ہے۔ یہی کہ موجِ خرامِ یار راہ میں نقش و نگار سے بنائی گئی ہے اور اس کے اندازِ نقش
یا فریبی، قابلِ دید ہے!

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا — کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے — (صفحہ ۷۴۰)

جناب نظم طباطبائی نے جو "کریدتے" پر بجا اعتراض کیا ہے، اس کو رد کرتے ہوئے فاضل شارح کا یہ لکھنا:-

"میری رائے میں تو یہ شعر بیت الغزل ہے، بلکہ غالب کے نشتروں میں سے ہے، اس میں جو سوز و گداز مخفی ہے اس کا بیان لفظوں کے ذریعہ سے ناممکن ہے۔"

مذاقِ شعر فہمی کو مشتبہ بناتا ہے! یہ شعر غالب کے بڑے شعروں میں شمار کیا جانا چاہیئے، رہی بات استعارے میں کہیں چاہیئے

تھی۔ مگر غالب نے اس طرح بیان کی ہے کہ جس طرح الاؤ میں چھپا جل جاتا ہے، ان کا جسم اور دل بھی اسی طرح جل کر راکھ ہو گیا ہے اور شاعر کا محبوب اس راکھ کو بیٹھا ہوا کرید رہا ہے۔ اس تصور سے وجدان کس قدر وحشت محسوس کرتا ہے۔

صفحہ ۲۶۳ پر "مُند گئیں" کو شارح نے "متروک" لکھا ہے، اردو کے ایسے الفاظ کسی قیمت پر ترک کرنے کے قابل نہیں ہیں: "دن مُند گیا ــــــ آنکھیں مُند گئیں" اس میں زبان کا کیا خوب چٹخارہ پایا جاتا ہے، "ترک" کے لئے کوئی علت و سبب بھی تو ہونا چاہئے

صفحہ ۲۶۹ پر، جو شعر شارح نے چھانٹ کر درج کیا ہے:-

زندگی درد سر ہوئی حاتم کب ملے گا مجھے پیا میرا

بالکل گھٹیا شعر ہے، جو اچھے شعروں کی صف میں بار پانے کے قابل نہ تھا:-

صفحہ ۲۴ پر کتابت کی غلطی کے سبب "دُختِ رز" "دُختِ زر" اور صفحہ ۲۰۰ پر "نذر" "نظر" (جاں نثار دلفریبی عنواں کئے ہوئے) چھپ گیا۔

دیوانِ غالب کی یہ شرح کوئی شک نہیں اپنی جگہ منفرد ہے، پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے بڑی محنت، تحقیق اور کاوش سے یہ کتاب مرتب فرمائی ہے۔ کلام غالب کے مطالعہ کرنے والوں کو اس شرح کا پڑھنا ہر اعتبار سے مفید بلکہ لازم ہے! فاضل شارح نے یہ کتاب لکھ کر شعر و ادب کا کارنامہ انجام دیا ہے!

المكالمة الاعظمية
یا
اردو عربی، و عربی اردو ترجمہ مع کلید

(حصہ اول) تالیف:- محمد حسن الاعظمی (سابق پروفیسر قاہرہ یونیورسٹی)
ضخامت ۶۰ صفحات، قیمت:- ایک روپیہ چار آنے،
ملنے کا پتہ:- شیخ محمد فضل، اسپنسر بلڈنگ، تیسری منزل میکلوڈ روڈ کراچی۔

پروفیسر حسن الاعظمی نے اپنی زندگی کو عربی زبان و ادب کی اشاعت و ترویج کے لئے وقف کر دیا ہے۔ ان کی یہ تالیف (المکالمۃ الاعظمیہ) عربی زبان سے موصوف کے شغف و دلچسپی کا عملی ثبوت ہے! اس کتاب کے چار ایڈیشن اب تک نکل چکے ہیں، یہ پانچواں ایڈیشن نہایت ہی دیدہ زیب چھپا ہے۔

اس ریڈر میں روزمرہ کے الفاظ اور جملوں کا مفید و کارآمد ذخیرہ جمع کیا گیا ہے، اگر عربی زبان سے ذرا سی بھی مناسبت اور لگاؤ ہو، تو اس کتاب کی مدد سے گھر بیٹھے عربی سے ابتدائی شناسائی ہو سکتی ہے، اور............ اگر کسی عربی معلم کا تعاون حاصل ہو جائے تو بہت زیادہ فائدہ ہوگا۔

کتاب ختم کرنے کے بعد ایک ذہین طالب علم عربی کے اس سطح کے جملے:-

هل رأى أحدٌ هذا الطفل يفقد الحذاء

سمجھ سکتا ہے اور اردو کی اس قسم کی عبارت:-

"کیا بچی پاؤں میں درد محسوس کرتی ہے"

کا عربی میں ترجمہ کر سکتا ہے۔

صفحہ (۹) پر "گاڑی بان" کا ترجمہ "حُوذِیّ" کیا گیا ہے جو درست ہے، مگر بگھی اور ٹم ٹم چلانے والوں کو عام طور پر "گاڑی بان" نہیں، "کوچبان" یا "کوچمین" کہتے ہیں، اس لئے "گاڑی بان" کے ساتھ "کوچبان" بھی لکھنا چاہئے تھا۔

"جوڑی گاڑی، رکشہ، تانگہ، بگھی، ٹمٹم اور ٹرام چلانے والوں کے لئے عربی میں بولا جاسکتا ہے۔
صفحہ ۱۴ پر کھانڈ کا ترجمہ "السکّر" کیا گیا ہے، جو درست ہے مگر "شکر" بھی لکھنا ضروری تھا، عام ستعمال کھانڈ کا نہیں شکر کا ہوتا ہے۔
صفحہ ۲۸ پر قذرۃ کا ترجمہ "غلیظ" کے ساتھ ساتھ "گندہ" بھی کرنا چاہیئے تھا ——— صفحہ ۱۰ پر "قفز، یقفز" کا ترجمہ "چھلانگ لگانا" کیا گیا ہے، حالانکہ اس کے ساتھ "اچھلنا، کودنا" بھی لکھنا ضروری تھا!
اسی صفحہ پر "مبکراً" کا ترجمہ "جلدی" کیا گیا ہے، صحیح ترجمہ "صبح سویرے" ہے
درس و تمرین کے ساتھ "عربی گرامر" بھی درمیان میں آگئی ہے، اور اس طرح بیان کی گئی ہے کہ طالب علم کا ذہن الجھن محسوس نہ کرے اور باتوں باتوں میں عربی گرامر کی کچھ ابتدائی اور ضروری باتیں بھی ذہن نشین ہوتی چلی جائیں!

قوس قزح

مرتبہ: — شنیم سبحانی، ضخامت ۱۴۴ صفحات، قیمت: — ایک روپیہ چودہ آنہ۔
ملنے کا پتہ: — مکتبہ تعمیر انسانیت، موچی دروازہ — لاہور۔

یہ اسلامی ادب کی معیاری، غزلوں کا انتخاب ہے، جو شعراء کے مختصر حالات اور خصوصیتِ کلام کے ساتھ مکتبہ تعمیر انسانیت نے بڑے دیدہ زیب انداز میں چھاپا ہے۔ سرورق تین رنگوں سے مزین ہے!
جناب شنیم سبحانی نے یہ کتاب مرتب فرما کر اپنی خوش ذوقی کا ثبوت دیا ہے۔ اور وہ اُن شعراء کو اس طرح منظرِ عام پر لائے ہیں جن کو "نام نہاد" ترقی پسند حلقے، اپنی تنگ نظری کے سبب نظر انداز کر دیتے ہیں! "قوس قزح" میں پندرہ شاعروں کی منتخب غزلیں اور سوانح حیات ملتے ہیں، اس فہرست کا آغاز ماہر القادری سے ہو کر خود فاضل مرتب (شنیم سبحانی) پر ختم ہوتا ہے۔
اسد ملتانی، روش صدیقی، اور حسان دانش جیسے شاعروں کی اس انتخاب میں خاصی کمی محسوس کی گئی ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ کے بعض حصوں پر گفتگو ہو سکتی ہے، مگر مجموعی طور پر یہ ایک جاندار مضمون ہے۔
"شعر و ادب میں مقصد اور فنکارانہ امتزاج پر محارت رکھنے کی وجہ سے مقام اول حاصل ہے۔" (صفحہ ۱۴)
"مہارت" کا "محارت" لکھا جانا، کتابت ہی کی غلطی ہو سکتی ہے ——— مہارت کے ساتھ "پر" نہیں "میں" بولا جاتا ہے!
"پر" قدرت کے ساتھ عام طور پر بولتے ہیں، اس طرح: —
"وہ زبان پر قدرت اور اظہارِ بیان میں مہارت رکھتا ہے۔"
صفحہ ۹۶ پر "متفکرانہ سکوت" نظر سے گزرا، "مفکرانہ سکوت" لکھنا چاہیئے تھا!
صاحبِ فکر کو "متفکر" نہیں "مفکر" کہتے ہیں! اُردو میں "متفکر" تو فکر مند آدمی کے لئے بولا جاتا ہے۔
"قوس قزح" نے شعر و ادب کے افق کو رنگینی بخشی ہے، اگرچہ چشمِ حُسّاد میں یہ رنگینیاں کھٹک پیدا کریں گی!

تنویر عجم

از صاحبزادہ ظفر ہاشمی، ضخامت دو سو صفحات، قیمت: — تین روپے۔
ملنے کا پتہ: — صاحبزادہ ظفر ہاشمی، انصار گلی، منٹگمری۔

جناب ظفر ہاشمی اُردو دنیا کے لئے اجنبی تو نہیں ہیں مگر زیادہ معروف شاعر بھی نہیں ہیں۔ تقسیم ہند سے قبل ان کا کلام ...... ادبی رسالوں میں شائع ہوتا رہا ہے، وہ پنجاب کے مشاعروں میں بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ مگر اب انھوں نے مشاعروں میں جانا ترک کر دیا ہے اور اپنے عزم پر قائم ہیں!

جناب ظفر ہاشمی ملازمت کے سلسلہ میں برسوں عراق اور ایران میں رہے ہیں۔ اُن کا یہ مجموعہ کلام جن اشعار سے عبارت ہے، وہ عراق و ایران ہی کی پیداوار ہیں! ظفر ہاشمی کے کلام میں جوش اور تنوع پایا جاتا ہے، قومی درد اور اسلامی جذبہ تو ان کے دل و دماغ میں رچا ہوا ہے، شاعری میں حضرت وحشت کلکتوی مرحوم سے نہ صرف یہ کہ نسبت تلمذ رکھتے ہیں بلکہ اپنے استاد کے شیدائی ہیں۔ چند منتخب اشعار:۔

میں آپ ہی کر لوں گا علاجِ دلِ مجبور   تم سے تو مرے غم کا مداوا نہیں ہوتا

جو تمہارے سامنے آیا وہ حیراں ہی رہا   جو ہمارے پاس آ بیٹھا پریشاں ہی رہا

دلِ حزیں کی تمنا کا حال کیا ہو گا   تجھے خبر بھی ہے، برقِ جمال کیا ہو گا

زلفوں سے تیری رات کے افسانے مل گئے   رُخسار و لب سے رازِ شبستاں سمجھ لیا

نہ جاؤ بزم میں ان کی جو آبرو ہے عزیز   اٹھائے جاتے ہیں، جو بے بلائے جاتے ہیں

دقت پسند دل کے لئے عشق بھی ہے کم   اس سے بھی بڑھ کے منزلِ دشوار چاہیئے

دلِ پُر خوں کی زینت دیدۂ نم سے ہوتی ہے   مرے گھر میں بڑی رونق، مرے ماتم سے ہوتی ہے

کھل رہے ہیں سامنے آنکھوں کے دیوان بہار   نکہتِ گل اہتمام ساغر و مینا کرے

کوششیں ظالم نہ کر میرے مٹانے کے لئے   میں تو اک عنوان ہوں تیرے فسانے کے لئے

جوشِ گریہ آج دکھلا دے انھیں اپنی بہار   وہ بہانہ ڈھونڈتے ہیں مسکرانے کے لئے

ہے یاد ہاں! کبھی ایسا بھی اک زمانہ تھا   نہ دشمنی تھی کسی سے، نہ دوستانہ تھا

دوسرا رُخ:

محوِ خرامِ ناز تھی گلزار میں نسیم   میرے لمَس نے اس کو معطر بنا دیا   (صفحہ ۲)

"لمس" (بروزن "درس") کو "لمَس" (بروزن "برَس") نظم کر کے، شاعر نے اپنی علمی استعداد کو مشتبہ بنا دیا۔

سنا ہے عیادت کو وہ آ رہے ہیں   ظفر دردِ الفت سے بھر جائیگا   (صفحہ ۱۰)

"دردِ الفت سے بھر جائیگا" یہ کیا زبان ہے، کیا فکر ہے اور کیا انداز بیان ہے!

اُن کے کوچے میں آج جا کر دل   جامۂ زندگی اُتار آیا   (صفحہ ۲۹)

"دلدار کے کوچہ میں جامۂ زندگی اتارنا" یہ بات کیا ہوئی؟ اس شعر میں "جامۂ زندگی" اس طرح استعمال ہوا ہے، جیسے "جامۂ زندگی" کوٹ یا شیروانی طرح کا کوئی کپڑا تھا، جسے کوچۂ یار میں دل نے جا کر اتار دیا۔

ہجومِ جلوہ سے خیرہ ہوئی نظر میری   نہ نکلی آرزوئے دید، ان کو دیکھا ضرور   (صفحہ ۴۱)

"دیکھا" کا "الف" کس بُری طرح دب رہا ہے۔

کون کہتا ہے کہ عاشق میں غرور آتا نہیں   وہ طلب کرتے ہیں مجھ کو اور میں جاتا نہیں   (صفحہ ۳۰)

"عاشق میں غرور آنا" یہ کہاں کی زبان ہے؟ یوں بھی شعر سطحی اور بے مزہ ہے۔

تمہاری یاد سے ہم اپنے دل کو شاد کرتے ہیں   ترے غم سے علاجِ خاطرِ ناشاد کرتے ہیں   (صفحہ ۵۰)

"ایطائے جلی" کا اس مطلع میں عیب لگ رہا ہے اور "شتر گربگی" اس پر مستزاد، پہلے مصرعہ میں "تمہاری یاد" اور مصرعہ ثانی میں "ترے غم"

نظم کیا ہے -

وہ عقیدہ اب مرا ہاں ! دیکھ لیں　　دین میرا ، میرا ایمان دیکھ لیں　　(صفحہ ۵۵)

"دندانِ تو جملہ در دہانند" کی قسم کا ہے یہ شعر! ایسے اشعار اگر نو مشقی کے زمانے کے تھے ، تو مجموعہ کلام میں انہیں رکھنے کی کیا مار پڑی تھی

جناب ظفر ہاشمی علامہ اقبال سے بھی بہت متاثر ہیں! ان کی نظموں میں اقبال کا رنگ جھلکتا ہے - بعض قطعات میں انھوں نے مولانا ظفر علی خاں مرحوم کی بھی پیروی کی ہے - انھوں نے فارسی میں بھی شگفتہ غزلیں کہی ہیں -

ظفر ہاشمی اپنے تمام کلام کا انتخاب شائع کر سکیں ، تو ان کے کلام کے اصلی جوہر اہلِ نظر کو نظر آسکیں گے ، اس انبارِ خار و خس میں ان کے گلہائے فکر نہ جانے کس کس گوشے میں دب کر اور چھپ کر رہ گئے ہیں !

اسلامی نظامِ تعلیم

از پروفیسر سعید احمد رفیق ، ضخامت ۳۰۲ صفحات ، مجلد گرد پوش کے ساتھ ، قیمت تین روپے ، ملنے کا پتہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ، ناظم آباد - کراچی -

اس کتاب کا نام : ــــــ "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم" ــــــ ہونا چاہئے تھا

ابواب کی فہرست : - اشاعتِ تعلیم - طریقہ تعلیم - سلاطینِ دہلی کے زمانہ میں تعلیمی ترقی - آزاد صوبوں میں تعلیمی ترقی - عہدِ مغلیہ میں تعلیمی ترقی - سیاسی انحطاط کے زمانہ میں تعلیمی حالات - تعلیمِ نسواں - نصابِ تعلیم - ابتدائی اور ثانوی تعلیم - فنونِ لطیفہ اور فنونِ مفیدہ

کوئی شک نہیں کہ کتاب پڑھکر مصنف کی محنت و جانفشانی کا احساس ہوتا ہے کہ اس ایک کتاب کے لئے انھیں کتنی بہت سی کتابیں پڑھنی پڑی ہیں ، ہندوستان میں مکتبوں سے لیکر بڑے مدارس تک تعلیم کا کیا نظام رہا ہے ، اسکی ایک جھلک اس کتاب میں نظر آجاتی ہے - درسِ نظامی سے پہلے ہندوستان کے عربی مدارس میں کونسا "نصاب" رائج تھا اور خود "درسِ نظامی" میں کیا تبدیلیاں ہوئیں ، اسکی تفصیل بھی ملتی ہے مسلمان بادشاہوں ، امیروں ، شاہزادوں اور شاہزادیوں کی علم دوستی اور فن پروری کے تذکرے بھی اس میں آگئے ہیں - مگر ــــــ

حق بات یہ ہے کہ اس موضوع پر مستقل ریسرچ کی ضرورت ہے ، اور یہ کام چند اہلِ فکر کے کرنے کا ہے ، تب کہیں جاکر "مسلمانوں کے نظامِ تعلیم" پر کوئی قابلِ قدر کتاب مرتب ہوسکتی ہے - صرف یہ دکھا دینا کہ فلاں بادشاہ نے تزک لکھی ہے ، فلاں بادشاہ شعر و موسیقی کا ذوق رکھتا تھا ، فلاں شاہزادی شہسواری جانتی تھی ، فلاں سلطان علماء کا بہت قدرداں تھا ، اور اسکے دربار میں علماء کے جمگھٹے رہتے تھے ــــــ یہ "مسلمانوں کے نظامِ تعلیم" کی تاریخ تو نہیں کہا جاسکتا ، چونکہ موضوع بہت زیادہ مطالعہ چاہتا ہے ، اسلئے لکھنے والے کتاب کا حجم بڑھانے کے لئے اس قسم کے تذکروں کو پھیلا کر بیان کرتے ہیں ، اور شاید مطمئن بھی ہو جاتے ہیں کہ "مسلمانوں کے نظامِ تعلیم" کی تاریخ انھوں نے مرتب فرمادی -

---

تاریخ بیت اللہ

از : - ابو البیان سیف الرحمن سیف (مولوی فاضل) ضخامت ۱۹۰ صفحات (مجلد گرد پوش کیساتھ) قیمت دو روپے آٹھ آنے ، ملنے کا پتہ : ادارہ اشاعت السنۃ شیش محل روڈ ، لاہور !

اس کتاب میں بیت اللہ شریف کی تاریخ بیان کی گئی ہے ، اور مروج الذہب ، تفسیر ابن کثیر ، سیرت النبی ، تاریخ اسلام (مولینا اکبر شاہ خاں) مشکوٰۃ ، ارشاد السائل الی دلیل المسائل (علامہ شوکانی) ، فتح الباری وغیرہ کتابوں کے حوالے ملتے ہیں ، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے اس کتاب کی تدوین و ترتیب سے پہلے بہت سی کتابیں مطالعہ کی ہیں -

اردو میں اس موضوع پر حیدرآباد دکن کے ایک صاحب (　　) نہایت ہی جامع و مستند کتاب لکھ چکے ہیں - یہ کتاب کوئی شک نہیں محنت اور اخلاص کے ساتھ لکھی گئی ہے ، مگر ، شکوہ کیا جائے کہ مصنف کو انشاء پردازی کی مشق نہیں ہے ، ذیل کے چند نمونوں سے

انکی تحریر کی ناپختگی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے :

"اگر حرف مرکب عقل پر سوار ہو کر روایات پر نظر کی جائے" (صفحہ ۱۸۳)

"اب وہ زمانہ محویت سے بغل گیر ہوچکا ہے، جبکہ حنابلہ، شوافع کے سایہ سے بھی گریز کرتے ہیں" (صفحہ ۱۵۶)

"کیونکہ ایسا کرنے سے تو ان کا مشن معدومیت کے پردے میں چھپ جاتا ہے .... میری تحریر میں ... اور کسیلا پن کی قدرے آمیزش ہوگئی ہے ...." (صفحہ ۱۴۷)

"اگر حجر اسود کی تقبیل کو شرک سے موسوم کیا جائے تو، ائمہ عظام اور صحابہ کبار کے علاوہ خود آنحضرت صلعم کی ذات اقدس مخدوش ہوجاتی ہے" ...... (صفحہ ۰۳)

مصنف "مولوی فاضل" ہیں مگر صفحہ ۲۲ پر "بے نیل مرام" کو "بے نیل و مرام" لکھا ہے !

حیرت ہے کہ یونیورسٹیوں میں تعلیم پاکر اور اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرکے بھی بعض لوگوں کو اپنی ذات کا اتنا عرفان نہیں ہوتا کہ وہ کس کام کے اہل ہیں اور کس کے نہیں ہیں ! مذہبی اور دینی طبقہ میں جب اس قسم کے لوگ نظر آتے ہیں تو اور زیادہ طبیعت مکدر ہوتی ہے۔

معانیِ سخن

انتخاب کلام محمد قلی قطب شاہ معانی، مرتبہ، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، ضخامت ۱۱۳ صفحات (مجلد) قیمت ایک روپیہ پچاس نئے پیسے، ملنے کا پتہ : سب رس کتاب گھر، رفعت منزل، خیریت آباد، حیدرآباد دکن

محمد قلی قطب شاہ (سنہ ۱۵۶۶ء — سنہ ۱۶۱۲ء) گولکنڈے کا پانچواں بادشاہ تھا، اسی نے شہر حیدرآباد کی بنا ڈالی تھی۔ یہ اردو زبان کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر تھا، معانی تخلص کرتا تھا۔ تلنگی زبان میں اسکا تخلص ترکمان تھا اور کہیں کہیں اردو کلام میں بھی اس نے یہ تخلص (ترکمان) اختیار کیا ہے، یا یوں کہیے کہ خود بخود آگیا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ نے ہر حیثیت سے شاعرانہ مزاج پایا تھا، راگ رنگ سے دلچسپی، عشق بازی کا چسکا، شراب کی لت، میلوں ٹھیلوں، جشن و انجمن آرائی کا شوق، فیاض اور مہمان نواز بھی تھا۔ اسی کے کلام کا انتخاب جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے اپنے ایک فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے! اس مقدمہ میں دکن کی شاعری کے مختلف ادوار کا اجمال کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، یہاں تک کہ سنہ ۱۹۴۸ء میں جاکر یہ بساط ہی الٹ جاتی ہے،

قلی قطب شاہ کے کلام سے اردو زبان کے متقدم ناقدین (حالی آزاد) کو واقفیت نہ تھی۔ ورنہ اردو شاعری اور اسکے تدریجی ارتقاء اور اولیت کے بارے میں ان کا اندازِ فکر کچھ اور ہوتا،

قلی قطب شاہ کی شاعری آج سے چار سو سال پہلے کی شاعری ہے، اسلئے ہمارے دور کے لئے وہ زبان نامانوس ہونی ہی چاہئے۔ چند نمونے :

پھولیاں کلیاں کئے مجلس خوشی مل چمناں میں ٭ دے یک بیل کوں یک پھول میٹھا ایک سن تلخ

مُرید پیر میخانہ ہوا ہوں دیکھ لے زاہد! ٭ ہماری نے پرستی میں تن تسبیح تار ہے اب

پیا باج پیالہ پیا جائے نا ٭ پیا باج یک تل جیا جائے نا

(یعنی محبوب کے بغیر جام شراب نہیں پیا جاتا، اور اسکے بغیر ایک لمحہ کے لئے بھی جینا دشوار ہے)

پڑے دنبال میں میرے سو اس نیناں کے دنبالے ٭ خدایا عشق مشکل ہے بھرم رکھ توں معانی کا

کتاب کے آخر میں فرہنگ الفاظ ہے۔ جس کے چند نمونے یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

تسبیح

انن (ان کا)، بسلانا (بھلانا)، چھن (لمحہ)، درانی (آفاقی)، منج (میرا)، منددھر (مکان)، ہمنا زیبیٔ ... سنا (ہم)، ٹھٹری (شکن)، سرا (شراب)۔

فرہنگ دیکھنے سے پتہ چلتاہے کہ قلی قطب شاہ کے زمانہ میں جو اردو زبان بولی جاتی تھی، اسکے نہ جانے کتنے الفاظ ایسے ہیں جنھیں لکھنؤ اور دلی والے بلکہ اعلیٰ دکنی بھی شاید نہ جانتے ہوں مگر یو۔ پی کے گاؤں میں اب بھی بولے جاتے ہیں۔ مثلاً

بھاجنا (بھاگنا)، بیٹینا (پیغنا)، تائیں (واسطے۔ لئے) تمن (تمھارا) جد (جب)، چوانا (ٹھکانا)، دوال (دیوار) ... اں (کہاں)، لاگنا (لگنا)، نیارا (جدا، عجیب)، لجانا (بھانا)، کتا (کتنا)، جتا (جتنا)۔

رہنمائے حج

از:۔ مولینا عطاءاللہ حنیف بھوپالی اور الحاج عبدالرحمٰن گیلانی، ضخامت ۱۲۰ صفحات (مجلّد) قیمت ایک روپیہ چار آنہ، ملنے کا پتہ: مکتبہ اسلام کشمیری بازار، لاہور۔

حج اور حجاز کے متعلق یہ کتاب کوئی شک نہیں معلومات کا قابل قدر ذخیرہ ہے، حج کے مناسک اور دعاؤں سے لیکر حجاج کے سفر و رہائش ضروری ہدایتیں تک اس میں درج ہیں۔

بعض دعائیں اتنی طویل ہیں کہ انھیں زبانی یاد کرنا بہت مشکل ہے، کتاب کو دیکھکر ہی انھیں پڑھا جاسکتاہے۔ مثلاً عرفات کے میدان کی دعائیں سات صفحات میں پھیلی ہوئی ہیں۔

کوئی شک نہیں حجاج کے لئے یہ کتاب مفید وکارآمد ہے اور اپنے نام کی مناسبت سے واقعی "رہنمائے حج" ہے۔

ماہنامہ "دانش"

مجلس ادارت:۔ سید احمد عروج قادری، سید زین العابدین، حنیف مرتضیٰ اور ابن فرید۔ سالانہ پانچ روپے، فی پرچہ پچاس نئے پیسے، ملنے کا پتہ: ماہنامہ "دانش" رام پور (یو۔پی) پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:۔ ماہنامہ "بتول" لاہور۔

ماہنامہ دانش (رام پور) کے پانچ شمارے اب تک منظر عام پر آچکے ہیں، یہ مجلہ ادب اسلامی کا ترجمان ہے، اور اپنے مسلک میں مخلص و صادق ہے، علمی وادبی مقالے، افسانے، نظمیں اور غزلیں سب کی سب پاکیزہ اور سنجیدہ ہیں، ان عنوانات سے مرتبین کی خوش ذوقی کا اندازہ لگایا جاسکتاہے۔ اداریہ، مقالات، نظمیں، افسانے، غزلیں، نقد ونظر، بزم دانش، اخبار وافکار، منزل بہ منزل۔

"منزل بمنزل" کے پڑھنے سے مسرت ہوئی کہ ہندوستان میں اسلامی ادب کے حلقے قائم ہوتے جا رہے ہیں اور یہ آواز رفتہ رفتہ اثر کر رہی ہے (اللہم زد فزد)

ماہنامہ "دانش" کی ترقی وبقا کے لئے ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں۔ اسلام پسند اور سنجیدہ حلقوں میں اس مجلہ کو مقبول ہونا چاہئے یہاں تک کہ اقتصادی دشواریاں دور ہوجائیں، اور یہ قافلہ منزل کی طرف بڑھتا چلا جائے!

دردِ سر دوسرے ہر قسم کے درد اور
نزلہ و بخار کیلئے
انالجین ٹکیاں
ANALG
Opal
ہر قسم کی کھانسی!
سے فوری
نجات
کیلئے
صحت اور
توانائی
کیلئے
LEXSAL
فروٹ سیلائن
لیکسال
کفنسول شربت
اوپل لیبارٹریز لمیٹڈ - کراچی

ماہر القادری

ماہنامہ

جلد — ١١

فاران

کراچی

شمارہ — ٣

ماہ جون ۱۹۵۹ء

ایڈیٹر ماہر القادری

سالانہ چندہ چھ روپے

فی پرچہ آٹھ آنے

ترتیب

مقام اشاعت :- دفتر فاران، کیمبل سٹریٹ، کراچی نمبر (١)

پرنٹر پبلشر :- مسرور حسین

مطبع سعیدی قرآن محل، کراچی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نقشِ اوّل

عراق اور تبت کے خونیں حوادث اور انقلابات نے اس حقیقت کو اب کسی تحقیق و ثبوت کا محتاج نہیں رکھا کہ کمیونزم کی وبا دنیا کے ہر گوشہ میں پھیل رہی ہے کہیں جنگل کی آگ کی طرح اور کسی جگہ دھیمی آنچ کی مانند ـــــــ اس زہر سے کرۂ ارض کا کوئی حصہ بھی محفوظ نہیں ہے فرق صرف اتنا ہے کہ کہیں ابھی صرف تبلیغی کام ذہن کی آزمائش ہو رہی ہے اور کسی جگہ یہ زہر رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے۔

کمیونزم کی مقبولیت و کامیابی کے اسباب کیا ہیں؟ اس پر ہم اس فرصت میں روشنی ڈالنا چاہتے ہیں، یہ مسئلہ بہت کچھ وضاحت چاہتا ہے مگر ہم بات کو زیادہ سے زیادہ پھیلا کر نہیں بلکہ سمیٹ کر بیان کریں گے، اطناب کی جگہ اجمال سے کام لیا جائے گا لیکن "اجمال" سے اس میں کوئی ضروری نکتہ اور اہم بات چھوٹنے نہ پائے، اور تصویر کے تمام رُخ سامنے آجائیں، مقصود طوالتِ بیان نہیں بلکہ حقیقت کی نقاب کشائی ہے تاکہ جو بے خبر ہیں وہ باخبر ہو جائیں اور جو اربابِ خبر ہیں وہ یہ جان کر مطمئن ہو جائیں کہ ان کی طرح دوسرے لوگ بھی حقیقتِ حال کی خبر رکھتے ہیں! غفلت اور بے خبری بہت بڑی چیز ہے، دشمن اس سے بروقت فائدہ اٹھا کر بہت کچھ کر گزرتا ہے! خبر و آگہی کی صورت میں دشمن کے کھلے اور چھپے حملوں کی مدافعت، سازشوں کا توڑ اور فتنوں کا سدِ باب کیا جا سکتا ہے!

کمیونزم کوئی چلتا ہوا نعرہ یا ہوائی ہنگامی تحریک نہیں ہے یہ ایک نظامِ حیات ہے جس کی پشت پر فلسفہ، شعر و ادب اور اقتصادیات کا لاکھوں صفحات کا لٹریچر موجود ہے جس میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے، یہ لٹریچر ہلکا پھلکا بھی ہے جو عوام اور سطحی ذہن کے لوگوں کو متاثر کر سکے اور وزنی لٹریچر بھی جو ذہین افراد کو اپنی طرف مائل کر سکیں، دنیا کے کونے کونے میں اشتراکی لٹریچر پہنچایا جا رہا ہے دو ہزار دن کاغذ کمیونزم کی اشاعت میں صرف ہو رہا ہے یہ بھی درست ہے کہ اس لٹریچر کی مفت اشاعت پر بے دریغ روپیہ خرچ ہوتا ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ لاکھوں آدمی اسے خرید کر بھی پڑھتے ہیں! جس لٹریچر کو کروڑوں لوگ شوق سے پڑھتے ہوں اس کے اثرات سے قلوب و اذہان بھلا کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں! ایک چھوٹا سا مضمون دل و دماغ پر اپنا نقش چھوڑ جاتا ہے، تو اشتراکی لٹریچر کے ہزاروں صفحات کا مطالعہ بے اثر کس طرح رہ سکتا ہے۔

کمیونزم کی پشت پر ادب کے دفتروں کے ساتھ ساتھ حکومتیں بھی ہیں، جو اشتراکی عقائد و نظریات کی محافظ، مبلغ اور ترجمان ہیں یہ حکومتیں بڑی طاقتور حکومتیں ہیں، جو کسی دوسری مملکت کی دست نگر نہیں ہیں بلکہ دوسری حکومتیں ان سے اُمید کرم رکھتی اور امداد کی محتاج و آرزومند رہتی ہیں! یہ کمیونسٹ حکومتیں نہ تو روحانیت کی دعویدار ہیں، اور نہ اخلاق کی علمبردار ہیں، مادیت ان کا نصب العین و منتہا ہے اور اپنے اس مقصد میں وہ سو فیصدی کامیاب ہیں، سائنسی ایجادات کے ذریعہ ان کے یہاں صنعت، حرفت اور زراعت جو ترقیاں ہو رہی ہیں ان کی کوئی حد و نہایت نہیں، ویرانوں اور چٹیل میدانوں کو انھوں نے سچ مچ لالہ زار بنایا اور پہاڑوں کو چمن میں تبدیل کیا ہے! کمیونسٹ حکومتیں اعداد و شمار کے ذریعہ بتاتی رہتی ہیں کہ اب سے چند سال پہلے فلاں شعبہ کی یہ حالت تھی اور اب اس میں ترقی اتنے سو گنا زیادہ ہو گئی ہے اور مستقبل زمانہ حال سے بھی بہت زیادہ شاندار اور اُمید افزا ہے! یہ اعداد و شمار مبالغہ آمیز ہوں

ہیں مگر فرضی اور من گھڑت نہیں ہوتے کہ کاغذ پر تو پائے جائیں اور اصل میں ان کا کوئی وجود نہ ہو ـــــــ کمیونسٹ حکومتوں کی مادی ترقیوں کی یہ تفصیلات اور روداد پڑھ کر عوام کسی نہ کسی درجہ میں ضرور متاثر ہوتے ہیں اور قدرتی طور پر ان کا دل چاہتا ہے کہ کمیونسٹ حکومتوں کی مادی اور صنعتی ترقیوں کے سامنے سے ہمارے ملک بھی محروم نہ رہیں اور یہ خوش بختی ان کو کسی نہ کسی طرح نصیب بھی ہو جائے!

کمیونسٹ حکومتوں کے ارباب اقتدار اور عمّال اپنے عقیدہ اور نظریے میں انتہائی مخلص ہیں اور ان کی تمام جد و جہد کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ دنیا میں کسی طرح کمیونزم کو سربلندی اور غلبہ حاصل ہو۔ ان حکومتوں کے سفراء دوسرے ملکوں میں کمیونزم کو مقبول و ہر دلعزیز بنانے کے لیے جو تدبیریں کرتے رہتے ہیں ایسی تدبیریں دوسری مملکتوں کے سفیروں کو کم ہی سوجھتی ہیں۔ ملکوں کی مشہور و ممتاز شخصیتوں کے بارے میں اشتراکی سفارت خانے پوری واقفیت رکھتے ہیں کہ کس میں کیا خوبیاں ہیں اور کیا کمزوریاں ہیں! افراد کی ان کمزوریوں سے وہ پورا فائدہ اٹھاتے ہیں یہاں تک کہ جاہ پسند اور بے ضمیر مذہبی علماء تک کو وہ اپنے مقصد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ روپیہ، شہرت، سیر و تفریح، تحفے، عیش و عشرت غرض جس دام میں جو شکار پھنس سکتا ہے، اس کے لیے زمین ہم رنگ تیار کی جاتی ہے۔

کمیونسٹ سفارت خانے دراصل کمیونزم کی تبلیغ و اشاعت کے مرکز ہیں جو اپنے ڈھب کے آدمیوں سے گہرا ربط رکھتے ہیں اور اپنے ہم خیال اخبارات اور رسالوں کی مالی امداد کرتے ہیں: ان کی تدبیریں بڑی زیرکی اور پُر پیچ ہوتی ہیں ـــــــ مثلاً علامہ اقبال کی اسلامی شاعری کی مقبولیت کو کم کرنے کے لیے وہ میر اور غالب کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنے کی تحریک کی پشت پناہی اس خوبی کے ساتھ کر سکتے ہیں ـــــــ کہ ع

جلتا ہے چراغ ہوا کو خبر نہ ہو

کمیونسٹ دنیا کے پردے پر جہاں کہیں بھی پائے جاتے ہیں، وہ اپنے مقصد سے غافل نہیں رہتے۔ ہر آن یہی دھن کہ کسی طرح کمیونزم کا کام آگے بڑھے، اس کوشش اور جد و جہد کا اثر ہے کہ کمیونسٹوں کی تعداد ہر جگہ بڑھ رہی ہے۔ یہ لوگ خوب سوچ سمجھ کر بات بنا کر کام کرتے ہیں۔ انتہائی ہوشیاری اور دانائی کے ساتھ اپنے مقصد کے حصول کے لئے جلد بازی اور بے صبری سے کام نہیں لیتے جس ملک میں وہ دیکھتے ہیں کہ فضا ان کے مقصد کے لئے زیادہ سازگار نہیں ہے، وہاں وہ دوسرے سیاسی، غیر سیاسی اور علمی و ادبی اداروں میں گھس کر کام کرتے ہیں۔ کسی خالص علمی انجمن اور ادبی ادارے میں انہیں بار پانے کا موقعہ مل جائے تو وہ وہاں "کلچرل شو" کے نام پر رقص و موسیقی کا کوئی رنگین پروگرام ہی مرتب کر دیں گے، اس لئے کہ ہر بداخلاقی، معصیت اور رنگین و غیر محتاط تفریح کا فائدہ کمیونزم کو پہنچتا ہے! ایک کمیونسٹ کسی دینی ادارے میں گھس کر "اعتزال" کی تبلیغ کر سکتا ہے، صرف اس لئے کہ ایسا کرنے سے "دین" کا نقش کسی نہ کسی حد تک مجروح ہوتا ہے اور ایمان و یقین کے مقابلہ میں عقلی مغالطوں کو تقویت ملتی ہے، وہ غزالی اور ابن تیمیہ کے مقابلہ میں بو علی سینا اور ابن رشد کو لائے گا اور ان کے کارناموں کو خوب اچھالے گا اور یہ کام وہ اس خوش اسلوبی سے انجام دے گا کہ کسی کے دل میں اس کی طرف سے ذرہ برابر بدگمانی پیدا نہ ہو سکے گی۔

دنیا میں سرمایہ داروں، منافع خوروں، خود غرض حاکموں اور عیش پرست جاگیرداروں کے ہاتھوں جو لوٹ کھسوٹ مچی ہوئی ہے اس کا کمیونزم کو بہت فائدہ پہنچ رہا ہے۔ جہاں کہیں بھی انتشار ہے، بے روزگاری اور افلاس ہے، وہاں کمیونزم کے لئے زمین ہموار ہے! کمیونسٹوں نے پروپیگنڈے کے زور سے دنیا کی اچھی خاصی آبادی کے دل میں یہ بات اتار دی ہے کہ کمیونزم غریبوں اور مظلوموں کا حامی و مددگار اور بادشاہوں، جاگیرداروں، ظالم حاکموں اور سرمایہ داروں کا دشمن ہے ـــــــ تو صورت حال یہ

ہے جس دل میں سرمایہ داری، جاگیرداری اور ظلم و عدوان کے خلاف نفرت پائی جاتی ہے، اس دل میں کسی نہ کسی حد تک کمیونزم کے لئے گنجائش موجود ہے یا کم سے کم اس طرف تھوڑا بہت رجحان ضرور پایا جاتا ہے ——— یعنی یہ احساس کہ سرمایہ داری اور جاگیرداری نفرت کی دشمنی میں ہم اور کمیونسٹ برابر کے شریک ہیں۔

یورپ اور امریکہ کا تمدن عیش و عشرت میں ڈوبا ہوا تمدن ہے۔ ہوسناکیوں کی شدت نے اس تمدن سے متاثر لوگوں میں نیکی اور پاکبازی کی حس کو قریب قریب ختم کر دیا ہے، خدا اور آخرت کا تصور روز بروز مضمحل کمزور ہوتا جا رہا ہے، بداخلاقی، معصیت کوشی، آخرت فراموشی اور بے یقینی ہی "کمیونزم" کی جیت ہے! امریکہ اور انگلستان کمیونزم کے کوئی شک نہیں بہت زیادہ مخالف ہیں مگر اس کو کیا کیجئے کہ ان کے تمدن و تہذیب سے کمیونزم کو فائدہ پہنچ رہا ہے! جہاں تک عیش پرستانہ تمدن اور جاہلانہ تہذیب کا تعلق ہے روس اور دیگر مغربی ممالک میں کوئی فرق نہیں ہے، شراب ہر جگہ شیرِ مادر بنی ہوئی ہے، لحم خنزیر ان سب کی پسندیدہ چیز ہے۔ بدکاری اور جنسی انارکی کہیں کوئی قدغن نہیں ہے مادی نقطۂ نگاہ سے آزادی جمہوریت اور دہریت کی زندگیاں قریب قریب ایک جیسی ہیں، پاکیزگی اور تقویٰ دونوں زندگیوں میں مفقود و معدوم ہے!

عصر حاضر کے تمدن و تہذیب نے ضروریات زندگی میں اس قدر تنوع پیدا کر دیا ہے اور رہن سہن کے معیار کو اتنا بلند کر دیا ہے کہ انسانوں میں قناعت کا جذبہ ہی مفقود ہو چلا ہے، ہر زندگی عیش و تفریح اور ضروریات زندگی کے لئے "ہل من مزید" کا مطالبہ کرتی ہے! انسانوں میں قناعت اور صبر و شکر کے جذبات کا فقدان بھی "کمیونزم" کو سہارا دیتا ہے!

اوپر کہا جا چکا ہے کہ کمیونسٹ زمانے کے بڑے نبض شناس واقع ہوئے ہیں اور خوب سوچ سمجھ کر پلاننگ کرتے اور ہوا کے رُخ کا ٹھیک اندازہ لگاتے ہیں، اسٹالن کی پالیسی بین الاقوامی مسائل میں بے تعلقی کی تھی نہ جانے کتنی حکومتوں کے سفیروں کو اسٹالن سے ملنے کی تمنا ہی رہ گئی مگر خروشیف نے زمانہ کے حالات کی رفتار کا اندازہ کر کے اپنی پالیسی کو بدل دیا ہے، اُس نے کھلے خزانے دنیا کے بہت سے ملکوں کے دورے کئے ہیں اور پبلک اجتماعات میں تقریریں کی ہیں دوسرے ملکوں کے سفراء، وفود اور فنکار اس سے آسانی کے ساتھ مل سکتے ہیں ——— کمیونسٹ عام طور پر جلد بازی سے کام لے کر اوچھا ہاتھ نہیں ڈالتے، بڑی ہوشیاری اور عاقبت بینی کے ساتھ وہ پلان بناتے ہیں، وہ یہ نہیں کرتے کہ آج پودا لگائیں اور چند دن کے بعد ہی اُس پودے کی شاخوں میں پھل ڈھونڈنے لگیں بیج ڈال کر اور پودا لگا کر وہ اس پر فطری مدت گزرنے کے بعد پھلوں کی توقع رکھتے ہیں اور انتظار کی مدت سے اکتا نہیں جاتے! عراق میں وہ برسوں سے کام کر رہے تھے، انھوں نے حکومتِ عراق پر بھرپور وار اُس وقت کیا ہے، جب وہ ہر محاذ کو اپنے موافق بنا چکے تھے، وہ جو دوسرے ملکوں میں صلح و آشتی کے نعرے بلند کرتے ہیں اور انسانی ہمدردی کے گیت گاتے ہیں۔ انھوں نے عراق میں اپنے مسلک کے مخالفین کا خون بہانے میں ذرہ برابر دریغ نہیں کیا۔ وہ ہر ملک میں عراق جیسا خونیں ڈرامہ کھیل سکتے ہیں مگر بڑے منظم طریقہ پر!

ہر ملک میں کچھ ایسے بے ضمیر لوگ ہوتے ہیں جو صرف طاقت اور عہدے کا ساتھ دیتے ہیں، مرغانِ بادنما، چڑھتے سورج کے پجاری اور اہل اقتدار کے ہوا خواہ! عوام ہی نہیں حکومت کے عہدیداروں میں بھی اس مزاج و ذہنیت کے لوگ نکل آتے ہیں جو ہر ابھرنے والی طاقت سے ربط ضبط رکھتے ہیں، ان لوگوں کا کوئی نظریہ یا مقصدِ حیات نہیں ہوتا، سوائے اس کے کہ ان کی گدی سلامت رہے اور ان کے عیش و آرام میں فرق نہ آنے پائے۔ یہ لوگ ہر ملک میں کمیونسٹوں کے ابتدائی غلبہ کو دیکھ کر ہی ان کے ہوا خواہ بن جاتے ہیں اور حکومت کی مشینری چلانے میں کمیونسٹوں کو ان سے بڑی مدد ملتی ہے۔

اسلام اور کمیونزم

دنیا اپنی بد اعمالیوں کے سبب ایسی پوزیشن میں آگئی ہے کہ "کمیونزم" کی ترقی کے لئے حالات سازگار ہوتے چلے جا رہے ہیں "کمیونزم" دورِ حاضر کا سب سے زیادہ خبیث فتنہ ہے۔ جس کی پرچھائیں سے بھی اللہ ہر کسی کو بچائے رکھے،
کمیونزم کی بنیاد ہی وجودِ باری کی نفی پر قائم ہے، یوں تو کمیونزم تمام مذہبوں کا مخالف ہے مگر اسے سب سے بڑا عناد "اسلام" سے ہے
کمیونزم اسلام کو اپنی ترقی کی راہ میں سنگِ گراں سمجھتا ہے!

کمیونزم کو فتنہ کہئے، خدا کے عذاب سے تعبیر کیجئے، شجرِ خبیث کا اسے نام دیجئے، مگر صرف برا بھلا کہنے اور بددعا دینے سے تو اس فتنہ کا سدِباب نہیں ہو سکتا، لوہے کو لوہا کاٹتا ہے، "کمیونزم" ایک نظریۂ حیات اور منظم تحریک ہے۔ اس کے جواب میں کسی نظریۂ حیات ہی کو لانا پڑے گا، نظریہ کا توڑ نظریہ ہی سے ممکن ہے، دلائل کا جواب دلائل سے، نظریہ کا جواب نظریہ سے، تحریک کا جواب تحریک ہی سے دیا جاسکتا ہے!

دوسرے مذاہب تو پوجا پاٹ کے مذاہب ہیں، جن کے پاس کوئی نظامِ حیات نہیں ہے، اس لئے ان کے ماننے والے ہر سانچے میں آسانی سے ڈھل جاتے ہیں اور ہر نظریۂ حیات کو قبول کر لیتے ہیں، تنہا اسلام ہی وہ "دین" ہے، جو ہر جہت سے ایک مکمل نظامِ حیات ہے، جو دینِ فطرت ہونے کا مدعی ہے اور جو زندگی کی ہر منزل میں انسان کی رہنمائی کرتا ہے اس لئے آج کی دنیا میں کمیونزم کا مقابلہ "اسلام" ہی سے ہے۔

اسلام اور کمیونزم اپنی فطرت سے ایک دوسرے کے مخالف واقع ہوتے ہیں، ایک حق ہے، دوسرا باطل ہے، اور حق و باطل کے درمیان مصالحت ہو ہی نہیں سکتی، جو کوئی کمیونزم اور اسلام کے مابین صلح کرانا چاہتا ہے یا کسی درمیانی راہ نکلنے کی امید رکھتا ہے، خود اس کی عقل کا دیوالہ نکل چکا ہے!

قیامت کے دن اسلام کے علمبرداروں سے سوال ہوگا کہ تمہارے اشتراکیت جیسے فتنۂ دین و ایمان کو روکنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کیں تم کو اللہ تعالیٰ نے "اُمتِ وسطیٰ" بنایا تھا، تم نے اپنی ذمہ داری کو کس حد تک پورا کیا، خدا، رسول، آخرت اور اخلاق و نیکوکاری کے خلاف جو باقاعدہ ایک تحریک چل رہی تھی، تم نے اس تحریک کی کہاں تک روک تھام کی! مسلم حکومتوں کے سربراہ کاروں سے باز پرس ہوگی کہ کمیونزم جو سراسر باطل نظام تھا اس کی سربلندی کے لئے کمیونسٹ حکومتوں کے اربابِ حل و عقد نے جو جدوجہد کی، جس اخلاص کا ثبوت دیا اور جس تندہی سے کام لیا، کیا تم نے حق پر ہوتے ہوئے اس کے مقابلہ میں سوواں حصہ بھی ایثار، جدوجہد اور اخلاص کا مظاہرہ کیا۔

پاکستان میں

عراق میں ان سرخوں نے جو خونیں انقلاب برپا کیا ہے اور تبت میں جس انداز پر دلائی لامہ کو دیس نکالا ملا ہے، اس سے کمیونزم کی رفتارِ ترقی کا تھوڑا بہت اندازہ کیا جاسکتا ہے، ہندوستان میں کمیونسٹ پہلے ہی سے زور پکڑتے جا رہے ہیں یہاں تک کہ ایک صوبہ کی عنانِ حکومت ان کے ہاتھوں میں ہے۔ بمبئی، کان پور اور احمد آباد جیسے صنعتی شہروں میں کمیونسٹوں کا سب سے زیادہ زور ہے، وہاں کے مزدور کمیونسٹوں کے اشاروں پر کھیلتے ہیں، وہ کانگریس جس نے نصف صدی تک ہندوستان کی آزادی کے لئے جدوجہد کی ہے اور جو ایک زمانے میں بھارت کی سب سے زیادہ مقبول جماعت تھی، کمیونسٹوں کے مقابلہ میں وہ بھی غیر مقبول بنتی چلی جا رہی ہے! بھارت کی فضا کمیونزم کے لئے خاصی سازگار ہے! یہ آگ جو بھارت میں سلگ چکی ہے، اس کی لپٹ سے پاکستان کا محفوظ رہنا مشکل ہے، خصوصاً جب کہ مشرقی پاکستان میں کمیونسٹ جگہ پکڑ چکے ہیں اور بڑی قوت کے ساتھ اپنے مشن کو آگے بڑھا رہے ہیں!

ہم مانتے ہیں کہ ضرورت کے وقت ..... حکومت کا تعزیری قانون حرکت میں آسکتا ہے، غلط کاروں پر احتساب و دار و گیر کی ضرورت سے بھی ہم منکر نہیں ہیں، انتشار و تخریب کے سدِباب کے لئے طاقت بھی استعمال کی جاسکتی ہے، مجرموں، باغیوں اور جاسوسوں کو جیلخانوں میں

بھی ڈالا جا سکتا ہے ——— مگر صرف ان تدبیروں سے کسی منظم تحریک کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ ڈکیتوں کی کسی ٹولی کو قید خانہ میں بند کر دیا جائے تو اس علاقہ میں ڈکیتی کی وارداتیں بند ہو سکتی ہیں مگر کسی منظم تحریک کے کرتا دھرتاؤں کے صرف نظر بند یا قید کر دینے سے وہ تحریک مٹ نہیں سکتی بالخصوص ایسی حالت میں کہ عوام کی ہمدردیاں اس تحریک کو حاصل ہوتی ہیں۔

جن کی یہ ذہنی انداز ہے [illegible] خیال ہے کہ چند کمیونسٹ اخباروں کے حکومت کی تحویل میں چلے جانے اور کچھ کمیونسٹوں کے نظر بند کر دینے سے پاکستان میں کمیونزم کا فتنہ دب جائے گا، تحریکیں صرف طاقت کے زور سے مٹا نہیں کرتیں، پاکستان میں کمیونزم کے فتنہ کا صرف ایک ہی توڑ ہے کہ یہاں اسلامی نظام نافذ کر دیا جائے۔ نظام اسلامی کا برپا ہونا کمیونزم کے لئے ان شاء اللہ .... پیغام مرگ ثابت ہوگا۔

"اسلامی نظام" [illegible] اقدام ہے جس کی زد براہ راست اس تحریک کی بنیادوں پر پڑتی ہے۔ اسلام کو جہاں بھی عملی طور پر متشکل کر دیا جائے گا اس کے سامنے کمیونزم یا کوئی دوسری باطل تحریک ٹھہر نہیں سکتی، یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ "اسلام" جہاں آئے گا وہاں باطل ایک لمحے کے لئے بھی ٹک نہیں سکتا۔

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا

اس منظر کا دنیا بار بار تجربہ اور مشاہدہ کر چکی ہے۔

کسی تحریک کو آگے بڑھنے اور مقبول بننے میں حکومت کی طاقت بہت بڑا کارنامہ انجام دیتی ہے، کمیونزم کو طاقت ہی اس وقت حاصل ہوئی ہے، جب روس میں وہ خود غالب قوت بن چکا ہے، پاکستان میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے اسلام کو غالب قوت بنانے کے مواقع حاصل ہیں۔ دنیا کی نگاہیں پاکستان کی جانب لگی ہوئی ہیں کہ جس مقصد کے لئے پاکستان وجود میں آیا ہے، اس کی تکمیل کب ہوتی ہے؟ دنیا کو یہ دیکھنے اور موازنہ کرنے کا حق حاصل ہے کہ کمیونسٹوں کو روس میں جب بھی پہلا موقعہ ملا، انھوں نے کسی تاخیر اور سوچ بچار کے بغیر کمیونزم کو عملاً نافذ کر دیا اور روسی حکومت کی پوری طاقت کمیونزم پھیلانے میں صرف ہو رہی ہے، مگر پاکستان میں "نظام اسلام" کے عملاً نفاذ کا مسئلہ کھٹائی میں پڑا ہوا ہے تو ——— کہ کمیونزم ایک حکومت کا آئین و دستور اور ایک ملک کے نظام تمدن کی عملی اساس بننے کی صلاحیت رکھتا ہے، مگر "اسلام" میں یہ صلاحیت موجود نہیں ہے .... یہ جملے ہمارے دل پر پتھر بن کر برسے ہیں اور ایک ایک لفظ پر ہم نے چبھن محسوس کی ہے۔ لیکن ہم کو کیا کیا جائے، دو نظام ہائے حیات، دو تحریکوں اور دو نظریوں کے درمیان مقابلہ اور موازنہ کرنے سے آپ دنیا کو روک نہیں سکتے۔ دنیا الفاظ کو نہیں عمل کو دیکھتی ہے ایک طرف کارل مارکس کے ماننے والے ہیں جو اپنے پیشواؤں کی تعلیم اور نظریہ کو عملی طور پر متشکل کر چکے ہیں، دوسری طرف محمد عربی کے امتی ہیں، جو اپنے .... نبی کے پیش کئے ہوئے نظریہ کی عملی تنفیذ نہ کر سکے [illegible] اس موازنہ سے ایک حساس قلب کو جتنی ٹھیس پہنچ سکتی ہے اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا! اہل باطل کا اپنے مشن سے یہ اخلاص اور ہم [illegible] اپنے مشن سے یہ غفلت اور بے پروائی جیسے ہم پر اقامت دین کی کوئی ذمہ داری ہی عائد نہیں ہوتی! کاش! ہم غلام ہی رہتے تاکہ غلامی ساری غفلتوں پر پردہ ڈالے رہتی، مگر ہماری آزادی تو اسلام کی رسوائی کا سبب بن رہی ہے کہ ہم ایک آزاد مملکت کو اسلامی قالب میں نہ ڈھال سکے! دنیا کو کیا پڑی ہے جو اس "اسلام" کی طرف آئے جسے اس کے ماننے والے قدرت رکھنے کے باوجود نافذ نہیں کر سکتے ——— "دنیا" کمیونزم کی طرف کیوں نہ بڑھے جسے اس کے پیرووں نے عملی طور پر نافذ کر کے دکھا دیا ہے

اوپر کہا جا چکا ہے کہ بد اخلاقی، معصیت اور ناجائز عیش و تفریح کا کمیونزم کو فائدہ اور اسلام کو نقصان پہنچتا ہے، اس لئے

پاکستان میں رقص و سرود کا کوئی جلسہ کاک ٹیل کی کوئی پارٹی، گھوڑ دوڑ اور کلب گھروں کی قمار بازی، سُود کا رواج اور اسی قسم کی دوسری ناجائز تفریحات کمیونزم کے لئے زمین ہموار کر رہی ہیں اور اسلام کے لئے مشکلات پیدا ہوتی جا رہی ہیں۔

معاصی، فواحش اور ناجائز تفریحات کے ہجوم میں آدمی خدا، رسول، آخرت اور اخلاق و نیکوکاری سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ اور اگر یہ برائیاں کسی معاشرے کی رگ و پے میں سرایت کر جائیں اور ان کا اعادہ ہوتا رہے اور ان کی کراہت دلوں سے نکل جائے، تو یہی کمیونزم کی فتح ہے، کیونکہ کمیونزم یہی چاہتا ہے کہ دینی تصورات و معتقدات کمزور ہوتے ہوتے بے جان ہو جائیں، دلوں میں نہ تو خدا کا خوف رہے اور نہ آخرت کی باز پرس کا احساس دل میں کھٹک پیدا کرے۔ عوام و خواص دین سے بیزار اور خدا سے بے پروا ہو جائیں۔

پاکستان کو اگر واقعی کمیونزم سے بچانا ہے اور عراق و تبت جیسے حالات یہاں پیدا نہیں ہونے دینے ہیں، تو اس کی واحد تدبیر یہی ہے کہ یہاں ہر شعبۂ زندگی میں خالص اسلامی فضا پیدا کی جائے۔ ہر طرف نیکوکاری کا چلن ہو، لوگوں کے ذہن و فکر کی تربیت اس انداز پر کی جائے کہ ان کے اندر خدا کا خوف، اطاعت رسولؐ کا جذبہ اور آخرت کی باز پرس کا یقین پیدا ہو، ریڈیو، پریس اور تعلیمی ادارے سب کے سب اسی مقصد کی اشاعت اور اس کے حصول کے لئے وقف ہوں، اسلام کی محبت دلوں میں اتار دی جائے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا احساس ذہنوں پر مسلّط کر دیا جائے۔

پچھلے سیاست دانوں کا سب سے بڑا اور سنگین جرم یہ ہے کہ انھوں نے "اسلام" کو پاکستان کی غالب قوت نہیں بننے دیا۔ ہمارے نئے حکمرانوں کی سب سے بڑی خوش بختی اور سعادت اسی میں ہوگی کہ ان کے دور حکومت میں "اسلامی نظام" یہاں قائم و برپا ہو جائے۔

جو کوئی "اسلام" کے بارے میں مذبذب ہے کہ اس کو کسی حکومت میں عملاً نافذ کیا جا سکتا بھی ہے یا نہیں؟ ایسے شخص کو چاہیئے کہ وہ توبہ و استغفار کرے اور تجدید ایمان بھی! اسلام مسجد و خانقاہ کی چار دیواری میں محبوس ہونے کے لئے نہیں آیا، وہ "دین فطرت" ہے اور عمل و نفوذ اس کی سرشت میں شامل ہے! "خلافت راشدہ" کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ بس اسی نمونہ پر ایک ایک شعبۂ حیات کو ڈھالتے چلے جائیے۔

اسلامی حکومت اور دینی معاشرے میں "کمیونزم" کے لئے کوئی گنجائش نکل ہی نہیں سکتی۔ اسلامی ماحول اس شجر خبیث کو راس ہی نہیں آسکتا۔ کمیونزم تو لادینی حکومتوں اور فسق و فجور سے لبریز معاشرے میں پروان چڑھتا ہے؛ عراق میں "کمیونزم" کو غلبہ اسی وقت حاصل ہوا ہے جب وہاں کا معاشرہ بدکاریوں میں غرق ہو چکا ہے۔

دنیا کے ہر باطل نظام اور خاص طور سے کمیونزم سے پاکستان صرف اسی صورت میں محفوظ رہ سکتا ہے کہ یہاں اللہ کے دین کو غلبہ اور سربلندی حاصل ہو، معروف پھیلیں پھولیں اور منکر کی جڑ کاٹ دی جائے۔ اس پاک سرزمین میں اچھائیاں سبزے کی طرح اگیں اور نیکیاں شبنم بن کر برسیں، یہاں تک کہ اللہ کی رضا حاصل ہو جائے اور مشرق و مغرب ہدایت کی روشنی اور سعادت و فلاح کے نور سے جگمگانے لگیں۔

ماہر القادری

۲۳ مئی ۱۹۵۹ء

صدیقؓ و فاروقؓ
مستشرقین کی نظر میں

اسلام کی پوری تاریخ میں ایک سطر بھی ایسی نہیں ملتی، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں، اور حضورؐ کے بعد اجل صحابہ اور خاص طور سے خلفاء راشدین اور ان میں بھی ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) نے اسلام سے ذرہ برابر بیوفائی کی ہو! تاریخ بتاتی ہے اور صحیح بتاتی ہے کہ یہ نفوس قدسیہ اسلام کے مخلص ترین وفادار تھے، ان کی کوششوں کی بدولت اسلام کو زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی، سربلندی اور غلبہ نصیب ہوا! دورِ خلافت میں ایک طرف :-

"یدخلون فی دین اللہ افواجا"

کا روح پرور منظر دکھائی دیتا ہے تو دوسری طرف اسلامی حکومت کے حدود وسیع سے وسیع تر ہوتے چلے جاتے ہیں! دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت فرزندانِ اسلام کے سامنے ٹک نہیں سکی، جس کسی نے سرکشی کی اُسے سرنگوں ہونا پڑا۔ اللہ کے کلمہ کو ایسی بلندی پھر کبھی میسر نہ آسکی۔

حضرات شیخین (ابوبکر و عمرؓ) نے جس بے نفسی کے ساتھ حکمرانی کی ہے اور اپنی ذات مع اپنے اہل وعیال اور متعلقین کو دُنیوی لذتوں سے جس قدر دور رکھا ہے وہ ایک طرف دنیا کے لئے "مثالی نمونہ" ہے اور دوسری طرف اس حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ "غاصبین" کا کیا یہی سیرت و کردار ہوا کرتا ہے؟ اور ایسے قدسی صفت افراد جو بیت المال سے دوا کے لئے شہد بھی اُمت کی اجازت کے بغیر نہ لے سکے ہوں، کیا کسی کا "حق غصب" کرنے کے روادار ہو سکتے ہیں؟ دنیا کی تاریخ میں اُن بادشاہوں اور حاکموں کی بھی زندگیاں ملتی ہیں، جنھوں نے لوگوں کے حقوق غصب کر کے حکومتوں پر قبضہ کیا ہے، مگر صدیقؓ و فاروقؓ کا کردار، ان کی زندگیوں سے صاف طور پر نمایاں اور ممتاز نظر آتا ہے۔

مستشرقین نے خلفاء راشدین کی زندگیوں کو پڑھ کر جو رائے قائم کی ہے اس کے چند اقتباسات یہاں پیش کئے جاتے ہیں، دنیا کے کسی متعصب سے متعصب غیر مسلم مورخ نے بھی حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما پر اسلام سے بے وفائی یا نفاق کا الزام نہیں لگایا، لگا کیسے سکتے تھے جب کہ اسلام کے ساتھ ان کی وفاداریاں روزِ روشن کی طرح نظر آرہی تھیں۔

حضرت صدیق اکبرؓ، حضرت عمر فاروقؓ ——— اور "نفاق" ——— توبہ!

نعوذ باللہ! یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی بدباطن کہنے لگے کہ نوشیرواں ظلم کیا کرتا تھا، سکندر کی ساری عمر

غلامی میں بسر ہوتی ہے۔ سورج اندھیرا پھیلاتا ہے، گلاب کے پھول سے بساند آتی ہے، چاندنی بڑا بھیانک منظر پیش کرتی ہے، نسیم صبح کے جھونکے آگ برساتے ہیں، اور برف کے چھونے سے ہاتھ جل جاتا ہے، جب کوئی حقیقتوں کو اس طرح بے دردی کے ساتھ الٹ دے، تو وہ ان نفوس قدسیہ پر تہمتیں جوڑ کر اپنے دین وایمان کو بھی خراب کر سکتا ہے۔　　　(م - ق)

سر ولیم میور Sir William Muir لکھتا ہے:-

"محمدؐ کی وفات کے چھ ماہ بعد تک حسب سابق ابوبکرؓ بالائے مدینہ کے ایک مقام السنح میں قیام فرماتے ہیں، یہاں وہ ایک سادہ سے مکان میں اپنی بیوی کے ساتھ رہتے تھے، جس سے مدینہ آنے پر انھوں نے شادی کی تھی۔...... وہ ہر روز صبح سویرے یا تو گھوڑے پر یا پیدل محمدؐ کی اس مسجد میں جاتے، جہاں آپ قیام فرمایا کرتے تھے اور جہاں سے حکمرانی کرتے تھے، یہاں آکر ابوبکرؓ دن بھر کام کرتے اور نمازوں کی امامت بھی کرتے، اُن کی غیر حاضری میں یہ فریضہ عمرؓ انجام دیتے،..... یہاں بھی انھوں نے اپنی ابتدائی زندگی کی شدید سادگی برقرار رکھی، یہاں تک کہ گھر کی بکریوں کا دودھ بھی خود ہی دوہتے۔ خلافت کے ابتدائی زمانے میں ابوبکرؓ کی گزر بسر کا ذریعہ ان کا اپنا کاروبار تھا، لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ یہ کاروبار ریاست کے فرائض میں خلل انداز ہوتا ہے، اپنے گھر کا خرچ چلانے کے لئے چھ ہزار درہم سالانہ کا مشاہرہ لینے پر تیار ہو گئے۔

پھر یہ دیکھ کر مسجد نبویؐ جہاں محمدؐ کے زمانہ کی طرح تمام اجتماعی کام انجام دیئے جاتے تھے۔ سنح سے دور ہے، وہ مسجد نبویؐ کے پاس ہی منتقل ہو گئے۔

........عوام کے بیت المال سے جتنی کچھ بھی رقم ابوبکرؓ نے لی تھی وہ بھی ان کے ضمیر پر گراں تھی، لہٰذا ابوبکرؓ نے بستر مرگ پر یہ حکم دیا کہ ان کی ذاتی جائداد سے کچھ زمینیں فروخت کر کے جتنی رقم وہ بیت المال سے لے چکے ہیں، اتنی ہی رقم بیت المال میں جمع کردی جائے۔　　　(ص ۷۹)

"اپنی افتاد طبع کے لحاظ سے ابوبکرؓ بیحد نرم اور شریف تھے، عمرؓ کہا کرتے تھے کہ کوئی شخص ایسا نہیں جس کی خاطر لوگ اتنی آسانی سے اپنی جان پر کھیل جانے کو تیار ہو جائے۔"　　　(ص ۷۹)

"اپنے دربار میں بھی ابوبکرؓ نے محمدؐ کی سادہ اور کفایت شعارانہ زندگی کو برقرار رکھا، خدم وحشم اور حاجب ودربان کا سوال ہی نہ تھا اور نہ کوئی ایسی چیز تھی جو شان وشوکت اور ٹھاٹ باٹ سے ذرا بھی میل کھاتی ہو...... ابوبکرؓ اپنی ذات کو کاموں کے سلسلہ میں کبھی نہ بخشتے اور چیزوں کی تمام تفصیلات میں جانے کی کوشش کرتے، آپ راتوں کو غریبوں اور دکھیاروں کا حال معلوم کرنے کے لئے نکل پڑتے تھے، ایک رات عمرؓ نے انہیں ایک اندھی بڑھیا کی خبر گیری کرتے ہوئے پایا جس کی خبر گیری کے لئے خود عمرؓ بھی گئے ہوئے تھے، ابوبکرؓ نے محکمہ عدل عمرؓ کو سونپ دیا تھا مگر پورے ایک سال کے دوران میں کل دو مقدمے آئے...... ریاست کی مہر پر "اللہ بہترین حکمراں" لکھا ہوا ہوتا تھا...... بڑے بڑے مناصب یا فوج کی کمان کے لئے لوگوں کا انتخاب کرنے میں ابوبکرؓ جانب داری سے پاک اور ان لوگوں کے کردار کا اندازہ لگانے کے سلسلہ میں بڑے دانا و فہیم تھے:　　　(ص ۸۰ - ۸۱)

"ابوبکرؓ کو اپنی ذاتی اغراض کی تکمیل کی کوئی فکر نہ تھی۔ اگرچہ انہیں بادشاہوں کا سا اقتدار حاصل تھا، جس کے لئے وہ جواب دہ بھی نہ تھے۔ انھوں نے اسے (یعنی اقتدار کو) صرف اسلام کے مصالح اور عوام کی بہبودی کے لئے استعمال کیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ

"مجھے خلیفۃ اللہ نہ کہا کرو ..... مجھے خلیفہ رسول اللہ کہا کرو" ابوبکر رض کے سامنے ہمیشہ یہ سوال تھا کہ محمدؐ کا اس مسئلہ میں کیا حکم یا یہ کہ اس معاملے میں آپ (محمدؐ) کیا طرزِ عمل اختیار کرتے؟ اور اس سوال کا جو جواب بھی ہوتا اس سے ابوبکر رض نے کبھی بال برابر بھی تجاوز نہیں کیا، اسی وجہ سے انھوں نے (فتنۂ ارتداد کو کچل ڈالا اور اسلام کی بنیادیں مستحکم کردیں، آپ کا دورِ حکمرانی بڑا مختصر تھا۔ لیکن محمدؐ کے بعد کوئی اور شخص ایسا نہیں ہے جس کا یہ مذہب (اسلام) اتنا زیر بار احسان ہو"

"اسی چیز کے پیش نظر، اس وجہ سے کہ ابوبکر رض کا محمدؐ پر ایسا ایمان واعتقاد خود محمدؐ کے اخلاص کا ایک زبردست ثبوت ہے۔ میں ابوبکر رض کے سیرت وکردار کے بارے میں کسی قدر تفصیل سے کلام لیا ہے، اگر محمدؐ نے اپنے کام کا آغاز .... ایک جعل ساز کی حیثیت سے کیا ہوتا تو وہ ایک ایسے شخص کی دوستی اور اس کا اعتماد نہ حاصل کرپاتے جو صرف دوراندیش اور عقلمند ہی نہیں تھا، بلکہ جو ساری عمر اپنے اصولوں میں یک رنگ ومخلص رہا ہو۔ (ص۔ ۸۰)

"عمر رض نے جو نبیؐ کے بعد اسلام کی مملکت میں سب سے عظیم الشان تھا۔ اس طرح وفات پائی۔ سب سے عظیم اس لئے کہ عمر رض کے دورِ حکمرانی) کے ان دس سالوں ہی میں دانش مندی، صبر اور قوت کے طفیل شام، مصر اور ایران فتح ہوئے، ابوبکر رض نے مرتد قبائل کو ضرور دبا دیا لیکن ان کی وفات کے وقت اسلام کی فوجیں ابھی صرف شام کی سرحد ہی کو پار کرسکی تھیں، عمر رض نے اپنی حکمرانی کا جب آغاز کیا، اس وقت آپ صرف عرب کے حکمران تھے، جب آپ کی وفات ہوئی تو وہ ایک ایسی سلطنت کے خلیفہ تھے جس کے زیر نگیں بازنطینی مملکت کے حسین صوبے اور ایران تک آچکے تھے، لیکن اس عظیم الشان اقبال مندی کے پورے دور میں آپ نے اپنے فیصلوں میں کبھی بھی میانہ روی اور دانش مندی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اور نہ خود کو ایک سادہ اور معمولی عرب سردار سے زیادہ بلند سمجھا۔ بعض اوقات باہر سے آنے والے پوچھتے کہ "خلیفہ کہاں ہے؟" اور مدینہ کی مسجد کے صحن میں اسے کہیں تلاش کرتے رہتے درآں حالیکہ اس سارے وقت (تلاش وجستجو کے دوران) خود وہ فرمانروا اپنے گھر کے (معمولی) کپڑے پہنے ہوئے اُن کے سامنے ہی بیٹھا ہوتا۔

"عمرؓ کی زندگی کے بارے میں لکھنے کے لئے صرف چند سطریں درکار نہیں، سادگی اور احساس فرض یہ ان کی زندگی کے رہنما اصول تھے اور غیر جانبداری اور مخلصانہ خدمت گزاری ان کے نظم ونسق کے امتیازی نشانات تھے، اور ان کا احساس ذمہ داری اس قدر شدید تھا کہ عمر رض کی زبان سے یہ الفاظ سنے گئے:۔

"کاش! میری ماں نے مجھے نہ جنا ہوتا، کاش میں گھانس کا ایک تنکا ہوتا" (ص، ۱۹۰۔ ۱۹۱)

"عمر رض اپنے ہاتھ میں کوڑا لئے مدینہ کی گلیوں اور بازاروں کے چکر لگاتے رہتے تاکہ مجرموں کو برمحل سزا دے سکیں، اس لئے یہ کہاوت مشہور ہوگئی ہے کہ "عمر رض کا کوڑا اوروں کی تلوار سے زیادہ ہیبت ناک ہے" لیکن ان باتوں کے باوجود عمر بڑے رقیق القلب تھے اور لوگوں پر اُن کی شفقت ومہربانی کے بے شمار واقعات (تاریخ میں) ملتے ہیں، مثلاً بیواؤں اور یتیموں کی ضروریات کی تکمیل ..."

(ص ۱۹۱)

(The caliphate its Rise, decline and Fall (Edinburgh 1915)

آر۔اے۔نکلسن (R. A Nicholson) لکھتا ہے:۔

"ابوبکر ــــ مزاج میں سادہ اور اپنے برتاؤ میں، شان وشوکت سے عاری تھے، اور نبیؐ پر اپنے پختہ ایمان کی بدولت محمدؐ کی

لقب حاصل کر چکے تھے، طبعاً شریف اور رحمدل، لیکن جب اسلام پر خطرے کی گھڑی آئی تو مضبوطی سے اپنی جگہ پر جمے رہے اور اپنے دی ہاتھ سے اس بغاوت کا سر کچل کر رکھ دیا جو محمدؐ کی وفات کی خبر پاکر جنگل کی آگ کی طرح پورے عرب میں پھیل گئی تھی " ص ۱۸۳

حضرت عمرؓ

"اوپر جو واقعات بیان کئے گئے ہیں اُن سے ان (عمرؓ) کے کردار کے اہم خدوخال سامنے آجاتے ہیں۔ سادہ و کم خرچ، خوف اور جانبداری و رعایت کے بغیر اپنا فرض انجام دینے والے (خود پر) سختی کرنے کی حد تک سرگرم عمل لیکن کمزوروں کے ساتھ نرمی کی صلاحیت رکھنے والے، دوسروں کے اور خاص طور پر خود اپنی ذات کے لئے سخت گیر ناقد و مبصر۔ عمرؓ ایک پیدائشی حکمراں تھے، اور ان کے رگ و پے میں انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی" (ص ۱۹۰)

(A Literary History of the Arabs
London 1923 (II edition)

تھیوڈر نولڈیک (Theodor Noldek) لکھتا ہے:-

"محمدؐ کی وفات (۸ جون ۶۳۲ء) کے بعد آپ کے سربرآوردہ اصحاب نے اکٹھا ہو کر ابوبکرؓ جو آپ کے سب سے زیادہ معتمد علیہ دوست تھے، آپ کا جانشین چن لیا، ابتدا میں مدینہ النصاریٰ کے ذہن میں اس خیال کے دور کرنے میں کہ امارت کا منصب اُن میں سے کسی کو ملنا چاہئیے یقیناً کچھ دشواری پیش آئی لیکن علیؓ کی آزردگی پر (جن کی بیوی فاطمہؓ اور اُن کے چچازاد بھائی محمدؐ کی کیلی زندہ، اولاد تھیں) کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ابوبکرؓ کا انتخاب ایک ایسا انتخاب تھا جسکی خود نبیؐ کو پسندیدگی حاصل تھی۔ عرب محمدؐ کی وفات کی خبر سنتے ہی گروہ در گروہ بغاوت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، بہتوں نے اسلام سے مکمل طور پر علیحدگی اختیار کرلی، بعض نماز کو برقرار رکھنے کے لئے تو تیار تھے، لیکن زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے آمادہ نہ تھے .... یوں سمجھنا چاہئیے کہ محمدؐ کا پورا کام معرض بحث میں آگیا تھا، ایسے وقت میں اسلام کی طاقت اور ایک فرد کے مضبوط عزم و ارادت کا اظہار ہوا۔

"ابوبکرؓ خود اپنے ایمان و اعتقاد میں مضبوط تھے، شدید ضرورت کے تقاضوں کے باوجود بھی ایک لمحہ کے لئے ان باغیوں کے ساتھ ذرہ برابر رو رعایت کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے، (ص ۴۲ - ۴۳)

"عمرؓ نے جو ابوبکرؓ کے مختصر دو سالہ عہد حکمرانی کے بعد محمدؐ کے خلیفہ بنے اور جو "امیرالمومنین" کا لقب اختیار کرنے والے پہلے شخص تھے، ایک مکمل عسکری مذہبی ریاست منظم کی، مذہب کے اصولوں کو شدت کے ساتھ برقرار رکھا، خلیفہ اپنی رعایا میں سے "حقیر ترین" کی سی سادہ زندگی گزارتا تھا" (ص ۴۶)

(Sketch from Eastern History
Translated into English by J. S. Black Lon

ایڈورڈ اٹیا (Edward Atiya) رقمطراز ہے:-

"ابوبکر رضی اللہ عنہ ایک معمر آدمی تھے، لیکن اُن کی شخصیت میں ناقابل تسخیر عزم و ارادہ کی قوت اور ایک مذہبی شخص کے ایمان کی پاکیزگی و اخلاص ایک ساتھ جمع ہو گئے تھے، اور یہ انہیں کے غیر متزلزل ارادے اور

(باقی مضمون صفحہ ۲ پر دیکھئے)

محمد اکرام

فقہ اسلامی کے تاریخی ادوار

کس طرح کیا کام ہوا؟

اور اب کیا کرنا ہے؟

علمائے اسلام نے تاریخ فقہ اسلامی کو چھ ادوار میں تقسیم کیا ہے:-

(۱) **دورِ اول:**- نبی کریمؐ کا دور خیر القرون ہے۔ احکام شرعیہ براہِ راست خداوند تعالیٰ کی جانب سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتے تھے اور آپؐ ان احکامات کی بنا پر جمیع المسلمین کے درمیان مسائل کا فیصلہ فرماتے تھے اور ان کے درمیان معاملات کی حدود متعین فرماتے تھے۔

(۲) **دورِ دوم:**- یہ دور خلفائے راشدین کا دور ہے جو رحلتِ نبویؐ سے آغاز ہو کر اختتام خلافت علیؓ پر منتہی ہوتا ہے۔ اس دور کا ابتدائی زمانہ فتنوں کی سرکوبی اور حدودِ سلطنت اسلامی کی توسیع کی بنا پر ممتاز ہے۔ اسی زمانہ میں جمع القرآن کا کارنامہ سرانجام پایا اسی دور کا عہد آخر اس بنا پر اہم ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں میں سب سے پہلے سیاسی تفریق رونما ہوئی۔ اس تفریق نے آئندہ ادوار میں فقہ اسلامی پر دور رس اثرات مرتب کئے۔

(۳) **دورِ سوم:**- یہ دور دورِ صحابہ اور تابعین ہے۔ اس دور کا آغاز حکومت امیر معاویہؓ سے ہوتا ہے اور پہلی صدی ہجری کے آخر میں ختم ہوتا ہے۔ اس دور میں علم دین یعنی قرآن اور حدیث کی بے انتہا ترویج ہوئی۔ عوام الناس جوق در جوق علمی مجالس میں آنے لگے۔ لوگوں کے بڑھتے ہوئے ذوقِ حدیث کی وجہ سے بعض فتنہ پردازوں نے موضوع احادیث کی روایت کو بھی رواج دیا۔ لیکن ناقدین حدیث نے فن اسماء الرجال اور نقد حدیث کے اصول قائم کر کے حدیثیں پرکھیں اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیا۔

(۴) **دورِ چہارم:**- یہ دور دورِ فقہا کہلاتا ہے۔ اس دور میں فقہ نے ایک مستقل علم کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اسی دور میں کبار فقہا اور ائمہ فقہ نے تدوین فقہ کی خدمت انجام دی۔ یہ دور دوسری صدی ہجری کے آغاز سے شروع ہو کر چوتھی صدی ہجری کے آغاز تک رہا۔

(۵) **دورِ پنجم:**- یہ دور چوتھی صدی کے آغاز کے فوراً بعد شروع ہوتا ہے اور فتنۂ تاتار تک رہا۔ اس دور میں گو علم میں کوئی قابل قدر اضافہ نہیں ہوا لیکن مختلف مذاہب فقہ کے پیرو اور مقلدین اپنے اپنے مسلک میں غلو کرنے لگے۔ علمی اور اخلاقی مسائل میں مناظرہ بازی کا رواج ہو گیا۔ لوگ دنیا داری میں منہمک ہو گئے۔ علم کلام اور یونانی فلسفہ کی اشاعت نے دینی عقائد کو مجروح کیا۔

(۶) **دورِ ششم:**- یہ دور فتنۂ تاتار کے بعد سے لے کر تا حال قائم ہے۔ یورشِ تاتار کی تباہ کاریوں نے مسلمانوں کو پژمردہ کر دیا روحِ اجتہاد مسلوب ہو گئی۔ نتیجتاً اجتہاد کو ترک کر دیا گیا۔ اسی عہد میں متصوفین کو فروغ حاصل ہوا۔ تقلید محض کا رواج عام ہو گیا۔

اس دور میں مسلمان فکر و عمل دونوں حیثیتوں سے زوال پذیر ہو گئے، اور اسلام کی جامعیت اور ہمہ گیری کے مقابلہ میں اسلام محض چند عقائد، عبادات اور رسوم کے مجموعے کا نام ہو کر رہ گیا۔

دورِ اوّل فقہی نقطۂ نظر سے اس دور کا آغاز ہجرت سرور کائنات سے ہوتا ہے۔ مکی دورِ نبوت میں جو آیاتِ قرآنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئیں ان میں عموماً عقائد یعنی توحید، رسالت، آخرت، اعمال کی جزا سزا، اور جنت و دوزخ کا بیان تھا۔ احکامِ شریعت کی حیثیت شواذ و نوادر کی ہے۔ اس کے برعکس مدنی آیتِ قرآنی میں غالب حصہ احکام شرعیہ سے متعلق ہے اور علم فقہ کا تعلق انہی احکام و نواہی سے ہے۔

نبوت کی ۲۳ سالہ زندگی میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر حسب ضرورت موقعہ بموقعہ آیات قرآنیہ کا نزول ہوتا رہا۔ مکی دورِ نبوت میں جبکہ تبلیغ ایمانیات ہی مقصد واحد تھا لوگوں کو عقائد یعنی توحید، رسالت، جزا سزا اور احسان سے متعلق تعلیم کی ضرورت تھی۔ انہی موضوعات پر مشتمل آیات نازل ہوتی تھیں۔ اور مدنی زندگی میں جبکہ مسلمانوں نے اپنی ہیئتِ اجتماعیہ (Society) قائم کر لی اور ان میں لین دین، اور معاملات طے پانے لگے تو ضرورت اس امر کی پڑی کہ اس اسلامی حکومت کو چلانے کے لئے اصول اور قواعد اور عوام الناس کے باہمی معاملات کے قوانین رائج کئے جائیں۔ لہٰذا احکام شریعت کی حامل آیت نازل ہوئیں۔ کبھی کوئی خاص حکم نازل ہوا اور کبھی کوئی اصول ضرورت کے مطابق بیان کر دیا جاتا تھا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست احکام کے نزول کا یہ سلسلہ حجۃ الوداع تک جاری رہا۔ جہاں قرآن کی یہ آخری آیت "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ" نازل ہوئی۔

اس دورِ سعادت میں مسلمانوں کو جب کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ خداوند پاک کے حکمی فرمان (فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (الآیہ) کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا حل دریافت کرتے۔ اور آپ اگر قرآن کریم میں اس کے متعلق کوئی واضح اور صریح حکم ہوتا تو اس کو بیان کرتے ورنہ قرآن کے بیان کردہ اصولوں کی روشنی میں خداداد حکمت و فراست سے فیصلہ صادر فرماتے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان فیصلوں کو تسلیم کرنا ازروئے قرآن مومن ہونے کی شرط ہے (لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْكَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ)

الغرض اس دور میں فقہ اسلامی کا سرچشمہ صرف قرآن حکیم اور حضور نبی کریم کی ذات گرامی تھی۔ لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ .... (الآیہ) آپ پر نازل شدہ قرآن اور آپ کے فرمودات اور فیصلے جن کو اصطلاح میں سنت و حدیث کہتے ہیں۔ ابد تک واجب التعمیل ہیں اور ہر دور میں یہ دونوں فقہ اسلامی کا سب سے عظیم ماخذ ہے ہیں اور قیامت تک رہیں گے۔

دورِ دوم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت (سلہ ھ) کے بعد جب تمام امت نے متفقہ طور پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا خلیفہ منتخب کر لیا تو آپ فتنۂ ارتداد اور مرتدین کی سرکوبی کی جانب متوجہ ہوئے۔ سرزمین عرب میں پوری طرح امن و امان قائم کرنے کے بعد آپ نے سرحدات کی جانب توجہ فرمائی اور شرپسند اور ستم شعار رومیوں اور ایرانیوں کی سرکوبی کے لئے لشکر روانہ کئے۔ رومی اور ایرانی طاقت کا پوری طرح استیصال نہ ہوا تھا کہ آپ ۲۲ جمادالثانی ۱۳ھ میں انتقال فرما گئے۔ حضرت ابو بکر رض کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھوں میں زمام خلافت آئی۔ اس سنہری دور میں اسلامی حکومت کی حدود انتہائی وسیع ہو گئیں۔ حضرت عمر رض کے بعد امت نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ حضرت عثمان رض کے عہد میں فتوحات کا سلسلہ کم ہو گیا۔ اور ساتھ ہی ملتِ اسلامیہ میں سب سے پہلا تفرقہ رونما ہوا۔ حضرت عثمان رض

کی فطری نرم دلی، تحمل اور بردباری اور قرابت داروں کی صلہ رحمی؟ کی بنا پر چند شر پسندوں نے آپ کے خلاف سازش کی۔ اور آپ کو نہایت بے رحمی سے گھر کے اندر قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے شہید کر دیا گیا۔ حضرت عثمان رضؓ کی شہادت نے ملت اسلامیہ میں فتنوں کا دروازہ کھول دیا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہ کی خلافت کے زمانے میں آپ سے بار بار خونِ عثمان رضؓ کے قصاص کا مطالبہ کیا جاتا رہا لیکن آپ ہر مرتبہ بعض وجوہ کی بنا پر خاموش ہو جاتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہ رضؓ (جو اس مطالبہ کرنے والوں میں پیش پیش تھے) کے درمیان جنگِ صفین برپا ہوئی۔ نقصان دونوں مسلم فریقوں کا ہوا اور فائدہ ان لوگوں کو ہوا جو اسلام کے دشمن تھے اس کش مکش میں مسلمانوں میں تین فرقے پیدا ہوئے۔ ۱:- جمہور مسلمان ۔ ۲:- شیعہ ۔ ۳:- خوارج ۔

جمہور مسلمان تمام صحابہ کی یکساں عزت کرتے تھے۔ حضرت علی رضؓ اور امیر معاویہ کی کش مکش کو اجتہادی غلطی تصور کرتے تھے۔ شیعہ حضرت حضرت علی رضؓ کے طرفدار اور حامی تھے۔ اور امیر معاویہ رضؓ سے سخت بغض رکھتے تھے۔ خوارج امیر معاویہ رضؓ علی کرم اللہ وجہہ اور عثمانِ غنی رضؓ تینوں سے ناخوش تھے۔ اور یہ تفریق محض سیاسی سی تفریق تھی۔ لیکن بعد ازاں اس نے مذہبی رنگ اختیار کر لیا۔ اس تفرقہ کا جو گہرا اور دور رس اثر فقہ اسلامی پر ہوا اس کو ہم آئندہ صفحات میں بیان کریں گے۔

رحلت نبوی کے بعد چونکہ لوگ براہِ راست شارع علیہ السلام سے اپنے مسائل کا حل دریافت نہ کر سکتے تھے۔ اس لئے اب ان کے پاس دو ماخذِ احکام رہ گئے تھے۔ ایک قرآن اور دوسرے سنت و حدیث۔ قرآن تو خیر واجب التعمیل ہے ہی۔ لیکن سنت و حدیث بھی از روئے قرآن واجب التعمیل ہے۔ کیونکہ قرآن میں ہر جگہ " اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول " کے الفاظ باہم آئے ہیں۔ در اطاعت رسول کا مطلب ہے اتباعِ اقوال وافعالِ رسول ہے۔ اس کے علاوہ قرآن میں منجملہ اور امور کے فرائضِ نبوت میں ایک فریضہ تعلیم حکمت بھی ہے۔ قد جئتکم بالحکمۃ (الآیہ۔ الزخرف ۶۰) ویعلمہ الکتاب والحکمۃ (آلِ عمران ۵۱)

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ حکمت کا مفہوم تمام علماء کے نزدیک سنت ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین اپنے تمام مسائل کا حل انہی دو جگہ تلاش کرتے تھے اور اگر یہ دونوں ماخذ خاموش ہوتے اور انہیں کوئی واضح رہنمائی حاصل نہ ہوتی تو پھر وہ اجتہاد کرتے۔

یہاں اکابر صحابہ اور شیخین یعنی حضرت ابو بکر رضؓ اور حضرت عمر رضؓ کے طرزِ عمل سے متعلق چند باتیں بیان کرنی برمحل ہونگی۔

جمع قرآن:- گو یہ آیاتِ قرآنیہ مختلف اشیاء مثلاً کھجور کے پتوں اور اونٹوں کی ہڈیوں پر تحریر شدہ تھیں اور پورے کا پورا قرآن حفاظ کے سینے میں محفوظ تھا۔ تاہم کتابی صورت میں مدون نہ تھا۔ جیش اسامہ رضؓ کے بیشتر حفاظ کی شہادت کے بعد شیخین رضوان اللہ کو فکر ہوئی کہ اگر رفتہ رفتہ تمام حفاظِ قرآن ختم ہو گئے تو کہیں قرآن نہ مٹ جائے۔ لہذا ان اصحاب رسولؐ نے باہم مشورہ کے بعد حضرت زید بن ثابت رضؓ کو جمع القرآن کی یہ اہم خدمت تفویض کی۔ اور انھوں نے نہایت ذمہ داری سے اور مستعدی سے اسے انجام دیا۔

اول اول تو شیخین رضوان اللہ کا یہ خیال تھا کہ کتابتِ قرآن کے ساتھ ہی ساتھ تدوینِ حدیث کا کام بھی شروع کر دیا جائے۔ لیکن پھر اس خیال سے کہ کہیں حدیث کے کلمات آیاتِ قرآنیہ کے ساتھ خلط ملط نہ ہو جائیں اپنے اس ارادے سے باز رہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت عمر رضؓ نے صحابہ کرام کو کثرتِ روایت سے روک دیا تھا۔ اس حکم کی بھی وہی وجہ ہے جو تدوینِ حدیث کے سلسلے میں بیان کی گئی اور ساتھ ہی ساتھ یہ امر بھی ملحوظ تھا کہ حدیث کی روایت میں نہایت احتیاط اور تحقیق سے کام لیا جائے۔ لیکن بایں ہمہ شیخین کا اپنا طرزِ عمل اور مسلک یہی تھا کہ ہر مسئلہ کا حل اول قرآن میں تلاش کیا جائے۔ اگر وہاں بھی کوئی ہدایت نہ ملے تو سنتِ رسول اکرمؐ میں ڈھونڈا جائے۔ اور اگر یہاں بھی ناکامی ہو تو اجتہاد سے کام لیا جائے۔

اس موقعہ پر یہاں سے متعلق چند باتیں خارج از بحث نہ ہونگی۔

حضرت عمرؓ نے ابو حضرت ابو موسیٰ اشعری رضؓ کے نام مکتوب میں تحریر کیا :۔

"جو چیز تم کو قرآن اور حدیث میں نہ ملے اور تم کو اس کی نسبت شبہ ہو تو اس پر غور کرو اور خوب غور کرو۔ اس کے ہم صورت اور ہم شکل واقعات کو دریافت کرو پھر ان سے قیاس کرو۔"

حضرت عمرؓ کا یہ فرمان اجتہاد کی نہایت جامع تعریف ہے۔ یہ اجتہاد کی کوئی نئی چیز نہ تھی بلکہ اس کی اجازت خود شارع اسلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ بن جبل کو یمن کی جانب حاکم بناکر بھیجا تو ان سے دریافت کیا کہ اگر کوئی مسئلہ تمہارے پاس آیا تو تم اس کا فیصلہ کس طرح کروگے؟ حضرت معاذ بن جبل نے عرض کی کہ قرآن میں اس کا فیصلہ تلاش کروں گا پوچھا اگر وہاں کوئی حکم نہ ملے تو؟ جواب دیا۔ سنتِ رسول اللہؐ میں تلاش کروں گا۔ حضورؐ نے پوچھا اگر وہاں بھی کوئی حکم نہ ملے تو؟ جواباً عرض کیا کہ پھر میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس کوشش میں کسر نہ اٹھا رکھوں گا۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کی تحسین فرمائی اور رخصت کیا۔

علامہ محمد الخضری نے اپنی کتاب تاریخ فقہ اسلامی میں تحریر فرمایا ہے کہ اجتہاد کے معنی یہ ہیں کہ شارع کے معتبر دلائل یعنی قرآن و حدیث سے حکم شرعی کے ڈھونڈنے اور استنباط میں پوری کوشش صرف کی جائے۔ اور اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن و حدیث کے واضح اور ظاہر الفاظ سے حکم کا استنباط کیا جائے اور دوسرے یہ کہ قرآن و حدیث کے سیاق و سباق اور عقلی مفہوم سے حکم کا استنباط کیا جائے اس کو اصطلاح فقہ میں قیاس کہتے ہیں اور اسی کا دوسرا نام اجتہاد ہے۔

خلفاء راشدین کے اس دور میں جب کسی مسئلہ پر صحابہ کی رائے حاصل کی جاتی اور ان کی ایک رائے متعین ہو جاتی تو اس مسئلہ کا فیصلہ اسی کے مطابق کیا جاتا۔ تمام صحابہ کے اس طرح ایک فیصلہ پر متفق ہونے کو اجماع صحابہ کہا جاتا ہے۔ یہ اجماع ہمیشہ کے لئے سند ہے۔ اور اس سے انحراف ممکن نہیں۔ اس دور کے مشہور مفتی اور فقہا۔ خلفاء اربعہ، عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت زید رضؓ بن ثابت، معاذ بن جبلؓ، ابو موسیٰ اشعری رضؓ اور ابی بن کعبؓ ہیں۔

الغرض اس دور میں فقہ کے چار ماخذ تھے :۔ قرآن۔ حدیث۔ قیاس اور اجماع۔

دورِ سوم امیر معاویہ رضؓ نے مسندِ حکومت سنہ۴۱ھ میں سنبھالی اور اپنی حکمتِ عملی سے اپنے دور کو انتہائی پرسکون بنا دیا لیکن امیر معاویہ رضؓ کی وفات رجب سنہ۶۰ھ کے بعد یزید کے دور میں سانحۂ کربلا پیش آیا۔ اس واقعہ نے دونوں سیاسی فرقوں یعنی شیعہ اور خارجی فرقوں کو مستقل مذہبی فرقے بنا دیا۔ چنانچہ یہ واقعات بھی فقہ اسلامی پر دور رس اثرات کے حامل ہوئے اہل تشیع اس بات کے قائل تھے کہ "امارت" میں وراثت ہے۔ اور خلافت صرف علی رضؓ اور ابنائے علی رضؓ کا ہی حق ہے۔ جو لوگ اس مسلک میں غلو کرتے تھے، وہ حضرت ابوبکر رضؓ، حضرت عمر رضؓ اور حضرت عثمان رضؓ کو (نعوذ باللہ) غاصب سمجھتے تھے۔ اس کے برعکس خوارج صرف شیخین ابوبکر رضؓ اور عمر رضؓ سے خوش تھے، اور حضرات عثمان رضؓ علی رضؓ اور امیر معاویہ رضؓ سے بغض رکھتے تھے۔ ایک جانب جہاں روافض اپنے مسلک کی تائید میں وضعی احادیث پیش کرتے تھے اور شیعہ حضرات استخراج مسائل کا حق صرف ائمہ اہل بیت کے ساتھ مختص کرتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک ائمہ اہل بیت معصوم عن الخطا ہیں۔ تو دوسری جانب خوارج حضرت علی رضؓ اور ان کے حلیفوں کی کوئی روایت قبول نہ کرتے تھے اور انہیں (نعوذ باللہ) کاذب ٹھہراتے تھے۔ ان فرقوں کی موجودگی اور آپس کے شدید اختلافات کی نوعیت نے استنباط احکام پر وسیع اثر ڈالا۔ یہی وجہ ہے کہ جمہور علمائے اسلام نے دونوں فرقوں سے اعراض کیا اور

ان کی کسی حدیث کو قبول نہ کیا، الا یہ کہ وہ حدیث کسی دوسرے طریق اور ذریعے سے بھی مروی ہوئی ہو۔

اس دور میں علمائے اسلام مملکتِ اسلامی کے طول و عرض میں پھیل گئے تھے۔ اور اپنے اپنے شہر میں علم دین کی اشاعت کا سرچشمہ مانے جاتے تھے۔ مدینہ منورہ میں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ، ام المومنین عائشہؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کے شاگرد درس کا مرکز تھا۔ مکہ مکرمہ میں عبداللہ ابن عباسؓ اور بصرہ میں انس ؓ بن مالک کے شاگرد توسیع علم میں مصروف تھے۔ اور کوفہ میں ابوموسیٰ اشعریؓ، علی کرم اللہ وجہہ اور عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگرد خدمت دین میں لگے ہوئے تھے۔ چونکہ ان اصحاب میں شرائط حفظ و روایت حدیث میں کچھ فرق ہے، اس لئے ان کے شاگردوں میں بھی یہ اختلاف ذرا شدت کے ساتھ رونما ہوا۔

بدقسمتی سے اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس دور میں جھوٹی حدیثیں گھڑنے یعنی "کذب فی روایت الحدیث" کا فتنہ شروع ہوا۔ یہ ایک بہت بڑا فتنہ تھا۔ اس نے صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین اور تابعین کو غیر معمولی طور پر محتاط بنا دیا۔ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ پہلے جب کبھی کوئی شخص حدیث بیان کرتا تھا تو ہمارے کان اس کی طرف لگ جاتے تھے لیکن اب ہم (احتیاطاً) منہ پھیر لیتے ہیں۔

صحابہ کرام اور تابعین کا اب یہ دستور ہو گیا تھا کہ حدیث کے راوی، اگر صحیح العقیدہ اور نیک سیرت ہوں تو حدیث قبول کی جائے ورنہ نہیں۔ لہٰذا اب راویوں کے عقیدہ، عمل، سیرت اور کردار کی پوری پوری چھان بین کی جانے لگی۔

غلط احادیث کو رواج دینے والے حسب ذیل گروہ تھے :۔

۱۔ زنادقہ :۔ جن کے نزدیک مذہب کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔

۲۔ روافض :۔ یہ لوگ اپنے مسلک کی تائید میں اور دوسروں کی تردید یا تحقیر کے لئے احادیث گھڑتے تھے۔

۳۔ بدعتی :۔ یہ وہ لوگ تھے جو دین میں اپنی طرف سے نئی باتیں تراشتے تھے اور پھر اس کے جواز میں جھوٹی حدیثیں اختراع کرتے تھے۔

۴۔ نیک نیت لیکن نادان واعظین :۔ یہ لوگ عوام کو عبادت گزار بنانے اور لوگوں کو آخرت کی طرف متوجہ کرنے اور اعمالِ صالحہ کی ترغیب دلانے کے لئے ترغیب و ترہیب کی احادیث وضع کیا کرتے تھے۔ اسلام کے یہ نادان دوست "وضع حدیث" کو اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے گناہ نہیں سمجھتے تھے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "من کذب علیّ فلیتبوأ مقعدہ من النار" (جس نے مجھ پر جھوٹ بولا بے شک اس نے آگ میں اپنا ٹھکانہ بنا لیا)

۵۔ دنیادار اور حکومت کے خوشامدی لوگ :۔ یہ لوگ بادشاہ اور امراء کی مدح و ستائش میں لگے رہتے اور ان کو خوش کرنے کے لئے حدیث اختراع کرتے۔

اس فتنہ وضع حدیث نے محدثین کرام کے لئے بے انتہا مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ لیکن تدوین حدیث کے سلسلہ میں محدثین کا سب سے بڑا کارنامہ نقد حدیث اور فنِ اسماء الرجال ہے جس میں جرح و تعدیل کے اصول و ضوابط مقرر ہوئے۔ راویوں کے کردار، صدق و کذب کی مکمل چھان بین کی گئی۔ اسماء الرجال کا فن اتنا عظیم علمی کارنامہ ہے جس پر امت مسلمہ ہمیشہ فخر کرے گی۔

جمہور علمائے اسلام میں دو قسم کے لوگ ظاہر ہوئے۔ ایک گروہ وہ لوگ تھے جو اہل ظاہر کہلائے۔ یہ لوگ نہایت متقی، پرہیزگار اور عابد ہوتے تھے، اور صرف حدیث پر اکتفا کرتے تھے۔ جو مسئلہ قرآن و حدیث میں کہیں نہ ملتا اس کا فیصلہ کرنے میں بہت پس و پیش کرتے۔ ان کے برعکس اہل الرائے علماء تھے۔ یہ گروہ بھی اہلِ الظاہر کی طرح پابند شرع اور متقی اور دیندار تھا۔ فرق صرف

ان کے طریقہ استنباط اور استخراج مسائل میں تھا۔ یہ لوگ جب کبھی کسی مسئلہ میں کوئی نص نہ پاتے اور نہ صحابہ کرام ہی سے کوئی فیصلہ یا رائے اس کے متعلق معلوم ہوتی تو اپنی رائے اور قیاس سے کام لینے میں باک نہ کرتے۔ سعید[۲] ابن المسیب گروہ اہل الظاہر کے نمائندہ ہیں اور شاگردان عبداللہ ابن مسعود اہل الرائے علما کے نمائندہ ہیں۔

اہل الظاہر کبھی کبھی اہل الرائے علماء پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ اپنی رائے کے مقابلے میں حدیث کی پروا نہیں کرتے۔ لیکن حقیقت میں یہ واقعہ نہیں ہے۔ یہ ان کا محض ایک غیر ثابت شدہ الزام ہے۔ "رائے" صرف اسی وقت کام میں لائی جاتی ہے جبکہ قرآن وحدیث، اقوالِ صحابہ اور اجماع میں سے کوئی واضح اور نیم واضح ہدایت نہ ملے۔ اہل الظاہر کا یہ کہنا کہ "رائے" یا "قیاس" کبھی بھی حدیث کا مقابلہ نہیں کر سکتی بلاشبہ صحیح ہے اور اس پر ہر دور کے علمائے امت کا متفقہ اجماع ہے۔

دورِ چہارم یہ دور دوسری صدی ہجری کے آغاز سے شروع ہو کر چوتھی صدی ہجری کے آغاز تک رہا۔ سیاسی نقطۂ نظر سے اس دور میں بنو امیہ کی حکومت کا خاتمہ اور سلطنتِ عباسیہ کا قیام (۱۳۲ھ) سب سے اہم واقعہ ہے عبدالرحمٰن الداخل بنو امیہ کا شہزادہ اندلس کی طرف فرار ہو گیا اور وہاں ۱۳۸ھ میں عباسیہ سلطنت کے اثر سے آزاد ایک اموی حکومت قائم کر لی۔ اس دور کے حکمرانوں میں اہم ترین اسلامی شخصیت حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی ہے۔ بنو امیہ کے خلفائے امورِ خلافت کی بنیادی روح کو اسلامی اصول حکومت کے دائرے سے گویا باہر کر دیا تھا۔ اس وجہ سے سلطنت کے ہر شعبہ میں بگاڑ اور خرابیاں رونما ہو رہی تھیں۔ حکام کی دیکھا دیکھی عوام الناس میں بھی دین سے غفلت اور اعراض کا خیال بڑھتا جا رہا تھا۔ ایسے پر آشوب دور میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی با سعادت شخصیت نے امورِ مملکت میں ہمہ گیر اصلاحات کیں۔ دین کو ہر شعبۂ زندگی میں رائج کیا اور چن چن کر ایک ایک غیر اسلامی طریق کو ختم کر دیا۔ ان کے دور میں دینی روح اور علم دین کی تحصیل کا جذبہ پھر ترقی کر گیا۔ اور لوگ دینی امور میں منہمک ہو گئے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا عظیم دینی کارنامہ تدوینِ حدیث ہے۔ وضعِ حدیث کے فتنے کی بنا پر ان کو خیال پیدا ہوا کہیں صحیح احادیث غفلت ونسیان کا شکار نہ ہو جائیں۔ اس لئے آپ نے امام زہریؒ کو جو تمام علمائے امت کے نزدیک اپنے وقت کے امام الحدیث تھے۔ تدوینِ حدیث کے لئے مامور کیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے مختصر سے دورِ حکومت میں تجدید واحیائے دین کے تمام مراحل طے کئے۔ لیکن افسوس کہ ان کی زندگی نے ان کو مہلت نہ دی اور وہ صرف آخری مرحلہ جس پر آئندہ بہتر نظم ونسق کی بنیاد پڑ سکتی تھی پورا نہ کر سکے۔ یعنی خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا پوری طرح احیاء اور قیام۔

بنو امیہ کے دورِ حکومت کے بعد بنو عباس مسند آرا ہوئے۔ ان کا زمانہ معاشی خوشحالی اور امن کا زمانہ تھا۔ لہٰذا اس دور میں دنیوی علوم کی خوب اشاعت ہوئی۔ یونان اور ہند کے فلاسفہ کی کتب کے ترجمے کئے گئے اور لوگ اس جدید علم میں مستغرق ہو گئے۔ اس عمل نے عوام الناس کے دینی عقائد کو مجروح کیا اور بعض کلامی اور غیر کلامی مسائل پیدا ہوئے۔ ان ناساز گار حالات کا مقابلہ علمائے حق نے نہایت ذمہ داری کے ساتھ کیا۔ جس کے نتیجے میں اس دور کی اہم ترین کتاب موطا امام مالکؒ شائع ہوئی۔ کتابی شکل میں تدوین حدیث کے سلسلے میں یہ کتاب پہلی اہم کڑی ہونے کا شرف رکھتی ہے۔ مسند احمد ابن حنبل[۲] اور صحیحین بخاری ومسلم بھی اسی دور میں مدون ہوئیں۔

فتنۂ وضعِ حدیث اور کذب فی الروایت الحدیث کی بنا پر ذخیرۂ احادیث میں بکثرت غلط حدیثیں تھیں۔ جب ایک مختصر گروہ نے اس صورتِ حالات کو دیکھا تو اس نے سرے سے حدیث ہی کا انکار کر دیا۔ اور صرف تعامل امت کو اپنایا۔ ایک فتنہ کے جواب میں یہ دوسرا فتنہ تھا۔ علمائے حق ایک طرف تو صحیح احادیث کے انتخاب میں مصروف تھے۔ دوسری جانب ان کو حدیث

کے ماخذ احکام ہونے اور واجب العمل ہونے پر منکرین حدیث سے مناظرہ کرنا پڑتا تھا۔ اسی دور میں علمائے اسلام کی ذکاوت نے علم اسماء الرجال ایجاد کیا۔ یہ ایک ایسا علم ہے جس کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ اس کے تحت ایک حدیث کے سلسلۂ اسناد میں سے ہر راوی کے متعلق پوری پوری طرح چھان بین کی جاتی اور اگر اسے مرجح و قابل اعتبار پاتے تو اس حدیث کو قبول کرتے۔

اس دور کا عظیم علمی کارنامہ تدوینِ فقہ ہے۔ اسی دور میں ان ائمہ کبار کا ظہور ہوا جن کی سیادت تمام امت نے تسلیم کر لی یعنی امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ۔ ان ائمہ نے زمانے کی ضروریات کے مطابق مختلف اوقات میں فتاویٰ جاری کیے۔ مسائل کا استنباط کیا اور ان کی پوری طرح جانچ پڑتال کی۔ امام ابو حنیفہؒ گروہ اہل الرائے کے سرخیل ہیں۔ امام مالکؒ امام دار الہجرۃ کہلاتے ہیں۔ اور ان کے نزدیک علمائے مدینہ کا عمل سب سے بڑی سند ہے۔ امام شافعیؒ اہل الرائے اور اہل الظاہر کے بین بین چلتے ہیں اور امام احمد بن حنبل شدت سے اہل الظاہر کے مسلک پر کاربند ہیں۔

امام شافعیؒ نے اپنی مشہور کتاب "الرسالہ" میں اصول فقہ کی تدوین کے متعلق سیر حاصل بحث کی ہے۔ انھوں نے فقہ کے یہ ماخذ قرار دیے ہیں۔ قرآن۔ حدیث۔ اجماع، اجتہاد۔ قیاس اور استحسان۔ پچھلی بحث میں ہم اول پانچ ماخذوں کے متعلق لکھ آئے ہیں۔ اب صرف استحسان کا مسئلہ ہے۔ استحسان کا یہ مطلب ہے کہ قیاس کو اگر اس سے تقاضائے انصاف پورا نہ ہوتا ہو رد کر کے اس کی جگہ کوئی ایسی رائے دی جائے جو بہتر کام کر سکے۔ حنفی علماء نے سب سے بڑھ کر استحسان سے کام لیا ہے۔ مالکی اور شافعی علما استحسان سے بہت کم فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اس دور میں اہل الظاہر اور اہل الرائے میں نزاع بڑھی۔ اہل الرائے بسا اوقات اخبارِ احاد اور اکثر ضعیف حدیث کو نظر انداز کر دیتے تھے (لیکن یہ سب کچھ ہوائے نفس کی بنا پر نہ تھا بلکہ اس کے لیے ان کے پاس دلائل ہوتے تھے) جبکہ اہل ظاہر کے نزدیک اخبارِ احاد ہمیشہ واجب العمل ہے اور ضعیف حدیث رائے کے مقابلے میں افضل ہے۔ قرآن حکیم میں احکام تین اصولوں پر ملتے ہیں۔

۱:۔ عدمِ حرج :۔ یعنی کوئی حکم ایسا نہ ہو جس پر عمل کرنے میں مسلمانوں کو دشواری اور تنگی ہو۔

۲:۔ قلتِ تکلیف :۔ یعنی احکام ایسے ہوں کہ ان پر عمل کرنے میں کم سے کم تکلیف ہو اور

۳:۔ تدریج :۔ یعنی مسلمانوں پر درجہ بدرجہ ان احکام کو نافذ کیا جائے۔ علمائے فقہ نے جو احکام استنباط کیے ان میں قلتِ تکلیف کا سب سے زیادہ خیال رکھا گیا۔ لہٰذا اس وجہ سے بھی فتاویٰ میں اختلاف ہوا۔ اسی دور میں مذاہب اربعہ کو فروغ ہوا۔ وہ اس لیے کہ ائمہ کے شاگردوں نے ان کے اقوال و فرامین قلم بند کیے۔ ان کے فتاویٰ کو اپنایا اور آئندہ ان کی ترویج کی۔ یہ دور اس لیے بھی اہم ہے کہ اس دور میں پہلی مرتبہ اصطلاحاتِ فقیہہ کا ظہور ہوا۔

دورِ پنجم

یہ دور چوتھی صدی ہجری سے لے کر فتنۂ تاتار کے ظہور تک رہا۔ سیاسی نقطۂ نظر سے یہ دور مسلم ممالک کے انتشار، لامرکزیت اور ان کی سیاسی پستی کا دور ہے۔ مصر میں فاطمین اور اتابک حکمران ہوئے ماوراء النہر میں خوارزم، سامانیہ اور سلجوقی خاندانوں کا عروج و زوال ہوا۔ عباسی حکمرانوں کی حکومت گھٹتے سمٹتے بالآخر حدودِ عراق تک پہنچ گئی۔

علمِ دین سے اعراض کی رو جو چوتھی صدی کے آغاز سے شروع ہوئی تھی۔ بڑھتے بڑھتے جہالت تک آ گئی۔ آخر عالم یہ ہوا کہ دین کا تذکرہ محض وقت گزاری کے لیے رہ گیا۔ آہستہ آہستہ علماء کے اندر جو روح اجتہاد باقی رہ گئی تھی وہ بھی ختم ہو گئی اور ہر شخص اپنے اپنے مذہب پر قانع ہو کر رہ گیا۔

اسی پر بس نہیں بلکہ دین کی طرف سے بے توجہی برت کر ہر گروہ اپنے ائمہ کے مذہب کی تلقین اور تبلیغ میں وقت صرف

جانے لگا۔ اس چیز نے مختلف فرقوں کے مابین عناد پیدا کیا اور ان کے علماء نے مناظرہ بازی شروع کی۔ ظاہر تو یہ سارا کھیل شریعت کے دقیق نکتوں کو سمجھنے کے لئے رچایا جاتا تھا مگر دراصل اس کا مقصد ایک دوسرے پر اپنی علمیت کا رعب جمانا تھا۔ اور جیسا کہ حجۃ الاسلام امام غزالیؒ نے فرمایا کہ یہ مناظرہ بازی کرنے والے اپنے نفس کو دھوکا دیتے تھے اور دین کے نام پر یہ تمام تگ و دو محض دنیاوی منفعت کی اور شہرت و ناموری حاصل کرنے کے لئے تھا۔ اس سے بڑھ کر اس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ امام غزالیؒ نے اس مناظرہ بازی کی بعض برائیاں بیان کی ہیں جن میں حسد، دشمنی، غیبت اور نفاق موٹی موٹی برائیاں ہیں۔ فی الجملہ اس دور میں مذہب و مسلک کو دین بنا دیا گیا اور دین فروع اور جزئیات میں الجھ کر رہ گیا۔

اس دور میں البتہ جو کچھ قابل قدر کام ہوا وہ صرف یہ ہے کہ مسائل بکثرت پیدا ہوئے اور ان کا حل تلاش کیا گیا علاوہ ازیں ہر فرقے کے سمجھدار علماء نے اپنے ائمہ کے اقوال اور فتاویٰ کو ترتیب دیا اور ان کی غرض و غایت معلوم کر کے تطبیق دی۔ لیکن یہ کام بھی جو اس دور کے زمانہ آغاز ہی میں سرانجام پایا۔ لہٰذا اس دور کے علماء جنہوں نے اپنے اپنے ائمہ کے مذہب کو مکمل کرنے میں مدد دی ابو بکر رازیؒ، امام غزالیؒ، ابو بکر بن العلا، قشیریؒ اس دور کے ممتاز ترین فقہاء میں سے ہیں۔

دورِ ششم یورش تاتار نے مسلم ممالک کی بنیادوں کو ہلا کے رکھ دیا تھا۔ سلطنتِ عباسیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ ہلاکو خان کے طوفانی حملے (۶۵۶ھ) سے بجھ گیا۔ عباسیہ خاندانوں کے ختم ہونے سے پیشتر سامانی، سلجوقی، اور خوارزمی حکومتیں بھی نابود ہو گئیں تھیں۔ ایسے پُر آشوب دور میں جبکہ مسلمان ہر روز کمزور سے کمزور تر ہوتے جا رہے تھے اور ان کے ممالک محدود سکڑ رہی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہی تاتاریوں کو مائل بہ اسلام کیا۔ اور یہ لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ تاتاریوں کے قبول اسلام سے گو کہ مسلم ممالک کے سر سے ایک ہمہ وقتی خطرہ ختم ہو گیا۔ تاہم گزشتہ جنگوں کی تباہ کاریوں نے مسلم عوام الناس کے دلوں کو مردہ کر دیا تھا۔ اب ان میں کوئی امنگ اور کوئی ولولہ باقی نہ رہا۔ زندگی کے ہر شعبے پر قناعت پسندی کا رنگ چھا گیا اس دور میں تصوف کو فروغ حاصل ہوا۔ اس تصوف نے پہلی مرتبہ تصوف اور طریقت کو شریعت سے الگ ایک مستقل بالذات فن کی حیثیت سے اپنایا۔ اور اس کا پرچار کرنا شروع کیا۔ عوام میں خانقاہی ذوق کی نشو و نما ہوئی۔ اور ترکِ دنیا و علائقِ دنیا کو بہترین عمل خیال کیا جانے لگا۔

فقہی نقطہ نظر سے یہ دور تقلیدِ محض کا دور ہے۔ ہر شخص چاہے وہ عالم ہو یا جاہل اپنے اپنے فرقے کا پیرو ہے اور اسی پر قانع ہے۔ نئے مسائل کے حل کے لئے جستجو نہیں کوئی تحقیق نہیں۔ اس دور کی ابتداء میں ہمیں ابن تیمیہؒ، ابن القیم جوزیؒ، اور جلال الدین سیوطیؒ ان معدودے چند لوگوں میں نظر آتے ہیں جنھوں نے اس روش کیخلاف کافی سرگرمی سے کام کیا۔ لیکن افسوس کہ انکی زندگیاں اپنے اردگرد میں پھیلے ہوئے فساد کو ختم کرنے کی کوشش میں صرف ہو گئیں اور یہ لوگ فقہ کے ارتقاء میں کوئی قابل قدر حصہ نہ پا سکے۔ یہ ناقدر شناسی ہوگی اگر اس امر کا اعتراف نہ کیا جائے کہ آج ہمارے پاس فقہ اسلامی کا قابل قدر با اعتبار ذخیرہ انہی نفوسِ قدسیہ کی بدولت موجود ہے۔ اور اگر یہ لوگ اتنے سرگرم نہ ہوتے تو خدا جانے ہمارے دین کا کیا رنگ ہوتا۔ اس لحاظ سے ہم ان بزرگوں کے احسان سے کبھی سبکدوش نہ ہو سکیں گے۔ ایک طویل عرصہ گذر جانے کے بعد ہندوستان میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شخصیت نمودار ہوتی ہے۔ شاہ صاحب صوفی منش بزرگ تھے۔ لیکن فقہ اسلامی میں درجۂ اجتہاد پر فائز تھے۔ آپؒ نے بھی تقلیدِ محض اور علم کی تنگی کے خلاف پُر زور جہاد کیا۔

ہمارے لئے اس دور کی اہمیت اس لئے بڑھ جاتی ہے کہ ہماری زندگیاں بھی اسی دور میں گذر رہی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ

اب تقلیدِ جامد کے بجائے ہمیں خود قرآن و سنت اور اجماعِ صحابہ کی روشنی میں نئے مسائل کا حل تلاش کرنا پڑے گا۔ فقہائے سلف کے فیصلوں سے صرف نظر جاہلیت ہوگی۔ ماضی کی ہر وہ چیز جو ہمارے لئے سود مند ہو۔ اسے اپنایا جائے اور جو اجتہاد ہمارے مسائل میں بالکل مدد نہ دے اس سے اعراض کیا جا سکتا ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ہمارے علمائے کرام اپنے فروعی اختلافات کو پسِ پشت ڈال کر اس دور کی ضروریات کے مطابق تدوینِ فقہ کی خدمت انجام دیں!

بقیہ مضمون صفحہ ۱۱ سے آگے:۔

خطرات کا سامنا کرنے کی صلاحیت کا طفیل ہے کہ اسلام محمدؐ کی وفات کے صدمے سے جاں بر ہو سکا، اور ایک ایسے خطرناک وقت کے درپیش ہونے کے بعد بھی جب کہ اسلام کی بنیادیں ہل چکی تھیں، وہ نہ صرف زندہ رہا بلکہ پورے جزیرہ نمائے عرب پر چھا گیا۔" (ص ۔ ۳۰)

(The Arabs — Edinburgh 1955)

یہ کتابیں آپ کے یہاں ضرور رہنی چاہئیں

حیاتِ سرورِ کائنات:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت انتہائی دلنشین انداز میں، مستند روایات، معتبر واقعات، نعیم سعلی کی صاف ستھری زبان، ملا واحدی کی مقبول ترین تصنیف، اس کتاب کے پڑھنے سے ایمان تازہ ہوتا ہے، پہلے حصہ کی قیمت سوا چار روپے، دوسرے حصہ کی قیمت ساڑھے تین روپے۔

میرے زمانے کی دلی:۔ میر و غالب کی دلی کے لئے اب نگاہیں ترستی ہیں مگر ملا واحدی کی اس کتاب میں یہ "دلی" آپ کو نظر آسکتی ہے، اس "عالم انتخاب شہر" کے تمدن و تہذیب کا دل افروز مرقع! جس جگہ یہ کتاب پہنچی اک دھوم مچ گئی۔
قیمت:۔ ساڑھے تین روپے۔

فردوس:۔ ماہر القادری کی غزلوں، نظموں، رباعیات اور قطعات کا شاہکار مجموعہ، حقیقی "ترقی پسند شاعری" کا سدا بہار گلدستہ، ——— قیمت:۔ تین روپے آٹھ آنے۔

کاروانِ حجاز:۔ مکہ، مدینہ میں کیا دیکھا اور کیا محسوس کیا؟ اس کی تفصیل اور ماہر القادری کا قلم بس یوں سمجھئے کہ خدا اور رسولؐ کی محبت کا عذر پر مصور ہوتی چلی گئی ہے، ادب و انشا کے اعتبار سے بھی اس کتاب کا مقام بہت بلند ہے، قیمت:۔ چار روپے۔

نقشِ توحید:۔ فاران کا "توحید نمبر" اب کسی قیمت پر نہیں ملتا مگر اس کا معرکۃ آرا "نقش اول" کتابی صورت میں چھپوا لیا گیا ہے، "نقش توحید" کا ایک ایک حرف عقائد کو درست کرتا اور شرک و بدعت کی جڑ کاٹتا ہے!

قیمت مجلد، ایک روپیہ چھ آنے، غیر مجلد ایک روپے

(ان تمام کتابوں کی قیمتیں جو درج کی گئی ہیں، وہ محصول ڈاک کے علاوہ ہیں)

مکتبہ فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی ۱

ایک عقیدت مند کے قلم سے

مولانا سہیل کی وفات پر اب تک جتنے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ جامع، مکمل، دلچسپ اور اقبال کی
شخصیت کے شایان شان مرزا احسان احمد صاحب بی اے علیگ کا مضمون ہے، جو "اقبال سہیل میری نظر میں" کے عنوان سے معارف
۵۸ء کے دو نمبروں میں شائع ہوا ہے، اس میں ان کے قلم سے یہ جملہ نکل گیا ہے۔ کہ "قدرت نے ان کو ایک غیر معمولی دماغ عطا کیا تھا،
اس سے اگر وہ صحیح طور پر کام لیتے تو یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ علامہ شبلی کا صحیح معنوں میں کوئی جانشین نہیں ہے"۔ اس کو پڑھ کر ہم کو سخت
حیرت ہوئی، اور اس سے زیادہ حیرت اس پر ہوئی کہ صاحب معارف شاہ معین الدین احمد ندوی نے کیسے اس کو نظر انداز کر لیا۔ اور وہ معارف
میں شائع ہو گیا، اگر یہ مضمون کسی اور رسالہ میں، یا الگ شائع ہوتا تو ہم اس سے ہرگز تعرض نہ کرتے۔ کہ اگر ایک شخص کی یہی رائے ہے
تو ہمیں اس کے بدلنے یا اس سے اختلاف کرنے کی کیا ضرورت ہے!۔

وللناس فیما یعشقون مذاہب

لیکن چونکہ معارف میں شائع ہوا ہے، اس لئے ہم اس کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ اس سے ارادی غیر ارادی طور پر جانشین شبلی مولانا
سید سلیمان ندوی کا استخفاف ہو گیا ہے۔ جو ایک ناقابل برداشت بات ہے ان لاکھوں عقیدت مندان سید کے لئے جو ان کو صحیح معنوں
میں مولانا شبلی کا صحیح جانشین سمجھتے ہیں۔ اور ان کے حلقہ بگوش ہیں اس مضمون سے خدانخواستہ مقابلۃً جناب سہیل کا استخفاف مقصود
نہیں ہے۔ بلکہ ایک حقیقت کا اظہار ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے جو صلاحیتیں ودیعت فرمائی تھیں اور وہ جس حد تک وہ ان سے کام لے
سکے، وہ اپنی جگہ پر مسلّم ہیں، اور ہمارا ایمان ہے کہ وہ غیر معمولی ذہن و دماغ کے مالک تھے، اس پر مستزاد یہ کہ مولانا شبلی جیسے جلیل
حضرات سے ان کو شرف تلمذ بھی حاصل تھا۔

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

لیکن مولانا شبلی کی جانشینی کے لئے محض ایک غیر معمولی دماغ صاف ستھرا ادبی ذوق، شاعرانہ ہنر اور انشائی صلاحیت ہی کافی ہوتی تو
مولانا سہیل ہی پر کیا موقوف ہے جس میں بھی یہ صلاحیتیں ہوتیں۔ اور ان صلاحیتوں سے کام لینے کا اس کو موقع ملتا، تو وہ بھی
جانشین ہو سکتا تھا۔ خود مرزا احسان بھی اگر اپنی قابل رشک ادبی صلاحیتوں سے کام لیتے۔ اور کچہری کی خشک و بے کیف
مسلوں کے پڑھنے اور ذوق کش مقدمات کے عرضی دعووں کی تسوید و ترتیب میں وقت صرف نہ کرتے اور مضمون نگار سے آگے بڑھ کر
مصنف بننے کی کوشش کرتے۔ تو کون کہہ سکتا تھا کہ مولانا شبلی کا صحیح معنوں میں جانشین نہیں پیدا ہوا۔ ہمارے نزدیک اقبال صاحب
سے کہیں بڑھ کر وہ ایک اچھے نثر نگار ہیں جس کا اندازہ ان کے بے شمار ادبی تنقیدی و تاریخی مضامین سے کیا جا سکتا ہے جو علیگڑھ
میگزین اور معارف جیسے وقیع رسالوں میں شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں اور جن کا مجموعہ عنقریب انجمن ترقی ہند سے شائع

ہونے والا ہے لیکن مولانا شبلی جیسے ہمہ گیر انسان کی جانشینی کے لئے تنہا ادیب و نثار اور شاعر ہونا ہی تو کافی نہیں تھا، مولانا ان خصوصیات کے بدرجۂ تمام حامل ہونے کے ساتھ مفسر، محدث، متکلم، مورخ وغیرہ بھی تو تھے، بلکہ وقت کے ابن تیمیہ و شاہ ولی اللہ تھے ان کی جانشینی کے لئے انہی کے جیسا جامع حیثیات شخص موزوں ہو سکتا تھا۔

مولانا سہیل نے عربی ضرور پڑھی تھی اور مولانا شبلی و مولانا فراہی جیسے بزرگوں سے پڑھی تھی، اور یہ حضرات ان کو جی لگا کر پڑھاتے بھی تھے۔ حماسہ، عقد الفرید جیسی عربی ادب کی بلند پایہ کتابیں درس میں تھیں۔ لیکن کسی درسگاہ میں جا کر یا کسی اور بزرگ کے دامن شفقت میں بیٹھ کر علوم عربیہ کی تکمیل نہیں کی تھی۔ یہ ضرور تھا کہ ان کا حافظہ بہت قوی تھا۔ جو کچھ ابتداء میں پڑھا تھا، اس کا ایک ایک حرف ان کو یاد تھا، اور اس کا اظہار بھی برابر ہوتا رہتا تھا۔ خود مولانا شبلی کے زمانہ تلمذ میں اپنی غیر معمولی ذہانت، جودت، و تیزی فکر کا بارہا ثبوت انھوں نے دیا۔ لیکن استاد اپنے اس ذہین، و طباع شاگرد سے کس حد تک متاثر تھا۔ درس و تدریس کی ان ساری تفصیلات سے جو مولانا سہیل نے خوب مزہ لے لے کر بیان کی ہیں۔ اس کا بالکل پتہ نہیں چلتا۔ مثلاً

علامہ مرحوم کے حیدرآباد تشریف لے جانے کے بعد ان کے ماموں نے عین عنفوان شباب میں وفات پائی۔ اس سے وہ بہت متاثر ہوئے اور اس عالم حزن و غم میں بے اختیارانہ ان کے قلم سے چند نہایت موزوں ایک فارسی مرثیہ کی شکل میں نکل گئے ان کی عمر اس وقت ۱۳-۱۴ سال سے زیادہ نہ تھی۔ ان کی یہ جرأت اعظم گڈھ کے مختصر تعلیمی حلقہ میں غیر معمولی جودت متصور ہوئی۔ اور ایک چہاردہ سالہ لڑکے کا ایک فوق العادت کارنامہ سمجھ کر وہ خوب خوب بڑھا گیا۔ بہت سے بزرگوں نے اس کی نقلیں لیں۔ انہی میں ایک بزرگ منشی قدرت علی خاں لکھنوی مرحوم تھے۔ جو اعظم گڈھ میں ایک ہفتہ وار اخبار [illegible] نکالا کرتے تھے۔ ان مرحوم نے ان کی استصواب کے بغیر ہی وہ مرثیہ شائع کر دیا اور اس پر طرہ یہ کہ ان کے نام کے ساتھ "شاگرد علامہ شبلی نعمانی" کا خطاب اپنی طرف سے بڑھا دیا۔ حالانکہ شاعری میں مولانا سے یا کسی سے ان کو تلمذ کا شرف حاصل نہ تھا۔ اور نہ فن عروض ہی سے کوئی واقفیت تھی۔ ان کو خوف پیدا ہوا کہ مولانا اس نظم کی اشاعت کا ذمہ دار انہی کو قرار دیں گے۔ اور خطاب شاگردی کو ان کی خودستائی بلکہ گستاخی پر محمول فرمائیں گے، چنانچہ جب مولانا حیدرآباد سے تشریف لائے، تو اس خوف کی وجہ سے وہ خود حسب معمول حاضر نہ ہوئے، بلکہ مولانا نے خود بلوا بھیجا۔ اور بجائے زجر و توبیخ کے، حوصلہ سے کہیں زیادہ ہمت افزائی فرمائی اور اتنا ہی نہیں کیا بلکہ بلا اصلاح فکر سخن کی اجازت بھی دے دی۔ اس سے زیادہ اس واقعہ سے مولانا کے تاثر کا پتہ چلتا نہیں جاتا، وہ مرثیہ اتفاق سے کھو گیا۔ ورنہ پتہ چلتا کہ اس کمسنی اور عمر چہاردہ سالگی میں ایک غیر زبان میں مرثیہ کہہ کر انھوں نے کیا جدت آفرینی کی تھی۔ اس حادثہ پر بہت سے لوگوں نے قطعات اور رباعیاں کہیں مثلاً مولانا حالی، نواب سید علی حسن خاں، خواجہ عزیز الدین اور ان کے تلامذہ میں مولانا سہیل، مولانا عبداللہ، مولانا سید سلیمان اور سب ایک سے ایک بڑھ کر بلند اور معنی خیز، خود مولانا شبلی نے متعدد نظمیں اور رباعیاں کہیں ان میں سے ایک یہ ہے اور ہمارے نزدیک اس سلسلہ کے تمام قطعات اور رباعیوں پر بھاری ہے۔

حالت از گردش ایام اگر گشت بتر — صبر فرما کہ ازیں تیز بتر می بایست
شبلی نامہ سیہ را بجزائے عملش — پا بریدند و سزا خواست کہ سر می بایست

مولانا سید سلیمان نے حیات شبلی میں ایک خاص عنوان کے تحت بہت تفصیل سے اس واقعہ کو لکھا ہے لیکن ہم یہاں مولانا سہیل ہی کی زبانی نقل کرتے ہیں۔

"شعر العجم کے دوران تصنیف میں ایک اتفاقی واقعہ سے مولانا کا ایک پاؤں شہید ہو گیا۔ میں اس زمانہ میں اپنے گاؤں بڑھریا

میں تھا، دو تین دن کے بعد مجھے خبر ملی تو حاضرِ خدمت ہوا، اور یہ منظر دیکھ کر آبدیدہ ہو گیا، مولانا نے میرا یہ حال دیکھا تو فرمایا یہ کیا بزدلی ہے، مسلمانوں کے اسلاف تو وہ تھے کہ معرکۂ جہاد میں ایک پاؤں کٹ جاتا تھا، تو ان کو خبر تک نہ ہوتی تھی، اور نہ ان کے جوشِ جہاد میں فرق آتا تھا۔ اس کے بعد غالبؔ کا یہ شعر پڑھا:۔

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

دوسرے دن حاضر ہوا، تو مولانا نے اپنی ایک رباعی سنائی جس کا دوسرا شعر یہ ہے:۔

یعنی یہ کہ پہنچ گیا ہوں منزل تک
یاں سے سفرِ عدم بس اب آسان ہے

یہ رباعی سنتے ہی ایک خیال میرے دل میں وارد ہوا، اور وہ فوراً موزوں بھی ہو گیا۔

شکستہ پائی مقدر تھی سرنوشت میں حضرتؔ — نہ ہاتھ آئے گا کچھ اب تو ہاتھ ملنے سے
عدم کی دور ہے منزل نہ جا سکیں گے حضور — بچے گا قوم کا کام آپ کے نہ چلنے سے

یہ قطعہ لکھنے بیٹھا تو اور چند رباعیاں میرے ذہن میں آ گئیں ان میں سے بعض یہ ہیں:۔

اے سرورِ قوم و فخرِ ابنائے زماں — وے علم و کمال بر وجودت نازاں
یک پائے تو شد بہ عدم دانستم — زیرِ قدمِ تو شد کنوں ہر دو جہاں

کیجئے نہ غمِ شکستِ پا مولانا — اس میں بھی تھی حکمتِ خدائے دانا
تھی اہلِ عدم کو آرزوئے پابوس — اک پاؤں وہاں بھی چاہیے تھا جانا

اسی خیال کو یک دوسرے پیرایہ میں انھوں نے اس طرح ادا کیا ہے:۔

کیا اس سے بھی ہو گی کوئی ساعت منحوس — زخمی ہوا جبکہ پائے شبلیؔ افسوس
ک پاؤں عدم کو کیوں نہ جاتا اقبالؔ — تھا اہلِ فنا کو اشتیاقِ پابوس

اقبال صاحب نے یہ تمام رباعیاں مولانا شبلی کو سنائیں تو نہی کا بیان ہے کہ بہت محظوظ ہوئے اور فرمایا کہ ان کو شائع کرنے کے لئے الندوہ میں بھیج دو، اور خود بھی ایک خط سید صاحب کو جو اس زمانہ میں الندوہ کے سب اڈیٹر اور مرتب تھے لکھا کہ یہاں بھی ایک صاحب نے اس واقعہ پر کچھ رباعیاں کہی ہیں، جو تمہارے پاس جا رہی ہیں ان کو الندوہ میں شائع کر دو، شاعر کو خوب مضمون ہاتھ آیا ہے۔

یہ موقع تھا کہ مولانا شبلی اساتذۂ وقت کے مقابلہ میں ایک طالب علم کے اس غیر معمولی فکر سخن پر جس کی شاعری کا ابھی ابھی آغاز تھا۔ مولانا حمید الدین کی طرح ان کا بھی الندوہ میں باقاعدہ تعارف کراتے، ان کی ذہانت، جودت، طباعی کی داد دیتے، اگر خود نہیں لکھ سکتے تھے تو سید صاحب کو ہدایت کرتے کہ یہ ایک طالب علم کا کارنامہ ہے، جو میرا شاگرد اور عزیز بھی ہے۔ لیکن تعارف اور سید صاحب کو ان کے ملکۂ شاعری کی تعریف و توصیف لکھنے کی ہدایت تو در کنار خط میں ان کا نام تک نہیں لیا۔ زیادہ سے زیادہ جو کیا وہ یہ تھا کہ اشاعت کے لئے الندوہ میں بھجوا دیا۔ اور سید صاحب نے بھی بغیر کسی تعارفی نوٹ کے جوں کا توں شائع کر دیا۔ حالانکہ یہی مولانا شبلی ہیں کہ مولانا حمید الدین کی کتاب نظم القرآن و جمہرۃ البلاغۃ پر الندوہ میں ریویو لکھا۔ تو بہت شاندار الفاظ میں ان کا تعارف

کرادیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کم سے کم الندوہ کے حلقہ کا ہر شخص مولانا حمید الدین سے واقف ہو گیا، پھر اس کے بعد ان کی جو شہرت ہوئی اُس سے آپ اور ہم سب واقف ہیں۔ لیکن سہیل باوجود اپنے فطری ملکۂ شاعری کے، مولانا شبلی کی زندگی میں کوئی شہرت حاصل نہ کرسکے اگر وہ ان واقعات کے خود ناقل و راوی نہ ہوتے کسی کو مولانا سے ان کے تلمذ کا اور شاگردی کا و استفادہ کا پتہ بھی نہ چلتا مولانا سید سلیمان نے حیات شبلی میں ان کے متعلق جو روایتیں لکھی ہیں وہ سب سہیل ہی سے منقول ہیں، اور یہ سید صاحب کا اخلاق اور ان کی انتہائی فراخدلی ہے کہ ان کے بیان کردہ ہر واقعہ کو خواہ وہ ان سے متعلق ہو یا مولانا شبلی سے، اعظم گڈھ میں ہوا ہو یا علی گڑھ میں قابل استناد سمجھا اور کتاب میں درج کر دیا اس سے بڑھ کر سید صاحب ان کی قدر و منزلت اور کیا کرسکتے تھے۔

(۳) اور ایک واقعہ انہی سے منقول ہے، فرماتے ہیں:-

عقیقہ کی شادی کی خبر مولانا شبلی کو معلوم ہوئی تو انھوں نے جب عقیقہ کو مبارکباد کا خط لکھا ہے۔ میں اس وقت شبلی منزل ہی میں موجود تھا۔ مولانا نے مبارکباد کیا لکھی تھی، ایک قطعہ لکھا تھا۔ جو مجھ کو بھی سنایا اور میز سے اٹھ گئے۔ مجھے موقع ملا، تو کاغذ کی ایک چٹ پر

"جائے شاگرد خالیست"

کے عنوان کے تحت حسب ذیل قطعہ لکھ کر مولانا کی میز پر رکھ دیا اور گھر چلا آیا۔

کب یہودی سے خدیو! عقد زیبا تھا تمہیں بنت فیضی تم ہو یہ رشتہ نہ کرنا تھا تمہیں

میں نے یہ مانا وہ مانی ہے تو تم تصویر حسن کھو کھینچنا تھا مصور نے جو کھینچی تھا تمہیں

شام کو پھر حاضر ہوا تو مولانا مسکرائے اور فرمایا تمہاری مولویانہ تنگ نظری ابھی گئی نہیں، اور اس وقت میں نے شوہر عقیقہ کی جانب سے یہ شعر لکھ پیش کیا۔

صفحۂ دل پر جو کھینچی آپ کی تصویر حسن

مستحق تھا جس عطیہ کا وہ میں نے پالیا

یہ سب مولانا سہیل کی طالب علمی کی زندگی کے غیر معمولی واقعات تھے۔ جو سہی دنیا کو ان کی طرف متوجہ کرسکتے تھے، اور بالخصوص مولانا شبلی جیسے جذباتی کو، لیکن وقتی مدح و تحسین سے زیادہ مولانا شبلی کے تاثر کا پتہ خود مولانا سہیل کی تحریروں سے بھی نہیں چلتا۔ مولانا سہیل کو ان کی ذات سے جو عشق تھا، اس کا تقاضا تھا کہ مولانا جہاں بھی ہوتے، ان کو یاد رکھتے۔ لوگوں سے ان کا ذکر کرتے ان کا خطوط لکھتے۔ لیکن اس گہری عقیدت اور تعلق کے باوجود مکاتیب شبلی کے ہر دو مجموعوں میں نہ ان کے نام کا کوئی خط ہے۔ نہ کسی کے نام کے خط میں ایسے مافوق العادۃ شاگرد کا کوئی ذکر ہے، اس بے التفاتی کے کیا اسباب تھے اس پر مولانا سہیل ہی روشنی ڈال سکتے تھے جو ہماری بدقسمتی سے اب دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ لیکن ان کے غالی معتقدین اس کے اسباب کیا بتا سکتے ہیں؟ ہم کو خدانخواستہ مولانا سہیل کے کمالات سے انکار نہیں ہے وہ بلاشبہ اپنے اوصاف و خصوصیات کے اعتبار سے اپنے ہم چشموں میں منفرد تھے، لیکن ان کے متعلق ان کے معتقدین جو عقیدہ رکھتے ہیں، اور جو خوارق ان سے منسوب کرتے ہیں، ان کو ہم صحیح نہیں سمجھتے لیکن اپنے شہرۂ آفاق شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی سے مولانا شبلی کو ان کے زمانۂ طالب علمی میں، اور ان کی فراغت تعلیم کے بعد کس قدر دلچسپی تھی، وہ ان کو کیا بنانا چاہتے تھے، ان سے ان کو کیا توقعات تھیں، اور یہ توقعات کس حد تک پوری ہوئیں۔ وہ آپ کو بعد کے واقعات اور خود مولانا شبلی کے الندوہ کے ادارتی نوٹوں، ان کی تحریروں، ان کے خطوط و تعارف اور ان کی زبانی گفتگو سے

معلوم ہوگی، جنہیں ہم آگے درج کر رہے ہیں۔

۱۔ سید صاحب ندوہ کی تعلیم سے فارغ ہوئے تو بڑی سنجیدگی کے ساتھ یہ مسئلہ ان کے سامنے آیا کہ اب ان کو کیا کرنا چاہئے۔ ان کے والد حکیم ابوالحسن صاحب اور ان کے بڑے بھائی سید ابو حبیب صاحب کی خواہش تھی، کہ وہ طب کی تعلیم حاصل کر کے اپنے خاندانی و آبائی پیشہ طبابت کو اختیار کریں جس میں ان کو ترقی کے بڑے امکانات تھے، ان کے والد بڑے کامیاب طبیب تھے، بڑا زبردست مرجوعہ تھا۔ آس پاس بہت دور دور تک ان کی شہرت تھی۔ وہ بڑی آسانی سے ان کی جگہ لے سکتے تھے۔ لیکن خود ان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مولانا شبلی بھی چاہتے تھے کہ وہ طب کی تعلیم حاصل کرنے کے بجائے علمی کاموں میں مصروف ہوں۔ چنانچہ جب انھوں نے مولانا شبلی سے اس کا تذکرہ کیا۔ تو مولانا نے ان کے خسر سید ابو یوسف صاحب کو جو ان کے حقیقی چچا بھی تھے، ایک خط لکھا کہ سید سلیمان ایک ہونہار لڑکا ہے، اس وقت وہ کام کر رہا ہے...... جو بے حد موزوں ہے۔ اس کو وہی کام کرنے دیجئے۔ اسی درمیان میں مولانا شبلی کسی ضرورت سے پٹنہ تشریف لے گئے۔ ابو یوسف صاحب ان سے ملنے کے لئے آئے۔ تو سید صاحب کے مستقبل کا مسئلہ پھر پیش ہوا مولانا نے ان کے چچا سے کہا کہ ان کے والد سے جا کر کہہ دیجئے، کہ وہ سید سلیمان کو ہمیں دیدیں ان کے والد نے اپنے ہونہار فرزند پر مولانا کی یہ بے پایاں شفقت دیکھی تو خاموش تو ہو گئے۔ لیکن دل سے کچھ زیادہ پسند نہیں کیا، کہ طبابت اور تصوف سید صاحب کے خاندان کی خاص چیزیں تھیں، جن سے ان کا ہمیشہ کے لئے سلسلہ منقطع ہو گیا۔ لیکن ان کے والد کچھ دنوں اور زندہ رہتے تو دیکھتے کہ وہ جس لڑکے کو طبیب بنانے پر مصر تھے، تھوڑے ہی دنوں میں مولانا شبلی کے فیض صحبت اور حسن تربیت سے عالم اسلام کا مشہور ترین عالم ہو گیا۔

۲۔ سید صاحب کے بلند پایہ علمی مضامین کی بنا پر جو الندوہ میں شائع ہو چکے تھے باہر سے ان کی بہت مانگ آنے لگی تھی۔ لیکن مولانا شبلی کسی طرح ان کو اپنے سے جدا کرنے کے لئے تیار نہیں تھے جب لوگوں نے بہت تنگ کیا تو الندوہ کے شذرات میں لکھا کہ مولوی سید سلیمان دارالعلوم کے ایک ہونہار طالب علم ہیں، ہم ان کی علمی ترقیوں کے پیش نظر ابھی دارالعلوم ہی میں ان کا رہنا پسند کرتے ہیں، چنانچہ مولانا کی سفارش سے دارالعلوم ہی میں عربی لٹریچر کی تعلیم کے لئے ان کا تقرر ہو گیا، اور ایک معمولی مشاہرہ پر نہایت ایثار کے ساتھ یہ خدمت دو برس تک انجام دیتے رہے۔ مولانا شبلی عام طلب کی بنا پر ان کو باہر بھیج سکتے تھے۔ ان کو گرانقدر مشاہرہ بھی ملتا، اور اس میں سال بسال اضافہ بھی ہوتا رہتا۔ لیکن اسی کے ساتھ جیسا کہ مولانا شبلی نے خود بھی لکھا ہے ان کی علمی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا جس کے لئے انھوں نے ان کے والد سید ابوالحسن سے مانگ کر اپنے دامن تربیت میں لیا تھا۔ گو اس کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کے اصرار پر الہلال کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں شامل ہو گئے اور جب الہلال انہی کے ایک مضمون کی وجہ سے بند ہو گیا، تو وہاں سے مولانا شبلی ہی کی سفارش سے پونہ کالج کی پروفیسری پر چلے گئے، لیکن مولانا شبلی کے حسن تربیت و فیض صحبت سے علم کا جو ذوق پیدا ہو گیا تھا وہ ان مشاغل کی وجہ سے ختم نہیں ہوا۔ متعلقہ فرائض کی ادائگی کے ساتھ علمی مضامین کی تسوید اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی برابر قائم رہا یہ ان کے لئے کچھ مقدر بھی تھا، کہ ایک ہمہ گیر مصنف بننے کے لئے وہ بھی ان مراحل سے گذریں، جن سے گذر کر، مولوی شبلی، مولانا شبلی ہو گئے تھے۔ مولانا شبلی نے صحافت میں تو قدم نہیں رکھا۔ لیکن وحید الدین سلیم کے مسلم گزٹ میں مضامین برابر لکھتے رہے ان کا مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ والا مضمون اسی میں شائع ہوا تھا جس نے مسلمانوں کی سیاست کا رخ بدل دیا، اور ان میں آزادی کی لگن پیدا کر دی، لیکن پروفیسری انھوں نے ضرور کی تھی۔ اور انہی کے نقش قدم پر ان کا سعادت مند شاگرد بھی چلا اور پونہ فرگوسن کالج میں فارسی کا پروفیسر ہو گیا، اور جب وہاں سے لوٹ کر آیا، تو اردو کا ایک مشہور مصنف بن گیا

این سعادت بزور بازو نیست　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مولانا شبلی نے سید صاحب کو کچھ کام سپرد کئے تھے، جن کو وہ کسی وجہ سے انجام نہ دے سکے، اس پر ان کو ایک خاص خط میں لکھتے ہیں۔ کہ سخت افسوس اور رنج پیدا ہوتا ہے کہ خدا قابل طبیعتوں میں ایک نہ ایک ایسا عیب ایسا پیدا کر دیتا ہے کہ وہ دنیا میں کام نہیں کر سکتے۔

"حکمائے اسلام اور مسئلہ ارتقاء" کی سرخی سے الندوہ جلد ۲ میں مولانا نے ایک مضمون لکھا تھا اس پر بعض مذہبی حلقوں میں شورش ہوئی، اور بعضوں نے سخت درشت اعتراضات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس پر سید صاحب نے قرآن مجید اور مسئلہ ارتقاء کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس میں ثابت کیا کہ ارتقاء کا خیال قرآن کے مخالف نہیں ہے، مولانا شبلی کو معلوم ہوا تو ناراض ہوئے اور سید صاحب کو لکھا کہ ارتقاء پر جو تم نے مضمون لکھا گو میں نے دیکھا نہیں۔ اچھا ہی ہوگا۔ لیکن میری ناراضی کا سبب یہ ہے کہ اس سے معترضوں کا حوصلہ بڑھتا ہے کہ ہم بھی کچھ ہیں، کہ ہمارا جواب لکھا جاتا ہے، یہ کون یقین کرے گا کہ تم نے لکھا ہے۔

سید صاحب تعلیم سے فارغ ہوئے تو ان کو بڑی فکر ہوگئی، کہ کہیں یہ کام پر لگ جائیں، سید صاحب نے دبے لفظوں میں ایک مرتبہ اس کا اظہار کیا تو لکھا کہ تم ہر وقت میری آنکھوں میں ہو، اور میں موقع ڈھونڈتا رہتا ہوں، لیکن ابھی تم کو شہرت کے عام منظر پر زیادہ نمایاں ہو کر آنا چاہیے۔

کورس کی انگریزی کتابوں میں اسلامی تاریخ اور معلومات کے متعلق بڑی غلطیاں ہوتی تھیں، ان کی تصحیح کے لئے مولانا شبلی نے ندوہ میں ایک مستقل شعبہ تصحیح اغلاط کا کام کیا تھا۔ جس کا انچارج انھوں نے سید صاحب کو بنایا، اور اس سلسلہ میں انھوں نے بڑی خدمات انجام دیں۔ ان کے مضمون تصحیح اغلاط پر ارباب علی گڑھ چونک پڑے اور لکھا کہ یہ کام تو یہاں پہلے سے ہو رہا ہے۔ اس پر مولانا شبلی سید صاحب کو لکھتے ہیں، کہ کام ہونا چاہئے، کہیں بھی ہو، تاہم تمہارا دائرہ بالکل الگ ہے۔

مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سہارنپوری ایک بزرگ تھے، جو ندوہ کے ممبر تھے، ایک مرتبہ انھوں نے مولانا شبلی کو لکھا کہ سید سلیمان تمہاری تربیت و تعلیم کا اصلی نمونہ ہے۔

ایک مرتبہ سید صاحب نے تجویز پیش کی کہ اسلام کا کام عیسائی مشنریوں کے طریقہ کے مطابق بڑے پیمانہ پر ہو اور اس کے لئے ایک مستقل صیغہ قائم کیا جائے۔ مولانا نے ان کو لکھا کہ اس صیغہ کی ابھی ضرورت نہیں، لیکن کام آہستگی اور خاموشی سے کیا جائے۔

سیرت کی تالیف کے سلسلہ میں ایک مرتبہ ان کو لکھا کہ معلوم نہیں تم کیا کر رہے ہو، کوئی کام نہ ہو، تو سیرت کے دوسرے حصے کے اجزاء لے لو۔

سیرت کے لئے بطور مقدمہ کے، عرب جاہلیت کی تاریخ کی ضرورت تھی۔ مولانا کے ایما سے انھوں نے اس کو لکھنا شروع کیا تو وہ بڑھ کر ایک مستقل کتاب بن گئی کہ یہی کتاب ارض القرآن کے نام سے، مولانا کی وفات کے بعد، دار المصنفین کی طرف سے دو حصوں میں شائع ہوئی۔ اور اس کو سید صاحب کا بڑا علمی کارنامہ سمجھا گیا، اور اس کی داد بڑے بڑے اہل علم نے دی آج تک اس موضوع پر کوئی کتاب اردو میں نہیں لکھی گئی۔

سید صاحب سے خط و کتابت کے مولانا شبلی بہت متمنی رہتے تھے، ان کے آخری دور کے سارے خطوط سیرت سے متعلق ہیں ایک مرتبہ ان کو لکھا کہ سیرت کے متعلق وقتاً فوقتاً جو بات ذہن میں آئے، اس کو لکھ بھیجا کرو۔ ایک مرتبہ ان کو اس کے

...ا کہ تمہارے چلے جانے کا افسوس ہے تم ہوتے تو لائف کے علاوہ کتاب کے اور حصے ساتھ ساتھ ہوتے جاتے، ان کو حصوں کو تم اچھی طرح
د سکتے۔

مولوی افتخار عالم مارہروی سوانح نگار مولوی نذیر احمد مرحوم، مولانا کی لائف بھی لکھنا چاہتے تھے، سید صاحب نے حالات و
معلومات کے لئے سفارش کی، تو ان کو لکھا کہ افتخار عالم صاحب میری لائف کیا لکھیں گے، کبھی تم دنیا کے اور تمام کاموں سے فارغ
ہو تو تمہیں لکھنا۔

سیرت کے سلسلہ میں قبل اسلام پر جو کچھ لکھا تھا، اس کے متعلق مولانا نے ان کو لکھا کہ وہ اجزا یہیں رہ گئے تو سیرت میں تمہارے
نام سے شامل کردوں گا۔ لیکن وہی اجزاء، زیادہ طویل ہونے کی وجہ سے بعد میں ارض القرآن کے نام سے شائع ہوئے۔

سید صاحب سیرت عائشہ رض لکھ رہے تھے، لیکن اس کی تکمیل میں ذرا دیر تھی۔ اس کے متعلق ان کو لکھا کہ حضرت عائشہ رض کے سوانح کا
وقت تقاضا ہے، تم اس میں ایک مدت سے مصروف ہو، اب اس کو جلد تیار کردو۔ الاصابہ فی استدراک عائشہ علی الصحابہ، حافظ سیوطی
کا ایک رسالہ ہے، اس کی سید صاحب کو بڑی تلاش تھی۔ اور اس کو شاید سوانح کے آخر میں شامل کرنا چاہتے تھے، اس کو مولانا شبلی نے
بڑی کوشش سے بہم پہنچا دیا۔ لیکن وہ پہلے اڈیشن میں کسی وجہ سے شامل نہ ہو سکا۔ دوسرا ایڈیشن شائع کیا تو بڑے اہتمام سے اس کو ایڈٹ
کرکے کتاب کے ساتھ شائع کیا۔

بیگم صاحبہ بھوپال کی خواہش تھی کہ دیگر ازواج مطہرات کی بھی سوانح عمریاں قلم بند کی جائیں، مولانا شبلی نے ان کو لکھا کہ تم کو تو
فرصت ہوگی نہیں، اس لئے کچھ اور انتظام کرنا پڑے گا، لیکن مولانا شبلی کی زندگی میں اس کا انتظام نہ ہو سکا، دار المصنفین قائم ہوا
تو سید صاحب نے دار المصنفین کے ایک لائق رفیق سعید انصاری صاحب سے سیر الصحابیات کے نام سے مستقل ایک کتاب لکھوا کر
شائع کی جس میں پہلے ازواج مطہرات، اور بنات طاہرات کے حالات ہیں، اس کے بعد عام صحابیات کے سوانح و وقائع زندگی
ہیں۔ اس موضوع پر اردو میں یہ پہلی کتاب تھی جو بہت مقبول ہوئی اس وقت بازار میں اس کا چوتھا اڈیشن ہے، ازواج مطہرات اور
آپ کی صاحبزادیوں کے مختصر حالات سیرۃ کی پہلی جلد کے دوسرے حصہ میں بھی ہیں، مولانا شبلی کو آخری دور میں علامہ ابن تیمیہ سے
بڑا شغف ہو گیا تھا۔ اور ان پر ایک طویل مقالہ بھی لکھا تھا۔ جو مقالات شبلی میں شامل ہے لیکن ان پر ایک مستقل کتاب لکھوانا چاہتے
تھے۔ سید صاحب جس زمانہ میں امام مالک کے حالات قلمبند کر رہے تھے، تو ان کو لکھا کہ اگر تم نے یہ شروع کر دیا ہے تو خیر ورنہ ابن
تیمیہ کی لائف فرض اولین ہے، مجھے اس شخص کے سامنے رازی و غزالی سب ہیچ نظر آتے ہیں، افسوس ہے کہ آج تک مولانا شبلی کی
خواہش پوری نہ ہو سکی۔ مولانا سید سلیمان کی وفات کے بعد تو اور بھی اس کی کوئی .... امید نہیں ہے[1]

مولانا شبلی کو سید صاحب سے بڑی امیدیں تھیں۔ سیرت کی تالیف کے دوران میں تو ان کے متعلق، ان کی توقعات اور زیادہ
بڑھ گئی تھیں، اور اپنے تمام رفقاء و تلامذہ میں جن کی ایک اچھی خاصی تعداد تھی، انہی کو اس کام کا اہل سمجھتے تھے۔ آخری دور کے
بعض خطوط۔ سیرت ہی کے متعلق ہیں۔ جس کے ناتمام رہ جانے کا ان کو بڑا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا، اور چاہتے تھے کہ جلد سے جلد
وہ انہی کی زندگی میں ہو جائے۔ اسی لئے اس کا مقدمہ جو تاریخ قبل اسلام سے متعلق تھا مستقلاً سید صاحب کو لکھنے کے لئے دیدیا
جس کے متعلق ابھی آپ پڑھ چکے ہیں، کہ وہ بڑھ کر ایک کتاب بن گئی۔ اور اتنی طویل کہ اس کو دو حصوں میں شائع کرنا پڑا اور
اس کا نام ارض القرآن رکھا گیا، اسی طرح سیرت کے اور حصے بھی ان سے لکھوانا چاہتے تھے، اور خطوط کے ذریعے برابر ان کے متعلق مشورے

---

[1] فاضل مضمون نگار کو یہ معلوم نہیں ہے کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے ابن تیمیہ رحمۃ اللہ پر بڑے معرکہ کی کتاب لکھی ہے!

اور تبادلۂ خیالات کرتے رہتے تھے، لیکن افسوس کہ ان کا پیمانۂ عمر لبریز ہو گیا۔ اور وہ اس کام کو جس کو اس آرزو و تمنا کے ساتھ شروع کیا تھا، کہ ؎

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی — مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم — خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

اتمام کو نہ پہنچا سکے، اور چاہتے تھے کہ سید صاحب ان کی زندگی میں آجاتے تو اس کے متعلق ساری ہدایات ان کو دیدیتے، جب انتظار کرتے کرتے تھک گئے، تو لکھا کہ:

"بھائی مجھ کو اور یہ کو تو کیوں دق کر رکھا ہے، آنا ہے تو آؤ ورنہ الیاس احدی الراحتین"

یہ مکتوب الیہ کے نام مولانا شبلی کا آخری خط تھا۔ اور جب یہ خط پاکر مکتوب الیہ پہنچا ہے، تو بلانے والا بستر مرگ پر دراز تھا اور ہوش و حواس تقریباً رخصت ہو چکے تھے، کمزوری کا اس قدر غلبہ تھا کہ اشارہ و کنایہ تک مشکل تھا، سید صاحب کے آنے کے بعد زہر مہرہ گھس کر پلایا گیا، تو دفعتاً طاقت آگئی، اور سید صاحب کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ "سیرت! سیرت!" اس کا منشا تھا کہ ان کی صحیح جانشینی کا استحقاق انہی کو ہے، اور ان کے ناتمام کاموں کی تکمیل وہی کر سکتے ہیں، مولانا حمید الدین عیادت کر کے قرآن کیسے نے بھی یہی اقدام کر کے اس عہد کو اور زیادہ موکد اور موثق کر دیا۔ اب اس کے بعد آپ خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ سیرت کی جمع و تالیف کے علاوہ اپنے تمام علمی، مذہبی وادبی و ملی و قومی خدمات اور کارناموں کے اعتبار سے سید صاحب ہی ان کے صحیح جانشین تھے اور انھوں نے ہی جانشینی کا حق ادا کر دیا۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے دنیا کے سارے کاموں سے منہ موڑ کر پہلے ان کی وصیت پر عمل کیا۔ پونہ کالج کی پروفیسری سے استعفیٰ دیا جہاں بھی خاصی تنخواہ پاتے تھے، اور آئندہ ترقی کے بڑے امکانات تھے۔ سیرت کے تمام منتشر اجزاء کو اکٹھا کیا ان پر نظر ثانی کی جہاں جہاں واقعات کے اضافہ کی نشاندہی کی گئی تھی۔ وہاں توسین میں اپنے قلم سے واقعات کا اضافہ کیا۔ یہ اضافے پہلے حصہ میں تو کم، لیکن دوسرے حصہ میں جو آپ نے اخلاق و عادات و معمولات و شمائل پر ہے، اور مولانا شبلی ہی کے قلم سے ہے۔ بہت ہیں اس کے بعد مولانا شبلی کے نقشۂ عمل کے مطابق بقیہ جلدیں جو معجزات، منصب نبوت، اخلاق و عبادات پر ہیں، اور جن میں سے بعض بعض ہزار ہزار صفحات کی ہیں، اپنے قلم سے لکھیں، اور شروع سے آخر تک استاد کی شانِ تحقیق اور اسلوبِ تحریر کو قائم رکھا۔ اور کہیں اسے مولانا شبلی کے مقرر کردہ معیار سے گرنے نہیں دیا، معاملات کا حصہ زیر قلم تھا کہ صحت نے دفعتاً جواب دیدیا اور باوجود ہزار سعی و کوشش کے اس کی تکمیل نہ کر سکے۔ بہر حال جتنا کچھ بھی لکھا جا چکا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ حصہ بھی اگر مکمل ہو جاتا تو اسی معیار کا ہوتا۔ اس کا مسودہ شاید وہ اپنے ساتھ کراچی لے گئے تھے۔ اور اب ان کے اعزا کے پاس ہے، ہم اُن سے درخواست کریں گے، کہ سید صاحب کی ایک اہم علمی یادگار کے طور پر اس کو نامکمل ہی شائع کر دیں۔

مولانا شبلی نے الندوہ اور دوسرے اخبارات و رسائل میں مستقل تصنیفات کے علاوہ بہت سے متفرق مضامین بھی لکھے تھے جن کے تین مجموعے بڑے اہتمام سے آرٹ پیپر پر ان کی زندگی ہی میں شائع ہو گئے تھے۔ یعنی مقالات شبلی، رسائل شبلی...... اور اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر، آخری مجموعہ صرف اورنگ زیب ہی پر ہے جس کے مضامین الندوہ میں بالاقساط شائع ہوئے تھے۔ یہ بڑا معرکہ آرا رسالہ ہے۔ اس کو لکھ کر مولانا شبلی نے اورنگ زیب کے معترضین و منتقدین کا منہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ سید صاحب نے مولانا شبلی کے تمام مضامین اور ان مجموعوں کا از سرِ نو جائزہ لیا، اور ان کو فن کے اعتبار سے دس جلدوں میں

الگ الگ شائع کیا۔ ان میں ایک جلد خطبات پر بھی ہے جس میں مولانا کے تمام علمی، قومی، ی، اصلاحی خطبات اور تقریریں جو انھوں نے ندوۃ العلماء کے جلسوں، ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں اور مختلف تقریبوں میں کی تھیں، وہ سب اکٹھا کردی گئی ہیں۔ شعرالعجم کی چار جلدیں تو مولانا شبلی کی زندگی ہی میں شائع ہوگئیں تھیں۔ ایک جلد نامکمل رہ گئی تھی، سید صاحب نے اس کو از سر نو ایڈٹ کر کے شائع کیا۔

مولانا شبلی کے خطوط کی بھی ادبی حیثیت سے بڑی اہمیت ہے۔ ان کے اکھٹا شائع کرنے کا خیال سید صاحب کو مولانا کی زندگی ہی میں پیدا ہو گیا تھا۔ اور اس خیال کا اظہار جب انھوں نے مولانا شبلی سے کیا تو گو کچھ زیادہ پسند تو نہیں کیا، تاہم اپنے بعض دوستوں کو انھوں نے لکھا کہ سید سلیمان میرے خطوط جمع کر رہے ہیں۔ کیا آپ کے پاس میرے کچھ ہفوات غلطی سے محفوظ ہوں گے۔ یہ خطوط برابر جمع ہوتے رہے، لیکن ان کی اشاعت کی نوبت مولانا کے انتقال کے کئی برس کے بعد آئی اور ان کو دو جلدوں میں ایک طویل مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔ پہلی جلد اعزا و احباب و معاصرین کے نام کے خطوط پر مشتمل ہے، اور دوسری جلد میں تلامذہ اور شاگردوں کے نام خطوط ہیں، جن میں زیادہ تر علمی اور اصلاحی خیالات کی ان کو تعلیم و تلقین کی گئی ہے، اور مضمون نگاری اور تصنیف و تالیف سے متعلق ان کو ہدایتیں اور مشورے دیئے گئے ہیں۔ یہ خطوط کیا ہیں درحقیقت صاحب خطوط کے سوانح زندگی کا ایک مستند ترین ذخیرہ ہیں جو حیات شبلی کی تالیف کے وقت بے حد کار آمد ثابت ہوئے، اور مولانا شبلی کے بہت سے حالات و واقعات اور دوسرے متفرق معلومات کے انہی سے یکجا کیے گئے۔

تاریخ قبل از اسلام کے متعلق دو جلدوں میں سیرت کا مقدمہ شائع کیا اور اس کا نام ارض القرآن رکھا۔ مولانا شبلی کے فارسی اور اردو کلام کے دو الگ الگ مجموعے شائع کئے۔ جب اردو کلام کے مجموعے کے دوبارہ شائع ہونے کی نوبت آئی تو مولانا شبلی کی شاعری پر ایک طویل مقدمہ لکھ کر اس کے ساتھ شامل کیا۔ ان کی مشہور کتاب خیام بھی درحقیقت مولانا شبلی کی شعرالعجم ہی کا ایک تکملہ ہے۔ پنجاب کے پروفیسر اقبال وغیرہ نے شعرالعجم پر تنقیدی مضامین کا ایک سلسلہ انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالہ اردو میں شروع کیا تھا۔ جس کی ایک قسط خیام پر تھی سید صاحب نے اس کے جواب میں معارف میں ایک مضمون لکھا۔ جس کو خواص اور اہل تحقیق نے بے حد پسند کیا۔ وہی مضمون بڑھ کر ایک کتاب بن گئی۔ اور خیام کے نام سے موسوم ہوگئی۔ جو اس قدر مقبول ہوئی کہ جب ایران میں فردوسی کی ہزار سالہ جوبلی منائی گئی تو کابل کی افغان گورنمنٹ کی طرف سے اس موقع پر جو علمی تحائف پیش کئے گئے۔ ان میں مولانا سید سلیمان ندوی کی یہ مایۂ ناز کتاب خیام بھی تھی۔ اس طرح سے وہ ساری عمر مولانا شبلی کے مشن کی تبلیغ، ان کے ناتمام کاموں کی تکمیل اور ان کے معترضین و معتقدین کا دفاع کرتے رہے، اور آخر میں جب وہ تمام کاموں سے فارغ ہوگئے تو حیات شبلی کی تالیف کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کو دو برس کی محنت شاقہ کے بعد اس طرح مکمل کر دیا کہ وہ نہ صرف ایک شخص کی سادہ سوانح عمری ہے، بلکہ درحقیقت مسلمانان ہند کی ۵۰ برس کے علمی ادبی، سیاسی، تعلیمی اور قومی تحریکات و واقعات کی تاریخ بن گئی ہے، اور اس حیثیت سے وہ اردو کی تمام قابل الذکر سوانح عمریوں میں ممتاز ہے۔ کیا ان طویل خدمات کے بعد بھی کسی کو یہ شبہ باقی رہ سکتا ہے کہ مولانا شبلی کا کوئی صحیح جانشین نہیں پیدا ہوا کیا خوب فرمایا ہے حضرت سعدی علیہ الرحمتہ نے:۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمہ آفتاب را چہ گناہ

مولانا شبلی اپنے اعزہ و تلامذہ میں سب سے زیادہ متاثر مولانا حمید الدین سے تھے، اگر ان کو اردو میں لکھنے کا ذوق ہوتا، تو ان کے فیض صحبت سے مولانا شبلی ہی کی طرح وہ بھی اردو کے بہت بڑے مصنف ہوتے۔ اور وہی ان کے جانشین بھی ہوتے، لیکن

انھوں نے اردو میں لکھنے کی کوشش کی، نہ مولانا شبلی جیسی ہمہ گیر ہستی کی جانشینی کا استحقاق وہ اپنے میں پیدا کرسکے۔ مولانا شبلی ان کی بیحد قدر کرتے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ ان کی علمی خدمات ایک ایک کرکے منظر عام پر آجائیں۔ ان کی کتاب نظم القرآن و جمہرۃ البلاغۃ پر الندوہ میں ریویو لکھا، اور اس کے بعض اقتباسات ترجمہ کرکے نقل کئے، تو بہت زوردار الفاظ میں ان کا تعارف کرایا۔ پہلے نہایت اختصار کے ساتھ ان کے ابتدائی حالات لکھے، پھر ان کی بعض مترجمہ کتابوں کا تذکرہ کیا اور پھر ان کے سواحل عرب کے سفر کا ذکر کیا جو انھوں نے لارڈ کرزن وائسرائے ہند کے ساتھ کیا تھا۔ جس میں انھوں نے لارڈ کرزن کی ترجمانی کا فرض ادا کیا تھا۔ اس کے بعد لکھا کہ اس طرح کے واقعات میں سے ایک واقعہ بھی انسان کی شہرت کے لئے کافی ہوسکتا ہے پھر حسرت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ یہ حضرات اب بھی گمنام ہیں۔ ان کی اگر یہی خواہش ہے تو اس میں ہمارا کوئی ہرج نہیں ہے۔ پھر ان کی زیر ریویو کتاب کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ اسلامی جماعت کے لئے اسی قدر ضروری اور مفید ہے جس قدر ایک تشنہ لب اور سوختہ جان کے لئے آب زلال ۔ ان کے فارسی دیوان کے متعلق ایک جگہ لکھا ہے، کہ اس کا ایک ایک شعر ان کے پورے شعر العجم پر بھاری ہے۔ لیکن فارسی و عربی کے اعلیٰ مذاق رکھنے، اور انگریزی میں بی اے ہونے کے باوجود مولانا شبلی نے اپنی جانشینی کا مستحق ان کو نہیں سمجھا۔ تو مولانا سہیل کس بنا پر اس کی توقع رکھ سکتے تھے۔ عالم احتضار میں مولانا شبلی کو اپنے تمام اعزا، تلامذہ، احباب و معاصرین میں صرف سید سلیمان ہی یاد آرہے تھے، اور جب وہ آگئے، تو ان کی تمنا پوری ہوگئی۔ اور ان کا ہاتھ پکڑ کے کہا کہ "سیرت، سیرت"! یہ تمام اشارات درحقیقت ان کی جانشینی ہی پر دال تھے، اور جب اس کا وقت آیا، تو بلا نزاع اُن کی مسند خلافت پر وہ متمکن ہوگئے، غفر اللہ لہ۔

اب ہم اس مضمون کو شبلی کی شعر العجم کے مشہور نقاد جناب محمود شیرانی کے لائق شاگرد ابراہیم ڈار مرحوم کے ان فقروں پر ختم کرتے ہیں، جو انھوں نے اسی رسالہ کے ایک نمبر میں جناب شبلی پر تنقید کرتے وقت اپنے مضمون کی ابتدا میں لکھے تھے جس میں انھوں نے شروع سے آخر تک سید صاحب کے ساتھ کہیں بھی نرمی نہیں برتی ہے، فرماتے ہیں:-

"علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا شبلی کے معنوی فرزند اور حقیقی جانشین ہیں۔ شبلی کی طرح ان کی فتوحات کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے، شبلی ایک مورخ، ادیب، ناقد اور محقق تھے، سید صاحب بھی ان تمام میدانوں کے شہسوار ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ایک محقق کی حیثیت سے بعض باتوں میں سید صاحب اپنے استاد سے بھی بڑھ کر ہیں۔"

فبای حدیث بعدہ یومنون

۱؎ مگر جہاں تک قرآن فہمی کا تعلق ہے، مولانا فراہی، علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی دونوں سے بڑھ کر ہیں۔ (م۔ ق)

۲؎ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو علامہ شبلی نعمانی کے مقابلہ میں مطالعہ اور تجربہ و مشاہدہ کی بہت زیادہ فرصت نصیب ہوئی۔ بعض ایسی کتابیں جن کے دیکھنے کی شبلی کو بڑی تمنا تھی۔ سید صاحب مرحوم کے زمانے میں منظر عام پر آچکی تھیں، اس لئے کوئی شک نہیں بعض مسائل میں ان کی تحقیق اپنے استاد سے بڑھ کر ہے۔ لیکن علامہ شبلی کے انداز نگارش میں جو شگفتگی، روانی، اور دلکشی تھی وہ ان کے کسی شاگرد اور خوشہ چین کو میسر نہ آسکی۔ (م۔ ق)

جمال اختر ہاشمی

پاکستانی تہذیب

یہ خطۂ ارضی جسے ہم آج پاکستان کے نام سے جانتے ہیں تاریخ کے مختلف زمانوں میں مختلف اقوام کی آماجگاہ رہا ہے۔ اور آج ہم جس تمدن اور تہذیب کو یہاں پاتے ہیں۔ یہ ان ہی اقوام کا تمدن ہے جنھوں نے مختلف اوقات میں ان علاقوں کو اپنی جولانگاہ بنایا تھا۔ مثال کے طور پر ہماری شلواریں کشان اثرات کے بقایا ہیں۔ ہمارے مذہبی افکار و خیالات پر عرب کے اثرات ہیں اور ادب و فن پر ایران کا اثر غالب ہے۔

مختلف اقوام نے اپنی مختلف خصوصیات اس سرزمین کے باشندوں کے لئے چھوڑی ہیں۔ لیکن جتنے گہرے نقوش عربوں نے اس پر چھوڑے اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ایرانی یہاں آئے اور بس گئے لیکن اپنی جہالت کی بنا پر اس سے پہلے کے باشندوں کو یا تو ختم کر دیا یا جنوب کی طرف دھکیل دیا۔ یونانی، کشان، ہن، اور دیگر اقوام نے تسخیر ملک کے زعم میں کچھ دنوں حکمرانی کی اور پھر دوسری قوم میں مل کر خود فنا ہو گئے۔ لیکن عرب ایک مذہب، ایک مکمل ضابطہ اور نظام حیات لے کر آئے تھے۔ اس لئے اگرچہ ان کی حکمرانی اس ملک کے صرف تھوڑے حصے پر رہی اور تھوڑے دنوں رہی پھر بھی ان کے نقوش سب سے زیادہ واضح اور ان کے اثرات سب سے زیادہ دیرپا ثابت ہوئے۔

عرب یوں تو صدیوں پہلے اپنے حوصلہ مند تاجروں کے ذریعہ اس ملک سے واقف تھے۔ اور ہندوستان کے لوگ ان کی زبان اور رسم و رواج کو جانتے تھے۔ چنانچہ علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم اپنی کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب پانڈوں کے خلاف لاکھ کے محل میں جلانے کی سازش کی گئی تھی تو ارجن کو جس زبان میں خبردار کیا گیا تھا وہ عربی زبان تھی۔ بہرحال یہ واقعہ ہو یا نہ ہو یہ صحیح ہے کہ عرب ہندوستان میں تجارت کے لئے آیا کرتے تھے۔ اور ہندوستان والے انہیں اچھی طرح جانتے تھے۔

عرب و ہند کے تعلقات کا دوسرا دور اس وقت شروع ہوتا ہے جبکہ عرب فاتحین کی آمد شروع ہوئی۔ اب عرب جاہل نہیں تھے بلکہ برتر مذہب اور برتر نظامِ زندگی کی تبلیغ کے سلسلے میں وہ دنیا کے سب سے بڑے فاتح اور حکمراں بن چکے تھے۔ چنانچہ ۷۱۲ء میں انھوں نے برصغیر پاک و ہند کے اسی حصہ پر حملہ کیا جو اب مغربی پاکستان کہا جاتا ہے۔ اس حملہ نے اس علاقہ کو دمشق کے زیرِ نگیں تو کر دیا مگر مرکز سے دوری کی بنا پر یہ رشتہ اتنا کمزور تھا کہ عربوں کے وہ تمدنی اثرات جو ایران اور مصر پر ظاہر ہوئے یہاں ظاہر نہ ہو سکے۔ پھر یہ علاقہ بہت ہی جلد اپنے جدید مقامی امراء کے ماتحت مرکز سے الگ بھی ہو گیا۔ کچھ دنوں کے لئے عربوں سے ان کا تعلق ختم بھی ہو گیا۔ مگر اس درمیان میں خود اصل اسلامی دنیا میں نئی نئی طاقتیں جنم لے رہی تھیں۔ عربوں نے جس تمدن کے لئے راستہ ہموار کیا تھا اسی تمدن کے سربراہ اب ترک تھے۔ چنانچہ کوئی دو سو برس کے مسلسل حملے کے بعد ۱۱۹۲ء میں انھوں نے اس پورے برصغیر پر قبضہ کر لیا۔ اور حقیقتاً اسی کے بعد ہی عرب کا تمدن اپنی راہ اس ملک اور اس ملک کے ہر شعبۂ حیات میں پا سکا۔

یہ سیاسی انقلاب جو ان فاتحین کے واسطے سے آیا، ان افواج قاہرہ کے علاوہ جن کے گھوڑوں کی ٹاپوں نے بارہا اس سرزمین

کورومنڈ اپنے ساتھ تہذیب و تمدن کے بیج بھی لایا۔ جب یہ لوگ یہاں کے مستقل حاکم بن گئے تو آہستہ آہستہ اس ملک میں علماء مشائخ کاریگر اور صناع بھی آ آکر بسنے لگے دوسری طرف وسط ایشیا میں ایک نئی طاقت نے سر اٹھایا اور اسی قوت یعنی مغلوں کی بربریت اور زبردستی و دہشت سے بچنے کے لئے بھی اُس علاقہ کے ذہین طبقہ نے اس ملک کو اپنی جائے پناہ بنایا۔ اور یہ انہی کی محنت کا ثمرہ ہے کہ علم و فضل کے اعتبار سے اس بنجر خطہ کو علم و عمل کا لہلہاتا ہوا باغ بنا دیا اگر کوئی البیرونی کا ہندوستان پڑھے اور پھر علاء الدین خلجی کا ہندوستان دیکھے تو وہ البیرونی کو جھوٹا سمجھے گا یا اپنی نگاہ میں عیب تلاش کرے گا۔ اور پھر شاہجہاں اور عالمگیر کے ہندوستان کا کیا کہنا۔

اوپر میں عرض کر چکا ہوں کہ عربوں نے بلا واسطہ اس ملک پر بہت کم حکومت کی۔ لیکن عرب کے اثرات ہم کو ایران اور وسط ایشیا کے ذریعہ ملے۔ کیونکہ انھوں نے عربوں کے تمدن، ان کے علم اور فن سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا تھا اور جب یہ یہاں وارد ہوئے تو ان کا تمدن اپنے شباب پر تھا۔

اسی تمدن کے اثرات یہاں کی زندگی کے ہر شعبہ پر پڑے، مذہب، سیاست، فلسفہ، معاشرت، کھانا پینا، رہن سہن فنون لطیفہ، علم و ادب۔ اور صنعت و حرفت وغیرہ میں یہ اثرات پائدار ہو گئے۔

ان فاتحین کی آمد کا سب سے پہلے اثر سماج پر پڑا۔ ہندو سماج میں ایک طبقہ ابدی غلامی کے لئے مجبور تھا چنانچہ :- ڈی۔ سی۔ سین (D. C. Sen) اپنی تالیف History of Bengali Language & Literature میں لکھتے ہیں۔

"برہمنوں کی قوت انتہائی ناقابل برداشت ہو چکی تھی "

اسلام کے عام مساوات انسانی کے اصولوں میں ان کو بے پناہ کشش محسوس ہوئی چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں انھوں نے برہمنوں کے ظلم سے چھٹکارا پانے کے لئے جوق، جوق اسلام کے سایۂ عاطفت میں پناہ لینی شروع کی۔ ڈاکٹر آرنلڈ The Preaching of Islam ... میں لکھتے ہیں :-

> "ان بے چارے مچھیروں، شکاریوں اور کم ذات کاشتکاروں کے لئے اسلام خدا کی رحمت بن کر آیا۔ یہ اس نسل کی اعلیٰ ترقی تھی اور اس کے مبلغین کی محنت جس نے ان آفت رسیدہ اور برباد حال لوگوں کو انسانی اخوت اور خدا کی وحدت کے اصول سے ہم کنار کر دیا۔ اس میں عوام کے لئے کشش تھی اور نو مسلموں میں انہی لوگوں کی اکثریت تھی۔ اس نے خدا کے متعلق ایک اعلیٰ زاویہ نظر اور عالمی برادری کا شریفانہ سبق دیا۔ اس نے بنگال کے کم ذات لوگوں پر جو ایک زمانہ سے ہندو سوسائٹی کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے ایک نئی سماجی تنظیم کا دروازہ کھول دیا۔"

یہ اثر تو ہندو سماج پر بلا واسطہ پڑا لیکن بالواسطہ اثرات کی بنا پر سکھ، آریہ سماجی اور برہمو سماج وغیرہ وجود میں آئے گو ان لوگوں کی اکثریت اب پاکستان سے باہر جا چکی ہے پھر بھی مشرقی پاکستان میں ایسے کچھ لوگ باقی ہیں جو ان سماجوں کی نمائندگی کرتے ہیں اس کے علاوہ ذات پات کی تقسیم کمزور پڑنے لگی۔ پاکستان کے دستور میں چھوت چھات بدترین جرم قرار دیا گیا ہے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ عملاً پاکستان میں چھوت چھات کہیں موجود نہیں ہے۔

مذہب، فکر اور خیال پر اس نے معاشرت اور عام بود و باش پر اثر ڈالا، چنانچہ اس کا اعتراف کرتے ہوئے ہندوستان

وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو اپنی تصنیف Discovery India میں لکھتے ہیں:۔

"غذا، لباس، سامان آرائش، خصوصاً چینی کے برتن اور قالین اس کے علاوہ آداب میں مسلمانوں کا خاص اثر پڑا جو زندگی کے لئے ہر اچھی چیز کے خواہشمند تھے۔ اور اسی سے محبت رکھتے تھے۔ اسلام کا طرز فکر خالصاً عملی تھا اس نے زندگی کو ایسے ہی اختیار کیا جیسا اس نے پایا۔ اور مسلمانوں نے اس کو ترقی دے کر بہترین بنا دیا۔"

مذہب اور رسم و رواج کے بعد جو چیز سب سے زیادہ متاثر ہوئی وہ زبان تھی۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ان علاقوں میں عام آدمیوں کے بولنے کی زبان الگ تھی اور علمی زبان سنسکرت تھی۔ اگر سنسکرت کے الفاظ کسی غیر برہمن کے کانوں میں پڑ جاتے تو اس کے کان میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیا جاتا۔ البیرونی خود ہی سر سے ایک دفعہ بال بال بچا تھا۔ دوسری طرف ان علاقائی زبانوں کی ترقی کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اور نہ ان زبانوں میں تصنیف و تالیف یا ترجمہ کی اجازت تھی۔ اور تو اور خود مذہبی کتابوں کا ترجمہ بھی ان زبانوں میں ناقابل معافی جرم تھا۔ چنانچہ ڈی۔ سی۔ سین جن کا تذکرہ اوپر آچکا ہے رقمطراز ہیں:۔

"اگر کوئی شخص رامائن یا ۱۸ پرانوں کی کہانی بنگالی زبان میں سنے گا تو اسے "رورا وا" نامی جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔"

برہمنوں کے اس جلاد شاہی حکم کے بیان کے بعد لکھتے ہیں:۔

"اگر ہندو حکمران آزاد رہتے تو بنگالی زبان کبھی درباروں تک نہ پہنچ پاتی۔"

یہ تھا بنگالی کا حال۔ ذرا ہندی کا حال ڈاکٹر لچھمی دھر کی زبان سے سنئے:۔

"یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ یہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے اس زبان یعنی ہندی کو شروع شروع ادبی ضروریات کے لئے استعمال کیا۔ جسے برہمن بیہودہ اور مہمل کہہ کر نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔ اور قابل اعتنا نہ سمجھتے تھے۔"

مسلمانوں کی آمد کے پہلے علم و ادب پہ گراں خوابی طاری تھی لیکن مسلمانوں کے آتے ہی اس میں یکلخت بیداری پیدا ہوگئی۔ چونکہ ہندوستان کا عام رسم الخط سنسکرت برہمنوں کی جاگیر تھا دوسری طرف فارسی و عربی کی تعلیم کا دروازہ مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لئے کھلا ہوا تھا اس لئے عوام نے بڑی تعداد میں فارسی اور عربی پڑھنا شروع کیا۔ اور اسی کے رسم الخط کو اپنے خیالات کے اظہار کے لئے منتخب کیا۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مختلف زبانوں کے امتزاج نے ایک نئی زبان کی شکل لے لی، اور چونکہ اس زبان کی ادبی [illegible]اشت عربی اور فارسی تک محدود تھی اس لئے اس کے ادب اور زبان پر ان دو زبانوں کا گہرا اثر پڑا۔ اور صدیوں بعد جب یہ زبان اسی شکل میں نمودار ہوئی جسے آج ہم اردو کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ ان تمام اقوام کی زبانوں اور خیالات کا ایک حسین امتزاج اس میں نظر آیا جن کی محنتوں اور کوششوں نے اس وسیع خطہ ارضی کو ایک مشترک زبان عطا کی۔ لیکن اس میں سب سے گہرا اور واضح اثر عربی کا ہے۔ اس کے سارے ادب اور ادبی ڈھانچہ پر عربی و فارسی کے اثرات طاری ہیں۔ فارسی زبان خود عربی سے اس قدر متاثر ہے کہ اصل فارسی کا ڈھونڈے کہیں پتہ چلتا نہیں۔ یہی اثر فارسی کے ذریعہ اردو میں منتقل ہوگیا۔ خصوصیت کے ساتھ شاعری کے تمام اصناف خالصۃً عربی ہیں۔ گرچہ اس میں ہندی رنگ اور خالص ایرانی اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن اصل ڈھانچہ عربی کا ہے۔ لالو جی لال اور ان کے رفقاء نے جب انیسویں صدی کے اوائل میں فورٹ ولیم میں بیٹھ کر ہندی کو ماڈرن بنانے کا بیڑا اٹھایا تو خود ہندی اس سے متاثر ہوئی

ذکار ردو۔ اردو پر سنسکرت کا اثر ڈالنے کی پوری کوشش کی گئی مگر یہ سازش اس لئے کامیاب نہ ہوسکی کہ اردو مسلمانوں نے پاکستان اور ہندوستان کے عوام پر لادی نہیں ہے بلکہ یہ خود مسلمانوں اور ہندوؤں کی صدیوں کی باہمی یگانگت کا نتیجہ ہے۔ غرضیکہ اردو زبان اور ادب پر عرب خیالات اور عربی فکر کے اتنے گہرے نقوش ہیں کہ وہ خود اپنی مثال ہیں اور اس پر مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے

مغربی پاکستان کی دوسری زبانیں سندھی، پشتو، پنجابی اور بلوچی وغیرہ ہیں۔ ان میں عربی رسم الخط کے استعمال کی بنا پر ایک واحد رشتہ موجود ہے۔ ان زبانوں کا ادب جتنا کچھ بھی پایا جاتا ہے، وہ کم و بیش عربی سے اتنا ہی متاثر ہے جتنا اردو سے!

بنگالی کی حالت ذرا مختلف ہے۔ یہ زبان عوام میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے رائج تھی ان کی آمد کے بعد یہ زبان تصنیف و تالیف کے لئے بھی استعمال ہونے لگی۔ لیکن رسم الخط عربی تھا۔ چنانچہ آلاؤل جو بنگالی زبان کا اولین شاعر تھا اس کی تصنیفات فارسی یا عربی رسم الخط میں ملی ہیں، (Bengali Literature) میں اننڈ شنکر اور لیلا رے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"یہ عجیب حقیقت ہے کہ گرچہ اس نے (یعنی الاول نے) معیاری بنگلہ استعمال کی۔ مگر اس کی تصنیفات فارسی رسم الخط میں پائی گئیں ہیں۔ اور ہمارے لئے اس کو بنگلہ رسم الخط میں دوبارہ لکھنا پڑا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک قسم کی بنگالی اردو جنم لے رہی تھی جو زمانہ کے ہاتھوں برباد ہوگئی۔"

فارسی رسم الخط کے استعمال کی بنا پر اس میں فارسی و عربی کے بہت سے الفاظ مستعمل ہونے لگے۔ لیکن موجودہ زمانے میں جبکہ ہندو بنگال نے بنگلہ زبان کی ترویج و ترقی اپنے ہاتھ میں لی تو سنسکرت الفاظ کا استعمال بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ بنگالی زبان کی شکل وہ نہ رہی جو پہلے تھی۔ اس زبان کو ایک سوچی سمجھی تحریک کے تحت "سنسکرت آمیز" بنانے کی کوشش بلکہ یوں کہئے سازش کی گئی ہے

عربی اثرات کی بنا پر سب سے اہم چیز جو ہم پاکستان کی مختلف زبانوں میں دیکھتے ہیں۔ وہ خیالات اور فکر کی یگانگت ہے۔ مصنف خواہ بنگال کا ہو یا سندھ کا جب قلم اٹھاتا ہے تو اس کا خیال اور فکر کم و بیش یکساں ہوتا ہے۔ اس لئے کہ زبان کے اختلاف کے باوجود ہمارا قدیم ادبی سرمایہ اور قومی و مذہبی روایات مشترک ہیں۔ اسی بنا پر پاکستان کی کسی زبان کے ادب سے بعض مقامی اثرات کو نکال کر دیکھا جائے تو عربی اور اسلامی اثرات واضح اور صاف دکھائی دیں گے۔

فنون لطیفہ پر اثرات:- عربوں میں تصویر کشی کا شوق کبھی نہ تھا۔ اور مذہبا گناہ ہونے کی بنا پر عربوں نے اُسے کبھی ترقی نہ دی۔ اس کی جگہ ان کے یہاں فن خطاطی نے لے لی۔ یہ فن تعمیرات کی سجاوٹ میں بڑا کارآمد ثابت ہوا۔ گو یہ فن اب زمانے کے ہاتھوں مردہ ہو رہا ہے پھر بھی پاکستان میں اس کا وجود عرب اثرات کا مرہون منت ہے۔

موسیقی:- مغربی و مشرقی موسیقی کا بین فرق اس کے ترنم (زیر و بم) کی پیمائش ہے۔ یعنی مغربی موسیقی عمودی ہوتی ہے جبکہ مشرقی موسیقی کا خط افقی ہوتا ہے۔ عرب موسیقی بھی افقی ہے۔ لیکن اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ترنم مختلف برابر ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا ہے چنانچہ پاکستان میں جتنے راگ ہیں ان میں یہ خصوصیت جاری و ساری ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جس کی بنا پر یہ موسیقی، کرناٹکی یا جنوبی ہند کی موسیقی سے ممیز ہوتی ہے۔

صنعتوں پر اثر:- مشہور فرانسیسی محقق ڈاکٹر گستاؤلی بان عربوں کے تمدن کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ لوگ فطرتاً ذہن رسا کے مالک تھے، اور اپنی مفتوحہ اقوام کی اچھی چیزوں کو قبول کرنے میں کبھی تعصب نہ برتتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے

مختلف صنعتیں ایک مفتوحہ ملک سے دوسرے ملک میں پھیلائیں، ہمارے ملک میں انھوں نے کپڑے کی مختلف صنعتیں اور برتنوں کی صنعت اوران کے پالش وغیرہ کے فن کو بڑی ترویج و ترقی دی، ڈھاکہ کی روایتی ململ ان کے اعلیٰ ذوق کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ مسلم گھرانوں میں مستعمل ہونے والے نفیس کپڑوں کا وجود انہیں کا مرہون منت ہے۔ اور ملتان اور بھاولپور کے اعلیٰ اقسام کے مٹی کے برتن اور سلور کے برتنوں کے نقش ونگار کی صنعت بھی انھوں نے ہی یہاں پھیلائی۔ اور اسے ترقی دی

تعمیرات: اس فن میں ہمیں عربی اثرات، ایرانی خصوصیات کے ساتھ ملے جلے ملے۔ جس میں ہندوستانی اثرات شامل کرکے ہم نے اپنی ایک الگ راہ نکالی۔ لیکن ہماری پرانی تعمیرات اور نئی مذہبی تعمیرات میں خط امتیاز۔ نقش ونگار اور گول محرابیں خالصتاً عربی ہیں۔ حال کی بنی ہوئی عمارتوں میں بھی مثلاً کراچی کی نئی میمن جامع مسجد اور دیگر مساجد میں یہ حسین امتزاج نظر آتا ہے۔

عربی تمدن کا غالباً سب سے زیادہ اثر ہماری اجتماعی زندگی پر پڑا ہے۔ اس لئے کہ پاکستان کا وجود بجائے خود مذہب کا مرہون منت ہے۔ عربوں کی تمدنی خصوصیات سے بحث کرتے ہوئے پروفیسر ٹوئن بی اپنی مشہور تالیف (A Study of History) میں لکھتا ہے کہ عربوں میں قومیت کی بنیاد ان کا دیوتا ہوا کرتا تھا۔ دیوتا کا بدل ان کے یہاں ایسا ہی تھا جیسا ہمارے یہاں قومیت کی تبدیلی۔ پروفیسر موصوف نے کوئی نئی چیز بیان نہیں کی ہے۔ وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ ابن خلدون نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام دیوتاؤں کی جگہ ایک خدائے واحد کی بنیاد پر عرب قومیت کی تعمیر کی۔ چنانچہ یہ روح ہم پاکستان کی اجتماعی زندگی میں پوری طرح کارفرما دیکھتے ہیں، موجودہ زمانہ میں یہ ملک اپنی آپ مثال ہے۔ جس میں جغرافیائی حدود، نسل، رنگ اور مشترک تمدن کی بجائے مشترک مذہب پر ایک سماج، ایک حکومت اور ایک ملک کی بنیاد رکھی گئی ہے، ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو قائد ملت مرحوم نے پاکستانی دستور یہ میں جس "قرارداد مقاصد" کو پیش کیا وہ اسلامی نظامی حکومت کا سنگ بنیاد ہے اور پاکستانی دستور کے (Preamble) کے یہ الفاظ ہیں:-

> "ہرگاہ کہ ساری کائنات پر اقتدار اعلیٰ صرف خدائے قادر مطلق ہی کو حاصل
> ہے۔ اور جمہور پاکستان کو خداوند تعالیٰ کے بتلائے ہوئے حدود کے اندر
> تصرفات کا حق (اسی کا عطا کردہ) ایک مقدس امانت ہے"۔

[...]نے والی نسلوں کو ہمیشہ خواب سے بیدار کرتے رہیں گے، اور میرے خیال میں یہ عرب تمدن کی اس ملک میں سب سے بڑی فتح [...]ہے۔

پاکستان کو انشاءاللہ اسلامی تہذیب اور دینی نظریات کا گہوارہ بننا ہے، تمام قوم اسی "بشارت" کے سہارے [...]جی رہی ہے!

نعتِ رسولؐ

ارشد صدیقی امروہوی

دنیا نظر آتی ہے خریدارِ محمدؐ دیکھے تو کوئی گرمیِ بازارِ محمدؐ
خالق نے براق آپ کو بھیجا شبِ معراج جبریل بنے غاشیہ بردارِ محمدؐ
قرآن کی آیات سے یہ بات ہے ثابت اللہ کا انکار ہے انکارِ محمدؐ
دُنیا کی اُسے فکر نہ عقبیٰ کا کوئی غم آزاد دو عالم ہے گرفتارِ محمدؐ

بہر طور جو وقفِ عشقِ نبیؐ ہے حقیقت میں وہ زندگی زندگی ہے
محیطِ دو عالم ہے نورِ محمدؐ یہاں روشنی ہے وہاں روشنی ہے
بہاروں کا مجموعہ ذاتِ محمدؐ چمن در چمن آپ سے تازگی ہے

دیوانے جو پڑے ہیں مدینے کی راہ میں خلدِ بریں کو بھی نہیں لاتے نگاہ میں
اچھی وہ جان ہے جو مٹے انکے نام پر اچھا وہ مال ہے جو لٹے ان کی راہ میں

کیا کہوں ہجر ہے اچھا کہ وصال اچھا ہے جسمیں محبوبِ خدا خوش ہیں وہ حال اچھا ہے
اللہ اللہ رے اُس در کی غلامی کا شرف ہفت اقلیم کے شاہوں سے بلالؓ اچھا ہے
علم تقویم کو مشتاقِ نبیؐ کیا جانے ہو مدینے کا سفر جس میں وہ سال اچھا ہے
شعر کہتا ہوں عجب نعتِ نبیؐ میں ارشد ہر سخنور سے مرا سحرِ حلال اچھا ہے

تشریف لائے بزمِ رسالت میں جب حضورؐ ہر اک چراغ آپ کا پروانہ ہوگیا
جس کی ہوئی تھی حضرتِ آدمؑ سے ابتدا احمدؐ پہ آکے ختم وہ افسانہ ہوگیا
دیوانۂ نبیؐ کا ذرا جذب دیکھئے جس پر نگاہ ڈالدی فرزانہ ہوگیا

بشیر فاروقی

محمدؐ ہے سرمایۂ دو جہاں محمدؐ پہ رکھتے ہیں ایمان ہم
تراشیں گے ذروں سے خورشید نو اٹھائیں گے قطروں سے طوفان ہم
ہمارے لئے بس ہے عشقِ نبیؐ یہی لے کے جائیں گے سامان ہم

جذبات و واردات

منظر کلیمی

سہارا دے کہ لرزیدہ قدم کی بات رہ جائے
نگاہِ مست! ترے کیف و کم کی بات رہ جائے

رہ دیر و حرم سے چل کے میخانے میں آئے ہیں
کہ شاید اس طرح دیر و حرم کی بات رہ جائے

گریزاں ہوں میں خود ہی انتظارِ عہدِ فردا سے
ترے اقرار کی قول و قسم کی بات رہ جائے

زندگانی کی خوشی، موت کے غم سے کیا کام
عشق والوں کو وجود اور عدم سے کیا کام

درگہِ عشق کے درویشِ تہی داماں کو
شوکتِ خسروی و عشرتِ جم سے کیا کام

تو نہیں ملتا تو ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں تجھے
تو جو مل جائے تو پھر دیر و حرم سے کیا کام

ہم تو مجبورِ محبت ہیں پڑے ہیں در پر
آپ مختار ہیں پھر آپ کو ہم سے کیا کام

گلوں کے دیس میں گزری بہار میں گزری
ہماری زیست مگر انتظار میں گزری

کسی کو لطف میسر کسی کو عیش نصیب
اور اپنی عمر غمِ روزگار میں گزری

وہ آئے آئے ابھی آئے آنے والے ہیں
یہ زندگانی بھی کس اعتبار میں گزری

نہ آئی راس وفا عمر بھر ہمیں منظر
مگر تمام اسی کاروبار میں گزری

عیش ٹونکی

آنکھ سے دیکھے ہیں منظر یہ شبستانوں کے
شمع روتی ہی رہی سوگ میں پروانوں کے

تو نہ کر فکرِ تلافیِ تغافل اے دوست
خود بدل جائیں گے حالات پریشانوں کے

ہوش اڑائے دمِ دیدار نہ کیوں برقِ جمال
شمع کے سامنے پر جلتے ہیں پروانوں کے

جذبِ اہلِ جنوں تو کوئی دیکھے آ کر
ہار ڈالے ہوئے پھرتے ہیں گریبانوں کے

وہی اک بات کہے جاؤں کہاں تک آخر
تم نے عنواں ہی نہ بدلے مرے افسانوں کے

آج وہ میکدہ بردوش نظر آتے ہیں
کل جو واقف بھی نہ تھے نام سے پیمانوں کے

اپنی افتادِ طبیعت سے ہیں مجبور اے عیش
ہم تو کعبے کے رہے اب نہ صنم خانوں کے

ماہرالقادری

گل ہائے تازہ

(دہلی میں بزمِ میر تقی میر کے سلسلے میں دو دن بڑے دھوم کا مشاعرہ ہوا۔ آخری نشست (۱۹ اپریل ۵۹ء) طرحی مشاعرے کے لئے مخصوص تھی۔ شاعر نے اپنی یہ غزل مشاعرے میں مترنم لہجہ میں سنائی۔)

کس منہ سے کہوں دولتِ دیدار ملی ہے
نظارے کا حاصل تو پریشاں نظری ہے

دُنیا میں یہ کیوں سوزِ محبت کی کمی ہے
شاید مری فریاد کی "لے" ٹوٹ گئی ہے

وہ سامنے ہیں اور پھر آنکھوں میں نمی ہے؟
اے دیدۂ مشتاق! یہ کیا بے ادبی ہے

ماہر! مری فریاد جو شعروں میں ڈھلی ہے
جبریلؑ سے حاصل مجھے اب ہم نفسی ہے

آنکھوں میں ہے دم اور جبیں در پہ جُھکی ہے
اس موت پہ قربان، حیاتِ ابدی ہے

پروانہ ہے خود اپنی جگہ شعلۂ بے تاب
اور شمع کا یہ حال جلایا تو جلی ہے!

پیمانے تو خود گرد مرے گھوم رہے ہیں
میں وُہ ہوں کہ ساقی سے مری آنکھ ملی ہے

دُنیا ہے کہ گرتی ہوئی دیوار کا سایہ
انسان کو پھر بھی غمِ دُنیا طلبی ہے

نکھرا ہوا ماحول، یہ گل رنگ اُجالا
شاید ترے عارض کی کہیں چھوٹ پڑی ہے

سرو و گل و لالہ کا تو کیا ذکر ہے ماہر
ہر خار کو یاں نازِ گلستاں نسبی ہے

ایک شعر

میں نے دیکھی تھی اک تجلّی سی
یہ حقیقت بھی ہے تعلّی سی

[...]روح انتخاب

قرآن کریم کی عظمت و صداقت کا اعتراف

غیر مسلم مشاہیر کی زبان سے

[...]لر گستاولی بان فرانسیسی — قرآن دلوں میں ایسا زندہ اور پُر زور ایمانی جوش پیدا کر دیتا ہے کہ پھر کسی شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ (ذکریٰ مصر) ص[...]

[...]ر ولیم میور — قرآن نے فطرت اور کائنات کی دلیلوں سے خدا کو سب سے اعلیٰ ہستی ثابت کیا اور انسانوں کو خدا کی اطاعت اور شکر گزاری پر جھکا دیا۔

[...]وفیسر اڈورڈ جی، براؤن ایم اے — جوں جوں قرآن پر غور کرتا ہوں اور اس کے مفہوم و معانی کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں میرے دل میں اس کی قدر و منزلت زیادہ ہوتی جاتی ہے لیکن شذ و نادرا[...] [...]العربجز ایسی حالتوں کے کہ علم الازمان یا تحقیق لسانی یا اسی قسم کی دیگر اغراض کے لئے پڑھا جائے طبیعت میں تکان پیدا کرتا اور بار خاطر [...]وتا ہے۔

[...]سٹر عمانوئل۔ ڈی۔ انش — قرآن کی روشنی اس وقت یورپ میں نمودار ہوئی جب تاریکی محیط ہو چکی تھی اور اسی سے یونان کی مردہ عقل اور علم کو زندگی مل گئی۔

[...]لر جانسن — قرآن کے مطالب ایسے مناسب وقت اور عام فہم ہیں کہ دنیا ان کو آسانی سے قبول کر سکتی ہے، پر افسوس ہمارا ہی قصور ہے کہ ہم کو دیکھ دیکھ کر دنیا اس سے نفرت کرتی ہے۔

[...]وفیسر رینلڈ اے نکلسن — قرآن کے اثر سے عربی زبان تمام اسلامی دنیا کی متبرک زبان بن گئی اور قرآن نے دختر کشی کا خاتمہ کر دیا۔

[...]سٹر ایچ۔ ایس۔ لیڈر — تعلیم قرآن سے فلسفہ و حکمت کا ظہور ہوا اور ایسی ترقی کی اپنے عہد کی بڑی سے بڑی یورپین سلطنت کی تعلیم حکمت سے بڑھ گیا۔

[...]سٹر ای۔ ڈی ماریل — اسلام کی قوت و طاقت قرآن میں ہے قرآن قانون اساسی ہے اور حقوق کی دستاویز ہے۔

[...]ن جاک ریسک، جرمنی فلاسفر — جب کہ قرآن پیغمبر کی زبان سے منکر سنتے تھے تو بیتاب ہو کر سجدے میں گر پڑتے تھے اور مسلمان ہو جاتے تھے۔

تھیوڈر ونولڈیکی — قرآن لوگوں کو ترغیب و ترہیب کے ذریعہ معبودان باطل سے پھیر کر ایک قرآن میں موجودہ دور آئندہ کے تمام علوم و فنون القرآن میری کتاب میں ملاحظہ کرو۔

مسٹر سٹینلی لین پول — قرآن میں سب کچھ موجود ہے جو ایک بڑے مذہب میں ہونا چاہئے اور جو ایک بزرگ انسان (محمد صلعم) میں موجود تھا۔

مسٹر جے لی بٹانی — قرآن نے بیحد و بے شمار انسانوں کے اعتقاد اور چال چلن پر نمایاں اثر ڈالا ہے۔ (اور سائنس کی دنیا نے قرآن کی ضرورت کو اور واضح کر دیا)

ایچ - جی - ویلز — قرآن نے مسلمانوں کو ایسی مواخات کے بندھن میں باندھ رکھا ہے جو نسل اور زبانوں کے فرق کے پابند نہیں ہے۔

پادری والرش - ڈی - ڈی — قرآن کا مذہب امن اور سلامتی کا مذہب ہے۔

مسٹر بوسورتھ اسمتھ — محمد (صلعم) کا دعویٰ ہے کہ قرآن ان کا مستقل اور دائمی معجزہ ہے اور میں مانتا ہوں کہ واقعی یہ ایک معجزہ ہے۔

گاڈفری ہنگیس — قرآن غریب آدمی کا دوست اور غمخوار ہے بڑے آدمیوں کی ناانصافی کی ہر جگہ پر..... مذمت کرتا ہے۔

مسٹر رچرڈسن — غلامی کی کروہ رسم اٹھانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہندو شاستر قرآن سے بدل دیا جائے!

ڈین سٹینلی — قرآن کا قانون بے شبہ بائیبل کے قانون سے زیادہ موثر ثابت ہوا ہے۔

میجر لیونارڈ — قرآن کی تعلیم بہترین ہے اور انسانی دماغوں پر نقش ہو جاتی ہے۔

اخبار نیر ایسٹ — اگر ہم قرآن کی عظمت و فضیلت اور حسن و خوبی سے انکار کریں تو ہم عقل و دانش سے بیگانہ ہونگے۔

سر اڈورڈ ڈینی سن راس سی آئی ای — قرآن شریف اس بات کا مستحق ہے کہ یورپ کے گوشہ گوشہ میں پڑھا جائے۔

ڈاکٹر چارٹن — قرآن کا طرز تحریر دل آویز ہے، رواں ہے مختصر اور جامع ہے خدا کا ذکر شاندار طریقہ سے کرتا ہے۔

مسٹر آرنلڈ وہائٹ — قرآن نے مسلمانوں کو جنگ آرائی بھی سکھائی اور ہمدردی و خیرات و فیاضی بھی۔ قرآن نے وہ اصول فطرت پیش کئے کہ سائنس کی بڑھتی ہوئی ترقیاں اس کو شکست نہیں دے سکتیں۔

ڈاکٹر موریس فرانسیسی قرآن کی سب سے بڑی تعریف اس کی فصاحت و بلاغت ہے۔ مقاصد کی خوبی اور مطالب کی خوش اسلوبی کے اعتبار سے قرآن کو تمام آسمانی کتابوں پر فوقیت حاصل ہے۔

مسٹر لڈلف کریل قرآن میں عقائد و اخلاق کا مکمل ضابطہ و قانون موجود ہے۔ وسیع جمہوریت، رشد و ہدایت، انصاف و عدالت، فوجی تنظیم و تربیت، اور مالیات اور غرباء کی حمایت و ترقی کے اعلیٰ آئین موجود ہیں اور ان سب قانونوں کی بنیاد ذات باری کے اعتقاد پر رکھی گئی ہے۔

جارج سیل قرآن کریم بے شبہ عربی زبان کی سب سے بہتر اور سب سے مستند کتاب ہے، کسی انسان کا قلم ایسی معجزانہ کتاب نہیں لکھ سکتا اور یہ مردوں کو زندہ کرنے سے بڑھا ہوا معجزہ ہے۔

ریورنڈ جی ایم راڈویل قرآن کی تعلیم نے بت پرستی مٹائی۔ جنات اور مادیات کا شرک مٹایا۔ اللہ کی عبادت قائم کی، بچوں کے قتل کی رسم نیست و نابود کردی۔

آر ریورنڈ میکسویل کنگ قرآن الہامات کا مجموعہ ہے اس میں اسلام کے اصول و قوانین اور اخلاق کی تعلیم اور روزمرہ کے کاروبار کی نسبت ہدایات موجود ہیں۔ اس لحاظ سے اسلام کو عیسائیت پر فوقیت ہے اس کی مذہبی تعلیم اور قانون علیحدہ چیزیں نہیں ہیں۔

موسیو اوجین۔ کلافل۔ فرانسیسی قرآن مذہبی تو عادات و احکام ہی کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس میں اجتماعی (سوشیل) احکام بھی ہیں جو انسان کی زندگی کے لئے ہر حالت میں مفید ہیں۔

ڈیون پورٹ قرآن مسلمانوں کا مشترکہ قانون ہے معاشرتی، ملکی، تجارتی، فوجی، عدالتی، تعزیری: سب ہی معاملات اس میں ہیں۔ باوجود اس کے یہ ایک مذہبی کتاب ہے، اس نے ہر چیز کو باقاعدہ بنایا ہے ....

....

پروفیسر کارلائل میرے نزدیک قرآن میں خلوص اور سچائی کا وصف ہر پہلو سے موجود ہے۔ اور سچ تو یہ ہے اگر کوئی خوبی پیدا ہوسکتی ہے تو اسی سے پیدا ہوسکتی ہے۔

کونٹ ہنری دی کاسٹری قرآن کو دیکھ کر عقل حیرت میں ہے کہ اس قسم کا کلام اس شخص کی زبان سے کیوں کر ادا ہوا جو بالکل امی تھا۔

ڈاکٹر گبن قرآن وحدانیت کا بڑا گواہ ہے۔ ایک موحد فلسفی اگر کوئی مذہب قبول کرسکتا ہے تو وہ اسلام ہی ہے غرض سارے جہان میں قرآن کی نظیر نہیں مل سکتی۔

ملکس لتوازوں، فرانسیسی فلاسفر قرآن روشن اور پرحکمت کتاب ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ ایسے شخص پر نازل ہوا جو سچا نبی تھا اور خدا نے اس کو بھیجا تھا۔

جدید علمی انکشافات میں یا ان مسائل میں جن کو ہم نے اپنے علم کے زور سے حل کیا ہے یا ہنوز زیر تحقیق و نظر ہیں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو تحقیق قرآنی کے مخالف ہو۔ ہم نصرانیوں نے نصرانیت کو علم و سائنس کے ہم آہنگ و ہم نشین بنانے میں اب تک جتنی کوششیں کی ہیں۔ اسلام و قرآن میں یہ سب کچھ پہلے ہی سے موجود ہے اور پوری طرح سے موجود ہے۔

موسیو سیڈیو فرانسیسی اسلام کو جو لوگ وحشیانہ مذہب کہتے ہیں انہوں نے قرآن کی تعلیم کو نہیں دیکھا جس کے اثر سے عربوں کی تمام بری اور معیوب عادتوں کی کایا پلٹ ہو گئی۔

موسیو کاسٹن کار روئے زمین سے اگر قرآن کی حکومت جاتی رہے تو دنیا کا امن و امان کبھی قائم نہیں رہ سکتا جیسا کہ یہ دنیا کے شدید تکلیف دہ حالات پکار پکار کر کہہ رہے ہیں۔

ایم ڈی بولف، جرمنی قرآن نے صفائی طہارت اور پاکبازی کی ایسی تعلیم دی کہ اگر ان پر عمل کیا جائے تو بیماری کے کیڑے سب کے سب ہلاک ہو جائیں۔

مسٹر روڈول جتنا بھی ہم اس کتاب کو (قرآن) کو الٹ پلٹ کر دیکھیں اسی قدر پہلے مطالعہ میں اس کی نامرغوبی نئے نئے پہلوؤں سے اپنا رنگ جماتی ہے لیکن فوراً ہی ہمیں مسخر کر لیتی ہے متحیر بنا دیتی ہے اور آخر میں ہم سے تعظیم کرا کے چھوڑتی ہے۔ اس کا طرز بیان باعتبار اس کے مضامین و اغراض کے عفیف، عالیشان اور تہدید آمیز ہے اور جا بجا اس کے مضامین سخن کی غایت رفعت تک پہنچ جاتے ہیں۔ الغرض یہ کتاب ہر زمانہ میں اپنا پُر زور اثر دکھاتی رہے گی۔

گوئٹے جس قدر ہم اس (کتاب) کے قریب پہنچتے ہیں یعنی اس پر زیادہ غور کرتے ہیں وہ اسی قدر دور کھینچتی جاتی ہے یعنی زیادہ اعلیٰ معلوم ہوتی ہے وہ بتدریج فریفتہ کرتی ہے، پھر متعجب کرتی ہے، فرحت آمیز تحیر میں ڈال دیتی ہے اور آخر کار احترام کرا کے چھوڑتی ہے۔ اس طرح یہ کتاب تمام نظروں میں ہمیشہ زبردست اثر ڈالتی ہے۔

پاپولر انسائیکلوپیڈیا قرآن کی زبان بلحاظ لغت عرب ہمیشہ نہایت فصیح ہے اسکی انشائی خوبیوں نے اُسے اب تک ہمیشہ بے مثل اور بے نظیر ثابت کیا ہے علاوہ ازیں اس کے احکام اس قدر مطابق عقل و حکمت و فطرت ہیں کہ اگر انسان انہیں چشم بصیرت سے دیکھے تو وہ ایک پاکیزہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ کیا ان حقائق سے یورپ زدہ مسلمان سبق نہیں حاصل کریں گے؟

اڈمنڈ برک اسلامی (قرآنی) قانون ایک تاجدار سے لے کر ادنیٰ ترین، فرد رعایا تک کو حاوی ہے یہ ایک ایسا قانون ہے جو ایک معقول ترین علم فقہ پر مشتمل ہے جس کی نظیر اس سے پیشتر دنیا پیش نہیں کر سکی۔

بابا نانک توریت، زبور، انجیل، اور وید وغیرہ سب کو پڑھ کر دیکھ لیا۔ قرآن شریف ہی قابل قبول اور اطمینان قلب کی کتاب نظر آئی۔ اگر سچ پوچھو تو سچی اور ایمان کی کتاب جس کی تلاوت سے دل باغ باغ ہو جاتا ہے، قرآن شریف ہی ہے۔

بابا بھوپندر ناتھ باسو تیرہ سو برس کے بعد بھی قرآن کی تعلیم کا یہ اثر ہے کہ ایک خاکروب بھی مسلمان ہونے کے بعد بڑے بڑے خاندان کے مسلمان کی برابری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

بابو بپن چندر پال قرآن کی تعلیم میں ہندوؤں کی طرح ذات پات کا امتیاز موجود نہیں ہے نہ کسی کو محض خاندانی اوصاف یا عظمت کی بنا پر بڑا سمجھا جاتا ہے۔

مسز سروجنی نائیڈو قرآن کریم غیر مسلموں سے بے تعصبی اور رواداری سکھاتا ہے دنیا اس کی پیروی سے خوشحال ہو سکتی ہے۔

مہاتما گاندھی مجھے قرآن کو الہامی کتاب تسلیم کر لینے میں ذرہ برابر بھی تامل نہیں ہے۔ (تاریخ القرآن)

ہماری نظر میں

سُنن دارمی شریف

اردو ترجمہ، ضخامت ۶۹۴ صفحات (مجلد) قیمت آٹھ روپے،
ملنے کا پتہ :- محمد سعید اینڈ سنز۔ قرآن محل مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی

امام دارمی رحمۃ اللہ علیہ اجل محدثین میں شمار ہوتے ہیں۔ امام مسلم اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہما کو آپ کی ذات سے شرفِ تلمذ ہے۔ امام موصوف "سُنن دارمی" کے جامع ہیں۔ بعض علماء نے ابن ماجہ پر سُنن دارمی کو ترجیح دی ہے۔ آپ ۱۸۱ھ ہجری میں سمرقند میں پیدا ہوئے اور ۲۵۵ھ ہجری میں انتقال فرمایا۔ امام موصوف نے طلب حدیث کے لئے طویل سفر کئے اور بڑی محنت، ریاضت جانفشانی اور خلوص و عقیدت کے ساتھ احادیث نبوی کے سرمایہ کو جمع کیا۔

"سُنن دارمی" تین ہزار چار سو دو (۳۴۰۲) احادیث جمع کی گئی ہیں۔ احادیث رسولؐ کا یہ مستند مجموعہ، محمد سعید اینڈ سنز نے اردو میں سلیس اور عام فہم ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس پر مولانا امجد العلی اور مفتی انتظام اللہ شہابی کے "مقدمے" ہیں اور امام دارمی کا مختصر تذکرہ بھی درج ہے۔

ترجمہ کا ایک نمونہ :-

"ابو ہریرہ رضؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محتاج وہ شخص نہیں ہے جسے ایک دو لقمے، ایک دو ٹکڑے، اور ایک دو خرمے دیئے جاتے ہیں، بلکہ محتاج وہ شخص ہے کہ جس کے پاس اس قدر مال نہ ہو، جس سے اسے بے پروائی حاصل ہو، اور لپٹ کر سوال کرنے سے شرماتا ہو یا (فرمایا) کہ لپٹ کر سوال نہیں کرتا ہو۔"

یہ مقدس کتاب ۱۳۶۴ عنوانات پر مشتمل ہے اور ہر قولِ رسولؐ اُمت کے لئے نمونہ ہے۔ حجت ہے۔ فرمانِ واجب الاذعان اور لائق عمل ہے۔ ناشرین نے اس کتاب کو چھاپ کر دین کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل و اتباع کی توفیق عطا فرمائے۔

امامتِ عظمیٰ

از :- علامہ سید محمد رشید رضا (مدیر المنار مصر) ترجمہ :- مولانا ابوالفتح عزیزی۔
صفحات ۲۰۸۔ (مجلد خوبصورت رنگین گرد پوش کے ساتھ) قیمت دو روپے۔
ملنے کا پتہ :- محمد سعید اینڈ سنز۔ قرآن محل، مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی۔

مصر کے شہرہ آفاق عالم مفتی محمد عبدہ اور ان کے نامور شاگرد سید رشید رضا علمی اور اسلامی دنیا میں غیر معمولی شہرت رکھتے ہیں۔ رشید رضا نے ...

"الخلافۃ او الامامۃ العظمیٰ"

موضوع پر اسی نام سے ایک کتاب لکھی تھی، مولانا ابوالفتح عزیزی نے اس بلند پایہ کتاب کا عام فہم انداز میں ترجمہ کیا ہے۔ چند عنوانات :-

خلیفہ کے قیام اور امامت کا حکم ——— جماعت کے معنیٰ اور امت کا اقتدار ——— بیعت کے بعد اُمت پر

کیا چیز واجب ہوتی ہے۔ ——— اسلام میں شوریٰ کی حقیقت، ——— خلافت میں جبر و تغلب کی ابتدا کس طرح ہوئی
اسلامی دستور سازی اور خلافت ——— اسلام میں بادشاہت ۔۔۔۔۔۔

یہ کتاب فاضل مصنف کے تفریج اور تجدد پرستی کے باوجود ان کی دینی فکر اور ذہن و دماغ کی جودت اور نکتہ رسی کی شہادت دیتی ہے، کتاب کی "تمہید" میں مصنف کا یہ انتباہ کس قدر یقین افروز ہے۔

"مسلمانو! مغرب زدہ لوگ تمہیں عادات و خصائل میں فرنگیوں کی تقلید پر آمادہ نہ کردیں، تم تو ان کے تمدن سے بہتر تمدن کے مالک ہو کر ان کے امام اور پیشوا بننے کے مستحق ہو۔ اسلام کے سوا کوئی ایسا تمدن نہیں جس کے قواعد مستحکم ہوں اور اس کے دینی عقائد معقولیت پر مبنی ہوں۔۔۔"

وہ امور جو اسلام میں حرام ہیں، ان کے ارتکاب پر غیر مسلموں کے ساتھ اسلامی حکومت میں کیا سلوک کیا جائے گا؟ اس پر فاضل مصنف کی رائے بلکہ یوں کہئے فیصلہ پڑھنے کے لائق ہے، فرماتے ہیں:۔

"اسلامی حکومت غیر مسلمین کو ان امور میں سزا نہ دے گی، جو ان کے مذہب میں جائز ہیں، اگرچہ مذہب اسلام میں حرام ہوں مگر یہ کہ دوسروں کو ان کی حرکتوں سے تکلیف نہ ہو۔ بلکہ ان کے انفرادی اعمال پر جو مسلمانوں یا دوسروں کے لئے مضرت رساں نہ ہوں، ان کا محاسبہ نہیں کیا جائے گا، اگرچہ مسلمانوں کے مذہب کے خلاف ہوں۔ لیکن مسلمانوں کا محاسبہ کیا جائے گا، اگرچہ مسلمانوں کے مذہب کے خلاف ہوں۔ لیکن مسلمانوں کا محاسبہ کیا جائے گا، اور گناہوں پر حدود اور زجر و توبیخ کی شکل میں انہیں سزا دی جائے گی۔۔۔"

"اس سے معلوم ہوا کہ ملحد اور فاسق مسلمان پر اسلامی حکومت کا قیام غیر مسلمین کے اعتبار سے زیادہ شاق ہونا چاہئیے، اس لئے کہ اسلامی حکومت ان کو اس امر کی تکلیف دیتی ہے جس کی دوسروں کو نہیں دیتی، اور ان سے اُن امور میں باز پرس کرتی ہے، جن میں دوسروں (یعنی غیر مسلموں) کا مواخذہ نہیں کرتی:"

ابن خلدون نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے طرز عمل کو یہاں تک کہ یزید کی جانشینی کو صحیح قرار دینے کی جو کوشش کی ہے اس پر علامہ رشید رضا نے بڑی سخت گرفت فرمائی ہے اور یہاں تک لکھ دیا ہے کہ امیر معاویہؓ حب دنیا اور ملوکیت کے فتنہ میں مبتلا ہو گئے تھے!

یہ کتاب اپنے موضوع پر بہت خوب ہے مگر اس دور میں جب کہ مسلمانوں کے عوام و خواص ۔ رعایا اور سلاطین عام طور پر دین سے بے پروائی پائی جاتی ہے خلافت اور امامت منظمے کی آواز نامانوس سمجھی جائے گی، "خلافت" کے قیام و احیاء کا تصور ہی ذہنوں سے نکل چکا ہے، ورانسانی گروہوں میں تیزی سے پھیلی جا رہی ہے! ؏

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

اسلام اور مغربی تہذیب

اُردو پوش کے ساتھ

از:۔ مولانا قاری محمد طیب (مہتمم دارالعلوم دیوبند) ضخامت ۱۸۶ صفحات (خوب صورت
قیمت:۔ دو روپے ملنے کا پتہ:۔ ادارہ تاج المعارف، دیوبند (یوپی)

حضرت مولانا قاری محمد طیب مدظلہ کی ذات منقولات و معقولات کی جامع ہے، اللہ تعالیٰ نے قاری صاحب موصوف کی زبان میں بڑی حلاوت، دل کشی اور تاثیر عطا فرمائی ہے، ان کی وعظ کی محفلوں کا سماں جس نے دیکھا ہے، اس کی کیفیت کو وہی محسوس کر سکتا ہے! قاری محمد طیب صاحب کے قلم نے بھی دینی گراں بہا خدمت انجام دی ہیں!

اس کتاب میں فاضل مصنف نے ثابت کیا ہے کہ :-

"اُمتِ نصرانیہ کیفیت کی بجائے کمیت کی دلدادہ ہے ——— اُمتِ نصرانیہ علمی امت نہیں ہے ——— اُمت مسیحیہ کا میلان مصنوعی اشیاء کی طرف ہے اور وہ عاقل نہیں بلکہ ایک غبی قوم ہے ——— اس کے مقابلہ میں اُمت مسلمہ علمی امت ہے جس پر علم وحکمت کا غلبہ ہے۔"

قاری صاحب مدظلہ نے مغربی تہذیب و تمدن کی ظاہری نمود اور چمک دمک کو حقیر اور بے وزن ثابت کرکے اسلامی اصول کی ہمہ گیری، جامعیت اور افادیت کو جس انداز میں پیش کیا ہے، وہ بس انہی کا حصہ ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر اسلام کی برتری، بلندی اور عظمت کا احساس ابھرتا ہے!

اس کتاب میں کہیں کہیں کلامی رنگ اور فلسفیانہ انداز بھی آگیا ہے، مثلاً شیخ عبدالغنی نابلسی قدس سرہ کے ایک قطب سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ :-

"شیخ کی تفسیر سے اتنا ضرور واضح ہوگیا کہ حضرت عیسیٰ کی تکوین و تولید میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا والد کی حیثیت میں دخل ضرور ہے۔ پھر ہم نے تو صرف یہی دعویٰ کیا تھا کہ حضورؐ کی صرف شبیہہ مبارک ہی حضرت عیسیٰ کے لئے بہ منزلہ باپ کے ہے، جس میں جبرئیلؑ نے نمایاں ہوکر مریمؑ کے گریبان میں پھونک ماری لیکن شیخ کے کلام میں اس سے بڑھ کر یہ دعویٰ موجود ہے کہ مریم عذرا کے سامنے نہ صرف شبیہہ محمدیؐ ہی نمایاں ہوئی، بلکہ حقیقت محمدیؐ بھی اس میں کارفرما تھی۔ جو حمل عیسویؑ کا ذریعہ بنی۔"

یہ تصور ایک مستقل خلجان، یہ عقیدہ سرتاپا اضطراب اور یہ فکر بڑی خطرناک ہے۔ شیخ عبدالغنی نابلسی نے اپنے ذہن سے ایک نکتہ پیدا کرکے خطرات کا جو دروازہ کھولا ہے، اس کی قاری محمد طیب صاحب نے تصدیق فرماکر، ان خطرات کو اور شدید کردیا، انھوں نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے :-

"مریم عذرا کے سامنے جس شبیہہ مبارک اور بشر سوی نے نمایاں ہوکر پھونک ماری وہ شبیہہ محمدیؐ تھی ..... جب کہ یہ واضح ہوگیا کہ مریم رضی اللہ عنہا اس شبیہہ مبارک کے تصرف سے حاملہ ہوئیں اور اس شبیہہ کے لئے بہ منزلہ زوجہ کے ہوئیں ...... پس حضرت مسیح کی ابنیت کے دعویدار ہم ایک حد تک ہم بھی ہیں مگر ابن اللہ مان کر نہیں بلکہ ابن احمد کہہ کر خواہ وہ ابنیت تمثالی ہی ہو۔"

اس کتاب کا سب سے کمزور حصہ یہی بحث و مذاکرہ ہے، اس "تحقیق انیق" اور "فکر دقیق" (؟) نے پوری کتاب کی افادیت کو مجروح کردیا، دوسرے ایڈیشن میں اس پورے باب کو حذف کردینا چاہئے، دین فطرت کی سادگی کو اس قسم کے لطائف و ظرائف نے بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ محقق علماء کو پچھلے لوگوں کی اس قسم کی خطرناک نکتہ آفرینیوں اور لغزشوں سے احتراز کرنا چاہئے، نہ یہ کہ ان کو اپنے مضامین میں دلیل بناکر پیش کریں اور ان کمزور و خطرناک بنیادوں پر ہوائی قلعے کھڑے کردیں۔

ہفت روزہ "المنبر" | مدیر :- حکیم محمد اشرف - قیمت :- فی پرچہ چار آنے - سالانہ نو روپے -
ملنے کا پتہ :- المنبر، ماڈل ٹاؤن بی، لائلپور

"المنبر" نام سے ناظرینِ فاران" نا آشنا نہیں ہیں، یہی جریدہ اب نئے انتظامات اور مضامین کے تنوع کے

ساتھ "المنبر" کے نام سے بڑی آب وتاب کے ساتھ نکل رہا ہے۔ اس کے مضامین دینی اعتبار سے مفید اور جاذب ہوتے ہیں۔ "المنبر" کا گیٹ اپ بھی "المنیر" سے زیادہ اچھا ہے بلکہ حسین وجاذب نظر ہے۔ سب سے زیادہ خوشی یہ دیکھ کر ہوئی کہ مولانا مودودی اور (سابق) جماعت اسلامی سے جو چشمک "المنیر" کے مضامین میں پائی جاتی تھی "المنبر" میں اُسے بند کر دیا گیا ہے۔ توقع ہے کہ یہ روش آخر تک قائم رہے گی اور گذشتہ تلخیوں کو قطعاً بھلا دیا جائے گا! "المنبر" کا ہم انشراح قلب کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں!

تاریخ گجرات

تالیف: پروفیسر مولانا سید ابو ظفر ندوی مرحوم۔ ضخامت ۴۲۰ صفحات مجلد، گردپوش کے ساتھ۔
قیمت: مجلد آٹھ روپے، غیر مجلد سات روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ ندوۃ المصنفین، اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی!

پروفیسر مولانا سید ابو ظفر ندوی مرحوم ایک خاموش عالم اور اہل قلم تھے۔ جو شہرت ونمود سے بلند ہو کر ساری عمر دین و ادب اور علم وفن کی خدمت کرتے رہے، اپنی اس کتاب میں مولانا مرحوم نے "کرشن مہاراج کے عہد سے محمود تغلق شاہ اور ظفر خاں آخری ناظم گجرات تک سیاسی حالات" قلمبند فرمائے ہیں۔

یہ کتاب بڑی محنت اور تحقیق سے لکھی گئی ہے، گجرات کی یہ جامع اور مستند تاریخ ہے، اور اپنے موضوع پر ایک اچھی تاریخی پیش کش ہے، کاش ا تاریخی معلومات کے ساتھ لکھنے والے کا قلم بھی شگفتہ ہوتا۔ یہ کمی جگہ جگہ کھٹکتی ہے۔

کتاب کی زبان بہت ہی آسان، سادہ اور سلیس ہے، بعض تاریخی واقعات کی تفصیلات سے عوام تو ایک طرف رہے فن تاریخ کے علماء کی معلومات میں بھی اضافہ ہوگا، ندوۃ المصنفین نے یہ کتاب بڑے اہتمام سے چھاپی ہے!

مثنوی سیر کراچی

از:۔ شبنم رومانی، ضخامت ۱۳۴ صفحات۔ قیمت دو روپے۔
ملنے کا پتہ:۔ قصر ناز ۳/ڈی ناظم آباد، کراچی۔

یہ کتاب شہر کراچی کا "منظوم جغرافیہ" بھی ہے اور یہاں کے بعض اداروں اور معروف شخصیتوں کا "تعارف نامہ" ہے۔ اُردو شاعری میں اپنے طرز کی پہلی کتاب منظر عام پر آئی ہے۔

جناب شبنم رومانی بڑے ذہین اور طباع شاعر ہیں مترنم بحروں میں ہلکی پھلکی نظمیں کہنے کا انہیں بہت شوق اور خاص سلیقہ ہے۔ اُن کی اس کتاب کے چند منتخب اشعار سے قارئین "فاران" کی تواضع کی جاتی ہے۔

یہ زینب کے پہلو میں کے والٹی	چھلکتی ہوئی چائے کی پیالی
یہ جوڑی کہ ہے غرق بند ار میں	کلائی پکڑتی ہے بازار میں
یہاں لُٹ گئے، کچھ وہاں لُٹ گئے	غرض خوش رہیں بیوی میاں لُٹ گئے
کوئی ہو تو کیسے ہو بس پر سوار	کہ اس تین ہی کے رستے ہیں چار
یہ کاٹن کا اینٹھا ہوا ایکس چینج	بنولے سے کہہ دو کرے سیکس چینج

؎ صفحہ ۲۴ پر "رشیدی" (حبشی) نظر آیا یہ غالباً "شیدی" ہوگا۔ "ر" کا اضافہ کاتب صاحب نے فرما دیا۔

سرِ راہ اک کافی ہاؤس ہے یہ　　کسی پیرزن کا بلاؤز ہے یہ
سمندر نے سونا یہ کہہ کر دیا　　"سپردم بہ تو مایۂ خویش را"
یہ مشرق کے چہرے پہ مغرب کا رنگ　　یہ زلفیں کہ کٹ جائے جیسے پتنگ
یہ چڑیوں کے شہد آفریں چہچہے　　جوانی کے قصے کہے، ان کہے

مگر جہاں اس قسم کے شعر سے

ہوئی جب سے تبت کی شہرت نئی　　کئی کیوڑا کی ناک ہی کٹ گئی
یہ اک مینیئر جس کی غائب ہے چھت　　کہ پھر دیکھئے، کچھ دکھانے کی لت
یہ انہالہ کی چھینکتی رس ملائی　　یہ لڈو ہے بے پی جلیبی کا بھائی

آگئے ہیں، طبیعت کو وحشت ہوتی ہے، بعض شعروں میں جھول پایا جاتا ہے، جسے دوسرے ایڈیشن میں نظر ثانی کرکے نکال دینا چاہیے۔

تاریخ قرآن

از:۔ مولانا عبدالقیوم ندوی، ضخامت ۱۴۲ صفحات (مجلد، رنگین گرد پوش کے ساتھ) قیمت دو روپے،
ملنے کا پتہ:۔ مطبع سعیدی، قرآن محل مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی۔

اس کتاب میں قرآن پاک کے نزول اور جمع و ترتیب کی تاریخ بیان کی گئی ہے، ان چند اہم عنوانات سے کتاب کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

"قرآن پاک کس ترتیب سے نازل ہوا ——— ربطِ قرآن ——— قرآن کیسے جمع ہوا ——— قرآن پاک میں کیا مباحث ہیں ——— تراجم قرآن شریف کیسے ہوئے ——— مذاہب غیر اور قرآنی تعلیم ——— قرآن مجید نے عالم انسانیت پر کیا اثر ڈالا ——— خلاصہ تعلیمات قرآن"

فاضل مصنف نے کتاب کی تدوین میں بڑی محنت کی ہے، اس کتاب پر مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم، مولانا سید ابوالحسن ندوی اور ڈاکٹر وحید مرزا صاحب نے تقریظیں لکھی ہیں، جن میں مصنف کی علمی کوششوں کو سراہا گیا ہے۔

"قرآن کا ربط مشکل کیوں ہے" ——— صفحہ ۵۲ پر اس عنوان کے تحت لائق مصنف نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے عنوان کی کوئی شک نہیں کہ ایک حد تک خاصی وضاحت ہو گئی ہے، مگر "ربطِ قرآن" کے سلسلہ میں سب سے زیادہ وزنی، دلنشین اور مطابق واقعہ بات یہ ہے کہ قرآن کا اندازِ بیان دوسری کتابوں کی طرح "تصنیفی" نہیں ہے بلکہ "تقریری" ہے؟ جو کوئی اس حقیقت کو سمجھ لے گا، اسے قرآن پاک میں کمال درجہ کا ربط و نظم نظر آئے گا!

"قرآن میں خدا نے قسمیں کیوں کھائی ہیں"؟ ——— (صفحہ ۷۵) اس عنوان پر مصنف نے بڑی اچھی باتیں کہی ہیں مگر مولانا حمید الدین فراہیؒ کی "اقسام القرآن" بھی ان کے پیشِ نظر ہوتی، تو یہ عنوان اور زیادہ وزنی ہو جاتا۔

"نسخ آیات" کے بارے میں مصنف نے الاتقان کے حوالے سے لکھا ہے:۔

"قرآن حکیم میں نسخ اس معنی کر کے میرے نزدیک بالکل نہیں ہے کہ کسی ایک آیت کا حکم بالکل ختم ہو گیا ہو اور اس پر عمل کرنا اب ممنوع قرار پایا ہو، بلکہ متقدمین نے نسخ جہاں جہاں مانا ہے، اس سے زیادہ کا مطلب یہ ہے کہ کسی آیت کے ابہام کو واضح کیا گیا ہو، یا تخصیص کی تعمیم یا تعمیم کی تخصیص یا مقید کو مطلق یا مطلق کو مقید کیا گیا ہے، اور مجازاً اس کو نسخ بولا گیا ہے"

"خداؤں کی کثرت وبہتات" (صفحہ ۶۲) واؤ عطف کی جگہ" اور" لکھنا تھا کہ عربی اور اردو کے لفظوں کے درمیان واؤ عطف نہیں آتا
"اور اگلے مفسرین نے پانچو آیت تک منسوخ گن ڈالا" (صفحہ ۵۳) اس خیال کو اچھے لفظوں میں ادا کرنا تھا، عبارت نوشتوں کی سی ہے
صفحہ ۷۰ پر "ابن فورک" کو جو "ابن فواک" لکھا ہے اسے کتابت ہی کی غلطی پر محمول کیا جائے گا!
صفحہ ۷۹ پر "رامائن" کو الہامی کتابوں میں شمار کیا گیا ہے، یہ بالکل خلاف واقعہ ہے۔ "رامائن" ہندوؤں کے یہاں بھی الہامی کتاب نہیں مانی جاتی!

محمد شیبانی خاں

از:۔ محمد رحیم دہلوی، ضخامت ۲۷۶ صفحات (مجلد، رنگین سرورق) قیمت تین روپے۔
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ رضیہ، جناح ہاؤس، نکوس اسٹریٹ لارنس روڈ۔ کراچی ۳

محمد شیبانی خاں ایک معمولی حیثیت کا آدمی تھا۔ مگر اس نے اپنی جرأت و تدبیر اور جانبازی کی بدولت اتنی طاقت حاصل کی کہ بابر جیسے اولوالعزم فرمانروا کو ماوراء النہر چھوڑ کر ہندوستان کی جانب راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔
ایک بار شیبانی خاں نے بابر کو سمرقند کے محاصرے میں اس قدر تنگ اور بے دست وپا کیا کہ اسے اپنی بہن خانزادہ بیگم کو سمرقند میں چھوڑ کر وہاں سے بھاگنا پڑا اور شیبانی نے اس سے نکاح کر لیا۔ ——— اسی حوصلہ مند مرد تیغ زن کے حالات جناب محمد رحیم دہلوی نے جمع کئے ہیں، اس سے قبل وہ بابر کے دوسرے حریف سلطان احمد تنبل کے سوانح حیات مرتب کر چکے ہیں!
اس کتاب میں خاندان شیبانیہ کے علاوہ خاندان چغتائیہ کی بھی مختصر تاریخ ملتی ہے، اور مشہور امراء اور معروف مقامات کے حالات بھی قلمبند کئے گئے ہیں، لائق مورخ کی سعی وتفحص ہر آئینہ قابل داد ہے۔
اس کتاب میں یہ سبق آموز دلچسپ واقعہ بھی ملتا ہے کہ بابر علم نجوم میں بہت کچھ یقین رکھتا تھا اور ستاروں کو دیکھ کر اپنی کامیابی اور ناکامی پر حکم لگاتا تھا مگر ایک لڑائی میں اس کی یہ ستارہ شناسی بالکل غلط ثابت ہوئی اور اس علم کی لغویت کا اسے اعتراف کرنا پڑا ———
"حضرت علیؓ کا مزار وہاں ہے اس لئے مشہد کہنے لگے" (صفحہ ۲۶۰) حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مزار نجف میں ہے مشہد میں امام علی رضا کی قبر ہے۔
صفحہ ۲۲۹ پر شیراز کو شہر سمرقند سے ۲۵ میل کے فاصلہ پر لکھا ہے، یہ مسافت بالکل غلط ہے، شیراز اور سمرقند کے درمیان سینکڑوں میل کا فاصلہ ہے۔

سلاطین اندلس یعنی تاریخ ہسپانیہ

از:۔ مفتی انتظام اللہ شہابی، ضخامت دو سو صفحات، (مجلد) قیمت تین روپے
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ فریدی، اردو کالج، کراچی۔

جناب مفتی انتظام اللہ شہابی اردو زبان کے مشہور مورخ ہیں۔ یہ کتاب (سلاطین اندلس) انھوں نے اگرچہ اختصار کے ساتھ مرتب کی ہے مگر اہم واقعات چھوٹنے نہیں پائے، دو سو صفحات میں انھوں نے ہزاروں اوراق کا خلاصہ اور نچوڑ پیش کر دیا ہے۔
اس کتاب میں سلاطین کے حالات زندگی اور ان کی معرکہ آرائیوں کی داستانوں کے علاوہ اندلس کی تہذیب وتمدن، علم وفن، شعر وادب، صنعت وحرفت، سیاست وتجارت اور ایجادات کا بھی مختصر تذکرہ ملتا ہے، لائق مصنف کی یہ عمدہ کوشش تحسین وتبریک کی مستحق ہے
صفحہ ۱۶ پر تشدد کی جمع "تشددات" لکھی ——— صفحہ ۵۰ پر یہ جملہ:-

"یوسف نے رئیس صوبہ "برمیوڈو" کے مزاج صحیح کر دیئے":

...ش: اس طرح ہوتا۔

"یوسف نے رئیس صوبہ "برمیوڈو" کا مزاج درست کر دیا"۔

یہ کتابت کی غلطی ہے کہ ایک جگہ "نفح الطیب" کی جگہ "نفخ لطیب" نظر آیا ---------- اسی طرح صفحہ ۱۶۸ پر "زریجیز"

...مختصر کر دیا"۔ یہی کاتب صاحب کی شوخیٔ قلم کا ظہور ہے کہ "دریچوں" کو "زیچیوں" لکھ مارا ---------- صفحہ ۱۹۹ پر "اوج کمال"

"عروج کماں" پڑھ کر ہنسی بھی آئی اور کوفت بھی ہوئی۔

"تاریخ ہسپانیہ" میں ایک حساس شخص کے لئے عبرت و موعظت کے بہت سے نقوش ملتے ہیں۔ سلطان عبدالرحمٰن کا یہ کردار ... ملتا ہے کہ شارلیمین سلطان سے صلح کی درخواست کرتا ہے اور یہ بھی کہ اس کی حسین و جمیل بیٹی کو سلطان اپنے حبالۂ عقد میں لے ... سلطان صلح کے لئے تو آمادہ ہو جاتا ہے مگر شارلیمین کی بیٹی سے شادی کرنے کی درخواست کو اس لئے ٹھکرا دیتا ہے کہ شارلیمین ... بھی بدکار تھا اور اس کی لڑکیاں بھی عصمت فروش تھیں۔ سلطان نے حرم سرا میں اس کردار کی عورت کو داخل کرنا گوارا نہیں کیا ... عربوں کی ایجادات کا یہ باب سائنس کے اس روشن دور میں بھی حیرت کے ساتھ پڑھا جائے گا کہ ابوالقاسم عباس ابن فرناس ... بازووں میں پر لگا کر دور تک اڑ گیا، لیکن اترتے وقت وہ سنبھل نہ سکا اور اس کے چوٹ لگ گئی۔ یہ واقعہ اب سے تقریباً ... ہزار سال پہلے کا ہے جب کہ یورپ نے سائنس کا نام بھی نہ سنا تھا۔

یہ کتاب ان پر از حقیقت جملوں پر ختم ہوتی ہے:-

"غرضیکہ یہ عربی فلسفہ ہی تھا جس نے یورپ کو آزادیٔ خیال، حریت جمع، اور انشراح جذبات کا پیغام دیا۔ آج یورپ نے جو ترقی کی ہے اور اوج کمال پر پہنچا ہے۔ یہ اندلسی عربوں کا طفیل و صدقہ ہے"۔

...ولانا عبدالسلام ندوی کی یاد میں

مرتبہ:- کبیر احمد جائسی۔ ضخامت ۸۲ صفحات (بڑا سائز) قیمت آٹھ آنے
ملنے کا پتہ:- شبلی نیشنل کالج میگزین، اعظم گڑھ۔

اس کتاب میں مولانا عبدالسلام مرحوم ندوی کے سوانح زندگی اور علمی کمالات پر پانچ گرانقدر مقالے درج ہیں، جن کے لکھنے والے ... معین الدین احمد ندوی، مولانا سعید انصاری، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، علی حماد عباسی، اور کبیر احمد جائسی جیسی ممتاز ادبی و علمی ...شخصیتیں ہیں۔

مولانا مرحوم کیا تھے؟ اس کا تھوڑا بہت اندازہ اُن کے ایک سیرت نگار جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے ان جملوں سے ہو سکتا ہے:

"...... انھوں نے تقریباً پچاس برس تک مسلسل علم و فن کی خدمت کی، ان کا پہلا مضمون ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا، اور جب ۴ اکتوبر ۱۹۵۶ء میں ان کا انتقال ہوا، تو اس روز بھی ان کا قلم ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ ان پچاس سال میں قرآن پاک، تفسیر، حدیث، سیرت، کلام، فلسفہ، منطق، نفسیات، اجتماعیات، تاریخ اور شعر و ادب شاید ہی کوئی ایسا فن رہ گیا ہو جس کے کسی نہ کسی پہلو پر ان کا قلم نہ چلا ہو۔ علم و فن کا اتنا طویل المدت خدمت گزار اردو زبان میں شاید ہی گزرا ہو"۔

مولانا عبدالسلام ندوی کی دینی، علمی اور ادبی خدمت گرانقدر اور شاندار ہیں، جن پر ایک مستقل کتاب لکھے جانے کی ضرورت ... یہ چند مضامین تو ان کی شخصیت کا نا تمام تعارف ہیں ---------- مگر ان مضامین کے ذریعہ مرحوم کے بارے میں جن

باتوں کا ہمیں علم ہوا ہے وہ بڑی دل چسپ ہیں۔ مرحوم سچ مچ ایک "مجذوب الث پر دانہ تھے! ساری دنیا سے نرالی سج دھج، پارسا بھی رنگین مزاج بھی، فرض شناس بھی! بے پروا بھی۔ پھر مزاج وطبیعت کے ان عناصر کے ساتھ علم وفلسفہ کا تبحر، اللہ تعالیٰ کے کمالِ تخلیق کا ایک اعجوبہ!

صفحہ ۵۰ پر کتابت کی غلطی کے سبب "حظیرۃ القدس" کو "خطیرۃ القدس" پڑھنا پڑا ـــــــ صفحہ ۱۴۲ پر مولانا مرحوم کا یہ شعر نظر سے گذرا! ـ ؎

ہوا مرنے پہ آغاز محبت　　　شروع ہوتا ہے یہ قصہ یہیں سے

اس میں "شروع" کا "ر" تقطیع سے گرتا ہے۔ "شعرالہند" اور "اقبال کامل" کے مصنف سے بھی ایسی چوک ہوگئی!
"کپڑا اسموں قیمت کا پھر کدر لپیٹا ہے" (صفحہ ۲۳) "پھر گدڑ" (ب کے تھا) لکھنا چاہیے تھا۔
یہ کتاب ہر اعتبار سے دل چسپ اور سیرت نگاری کا دل کش مُرقّع ہے!

متاعِ کلیم

از: کلیم احمد آبادی، ضخامت ۱۷۶ صفحات، مجلد، رنگین گرد پوش کے ساتھ (سائز "غبارِ خاطر")
قیمت چار روپے۔ ملنے کا پتہ:- کلیم بک ڈپو۔ خاص بازار، احمد آباد (بھارت)

حضرت کلیم احمد آبادی گجرات کے معمر، مشاق اور معروف ومقبول شاعر ہیں: ۱۹۵۸ء میں احمد آباد کے قدر شناس ارباب ذوق نے کلیم کی جوبلی خاصے تزک واحتشام کے ساتھ منائی، شاعر کی خدمت میں خراج قدردستائش کے علاوہ ایک ہزار کی تھیلی بھی پیش کی۔

جناب کلیم کے مجموعۂ کلام ـــــــ "متاعِ کلیم" ـــــــ پر پیش لفظ مولانا حبیب الرحمن غزنوی نے، تقریب پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے اور دیباچہ حضرت اعجاز صدیقی مدیر "شاعر" نے تحریر فرمایا ہے! کلیم احمد آبادی سن وسال کے اعتبار سے امیر وداغ کے دور اور ماحول کے شاعر ہیں مگر ان کے کلام میں جدید رجحانات کی خاصی جھلک ملتی ہے، کلیم کی شاعری میں جذبات فوارے کی طرح ابلتے ہیں اور ان کی آواز کا پُرشکوہ ترنم ان کے کلام میں بھی گھل مل گیا ہے! ان کا سن اسّی سال کے لگ بھگ ہے مگر ان کی غزلوں سے جوانی کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے ـــــــ چند منتخب اشعار ؎

کبھی وہ شاخ پہ بیٹھا نہ مطمئن ہو کر　　　کھلی فضا میں جو اڑتے ہوئے جھجکتا ہے
دور اک ایسا بھی آیا چند لمحوں کے لئے　　　آئی، لیکن آ کے پلٹا کھا گئی موجِ طرب
عشق کی سرگرمیوں نے کر دیا ہے بیقرار　　　اور جاذبِ شوق کہتا ہے، تحمل کیجیے
جنوں تک ہی نہیں محدود منزل تیرے مستوں کی　　　اگر کچھ اور بڑھ جاتے تو پھر جانے کہاں جاتے
چلے چلو کہ ابھی صبح کی سپیدی ہے　　　سحر قریب ہے تارا کوئی ہوا نہ ہوا
چلے تو موجِ محبت سبک روی سے چلے　　　یہ کیا کہ شورشِ بے اختیار بن جائے
آسماں وزمیں کو دیکھ لیا　　　ہم تو قائل ہیں دل کی وسعت کے
گرم آنسو بہہ رہے ہیں اس طرح　　　لُو چلے جیسے کہیں برسات میں
تو نہیں تو کائناتِ حسن ہے بے رنگ وبو　　　تیرے جلوے بھی ہیں خود نامعتبر تیرے بغیر
اُسے عشق بھی نہ سمجھا، اُسے حُسن بھی نہ جانا　　　جو سے تجھ میں اور مجھ میں رہ ورسمِ غائبانہ

مرے نصیب کا تارا بھی ٹوٹ کر نہ گرا   گیا تھا شب کی سیاہی میں انتظار بہت
عشق ہی تو سب کچھ ہے حُسن ہے تو سب کچھ ہے   مل گیا جو ملنا تھا تیرے آستانے سے
بڑا اعزاز ہے خلوت نشینِ حُسن ہونا بھی   عبادت ہے یہاں کا جاگنا بھی اور سونا بھی
بڑا مشکل ہے اس دنیا میں جینا دامن بچا کر   نگاہ و دل کی آزادی کو اک انداز پر رکھنا
ڈوبتا بھی ہوں ابھرتا بھی ہوں موجوں کی طرح   مجھ کو منزل پہ پہنچنا ہے سفینہ کے بغیر
کتابِ دہر میں اکثر یہی دو باب ملتے ہیں   کہیں ہے تذکرہ اُن کا، کہیں ہے داستاں میری
وہ مقامات تری شام و سحر میں بھی نہیں   جو مقامات مری فکر و نظر سے گزرے
سکوں نصیب ہوں، پھر بھی سکوں نصیب نہیں   قرار میں بھی ہے اندیشۂ قرار مجھے
وہاں تو ایک ہی انداز ہے ہر لحظہ جلووں کا   وہاں یکساں فضائے نور و ظلمت ہے جہاں میں ہوں
محبت ہے کہ تسکینِ دل و جاں ہوتی جاتی ہے   جسے میں کفر سمجھا تھا، وہ ایماں ہوتی جاتی ہے
ٹوٹا نہ کاروانِ محبت کا سلسلہ   ہارے تھکے سب ایک ہی منزل میں آ گئے
آدابِ بزمِ ناز کی مجبوریاں نہ پوچھ   کہنے کی بات بھی نہ زباں سے کہی گئی
مکاں سے لامکاں تک سلسلہ ہے جلوہ گاہوں کا   ہے یہ بھی معجزہ اہلِ محبت کی نگاہوں کا

یہ سرگزشت زخمِ جگر ہے کہ اے کلیمؔ
کچھ پھول کھل رہے ہیں بہار و خزاں سے دور

دوسرا رُخ :-

اعلیٰ ہمارا خطۂ گجرات ہے کلیمؔ!   لیکن سکونِ ذوقِ طبیعت کہاں سے لائیں   (صفحہ ۲۴)

مصرعہ اولیٰ میں "اعلیٰ" کس قدر اکھڑا اکھڑا لگتا ہے ——— شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ ہمارا خطہ گجرات بڑا شاداب خطہ اور دل چسپ قطعہ ارض واقع ہوا ہے مگر اس سے لطف اٹھانے کے لئے پُرسکون طبیعت کہاں سے لائیں ——— کیا یہ شعر اس مفہوم کی کماحقہٗ ترجمانی کرتا ہے؟

کم نہیں یہ بھی کہ سازِ دہر پہ   ہم نے اپنا گیت گایا تو سہی   (صفحہ ۲۷)

آخر یہ بات کیا ہوئی؟ بہت ہی سطحی شعر ——— سازِ دہر کی کیا یہ خصوصیت ہے کہ اس پر دوسروں کے ہی گیت گائے جاتے رہیں!

تنہائی ان کی فطرت ہے، آزادی اُن کا شیوہ ہے
یہ بات نہ ہوتی تو طائر شاخوں پہ سکونت کیوں کرتے   (صفحہ ۲۸)

"سکونت" نے پورے شعر کے حسن کو غارت کر دیا "سکونت" سے زیادہ اچھا لفظ تو "اقامت" تھا!

خود آگے پوچھ لیتے ہیں وہ میرے دل کا حال   کتنا خلوص رکھتی ہے تخمینِ ذہن کی موج   (صفحہ ۲۹)

"تخمینِ ذہن کی موج" کیا ہوتی ہے؟ شعر میں ایسا ابہام پایا جاتا ہے، جس کی سرحد "اہمال" سے جا ملتی ہے۔

ہر نفس کو اپنی منزل کا پتہ ملتا نہیں   جو جہاں ٹھہرا، وہیں اک کارواں بنتا گیا   (صفحہ ۳۰)

"جو جہاں کھڑا ہے کے تیور بتاتے ہیں کہ مصرعہ اولیٰ میں "بر نفس" بر "متنفس" کے معنی میں استعمال ہوا ہے، مصرعہ اولیٰ میں جو دعویٰ کیا گیا ہے، اس کے لئے ثبوت درکار تھا، جو شعر میں کہیں نہیں ملتا۔

کس کو آواز دوں، میں کس کو پکاروں اے دوست | میری آواز میں تو جلوہ گزیں ہے کہ نہیں (صفحہ ۴۲)

آواز میں یار کا "جلوہ گزیں" ہونا ایک اعجوبہ سے کم نہیں!

وہ اپنے ارزوں کو نے کر جب رونقِ محفل بنتے ہیں
اُس وقت نئی جان آتی ہے، اس وقت نئے دل بنتے ہیں (صفحہ ۶۶)

اس قسم کے اشعار "متاعِ کلیم" کی "جنس کاسد" ہیں!

مجھے یاد ہے کہ ہمدم میں جہاں جہاں گیا ہوں | مری رُوح نے ترتیب کر کیا، میرا خیر مقدم (صفحہ ۷۰)

یہ شعر نہیں ہے الفاظ موزوں کا ایک مجموعہ ہے!

جس کو کہتے ہیں ہم نسیمِ سحر | وہ بھی ذوقِ دل و نظر نہ ہوئی (صفحہ ۷۶)

"ذوقِ دل و نظر نہ ہوئی" یہ کہاں کی زبان ہے! اور "نسیمِ سحر" کو "ذوقِ نظر" سے کیا مناسبت ہے؟ کیا "نسیمِ سحر" کا نظارہ کیا جا سکتا ہے یہ کیا کہ جو خیال ذہن میں آیا، اسے منظم کر ڈالا۔

شورشِ ذوقِ التفات کہاں | بجھ گیا دل، تو پھر حیات کہاں (صفحہ ۱۳۱)

مصرعہ اولیٰ میں بس الفاظ جوڑ دیئے گئے ہیں ——— "ذوقِ التفات" سے یہاں آخر کیا مراد ہے! اور اس "التفات" کی نسبت کس سے ہے؟ پھر ذوقِ التفات کی "شورش" اور زیادہ عجیب ہے! شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ دل کے بجھ جانے سے، زندگی اور زندگی کے ہنگاموں سے کوئی دلچسپی اور لگاؤ نہیں رہا۔ ——— مگر اس خیال کو ادا کن لفظوں میں کیا ہے؟

ہستی سے اجتناب کئے جا رہا ہوں میں | یہ خواب، عینِ خواب کئے جا رہا ہوں میں (صفحہ ۱۵۷)

مبہم نہیں مہمل شعر!

رگ رگ حیات ذوقِ نظارہ سے بھر گئی | دیکھا کئے انہیں کو جہاں تک نظر گئی (صفحہ ۱۶۳)

مصرعہ ثانی کا تو غالباً کسی شاعر کے مشہور مصرعہ سے توارد ہو گیا ——— اور مصرعہ اولیٰ گورکھ دھندے کے سوا اور کچھ نہیں!

وہ کیوں نہ ہستی پہ اے دوست اپنی ناز کرے | جسے خدا شرفِ غم سے سرفراز کرے (صفحہ ۱۶۴)

"ہستی" کی "ی" ناگوار حد تک دب رہی ہے، دوسرا مصرعہ جتنا جاندار ہے، پہلا مصرعہ اتنا ہی پھُس پھُسا ہے، "اے دوست" کی اس شعر میں کوئی ضرورت ہی نہ تھی!

المکاتیب الاعظمیہ الجزء الاول

تالیف:- محمد حسن الاعظمی، ضخامت ۲۸۲ صفحات، قیمت تین روپے آٹھ آنے
ملنے کا پتہ:- مکتبہ اعظمیہ، گاندھی گارڈن، کراچی۔

اس کتاب میں عربی کے وہ خطوط درج کئے گئے ہیں جو مسلم ممالک کے مشاہیر نے (غالباً) فاضل مؤلف کو لکھے ہیں۔ ان میں سے بعض مکاتیب تین چار سطروں کے بھی ہیں اور بعض خاصے طویل ہیں؛ بعض خطوط میں عربیت اور ادبیت پائی جاتی ہے، جن کے مطالعہ سے خطوط نویسی اور اظہارِ مطلب کا سلیقہ پیدا ہوتا ہے۔

اسی کتاب کے دوسرے حصہ (قیمت تین روپیہ چار آنے) میں مشاہیر کے مکاتیب کے علاوہ عربی زبان و ادب کے

نثر پارے" جمع کئے گئے ہیں جن کا مطالعہ ہر اعتبار سے مفید ہے!

یہ دونوں کتابیں عربی زبان و ادب کا ذوق رکھنے والوں کو یقیناً پسند آئیں گی؛ اور عربی کے طالب علموں کی انشا پردازی میں ان کتاب کے مطالعہ سے جلا پیدا ہو گی۔

انقلاب اسلام (پہلی جلد) از:- عمرآن انصاری، ضخامت ۱۳۶ صفحات (مجلد خوب صورت گردپوش، بڑا سائز)، قیمت:- دو روپیہ بارہ آنے ملنے کا پتہ:- پٹیل پبلیکیشنز پرشوتم بلڈنگ ۱۲ تربھون روڈ بمبئی ۴

جناب عمرآن انصاری ایک با حمیت اور غیرت مند شاعر ہیں۔ جن کا قلب اسلامی جذبات سے لبریز ہے۔ یہی جذبات شعر کے سانچے میں ڈھل کر ایک مستقل کتاب بن گئے ہیں! "انقلاب اسلام" ایک ولولہ انگیز مسدس ہے، جس میں جوش اور رجائیت پائی جاتی ہے۔

عمرآن انصاری نے علامہ اقبال کے "شکوہ" پر احترام و عقیدت کی حدوں میں رہ کر تنقید کی ہے، وہ لکھتے ہیں:-

"........ ورنہ یہی نوعیت اس وقت ڈاکٹر اقبال کے ذہن میں آجاتی تو وہ یقیناً اللہ سے ہرگز شکوہ نہ کرتے بلکہ نفسِ انسانی کو موردِ الزام قرار دیتے ...."

"انقلاب اسلام" کے دو بند ہیں:-

شمع فاران و حرا کا وہ سماں صلِّ علیٰ | نورِ ہی نور کا دریا تھا رواں صلِّ علیٰ
ذرہ ذرہ تھا دل کا ہکشاں صلِّ علیٰ | سُرمہ سُرمہ تھا ہر اک کوہِ گراں صلِّ علیٰ

زمزمے چشمۂ زمزم سے اُبل پڑتے تھے
دل میں جاں دینے کے ارمان مچل پڑتے تھے

وہ صداقت کے لئے جذبۂ صدیقِ صدیق | حق کی خاطر وہ خدیجہؓ کی نگاہِ تحقیق
کرم اللہ تعالیٰ وہ علیؓ کی تصدیق | پھر خدائی تھی کہ آئی گئی حسبِ توفیق

نورِ حق پھیل گیا جہل کی تاریکی میں
ہر نظر تیر گئی دین کی باریکی میں

کاش! پورے مسدس میں یہی رنگ قائم رہ سکتا۔ مگر نہیں رہ سکا، کسی بند کی ٹیپ جاندار ہے تو شروع کے دو شعر کمزور ہیں، کسی بند کے ایک دو مصرعے اچھے ہیں تو ٹیپ میں کوئی جان نہیں! بعض مقامات پر تو مشقوں کا سا انداز پایا جاتا ہے۔

کل جو بویا تھا وہی کاٹ رہے ہیں ہم آج | دانے دانے کو ہوئے اپنے ہی کرموں محتاج (صفحہ ۳۰)

اس شعر میں "کرموں" نے شعریت کو غارت کر دیا۔ اسی بند کا تیسرا مصرعہ ہے:-

دین و دانش کی نفی کی، تو لدے رسم و رواج

دین و دانش کی نفی کی ــــــــ اور "لدے رسم و رواج" یہ کس قدر بے مزہ اندازِ بیان ہے۔

صفحہ ۳۲ پر ایک بند کی ٹیپ ہے:-

جن کی نسبت سے شرفِ خلق میں پایا ہم نے | پیرِ مسلماں سے ہی بغاوت کا اٹھایا ہم نے

دوسرا مصرعہ زبان اور پیرایہ بیان کے اعتبار سے کس قدر کمزور اور بے کیف پھسپھسا ہے۔

نفس نے خوار کیا، منصب سلطانی سے نفس سے آج نظر آتے ہیں ہم فانی سے (صفحہ ۲۹)

بیگانۂ انداز بیان ——— یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ نفس نے منصبِ سلطانی سے گرا دیا، مگر " منصب سلطانی سے خوار کیا " یہ کہ... کی زبان ہے، اور پھر :-

نفس سے آج نظر آتے ہیں ہم فانی سے

شاعری کے ساتھ مذاق نہیں تو اور کیا ہے۔

نفس کا دین نہیں، آئین نہیں دستور نہیں نفس جو کچھ بھی نہ کر جائے تو کچھ دور نہیں (صفحہ ۳۱)

مصرعہ ثانی پڑھ کر وجدان کو کس قدر انقباض ہوتا ہے۔

یہ نہیں ہے کہ خدا جلوہ دکھاتا ہی نہیں بعدِ خود ہم کو خدا بھی نظر آتا ہی نہیں (صفحہ ۳۲)

اس طرح لفظوں کو موزوں کر دینا شاعری تو نہیں ہے۔

رمزِ رحمت حرکت میں ہے یہی یاد نہیں جو عمل کرتے ہیں انکی کہاں امداد نہیں (صفحہ ۳۹)

"حرکت میں برکت ہے" یہ تو زبان کا محاورہ ہے مگر حرکت میں " رمزِ رحمت " کا ہونا یہ پیرایۂ بیان ہی نا آموزوں کا سا ہے
دوسرا مصرعہ شاعری کی توہین ہے ——— توبہ!

کہیں کرگس، کہیں شاہیں، کہیں شہباز بھی ہیں نئے اقدام پہ آمادۂ آغاز بھی ہیں (صفحہ ۴۵)

"نئے اقدام" پر "آمادۂ آغاز" ہونا" یہ کیا بات ہوئی! " اقدام " کے ساتھ " آغاز " وہی شخص استعمال کر سکتا ہے، جو " اقدام " کے معنی سے بے خبر ہو۔

مُفت خوری کی بُری لت بھی پڑی جاتی ہے بے حیائی ہے کہ محنت سے حیا آتی ہے
اُنکے پاس آتے ہوئے روزی بھی شرماتی ہے یہ تو کیا کھاتے ہیں، وہ خود ہی انہیں کھاتی ہے
اپنے ہر لقمہ کا خود لقمہ بنے جاتے ہیں
دل میں پھولے نہ سماتے ہیں تنے جاتے ہیں (صفحہ ۴۸)

یہ "تک بندی" کے سوا اور کیا ہے! اس قسم کے متعدد بند اس کتاب میں ملتے ہیں۔

اپنی دنیا کا ہر اک کام بنا لیتے ہیں ذکرِ عقبیٰ کا جو آئے تو اڑا دیتے ہیں (صفحہ ۵۰)

اس خیال کو ادا کرنے کے لئے جو پیرایۂ بیان اختیار کیا گیا ہے، وہ کس قدر بے جان اور غیر شاعرانہ ہے۔

ان سے ملنے کے لئے لوگوں میں اوسان نہیں اور تو اور، یہیں خود ایسے مسلمان نہیں (صفحہ ۵۵)

بے چارہ لفظ " اوسان " تو چیخ رہا ہے کہ مجھے کہاں استعمال کر دیا؟

کھینچ کر سُرمہ ہر برقعوں کو تکا کرتا ہے کوئی گر منہ نہ لگائے تو بکا کرتا ہے (صفحہ ۵۹)

سُرمہ آنکھوں میں لگایا جاتا ہے۔ کھینچا نہیں جاتا۔ دوسرے مصرعہ کی پستی کی کوئی حد ہی نہیں!

حال تم ایسا بنا لو کہ تڑپ جائے خدا قسم اللہ کی شہ رگ میں اتر جائے خدا (صفحہ ۶۰)

یوں تو کہہ سکتے ہیں کہ رحمتِ الٰہی تڑپ جائے " مگر " خود اللہ تعالیٰ تڑپ جائے " ایسا کہنا گستاخی ہے! دوسرا مصرعہ بھی پہلے سے کم نہیں... کہ اللہ تعالیٰ کے شہ رگ میں اتر آنے کی تمنا کی جا رہی ہے۔

علم قرآن ہے اُمّت کی قیادت کے لئے — ہم اُسے پڑھتے ہیں مسجد میں عبادت کے لئے (صفحہ ۸۰)

...جد میں قرآن کی تلاوت" کے بغیر نماز ہی نہیں ہو سکتی ——— پھر اس پر یہ طنز کیوں؟ جو الٹم غلٹم خیال ذہن میں آیا، ...نظم کر کے چھوڑا ——— توبہ!

ہم صحیح دین کی تعلیم سے محروم بھی ہیں — اس کمی ہی سے تو بے معنی و مفہوم بھی ہیں (صفحہ ۸۱)

...ع میں صحیح کی "ح" گر گئی، شاعر نے "صحیح" کو بر وزن "سہی" نظم کیا ہے، مصرعہ ثانی مہمل ہے!

موت سے پہلے ہر اک فرض بجانا ہوگا — بھولے بھٹکوں کو رہِ حق بھی دکھانا ہوگا (صفحہ ۸۴)

...رض بجالانا" روزمرہ ہے، "فرض بجانا ہوگا" سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فرض بھی ڈھول تاشے کی طرح کوئی چیز ہے جو بجائی ...ی ہے ——— "راہ" مذکر نہیں مونث ہے!

دھوم مچ جائے خدائی میں خدا کے گھر کی — یعنی دنیا میں نظر آئے ادا محشر کی (صفحہ ۹۲)

...ر کی بھی کوئی "ادا" ہوتی ہے — کچھ لفظ ذہن میں آئے، اور انہیں جھٹ سے جوڑ دیا!

جو بھی کہتے بصد آداب کہا کرتے تھے — تا بہ بانِ ربّ الارباب کہا کرتے تھے (صفحہ ۱۱۹)

...بّ الارباب" کی "ب" مشدد ہے، اس شعر میں "رب لارباب" جس انداز میں نظم ہوا ہے، وہ شاعر کی کم علمی کا راز فاش کرتا ہے

ایک دُنیا تھی کہ تسخیر ہوئی جاتی تھی! — دینِ فطرت کی عناں گیر ہوئی جاتی تھی (صفحہ ۱۳۰)

...عر نے اگر غالب کا یہ مطلع پڑھا ہوتا۔

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا — آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

...و "عناں گیر" کا غلط استعمال نہ کرتا! "عناں گیر" روکنے والے کو کہتے ہیں، اور یہاں "غاشیہ بردار" کے معنی میں یہ لفظ استعمال کیا ...ہے۔

ارتقائے بشری کی یہ ہے اک زندہ مثال — آب و گِل چمن کی ظاہر ہوا صورتِ زُلال (صفحہ ۱۳۶)

...ری کے ساتھ انتہائی دردناک مذاق۔ لاحول ولاقوۃ۔

ملنے اللہ سے یہ نیاز بھی ہے ناز بھی ہے (صفحہ ۱۴۰)

...و کتنی بے خبری کی کہ شاعر کو "نیاز" کا وزن اور تلفظ بھی معلوم نہیں ہے!

جناب عمرانؔ انصاری کا خلوص، دینی جوش اور قومی درد اپنی جگہ مسلّم ہے مگر افسوس ہے کہ انہیں شعر گوئی اور زبان و بیان پر قدرت ...ہے، ان کے اس مسدس (انقلابِ اسلام) میں جگہ جگہ جھول اور خامیاں ملتی ہیں، اسی مسدس کے اور تین حصے مُرتب کرنے کا وہ عزم ...تے ہیں — اُن کی خدمت میں ہمارا مشورہ اور گزارش یہ ہے کہ وہ دو چار سال شعر گوئی کی مسلسل مشق کے بعد اس ...س کے سلسلہ کو شروع فرمائیں، ورنہ "انقلابِ اسلام" کے دوسرے حصوں کا بھی یہی رنگ رہا، تو اُن کی شہرت کم ہوگی اور تشہیر زیادہ!

...تِ دو عالم ؐ

مرتبہ:- قاری احمد صاحب۔ ضخامت ۱۷۶ صفحات (مجلد، گرد پوش کے ساتھ) قیمت:- دو روپیہ۔
ملنے کا پتہ:- محمد سعید اینڈ سنز، قرآن محل، مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی۔

اس کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس سوانح حیات عام فہم زبان میں مدون کئے گئے ہیں، "ارشاداتِ نبوی" ...کتاب کا سب سے زیادہ اہم باب ہے، یہ تمام احادیث حرزِ جان اور زندگی کا نظام العمل بنائے جانے کی مستحق ہیں۔

"پتھر پر چلتے وہ نرم ہو جاتا۔ اور ریت پر چلتے تو سخت ہو جاتا۔" (صفحہ ۱۰) حضورؐ کے اس معجزہ کا ہمیشہ ظہور میں آنا محل غور ہے ——— صفحہ ۱۴۲ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تلوار کا نام "بتار" لکھا ہے، غالباً کتابت کی غلطی کے سبب "بتار" کی بہ صورت ہو گئی ——— اسی طرح صفحہ ۲۴، پر "ثرید" کو "شرید" پڑھنا پڑا۔ ——— "جمہوری طریقہ کو ختم کرکے شہنشاہی کی ابتدا امیر معاویہؓ نے اسلام میں جاری کی۔" (صفحہ ۱۸۲) ——— "ابتدا کا جاری کرنا" یہ کیا انداز بیان ہے "ابتدا کی" لکھنا چاہیے تھا!

جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات (جلد دوم، حصہ دوم)

از:- جناب اسرار احمد آزاد
ضخامت:- ۴۰۰ صفحات

(مجلد، گرد پوش کے ساتھ) قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے، ملنے کا پتہ:- مکتبہ برہان اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔

یہ کتاب "بین الاقوامی سیاسی معلومات" کی انسائیکلو پیڈیا ہے، جس میں بین الاقوامی سیاسیات کے منصوبے، تجاویز، دفعات، محاربات، اجتماعات، تحریکات، نظریات، معاہدات اور اعلانات ملتے ہیں!

اردو میں اس موضوع پر اپنے طرز کی یہ منفرد کتاب ہے جو کتابت و طباعت کی تمام خوبیوں کے ساتھ منظر عام پر آئی ہے، اردو اخبار نویسوں کے لئے خاص طور سے یہ کتاب بڑے کام کی چیز ہے، یہ کتاب ان کے مطالعہ میں رہنی چاہیے۔

"کولمبو پلان کیا ہے؟ الاٹمک انرجی کمیشن کس سنہ میں مقرر ہوا تھا؟ بینکنگ ایکٹ کیا چیز ہے؟ Exchange Rate کسے کہتے ہیں؟ "سول وار آف اسپین" کی کیا تفصیلات ہیں؟ W. F. T. U کس عبارت کا مخفف ہے؟ اس قسم کی سینکڑوں سیاسی معلومات اس کتاب میں ملتی ہیں!

مکتبہ برہان (دہلی) نے بڑے کام کی کتاب شائع کی ہے، جس کے لئے ناشر اور مصنف دونوں قابلِ مبارکباد ہیں!

قادیانی قول و فعل (حصہ دوم)

از:- پروفیسر محمد الیاس برنی مرحوم، ضخامت ۱۹۲ صفحات (یہ کتاب مفت ملتی ہے، البتہ محصول ڈاک کے لئے ہندوستانی بیس پیسے کے ٹکٹ بھیجنے ضروری ہیں)

ملنے کا پتہ:- بیت سلام، سیف آباد، حیدرآباد دکن (آندھرا، بھارت)

یہ کتاب مولانا محمد الیاس برنی مرحوم نے اپنی زندگی میں تبصرے کے لئے بھیجی تھی، مگر افسوس ہے کہ اس پر تبصرے کی اس وقت نوبت آرہی ہے، جب کہ وہ اس دنیا میں نہیں رہے!

پروفیسر الیاس برنی مرحوم کا یہ کارنامہ آخرت میں ان کے لئے نجات کا ذریعہ اور مغفرت کا وسیلہ بن جائے گا کہ انھوں نے قادیانی لٹریچر سے پوری دیانت کے ساتھ اقتباسات پیش کرکے دنیا کو بتا دیا کہ "قادیانیت" کیا ہے؟

اس کتاب میں بھی انھوں نے قادیانیوں کے لٹریچر ہی کے اقتباسات مستند حوالوں کے ساتھ پیش کئے ہیں۔ مثلاً رسالہ ریویو آف ریلیجنز قادیان بابت مئی ۱۹۲۷ء کے حوالے سے لکھا ہے:-

"حضرت مرزا صاحب کی تمام تکالیف مثلاً دورانِ سر، دردِ سر، کمی خواب، تشنج دل، بدہضمی، اسہال، کثرت پیشاب اور مراق وغیرہ کا صرف ایک ہی باعث تھا اور وہ عصبی کمزوری تھی۔"

لفٹنٹ گورنر بہادر صوبہ پنجاب کو مرزا غلام احمد نے ایک درخواست ۲۴ر فروری ۱۸۹۸ء کو دی تھی، اس میں لکھا تھا۔

"غرض یہ ایک ایسی جماعت ہے جو سرکار انگریزی کی نمک پروردہ اور نیک نامی حاصل کردہ ہے۔"

تریاق القلوب کے صفحہ ۱۵ پر مرزائے قادیان نے تحریر کیا ہے -
"میری عمر کا اکثر حصہ اس سلطنت انگریزی کی تائید اور حمایت میں گزرا ہے"۔

اور

۱۰ نومبر ۱۹۰۱ء کو ایک اشتہار مرزا غلام احمد قادیانی نے چھپوایا جس کا ایک اقتباس یہ ہے :-
"جس گورنمنٹ کی اطاعت اور خدمت کی نیت سے ہم نے کئی کتابیں مخالفتِ جہاد میں لکھیں، اور گورنمنٹ کو اب تک معلوم نہیں کہ ہم دن رات کیا خدمت کر رہے ہیں"۔

"قادیانی قول و فعل" کے صفحہ ۶۹ کے ایک اقتباس سے یہ انکشاف ہوا کہ مرزائے قادیان نے انگریزی حکومت میں مظلوم مسلمانوں کی مخبری کا فرض بھی انجام دیا ہے -

"قادیانی قول و فعل" کو پڑھ کر "عقیدہ ختم نبوت" میں اور زیادہ پختگی اور "خود ساختہ نبوت" سے اور زیادہ بیزاری پیدا ہوتی ہے! ایک مسلمان کی غیرت حضور "خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی بھی قسم کی "نبوت" کو برداشت کر ہی نہیں سکتی، یہ کوئی فرقہ وارانہ نزاع نہیں ہے بلکہ جمہور اُمت کا یہی عقیدہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر اللہ تعالیٰ نے نبوت کو ختم فرما دیا کہ اور اب قیامت تک کوئی نیا نبی مبعوث نہیں ہوگا۔ (نحن نصلی علی من قال " لا نبی بعدی")

رکن :- انجمن ادبی رسائل پاکستان

ماہنامہ

فاران

کراچی

جولائی ۱۹۵۹ء | جلد ۱۱ | شمارہ ۴ | ایڈیٹر ماہر القادری

سالانہ چندہ چھ روپے

فی پرچہ آٹھ آنے

ترتیب

مقامِ اشاعت: دفتر فاران، کیمبل اسٹریٹ، کراچی، نمبر ۱

مطبع سعیدی قرآن محل کراچی

پرنٹر پبلشر:- مسرور حسین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نقشِ اوّل

"فاران" کی دس سالہ زندگی، اس کے پچھلے فائل اور گزشتہ شمارے اس کے گواہ ہیں کہ ہم نے بھارت کے داخلی مسائل اور اندرونی معاملات پر تنقید و احتساب سے عام طور پر گریز کیا ہے۔ اور جب کبھی کچھ لکھا ہے تو حزم و احتیاط کے ساتھ نرم لہجہ، مصلحت جویانہ انداز — پیرایہ بیان ایسا کہ لفظوں میں ذرہ برابر اضافہ نہ ہونے پائے۔ "توڑنے" کے مقابلہ میں "جوڑنے" کو ترجیح، نزاع وجدال کے مقابلہ میں صلح و آشتی کی تلقین، کوئی چیلنج نہیں، کوئی تعلّی نہیں، سیاسی زبان اور مبالغہ آمیزی سے سو فیصدی اجتناب! صرف حقائق کا اظہار! بھارت اور اس کے لیڈروں پر کوئی تہمت نہیں جوڑی، کسی غلط بیانی سے کام نہیں لیا، ان کی شان میں کوئی ایسی بات نہیں کی جس پر سوءِ ادبی کا اطلاق ہو سکے!

ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جن کے دل میں کچھ ہوتا ہے اور زبان و قلم کچھ اور ظاہر کرتے ہیں، ہمارے دین نے اس نفاق کی تعلیم نہیں دی، ہم ڈنکے کی چوٹ اس کا اعلان کرتے ہیں کہ "وحدتِ ادیان" کا نظریہ سو فیصدی غلط اور انتہائی گمراہ کن ہے، ہم زنار و تسبیح کی تفریق کو بھی مانتے ہیں اور بت خانہ و حرم اور کفر و اسلام کے امتیاز کو بھی تسلیم کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ:-

"الخلق عیال اللہ"

پر بھی ہمارا ایمان ہے — اس پر کہ "تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے" یہ ہمارے نبیؐ کا فرمان اور ہمارے دین کی تعلیم ہے، یہی حقیقت بلبلِ شیراز کی زبان پر :-

بنی آدم اعضائے یکدیگر اند

بن کر گویا ہوئی ہے! کفر و اسلام کے امتیاز و تفریق کے باوجود ہماری نگاہ میں "عام انسانی حقوق" کی بہت بڑی اہمیت ہے، بے دینی کوئی شک نہیں بہت بڑی بے توفیقی، بے دانشی اور غلط کاری ہے، مگر یہ بھی کسی کو انسانیت کے دائرے سے باہر نہیں کرتی: انسانی اخوت کا ہر حالت میں احترام کیا جائے گا، اسلام کسی ملحد اور کافر پر بھی ظلم و زیادتی کی اجازت نہیں دیتا اور اس کی نگاہ میں مظلوم کی آہ عرشِ اعظم کو ہلا دیتی ہے چاہے وہ مظلوم کافر و بے دین ہی کیوں نہ ہو!

ہم جس خدا کو مانتے ہیں وہ "رب المسلمین" نہیں "رب العالمین" ہے، جس کی ربوبیت ہر امتیاز و تفریق سے بلند ہو کر ہوا، پانی اور روشنی کی طرح عام ہے ہیں —

"تخلقوا باخلاق اللہ"

کی تعلیم دی گئی ہے، اس لیے ایک مخلص اور پکے مسلمان کے برتاؤ، طور طریق، اور کردار و عمل سے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اظہار ہونا چاہیئے اور اس کی شبنمِ کرم سے جگرِ لالہ کو ٹھنڈک ہی نہیں خارِ خس کو بھی طراوت ملنی چاہیئے۔

ادیمِ زمیں سفرۂ عام اوست ÷ برایں خوانِ یغما چہ دشمن چہ دوست

جیسا سماں، تواضع اور کرمِ عام!

ہم جس طرح "ربّ العالمین" کے بندے ہیں، اسی طرح "رحمۃ للعالمین" کے اُمتی اور فرمانبردار ہیں۔ ہمارے نبیؐ کی رحمت سارے عالم کے لئے عام ہے۔ پس وہ مسلمان جس کے دریائے رحمت سے اپنے تو سیراب ہوتے ہوں مگر غیروں کو لب تر کرنے کی اجازت نہو.... اسوۂ نبویؐ کا متبعِ خام، کوتاہ اندیش اور ناقص العمل ہے۔

اسلامی قانون میں "ذمیوں کے حقوق" کا ایک مستقل باب موجود ہے، اس باب پر، اور جہاں جہاں اس قانون کا صحیح استعمال کیا گیا ہے اس پر ہم فخر کرتے ہیں، ہم نے پچاس سو سال نہیں، صدیوں، کروڑوں انسانوں پر حکومت کی ہے، اور دنیا جانتی ہے کہ ہمارے اسلام پسند حکمرانوں نے غیر مسلم رعایا کے ساتھ کتنا شریفانہ برتاؤ اور منصفانہ سلوک کیا ہے: ہماری تلواروں نے بے شک ملک فتح کیے ہیں، مگر ہمارے سلوک اور برتاؤ کو دیکھکر مغلوب و مفتوح رعایا نے ہمیں قاہر و جابر فاتح نہیں بلکہ رحمت کا فرشتہ سمجھا ہے! تاریخ بتاتی ہے کہ ہمارے لشکروں کا غیروں نے مسرت و شادمانی اور انشراحِ قلب کے ساتھ خیر مقدم کیا ہے ـــــ یہ سمجھ کر کہ یہ تلواریں ان کے جان و مال اور عزت و آبرو کی محافظ ہیں ان کی حکومت میں کسی پر ظلم و تعدی نہیں کی جائے گی۔ اور یہ غازیانِ صف شکن امن و سلامتی کے پیغامبر ہیں۔ زمین کے ذرّے اور آسمان کے تارے اس کے گواہ ہیں کہ ان کا یہ حسنِ ظن مجروح نہیں ہوا، تجربہ اور برتاؤ کے بعد غیر مسلم مفتوحین نے مسلم فاتحوں کو "حسنِ ظن" سے بہتر ہی پایا۔

ہمارے دین میں جبر و اکراہ بھی نہیں ہے، صاف طور پر کھول کر بیان کر دیا گیا ہے کہ:-

"لا اکراہ فی الدین، قد تبیّن الرشد من الغیّ"

دین خوشی کا سودا اور اطمینانِ قلب کا معاملہ ہے، جس کا دل اسلامی تعلیمات پر مطمئن ہو جائے، وہ اسے قبول کر سکتا ہے اسے کسی پر زبردستی مسلط نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان میں مسلمانوں نے کئی سو سال تک حکومت کی ہے، اگر وہ جبر و اکراہ سے کام لیتے تو مسلم اور غیر مسلم کا تناسبِ آبادی، موجودہ تناسب کے برعکس ہوتا۔ انڈونیشیا اور چین کی روشن مثالیں دنیا کے سامنے ہیں کہ ان ملکوں میں کوئی فوج کشی اور کسی قسم کی معرکہ آرائی نہیں ہوئی، یہ کروڑوں انسان رضا و رغبت کے ساتھ اسلام کے دائرے میں داخل ہوئے ہیں

اقلیت کے ساتھ ہمارا سلوک اور....؟

گزری ہوئی تاریخ اور کتابوں میں لکھے ہوئے واقعات کا ذکر کیوں چھیڑیے، جب کہ پاکستان کی زندہ تاریخ اور بولتی ہوئی شہادت موجود ہے۔ یہاں کراچی میں سنہ ۱۹۴۸ء کے آغاز میں ایک فساد ضرور ہوا تھا۔ جسے اس وقت کی صوبائی حکومت نے بڑی سختی کے ساتھ دبا دیا۔ فسادی مسلمانوں کی پشت پناہی تو ایک طرف رہی، پولس نے ان کے ساتھ نہ تو کسی قسم کی رعایت کی اور نہ درگزر اور چشم پوشی سے کام لیا۔ اس احتساب اور دار و گیر میں اس قدر شدت برتی گئی کہ جس مسلمان پر کسی مفسد اور شر انگیز کی ذرا سی اعانت کا شبہ بھی ہوا اسے دھر لیا گیا۔ کتنے ہی مسلمانوں کو صرف شک کی بنا پر ہفتوں جیلخانہ میں محبوس رہنا پڑا۔ مظلوم ہندوؤں کی پوری حفاظت اور دلدہی کی گئی!

حکومت خلوص و نیک نیتی کے ساتھ کسی شورش اور فساد کو دبانا چاہے تو معاملہ طول ہی نہیں کھینچ سکتا۔ فساد رونما ہوتے ہی مفسدوں کی گردنیں ناپ دی جائیں اور شورش پسندوں کو بند کر دیا جائے، پھر یہ فتنہ پاؤں پھیلانے نہیں پاتا، اور اگر کہیں کی حکومت کی نیت میں فساد ہو اور وہاں کی پولس شورش پسندوں کو شہ دیتی ہو تو پھر اس جگہ کی مظلوم اقلیت پر جو قیامت بھی ٹوٹ پڑے کم ہے!

ہم پاکستانی مسلمان اپنے سرِ افتخار کو اونچا کر کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری حکومت نے کسی فسادی مسلمان کی پشت پناہی نہیں کی؛ ہماری پولس نے کسی مظلوم غیر مسلم کے ساتھ برا سلوک نہیں کیا، ہمارے عوام اور لیڈروں نے پاکستانی ہندوؤں سے حکومت کی وفاداری

کا بار بار ثبوت طلب کر کے انھیں خوفزدہ اور ہراساں نہیں بنایا۔ ان کو اس طرح کی دھمکیاں نہیں دیں کہ پاکستان میں رہنا ہے تو چوٹیاں، کٹوانی ہوں گی اور جنیوا اتار دینے ہوں گے۔ پاکستان میں رہ کر غیر ملک بھارت کے متھرا بندرابن، اجودھیا اور بنارس جیسے پوتر استھانوں کی طرف دیکھنا چھوڑ دو اور اسلامی تہذیب کو اپنا شعار بنالو!

ہمارے یہاں کے کسی اخبار نے، رسالہ نے، کسی مصنف نے، کسی شاعر اور لیڈر نے ہندوؤں کے کسی پیشوا اور رشی منی کی شان میں حقارت کا کوئی کلمہ یا بے ادبی کا کوئی جملہ نہیں کہا۔ پاکستان میں ہندوؤں کو اکھاڑنے یا انھیں ذلیل و پامال کرنے کی کوئی سکیم نہیں بنائی گئی جس زمانے میں "اسلامی دستور" کی مہم جاری تھی، اس زمانے میں مسلم علماء، اور دانشوروں نے ہندوؤں کو مطمئن کرنے کے لئے اسکا اعلان کیا کہ کتاب و سنت کی صحیح بنیادوں پر جو اسلامی حکومت قائم ہوگی، وہ غیر مسلموں کے لئے آیۂ رحمت ثابت ہوگی۔ یہ حکومت ان کے حقوق کی پوری پوری حفاظت کرے گی۔

پاکستان کی حکومت اور یہاں کی مسلم اکثریت نے غیر مسلم اقلیت کے ساتھ انتہائی شریفانہ سلوک کیا ہے، نہ کوئی دھمکی، نہ کسی قسم کا دباؤ، نہ کوئی چھیڑ چھاڑ، نہ اپنی برتری کا مظاہرہ، نہ دوسروں میں محکومیت و کمتری کا احساس ابھار کر ان کو پست ہمت بنانے کی تدبیریں! ——— مگر ———

ہندوؤں نے اس شریفانہ سلوک اور انسانیت نواز برتاؤ کے مقابلہ میں جو جو کھیل کھیلے ہیں اور جیسی شاطرانہ چالیں چلی ہیں، ان کے تصور سے بڑا دکھ ہوتا ہے، یہ داستان بہت کچھ تلخ و اذیت کوش ہے ——— صرف چند جھلکیاں . . .

پاکستان کا ہندو وزیر (مسٹر منڈل) بے وفائی بلکہ غداری کر کے ایکایکی پاکستان سے بھارت چلا جاتا ہے اور غیر بلکہ معاند حکومت کے سامنے پاکستان کے تمام "راز" رکھ دیتا ہے کہ وہاں کی اقتصادی پوزیشن یہ ہے، فوجی طاقت اتنی ہے اور آئندہ ترقی و توسیع کے منصوبے یہ ہیں ………… !

جس زمانہ میں "دستور سازی" کا کام جاری تھا، تو پاکستانی ہندوؤں نے "اسلامی دستور" کے خلاف باقاعدہ مہم چلائی تھی حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ پاکستان "اسلام" کے نام پر ہی وجود میں آیا ہے۔ اور "اسلام" کی اگر نفی کر دی جائے تو پاکستان کا وجود ہی سرے سے بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے ——— بنگالی اور غیر بنگالی کے فتنہ کو یہاں کے ہندوؤں ہی نے کھڑا کیا ہے، صرف اس لئے کہ اس طرح پاکستان کی سالمیت، وحدت اور یکجہتی پر ضرب لگتی ہے، اور اکثریت کا شیرازہ بکھرتا ہے ——— "مخلوط انتخاب" کی آگ بھی ہندوؤں کی بھڑکائی ہوئی ہے اور اس کے لئے انھوں نے رشوتیں دے کر بعض خود غرض مسلمان لیڈروں کو خریدا ہے۔ اور انکی ہوس جاہ و دولت کی کمزوری سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے!

اردو کے مقابلہ میں بنگلہ زبان کو حریف بنا دینا بھی پاکستانی ہندوؤں کے ذہن مفسد اور دماغ فتنہ پرور کی اپج ہے۔ صرف زبان کے اس مسئلہ کے سبب کتنی تلخیاں پیدا ہوئی ہیں ——— پاکستان کے ہندو لیڈروں نے کلکتہ اور دہلی سے ربط قائم رکھا ہے اور خاص طور سے مسٹر دیسائی کے زمانہ میں انڈیا ہائی کمشنر کے دفتر سے ہدایتیں لی ہیں۔ اور سیاسی مسائل پر مشورے لئے ہیں!

اس واقعہ کو ایک سال بھی نہیں ہوا کہ سندھ میں عمرکوٹ کے ہندوؤں نے وہاں کے مسلمانوں پر منظم ہو کر حملہ کر دیا، اس گھمنڈ پر کہ عمرکوٹ کا علاقہ بھارتی سرحد سے بہت قریب ہے!

مشرقی پاکستان میں حکومت و سیاست اور جاہ و اقتدار کی آڑ میں جتنی غنڈہ گردی ہوئی ہے، اس میں وہاں کے ہندو سیاستدانوں کا بہت کچھ ہاتھ رہا ہے، ان شاطروں نے وہ وہ چالیں چلی ہیں کہ اچھے اچھے کھلاڑیوں کو زچ کر دیا ہے، بساط سیاست پر مہروں کو ٹھیک

طرح جمنے ہی نہیں دیا۔ ہر وقت انتشار، اکھاڑ پچھاڑ، رسہ کشی۔ یہاں تک کہ حکومت کا ایوان بازیچۂ اطفال بن گیا۔ مگر پاکستانی ہندوؤں کے اس معاندانہ طرزِ عمل کے باوجود پاکستان حکومت اور یہاں کے عوام مسلمانوں نے جس عفو و درگزر، شرافت، تحمل اور عالی ظرفی سے کام لیا ہے اس پر ہمیں ملال و شکوہ نہیں، فخر ہے!

جنگِ آزادی اور مسلمان

اس تمہید کے بعد ہم چند تاریخی حقائق کو دہرانا اور ایسے واقعات کو پیش کرنا چاہتے ہیں جو شہرت کے اعتبار سے اپنی صداقت کے لئے کسی ثبوت و برہان کے محتاج نہیں ہیں!

اوپر کہا جا چکا ہے کہ مسلمانوں نے کم و بیش ایک ہزار سال ہندوستان میں حکومت کی ہے، مگر انھوں نے دین کے معاملہ میں قطعی جبر و اکراہ سے کام نہیں لیا۔ اگر وہ تلوار کے زور سے اپنا دین نافذ کرتے تو آج بھارت میں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی۔ مسلم حکمرانوں نے پوری طاقت اور غلبہ رکھنے کے باوجود ہندوؤں پر نہ زمین کو تنگ کیا اور نہ روزی کو! عالمگیر اورنگ زیب جس کی مذہبی عصبیت کو بہت کچھ نمک مرچ لگا کر بیان کیا جاتا ہے، اس تک کے دور میں ہندوؤں کے مندروں اور استھانوں کو جاگیریں دی گئی ہیں اور پنڈتوں اور سادھوؤں کے وظیفے اور روزینے مقرر کئے گئے ہیں۔

انگریزی دور میں بھارت کی ہندو ریاستوں میں گائے کا ذبیحہ قانوناً بند کر دیا گیا تھا، مگر مسلم ریاستوں میں ہندوؤں کی کسی مذہبی رسم پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی۔ برطانوی ہند کی سب سے بڑی مسلم اسٹیٹ (حیدرآباد دکن) پر ایک ایسا دور بھی گزرا ہے کہ راجہ چندولال وہاں کے سپید و سیاہ کے مالک تھے، اور اس کے بعد نواب میر عثمان علی خاں کے زمانے میں بھی حیدرآباد اسٹیٹ کا وزیر اعظم ہندو تھا۔ کوتوال شہر ہندو تھا اور نظام کی ذاتی جاگیر ——— صرفِ خاص مبارک —— کی مدارالمہامی کے منصب بلند پر ایک ہندو فائز تھا۔

ہندوستان کی تاریخ کے ان اوراق کو کھولئے، جن میں انگریزی حکومت کے مقابل سیاسی جنگ آزادی کی تفصیل ملتی ہے، بھارت میں "ہوم رول" کی تحریک بھی شروع ہو چکی تھی، کانگریس بھی وجود میں آچکی تھی، اور فیروز مہتا، دادا بھائی نوروجی، بال گنگا دھر تلک اور گوکھلے جیسے محبانِ وطن اور علمبردارانِ حریت بھی پیدا ہو چکے تھے ——— مگر کانگریس میں درحقیقت روح مسلمانوں نے پھونکی ہے، مسلمانوں کی شرکت سے پہلے کانگریس ایک چرخے کی طرح تھی، مسلمانوں نے اپنے نفسِ گرم اور جذبۂ حریت سے اس چرخے کو مشین گن بنا دیا۔

کانگریس کی "نان کوآپریشن" کی تجویز کی تائید میں سرکاری اور نیم سرکاری کالجوں اور اسکولوں کو چھوڑنے والے طلبا ہوں یا سرکاری ملازمتوں کو ترک کرنے والے ملازم، آبادی کے تناسب کے اعتبار سے مسلمانوں کی تعداد نمایاں طور پر سب سے بڑھ چڑھ کر تھی، اور جانی نقصانات میں تو تنہا سرحد کے مسلمان سرخپوشوں کی قربانیاں، ہندوستان کی تمام قوموں کی مجموعی قربانیوں سے زیادہ تھیں۔

انگریزی حکومت کے خلاف جہاں تک تشدد پسند اور دہشت انگیز پارٹیوں اور گروہوں کا تعلق ہے تو ان میں بھی مسلمان شامل تھے، کاکوری ڈکیتی کیس میں لاہری پرشاد بسمل اور دوسرے سرفروش نوجوانوں کے ساتھ اشفاق اللہ نے بھی پھانسی پائی تھی اور بھگت سنگھ کے مسٹر سانڈرس (ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولس) کے قتل کرنے سے بہت پہلے ایک مسلمان لکھیم پور کے انگریز کلکٹر کو ٹھکانے لگا چکا تھا ——— غرض آزادی کی ہر تحریک، پارٹی، جماعت اور گروہ میں چاہے وہ انارکسٹوں کا گروہ ہو یا اہنسا (عدم تشدد) کے معتقدین ہوں، ہندوستان کے مسلمان نہ صرف یہ کہ شریک تھے بلکہ فعال عنصر کی طرح سرگرمِ کار تھے!

ہندوستان کے مسلمان جب کانگریس میں شریک ہوئے ہیں تو اس سے چند سال قبل آرہ، کٹار پور کے خونیں فسادات ہو چکے تھے، جن میں ہندوؤں نے مسلمان عورتوں اور بچوں تک کو خاک و خون میں تڑپا دیا تھا، مگر مسلمانوں نے ان تمام تلخیوں کو بھلا دیا اور آزادی کے جوش میں ان کا اخلاص اس بلندی تک پہنچ گیا کہ سوامی شردھانند جیسے مہاسبھائی لیڈر کو وہ دلی کی جامع مسجد میں لے گئے

اور منبر جس پر اللہ تعالیٰ کی تکبیر بلند ہوتی ہے، اس پر چڑھا کر ان کے وعظ کو سنا۔
مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کی مقبولیت اور ہردلعزیزی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری بھی مسلمانو
چوٹی کے لیڈر تھے۔ مگر ان تمام رہنماؤں نے اپنی شخصیتوں کو مہاتما گاندھی کی ذات میں گم کر کے، انہی کو پیش پیش رکھا۔ آگے بڑھ
سر پر بٹھایا اور گاندھی جی کی رہنمائی قبول کرلی۔
مسلمان بات کا سچا اور قول کا پکا ہوتا ہے، اس کی فطرت نفاق اور دوئی کو قبول نہیں کرتی۔ اسکا تجربہ دنیا نے ہندو
کی جد و جہد آزادی کے زمانہ میں بھی کر لیا ——— وہ اس طرح کہ کانگریس نے جب "ترک موالات" کا ریزولیوشن پاس کر دیا
مولانا محمد علی مرحوم سیدھے علی گڑھ پہنچے۔ اور مسلم یونیورسٹی کے خلاف مورچہ جما دیا، مگر اس کے برخلاف پنڈت مدن موہن مالویہ جی
بنارس پہنچ کر ارشاد فرمایا کہ کانگریس نے ترک موالات کے سلسلہ میں جو تجویز منظور کی ہے، اسکے دوسرے تمام اجزاء سے مجھے اتفاق
صرف اس جزو سے کہ سرکاری اور نیم سرکاری تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کیا جائے مجھے اتفاق نہیں ہے! چنانچہ بنارس ہندو یونیورسٹی
ذرا سی آنچ بھی نہ آئی، مگر مسلم یونیورسٹی کو خاصہ نقصان پہنچا۔ یہاں تک کہ وہ ٹوٹتے ٹوٹتے رہ گئی
یہی پنڈت مدن موہن مالویہ جن کی دورنگی آشکارا ہو چکی تھی، جب کانگریس کے اجلاس میں ہندو مسلم اتحاد اور آزادی پر
تقریر فرماتے ہیں۔ تو مولانا شوکت علی مرحوم فرط محبت سے انہیں پنکھا جھلنے لگتے ہیں ——— مسلمانوں کی بے نفسی، حریت
اور وضع داری کا یہ منظر بھی چشم فلک نے دیکھا ہے کہ بعض علماء نے عماموں کی جگہ گاندھی ٹوپی پہننا شروع کر دی تھی۔ مسلم نوجوانوں
جوش آزادی اور بے تعصبی کا یہ عالم تھا کہ لالہ لاجپت رائے کے انتقال کی خبر سن کر ایک مسلمان نوجوان اس صدمہ سے پاگل دیوانہ
اسی آپس کے میل ملاپ کو بڑھانے کے لئے اور اس اتحاد کو مضبوط تر بنانے کیلئے دو تین سال تک مسلمانوں نے رضاکارانہ طور پر گا
کی قربانی سے اجتناب کیا اور بقرعید پر دوسرے حلال جانوروں کی قربانی کی۔

——— مگر ———

دنیا یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ جس زمانہ میں ہندوستان کے مسلمان، ہندوؤں کے ساتھ میل ملاپ میں بے غرضی، سادگی اور
کی اس حد تک پہنچ گئے تھے، قریب قریب اسی زمانے میں مسلم ملکانوں کو شدھ کیا جا رہا تھا، اور شدھی کی اس تحریک کی روح رواں
سوامی شردھانند جی تھے جنکو مسلمانوں نے دلی کی جامع مسجد کے منبر پر چڑھا کر عزت و احترام کی انتہا کر دی تھی۔
"ترک موالات" کی تجویز جس کے محرک گاندھی جی تھے، اس کی تائید میں ہندوستان کے علماء کی اکثریت نے شرعی فتوی دیا ... آ
کی تحریک میں علماء کرام پیش پیش تھے۔ بہت سوں نے قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں۔ اور طرح طرح کی تکلیفیں جھیلیں، حالانکہ اس زمانہ میں
ودوان اور سادھو اپنے آشرموں اور ودیالاؤں میں لگی سیاسیات سے دور رہ کر دید، رشیوں کو دھرم کی شکشا دے رہے تھے اور دو
رہے تھے مسلم علماء کی طرح ہندو عالموں نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں حصہ نہیں لیا۔ دار العلوم دیو بند کو تحریک آزادی سے بہت کچھ
رہی ہے! یہ مسلم علماء ہی تھے جن کے "ریشمیں خطوط" کی خفیہ تحریک نے انگریزی حکومت کو سخت اضطراب میں مبتلا کر دیا تھا۔ مولانا عبید
سندھی نے ہندوستان کی آزادی کی ہی خاطر روس کا سفر کیا تھا۔ اور برسوں جلا وطنی میں گزر رہے تھے اور مولانا منصور انصاری کی تو س
عظیم کی خاطر قریب قریب پوری زندگی، بیوی بچوں سے دور رہ کر جلا وطنی میں بسر ہوئی اور پردیس ہی میں داعی اجل کو لبیک کہا۔
اس تفصیل سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمان کسی دوسری قوم سے پیچھے نہیں رہے بلکہ ہمو
دوسروں سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے، پس آزادی ملنے کے بعد ہندوستانی مسلمان ذلت نہیں عزت کے مستحق تھے۔

...یس نے کیا کیا؟

ہندوستان کی تحریک آزادی کے دوران میں مسلمانوں نے اس پر غور ہی نہیں کیا انگریزوں کے رخصت ہونے اور آزادی کے مل جانے کے بعد حکومت میں ان کی کیا پوزیشن ہوگی ؟ اور خود حکومت کس طرح تشکیل ...ے گی ؟ وہ تو پورے خلوص اور بے غرضی کے ساتھ آزادی کے نشہ میں سرشار تھے اور یہ دھن لگی تھی کہ کیسے بھی آزادی مل جائے ۔ اور ...یزی پرچم کا منحوس سایہ ہمارے سروں پر نہ رہے ! ملک جب آزاد ہو جائے گا تو وطنی بھائیوں کی طرح سب مل جلکر حکومت کریں گے ، ...ہرو رپورٹ شائع ہونے پر پہلی بار انھیں اسکا احساس ہوا کہ آزادی ملنے کے بعد اکثریت کے سیاسی استیلاء سے ان کا سابقہ پڑے گا ۔ اس ...ان کے بعد اگرچہ چند مسلم لیڈر کانگریس سے الگ ہو گئے مگر مسلمانوں کی اکثریت کانگریس کے ساتھ رہی ۔

جس وقت صوبوں میں ہندوستانیوں کو خود مختاری ملی ہے اس وقت مسلمانوں کے ساتھ کانگریس کی صوبائی حکومتوں نے جو برتاؤ کیا ہے ، ...نے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں کہ آزادی کے اس خواب کی تعبیر تو کچھ اور ہی نکل رہی ہے ، انگریزی حکومت کے ختم ہونے کے بعد حکومت کا یہی ...رہا تو انھیں انگریزوں سے بلاشبہ چھٹکارا مل جائے گا مگر اکثریت کی غلامی کا طوق پہننا پڑے گا ! صوبوں میں کانگریسی حکومتوں کے مسلمانوں ...ساتھ اس تعصب آمیز سلوک کے سبب مسلمان کانگریس سے بددل ہوتے گئے اور مسلم لیگ کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی میں اضافہ ...گیا ! اگر صوبجاتی حکومتوں میں مسلمانوں کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کیا جاتا تو مسلمانوں کی اکثریت مسلم لیگ کی طرف اس طرح ڈھلتی نہ جاتی ۔

جب غیر منقسم ہندوستان کے مرکز میں کانگریس نے حکومت سنبھالی اور محکمہ اطلاعات و نشریات کی وزارت مسٹر ولبھ بھائی پٹیل کو ...تفویض ہوئی تو انھوں نے سب سے پہلا وار ریڈیو کے اردو پروگرام پر ہی کیا ۔ اس چیز نے مسلم لیگ کے رہنماؤں کے اندیشوں کو اور تقویت ...ی اور پاکستان کے مطالبہ نے یہ شدت اختیار کر لی ــــــــ کہ ــــــ

ع موت ٹل سکتی ہے پاکستان ٹل سکتا نہیں

یہاں تک کہ ملک تقسیم ہو کر اور پاکستان بن کر رہا ۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں جو ہولناک خونیں واقعات پیش آئے انھیں دہرا کر اپنے ...وں کو ہم ہرا کرنا نہیں چاہتے ! یہ داستان بڑی ہی دردناک اور تکلیف دہ ہے ۔ ان دنوں غالب کا یہ شعر ـــ

> ہے سامنے اک موجۂ خوں کاش ! یہی ہو
> آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

...زندہ حقیقت بن گیا تھا ....!

تقسیم ہند کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کو جو صدمے سہنے ، دکھ اٹھانے اور ذلتیں برداشت کرنی پڑی ہیں ، ان کو زیادہ سے زیادہ گھٹا ...اور کم کر کے بھی بیان کیا جائے تو بھی ان کی دردناکی ایک حساس دل کو تڑپا دینے کے لئے کافی ہے ــــــــ ان پر ہندوستان سے غداری ...بے وفائی کی تہمتیں لگائی گئیں ، وفاداری کا ثبوت طلب کر کے انھیں ہراساں اور پریشان کیا گیا ۔ ان کو دھمکی دی گئی کہ مکہ اور مدینہ کی طرف ...بھاگ جاؤ یا چھوڑ دو ۔ بھارت میں رہنا ہے تو یہاں کی ہندو تہذیب اختیار کرو ۔ اور یہاں کے ہندو راج ، اجودھیا اور ہردوار کو مقدس و محترم سمجھو ...نکے کی چوٹ کہا گیا کہ بھارت کے مسلمانوں کی کثیر تعداد ہندو سے مسلمان ہوئی ہے اب وقت آگیا ہے کہ وہ پھر اپنے پہلے مذہب کی طرف ...لوٹ جائیں ، چھوٹے چھوٹے گاؤں میں غریب اور بے کس مسلمانوں کو ڈرا دھمکا کر شدھی کیا گیا ۔ ان کی قبروں اور مسجدوں کی بے حرمتی ...کی ، مسجدوں میں مورتیاں رکھی گئیں ، بعض مہاسبھائیوں نے اسرائیلی حکومت کو اپنے تعاون کا یقین دلایا ۔ بلکہ اپنی خدمات پیش کیں ... ...لئے ! اسلام اور مسلمانوں کو کمزور کرنے اور انھیں مٹانے کے لئے !

مسلمانوں کو برباد و تباہ کرنے کے لئے منظم فسادات بھی ہوتے رہے اور اکا دکا حملے بھی ! کوئی مسلمان سودا سلف لینے کے لئے

گاؤں سے کسی قصبہ کی طرف روانہ ہوا، بس وہ پھر لوٹ کر نہیں آیا۔ معلوم ہوا کہ اس کی لاش کسی تالاب یا نہر میں تیرتی ہوئی پائی گئی۔ کوئی
مسلمان کیلوں کا ٹھیلہ لیکر بازار سے نکلا اور اسکول کے ہندو طلبا نے اس غریب کو زدوکوب بھی کیا اور کیلے بھی لوٹ لئے، اس نے پو
کے تھانے میں جاکر داد فریاد کی تو اسے حوالات میں بند کر دیا گیا کہ تم ایسی بے سروپا باتیں کرکے اور اس قسم کی افواہیں پھیلا کر فرقہ وارانہ فسا
کرنا چاہتے ہو ـــــــ "زبردست مارے اور رونے نہ دے" اس کا تجربہ ہندوستانی مسلمان بارہ سال سے کر رہے ہیں ؎

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے
آشیاں جلتا رہا اور بے زباں دیکھا کئے

ہندوستان میں پچاس سو نہیں سینکڑوں ایسے فسادات ہو چکے ہیں کہ خود ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملہ کیا، ان کے مال و اسباب
کو لوٹا، گھروں میں آگ لگائی، عورتوں کو بے آبرو کیا، نہتوں کو زخمی اور قتل کیا۔ اور پولیس نے الٹا ان مظلوموں ہی کو پکڑا۔ اور وہ غریب
مہینوں کچہری کچہری پھرے، قاتلوں، اور غارت گروں سے باز پرس تک نہیں کی گئی۔ شورش پسند اور فسادی آزادی کے ساتھ دندناتے
بلکہ اپنے بہادری کی اپنے بھائی بندوں سے داد لیتے رہے کہ ان "مسلا ملیچھوں" کو ہم نے اس اس طرح ستایا ہے، برباد کیا ہے اور موت
کے گھاٹ اتارا ہے ـــــــ

کوئی شک نہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے دشمن مہا سبھائیوں نے ملک میں فرقہ واریت اور عناد و تعصب کا کافی زہر پھیلا دیا
مگر ہندوستان کی اکثریت کے تمام افراد مہا سبھائی ذہنیت نہیں رکھتے، مہا سبھائیوں اور جن سنگھیوں کی طرح پورا دیس باؤلا نہیں ہو
ہے، حکومت اگر چاہے اور اپنے فرض کو پہچانے تو یہ فتنہ اب بھی دبایا جا سکتا ہے، ابھی پانی سر سے اونچا نہیں ہوا ہے، لیکن چند دن
اسی طرح اور ڈھیل دی جاتی رہی تو پھر حکومت بھی کچھ نہ کر سکے گی اور پھر حکومت پر یا تو کمیونسٹوں کا قبضہ ہوگا یا جن سنگھیوں اور مہاسبھ
کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ڈور ہوگی ـــــــ

اردو زبان کے معاملہ میں بھارت کی حکومت نے جو کھلی ہوئی ناانصافی اور دھاندلی کی ہے، وہ عالم آشکارا ہے، اس بین الاقوا
اور آفاق گیر زبان کو صرف اس لئے مٹایا جا رہا ہے کہ اس کی زد مسلمانوں کے ادب و تہذیب پر آکر پڑتی ہے، اردو کے حامیوں نے جن میں
ہندو اور سکھ بھی شامل ہیں دلیلوں کے انبار لگا دیئے ہیں، مگر.......

واں اِک خامشی تری سب کے جواب میں

بعض سرکاری اسکولوں میں گنیش جی اور گاندھی جی کی مورتیوں کے سامنے مسلم طلبا کو ڈنڈوت کرنے اور اُن پرارتھناؤں میں جن کی
عبارتیں شرک آمیز ہیں مسلمان طالب علموں کو حصہ لینے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے ـــــــ بھارت کے اسکولوں اور کالجوں میں تاریخ
جو نصاب پڑھایا جاتا ہے اس میں مسلمانوں کی تاریخ جان کر مسخ کی گئی ہے ـــــــ گئوکشی کو قانوناً بند کر دیا گیا ہے ـــــــ دفتری
انتخابات اور سرکاری مقابلوں میں مسلمان امیدوار شاذونادر ہی کامیاب ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ دیکھا گیا ہے کہ ان میں سے بعض مسلم
امیدوار یونیورسٹیوں کے امتحانات میں اول آئے ہیں اور بہت سے مضامین میں انھوں نے امتیاز حاصل کیا ہے مگر اتنے ذہین اور ہونہار طا
کو نہ جانے مقابلہ کے امتحانات میں جاکر کیا ہو جاتا ہے کہ ان کی ذہانت صفر ثابت ہوتی ہے یہ "اتفاقات" نہیں ہیں، یہ سب کچھ قصداً ا
اور سوچی سمجھی اسکیم کے تحت کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں پر معیشت کی راہیں بند ہو جائیں، یہاں تک کہ وہ رفتہ رفتہ اچھوتوں کی طرح ذلیل او
بے اثر بن کر رہ جائیں ـــــــ ریاست حیدرآباد دکن کو اسی سکیم کے تحت ٹکڑوں میں بانٹ گیا ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعیت اور مرکزی
پارہ پارہ ہو جائے ـــــــ!

ــــــ اور ــــــ

سب سے بڑی غفلت اور ناانصافی تو ہندوستانی حکومت سے یہ ہوئی ہے کہ مسلمانوں کے آقا و مولا حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی کئی بار توہین کی گئی ہے مگر حکومت نے ان گستاخوں اور انسانیت کے محسن اعظم کی توہین کرنے والوں کو قرار واقعی سزا نہیں دی، یہ وہ زخم ہے جس کی اذیت کا احساس قلب مومن کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ گھاؤ بھرتا ہی نہیں ہے، سدا رستا اور ہرا رہتا ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی تیغ انتقام بے نیام ہو کر فیصلہ کر دے۔

بھارت کی حکومت کی اس پالیسی کو جب شورش پسند دیکھتے ہیں تو ان کی ہمتیں بڑھتی اور حوصلے بلند ہوتے ہیں بلکہ حکومت کی اس پالیسی سے انھیں "اشارہ" (HINT) اور شہ ملتی ہے کہ بھارت میں مسلمانوں کو عزت و آبرو اور اطمینان کے ساتھ نہیں رہنے دینا ہے، ان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ ہوتی رہنی چاہیئے۔ تاکہ وہ جم نہ سکیں۔ پریشان اور بدحواس رہیں، اس طرح بھارت کے بدنصیب مسلمان حکومت اور اکثریت کے دو پاٹوں کے درمیان پسے جا رہے ہیں ــــــ اور ــــــ

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

کا مصداق بن کر رہ گئے ہیں!

ایک طرف یہ ظلم اور زیادتیاں ہیں، دوسری طرف بھارت کے مسلمانوں میں کسی نے آج تک وہاں کی حکومت سے بے وفائی یا غداری نہیں کی، بھارت کا کوئی مسلمان پاکستان کا جاسوس ثابت نہیں ہوا۔ ان کے بعض اکابر نے گئوکشی کے مسئلہ پر ہندوؤں کے نقطۂ نگاہ تک کی صوبائی اسمبلیوں اور میونسپلٹیوں میں تائید کی ہے اور کشمیر کے معاملہ میں بھی ہندوستانی حکومت کے موقف کی تائید میں بیانات دیئے ہیں، مسلم وزیروں نے انتہائی دیانت، وفاداری اور خلوص کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیئے ہیں، مسٹر رفیع احمد قدوائی مرحوم کو جان کر مرکزی حکومت میں سب سے خراب محکمہ دیا گیا تھا، مگر قدوائی مرحوم نے اپنی فراست، ہمت و بصیرت اور انتھک کوششوں سے فوڈ ڈپارٹمنٹ کی ساری ابتری دور کر دی اور اپنی قابلیت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم جو ایک زمانہ میں حکومت الہیہ کے داعی اور ابن تیمیہؒ اور مجدد الف ثانیؒ کے پیغام کے مبلغ تھے، بھارت راج میں شریک بننے کے بعد وہ اس حکومت کے نیاز مند وفادار بن کر رہ گئے تھے، ہر حکم کی تعمیل و اطاعت، حکومت کی پالیسی سے پوری پوری مطابقت ان کے دور وزارت میں کیسی کیسی غلط کتابیں نصاب تعلیم میں داخل ہوئی ہیں، جن میں مسلمانوں کی تاریخ کو مسخ کر کے پیش کیا گیا تھا، مسلم طلبا کو کیسی کیسی مشرکانہ تقریبوں میں حصہ لینے پر مجبور کیا گیا، اردو زبان کے ساتھ کس قدر بے انصافی کی گئی مگر مولانا ابوالکلام آزاد چپ لگائے اور دم سادھے بیٹھے رہے، نہ کوئی اختلاف، نہ کسی قسم کا احتجاج، انگریزی دور حکومت کا مجاہد، ہندو راج میں خاموش تماشائی بن کر رہ گیا تھا۔ جیسے عزیمت ان کے اندر باقی ہی نہیں رہی تھی۔ اور حق و باطل کے امتیاز کی بساط انھوں نے لپیٹ کر رکھ دی تھی

کشمیر کے معرکہ میں بریگیڈیر عثمان نے اپنے لہو سے بھارت راج کی وفاداری بلکہ جاں نثاری کے منشور کو رقم کیا ہے، یہ ہے بھارتی مسلمانوں کے اکابر اور عوام کا حکومت کے ساتھ وفاداری کا عالم، اس کے جواب میں بھارت کی حکومت اور اکثریت کا جو اس بدنصیب وفادار رعایا کے ساتھ سلوک ہے، اس کی چند جھلکیاں پیش کی جا چکی ہیں۔

اعتراف

ہم نے جو کچھ کہا ہے، اور جو آگے چل کر لکھیں گے، اس میں کوئی بات بھی ہم نے نہیں کہی، کسی پر تہمت جوڑنا اور غلط و بے بنیاد باتیں منسوب کرنا ہمارے مذہب میں بہت بڑا گناہ ہے۔ ہم نے کامل احساس ذمہ داری کے ساتھ

حقائق سپردِ قرطاس کئے ہیں! دو قوموں اور دو حکومتوں کے درمیان افواہیں اڑا کر اور شوشے چھوڑ کر تعلقات کو ناخوشگوار بنانا پاپ نہیں
مہا پاپ ہے۔ ایسی رکیک باتیں وہی لوگ کرسکتے ہیں جن کو نہ خدا کا خوف ہو اور نہ بندوں کی شرم ہو!

ہم نے اس مضمون کی تمہید میں کانگریس کا ذکر کیا تھا۔ اس سلسلہ میں اس وضاحت کو ضروری سمجھتے ہیں کہ کانگریس میں بھی نیتا پٹیل،
ٹنڈن اور سمپورانند جیسے نہ پہلے تھے اور نہ اب ہیں۔ مہاتما گاندھی، سی آر داس، سبھاش چندر بوس، راج گوپال آچاریہ، سروجنی نائیڈو اور
خود پنڈت جواہر لال نہرو کی شرافت اور انسانیت دوستی سے کون انکار کرسکتا ہے، گاندھی جی ہندوستان میں کوئی شک نہیں ہندو قوم کی
سیاسی برتری کے تو خواہشمند تھے، اور ایسی خواہش کرنے کا انھیں حق حاصل تھا مگر وہ مسلمانوں کی غارت گری، جلاوطنی، قتل و بربادی اور
بے آبروئی نہیں چاہتے تھے اسی شرافت اور بھلمنساہت کے جرم میں انھیں پستول کا نشانہ بننا پڑا۔ گاندھی جی کے قاتل گوڈسے کی اس
خونخوار ذہنیت کو مہا سبھا اور جن سنگھ نے پروان چڑھایا ہے اور پورے ہندوستان میں اس زہر کو پھیلانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

مسلم لیگ کے فضل الحق جیسے نادان لیڈروں کی نادانیوں کا بھی ہم اعتراف کرتے ہیں، جنھوں نے ڈنکے کی چوٹ فرمایا تھا، کہ
اقلیتی صوبوں میں اگر مسلمانوں پر زیادتی کی گئی تو اسکا انتقام مسلم اکثریت کے صوبوں میں لیا جائے گا، ہمیں اسکا بھی اعتراف ہے کہ غیر منقسم
ہندوستان میں جب پاکستان کا مطالبہ اپنے شباب پر تھا تو بعض مقامات پر مسلم لیگیوں کا جوش اپنے حدود سے تجاوز کرگیا تھا۔ تقسیم ملک
کے بعد سنہ ۴۷ء کے وسط سے لیکر بعد کے چند مہینوں میں مجموعی طور پر مسلمانوں کو بہت زیادہ نقصان پہنچا ہے مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ
مسلم اکثریت کے صوبوں میں ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ بھی زیادتی ہوئی ہے۔ اس مظلومیت کی کثیر مقدار میں جو تھوڑا بہت ظلم شامل
ہوگیا، اس نے قدرت کے انتقام کو روک دیا، تیغ انتقام بے نیام ہوتے ہوتے رہ گئی۔

——— ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ سنہ ۱۹۴۷ء میں اور اس کے بعد جو ہولناک زیادتیاں کی گئی ہیں، اس کے
بارے میں یہ معذرت پیش کی جاتی تھی کہ انگریز نے اپنی شاطرانہ چالوں سے ہندو مسلمانوں کے درمیان جو پھوٹ ڈالدی
تھی اور ملک کی تقسیم نے اکثریت کے طبقہ میں جو برہمی اور ناراضگی پیدا کردی تھی یہ سب اسی کے اثرات ہیں، مگر یہ کیا قیامت ہے کہ بارہ
سال گزرنے کے بعد بھی یہ عتاب اور غم و غصہ کم نہیں ہوا۔ اور جس طرح سنہ ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کو تباہ کرنے کے منصوبے عمل میں لائے
گئے تھے اسی نہج پر اس تباہی اور غارت گری کی تجدید کی جارہی ہے۔

مبارک پور، بھوپال، اور سیتا مڑھی وغیرہ مقامات کے فسادات کو "فرقہ وارانہ" COMMUNAL RIOT! کہنا
اتنا ہی غلط ہے جتنا کسی ڈکیتی کو فرقہ وارانہ فساد کا نام دیدیا جائے۔ ان فسادات میں ہندوؤں نے ایک سوچے سمجھے منصوبہ اور پہلے
سے تیار کی ہوئی اسکیم کے تحت مسلمانوں پر حملہ کرکے ان کے مال و اسباب کو لوٹا ہے، ان کے مکانوں کو جلایا ہے، انھیں ہلاک و زخمی کیا
ان زخمیوں میں بوڑھی عورتیں اور معصوم بچے بھی شامل ہیں، سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ پولس نے قاتلوں، لٹیروں، غارت گروں اور شورش پسندوں
کو پکڑنے اور انھیں دبانے کے بجائے خود مظلوم مسلمانوں پر سختیاں کی ہیں، مسجدوں میں دندناتے گھس گھس کر بے گناہ مسلمانوں کو گرفتار کیا
اور ان کو طرح طرح سے ڈرایا، دھمکایا اور خوفزدہ کیا ہے تاکہ وہ دادرسی بھی نہ کرسکیں، پولس نے ان وحشیانہ حملوں اور انسانیت سوز
فسادات کے سلسلہ میں کیا پارٹ ادا کیا ہے، اس کی روداد کسی مولوی اور مسلمان اخبار نویس کی زبان سے نہیں بلکہ ایک بہت بڑے ہندو
لیڈر اور پارلیمنٹ کے ممبر پنڈت الگو رائے جی شاستری کی زبانی سنئے:-

"میں نے سنا تھا کہ مبارک پور میں معمولی طور پر ہنگامہ ہوا اور پولس نے عوام کی مزاحمت
کے نتیجہ میں تھوڑی بہت طاقت استعمال کی جسے سیاسی رنگ دیکر مشہور کیا گیا، مگر آج میرے ......

خیالات سراسر بے بنیاد نکلے، اور معلوم ہوا کہ جو کچھ یہاں ہوا ہے وہ ہمارے لئے انتہائی رنج کا باعث ہے، اور معاملہ سیاسی نوعیت کا بالکل نہیں ہے۔ بلکہ واقعات و شواہد کی روشنی میں یہاں کے حالات انسانیت کے لئے بدنام کن ہیں، میں نے ان لوگوں کے زخم دیکھے ہیں، جنھیں پولس نے بری طرح مارا پیٹا اور ذلیل کیا ہے، ان کی چوٹ سے میرے دل پر چوٹ لگی ہے......"

وہ مسلمان لیڈر جو ہندوستانی حکومت کے بڑے ہوا خواہ ہیں، اور انھوں نے ہمیشہ بھارت راج کی غلطیوں پر پردہ ڈالا اور ان کی طرح طرح سے تاویلیں کی ہیں اور جو کانگریس کے ٹکٹ پر اسمبلیوں کے ممبر بنے ہیں، ان فسادات پر وہ تک چیخ اٹھے ہیں اور انھوں نے ان ہولناک فسادات میں سب سے زیادہ مجرم پولس اور ہندو سول حکام کو قرار دیا ہے جنھوں نے شورش پسندوں کی پشت پناہی اور مظلوموں پر طرح طرح کی زیادتیاں کی ہیں۔ اتر پردیش (یو۔ پی) اور مدھیہ پردیش کی حکومتیں ناانصافی کی اس حد تک پہنچ گئی ہیں کہ جب مسلمانوں کی طرف سے ان فسادات کی غیر جانبدارانہ عدالتی تحقیقات کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو اس جائز مطالبہ کو یک قلم مسترد فرما دیا جاتا ہے ؎

وہی قاتل بھی ہیں، منصف بھی ہیں، شاہد بھی ہیں
اقربا میرے کریں خون کا دعویٰ کس پر؟

اس شعر کو بچپن سے پڑھتے اور سنتے آئے ہیں، مگر بھارتی حکومت کی پالیسی کی بدولت اس کے معنی ٹھیک طرح سمجھ میں آئے! سنہ ۱۹۴۷ء میں ضلع بلند شہر کے ایک گاؤں میں بے گناہ مسلمانوں کو پکڑتے ہوئے، ایک ہندو افسر کے منھ سے جو یہ حق بات نکل گئی تھی:۔

"چاہے تم مسلمانوں کے یہاں ترکاری کاٹنے کا چاقو بھی نہ نکلے، مگر ہمیں تمھارا زور توڑنے کے لئے پکڑنے اور پریشان کرنے کا حکم دیا گیا ہے......"

بارہ سال گزرنے کے بعد اسی مسلم آزاری، مسلم کشی اور مسلم دشمنی کی تجدید ہو رہی ہے، اور ستم ظریفی یہ ہے کہ جو حکومت مہا سبھا اور جن سنگھ کی خواہشوں اور تمناؤں کی رفتہ رفتہ تکمیل کرتی جا رہی ہے اس پر "سیکولر سٹیٹ" کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔

دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

پالیسی اور اسکیم یہ ہے کہ بھارت کے مسلمانوں میں اطمینان اور جمعیت خاطر پیدا نہ ہونے پائے، ان کے قدم اکھڑے اکھڑے اور ڈگمگاتے رہیں، ان کا احساس خودی اس تصور کے تلے ہمیشہ دبا دبا بلکہ کچلا ہوا رہے کہ ان کی عزت، آبرو اور جان و مال اکثریت کے رحم و کرم پر منحصر ہے!

ہم نے اوپر بھی عرض کیا تھا، اور اب پھر اسی حقیقت کو دہراتے ہیں کہ حکومت اپنے فرض کو پہچانے اور عدل و انصاف سے کام لے تو ہر شورش دب سکتی ہے اور ہر فساد کا سر کچلا جا سکتا ہے، مدراس اور شہر بمبئی کی زندہ مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ یہاں کی حکومتوں نے شورش پسندوں کو سر اٹھانے کا موقع نہیں دیا۔ اسلئے وہاں امن و اطمینان ہے اور مسلمان اپنے کو غیر محفوظ اور خطرات میں گھرا ہوا محسوس نہیں کرتے۔

گزارش

دھاندلی، ہٹ دھرمی اور کٹ حجتی کی دوسری بات ہے کہ ہر روشن سے روشن حقیقت کو مسخ کیا جا سکتا ہے مگر جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کو کوئی شریف اور انصاف پسند شخص جھٹلانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس ظلم و زیادتی کے خلاف احتجاج کر کے ہم نے اس جائز حق کو استعمال کیا ہے جو فطرت نے ہر انسان کو عطا فرمایا ہے اور ایسے موقعوں پر سکوت اختیار کرنے سے

اور بے غیرتی بن جاتا ہے۔

ایسے معاملات میں جبکہ حکومتیں عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا نہ کرسکیں، مجلس اقوام متحدہ سے اپیل کی جاسکتی ہے۔ مگر اس مجلس نے آج تک کس ظالم کا ہاتھ پکڑا ہے اور کس مظلوم کی دادرسی کی ہے، جو ہندوستانی مسلمانوں کی مظلومیت کی تلافی کی اس سے توقع کی جائے۔ یہ مجلس خود "امتیوں" کا شکار ہے اور اپنے فیصلوں کے منوانے کی اس میں طاقت بھی نہیں ہے،

ع نشستند و گفتند و برخاستند

اس مجلس کا طغرائے امتیاز رہا ہے!

حکومت پاکستان کو اس مسئلہ کی طرف متوجہ کیا جاسکتا ہے۔ مگر وہ ہمارے کہنے سے پہلے ہی بھارت گورنمنٹ سے احتجاج کرچکی ہے لیکن پاکستان کی پچھلی حکومتیں جو "زبان سیاست" سے احتجاج کیا کرتی تھیں، اور موجودہ حکومت نے "زبان شمشیر" سے جو احتجاج فرمایا ہے نتیجہ کے اعتبار سے دونوں "احتجاجوں" میں کوئی فرق نظر نہیں آیا۔

بھارت کی حکومت اور عوام میں سب ہی ایک جیسے نہیں ہیں، ان میں بہت سے شریف اور امن پسند لوگ بھی پائے جاتے ہیں ان سے ہماری گزارش ہے کہ بھارت میں ہر سال رام لیلا کا تہوار بڑے دھوم دھام سے منایا جاتا ہے، جس میں رام چندر جی کی شرافت، نیکی اور راون کی شرارت اور ظلم و زیادتی کا ناٹک کھیلا جاتا ہے، اور اس کھیل کا خاتمہ اس سین پر ہوتا ہے کہ رام چندر جی اپنی بے سروسامانی کے باوجود فتحیاب ہوتے ہیں اور راون سب کچھ قوت اور سروسامان رکھتے ہوئے ایسی عبرتناک شکست کھاتا ہے کہ اس کے راج پاٹ کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا! قدرت کا یہ انتقام اس ظالم راون کے لئے ہی مخصوص نہ تھا، جو لنکا کا راجہ تھا، کنبھ کرن جس کا بھائی اور کالی جس کی بہن تھی۔ دنیا کے ہر ظالم کو راون ہی کی طرح روز بد دیکھنا پڑتا ہے، اور کوئی نہ کوئی ہنومان ہرا تیاچار کی لنکا کو آگ لگا کر بھسم کر دیتا ہے۔ اور حکومتیں کفر پر تو قائم رہ سکتی ہیں لیکن ظلم پر قائم نہیں رہ سکتیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظالموں کو ڈھیل ضرور ملتی ہے مگر پاپ کا گھڑا جب بھر جاتا ہے تو پھر اس کے ڈوبنے میں دیر نہیں لگتی۔

بھارت کے مسلمانوں سے ہمیں انسانی ہمدردی بھی ہے اور دینی ہمدردی بھی ہے۔ ان کے پاؤں میں جو کانٹا چبھتا ہے اس کی کھٹک ہمارے دل محسوس کرتے ہیں، مگر اس بدنصیبی کو کیا کیجئے بین الاقوامی سیاسیات کے چکر اور الجھاوے نے ایک آزاد حکومت رکھنے کے باوجود ہمیں بے دست و پا بنا دیا ہے، اس کے سوا اور چارہ کار ہی کیا ہے کہ ہم اور وہ اپنا غم اور دکھ درد اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کریں، اسی پر بھروسہ کریں، اسی کو اپنا دمساز اور مددگار سمجھیں، دل جب ٹوٹتے ہیں تو اللہ سے تعلق مضبوط تر ہو جاتا ہے، اس دل شکستگی اور پریشاں حالی سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر تعلق باللہ کی کیفیت پیدا ہو جائے، تو ان کی یہ بربادی آخرت میں ان کے فوز و فلاح کا سبب بن جائے گی: قرآن پاک کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جان و مال کے نقصانات اور صدموں کے ذریعہ بھی آزماتا ہے۔ اس پرآشوب دور میں یوں تو اہل ایمان ہر جگہ پریشان و مضطرب ہیں، مگر بھارت کے مسلمانوں کو خاص طور پر اس آزمائش میں ڈالا گیا ہے۔ اس آزمائش میں وہ کامیاب ہو گئے تو پھر ان کے لئے فتح و نصرت کی بشارت ہے! زمانہ سدا ایک سا نہیں رہتا۔ یہ پریشانی کا دور بھی گزر ہی جائے گا۔ مگر اللہ تعالیٰ دیکھنا یہ چاہتا ہے کہ اس دور ابتلاء کو بھارت کے مسلمان کس طرح گزارتے ہیں؟

مصیبتوں اور پریشانیوں کے اس دور میں جان و مال کا چاہے کتنا ہی نقصان ہو جائے، مگر ایمان کا، اسلام کا، یقین و پاکیزگی کا کوئی نقصان نہ ہو، تو سب کچھ لٹ جانے اور بے سروسامان ہونے کے بعد بھی اچھی کی فتح ہوگی:

آخری بات ہمیں بھارت کے مسلمانوں سے یہ کہنی ہے کہ اس دور مظلومیت میں وہ کمینوں سے ہوشیار رہیں، وہ ان کے پاس

ہمدردی اور تعزیت کرنے والوں کے بھیس میں آئیں گے، اور اپنے کو مسلمانوں کا غم خوار، خیر خواہ اور دردمند ثابت کریں گے، یہ ساری غمخواری، ہمدردی اور تسلی صرف اس لئے ہوگی کہ مسلمانوں کے دلوں میں کمیونزم اور کمیونسٹوں کے لئے جگہ پیدا ہو جائے اور اسمبلیوں کے انتخابات کے زمانہ میں وہ اس سے فائدہ اٹھائیں! حقیقت یہ ہے کہ یہ کمیونسٹ کسی مظلوم کے غم خوار ہیں اور نہ کسی پریشان حال سے انھیں ہمدردی ہے، اور مسلمان کے تو یہ دوست ہو ہی نہیں سکتے، ان کو تو صرف اپنے مشن (کمیونزم) سے دلچسپی ہے، اس مقصد کی کامیابی کے لئے وہ ظالم کا ساتھ بھی دے سکتے ہیں اور مظلوم کو ٹھکرا بھی سکتے ہیں۔ اگر ہندوستان کے مسلمان اپنی مظلومیت سے گھبرا کر خدا نخواستہ کمیونسٹوں کے ہتھے چڑھ گئے تو ان کے دین وایمان کی تباہی یقینی ہے۔ اور وہ یہ سودا کر کے اتنے بڑے خسارے میں رہیں گے، جس کی کوئی تلافی نہیں ہو سکتی۔

کمیونزم ہو، ہندوازم ہو یا اس طرح کا کوئی اور لادینی فتنہ ہو، ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں کو ان سب سے دامن بچا کر، اور کون کس بھیس میں نمودار ہوتا ہے اسے پہچان کر اپنے اس دورِ ابتلاء کو گزارنا ہے، فراستِ مومن ایسے ہی موقعوں پر تو کام آتی ہے، ثبات واستقامت کے ساتھ انھوں نے فراست اور ہوش ودانش سے کام لیا، تو انشاء اللہ انکا مستقبل تاریک نہیں روشن ہے!!

ماہر القادری

ماہر القادری

جائزہ

کاش اِس کی نوبت نہ آتی!

قلم کانپا زباں تھرا گئی اظہار سے پہلے

دینی جماعتوں اور مذہبی اداروں میں لوگ شامل بھی ہوتے رہتے ہیں اور نکلتے بھی رہتے ہیں، کچھ خدا کے بندے اس خاموشی اور وقار و تحمل کے ساتھ کسی جماعت سے علیحدہ ہوتے ہیں کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی، یہ سکوت و درگزر کسی کمزوری یا انفعال کے سبب اختیار نہیں کی جاتی بلکہ اس کا سبب دین کی خیر خواہی ہوتی ہے ——— یہ کہ ان اختلافات کو عوام میں لانے اور اس کشیدگی کو بڑھانے سے بے دین لوگوں کو طرح طرح کے شوشے چھوڑنے کا موقعہ ہاتھ آئے گا! اور دیندار طبقہ کی ہوا خیزی ہوگی! یہ حضرات کسی جماعت سے علیحدہ ہو جانے کے بعد اُس جماعت کے درپے نہیں رہتے، اس کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں اور نہ اس جماعت کی اصلاح کا اپنے کو ذمہ دار سمجھتے ہیں، وہ کسی دوسری دینی جماعت میں شامل ہو کر، اپنی زندگی کو مصروف بنا لیتے ہیں۔

انہی "خاموش تارکین" میں کچھ ایسے حضرات بھی نکل آتے ہیں کہ جو اختلافات کو کھل کر ہوا تو نہیں دیتے، مگر اس چھوڑی ہوئی جماعت کی اصلاح کی انہیں فکر رہتی ہے اور یہ فکر و غم یہ نفسیاتی الجھن اختیار کر لیتا ہے کہ ان کی زبان سے نکلا ہوا "کلمۂ خیر" اُس جماعت کی پوزیشن کو دوسروں کی نگاہ میں مشتبہ بنا دیتا ہے۔ اس حقیقت کو اگر "دوسرا انداز" سے تعبیر کیا جائے، تو یہ کوئی مبالغہ کی بات نہ ہوگی۔

بعض افراد اس علیحدگی و اختلاف کو اس طرح نمایاں کرتے ہیں کہ اخبار نویسوں کو بلا کر پُرجوش بیان دیتے ہیں، اور خالص سیاسی پارٹیوں کے انداز پر طرح طرح کے الزامات لگاتے ہیں۔ اپنے احباب اور جاننے والوں میں یہ پیش گوئی بھی کر جاتے ہیں کہ یہ "علیحدگی" تنہا ایک شخص کی علیحدگی نہیں ہے، ترک و علیحدگی کا یہ سلسلہ طُول کھینچے گا۔ ؎ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟

——— اور ———

اسے سُوءِ اتفاق کہئے یا حُسنِ اتفاق کہ یہ پیش گوئی صحیح ثابت ہوتی ہے اور جماعت سے تدریج کے ساتھ افراد کی علیحدگی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے! ان میں سے بعض حضرات چھوڑی ہوئی جماعت پر خاصی شدت کے ساتھ تنقید فرماتے ہیں، جیسے یہ جماعت جو اُن کی نگاہ میں چند دن پہلے انتہائی محبوب تھی۔ اب اس افتراق و علیحدگی کے بعد انتہائی مبغوض ہو گئی ہے اور اس کے اکابر سے جو محبت و عقیدت اور وابستگی تھی وہ دوسرا رُخ اختیار کر چکی ہے ——— مگر یہ حضرات تنقید و احتساب کے نتائج کا جائزہ لگاتے ہیں تو انہیں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی اس روش سے نہ تو جماعت ہی کی اصلاح ہوئی اور نہ معاشرے میں علمی اور عملی حیثیت سے کوئی ..... نمایاں دینی فائدہ ظاہر ہوا بلکہ اس سے کسی نہ کسی درجہ میں دینی محاذ کو نقصان ہی پہنچا، کمیونسٹوں، مغرب زدوں اور بے دینوں کو تقویت ملی۔ اس اندازے کے بعد یہ حضرات تنقید و احتساب اور طنز و تعریض کی جگہ سکوت اختیار فرما لیتے ہیں، نہ

مدح نہ ذم، نہ تحسین نہ تنقید!

کسی دینی جماعت کی یہ پوزیشن نہیں ہوتی کہ جو اس سے وابستہ رہیں وہ تو "اصحاب علی رضی اللہ عنہ" ہیں اور جو علیحدہ ہوگئے وہ "خوارج" ہیں جو کوئی اس انداز پر سوچتا ہے، وہ غلط سوچتا ہے، ذہنیت کی اس کجی سے اللہ کی پناہ! ان مبالغہ آمیزیوں سے اللہ تعالیٰ ہر کسی کو بچائے رکھے

تنزیہہ کامل جہاں بھول چوک کا سرے سے امکان ہی نہ ہو، صرف اللہ تعالیٰ کی شان ہے، انبیاء کرام اس اعتبار سے بیشک معصوم ہیں کہ ہوائے نفس کی بنا پر اُن سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی مگر سہو و نسیان اور "ترک اولیٰ" سے وہ بھی محفوظ نہ تھے۔ صحابہ کرام بلاشبہ عدول ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے بعد اللہ تعالیٰ کے انہی نیک بندوں کا اسوہ معتبر ہے مگر ان کی تاریخ میں بھی جمل و صفین کے اندوہناک واقعات ملتے ہیں ——— پس کسی دینی جماعت کے اکابر ہوں، وابستگان ہوں یا تارکین ہوں، اُن سب سے غلطیاں ہو سکتی ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ ایک طرف "عصمت" ہو اور دوسری طرف "عصیان و تمرد" ہو! ایسا بھی نہیں ہے کہ جو لوگ کسی جماعت کے ساتھ مسلسل وابستہ ہیں اور اُن کی اس وابستگی میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوا، وہ تو "نیک نیت" ہیں، اور جو افراد کسی دینی جماعت سے ترک تعلق کرتے ہیں وہ "بدنیت" ہیں! جس طرح کسی جماعت کے ساتھ وابستگی نیک نیتی کے ساتھ باقی رہ سکتی ہے، اسی طرح کسی جماعت سے ترکِ تعلق بھی دین کی خیر خواہی کے جذبہ کے تحت پوری نیک نیتی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے! ہاں! یہ ضرور ہے کہ "نیک نیتی" کے باوجود کسی کی غلطی، شدتِ احتساب اور مخالفت سے دینی محاذ کو نقصان پہنچ سکتا ہے، شدت پسند آدمی کو نیک نیتی کے باوجود یہ نقصان نظر نہیں آتا۔ اور بعض اوقات نیک نیتی بھی وہ فرض انجام دے سکتی ہے جو بدنیتی انجام دے سکتی تھی! اختلاف و بیزاری کی فضا میں نفسیاتی نزاکت کا تجزیہ بہت دشوار ہو جاتا ہے کہ اس "اعلانِ حق" کی زد کس پر پڑ رہی ہے اور اس کے کیا نتائج برآمد ہو رہے ہیں، اور اس اعلانِ حق سے باطل کیا فائدہ اٹھا رہا ہے؟

غلطیاں کسی جماعت کے امیر سے بھی ہو سکتی ہیں اور اس کے ارکان سے بھی! لیکن جب دلوں میں فرق پڑ جاتا ہے اور گنجائشیں باقی نہیں رہتیں تو کسی جماعت کا سربراہ کار اگر کسی انتظامی معاملہ میں شدت برتتا ہے یا غلطی کرتا ہے، تو اُس کی اس شدت اور غلطی کو "آمریت" پر محمول کیا جاتا ہے، اور نفس اکساتا ہے کہ تم کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ صحابی رسول کی ملوکیت پر تنقید کرنے سے نہیں چوکتے بھلا ایک اپنے ہی ساتھی کی انتظامی برتری اور "موجود ہراہٹ" کو برداشت کر سکتے ہو! بس اسی نقطے سے کھچاؤ شروع ہو جاتا ہے، اس تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ اختلافات کی اس فضا میں جب امیر یا ذمہ دار مجلس کی کسی تجویز سے ایک یا چند رکن اختلاف کرتے ہیں تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ جماعت میں اس طرح "حزبِ مخالف" قائم کیا جا رہا ہے، اور یہ پارٹی بندی جماعت کے شیرازے کو درہم برہم کر دے گی، ان لوگوں کے ساتھ مل کر اب کام نہیں ہو سکتا! اس تصور کے قائم ہونے کے بعد اختلاف کرنے والوں پر "تالیفِ قلب" کی تدبیر کو بھی نہیں آزمایا جاتا۔ مزاج یہ ہو جاتا ہے کہ یہ اللہ کا کام ہے، ہمارا اپنا کام نہیں ہے، پس جسے جڑنا ہے جڑا رہے اور جسے کٹنا ہو کٹ جائے۔ کسی جماعت کے تمام کے تمام ارکان ایک ہی دماغی سطح اور یکساں مزاج و ظرف کے تو نہیں ہوتے ان اختلافات پر رائے زنی اور چہ میگوئیاں شروع ہو جاتی ہیں اور غیر محتاط تنقیدیں جو نیک نیتی کے ساتھ اعلانِ حق ہی کے جذبہ کے تحت ہوا کرتی ہیں۔ معاملہ کو سلجھانے کے بجائے اُس میں اور اُلجھنیں ڈال دیتی ہیں اور اختلافات کی خلیج وسیع تر ہو جاتی ہے۔

یوں کوئی کا پتی بات پر اڑ جائے اور تنقید و احتساب ہی پر اتر آئے، تو "ڈاڑھی کے طول" اور "استنجے کے ڈھیلوں کی تعداد" کے اختلاف یا اُن پر طنز کو فسق نہیں کفر ثابت کر سکتا ہے، دنیا میں دلیلوں کی کمی نہیں ہے اور "چونکہ" "چنانچہ" "لہٰذا" "مگر" اور "پس" کے

کلامی انداز پر اپنے مخالف کو ہوائے نفس کا متبع، حق سے منحرف اور گمراہ ثابت کیا جاسکتا ہے　　　　مگر حق یہ ہے کہ معاملہ فسق و گمراہی کا یا اختلاف کفر و اسلام اور حق و باطل کا نہیں ہوتا کسی نیک مقصد کے حصول کے لئے طریق کار اور پروگرام کا اختلاف ایسا نہیں ہے کہ اُسے گمراہی سے تعبیر کیا جائے، کسی جماعت کا ذمہ دار شخص یا امیر اپنی کسی برسوں پہلے لکھی ہوئی عبارت کی کوئی تاویل کردے اور وہ تاویل کسی کی نگاہ میں غلط بھی ہو۔ تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اس تاویل کے بعد امیر جماعت سے کسی خیر کی امید ہی باقی نہ رہے اور یہ "ناقص تاویل" اس کی تمام دینی خدمات پر پانی پھیر دے۔

ہم نے یہاں چند اشارے کر دیئے ہیں، اس معاملہ کے اور بہت سے پہلو اور [illegible] بھی ہوسکتے ہیں، جماعت سے باہر رہنے والے ہمدرد معاملہ کے ظاہری پہلو اور سُنی سنائی باتوں کی بنیاد پر ہی کوئی حکم لگا سکتے ہیں، اب رہے جماعت کے اندر کے لوگ (تارکین و وابستگان) تو اُن کو خود اپنی کمزوریاں کہاں نظر آسکتی ہیں اپنے عیوب پر انسان کی نگاہ کم ہی جاتی ہے، اس لئے کسی جماعت سے "ترک و وابستگی" کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہوسکتی ہے کہ وہ دلوں کے احوال و کوائف سے پوری طرح باخبر ہے ——— یہ کہ کس کا نفس کس قدر شریک تھا، کس نے کس پر زیادتی کی، کس کی ضد نے معاملہ کو بگاڑا، کون اپنے اندر کسی عہدے اور منصب کی طلب رکھتا تھا۔ کس کے منصب اور عہدے نے کس کے نفس کو کس قدر غذا پہنچائی، کس میں اخلاص کی کمی تھی کس نے تدبیر سے صحیح کام نہیں لیا۔ کس کی لگائی بجھائی نے دلوں میں اختلاف پیدا کیا، کس کا دل خشیت الٰہی سے گداز تھا، اور کس کے دل کو ہوائے نفس نے سخت بنا دیا تھا۔ کون اس کا متمنی تھا کہ ہمارے کام کی قدر اور ہماری دینی خدمات کا اعتراف کیا جائے، کس کو کس کا منصب کھٹکتا تھا، کس کی رائے صائب تھی؟ کس نے واقعی بُرے ارادے کے تحت جماعت کو نقصان پہنچانے کی روش اختیار کی، کس کی نیک نیتی نے کیا گل کھلائے، کس نے حق کے معاملہ میں شخصیتوں کے اثر کو قبول کیا۔ کسی کے نزدیک جماعت اور اس کے اکابر مبغوض ہوئے تھے تو اس میں اس کے اپنے نفس کی کتنی آمیزش تھی، کس کے اندر عزیمت تھی، کس میں عزیمت کی کمی پیدا ہوگئی تھی ان تمام باتوں کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا، جس کسی کے اندر اخلاص کی جتنی کمی ہوگی، اس کے بقدر اجر و ثواب اور نعمت و جزا میں کمی کردی جائے گی!

کسی جماعت میں اختلاف پیدا ہوتا ہے تو اس کے وابستگان اور تارکین دونوں کو رنج ہوتا ہے، اور جس کو نہیں ہوتا اس کا اخلاص معتبر نہیں، مگر جماعت سے باہر جو اُس کے ہمدرد ہوا کرتے ہیں، ان کا صدمہ جماعت کے متعلقین کے صدمے سے کم نہیں ہوتا، بلکہ بعض کے درد و غم کی تو یہ نوعیت ہوتی ہے کہ اس جماعت کے تارکین کو دیکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتے ہیں، زبان سے کچھ نہیں کہتے مگر غم اشک بن کر ظاہر ہو جاتا ہے ——— اس کی تازہ مثال مولانا امین احسن اصلاحی کے سفرنامہ حجاز میں ملتی ہے کہ مکہ معظمہ میں ایک ہمدرد جماعت نے اُن سے مل کر، بس اتنا کہا کہ "آپ بھی جماعت سے علیحدہ ہوگئے" اور وہ زار و قطار رونے لگا۔ دوسری بار بھی یہی کیفیت پیش آئی!

کسی جماعت سے باہر رہنے والوں کو اس انداز پر سوچنے کا حق حاصل ہے کہ جماعت سے جاتنے مخلص اور دیرینہ کارکن اور اکابر علیحدہ ہوگئے ہیں، یقیناً جماعت میں کوئی ایسی خرابی پیدا ہوگئی ہوگی جس کے سبب انھوں نے وابستگی کے مقابلہ میں قطع تعلق کو ترجیح دی، یہ حضرات نہ کسی ولالچ کی بنا پر شریک ہوئے تھے۔ اور نہ کسی خوف و طمع کی بنا پر جماعت سے علیحدہ ہوئے ہیں۔ اسی طرح بعض دوسرے افراد اس طرز پر بھی سوچنے اور غور کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ جماعت میں جو ارکان اور قائدین و اکابر رہ گئے ہیں، اُن کی سیرت و کردار　بارہا آزمائے جاچکے ہیں، ان لوگوں کے فکر و عمل میں کوئی بنیادی تبدیلی بھی پیدا نہیں ہوئی، اس سے کوئی

خیانت بھی سرزد نہیں ہوتی، ان کی زندگیوں میں اس کی جھلک تک نہیں ملتی کہ یہ لوگ پہلے تو دیندار تھے مگر اب دنیا دار ہو گئے ہیں، ان کے دینی مقاصد بھی وہی ہیں، جو جماعت کے منشور میں آغازِ کار سے شامل ہیں، تو ہم اس بات کو کس طرح درست مان لیں کہ یہ سینکڑوں مخلصین گمراہ ہو گئے ہیں اور ان کا وہ قائد جس کے افکار نے ہزاروں لاکھوں زندگیوں میں اسلامی انقلاب پیدا کیا ہے، وہ ایکا ایکی بندۂ نفس بن کر رہ گیا ہے اس کی اب نہ فکر معتبر رہی ہے اور نہ عمل ــــــــ حقیقت حال یہی کیوں نہ ہو کر جماعت سے علیحدہ ہونے والوں کا موقف کمزور ہے اور یہ علیحدگی غیر مستحسن ہے! جماعت کے بعض ہمدرد یہ سوچ کر بھی صبر کر لیتے ہیں کہ اختلافات کو تو صحابۂ کرام تک نہ روک سکے یہ بیچارے جماعت والے کس گنتی میں ہیں! قرنِ اول کے مقابلہ میں یہ چودھویں صدی ٹوکرز دہ یوں اور فتنوں کا زمانہ ہے

حکمتِ عملی ہم نے بڑی احتیاط کے ساتھ یہ جائزہ لیا ہے اور اپنی دانست میں کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کی، اس جائزہ و تمہید کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی کہ (سابق) جماعت اسلامی پاکستان سے چند ارکان کے علیحدہ ہونے کے بعد بعض مضامین کا سلسلہ شروع ہوا تھا جس میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعت پر تنقید کی گئی تھی، سب سے زیادہ کڑی تنقید اس پر تھی کہ مولانا مودودی صاحب نے تقسیم ہند سے قبل "اقامتِ دین" کے سلسلہ میں بعض خیالات کا اظہار جو فرمایا تھا۔ اب اُن کی بعض تحریریں اُن سابق خیالات سے مختلف و متضاد ہیں ــــــــ مولانا نے اس پر

"دین میں حکمتِ عملی کا مقام"

کے عنوان سے دسمبر ۱۹۵۸ء کے "ترجمان القرآن" میں ایک مقالہ لکھا تھا۔ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے اس مقالہ کے جواب بلکہ یوں کہیے تردید میں ایک پر زور مضمون تحریر فرمایا! مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا یہ مضمون سب سے پہلے کراچی کے ماہنامہ "مقامِ رسالت" میں چھپا، اس رسالہ کو اس مضمون کی اشاعت کا شرفِ اولیت اس لئے حاصل ہوا کہ اس ماہنامہ کے ادارے سے ایک ایسے صاحب وابستہ ہیں، جو (سابق) جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہو چکے ہیں اور جنھوں نے خاص طور سے وصل کے مقابلہ میں فصل کو بہتر سمجھا ہے ان صاحب کا فکر و مزاج، رجحان اور حالیہ موقف کیا ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اب سے تقریباً ڈیڑھ دو سال قبل مولانا محمد منظور نعمانی کا جو مضمون "الفرقان" میں شائع ہوا تھا جس میں مولانا مودودی کے علم و تقویٰ اور ناموس تک پر جرح و تنقید فرمائی گئی تھی، اس مضمون کا مجلہ "تجلی" دیوبند نے جب جواب دیا۔ تو ان صاحب کی رگِ حمیت کو حرکت ہوئی اور مدیر تجلی کی خوب خوب خبر لے ڈالی حالانکہ دیانتِ نقد و احتساب کا یہ تقاضا تھا کہ مدیر "تجلی" کے مضمون پر تنقید سے پہلے مولانا نعمانی کے مقالہ پر تنقید کی جاتی، یا پھر دونوں میں سے کسی پر بھی نہ ہوتی، سکوت ہی اولیٰ تھا! مگر دلی جذبات ظاہر ہو کر رہے کہ اب عقیدت و پسندیدگی کا مرکز بدل چکا ہے۔

مولانا اصلاحی صاحب کے اس مقالہ کو جو گزشتہ مہینے "مقامِ رسالت" میں چھپ چکا ہے، ماہنامہ الفرقان لکھنؤ نے بڑے اہتمام سے نمایاں اور متنوع سُرخیوں کے ساتھ شائع کیا ہے، ان میں سے ایک ذیلی عنوان یہ بھی ہے:۔

"پرویزیت سے ہم آہنگی"

بعض مذہبی طبقوں نے مولانا مودودی کے خلاف عرصے سے یہ مہم شروع کر رکھی ہے کہ انہیں مرزا غلام احمد قادیانی اور غلام احمد پرویز کے مماثل ٹھہرا کر، ملتِ اسلامیہ کو اُن سے متنفر، بیزار یا کم سے کم بدگمان کر دیا جائے۔ لکھنؤ کے "الفرقان" نے بھی اسی لے میں لے ملا کر اپنے دل کو بھی خوش کر لیا اور مودودی صاحب کے مخالفین کے دلوں کو ٹھنڈک اور آنکھوں کو سرور بخش دیا۔ اس مقالہ کے آغاز میں "ادارہ" کی طرف سے جو نوٹ دیا گیا ہے، اس کا اختتام قرآنِ کریم کی اس آیت پر ہوتا ہے:۔

وَاللّٰهُ يَهْدِي مَنْ يَّشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

مجلہ "الفرقان" کے مدیر مسئول اور مرتب اللہ کے فضل سے دونوں صاحب تقویٰ بھی ہیں اور اہل علم بھی ہیں، لہٰذا قرآن کی آیت اس طرح استعمال کرنے کی جرأت یہی حضرات کر سکتے ہیں، ہم گنہگاروں اور بے علموں کی تو یہ مجال نہیں ہو سکتی۔ اُن کی نگاہ میں مولانا اصلاحی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے صراط مستقیم کی طرف ہدایت اب کی ہے جب کہ وہ (سابق) جماعت اسلامی سے علیحدہ ہو چکے ہیں۔ وہ مولانا مودودی کی عربی دانی، علم و فضل اور فکر و فہم، ان سب کو مجروح فرما چکے ہیں! مگر ہمیں مولانا اصلاحی کے ہدایت یاب ہونے میں کبھی شک نہیں رہا، جماعت میں شامل ہونے سے پہلے بھی وہ ہدایت پر تھے۔ جماعت میں شامل ہو کر بھی وہ صراط مستقیم ہی پر تھے اور جماعت سے علیحدہ ہونے، اور مولانا مودودی پر شدید سے شدید تنقید کے بعد بھی ان کا ہدایت یافتہ ہونا مجروح اور مشتبہ بھی نہیں ہوا۔ ان کا کوئی دور بھی ضلالت اور گمراہی کا دور نہیں رہا! اور انشاء اللہ ان کی بقیہ زندگی بھی صراط مستقیم ہی کے رہرو کی حیثیت سے بسر ہوگی

ہم مولانا مودودی کے اصلاحی افکار کو امت مسلمہ کے لئے رحمت سمجھتے ہوئے بھی، ان کو غلطیوں سے محفوظ نہیں سمجھتے۔ اُن سے غلطیاں بھی ہوئی ہیں، اور بعض علمی غلطیوں کا انہوں نے برملا اعتراف بھی کیا ہے۔ مجموعی طور پر ان کی "صراط مستقیم" ہے۔ اگر کہیں ان کی تحریروں میں تضاد ثابت کر دیا جائے، تو ان کی تاویل و توجیہ پر بھی غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر کسی کو ان کی تاویل سے بھی تسلی اور اطمینان نہ ہو تو وہ اپنی رائے رکھنے کا حق رکھتا ہے مگر اس شدت سے تو کوئی فتویٰ صادر فرمانا نہیں کہ مودودی صاحب کی فلاں فلاں عبارتوں میں چونکہ تضاد پایا جاتا ہے اس لئے ان کا علم مشتبہ ہے [illegible] نہ ان کی بصیرت پر اعتماد کیا جا سکتا ہے اور اس تضاد فکر و عمل نے ان کی تمام گزشتہ دینی خدمات پر [illegible]

کسی کو اس کی غلطی کی حد تک ہی سزا دینی چاہیے!

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گنہگار ہوں، کافر نہیں ہوں میں

کون سا ایسا اگلا پچھلا عالم ہے جس سے غلطی نہیں ہوئی؟ دور کیوں جائیے حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شاہ اسمٰعیل رحمہما اللہ تعالیٰ کے علم و تقویٰ اور دین کی خیر خواہی میں کون شک کر سکتا ہے، مگر ان کی تحریروں میں خاصہ تضاد ملتا ہے! یہاں تک کہ ان کی بعض تحریروں سے اہل بدعت تک اپنے مسلک کی تائید میں دلیلیں لاتے ہیں۔ تضاد کوئی اچھی بات نہیں ہے، ہم اس کی تحسین اور تصویب نہیں کر رہے ہیں، گزارش صرف اس قدر ہے کہ تحریروں کے اس تضاد کے باوجود آپ ان علماء دین کا [illegible] دیتے ہیں اور ان کی دوسری بہت سی اچھائیوں اور نیکیوں کے مقابلہ میں ان چند غلطیوں کی بنا پر ان کی شخصیت پر کوئی فرد جرم نہیں لگاتے، تو بے چارہ مودودی کیا اس سلوک کا مستحق نہیں ہے! کیا شخصیتوں کے جانچنے کے الگ الگ پیمانے ہوا کرتے ہیں، [illegible] مودودی صاحب کے یہاں اس قسم کا تضاد بھی نہیں پایا جاتا!

جو چیزیں نص کے ذریعہ حلال و حرام ہیں، ان کی برابری کسی حیثیت سے بھی وہ اجتہادی مسائل نہیں کر سکتے جن پر جواز و عدم جواز کا فقہاء حکم لگاتے ہیں، اگر کوئی عالم پارلیمانی ایوانوں کے الیکشن کو ناجائز ٹھہرائے اور کچھ زمانہ کے بعد الیکشن کی مہم کا خود آغاز کر دے تو اس "جواز و عدم جواز" کو منصوص حلال و حرام کی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ اس نے کسی ایسی چیز کو نہیں بدلا جس کو اللہ اور رسول نے حلال یا حرام قرار دیا تھا! اگر حالات کی تبدیلی کے ساتھ قیاسی و اجتہادی مسائل میں تبدیلی ہو سکتی ہے، اور اس تبدیلی کی ... جسے دوسرے لوگ "تضاد قول و عمل" سمجھتے ہوں، وہ [illegible] "حکمت عملی" سے توجیہ کرے، تو

تقسیم ہند سے قبل مولانا مودودی نے سیاست و انتخابات اور اصلاح معاشرہ کے سلسلہ میں جو کچھ کہا تھا، وہ اُس دور کے حالات کے مطابق تھا، اس وقت سیاست بازی اور الیکشن سے دور رہ کر صرف اصلاح معاشرہ ہی کا کام کرنا تھا مگر پاکستان بننے کے بعد حالات بدل چکے تھے، یہاں اصلاح معاشرہ ہی کی خاطر حکومت پر دیندار طبقہ کا تسلط ضروری تھا، تاکہ معاشرے کی اصلاح کا جو کام بیسیوں برسوں میں انجام دیا جا سکتا ہے، حکومت کے اثر سے کم سے کم مدت میں انجام پا سکے! اور پاکستان کی اُس وقت کی جمہوری حکومت میں الیکشن کے ذریعہ ہی حکومت میں اسلامی انقلاب لایا جا سکتا تھا جس کے لئے (سابق) جماعت اسلامی نے جدوجہد کی۔ اور ٹھیک جدوجہد کی! (سابق) جماعت اسلامی پاکستان نے دین کو سیاست سے کبھی علیحدہ نہیں سمجھا اور نہ اصلاح معاشرہ کی اہمیت کو کمتر جانا، ہاں! ان کے درمیان مواقع و موانع اور حکمت عملی کو ملحوظ رکھا! البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سابق جماعت اسلامی نے سیاست و حکومت پر جتنا زور دیا، اتنا زور اصلاحِ معاشرہ پر نہیں دیا، اور پبلک جلسوں میں جس سختی کے ساتھ اُس دور کے ارباب اقتدار کے سیرت و اعمال پر تنقید کی جاتی تھی، اُس طرح عوام کے کردار و عمل پر تنقید نہیں کی گئی ———— تو "سیاست و حکومت" اور "اصلاح معاشرہ کے کام میں" جتنے "اونٹا نیٹا" کا جس قدر فرق رہ گیا تھا، اُس پر ہر کوئی تنقید کر سکتا ہے، مگر یہ کہنا ظلم ہے کہ سابق جماعت اسلامی میں دین کی جگہ دنیاداری آگئی تھی اور وہ اپنی منزل سے بھٹک گئی تھی؟ جماعت منزل سے نہیں بھٹکی، ہاں! کام کی نوعیت کے اعتبار سے دو رائیں ہو سکتی ہیں کہ جماعت کو پہلے راستہ کے گڑھے بھرنے اور پاٹنے تھے یا راہ کے کانٹوں کو ہٹانا تھا یا یہ دونوں کام ایک ہی جوش و ولولہ کے ساتھ، ایک ہی وقت میں ساتھ ساتھ ہونے تھے!

آج کوئی امریکہ میں جا کر دین کا کام کرے تو "دین و سیاست کے تعلق" پر ایمان رکھتے ہوئے بھی اس کام کا آغاز سیاست سے نہیں ہو گا، اگر کوئی ایسا کرے گا تو یہ حکمت عملی کے خلاف ہو گا اور فراست مومن کی بُری مثال ہو گی، مگر اس کے برخلاف انڈونیشیا میں کام کی نوعیت دوسری ہو گی۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں کی موجودہ قوم پرست لادینی حکومت کے مقابلہ میں اقامت دین کی خاطر حکومت کے باغی محمد ناصر کی پارٹی کا ساتھ دینا پڑے! طریق کار کے اس اختلاف کو "تضاد" نہیں حکمت عملی کہتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ "حکمت عملی" کو کھلونے کی طرح استعمال نہیں کیا جا سکتا، اور اس کی یہ نوعیت ہرگز نہیں ہے کہ صبح کو جسے موم بنایا۔ شام کو اُسے "آہن" بنا دیا! "حکمت عملی" کے شرائط و حدود ہیں! "حکمت عملی" سے غلط کار بہت کچھ ناجائز فائدہ بھی اٹھا سکتے ہیں اور اپنی غلطیوں اور نفس کی خواہشوں کو اس لیبل کے ساتھ لوگوں کی نگاہ میں خوشنما بھی بنا سکتے ہیں! "حکمت عملی"..... قول و عمل کے نفاق اور دورنگی کو ہرگز ہرگز نہیں کہتے، جس کسی نے نفاق کو حکمت عملی سے تعبیر کیا، اُس نے اپنے نفس کو دھوکا دیا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ چالبازی کی۔

جس کے اندر خوف خدا ہو گا۔ وہی بصیرت اور مومنانہ فراست ہو گی، وہ "حکمت عملی" کا صحیح استعمال کرے گا۔ اب رہیں دلوں کی چالبازیاں اور نفس کی دراز دستیاں سو ایسے لوگ شریعت کی ہر رُخصت سے ناجائز فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اٹھاتے ہی ہیں! کسی کے پیٹ میں ذرا سی گرانی ہو جائے اور اپنے سر کو بھاری بھاری محسوس کرے، بس اس کو "لَيْسَ عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ" کے تحت بہانہ بنا کر رمضان کی گرمی سے بچنے کے لئے روزہ رکھنا ترک کر دے، اجنبی عورت پر پہلی اچانک نگاہ اگر پڑ جائے تو معاف ہے، مگر کوئی شخص پہلی نگاہ کے طُول ہی کو بڑھا لے، اور اس نظارگی کو "پہلی نگاہ" ہی سمجھتا رہے تو اللہ تعالیٰ کے سوا اس کے نفس کی اس چوری کو کون پکڑ سکتا ہے! یہی حکمت عملی کا معاملہ ہے۔ جو کوئی اسے ہوائے نفس کے لئے استعمال کرے گا، قیامت کے دن اس

چالبازی کی اس سے باز پُرس ہوگی، اور جو کوئی دین کی خیر خواہی کی خاطر، دین و شریعت کی حقیقی روح کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، حکمتِ عملی سے کام لے گا، اُس کو اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر ملے گا! اب رہی نزاع و جدال کی بات اور دین میں تنگی و شدت کا معاملہ تو ایسے علماء بھی امت میں پائے گئے ہیں جنھوں نے حقہ پینے اور انگریزی جوتا پہننے والوں کو فاسق قرار دیا ہے! دین میں یہ شدت خواہ اس کی محرک دینی حمیت و غیرت ہی کیوں نہ ہو، بڑی ناپسندیدہ بات اور انتہائی غیر محتاط روش ہے۔

مولانا اصلاحی صاحب نے اپنے فاضلانہ مقالہ میں فرمایا ہے کہ "حکمتِ عملی" کا لفظ بھی گمراہ کن ہے ـــــــــ مگر اس کو کیا کیجیے کہ "تورِیہ" "اہون البلیتین" اور "اضطرار" وغیرہ اس قبیل کے الفاظ شریعت میں پائے جاتے ہیں، کوئی ان کا غلط استعمال کرے گا تو گناہ کا مرتکب ہوگا، صحیح استعمال کرے گا تو گمراہی اس کے پاس بھی نہ پھٹک سکے گی!

جہاں تک اصل موضوعِ بحث (حکمتِ عملی کا دین میں مقام) کا تعلق ہے، اس پر جتنے مضامین موافق و مخالف اب تک آئے ہیں یا پچھلے علماء اور اہلِ فکر نے جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ کر ایک صاحب الرائے شخص موازنہ اور محاکمہ کر سکتا ہے کہ کس کا موقف درست ہے اور کس نے اپنی بات کی پچ میں کتنی دھاندلی کی ہے؟ جہاں تک دین کے اصل احکام کا تعلق ہے اُس میں بے شک اللہ اور رسولؐ کے علاوہ اور کسی کو ردوبدل کا حق حاصل نہیں ہے، "حکمتِ عملی" دین کے احکام کا حالات و موقع کے لحاظ سے اُن کے صحیح استعمال کا نام ہے، دینی احکام کے ردوبدل کو "حکمتِ عملی" نہیں کہتے!

یہ تضاد!! تمہید ضرورت سے زائد طویل ہوگئی جو مُباحث ادپر آئے ہیں وہ نفسِ مضمون سے اگرچہ غیر متعلق نہیں ہیں مگر ہمیں جو بات کہنی ہے، وہ تو اب آرہی ہے، جہاں سے اس مقالہ کا آغاز ہونا چاہیے تھا، وہ اس مقالہ کا نقطۂ اختتام بن کر رہ گیا۔ بعض وقت مضمون نگار کے مقصد و ارادہ کے بغیر ذرا سی بات پھیل کر بہت طویل ہو جاتی ہے!

مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ کے جس مقالہ کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں، اس کا ایک اقتباس یہ ہے:۔

"مولانا محمد منظور نعمانی ہماری قوم کی جانی پہچانی ہوئی شخصیت ہیں۔ علمِ دین کے لحاظ سے وہ مسلمان قوم کے چوٹی کے علماء میں سے ہیں، صاحبِ قلم ہیں، صاحبِ زبان ہیں، نہایت مقبول بلند پایہ اور نہایت مؤثر کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کے رسالہ "الفرقان" کی دینی و اصلاحی خدمات سے شاید ہی کوئی شخص انکار کی جرأت کر سکے، ان کا قلم اس درجہ محتاط ہے کہ اگر یہ قسم کھائی جائے کہ انھوں نے اس طرح کے الفاظ اپنی پوری تصنیفی زندگی میں کسی مسلمان کے متعلق کبھی نہ لکھے ہوں گے۔ جس قسم کے الفاظ مولانا مودودی صاحب نے ان کے بارے میں رقم فرمائے ہیں تو انشاء اللہ قسم کھانے والا جھوٹا ثابت نہ ہوگا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ عملی انسان ہیں جس دین کی تعلیم وہ دوسروں کو دیتے ہیں، اس کے وہ خود بھی عمل پیرا ہیں ان کی زندگی طالب العلمانہ نہیں بلکہ درویشانہ ہے، کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ انھوں نے اپنے علم و تقویٰ کو کسی منفعتِ دُنیوی کے حصول کا ذریعہ بنایا ہو۔ انکی نسبت مولانا مودودی صاحب کا یہ فرمانا کہ وہ خشیت و تقویٰ کا لباس زیب تن کر کے ان کے خلاف پندرہ سولہ سال سے تہمت تراشیوں میں لگے ہوئے ہیں ایک ایسی بات ہے جس کے جواز کو مولانا مودودی صاحب کے مخصوص حلقۂ معتقدین کے سوا، شاید ہی کوئی تسلیم کر سکے، خود

بھی فرمادیا اور حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ... وہ بات ان کو یاد نہ آئی کہ کفی
بالمرء کذباً ان یحدث بکل ما سمع " (صفحہ [illegible])

اس کا اظہار کہ سابق جماعت اسلامی پاکستان کے بانیوں میں مولانا محمد منظور صاحب کے راہ دکھانے والے اندھے اور بے بصیرت تھے اور مولانا نعمانی صاحب نے اس رہنمائی کو قبول بھی کر لیا! مولانا نعمانی صاحب کی زیست پر تنقید!

"یہ کوئی تقویٰ نہیں ہے کہ بغیر کسی تحقیق اور تشخیص کے محض ایک بُرائی کا الزام دوسروں پر
چسپاں کر دیا جائے" (صفحہ [illegible])

مولانا نعمانی اُن کے ہم خیالوں، مشیروں اور رہنماؤں کے "تقویٰ" پر تنقید کہ وہ کسی تحقیق کے بغیر دوسروں پر بُرائی کا الزام چسپاں کر دیا کرتے ہیں!

"ہمارے اور مولانا کے تصورِ فکرِ آخرت کا ایک بڑا اختلاف یہ بھی ہے، وہ انسانی زندگی
کے کسی ایک گوشہ میں تو دین پیدا کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں اور یہ زندگی فکرِ آخرت سے نجات
کی جگہ کا اتفاق ہے. اگرچہ اس زندگی کے دوسرے گوشوں میں جاہلیت کی کتنی ہی گندگیاں اور
آلودگیاں موجود ہیں، لیکن ہم زندگی کو ایک ناقابلِ تقسیم وحدت کی حیثیت سے دیکھتے
ہیں. اس لئے جب تک کسی شخص کی زندگی بحیثیت مجموعی حدود اللہ کے اندر نہ آجائے
اس وقت تک ہم فکرِ آخرت کے نقطۂ نظر سے اس کو ناقص سمجھتے ہیں. اس اختلاف کے
سبب سے اگرچہ ہمارا حاصل مولانا کے حاصل سے زیادہ ہے لیکن مولانا کے نقطۂ نظر سے
ہم خسارہ میں رہیں گے" (صفحہ [illegible])

یہ لیجئے مولانا محمد منظور نعمانی کا تصورِ فکرِ آخرت بھی مولانا اصلاحی کے تصور سے مختلف ہے. حد ہو گئی اختلاف کی. کیونکہ نعمانی صاحب جو کچھ کر رہے ہیں اس سے مسلمانوں کی زندگی کا ایک گوشہ تو روشن ہو جاتا ہے مگر دوسرے گوشوں میں جاہلیت کی گندگیاں اور آلودگیاں باقی رہتی ہیں ——— اس طرح ان کا دینی مشن اور تبلیغی کام نہ صرف ناقص ٹھہرتا ہے بلکہ زندگیوں کو ذرا سا چمکا کر، اُن کو زیادہ تر جاہلیت کی گندگیوں میں مبتلا رکھتا ہے ——— توبہ!

"یہ ساری باتیں ہم نے تہذیبِ اخلاق اور تزکیۂ نفس ہی کی غرض سے اختیار کی ہیں
اگر مولانا کو ان باتوں کی اطلاع نہیں ہے، تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دُنیا میں کوئی کام
ہو ہی نہیں رہا ہے. کام سے زیادہ اس کا ڈھنڈورا پیٹنا اور وہ بھی تزکیہ و تقویٰ کا
ڈھنڈورا، یہ ہمارا طریقہ نہیں ہے" (صفحہ [illegible])

مولانا مودودی صاحب نے مشیت و تقویٰ کے لباس زور کی جو طنز کی تھی، اس میں ظاہر ہے مولانا نعمانی صاحب کا نام نہیں لیا تھا مگر جس طرح اُس اشارہ سے مولانا اصلاحی صاحب نے مولانا نعمانی کی ذات و شخصیت کا تعین فرمایا ہے: اس طرح اس عبارت میں بھی مولانا محمد منظور نعمانی اور ان کے رفقاء ہی کے "تقویٰ" پر طنز فرمائی گئی ہے کہ وہ اپنے تزکیہ و تقویٰ کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں. ظاہر ہے کہ جس تقویٰ کا اعلان کیا جائے، اُس میں اخلاص کی مقدار خوردبین لگا کر ہی دیکھی جا سکتی ہے اور بس—

"لیکن اگر مولانا گروہی عصبیت سے کام نہ لیں، بلکہ عدل و قسط کے ساتھ حملوں اور ان کے جوابات کا موازنہ فرمائیں تو اُن کا اپنا دل گواہی دے گا کہ ظلم دوسری طرف سے ہوا تھا۔" (صفحہ ۹۲)

مولانا نعمانی پر "گروہی عصبیت کی فردِ جرم"!

"اگر مولانا اس سوال کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتے، تو میں اُن سے پوچھتا ہوں کہ صریح بہتان لگاتے وقت خود ان کی اپنی فکرِ آخرت کو کیا ہو گیا تھا؟" (صفحہ ۹۴)

یعنی مولانا نعمانی، فکرِ آخرت سے بے پروا ہو کر بہتان ہی نہیں "صریح بہتان" بھی لگا دیا کرتے ہیں!

"لیکن مولانا محمد منظور صاحب نے ہماری اس روش کو پسند نہیں فرمایا، پہلے وہ در پردہ جماعت اسلامی کے خلاف وسوسہ اندازیاں کرتے رہے۔" (صفحہ ۱۰۰)

اور

"خدا کے دین کی جتنی خدمت بھی وہ کریں گے، وہ خدا کے دین ہی کی خدمت ہوگی، بشرطیکہ وہ دین کے دوسرے خادموں کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش نہ کریں۔" (صفحہ ۱۰۱)

مولانا محمد منظور نعمانی نے جماعت کے خلاف "وسوسہ اندازی" ہی کا پارٹ انجام نہیں دیا، بلکہ دین کے خادموں کی راہ میں رکاوٹیں بھی ڈالی ہیں! عجیب انکشاف!!

"اس سلسلہ میں مولانا نے حضرت یوسف علیہ السلام کا بھی حوالہ دیا ہے کہ انھوں نے بھی ایک نظامِ باطل کے ساتھ تعاون کیا تھا ——— اس سوال پر جماعت اسلامی کے لٹریچر میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب کسی مزید بحث کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے، لیکن معلوم نہیں کیوں لوگوں کو یہ ثابت کرنے پر اصرار ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر نے اپنی قوتیں اور قابلیتیں نعوذ باللہ ایک طاغوتی نظام کو پروان چڑھانے میں صرف کیں، جن لوگوں نے یہ بات کہی ہے، اللہ تعالیٰ ان کو معاف کرے، انھوں نے ایک عظیم الشان پیغمبر پر تہمت لگائی ہے۔" (صفحہ ۱۲۱، ۱۲۲)

اور "جن لوگوں" میں مولانا محمد منظور نعمانی بھی شامل ہیں، اس طرح انھوں نے بھی ایک عظیم الشان پیغمبر پر تہمت لگانے کے جرم کا ارتکاب کیا ہے!! نعوذ باللہ!

"ایک نیک نیت آدمی کو اس پر کچھ اچنبھا سا ہوگا کہ مولانا نے یہ کیا بات فرمادی! لیکن میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ سوچنے کا یہ انداز کچھ مولانا ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ادھر زوال کی صدیوں میں ہمارا جو علم فقہ مرتب ہوا ہے وہ زیادہ تر اسی طرز کی ذہنیت کی پیداوار ہے۔" (صفحہ ۱۲۶)

یعنی مولانا نعمانی صاحب کا اندازِ فکر مسلمانوں کے دینی اور معاشرتی زوال سے متاثر ہے۔

"لیکن مولانا نے یہ کہہ کر صریح مغالطہ دیا ہے کہ ہم لوگوں سے اس مسلہ پر ایمان لانے کا مطالبہ کر رہے ہیں جس پر عمل کرنے کو ہم نے شرطِ رکنیت قرار دیا ہے تاکہ اس سے بآسانی یہ نتیجہ،

نکالا جاسکے کہ جو شخص اس پر عمل نہیں کرتا وہ ہمارے نزدیک کافر ہونا چاہیے، میں پوچھتا ہوں کہ اس طرح کے مغالطوں سے خلقِ خدا کو دھوکا دینا اور اپنے جیسے چند خادمانِ دین کو ہدف بنانا آپ کے لئے کیسے جائز ہو گیا؟ یہ کیسا تقویٰ ہے! یہ کیسی فکرِ آخرت ہے یہ کس قسم کا تزکیۂ نفس ہے جس کی مشق پچھلے دس سال میں آپ کرتے رہے ہیں۔ (صفحہ ۱۲۸)

زاویۂ نگاہ، طریقِ فکر اور طریقِ کار کے اختلاف کی دوسری بات ہے، اس میں کوئی شخص غلطی بھی کر سکتا ہے، مگر مولانا اصلاحی صاحب کی اس رائے سے ہم قیامت تک متفق نہیں ہو سکتے کہ مولانا محمد منظور نعمانی دانستہ طور پر "مغالطوں" کے ذریعے خلقِ خدا کو دھوکا بھی دے سکتے ہیں!

"اگر مولانا منظور صاحب کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ ہم بھی انہی طریقوں سے مسلمانوں کے دلوں میں اسلاف کا احترام پیدا کریں جس طرف انھوں نے رہنمائی کی ہے تو میں صاف عرض کئے دیتا ہوں کہ ہم اس سے معذور ہیں، ان طریقوں سے اسلاف کی عزت و عظمت تو معلوم نہیں دلوں میں پیدا ہوگی یا نہیں البتہ دین کی جڑیں اکھاڑنے کی جو کوشش یہ ہمارے مفتیانِ دین کر رہے ہیں، اس میں کوئی کسر نہ رہ جائے گی، آخر اس سے بڑھ کر اس دین کے لئے نقصان دہ چیز اور کیا ہو سکتی ہے کہ قرآن و حدیث اور صریح عقل کے خلاف باتیں بزرگوں کی طرف نسبت کر کے پیش کی جائیں، اور پھر بزرگوں کے نام کا واسطہ دے کر لوگوں سے ان کے ماننے کا مطالبہ کیا جائے۔" (صفحہ ۱۳۲ و ۱۳۳)

اچھا ہے کہ یہ اقتباس "بلاتبصرہ" ہی رہے، خط کشیدہ عبارت کو قارئین ذرا غور سے پڑھیں!

"مولانا نے بڑے ہی عارفانہ انداز میں اس عجیب و غریب اصول کی روحانی برکتوں کا حوالہ دیا ہے اور ازراہِ نوازش اس کی برکات پر ایک مقالہ بھی لکھنے کا وعدہ فرمایا ہے، ہمیں اس کی روحانی برکتوں کا تو پتہ نہیں ہے۔ لیکن اس کی مادی برکتوں کا ہم کو پورا یقین ہے تاریخ بھی شاہد ہے اور ہمارا آج کا مشاہدہ بھی یہی ہے کہ اس اصول پر "مذہب" کی تبلیغ فسق و جاہلیت کے علمبرداروں کو کبھی گوارا نہیں ہوتی، بلکہ بارہا انھوں نے خود ایسی تبلیغ کی سرپرستی کی ہے۔" (صفحہ ۱۳۴)

مولانا محمد منظور نعمانی جس تبلیغی مشن کو اپنی زندگی کا مقصدِ عظیم بنائے ہوئے ہیں، یہ اُس پر تنقید ہے!

اپنے اس مقالہ میں مولانا اصلاحی صاحب نے مولانا محمد منظور نعمانی کے فکر و عمل کی جو تصویر پیش کی ہے وہ کتنی تاریک ہے ان کے سوچنے کا ڈھنگ، ان کا تصورِ آخرت، ان کا زہد و تقویٰ، ان کی ذہنیت، ان کی فراست و بصیرت، ان میں سے کونسی ایسی چیز ہے جس کو مولانا اصلاحی صاحب کے نوکِ خامہ نے ثابت چھوڑا ہو اور مجروح نہ کر دیا ہو! مولانا مودودی صاحب کی خشیت و تقویٰ کا لباس زور پہننے" کی حسرت تو مولانا اصلاحی صاحب کے لگائے ہوئے الزامات کی "فردِ جرم" کے سامنے پھیکی نظر آتی ہے! مثالب کے بعد مناقب اور ہجو کے بعد قصیدہ خوانی کی طرف یہ گریز کیوں؟ حالانکہ مولانا محمد منظور نعمانی کے اندازِ فکر، تصورِ آخرت، شانِ زہد و تقویٰ اور فراست و بصیرت میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی وہ جیسے پہلے تھے اب بھی وہی ہیں اور پوری استقامت

کے ساتھ اُسی تبلیغی مشن کے ساتھ وابستہ ہیں، جس پر مولانا اصلاحی نے اپنے مقالہ میں بہت سی پھبتیاں چست کی ہیں مولانا نعمانی کی شخصیت کے بارے میں مولانا اصلاحی صاحب کے نقطۂ نگاہ کی تبدیلی کا سبب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ جہاں تک مولانا مودودی کی ذات کا تعلق ہے اُن سے سوءِ ظن رکھنے، اُن کو مبغوض سمجھنے اور اُن سے بیزار ہونے میں، مولانا اصلاحی صاحب اپنے حالیہ ممدوح کی سطح پر آگئے ہیں، اور اس ہم خیالی اور یک رنگی نے ذم کو مدح سے، معائب کو محاسن اور مثالب کو مناقب بنا دیا ہے!

یہ دُنیا ہے یہاں اے ہم نشیں! ایسا بھی ہوتا ہے

کچھ اور ہو گئے وہ کسی کی نگاہ میں

مثالب سے مناقب کی طرف صعود کا منظر آپ دیکھ چکے، اب محاسن سے معائب کی جانب ہبوط کا منظر ملاحظہ فرمایئے ——— اپنے مضمون کی ابتداء ہی میں مولانا اصلاحی صاحب فرماتے ہیں:-

"لیکن معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ ایام میں مولانا مدظلہ (مودودی صاحب) کے قلم سے
اسلام اور مسلمانوں کی تھوڑی بہت جو خدمت بن آئی تھی، وہ اس کا بدلہ اب مع سُود
چکانا چاہتے ہیں (الفرقان، شوال ۷۸ھ صفحہ ۲۱)

کوئی سطحی قابلیت کا عالم فقہی مسائل کسی کتاب میں جمع کر دے، یا کسی دینی موضوع پر ایک دو معمولی سی کتابیں لکھ دے، کوئی پیش امام جُمعہ کے جمعہ وعظ بیان کیا کرے...... اس پر تو "دین کی تھوڑی بہت خدمت" کا اطلاق شاید ہو سکتا ہے، اسی انداز میں مولانا اصلاحی صاحب نے مودودی صاحب کی "دینی خدمت" کا اعتراف فرمایا ہے۔ بادلِ ناخواستہ، جیسے کسی کا دل تو نہ چاہتا ہو، مگر مجبوراً کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑے! جس زمانہ میں سابق جماعتِ اسلامی پاکستان سے بعض ارکان اور خاص طور سے مولانا امین احسن اصلاحی کے اختلافات کی خبریں گرم تھیں، اسی سلسلہ میں یہ خبر بھی ہم تک پہنچی تھی کہ مولانا اصلاحی صاحب کو مولانا مودودی کی ذات سے سُوءِ ظن پیدا ہو گیا ہے، اور بعض نے تو اس سوءِ ظن کو "کد" سے تعبیر کیا، جس کو ہم نے کہنے والوں کا مزاد ہم سمجھا کہ اختلافات کی فضا میں بعض لوگوں کے دلوں میں عجیب عجیب طرح کے خطرے اور وسوسے گزرتے ہیں، مگر مولانا مودودی صاحب کی دینی خدمت کے بارے میں جو مولانا اصلاحی صاحب نے رائے ظاہر فرمائی ہے، اس نے ان توہمات، اندیشوں، خطروں اور وسوسوں میں خواہ مخواہ وزن پیدا کر دیا ——— مولانا مودودی کے خلاف برسوں سے یہ مہم جاری ہے کہ ان کو عوام مسلمانوں کی نگاہ میں بے وقعت اور بے علم ٹھیرا دیا جائے، مگر اس کا کبھی وہم بھی دل میں نہ گزرتا تھا کہ خود مولانا کے برسوں کے رفیق کار اور دست و بازو کے ہاتھوں یہ کارنامہ انجام پائے گا کہ مولانا مودودی کی گرانقدر دینی خدمات کو ہلکا ثابت کیا جائے!! یا للعجب است

خندۂ اہلِ جہاں کی مجھے پروا کیا تھی
تم بھی ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی

مولانا مودودی نے بالکل اوائل عمر میں "الجہاد فی الاسلام" مرتب کی تھی، اگر وہ کچھ اور نہ لکھتے تو تنہا یہی ایک کتاب اُن کی دینی خدمت کو وزن دار بنانے کے لئے کافی تھی، کوئی شخص اُن کے "رسائل و مسائل" کے بعض فقہی مسائل سے اختلاف نہیں بلکہ ان کو رد کر سکتا ہے۔ کوئی شخص یہ بھی کہنے کا حق رکھتا ہے کہ مولانا مودودی کی تحریروں میں "اقامتِ دین" کے لئے "سیاست و حکومت" کا رنگ، اور ان کی کتاب "تجدید و احیاءِ دین" میں مجددینِ اُمت کے کارناموں پر احتساب ضرورت سے زیادہ تیز ہو گیا ہے اور یہ کتاب نہ آتی تو دین کی کوئی ضرورت پڑے ہونے سے رہ نہ جاتی ——— مگر اس قسم کی نرم و سخت تمام

تنقیدوں کے باوجود مجموعی طور پر مودودی صاحب کے قلم نے جو دینی خدمات انجام دی ہیں وہ "تھوڑی بہت" نہیں، "بہت ہی کثیر ہیں" وافر وعظیم ہیں! اُن کے قلم نے سو دو سو نہیں ہزاروں صفحات پر دین کے معارف وحکم کے موتی بکھیرے ہیں، اُن کے قلم نے بلاشبہ اس دور میں تجدید دین کا عظیم وگرانقدر کارنامہ انجام دیا ہے اور سب سے خوبی کی بات یہ ہے کہ کوئی دعویٰ نہیں کیا! اس زمانہ میں اگر غزالی، ابن تیمیہ، ابن قیم اور شاہ ولی اللہ (رحمہم اللہ تعالیٰ) ہوتے، تو غالباً اسی نہج واسلوب پر دین مُبین کو پیش کرتے، ....
اشترکیت ہو، فتنۂ انکارِ حدیث ہو، لادینیت ہو، متحدہ قومیت ہو، بے پردگی اور سود خواری ہو، عجمی تصوف اور مشرکانہ بدعات و رسوم ہوں، مغرب زدگی اور فلسفہ یونان کی مرعوبیت ہو، مولانا مودودی ایک ایک محاذ پر سینہ سپر نظر آتے ہیں، دین کی حمایت میں ان کا ہمیشہ یہ حال رہا ہے، ... ؎

آ چکے تھے بجلیوں کی زد میں ارباب چمن
میں نے اپنے آشیانے کو مقابل کر دیا

اور پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت وکرم کے بعد اُن کے اخلاص فی القول اور اخلاص فی العمل کا یہ نتیجہ ہے کہ اُن کی کتابوں نے لاکھوں زندگیوں میں اسلامی انقلاب پیدا کر دیا! اگر دین کی یہ خدمت بھی "تھوڑی بہت" ہے تو پھر اسلام کی ایک ہزار سالہ تاریخ میں شاید "دین کی بہت سی خدمت" انجام دینے کی کسی کو توفیق ہی نصیب نہیں ہوئی۔

مولانا امین احسن اصلاحی نے جو مضامین لکھے ہیں اور جو دوسروں نے ان کے اقوال کے حوالے سے نقل کئے ہیں ان میں مولانا مودودی کی عربیت اور نحودانی پر چوٹیں کی گئی ہیں، اُن کے جذبہ خیر پسندی پر طنز فرمائی گئی ہے اُن کو پرویز کا ہمسر ٹھیرایا گیا ہے، یعنی یہ کہ وہ بہت ہی سطحی قسم کا دینی علم رکھتے ہیں، ٹھیک طرح سے عربی بھی نہیں آتی ..... اور .... !

لیکن اب سے چند سال قبل مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی مولانا مودودی کے علم وفضل اور شخصیت کے بارے میں یہ رائے تھی :-

> "مولانا مودودی کا علم ومطالعہ بھی مدرسی اور خانقاہی حلقوں میں اکثر زیر بحث رہا ہے، اور میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ اس معاملہ میں اکثر لوگوں کا غرورِ علم اکثر اعترافِ حق پر غالب آیا ہے، میں یہ تو نہیں جانتا کہ مودودی صاحب نے کہاں پڑھا ہے اور کیا پڑھا ہے لیکن اس بات کو میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ نہایت ذہین آدمی ہیں، نہایت قابل آدمی ہیں اور نہایت وسیع النظر عالم ہیں ان کا مرتبہ صرف اس پہلو ہی سے اونچا نہیں ہے کہ وہ جدید علوم وافکار پر نہایت وسیع نگاہ رکھتے ہیں اور ایک بلند پایہ انشاپرداز ہیں بلکہ ان کی اصل خوبی یہ ہے کہ وہ کتاب وسنت پر نہایت ادگہری اور وسیع نظر رکھتے ہیں، قرآن کا انھوں نے ایک اسکالر کی طرح مطالعہ کیا ہے اور برابر اس پر تدبر کرتے رہتے ہیں، صرف بیضاوی اور جلالین "بقدر نصاب" پڑھ کر مفسر نہیں بن بیٹھے ہیں انھوں نے حدیث کی تمام مستند کتابوں کو حرف بحرف نہایت غور وفکر کے ساتھ پڑھا ہے، صرف ان کے "دورہ" پر اکتفا نہیں فرمایا ہے اسی طرح فقہ، اصول، سیرت اور رجال کی تمام ضروری کتابیں ان کی نگاہ سے گزری

ہوئی ہیں۔ ان کے مطالعہ کا طریقہ بھی محققانہ ہے، میں بیس ماہ ان کے ساتھ جیل میں رہا ہوں اور میں نے نہایت قریب سے ان کو دیکھا ہے کہ وہ کس طرح کی چیزیں پڑھتے ہیں۔ کس طرح پڑھتے ہیں، اور کس قدر پڑھتے ہیں، انھوں نے صرف جیل کے قیام کے دوران میں عام علوم و فنون کے سوا تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت اور رجال کی اتنی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے کہ میں پورے اطمینان کے ساتھ یہ کہہ رہا ہوں کہ جو حضرات ان کے مطالعہ کتاب و سنت پر بانداز استخفاف تبصرہ فرماتے ہیں ان کو شاید مدۃ العمر اتنی کتابیں پڑھنے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی میں نے جب کبھی ان کی کوئی پڑھی ہوئی کتاب کسی ضرورت کے لئے اٹھائی تو حدیث اور فقہ کی موٹی موٹی کتابوں پر بھی دیکھا ہے کہ ان کے اہم قابل تنقید مقامات حاشیہ میں خود اُن کے قلم سے مفید نوٹ موجود ہیں۔

"وہ عربی زبان کو عالمانہ طور پر سمجھتے ہیں، حاطب اللیلوں کی طرح ہوائی تیر تکے نہیں چلاتے، جیل کے دوران قیام میں مجھے بعض اوقات عربی کی بعض مشکل یا غلط چھپی ہوئی عبارتوں کے بارے میں اُن کے مشوروں سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ ملا ہے، اور میں نے ہر مرتبہ یوں محسوس کیا کہ وہ عبارت کا تجزیہ کرنے اور کلام کی نحوی تالیفات میں سمجھنے میں مدرسی مولویوں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں، پھر وہ کام کو جس ذمہ داری کے ساتھ کرتے ہیں اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی تقریر بھی اس وقت تک کرنا پسند نہیں کرتے جب تک اس کے لئے اچھی طرح تیاری نہ کرلیں ——— اگر ایک ایسے شخص پر بھی کتاب و سنت کے علوم کے بارے میں ہم اعتماد نہیں کر سکتے تو پھر میں نہیں سمجھتا کہ کتاب و سنت کے علم کے بارے میں اس ملک میں کس شخص پر اعتماد کیا جا سکتا ہے"

(تنقیدات: ــ از مولانا امین احسن اصلاحی۔ صفحہ ۱۴۰، ۱۴۱، و ۱۴۲)

مولانا مودودی کے شرافت و تحمل کی شہادت:ــ

"میرا اشارہ مولانا ابوالیث اور مولانا مودودی صاحب کی طرف ہے ان حضرات نے جس تحمل و وقار کے ساتھ اس ہنگامہ تکفیر و تفسیق کا سامنا کیا ہے اور انتہائی رنجیدہ اور اشتعال انگیز رویہ کے مقابلہ میں جس صبر و رزانت، جس شرافت لہجہ اور کظم غیظ اور عفو عن الناس کا مظاہرہ کیا ہے، کیا کوئی شخص اس کا انکار کر سکتا ہے"

(تنقیدات از مولانا اصلاحی ۲۳۷)

مولانا مودودی ایک داعی اور مصلح کی شان رکھتے ہیں۔

"مودودی صاحب کوئی اکیڈمک طرز کے مصنف نہیں ہیں، کہ انھوں نے مجرد علمی خدمت کے لئے زندگی سے غیر متعلق مسائل پر خامہ فرسائی کی ہو وہ کوئی ناقل قسم کے آدمی بھی

نہیں ہیں کہ ایک خاص مسلک کی عربی کی کتابوں میں جو کچھ لکھا ہوا ہے، اس کو اپنے الفاظ میں اردو میں منتقل کر دیتے ہوں وہ کوئی جامد اور مقلد قسم کے آدمی بھی نہیں ہیں کہ ان کا سارا تصنیفی کارنامہ صرف مکھی پر مکھی مار دینا ہو۔ وہ دین و دنیا کی تفریق کے وہم میں بھی مبتلا نہیں ہیں کہ ان کا سارا زورِ قلم غسل و وضو کے مسائل ہی تک محدود ہو وہ ایک ــــــ داعی اور مصلح کی شان رکھتے ہیں؟ اور جو کچھ لکھتے ہیں دعوت و اصلاح کے مقصد کو سامنے رکھکر لکھتے ہیں اس مقصد کی خاطر انھوں نے دین کی متعدد ایسی حقیقتوں کو برملا آشکارا کیا ہے جو اگرچہ دین کی نہایت ثابت و معروف حقیقتیں رہی ہیں، لیکن اس دورِ زوال میں اس وضاحت کے ساتھ کہنے کی ہمت لوگ کھو بیٹھے تھے، ــــــ اس اصلاح کے مقصد کی خاطر ان کو صرف مسلمانوں کے گمراہ فرقوں ہی پر نہیں بلکہ ان فقہی گروہوں پر بھی تنقیدیں کرنی پڑی ہیں جو صحیح بنیاد پر ہونے کے باوجود بہت سی بے اعتدالیوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اس مقصد کے لئے انہیں ان لوگوں سے بھی لڑنا پڑا ہے، جو بے جا تعصبات اور تقلید جامد کی بندشوں میں گرفتار ہیں، انہیں دین کے صحیح تصور اور اس کے نظام کے احیاء کی خاطر ان لوگوں سے بھی نبرد آزمائی کرنی پڑی ہے جو موجودہ معاشرے کی قیادت کر رہے ہیں پھر یہی نہیں کہ انھوں نے ان لوگوں پر تنقید کی ہے بلکہ اپنے خیال کے مطابق ایک مثبت پروگرام بھی پیش کیا ہے، جس پر چل کر، ان کے خیال میں مسلمانوں کی حالت درست کی جاسکتی ہے اور اسلام کو از سر نو بحیثیت ایک نظامِ زندگی کے برپا کیا جاسکتا ہے"

(تنقیدات از مولانا اصلاحی صفحہ ۲۶۱، ۲۶۲)

مولانا مودودی کی حق پسندی کا حال مولانا اصلاحی کی زبان سے سنئے:-

"باقی رہا اصل مسئلہ تو میں مولانا کو یقین دلاتا ہوں کہ مودودی صاحب پر اگر ان کی غلطی دلائل سے واضح کر دی جاتی ہے، تو اس کے تسلیم کرلینے میں اُن کو ذرا بھی تامل نہیں ہوتا ہے۔ خود مولانا محمد منظور صاحب کو بھی تجربہ ہوگا کہ اب سے دس سال پہلے انھوں نے "حقوق الزوجین" کی ایک عبارت کی طرف مولانا مودودی کو توجہ دلائی اور انھوں نے "ترجمان القرآن" میں اعلان کرکے اس عبارت سے رجوع کیا، ابھی حال ہی کی بات ہے کہ اپنی کتاب "سود" کی ایک پوری فصل انھوں نے اپنی ایک غلطی پر متنبہ ہو کر بدل ڈالی اور اس کا اعلان کر دیا" (تنقیدات:- صفحہ ۲۶۵)

مولانا مودودی یقین و اعتماد کے ساتھ بات کہتے ہیں:

"ابن تیمیہ کا مقام تو بہت اونچا ہے لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مودودی صاحب نے بھی حدیث کے معاملہ میں کبھی کسی سے دب کر بات نہیں کی، جب بات کی تو زور و قوت

سے بات کی یقین و اعتماد کے ساتھ بات کی، اس جوش و جذبہ کے ساتھ بات کی جو کسی چیز پر ایک شخص کے قلبی ایمان کی شہادت دیتا ہے، میں نے یہ چیز ان کے لٹریچر کے صرف اسی حصہ میں نہیں محسوس کی ہے، جو انھوں نے منکرین حدیث کی تردید میں لکھا ہے، بلکہ یہ جرأت ان کے قلم سے نکلی ہوئی ہر سطر کے اندر محسوس ہوتی ہے۔

(توضیحات، از مولانا امین احسن اصلاحی صفحہ ۱۰۹ و ۱۱۰)

"مولانا مودودی جیسے آدمی کم پیدا ہوتے ہیں"

"اصلاحی صاحب کو نمبردار نے بتایا کہ آپ کی رہائی کے کاغذات آگئے ہیں، مولانا نے خاموشی سے سنا۔ بعد میں جذبات اُمڈ آئے تو کہنے لگے کہ "جب وہی شخص دُنیا میں نہ رہا جس کی رفاقت میں رہنے سے زندگی، زندگی تھی۔ تو پھر میں رہا ہو کر کیا کروں گا میرے لئے رہائی میں اب کون سی خوشی باقی رہ گئی ہے، جیل سے باہر اب میرے لئے کیا دلچسپی ہوگی؟ ...... اس کے بعد پھر بولے تو کہا کہ "میں مودودی صاحب کو ایک بڑا اور بہت بلند آدمی سمجھتا تھا۔ ایسے کم آدمی پیدا ہوتے ہیں، مگر آج تک ان کو اتنا بڑا نہیں سمجھتا تھا، جتنا وہ آج بڑے ہو گئے ہیں۔ مجھے اس کا کبھی اندازہ نہیں تھا کہ خدا نے ان کے لئے ایک ایسی سعادت مخصوص کر رکھی ہے کہ وہ اس کے دین کی راہ میں ایک دن پھانسی کی سزا پائیں گے، اللہ تعالیٰ نے ان کو ہزار ہا ہستیوں میں سے چن کر ایک اونچے مقام پر لا کھڑا کیا ہے"

(چراغ راہ، مارچ ۱۹۵۴ء۔ صفحہ ۷۴، ۷۵)

"مولانا اصلاحی صاحب مولانا مودودی کے ہاتھ اور کپڑوں کو چوم لیتے ہیں"

"تھوڑے وقفہ کے بعد مولانا اصلاحی نے فرمایا ———— بھئی! مجھ سے ایک ایسی حرکت بھی سرزد ہو گئی ہے جو اس سے قبل ساری زندگی میں کبھی نہیں ہوئی تھی اور نہ آئندہ ہونے کا اندیشہ ہے ———— ظہر تک مولانا نے اپنا بیان مجھے (یعنی اصلاحی صاحب) کو پڑھنے کے لئے دیا اور جب میں نے نماز کے بعد اسے پڑھا تو مجھے احساس ہوا کہ مولانا مودودی کے صبر و ضبط اور سکون و اطمینان کا جب بھی کوئی اندازہ لگایا تو وہ ہمیشہ اس سے کچھ زائد نکلے، خود اس بیان کو دیکھ کر یہ اندازہ ہی نہ ہوتا تھا کہ اس کا مصنف ابھی ابھی ایک طویل قید تنہائی سے نکلا ہے۔ اور گزشتہ رات ہی کو اسے ایک سخت قسم کی اعصابی جنگ سے سابقہ پیش آ چکا ہے۔ نہ غصہ، نہ جھنجلاہٹ نہ سختی نہ درشتی بلکہ اس کی بجائے وہی باوقار انداز، سنجیدہ طرزِ بیان، ٹھوس دلائل اور ٹھنڈا طریق استدلال شاید یہ اسی تاثر کا نتیجہ تھا کہ جب میں باہر جانے سے قبل مولانا سے رخصت ہونے اور ان کا تحریری بیان واپس کرنے کے لئے اُن کے پاس گیا تو معانقہ کے ساتھ بے ساختہ ان کے ہاتھوں کو چوم لیا، جن میں اللہ تعالیٰ نے قلم کی مدد سے اظہار حق کی کیسی قدرت

ودیعت فرمائی تھی (چراغ راہ احتجاج نمبر، اکتوبر و نومبر ۱۹۵۳ء)
مضمون "آہنی سلاخیں اور آہنی عزائم" از سلطان احمد صاحب)

اور

"کپڑے نقی علی کے ہاتھ سے امین اصلاحی صاحب نے لے لئے ہیں، اور شاید اپنی عمر میں پہلی مرتبہ ان جیسے شخص نے ان کپڑوں کو چوم لیا اور آنکھوں سے لگایا۔ (چراغ راہ جنوری ۱۹۵۴ء صفحہ ۴۲)

شخصیتوں کے بارے میں مولانا امین احسن اصلاحی کی تحریروں میں جو یہ شدید تضاد پایا جاتا ہے اسے دیکھ کر کوئی اجنبی شخص جو مولانا موصوف کے مزاج و طبیعت، علم و سیرت کا پہلے سے علم نہیں رکھتا، مولانا کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم نہیں کر سکتا، وہ یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مولانا اصلاحی صاحب جسے قدر و منزلت کے عرش پر بٹھا سکتے ہیں، اس بیچارے کو استخفاف و ذلت کی پستی میں بھی اتار سکتے ہیں، ان کا قلم سر پر زریں تاج بھی رکھ سکتا ہے، اور اسی سر سے تاج اتار کر اسے نمدے کی ٹوپی بھی پہنا سکتا ہے۔

وہ شخص جاہل ہے جو مولانا اصلاحی صاحب کے علم و فضل میں شک کرتا ہے علم و فضل کے ساتھ وہ صاحب تقویٰ بھی ہیں، کوئی خوف انہیں مرعوب نہیں کر سکتا اور کوئی طمع انہیں پرچا نہیں سکتی، وہ طبعاً حق شناس اور حق پسند ہیں، اور دین کی خیر خواہی کا بے پناہ جذبہ اپنے اندر رکھتے ہیں، ان کی ذات میں بڑی دل کشی اور ان کی صحبت میں بڑی دلچسپی پائی جاتی ہے۔ ان کی صحبت میں دل نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے، سیرت و کردار کی ان تمام خوبیوں کے ساتھ ان کے مزاج میں بڑی حدت اور طبیعت میں غضب و غصہ کی غیر معمولی گرمی پائی جاتی ہے، ان کے مزاج کی اس حدت و تیزی کا ہمیں ذاتی طور پر تجربہ ہے۔

۱۹۵۲ء میں (سابق) جماعت اسلامی کا سالانہ اجلاس کراچی میں منعقد ہوا تھا۔ راقم الحروف کا زیادہ وقت مولانا اصلاحی صاحب کی خدمت میں گزرتا تھا، مولانا موصوف بڑی شفقت سے پیش آتے تھے، اس مدت میں نہ جانے دین کے کتنے مسائل میں نے ان سے پوچھ ڈالے اور ان کے مطمئن کن جوابات سے میرے دل کی کتنی گرہیں کھل گئیں، شعر و شاعری کا ذکر چھڑتا تو میں ٹال جاتا، اس میں میری خود غرضی بھی شامل تھی، کہ میں جتنی دیر شعر خوانی کروں، اتنا وقت مولانا کے افادات کی خوشہ چینی میں کیوں نہ صرف کروں۔

کسی نہ کسی درجہ میں یہ تو فرض کیا جاسکتا ہے کہ ایک شخص کی کمزوریاں خوبیوں سے بدل جائیں اور اس میں وہ معائب باقی نہ رہیں، جن پر گرفت کی گئی تھی اور یہ بھی ممکن ہے کہ دوسرے شخص کی جن خوبیوں کو سراہا گیا تھا وہ کمزوریاں بن جائیں مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ کردار کی کمزوریوں کے ساتھ ایک شخص جو پہلے صرف و نحو جانتا تھا، اب وہ صرف و نحو کو بھول جائے، جس کی عربی دانی کی تعریف کی جاتی تھی، اب وہ غیر عربی داں ہو جائے، جس کے علم و فضل کو سراہا جاتا تھا، اب وہ علم و فضل سے کورا ہو جائے، یہ تو کسی شخصیت کی وہ صفات ہیں، جو فسق کیا کفر و الحاد کے ساتھ بھی باقی رہتی ہیں مولانا اصلاحی صاحب ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ جس کو وہ "داعی و مصلح" کہہ چکے ہیں اسے اب کیا کہہ رہے ہیں! یہ مقام حیرت نہیں ہے مقام عبرت بھی ہے!

ہم مولانا موصوف سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے مزاج و طبیعت اور نگارش و تحریر پر نظر ثانی فرمائیں کہ حق پسندی کا یہی تقاضا ہے!

(م۔ق)

کبھی کبھی تو یہ لمحے نصیب ہوتے ہیں

(سابق) جماعت اسلامی کے کیمپ کا انتظام مثالی انتظام تھا۔ ہر چیز قاعدے قانون کے مطابق! مطبخ اور دار الطعام کی سمت ایک دو رضاکار ہر وقت متعین رہتے تھے، اور اُدھر کوئی شخص "بلا" دکھائے بغیر نہیں جا سکتا تھا، رات کو عشاء کی نماز کے بعد مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کسی ضرورت سے اُدھر گئے۔ تو رضاکار نے جو غالباً یا تو مولانا موصوف کو پہچانتا نہ تھا، یا وہ انتہائی فرض شناس، قانون قاعدے کا آدمی تھا، اس نے مولانا سے "بلا" مانگا۔ تو مولانا کے پاس "بلا" (بیج) نہ تھا اس پر وہ وہاں سے غصہ میں بھرے ہوئے لوٹے ان کی فرودگاہ میں میرے علاوہ دو تین صاحبان اور تھے، اور جماعت کے کارکن صادق حسین صاحب بھی تھے، اور نہ جانے کیا ان کی شامت ان کو وہاں لے آئی تھی، مولانا اصلاحی صاحب نے صادق حسین صاحب پر جو برسنا بگڑنا اور گرجنا شروع کیا ہے تو بیچ مچ اُس غریب کے لتّے لے ڈالے، "ایسی تیسی" کا لفظ تک استعمال فرمایا، یہ بھی کہا کہ یہ کہاں کے جاہل لوگ ڈیوٹی پر رکھ لئے ہیں۔ میں نے اس کے چانٹا مار دیا ہوتا۔ میں ابھی اس کیمپ سے چلا جاؤں گا دشمن کے کیمپ میں بھی اتنی ذلت نہیں ہو سکتی ...." صادق صاحب کے ضبط و تحمل کی داد دینی چاہئے کہ بڑی خاموشی کے ساتھ سب کچھ سنتے رہے، مولانا موصوف کا موڈ اتنا بگڑا ہوا تھا اور ان کے غصہ کا پارہ اتنا چڑھا ہوا تھا کہ جماعت کا کوئی کارکن ایک حرف بھی منہ سے نکالتا، تو وہ اپنا بستر اور سامان لے کر جماعت کے کیمپ سے غالباً چلے جاتے ——————— حالانکہ صادق حسین صاحب کہہ سکتے تھے کہ حضرت! جس شعبہ کے آدمی سے آپ کو شکایت پیدا ہوئی ہے، اس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے، پھر اس رضاکار نے تو انتہائی فرض شناسی کا ثبوت دیا ہے، وہ زجر و توبیخ کا نہیں بلکہ تحسین و ستائش کا مستحق ہے، پھر آپ وہ ہیں کہ امیر جماعت کے بعد آپ ہی کا درجہ اور شخصیت ہے، آپ کو تو سب سے زیادہ جماعت کے قانون قاعدے کی پابندی کرنی چاہئے، انگلستان کے ایک وزیر اعظم نے تو ٹریفک کے سپاہی کا اس فرض شناسی پر عہدہ بلند کر دیا تھا کہ اُس کی موٹر کار سپاہی نے روک دی تھی۔ اور وزیر اعظم کے یہ جتانے پر کہ میں "لائڈ جارج ہوں" سپاہی نے وقت سے پہلے اس کی کار کو آگے نہیں بڑھنے دیا۔

غضب و غصہ کے وقت آدمی پر ذہول طاری ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کا حافظہ بھی ساتھ نہیں دیتا، مولانا امین احسن اصلاحی پر یہی عالم گزرا ہے کہ مضمون لکھتے وقت انہیں یاد ہی نہیں رہا کہ جن شخصیتوں کی وہ تعریف یا تنقیص کر رہے ہیں، ان کے بارے میں وہ اس سے پہلے کن خیالات کا اظہار کر چکے ہیں، اور اس کھلے ہوئے تضاد کو دیکھ کر پڑھنے والے ان کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے؟ غضب و غصہ کی شدت کے عالم میں "اظہار حق" کا بھی کسی پردہ پڑ جانے کا بولنے والی زبان اور لکھنے والا قلم "حجاج کی تلوار" بن جاتے ہیں، مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اعتدال مزاج کی حالت میں جب بھی کچھ لکھیں گے۔ وہ تحریر شاہکار ہوگی، مگر غضب و غصہ کے عالم میں ان کے خامہ شرر بار سے اعتدال کی توقع کم ہی کی جا سکتی ہے!

خدا دلوں کا حال جانتا ہے کہ اتنی کچھ تنقید و احتساب کے بعد بھی ہمارا دل مولانا امین احسن اصلاحی کے احترام*

---

* علاوہ اس کا کبھی خطرہ تک ذہن میں نہ آیا تھا کہ اس واقعہ کو اس طرح بر ملا کہنا پڑے گا، آدمی کو بعض وقت طبیعت کے خلاف کیسی کیسی ناخوشگوار باتوں کا اظہار کرنا پڑ جاتا ہے۔ توبہ! م۔ ق

معلوم ہے، کسی مسئلہ میں اختلاف کے باوجود ہماری نیاز مندی اُن کے ساتھ بدستور رہے گی، ایک بار مولانا محترم نے راقم الحروف کے ایک نیاز نامہ کے جواب میں تحریر فرمایا تھا کہ:۔

"جو جگہ میرے دل میں آپ کے لئے ہے وہ کسی کے لئے بھی نہیں ہے"۔

خدا کرے ہمارا یہ فخر و مسرت کبھی مجروح نہ ہو! روابط و مراسم کی دنیا میں شکوے شکایت کے مواقع بھی آتے ہی رہتے ہیں ـــــــ کہ سہ

جس سے ہوتی ہے امید اُس سے گلہ ہوتا ہے

پروفیسر اسرار احمد سہاروی

وحدتِ ادیان

وحدتِ ادیان کے مسئلہ پر آج کل بھارت میں بڑی گرماگرم بحث ہو رہی ہے، اور اس مسئلہ سے دلچسپی رکھنے والے بہت سے حضرات حق القد
اس میں حصہ لے رہے ہیں خصوصاً مولانا آزاد کے عقائد کو اس ضمن میں زیر بحث لایا جا رہا ہے۔ "الجمعیت دہلی" کے آزاد نمبر میں اس سلسلہ میں کا
خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ وحدتِ ادیان کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک تو اسلامی مفہوم ہے یعنی کہ دین فطرت ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے اسی کو تمام
انبیاء و رسل نے پھیلانے کی کوشش کی ہے اس دین کے بنیادی احکام تقریباً ایک ہی رہے ہیں۔ فروع میں ہر نبی کے زمانہ میں کچھ تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں
یہاں تک کہ آخری نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا خاتمہ ہو گیا اور اس دین فطرت کو مکمل کر دیا گیا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خود فرما دیا: "اتممت
علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا....... یعنی تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تمہارے لئے پوری کر دی اور تمہا
لئے دین اسلام کو پسند فرمالیا۔ اس آیت کریمہ سے کئی باتیں بالکل واضح ہو جاتی ہیں یعنی، اول یہ کہ اس وقت تک دین مکمل نہیں تھا۔ جس میں کچھ ک
باقی تھی۔ اور یہ کہ وہ دین جو ابتدائے آفرینش سے صحیح دین تھا اسکا نام اسلام ہے یہیں سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ اسلام کی وہی کیف
اور وہی درجہ مطلوب اور مقصود تھا جبکہ اسکو مکمل کر دیا گیا۔ اب یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ دین جبکہ مکمل ہو گیا تو پھر خداوند تعالیٰ
یہ مقصد نہیں ہو سکتا کہ اس تکمیل کے بعد بھی لوگ نامکمل دین کی بھی پیروی کرتے رہیں۔ دین کے مکمل ہونے سے پہلے تو اسکی اجازت ہو سکتی
لیکن مکمل ہونے کے بعد تو نامکمل کو چھوڑ کر اس مکمل کو اختیار کرنا چاہیئے۔ اور جو نامکمل سے ہی چپٹا رہے گا تو ظاہر ہے کہ وہ خسارے میں رہے گ
اور یہ اسکی بڑی نادانی ہوگی اور یقیناً اس خسارے کی تلافی کسی دوسری عبادات یا ریاضات وغیرہ سے نہیں ہو سکے گی۔ یہ کوتاہی بہرحال اپنے نتا
پیدا کر کے رہے گی۔ اس کوتاہی اور انکار کی سزا لوگوں کو ضرور ملے گی خواہ وہ کتنے ہی نیکوکار اور عبادت گزار کیوں نہ ہوں۔ سزا کے بعد اگر خد
چاہے تو ان کی نجات دے سکتا ہے یہ اسکی اپنی مرضی ہے۔ اسکے بارے میں کوئی قطعی حکم لگانا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن یہ معاملہ بھی ان لوگو
کا ہے جو دین فطرت کے اس کی کسی نہ کسی صورت میں پیرو رہے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو کھلے شرک میں مبتلا رہے اور دین فطرت کی طرف مائل
نہیں ہوئے، اور سچے نبیوں اور رسولوں کو جھٹلاتے رہے۔ ان کی نجات کا امکان نظر نہیں آتا۔ دوسرا مفہوم غیر اسلامی معلوم ہوتا ہے
اور وہ یہ ہے کہ کوئی مذہب اور کوئی فرقہ کیوں نہ ہو۔ دین فطرت کا پیرو رہا ہو یا نہ رہا ہو۔ مشرک ہو یا موحد ہو اگر عمل صالح کرتا رہے
تو باوجود بدعقیدہ ہونے کے نجات حاصل کر سکے گا۔ بعض لوگ اس میں یہ ترمیم کرتے ہیں کہ خواہ کوئی ہو اگر توحید پر عقیدہ رکھتا ہے اور نیک ع
کرتا ہے تو وہ ناجی ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ یہ عقیدہ کسی مسلمان کا نہیں ہو سکتا۔ یہودی، عیسائی، صابی وغیرہ فرقوں کی کیفیت تو میرے نزدیک
یہ ہے کہ اہل کتاب ہونے کی حیثیت سے ان کا دین دین فطرت تھا۔ اور اسلام ہی کی ایک غیر مکمل صورت تھی۔ لیکن وقت گزرنے پر لوگوں
اصل کتابوں اور انکے قوانین کو بھلا دیا۔ اسلئے ان کی شریعت منسوخ ہوتی چلی گئی۔ دوسری شریعت آنے تک ایسے لوگ غالباً معذور سمجھے جا
گے لیکن جب نئی شریعت آگئی تو پھر ایسے لوگوں پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ نئی شریعت کو اختیار کریں۔ لیکن مشرکین کا حکم دوسرا ہوگا۔ وہ
دین فطرت کی طرف کبھی مائل ہی نہیں ہوئے۔ ان کی نجات ظاہری احکام دیکھتے ہوئے تو نہیں ہو سکتی۔ یوں خدا بے نیاز اور اپنی مرضی کا مخ
ہے۔ جو چاہے کرے۔ بظاہر تو ہر شخص کے لئے توحید اور عمل صالح کے ساتھ ساتھ سچے رسولوں کی پیروی۔ کسی نہ کسی شریعت کی پابندی بھی لاز

ہوتی ہے۔ عمل صالح کا آخر کوئی معیار ہونا چاہیئے اگر کوئی شخص کسی شریعت کا پیرو نہیں تو اس کے لیے عمل صالح کا معیار کیا ہوگا۔ یا یہ مطلب ہے کہ جس کو چاہے وہ اعمال صالحہ کی فہرست میں داخل کرے اور جس کو چاہے اس فہرست سے خارج کر دے۔

بعض قرآنی آیات اور احادیث نبوی سے بھی یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ظہور اسلام کے بعد غیر اسلامی دوسرے مذہب کی پیروی کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ مثلاً قرآن کریم میں آتا ہے "ومن لم یومن باللہ ورسولہ فانا اعتدنا للکفرین سعیرا" (سورہ الفتح رکوع ۲) یعنی جو خدا اور رسول کریم صلعم پر ایمان نہ لایا اس کے لئے دوزخ تیار ہے۔ اس آیت میں یہودی، عیسائی وغیرہ کو مستثنیٰ قرار نہیں دیا گیا بلکہ ایک عام حکم ہے۔ اس سے ہر شخص پر خدا اور رسول کی اطاعت واجب ہو جاتی ہے۔ ایک اور جگہ فرمایا ہے "قل یاایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعاً" (سورہ نساء ع ۲۱) اس آیت میں تمام انسانوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہہ دیجئے کہ میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ انسانوں میں کسی کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا ہے۔

ایک اور آیت میں خدا کی محبت کا سزاوار اس کو قرار دیا گیا ہے جو نبی کریم سے محبت رکھتا ہو "ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ" اس کے علاوہ اگر تمام امتیں برابر ہی نجات اور انعام کی مستحق ہوتیں تو اس آیت کریمہ کا کیا مقصد ہو سکتا تھا۔ "کنتم خیر امۃ اخرجت للناس" بہترین امت سے آخر امت مسلمہ کو کیوں خطاب کیا گیا۔ اسی قسم کی بہت سی آیات جمع کی جا سکتی ہیں مگر ہم فی الحال اسی پر اکتفا کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں ایک دو حدیثوں کا ذکر کر کے اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔

مشکوٰۃ شریف میں بحوالہ احمد و بیہقی حضرت جابرؓ سے روایت ہے اسکا آخری حصہ قابل غور ہے جس میں رسول اللہؐ نے فرمایا۔ "لوکان موسیٰ حیاً ماوسعہ الا اتباعی" یعنی اگر حضرت موسیٰؑ بھی زندہ ہوتے تو ان پر بھی میری پیروی فرض ہوتی۔ اب اس کے بعد کیا گنجائش ہو سکتی ہے کہ کوئی مسلمان یہ عقیدہ رکھے کہ یہودی یا عیسائی بغیر رسول کریم کی پیروی کے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ اس حدیث کو غلط ثابت کر دیا جائے۔ اس قسم کی اور بہت سی احادیث بھی ملتی ہیں۔ ان حالات میں کسی مسلمان کا عقیدہ یہ نہیں ہو سکتا کہ دنیا کے تمام دین برابر ہیں۔ اور نجات کے لئے رسول کریم پر ایمان لانا اور ان کی شریعت کی پیروی کرنا ضروری نہیں۔

اب اس سلسلہ میں مولینا آزاد کے متعلق بھی چند باتیں عرض کر دی جائیں۔ میرا خیال یہ ہے۔ مولانا کے متعلق یہ رائے قائم کرنا کہ وہ وحدت ادیان کے غیر اسلامی عقیدے کے پابند تھے حسن ظن اور حقائق کے خلاف ہوگا۔ البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے ماحول کو اور وہاں کے مسلمان حضرات کی نازک پوزیشن کو دیکھتے ہوئے ہندوؤں کی تالیف قلب[1] کی کوشش کی ہے۔ اور سورہ بقرہ کی تفسیر میں "ان الذین امنوا والذین ھادوا والنصاریٰ والصابئین" کے مقام پر کچھ معذرت کا کمزور پہلو اختیار کر لیا ہے۔ اس معذرت کے پہلو پر حکم لگاتے وقت ہمیں بھی بھارت کے مسلمانوں کی حالت کا کچھ خیال رکھنا چاہیئے۔ اور کسی حد تک مصلحت اندیشی کی گنجائش نکالنی چاہیے۔ اس کے علاوہ ایک کی تفسیر کے اس مقام میں یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ مولانا مرحوم نے معذرتی مباحث کو کافی طول دیکر بھی یہود و نصاریٰ و مشرکین کے متعلق کوئی واضح محاکمہ نہیں کیا۔ یہ خاموشی البتہ کھٹکتی ہے۔ یہ بھی غالباً مصلحت کے تحت ہی کیا گیا ہے ورنہ مولینا کا ذہن اس بارے میں بھی صاف

---

[1] ایسی تالیف قلب جس کی زد دین کے کسی بنیادی عقیدے پر پڑتی ہو۔ اللہ اور رسول کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہو سکتی! مولینا ابوالکلام آزاد مرحوم نے یہ تفسیر تقسیم ہند کے بعد نہیں لکھی تھی جبکہ ہندوستان کے مسلمان سخت خطرے میں تھے۔ بلکہ یہ بہت پہلے کی لکھی ہوئی ہے جبکہ کانگریسی ہندو خود مسلمانوں کی "تالیف قلب" کی طرف مائل تھے، مولینا آزاد کی اس تفسیر نے خطرناک ترین گمراہی کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اس گمراہی سے ہر مسلمان کو اظہار بیزاری کرنا چاہیے۔ (م۔ ق)

تھا۔ اور اس بارے میں مولانا نے دوسرے مقامات پر اپنے اعتقادات کی وضاحت فرما دی ہے۔ میرے خیال میں مولانا کی مجبوریوں کو دیکھتے ہوئے ہمیں ان وضاحتوں کو قبول کر لینا چاہیے۔

نظریہ متحدہ قومیت کے سلسلہ میں مولانا آزاد نے اجلاس کانگرہ میں مندرجہ ذیل تقریر فرمائی۔

"_____ میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو سال کی شاندار روایتیں میرے ورثہ میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اسکا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اسکی حفاظت کروں۔ لیکن ان تمام.... احساسات کے ساتھ میں ایک اور بھی احساس رکھتا ہوں۔ جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اور اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی بلکہ وہ میری اس راہ میں رہنمائی کرتی ہے۔ اور میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں ـــ" (آزاد نمبر۔ الجمعیتہ دسمبر ۱۹۵۸ء)

مندرجہ بالا آزاد نمبر میں ہی مولانا محمد میاں ناظم جمعیت علمائے ہند کا ایک مضمون شائع ہوا ہے اس میں لکھا ہے کہ جنوبی افریقہ کے مسلمانوں میں کسی احمد سنت صاحب نے مضمون نگار سے سوال کیا تھا کہ اگر کسی غیر مسلم کو اسلام کی صداقت و حقانیت کا یقین نہ ہو اور محمد رسول اللہ پر ایمان نہ ہو، تو یہ عدم ایمان قابل مواخذہ ہوگا یا نہیں۔ ہر غیر مسلم یہودی، نصاریٰ، مشرک سب کو نیک عمل کا پورا اجر ملے گا یا نہیں اسکا جواب محمد میاں صاحب نے مولانا آزاد مرحوم سے دریافت کیا تو انھوں نے یہ جواب لکھوا دیا۔ " قرآن نے ایمان، نجات کے لئے بات کو بنیادی شرط کے قرار دی ہے کہ تفریق بین الرسل نہ کی جائے یعنی تمام انبیاء پر بلا استثنا ایمان لایا جائے۔ جو غیر مسلم حضرات خاتم النبین صلعم پر ایمان نہیں لاتے وہ تفریق بین الرسل کرتے ہیں اور یہ کفر ہے۔ البتہ قرآن نے یہ ضرور کہا ہے کہ ہر عمل کی ایک جزا ہے اور وہ عامل کو ضرور ملتی ہے۔" (یعنی اگر کافر نیکی کریں گے تو ان کو اس کی جزا ضرور ملے گی خواہ وہ تفریق بین الرسل کی وجہ سے نجات پا سکیں یا نہ پا سکیں۔)

اس میں شک نہیں کہ مولانا ہندو مسلم اتحاد کے بہت بڑے حامی تھے۔ اور ہمیشہ ہے اور اسی رعایت سے انھوں نے اپنی "تفسیر" میں بعض ... کمزوریاں پیدا کر دیں اور ان میں سے ایک یہ وحدت ادیان کا تصور بھی ہے۔ ان کی سورہ بقرہ کی تفسیر میں اس مسئلہ پر خاموشی کہ رسالت نبوی اور شریعت محمدی پر نجات کے لئے ایمان لانا ضروری ہے یا نہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے ایک فتنہ سا بن گیا ہے۔ اور کمزور طبیعت کے لوگ اسکا سہارا لیکر حد سے تجاوز کرتے نظر آتے ہیں۔ اور علی الاعلان کہہ رہے ہیں کہ رسالت پر ایمان نجات کے لئے ضروری نہیں۔ ہندو بھی اسکا سہارا لیکر مسلمانوں کو ورغلانے کی اور ان کے ایمان میں کمزوری پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن مولانا آزاد یقینی اس حد تک جانا نہیں چاہتے تھے۔ اور یہ بات ان کے افریقہ کے خط کے جواب نے ثابت کر دی ہے۔ اور ایک مسلمان ان آیات و احادیث کی روشنی میں جن کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کس طرح یہ عقیدہ رکھ سکتا ہے کہ تمام مذاہب کے پیرو ناجی ہیں اور شریعت نبوی اور رسالت پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ مثلاً اس قسم کی واضح آیات کی کوئی کیا تفسیر پیش کر سکتا ہے جن میں اسلام کو تمام ادیان پر فوقیت دی گئی ہے۔ اور اسکا ظہار ہے کہ اسلام کو ہی تمام ادیان پر غالب ہونا چاہیے۔ ایک جگہ فرمایا، "ھوالذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولوکرہ الکافرون" یعنی اس نے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ تمام دین پر حاوی کر دے خواہ کافروں کو کتنا ہی برا کیوں نہ لگے۔

اس کے بعد میں مولانا سید سلیمان ندوی کے خطبات مدراس میں سے کچھ تلخیص پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جہاں مرحوم نے بڑے واضح نظریہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام کے سامنے اب کسی دوسرے مذہب کی پیروی عقلاً بھی کسی طرح ممکن اور مناسب نہیں۔ ضد اور ہٹ دھرمی کی

بات ہے ......

"انبیاء علیہم السلام میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے وقت میں اپنی اپنی قوموں کے سامنے اس زمانہ میں مناسب حال اخلاق عالیہ اور صفات کاملہ کا ایک نہ ایک بلند ترین معجزانہ نمونہ پیش کیا ہے۔ کسی نے صبر، کسی نے ایثار، کسی نے جوش توحید، کسی نے تسلیم و رضا، کسی نے زہد، غرضیکہ ہر ایک نے زندگی کے پر پیچ راستے میں ایک ایک مینار قائم کر دیا ہے۔ مگر ضرورت تھی ایسے رہنما کی جو اس سرے سے اس سرے تک پوری راہ کو اپنی ہدایات اور عملی مثالوں سے روشن کر دے۔ یہ رہنما سلسلۂ انبیاء کے آخری فرد محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔"

تاریخیت وہ سیرت یا نمونہ حیات جو انسانوں کے لئے رہنما سیرت کا کام دے اس کے لئے مستند دستاویز کی ضرورت ہے۔ جس میں پہلی اور اہم ترین شرط تاریخیت ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ ایک رہنما انسان کے جو سوانح اور حالات پیش کئے جائیں وہ تاریخی روایت کے لحاظ سے مستند ہوں۔ ان کی حیثیت قصوں اور کہانیوں کی نہ ہو۔ کسی مذہب کے کسی رہنما کی سوانح کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تاریخی طور پر مستند ہیں۔ اس معیار پر اگر کوئی سوانح پوری اترتی ہے تو وہ نبی آخر الزماںؐ کی سوانح حیات ہے۔

کاملیت کسی انسانی سیرت کے دائمی عملی نمونہ بننے کے لئے یہ چیز بھی ضروری ہے کہ اس کی صحیفۂ حیات کے تمام حصے ہماری نگاہوں کے سامنے ہوں۔ اس معیار پر اگر بانیان مذاہب کے سوانح کو اور سیرتوں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ رسول کریمؐ کے سوا کوئی ہستی اس معیار پر پوری نہیں اترتی۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور خاتم الانبیاء ہو کر دنیا میں تشریف لائے۔

جامعیت جامعیت کے معنی یہ ہیں کہ رہنما کی زندگی میں ہر پہلو سے متعلق حالات مل سکیں۔ مثلاً معاشرتی، معیشی، سیاسی، روحانی وغیرہ۔ ان تمام تفاصیل سے دوسرے انبیاء و رسل کی زندگیوں کے حالات یکسر خالی ہیں۔ صرف ایک ایک دو دو پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ باقی پہلو واضح اور روشن نہیں ہیں۔

عملیت عملیت سے مطلب یہ ہے کہ بانی مذہب جس تعلیم کو پیش کر رہا ہو خود اس کا ذاتی عمل اس کی مثال اور نمونہ ہو اور خود اس کے عمل نے اس کی تعلیم کو عملی یا قابل عمل ثابت کیا ہو۔ اس معیار پر بھی سیرت محمدیؐ ہی پوری اترتی ہے اور یہی چیز اس کا ثبوت ہے کہ محمد رسول اللہؐ تمام دنیا کی قوموں کے لئے اور قیامت تک کے لئے نمونہ عمل اور قابل تقلید بنا کر بھیجے گئے تھے اس لئے آپ کی سیرت کو ہر حیثیت سے مکمل کیا گیا اور یہی ختم نبوت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

محمد عربی کآبروئے ہر دو سراست
کسیکہ خاک درش نیست خاک برسر او

رشید کوثر فاروقی

ادراک

وہ نور وہ رعنائی وہ رنگین نظارے
لمحات جو گہوارۂ فطرت میں گزارے

بے قید زماں آج تصور کی حدوں میں
رقصاں ہے مسلسل انہیں لمحات کا عالم
کیفیت سرگوشی و امواج تبسم
آفاق کے اسرار و اشارات کا عالم
وہ ذہن کے پردے پہ ابھرتے ہوئے افسانے
تاریخ کے آثار و نشانات کا عالم
گرتی ہوئی دھاروں پہ چمکتی ہوئی بجلی
تنہائی کی راتوں میں وہ برسات کا عالم
بادل کی ابھرتی ہوئی مٹتی ہوئی شکلیں
دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کا عالم
نکھری ہوئی شاخوں پہ نہاتی ہوئی کلیاں
پتوں سے ٹپکتے ہوئے قطرات کا عالم
وہ جنبش صد برگ، وہ پھولوں کا تموج
سبزے کی لہکتی ہوئی باتات کا عالم

غنچے پہ وہ شبنم کی ڈھلکتی ہوئی بوندیں
اک تشنۂ تکمیل ملاقات کا عالم
دریا کے کناروں پہ وہ بکھرے ہوئے سورج
آئینہ دکھاتے ہوئے ذرات کا عالم
برفاب کہستاں سے ابلتا ہوا سونا
کرنوں کی اترتی ہوئی بارات کا عالم
مہتاب کی چھیڑی ہوئی موجوں کا تلاطم
فطرت کے مچلتے ہوئے جذبات کا عالم
اشجار پہ چھائی ہوئی حیرت کی ردائیں
ماحول پہ معصوم خیالات کا عالم
وہ نہر کی آغوش میں ہنستے ہوئے جگنو
سمٹی ہوئی شرمائی ہوئی رات کا عالم
آتی ہے کہیں سے مگر آواز کہ شہرِ طلسم
ایک ادب بے احوال و مقامات کا عالم

نادیدہ چمن زار کے نشنیدہ ترانے
اک عالم بے نام کے ناگفتہ فسانے

بہار و نغمہ

شبنم رومانی

چاندنی ہی کی تقلید فرمایئے
احتیاطاً دبے پاؤں آجایئے

میں پریشاں رہوں آپ کو اس سے کیا
آپ تو اپنی زلفوں کو سلجھایئے

یا بھٹکئے "نسیم سحر" کی طرح!
یا کسی "زلف کا پھول" بن جایئے

میں ہوں اپنے لئے اجنبی آجکل
دل کی دھڑکن کا مفہوم سمجھایئے

زندگی موجِ عشرت ہوں یا سیلِ غم
فاتحانہ گذرتے چلے جایئے

لکھ گئے آپ شبنم کے اشعار میں
محفلِ عام ہے ہوش میں آیئے

فضا جالندھری

خاک کہیں رُوداد مصیبت دامن ہمت چھوٹ گیا
یاس نے دل سے ناطہ جوڑا، آس کا رشتہ ٹوٹ گیا

پھولوں سے فردوس ہو گلشن یا کانٹوں سے وحشت بنے
اس طائر کو اس سے غرض کیا جس سے نشیمن چھوٹ گیا

بہت تلاش کی لیکن نشاں نہیں ملتا
چمن ملا ہے مگر آشیاں نہیں ملتا

شریک بزم اگر ہوں تو کس توقع پر
مزاجِ حضرتِ پیرِ مُغاں نہیں ملتا

خان بہادر عالم خان عالمؔ
(سابق دیوان پوڈی اسٹیٹ)

دل میں وہ درد و سوزِ فراواں نہیں رہا
اب کیا جیوں کہ جینے کا ساماں نہیں رہا

وہ ذوق شوق ہے نہ وہ یکسوئی خیال
وہ لطفِ انتظارِ حسیناں نہیں رہا

غم کے بغیر کچھ نہیں انساں کی زندگی
واحسرتا! کہ اب غمِ جاناں نہیں رہا

ہر قطرہ جس کا میرے لئے تھا پیامِ زیست
آنکھوں میں اب وہ چشمۂ حیواں نہیں رہا

ذوقِ نظر بھی چھین لے مجھ سے مرے خدا!
میں جب کسی کے لطف کے شایاں نہیں رہا

پھولوں میں رنگ و بو ہے نہ سبزے میں دلکشی
اب دل کو شوقِ سیرِ گلستاں نہیں رہا

پرساں نہیں ہے کوئی دلِ دردمند کا
کیا شہر بھر میں کوئی مسلماں نہیں رہا

صورت جو دیکھنی ہے تو عالمؔ کی دیکھ جاؤ
جینے کا اب غریب کے امکاں نہیں رہا

دل تاج محلی

نجات غم سے ملے تو پوچھوں یہ گردشِ ایام کیا ہے
ابھی تو یہ سوچنا ہے مجھکو کہ اس تباہی کا نام کیا ہے

عوام سے چاہتا ہے سب کچھ نیا تمدن، نیا زمانہ
کبھی زمانے نے یہ بھی پوچھا کہ آرزوئے عوام کیا ہے

پکار تو لوں انہیں میں لیکن یہ سوچتا ہوں کہ کیا کہونگا
کہیں وہ مجھ سے یہ پوچھ بیٹھے کہ کیوں پکارا ہے کام کیا ہے

تمہارے سائے، تمہارے جلوے، تمہارے عارض، تمہارے گیسو

بہت دنوں سے یہ سوچتا تھا سحر ہے کیا چیز، شام کیا ہے

پیام ہے تو نگاہ سے بھی ادا کرے گی مری محبت

زباں سے کہنا پڑا جو اے دل وہ خودکشی ہے پیام کیا ہے

مشتاق اختر

اک ترے غم کے سوا   دل میں اب کچھ نہ رہا

لالہ و گل کی مہک   تیری خوشبوئے قبا

یہ ترے ہونٹ ہلے   یا کوئی پھول کھلا

نکہتِ گل سے مجھے   تیرا ادراک ہوا

رنگتیں پھیل گئیں   جب ترا ذکر چلا

کتنا تاریک ہے دن   کیوں بجھاتے ہو دیا

ہم کو وہ بھول گئے   اُن سے اتنا تو ہوا

عاصی کرنالی

روح جب چمکتی ہے نورِ ارجمندی سے

فکرِ شعر لاتی ہے عرش کی بلندی سے

بجلیاں گرائی ہیں تم نے خود پسندی سے

اب کسے صدا دو گے طور کی بلندی سے

آپ شورشِ محفل، ہم بھی شورشِ محفل

آپ خود پسندی سے، ہم خدا پسندی سے

کوئی شے نہیں چھوٹی کارگاہِ فطرت میں

شرط یہ ہے، دنیا کو دیکھ مت بلندی سے

میری بیخودی کیا تھی، اک لطیف پردا تھی

میں نے تجھ کو دیکھا ہے کتنی ہوشمندی سے

عشق دل گنوا بیٹھا عشق جان دے بیٹھا

حسن نے نظر ڈالی کس نیازمندی سے

سادگیٔ نظارہ تو کہاں ہے گلشن میں

پھول پھول رنگیں ہے اک نقشبندی سے

شفقت کاظمی

یہی نہیں کہ وہ ہم کو بلا کے پچھتائے

حضورِ دوست میں خود ہم بھی جا کے پچھتائے

انہیں بھی اپنی طبیعت پہ اب نہیں قابو

وہ غمزدوں سے نگاہیں ملا کے پچھتائے

کوئی سکون کا پہلو نہ مل سکا یوں بھی

ہم ان کی یاد کو دل سے بھلا کے پچھتائے

ہزار بار پڑا واسطہ اُنہی سے ہمیں

ہزار بار جنہیں آزما کے پچھتائے

کوئی نہیں جو سُنے بات ہم فقیروں کی

تری گلی میں ترے بعد آ کے پچھتائے

مجالِ ترکِ تعلق بھی کاظمی نہ ہوئی

اگرچہ ان سے تعلق بڑھا کے پچھتائے

رُوحِ انتخاب

الفضل ماشهدت به الاعداء

اسلام کے بارے میں یہ شہادتیں بکثرت ملتی ہیں

۱:- امریکہ کے مشہور عالم ڈریپر کا قول ہے:-

"دنیا کی تاریخ میں کوئی مذہب اتنی جلدی اور اس قدر وسعت کے ساتھ نہیں پھیلا جتنا کہ مذہب اسلام تھوڑے ہی عرصے میں کوہ الطائی سے لے کر بحر الکاہل تک اور ایشیا کے مرکز سے لے کر افریقہ کے مغربی کناروں تک جا پہنچا"

اس قول کو پڑھ کر سوچنا چاہیے کہ اسلام کی یہ حیرت انگیز اشاعت تلوار یعنی جبر و تشدد کے ذریعہ ہوئی تھی یا اپنے اعلیٰ اصول اور مفید تعلیمات کے ذریعہ۔

۲:- سر ولیم میور (لائف آف محمد) کا مصنف جو اسلام کی مخالفت میں شہرت حاصل کر چکا ہے ایک جگہ مندرجہ ذیل الفاظ لکھنے پر مجبور ہو گیا ہے:-

"اسلام نے ہمیشہ کے واسطے توہمات باطلہ کو جن کی تاریکی دنیا پر مدتوں سے چھا رہی تھی کالعدم کر دیا۔ بت پرستی موقوف ہو گئی اور خدا کی وحدانیت اور غیر محدود کمالات اور ہر ایک جگہ محیط قدرت کا مسئلہ حضرت محمد (صلعم) کے معتقدوں کے دلوں اور جانوں میں ایسا ہی زندہ اصول ہو گیا ہے جیسا کہ حضرت محمد صلعم کے دل میں تھا مذہب اسلام میں سب سے پہلی بات جو خاص اسلام کا مفہوم ہے یہ ہے کہ خدا کی مرضی پر کامل بھروسہ اور توکل کرنا چاہیے۔ مذہب اسلام میں یہ ہدایت ہے کہ سب مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ محبت رکھیں یتیموں کے ساتھ نیک سلوک کرنا چاہیے غلاموں کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آنا چاہیے۔ نشہ کی چیزوں کی ممانعت ہے۔ مذہب اسلام اس بات پر فخر کر سکتا ہے کہ اس میں پرہیزگاری کا ایک ایسا درجہ موجود ہے جو کسی اور مذہب میں نہیں پایا جاتا"

۳:- چیمبرز انسائیکلو پیڈیا میں ایک آرٹیکل لکھنے والا اسلام اور اسلامی تعلیم کی نسبت لکھتا ہے کہ:-

"مذہب اسلام کے نہایت کامل اور روشن حصے یعنی قرآن مجید کی اخلاقی تعلیم میں ناانصافی، کذب، غرور، انتقام، غیبت، استہزا، طمع، اسراف، عیاشی، بدگمانی نہایت قابل ملامت قرار دی گئی ہے۔ نیک نیتی، فیاضی، حیا، تحمل، صبر، بردباری، کفایت شعاری، سچائی، راست بازی، ادب، صلح، سچی محبت، اور سب سے پہلے خدا پر ایمان لانا اور اس کی مرضی پر توکل کرنا سچی ایمانداری کا رکن اور سچے مسلمان کی نشانی خیال کی گئی ہے .... یورپ میں علوم و فنون کی ترقی کا اصل سبب بھی اسلام ہی ہوا ہے"

۴:- ڈاکٹر گستاولی بان فرانسیسی لکھتا ہے کہ:-

"جس وقت ہم فتوحات عرب پر نظر ڈالیں گے اور ان کی کامیابی کے اسباب کو ابھار کر دکھائیں گے تو معلوم ہوگا کہ اشاعت مذہب میں تلوار سے مطلق کام نہیں لیا گیا کیونکہ مسلمان ہمیشہ مفتوح اقوام کو اپنے مذاہب کی پابندی میں آزاد چھوڑ دیتے تھے اگر اقوام عیسوی نے

اپنے فاتحین کے دین کو قبول کرلیا اور بالآخران کی زبان کو بھی اختیار کیا تو یہ محض اس وجہ سے تھا کہ انھوں نے اپنے جدید حاکموں کو ان قدیم حاکموں سے جن کی حکومت میں اُس وقت تک تھے، بہت زیادہ منصف پایا ان کے مذہب کو اپنے مذہب سے بہت زیادہ سچا اور آسان پایا۔ یہ امر تاریخ سے ثابت ہو چکا ہے کہ کوئی مذہب بزور شمشیر نہیں پھیل سکتا جس وقت عیسویوں نے اندلس کو عربوں سے فتح کرلیا اس وقت اس مفتوح قوم نے جان دینا قبول کیا لیکن مذہب کا بدلنا قبول نہیں کیا۔ فی الواقع دین اسلام بعوض اس کے بزور شمشیر پھیلایا گیا ہو محض بہ ترغیب اور بزور تقریر شائع کیا گیا ہے اور یہی ترغیب تھی جس نے اقوام ترک و مغل کو بھی جنھوں نے آگے چل کر عربوں کو مغلوب کیا دین اسلام قبول کرنے پر آمادہ کردیا۔ چین میں بھی اشاعت اسلام کچھ کم نہیں ہوئی ہماری کتاب کے ایک دوسرے حصے میں معلوم ہوگا کہ اس ملک میں بھی اسلام کس قدر جلد پھیلا اگرچہ عربوں نے چین میں گز بھر زمین پر بھی قبضہ نہیں کیا تاہم اس وقت چین میں کروڑوں مسلمان ہیں۔" (منقول از تمدن عرب)

(۵) ۔ رابرٹس اپنی تاریخ چارلس پنجم میں لکھتا ہے :۔

"وہ مسلمان ہی تھے جن میں اشاعت مذہب کے جوش کے ساتھ رواداری ملی ہوئی تھی ایک طرف تو وہ اپنے پیغمبر کے دین کو پھیلاتے تھے دوسری طرف اُن اشخاص کو جو اُسے قبول نہیں کرتے اپنے اصلی ادیان پر قائم رہنے دیتے تھے۔"

(۶) ۔ میشور ہبان اپنی کتاب سفر مشرق میں لکھتا ہے کہ :۔

"عیسائیوں کے لئے نہایت افسوس کی بات ہے کہ مذہبی رواداری جو مختلف اقوام میں ایک بڑا قانون ہے مروت ہے عیسائیوں کو مسلمانوں نے سکھایا یہ بھی ایک ثواب کا کام ہے کہ انسان دوسرے کے مذہب کی عزت کرے اور کسی کو مذہب کے قبول کرنے پر مجبور نہ کرے۔"

(۷) ۔ تاریخ جنگ صلیبی میں مذکورہ مصنف میشو لکھتا ہے کہ :۔

"جس وقت حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کو فتح کیا تو انھوں نے عیسائیوں کو مطلق نہیں ستایا۔ برخلاف اس کے جب صلیبیوں نے اسی شہر مقدس کو لیا تو انھوں نے نہایت بے رحمی سے مسلمانوں کا قتل عام کیا اور یہودیوں کو جلادیا۔"

(۸) ۔ فتح بیت المقدس کے متعلق ڈاکٹر گستاولی بان لکھتا ہے :۔

"بیت المقدس کی فتح کے وقت حضرت عمرؓ کا اخلاق ہم پر ثابت کرتا ہے کہ ملک گیران اسلام مفتوح اقوام کے ساتھ کیسا نرم سلوک کرتے تھے اور یہ سلوک اس مدارات کے مقابل جو صلیبیوں نے اسی شہر کے باشندوں سے کئی صدی بعد کیا نہایت حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے حضرت عمرؓ نے اس شہر مقدس میں بہت تھوڑے اشخاص کے ساتھ داخل ہوتے تھے اور آپ نے سفرونیس بطریق سے درخواست کی کہ مقامات مقدسہ کی زیارت میں آپ کے ہمراہ چلے۔ اُسی وقت حضرت عمرؓ نے منادی کردی کہ میں ذمہ دار ہوں کہ باشندگان شہر کے مال اور اُن کی عبادت گاہوں کی حُرمت کی جائے گی اور مسلمان عیسائی گرجوں میں نماز پڑھنے کے مجاز نہ ہوں گے۔ جو سلوک عمرو بن عاص رضؓ نے مصریوں کے ساتھ کیا وہ اس سے کم نہ تھا۔ اس نے باشندگان مصر سے وعدہ کیا کہ انہیں پوری مذہبی آزادی، پورا انصاف بلا رورعایت اور جائداد کی ملکیت کے پورے حقوق دیئے جائیں گے اور اُن ظالمانہ اور غیر محدود مطالبات کے عوض میں جو یونانی شہنشاہ اُن سے وصول کیا کرتے تھے صرف ایک جزیہ لیا جائے گا جس کی تعداد دس روپیہ سالانہ تھی رعایا موبجات نے ان شرائط کو اس قدر غنیمت سمجھا کہ وہ فوراً عہد و پیمان میں شریک ہوگئے اور جزیہ کی رقم انھوں نے پیشگی ادا کردی۔ عمال اسلام اپنے عہد پر اس درجہ مستحکم رہے اور انھوں نے ان لوگوں کے ساتھ جو ہر روز شاہنشاہ قسطنطنیہ کے عاملوں کے ہاتھ سے انواع واقسام

کے مظالم سہا کرتے تھے اس طرح کا عمدہ برتاؤ کیا کہ سارے ملک نے کشادہ پیشانی سے دین اسلام اور عربی زبان کو قبول کر لیا۔ میں بار بار کہوں گا یہ وہ نتیجہ ہے جو ہرگز بزور شمشیر نہیں حاصل ہو سکتا۔"

۹:۔ مصر کے مشہور اخبار ایجپٹ میں ایک مسیحی نے لکھا کہ:۔

"ہم عیسائیت اور اسلام کا مقابلہ کرتے ہیں تو ایک نمایاں فرق یہ نظر آتا ہے کہ عیسائی مذہب کے راستے میں جب علوم و فنون آگئے تو انھوں نے نہایت بیدردی سے اُن کو پامال کیا لیکن اسلام نے خود علوم و فنون کی بنیادیں قائم کیں اور عیسائیت و مجوسیت نے جن شائقین علوم کو شوق علم کے جرم میں جلاوطن کیا اسلام نے اُن کو اپنے دامن میں پناہ دی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "جس طرح عیسائیت علم اور تمدن کے میدان میں اسلام کے دوش بدوش نہیں چل سکی اسی طرح اخلاقی حیثیت سے بھی اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔"

۱۰:۔ بیروت کے ایک مسیحی اخبار الوطن میں ایک مسیحی نامہ نگار نے آنحضرت صلعم کے متعلق ایک مضمون لکھا اس میں وہ لکھتا ہے۔

"پیغمبر اسلام نے مسلمانوں کی قوم کے پھیلنے اور باقی رہنے کے تمام سامان فراہم کر دیے کیونکہ مسلمان جب قرآن و حدیث میں غور کریں گے تو وہ اپنی ہر دینی و دنیوی ضرورت کا علاج اس میں پائیں گے، انھوں نے اپنے پیرووں کے لئے ایک عالمگیر کانفرنس کی بنیاد ڈالی یعنی حج کے ذریعہ تمام دنیا کے صاحب ثروت اور بااثر لوگ ایک جگہ جمع ہو کر آپس میں ربط و اتحاد بڑھا سکتے ہیں۔ انھوں نے زکوٰۃ فرض کر کے فقرائے قوم کا کافی بندوبست کیا کہ قوم میں کوئی فقیر باقی نہ رہے انھوں نے ایک زندہ جاوید زبان مسلمانوں کے لئے قائم کر دی کیوں کہ قرآن عربی زبان میں ہے جس کا سمجھنا ہر مسلمان پر فرض ہے عام افراد قوم کے لئے ترقی کرنا اور ابھرنا آسان کر دیا کیوں کہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان پر سوائے تقویٰ کے اور کسی چیز کے سبب ترجیح نہیں دی۔ مسلمان اپنے پریسیڈنٹ جس کو وہ خلیفہ کہتے ہیں خود انتخاب کرتے تھے۔ غیر مسلم یعنی ذمیوں کے لئے اسلامی ممالک میں عیش و راحت کے ساتھ رہنا آسان کر دیا کیوں کہ حکم دیا کہ تمام مخلوق خدا کی اولاد ہے اور سب سے پسندیدہ خدا کے نزدیک وہ ہے جو اس کی اولاد کو نفع پہنچائے۔ انھوں نے عورت کے مرتبہ کو بلند کر دیا بیت المال کے لئے قواعد مرتب کئے اور حکمت و دانائی کو مسلمانوں کا گم شدہ مال قرار دیا اور اس کے حاصل کرنے کی تاکید کی۔"

۱۱:۔ جون ڈیون پورٹ صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"یہ خیال کہ قرآنی مذہب تلوار کے ذریعہ سے شائع ہوا تھا بالکل غلط ہے کیوں کہ ہر ایک غیر متعصب آدمی ادنیٰ فکر سے معلوم کر سکتا ہے کہ آنحضرت (صلعم) کا مذہب ایسا تھا کہ جس میں، انسان کی قربانی اور خونریزی کی جگہ نماز اور زکوٰۃ قائم کی گئی تھی اور ہمیشہ کے جھگڑوں اور قضیوں کی جگہ باہمی اخلاص و محبت کی بنیاد ڈالی گئی تھی اور یہی باعث ترقی کا ہوا تھا۔ حقیقت میں یہ مذہب اہل مشرق کے واسطے سرتاپا برکت تھا اور آں حضرت (صلعم) نے ہرگز اس قدر خونریزی نہیں کی جس قدر موسیٰ علیہ السّلام نے بت پرستی کی بیخ کنی کے لئے کی تھی۔"

۱۲:۔ مشہور مورخ ایڈورڈ گبن لکھتا ہے کہ:۔

"قدرت کے قانون میں ہر شخص اسلحہ کے ذریعہ اپنی ذات و ملکیت کی حفاظت کا حق رکھتا ہے وہ اپنے دشمنوں کو دفع کر سکتا یا اُن سے زیادتی کا بدلہ لے سکتا ہے اور اپنے انتقام و معاوضہ کو ایک مناسب حد تک وسیع کر سکتا ہے۔ محمدؐ صاحب (صلعم) کو اُن کے ہم وطنوں کی ناانصافی نے اُس وقت محروم و جلاوطن کیا جبکہ وہ اپنے خیر اندیش مذہب اور صلح عامل رسالت پر عامل تھے۔

۱۳:۔ مسٹر ٹامس کارلائل اپنی کتاب "لیکچرز آن ہیروز" میں لکھتا ہے کہ:۔

"اسلام کا آنا عرب کی قوم کے حق میں گویا تاریکی میں روشنی کا آنا تھا عرب پہلے ہی پہل اُس کے ذریعہ زندہ ہوا۔ اہل عرب گلہ بانوں کی

غریب قوم تھی اور جب سے دنیا بنی تھی عرب کے چٹیل میدانوں میں پھرا کرتی تھی اور کسی شخص کو ان کا کوئی خیال بھی نہ تھا۔ اس قوم میں ایک الوالعزم پیغمبر ایسے کلام کے ساتھ جس پر وہ یقین کرتے تھے بھیجا گیا۔ اب دیکھو کہ جس چیز سے کوئی واقف ہی نہ تھا وہ تمام دنیا میں مشہور و معروف ہو گئی اور چھوٹی چیز نہایت بڑی بن گئی اس کے بعد ایک صدی کے اندر ایک جانب غرناطہ اور ایک طرف دہلی ہو گئی .... ایک چنگاری ایسے ملک میں پڑی جو ظلمت میں چھپا ہوا ریگستان تھا مگر دیکھو اس نے زود شور سے اڑ جانے والی بارود کی طرح نیلے آسمان تک اٹھتے ہوئے شعلوں کے ذریعہ دہلی سے تا بہ غرناطہ روشن کر دیا۔

۱۴:۔ جی مایم۔ راڈویل کہتا ہے کہ :۔

"دلیلوں سے ثابت ہے کہ آں حضرت (صلعم) کے سب کام اس نیک نیتی کی تحریک سے ہوتے تھے کہ لوگوں کو جہالت اور بُت پرستی سے چھڑائیں اور یہ کہ اُن کی زیادہ سے زیادہ خواہش یہ تھی کہ امر حق یعنی توحید الٰہی کا جوش جو ان کی روح پر غایت درجہ مستولی ہو رہا تھا اس کا خوب اشتہار و اظہار کریں اُن کی ذات کریم اور سیرت صداقت مشحون کی نسبت اُن لوگوں کا تصور کرنا چاہیئے جن کے اخلاق اور ایمان کو ابنائے جنس کے تمام امور دینی پر کامل اختیار حاصل ہے .... قرآن میں ایک نہایت گہری حقانیت ہے جو ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے جو باوجود مختصر ہونے کے قوی اور صحیح رہنمائی اور الہامی حکمتوں سے مملو ہیں"۔

۱۵۔ جرمن مستشرق عمانویل ڈوئش لکھتا ہے کہ :۔

"قرآن مجید کی مدد سے عربوں نے سکندر اعظم اور رومیوں کی سلطنت سے بڑی دنیا فتح کر لی، فتوحات کا جو کام رومیوں سے سینکڑوں برس میں ہوا تھا عربوں نے اسے اس کے دسویں حصہ وقت میں انجام پر پہنچایا۔ اسی قرآن کی مدد سے تمام سامی اقوام میں صرف عرب ہی یورپ میں شاہانہ حیثیت سے داخل ہوئے جہاں اہل فینشیا بطور تاجروں کے اور یہودی لوگ پناہ گزینوں اور اسیروں کی حالت میں پہنچے۔ ان عربوں نے بنی نوع انسان کو روشنی دکھلائی جب کہ چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی ان عربوں نے یونان کی عقل و دانش کو زندہ کیا اور مغرب و مشرق کو فلسفہ، طب اور علم ہیئت کی تعلیم دی اور موجودہ سائنس کے جنم لینے میں انھوں نے حصہ لیا۔ ہم ہمیشہ اُس روز کا ماتم کریں گے جس دن غرناطہ عربوں کے ہاتھ سے نکل گیا"۔

۱۶:۔ ڈاکٹر سموئیل جانسن لکھتا ہے کہ :۔

"قرآن کے مطالب ایسے ہمہ گیر ہیں اور ہر زمانہ کے لئے اس قدر موزوں ہیں کہ زمانہ کی تمام صدائیں خواہ مخواہ اس کو قبول کر لیتی ہیں اور وہ محلوں، ریگستانوں، شہروں اور سلطنتوں میں گونجتا ہے ...... وہ ایسی کارکن قوت بن گیا جس کے ذریعے سے جس وقت عیسائیت تاریکی کی بلکہ بنی ہوئی تھی یونان اور ایشیا کی تمام روشنی عیسائی یورپ کے گہرے اندھیرے میں پہنچی"۔

۱۷:۔ سار گولیتھ انگریزی ترجمہ قرآن (مترجمہ راڈویل) کے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ :۔

"تحقیقات سے یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ یورپ میں علم کے دور جدید سے کئی صدیوں بیشتر یورپ کے علماء فلسفہ، ریاضی ہیئت اور دیگر علوم کے متعلق جو کچھ جانتے تھے وہ تقریباً سب کا سب اہل عرب کی کتابوں کے لاطینی ترجموں کے ذریعے سے انہیں حاصل ہوا تھا، قرآن ہی نے شروع میں کنایۃً ان علوم کے حاصل کرنے کا ذوق شوق عربوں اور ان کے دوستوں میں پیدا کیا تھا"۔

۱۸:۔ لڈ ولف کریہل جس نے ۱۸۳۴ء میں آں حضرت صلعم کے حالات شائع کئے تھے لکھتا ہے کہ :۔

"قرآن میں عقائد، اخلاق اور ان کی بنا پر قانون کا مکمل مجموعہ موجود ہے اس میں ایک وسیع جمہوری سلطنت کے ہر شعبہ کی بنیادیں بھی رکھ دی گئی ہیں عدالت، حربی انتظامات، مالیات اور نہایت محتاط قانون غربا وغیرہ کی بنیادیں خدائے واحد کے یقین پر رکھی گئی ہیں

۱۹:- ریورینڈر ڈبلیو اسٹیفن لکھتا ہے کہ:-

"آن حضرتؐ نے بُت پرستی کے ایک منتشر انبار کے عوض میں خالص توحید کا عقیدہ قائم کیا۔ آپ نے لوگوں کے اخلاقی معیار کو بلند کیا اور ان کی تمدنی حالت کو ترقی دی اور ایک سنجیدہ اور معقول طریق عبادت جاری کیا آخر کار آپ نے اس ذریعہ سے بہت سے وحشی اور آزاد قبیلوں کو جو محض ذروں کی طرح ادھر اُدھر اڑتے پھرتے تھے باہم ملا کر ایک ٹھوس ملی جماعت کی شکل میں منتقل کردیا۔ آپ ایک ایسے ملک میں پیدا ہوئے تھے جہاں ملکی نظام معقول اعتقاد اور خالص اخلاق سے لوگ ناواقف تھے آپ نے ان تینوں باتوں کو وہاں رواج دیا۔ ملکی حالت، مذہبی اعتقاد اور اخلاقی حالت کی اصلاح کردی بہت سے آزاد قبیلوں کی جگہ آپ نے ایک قوم چھوڑی بہت سے معبودوں اور بہت سے خداوندوں کے باطل عقیدے کی جگہ آپ نے ایک قادر مطلق مگر رحمن و رحیم خدا کا معقول عقیدہ قائم کیا لوگوں کو تعلیم دی کہ وہ اس خیال کے ساتھ زندگی بسر کریں کہ وہ وجود مطلق ہر دم ہمارا محافظ و نگہبان ہے، اسی کو نیکیوں کا جزا دینے والا سمجھیں اور اسی کو بدوں کا سزا دینے والا سمجھ کر اُس سے ڈریں۔ بہت سی قابلِ نفرت اور وحشت انگیز رسمیں جو آپ کے زمانہ تک عرب میں رائج تھیں ان پر آپ نے زبردست حملہ کیا، اوباشانہ بدکاری کی بجائے تعدد زوجات کا ایک با احتیاط اور باضابطہ اصول منضبط کیا گیا۔ دختر کشی کی رسم کا پورا پورا انسداد کیا۔ ترک ہندوستانی حبشی اور بربری اس بات پر مجبور ہوگئے کہ اپنے بتوں کو اٹھا کر پھینک دیں اپنے رندانہ رسم و رواج کو خیر باد کہدیں اور خدائے واحد کی پرستش میں شائستہ طرزِ عبادت اور ایک باقاعدہ طرزِ معاشرت کی طرف رجوع کریں۔ اہل فارس کا عقیدہ بھی صاف اور خالص ہوگیا اور انھوں نے اسلام سے یہ بات سیکھ لی کہ نیکی و بدی کی دو ہمسر قوتیں (یزدان و اہرمن) نہیں ہیں بلکہ نیکی و بدی دونوں اُسی حکیم اور قدوس کے زیرِ فرمان ہیں جو آسمان اور زمین کی تمام چیزوں پر حکمرانی کرتا ہے۔"

۲۰:- ڈاکٹر ڈبلیو ٹی آرنلڈ کی کتاب پریچنگ آف اسلام اسی موضوع پر لکھی گئی ہے کہ "اسلام کی اشاعت بزور شمشیر نہیں بلکہ صلح و آشتی کے ساتھ ہوئی ہے" جو قابل مطالعہ ہے اور اس کا اردو ترجمہ دعوت اسلام کے نام سے شائع ہوا ہے۔

۲۱:- موسیو لیبلی جنھوں نے ایک بے نظیر کتاب مشرق پر لکھی ہے اور جو ایک نہایت محقق اور مذہبی مصنف ہیں اُن کا قول ڈاکٹر گستاولی بان نے اپنی کتاب تمدنِ عرب میں اس طرح نقل کیا ہے:-

"مسلمان اُن نظامات میں جو اقوام مزدوری پیشہ کی بہبودی سے متعلق ہیں اس وقت تک اُن سخت غلطیوں سے بچے ہوئے ہیں جو مغرب میں واقع ہوئی ہیں۔ ان سے اب تک وہ عمدہ نظامات کامل طور سے باقی ہیں جن کے ذریعے سے انھوں نے امیر و غریب غلام و مالک میں صلح قائم رکھی ہے اسی قدر کہنا کافی ہے کہ وہ قوم جس کو تعلیم دینے کا دعویٰ یورپ کر رہا ہے فی الواقع وہ قوم ہے جس سے خود اسے سبق لینا چاہیئے۔"

۲۲:- پروفیسر ایڈورڈ مونٹٹ پروفیسر السنہ مشرقیہ جنیوا یونیورسٹی کہتے ہیں کہ:-

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اصلاح اخلاق اور سوسائٹی کے متعلق جو کامیابی ہوئی اس کے اعتبار سے آپ کو انسانیت کا محسنِ اعظم یقین کرنا پڑتا ہے۔" (آئینۂ حقیقت نما)

ہماری نظر میں

شہادتِ حسینؑ

مرتبہ:- مفتی انتظام اللہ شہابی، ضخامت ۱۴۶ صفحات (مجلد، رنگین گردپوش کے ساتھ) قیمت:- ایک روپیہ آٹھ آنہ، ملنے کا پتہ:- محمد سعید اینڈ سنز، مطبع سعیدی، مقابل مولوی مسافرخانہ، کراچی۔

ایک صاحب ایمان کو حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بارے میں کسی تذبذب اور اندیشہ میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے، حضرت امامؓ کی پوری زندگی حق کی حمایت اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں بسر ہوئی، حق ہی کو بلند کرنے کے لئے آپ نے یزید کی بیعت سے انکار فرمایا، یہاں تک کہ اس کش مکش میں آپ کو اپنا سب کچھ لٹا دینا پڑا۔ اور خود اپنی جان دے کر حق کی وہ شہادت ادا کی کہ:- ؎

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

حق و باطل کی کش مکش کا ایک کلیہ بن کر رہ گیا!

اس کتاب میں جناب مفتی انتظام اللہ شہابی نے حضرت سیدنا امام حسین علیہ السلام کے سوانح حیات اور معرکہ کربلا کے واقعات اثر انگیز انداز میں بیان کئے ہیں! انیسؔ کے مرثیوں کے اقتباسات نے کتاب کی تاریخی حیثیت کو اگرچہ بلند نہیں ہونے دیا مگر درد و اثر کو بڑھا دیا ہے،

حضرت سیدنا امام حسینؓ نے یوم شہادت کی صبح کو اہل بیت اطہار کو تلقین و وصیت فرمائی کہ:-

"میں تم کو خدا کی قسم دلاتا ہوں کہ اگر میں مر جاؤں تو اسوۂ حسنہ کے خلاف نہ کرنا، میری موت پر گریبان نہ پھاڑنا، منہ نہ نوچنا اور نہ بین کرنا" (صفحہ ۶۸)

جو کوئی "غم حسینؓ" کا اظہار ان حرکات سے کرتا ہے جن کی آپ نے ممانعت فرمائی تھی، وہ آپ کی تعلیم کا نافرمان ہے، مشرکانہ رسوم اور خود ساختہ بدعتوں سے "غم حسینؓ" کی توہین ہوتی ہے!

اسبابِ زوالِ اُمت

از:- علامہ شکیب ارسلان، ضخامت ۱۳۸ صفحات (مجلد، خوب صورت گردپوش کے ساتھ) قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:- نور محمد کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ کراچی۔

علامہ شکیب ارسلان کا نام اور کام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے، اس مرد مجاہد اور ادیب شہیر کے قلم نے اسلام کی مدافعت میں تیغ و شمشیر کا کام انجام دیا ہے، اس کتاب میں علامہ مرحوم نے زوالِ اُمت کے اسباب ایک ایک کرکے بیان کئے ہیں........ یہ کہ مسلمانوں میں اخلاقی زوال رونما ہو گیا ہے، اُن کے اندر موت کا خوف اور دولت کی محبت پیدا ہو گئی ہے، جہالت اور کم علمی کے سبب وہ حق و باطل کی صحیح شناخت نہیں کر سکتے، وہ صرف دعاؤں پر بھروسا کئے ہوئے ہیں اور رزمگاہ حیات میں عملی جد و جہد سے محروم

ہیں، اُن میں ایسے علماء پیدا ہوگئے ہیں جنھوں نے علم کو روٹی کمانے کا ذریعہ بنالیا ہے اور وہ غلط کار حاکموں کی رضا جوئی کے لئے دین کے احکام تک کو بدل ڈالتے ہیں اُنکے دلوں میں مایوسی اور بزدلی گھر کر گئی ہے، وہ تن آسان بن گئے ہیں اور محنت و قربانی سے گھبراتے ہیں!

علامہ شکیب ارسلان نے مغرب زدہ حامیانِ ترقی سے ان لفظوں میں خطاب فرمایا ہے:۔

"بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کو تعلیم کی طرف توجہ دلانا مقصود ہو تو قرآن کی طرف رجوع کرنے کی کیا ضرورت ہے ہم یورپ کی طرح ترقی چاہتے ہیں نہ کہ دینی ترقی، ــــــــــ ان اصحاب کی خدمت میں ہمارا جواب یہ ہے کہ ہمارا مقصود بھی ترقی ہے، خواہ وہ ترقی قومی ہو یا دینی لیکن جس چیز سے ہمیں خوف معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر ہم نے اپنی ترقی کی بنیادیں قرآنی تہذیب پر قائم نہ کیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان ملحد، نفس پرست اور گمراہ ہو جائیں گے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس ترقی کا "نقصان" اس کے فائدوں سے کہیں زیادہ ہوگا، کیونکہ جب تک علمی تربیت کے ساتھ ساتھ دینی تربیت کی رہنمائی نہ ہوگی مسلمان کبھی ایک نقطے پر جمع نہ ہوسکیں گے"

کتاب کا ترجمہ رواں اور شستہ ہے، اُردو داں طبقہ میں یہ کتاب، زیادہ سے زیادہ اشاعت کی مستحق ہے۔

طوفان وساحل

از۔ قیصر امراوتوی، ضخامت ۱۶۲ صفحات (مجلد، گردپوش کے ساتھ) قیمت:۔ دو روپے چار آنہ
ملنے کا پتہ:۔ عبدالحفیظ خاں، گنگادھر پلاٹ اکولہ (برار، بھارت)

جناب قیصر امراوتوی صوبہ برار کے قادرالکلام شاعر ہیں، جن کے کلام میں ولولہ اور جوش پایا جاتا ہے، جناب رشید کیفی نے ان کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:۔

"اور (قیصر صاحب) آغا حشر کاشمیری کے دامن سے وابستہ ہوگئے، آغا صاحب اپنی ذات سے اک انجمن تھے، اور ان کی رنگا رنگ اور ہمہ گیر طبیعت نے قیصر صاحب کی سیرت اور ان کے کردار پر بڑے گہرے نقش چھوڑے ہیں"

مگر یہ قیصر صاحب کی سیرت و کردار کا کوئی اچھا تعارف نہیں ہے!

قیصر کے اس مجموعہ کلام (طوفان وساحل) میں اس انداز کی ولولہ انگیز نظمیں بھی ملتی ہیں:۔

وقت کی پکار

سُن ہوش کے کانوں سے ذرا وقت کی آواز ہونے ہی کو ہے دورِ طرب ناک کا آغاز

اک دورِ کشاکش کی بنا ڈال چکا ہے مردودِ جفاکیش و جہاں سازِ خوش انداز

اس سُرخ سویرے کی جھلک دیکھ رہا ہوں اک عالمِ نو جاگنے والا ہے بصد ناز

کلیاں نہ چٹکیں تو کبھی پھول نہ کھلتے ہر رنگ میں تخریب ہے تعمیر کا آغاز

سر کٹنے پہ بھی شمع کی لو تیز رہے گی جھکتا ہی نہیں جبر کے آگے سرِ جانباز

گلشن بھی نہیں دور، نشیمن بھی نہیں دور
رکھتے ہیں پر و بال اگر قوتِ پرواز

یہ اشعار کتنے جاندار ہیں :۔

وطن کی خاک ہی عنبر مری نگاہوں میں ——— وطن کا قطرہ سمندر مری نگاہوں میں
وطن کے ذرے ہیں گوہر مری نگاہوں میں ——— وطن کے خار گل تر مری نگاہوں میں

بہت عزیز ہے مجھکو وطن ، عزیز وطن

ابھی روتی ہوئی آنکھوں کا پردہ آستینیں ہیں ——— ابھی تک سیم وزر کے آستانوں پر جبینیں ہیں
جو دل ہزاروں دُکھا چکے ہیں ، وہی شکارِ گمند ہونگے ——— انہیں پہ برق بلا گرے گی جو بام ، بام بلند ہونگے
کیوں بارشِ خوں سے روز دُھلیں ، رنگین کلس ایوانوں کے ——— کیوں گرمیٔ محفل کی خاطر یوں ڈھیر لگیں پروانوں کے
سینکڑوں سجدوں میں واعظ کو ہوا ہی حاصل ——— زینتِ محفل اربابِ ریا ہو جاتا
جھوم کر سوئے چمن آیا تو کیا برسا تو کیا ——— آشیاں تو کب کا اے ابرِ بہاراں جل گیا
کچھ اپنا درد سُنا شمع ! کچھ ہماری سُن ——— کسے خبر کہ ٹھکانا ہو کل کہاں اپنا
ایک منزل پہ پہنچ کر غم بھی غم رہتا نہیں ——— دوپہر ہوتے ہی جیسے دھوپ ڈھلتی ہے ضرور
بھُلا بیٹھا ہوں یادِ تلخ ، ایامِ گزشتہ کی ——— مگر اب بھی کبھی خوابِ پریشاں دیکھ لیتا ہوں
دل خون ہو رہا ہے مگر اس خوشی کو دیکھ ——— اے غم نصیب ! باغ میں ہنستی کلی کو دیکھ
فریبِ رنگ نہ دے جلوۂ بہار مجھے ——— عزیز تر ہیں چمن میں گلوں سے خار مجھے
دیکھنے آئے تھے میرا حالِ زار ——— درد کی تصویر بن کر رہ گئے
یہی تاریکیاں غم کی پیامِ امن لائیں گی ——— اندھیروں کے پسِ پردہ سحر تعمیر ہوتی ہے
کانٹوں کی وہی قسمت ، شبنم کا وہی رونا ——— یوں فصلِ گل والا آئی بھی تو کیا آئی
آہوں کا دھواں اب تک اُٹھتا ہے گلستاں سے ——— چھیڑو نہ چمن والو ! بے وقت کی شہنائی
فسانۂ دل پُرشوق پوچھنے والو ! ——— یہ داستاں بھی کسی کو سُنائی جاتی ہے
شباب میں بھی نہ دکھائی ہر چوٹ جس دل نے ——— وہ بدنصیب مرے دل کا حال کیا جانے

ہم اپنی وضعِ جنوں چھوڑ جائیں گے قیصر
بنانے والے ، بناتے رہیں گے افسانے

دوسرا رُخ :۔

سمیٹوں مرکزِ انسانیت پر نظمِ برہم کو ——— سکھاؤں احترامِ زندگی اولادِ آدم کو (صفحہ ۴۴)

"نظمِ برہم کا سمیٹنا" بہت کچھ محلِ نظر ہے ، مصرعہ اولیٰ میں "پر" کا استعمال بھی خاصہ کھٹکتا ہے ۔

حقیقت آشنائے ذوق کر دوں کج نگاہوں کو ——— جگہ دیں نیکیوں میں یہ مرے رنگین گناہوں کو (صفحہ ۴۴)

مصرعہ اولیٰ کی ناہمواری اگر گوارا بھی کر لی جائے ، مگر دوسرے مصرعہ کو کیا کیجئے کہ اس نے پورے شعر کو مہمل بنا دیا ۔

فرعون ہو رہے ہیں، ملعون ہو رہے ہیں　　مذہب فروش مُلا قارون ہو رہے ہیں　　(صفحہ ۴۸)

گالیاں مگر بے مزہ اور غیر شاعرانہ! شاعر کو طنز اور دشنام طرازی میں فرق کرنا چاہیے! پھر "بخل" پانڈوں اور مہنتوں کی صفت ہو تو ہو مگر مُلاؤں کی عام صفت نہیں ہے!

کلیدِ قفلِ اسرارِ حقیقت میری خاموشی　　عدوئے امتیازِ دین و ملّت میری مدہوشی　　(صفحہ ۵۱)

امتیاز کے لئے دو متضاد چیزوں کا ہونا ضروری ہے، "دین و ملّت" دو متضاد چیزیں نہیں ہیں، "امتیازِ کفر و دیں" کا محل تھا۔ "عدو" کا لفظ بھی یہاں اکھڑا اکھڑا سا لگتا ہے!

مری تشنہ لبی خالی نہیں چشمِ مروّت سے　　مجھے تو مل ہی جائے گی مے ساقی مگر پہلے
ذرا یہ بھی تو سُن لوں میکشوں کو اذنِ عام آیا　　(صفحہ ۵۳)

"تشنہ لبی کا چشمِ مروت سے خالی ہونا" آورد و تکلف کے سوا اور کیا ہے، مصرعِ اولیٰ اس انداز کا ہونا چاہیے تھا:- ع

مری تشنہ لبی ہے آشنا مہر و مروت سے

آج بھی سینکڑوں صدیوں کا پرانا ڈھانچہ　　دردِ غم کلفت و آلام کا گھر ہے کہ نہیں　　(صفحہ ۵۷)

یہی وہ اندازِ بیان ہے جس نے "ترقی پسند شاعری" کو بے وقعت کر رکھا ہے۔

فردوس کے پھولوں سے نکہت، کوثر کا سرور لائی　　سیماب کی روح بے تابی، غنچوں کا سوزِ پنہانی　　(صفحہ ۶۰)

فردوس، کوثر اور غنچوں کے درمیان "سیماب" کا ذکر کس قدر بے جوڑ ہے، پھر "غنچوں" کو سوزِ پنہانی سے آخر کیا مناسبت ہے؟

نیاز محبت دکھانا پڑے گا　　نیا داغ ہر روز کھانا پڑے گا　　(صفحہ ۸۴)

ایسے بے جان اور طفلانہ اشعار مجموعۂ کلام سے چھانٹ دینے چاہیئے تھا۔

چراغِ طور کی ضو سے دلِ حیراں جلاؤنگا　　فرازِ عاشقی پر ایک بامِ نو بناؤں گا　　(صفحہ ۹۲)

چراغ کی "ضو" نہیں "لو" میں جلانے کی قابلیت ہوتی ہے! "دلِ حیراں جلاؤں گا" مصرعِ اولیٰ کے اس ٹکڑے سے شاعر کی قدرتِ کلام پر حرف آتا ہے۔

یہ خوفِ دوزخ و تحریصِ خلد و ثوابِ شیق　　ہے ٹوٹنے کو یہ کہنہ حصار اے ساقی　　(صفحہ ۹۳)

اور

غرورِ چیرہ دستی میں ادائیں کھوتی جاتی ہیں　　خدا کے نام سے بیزار روحیں ہوتی جاتی ہیں

قطع نظر اس کے کہ یہ دونوں شعر انتہائی پھس پھسے ہیں اور "غرورِ چیرہ دستی میں اداؤں کا کھونا" زبان و ادب اور شاعری کے ساتھ مذاق ہے، فکری اعتبار سے "الکار و الحاد" کے مظہر ہیں! قیصر صاحب چونکہ "سُرخ سویرے" کے تمنائی ہیں، اس لئے انہیں خدا، دین آخرت اور ثواب و طاعت کا منکر ہونا ہی چاہیئے! کمیونسٹ دیندار اور خدا پرست کیسے ہو سکتا ہے!

آرزوئیں جل گئیں، شوقِ فراواں جل گیا　　بجھ گیا دل، زندگی کا ساز و ساماں جل گیا　　(صفحہ ۱۳۰)

غزل کا مطلع اس قدر بے کیف! "شوق" کا جل جانا پہلی بار نگاہ سے گزرا۔

ضبط غم کی کاوشوں میں چشم نم ہو ہی گئی — خیر ہو یارب بھری محفل میں راز دل چلا (صفحہ ۱۲۳)

محفل میں "ذکر" اور "بات" چلا کرتی ہے، "راز" نہیں چلا کرتا۔

چمن میں دل میں نگاہوں میں آشیاں اپنا — قفس میں زور دکھائے تو آسماں اپنا (صفحہ ۱۲۵)

ایسے شعر پڑھ کر وجدان کو کس قدر اذیت ہوتی ہے۔

مآل تمنا ابھی دیکھ جاؤ — ابھی جیب و دامن میں رنگینیاں ہیں (صفحہ ۱۳۶)

ابہام اور اہمال کی معجون مرکب!

بیٹھے بیٹھے ہی دھڑک اٹھتا ہے کیوں پہلو میں دل — کیا کمی کوئی ابھی تک میرے افسانے میں ہے (صفحہ ۱۴۳)

"دل کے دھڑک اٹھنے" کو افسانہ کی کمی سے آخر کیا نسبت ہے!!

جیسے کسی کے جلوے زینت طراز دل تھا — محفل میں میری ہستی اک راز ہو گئی ہے (صفحہ ۱۶۰)

الفاظ معلوم مگر مفہوم مجہول! توبہ!

صحیح فاتحہ کا طریقہ

مولفہ:۔ قاضی سید اسماعیل حنفی قادری، ضخامت ۶۲ صفحات، صرف ڈاک کے ٹکٹ بھیجکر، یہ کتاب مفت طلب کی جا سکتی ہے، ملنے کا پتہ:۔ قاضی بک ڈپو، پنگنور (PANGANOOR) ضلع چتور (آندھرا، بھارت)

جناب مولانا قاضی سید اسماعیل صاحب نے عام فہم انداز میں نقلی و عقلی دلائل کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ "ایصالِ ثواب کا صحیح طریقہ کیا ہے"! یہ کتابچہ اس قدر مقبول ہوا ہے کہ اس کے پے بہ پے چار ایڈیشن شائع کرنے پڑے ہیں: اس کتاب پر دو چار نہیں دسیوں علماء کرام کی گرانقدر آراء ثبت ہیں، جنھوں نے اس کتاب کے مسائل کی تصویب کی ہے یہ جو مسلمانوں میں "دین و شریعت" اور "بزرگانِ دین کے احترام" کے نام پر طرح طرح کی مشرکانہ رسمیں اور بدعتیں رواج پا گئی ہیں مثلاً کھانا اور پھل وغیرہ سامنے رکھ کر فاتحہ دینا اور ایصالِ ثواب کرنا بی بی کی صحنک اور امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کے کونڈے بھرنا ولیوں اور شہیدوں کے نام کے جھنڈے اور پنجے کھڑے کرنا، تعزیے، تابوت اور صندل وغیـــرہ نکال کر گلی کوچوں میں پھرانا مزامیر کے ساتھ گانا سننا اور رقص کرنا قبروں پر میلے لگانا پیر کے نام کا بکرا کرنا قبروں پر چادر اور پھول چڑھانا اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی روح یا صاحب قبر سے مدد چاہنا اور اس کے نام کی دہائی دینا! ان سب کی اس کتابچہ میں تردید کی گئی ہے!

افسوس ہے کہ کتاب کی زبان میں "مدراسی اثرات" جگہ جگہ نمایاں ہیں مثلاً:۔

"اولیاء اللہ دین کی بڑی خدمت کئے ہیں پیغمبر بعثت فرمائے ہیں

شکرانہ کا رسم بے سند ہے"

مگر اس اندازِ بیان میں بڑا اخلاص، سادگی، توحید اور شرک و بدعت کے مٹانے کا ولولہ پایا جاتا ہے۔

یہ جو بعض کتابوں میں فتاوائے ملا علی قاری وغیرہ کا حوالہ دے کر، یہ روایت لکھی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

اپنے فرزند ابراہیم کی وفات کے تیسرے دن دودھ، روٹی اور کھجوراپنے سامنے رکھکر اس پر فاتحہ دی تھی۔ اس کو اس کتابچہ میں سراسر جھوٹ اور بے بنیاد بتایا گیا ہے، اور یہ بھی کہ ملا علی قاری کی کسی کتاب میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔

قرآن شریف وغیرہ پڑھ کر ثواب پہنچانے کا جو صحیح طریقہ صفحہ ۱۶ پر بتایا گیا ہے، وہ اپنی جگہ محقق اور پختہ نہیں ہے۔

کتاب کے آخر میں شرک و بدعت کی تردید میں چند نظمیں درج ہیں، اس کتاب کی عوام مسلمانوں میں زیادہ سے زیادہ اشاعت ہونی چاہئے تاکہ اُن کے عقائد و اعمال درست اور مطابق شریعت ہو سکیں!

تابشِ سُہیل

اقبال سُہیل کی غزلوں کا مجموعہ، مرتبہ۔۔ افتخار اعظمی ضخامت ۲۷۰ صفحات مجلد، کتابت، طباعت اور کاغذ ہر چیز خوب سے خوب تر، جلد چرمی خوب صورت، سنہری مرقومہ ڈائی کے ساتھ۔

قیمت:۔ پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ مرکز ادب، جہانگیر آباد پیلیس لکھنؤ۔

شعر و ادب کی دنیا میں جناب اقبال سُہیل کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ خاص طور سے "فاران" کا حلقہ اقبال سہیل سے اچھی طرح واقف ہے اس لئے کہ کئی طویل مضامین میں ان کی شخصیت کا مفصل ذکر آچکا ہے!

اقبال سہیل نے لاابالی اور بے نیاز طبیعت پائی تھی، اس لئے اندیشہ تھا کہ اُن کی غزلیں کہیں ضائع اور خرد برد نہ ہو گئی ہوں، مگر مقام شکر و مسرت ہے کہ "تابش سہیل" نے اس اندیشہ کو واقعہ نہ بننے دیا، اور اس کتاب کو دیکھتے ہی جی باغ باغ ہو گیا جناب افتخار اعظمی نے اقبال سہیل کی غزلوں کو مُرتب فرما کر شعر و ادب کی گرانقدر خدمت انجام دی ہے، وہ خود ایک اچھے شاعر اور ذہین ناقد ہیں، اسلئے اس مجموعہ کی ظاہری و باطنی ترتیب میں خوش مذاقی اور حُسن پایا جاتا ہے۔

کتاب کا دیباچہ خود فاضل مُرتب نے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے، اپنے اس دیباچہ کے آغاز میں انھوں نے اُردو غزل کا بڑے سلیقہ کے ساتھ جائزہ لیا ہے! افتخار اعظمی کو جناب اقبال سہیل کی ذات سے گہری وابستگی اور خاص عقیدت ہے، اُن کے دیباچہ میں اس وابستگی اور عقیدت کی جھلکیاں ملتی ہیں!

دیباچہ کے اس ایک اقتباس سے افتخار اعظمی کے ادب و انشا اور نقد و نظر کی قوتوں کا تھوڑا بہت اندازہ ہو سکتا ہے:۔

> "اُن (اقبال سہیل) کا انداز بیان مہذب، شائستہ، اور سنجیدہ ہے، ان کے لب و لہجہ میں ایک وقار اور شان تمکنت ہے، وہ کسی کے اسلوب نگارش کی تقلید پسند نہیں کرتے، وہ اجتہاد کے زیادہ قائل ہیں، لیکن جوش اجتہاد میں روایات کے حُسن کو بھول نہیں جاتے، چونکہ وہ فارسی کے عمدہ شاعر ہیں اس لئے الفاظ کے صوتی، صوری حُسن کے اداشناس ہیں۔ تراکیب کی تراش خراش میں بھی انہیں خاص ملکہ ہے، اُن کی باغیانہ شاعری میں لطافت ادا کے ساتھ ساتھ قنگی ہے، اُن کی غزلوں کی فارسی تراکیب غرابت و اشکال سے خالی ہیں"

دیباچہ کا پہلا جُملہ:۔

"غزل کی خصوصیت دردوں بینی ہے"

اپنے اندر خاصہ اُلجھاؤ رکھتا ہے، شاید فاضل دیباچہ نگار یہ کہنا چاہتے ہیں کہ غزل واردات قلبی کی عکاس اور مظہر ہوتی ہے۔ "دروں بینی" کی جگہ "اظہارِ دروں" ہوتا تو بات صاف ہو جاتی!

دیباچہ کے صفحات میں اعداد کی جگہ حروفِ تہجی کو جو اس طرح۔

"یب　　یج　　یط　　ک　　کج　　مب　　یج"

استعمال فرمایا گیا ہے، وہ جدت تو ضرور ہے مگر مضحکہ خیز جدت ہے۔

دیباچہ کے بعد حضرت سہیل کے سوانح حیات بھی افتخار اعظمی نے قلمبند کئے ہیں جو خاصے دل چسپ ہیں، پروفیسر رشید احمد صدیقی کا شہ پارہ بھی اسی سلسلہ کی ایک سُنہری کڑی ہے جناب اثر لکھنوی، جناب آل احمد سرور اور جناب حبیب احمد صدیقی نے اپنے مقالات میں سہیل کے تغزل کے محاسن کو بڑے دل نشین انداز میں نمایاں کیا ہے۔ یہ مضامین تقریباً نصف کتاب میں پھیلے ہوئے ہیں

حضرت اصغر گونڈوی کا رنگ تغزل اپنی جگہ منفرد مانا جاتا ہے اور وہ اس رنگِ خاص کے اُردو زبان وادب میں موجد سمجھے جاتے ہیں مگر اثر لکھنوی نے پہلی بار اس کا انکشاف فرمایا:۔

"جب خود سہیل مرحوم نے "نشاطِ روح" کے مقدمے میں اصغر صاحب کی تعریف کے دریا بہا دیئے ہیں۔ جس کے ہوتے کسے شبہ گزرے گا کہ اصغر اس رنگ کے موجد نہیں بلکہ مقلد ہیں۔۔۔۔ سہیل کی بلند کرداری اور عالی ظرفی کا یہ ایک محیر العقول کرشمہ ہے کہ اصغر کی شاعری کو سراہا مگر اس کی تخلیق میں خود ان کا کس قدر حصہ ہے، اس کی چھاؤں بھی نہیں آنے دی، یہ زمانے کی ستم ظریفی ہے کہ مقلد کو پیشوا اور پیشوا کو مقلد بنا دیا۔[1]"

نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے اقبال سہیل کی غزلوں کا اُردو کے صفِ اول کے متغزلین کی غزلوں سے مقابلہ کیا ہے اور کوئی شک نہیں بڑی نازک باتیں بیان کی ہیں مگر کہیں کہیں اُن کی "مدح وستائش" اور "نقد واحتساب" خاصے محلِ غور بھی ہیں　　مثلاً ؎

ہے داد کے قابل مری تجرید تصور　　کرتا ہوں تجھے غیر کی محفل سے جدا یاد

سہیل کے اس شعر کی مدح ان لفظوں میں کی ہے:۔

"شعر میں "تجرید تصور" کے بلیغ فقرے نے روح پھونک دی ہے اور یہ فقرہ ذہن وضع نہیں کر سکتا تھا، اگر سہیل بادۂ تصوف کے لذت چش[2] نہ ہوتے۔"

---

[1] یہ عبارت اور مفہوم لفظ "امام" کے متقاضی تھے، لفظ "پیشوا" اس عبارت کے دروبست کے لحاظ سے اکھڑا اکھڑا سا لگتا ہے۔ مگر شیعہ حضرات بارہ اماموں کے علاوہ اور کسی کے لئے "امام" کا لفظ استعمال نہیں کرتے، اس لئے جناب اثر لکھنوی نے بھی اسی احتیاط کو ملحوظ رکھا ہے۔　　(م۔ق)

[2] "ذائقہ چشیدہ" کی جگہ "لذت چش" کی ترکیب نادر ہے مگر بھلی نہیں۔　　(م۔ق)

حالانکہ اس شعر کو "تجرید تصور" کے بلیغ فقرے (؟) ہی نے بوجھل بنا دیا۔ غزل اس قسم کی ترکیبوں (تجرید تصور، ترصیع خیال، توضیح مفہوم، تمہید و دلائل، آغاز تنویر) کی متحمل نہیں ہو سکتی، یہ درحصل قصیدہ اور مثنوی کی زبان ہے! پھر اس شعر کا جو تصوف سے پیوند جوڑا گیا ہے، اس سلسلہ میں ہمیں یہ عرض کرنا ہے "تجرید تصور" نے جو تصوف کا رنگ پیدا کیا تھا اُسے "محفلِ غیر" نے غارت کر کے شعر میں رنگِ مجاز پیدا کر دیا۔

حضرت جگر مراد آبادی کے اس شعر:-

کیا لطف کہ میں اپنا پتہ آپ بتاؤں　　کیجئے کوئی بھولی ہوئی خاص اپنی ادا یاد

پر یہ گرفت فرمائی گئی ہے ــــــــــــ یہ مانا کہ جیسا برسبیلِ تجاہل سوال تھا، ویسا ہی جواب دیا گیا مگر معشوق کی بھولی ہوئی خاص ادا کا تعین "کوئی" سے ہو گا یا "ایک" سے یعنی مصرعِ ثانی کچھ اس طرح ہوتا،- ؎

کیا آپ کو اپنی نہیں اک خاص ادا یاد"

حالانکہ "کوئی" کے نکال دینے سے شعر کا سارا لطف ہی جاتا رہا۔ "کیا آپ کو اپنی نہیں" مصرعہ کا کس قدر کمزور اور بے مزہ رکن ہے! اردو غزل کا بہت مشہور شعر ہے ؎

نہ ہم سمجھے، نہ تم آئے کہیں سے　　پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

اس میں بظاہر "کہیں" سے اُس محفل اور مقام کا تعین نہیں ہو رہا ہے، جہاں سے محبوب آیا ہے مگر حقیقت میں "کہیں" میں "بزمِ غیر" کا تعین پایا جاتا ہے، اسی طرح حضرت جگر کے شعر میں "کوئی" سے بھی خاص ادا کی طرف بڑا لطیف اشارہ کیا گیا ہے۔

جگر کا شعر ہے ؎

جب کوئی حسیں ہوتا ہے سرگرم نوازش　　اُس وقت وہ کچھ اور بھی آتے ہیں سوا یاد

"آپ حسینوں سے صحبت بھی گرم رکھتے ہیں، لگاوٹ کی یا خوشامد کی باتیں بھی کرتے ہیں، ورنہ وہ سرگرم نوازش کیوں ہو۔ تاہم اس وجہ سے "وہ" آپ کو سوا یاد آتے ہیں، چونکہ یہ عامۃ الورود واردات نہیں، شعر کے مذاق یا مخالف فیصلہ کرنا دشوار ہے"۔

اتنے اچھے، پُرلطف اور اثر انگیز شعر پر حضرت اثر لکھنوی کی یہ تنقید پڑھ کر حیرت ہوئی! حسینوں کے جھرمٹ میں یا کسی حسین کو متوجہ پاکر، شاعر کا یہ کہنا ؎

اس وقت وہ کچھ اور بھی آتے ہیں سوا یاد

محبوب سے شاعر کے انتہائی ربط و شغف کو ظاہر کرتا ہے! یہ واردات "عامۃ الورود" اس لئے نہیں ہو سکتے کہ ان میں عشقِ مجازی کی بڑی پاکیزگی اور نزاکت پائی جاتی ہے، اور ہر بوالہوس یا مجازی عاشق اس نزاکت اور پاکیزگی سے آشنا نہیں ہو سکتا!

اثر صاحب نے سہیل کے اس شعر:-

دم آتے یا کرم مرگِ ناگہاں ہوتا　　کوئی تو چارہ نوازِ بلاکشاں ہوتا

کو بہت سراہا ہے۔ حالانکہ "چارہ نواز" کی ترکیب وجدان کو بہت کچھ کھٹکتی ہے، اس شعر کا یہ نقص ہے کہ وزن پورا کرنے کے لئے

"چارہ ساز" نہ آسکا، تو اس کی جگہ "چارہ نواز" جوڑ کر شعر پورا کر دیا۔

غزلوں سے پہلے اقبال سہیل کی ایک نعتیہ نظم (موجِ کوثر) درج کی گئی ہے، جو اُردو شاعری کی آبرو ہے! ایمان افروز، فکر آفریں اور کیف انگیز

جناب آلِ احمد سرور نے تغزل سہیل پر ان الفاظ میں تبصرہ فرمایا ہے:-

"ان کی فکر لالہ کارا اور تانہ کار ہے، جذباتیت کے مقابلہ میں ان کے یہاں جوشِ بیان کا احساس ملتا ہے، وہ اپنے صاحب طرز متاخرین میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں، بلکہ ان سے منفرد ہیں۔ ان کے یہاں تفکر تغزل بن گیا ہے اور جذبہ لطیف و پر کیف ہو کر قدح مے اور بوئے گل کی طرح مست و سرشار کرتا ہے۔ مگر یہ مستی ایک ہشیاری ہے، یہ جادو ایک عرفان رکھتا ہے۔"

سرور صاحب کے ایک ایک لفظ سے اتفاق کرتے ہوئے، سہیل کے چند منتخب اشعار یہاں درج کئے جاتے ہیں:-

آخر غرورِ حُسن کو کھانی پڑی شکست
میرے نیازِ عشق کو خود دار دیکھ کر

نہ گوشِ گل در خورِ سماعت، نہ بلبلوں کو بیاں کی طاقت
یہ رازِ سربستۂ محبت شنیدنی ہے نہ دیدنی ہے

مجھے بھی اذنِ فغاں مل سکے تو مُرغِ اسیر!
ترے قفس سے بدل لوں میں آشیاں اپنا

کس کی بہارِ حُسن ہے میری نگاہ میں
جس سمت اُٹھ گئی، چمنستاں بنا دیا

وارفتگانِ شوق کو کیا دیر، کیا حرم
جس در پہ دی صدا درِ جاناں بنا دیا

چشمک کرے مجھی سے یہ ایسی کہاں کی ہے
بجلی تو خانہ زاد مرے آشیاں کی ہے

وہ سامنے ہے منزلِ مقصود اے جنوں
بس چند گام لغزشِ مستانہ چاہیئے

ترے قرباں ادھر بھی ایک جھونکا ابرِ رحمت کا
جبینوں میں گرہ ہے سجدۂ شکرانہ برسوں سے

پھر موج زندگی میں نہیں شورشِ عمل
پھر کوئی سنگِ راہ مقابل نہیں رہا

پہنچی وہاں بھی شیخ و برہمن کی کش مکش
اب میکدہ بھی سیر کے قابل نہیں رہا

دل خطا وارِ اشتیاق سہی
لب گنہگار التجا نہ ہوا

حسن لا تا نہ تاب جلوۂ عشق
خیر گزری کہ سامنا نہ ہوا

دوستی کیا نبھائیں گے جن سے
دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا

اس تلون کا کیا ٹھکانہ ہے
کہ تغافل بھی دیرپا نہ ہوا

شبنم ناتواں سہی لیکن
اس گلستاں میں ہے نمو مجھ سے

اُٹھے ہیں آج خوابِ ناز سے وہ شرمگیں ہو کر
شکن در زلف، ناوک در نگہ، چیں بر جبیں ہو کر

حیا کے لطف ہو شوخی، ادب کے ساتھ ہو شوق
کمالِ حسن و محبت ہے اعتدالِ نظر

قفس میں دیتے ہو کیا طعنِ سستِ پروازی
فضا کھلی ہوئی ہوتی تو امتحاں ہوتا

لائی ہے موجِ صبا زلفِ معنبر کی شمیم
وادیٔ جاں کو مبارک ہو گلستاں ہونا

تنگ ہے صیدِ زبوں ہمتِ عالی کے لئے / میری مشکل ہے مرے کام کا آساں ہونا

پہلے پیدا تو کر آتش کدۂ شوقِ خلیل / آج بھی سہل ہے شعلوں کا گلستاں ہونا

اے گرفتارِ قفس! وقتِ پرافشانی ہے / پھر ملے شاخِ نشیمن تو غزلخواں ہونا

صدا فریاد کی آئی کہیں سے / وہ ظالم بدگماں ہوگا ہمیں سے

میں تیری حکایت ہوں، تو میرا فسانہ ہے / جس نے تجھے سمجھا ہے، اُس نے مجھے جانا ہے

نیرنگ ہی فطرت ہے اس عالمِ ہستی کی / اک میری ہی قسمت کیا، گردش میں زمانہ ہے

دل برباد، محرومی پہ جس کی آج ہنستے ہو / یہی دیوانہ کرتا تھا کبھی لعل و گہر پیدا

بزمِ ازل میں دور سے دیکھی تھی اک جھلک / اب تک نگاہِ شوق کا آغوش باز ہے

کیوں بڑھایا آپ نے جامِ تہی میری طرف / اور اس سے تیز میری تشنہ کامی ہوگئی

لذت شناسِ غم کو ہے اظہارِ غم حرام / روتا ہوں اور دامنِ مژگاں بھی تر نہیں

اب ہجر کا شکوہ نہ تغافل کا گلہ یاد / آئی جو تری یاد تو کچھ بھی نہ رہا یاد

صیاد نے اس طرح سجایا ہے قفس کو / آتی نہیں اب مجھ کو نشیمن کی فضا یاد

کیوں کفر ہو گر سجدہ گہِ اہلِ نظر ہو / وہ بُت کہ جسے دیکھ کے آتا ہے خدا یاد

نخوتِ حسن کے ماتھے پہ شکن دوڑ گئی / عشق نے وا نہ کئے تھے لبِ فریاد ابھی

مرے نالوں کا ظالم پر اثر ہوتا تو کیوں ہوتا / ہے اُس کی بزمِ عشرت میں صدائے ارغنوں وہ بھی

پیچھے ہیں قدم، آگے ہے نظر، جاناں ہو کہاں جاتے ہیں کدھر
مبہم ہے یہاں خود سمتِ سفر، رفتارِ زمانہ کیا کہئے

گلشن میں دلِ غمزدہ کچھ اور بھر آیا / دیکھا نہ گیا نکہتِ برباد کا عالم

ذرے جو کل اُڑے تھے مری گردِ راہ میں / روشن ہیں اب وہ انجمنِ مہر و ماہ میں

اُسے مجالِ سخن نہ بخشی، جسے ذرا رازداں بنایا
زباں کو بے نگاہ رکھا، نگاہ کو بے زباں بنایا

چھلک جائے اگر ساغر تو کیا الزام ساقی پر / خود اپنے ہاتھ رعبِ حسن سے ہیں رعشہ دار اب تک

سہیل! اس چلتی پھرتی چھاؤں سے دل گیر کیا ہونا
یہ دُنیا کروٹیں لیتی رہی ہے بار بار اب تک

دوسرا رُخ:—

یہ امن سلطنتِ حسن ہے کہ اہلِ وفا / ہتھیلی پہ لئے پھرتے ہیں نقدِ جاں اپنا (صفحہ ۱۶۸)

...ئی شک نہیں کہ نادر ہے کاش "امن سلطنتِ حسن" کی جگہ کوئی حسین ٹکڑا ہوتا۔

...خیال ہندی شاعری سے ماخوذ و مستفاد ہے۔ (م۔ق)

سو سجدے ایک لغزشِ مستانہ وار میں   اللہ! کیا ادا ہے ترے بادہ خوار میں   (صفحہ ۱۶۹)

مصرعہ ثانی کمزور ہے اور مصرعہ اولیٰ کے جوڑ کا نہیں ہے، پھر ایک لغزشِ مستانہ وار میں "سو سجدوں" کا ادا ہونا بھی مبالغے سے "خالی" نہیں

نہیں بحرِ ہستی کا معبر معین   جہاں غرق ہو جائیں ساحل وہی ہے   (صفحہ ۱۸۲)

"معبر" کتنا ثقیل اور نامانوس لفظ شعر میں آ گیا ہے! "معبر" کو شاعر نے ساحل کے معنی میں استعمال کیا ہے، حالانکہ "معبر" پل یا کشتی کو کہتے ہیں۔

تیرا کمال ضو فگن، تیرا جمال جلوہ زن   میرے ہر ایک نقش میں، میرے ہر اک فتور میں   (صفحہ ۱۹۰)

"فتور" کے ساتھ اردو زبان میں "ہر اک" نہیں بولتے، اور نہ اس کی جمع آتی ہے "میرے ہر اک قصور" ہوتا تو یہ عیب نکل جاتا۔
مصرعہ اولیٰ میں "جمال" کے ساتھ "جلوہ زن" کی ترکیب وجدان کے لئے کس قدر وحشتناک ہے، اس قسم کے سطحی اور کمزور شعر اگر شاعر نے اپنے کلام میں رہنے دیئے تھے تو مرتب کو چھانٹ دینے چاہیئے تھے۔

ترے نثار زخمِ عشق! کچھ وہ لذتیں ہیں   بلائیں لے رہا ہے دل خدنگِ جاں شکار کی   (صفحہ ۱۹۴)

نری آورد ہی آورد، تکلف ہی تکلف!

ذرا اگر التفات نرگسِ میخوار ہو جائے   صبا سرمست ہو جائے، چمن سرشار ہو جائے   (صفحہ ۲۰۲)

نرگس کے ساتھ "مخمور" بولا جاتا ہے "میخوار" نہ بولتے ہیں اور نہ بھلا لگتا ہے، قافیے کی پابندی کے سبب شاعر کو، یہ ناگواری قبول کرنی پڑی۔

حسن گرہ برابرو اب گوش بر فغاں ہے   کچھ کھل چلی زباں کیا عشقِ نیاز خو کی   (صفحہ ۲۰۹)

شعر بظاہر اچھا خاصہ ہے مگر اس کو کیا کیجیئے کہ شعر پڑھ کر طبیعت کو فرحت نہیں ہوتی!

رتبہ داں تھا جبینِ عشق کا میں   حسن کے در پہ جبہ سا نہ ہوا!   (صفحہ ۲۱۶)

یہ شعر اقبال سہیل کی شاعرانہ منزلت سے فروتر ہے۔

خدا بچے بُتِ سحر آفریں سے   گریباں کو لڑایا آستیں سے   (صفحہ ۲۴۰)

مصرعہ ثانی مبہم نہیں مہمل ہے۔

خرد ہے اب بھی جس کے حل سے عاجز   وہ نکتے حل کئے ہم نے یقیں سے

"حل سے عاجز" یہ ٹکڑا! غزل کے مزاجِ نازک پر بار ہے۔

کیا سحر کر دیا بتِ جادو نگاہ نے   پہلو میں آج چپ ہے دلِ بیقرار تک   (صفحہ ۲۵۱)

تابش سہیل کو مدھم کرنے والا شعر! کوئی کیف اور خوبی نہیں!

قیدِ غلامی و حیات، ننگ ہر، ننگِ کائنات
لعنتِ بندگی کے ساتھ، صورتِ زندگی نہ دیکھ   (صفحہ ۲۵۵)

اُلجھا ہوا مغز دم! اور کوئی ناقد و شارح اس گتھی کو سلجھا بھی دے تو "قیدِ غلامی و حیات" کی ترکیب تو ہمیشہ کھٹکتی رہے گی۔

دل کے ہر ایک ٹکڑے میں پرتوِ روئے دوست ہے
آ مرے آئینہ کو دیکھ، اس کی شکستگی نہ دیکھ

مصرعہ ثانی کس قدر حسین ہے، مگر مصرعہ اولیٰ کے پہلے جُز (دل کے ہر ایک ٹکڑے ہیں) نے اس حسن کو غارت کو کر دیا ہے پھر "ٹکڑے" کی "ے" شعر پڑھنے میں نطق پر کس قدر گراں گزرتی ہے۔

حرم حسن سے بیگانگی پیدا نہ ہو جائے! کہیں خودداری غم بڑھ کے استغنا نہ ہو جائے (صفحہ ۲۶۵)

شعر میں آورد و تکلف اور ابہام کے سوا کیا دھرا ہے؟

اس میکدے میں ہے گلۂ بیش و کم غلط پیر مغاں وہی ہے جو پیمانہ ساز ہے (صفحہ ۲۶۹)

اس خیال کو حکیم ناطق لکھنوی نے بڑے لطیف انداز میں بیان کیا ہے:۔

میکشو! مے کی کمی بیشی پہ ناحق جوش ہے یہ تو ساقی جانتا ہے کس کو کتنا ہوش ہے

اقبال سہیل نے تو اپنے شعر میں پیر مغاں کو پیمانہ ساز ——— یعنی ظروف گر (کمہار) بنا دیا! بقول ان کے مرتب کے "اس میکدے" سے "کائنات" اور "پیر مغاں" سے ذات خالق مراد لی جائے اور اس کی نعمتوں کی کمی بیشی کے گلہ کو اس طرح رفع کیا جائے، کہ جو رازق ہے اسی نے انسانوں کے ظرف بنائے ہیں ——— تو اس طرح بات صاف کہاں ہوتی ہے ناطق مرحوم کا شعر اس حقیقت کا صحیح ترجمان ہے!

یہ بد بخت آنکھیں کھلی ہیں قفس میں مجھے یاد تک آشیانہ نہیں ہے (صفحہ ۲۷۴)

جب قفس میں جاکر ہی طائر کی آنکھیں کھلی ہیں یعنی اس کی پیدائش ہوئی ہے تو پھر آشیانہ یاد کیسے آتا۔

اس غزل کا یہ شعر کس قدر یقین آفریں ہے۔

بصیرت سے پہلے عقیدت ہے لازم وہ جانے گا کیا جس نے مانا نہیں ہے

تجھ کو آنکھوں میں جگہ دی تھی سمجھ کر خانہ زاد اے نظر! تو بھی صف مژگاں کی حامی ہو گئی (صفحہ ۲۷۸)

"صف مژگاں" کے ساتھ "دوست" کی اضافت ضروری تھی!

وہی حسن ستم گر پھر نئی سج دھج سے آئے گا کہا کس نے کہ بزم کہنہ برہم ہوتی جاتی ہے (صفحہ ۲۶۳)

"بزم کہنہ" نے شعریت و نغمگی کو مجروح کر دیا۔

فکر تعمیر نشیمن ہو یہاں کس کو سہیل ہوش گم کردہ ہیں مرغان نو آزاد ابھی (صفحہ ۲۹۷)

"نو" کا واو کس بری طرح دب رہا ہے۔

صبا نے جاتے جاتے جانے کیا سرگوشیاں کی ہیں نہ بھولا ایک برگ گل بھی وہ سیر انتشار رنگ (صفحہ ۳۰۰)

شعر میں "معمہ" اور "لغز و چیستاں" کا رنگ پیدا کرنا، کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

انہی موجوں کی تحریک نے اٹھائے کتنے طوفاں بھی یہی اب مل کے سینچیں گی وطن کا باغ ویراں بھی (صفحہ ۳۰۴)

غزل کا مطلع اور اقبال سہیل کی غزل کا مطلع، اور اس قدر بے جان! "تحریک" پڑھ کر وجدان جھنجلا کر رہ گیا۔

ابرام نہیں گو شرط ادب، الحاج سے بھی ہیں دوختہ لب
دعوے سے نہ کر سکتے ہوں طلب تو ملتجیانہ کیا کہیے (صفحہ ۳۱۲)

یہ کیا گورکھ دھندا ہے ——— توبہ!

اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کا کام بے عیب ہے ورنہ ہر انسان کے کام میں کور کسر رہ جاتی ہے ....

کوئی شک نہیں ملائش سہیل نے اردو غزل کی تابناکیوں میں نمایاں اضافہ کیا ہے، ہم اس کتاب کا کھلے دل سے خیر مقدم کرتے ہیں!

فاران
کراچی
پاکستان
ماہر القادری

رکن: انجمن ادبی رسائل پاکستان

جلد ۱۱

ایڈیٹر ماہر القادری

شمارہ ۵

ماہ اگست ۵۹ء

فاران

کراچی

سالانہ چھ روپے

[illegible] دفتر فاران کیمبل اسٹریٹ، کراچی

فی پرچہ ۸/

پرنٹر پبلشر مسز [illegible]

مطبع سعیدی، کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

اُن سادہ لوحوں کے حسنِ ظن کو کیا کہیئے جو اب تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ کمیونزم صرف ایک معاشی نظام ہے، خدا اور مذہب کے ماننے اور نہ ماننے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، وہ ایک منکرِ خدا اور دہریہ کی طرح ایک دیندار بھی کمیونسٹ بن سکتا ہے۔ اور اس کے معتقدات اور دین داری کی راہ میں "کمیونزم" کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتا —————— یہ کس قدر گمراہ کن حسنِ ظن، کیسی جاہلانہ غلط فہمی اور کتنی شدید بے خبری ہے۔

کمیونزم اپنے لٹریچر سے لیکر کمیونسٹ حکومتوں کی تشکیل اور ان کی پالیسی تک، ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح موجود ہے جس کے بارے میں ایک اور صرف ایک ہی رائے قائم کی جا سکتی ہے! کمیونزم کے سمجھنے اور جاننے میں اب نہ کسی قسم کا التباس باقی رہا ہے اور نہ اشتباہ!

اور وہ ثابت شدہ حقیقت

اور واضح رہے یہ ہے کہ کمیونزم کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے وجود سے انکار اور دین و اخلاق سے بغاوت پر رکھی ہوئی ہے۔ کارل مارکس اور اینجلز سے لیکر لینن، اسٹالن اور خروشچیوف تک ہر کمیونسٹ لیڈر کے بیانات اور تحریروں میں جو قدرِ مشترک پائی جاتی ہے۔ وہ "وجودِ باری کا کھلا ہوا انکار اور مذہب و اخلاق سے بغاوت" ہے۔

ہر شخص اپنے دین و ایمان اور افکار و معتقدات کا خود ذمہ دار اور اپنے مسلک میں آزاد ہے، اس میں کسی پر جبر نہیں کیا جا سکتا کسی کو کمیونزم پر قلبی اطمینان ہو جائے تو وہ کمیونزم کو قبول کر سکتا ہے، مگر اسے اپنے ضمیر کو اس دھوکے میں مبتلا نہ کرنا چاہیے کہ وہ اللہ رسول اور دین و اخلاق کے فرائض و مطالبات اور کمیونزم کے تقاضوں کو ایک ساتھ نباہ سکتا ہے۔

سوویٹ گورنمنٹ جو "خدا دشمنی" میں تمام سوشلسٹ اور نیم اشتراکی حکومتوں سے پیش پیش ہے، اُسے یہ نفاق کی پالیسی اور دکھاوے کی باتیں زیب نہیں دیتیں کہ وہ اسٹالن آبادی کی کسی مسجد یا سمرقند و بخارا کے کسی مقبرے کی تصویر چھاپ کر، یا کچھ مولویوں کو روس کی سیاحت کرا کے اور ان کے بیانات منظرِ عام پر لا کر یہ چکمہ دینے کی کوشش کرے کہ سوویٹ حکومت مذہب کے معاملہ میں بڑی روادار اور فراخدل واقع ہوئی ہے! ایسا جھوٹا پروپیگنڈا زیادہ دن تک نہیں چل سکتا۔

روس میں مسلمانوں کی پوری نسل کو دین سے بیگانہ اور متنفر کرنے کی ہر تدبیر اختیار کی جا رہی ہے وہ مسلم گھرانے جو زہد و تقویٰ میں ممتاز تھے ان کو روسی حکومت نے رقص و سرود اور رندی و شراب نوشی کی راہ پر لگا دیا ہے۔ اور مسلم علاقوں کے چھوٹے چھوٹے گاؤں میں ڈانسنگ ہال اور شراب خانے کھول دیے گئے ہیں کہ مستی و ہوس کی راہ سے مسلمانوں کی سیرت و کردار کو بگاڑ کر ان کے دینی احساس کو موت کی نیند سلا دیا جائے۔

کمیونزم کو جب روس میں پوری طرح تسلط حاصل ہو گیا تو اس کا سب سے پہلا وار مسجدوں اور کلیساؤں پر ہی ہوا، اور اس کے

اکابر کی یہ "اسلام دشمنی" تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ ثبت رہے گی کہ سمرقند کی جامع مسجد کے منبر پر یہ عبارت لکھ دی گئی تھی کہ:-

"اب یہاں خدا کا نام کبھی بلند نہ ہوگا"

یہ عبارت لکھ کر کمیونسٹ لیڈروں نے اپنی دانست میں گویا خدا سے انتقام لیا۔ کاش! ان تنگ ظرفوں، نادانوں اور ظالموں کو اس کی خبر ہوتی کہ اللہ کی ذات بے پایاں کسی کی تکبیر و تسبیح کی محتاج نہیں ہے، اگر کائنات میں اس کی تکبیر کی ایک آواز بھی بلند نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کو ذرہ برابر نقصان نہیں پہنچ سکتا اور اگر ساری مخلوق ہر آن اس کی تسبیح و تحمید میں لگی رہے تو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں رائی کی برابر بھی اضافہ نہیں ہو سکتا، اللہ کی تکبیر جو کوئی بھی بلند کرتا ہے تو اس میں اس شخص کیلئے سعادت و فلاح پنہاں ہے اور جس فضا میں یہ تکبیر بلند ہوتی ہے، اس فضا کی خوش قسمتی ہے

یہ سوویٹ روس کا ماضی تھا اور اس کا حال "خدا دشمنی" میں اس حد تک پہونچ چکا ہے کہ روس نے اللہ تعالیٰ کو چیلنج دیا کہ

"اللہ کا اگر کوئی وجود ہے تو وہ کوئی معجزہ کیوں نہیں دکھا دیتا"

کمیونسٹوں کے اس چیلنج کو پڑھ کر قرآن پاک کی بیان کی ہوئی اس حقیقت پر یقین مستحکم تر اور ایمان اور زیادہ وثیق ہو گیا کہ حق ناشناسوں، باطل پرستوں اور خدا کے دشمنوں کی ذہنیت ہر زمانہ میں ایک سی رہی ہے وہ چاہے نمرود و فرعون کا زمانہ ہو یا ابوجہل و ابولہب کا عہد ہو یا اسٹالن و خروشچیف کا دور ہو، صدیوں کی فصل مدت کے باوجود ان ادوار میں حق و صداقت کے ساتھ ایک ہی جیسا سلوک کیا گیا ہے۔

ان اوچھوں اور نادانوں کے دل میں اس حقیقت کو کوئی کس طرح اتار دے کہ معجزوں کے ذریعہ اپنی ذات کو منوانا اور اپنے دین کو انسانوں پر نافذ کرنا اللہ تعالیٰ کی سنت ہی نہیں ہے۔ اگر جبر و طاقت اور قاہریت کے ذریعہ لوگوں کو مومن و منقاد بنانا سنۃ کا دستور ہوتا تو پھر دنیا میں اس سرے سے تک ایمان و اسلام ہی کی فرمانروائی ہوتی اور انکار و الحاد اور طغیان و معصیت کا ایک ذرہ سا نقش بھی کہیں دکھائی نہ دیتا۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت کا ملہ نے بندوں کو حق و باطل کے درمیان انتخاب کرنے کی قوت تمیز عطا کی ہے اور اس عالم اسباب اور جہان کون و فساد کو بندوں کے لئے امتحان گاہ بنایا گیا ہے جزا و سزا کی اصل جگہ یہ مادی دنیا نہیں بلکہ عالم آخرت ہے وہاں ہر نفس کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ ہاں اس دنیا میں بھی جب اللہ تعالیٰ کی مشیت کو منظور ہوتا ہے تو بندوں کو جزا و سزا کی جھلکیاں دکھا دی جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی عام طور پر یہ سنت نہیں رہی کہ ادھر کسی انسان سے ظلم و طغیان سرزد ہوئے وہ ہاتھ کے ہاتھ اس کی گردن ناپ دی گئی، اللہ تعالیٰ "شدید العقاب" تو ضرور ہے مگر "سریع العقاب" نہیں ہے، اس دنیا میں منکروں، حق ناشناسوں اور ظالموں کو اصلاح حال کی مہلت دی جاتی ہے، اور جب پاپ کا گھڑا اچھی طرح بھر چکتا ہے، تو پھر اس کے ڈوبنے میں بھی ایک لمحہ کی تاخیر نہیں ہوتی ——— اللہ کی طرف سے ظالموں کو جو ڈھیل جاتی ہے اور اس پردہ کرنے لگتے ہیں، ان کی عبرت کے لئے ہٹلر کا حشر ہمارے سامنے ہے۔ اس ظالم کا کیا طنطنہ تھا کیسی دھاک تھی اور کیا رعب داب تھا، ساری دنیا میں بس اسی کے نام کی گونج سنائی دیتی تھی۔ اور پھر اس کے وہ ساری دنیا کو فتح کرنے کے عزائم! اور ان عزائم کی بڑی حد تک کامیابی لوگوں نے دیکھ بھی لی ——— مگر جب اس کو دی ہوئی مہلت ختم ہو چکی تو پھر اس کا پندار ریت کی دیوار کی طرح آن کی آن میں ڈھے گیا، اور اس کا انجام تاریخ کے صفحات پر ایک نمونۂ عبرت بن کر رہ گیا۔

کیا سوویٹ روس کے اکابر اور عوام کو وہ وقت یاد نہیں ہے جب ہٹلر کی فوجیں روس کو نہ صرف یہ کہ فتح بلکہ الفیتح دبا لیا

کرتی چلی جارہی تھیں اور روس کی مکمل شکست وتباہی میں دو ایک تپ کی دیر رہ گئی تھی، اس وقت اسٹالن جیسے مادہ پرست اور منکرِ خدا کو خدا یاد آیا، اس نے کلیساؤں اور مسجدوں کے تالے کھلوا دیئے اور روسی عوام سے درخواست کی کہ ایسے نازک وقت میں اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کریں ؎

ہر مضطرب کو اس کی طرف التفات ہے
آخر خدا کے نام میں کوئی تو بات ہے

خود روس میں اللہ تعالیٰ اس معجزے کو دکھا چکا ہے۔ مگر کس قدر حق ناشناس ہیں وہ لوگ جنھوں نے اتنی بڑی حقیقت کو بھلا دیا۔ اللہ تعالیٰ کی آیتیں، نشانیاں اور معجزے، انفس وآفاق میں بکھرے پڑے ہیں۔ انسان کا جسم اور اس کی جان اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا معجزہ ہے؟ یہ صبح کا طلوع، شام کا غروب، موسموں کا تنوع، ہریالی اور پھل پھول کی نشوونما، ثوابت اور سیاروں کا یہ محیر العقول نظام، یہ لق ودق صحرا، یہ اتھاہ سمندر یہ سب اللہ تعالیٰ کے معجزے اور نشانیاں ہی تو ہیں، کائنات میں جو اس درجہ تنظیم پائی جاتی ہے کیا اس کا کوئی منظم نہیں ہے؟ کیا جڑی بوٹیوں میں یہ کیمیاوی تنوع، پھلوں میں یہ رنگا رنگ ذائقے، پھول پتیوں میں یہ بوقلمونیاں آپ ہی آپ پیدا ہو گئی ہیں ان کا کوئی صانع وخالق نہیں ہے، ایک ذرا سی سوئی آپ ہی آپ نہیں بن جاتی تو اتنی بڑی کائنات خود بخود کس طرح وجود میں آسکتی ہے؟ صنعت ہو اور صانع نہ ہو، ایجاد پائی جائے اور موجد کا سرے سے وجود ہی نہ ہو، مخلوق ہو، اور اس کا کوئی خالق تسلیم نہ کیا جائے، یہ کتنی بڑی بے دانشی اور جہالت ہے! کیا آج تک دنیا میں کوئی نقش کسی نقاش کے بغیر آپ ہی آپ کھنچ گیا ہے، کیا زمین کا کوئی ذرہ اور درخت کا کوئی پتہ کسی خارجی سبب کے بغیر آپ ہی آپ حرکت میں آجاتا ہے. قلم دوات، کاغذ، مسطر، قلمدان، میز کرسی یہ سامنے کی چیزیں کیا خود بخود بن گئی ہیں؟

سائنس کے گوناگوں تجربوں کے بعد تو روس کو نفی وانکار کی تاریکی سے نکل کر اثبات واقرار کی روشنی میں آجانا چاہیئے تھا۔ مگر اس بدتوفیقی اور بے بصیرتی کو کیا کہیے کہ جن انکشافات کے بعد فکر ونظر اور دل ونگاہ کو تو بروجلا ملنی چاہیئے تھی۔ وہ کمیونسٹوں کے تعصب وتمرّد کی ظلمت کو اور گہرا کرنے جارہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انفس وآفاق میں جو کوئی جتنا زیادہ غور کرے گا، اللہ تعالیٰ کے وجود کا، اس کی خالقیت اور ربوبیت کا اس کو اتنا ہی زیادہ یقین ہوتا چلا جائے گا۔ اب کسی نے ہٹ دھرمی، دھاندلی اور حقیقتوں کے انکار ہی کی قسم کھا رکھی ہو تو ایسے دل ودماغ کو روشنی مل ہی نہیں سکتی! آہ وہ بدنصیب ونادان اندھا جو اپنے اندھے پن پر فخر کرتا ہو اور جس کی زندگی کا یہ مشن ہو کر دوسرے لوگ بھی اسی کی طرح نورِ بصارت سے محروم ہو جائیں۔

بڑے بول کا سر نیچا ہو کر رہتا ہے، سوویٹ روس نے اللہ تعالیٰ کو جو چیلنج دئے ہیں اس کی تھوڑی بہت سزا کیا عجب کہ اسی دنیا میں اسے مل جائے، اور ہم اپنی آنکھوں سے اس کے حشر کو دیکھ لیں۔ اللہ تعالیٰ کے غضب کو جب بھی حرکت ہوگی سوویٹ روس، اور اس کی ہم عقیدہ حکومتوں کو دن میں تارے نظر آنے لگیں گے۔ عاد وثمود کی تاریخ اگر دہرائی گئی تو آج بہت کچھ ہیں وہ کچھ بھی نہ رہیں گے اور صفحہ ہستی سے ان کے نام ونشان تک مٹ جائیں گے، ظالموں، نافرمانوں اور اللہ تعالیٰ کے باغیوں کو ایسی سزائیں بھی ملتی رہی ہیں۔

کمیونزم کا توڑ اسلامی نظام اخلاق ہی سے ہو سکتا ہے

کمیونسٹ کوئی شک نہیں مسجدوں ہی کے نہیں کلیساؤں، مندروں، صومعوں، پگوڈوں اور گردواروں کے بھی دشمن ہیں اور وہ دنیا میں کسی مذہب کو زندہ اور فعال دیکھنا نہیں چاہتے

مگر کمیونسٹوں اور کمیونزم کو اصل دشمنی "اسلام" کے ساتھ ہے اور وہ اس لئے کہ دنیا کے تمام مذاہب گنتی کے چند عقیدوں اور پوجا پاٹ کی چند رسموں سے عبارت ہیں "دین کامل" صرف اسلام ہے جو انسانی زندگی اور معاشرے کی ہر منزل میں رہنمائی کرتا ہے اور دنیا کو مکمل نظام حیات دیتا ہے ـــــــ تو موجودہ دنیا میں "کمیونزم" کا اصل حریف "اسلام" ہے۔ یہی سبب ہے کہ سوویٹ روس میں نہ تو ویدوں پر تنقید کی جاتی ہے، نہ ژند پاژند پر گفتگو ہوتی ہے، نہ کنفیوشس کی تعلیمات زیر بحث آتی ہیں اور نہ بدھ کے اقوال موضوع مذاکرہ بنتے ہیں۔ وہاں تنقید صرف "قرآن کریم" پر ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی اس آخری کتاب کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلائی جاتی ہیں۔ کمیونزم بالکل کھل کر اسلام کے مقابل آگیا ہے اور خروشچیف صاحب نے اپنی مہربانی سے اس آہنی پردے کو بالکل اٹھا دیا ہے۔

ہونا یہ چاہیئے تھا کہ دنیا کی تمام مسلمان حکومتیں مل کر ایک "پیکٹ" کرتیں اور ایک ہی میثاق کے رشتہ میں بندھ جاتیں اور اس طرح روس اور امریکہ کے مقابلہ میں "مسلم ممالک" کی ایک زبردست طاقت وجود میں آجاتی اور یہ ہو جانے کے بعد ہوا کا رخ ہی کچھ اور ہوتا۔ اسلامی حکومتوں کا یہ گروپ الجزائر، کشمیر، اسرائیل و فلسطین کے تمام مسائل پر پوری قوت کے ساتھ اثر انداز ہوتا۔ مگر امت کی انتہائی بدقسمتی ہے کہ تمام اسلامی حکومتیں ایک مرکز پر جمع نہیں ہو سکیں، اور جس قوم کو "جسد واحد" اور "بنیان مرصوص" بننا چاہیئے تھا وہ تاش کے پتوں کی طرح بکھری ہوئی ہے۔

انڈونیشیا، مصر اور عراق کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ ان ملکوں میں حکمرانوں نے ایک طرف دینی طبقہ کو دبایا بلکہ پامال کیا اور دوسری طرف اسلامی اخلاق کو عملاً متشکل نہیں ہونے دیا۔ اس کے برخلاف وہ جماعتیں جو رقص و سرود، شراب نوشی، قمار بازی اور غیر اسلامی ثقافتی مظاہروں کی دلچسپیوں اور رنگ آرائیوں کی آڑ میں اپنے سیاسی و معاشی عزائم کی تبلیغ کرتی تھیں ان کی ہمت افزائی کی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج عراق کی حکومت پر کمیونسٹ چھائے ہوئے ہیں۔ مصر و شام میں کمیونزم کی جڑیں بہت گہری اور دور تک پھیل گئی ہیں۔ انڈونیشیا قوم پرستی اور آزاد خیالی کے چنگل میں گرفتار ہے اور اس کا دوسرا قدم "کمیونزم" ہوگا۔

ہم مادی ذرائع کی افادیت اور اہمیت کے منکر نہیں ہیں، اسلحہ ساز فیکٹریوں سے لیکر صنعتی کارخانوں اور سائنسی تجربگاہوں تک ہر شعبہ کو زیادہ سے زیادہ ترقی یافتہ ہونا چاہیئے اور اس کوشش سے غافل نہ رہنا چاہیئے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ روس و امریکہ کے مقابلہ میں ہمارے وسائل اس قدر قلیل و کمزور ہیں کہ اس میدان میں تنہا مادی وسائل سے ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے مادی ذرائع و وسائل کی کمی کو جو چیز پورا کر سکتی ہے وہ اخلاقی قدریں ہیں کہ اس دولت لازوال کا ان کے یہاں قحط ہے۔

اسلام کی تعریف میں ہم مسلمان ایک زمانہ سے قصیدے پڑھ رہے ہیں۔ مگر ایسا کرنے سے کچھ حاصل وصول نہیں ہوتا آج بھی اسلام کو عملاً نافذ کیا جائے گا تو نافذ ہوگا اور اسلام کے نفاذ کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہے کہ اسلام کے نظام اخلاق کو عملاً متشکل کر دیا جائے۔

کمیونزم کی سب سے بڑی فتح و کامیابی اس میں ہے کہ لوگ اخلاق و نیکو کاری سے بیزار ہو کر ناجائز تفریحوں، ہوسناک رنگینیوں اور صنفی انارکی کی طرف مائل ہو جائیں۔ سوویٹ روس میں مسلمانوں کے اخلاق و ایمان کو تباہ کرنے کے لئے کمیونسٹوں نے یہی حربے اختیار کئے ہیں اور کر رہے ہیں کہ وہاں مسلم علاقوں میں کلچرل شو، ثقافتی نمائشوں اور فلمی میلوں ٹھیلوں کے نام پر رقص و سرود، شراب نوشی مرد و زن کے بیباکانہ اور آزادانہ اختلاط کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جاتا ہے مقصود یہ کہ ان ہوس انگیز دلچسپیوں اور غیر اخلاقی رنگینیوں میں مبتلا ہو کر خوف خدا اور آخرت کے محاسبہ کا تصور مضمحل ہو تا رہے۔ یہاں تک کہ دل و دماغ پر اخلاقی ذمہ داریوں کا کوئی دھندلا نقش

(باقی مضمون ص ۱۳ پر)

مولانا مفتی سید سیاح الدین کاکاخیل
(صدر مدرس اشاعۃ العلوم لائلپور)

ذبیحۂ اہلِ کتاب

جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو
اس کی حرمت کی فقہی تحقیق

میرے ایک عزیز تنظیم الحق صاحب بی۔ اے۔ ترقی دیہات کے سلسلے میں ٹریننگ کے لیے حکومت پاکستان کی طرف سے اس سال امریکہ بھیجے گئے ہیں۔ وہاں سے انہوں نے مجھے خط لکھا جس کا مضمون مندرجہ ذیل ہے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ میں دیہات سدھار کے سلسلے میں امریکہ آیا ہوا ہوں۔ یہاں میرے پاس بہت سے رفقا ممالک عربیہ، لیبیا، انڈونیشیا وغیرہ کے مسلمان بھی ہیں۔ یہاں جانوروں کا گوشت اسی طرح حاصل کیا جاتا ہے کہ ذبح کرنے کا طریقہ تو وہی ہے جو ہمارے ہاں ہے لیکن ذبح کرتے وقت یہ لوگ اللہ کا نام نہیں لیتے اور کچھ پڑھے بغیر ہی ذبح کر ڈالتے ہیں۔ میں ایسا گوشت نہیں کھاتا، کیونکہ آتے وقت مجھے میرے بھائی مولوی شبنم الحق صاحب نے گوشت کھانے سے روکا تھا۔ اور میرے دوسرے رفقا بلا تکلف کھاتے ہیں۔ بلکہ مجھ سے بحث کرتے ہیں کہ آپ کیوں نہیں کھاتے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ گوشت حلال ہے۔ لندن کی مسجد کے امام صاحب نے اور واشنگٹن کے اسلامی مرکز کے امام صاحب نے اس کی حلت کا فتویٰ دیا ہے۔ ان اماموں کے فتوے کے بعد اب اور کون سی وجہ رہ گئی ہے۔ الغرض وہ مجھے بار بار تنگ کرتے ہیں۔ میرے پاس سوائے اس کے اور کوئی دلیل نہیں کہ مجھے میرے بھائی نے منع کیا ہے۔ وہ تقاضا کرتے ہیں کہ آپ حرام ہونے کی وجہ بتائیے۔ لہٰذا چونکہ مجھے آپ پر اعتماد ہے۔ آپ اس مسئلہ کے بارے میں اپنی تحقیق مجھے لکھ دیجیے تاکہ مجھے پورا اطمینان ہو جاوے۔ اور میں علیٰ بصیرۃ عمل کر سکوں۔ میں آپ کے جواب کا شدید منتظر ہونگا بلکہ ان حضرات کو بھی آپ کا جواب دکھاؤں گا۔

مندرجہ بالا استفسار کے جواب میں احقر نے اس کو جو تحقیقی و مفصل جواب بھیجا ہے اس کی نقل یہاں درج کر رہا ہوں اس جواب سے عزیزم تنظیم الحق کی تسلی ہو گئی بلکہ افسوس ہے کہ دوسرے [illegible] ممالک کے مسلمان رفقا اپنی بات پر مصر ہیں اور کسی معقول دلیل اور قرآن و حدیث اور اقوال ائمہ کی بجائے صرف لندن و واشنگٹن کے امام صاحب کے قول کو ہی حجت سمجھتے ہیں

الجواب

برادر عزیزم تنظیم الحق زادہ اللہ عزاً و شرفاً۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ بعد از سلام مسنون عرض ہے آپ کا گرامی نامہ [illegible] موصول ہوا۔ بڑی خوشی حاصل ہوئی مجھے مولانا عبدالقدوس صاحب [illegible] میں اپنا [illegible] میں موجود [illegible]

امریکہ و یورپ کی سیاحت، یا وہاں کسی ٹریننگ کے لئے جانا، ایک خوش بختی سمجھی جاتی ہے۔ اور دنیوی اعزاز ہے بس اس حیثیت سے بھی آپ کو مبارکباد بھی دیتا ہوں دور کا سفر ہے اور ہر طرح کے فتنوں سے پُر۔ اس لیے دعا بھی کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دوبارہ بخیر و عافیت بدن اور دین و ایمان کی صحت و سلامتی کے ساتھ اپنے گھر پہونچائے۔ یوں تو امریکہ و یورپ جانا۔ وہاں تردامنی آلودگی سے محفوظ رہنا ایک کرامت ہے۔ اور وہ، جو حافظ شیرازی نے فرمایا ہے۔ ؎ درمیان قعرِ دریا تختہ بندم کردۂ + بازمیگوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش اس کا اصل مصداق اس زمانے میں یہی ہے کہ کوئی وہ مغرب میں بھیجا بھی جائے، اور پھر اس سے تقویٰ و طہارت کی تاکید بھی کی جائے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے بھی ہیں جو اس امتحان میں پورے کامیاب ہوئے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے نہیں وہاں بھی دین و ایمان، بلکہ تقوے و طہارت کے آخری درجے کو محفوظ رکھنے کی توفیق دی ہے۔ وہاں رہ کر عقائد و نظریات کو اسلام و حق کے مطابق رکھنا اور ماحول کی کشش اور نفس کے تقاضوں سے متاثر نہ ہونا، ایک بہت بڑا مجاہدہ نفس و تزکیہ باطن ہے۔ کوئی براہیم فطرت ہی اس آگ میں رہ کر جلانے والے شعلوں سے بچ سکتا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ جو کوئی وہاں سے محفوظ ہو کر آیا، وہ ولی ہو کر آیا ہے۔ اس لئے میں تمام مسلمان نوجوانوں کے بارے میں، اور خاص کر آپ جیسے عزیزوں کے بارے میں اس ولایت و بزرگی کی امید رکھتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتا ہوں۔ حبیب پاک صلے اللہ علیہ وسلم کی خاطر اللہ تعالیٰ اس بے لوث دعا کو قبول فرمائے۔

آپ نے جس مسئلہ کے بارے میں پوچھا ہے، اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ فتوے کی حیثیت سے میں بھی یہی کہتا ہوں کہ وہ گوشت حلال نہیں۔ آپ اُسے نہ کھائیں۔ ترکاریوں، مچھلی، انڈوں پر گذر کریں۔ مگر آپ نے اس کی دلیل اور تفصیل طلب کی ہے، اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ خواہ جواب دینے میں قدرے تاخیر ہو جائے مگر نئے سرے سے مطالعہ کر کے تحقیقی جواب لکھوں گا۔ چنانچہ میں نے اپنے کتب خانے میں موجودہ کتب تفاسیر، کتب احادیث، اور کتب فقہ کا مطالعہ کیا۔ اور اپنے علم و فہم کے مطابق اطمینان کر لیا۔ اور اب جو کچھ لکھ رہا ہوں، اپنی طرف سے قلبی اطمینان حاصل کر کے تحریر کر رہا ہوں۔ تمام کتابوں کے حوالوں کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ صرف چند حوالے پیش کروں گا۔ آپ کے لئے تو ان کی بھی ضرورت نہ تھی۔ البتہ عرب رفقا کو اگر آپ سمجھانا چاہیں تو ان کو توجہ دلائیں۔ عام طور سے تو ہم نے یہ سنا تھا کہ یورپ و امریکہ میں جانوروں کو ذبح نہیں کرتے، بلکہ بجلی کے ذریعے سے انھیں مارا جاتا ہے۔ اس صورت میں جب کہ باقاعدہ ذبح کر کے سارا خون نکالا نہ جائے حرمت کا حکم تو اس بنا پر ہے کہ تذکیہ جو قرآن مجید کی رو سے شرط ہے، وہ نہیں پایا گیا لیکن آپ نے چونکہ ایسا لکھا ہے کہ ذبح تو وہ باقاعدہ اسی طرح کرتے ہیں جیسا کہ ہمارے ہاں مسلمانوں کا طریقہ ہے اور خون بہایا جاتا ہے۔ صرف یہ کہ ذبح کرتے وقت اس پر اللہ کا نام نہیں لیتے، بالکل خاموش رہتے ہیں۔ اس لئے میرے جواب کا مدار سارا اسی پر رہے گا کہ جس پر اللہ کا نام نہ لیا جائے، اور ذبح کیا جائے اس کا کیا حکم ہے؟

میں یہ بھی عرض کرتا ہوں کہ جانور کے حلال ہونے کے لئے جو شرطیں ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ذابح یعنی ذبح کرنے والا مسلم یا اہل کتاب ہو، اس لئے میں اصولاً تسلیم کرتا ہوں کہ اہل کتاب ذابح کا ذبیحہ حلال ہوتا ہے اس لئے میں اسے حرام اس بنا پر نہیں کہتا کہ ذابح اہل کتاب غیر مسلم ہے۔ (اس پر تفصیلی بحث آگے آئے گی) میرے ہاں اس کی حرمت کی وجہ یہ ہے کہ اس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا۔ اور جس جانور پر قصداً اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا جائے، اور ذبح کیا جائے، خواہ ذبح مسلمان ہو یا اہل کتاب میں سے ہو، دیگر شرائط پائی جانے کے باوجود صرف اللہ تعالیٰ کا نام نہ لینے کی وجہ سے اس ذبیحہ کا گوشت کھانا حرام ہے۔ اس بات کو تو ہر مسلمان ضرور مانے گا کہ تحلیل و تحریم کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ تمام اشیا اس خالق و مالک حقیقی کی پیدا کردہ ہیں۔ اور اسی کی مملوک ہیں۔ اسے اختیار ہے کہ جس قسم کی چیزوں سے بندوں کو فائدہ حاصل کرنے کی اجازت دے یعنی حلال قرار دے اور جس قسم کی چیزوں سے فائدہ حاصل کرنے سے روکے اور منع کرے یعنی حرام قرار دے

تحلیل وتحریم کا یقینی ذریعہ اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید ہے، یا پھر وہ احادیث ہیں جن کا قولِ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونا قوی دلائل سے ثابت ہے اور جب خدا ورسول صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کسی چیز کی حلت یا حرمت ثابت ہو جائے تو کسی مسلم کیلئے پھر چون وچرا کی گنجائش نہیں رہتی۔ اور کتاب وسنت کے ذریعے (قرآن مجید واحادیث سمجھنے والے ائمہ کرام کے اقوال کی روشنی میں) جب یہ واضح کر دیا جائے کہ فلاں چیز حلال ہے تو پھر کسی کو حرام قرار دینے کا حق نہیں، اور فلاں چیز حرام ہے، تو پھر کسی کو حلال قرار دینے کا حق نہیں۔ اس متروک التسمیہ کے بارے میں قرآن مجید کی یہ آیت موجود ہے۔ وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ ۗ وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ ۖ وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ ۝ پ ع

میں اس کا ترجمہ وہی نقل کرتا ہوں، جو شیخ الہندؒ نے کیا ہے۔ ویسے اس کے ترجمے میں کسی قسم کے اختلاف کی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی۔
ترجمہ۔ اور اس میں سے نہ کھاؤ جس پر نام نہیں لیا گیا اللہ کا، اور یہ کھانا گناہ ہے۔ اور شیطان دل میں ڈالتے ہیں اپنے رفیقوں کے تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں، اور اگر تم نے ان کا کہا مانا تو تم بھی مشرک ہوئے۔ علاوہ ازیں قرآن مجید میں جہاں کہیں حیوانات کو ذبح کرنے کا ذکر آیا ہے وہاں اس کے ساتھ اللہ کا ذکر کرنے کی شرط لگی ہوئی ہے۔ جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ گوشت کی حلت کے لئے بوقت ذبح اللہ کا نام لینا ضروری ہے مثلاً جہاں قربانی کے جانوروں کا ذکر ہے فَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا صَوَافَّ (الحج) ترجمہ۔ سو پڑھو ان پر نام اللہ کا قطار باندھ کر۔ اور شکار کے سلسلے میں فرمایا: يَسْأَلُونَكَ مَاذَا أُحِلَّ لَهُمْ ۖ قُلْ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُم مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِينَ ۔الخ
ترجمہ۔ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا چیز ان کے لئے حلال ہے، کہہ دے تم کو حلال ہیں ستھری چیزیں، اور جو سدھاؤ شکاری جانور شکار پر دوڑانے کو

پس قرآن مجید کی نصوص صریحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی جانور کے گوشت کے حلال ہونے کے لیے ضروری ہے کہ بوقت ذبح اور غیر اختیاری صورت مثلاً شکار کے موقع پر تیر یا شکاری کتے کے چھوڑتے وقت اللہ کا نام لیا جائے اور اگر اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لیا گیا تو پھر خواہ ذبح ہو جائے، خواہ تیرے شکار ہو کر خون بہے یا کتا اسے پھاڑ ڈالے اور خون بہائے وہ گوشت حرام ہوگا۔ اور یہی مضمون بہت سی صحیح اور صریح احادیث میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں حضرت عدی بن حاتم رضؓ کی ایک ایک حدیث خاص طور سے مشہور ہے عَنْ عَدِيِّ بْنِ حَاتِمٍ قَالَ قَالَ لِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَرْسَلْتَ كَلْبَكَ فَاذْكُرِ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهِ فَإِنْ أَمْسَكَ عَلَيْكَ فَأَدْرَكْتَهُ حَيًّا فَاذْبَحْهُ وَإِنْ أَدْرَكْتَهُ قَدْ قَتَلَ وَلَمْ يَأْكُلْ مِنْهُ فَكُلْهُ وَإِنْ أَكَلَ فَلَا تَأْكُلْ فَإِنَّمَا أَمْسَكَ عَلَى نَفْسِهِ فَإِنْ وَجَدْتَ مَعَ كَلْبِكَ كَلْبًا غَيْرَهُ وَقَدْ قَتَلَ فَلَا تَأْكُلْ فَإِنَّكَ لَا تَدْرِي أَيُّهُمَا قَتَلَهُ وَإِذَا رَمَيْتَ بِسَهْمِكَ فَاذْكُرِ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهِ فَإِنْ غَابَ عَنْكَ يَوْمًا فَلَمْ تَجِدْ فِيهِ إِلَّا أَثَرَ سَهْمِكَ فَكُلْ إِنْ شِئْتَ وَإِنْ وَجَدْتَهُ غَرِيقًا فِي الْمَاءِ فَلَا تَأْكُلْ (بخاری، مسلم) اس حدیث کے اس جملہ پر کہ فَإِنَّكَ لَا تَدْرِي أَيُّهُمَا قَتَلَهُ شارحین حدیث کی یہ تشریح ملاحظہ کی جائے قَالَ الشُّمُنِّيُّ وَفِي الْكُتُبِ السِّتَّةِ (یعنی صحاح ستہ میں) عَنْ عَدِيِّ بْنِ حَاتِمٍ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنِّي أُرْسِلُ كَلْبِي فَأَجِدُ مَعَهُ كَلْبًا آخَرَ وَلَا أَدْرِي أَيُّهُمَا أَخَذَهُ فَقَالَ لَا تَأْكُلْ فَإِنَّمَا سَمَّيْتَ عَلَى كَلْبِكَ وَلَمْ تُسَمِّ عَلَى كَلْبٍ آخَرَ ۔ وَلِهَذَا قَالَ عُلَمَاؤُنَا يُشْتَرَطُ فِي الذَّابِحِ أَنْ لَا يَكُونَ تَارِكَ التَّسْمِيَةِ عَمْدًا مُسْلِمًا كَانَ أَوْ كِتَابِيًّا فَأَمَّا إِنْ نَسِيَ التَّسْمِيَةَ صَحَّ لِأَنَّ النِّسْيَانَ مَرْفُوعُ الْحُكْمِ عَنِ الْأُمَّةِ لِقَوْلِهِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رُفِعَ عَنْ أُمَّتِي الْخَطَأُ وَالنِّسْيَانُ وَمَا اسْتُكْرِهُوا عَلَيْهِ رَوَاهُ الطَّبَرَانِيُّ بِسَنَدٍ صَحِيحٍ وَلِأَنَّ فِي اعْتِبَارِهِ حَرَجًا لِأَنَّ الْإِنْسَانَ كَثِيرُ النِّسْيَانِ وَالْحَرَجُ مَدْفُوعٌ فِي الشَّرْعِ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ) وَقَالَ الْإِمَامُ الْهُمَامُ حُجَّةُ الْإِسْلَامِ أَبُو بَكْرٍ الرَّازِيُّ الْجَصَّاصُ رَحِمَهُ اللَّهُ تَعَالَى قَالَ اللَّهُ تَعَالَى وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ ۔ فَنَهَى عَنْ أَكْلِ مَا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَيَدُلُّ عَلَى أَنَّ الْمُرَادَ حَالَ تَرْكِهَا عَمْدًا قَوْلُهُ تَعَالَى وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ وَالنَّاسِي لَا يَلْحَقُهُ سِمَةُ الْفِسْقِ وَيَدُلُّ عَلَى أَنَّ تَرْكَ التَّسْمِيَةِ

یفید الذکاۃ قولہ تعالیٰ یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ الیٰ قولہ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ومعلوم ان ذالک امر یقتضی الایجاب وانہ غیر واجب عند الاکل فدل علیٰ انہ اراد بہ حال الاصطیاد والسائلون قد کانوا مسلمین فلم یبح لہم الاکل الا بشریطۃ التسمیۃ ویدل علیہ قولہ تعالیٰ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ یعنی فی حال النحر لانہ قال اللہ تعالیٰ شانہ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا والفاء للتعقیب انتہیٰ

احکام القرآن للامام الجصاصؒ میں جس جانور پر بوقت ذبح اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا جاوے اور ذبح کر دیا جائے، اس کے بارے میں تین مسلک منقول ہیں

۱۔ ایسی صورت میں گوشت حلال نہیں مطلقاً، خواہ ترک تسمیہ عمداً ہو یا سہواً یا نسیاناً۔ یہ قول حضرت ابن عمرؓ، نافع رہ، عامر شعبیؒ، محمد بن سیرین سے منقول ہے۔ اور امام مالک رہ اور امام احمد رہ سے بھی یہ روایت منقول ہے۔ اور بہت سے متقدمین و متاخرین حنابلہ نے اس کو پسند کیا ہے۔ ابو ثور اور داؤد ظاہری کا بھی یہی قول ہے۔ اور وہ حضرات اپنے استدلال میں قرآن مجید کی آیات کا عموم و اطلاق اور بہت سی ایسی حدیثیں پیش کرتے ہیں جن میں عمداً اور سہواً کا کوئی فرق مذکور نہیں، اس لئے دونوں صورتوں میں ایک حکم مانتے ہیں۔

۲۔ اگر ترک تسمیہ عمداً ہو تو گوشت حلال نہیں، اور اگر سہواً و نسیاناً رہ گیا ہو تو کوئی حرج نہیں۔ امام مالک رہ، امام احمد بن حنبل رہ، امام ابو حنیفہ و صاحبین اور اسحاق ابن راہویہ رحمہم اللہ کا مسلک یہی ہے۔ اور حضرت علی رہ حضرت ابن عباس، سعید ابن المسیب، عطا، طاؤس، حسن بصری، ابو مالک، عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، جعفر بن محمد، ربیعہ بن عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ کرام اور تابعین عظام کا مسلک یہی ہے۔

۳۔ تسمیہ مستحب اور بہتر ہے، لیکن اگر تسمیہ نہ ہو تب بھی ذبح کرنے کے بعد گوشت حلال ہوگا۔ یہ تیسرا مسلک امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے وہ فرماتے ہیں کہ اگر عمداً بھی ترک تسمیہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔ انہوں نے اپنے استدلال میں دو حدیثیں پیش کی ہیں۔ ایک مرسل روایت ابو داؤد کی ہے ذَبِيْحَةُ الْمُسْلِمِ حَلَالٌ ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ اَوْ لَمْ يُذْكَرْ اِنَّهُ اِنْ ذَكَرَ لَمْ يَذْكُرْ اِلَّا اسْمَ اللّٰهِ، اور بیہقی میں ابن عباسؓ کا قول ہے اِذَا ذَبَحَ الْمُسْلِمُ وَلَمْ يَذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ فَلْيَاْكُلْ فَاِنَّ الْمُسْلِمَ فِيْهِ اسْمٌ مِّنْ اَسْمَآءِ اللّٰهِ۔ ذبیحہ کے بارے میں یہ تین مسلک تمام کتب تفسیر، حدیث اور فقہ میں مذکور ہیں۔ یہاں میں نے مختصراً تفسیر ابن کثیر سے نقل کیا ہے۔ تینوں مسلکوں اور ان کے دلائل کو میں نے غور سے دیکھا اور سوچا۔ اگر مجھے حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کی دیانت و ذہانت پر مکمل اعتماد نہ ہوتا، یا مسلک ثالث کے سلسلے میں ذکر کردہ روایات نہ ہوتیں اور میں اپنے اجتہاد سے سوچتا، تو یقیناً میں اول مسلک کی تائید کرتا، کیونکہ قرآن مجید کے الفاظ میں عموم و اطلاق ہے۔ اور ممانعت بھی نہایت زوردار الفاظ میں ہے لیکن میں تحقیقی طور سے سمجھتا ہوں کہ امام ابو حنیفہ رہ کا اجتہاد جبکہ قرآن مجید کی آیت بھی ان کے سامنے ہو بہرحال نہایت عمیق ہوتا ہے۔ اس لیے علےٰ بصیرۃ تقلید کرتا ہوا میں بھی مسلک ثانی کو راجح قرار دیتا ہوں۔ البتہ میں اتنا ضرور سمجھتا ہوں جس کی تصریح مجھے کسی کتاب میں لکھی ہوئی نہیں ملی کہ عمداً و نسیاناً کا فرق بھی صرف مسلمان کے بارے میں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ نسیاناً حلال قرار دینے کی جتنی دلیلیں ان حضرات نے دی ہیں ان سب میں مسلم او مومن، اور رفع عن امتی الخ کا بار بار ذکر ہو رہا ہے۔ اس لئے جب دلائل میں مسلم کی قید بار بار لگی ہوئی ہے، تو میں سمجھتا ہوں کہ نسیاناً ترک تسمیہ صرف مسلمان کے لئے ہونا چاہیے اور بس۔ اہل کتاب غیر مسلموں کے لئے وہی عموم رہے کہ خواہ ترک تسمیہ عمداً کریں یا سہواً، آیت کے عموم کے مطابق حرمت ثابت ہو۔ اور تیسرا مسلک جو حضرت امام شافعیؒ کا ہے اس کو با عتبار دلیل نہایت ضعیف سمجھتا ہوں جس کی تضعیف پر مفصل بحث کی جا سکتی ہے۔ اور عام کتب فقہ میں یہ بحث موجود بھی ہے اور اس کے متعلق حنفیہ کے دلائل کا پلڑا نہایت بھاری ہے۔ اور اگرچہ امام شافعی کا قول نہ تو میرے خیال میں ذکر کرنے کے قابل بھی نہیں۔ امام شافعی رہ نے بھی جو دو حدیثیں اپنی تائید میں نقل فرمائی ہیں، ان میں صریحاً ذَبِيْحَةُ الْمُسْلِمِ اور اِذَا ذَبَحَ الْمُسْلِمُ کے لفظ موجود ہیں۔ بس ان کے قول کا مطلب بھی

صرف یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان صحیح العقیدہ صرف ترک تسمیہ عمداً کرے تو چونکہ اس کا عقیدہ درست ہے اور بہرحال اللہ تعالیٰ ہی کا نام لے گا اس لئے اس کا ترک تسمیہ مضر نہیں۔ اہل کتاب کے بارے میں ان کا قول بھی نہیں۔ قرآن مجید کی آیات اور احادیث کثیرہ کے عموم کی بنا پر اگرچہ مطلقاً متروک التسمیہ کی حرمت کا حکم معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بعض احادیث کے مضمون اور نسیان کے عذر کو سامنے رکھ کر ایک صحیح العقیدہ مسلمان کے بارے میں ترک تسمیہ نسیاناً حکم میں ذکر اسم اللہ کے ہے۔ اس لئے امام ابو حنیفہؒ و صاحبینؒ اور امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے قول کے مطابق صرف وہی صورت مستثنیٰ ہے کہ مسلمان سے سہواً اللہ تعالیٰ کا نام رہ جائے ورنہ اس کے علاوہ ترک تسمیہ کی جتنی صورتیں ہیں ان میں ذبیحہ حرام ہوگا۔ یہ چند فقہی عبارات بھی نقل کرتا ہوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے فقہائے کرام نے اس مسئلہ کو کس طرح سمجھا ہے۔

ہدایہ ایک مستند فقہی کتاب ہے اس میں لکھا ہے "وَذَبِيْحَةُ الْمُسْلِمِ وَالْكِتَابِيِّ حَلَالٌ" اس ہدایہ کی شرح عنایہ میں لکھا ہے ذَبِيْحَةُ الْمُسْلِمِ وَالْكِتَابِيِّ ذِمِّيًّا كَانَ اَوْ حَرْبِيًّا اِذَا اَتٰى بِهٖ مَذْبُوْحًا اُكِلَ وَاِذَا ذَبَحَ بِالْحُضُوْرِ فَلَا بُدَّ مِنَ الشَّرْطِ الْمَذْكُوْرِ وَهُوَ اَنْ لَّا يَذْكُرَ اسْمَ غَيْرِ اللهِ عَلَيْهِ۔ ہدایہ میں ہے "وَتَحِلُّ اِذَا كَانَ يَعْقِلُ الذَّابِحُ لَفْظَ التَّسْمِيَةِ وَقِيْلَ يَعْقِلُ اَنَّ حِلَّ الذَّبِيْحَةِ بِالتَّسْمِيَةِ" (یعنی ذابح کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ اس کا نظریہ یہ ہو کہ اللہ کا نام لے کر ذبح کرنے سے جانور حلال اور قابل انتفاع ہو جاتا ہے)

اسی طرح ہدایہ کی عبارتوں کی تشریح کے سلسلے میں علامہ ابن ہمامؒ صاحب فتح القدیر نے لکھا ہے "وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ عَامٌّ مَخْصُوْصٌ يُخْرِجُ مَا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللهِ عَلَيْهِ فَيَقْتَضِيْ اَنْ تُصُوِّرَ اِلَيْهِ دَلِيْلٌ اٰخَرُ" صاحب ہدایہ نے متروک التسمیہ کے بارے میں جب تین مسالک نقل کئے ہیں تو وہاں یہ تصریح بھی کر دی ہے "وَالْمُسْلِمُ وَالْكِتَابِيُّ فِيْ تَرْكِ التَّسْمِيَةِ سَوَاءٌ" ویسے آپ خود عقلاً بھی اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ جب مسلمان اللہ تعالیٰ کا نام لئے بغیر ذبح کرے تو حرام ہو اور یہودی و نصرانی اللہ تعالیٰ کا نام لئے بغیر ذبح کرے تو حلال ہو، کیا اس ذابح کا مسلمان ہونا کوئی جرم ہے کہ بیچارہ چونکہ مسلمان تھا اس لئے اس کا ذبیحہ حرام ہو گیا۔ اور وہی ترک تسمیہ غیر مسلم کتابی نے کیا تو مسلمان نہ ہونے کی برکت سے وہ حلال ہے۔ اس بات کا غیر معقول ہونا واضح ہے۔ متروک التسمیہ عامداً کے بارے میں ہدایہ میں بھی نقل ہے "وَقَالَ اَبُوْ يُوْسُفَ وَالْمَشَائِخُ رَحِمَهُمُ اللهُ اَنَّ مَتْرُوْكَ التَّسْمِيَةِ عَامِدًا لَا يَسَعُ فِيْهِ الْاِجْتِهَادُ وَلَوْ قَضَى الْقَاضِيْ بِجَوَازِ بَيْعِهٖ لَا يَنْفُذُ لِكَوْنِهٖ مُخَالِفًا لِلْاِجْمَاعِ" اس سلسلہ میں فقہائے کرام کی کافی عبارتیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مگر میرے خیال میں مزید حوالجات کی ضرورت نہیں۔

اب حیرانی اس بات پر ہے کہ کسی عالم دین نے مذکورہ صورت میں گوشت کھانے کا حکم کیسے دے دیا؟ اصل بات یہ ہے کہ امام خواہ واشنگٹن کا ہو یا لندن کا وہ یورپ کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوتے ہیں اور احساس کمتری میں مبتلا ہوتے ہیں اوّل تو ان لوگوں کے پاس علوم دینیہ کا علم نہیں ہوتا اور جو کچھ جانتے بھی ہیں تو یورپ والوں کے سامنے عربیت کی خاطر کھل کر بات کرتے ہوئے شرماتے ہیں۔ ذہنی افلاس عام ہے۔ نیز ان کا علم بھی مستشرقین کی لکھی ہوئی "اسلامی کتابوں" کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ہر مسئلہ کو ان کی عینک سے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس لئے آپ اصولاً اس بات کو سمجھ لیجئے کہ واشنگٹن کے دو رکعت کے اماموں کا یہ قول ان مسائل میں بالکل کوئی حجت نہیں۔ ائمہ تفسیر و حدیث اور امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف و امام محمد یا پھر امام مالک و امام احمد و امام شافعی رحمہم اللہ جیسے حضرات کے اقوال و فتاویٰ کا اعتبار ہے۔ اور پھر حیرانی ہوتی ہے کہ یہ لوگ عام طور سے دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم قرآن مجید کے حلال و حرام کو معیار ٹھہراتے ہیں۔ تو پھر قرآن مجید کی آیات صریحہ سے تو مطلقاً حرمت ثابت ہوتی "وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ" لم یذکر فعل مجہول شاید اسی لئے ذکر کیا گیا ہے کہ اصل حرمت کی وجہ اللہ کے نام کا ذکر نہ ہونا ہے۔ ذکر نہ کرنے والا خواہ مسلمان ہو، خواہ کتابی، اور اگر صرف مسلمان کا ذکر نہ کرنا موجب حرمت ہوتا، اور کتابی کا نہ کرنا بھی معاف ہوتا تو پھر یقیناً عبارت یوں ہوتی۔ "وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ تَذْكُرُوا اسْمَ اللهِ عَلَيْهِ" یہاں ایک عجیب لطیفہ بھی یاد آیا جس کو آپ کے لئے تائید غیبی سمجھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے متروک التسمیہ ذبیحہ کے کھانے سے زور دار طرز بیان کے ساتھ منع فرمانے اور اسے فسق

قرار دینے کے بعد شاید آپ جیسے مبتلا حضرات اور ایسے رفقاء میں گھرے ہوئے مسلمانوں کو تنبیہ کرنے کے لیے اس سے آگے مقصد فرمایا!

وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ ۝

اور بے شک شیاطین اپنے دوستوں کو پٹی پڑھا رہے ہیں تاکہ وہ تم سے اس مسئلے میں حجت بازی کریں اور یاد رکھو اے مسلمانو! اگر تم نے ان جھگڑنے والے شیطان کے دوستوں کا کہا مانا اور مردار کو حلال سمجھا اور کھانے لگے، تو تم بھی مشرک ہو جاؤ گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیز کو محض ان شیاطین کے کہنے پر حلال ٹھہرانا انسان کو مشرک بنا دیتا ہے۔

میں امید کرتا ہوں کہ قرآن مجید کی یہ آیت آپ کے لیے کافی تنبیہ ثابت ہوگی۔ اور ان جھگڑنے اور بحث کرنے والوں کی خوشنما کج بحثی کا ہرگز شکار نہ ہوں گے۔ گوشت کی وقتی لذت کی خاطر دین و ایمان سے ہاتھ دھو نہ بیٹھو گے۔ میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ آپ کے لیے یہ مجاہدہ ہے محض خوف خدا کی بنا پر وقتی لذتوں کو ترک کرنے۔ جہاد اور نفس کے تقاضوں کو پامال کرنا آپ کی دیانت داری کا تقاضا ہونا چاہیے۔ اگرچہ ان شرعی دلائل کے بعد کوئی عقلی وجہ پیش کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن اطمینان قلب کے لیے اس مسئلہ کو یوں بھی ذہن نشین کیجئے کہ اللہ تعالیٰ کو منظور یہ ہے کہ اس کائنات میں ہر طرح سے اور ہر شعبۂ زندگی میں اس کے نام کا سکہ چلے اور اس کی آقائی و حاکمیت ہر معاملہ میں تسلیم کی جائے اور بندے کا تعلق اپنے مولا سے تازہ رہے۔ کسی دنیوی حکومت میں اگر کوئی شخص عمدہ سے عمدہ کاغذ پر نوٹ چھاپ کر یا چاندی سونے کا روپیہ بنا کر اس پر اپنی مہر ثبت کر دے تو اگرچہ وہ چیز وہی ہے جو حکومت کی کرنسی میں مستعمل ہوتی ہے، لیکن چونکہ حکومت کی کرنسی نہیں اور اس حکومت کا ٹھپہ نہیں، تو حکومت کے ہاں نہ صرف یہ کہ اس کی قدر و قیمت نہیں ہوتی بلکہ وہ حکومت کے قانون میں ایک سنگین جرم ہے۔

اسی طرح جانور اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے ہیں اور ان کے گوشت کو حلال قرار دے کر انسانوں کے لیے اپنا انعام فرمایا ہے۔ چونکہ خون مضر ہے اس لیے اسے حرام فرمایا اور گوشت سے خون خارج کر دینے کا حکم فرمایا۔ اور خون خارج کرنے کا خاص طریقہ بصورت ذبح مقرر فرمایا اور ساتھ ہی ارشاد ہوا کہ چونکہ یہ سب کچھ میرا دیا ہوا مال ہے اور میں نے ہی تمہارے استعمال کے لیے اسے جائز اور حلال قرار دیا ہے اس لیے بوقت ذبح میرے نام کا سکہ چلنا ضروری ہے۔ اور اگر میرے پیدا کردہ جانوروں پر ذبح کے وقت تم میرا نام نہیں لیتے تو گویا میری حاکمیت و آقائی کو بھول کر اپنی مرضی اور اختیار کو دخل انداز کرنے لگے ہو۔ اس لیے یہ غیر سرکاری سکہ چلانا قانون الٰہی میں جرم ہے۔ معلوم نہیں یورپ و امریکہ کے مفتیوں کے پیش نظر اس کے لیے کون سی دلیل جواز ہے؟

میرے خیال میں اگر کسی کو ظاہر طور پر شبہ پڑ سکتا ہے، تو قرآن مجید کی صرف اس آیت سے وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ (پ ۶) یعنی اہل کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے۔ اس آیت کو دیکھ کر اگر کوئی شخص فوراً یہ کہہ دے کہ یہود و نصاریٰ کے ہاں گوشت جس طرح بھی ہو حلال ہے اور اس کے لیے بطریق معروف ذبح اور ذکر اللہ (بسم اللہ، اللہ اکبر کہنا) عند الذبح شرط نہ سمجھے، تو آپ خود ہی سوچ لیجئے کہ یہ بات کس قدر غیر معقول ہے۔ کیونکہ مسلمان بیچارہ تو بحکم قرآن "إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ" مقررہ شرائط کے مطابق اللہ کا نام لے کر ذبح کرنے کا پابند ہو، مگر یہود و نصاریٰ کو کھلی چھٹی ہو کہ جس طرح چاہیں بلا ذبح و بلا تسمیہ جانور کو ہلاک کر دیں۔ اور پھر بھی وہ حلال ہو۔ یہ کتنی بڑی غلط فہمی ہو جو آیۂ مذکورہ کا پیش کر کے پیدا کی جاتی ہے۔ حالانکہ اس کا مطلب تو صرف اتنا ہے کہ جس طرح ایک مسلمان کا ذبیحہ حلال ہے، اسی طرح اہل کتاب یہودی و نصرانی کا ذبیحہ بھی حلال ہے۔ باقی جو دیگر شرائط مسلمان کے لیے ہیں وہ سب اہل کتاب کے لیے بھی ضروری ہیں۔ تب ذبیحہ کا کھانا حلال ہوگا یعنی باقاعدہ ذبح کر کے خون بہانا، اور بوقت ذبح اللہ تعالیٰ کا نام لینا۔ مطلب یہ کہ نہ تو متروک التسمیہ ہو اور نہ اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ کسی دوسرے کے نام کو شریک کیا گیا ہو۔ چنانچہ عقل کا تقاضا بھی یہی ہے۔ اور تمام مفسرین و فقہا نے اس کی تصریح بھی کر دی ہے۔

امام ابوبکر جصاص رازی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۳۷۰ھ نے صاف لکھا ہے کہ قال ابوحنیفہؒ و ابو یوسفؒ و محمدؒ و زفرؒ

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ
ترجمہ
مولانا معروف شاہ شیرازی

صوفیاء اور تفسیر

صوفیائے قرآن میں جو کلام کیا ہے وہ تفسیر نہیں ہے علامہ ابن الصلاح اپنے فتووں میں کہتے ہیں :-
صوفیا میں جو ثقہ ہیں ان کے متعلق یہ خیال یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ اس حیثیت سے نہیں کہتے کہ یہ تفسیر ہے، اور نہ کسی لفظ کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کیونکہ ظاہر کے خلاف کوئی تفسیر کرنا باطنیہ کا مسلک ہے
وہ یہ تفسیر وہ کسی نظیر کی وجہ سے کرتے ہیں جو کہ قرآن کریم میں وارد ہوتی ہے اور ایک نظیر دوسری کے ساتھ ذکر کردی جاتی ہے اور اس کے باوجود اگر صوفیا اس قسم کی تفسیر نہ کرتے جس میں وہم و اشتباہ کی گنجائش ہے تو بہت بہتر ہوتا۔

فرقہ باطنیہ کی تفسیر

علامہ نسفی اپنی کتاب عقائد نسفیہ میں کہتے ہیں "نصوص اپنے ظاہری معنی میں معتبر ہیں اور ظاہری معنے چھوڑ کر وہ معنے لینا جو باطنیہ بیان کرتے ہیں الحاد ہے۔"
علامہ تفتازانی اپنی شرح میں لکھتے ہیں :- "ملاحدہ کو باطنیہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ کہتے ہیں، نصوص کے ظاہری معنی مراد نہیں ہیں بلکہ ان کے کچھ باطنی معنی ہیں اور ان کو معلم کے سوا کوئی نہیں جانتا اور ان کا مطلب یہ ہے کہ شریعت معتبر نہیں ہے۔"

اہل تحقیق کی رائے

علامہ موصوف کہتے ہیں "اور یہ جو کہ بعض محققین نے کہا ہے کہ نصوص کا ظاہری مفہوم ہی معتبر ہے۔ اور اس کے باوجود نصوص میں بعض نکات کی طرف خفی اشارات ہیں اور ان نکات اور ظاہری معانی میں تطبیق بھی ہو سکتی ہے۔ تو یہ بڑے پتے کی بات ہے

باطنیہ کی تحریف

شیخ الاسلام بلقینی رح سے کسی شخص کے متعلق پوچھا گیا کہ وہ آیہ کریمہ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ۔ کون ہے وہ جو اللہ کے پاس شفاعت کرے اس کی اجازت کے بغیر، کی تفسیر یوں کرتا ہے من ذل ذی یشف ع عندہ الا باذنہ جس نے اس نفس کو ذلیل کیا شفا پائے گا جو اللہ کے نزدیک مگر اس کے حکم سے تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ ملحد ہے اور انہی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْ اٰیٰتِنَا لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَا ۔ جو لوگ ہماری آیتوں کے معنی بدلتے ہیں ہم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ ابن عباس کہتے ہیں آیت کے معنی کو اپنے محل سے ہٹانا الحاد ہے +

تو تمام قرآن مجید میں صرف یہی ایک آیت اس کے لئے قابل عمل رہ گئی ہے اور لا تقربوا الصلوٰۃ (نماز کے قریب مت جاؤ) والے مشہور لطیفے کی طرح باقی قرآن مجید سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ نیز ایک اور بات بھی پیش نظر رہے کہ موجودہ یورپ و امریکہ کے نصاریٰ حقیقت میں نصاریٰ ہی نہیں، وہ اکثر دہریے ہیں اور صرف نسلی نصرانیت باقی رہ گئی ہے اور حلال و حرام کے سلسلے میں توریت اور انجیل کی شریعت کو صرف عملاً ہی نہیں، بلکہ اعتقاداً بھی ترک کر چکے ہیں۔ اور بعض فقہائے امت نے تصریح کے ساتھ تاکید کی ہے، جن اہل کتاب کا ذبیحہ حلال ہے انھیں واقعۃً اور عملاً یہودی یا نصرانی ہونا چاہیے محض نسلاً یا اسماً ان کا اہل کتاب قوم سے ہونا کافی نہیں۔ ورنہ جو علت مشرکین کے ذبیحے کی حرمت کی ہے وہی یہاں بھی مشترک ہے۔ حضرت علی اور دوسرے صحابۂ کرام کے فتاوے اس باب میں موجود ہیں۔ اس وقت جو محض نام کے نصرانی تھے ان کا ذبیحہ روک دیا گیا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس اور دیگر تابعین رضی اللہ عنہم سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔

موجودہ زمانے میں یورپ و امریکہ کے عیسائی باشندوں کے متعلق آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کی مذہبی حیثیت کیا ہے، زندگی سے انھوں نے تو خداوند تعالیٰ کو عملی زندگی سے بالکل خارج کر دیا ہے اور نفس کو اپنا معبود بنا کر ہر معاملے میں نفسانی خواہشات کی بندگی کر رہے ہیں خدا کے ایسے باغیوں کو ٹھیک وہی مقام دینا جو اللہ کے فرماں بردار مسلم بندوں کا ہوتا ہے کسی طرح درست نہیں۔

بقیہ مضمون صفحہ ۵ سے آگے :-

بھی باقی نہ رہے۔

یہ بات ہم کسی قیاس اور مفروضہ کی بنا پر نہیں کہہ رہے ہیں۔ پورا کمیونسٹ لٹریچر اس پر شاہد ہے کہ اس میں اخلاق کو محض ایک "قدر اضافی" کی حیثیت دی گئی ہے جو ہمیشہ ادلتی بدلتی رہتی ہے، اشتراکی ادب کا یہ تصور فسق و فجور اور گناہوں کو سند جواز عطا کرتا ہے اس بات کو یاد رکھئے گرہ میں باندھ لیجئے اور ذہنوں میں اتار لیجئے کہ جہاں کہیں بھی اللہ کا خوف دلوں میں نہیں ہے اور بے تو یونہی سا ہے، آخرت کا تصور دھندلا پڑ گیا ہے۔ شراب نوشی، رقص و سرود، قمار بازی، مرد و زن کے بے باکانہ اختلاط اور دوسری ناجائز تفریحات کا زور ہے، وہاں کمیونزم کے لئے زمین بڑی حد تک ہموار ہے۔

جلیل احمد قدوائی
ایم۔اے

بجلیاں

بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی پوشیدہ ہیں (اقبال)

میں یہ ماننے سے انکار کرتا ہوں کہ کسی شاعر کا کسی زبردست تجربہ یا بڑے حادثہ سے متاثر ہو کر ایک طویل طویل فلسفیانہ نظم کہنا ایک غیر فطری امر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اپنی والدہ محترمہ کی وفات کی خبر سن کر اقبال کا "والدہ مرحومہ کی یاد میں" جیسی طولانی اور بلند مفکرانہ نظم لکھ دینا ایک غمگین بیسیر بیٹے کا قدرتی ردعمل نہیں ہے۔ مگر یہ غلط ہے ایک فنکار ہر حال میں ایک فنکار رہتا ہے۔ اسے اپنے فن سے زیادہ کسی چیز سے لگاؤ نہیں ہوتا۔ وہ اپنے ہر تجربہ کو اپنے فن میں منتقل و منضبط کرنا چاہتا ہے اپنے غم کو بھی اپنے فن میں متشکل دیکھنا چاہتا ہے۔ اور بڑے غم کو اپنے فن کے ایک بڑے نمونے بیں۔ اقبال ایک بڑا فلسفی شاعر تھا۔ اس نے اپنے غم کو ایک اعلیٰ پایہ کی فلسفیانہ نظم میں ابدیت بخشدی

خواجہ حسن نظامی مرحوم نے ایک مضمون لکھا تھا "ہماری ڈکار"۔ معلوم ہوا کہ ڈکار پر بھی خدا کا شکر ادا کرنا اور سننے والے کو خدا سے رحم کی درخواست کرنا چاہیئے۔ ایک ڈکار آجانے سے ع

کیسی ملی ہے قلب کو راحت نہ پوچھئے

انقباض کی ساری کلفت دور ہوگئی۔ جیسے زندگی پھر سے مل گئی۔ یہیں سے مشرق و مغرب کے آداب کا فرق ملاحظہ ہو۔ وہاں کسی کی موجودگی میں ڈکار آجائے تو اس شخص سے معافی مانگنی پڑتی ہے (Sorry) (معاف کیجئے) یعنی انسان ہو کر یہ کیسی ناشائستہ حیوانی حرکت سرزد ہوگئی۔ گویا اور جتنی حرکتیں سرزد ہوتی رہتی ہیں یا ہو رہی ہیں وہ سب کی سب اشرف المخلوقات کے شایانِ شان ہیں جن پر انسان کو سرفخر سے بلند ہونا چاہیئے

میں نے اپنے رب کی طرف ذرا سی توجہ کی اور جو چاہا پا لیا۔ وہ معاملات جو برسوں میں بڑی بڑی تدبیروں میں سرانجام نہ ہوتے تھے ایک آن میں طے ہوگئے۔ اب مجھے اس پر بالکل حیرت نہیں ہوتی کہ خاصانِ خدا کی زبان میں تاثیر کیونکر اور کہاں سے آتی ہے۔ اور پیغمبروں سے معجزات کا ظہور میں آنا بھی مجھے معمولی بات معلوم ہوتی ہے۔

میں ان لوگوں سے بیزار ہوں جو یہ کہتے ہیں اسلام میں دین اور دنیا الگ الگ نہیں ہیں۔ دین اور دنیا الگ الگ نہیں ہیں کہہ کر وہ دین اور دنیا کے الگ الگ ہونے کا تصور خود پیدا کرتے ہیں کہنا یہ چاہیئے کہ اسلام تو عین دنیا ہے۔ ہاں ہمارے اور آپ کے تصور کی ایک بے معنی بے مقصد یا صرف اپنے مطلب کی دنیا نہیں بلکہ نیابت الٰہی کے مقصد کو پورا کرنے کی غرض سے ایک مقررہ طریقہ ایک مجوزہ ضابطہ کے مطابق گذاری جانے والی دنیا۔ کیا اسلام کے تمام مختلف النوع احکام ایک اعلیٰ شرف رکھنے والے دنیا دار ہونے کی طرف

ہماری رہنمائی نہیں کرتے؟ کیا عورت و مرد، نیز والدین اور اولاد کے درمیان تعلقات، زیردستوں، کمزوروں، مسکینوں، محتاجوں کے ساتھ برتاؤ، ہمسایگی، وراثت، معیشت، معاشرت، اولی الامر منکم وغیرہ کے بارے میں ہدایات دنیا ہی میں ایک اعلیٰ نظام پیدا کرنے کی خاطر نہیں ہیں۔؟ کیا خود نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کے احکام کی تعمیل دنیوی زندگی کے ساتھ ساتھ اور دنیوی کاروبار کے متوازی فرض نہیں کی گئی ہے؟ کیا اسلام کے یہ فرائض دنیا ہی کی زندگی کی طہارت اور اس میں ایک عالمگیر نظم و ضبط پیدا کرنے کی غرض سے متعین نہیں کئے گئے ہیں؟ کیا حشر میں جزا و سزا کی ترغیب و تخویف اور جنت و دوزخ کی تحریص و تنقیص اس دنیا میں انسان کے عمل کی اصلاح کے لئے نہیں ہیں؟

اگر مجھے اس عظیم الشان معیار پر پورا اترنے والا دنیادار ہونے کی سعادت حاصل ہو جائے تو اس کے متعلق فکر نہیں کہ لوگ مجھے پابند مذہب کہتے ہیں یا لامذہب بتاتے ہیں۔

میں قرآن کریم پر آنکھ بند کر کے ایمان رکھتا ہوں۔ معناً ہی نہیں لفظاً بلکہ حرفاً۔ جب قرآن کہتا ہے" اور وہی قادر مطلق ہے جس نے زمین کو بچھایا" اور "بچھایا" کے سیدھے سچے اور صاف معنی لے کر زمین کے چپٹا اور صرف چپٹا ہونے پر یقین رکھتا ہوں۔

خدا کی اس وسیع و عظیم کائنات میں انسان کی حیثیت کیا ہے؟ اس کا اندازہ گھر کی چار دیواری میں رہ کر یا گھر کے کمرے کی محدود فضا میں بیٹھ کر نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہو تو جاؤ ساحل بحر پر یا کسی لق و دق صحرا میں آبادی سے دور، بہت دور جہاں سوا تمہارے ایک متنفس نہ ہو تاحد نظر دائیں بائیں آگے پیچھے اور سر پر ایک عظیم خلا ہو اور بس۔ تمہارے اور افق کے درمیان فاصلے کی کوئی حد ہی معین نہیں ہو سکتی کیا اس فضا میں صبح صادق کے وقت پہنچ سکتے ہو؟ اگر ہاں تو ایک عظیم سناٹا بھی چاروں طرف ہوگا ع

اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

ہر طرف ایک پُرجلال اور سربسجود خاموشی ہوگی۔ "سیاہ دھاری میں سے سفید دھاری" ابھرتی دکھائی دے گی ستارے دم توڑتے ہوں گے ہر اس نظارے کی عظیم، دربزرد وسعتوں میں ایک برکاہ، ایک ننھے سے صفر سے بھی زیادہ معلوم نہ ہوں گے۔

سراج احمد چشتی فتحپوری

چکبست کا ایک شعر

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے - انہی اجزا کا پریشاں ہونا

پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی آنجہانی کا یہ ایک مشہور شعر ہے - عرصہ ہوا جناب اسد ملتانی صاحب نے اس شعر پر تنقید کی تھی جو اگست ۱۹۵۸ء کے رسالہ فاران کراچی میں شائع ہوئی تھی - اس تنقید میں محل اعتراض اول تو عناصر میں ظہور ترتیب میں لفظ ترتیب تھا کہ معنی کے لحاظ سے بجائے ترتیب کے لفظ ترکیب ہونا زیادہ صحیح تھا کہ عناصر کی باہم ترکیب نہ کہ ترتیب سے کوئی شے وجود میں آتی ہے - دوسرا اعتراض اجزاء عناصر کے باہم مرکب ہونے یا پریشان ہونے پر زندگی اور موت کے انحصار پر تھا - کہ یہ نظریہ ناقابل تسلیم تھا اور اس مسئلہ پر علم الحیاتیات کے نقطۂ نظر سے بحث کی گئی تھی

قطع نظر ان اعتراضات کے اس وقت اسی شعر پر تنقید کا پہلو صرف یہ دکھانا ہے کہ جس خیال کا اس شعر میں چکبست نے اظہار کیا ہے وہ خیال اچھوتا یعنی خود انہی کے دماغ کی پیداوار تھا یا یہ کہیں اور سے اخذ کیا گیا تھا - لہٰذا میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ یہ خیال مسٹر چکبست نے معلوم ہوتا ہے حضرت مولانا روم کی مثنوی کے اشعار ذیل سے اخذ کیا تھا - چنانچہ

مولانا روم علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

"زندگانی آشتیٔ ضدہاست — مرگ آں اندر میاں شاں جنگ خاست"
"صلح اضداد ست عمر ایں جہاں — جنگ اضداد ست عمر جاوداں"
"زندگانی آشتیٔ دشمناں — مرگ - وا رفتن بہ اصل خویش داں"

یعنی عناصر اربعہ جو ایک دوسرے کی ضد ہیں ان کی آشتی یعنی میل سے زندگانی کا وجود ہوتا ہے اور جب ان میں جنگ یعنی اختلاف اور افتراق پیدا ہو جاتا ہے تو موت ظہور میں آتی ہے - اور یہ موت گویا اپنی اصل کی طرف رجوع جانا ہے -

(ملاحظہ ہو مثنوی مولانا روم دفتر اول باب ... دلیر کشیدن خرگوش از شیر چون نزدیک چاہ آمد)

سید محمد عبد الرشید فاضل ایم اے
پروفیسر آدم جی سائنس کالج۔ کراچی

اقبال اور تصوّف

فاضل مقالہ نگار کی زیر ترتیب کتاب کا ایک باب

اقبال کی دوسری حیثیتوں (Aspects) کی طرح اس حیثیت پر بھی کافی لکھا جا چکا ہے اور آئے دن اخبارات میں کچھ نہ کچھ شائع ہوتا ہی رہتا ہے۔ مگر اول تو زیادہ تر لکھنے والوں نے اقبال کے تصوف سے متعلق اشعار کو جمع کر کے بعض کر دینے پر ہی اکتفا کیا ہے۔ دوسرے جن لوگوں نے اس سے زیادہ کچھ کیا بھی ہے۔ تو یا اپنی غلط اندیشی کی وجہ سے ایک زبردست (Controversy) پیدا کر دی۔ بعض نے اقبال کو ایسا ہی صوفی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جیسے کہ آج کل کے صوفی ہوتے ہیں۔ حالانکہ خود اقبال یہ فرماتے ہیں کہ ؎

یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تو کر   کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریق خانقاہی

بعض نے اس کے برعکس اقبال کو تصوف کا بدترین دشمن ٹھہرا دیا۔ درآں حالے کہ ان کا اپنا دعویٰ یہ ہے کہ:-

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی   برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

بعض نے دو قدم آگے بڑھ کر اقبال میں تضاد ثابت کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ ان کے نزدیک اقبال تصوف کے حامی اور مخالف بھی۔ جب کہ اس بارے میں وہ خود آج سے بہت پہلے لسان العصر اکبر الہ آبادی مرحوم کو یہ تحریر فرما چکے ہیں کہ:-

"آپ مجھے تناقض کا ملزم گردانتے ہیں۔ یہ بات درست نہیں بلکہ میری بدنصیبی یہ ہے کہ آپ نے مثنوی "اسرار خودی" کو اب تک نہیں پڑھا۔ میں نے کسی گذشتہ خط میں عرض کیا تھا کہ ایک مسلمان پر بدظنی کرنے سے محترز رہنے کے لئے میری خاطر ایک دفعہ پڑھ لیجئے۔ اگر آپ ایسا کرتے تو یہ اعتراض نہ ہوتا۔" [1]

بعض حال کے لکھنے والوں نے کچھ ایسے مضامین بھی لکھے ہیں جن کو پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ بارے کچھ لوگوں نے صحیح سمت میں چلنا [شروع کیا] ہے مگر ساتھ ہی اس بات پر افسوس بھی ہوا کہ ان حضرات کے پیش نظر قرآن و سنّت اور صوفیائے اسلام سے کہیں زیادہ فلاسفہ کے نظریات و افکار رہے ہیں اور انہیں نظریات میں انھوں نے اقبال کے تصوف کی حقیقت تلاش کرنے کی ناکام [کوشش] کی ہے۔ بعض معاصر فلاسفہ سے اقبال کا موازنہ اس قدر طوالت اختیار کر گیا ہے کہ موضوع زیر بحث نگاہ سے بالکل [اوجھل] ہو گیا۔ یا "تصوف اور اقبال" کا عنوان قائم کر کے تصوف پر جو لکھنا شروع کیا تو ایسا معلوم ہوا کہ وہ عنوان پر [نہیں بلکہ کسی اور] مضمون لکھ رہے ہیں۔

---

[1] [illegible] مکاتیب اقبال حصہ دوم [illegible]

غرضکہ عنوان بالا پر لکھنے والوں نے کعبے کے لئے ترکستان کا راستہ اختیار کیا ہے اور اسی طرح وہ تنازع جو محض کوتہ اندیشی و کم نظری کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھی اور ابتدا میں بہت معمولی تھی۔ اُسی غلط سمت میں دوڑتے رہنے کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ وسیع ہوتی چلی گئی۔ لہٰذا میں نے عنوان بالا پر اس خیال سے قلم اٹھایا ہے کہ لوگوں کی غلط اندیشی و بے راہ روی کو بے نقاب کرکے اس نزاع کو ختم یا کم سے کم کرنے کی کوشش کروں کہ قوم کا فائدہ اسی میں ہے۔

اقبال کے متعلق مذکورہ بالا نزاع کا اصل سبب یہ ہے کہ خود تصوف کے بارے میں لوگوں کے خیالات میں یک رنگی نہیں ہے۔ بعض اس شدت سے مخالف کہ اس کو قطعاً ایک غیر اسلامی چیز قرار دیتے ہوئے اس کے بارے میں حق و راستی کے سوا سب کچھ کہہ ڈالتے ہیں اور بعض ایسے دلدادہ کہ "تصوف برائے تصوف" سے بھی گزر کر "تصوف برائے ہر گونہ آزادی" کے قائل ہوگئے ہیں اور جو باتیں جہالت اور نادانی کی وجہ سے تصوف میں داخل ہوگئی ہیں اُن کو بھی عین اسلام قرار دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ شریعت ان کے نزدیک اہلِ ظاہر بلکہ مبتدیوں کے لئے ہے۔ مگر جہاں پہلا گروہ تصوف کی مخالفت میں اس کو اسلام کے خلاف بتلاتا ہے، وہاں دوسرا اپنی خواہشاتِ نفس کی تکمیل کے لئے اس کو شریعت کا پابند نہیں سمجھتا، اس طرح دونوں ہی کے خیال کی بنیاد جہالت پر ہے، ورنہ ایک نفسِ تصوف کی مذمت نہ کرتا اور دوسرا واقف ہونے کی صورت میں اس طرح شریعت کے احکام سے دامن کشاں گزر جانے کو تصوف نہ کہتا، اس لئے ہم پہلے تصوف اور صوفی کی حقیقت کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں کہ یہی وہ آئینہ ہوسکتا ہے جس میں مخالف اور موافق دونوں اپنی صورت دیکھ کر اپنی غلطی پر متنبہ ہوسکتے ہیں۔ ایک انکار پر اور دوسرا اقرار کے باوجود ترک و اہمال پر۔ اور جب یہ بنیادی نزاع ختم ہوجائے گی تو "اقبال اور تصوف" کے تحت جو نزاع قائم ہوگئی ہے وہ بھی ختم ہوجائیگی۔

اس مقصد کے لئے ہم نے یہ شکل اختیار کی ہے کہ تصوف اور صوفی کے بارے میں اُن لوگوں کے اقوال و احوال نقل کریں جو تصوف کے ائمۂ اولین شمار ہوتے ہیں اور جن کو موجودہ صوفیہ ہی نہیں منکرینِ تصوف بھی "سلفِ صالحین" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان اقوال و احوال سے معلوم ہوجائے گا کہ تصوف اور صوفی کس کو کہتے ہیں اور کس کو نہیں کہتے۔ شیخ سراج کتاب اللمع میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"علم کی دو قسمیں ہیں۔ ظاہری و باطنی، جب تک اس کا تعلق زبان و اعضا سے ہوتا ہے اُسے علم ظاہر سے تعبیر کریں گے اور اس کا نام شریعت ہے مثلاً عبادات میں طہارت، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ یا احکام میں طلاق، فرائض، قصاص وغیرہ۔ جب اس کا اثر ظاہر سے گزر کر قلب و باطن تک محیط ہوجاتا ہے تو اس کو علم باطن یا طریقت سے موسوم کردیتے ہیں، یہاں عبادات و احکام کی بجائے مقامات و احوال کی اصطلاحیں رائج ہیں مثلاً تصدیق، اخلاص، صبر، تقویٰ، توکل، محبت، عشق وغیرہ۔ اور اس تفریق دوگانہ کی سند قرآن مجید سے ملتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، ۔ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً (اُس نے اپنی نعمتیں تمہارے اوپر پوری کردیں ظاہر بھی اور باطنی بھی)" لے

مسائلِ تصوف، مسائل فقہ کی طرح تمام کے تمام کتاب اللہ اور سُنتِ رسول ہی سے مستنبط و ماخوذ ہوتے ہیں اس کی کیفیت شیخ سراج اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

استنباط کا حق اُن محققین و ارباب فہم کو پہنچتا ہے جو ظاہر و باطن، ہر طرح کتاب اللہ و سُنتِ رسولؐ کے متبع ہوتے ہیں۔ یہ لوگ عرصے تک اپنے علم و معلومات کے مطابق عمل کرتے رہتے ہیں تو اللہ انہیں وہ علم بھی دیدیتا ہے جو پیشتر انہیں نہ تھا۔ اور یہ علم

مقالہ کے آخر میں ہمارا تبصرہ ضرور ملاحظہ فرمالیا جائے (م۔ق)　　لے کتاب اللمع صفحہ ۲۲، ۲۵

انہی کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے۔ وہ اُن کے نفوس میں تزکیہ، قلوب میں جلا پیدا کرتا ہے اور کثرتِ معاصی و شہوات، حُبِّ جاہ، حرص و طمع، خود پسندی وغیرہ سے جو زنگ الوح قلوب پر جما ہوتا ہے وہ دُھل جاتا ہے اس وقت اُن پر اسرارِ غیب منکشف ہو جاتے ہیں اور اُن کی زبان حقائقِ عالیہ کی ترجمانی کرنے لگتی ہیں ؎ [۶]

امام ابوالقاسم قشیری تصوف اور تاریخ تصوف کا بیان اس طرح کرتے ہیں:۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مومن کے لئے کوئی لفظ "صحابی" سے بڑھ کر اور فضل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس وقت کے افاضل اسی لقب سے موسوم ہوئے اس کے بعد جب دوسری نسل چلی تو اُن صحابیوں کے صحابیوں کے لئے "تابعین" کی اصطلاح وضع ہوئی۔ پھر ان کی آنکھیں دیکھنے والے "تبع تابعین" کہلائے۔ اس کے بعد جب اُمت زیادہ پھیلی اور لوگ طرح طرح کے پیدا ہونے لگے تو جن لوگوں کو امورِ دین میں زیادہ انہماک ہو نہیں زہاد و عباد کہا جانے لگا۔ لیکن جب بدعتیوں کا ظہور ہوا اور فرقہ فرقہ الگ ہو گئے تو ہر فرقہ اس کا مدعی بن بیٹھا کہ زہاد و عباد اُسی میں ہیں۔ اُسی وقت اہلِ سنت کے بندۂ خاص نے جو ذکرِ الٰہی میں مشغول اور غفلتوں سے دور رہتا تھا اپنے لئے "اہلِ تصوف" کی اصطلاح قائم کی اور ہجرت کو ابھی دو صدیاں پوری نہیں ہوئی تھیں کہ یہ لقب اس طبقہ خاص کے اکابر کے لئے مخصوص ہو گیا" [۷]

حضرت جنید بغدادی کے اقوال اس بارے میں یہ ہیں:۔

"ہم نے تصوف کو قیل و قال کے ذریعے حاصل نہیں کیا ہے، بلکہ گرسنگی، ترکِ دنیا یعنی ترکِ مرغوباتِ نفس سے حاصل کیا ہے"

"ہمارا سارا طریقہ کتاب و سنتِ رسول کا پابند ہے"

"جو شخص کلامِ الٰہی کا حافظ اور احادیثِ رسول کا عالم نہیں، اس کی تقلید طریقت کے باب میں درست نہیں۔ اس لئے کہ ہمارے اس سارے علم (سلوک) کا مآخذ قرآن و حدیث ہیں" [۸]

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "عوارف المعارف" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"تصوف نام ہے قولاً، فعلاً ہر حیثیت سے اتباعِ رسول اللہ کا، اور اس پر مداومت سے جب اہلِ تصوف کے نفوس مقدس ہو جاتے ہیں۔ حجابات اُٹھ جاتے ہیں اور ہر شے میں اتباعِ رسول ہونے لگتا ہے، تو اب حق تعالیٰ ان سے محبت کرنے لگتا ہے۔ اس لئے کہ وعدۂ الٰہی موجود ہے ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ" [۹]

---

[۵] اس پر ہم نے مقالہ کے اختتام پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ (م۔ق) [۶] کتاب اللمع ص۱۰۵، ۱۰۶ [۷] رسالہ قشیریہ ص۸

[۸] رسالہ قشیریہ ص۱۹ [۹] عوارف المعارف ص۳۶، ۳۷

شیخ ہجویری صوفی کی تعریف میں فرماتے ہیں :۔

"صوفی وہ ہے جو اپنے نفس سے فانی ہو کر حق میں زندہ و باقی ہو۔ اور مادیت سے گذر کر حقیقت تک رسائی حاصل کر چکا ہو۔ اور متصوف وہ ہے جو مجاہدہ کر کے یہ راہ طے کر رہا ہو اور اس منزل تک رسائی کی کوشش میں ہو اور مستصوف وہ ہے جو محض جاہ و مال کے لئے دنیا طلبی کی خاطر اپنے کو صوفیہ و متصوفہ کے مشابہ بنائے اور حقیقتاً دونوں سے اُسے بہرہ نہ ہو کسی نے خوب کہا ہے کہ مستصوف صوفی کی نظر میں مکھی کی طرح حقیر ہوتا ہے اور دوسروں کی نظر میں بھیڑیئے کی مانند جسکی غذا ہی گوشت اور خون ہے" [1]

کچھ وصایا و نصائح بھی سُن لیجئے جو یہ حضرات اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کو کیا کرتے تھے :۔

شیخ سراج فرماتے ہیں کہ :۔

"صوفیہ کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ وہ اللہ ہی پر نظر رکھتے ہیں، اُن کا مطلوب و مقصود تمامتر اللہ ہی ہوتا ہے۔ ماسوی اللہ اور لایعنی مشغلوں سے انہیں کوئی واسطہ نہیں ہوتا، اس کا لازمی اثر اُن کی عملی زندگی پر یہ پڑتا ہے کہ قناعت کو اپنا شیوہ بنا لیتے ہیں..... اللہ سے حسن ظن رکھتے ہیں، نیکیوں اور طاعتوں کی جانب خلوص نیت کے ساتھ پیش قدمی کرتے رہتے ہیں۔ بلاء الٰہی پر راضی رہتے ہیں۔ مجاہدہ اور مخالفتِ خواہش نفس میں مشغول رہتے ہیں۔ اور اس کو یاد رکھتے ہیں کہ کلام پاک میں نفس کو اَمَّارَۃٌ بالسُّوء سے تعبیر کیا گیا ہے اور حدیث نبوی میں ارشاد ہوا ہے کہ انسان کا سب سے بڑا دشمن وہ ہے جو اس کے دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے۔"

(اعدا عدوک بین جنبیک)" [2]

سہل بن عبد اللہ تستری فرماتے ہیں کہ :۔

جس وجد کی شہادت کتاب اللہ و سنّت نبوی نہ دیں وہ باطل ہے۔

حضرت شبلیؒ مرض الموت میں مبتلا تھے۔ نزع کا وقت تھا۔ گویائی کی قوت جواب دے چکی تھی، ایک خادم وضو کرا رہا تھا، ڈاڑھی میں خلال کرانا بھول گیا۔ شبلیؒ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر خلال کرائی کہ سنّت رسول کا کوئی جزو فرو گذاشت نہونے پائے" [3]

حضرت بایزید بسطامیؒ نے اللہ سے دعا مانگنی چاہی کہ گرسنگی اور شہوت کی آفت سے ہمیشہ محفوظ رہیں کہ معاً یہ خیال آگیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے ایسی دعا نہیں کی تو میں کیوں کر سکتا ہوں یہ خیال کر کے وہ اس دعا سے باز رہے۔ اس احترام رتبۂ رسالت کا صلہ اُنہیں یہ ملا کہ عورت کی خواہش ہی اُن کے دل سے جاتی رہی۔" [4]

حاتم اصم سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ کو خواہشات نہیں پیدا ہوتیں؟ جواب دیا کہ میری سب سے بڑی خواہش یہ رہتی ہے کہ رات ہونے تک دن خیریت سے گذر جائے۔ لوگوں نے کہا کہ دن تو خیریت سے گذرتے ہی رہتے ہیں ارشاد ہوا کہ میں خیریت اسے کہتا ہوں کہ اس روز معاصیِ الٰہی کا ارتکاب نہ ہو" [5]

---

[1] کشف المحجوب ص۳۵ [2] کتاب اللمع ص۲۳ [3] کتاب اللمع ص۱۴۳-۱۴۲ [4] کتاب اللمع ص[illegible] [5] رسالہ قشیریہ ص[illegible]

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

"ہر مومن کے لئے ہر حال میں تین چیزیں لازمی ہیں، ایک یہ کہ حکم الٰہی کی تعمیل کرے، دوسرے یہ کہ ممنوع سے بچتا ہے، تیسرے یہ کہ قضائے الٰہی پر راضی رہے، پس مومن کے لئے کم سے کم مرتبہ یہ ہے کہ ان تین چیزوں سے خالی نہ ہو۔" آگے چل کر فرماتے ہیں: "اتباعِ سُنّت کرتے رہو۔ اور راہِ بدعت نہ اختیار کرو، اور دائرہ اطاعت سے باہر نہ ہو۔ توحیدِ خداوندی کو مانو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔ وہی جو کچھ چاہتا ہے اپنی مشیت سے کرتا ہے۔ اس کو ہر عیب سے پاک سمجھو اور اس پر تہمت نہ لگاؤ اور تصدیق (اسلام) کرو، شک میں نہ پڑو۔ صبر سے کام لو۔ بے صبری نہ کرو۔ طاعتِ حق پر جمے رہو اور جماعت میں تفرقہ نہ ڈالو۔ گناہوں سے توبہ کرتے رہو اور غفلت کے دور کرنے میں تاخیر نہ کرو اور شب و روز استغفار، تقصیر اور رجوع الی اللہ کرنے کو اپنے اوپر بار نہ سمجھو۔" پھر فرماتے ہیں: "مومن کو چاہیئے کہ سب سے پہلے فرائض پر توجہ کرے، جب یہ ادا کر چکے تو سنتوں کو اختیار کرے اس کے بعد نوافل پر متوجہ ہو لیکن جو شخص ابھی فرائض سے فارغ نہیں ہوا ہے اس کے لئے سنتوں میں مشغول ہو جانا حماقت اور نادانی ہے۔ اس لئے کہ ادائے فرائض کے بغیر سنن و نوافل میں غیر مقبول رہیں گی اور جو شخص ایسا کرے گا خوار ہو گا۔" [1]

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رح اپنی کتاب "عوارف المعارف" کے صفحہ ۱۰۹ پر تحریر فرماتے ہیں:-

"خلقت کی اصل، ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ ساری کائنات آپ کے طفیل میں ہے اور یہی ذاتِ اقدس دنیا میں علم و ہدایت لے کر آئی۔ پس جو شخص اپنی پاکیزگی طینت کے لحاظ سے جتنا زیادہ قرب و مناسبت اس جوہر گرامی سے رکھتا ہے اُسی قدر وہ علم و ہدایت سے بہرہ اندوز ہوتا ہے اور دوسروں کی ہدایت کا باعث بنتا ہے۔ یہی گروہ صوفیہ ہے یا قرآن کی اصطلاح میں گروہ 'مقربین'۔" آگے چل کر فرماتے ہیں: "پس جو شخص جتنا زیادہ متبع رسولؐ ہے اُسی قدر زیادہ وہ محبت الٰہی میں حصہ دار ہے اور صوفیہ ہی نے اسلامی گروہوں میں سب سے زیادہ بڑھ کر اتباعِ رسولؐ کیا ہے۔" [2]

"فوائد الفواد" میں لکھا ہے کہ محفلِ سماع برپا تھی نوبت جب اس شعر پر آئی کہ:-

کُشتگانِ خنجرِ تسلیم را ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

تو قطبِ عالم (حضرت قطب الدین بختیار کاکی رح) کی حالت متغیر ہونی شروع ہوئی، جب خانقاہ سے گھر تشریف لائے تو مدہوش و متحیر تھے۔ بس یہی کہے جاتے تھے کہ ہاں اسی شعر کی تکرار کئے جاؤ۔

حضرت سلطان المشائخ رح فرماتے ہیں کہ "ہمیں بیت پیش او می گفتند، او ہمچناں متحیر بود۔ چوں وقتِ نماز در آمد نماز گذارد و باز ہمیں بیت می گویاند، حالتِ حیرتے پیدا می آمد، چہار شب و روز ہم بریں حال بود۔ شبِ پنجم رحلت نمود۔" [3]

---

[1] فتوح الغیب ص۱۱۔ [2] عوارف المعارف ص۱۰۹۔ یہ کہا جاتا ہے صحابہ کرام کا اسوہ معتبر ہے کہ ان پر شعر سن کر اس قسم کی کیفیت طاری نہیں ہوتی تھی اور نہ وہ سن کر لوٹتے پوٹتے تھے! احوال و کیفیات میں نگاہ اسوۂ رسولؐ و آثارِ صحابہ پر رہنی چاہیئے۔ (م۔ ق) [3] فوائد الفواد ص۲۳۱

امیر خورد فرماتے ہیں :۔

"نماز جماعت کے فضائل کا تذکرہ ہوا، بندے سے ارشاد ہوا کہ نماز باجماعت ہی پڑھنی چاہئیے۔ بندے نے عرض کیا کہ مکان کے قریب مسجد تو ضرور ہے، لیکن مکان سے اٹھ کر اگر ہم وہاں جائیں تو گھر پر کوئی کاغذ، کتاب وغیرہ کی حفاظت کے لئے موجود نہیں رہتا۔ اس لئے مکان ہی پر جماعت کے ساتھ پڑھ لیتے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ جماعت سے ضرور پڑھنا چاہئیے اور بہتر یہ ہے کہ مسجد میں پڑھی جائے"۔ [1]

سماع کے بارے میں بھی ارشاد سُن لیجئے :۔

"یکے از حاضرین گفت کہ ہم دریں روز با بعضے از درویشان آستانہ وارد مجمع شدند کہ چنگ و رباب و مزامیر بود و رقصہا کردند، خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود کہ نیکو نہ کردند۔ انچہ نامشروع است ناپسندیدہ است" جب درویش لوٹ کر آئے تو اُن پر گرفت ہوئی کہ اس مجلس میں باجہ بھی تھا، تم نے سماع کیسے سنا؟ انھوں نے جواب میں عرض کیا کہ ہم سماع میں اس قدر غرق و مست ہو گئے کہ ہمیں باجے کے ہونے نہ ہونے کا پتہ بھی نہ چلا۔ حضرت خواجہ نے فرمایا کہ یہ جواب لغو ہے۔ وہ عمل معصیت ہی لکھا جائے گا"۔ [2]

حضرت شیخ احمد بن ابراہیم الواسطی ؒ فرماتے ہیں :۔

"اگر سچی درویشی اور اصلی فقیری کی طلب ہے، جس کی جڑ مضبوط، جس کی شاخیں بلند ہوں تو لازم ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فقیری اور درویشی کو اختیار کرو کہ پانی سرچشمہ سے دور جا کر گندہ ہو جاتا ہے اور اس کا رنگ اصلی قائم نہیں رہتا۔ اس طریقۂ محمدی پر قائم رہے تو امید ہے کہ اگلوں سے، جو پیغمبر خدا کے اصحاب تھے، جا ملو گے اور قیامت کے روز پیغمبر کے جھنڈے کے نیچے پیغمبر اور یاران پیغمبر کے ساتھ تمہارا حشر ہوگا"۔ [3]

(مندرجہ بالا اقوال و احوال اور نصائح تصوف اسلام مصنفہ مولانا عبدالماجد دریابادی سے ماخوذ ہیں۔ انھی کی عبارت ہیں)

ہم نے صوفیہ کے اقوال و احوال کے نقل کرنے میں کافی طوالت سے کام لیا ہے۔ مگر اپنے پیش نظر مقصد کے لئے ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ ان بزرگوں کے اقوال و احوال ہیں جو دنیائے تصوف ہی کے آفتاب و ماہتاب نہیں تھے۔ آسمان علم و دین کے بھی آفتاب و ماہتاب تھے۔ انھوں نے اپنے اپنے زمانہ میں ظلمت فسق و فجور ہی کے دور کرنے کا کام کیا اور کفر و الحاد کی تاریکی اور بدعت و گمراہی کے اندھیروں کے مٹانے ہی کو اپنا وظیفہ حیات بنایا چنانچہ ان کے حالات زندگی آج بھی ہماری ملی تاریخ کے صفحات کی زینت بنے ہوئے ہیں اور ملت کے ہر فرد سے خراج عقیدت وصول کر رہے ہیں۔

ان اقوال و احوال سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ تصوف کس کو کہتے ہیں اور کس کو نہیں کہتے۔ یعنی کتاب و سنت پر اس شدت کے ساتھ عمل پیرا ہونے کا نام تصوف ہے کہ انسان کا ظاہر و باطن، دونوں اس سے یکساں متاثر ہوں۔ اور اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ جب قوم دنیا کی طرف اس درجہ مائل ہو گئی کہ دین کی صرف باتیں ہی باتیں رہ گئیں۔ دین پر عمل نہ رہا، اور اس پر بھی بحث و مناظرہ

[1] فوائد الفواد صلا [2] فوائد الفواد صلا [3] رسالہ الفقر محمدی ص

اور قیل وقال سے گذر کر فروعات پر جنگ و جدال تک کی نوبت آگئی تو ایسی صورت میں اللہ کے اُن نیک بندوں کو روحانی تکلیف ہوئی جن کے دلوں میں خدا و رسول کی محبت تھی اور دنیا کی محبت اُن پر اثر انداز نہ ہو سکی تھی۔ انھوں نے اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر میں دین کی صحیح تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی شروع کر دی۔ ایسی تربیت جو ظاہر سے گذر کر تزکیۂ نفس و تصفیۂ قلب بھی کر سکے اور لوگوں کو دنیا کی طرف سے ہٹا کر اللہ کے ساتھ ملا سکے اور چونکہ ان حضرات کا کام دین کو اُن بدعتوں سے پاک صاف کرنا تھا جو طالبانِ دنیا نے دین میں شامل کر دی تھیں، اور لوگوں کے جسم و جان دونوں کی یکساں اصلاح کرنا یعنی دلوں سے زنگِ دنیا کو دور کر کے ان کو محبتِ الٰہی کی جِلا سے مجلّٰی و مصفّٰی کرنا۔ اس لئے ان کا نام صوفی ہو گیا اور ان کے طریقۂ کار کو تصوف کہنے لگے۔

اس میں شک نہیں کہ تصوف، صوفی اور دوسری متعلقہ بے شمار اصطلاحات قرنِ اول میں نہ تھیں بلکہ دوسری صدی ہجری کے بھی آخر میں وضع ہوئی ہیں۔ مگر جن معانی و مطالب کے لئے یہ وضع ہوئیں وہ قرنِ اول میں موجود تھے اور قرنِ اول میں یہ الفاظ پیدا بھی کیوں کر ہو سکتے تھے کہ اس زمانے میں کوئی لفظ "صحابی" سے بڑھ کر فخر و مباہات کے قابل نہ تھا۔ اس کے بعد بھی ان الفاظ کے وجود میں آنے کا کوئی موقع اس لئے نہ تھا کہ "تابعین" اور "تبع تابعین" جیسی بلند پایہ اصطلاحات پیدا ہو چکی تھیں اس کے بعد جب اُمت زیادہ پھیل گئی اور ہر قسم کے لوگ پیدا ہونے شروع ہو گئے تو جن لوگوں کو دین کے کاموں میں زیادہ انہماک ہوا ان کو زہاد و عباد کہا جانے لگا اور جن کو پند و موعظت کی طرف میلان ہوا وہ واعظ کہلانے لگے مگر جب بدعتوں کی زیادتی ہوئی اور دنیا داری پر غالب آگئی اور لوگ فرقوں ہی میں تقسیم نہ ہو گئے بلکہ ہر فرقہ نے یہ دعویٰ بھی شروع کر دیا کہ زہاد و عباد اُسی میں ہیں تو مخلصین دین کو فکر دامن گیر ہوئی اور انھوں نے اپنے حلقہ ہائے اثر میں تلقین و تعلیم کے ذریعے دنیا کی مذمت شروع کی اور اپنے عمل کا بہترین نمونہ پیش کر کے لوگوں کو رجوع الی اللہ کی طرف راغب کیا اور چونکہ یہ تمام خرابیاں دنیا کی محبت کے غلبے کا نتیجہ تھیں اس لئے انھوں نے لوگوں کے ذہن نشین کیا کہ دنیا کی محبت آئینۂ دل کا زنگار ہے اور چشمۂ روح کے لئے کثافت جب تک یہ زنگار دور نہ ہوگا اور روحانی طہارت حاصل نہ ہوگی، شاہدِ حقیقی کا دیدار نہیں ہو سکتا اور ۔۔

اُسی کو ہستیاں جس نے فرزانہ دیکھا — برابر ہے دنیا کو دیکھ نہ دیکھا

اس طرح جو لوگ تزکیۂ نفس کی طرف متوجہ ہوئے وہ "صوفی" کہلانے لگے اور ان کے مسلک کا نام تصوف ہو گیا اور اس کے لئے جن امور کی ضرورت پیش آتی گئی اصطلاحات ایجاد ہوتی گئیں۔ جیسے تفسیر[1]، حدیث اور فقہ وغیرہ میں ہوا اور برابر ہو رہا ہے۔

اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ موجودہ زمانے کے اکثر صوفیوں کی زندگی شریعتِ اسلامیہ کے کسی بھی خانے میں جگہ پانے کے قابل نہیں ہے۔ مگر ایسے لوگ ہمیشہ "بدنام کنندۂ نکو نامے چند" سمجھے گئے ہیں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اخلاف کی جہالت کی وجہ سے اسلاف کے کمالات سے بھی انکار کر دیا گیا ہو۔ ورنہ آج اُمت کے کون سے گروہ کو پیش کیا جا سکتا ہے جس میں گروہ صوفیہ کی طرح خرابیاں نہ پیدا ہو گئی ہوں۔ اوروں کو جانے دیجئے کیا موجودہ زمانے کے علماء کی زندگیاں صدرِ اول کے علما کی زندگیوں سے کوئی مطابقت رکھتی ہیں؟ صدرِ اول کا کیا ذکر سو دو سو برس پہلے کے علماء ہی کے حالات سے مقابلہ کر کے دیکھ لیجئے! استثناء کہاں نہیں ہوتا۔ اگر آج کچھ علماء حق موجود ہیں تو تلاش کرنے سے ایسے صوفی بھی مل جائیں گے جو حقیقی معنی میں صوفی ہوں۔

غرضیکہ جیسا عرض کیا گیا۔ یہ وہ علم ہے جو احادیثِ نبوی کا خلاصہ ہے اور سرتاسر اتباعِ نبوی کو قولاً و حالاً اپنے اوپر حاکم بناتا جس کے مسائل تمام و کمال کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہ سے ماخوذ ہیں۔ جن کا اخذ و استنباط اُن لوگوں نے کیا ہے جو خود ظاہر و باطن، ہر اعتبار

---

[1] اس قسم کی تمام باتوں پر ہم نے مقالہ کے آخر میں گفتگو کی ہے۔ (م۔ ق)

سے کتاب و سنت کے متبع تھے اور کمالِ اتباع کی وجہ سے ان کے نفوس میں وہ تزکیہ اور قلوب میں وہ جلا پیدا ہوگئی تھی کہ ان کے مُجلا و مصفا قلوب کی الواح پر قرآن و سنت کی روشنی کے ساتھ اسرارِ غیب و حقائقِ عالیہ خود بخود منکشف ہونے لگتے تھے اور یہ وہ نفوسِ قدسیہ تھے جو اپنے نفس[1] کے تقاضے سے کوئی بات نہیں کہتے تھے بلکہ قرآن و سنّت کی زبان سے قرآن و سنت کی حدود میں کہتے تھے جن کی زندگیوں میں تضاد نہیں تھا کہ کہتے کچھ تھے اور کرتے کچھ تھے بلکہ ان کے قول و فعل میں کامل ہم آہنگی و یکسانیت تھی۔ ان کے ظاہر و باطن میں فرق نہ تھا۔ وہ جیسے خلوت میں تھے ویسے ہی جلوت میں رہتے۔ ریا و نمود سے پاک تھے اور جو بات اپنے لئے پسند کرتے تھے وہی دوسروں کے لئے بھی پسند کرتے تھے۔ ان کی خدا ترسی کا حال تھا کہ دن رات کا خیریت سے گذر جانا ان کے نزدیک یہ تھا کہ اس روز اُن سے کسی معصیت کا ارتکاب نہ ہو۔ جن کا یہ قول تھا کہ ہم نے اس علم کو قیل و قال سے حاصل نہیں کیا ہے بلکہ گرسنگی، ترک مرغوباتِ نفس اور مجاہدہ و ریاضت سے حاصل کیا ہے یہ وہ لوگ تھے کہ شریعت کی پابندی کا حق انھوں نے ادا کیا حرام اور مشتبہ چیزوں سے انکے دامن پاک رہے، خدا کی یاد ان کا دن رات کا محبوب مشغلہ تھا۔ ترکِ شہوات کے مجاہدے یہ کرتے تھے۔ تقویٰ میں کمال ان کو حاصل تھا۔ قرآن کے سرچشمے سے یہ سیراب ہوتے تھے۔ سنّت کے مہرِ درخشاں سے یہ اکتسابِ نور کرتے تھے۔ اللہ کے سوا نہ کسی سے ڈرتے تھے نہ امید رکھتے تھے اور پوری طرح اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیتے تھے۔ مقام تسلیم و رضا کا حصول ان کا مطمحِ نظر تھا حکمِ الٰہی کی تعمیل بہ طیب خاطر کرنا، ممنوعات سے قلبی تنفر کے ساتھ بچنا اور قضاء الٰہی پر راضی رہنا ان کا شعار تھا۔ بدعت کی ہوا ان کا دامن نہ چھو سکتی تھی، اور رسم پرستی کی گرد ان کے حاشیۂ خیال تک نہ پہنچ سکتی تھی۔ توحید خالص کا حصول ان کی غایت الغایات تھی، شرک کیا ان کے قول و فعل سے اشتباہِ شرک بھی نہ ہو سکتا تھا وہ ایسی بات کے قریب بھی نہ پھٹکتے تھے جس کی سند قرآن و سنّت سے نہ ہو جس کا جواز حضور سرورِ کائنات، حضور کے صحابہؓ۔ یا تابعین و تبع تابعین کی زندگیوں سے نہ ملے۔ یہی گروہ:-

> گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

کا مصداق صحیح ہے اور انہی پر اُس حدیث قدسی کا اطلاق ہوتا ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ:-

> "میں اپنے بندے کی آنکھ ہو جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے۔ اس کے کان ہو جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے، اس کے ہاتھ پیر ہو جاتا ہوں جن سے وہ کام کرتا اور چلتا پھرتا ہے...... الخ

غرضیکہ یہ لوگ تھے صوفی اور جُنید بغدادیؒ، ذوالنون مصریؒ، بایزید بسطامیؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، شیخ علی ہجویریؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ وغیرہ اسی گروہ کے سرخیل ہیں، اور اُن کے ملفوظات، سوانح حیات اور اُن کی عالمگیر محبوبیت و مقبولیت اس بات پر شاہد ہے۔

تصوف اور صوفی کی تعریف، صوفیہ کے اقوال اور ان کی زندگیوں کے کچھ حالات جو اوپر نقل کئے گئے ہیں۔ وہ تصوف کے مخالفین اور موافقین دونوں کے لئے آئینہ کا کام دے سکتے ہیں بشرطیکہ دونوں قسم کے لوگ غور و فکر اور انصاف سے کام لیں۔ منکرینِ تصوف اپنے انکار کی حقیقت اور تصوف کی لکیر پیٹنے والے، بے عمل صوفی اپنے تصوف کی حیثیت اس آئینے میں اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں۔

اب کہ تصوف اور صوفی کی حقیقت سامنے آگئی ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اصل موضوع "اقبال اور تصوف" سے

---

[1] "وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ" یہ نبی کی شان ہے۔ (م۔ق)

بحث شروع کی جائے۔

اقبال ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے جو تصوف سے خصوصی تعلق رکھتا تھا۔ اس سبب سے کہ ان کے جدِ امجد ایک فقیر کامل ہی کی توجہ سے مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ خود اقبال کے والد بزرگوار بڑے صوفی منش آدمی تھے اور ان کے پاس اسی قسم کے لوگ آتے بھی رہتے تھے۔ اس طرح اقبال بچپن سے فقر و تصوف ہی کے ماحول میں رہے اور فقر و تصوف ہی کی باتیں سنتے آئے تھے۔ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم فرماتے ہیں:۔

"ان کے والد پر تصوف کا رنگ بہت زیادہ غالب تھا اور ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس آبائی بلکہ خاندانی خصوصیت کی طرف بعض اشعار میں خود اشارہ کیا ہے۔
چنانچہ اپنے فرزند جاوید کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں:۔ ؎

جس گھر کا مگر چراغ تو ہے ہے اس کا مذاق عارفانہ

اس بنا پر ڈاکٹر صاحب نے ایک صوفیانہ ماحول میں پرورش پائی۔" [1]

اقبال اپنے خط میں جو ۳۰ دسمبر ۱۹۱۵ء کو لکھا گیا تھا، خواجہ حسن نظامی مرحوم کو لکھتے ہیں:۔

"میری نسبت بھی آپ کو معلوم ہے، میرا فطری اور آبائی میلان تصوف کی طرف ہے۔"

اور یہی نہیں کہ محض خاندان کی نسبت سے ان کا رجحان تصوف کی طرف تھا بلکہ خود بھی ایک بزرگ کے ہاتھ پر باقاعدہ بیعت تھے۔ چنانچہ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اور یہی سلسلہ قادریہ فرقے کا ہے جس میں مجھے بیعت حاصل ہے۔"

بلکہ بیعت کو اس قدر ضروری سمجھتے ہیں کہ ایک خط میں جو ۲ مارچ ۱۹۱۶ء کو مرکشن پرشاد کو لکھا ہے، فرماتے ہیں:۔

"برخوردار آفتاب اقبال دہلی کالج میں پڑھتا ہے، ذہین و طباع ہے مگر کھیل کود کی طرف زیادہ راغب ہے۔ آجکل میں اس فکر میں ہوں کہ اس کو کہیں مرید کرادوں یا اس کی شادی کردوں کہ اس کے ناز میں نیاز پیدا ہو جائے۔"

نازتا نازاست کم خیزد نیاز نازہا سازد بہم خیزد نیاز [2]

بیگم عطیہ فیضی صاحبہ تو یہاں تک لکھتی ہیں کہ:۔

"ان کے والد نے ایک ولی اللہ کی ہدایت کے مطابق مہینوں چلہ کشی کی تھی اور اقبال کو انہوں نے بچپن ہی میں علوم باطنہ خود سکھائے تھے۔" [3]

آخر عمر میں تو اقبال خود فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"میں نے اپنا نظریۂ حیات فلسفیانہ جستجو سے حاصل نہیں کیا۔ زندگی کے متعلق ایک مخصوص زاویۂ نگاہ ورثے میں مل گیا تھا۔ بعد میں میں نے عقل و استدلال کو اسی کے ثبوت میں صرف کیا۔" [4]

اقبال اگرچہ سلسلۂ قادریہ میں بیعت تھے مگر دوسرے سلاسل کے مشائخ سے بھی ویسے ہی عقیدت رکھتے تھے چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی

[1] اقبال کامل ص۲۔ [2] مکاتیب اقبال حصہ دوم ص۱۸۲۔ [3] سیرت اقبال ص۹۱۔ [4] فکر اقبال ص۲۔

حضرت داتا گنج بخشؒ، خواجہ معین الدین اجمیریؒ، سلطان المشائخ، نظام الدین اولیاؒ اور دوسرے پیرانِ طریقت کا ان کی تصانیف میں جا بجا ذکر آیا ہے اور اس انداز سے آیا ہے کہ ان کی والہانہ عقیدت وارادت بھی ظاہر ہوتی ہے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی ہدایت بھی۔ اپنے صاحبزادے جاوید کو جو نصیحتیں کی ہیں ان میں جابجا ایسے اشارات موجود ہیں جن سے ان کو ہدایت کی ہے کہ وہ مردانِ خدا کا دامن پکڑیں۔ جاوید نامے میں "خطاب بجاوید" میں مردانِ خدا کے پوشیدہ ہونے اور ان کی تلاش میں رہنے کی بابت فرماتے ہیں:۔

زسم ایں عصرے کہ تو زادی دراں ———— در بدن غرق است و کم داند ز جاں

چوں بدن از قحطِ جاں ارزاں شود ———— مردِ حق در خویشتن پنہاں شود

در نیابد جستجو آں مرد را ———— گرچہ بیند رو برو آں مرد را

تو مگر ذوقِ طلب از کف مدہ

گرچہ در کارِ تو افتد صد گرہ

اولیاء اللہ کے ساتھ عقیدت کا یہ حال تھا کہ لاہور میں حضرت شیخ علی ہجویریؒ اور شاہ محمد غوثؒ کے مزارات پر اکثر جایا کرتے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ سے تو اس قدر عقیدت تھی کہ ایک دفعہ بیمار ہوئے تو ایک نظم لکھ کر دہلی کسی عزیز کے ذریعے بھجوائی اور جب یورپ بغرضِ تعلیم جا رہے تھے تو جاتے وقت بھی آستانۂ محبوبِ الٰہی پر حاضر ہوئے اور واپسی پر بھی اسی عقیدت کے ساتھ حاضری دی بلکہ جاتے وقت تو ایک عقیدت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی نظم بھی مزارِ مبارک پر پڑھی تھی جو "بانگِ درا" میں "التجائے مسافر" کے نام سے شامل ہے۔ ایک خط میں جو سر کشن پرشاد کو ۲۹ مارچ ۱۹۱۱ء کو لکھا تھا۔ تحریر فرماتے ہیں:۔

"دہلی گیا تھا اور دو دفعہ حضرت خواجہ نظام الدینؒ کی درگاہ پر حاضر ہوا مگر افسوس کہ "پیر سنجر"ؒ کے دربار میں حاضر نہ ہو سکا۔ انشاء اللہ پھر جاؤں گا تو اس آستانے کی زیارت سے مشرف ہو کر واپس آؤں گا۔"[1]

اولیاء اللہ کی کرامات کے بھی بڑے قائل تھے۔ اپنے احباب سے اکثر کاملین کی کرامات کا ذکر کیا کرتے، اگر کوئی شخص صوفیہ کی برائی کرتا تو اس کو پسند نہیں کرتے۔ احباب کے اصرار پر ان کی دل نہادی کے لئے کبھی محفلِ قوالی میں بھی بیٹھ گئے ہیں۔ چنانچہ ایک خط میں مہاراجہ کشن پرشاد کو تحریر فرماتے ہیں:۔

"خواجہ حسن نظامی صاحب نے بہت اچھی قوالی سنوائی، سرکار بہت یاد آئے۔"[2]

لیکن ع یہ باتیں ہیں جب کی کہ آتش جواں تھا۔

رفتارِ عمر کے ساتھ ساتھ انسانی تجربہ بھی ترقی کرتا ہے اور جب وہ دور آتا ہے جس کو حاصلِ عمر کہنا چاہیئے تو آدمی جس نظریے کے متعلق اس وقت کوئی رائے قائم کرتا ہے وہ زیادہ وسیع و قابلِ قبول ہوتی ہے۔ اقبال بھی، جوں جوں مطالعۂ علمی زیادہ اور مشاہداتِ عینی وسیع سے وسیع تر ہوتے گئے، تصوف کے بارے میں جادۂ اعتدال پر آتے چلے گئے اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ جو تصوف اس زمانے میں رائج ہے، محض سراب کی حیثیت رکھتا ہے، اس کو حقیقی اسلامی تصوف سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ اس تصوف کا مزا چکھ لینے کے بعد تو رہی سہی دینی حالت بھی باقی نہیں رہ سکتی۔ اس حقیقت کا انکشاف ہوتے ہی انھوں نے اس کے خلاف جہاد کرنا ضروری سمجھ لیا۔ اور جب انھوں نے اپنی پہلی تصنیف "اسرارِ خودی" میں حافظ شیرازیؒ کے خلاف لکھا اور

---

[1] مکاتیب اقبال حصہ دوم ص ۱۳۲ ۱۹۵۱ء – [2] سیرت اقبال ص ۱۰۵

اُس پر چاروں طرف سے ان پر لے دے ہوئی تو تصوف کے بارے میں اُن کے صاف اور قطعی خیالات منظرِ عام پر آگئے اور موجودہ زمانے کے تصوف کی حقیقت لوگوں کو معلوم ہوگئی۔

ایک خط میں، جو لسان العصر اکبرالہٰ آبادی مرحوم کو ۱۱ر جون ۱۹۱۸ء کو لکھا ہے، تحریر فرماتے ہیں:۔

"میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ کون سا تصوف میرے نزدیک قابلِ اعتراض ہے اور میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ مجھ سے پہلے حضرت علاؤالدولہ سمنانی" یہی بات لکھ چکے ہیں۔ حضرت جُنید بغدادی" لکھ چکے ہیں میں نے تو شیخ محی الدین ابن عربی" اور منصور حلاج کے متعلق وہ الفاظ نہیں لکھے جو حضرت سمنانی" اور جُنید" نے ان بزرگوں کے متعلق ارشاد فرمائے ہیں۔ ہاں میں نے ان کے عقائد اور خیالات سے بیزاری کا ضرور اظہار کیا ہے" اسی خط میں آگے چل کر فرماتے ہیں "عجمی تصوف سے لٹریچر میں دلفریبی اور حُسن تو ضرور پیدا ہوتا ہے لیکن ایسا کہ طبائع کو پست کرنے والا ہے۔ اس کے برعکس اسلامی تصوف دل میں قوت پیدا کرتا ہے اور اس قوت کا اثر لٹریچر پر ہوتا ہے۔ میرا یہی عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کا لٹریچر تمام ممالکِ اسلامی میں قابلِ اصلاح ہے۔ قنوطی لٹریچر کبھی دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ قوم کی زندگی کے لئے اس کے لٹریچر کا رجائی ہونا ضروری ہے" [1]

ایک دوسرے خط میں جو ۲ر جولائی ۱۹۱۸ء کو لکھا ہے، تحریر فرماتے ہیں:۔

"میں اُس خودی کا حامی ہوں جو سچی بے خودی سے پیدا ہوتی ہے یعنی جو نتیجہ ہے ہجرت الی الحق کا اور جو باطل کے مقابلے میں پہاڑ کی طرح مضبوط ہے۔

بندۂ حق پیشِ مولا لاستے پیشِ باطل از نعم برجاستے

مگر ایک اور بے خودی ہے، جس کی دو قسمیں ہیں:۔

"ایک وہ جو عاشقانہ غزل (Lyric Poetry) کے پڑھنے سے پیدا ہوتی ہے یہ اسی قسم سے ہے جو افیون اور شراب کا نتیجہ ہے۔ دوسری وہ بے خودی ہے جو بعض صوفیہ اسلامیہ اور تمام ہندو جوگیوں کے نزدیک ذاتِ انسانی کو ذاتِ باری میں فنا کر دینے سے پیدا ہوتی ہے اور یہ فنا ذاتِ باری میں ہے نہ کہ احکامِ باری تعالیٰ میں، پہلی قسم کی بے خودی تو ایک حد تک مفید بھی ہو سکتی ہے مگر دوسری قسم کی تمام مذاہب و اخلاق کے خلاف جڑ کاٹنے والی ہے۔ میں ان دونوں قسموں کی بے خودی پر معترض ہوں اور بس حقیقی اسلامی بے خودی میرے نزدیک اپنے ذاتی اور شخصی میلانات و تخیلات کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند ہو جانا ہے اس طرح کہ اس پابندی کے نتائج سے انسان بالکل لاپروا ہو جائے اور محض رضا و تسلیم کو اپنا شعار بنائے۔ یہی اسلامی تصوف کے نزدیک فنا ہے۔ البتہ عجمی تصوف فنا کے کچھ اور ہی معنی جانتا ہے جس کا ذکر اوپر کر چکا ہوں" [2]

---

[1] مکاتیب اقبال حصہ دوم ص۵۵۔ [2] مکاتیب اقبال حصہ دوم صفحہ ۵۹، ۶۰

ایک اور خط خواجہ حسن نظامی مرحوم کو ۳۰ ردسمبر ۱۹۱۵ء کو لاہور سے لکھا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:۔

"میری نسبت بھی آپ کو معلوم ہے کہ میرا فطری اور آبائی میلان تصوف کی طرف ہے اور یورپ کا فلسفہ پڑھنے سے یہ میلان اور بھی تیز ہو گیا تھا کیونکہ یورپین فلسفہ بہ حیثیت مجموعی "وحدت الوجود" کی طرف رُخ کرتا ہے مگر قرآن میں تدبر کرنے اور تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے سے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور میں نے محض قرآن کی خاطر اپنے قدیم خیال کو ترک کر دیا اور اس مقصد کے لئے مجھے اپنے فطری اور آبائی رجحانات کے ساتھ ایک خوفناک دماغی اور قلبی جہاد کرنا پڑا۔ تصوف جو مسلمانوں میں پیدا ہوا اور اس جگہ تصوف سے میری مراد "ایرانی تصوف" ہے۔ اُس نے ہر قوم کی رہبانیت سے فائدہ اٹھایا ہے اور ہر راہبی تعلیم کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ "قرمطی تحریک" کا مقصد بھی بالآخر قیود شرعیہ اسلامیہ کو فنا کرنا تھا اور بعض صوفیہ کے متعلق تاریخی شہادت موجود ہے کہ وہ اس تحریک سے تعلق رکھتے تھے "حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی نے مکتوبات میں ایک جگہ یہ بحث کی ہے کہ گستن، عین اسلام ہے اور پیوستن رہبانیت یا ایرانی تصوف ہے، اور میں اس غیر اسلامی تصوف کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوں۔ گزشتہ علمائے اسلام نے بھی ایسا ہی کیا ہے اور اس بات کی تاریخی شہادت موجود ہے۔"

آپ کو یاد ہوگا جب آپ نے مجھے "سِرّ الوصال" کا لقب دیا تھا تو میں نے آپ کو لکھا تھا کہ مجھے "سِرّ الفراق" کہا جائے۔ اس وقت بھی میرے ذہن میں یہی امتیاز تھا جو حضرت مجدد الف ثانی نے کیا ہے .... آپ کے تصوف کی اصطلاح میں اگر میں اپنے مذہب کو بیان کروں تو یہ ہوگا کہ شان عبدیت انتہائی کمال روح انسانی کا ہے اس سے آگے اور کوئی مرتبہ نہیں ہے۔ یا بالفاظ دگر یوں کہہ سکتے ہیں کہ "حالت سکر" منشائے اسلام اور قوانین حیات دونوں کے خلاف ہے اور "حالت صحو" جس کا دوسرا نام اسلام ہے قوانین حیات کے عین مطابق ہے اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا بھی یہی تھا کہ ایسے لوگ پیدا ہوں جن کی حالت کیفیت صحو ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے صحابہ میں ... ہمیں صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ تو ملتے ہیں لیکن حافظ شیرازی ؒ کوئی نظر نہیں آتا۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں کہ "اصل بات یہ ہے کہ صوفیہ کو توحید اور وحدت الوجود کا مفہوم سمجھنے میں سخت غلطی ہوئی ہے۔ یہ دونوں اصطلاحیں مترادف نہیں ہیں۔ مقدم الذکر کا مفہوم مذہبی ہے اور موخر الذکر کا خالص فلسفیانہ، توحید کی ضد کثرت نہیں ہے جیسا کہ بعض صوفیہ سمجھتے ہیں، بلکہ شرک ہے اور وحدت الوجود کی ضد کثرت ہے۔ اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں نے وحدت الوجود یا زمانہ حال کے فلسفۂ یورپ کی اصطلاح میں

توحید کو ثابت وہ موحد تصور کئے گئے حالاں کہ اُن کے ثابت کردہ مسئلہ کا تعلق مذہب سے بالکل نہ تھا۔ بلکہ نظامِ عالم کی حقیقت سے تھا۔ (یعنی یہ کہ اس کائنات کا وجود حقیقی نہیں ہے)۔"

"اسلام کی تعلیم نہایت صاف، واضح اور روشن ہے یعنی یہ کہ عبادت کے لائق صرف ایک ذات ہے باقی جو کچھ کثرت عالم میں نظر آتی ہے وہ سب کی سب مخلوق ہے۔ گو علمی اور فلسفیانہ اعتبار سے اس کی حقیقت ایک ہی کیوں نہ ہو۔ چونکہ صوفیہ نے فلسفہ اور مذہب کے دو مختلف مسائل (وحدت الوجود اور توحید) کو ایک ہی سمجھ لیا اس لئے ان کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ توحید کو ثابت کرنے کا کوئی اور طریقہ ہونا چاہیئے جو عقل وادراک کے قوانین سے تعلق نہ رکھتا ہو اس غرض کے لئے حالتِ سُکر ممد ومعاون ہوتی ہے اور یہ ہے اصل مسئلہ حال ومقامات کی مجھے حالتِ سُکر کی واقعیت سے انکار نہیں ہے، انکار صرف اس بات سے ہے کہ جس غرض کے لئے یہ حالت پیدا کی جاتی ہے وہ غرض اس سے مطلق پوری نہیں ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ صاحبِ حال کو ایک علمی مسئلہ کی تصدیق ہو جاتی ہے نہ کہ مذہبی مسئلہ کی صوفیہ نے وحدت الوجود کی کیفیت کو محض ایک مقام لکھا ہے اور شیخ اکبرؒ کے نزدیک یہ انتہائی مقام ہے اور اس سے آگے عدم محض ہے لیکن یہ سوال کسی صوفی کے دل میں پیدا نہیں ہوا کہ آیا یہ مقام کسی حقیقتِ نفس الامری کو بھی واضح کرتا ہے یا نہیں؟ اگر کثرت حقیقتِ نفس الامری ہے تو یہ کیفیت وحدت الوجود جو سالک پر طاری ہوتی ہے؟ محض دھوکہ ہے اور مذہبی یا فلسفیانہ اعتبار سے اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ نیز اگر یہ کیفیت وحدت الوجود ایک مقام ہے اور کسی حقیقتِ نفس الامری کا اس سے انکشاف نہیں ہوتا تو پھر اس کو معقول طور سے ثابت کرنا بھی بے سود ہے۔ جیسا کہ ابنِ عربی اور ان کے متبعین نے کیا ہے اور نہ اس کے مقام ہونے کی بنا پر ہمیں روحانی زندگی میں کوئی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں یا اس کے رو سے وجود فی الخارج کو ذاتِ باری کے ساتھ اتحاد یا عینیت کی نسبت نہیں ہے۔ بلکہ مخلوقیت کی نسبت ہے۔ اگر قرآن کی تعلیم یہ ہوتی کہ ذاتِ باری تعالیٰ کثرتِ عالم میں داخل و ساری ہے تو کیفیت وحدت الوجود کو قلب پر وارد کرنا مذہبی زندگی کے لئے نہایت مفید ہوتا۔ بلکہ یہ کیفیت، مذہبی زندگی کی آخری منزل ہوتی۔ مگر میرا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کی تعلیم یہ نہیں ہے۔ اور اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ میرے نزدیک کیفیتِ قلبی، مذہبی اعتبار سے کوئی فائدہ نہیں رکھتی۔"[1]

خواجہ حسن نظامی مرحوم کو ایک دوسرے خط میں، جو ۲۹ جولائی ۱۹۱۶ء کو لکھا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:۔

"کل میں ایک صوفی مفسرِ قرآن کی ایک کتاب دیکھ رہا تھا: "خلق السموات والارض فی ستّۃ ایام" کی تفسیر میں لکھتے ہیں ستّۃ ایام سے تنزلات ستہ مراد ہیں۔ کمبخت کو یہ معلوم نہیں کہ

---

[1] شرح اسرارِ خودی از سلیم چشتی صفحہ ۲۰۔۲۹

عربی زبان میں یوم کا یہ مفہوم قطعاً نہیں اور نہ ہو سکتا ہے کیونکہ یہ مفہوم ہی عربوں کی فطرت کے خلاف ہے۔ اس طرح ان لوگوں نے نہایت بے دردی کے ساتھ قرآن اور اسلام میں ہندی اور یونانی تخیلات داخل کر دیئے ہیں۔"

"تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولٹیکل انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا۔ جس قوم میں طاقت اور توانائی مفقود ہو جائے جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی، تو پھر اس قوم کا نقطۂ نگاہ بدل جایا کرتا ہے۔ اُن کے نزدیک ناتوانی ایک حسین شے ہو جاتی ہے اور ترکِ دنیا، موجبِ تسکین۔ اس ترکِ دنیا کے پردے میں ضعیف قومیں، اپنی سُستی، کاہلی اور شکست کو جو ان کو تنازع للبقا میں نصیب ہوتی ہے چھپایا کرتی ہیں۔ خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے۔ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔"[1]

ایک خط میں جو مولانا اسلم جے راجپوری کو، ۱۷ رمئی ۱۹۱۹ء کو لکھا ہے، فرماتے ہیں:-

"معترض قرآن کریم کی تعلیم سے بے بہرہ ہے، علیٰ ہذا القیاس اسلامی تصوف میں مسئلہ خودی کی تاریخ نیز میری تحریروں سے ناواقف محض۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"جب انسان میں خوئے غلامی راسخ ہو جاتی ہے تو وہ ہر ایسی تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرنے لگتا ہے جس کا مقصد قوتِ نفس اور روحِ انسانی کا ترفع ہو۔ دینِ اسلام جو ہر مسلمان کے عقیدے کے رُو سے ہر شے پر مقدم ہے، نفسِ انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے لئے حدود متعین کرتا ہے۔ ان حدود کے متعین کرنے کا نام اسلام کی اصطلاح میں شریعت یا قانونِ الٰہی ہے اور شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے۔ جب احکامِ الٰہی خودی میں اس درجہ سرایت کر جائیں کہ خودی کے پرائیوٹ امیال و عواطف باقی نہ رہیں اور صرف رضائے الٰہی اس کا مقصد ہو جائے تو زندگی کی اس کیفیت کو بعض اکابر صوفیائے اسلام نے "فنا" سے تعبیر کیا ہے اور بعض نے اسی کا نام "بقا" رکھا ہے۔ لیکن ہندی اور ایرانی صوفیہ میں سے اکثر نے فنا کی تفسیر فلسفۂ ویدانت اور بدھ مت کے زیر اثر کی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارۂ محض ہے۔ میرے عقیدے کی رُو سے فنا کی یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے زیادہ خطرناک تھی اور ایک معنی میں میری تحریریں اس تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہیں۔"[2]

اقتباساتِ بالا کا ماحصل یہ ہے کہ:-

(۱) اقبال نفسِ تصوف کے خلاف نہیں ہیں۔ اُس تصوف سے بیزار ہیں جو عجمی اور ویدانتی تصورات کا معجون مرکب اور اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ وہ شیخ محی الدین عربی اور منصور حلاج کے نظریات سے بھی اتفاق نہیں کرتے یعنی تصوف اسلام

[2] مکاتیب اقبال حصہ اول صفحہ ۲۰۱ و ۲۰۲

کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ طبائع کو پست اور کمزور کر دینے والا بھی ہے اس کے برخلاف وہ اسلامی تصوف کے حد درجہ مداح ہیں اس لئے بھی کہ وہ اخلاص فی العمل کا نام ہے اور اس لئے بھی کہ وہ دل میں قوت پیدا کرتا ہے اور اسی قوت سے تحریر و تقریر میں زور پیدا ہوتا ہے اور قوم کی زندگی و بقا کے لئے ایسے ہی لٹریچر کی ضرورت ہے جس کی بنیاد رجائیت پر ہو اور جو قوم میں عملی تحریص کا فریضہ انجام دے سکے۔

(۲) وہ اُس بے خودی کے قائل ہیں جو رجوع الی اللہ کا نتیجہ ہے اور جو ذاتی اور شخصی میلانات کو ختم کر کے اللہ تعالیٰ کے احکام کا اس طرح پابند ہو جاتا ہے کہ انسان اس پابندی کے نتائج سے بھی بے پروا ہو کر محض تسلیم و رضا کو اپنا شعار بنالے۔ اسی کو وہ اسلامی تصوف کا "فنا" کہتے ہیں۔ اس کے برعکس جن صوفیہ نے فنا کی تفسیر ویدانت اور بدھ مت کی تعلیم سے متاثر ہو کر کی ہے جس نے مسلمانوں کو ناکارۂ محض کر کے رکھدیا ہے، وہ فنا کی اس تفسیر کو بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک سمجھتے ہیں اور اپنی تحریرات کو کسی حد تک اسی تفسیر کے خلاف ایک بغاوت قرار دیتے ہیں۔

(۳) عجمی تصوف کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ اُس نے ہر قوم کی رہبانیت سے فائدہ اٹھایا ہے اور ہر راہبی تعلیم کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ انکی تحقیق کے مطابق قرمطی تحریک سے بھی بعض صوفیہ کا تعلق ثابت ہے حالانکہ یہ تحریک قیودِ شرعی کو فنا کرنا چاہتی تھی۔

(۴) وہ نظریۂ وحدت الوجود کو تسلیم نہیں کرتے اور یہ بات ان کے سالہا سال قرآن میں تدبر کرنے اور تاریخ اسلام کے غائر مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

(۵) فرماتے ہیں کہ توحید کا مفہوم مذہبی ہے اور وحدت الوجود ایک خالص فلسفیانہ مسئلہ ہے۔ توحید کی ضد کثرت نہیں ہے بلکہ شرک ہے ہاں وحدت الوجود کی ضد کثرت ہے۔ اور چونکہ ذات باری تعالیٰ نظام عالم میں دائر و سائر نہیں بلکہ اس سے وراء الورا ہے اس لئے شکر اور بے خودی کے ذریعے کیفیتِ وحدت الوجود کا قلب پر وارد کرنا کوئی فائدہ بھی نہیں رکھتا۔

(۶) تصوف سے اگر خلاص فی العمل مراد لی جائے تو کسی کو بھی اعتراض نہیں ہو سکتا اور قرن اولیٰ میں اس سے یہی مراد لی جاتی تھی۔ مگر جب اخلاص فی العمل کو چھوڑ کر تصوف کو فلسفہ بنایا جاتا ہے اور اس کے ذریعے نظامِ عالم اور ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کیا جاتا ہے تو اقبال کی روح اس کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو جاتی ہے۔

(۷) اقبال تصوف کے "مسئلہ عینیت" کے بھی سخت خلاف ہیں۔ کیونکہ یہ بات قرآن سے ثابت نہیں، بلکہ قرآنی تعلیم کی رُو سے کائنات کو باری تعالیٰ کے ساتھ اتحاد یا عینیت کی نسبت نہیں، مخلوقیت کی نسبت ہے۔

(۸) تصوف کی شاعری کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ یہ پولیٹیکل انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی ہے یعنی تاتاریوں کی یورش اور غارت گری کے بعد جبکہ مسلمانوں میں طاقت و توانائی باقی نہیں رہی تھی۔ اسی وجہ سے ان کا نقطۂ نگاہ بدل گیا تھا۔ یعنی انکے نزدیک ناتوانی ایک حسین شے ہو گئی اور ترکِ دنیا موجب تسکین۔

غرضکہ عجمی تصوف کی رہبانی تعلیم نے حیاتِ انسانی کی جڑوں پر بھی تیشہ چلایا ہے اور اسلام کے بنیادی اصولوں پر بھی ظاہر ہے کہ جب انسان دنیا کو خیرباد کہہ کر پہاڑوں کے غاروں اور جنگل کی تنہائیوں میں جا چھپے گا یا خانقاہوں اور گھروں کی چار دیواریوں میں ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جائے گا تو وہ لامتناہی قوتیں اور گوناگوں استعدادیں جو اللہ تعالیٰ نے اس کی ذات میں ودیعت کی ہیں یونہی ضائع ہو جائیں گی اور ممکنات کی وہ دنیا جو اس کے اندر خوابیدہ ہے، اسی طرح خوابیدہ رہ جائے گی۔

مذہبی حیثیت سے قطع نظر، عقلی نقطۂ نگاہ سے بھی یہ بات کہاں درست ہے کہ جو قوتیں عمل کے لئے دی گئیں ہیں اور جو اپنے عمل سے حیرت انگیز کارنامے انجام دے سکتی ہیں۔ ان کو ترک دنیا و انقطاعِ تعلقات کے ذریعے فنا کر دیا جائے عجمی تصوف نے یہ بہت بڑا اجہاد کیا کہ خداداد قوتوں کو بروئے کار لا کر اُن سے تخلیق و آفرینش کا کام لینے کی بجائے ان کو مضمحل کرنے اور مٹا دینے کے بہت سے طریقے ایجاد کر دیئے اور اس طرح نوعِ انسانی کو تنزل، پستی ملکہ فنا کے راستے پر ڈال دیا۔

خدا نے انسان کو اپنا نائب بنایا تھا اور مسجودِ ملائک کر کے تمام موجودات سے اس کے افضل ہونے کو بھی واضح کر دیا تھا اور اس بات کو بھی کہ موجوداتِ عالم کو اس کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے۔ یعنی اس کے اندر وہ صلاحیتیں ودیعت کی ہیں جن کو کام میں لا کر وہ موجودات کی تسخیر میں کامیاب ہو سکتا ہے مگر تصوف نے ترکِ دنیا اور فنا کی تعلیم دے کر ان قابلیتوں کو ملیامیٹ کر دیا، اور وحدۃ الوجود کا سبق پڑھا کر خدا اور نائبِ خدا کے فرقِ مراتب کو بھی ختم کر دیا۔

تعلیمِ دین کی غایت الغایات عرفانِ خدا ہے اور عرفانِ خدا عرفانِ نفس کے ساتھ مشروط ہے مگر تصوف نے ترکِ خودی و فنائے نفس کو اتنا ضروری قرار دیا کہ اس کی خاطر " وجودک ذنب " تک کہہ دینے میں تامل نہ کیا۔ یعنی انسان کا وجود ایک برائی ہے لہٰذا اس برائی کو دور کرنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی گئی۔ کیا ایسی صورت میں عرفانِ خدا کا کوئی سوال پیدا ہو سکتا ہے؟ اللہ فرماتا ہے وَفِيْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ اور حدیث میں ہے کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ

قرآن موجوداتِ عالم میں سے ہر چیز کو آیت کہتا ہے اور ان آیاتِ الٰہی کے مشاہدے کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ ان کے ذریعے خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ مگر عجمی تصوف ہر چیز سے آنکھیں بند کر لینے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کے نزدیک:-

ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

خدا نے اپنے صالح بندوں کی تعریف میں فرمایا ہے يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ .... وہ اٹھتے بیٹھتے خدا کی یاد میں رہتے ہیں اور زمین و آسمان کی خلقت میں فکر و تدبر کرتے ہیں۔ مگر تصوف کا تقاضا ہے کہ خلوت میں بیٹھے خدا کی یاد ہی میں عمر گذار دینی چاہیئے اور موجودات کی تسخیر ایک طرف زمین و آسمان کی خلقت اور موجوداتِ عالم میں خدا کی صناعیوں پر غور کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ حالانکہ جس مقصد کے لئے ذکر کو ضروری قرار دیا ہے اس کی تقویت کے لئے بھی موجودات کا مشاہدہ ضروری ہے کہ خدا کی صفت ظاہر بھی ہے اور باطن بھی پس خلوت کی تنہائی میں باطن تک پہنچنے کی کوشش میں عمر ضائع کر دینا اور جس کے باطن کے لئے عمر ضائع کی جا رہی ہے اسی کے ظاہر کو آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے نہ دیکھنا مضحکہ خیز بات کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

قرآن ہر موجود و مخلوق چیز کا ذکر کر کے، اس کے خالق و موجد کی عظمت و کبریائی اور کمالِ صفت، کا اعتراف کرانا چاہتا ہے نیز اس بات کا یقین پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ جہان کو عبث اور بے مقصد نہیں پیدا کیا گیا ہے تاکہ انسان ان کے مشاہدے سے اپنے اندر جذبۂ طاعت و بندگی پیدا کرے۔ مگر یہ تصوف موجودات کو دھوکا، فریب اور باطل قرار دے کر انسان کو سعی عمل یا طاعت و بندگی کی طرف سے بھی بے نیاز کر دینا چاہتا ہے اور اس بات کی بھی پروا نہیں کرتا کہ قرآن میں اس قسم کی آیات موجود ہیں کہ فرمایا گیا ہے:- رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ

انسان کے اندر چھپے ہوئے امکانات اُسی وقت ظاہر ہو سکتے ہیں جب، وہ گوناگوں حالات بلاطرح طرح کی مشکلات و حوادث

کے ساتھ دوچار ہو اور اُن کا مردانہ وار مقابلہ کرے کہ۔

خطر تاب و تواں را امتحان است　　عیارِ ممکنات جسم و جان است

لیکن خلوت نشینی اور ترکِ علائق میں ایسے موقعے ہی کہاں میسر آسکتے ہیں کہ خودی کے جوہرِ پنہاں آشکارا ہوں۔ بلکہ تصادم سے اس طرح فرار کی صورت میں تو انسان کو اپنی خودی کا بھی یقین نہیں ہوسکتا۔ زندگی خیر و شر کی پیہم پیکار اور ادنیٰ سے اعلےٰ حالات میں جانے کی مسلسل کوشش کا نام ہے اور یہ دونوں باتیں انسان کے باطن کے لئے بھی ضروری ہیں اور اس کے ظاہر کے لئے بھی۔ باطن سے فردکی صلاحِ نفس کا تعلق ہے اور ظاہر سے جماعت اور معاشرے کی طہارت اور پاکیزگی وابستہ ہے۔

عجمی تصوف، جو دوسری چیزوں کے ساتھ، انسان کے وجود کو بھی دھوکا بتلاتا ہے۔ اس کے ماننے والوں نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ آیا یہ بات عقلاً بھی درست ہے کہ مجھے کسی چیز کے بارے میں شک و شبہ تو لاحق ہو، مگر میرا اپنا وجود نہ ہو یعنی شک ہو اور شک کرنیوالا نہ ہو۔ حالانکہ اس کے برعکس اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سب سے زیادہ یقینی چیز میری اپنی خودی ہے ایسی یقینی کہ اگر میں اس سے انکار بھی کرتا ہوں تو اس کا ہونا ثابت ہوتا ہے کہ انکار بغیر انکار کرنیوالے کے کیسے ہوسکتا ہے۔ یہ تو عقلی ثبوت ہے خودی اور نفس انسانی کا موجود ہونا ثابت ہوا۔ مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھئے کہ شریعتیں اور احکامِ الٰہی کس کے لئے ہیں؟ کیا ایسی شے کے لئے جو ایک فریب و گمان ہے؟ ان فرائض اور احکام کا وجود ہی اس بات کی دلیل ہے کہ ہمارا وجود ہے اور مستقل ہے اور یہ احکامِ الٰہی کے لئے ہیں۔ مگر جہاں احکامِ شرعیہ سے آزاد ہونے کے لئے ہی اس قسم کے بے سروپا تصورات گھڑے گئے ہوں وہاں احکامِ شرعیہ کے ذریعہ خودی کے موجود ہونے کو کون سمجھے گا اور اگر سمجھ بھی لے گا تو اس کے فنا کرنے اور مٹانے سے کیوں باز رہے گا۔

اسلام کی تعلیمات کا تو یہ اثر ہونا چاہیے کہ انسان اپنی ذات پر اعتماد پیدا کرے اور قوائے فطرت کو مسخر کرکے ان پر حکمراں ہو اور اس طرح اپنے خلیفۃ اللہ فی الارض ہونے کو ثابت کرے نہ کہ اپنے وجود ہی کو ایک فریب سمجھ بیٹھے کہ:-

مرا وجود ہے میری نگاہِ خود نشناس　　وہ راز ہوں کہ نہ ہوتا تو رازداں ہوتا

اسلام نے انسانوں کو باہمی محبت پر اس قدر زور دیا ہے کہ کسی مذہب میں اس کی مثال نہیں ملتی بلکہ یہاں تک باور کرانے کی کوشش کی کہ خدا کا راستہ پہاڑوں اور صحراؤں کی بجائے انسانوں کے دلوں میں سے ہو کر گزرا ہے جس کسی کو خدا تک پہنچنا ہے وہ یہ راستہ اختیار کرے "دل بدست آور کہ حج اکبر است اور "طریقت بجز خدمت خلق نیست" کا یہی مفہوم ہے اور یہ الخلق عیال اللہ .... کی تفسیر ہے مگر عجمی تصوف کہتا ہے کہ خدا کی محبت کے سوا اور کسی محبت کو دل میں جگہ ہی نہ دو۔ یعنی وہ اس تجریدی محبت کے ذریعے انسان کو اس راستے سے دور رکھنا چاہتا ہے جو واقعی خدا تک پہنچنے کا راستہ ہے اور از روئے عقل بھی یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ خدا کی محبت کا دعویٰ اور خدا کی مخلوق اور اس کے مظاہر سے نفرت!

اسلام ایسا ہمہ گیر مذہب ہے کہ ہر وقت، ہر جگہ کی تمام ضروریات کے پورا کرنے کے اعتبار سے بھی ہمہ گیری کا مالک ہے اور اس اعتبار سے بھی کہ انسانی زندگی کے ظاہر و باطن ہر پہلو کے لئے صاف اور واضح ہدایت رکھتا ہے اور دونوں کو لازم و ملزوم قرار دیتا ہے۔ اس لئے زندگی کے کسی ایک پہلو کو اختیار کرنا اور دوسرے کو نظر انداز کردینا خواہ وہ ظاہری ہو خواہ باطنی خود سری بھی ہے اور اسلام کی جامعیت و ہمہ گیری کو محدود کرکے اسلام کے ساتھ عملی دشمنی بھی۔

کائناتِ انفس و آفاق دونوں پر مشتمل ہے اور دونوں ہی کی تسخیر پر خودی کا استحکام موقوف ہے اس لئے دونوں میں سے کسی ایک ہی پر توجہ مبذول کرنا، ارتقائے خودی کا ناقص تصور ہے، مگر عجمی تصوف نے صرف باطن پر توجہ دینے اور ظاہر سے چشم پوشی کرنے

کی تعلیم دے کر "خیر کثیر" کو "خیر قلیل" بنانے کی کوشش کی ہے۔ ذکر اور فکر کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں فکر بغیر ذکر کے خسرانِ عظیم ہے وہاں ذکر بغیر فکر کے نقصان سے کیوں کر پاک ہو سکتا ہے۔ جب تک دونوں [illegible] زندہ بنائے گا انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی پستی سے باہر نہیں آ سکتی۔ انسان دل کے ساتھ ساتھ دماغ بھی تو رکھتا ہے پھر محض دل سے کام لینا اور دماغ کو معطل کر دینا کہاں کی دانشمندی ہے! دونوں قوتیں عطیہ الٰہی ہیں اور اس لئے ہیں کہ دونوں کی متحدہ کوشش انسانیت کو اُس مقامِ بلند پر لے جائے جہاں اس کو پہنچنا چاہیئے۔ صرف ایک قوت سے کام لینا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص دونوں آنکھوں کے ہوتے ہوئے ایک کو بند کر لے یا سرے سے کھولے ہی نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کی یہ حرکت خیرہ چشمی ہی پر محمول کی جائے گی۔

زندگی عمل پیہم کا نام ہے۔ بلکہ تنازع للبقا میں ہر روز زیادہ سے زیادہ جہد کرنے اور منازلِ ارتقاء کی طرف بڑھتے رہنے ہی زندگی ہے اور جو باتیں انسان کو حرکت کی بجائے جمود کی طرف لے جائیں وہ حیات کی نفی کرنے اور موت کو دعوت دینے والی ہیں۔ موجودہ تصوف نے "توکل" نام رکھا ہے اس کا کہ انسان کچھ نہ کرے۔ خدا پر ایسا بھروسہ کر کے بیٹھ جائے کہ وہ خود بغیر کوشش کے ضروریاتِ زندگی اس کو پہنچائے گا۔ ؎

کارسازِ ما بفکرِ کارِ ما   فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

ایک مستی اور ذوق و شوق وہ ہے جو آدمی کو خانقاہ میں لے جا کر بٹھا دیتا ہے اور ایک ذوق و شوق وہ ہے جو انسان کے باطن میں انقلاب برپا کر کے اس کو بگڑے ہوئے معاشرے اور ناسازگار حالات کے بدل دینے کے لئے بیتاب کر دیتا ہے۔ پہلا ذوق و شوق آجکل کے حلقہ صوفیہ میں ملتا ہے اور دوسرا قرآن کی آیات میں پوشیدہ ہے۔ مگر قرآن کی آیات میں تفکر کون کرتا ہے کہ اس گرمیٔ ہنگامہ سے بہرہ ور ہو جو قوموں کی تقدیر کو بدل کر ان کو زندگی کی نعمتوں سے مالامال کر دیتی ہے۔

ذکر اور خلوت نشینی کو بُرا کون کہہ سکتا ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک زمانے تک غارِ حرا میں خلوت نشین رہے اور نبوت کے زمانے میں بھی جبکہ کام کی کثرت کا کوئی اندازہ نہ رہا تھا، رات کی خاموشی اور تنہائی میں خلوت نشینی کو کبھی ترک نہیں کیا۔ لیکن اُس خلوت نے نورِ ذات سے مستنیر ہو کر ملتوں کی زندگی اور انسانوں کی سیرتوں میں انقلاب برپا کیا تھا:۔

مصطفٰے اندر حرا خلوت گزید   مدتے جز خویشتن چیزے ندید
نقشِ ما را در دلِ او ریختند   ملتے از خلوتش انگیختند

لہٰذا حضورؐ کی غارِ حرا کی خلوت نشینی کی تقلید اسی وقت مکمل ہو سکتی ہے کہ جب وہ خلوت نشینی فرد اور قوم کی زندگی میں کسی انقلابِ نو کا پیش خیمہ ہو۔ اور انفرادی و اجتماعی زندگی کی تعمیرِ نو کی تیاری ہو۔ ورنہ محض خلوت نشینی کا اختیار کرنا اور اس کی حقیقت کو نظر انداز کر دینا کوئی اچھا نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا!

زندگی عمل سے بنتی ہے۔ اپنی ذات میں نیز اپنی ذات سے باہر ماحول میں انقلاب عمل سے آتا ہے اور مسلمانوں کے ذمے تو باطل کی ظلمتوں کو دور کر کے دنیا کو حق کی روشنی سے منور کرنے کا کام کیا گیا ہے لہٰذا ان کے عمل کی وسعتوں کا کیا ٹھکانہ ہے! پھر اگر یہ گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر ذکر کرنے اور چند اوراد و وظائف کو اپنا منتہائے زندگی سمجھ لے تو کتنی بڑی نافرمانی ہے!

اسلام ایسی انقلابی تحریک بن کر نمودار ہوا جس نے اس عالمِ کہن کے زمین و آسمان بدل ڈالے، تہذیبوں کی بنا ڈالی۔ علوم و فنون سے دنیا کو آشنا کیا، عدل و مساوات کے اصول بنائے آج جس جمہوریت کا ڈھول پیٹا جا رہا ہے اس کی حقیقت سے کون ناواقف ہے ایک خلافتِ راشدہ کے زمانے کی جمہوریت اور مساوات تھی، تاریخ کے اوراق میں دیکھئے اگر کسی زمانے میں ایسی جمہوریت قائم

طرف یہ کثرت و تعداد! پھر ہر سلسلہ مسلمانوں کو اپنی ہی طرف دعوت دیتا اور دوسرے تمام سلاسل کے مقابلے میں اپنے آپ ہی کو برحق یا سب سے افضل سمجھتا ہے۔ افسوس کہ وحدت الوجود کے مدعیوں کا خیال اس کثرت پسندی کی طرف نہیں گیا۔ کاش کہ اس نظریے سے کم از کم ظالم اپنے ظلم سے اور عداوت شعار، کینہ ور اپنی عداوت و کینہ وری ہی سے باز آجاتے! اور مسلمانوں میں عداوت، منافرت اور جنگ و پیکار ہی دور ہو جاتی۔ گروہ بندیاں اور فرقہ آرائیاں ہی باقی نہ رہتیں جیسے علامہ اقبال نے اپنے ابتدائی دور میں وحدۃ الوجود ہی کا واسطہ دیتے ہوئے قوم کو متحد ہونے کی تلقین کی تھی۔

تعصب چھوڑ ناداں دہر کے آئینہ خانے میں یہ تصویریں ہیں تیری جن کو برا سمجھا ہے تو نے

اب ہم اقبال کی مستقل تصنیفات کا جائزہ لے کر دیکھتے ہیں کہ تصوف کے متعلق مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں ان کے نظریات کیا ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ خود اُن کے کلام میں اُن کے قائم کردہ معیارِ تصوف کی خلاف ورزی موجود ہو۔

فاران:- فاضل مقالہ نگار نے جس زیر ترتیب کتاب کے چند اوراق "فاران" کو مرحمت فرمائے ہیں۔ وہ اپنے موضوع پر گرانقدر علمی پیش کش ہوگی، موصوف سلجھا ہوا دماغ رکھتے ہیں اور پیرایہ زبان نہایت سادہ اور عام فہم ہوتا ہے، اعتدال اور سنجیدگی اُن کے قلم کی بہت بڑی خصوصیت ہے!

کوئی شک نہیں علامہ اقبال مرحوم کی دینی فکر صحیح اور مستقیم تھی، اُن کی شاعری سے دین کو جتنا فائدہ پہنچا ہے، اتنا فائدہ کسی مسلمان شاعر کے کلام سے نہیں پہنچا۔ اس اعتراف کے بعد عرض ہے کہ یہ نہیں ہے کہ علامہ اقبال کی زبان و قلم سے جو لفظ نکل گیا ہے وہ غلط ہو ہی نہیں سکتا، اُن سے کہیں کہیں اظہار و بیان میں غلطیاں بھی ہوئی ہیں اور ان کی جن غلطیوں کی توجیہہ اور تاویل نہیں ہو سکتی، ان کی صحت پر اصرار نہیں کرنا چاہیئے، مجموعی طور پر اقبال کے شاعرانہ افکار نے اسلام کی صحیح ترجمانی کی ہے! ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ علماء کی باتوں پر "ملائیت" کی پھبتی چست کر دیتے ہیں مگر اقبال کے کلام کو پڑھ کر ان کی زبانِ طنز گنگ اور اُن کی مغرب زدگی مرعوب ہو جاتی ہے۔ "مغرب زدہ فرعونوں" کے لئے اقبال کی شاعری سچ مچ "ضربِ کلیم" کی حیثیت رکھتی ہے! اقبال کو اس نیکی کا اللہ تعالیٰ کے یہاں بہت بڑا اجر ملے گا۔

مشہور شخصیتوں کے بارے میں لوگ مبالغہ کر جاتے ہیں، اس مقالہ میں بھی بیگم عطیہ فیضی کے حوالہ سے یہ بات کہی گئی ہے کہ اقبال کو ان کے والد نے لڑکپن ہی میں علومِ باطن خود سکھلائے تھے۔

سو دو سو سال کے بعد یہ مقالہ جن لوگوں کی نگاہ سے گزرے گا وہ عطیہ فیضی کے بارے میں یہ رائے قائم کریں گے کہ یہ بھی کوئی "ولیہ وقت" اور صاحبِ باطن خاتون ہوں گی جبھی تو اقبال کے علوم باطن حاصل کرنے کی روایت اُن سے لی گئی ہے۔۔۔! حالانکہ عطیہ فیضی صاحبہ کی روایت "رقص و سرود" اور "تصویر کشی و بُت تراشی" کے بارے میں تو مستند ہو سکتی ہے مگر "علوم باطن" کے بارے میں ان کی شہادت ایک مضحکہ سے کم نہیں ہے۔

پھر "علوم باطن" ریاضی و جغرافیہ کی طرح ایسے علوم نہیں ہیں جنہیں سبقاً سبقاً پڑھا دیا جائے جیسا کہ خود اس مقالہ میں بتایا گیا ہے کہ سخت ریاضت و مجاہدہ کے بعد علوم باطن حاصل ہوتے ہیں ——— تو "اقبال" کو ان کے والد کا بچپن ہی میں علوم باطن سکھا دینا ایک افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا! اور اگر اُن کے والد محترم نے باطنی علوم ان کو سکھا دیئے تھے، تو اقبال کی زندگی سے ان باطنی علوم کے اثرات کی شہادت نہیں ملتی، اقبال اور اُن کے والد ——— دونوں باپ بیٹوں کو "ولی اللہ"

ثابت کرنے کی کوشش کچھ عجیب سی لگتی ہے۔

اقبال کا شروع کا رنگ یہ ہے کہ وہ خواجہ حسن نظامی صاحب سے تصوف کے متعلق خط و کتابت کرتے ہیں حالانکہ خواجہ حسن نظامی اُس "عجمی تصوف" کے سب سے بڑے مبلغ تھے، جس کی علامہ اقبال نے سخت مخالفت کی ہے۔

خواجہ حسن نظامی کے یہاں قوالی سن کر اقبال کو مہاراجہ سرکشن پرشاد یاد آتے ہیں اور یہ وہ شخص ہیں، جن کو خواجہ حسن نظامی نے سلسلہ نظامیہ میں بیعت فرمالیا "ایمان اور اسلام" کی شرط بھی اڑا دی تھی، یہ وہ تصوف ہے جس سے ایمان لرزتا ہے اور اسلام ہزار بار پناہ مانگتا ہے ——— استغفراللہ!

اس مقالہ میں فاضل مضمون نگار نے شیخ سراج کی "کتاب اللمع" کے ایک اقتباس کے حوالہ سے جو علوم ظاہری و باطنی کی تقسیم کی ہے اور شریعت و طریقت کے فرق کو ظاہر کیا ہے، یہی چیز محل نزاع ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سعادت میں اور صحابہ کرام کے مبارک دور میں شریعت و طریقت یا ظاہر و باطن کے علوم کی کوئی تفریق نہیں پائی جاتی، اور نہ ان ادوار میں ایسے دو گروہ ملتے ہیں، جن میں سے ایک پر اصحاب ظاہر کا اطلاق ہوتا ہو اور دوسرے پر اصحاب باطن کا! دورِ رسالت، و عہد صحابہ میں شریعت ہی سب کچھ تھی، اسی سے مسلمانوں کے فکر و نظر، اعمال، اخلاق اور قلوب و اذہان کی اصلاح ہوتی تھی۔

یہاں اس غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے کہ جب ہم "شریعت" بولتے ہیں تو اس سے مراد صرف معروف فقہی مسائل نہیں بلکہ پورا دین ہوتا ہے، وہ دین جو "کتاب و سنت" میں پایا جاتا ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے احکام کی کھلی ہوئی تبلیغ فرماتے تھے، اس تبلیغ میں ظاہر و باطن کی کوئی تفریق نہ ہوتی تھی، اور نہ کسی خاص صحابی کو حضورؐ نے دین کے اسرار، دوسرے صحابہ سے چھپا کر بتا دیئے تھے۔ صحابہ کرام کی پوری جماعت میں حضرت حذیفہ یمانی رضی اللہ عنہ کو البتہ "صاحب السر" کہا جاتا تھا۔ وہ اس لئے نہیں کہ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کے مخصوص اسرار تلقین فرما دیئے تھے۔ بلکہ اس بنا پر کہ حضورؐ نے بعض منافقوں کے نام آپ کو بتا دیئے تھے!

جہاں تک باطن کے تزکیہ اور اخلاص فی العمل کا تعلق ہے، اس کی تعلیم بھی کتاب و سنت میں ملتی ہے، مثلاً "قربانی" کے بارے میں صاف لفظوں میں فرمایا گیا ہے کہ قربانی کے جانوروں کا خون اور گوشت اللہ تعالیٰ کے پاس نہیں پہنچتا بلکہ "تقویٰ" پہنچتا ہے، اور یہ ارشاد کہ اللہ تعالیٰ "مافی الصدور" کو جانتا ہے، اس بات کی تلقین ہے کہ قلب و اعمال میں یک رنگی ہونی چاہیے ظاہری اعمال اور الفاظ سے دُنیا کو دھوکا دیا جا سکتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے کتاب و حکمت کی تعلیم کے ساتھ تزکیہ باطن کے منصب پر بھی مامور فرمایا تھا اور تزکیہ باطن کی یہ تعلیم حضورؐ کی سنت میں تمام و کمال محفوظ ہے! اُس روزے کو جس میں روزہ دار منکر کو نہ چھوڑے "فاقہ" سے تعبیر فرمانا، اُس ہجرت کا جو عورت و مالِ غنیمت کے لئے ہو اللہ کے نزدیک معتبر نہ ہونا، نماز کا اس طرح ادا کرنا کہ گویا نماز پڑھنے والا خدا کو دیکھ رہا ہے یا یہ کہ خدا اُس کو دیکھ رہا ہے ——— اس قسم کی تمام احادیث کتابوں میں محفوظ ہیں ——— تو شریعت خود اپنی ذات سے ظاہر و باطن کی جامع و رابطہ واقع ہوتی ہے، اس صورت میں شریعت کو ظاہری اعمال کا مظہر ٹھیرا کر اس کے مقابلہ میں "طریقت" کو اخلاص فی العمل اور تزکیہ باطن کا ایک شعبہ قرار دینا، دین و شریعت کی وحدت اور کتاب و سنت کی جامعیت کو مجروح کرنا نہیں تو اور کیا ہے! یہ کہنا کہ شریعت کا تعلق ظاہر سے اور طریقت کا تعلق باطن سے ہے ایک

ایسی دوئی اور تفریق ہے، جسے اسلام کا مزاج گوارا نہیں کر سکتا۔ جس کسی نے اس تصور کی بنیاد پر شریعت کو "قشر" اور طریقت کو "مغز" کہا، اس نے شریعت کا استخفاف کیا۔

"شریعت و طریقت" کی تقسیم کو تصوف کی بنیاد قرار دینا، تصوف پر اتنا بڑا الزام ہے کہ اس کی صفائی میں جتنا زیادہ کہا جائے گا، اتنی ہی بات الجھتی چلی جائے گی!

شیخ سرج نے "وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً" کی شرح میں "نعمتِ ظاہرہ" سے شریعت اور "نعمتِ باطنہ" سے جو طریقت مُراد لی ہے، وہ صحیح نہیں ہے! کھلی ہوئی نعمتوں سے وہ نعمتیں مُراد ہیں جو حواس سے مدرک ہوں اور بے تکلف سمجھ میں آجائیں، چھپی نعمتیں وہ ہیں جو عقلی ہوں اور اُن کے ادراک کے لئے غور و فکر کی ضرورت لاحق ہو۔ مثلاً معاشی اور مادی نعمتیں "ظاہری نعمتیں" ہیں اور روحانی و معادی نعمتیں "باطنی نعمتیں" ہیں! معاش کے اسباب کا مہیا ہو جانا، یہ ظاہری نعمت ہے اور پیغمبر کا بھیجنا اور نیکی کی توفیق دینا یہ باطنی نعمت ہے! پھر ارباب باطن سے، اسرارِ غیب مُنکشف ہونے کی جو نسبت کی گئی ہے، وہ بڑے خلجان میں ڈالنے والی بات ہے!

غیب کی جو باتیں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب اور نبی آخر کے ذریعہ بتا دی ہیں، اُن کے علاوہ "غیوب" معلوم کرنے کی کوشش اور تمنا کرنا شریعت میں مطلوب ہے نہ پسندیدہ ہے! صحابہ کرام کی زندگیوں میں "اسرارِ غیب" کی کیفیت و کمیت نہ ہونے کے برابر ہے حالانکہ وہ تزکیہ باطن اور صفائے قلب کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھے۔

خود فاضل مضمون نگار نے اسلامی تصوف اور عجمی تصوف کی تقسیم کر کے "تصوف" کی دینی حقیقت پر بڑی کاری ضرب لگائی ہے۔ "فقہ" اور "حدیث" کی اس طرح تقسیم نہیں کی جاتی کہ یہ "اسلامی فقہ" ہے اور یہ "عجمی فقہ ہے"، یہ "اسلامی حدیث" ہے اور یہ "عجمی حدیث" ہے! ہاں علم کلام کو "اسلامی علم کلام" اور "عجمی علم کلام" میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ تو "تصوف" ——— حدیث و فقہ کی طرح دین کا ایسا علم نہیں ہے، جس کا حصول و عمل دین کی ناگزیر ضرورت ہے! اور جس کو حاصل نہ کیا جائے تو دین ناقص رہ جاتا ہے!

کوئی مسلمان جس طرح "علم کلام" کے مبادی سے بھی واقف نہ ہو، تو اس کے ایمان و اسلام میں ذرا سا بھی نقص نہیں رہ جاتا، اسی طرح "علم تصوف" سے بے گانگی، ناآشنائی اور اجنبیت کے سبب کسی مسلمان کے ایمان و اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا!

جہاں تک حدیث و فقہ کی اصطلاحات کا تعلق ہے وہ بے ضرر ہیں، اُن میں کوئی اضطراب و خلجان نہیں، اس کے مقابلہ میں تصوف کی اصطلاحات میں ذہن و فکر کے لئے شدید خلجانات ہیں، احادیث کی اقسام ——— صحیح و مشہور ——— کی تصوف کی اصطلاحات ——— سیر فی اللہ اور سیر مع اللہ ——— سے کوئی مماثلت نہیں ہے، ایک طرف سلجھاؤ ہے اور دوسری جانب الجھاؤ کہ اس کی بس تاویلیں ہی کرتے رہیئے!

حقیقت یہ ہے کہ تصوف کی مخصوص زبان اور اس کی عجیب و غریب فنی اصطلاحات اسلام کے مزاجِ سادہ سے ہم آہنگ نہیں ہیں! "تزکیہ باطن" کو تصوف نے "فلسفہ" بنا کر رکھ دیا ہے جس میں بڑی خطرناک الجھنیں پائی جاتی ہیں!

ایک مسلمان کی دین و دنیا کی کیا اس میں بھلائی ہے کہ وہ "قم باذنی" اور "انا الحق" میں غور کرتا ہے یا اس کے لئے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اس قول میں فلاح و سعادت ہے، جو آپ نے سنگِ اسود کو چومتے ہوئے کہا تھا کہ:-

"اے سنگِ اسود! تو کسی نفع نقصان کا مالک نہیں ہے۔ تُو تو بس ایک پتھر ہے، میں تجھے صرف اس لئے چومتا ہوں کہ رسول اللہؐ نے تجھے چوما تھا۔"

ہم صوفیائے کرام کے ادق احوال، ذہن کیفیت اور حیرت میں ڈال دینے والے واردات میں پڑ کر اپنے ذہن و فکر کو ناحق الجھن میں کیوں ڈالیں، جبکہ ہمارے سامنے اسوۂ رسول، اور آثارِ صحابہ موجود ہیں، جو سادہ ہیں، انسانی فطرت کے مطابق ہیں۔ جن میں کوئی الجھن نہیں ہے سیدھی، سچی، سادہ کھلی کھلی باتیں!

ہم اُن تمام صوفیائے کرام کا احترام کرتے ہیں، جن کی زندگیاں کتاب و سُنّت کے مطابق بسر ہوئی ہیں اور جن کے ملفوظات و ارشادات شریعت سے متصادم نہیں ہیں ——————— ہاں، جہاں کہیں شریعت سے کسی صوفی کے قول و عمل کا تصادم ہوتا ہے، وہاں ہمارے منہ سے بے ساختہ صدائے احتجاج نکل جاتی ہے!

علامہ اقبال کی اس صحتِ فکر کی داد دینی چاہیئے کہ وہ منصور حلاج اور شیخ محی الدین عربی کے نظریات سے اختلاف رکھتے تھے، اور وحدت الوجود کو صحیح نہیں سمجھتے تھے اور ہندی اور ایرانی صوفیا کی اکثر تعداد کے بارے میں اقبال کا یہ خیال تھا کہ اُنھوں نے "فنا" کی تفسیر فلسفۂ ویدانت، اور بُدھ مت سے متاثر ہو کر کی ہے۔

صحیح فکر و اعتقاد یہ ہے کہ اصل چیز "شریعت" ہے، جو ظاہر و باطن کی جامع ہے، اس کسوٹی پر ہر شخص کے قول و عمل کو پرکھ کر دیکھنا چاہیئے، اور جو چیز اس کسوٹی پر پوری نہ اُترے، اُسے رد کر دینا چاہیئے! بس پھر کوئی کھٹکا نہیں! مسلمان کی دینی غیرت کتاب و سنّت کے خلاف کسی کے قول و عمل کو برداشت نہیں کر سکتی!

مُلّا واحدی

نماز

(مُلّا واحدی دہلوی کی زیر ترتیب کتاب "حیات سرورِ کائنات" حصہ سوم کا ایک مضمون)

صف مسجد میں جو آئے نظر عزت کر و اُس کی
یہ سمجھو تم اُسے اللہ کے دربار میں دیکھا
(حضرت اکبر الٰہ آبادیؒ)

نماز کیا ہے؟ مخلوق کا اپنے دل، اپنی زبان اور اپنے ہاتھ پاؤں سے اپنے خالق کے سامنے عبودیت کا اظہار۔ اُس رحمان و رحیم کی یاد، اور اس کے بے انتہا احسانات کا شکریہ۔ حسنِ ازل کی حمد و ثنا اور اُس کی یکتائی اور بڑائی کا اقرار۔

یہ اپنے محبوب سے مہجور روح کا خطاب ہے۔ یہ اپنے آقا کے حضور میں جسم و جان کی بندگی ہے۔ یہ ہمارے اندرونی احساسات کا عرض نیاز ہے۔ یہ ہمارے دل کے ساز کا فطری ترنم ہے۔ یہ خالق و مخلوق کے درمیان تعلق اور وابستگی کی گرہ ہے۔ یہ بے چین روح کی تسکین مضطرب قلب کی تشفی، اور مایوس انسان کی آس ہے۔ یہ حساس و اثر پذیر طبیعت کی باطنی پکار ہے۔ یہ زندگی کا حاصل اور ہستی کا خلاصہ ہے۔ (علامہ سید سلیمان ندویؒ)

دشمن کی فوجیں مقابل کھڑی ہیں۔ تیروں کا مینہ برس رہا ہے، نیزوں اور تلواروں کی بجلیاں ہر طرف کوند رہی ہیں۔ ہاتھ اور بازو کٹ کٹ کر گر رہے ہیں کہ نماز کا وقت آجاتا ہے؛ فوراً جنگ کی صفیں نماز کی صفیں بن جاتی ہیں اور اللہ اکبر کی آواز کے ساتھ موت اور حیات سے بے پرواہ ہو کر گردنیں جھکنے اور اٹھنے لگتی ہیں۔

نور کا تڑکا ہے۔ دائرہ اسلام کا مرکز فاروق اعظمؓ امام نماز ہیں پیچھے صحابہ کی صفیں قائم ہیں۔ دفعتاً ایک شقی خنجر بکف آگے بڑھتا ہے اور خلیفہ پر حملہ آور ہو کر شکم مبارک کو چاک کر دیتا ہے۔ فاروق اعظمؓ غش کھا کر گر پڑتے ہیں۔ خون کا فوارہ جاری ہو جاتا ہے۔ مگر نماز کی صفیں نہیں ٹوٹتیں، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ حضرت فاروق اعظمؓ کی جگہ آتے ہیں اور نماز پوری کراتے ہیں۔ (دلی)

اللہ اور اللہ کے رسول ؐ پر ایمان لانے کے بعد، ایمان لانے کی پہلی نشانی، پہلی علامت اور پہلا مارکہ نماز ہے۔ حدیث ہے کہ ایمان اور کفر کے درمیان امتیاز نماز ہی سے ہوتا ہے۔ زکوٰۃ دینے کو سب نہیں دیکھتے۔ روزہ بھی چھپا رہ سکتا ہے۔ حاجی ہونے کا اظہار کرتے پھرنا تو کبھی کبھی برا لگتا ہے۔ لیکن نماز کے لئے حکم ہے کہ ظاہر کر کے پڑھو۔ تہجد اور اشراق وغیرہ کا ڈھنڈورا مت پیٹو مگر فرض نمازوں کے گواہ بناؤ۔ مسجد میں آؤ۔

پانچ وقت کی نماز عورت مرد۔ بوڑھے جوان۔ امیر غریب۔ بیمار اور تندرست ہر شخص کے لئے لازمی ہے۔ بیماری کی وجہ سے مسجد نہ جا سکو تو گھر میں پڑھو۔ کھڑے ہو کر نہ پڑھ سکو تو بیٹھ کر پڑھو۔ بیٹھ کر نہ پڑھ سکو تو لیٹے لیٹے پڑھو۔ اشاروں سے پڑھو۔ چلتے چلتے پڑھو۔ سواری پر بیٹھے بیٹھے پڑھو۔ پڑھو اور مرتے مرتے پڑھو۔ سوائے حیض و نفاس کے کسی وقت اور کسی حال میں نماز چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے۔

زکوٰۃ صرف اہل نصاب پر فرض ہے۔ روزہ انتہائی کمزوری ہو تو قضا لیا جا سکتا ہے یا اس کا فدیہ دیا جا سکتا ہے۔ حج

دولت مند کرتے ہیں۔ وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا لیکن نماز کا معاملہ دوسرا ہے۔ قریباً، قرار توحید و رسالت جیسا۔ اقرار توحید و رسالت کے معنی کیا ہیں اگر رسول م کی اتنی بات بھی نہ مانی جائے کہ اللہ کے آگے سر جھکاؤ۔

"نماز وہ فرض ہے جو اسلام کے ساتھ ساتھ پیدا ہوا اور اس کی تکمیل اُس شبستان قدس میں ہوئی جسے معراج کہتے ہیں"۔ نماز عامۃ المسلمین کی معراج ہے۔

نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج سے اسلام مکمل ہرگز نہیں ہو جاتا۔ جو حضرات ارکان اسلام پر اسلام کو ختم سمجھتے ہیں وہ ناواقف اور سادہ لوح ہیں۔ لیکن جو لوگ ارکان اسلام کی پرواہ نہیں کرتے اور بس معاملات کو اہمیت دیتے ہیں ان کے معاملات پابند ارکان مسلمانوں سے بدتر ہیں۔ وہ زیادہ ناواقف اور فریب خوردہ ہیں۔

مسلمان کی نمایاں پہچان نماز ہے۔ ھُمْ عَلٰی صَلَاتِھِمْ یُحَافِظُوْنَ مسلمان اپنی نماز سے (غفلت اور تساہل نہیں برتتے) خبردار (و ہوشیار) رہتے ہیں۔ اَلَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَاتِھِمْ دَآئِمُوْنَ نمازی (مسلمان) وہ جو اپنی نماز پر مداومت کرتے ہیں۔ (نماز ہمیشہ پڑھتے ہیں)

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب مبعوث ہوئے تو توحید کے بعد پہلا حکم حضور م کو نماز کا ملا:۔ یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ اے چادر اوڑھنے والے! اٹھو (لوگوں کو عذاب الٰہی سے) ڈراؤ۔ اور اپنے پروردگار کو تعظیم سے یاد کرو۔

"تعظیم سے یاد کرنا" نماز کی بنیاد تھی۔ پھر نماز آہستہ آہستہ تکمیل کے مدارج طے کرتی رہی اور روحانی معراج کی سرحد تک پہنچ گئی اور جمادات، نباتات اور حیوانات کی پرستش اور ہر کس و ناکس کے سامنے سر جھکانے کے بدلے اس کی پرستش کی جانے لگی جو حقیقتاً پرستش کا مستحق ہے۔ اللہ اور بندے کا ٹوٹا ہوا رشتہ جڑ گیا۔

ابتدائے اسلام میں نماز کا پڑھنا بہت دشوار کام تھا۔ نماز پڑھتے دیکھ کر دشمن ہلہ بول دیتے تھے اور نرغہ کر لیتے تھے۔ بدبختوں نے ایک مرتبہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی پُشتِ مبارک کے اوپر نماز کے دوران میں اونٹ کی آنتیں اوجھ اوجھڑی ڈال دی تھی کہ حضور م بوجھ سے دب گئے تھے اور ہل نہیں سکتے تھے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے تشریف لا کر اوجھڑی کو ہٹایا تھا۔ بدبخت گلے میں پھندا ڈال دیتے تھے اور اُسے کھینچتے تھے۔ گلا گھٹ جاتا تھا۔ اور نماز پڑھتے وقت حضور م کا اور حضور م کی نماز کا مذاق اڑانا اور سیٹیاں اور تالیاں بجانا تو روز کی بات تھی۔ اسی وجہ سے حضور م نے صحن حرم کی بجائے غاروں میں اور دروں میں چھُپ چھُپ کر نماز پڑھنی شروع کر دی تھی یا پھر رات کے سناٹے میں اس فرض کو ادا کرتے تھے۔ دن کو حرم میں نماز نہیں پڑھتے تھے۔ مگر اس کے باوجود حکم آتا ہے:۔ وَاْمُرْ اَھْلَکَ بِالصَّلٰوۃِ وَاصْطَبِرْ عَلَیْھَا اپنے گھر والوں پر نماز کی تاکید رکھو، اور خود بھی اُس پر جمے رہو۔ دشمنوں کے پریشان کرنے سے پریشان مت ہو۔)

حکم ہے:۔ قُوْمُوْا لِلّٰہِ قٰنِتِیْنَ اللہ کے سامنے ادب سے کھڑے ہوا کرو۔ اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَۃً اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر، گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارو۔ وَادْعُوْہُ خَوْفًا وَّطَمَعًا اور اس کو ڈر اور امید کی ملی جلی کیفیت سے پکارو۔

قرآن مجید نے انسان کی اس فطرت کا جا بجا نقشہ کھینچا ہے اور سوال کیا ہے کہ جب کوئی مصیبت پڑتی ہے۔ مثلاً سمندر میں طوفان آتا ہے اور تمہارا جہاز طوفان میں پھنس جاتا ہے تو وہ کون ہوتا ہے جس سے تم فریاد کرنے لگتے ہو۔ انسانی فطرت اُس کی متلاشی ہے جس سے عرض نیاز کرے۔ جسے دل کی تمنائیں سنائے۔ جس کے آگے جھکے۔ جس کے قدموں میں سر رکھ دے۔ نماز

روح کے اسی فطری مطالبے کا علاج ہے۔ دل کی گہرائیوں میں ایک ساز ہے جو نامعلوم انگلیوں کے چھونے سے بجتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیل ع کو بے آب و گیاہ، ویران سرزمین میں اسی لئے آباد کرتے ہیں کہ وہاں بھی نظام صلوٰۃ قائم ہو جائے۔ (لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ) پھر حضرت ابراہیم علیہ اور اپنی نسل کے لئے دعا مانگتے ہیں تو یہی کہ رب اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلٰوةِ وَمِن ذُرِّيَّتِي اے پروردگار! مجھے اور میری نسل کو نظام صلوٰۃ قائم کرنے والا بنا۔

حضرت اسماعیل علیہ اپنے اہل و عیال کو نماز کا حکم فرمایا کرتے تھے۔ وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ

حضرت شعیب ع کو ان کی قوم نے نماز ہی کا طعنہ دیا تھا۔ أَصَلٰوتُكَ تَأْمُرُكَ أَن نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا کیا تمہاری نماز تمہیں یہی سکھاتی ہے کہ ہمارے باپ دادا جسے پوجتے آئے ہیں ہم اُسے چھوڑ دیں۔

حضرت موسیٰ علیہ سے کہا گیا کہ میری (یعنی اللہ کی) یاد کے لئے نماز پڑھو۔ وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِي

حضرت ذکریا ع کی نسبت فرمایا ہے وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ وہ محراب میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔

حضرت عیسیٰ ع کے الفاظ ہیں۔ وَأَوْصَانِي بِالصَّلٰوةِ اللہ نے مجھے نماز کا امر کیا ہے۔

غرض نماز نئی چیز نہیں ہے۔ لیکن حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب تشریف لائے ہیں تو نماز کی موقعہ نہ شان مٹ چلی تھی، سجدہ جو نماز کی جان ہے قطعی ترک کر دیا گیا تھا۔ سورۂ مریم میں انبیا کا نام بنام ذکر کرکے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَخَلَفَ مِن بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ اُن کے بعد ان کی جگہ ایسے لوگوں نے لی جنھوں نے نماز کو برباد کر ڈالا اور اپنی خواہشات کی پیروی کی (اپنی من مانی کی، نماز کی حقیقت سے واسطہ نہ رکھا اور نماز کی روح کو نکال باہر کیا)

قرآن مجید میں سو دفعہ سے زیادہ نماز کی تعریف کی گئی ہے اور اس کی بجا آوری پر زور دیا گیا ہے۔ نماز میں سستی اور کاہلی برتنے کو نفاق کی علامت کہا ہے اور نماز ترک کرنے کو کفر کی علامت۔ بتوں کی پوجا، جنات کی دُہائی اور فرشتوں کی خوشامد سے باز آؤ اور اپنا مُنہ ہر طرف سے پھیر کر ٹھیک دین توحید کی طرف کرو۔ وہی فطرت اللہ جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا۔ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ...... اور نماز کو قائم رکھو اور مشرکوں کے طریقے میں شامل نہ رہو۔ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۔

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: "نماز دین کا ستون ہے" جس طرح ستون کے گر جانے سے عمارت گر جاتی ہے، اُسی طرح نماز کے ترک کرنے سے دل کی دینداری ختم ہو جاتی ہے۔ حیات سرور کائنات کا حصہ اول ملاحظہ کیجئے۔ طائف کے وفد نے حضور سے گفتگو شروع کی تو کہا کہ ہم مسلمان ہوتے ہیں، ہمیں نماز، جہاد اور زکوٰۃ سے مستثنیٰ کر دیجئے۔ حضور نے جہاد اور زکوٰۃ سے مستثنیٰ کر دیا، لیکن نماز کے متعلق فرمایا۔ "جس دین میں اللہ کے سامنے جھکنا نہ ہو اُس دین میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔"

ایک حدیث ہے۔۔ نماز دل کی روشنی ہے۔

ایک حدیث ہے:۔ نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وفات کے وقت آخری الفاظ جو فرمائے وہ "نماز اور غلام" تھے یعنی نماز اور غلام کا ضرور خیال رکھنا۔ نماز ادا ہوتی رہے اور غلاموں کے ساتھ میرا بتایا ہوا معاملہ کیا جائے۔

ایک حدیث ہے :- نماز قرآن پڑھنے اور اللہ سے دھیان لگانے اور اس کی پاکی اور بڑائی بیان کرنے کا نام ہے۔
قرآن مجید میں ہے :- اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ... آگاہ رہو کہ دل (فقط) اللہ کی یاد سے تسکین پاتے ہیں۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى کامیاب وہ ہوا جس نے اپنے آپ کو پاک اور منزّہ کیا اور اللہ کا نام لیا اور نماز پڑھی۔
جب کوئی آفت آئے یا تکلیف ستائے تو وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ثابت قدمی اور نماز کے ذریعہ (تم سے یعنی اللہ سے) مدد مانگو۔
ایک حدیث ہے : تم اپنے پروردگار کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور وہ تو بہرحال تمہیں دیکھتا ہے۔
قرآن مجید میں ہے :- وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ (نماز کبھی مت ترک کرو) نماز کو ضرور بالضرور خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرو۔ نماز (اگر مداومت اور خشوع و خضوع اور حسن نیت و حضور قلب کے ساتھ ادا کی جائے تو) بیہودگی اور ناشائستہ حرکتوں (کے کرنے) سے باز رکھتی ہے۔
حضور قلب اور خشوع و خضوع تو بڑے اوصاف ہیں، محض مداومت کرنے والے نمازیوں کو پرکھ لیجئے۔ آج بھی معمولی نمازی بہتر درجے اور رتبے میں بے نمازی سے بہتر نکلے گا۔ مقابلہ کلرک اور چپراسی کا نہ کیجئے۔ نمازی کلرک اور بے نمازی کلرک کا کیجئے یا نمازی چپراسی اور بے نمازی چپراسی کا کیجئے۔
خیر نماز سے بیہودگیوں اور ناشائستہ حرکتوں، خلاقی کمزوریوں اور نفسیاتی برائیوں کی کمی کا مشاہدہ آج بھی ہوتا ہے۔ بیہودگیاں اور ناشائستہ حرکتیں چھوڑ دینا ہی تزکیۂ نفس ہے۔ اور قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى جس نے نفس کا تزکیہ کر لیا وہ کامیاب ہو گیا۔
نماز کے ثمرات اور برکات کے متعلق حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک دفعہ بطور تمثیل فرمایا کہ اگر کسی شخص کے گھر کے آگے صاف شفاف نہر بہتی ہو اور وہ شخص اس میں پانچ وقت نہاتا ہو تو کیا اس کے بدن پر میل رہ سکتا ہے صحابہ نے عرض کیا۔ نہیں یا رسول اللہ۔ ارشاد ہوا۔ نماز بھی اسی طرح انسان کے گناہ دھو دیتی ہے۔
اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ۭ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ نیکیاں برائیوں کو دور کرتی ہیں۔ یہ نصیحت قبول کرنے والوں کے لئے ایک عمدہ نصیحت ہے۔
کم از کم نیکی کرتے وقت انسان کو بدی سے بچتے ہوئے ہم آپ بھی دیکھتے ہیں۔ نیکی کی مداومت بدی کا مستقلاً خاتمہ کر سکتی ہے۔ صحابہ کرام کی حالت یہی تھی کہ تجارتی کاروبار اور خرید و فروخت کے مشاغل انہیں اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتے تھے۔ ان کی شان میں اللہ کا ارشاد ہے۔ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ایسے لوگ جنہیں تجارتی کاروبار اور خرید و فروخت کے مشاغل اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتے۔
اسلام نے عبادت کی دو قسمیں رکھی ہیں۔ ایک عام تسبیح و تہلیل اور ذکر الٰہی۔ اس کے لئے نہ زمانے کی قید ہے، نہ مکان کی شرط ہے۔ نہ اٹھنے بیٹھنے کی پابندی ہے۔ یہ عبادت ہر قید و شرط کے بغیر، ہر لحظہ اور ہر صورت میں انجام پا سکتی ہے۔ دوسری قسم عبادت کی وہ ہے جو خاص شکل و صورت کے ساتھ، خاص اوقات میں ادا کی جائے۔ پہلا طرز عبادت انفرادی ہے۔ اسے جماعتی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ وہ تنہائی کا راز ہے۔ جس کو اس طرح خاموشی سے ادا کرنا چاہیئے کہ ریا اور نمائش کا شائبہ نہ پیدا ہو۔ دوسری قسم کی عبادت جماعتی اور متحدہ طریق کی عبادت ہے۔ اس کو جماعت میں شامل ہو کر ادا کرنا پڑتا ہے۔ پہلی قسم کی عبادت فرض نہیں ہے۔ دوسری قسم کی عبادت فرض ہے۔ اسے ادا نہ کرنے پر عاقبت میں بھی سزا ملے گی اور دنیا میں

بھی سزا مل سکتی ہے۔ اُسے جماعت کے ساتھ ادا نہ کیا جائے تو ثواب گھٹ جاتا ہے۔

نماز کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان کعبۃ اللہ کی سمت رُخ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ ذرا تصور کیجئے نماز کے واسطے کوئی سمت مقرر نہ ہوتی اور مسلمان جس سمت چاہتے رُخ کر کے نماز پڑھ لیا کرتے۔ کسی کا رُخ مغرب کی سمت رہتا کسی کا مشرق کی سمت اور کوئی شمال کی سمت رُخ کرتا اور کوئی جنوب کی سمت، تو کیسا بھونڈا منظر نظر آتا۔ میں نے ایک دعوت میں ایسا منظر دیکھا ہے۔ دسترخوان نہیں بچھایا گیا تھا۔ جو جہاں بیٹھا تھا وہیں اس کا کھانا رکھ دیا گیا تھا مجھے تو یہ منظر بڑا بھونڈا لگا۔ علاوہ بریں اس تصور سے جی الٹتا ہے کہ مختلف سمتوں میں نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ سلیقہ اور نظم ہی یہ ہے کہ مسلمان نہایت سیدھی صف بنائے اور کھوے سے کھوا ملائے ایک سمت رُخ لیے کھڑے ہیں۔ نماز کی یہ خصوصیت دنیا بھر کے مسلمانوں کو یک رُخی، یک جہتی اور یک رنگی سکھاتی ہے اور وحدت کا راستہ دکھاتی ہے۔ یہی نماز کی خصوصیت دراصل اقرار توحید کی عملی کیفیت کا اظہار ہے، خاص طریقے، خاص وقت اور خاص سمت اختیار کئے بغیر یہ ظاہر نہیں ہو سکتا تھا اور اسلام کی وحدت کا نظام قائم نہیں ہو سکتا تھا۔ نماز نے کروڑوں جسموں کو ایک جسم بنا دیا۔

انسان انسان کی تعظیم کرنا چاہتا ہے۔ یہ تو آپ نے دیکھا کہ جو جو جانتے ہیں نماز میں قیام تو بڑی تعظیم ہے۔ ہم اللہ کو اپنے روبرو دیکھتے ہیں یا کم از کم یہ ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ ہمارے روبرو ہے۔ ہم اللہ کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر اس کی کبریائی اور اس کا جلال ہم پر چھاتا ہے تو اس کے آگے جھک جاتے ہیں اور بالآخر اپنی عاجزی اور اپنا تذلل محسوس کر کے اس کے قدموں میں سر رکھ دیتے ہیں۔ کس قدر فطرت کے مطابق ہیں نماز کی حرکتیں اور کتنا تال میل ہے ان حرکتوں اور اُن دعاؤں میں جو نماز میں پڑھی جاتی ہیں۔ دعاؤں اور حرکتوں سے انسان عرض والتجا اور تذلل و عاجزی کی تصویر بن جاتا ہے۔

روح اور جسم دونوں اللہ کے مخلوق ہیں۔ انسانی زندگی کے یہ دونوں جز اللہ کے احسانات و انعامات سے یکساں گراں بار ہیں۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ روح اور جسم دونوں اپنے خالق اور اپنے پروردگار کے حضور تعظیم کو کھڑے ہوں جھکیں اور سجدہ کریں۔ تعظیم کی یہی تین صورتیں ہیں۔ چوتھی صورت طواف کی ہے جو نماز میں ممکن نہ تھی، وہ حج میں برتی جاتی ہے۔

لوگ تعظیم کی یہ صورتیں انسانوں، حیوانوں، نباتات اور جمادات کے ساتھ برتتے ہیں اور مسلمان اللہ اور صرف اللہ کے ساتھ جنھوں نے اپنی تعظیم اس صورت سے کرائی کہ اللہ کے بندے ہاتھ باندھے اور صفیں بنائے ان کے سامنے کھڑے رہیں اور ان کے آگے جھک رہے ہیں اور انہیں سجدے کر رہے ہیں انھوں نے اپنے آپ کو بھی تباہ کر لیا اور اپنی قوم کو بھی تباہ کر دیا۔ اور جو آج اپنی تعظیم کے لئے ان صورتوں کو پسند کرتے ہیں وہ بھی تباہ ہوں گے۔ دیر ہے، اندھیر نہیں ہے۔

ذرا ٹھہر جا مؤذن مرا دل لرز رہا ہے
کہیں کعبہ گر نہ جائے تری مستی اذاں سے

ماہرالقادری

"حُسنِ معصوم"

اک بتِ سیم بر، خوش ادا، خوش نظر
رشکِ سروِ سہی غیرتِ ماہِ فر

جس کی زلفوں پہ صدقے بر سی گھٹا
جس کے چہرے پہ قرباں طلوعِ سحر

چال سے جس کی شرمندہ کبکِ دری
چشمِ آہو پہ اک طنز جس کی نظر

شوخیاں سادگی میں سموئی ہوئیں
جیسے خوش تابیٔ موجِ آبِ گہر

مسکراہٹ لبوں پر مچلتی ہوئی
جیسے اک برق کی رَو اِدھر سے اُدھر

جس کی پائل سے بجنے لگیں چنگ و دف
جس کی رفتار اک موجۂ نغمہ گر

جس کے لہجے سے چھڑ جائیں سازِ طرب
جس کے جلووں سے آرائشِ بام و در

جس کی ٹھوکر سے ہونے لگے روشنی
غازۂ کہکشاں جس کی گردِ سفر

شادمانی سے جس کی فروغِ جہاں
جس کی افسردگی ظلمتِ بحر و بر

دلبری کے ہنر، دل ربائی کے فن،
ایسی باتوں سے بیگانہ و بے خبر

عصمتِ پاکبازی سے روشن جبیں،
حُسنِ غیرت سے رُخسار تابندہ تر

قابلِ اعتماد اک حسین زندگی
تیوروں سے عیاں سیرتِ معتبر

سر جھکائے ہوئے وہ گزرتی گئی
زخم جس کے لئے ہر ہوس کی نظر

ذرے قدموں کو چھو کر حسیں ہو گئے
رو کشِ آسماں بن گئی رہگذر

ضمیر نے چٹکی لی:- ہائے! وہ زندگی آہ، وہ شاعری جاہلیت کے ہوں جس میں باقی شرر

انوار ظہوری

تجلیاتِ انوار

آپ نے کی ترک جب سے دوستی — زندگی میں مستقل ٹھہراؤ ہے

سوچتا ہوں زندگی تیرے بغیر — مضطرب موجوں پہ تنہا ناؤ ہے

رہے کیا مصلحت اندیش کوئی — جوانی میں سلگ اٹھتے ہیں سینے

جو آدابِ نظر سے ہو نہ واقف — وہ کیا جانے محبت کے قرینے

اُجالا کر دیا ہر انجمن میں — مرے افکار کی تابندگی نے

دل نہ چاہے تو سر جھکانا کیا — روح کو شاملِ نماز کرو

اور کب تک یہ آتشِ سیّال — اہتمامِ مئے حجاز کرو

تماشہ بن گیا ہر آنے والا — یہاں کوئی تماشائی نہیں ہے

سوچتا ہوں ذرا دیر دم لوں — چھاؤں ہے اور بے حد گھنی ہے

لا کے منزل پہ وہ چھوڑ بیٹھے — رہبری ہے کہ یہ رہزنی ہے

آپ کے ہی روٹھنے سے مجھ کو اندازہ ہوا — دوستی میں بھی غلط فہمی کے امکانات ہیں

نہیں صرف ظلمت شب ہی ستیزہ کار اب تک — مری شام نیلگوں سے کئی اور بھی دھندلکے

یہ مصلحت کا تقاضا نہ تھا مگر پھر بھی — جو اُن سے بات ہوئی ذکر آگیا دل کا

مبالغہ نہیں انوارؔ واقعہ یہ ہے — تمہارے بعد نہیں ہے وہ رنگ محفل کا

کب تک بھری بہار میں آنسو بہائیں ہم — سوچا یہی ہے غم کا تمسخر اڑائیں ہم

یہ گل، یہ رنگ و بو، یہ فضائیں، یہ چہچہے — آؤ نئی بہار کا خاکہ سجائیں ہم

پردے میں ہر غزل کے انہیں سے ہے گفتگو — تصویر کھنچ رہی ہے محبت کی ہو بہو

انصاف کر یہ آگ بھی پینے کی چیز ہے — پیرِ مغاں شراب مرے سامنے نہ لا

کس جوش و ولولہ سے پتنگوں نے جان دی — ناموس انجمن کے لئے جب دیا جلا

چلنا سنبھل سنبھل کے قدم پھونک پھونک کے — نازک ہے زندگی میں جوانی کا مرحلہ

دنیا نہ آئے اہلِ محبت کے درمیاں — درکار اب نہیں ہے کوئی اور کربلا

شبستانِ تغزّل

تسکین قریشی

یہ کیا ادا تھی ہائے حسنِ خود بیں — دیکھا مجھے اور نظریں نہ اٹھیں
اہلِ خرد کی باتیں جو دیکھیں — پھر ہو گیا ہے دیوانہ تسکیں
کچھ زخمِ دل نے گلکاریاں کیں — کچھ زندگی تھی پہلے سے رنگیں
میرے جنوں سے سب باخبر ہیں — کیا لالہ و گل، کیا ماہ و پرویں
جب میں نے کی ہے فکرِ نشیمن — گھبرا گئے ہیں صیاد و گلچیں
آساں نہیں ہے دعوائے رندی — رندی کے بھی ہیں آداب و آئیں
ساقی کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہوں — ورنہ یہ مستی اور ہوش تمکیں
پھر بھی ہے تو، ہی مقصودِ ہستی — او دشمنِ دل، غارت گرِ دیں
اکثر سنا ہے اربابِ دل سے — تسکیں سے مل کر ہوتی ہے تسکیں

ماجد النیب بریلوی

دلکو تری یادوں سے ارم ہم نے بنایا — بت خانۂ عالم کو حرم ہم نے بنایا
ہر دل میں محبت کے دئے ہم نے جلائے — انسان کو شائستۂ غم ہم نے بنایا

صبا متھراوی

بے رنگ و بے نمو نہ ہوں پروردگار ہم — ہیں اس بھرے چمن میں امینِ بہار ہم
تیرے نثار اے غمِ جاناں مدد مدد — اب ہو چلے شکارِ غمِ روزگار ہم
لاکھوں چھپے ہوئے ہیں ابھی ہم میں آسماں — گو تیرے آستاں پہ ہیں مشتِ غبار ہم
کیا کیا نہ آئے صحنِ گلستاں میں انقلاب — ہر رنگ دیکھتے رہے آئینہ دار ہم
کانٹے بھی چوم چوم کے دامن میں رکھ لئے — پھر بھی رہے چمن کی نگاہوں میں خار ہم

جوانی کی غزل گر تجھ کو کہئے — تو اس تازہ غزل کی میں زمیں ہوں
مرے مٹنے سے مٹ جائیگا گلشن — میں تاریخِ گلستاں کا امیں ہوں
غمِ دوراں پہ ناہیں، لگتا ہے — غمِ جاناں کا جب سے خوشہ چیں ہوں
محبت مجھ سے تابندہ رہے گی — محبت کی انگوٹھی کا نگیں ہوں

سبط فاروق ایم۔ اے

ادبی راہیں

تاریخ ایک اہم مسئلہ کی جانب رہنمائی کرتی ہے۔ ہر سوسائٹی ملک و قوم تمدن و معاشرت [illegible] کے ادب [illegible] کی [illegible]
مواد یہ عقیدت دیومالا کی صورت میں ہو، یا خیر و شر کی قوتوں کے روپ میں یا خیر و شر کے خالق کے تصور کے [illegible] ادب کی
آبیاری ہوتی ہے۔ جب ادب کا حسین و نازک پودا بادِ سموم کی تندی، موسم کی شدت، باغبان کی [illegible]
ہے۔ اس وقت زیرِ زمین محوِ خواب سوت، چشمے ہی اس کی آبیاری کرتے ہیں اور حیات تازہ بخشتے ہیں [illegible]
نشاۃ ثانیہ، رفارمیشن، کلاسکی، رومانٹک اور بعد کے دور میں یہ عقیدت بہ سایہ ازلین یہ مذہبی قصے [illegible]
سے کارفرما رہی ہیں۔ اگر انگلش ادب سے بائبل اور یونانی [illegible] سرمایہ خارج کر دیا جائے تو [illegible]
FREAK OF NATURE بن جائے [illegible]

اب اپنے اردو ادب ہی کو لے لیجئے، عوامل خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں [illegible]
سے ہم رشتہ ہے۔ خواہ اس کی تخلیق میں کشمیری پنڈتوں، کایستھوں اور کالوں کا کتنا ہی بڑا حصہ کیوں نہ ہو۔ [illegible]
میں چند تفریحی تصانیف کو چھوڑ دیجئے۔ تمام تر سرمایہ اخلاق، مذہب اور تصوف پر مشتمل ہے۔ ان چند تفریحی کتب [illegible] فسانہ
عجائب، الف لیلی، فسانہ آزاد، داستان امیر حمزہ، داستان ہوشربا، قصہ چہار درویش کو انگلیوں کے پوروں پر گن لیجئے [illegible] ادب
کی سلامی مصطلحات، اسلامی روایات اور مسلم پس منظر سے ہم آشنا ہیں۔ خود امانت راجہ اندر کو کوہ قاف [illegible] اور مسلم روحی کردار
بنا کر پیش کر دیا۔ نثر میں باقی جتنا ادب ہے وہ کم تر فن شعر پر تنقید ہے۔ اور زیادہ تر اخلاق، تصوف، مذہب پر [illegible]
کا ترجمہ قرآن اپنے وقت کا بامحاورہ ادب ہے۔ شاہ اسمعیل شہید، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا فضل حق [illegible]
غلام علی غوث، سرسید، حالی، شبلی، نذیر احمد، ذکاء اللہ، مولوی چراغ علی، محسن الملک، راشد الخیری، عبد [illegible] ندوی
عبدالماجد دریابادی، اسمعیل میرٹھی، اقبال، شرر، ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، سالک، مہر، ابوالاعلیٰ مودودی جیسے آسمانِ نثر کے روشن
ستارے گنے شمار کئے جائیں، ان کے زاویہ ہائے نظر مختلف ہوں مگر اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ سب [illegible] کی ادب
کے علم بردار ہیں۔ اور اگر ان کا بخشا ہوا سرمایہ اردو ادب سے خارج کر دیا جائے تو اردو نثر [illegible] رہ کیا جائے گا۔

نثر کے بعد شاعری کو لیجئے۔ کیا قدیم اور کیا جدید شاعری، اگر ترقی پسندوں کے "ادبی جمناسٹک" ادب اور فن سے کشتی [illegible]
نظر انداز کر دی جائے تو شاعری میں دو متوازی رجحانات شروع سے ملتے ہیں۔ ایک خالص مذہبی، اخلاقی، متصوفانہ اور دوسرا [illegible]
حکایت مجاز، قصہ حسن و عشق اول الذکر شاعری ہر صنف سخن میں خواہ وہ مثنوی ہو، غزل ہو، قصیدہ ہو، رباعی و قطعہ ہو، نظم ہو یا
نعت ہو، مرثیہ ہو، رجزیہ ہو، رجزیہ ہو یا طربیہ ہو بطور وافر موجود ہے۔ ہر شاعر کے دیوان کی ابتدا حمد و نعت سے ہوتی ہے
اور اس طرح ولی، شاہ حاتم، میر سودا، خواجہ میر درد، ناسخ، آتش، مصحفی، انشا، ذوق، غالب، مومن، ظفر، انیس، دبیر،
داغ، امیر مینائی، محسن کاکوروی، شبلی، حالی، اکبر، اقبال، محمد علی، ظفر علی خاں، حسرت، جگر، وحشی اور ماہر القادری سب کا مذہبی

شاعری میں کچھ نہ کچھ حصہ ہے اور یہی شعرا مرد میدان سخن ہیں، مذہبی شاعری خواہ غزل کے اندر کسی واحد شعر میں تراوش کرے یا نظم، رباعی، تشبیب وغیرہ میں یہی شاعری ہی ان کے معتقدات کا آئینہ اور ان کے فن کا سنجیدہ دار داتی پہلو ہے۔ اور یہی ان کی واقعیت نگاری (REALISM) ہے۔ باقی سب محض روایت پسندی ہے۔

یہ روایت پسندی جدید روحانیت پرستی سے ممیز مجاز کے روپ میں ڈھل کر نمودار ہوتی ہے خود مجاز کی اصطلاح اس کا اتا پتا دیتی ہے کہ شاعر سے واقعیت اور حقیقت سے دور سمجھتا ہے۔ یوں تو حکایت حسن و عشق مجاز کی بے راہ روی عیاں ہے مگر پھر بھی جرأت اور انشا وغیرہ کو چھوڑ کر لذتیت اور نفس کی دراز دستیوں سے ذرا دوری ہی ملتی ہے۔ مقصود روایت کا تتبع ہے، پھر بھی ان شعر میں نہ کوئی جوش اور یگانہ چنگیزی ہے۔ اور نہ کوئی "ترقی پسند" ہے۔ ایک بنیادی امر سب کے روبرو ہے کہ :-

کچھ نہیں یاد رہے پر یہ دعا ہے کہ امیرؔ ؛ نزع کے وقت سلامت مرا ایمان رہے

کسی میں یہ جرأت نہیں کہ اسلامی قدریں ٹھکرائے، کفر اور ایمان کی قدریں مسلّم ہیں۔ ایمان کو چیلنج نہیں کیا جاتا۔ کفر، کفر ہی رہتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایمان سے شوخیاں کری جائیں اور شاہد و شراب گلے لگا لئے جائیں، دین و مذہب پر چھینٹے ہرگز مقصود نہیں طنز شیخ ریاکار، واعظ ضرور ہے، ریاکاری مذہب عشق میں حرام ہے، ورمنافقت کفر سے بدتر ہے۔ اسی لئے اس قسم کی شاعری کا ایک مستحسن پہلو ضرور ہے یہی کہ صداقت حسن و خلوص نیت کا طلب، تمام رنگ رلیاں جس قدر قبیح ہیں وہ ظاہر ہیں۔ مگر جب شاعر کہتا ہے :-

میرؔ کے دین و مذہب کو کیا پوچھو ہو ان نے تو ؛ قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

تو کفر کو ایک نا پسندیدہ امر ہی فرض کر کے شعر کی عمارت تعمیر کرتا ہے۔

غالبؔ جب کہتے ہیں :- ؎ دوزخ میں ڈالدے کوئی لیکر بہشت کو

تو جبر و بہشت مقصود نہیں بلکہ "ایسی بہشت" مردہ ہے جس کے حصول کے لئے اخلاص اور رضائے الٰہی کو پس پشت ڈالدیا جائے۔

ایک فاسقانہ شعر ہے :-

زاہد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر ؛ یا وہ جگہ بتا دے جہاں پر خدا نہ ہو

یہاں بھی خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا تصور ہے۔

داغؔ حضرت جبرئیل میں ڈوب کر کہتے ہیں :-

تعریف سے کوثر کی مجھے خوب پلائی ؛ کیا بات ہے واعظ تری عقبیٰ کا بھلا ہو

یہاں بھی عقبیٰ کا تصور موجود ہے، اگر متصوفانہ تاویل کیجئے تو طالب مولا اور طالب عقبیٰ کے فرق کی طرف اشارہ بھی ہو سکتا ہے۔

میرے خیال میں فاسقانہ شاعری کی یہ سب سے کریہہ ترین مثالیں ہیں مگر ایمان کی قدروں کو چیلنج نہیں کیا گیا۔ شاعر ایمان کی اچھائی اور کفر کی برائی ہی ذہنی طور پر فرض کر کے آگے بڑھتا ہے، اور شوخئ رندانہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ وہ اس میدان میں کھیلتا ہے، خوب کھیلتا ہے مگر پھر بھی اس تسلیل احساس سے خالی نہیں رہتا کہ ایمان کا تازیانہ پیچھے ہے۔ وہ ضرور کفر کی کشش کا شکار ہوتا ہے۔ مگر وہ کہ سرکشی سہی، بنیادی تصورات سے بغاوت ناممکن ہے۔ وہ برائی کو برائی سمجھ کر اسکا متبع ہوتا ہے برائی کو اچھائی سمجھ کر نہیں۔

لہ فاضل مضمون نگار ان لوگوں میں سے ہیں، جن کو ہر چیز میں خیر ہی خیر نظر آتا ہے، اور جن کی نگاہ عیب بیں نہیں بلکہ حسن شناس ہوتی ہے، اور جو "خیر و حسن" کے جویا (ریسرچ اسکالر) ہوتے ہیں۔ (م - ق)

بقولِ غالب :

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد ؛ پر طبیعت ادھر نہیں آتی

پھر بھی غالب پکار اٹھتے ہیں :

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب ؛ شرم تم کو مگر نہیں آتی

اس کے علاوہ یہ تمام روایتی ، مجازی شاعری اسلامی مصطلحات سے مملو ہے اور مصطلحات خود ایک وسیع پس منظر، ور ماحول کا مظہر ہوتی ہیں ۔ ایک اصطلاح خود ایک داستانِ دراز کا MINIATURE ہوتی ہے ۔ اردو شاعری خصوصاً غزل (جہاں فسق فاسق خوب رچایا گیا ہے) کی جان یہ اصطلاحات یا علامتیں ہیں ۔ ان علامتوں مصطلحات ، تشبیہوں ، ستعاروں ورکنایوں کو کہاں تک شمار کرایا جائے ۔ خود شراب و شاہد و نغمہ ، دیر اور بت کا پس منظر مذہبی تصورات سے عاری نہیں ہے ۔ اور مذہبی قدروں ۔ کو سمجھے بغیر یہ مصطلحات یا علامتیں واضح نہیں ہوتیں ۔ جس طرح رات کا تصور دن یا سورج کے تصور کے بغیر نہیں ہو سکتا ۔ اس کے علاوہ خالص دینی اصطلاحات مثلاً ایمان ، کفر ، عقبیٰ ، بہشت ، جہنم ، رضوان ، حور ، غلماں ، فرشتہ ، روح الامین ، ملک الموت ، جبریل ، پل صراط ، محشر ، خدا ، کائنات ، صنم کدہ ، صومعہ ، گبر و ترسا ، چادرِ زہرا ، ردائے مریم ، صبرِ ایوب ، دامنِ یوسف ، زندانِ مصر ، شہید ، عابد ، زاہد ، واعظ ، ناصح ، محتسب ، کعبہ و دیر ، طورِ سینا ، نارِ نمرود ، گلزارِ خلیل ، تسلیم و رضا ، توکل و قناعت ، شہادت ، پردہ ، حجاب ، نقاب وغیرہ وغیرہ کو اردو شاعری سے خارج کر کے دیکھئے ، پھر دیکھئے کلاسیکل شاعری کس قدر تہی مایہ ہو کر رہ جاتی ہے ۔

اس تفصیلی بحث نے یہ واضح کر دیا کہ ادب میں اسلام کی ، مذہب کی جڑیں کس قدر مضبوط اور گہری ہیں ۔ اب سوال پودے کی آبیاری کا ہے ، فکر آبیاری بھی اس لئے ہے کہ جدید ماحول کے تقاضے جدا ہیں ۔ اردو ادب مختلف بیرونی یا ناسازگار تحریکوں کی زد میں ہے ایک جانب جدید رومانیت نے جنسی بے راہ روی کو ہوا دی ہے اور دوسری جانب معاشی بدلگامی ادب پر تابڑ توڑ حملے کر رہی ہے ۔ ہر دو تحریکوں کی دو طرفہ پیشقدمی سے اسلامی قدروں کو پامال کرنے کے درپے ہیں ۔ اور اسی خطرے سے مدافعت کے لئے اسلامی تعمیری ادب کی تحریک بروقت اور برمحل رونما ہوئی ہے ۔ اب سے پہلے ادب اسلامی احیائی تحریکوں سے متاثر ہوتا رہا ۔ خواہ وہ سرسید کی تحریک ہو یا جمال الدین افغانی کی تحریک ، خواہ مجددی تحریک ہو یا ولی اللّٰہی تحریک ، خواہ خلافتی تحریک ہو یا پاکستانی تحریک ، لیکن اب ادب نے براہ راست بیرونی سیاسی معاشرتی تحریک کے دوش بدوش خود ایک تعمیری تحریک کو جنم دیا ہے ۔ یہ تحریک ابھی اپنے شیرخوارگی یا طفولیت کے دور میں ہے ۔ یہ تحریک منصب داری یا ملوکیت کے دور کے برخلاف ایک جمہوری عوامی دور میں پیدا ہوئی ہے اور جمہوری دور میں کیفیت کی جگہ کمیت لے لیتی ہے ۔ مگر اسی کمیت ، اسی کثرت سے انجام کار گوہر یکدانہ ابھرا کرتے ہیں ۔ یہاں پر ایک مثال یاد آتی ہے ، مولانا محمد قاسم نانوتوی اپنے دو شاگردوں ، مولانا احمد حسن امروہوی اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے متعلق فرمایا کرتے تھے محمود الحسن بہت ہے مگر چاندی اور احمد حسن تھوڑا ہے مگر سونا ۔ آج سونے کی بجائے چاندی کا دور ہے ، کثرت اچھی چیزیں آنکھ سے چھپا دیا کرتی ہے ، رطب و یابس کی بہت گنجائش ہوتی ہے اور خامیاں زیادہ نمایاں ہوتی ہیں ۔ یہ ایک تجرباتی عہد کا خاصہ ہے ، مگر اس دور کے تجربے ہی ترقی کے ضامن ہوتے ہیں ، اور جمود شکن ہوتے ہیں ۔ مذہبی عمارت کی پوری تصویر مگر یہ کیا کم ہے کہ معمار مصروفِ تعمیر ہیں ، مذہبی تعمیر میں پوری صفائی اور فنکاری ، سادگی اور پرکاری ! جذبہ اور عمل تو ہے ، یہ جذبہ اور عمل فنی شاہ پاروں میں کبھی نہ کبھی تشکیل پذیر ہو ہی جائے گا ۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ جذبہ و عمل کے بھٹکنے کا امکان نہیں ۔ فنی راہیں تو متعین کرنا ہی پڑیں گی ۔ یہ فنی راہیں کیا ہونگی ، کس حد

تک ماضی کی فنی قدریں رہنما ثابت ہوں گی اور کس قدر جدید اصولوں اور قدروں کو اپنانا ہوگا یہ فیصلہ تو کرنا ہی ہوگا، یہ فیصلہ ظاہر ہے یکبارگی نہیں ہوسکتا خود اس فیصلہ کے لئے ان گنت تجربے درکار ہونگے۔ پھر بھی انفرادی طور پر نشانِ راہ یا چراغِ راہ پیش کئے جاسکتے ہیں

ان چراغ ہائے راہ کے پیش کرنے میں ایک اسلامی ادیب یا ناقد کو کچھ سہولتیں بھی مہیا ہیں، وہ جانتا ہے کہ اسلامی ادب کی جڑیں اردو میں مضبوط ہیں اور ماضی سے اگر وہ بیگانہ ہونا چاہے بھی تب بھی وہ ایسا ہرگز ہرگز نہیں کرسکتا۔ اس کے علاوہ اس کے روبرو جدید مغربی ادب اور فن کے گوناگوں تجربے اور شاہکار بھی ہیں۔ خود اُردو ادب بھی ان تجربوں سے تہی دامن نہیں۔ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جدید فرائڈی اور مارکسی جنسی و معاشی، رومانوی اور اشتمالی تحریکوں نے مسابقت کے سبب اردو ادب کو فن اور اسلوب کے اچھے نمونے و تجربے پیش کئے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ مغرب کی کوئی فنی یا ادبی تحریک دس بیس سال کے بعد اردو ادب میں جگہ پاتی ہے۔

بہرحال اسلامی تعمیری ادیب اور شاعر اپنے کردار کے لحاظ سے گلچیں بھی ہے اور باغباں بھی، شہد کی مکھی کی طرح اسے تو پھول، حُسن اور خوشبو سے محبت ہے، جہاں کہیں بھی پھول ہوگا یہ اڑکر پہنچے گی اور پھول کے رس کو شہد بناکر چھوڑے گی یا یوں کہہ لیجئے کہ یہ مالی چمن چمن جاتا ہے اور اپنے باغ کے لئے گل بوٹے جمع کرتا ہے۔ ان گل بوٹوں پر خود نئے تجربے کرتا ہے۔

اس تخلیق اور تربیت اس باغبانی کے لئے اسے نقد و نظر کھوج اور پرکھ کی ضرورت ہے، کھوج بھی ایک قسم کا تجربہ ہی ہے، اور اسی سے پرکھ بھی پیدا ہوتی ہے، ان تجربوں کی نشاندہی انفرادی سطح پر ہی کی جاسکتی ہے اور ہماری انفرادی رائے میں اگر قدیم اور جدید ادب کھنگالا جائے تو اسلوب نگارش کے دو ممیز نشان ملتے ہیں۔ راہِ شعر میں غزل اور میدانِ نثر میں افسانہ۔

یہاں ہمارا اشارہ تخلیقی ادب سے ہے نہ کہ تنقیدی ادب سے۔ تخلیقی ادب میں ہم نے غزل اور افسانہ کا انتخاب کیا ہے، ممکن ہے یہ انفرادی اپج ہو مگر ایک انفرادی رائے بھی اپنے اسباب رکھتی ہے۔

غزل اردو، فارسی ادب کی مخصوص تخلیق ہے۔ یہ غزل ہی کی خصوصیت ہے کہ اس کا ایک شعر ایجاز بیان کی جان ہوتا ہے اور ایک پورے مضمون، پوری حکایت، پوری وارداتِ قلبی کا حامل ہوتا ہے، ایک شعر میں پوری دنیا نہاں ہوتی ہے، ایک چھوٹا سا جرعہ کیف مکمل بخشتا ہے، ایک چھوٹے سے جام میں پوری روحِ بادہ ہوتی ہے۔ تکمیلِ احساس کا ایسا نازک لطیف، جامع و بالغ آرٹ نظم، رباعی، قصیدے، قطعے، مثنوی، سانیٹ وغیرہ میں کہاں؟ نظم میں تو بعض اوقات احساس پھیل کر منتشر ہی ہوجاتا ہے۔ احساس کی نزاکت اور لطافت غزل اور اس کے ہر شعر کی جان ہوتی ہے مگر روحِ غزل کے لئے قالب بھی چاہیئے۔

یہ احساس، یہ جانِ غزل، یہ جذبات و حسیات کا محشر اگرچہ داخلی ہوتا ہے مگر اس حقیقت سے بھی آنکھ نہیں چرائی جاسکتی کہ اپنا احساس ماحول سے ہٹ کر خام اور ناپختہ ہی رہتا ہے۔ احساس میں پختگی اسی وقت آتی ہے جب اپنا احساس، احساسِ غیر اور احساسِ کائنات کے تہ یک جان ہوجائے۔ اپنے احساس کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ فنکار احساسِ عالم، احساسِ کائنات، احساسِ غیر میں ڈوبے اور ڈوب کر ابھرے اس کے لئے کھوج، کرید اور مطالعہ کی ضرورت ہے اس احساس کی پختگی کے لئے تعمیری ادیب کو روایتی گھسے گھسے یا تنگ اور محدود قدیم ماحول سے نکلنا ہوگا اور نئے دائرہ فکر و تجسس کے توسط سے احساس میں گہرائی اور گیرائی پیدا کرنی ہوگی۔ اور احساس کی تکمیل اور اس احساس کی ادائیگی کی پختگی کے لئے غمِ جہاں اور حسنِ مآل کو اپنانا ہوگا۔ اور اسی سے احساس کی نزاکت اور لطافت میں جلا اور تازگی پیدا ہوگی احتیاط صرف یہی پیشِ نظر رہے گی کہ کہیں جدت اور اپج غزل کا مزاج پراگندہ اور درہم برہم نہ کردے۔ اور تراش خراش نزاکت و لطافت کو مجروح نہ کردے۔

ہوچکی شام شفق باقی ہے ؎ اب بھی آجا کہ رمق باقی ہے

دیکھئے کہیں یہ "رمق" جدید غزل سے نہ جاتی رہے۔

چارۂ دل سوائے صبر نہیں ؛ سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

اس "تمہارے سوا" کا لطف ہوا نہ ہو جائے۔

باغباں دل میں بھری ہیں تری کیا کیا باتیں ؛ آشیاں جل کے کہیں اور بنالوں تو کہوں

ان "کیا کیا باتوں" کا کہیں پوسٹ مارٹم (POST MORTEM) نہ کر دیا جائے۔

اے قفس تجھکو کس طرح پھونکوں ؛ یاد آتا ہے آشیاں اپنا

اس شعر جیسی معنوی خوبی مجروح نہ ہو جائے۔

چند شعر اور حاضر ہیں :-

جاؤ بھی کیا کرو گے مہر و وفا ؛ بار ہا آزما کے دیکھ لیا

سب ہنس پڑے کھل کھلا کے غنچے ؛ چھیڑا جو لطیفہ اک صبا نے

سنا ہے حشر میں شانِ کرم بے تاب نکلے گی ؛ لگا رکھا ہے سینے سے متاعِ ذوقِ عصیاں کو

حسن ہزار طرز کا ایک جہاں اسیر ہے ؛ ملحدِ باخبر بھی گم جلوۂ لاالٰہ میں

دل بھی اے دردؔ قطرۂ خوں تھا ؛ آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

یارب یہ کیا طلسم ہے ادراک و فہم یاں ؛ دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ جا سکے

شام بھی ہو چکی کہیں اب تو ؛ آشنائی کہ رات جاتی ہے

ٹک خبر لے کہ ہر گھڑی ہم کو ؛ اب جدائی بہت ستاتی ہے

دردؔ اس کی بھی دید کر لیجئے ؛ نوجوانی یہ مفت جاتی ہے

اٹھتی نہیں خانۂ زنجیر سے صدا ؛ دیکھو تو کیا سبھی یہ گرفتار سو گئے

دوستو دیکھا تماشا یاں کا بس ؛ تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے

دردؔ کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب ؛ کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

کہتے تو ہو یوں کہتے، یوں کہتے جو وہ آتا ! ؛ سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

متصل روتے ہی رہیئے تو بجھے آتشِ دل ؛ ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں

آگے دریا تھے دیدۂ تر میرؔ ؛ اب جو دیکھو سراب ہیں دونوں

دل پر خوں کی اک گلابی سے ؛ عمر بھر ہم رہے شتابی سے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے ؛ اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

کام تھا عشق میں بہت پر میرؔ ؛ ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے ؛ یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

سرسری تم جہان سے گزرے ؛ ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے ؎ پچھتاؤ گے سنو ہو، یہ بستی اجاڑ کے

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے ؎ یعنی آگے چلیں گے دم لیکر

دیں پاکیٔ دامن کی گواہی مرے آنسو ؎ اس یوسف بیدرد کا اعجاز تو دیکھو

بیٹھ سو دہائے صنم پر دم و داغ ؎ مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

نام عشق بتاں نہ لو مومن ؎ کیجئے بس خدا خدا صاحب

طبیعت اس تصور سے بہت مایوس ہوتی ہے کہ بے یادِ خدا بھی زندگی محسوس ہوتی ہے

آگ دوزخ کی بھی ہو جائے گی پانی پانی ؎ جب یہ عاصی عرق شرم میں تر جائیں گے

وذیرب تا کجا یہ بت پرستی ؎ کسی دن تو بھلا یا دِ خدا کر

جہادِ نفس بھی ہے اے تب لیکن بہت ؎ بڑا ہی معرکۂ کارزار باقی ہے

بے ذوقِ ادب مست ہے مومن رہا کا ؎ لغزش ہے قلم کو جو لکھا نام خدا کا

احساں ہے اثیر چشم تر کا ؎ نامے کی سیاہی دھو رہی ہے

حضرت خضر جب شہید نہ ہوں ؎ لطفِ عمرِ دراز کیا جانیں

جائے گی لیکے اجل اپنے ہی مرکز کی طرف ؎ مشکل کی جا ہے کہیں اور نہ جانا ہوگا

غرض غزل ایک شیشۂ نازک ہے، یہ آبگینہ ٹھیس کے لئے کہاں؟ اندازِ غزل تو قطرے میں احساس کا دریا سموتا ہے احساس کا یہ سمٹاؤ نظم میں کہاں؟ جس کی بنیاد ہی احساس کا پھیلاؤ ہے۔ نشتر کی کسک نیزہ کہاں سے لائے؟

ع　یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

غزل کا یہ تیکھا انداز، یہ قطرے کا سازِ انا البحر ہونا مخصوص ممیز اسلوب، استعاروں، کنایوں، تلمیحوں، اشاریت اور رمزیت، الفاظ کے انوکھے دروبست، تراکیب کی لطافت و بلاغت پر موقوف ہے۔ اس لحاظ سے غزل کا میدان ناپیدا کنار ہے، اسی رمزیت و اشاریت کو تصوف نے اپنایا اور غزل سے یک جان ہو گیا۔ اکبر نے اپنے طنز کا تانا بانا اسی سے بنا اور منقار، طائر، صیاد، جال، حلقہ جیسی فرسودہ علامتوں سے مثال کے طور پر اس قسم کے بلند مضامین جلوہ گر کر دیئے ؎

اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا
طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

فلسفہ جیسا خشک موضوع بھی انہیں شعری علامتوں، اسی رمزیت اور اشاریت، ان ہی لطیف تلمیحوں اور کنایوں، غزل کی تیکھی ادا سیکھ گیا۔ اور اپنا مظہر غالب و اقبال کو بنا دیا۔

اسلامی ادب، تعمیری ادب کی تحریک کو بھی رمزیت اور اشاریت، استعاروں، کنایوں، تلمیحوں کو اپنانا ہوگا۔ براہ راست بات کہنے کے لئے نظم ہے مگر غزل کا مزاج قائم رکھنا ہوگا۔ ہمارا یہاں یہ مقصد نہیں کہ محض چند علامتوں کو نعرہ (SLOGAN) بنا کر ان پر اکتفا کر لیا جائے، غزل کی روح تنوع ہے۔ یہ گوناگوں گل رنگی ہی غزل میں جان ڈالتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ اصطلاحیں، یہ تلمیحات، یہ "علامتیت"، یہ اشاریت، یہ رمزیت اپنی جگہ کچھ نہیں اگر مقصد سے بیگانہ ہے حسن ادا کو، مقصد کے سانچے میں ڈھلنا ہوگا، یا مقصد کو حسن ادا کے سانچے میں، کسی طرح کہہ لیجئے بات ایک ہی ہے۔ مدعا۔ طرزِ ادا کو مقصد سے یک جان کرنا ہے۔ اس طرح

(باقی مضمون ص۵۰ پر دیکھئے)

دردِ سر دوسرے ہر قسم کے درد اور
نزلہ و بخار کیلئے
انلجین ٹکیاں
ANALGIN
Opal
ہر قسم کی کھانسی
سے فوری
نجات
کیلئے
کفسول شربت
صحت اور
توانائی
کیلئے
فروٹ سیلائن
لیکسال
اوپل لیبار یٹریز لمیٹڈ کراچی

ہماری نظر میں

ان دیکھی حقیقتیں

از:- کوثر نیازی ، ضخامت ۱۹۰ صفحات ، مجلد خوبصورت گرد پوش کے ساتھ ، قیمت دو روپے آٹھ آنے
ملنے کا پتہ :- آئینۂ ادب چوک مینار ، انار کلی ، لاہور ۔

جناب کوثر نیازی ایک جواں سال پسندیدہ شاعر ہیں ، اور جن کی فکر و نظر کی نشوونما اور سیرت و کردار کی تعمیر اسلامی ماحول میں ہوئی ہے ، یہ کتاب عام فہم انداز اور سادہ زبان میں لکھی ہے ، توحید ، رسالت اور آخرت —— اس کتاب کے عنوانات ہیں ، ان عنوانات کو بڑے دلنشین انداز میں پھیلا کر بیان کیا گیا ہے جس کے مطالعہ سے دل میں یقین و ایمان کی کیفیت پیدا ہوتی ہے ، چند ذیلی عنوانات سے کتاب کی اہمیت و افادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔

انسانی زندگی پر عقیدۂ توحید کا اثر —— رسالت کی ضرورت —— صداقت انبیاء کی دلیل —— ختم نبوت ، رسالت محمدی کی امتیازی حیثیت —— عقیدۂ آخرت کی اہمیت —— سائنس اور عقیدۂ آخرت —— خوفِ آخرت !

کتاب پر تعارف مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب نے تحریر فرمایا ہے اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی اس کتاب کی بہت تعریف کی ہے ۔ فرماتے ہیں " آج کے جدید ذہن کو اس طرح تفہیم کی ضرورت تھی ، یہ کتاب انشاء اللہ بہت سے لوگوں کے لئے ذریعہ ہدایت ثابت ہوگی "

خطاطی اور ہمارا رسم الخط

از:- سید یوسف بخاری دہلوی ، ضخامت ۲۱۳ صفحات ، خوشنما ٹائپ میں ، مجلد مع گرد پوش کے ساتھ قیمت تین روپے آٹھ آنے ، بلا جلد تین روپے ۔
ملنے کا پتہ :- ایچ ، ایم ، سعید کمپنی ناشران و تاجران کتب ، پاکستان چوک ، کراچی ۔

جناب سید یوسف بخاری دہلوی پاکستان میں ، افسوس ہے کہ گمنام ہو گئے ہیں ، تقسیم ہند سے قبل دہلی حلقوں میں ان کا خاصہ تعارف تھا ، پاکستان میں غالباً ان کی یہ پہلی کتاب منظر عام پر آئی ہے اس کتاب میں فن خطاطی کی تاریخ خط سریانی ، حمیری ، و رہیکونی سے لے کر خط نستعلیق تک پیش کی گئی ہے ، اور مشہور خطاطوں میں یاقوت اول ([illegible]) سے لیکر اس زمانہ کے منشی محمد یوسف اور ان کے نامور شاگرد منشی عبد المجید دہلوی تک کے مختصر حالات بیان کئے گئے ہیں ۔ کتاب میں خطوط کا ایک شجرہ بھی دیا گیا ہے ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلطان مقوقس والی مصر کو جو فرمان بھیجا تھا اس کا بھی عکس تحریر اس میں ملتا ہے ۔ بعض خطاطوں کی وصلیوں کے نمونے بھی کتاب میں اپنی بہار دکھا رہے ہیں ، یہ پورا باب معلومات افزا ہے —— مصنف کی تحریر کے دو مختصر اقتباس یہاں پیش کئے جاتے ہیں ، جن سے ان کی نگارش دانشورانہ کی خوبیوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔

" یہ پرزہ کاغذ آغا رشید کے حق میں سچ مچ کاغذی پیرہن ثابت ہوا جب یہ پیکر تصویر غم
بادشاہ کے روبرو حاضر ہوا تو شوخیٔ تحریر خود منہ سے بول اٹھی ، نقش خود فریادی بن گیا "
" گلزار خطوط میں بہادر شاہ نے جو قلمیں لگائیں اور ان سے جو گل بوٹے کھلے

۱؎ صفحہ ۹۰ پر " نقطۂ اعتدال " کو نکتہ اعتدال لکھا ہے ، یہ کتابت کی غلطی ہو سکتی ہے ۔ مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوتی (باقی نوٹ اگلے صفحہ پر)

ان میں بہت سے بادِ سموم کے جھونکوں سے مرجھا گئے جو باقی ہیں وہ اُس کی زندہ بہار او ادبی یادگار ہیں ۔"

کتاب کا دوسرا حصہ "ہمارا رسم الخط" بہت اہم اور وقت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے ۔ اس میں فاضل مصنف نے دلنشیں دلیلوں کے ذریعہ اس حقیقت ثابتہ کو اور زیادہ موثق کر دیا ہے کہ اردو زبان کے لئے عربی رسم الخط ہی ہر طرح موزوں ہے ور رومن رسم الخط اردو زبان کو تباہ کر دے گا ۔

صفحہ ۶۵ پر عہد شاہ جہانی کے خطاط منشی چندر بھان دہلوی کا سنہ وفات ۱۸۰۳ء لکھا ہے جو درست نہیں ہے ۔ صفحہ ۸۲، پر علامت تنوین کے سلسلہ میں جو یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ "نسلاً" کے بجائے "نسلن" ٹائپ میں لکھا جا سکتا ہے ۔ اس سے ہمیں اتفاق نہیں ہے ۔

جناب سید یوسف بخاری دہلوی اس کتاب کی تصنیف و تدوین پر تحسین و تبریک کے مستحق ہیں ۔

بقیہ نوٹ صفحہ ۵۶ سے آگے ۔ "کتابیات" میں تفسیر حقانی کو مولانا عبدالحق محدث دہلوی کی تصنیف بتایا گیا ہے ۔ تفسیر حقانی کے مصنف مولانا عبدالحق حقانی ہیں اور یہ کتاب اسی چودھویں صدی ہجری میں لکھی گئی ہے ۔

لہ "گل بوٹے" بولتے اور لکھتے ہیں ۔ "واو عطف" کا استعمال محل نظر ہے

بقیہ مضمون صفحہ ۵۵ سے آگے ۔

کہ یہ اصطلاحیں، یہ علامتیں مقصد کے لئے مخصوص و ممیز ہو کر رہ جائیں ۔ ہمارے ذہن میں بھی چند اصطلاحیں یا تراکیب الفاظ آئی ہیں کاش حسن قبول حاصل ہو ۔ یہ اصطلاحیں ہیں :-

حسن مآل، نسیم سحر، گلبانگ مقصد، ثبات جادہ، زلال آرزو، فتنۂ عالم (مارکسزم کے متعلق)، بالش خور (بدید روما نیت کے متعلق)، کاکل برہم (زمانہ کے متعلق)، زلف پرخم (مسائل کی پیچیدگی، راہ کی دشواری کے متعلق)، تصور حبیب، ہم صفیر، گلشن وفا، نشۂ الفت، خیر العمل، اعجاز عیسوی، بخت بیدار، سلسلۂ جنوں، مسرت ازل، تعمیر سکوں، آہ آتشیں، جہد نفس، عرض مطلب اور شہید جادہ ۔

غزل کے بعد افسانہ لیجئے اردو کلاسیکی ادب اس سے تہی دامن ہے، باغبانِ تعمیری ادب کو اس کے گل بوٹے چمن مغرب ہی میں لگے۔ افسانہ خواہ رمزیت و اشارت پر مبنی ہو، تصویری ہو یا تاثری ہو، نفسیاتی ہو، واقعاتی ہو اس کا تانا بانا سلسلۂ خیال سے Association of Ideas سے بنایا گیا ہو یا وہ کرداروں کے عمل، رد عمل پر مبنی ہو، ہمیں تو ہر چمن، ہر گل بوٹا دیکھنا، آزمانا اور لگانا ہے ۔ فن کی خوشہ چینی ہونے سے تولی جاتی ہے بشرطیکہ فن فن رہے اس میدان میں تعمیری ادیب سعی مسلسل میں مصروف ہے اور خدا وہ دن جلد لائے جب مغربی شاہکار تعمیری افسانہ کی ضیا پاشیوں سے ماند پڑ جائیں ۔

فاران
کراچی
پاکستان
ماہر القادری

رکن انجمن ادبی رسائل پاکستان

ماہ ستمبر ۱۹۵۹ء

ایڈیٹر - ماہر القادری

ترتیب

سالانہ چندہ ــ چھ روپے ــ فی پرچہ ــ آٹھ آنے

مقام اشاعت
دفتر فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی

پرنٹر پبلشر
مسرور حسین

مطبع
سعیدی کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نقشِ اوّل

مردِ مومن کی سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز صفت یہ ہے کہ وہ حق کو پہچانتا ہے، حق و باطل اگر ملتبس ہو کر اس کے سامنے آئیں، تو جس طرح جوہری خزف ریزوں سے لعل و گہر کو چُن لیتا ہے، اسی طرح مردِ مومن حق کو اخذ کر کے باطل کو رد کر دیتا ہے، حق شناسی اور حق نگری کے ساتھ مردِ مومن کی خود اپنی زندگی حق کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے، جس چیز کو وہ حق سمجھتا ہے، اس کے مطابق عمل کرتا ہے۔ بھول چوک کی اور بات ہے۔ مگر مجموعی طور پر مومن کی زندگی میں نفاق اور دو رنگی نہیں پائی جاتی، اور بہ تقاضائے بشریت جب کبھی وہ کسی برائی میں مبتلا ہو جاتا ہے تو وہ اس برائی کے چٹخاروں اور گناہوں کی لذتوں ہی میں ڈوب کر نہیں رہ جاتا۔ اس دوران میں اس کا ضمیر برابر چٹکیاں لیتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ نادم و تائب ہو کر اس گندگی سے نکل جاتا ہے۔

مردِ مومن حق شناس نہیں حق گو بھی ہوتا ہے، باطل کے خلاف صدائے احتجاج اور حق کا اعلان!

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اپنی ذات اور نفس کی بڑی سے بڑی توہین و تذلیل وہ گوارا کر سکتا ہے مگر دین کی ذرا سی اہانت بھی وہ کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتا۔ کسی کو الٹے ہاتھ سے ایک سانس میں پانی پیتے دیکھ کر بھی اس کا دل چبھن محسوس کرتا ہے کہ پانی پینے میں سنّتِ رسول کے خلاف یہ عمل کیوں ہو رہا ہے؟

مردِ مومن جس طرح حق شناس، حق نگر اور حق گو ہوتا ہے، اسی طرح وہ صاحبِ فراست اور اہلِ تدبیر بھی ہوتا ہے۔ صاف باطن، پاک ضمیر، سچا اور سادہ طبیعت مگر انتہائی زیرک، معاملہ فہم اور زمانہ کا نبض شناس! "حق گوئی" مردِ مومن کی کوئی شک نہیں بہت ممتاز صفت ہے، لیکن جب وہ اعلانِ حق کرتا ہے تو ماحول و فضا کی تمام نزاکتیں اس کے ذہن میں ہوتی ہیں، جس طرح وہ "حق" کو پہچانتا ہے، اسی طرح حق گوئی کے موقع و محل کو بھی جانتا ہے، ہر اچھی بات اس قابل نہیں ہوتی کہ موقع بے موقع اُسے لازماً کہہ ہی ڈالا جائے۔ بے "محل حق گوئی" جرأتِ ایمانی کی نہیں بے وقوفی کی دلیل ہے! حق یقیناً مصلحتوں سے بلند ہوتا ہے مگر اظہارِ حق کا حکمت و تدبیر سے بڑا گہرا تعلق ہے، بے تدبیری اور بے دانشی سے بعض اوقات حق کا اعلان حق کے لئے وبال بن جاتا ہے! اسلام کی تاریخ میں حضرت حسن رضؓ کی صلح پسندی اور حضرت حسین رضؓ کی سرفروشی دونوں اپنے اپنے مقام پر حکمت و عزیمت کا شاہکار ہیں۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ حق گوئی کا حکمت و تدبیر سے گہرا تعلق ہے، تو اس سے ہمارا مقصد خدانخواستہ یہ نہیں ہوتا کہ ہم اس پردے میں "عزیمت" کی اہمیت کو کم کرنا چاہتے ہیں۔ عزیمت تو ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ جس کسی میں عزیمت نہیں وہ کچھ بھی نہیں، ہم تو اپنی تمام گنہگاریوں کے باوجود امام احمد بن حنبل اور امام ابن تیمیہ (رحمہما اللہ تعالیٰ) کے مزاج و طبیعت

سے خاص لگاؤ رکھتے ہیں اور "فاران" کے ہزاروں صفحات اس کے گواہ ہیں کہ ہم نے عزیمت کی عنوان بدل بدل کر تلقین کی ہے۔
کوئی شک نہیں علامہ اقبال کا یہ شعر:-

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

اپنی جگہ صحیفۂ عزیمت ہے، اور دنیا میں جب بھی کوئی نمرود اللہ کے کلمہ کو پست کرنے کے لئے آتش کدہ بھڑکائے تو اہل حق کا فرض ہے کہ اس آزمائش میں پورے اتریں اور کسی تامل کے بغیر آتش کدے میں کود پڑیں ——— ——— ——— مگر حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی سیرت میں جہاں یہ ملتا ہے کہ آپ نے آتش نمرود میں اپنے کو ڈال دیا، وہاں بادشاہ وقت کے ایک استفسار کے سلسلہ میں "توریہ" سے بھی کام لینا پڑا!

وعظ ونصیحت، صداقت کی تبلیغ، نیکوکاری کی تعلیم اور غلطیوں کی تنقید واحتساب یہ تمام "حق گوئی" ہی کے مظاہر ہیں مگر وہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ:-

"سوروں کے آگے موتی نہ بکھیرو"

تو نااہل لوگوں کے سامنے حکمت ودانائی کی باتیں بیان کرنے سے، تضیع اوقات کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا جس کسان نے بنجر زمین میں تخم ریزی کی، اس نے بڑی بے دانشی اور ناتجربہ کاری کا ثبوت دیا، ہاں! زمین شور کو محنت کر کے کسی قابل بنا دیا جائے تو اس میں تخم ریزی کی جا سکتی ہے۔

حق کا پیغام یقیناً آفاقیت پسند ہے کہ دنیا کا کوئی گوشہ اس کی گونج سے خالی نہ رہے مگر جو لوگ سرے سے حق وصداقت کو سننا ہی نہ چاہتے ہوں، ان کے سامنے خواہ مخواہ حق وصداقت کا وعظ کہنے سے خود حق وصداقت کی سبکی وخفت ہوتی ہے۔

سلطانِ جابر کے سامنے اظہار حق یقیناً بہت بڑی نیکی اور افضل الجہاد ہے۔ وہ اہل عزیمت ہیں جنہوں نے تمام عواقب سے بے پروا ہو کر سر دربار غلط کار بادشاہوں کو ٹوکا ہے، اس تصویر کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ ایک بڑا آدمی تاش و شطرنج کھیلتا ہے اور جب اس کھیل سے جی اکتا جاتا ہے تو طبلہ ترنگ اور ستار بجا کر دل بہلاتا ہے، اس شخص کا مزاج ذرا بلی اور رنگین ہے، اگر یہ تفریحات اس پر بند کر دی جائیں تو اس کا قوی امکان ہے کہ وہ تاج رنگ، خمر وقمار دوسری برائیوں میں مبتلا ہو جائے گا ——— تو ایسے شخص کو تاش، شطرنج اور ستار بجانے پر نہ ٹوکنے ہی میں دین واخلاق کا فائدہ ہے، فواحش ومنکرات میں مبتلا ہونے سے یہ بہتر ہے کہ وہ ان لایعنی باتوں اور تفریحات ہی میں الجھا رہے!

کسی مسجد میں کوئی امام جمعہ کے جمعہ نمازیوں کے سامنے دین کے مسائل بیان کرتا ہے، اس کے عقائد وافکار بھی صحیح ہیں ان کے وعظ ونصیحت سے مسجد کے نمازی اچھا اثر قبول کرتے ہیں، یہی امام وعظ بیان کرتے میں کسی حدیث کا عربی متن غلط پڑھتا ہے، اس کی اس غلطی پر بر سر منبر اس انداز میں اسے ٹوکا جا سکتا ہے۔

"مولوی صاحب! خدا کا خوف کیجئے۔ رسول اللہ کی حدیث کو صحیح پڑھئے، آپ سے
ٹھیک طرح عربی پڑھنی بھی نہیں آتی، اور وعظ وارشاد کی مسند پر براجمان ہیں۔
لاحول ولا قوۃ!...."

ٹوکنے والے نے کوئی بات غلط نہیں کہی، اس کی نیت بھی سو فیصدی نیک ہے، اس کی دینی غیرت بھی مُسلّم ہے مگر اس کی اس حق گوئی کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ مسجد کے نمازیوں کے دلوں سے اس واعظ کا وقار اُٹھ جائے گا، اس کے وعظ و نصیحت کی اہمیت اُن کے دلوں میں باقی نہ رہے گی، اور یہ بھی ممکن ہے کہ مسجد کے نمازی بددل ہو کر اس امام کو مسجد کی امامت ہی سے علیحدہ کر دیں، اور اس کی جگہ کوئی غلط قسم کا آدمی آجائے ——— حکمت و دانش کا یہ تقاضا ہے کہ کسی وقت تنہائی میں جاکر مسجد کے اس امام کی غلطی پر متنبہ کر دیا جائے کہ اس طرح سے اپنی غلطی کا علم بھی ہو جائے اور وعظ و نصیحت کے ذریعہ نمازیوں کی ذہنی تربیت کا کام بھی بدستور ہوتا رہے۔

اُلٹے ہاتھ سے پانی پینا خلافِ سُنّت ہے مگر اس غلطی پر کوئی اُس آدمی کے چانٹا رسید کر دے، تو اس فعل سے دینی غیرت کا تو بے شک ثبوت ملتا ہے، مگر یہ "سزا" اس غلطی کے مقابلہ میں ایک تو سخت تر ہے، دوسرے اس کا بھی امکان ہے کہ اُس آدمی میں دین کے خلاف کوئی برا ردِّ عمل پیدا ہو جائے!

تنقید و احتساب کی اہمیت اور اس کی افادیت اپنی جگہ مُسلّم اور دین و اخلاق اور علم و ادب میں اس شعبہ کو کبھی بند نہیں ہونا چاہیے! ناقد و محتسب نہ ہوں تو غلطیوں کے ردّے پر ردّے اور انبار پر انبار لگتے چلے جائیں ——— مگر اس تنقید و احتساب کے بھی کچھ حدود و آداب ہیں، پہلے اچھی طرح اس کا اندازہ کر لینا ہے کہ جس غلطی پر ٹوکا جا رہا ہے وہ کس قسم کی ہے، سادہ اور معمولی، شدید یا سنگین! اسی اعتبار سے تنقید میں ——— زبان استعمال کی جائے اور لہجہ اختیار کیا جائے! کسی آدمی کے کسی خیال، عقیدہ اور رائے کو غلط کہہ دینے اور اس شخص کو اس غلطی کی بنا پر "غلط کار" ٹھیرا دینے میں بہت بڑا فرق ہے۔

ایک عالم دین ہے۔ جو کسی ناقد کی نگاہ میں اسلام کے مطلوبہ تقویٰ کے معیار پر پورا نہیں اترتا، مگر اس کی کتابوں سے لاکھوں انسانوں میں دین کی تڑپ پیدا ہوئی ہے اور خاص طور سے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ اس عالم دین کی کتابیں پڑھ کر دین کے دینی افکار سے متاثر ہو کر، دین کی طرف آیا ہے، اور اس کی تحریروں نے بے شمار متشککین، مذبذبین اور دین سے بے پروا لوگوں کو یقین و اخلاق کی راہ دکھائی ہے ——— اس عالم کی کسی فقہی رائے یا علمی فروگزاشت پر اس قدر ذلت آمیز درشت انداز میں کسی جوشِ حق سے مغلوب ناقد کا تنقید کرنا کہ اُس بے چارے کا نہ علم لوگوں میں معتبر رہے ورنہ سیرت و کردار! اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکل سکتا ہے کہ اسلام پسند نوجوانوں میں شدید بے چینی پیدا ہو، دین کے لئے کام کرنے کا جذبہ سرد پڑ جائے اور خود دین کے بارے میں جوان دماغ نہ جانے کس کس طرح اور کیا کیا سوچنے لگیں!

ایک حاذق طبیب کسی مریض کے کسی خاص مرض کے ازالہ کے لئے نسخہ تجویز کرتے وقت اس کی پوری جسمانی حالت کو نظر میں رکھتا ہے، یہ نہیں کرتا کہ اس کی دوا سے مریض کے سر کا تو درد بند ہو جائے مگر اس کے دل کو کمزوری کا روگ لگ جائے، یا اس کے دماغ کی شریانوں کو نقصان پہنچ جائے ——— ایک دینی ناقد و محتسب کی بھی اس حقیقت پر نظر رہنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے جس دین کی خاطر یہ نقد و احتساب کیا جا رہا ہے خود اس کے حق میں اس گرفت و احتساب کے کیا نتائج مُترتّب ہوں گے! تنقید کا لہجہ کیا ہونا چاہیے، گفتگو نفس مسئلہ پر کی جائے یا اس شخص کی پوری زندگی بحث میں لائی جائے! مانا کہ تنقید میں درشتی کی بھی ضرورت لاحق ہوتی ہے مگر اس کے بھی کچھ حدود ہیں، اگر کسی شخصیت پر لوگ دین کے

معاملہ میں اعتماد کرتے ہوں اور ناقد و محتسب کو اس کا دوسری طرح علم بھی ہو اور نہ صرف علم بلکہ وہ اپنی پچھلی تحریروں میں اس حقیقت کا اعتراف بھی کر چکا ہو ـــــــــ تو پھر ایسے ایسی شخصیت کی کسی رائے، اجتہاد یا غلطی پر تنقید کرتے ہوئے لوگوں کے "دینی اعتماد" کی نزاکت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے! ہم یہ نہیں کہتے کہ کسی بڑی سے بڑی دینی شخصیت کی علمی غلطیوں کو چھپایا جائے، عرض کرنا یہ مقصود ہے کہ "نقد و احتساب" میں ایسا رنگ پیدا کرنا کوئی حکمت کی بات نہیں ہے کہ لوگ اس قسم کی تنقیدوں کو پڑھ کر یہ سوچنے لگیں کہ ہم نے جس عالم دین پر اعتماد کیا تھا، وہ تو اخلاق و کردار، فہم و دانش اور علم و بصیرت کے معاملہ میں نرا کورا تھا! اور اس نے سود کی حرمت پردے کی اہمیت، جہاد کی ضرورت، ضبط ولادت کی خامی، اقامت دین کی فرضیت اور اسی قسم کے دوسرے مسائل پر جو کچھ لکھا ہے وہ نظر ثانی کا محتاج ہے! ان "شبہات" اور "بدگمانیوں" کے بعد دینی اعتبار سے فکر و عمل کو جو نقصان پہنچ جائے کم ہے۔

ایک ناقد و محتسب جو برسوں کسی دینی جماعت سے وابستہ رہا ہو، اس جماعت کے ارکان کی زندگیوں سے بھی واقف ہو۔ اس ملک میں جو حالات پیش آئے ہوں، ان کا بھی اسے علم ہو۔ وہ تنقید و احتساب میں اس قدر دل آزارانہ اور حقارت آمیز لہجہ اختیار کر جائے ـــــــــ کہ :-

"چوہوں کی طرح بلوں میں جا گھسے ـــــ ـــــ وقت کے اللہ کے سامنے اوندھے گر گئے"!

تو اس کے ان دلوں کو برمانے والے طعنوں کی کس سے شکایت کی جائے، جب کہ حضرت ناقد نے ان حالات میں خود بھی کسی عزیمت کا ثبوت نہ دیا ہو۔

یہ کیا لب و لہجہ ہے، یہ کیا فکر ہے، یہ کیا انداز بیان ہے، یہ دنیا کے سامنے کس کو ذلیل کیا جا رہا ہے، یہ کن لوگوں کے سینوں پر ناوک افگنی کی جا رہی ہے؟ یہ کن کی عزیمت کا مذاق اڑایا جا رہا ہے؟ یہ کس جرم کی سزا ہے جو ان "وقت کے مردوں" کو دی جا رہی ہے؟

ہم مانتے ہیں کہ تنقید و احتساب میں خیالات و افکار، معتقدات اور نظریوں کے ساتھ شخصیتوں کو بھی گرایا جاتا ہے .... مگر کن شخصیتوں کو؟ جو کھلے ہوئے فسق و فجور میں مبتلا ہوں، جو خائن اور بددیانت ہوں، جو شرک و بدعت کے مبلغ ہوں، جو جھوٹے نبیوں کے امتی ہوں جو منکر رسالت ہوں ...... مگر جو اللہ کے فضل سے موحد ہوں، شرک و بدعت کی پرچھائیں سے بھی دور رہتے ہوں، جن کی زندگیاں عام طور پر شریف انسانوں اور اچھے مسلمانوں جیسی ہوں، جنھوں نے برسوں ایک نظام کو دیانت و ذمہ داری کے ساتھ چلایا ہو، جو سنت رسول کے پر جوش مبلغ اور مخلص متبع ہوں، صرف چند جزئی اور فروعی اختلافات کی بنا پر ان کو گرانے اور ہدف طعن و ملامت بنانے سے، جوشِ حق گوئی کی کوئی اچھی اور مفید مثال قائم نہیں ہو سکتی۔

شخصیتوں اور جماعتوں سے اختلاف بھی ہو سکتا ہے اور ہوتا ہی رہتا ہے، مگر اختلاف کے آغاز یا وسط میں اس علمی، منظلنہ کا اظہار کہ میں نے قلم اگر ہاتھ میں لے لیا تو فلاں صاحب کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا ہیں؟ یہ علمی مکابرت کم از کم اُن بڑے آدمیوں کو زیب نہیں دیتی، جو "تزکیۂ نفس" کی باریکیاں دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہوں!

تنقید و احتساب کا یہ رنگ کہ شخص مقابل کی دلیلوں کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت کی بھی کاٹ ہوتی چلی جائے، ایک "فن" تو ضرور ہے مگر اس کے استعمال میں دوست دشمن کے درمیان تمیز کرنی چاہیئے! جانی پہچانی شخصیتوں کے ساتھ۔ مٹی اور پتھر کے بنے ہوئے بتوں جیسا معاملہ ہرگز نہ کرنا چاہیئے کہ جن کا ڈھا دینا ہی سب سے بڑی نیکی ہے، ان سے علمی مسائل میں اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر حدود میں رہ کر!

آج کی دنیا میں اللہ کا دین مظلومیت کے دور سے گزر رہا ہے، دیندار طبقہ کی تمام توانائیاں اللہ کے دین کو سربلند کرنے میں

صرف ہونی چاہئیں، علمی مباحث دنیا کے ادنیٰ فرع میں بھی ہو سکتے ہیں کہ اس سے تحقیق کی راہیں کھلتی ہیں مگر بحث میں ایک دوسرے کے گرانے کا جب رنگ پیدا ہو جائے تو یہ علمی مباحث دینی محاذ کو سخت نقصان پہنچاتے ہیں، اور یہ جتنا زیادہ طول کھینچتے ہیں اتنا ہی بے دین طبقہ کو ہنسنے اور دین کو بدنام کرنے کا طویل موقع ملتا ہے! ان مباحث میں جس کی طرف سے جتنی زیادتی ہوگی، اور جس کا نفس جس قدر شریک ہوگا، اور اس سے دینی محاذ کو جس قدر نقصان پہنچے گا، اس کی باز پرس اللہ تعالیٰ کے یہاں ہوگی، یہی وہ نازک مقامات ہوتے ہیں، جہاں امتحان لیا جاتا ہے کہ کون اپنے نفس، شخصیت، شہرت اور وجاہت کی قربانی پیش کرکے اس باب نزاع کو بند کر دیتا ہے، اور اس کی پروا نہیں کرتا کہ لوگ اس کی اس روش کو شکست سے تعبیر کریں گے! دیکھئے! یہ اجر جزیل کس کے حصہ میں آتا ہے اور کب آتا ہے!

ماہر القادری [illegible]

مُلّا محمد واحدی دہلوی

زکوٰۃ

مُلّا واحدی کی زیرِ ترتیب کتاب "حیاتِ سرورِ کائنات" حصہ سوم کا ایک مضمون

نماز والے مضمون میں صلوٰۃ کے ساتھ میں نے ایک دو جگہ نظام کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی [illegible] نماز نہیں لکھا، نظامِ صلوٰۃ لکھا ہے۔

نماز کا حقیقی مقصد یقیناً خالق و مخلوق کے درمیان رابطہ پیدا کرنا ہے۔ لیکن یہ رابطہ عام تسبیح و تہلیل [illegible] اندر فرداً فرداً نماز پڑھ لینے سے ہو سکتا تھا۔ نماز باجماعت پر زور دینے کی کیا ضرورت تھی؟

نماز باجماعت پر اس لیے زور دیا گیا ہے کہ اسلام فقط خالق و مخلوق ہی میں نہیں، مخلوق مخلوق میں بھی رابطہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ یا مخلوق مخلوق کے رابطے کے ذریعے خالق و مخلوق میں رابطہ پیدا کرانا چاہتا ہے۔

مخلوق مخلوق میں رابطہ نماز باجماعت سے پیدا ہوتا ہے۔ نمازِ جماعت کا ایک بڑا فائدہ نظامِ جماعت قائم کرنا ہے[1]۔

اسلام کے پورے نظام کی جڑ نماز باجماعت ہے۔ زکوٰۃ اسی نظام کی کڑی ہے۔ ایسی کڑی جسے نماز کے برابر کا درجہ حاصل ہے۔

زکوٰۃ، نماز کی طرح رکنِ اسلام ہے۔ توحید کے بعد پہلا رکن نماز، دوسرا رکن زکوٰۃ۔

قرآن مجید میں صلوٰۃ اور زکوٰۃ کی تاکید بالکل جڑواں کی گئی ہے۔ جہاں صلوٰۃ کا ذکر آتا ہے وہیں فوراً زکوٰۃ کا ذکر آجاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ نماز سب کو پڑھنا پڑتی ہے۔ زکوٰۃ سے مفلوک الحال (غیر اہلِ نصاب) مستثنیٰ ہیں۔ یا نماز اللہ کا حق ہے اور زکوٰۃ بندوں کا حق۔ یا نماز تنظیمِ اسلام کی روحانی بنیاد ہے اور زکوٰۃ مادی بنیاد۔

نماز باجماعت کا مقصد نظامِ جماعت قائم کرنا ہے اور زکوٰۃ کا مقصد نظامِ جماعت کے قیام کے واسطے سرمایہ بہم پہنچانا۔

زکوٰۃ دولت کی خاص مقدار بچ جانے پر لی جاتی ہے اور عامۃ الناس کی امداد اور فلاح و بہبود کے کاموں میں صرف کی جاتی ہے۔

---

[1] مشہور ہے کہ مسجد میں دنیا کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ ان باتوں سے وہ باتیں مراد ہیں جو قرآن و سنت کے خلاف ہوں۔ مومن کا تو ہر عمل دین ہوتا ہے۔ اسلام نے دین اور دنیا کی تفریق نہیں رکھی ہے۔ دنیا کا صحیح استعمال ہی دین ہے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانے میں زندگی کے تمام مسائل مسجد میں طے پاتے تھے۔ مجالسِ شوریٰ مسجد میں منعقد کی جاتی تھیں۔ احکام اور فیصلے مسجد کے منبر سے سنائے جاتے تھے۔ وفود آکر مسجد میں ٹھہرتے تھے۔

جن باتوں کو منع کرنے والوں نے منع کیا ہے، وہ صرف مسجد کے اندر نہیں مسجد کے باہر بھی منع ہیں۔ لہو و لعب اور رنگ رلیوں کی باتیں مسجد میں ہرگز مت کیجئے لیکن مسجدوں کو محض نماز و اعتکاف کے لیے مخصوص بھی نہ سمجھئے اور مسجدوں کو [illegible] کے کام میں لائیے۔ بغیر اس کے [illegible] ہو رہا ہے۔

مسجدوں میں مکتب اور مدرسے قائم کیے جا سکتے ہیں۔ مسجدوں کے ذریعے بغیر روپیہ خرچ کیے میونسپلٹیوں، اسمبلیوں اور پارلیمنٹ کا الکشن ہو سکتا ہے۔ مسجدوں سے کام لیجئے۔ مسجدیں دو دو ڈھائی ڈھائی گھنٹوں کے سوا سارے وقت بے مصرف رہتی ہیں۔

زندگی کے مسائل کو نمازوں کا ضمیمہ اور تتمہ بنائیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قریباً ہر نماز کے بعد زندگی کے مسائل لے کر بیٹھا کرتے تھے۔ ووٹروں اور الکشنوں کے درمیان کے جملہ مسائل مساجد کے اندر خوب حل ہو سکتے ہیں۔

زکوٰۃ ٹیکس ہے۔ مگر آمدنی کا ٹیکس نہیں۔ آمدنی کا ٹیکس، یعنی انکم ٹیکس کسی کے لئے ناقابلِ برداشت بار ہو جاتا ہے۔ اور کسی کو دھوکہ بازی سکھاتا ہے۔ زکوٰۃ بچت کا ٹیکس ہے۔ آپ کی آمدنی ہزار روپیہ ماہوار ہو لیکن جائز اخراجات کر کے بچانے کی نیت اور کوشش کے باوجود سال کے خاتمے پر اتنا روپیہ آپ کے پاس نہ بچے، جتنا بچنے کی صورت میں زکوٰۃ دی جاتی ہے تو آپ پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

روپے کو متحرک رہنا چاہیے۔ آج ایک کے پاس ہے، کل دوسرے کے پاس۔ کوئی روپے پر سانپ بن کر نہ بیٹھے۔ اس سال کی بچت چالیس سال میں قطعاً قبضہ سے نکل جائے۔ بس یہی ہے زکوٰۃ اور یہی ہے اسلامی ٹیکس

دولت چند افراد یا چند خاندانوں میں رُک کے رہنے کی شے نہیں ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ انسانوں تک پہنچنا اور پھیلنا اور زیادہ سے زیادہ انسانوں کے کام آنا چاہیے چالیس سال کے اندر تو آج کے مال و متاع کا آپ کے ہاتھ سے چلا جانا لازمی اور فرض ہے۔ ویسے منشاءِ خداوندی اس آیت نے صاف کر دیا ہے:۔

یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (اے رسول! مسلمان) آپ سے پوچھتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) کس قدر خرچ کیا کریں؟ تو کہہ دیجیے، تم دو کہ جس قدر تمہاری ذاتی ضرورتوں سے زیادہ ہو (سب اللہ کی راہ میں خرچ کر دو۔ اپنے آپ کو گرا کر نہیں، غریب مت بناؤ لیکن امیر بھی نہ بناؤ۔ بلکہ زائد از ضرورت مال و متاع غریبوں کو اوپر اٹھانے میں لگا دو!)

نادار صحابہ بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے بیتاب رہا کرتے تھے۔ جب حکم ہوا کہ صدقہ دینا ہر مسلمان پر فرض ہے تو نادار صحابہ نے عرض کیا:۔ یا رسول اللہ! جس کے پاس کچھ نہ ہو وہ کیا کرے؟ حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:۔ وہ محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ بھی بھرے اور دوسروں کو بھی دے۔ صحابہ نے عرض کیا:۔ کسی میں اگر محنت، مزدوری کرنے کی طاقت نہ ہو تو وہ اس حکم کی کیونکر تعمیل کر سکتا ہے؟ حضور نے فرمایا پیسے کے علاوہ اور طریقوں سے اہلِ حاجت اور فریاد خواہ کی مدد کرنا بھی صدقہ ہے۔

اسلام نے زکوٰۃ کا مکمل نظام تیار کیا ہے۔ سونے چاندی، جانور اور پیداوار کی الگ الگ شرحیں مقرر کر دی ہیں سونے چاندی کی زکوٰۃ ڈھائی فی صدی ہے۔ پیداوار کی دس فی صدی۔ جانوروں کی مختلف تعداد اور قیمت کی کمی بیشی کے لحاظ سے مختلف شرحیں ہیں افراط زر نے آجکل دنیا کو بیمار کر رکھا ہے، اور جس کا علاج انکم ٹیکس اور سپر انکم ٹیکس نہیں کر سکا اس کا علاج اسلامی ٹیکس زکوٰۃ سے ہو سکتا ہے بشرطیکہ بادشاہ ابو بکر و عمر کے مقلد بن جائیں اور ابو بکر و عمر کی مانند زکوٰۃ کی وصولی اور خرچ کا انتظام کریں۔ زکوٰۃ کو اپنے ہی اوپر خرچ کر دیں۔

سنہ ھ میں حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ یمن جا کر اسلام کی دعوت دو۔ اور کہا کہ پہلے توحید کا مطلب سمجھانا، لوگ توحید سے واقف ہو جائیں، تو بتانا کہ دن میں پانچ وقت کی نماز فرض ہے۔ پھر بتانا کہ زکوٰۃ بھی فرض ہے، جو ان کے دولت مندوں سے لے کر ان کے غربا پر خرچ کی جائے گی۔

نماز جماعت اور مسجد کے بغیر ادا ضرور ہو جاتی ہے، مگر اپنے بعض مقاصد سے دور رہ جاتی ہے ایسے ہی زکوٰۃ بیت المال کی مجتمع صورت کے علاوہ ادا ہو جاتی ہے لیکن اس کے بعض اہم مقاصد زندگی نہیں پاتے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں جب چند قبیلوں نے کہا کہ ہم زکوٰۃ بیت المال میں داخل نہیں کریں گے، بطور خود اسے صرف کر دیا کریں گے تو شریعتِ محمدی کے شناسا نے راز نے

سلہ ۱۹۵۰ء سے پہلے، جب میں دلی میں تھا تو ایک بہت بڑے مل والے کے متعلق سنا کرتا تھا کہ اس نے پانچ ہزار روپیہ ماہوار کا ایک ماہر انکم ٹیکس نوکر رکھ چھوڑا ہے، جو ایسی ترکیبیں بتاتا رہتا ہے کہ اسے پورا ٹیکس نہیں دینا پڑتا۔ انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے فرضی حساب دکھانا تو عام بات ہے۔

ان کی یہ تجویز قبول نہیں کی اور انہیں بزور مجبور کیا کہ زکوٰۃ بیت المال میں داخل کریں۔ قبیلوں کی تجویز مان لی جاتی تو اسلام کی وحدت کا سر رشتہ اسی وقت پارہ پارہ اور مسلمانوں کی امامت و جماعت کا نظام اسی وقت درہم برہم ہو جاتا۔

الغرض زکوٰۃ یا دوسرے الفاظ میں غریبوں کی چارہ گری، مسکینوں کی دست گیری، مسافروں کی امداد، یتیموں کی سرپرستی، مردوں کی نصرت، غلاموں اور قیدیوں کی رہائی کا اہتمام بڑی اہم عبادت ہے۔ کاش زکوٰۃ بیت المال میں جمع ہو اور ایمان داری سے خرچ کی جائے۔

اسلام کا خلاصہ یہی دو لفظ ہیں۔ صلوٰۃ اور زکوٰۃ۔ اللہ کا حق اور بندوں کا حق۔ جس طرح نماز کا آغاز اسلام کے ساتھ ساتھ ہوا [illegible] طرح زکوٰۃ کا آغاز اسلام کے ساتھ ساتھ ہوا۔ شروع میں نماز کی بھی بعینہ یہ شکل نہیں تھی جو مدینہ منورہ میں پہنچ کر ہوئی اور [illegible] میں زکوٰۃ کا بھی یہ نظم نہیں تھا، جو فتح مکہ کے بعد اختیار کیا گیا۔ لیکن مالی خیرات کی ترغیب اور ادائے نماز کا ساتھ کبھی نہیں [illegible]

سورۂ مدثر شروع زمانے کی سورۃ ہے۔ اسے پڑھیے۔ ارشاد ہے: وربک فکبر ۝ . . . ولا تمنن تستکثر ۝ اپنے پروردگار کو تعظیم سے یاد کرو۔ . . . . . اور کسی پر اس طرح احسان مت کرو کہ ایک وقت تو احسان کرو [illegible]

ابتدائے اسلام میں زکوٰۃ کے معنی خیرات تھے۔ پروردگار کو یکسوئی و تعظیم سے یاد کرنا نماز کی روح ہے [illegible] سکے میں بھی بڑی ہمت کا کام تھا کہ شکستہ حالی اور غربت و تنگی پراگندگی اور پریشانی کے باوجود کسی بھوکے کو کھانا کھلایا جائے [illegible] ان کی تعریف فرماتا ہے: ویطعمون الطعام علی حبہ مسکینا ویتیما واسیرا ۝ انما نطعمکم لوجہ اللہ لا نرید منکم جزاء ولا شکورا ۝ وہ خود بھوکے رہتے ہیں اور محتاج یتیم اور قیدی کو کھانا کھلا دیتے ہیں۔ اور جب کھانے والا شکریہ ادا کرتا ہے تو کہتے ہیں [illegible] ہم نے تو خالص اللہ کی رضا جوئی کے واسطے کھانا کھلایا ہے۔ ہم تم سے شکریے اور بدلے کے طلب گار نہیں ہیں

تاہم فتح مکہ سے قبل زکوٰۃ کی تنظیم کا موقع نہیں آیا تھا۔ رمضان ۸ھ میں مکہ فتح ہوا اور اسلام ما بین ملک عرب [illegible] تب یہ حکم ملا۔ خذ من اموالہم صدقۃ تطہرہم وتزکیہم بہا۔ (اے رسول!) ان کے مالوں میں سے زکوٰۃ [illegible] تم انہیں (گناہوں اور مال کے میل کچیل سے) پاک کر سکو۔

چنانچہ محرم ۹ھ میں بیت المال کھلا اور زکوٰۃ کے محصل مقرر کیے گئے۔ اور زکوٰۃ کے قوانین مرتب کر دیے گئے [illegible] جو ۹ھ میں اتری تھی زکوٰۃ کے اصولی قوانین و احکام موجود ہیں۔

زکوٰۃ کی تنظیم میں پہلی چیز اس کی مدت کا تعین تھا۔ [illegible] کا اصل سرچشمہ زمین کی پیداوار ہے۔ زمین کی پیداوار کے بعد [illegible] اور سب کچھ لہٰذا سال بھر کی مدت رکھی گئی کہ جاڑا گرمی برسات، ربیع اور خریف تمام موسم اور فصلیں گزر جائیں اور زمیندار کاشتکار تاجر ملازم اور صناع، ہر ایک آمد و خرچ کا حساب کرے اور اپنی مالی حالت کا اندازہ لگائے۔ بڑے جانوروں کی پیدائش اور افزائش کا زمانہ بھی اوسطاً ایک سال ہے

زکوٰۃ کی تنظیم میں دوسری چیز مقدار ہے۔ اس کا اسلام نے یہ اصول قرار دیا ہے کہ جس کام پر محنت اور سرمایہ کم صرف ہو اس کی زکوٰۃ زیادہ اور جیسے جیسے محنت اور سرمایہ بڑھتا جائے ویسے ویسے زکوٰۃ کم مثلاً جہاد کا مقصد دین کی حمایت اور اعلائے کلمۃ اللہ ہوتا ہے، مال غنیمت حاصل کرنا نہیں تاہم مال غنیمت ایک زائد شے ہے جو دو دن میں مل جاتی ہے۔ لہٰذا اس کی زکوٰۃ بیس فی صدی ہے: واعلموا انما غنمتم من شیء فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربی والیتمی والمسکین وابن السبیل (خوب) جان لو اور یاد رکھو کہ (لڑائی میں کافروں کا) جتنا مال و متاع تمہارے ہاتھ لگے، اس کا خمس (یعنی پانچواں حصہ) اللہ کے لیے اور رسول کے لیے، اور رشتہ داروں کے لیے اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کیلئے ہے یعنی جماعت کی مشترکہ ضروریات کے لیے)

یا دفینہ نکل آئے تو اس پر بھی خمس یعنی بیس فی صدی زکوٰۃ ہے۔ یہ زکوٰۃ مال غنیمت پر، جہاد اور دفینہ کی بابت اتفاقی بات ہے۔

ضرورت مندوں سے فائق ہیں

فقرا و مساکین کی امداد کے معاملے میں تمام مذاہب اسلام کے شریک نکلیں گے اور مسافروں سے بھی دوسرے مذاہب کو دلچسپی رہی ہے۔[1] لیکن غلاموں کی گردنیں چھڑانے اور قرض داروں کا قرض ادا کرنے پر ٹیکس کی رقم لگانا اسلام کی خصوصیت ہے۔ نیز ٹیکس کی تحصیل کے [illegible] عملہ بھی اسلام نے سکھایا ہے۔

انسانی نفس کی بیماریوں کا بڑا سبب اللہ سے بے تعلقی اور بے نیازی ہے۔ اس کا علاج نماز ہے۔ دوسرا سبب [illegible] بیماریوں کا غیر اللہ سے تعلق اور لگاؤ ہے۔ اس کا علاج زکوٰۃ ہے۔

مال سے انسان بے حد محبت کرتا ہے۔ لہٰذا مال اللہ کی راہ میں دینے سے نفس کے آئینے کا زنگ چھٹ جاتا ہے [illegible] ہمدردی کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے۔ مال کی حرص میں کمی آتی ہے۔ بخل چلا جاتا ہے۔ شخصی خودغرضی کی جگہ جماعتی اغراض [illegible]۔

اللہ تعالیٰ نے سود کا لین دین حرام کر دیا۔ کیونکہ سود شخصی دولت بڑھاتا ہے۔ اور جماعتی دولت گھٹاتا ہے۔ قوم مفلس ہو جائے تو قوم کے دولت مند بھی دولت مند نہیں رہ سکتے۔ دیرپا [illegible] نہیں۔ [illegible] يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ [illegible] (اللہ سود کی کمائی برباد کر دیتا ہے۔ اور صدقات و خیرات سے انسان کو دین و دنیا میں بڑھاتا ہے یعنی سود موجب تباہی ہے اور زکوٰۃ و خیرات موجب ترقی)[2]

اسلام نے مسلمان غربا کو یہ کہہ کر کہ غریب جنھیں دولت کا حساب نہیں دینا ہے، دولت مندوں سے چالیس سال پہلے جنت میں جائیں گے[3] خوشخبری بھی دی ہے اور اسلام نے غربا کی دنیاوی تکلیفوں کو بھی کم کیا ہے۔ زکوٰۃ ایک طرف دولت مندوں کا اخلاق درست کرتی ہے۔ دوسری طرف غربا پر ابر کرم بن کر برستی ہے۔

زکوٰۃ دینا تو ہر صاحب نصاب کا قانونی فرض ہے۔ ویسے بھی اہل دول کو غربا کی امداد کا اسلام نے انتہائی شوق دلایا ہے، جسے "انفاق" کہتے ہیں۔ "انفاق" کے لئے مجبور نہیں کیا گیا۔ یہ قانونی فرض نہیں ہے اخلاقی فرض ہے، لیکن صحابہ اس حکم کی تعمیل بھی اتنی شدت سے کرتے تھے کہ جو صاحب استطاعت نہ تھے وہ بازار جاکر بوجھ ڈھوتے تھے اور اس کی مزدوری سے معذور بھائیوں کو مدد پہنچاتے تھے۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ (وہ خود بھوکے رہ کر محتاج، یتیم اور قیدی کو کھلا دیتے ہیں۔) وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ (وہ اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ وہ خود فاقہ سے ہوں)

---

[1] آج کل امیر مسافروں کو جو آسائشیں ملنے لگی ہیں ان سے یہ مت سمجھئے کہ ہر مسافر کا مسئلہ حل ہو گیا۔ غریب مسافر اب اور زیادہ مستحق امداد ہیں۔ نئے طریقوں نے پرانے طریقوں کو ختم کر دیا ہے۔ جہاں جہاں یورپ کا سرمایہ دارانہ نظام پہنچ گیا ہے، [illegible] سرائیں۔ مسافر خانے اور مہمان نوازی ختم ہوتا ہے۔ غریب مسافر اب کہیں سر بھی نہیں چھپا سکتے۔ [2] زکوٰۃ کے معنی پاکی اور صفائی کے ہیں یعنی اخلاقی بیماریوں اور روح و قلب کے امراض سے پاک و صاف ہونا اپنا تزکیہ کرنا۔ جس نے اپنا تزکیہ کر لیا اس نے مراد پالی۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰىۙ ۔ سود خوار تاک میں رہتے ہیں کہ دوسروں پر مصیبت نازل ہو اور وہ اس کی مصیبت سے فائدہ اٹھائیں۔ اور زکوٰۃ دینے والے مستحق امداد لوگوں کی تلاش کرتے ہیں کہ اپنی دولت سے انھیں فائدہ پہنچائیں۔ سوچئے تزکیہ کی نعمت کس نے پائی؟ انھیں مت بھولئے جو زکوٰۃ اور سود دونوں کا کاروبار ساتھ ساتھ کر رہے ہیں وہ بھی خالص سودخوروں سے انشاء اللہ کسی نہ کسی قدر بہتر ثابت ہوں گے۔

[3] حدیث ہے۔

یہ آیتیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور بعض اصحاب کرام کی شان میں اتری تھیں۔ حضرت ابوذر غفاری دوسرے دن کے لیے کچھ بچانا حرام سمجھتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق نے وقت پر اپنی کل دولت اسلام کے قدموں میں لاکر ڈال دی تھی۔ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے اپنا تمام سرمایہ تجارت خیر کی راہ میں لٹا دیا تھا۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

خود حضور سرور کائنات صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہمیشہ یہی عمل رہا کہ جو آیا دن کے دن اسے مستحقین کو دے دیا۔ کبھی سونے چاندی کے پڑے بڑے رہ جاتے تھے تو بستر پر آرام نہ فرماتے تھے۔ لیکن عام امت کے لیے اس مسلک کو فرض نہیں کیا گیا۔ فرض اتنا ہی ہے جو قوت، استطاعت اور ہمت کے مطابق ہے

غریب طبقہ کی دلجوئی کا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کتنا خیال رکھتے تھے۔ فرماتے ہیں:-

غرباکو دینے کے لیے اگر تمہارے پاس روپیہ نہیں تب بھی تو ان سے لطف اور مہربانی کے ساتھ بات کرلینا ہی تمہاری خیرات ہے۔

ہاتھ پھیلانے کی برائی[1] سمجھنے کے باوجود فرمایا کہ "تم ہاتھ پھیلانے والے کو سختی سے واپس مت کیا کرو! یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے تمہیں دینے کے قابل کیا، اور دینے کی توفیق عطا فرمائی۔ تمہیں اللہ کا شکر کرنا چاہیے، لینے والے پر احسان نہیں دھرنا چاہیے۔ احسان دھرنے سے نیکی کا پیالہ پانی کے بلبلے کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔" (مفہوم حدیث)

حضور صلے اللہ علیہ وسلم ہاتھ پھیلانے کو بہت برا جانتے تھے اور زکوٰۃ وخیرات سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا مقصد ہی یہ تھا کہ روپیہ سب تک پھیل جائے، اور ہاتھ پھیلنے موقوف ہوں۔ چنانچہ خلفائے راشدین کے دور میں ایسا وقت آیا کہ زکوٰۃ لینے والا کوئی نہیں رہا تھا۔ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پوری قوم کو خوشحال بنانا چاہتے تھے۔

اسلام خوشحالی کے خلاف نہیں ہے۔ چند افراد اور چند خاندانوں کی حد سے زیادہ دولت مندی اور سونے چاندی کو بیکار ڈالے رکھنے کے خلاف ہے۔ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝ جو لوگ سونا چاندی دبائے رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں (حسب منشاء الٰہی) صرف نہیں کرتے (اے رسول!) انہیں تم دردناک عذاب کی بشارت دے دو اور اس روز کا حال بتا دو، جس روز اس (سونے چاندی) کو آتش دوزخ میں

---

[1] حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ پھیلانے، دوسروں کو دست نگر رہنے، اور دوسروں کے سہارے جینے کی برائی کس کس طرح سمجھائی ہے اور اس برائی اور (ذلالت) سے باز رکھنے کی کیا کیا کوششیں فرمائی ہیں، یہ انشاء اللہ ایک مستقل مضمون ہوگا۔ اسلام فقط امیر طبقہ میں جذبۂ ایثار، جود وسخا اور فیاضی کے جوہر نہیں ابھارتا، غریب طبقہ کو بھی دنائت، کم ہمتی اور لالچ دور کرکے پستی سے بلندی پر لاتا ہے۔ حضور کی بعثت کسی ایک طبقہ کے لیے نہیں ہوئی تھی حضور ہر طبقہ کے مصلح اور معلم بنا کر بھیجے گئے تھے۔ غربا کو دریوزہ گری کی اجازت دے دی جاتی تو انسانوں کی وسیع آبادی کی اخلاقی زندگی برباد ہوجاتی۔ امیروں سے اگر کہا گیا ہے کہ تمہارے آگے جو ہاتھ پھیلائے اُسے لقمہ دو، خالی مت جانے دو، کچھ نہیں تو چھوارے کا ٹکڑا ہی دے دو؛ تو غریبوں کو بھی بتایا ہے کہ لینے والے ہاتھ سے دینے والا ہاتھ بہتر ہوتا ہے۔ اپنی اولاد پر صدقات و زکوٰۃ کو حرام ہی کردیا جو لوگ بھیک مانگ کر حج کرتے تھے ان سے قرآن نے فرمایا وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى۔ زاد راہ ہمراہ لو اور بہترین زاد راہ، تقویٰ (بھیک نہ مانگنا) ہے

اسلام نے غربا کی کفالت کا حقیقی بار حکومت پر ڈالا ہے۔ حکومت اس بار کو اٹھائے تو سب درست ہوجائے۔ بیت المال کے دور میں ایک کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا جاتا تھا۔ زکوٰۃ دینے کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ زکوٰۃ بیت المال میں داخل کی جائے اور حکومت اسے مستحقین پر خرچ کرے۔

تپایا جائے گا اور اس سے ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی (اور کہا جائے گا کہ یہی ہے وہ دولت) جسے اپنے سینت جوڑ جوڑ کر رکھتے تھے۔ سو (اب اس کے) جوڑنے کا مزہ چکھو!

جس طرح دولت مندی و امارت ہزاروں سیہ کاریوں کی محرک ہوتی ہے، اسی طرح غربت و فلاکت ہزاروں جرائم کا باعث ہے۔ ایک طرف دولت مندوں کو سیہ کاریوں سے بچاتا تھا، دوسری طرف غریبوں کی حالت ایسی کر دی تھی کہ جرائم سے بچ جائیں۔ دولت انسان کے پاس اتنی رہنی چاہیے کہ "خیر" اور "فضل" کے قرآنی الفاظ اس پر صادق آئیں۔ دولت کا انتا فریں کرنا کہ بیری پاس تمہی میں اور بکریں کچے پکے "مکان کو ترسے، بس اسلام اسے گوارا نہیں کرتا۔ وہ اسلام کہتا ہے کہ اپنی اولاد کو اس قابل ضرور چھوڑو کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتی نہ پھرے۔

حضورؐ فرماتے ہیں:۔ دولت ہرے بھرے چراگاہ جیسی شے ہے۔ بعض حریص جانور چراگاہ کو ضرورت سے بہت زیادہ چر لیتے ہیں۔ اور چرنا ان کے حق میں موجب ہلاکت ہو جاتا ہے۔ لیکن جو جانور اسے اعتدال سے چرتے ہیں اور جب ان کا پیٹ بھر جاتا ہے تو جگالی کرنے لگتے ہیں، وہ زندہ، تندرست اور طاقت ور رہتے ہیں۔ دولت کو بھی جو انسان صحیح طریقہ سے خرچ کرے گا، دولت اس کی بہترین مددگار ہوگی۔ لیکن جو اسے غلط طریقہ سے کمائے گا اور غلط طریقہ سے خرچ کرے گا اس کی مثال یوں سمجھو کہ کھانے جاتا ہے مگر سیر نہیں ہوتا۔

نفسِ دولت میں خیر و شر نہیں ہے، بلکہ اس کے طریقۂ حصول اور طریقۂ صرف میں خیر و شر ہے۔ دولت اگر صحیح طریقے سے حاصل کی جائے اور صحیح طریقہ سے صرف کی جائے تو نیکیوں اور بھلائیوں کا بے مثل ذریعہ ہے اور حصول و صرف کا طریقہ صحیح نہیں تو دولت کے شر سے اللہ کی پناہ!

اخلاقی محاسن و معائب امیر و غریب دونوں کے لئے یکساں ہیں۔ فیاض و متواضع امیر اور صابر و شاکر غریب اسلام کی نظر میں فضیلت کے ایک مقام پر ہیں، اور بخیل و متکبر امیر، اور دنی الطبع و طامع فقیر پستی کی ایک سطح پر۔

اسلام نے دھوکہ، فریب، خیانت، لوٹ مار، جوا، سود، سب کو حرام کر دیا، اور سرمایہ داری کی جڑیں اکھاڑ پھینکیں۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔ "زمین اللہ کی ہے، اور بندے بھی اللہ کے ہیں۔ جو کسی مردہ زمین کو زندہ کرے، وہ اس کا مالک ہے"

میت کی متروکہ جائداد کا مالک بقدر استحقاق تمام عزیزوں کو بنا دیا۔ ممالک مفتوحہ جماعت مسلمین کی ملکیت قرار دیئے بغیر جنگ کے دشمن سے حاصل کی ہوئی زمینیں صرف غربا کا حق بتائیں۔ بخل کو انسانیت کا اہم ترین نقص کہا۔ اور اس بات کی طرف متوجہ فرمایا کہ جس دولت کو تم اپنا خیال کیے ہوئے ہو، وہ درحقیقت تمہاری نہیں ہے۔ اس کا اصلی مالک اللہ ہے۔ پھر جو شخص مالک نہ ہو محض امین ہو، اسے اصلی مالک کی مرضی کے خلاف خرچ کرنے نہ کرنے کا اختیار کیونکر مل سکتا ہے۔ اسی تصور نے کہ دولت میری ہے، دنیا کو تباہ کیا ہے۔ یہی تصور تمدن کی اینٹ سے اینٹ بجایا کرتا ہے۔ جب دیکھو کہ بعض طبقے نہایت دولتمند ہوتے جاتے ہیں، اور بعض طبقوں کو روٹی کے سوکھے ٹکڑے میسر نہیں آتے تو سمجھو کہ تمدن کا خاتمہ قریب آگیا۔

قارون نے کہا تھا:۔ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ - میرے پاس جو کچھ ہے مجھے اپنے علم و ہنر کے ذریعے ملا ہے۔

ہر زمانے کے قارون یہی خیال کرتے ہیں

ملہ یورپ نے تحقیق و تدقیق کے بعد ایشیا کے تجارتی و تمدنی تنزل کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ یہاں مال کا بڑا حصہ زمین میں مدفون رہتا ہے۔ یورپ کے محقق اور مدقق کاش قرآن مجید کی اس آیت پر غور کریں جو چودہ سو برس قبل نازل ہوئی تھی

ایک بلند پایہ مفکر اور انشا پرداز کا اہم مکتوب

مشفقی ۔ سلام مسنون !

... شکر گزار رہونا ۔ شرمندہ بھی اس لئے کہ نہ صرف اب تک اس کی کوئی خدمت کر سکا بلکہ آئندہ بھی اس امر کی توفیق نہ ہو تو کچھ بعید نہیں ۔

امور دین میں مجھے کچھ زیادہ درک نہیں ۔ چند موٹی موٹی باتیں جانتا ہوں ۔ ان سے بھی کم پر عامل ہوں ۔ لیکن اتنی رائے ضرور قائم کر سکا ہوں کہ مسلمانوں کی بے راہ روی پر آپ جس خلوص نیت اور جرأت سے لکھتے رہتے ہیں وہ قابل تعریف ہے ۔ عنوان کے تحت آپ جو باتیں جن مقصد کے پیش نظر تحریر فرماتے ہیں ان کا تقاضا ہے کہ خطابت کم اور دلنوازی زیادہ ہو ۔ آجکل تحریروں میں تکلف سے زیادہ سادگی اور توانائی پر زور دیتے ہیں ۔ شریعت میں موسیقی اور موسیقی میں مزامیر کے جواز یا عدم جواز پر آپ نے بحث کی نہ جانے کتنی ہوگی ۔ انشا پردازی کے بارے میں بھی اب کچھ اس طرح کی باتیں کرنے لگے ہیں ۔ اس کے علاوہ ایک ہی موضوع پر کئی صفحے لکھنے کے بجائے کئی مباحث پر اتنے ہی صفحے لکھے جائیں تو پڑھنے والوں پر اچھا اثر پڑے گا ۔ ہمیشہ نہیں تو کثرا ایک ہی بات دیر تک سننے کے بجائے مختلف موضوعات پر مختلف باتیں تھوڑی تھوڑی دیر تک سننا زیادہ گوارا ہوتا ہے ۔

دوسری بات جس کے لئے آپ ارباب شعر و ادب کی طرف سے شکریے اور تہنیت کے مستحق ہیں وہ ریویو کا حصہ ہے آپ کے تبصرے منصفانہ مبسوط، دردمندانہ ہوتے ہیں ۔ اس بارے میں فاران اردو کے بیشتر رسالوں سے ممتاز ہے جو اکثر دفع الوقتی سے کام لیتے ہیں یا پاسداری اور پروپیگنڈے سے ۔

لیکن یہ امور تو یونہی معرض گفتگو میں آگئے ۔ دراصل ایک اور مسئلے کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرانا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اسلام جتنا سادہ اور سچا مذہب ہے اتنے سادے اور سچے مسلمان کیوں نہیں ہیں ۔ شاید آپ نے ایک واقعہ یا لطیفہ سنا ہو کہ قرآن پاک اور سیرت رسول کے مطالعہ سے ایک ملک کے باشندے کثرت سے مسلمان ہونے لگے ۔ وہاں کے ارباب حل و عقد کو اس صورت حال سے بڑی فکر ہوئی تو ایک "پیر دانا" نے ان کو تسلی دی اور پاس ہی کے ایک اسلامی ملک سے کچھ مسلمان بلا کر اپنے ہاں بسا لیئے ۔ چند ہی دنوں میں سارے نو مسلم مرتد ہو گئے ۔

بیشتر ائمہ صوفیا اور مشائخ کی سیرت صحیح اور ملفوظات کے مطالعے سے کچھ اس طرح کا احساس ہوا کہ ان نفوس قدسیہ نے عقیدت مندوں کو عبادت ریاضت، درود اور وظائف کی جتنی تلقین کی اتنا بیکسوں مریضوں اور حاجت مندوں کی خدمت اور چارہ سازی پر مائل نہیں کیا یعنی خدا کی خوشنودی خلق اللہ کی خدمت کے واسطے سے حاصل کرنے کے بجائے عبادات اور وظائف کے براہ راست حاصل کرنے پر زور دیا گیا ۔ ممکن ہے صراحۃً ایسا نہ کیا گیا ہو یا اشارۃً ایسا کہا گیا ہو لیکن نتیجے کے اعتبار سے جو دیکھنے میں آرہا ہے وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں ۔

ریاضت اور مجاہدے کی جس کثرت سے جتنی حیرت انگیز مثالیں بزرگان دین نے چھوڑی ہیں وہ اپنی جگہ پر مسلم ہیں لیکن اس کے ساتھ رہ رہ کر اس کا بھی گمان ہوتا ہے کہ اس طرح کے مجاہدے اور ریاضت شاقہ اسلام کے سیدھے سادے حقایق عبادت سے کوئی قابل لحاظ ربط بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ ایسا تو نہیں کہ عبادت میں یہ غلو[1] اور شدت بعض دوسرے مذاہب کی تقلید سے آگئی ہو جن کے یہاں جسم و جان کو طرح طرح کی اذیتوں میں مبتلا کرنے اور رکھنے کے بعد نروان یا نجات ملتی ہے۔ میں ریاضت و مجاہدے کا مخالف نہیں ہوں لیکن اتنا محسوس ضرور کرتا ہوں کہ ان کی ایک مقدار اور ان کا ایک مقام ہونا چاہیئے ورنہ زندگی [illegible] ہو کر رہ جائے۔ غلو اسراف پر منتج ہوتا ہے چاہے وہ صرف "عبادت" ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے بچنا چاہیئے۔

اعتقاد مذہب کا بڑا اہم جز ہے اور اعتقاد کا اعمال پر بڑا کاری اثر پڑتا ہے۔ اس حیثیت سے مسلمانوں کے مذہب کو دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ ان کے عقائد میں خامی نہیں ہے۔ عقائد اور اعمال کی اس کشاکش کو دور کرنے اور ان میں یک جہتی اور یک رنگی پیدا کرنے کے بجائے اہل طریقت نے ریاضت اور مجاہدے کا ایک ایسا نظام قائم کر دیا جس سے نقشہ کبھی باہر نہ نکل سکا۔ اس نظام میں افراد کا رشتہ معاشرے میں کچھ اس طرح کا ہو گیا کہ افراد تو معاشرے سے پورے طور پر نفع اندوز ہوں لیکن معاشرہ ان افراد کی خدمات سے کلیتہً محروم رہے۔ یہ بہت ہی افسوسناک صورت حال رونما ہوئی جو اب تک قائم ہے۔ اس لئے دل میں اکثر یہ خطرہ گذرتا ہے کہ عقائد کی استواری یا عبادت اتنی اہم نہیں ہے جتنی اعمال کی درستی اور اعمال کی درستی کا بہت کچھ مدار خدمت خلق پر ہے۔ جس طرح عقائد سے اعمال متاثر ہوتے ہیں اسی طرح اعمال کا اثر اعتقاد پر پڑتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے بیگانہ رہ کر پنپ نہیں سکتے۔

یہاں یہ کہنا ہرگز مقصود نہیں ہے کہ عبادت کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ کہنا صرف اتنا ہے کہ عبادت الٰہی کو خدمت خلق سے ربط نہ دینا ایک بھول ہے جس میں مسلمان عرصے سے مبتلا چلے آتے ہیں۔ خلق خدا کی خدمت کی ذمہ داری سے بچنے کے لئے یا خلق خدا کے حقوق کو تلف کرنے اور مکافات سے بچ نکلنے کے لئے یا اوراد و وظائف یا عبادت الٰہی میں پناہ لینا فعل عبث نہیں تو کوئی مستحسن فعل بھی نہیں۔ ہم میں سے بیشتر نے اپنے آپ کو اس خوش فہمی میں مبتلا کر رکھا ہے کہ امور دین گناہوں سے بچانے میں معین ہوتے ہوں یا نہیں گناہوں کی سزا سے بچانے میں یقیناً معین ہوتے ہیں۔ حالانکہ سمجھنے کی یہ معمولی سی بات ہے کہ اگر گناہوں کی سزا سے بچنے کے لئے دین سپر کا کام دیتا تو دنیا کی کوئی حکومت اور کوئی معاشرہ دین کو دنیا میں نافذ نہ ہونے دیتا۔ مسلمانوں میں جو بے راہ روی بہت دنوں سے اب تک دیکھنے میں آ رہی ہے اس میں ان کا قصور یقیناً ہے لیکن اس مواخذے سے وہ حضرات بھی نہیں بچ سکتے جنھوں نے ان کو خلق خدا کے دکھ درد سے بیگانہ رکھ کر خدا سے لو لگانے کی تلقین کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان کو نہ خدا ملا نہ مخلوق کو مسلمان ملے بلکہ سارے مسلمان "پیران پارسا" کی نذر ہو گئے۔ تو کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ مسلمانوں میں خدمت خلق کی کوئی مسلسل اور مستقل روایت نہیں ملتی، خانقاہیں مزارات، یتیم خانے مسافر خانے درسگاہیں تو بے شمار نظر آئیں گی لیکن (مثال کے طور پر) کوئی "کوڑھی گھر" نہ ملے گا۔ عیسائیوں نے کوڑھیوں کی خدمت جس محبت اور جانبازی سے کی ہے اور کرتے رہتے ہیں اس کی مثال کسی دوسری قوم میں نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ دنیا کے صحیفۂ اخلاق میں "مشنری اسپرٹ" کی اصطلاح اس طرح کی خدمات کی قابل فخر یادگار ہے۔ ہندوؤں میں تو چھوت چھات ذات پات کے جھگڑوں نے خدمت خلق کے جذبے کو ابھرنے ہی نہیں دیا۔ لیکن یہاں اور مسلمانوں کے یہاں بھی جو جتنا فقیری گدائی یا "واصل بحق" ہونے کی طرف گیا اتنا ہی خلق اللہ کی خدمت کرنے کے بجائے الٹا انہیں سے خدمت لینے لگا۔

---

[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ——— مذہب میں غلو اور مبالغہ سے بچو، کیونکہ تم سے پہلی قومیں اسی سے برباد ہوئیں۔

افراد جماعت یا معاشرے کے خرچ پر دنیا سے منہ موڑنے اور اللہ سے لو لگانے کا میں قائل نہیں بالخصوص جب اس کا یقین بھی نہ ہو کہ دنیا سے منہ موڑنے اور اللہ سے لو لگانے میں خلوص کو دخل ہے۔

یہ تسلیم ہے کہ کم و بیش ہر مذہب کی تعلیم میں خلق خدا کی خدمت کے چھپے یا کھلے اشارے یا تاکید ملتی ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس تعلیم کو پھیلانے اور موثر بنانے کے لئے ہم کو تیرہ سو سال سے اوپر ملے لیکن ہم اس کی کوئی روایت قائم نہ کر سکے۔ امورِ دین کو پھیلانے اور شرک و بدعت کو دور کرنے کے لئے چھوٹے بڑے کتنے ادارے اور جماعتیں آج بھی ہم میں موجود ہیں جن کی کامیابی یا کامیابی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ آپس میں ان میں جھگڑے بھی خوب خوب ہوتے رہتے ہیں لیکن ان میں شاید ایک بھی ایسا نہیں ہے جس میں خلق خدا کی خدمت پر زور دیا جاتا ہو۔ اس سلسلے میں عہد سعادت یا دور خلافت یا اس کے بعد کے خاص خاص واقعات یا بعض اکابر کے کارنامے پیش کئے جا سکتے ہیں جن سے کسی کو بھی انکار نہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ انکی اس پابندی سے پیروی بھی کی گئی یا نہیں کہ یہ مسلمانوں کے کردار کا جز بن جاتے۔ روایت کے لئے ضروری ہے کہ دور سے اور دیر سے غیر منقطع چلی آتی ہو۔

ہم سب جانتے ہیں کہ سائنس کی اہمیت و افادیت بہت کم رہ جائے اگر نظری سائنس کے ساتھ عملی سائنس کی طرف توجہ نہ کی جائے۔ بالکل یہی حال مذہب کا ہے۔ مذہب میں معتقدات سے کم درجہ اعمال کا نہیں ہے۔ اعمال ہی کا سدھارنا... معتقدات کا عین مقصد ہے۔ لیکن مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ انھوں نے مذہب کی نظری حیثیت کو عملی حیثیت پر اور عبادت وریاضت کو خدمت خلق پر ترجیح دے رکھی ہے۔ ان میں کافی تعداد ایسوں کی بھی ہے جو عمل صالح کی توفیق کے لئے اتنی عبادت نہیں کرتے جتنی "کردہ گناہوں" کی مکافات سے بچنے اور "ناکردہ گناہوں" سے کام گار ہونے کے لئے۔

ساری دنیا میں جتنے مسلمان جس پابندی سے نماز پڑھتے ہیں روزے رکھتے ہیں حج کرتے ہیں زکوٰۃ دیتے وظیفے پڑھتے یا مذہبی اور نیم مذہبی تقریبیں مناتے ہیں (خلوص یا عدم خلوص سے قطع نظر) اس تناسب سے نہ مسلمانوں کو نفع پہنچ رہا ہے نہ خلق خدا کو۔ لیکن اگر اس کا عشر عشیر بھی خلق اللہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیں تو اس سے اتنے فوائد حاصل ہونگے جن کا ہم اندازہ نہیں کر سکتے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مسلمانوں میں جو عالمگیر ابتری اور انتشار ملتا ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انمیں خدمت خلق کا اتنا چلن نہیں جتنا کہ ہونا چاہیئے۔ خلق اللہ کی خدمت کرنے والا خلق اللہ کی کبھی حق تلفی نہ کرے گا۔ میں اس خدمت خلق کا قائل نہیں ہوں جو رفاہی حکومتوں کے پیش نظر ہوتا ہے۔ میں تو خدمت خلق کو انفرادی اور شخصی ذمہ داری بنانے کا قائل ہوں۔ پاکستان کو اسلامی شعائر اپنانے کا حوصلہ ہے تو اس کو پاکستان میں خدمت خلق کی روایت قائم کرنے کا عزم کر لینا چاہیئے۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہو گیا تو یہ ایک ایسا کارنامہ ہوگا جو شاید اب تک کسی اور اسلامی حکومت کے حصے میں نہیں آیا۔

فاران :۔ یہ مکتوب انتہائی دردمندی اور خلوص کے ساتھ لکھا گیا ہے، اس میں نہ کوئی دقیق و نازک بات بیان کی گئی ہے اور نہ کسی علمی و ادبی بحث کو اٹھایا گیا ہے، بالکل سامنے کی بات ہے اور سو فیصدی کام کی بات ہے مگر اس طرف لوگوں کی توجہ بہت ہی کم جاتی ہے! فاضل مکتوب نگار نے دین کی خیر خواہی اور اُمت کی بھلائی ہی کے لئے یہ خط لکھا ہے، اس لئے ہم اس ضمن میں جو کچھ

عرض کرنے والے ہیں اس کی حیثیت "جواب الجواب" کی ہرگز نہیں ہے۔

ہم اپنے محترم کرم فرما کے شکر گزار ہیں کہ ان کے مکتوب کے طفیل میں ہمیں ان باتوں کی وضاحت کا موقع مل گیا، جو بعض دلوں میں کھٹک پیدا کرتی رہتی ہیں، اور جن کی وضاحت ہر اعتبار سے ضروری اور فائدہ مند ہے: مقصودِ گزارش نہ کسی اپنی بات منوانا ہے اور نہ بحث و نزاع کا آغاز ہے! سیدھی سادی باتیں سادہ زبان میں عرض کی جا رہی ہیں!

نہ جانے یہ غلط فہمی کس نے پھیلا دی ہے کہ حضرت سیدنا محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بانیٔ اسلام Founder of Islam کہا اور سمجھا جاتا ہے۔ اسلام کا بانی خود اللہ تعالیٰ ہے اور دنیا میں جو پہلا انسان پایا جاتا ہے وہ "دینِ فطرت" پر یعنی اسلام پر تھا۔ انسان کی تاریخ جتنی قدیم ہے اتنی ہی قدیم اسلام کی تاریخ ہے۔ دنیا میں جتنے انبیاء و رسل مختلف زمانوں میں مبعوث ہوئے وہ سب کے سب "مسلم" تھے، اور ان کی بنیادی تعلیم اسلام ہی کی تعلیم تھی۔ ہم اُن سب پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔

صحفِ قدیم میں انبیاء کرام کی جو تعلیمات ملتی ہیں، ان میں "حق اللہ" اور "حق العباد" کا ساتھ ساتھ ذکر پایا جاتا ہے اور "حق العباد" ———— "خدمتِ خلق" کی بنیاد ہے، بندوں کے حقوق کا احساس و ذمہ داری تو انسانوں کو خدمتِ خلق کے لئے ابھارتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کسی شخص نے کہا کہ ایک عابد فلاں غار میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے اور اس کا بھائی اسے کھانا پانی پہنچاتا ہے تو اس پر حضرت مسیحؑ نے فرمایا کہ۔۔

"اس عابد کا وہ بھائی اللہ تعالیٰ کا زیادہ عبادت گزار بندہ ہے"۔

مقصود عرض کرنے کا یہ ہے کہ اسلام نے بندوں کے حقوق پہچاننے اور خدمتِ خلق کرنے کی ہر دور میں تعلیم دی ہے اور اس کے لئے لوگوں کو ابھارا ہے، عرب کے زمانۂ جاہلیت میں یہ اسلام اور ملتِ ابراہیمی ہی کے نیک آثار باقی رہ گئے تھے کہ وہ لوگ مہمانوں کی بڑی فراخدلی کے ساتھ میزبانی کرتے تھے اور حج کے ایام میں مختلف قبیلوں نے اپنے ذمے بعض فرائض لے لئے تھے ———— یعنی کوئی قبیلہ حاجیوں کو پانی پلانے (سقایہ) کا، اور کوئی قبیلہ کھانا کھلانے (رفادہ) کا انتظام کرتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جدِ امجد ہاشم کا یہ لقب اس وجہ سے مشہور ہوا ہے کہ ایک بار قحط کے دوران میں انہوں نے شوربے میں روٹیاں (ہشم) چورا کر کے لوگوں کو کھلائیں۔

قرآن پاک میں صوم و صلوٰۃ کے ساتھ ایثار و صلہ رحمی کی بھی تعلیم دی گئی ہے "زکوٰۃ" جو ہر مسلمان پر فرض ہے اس کا سو فیصدی تعلق "خدمتِ خلق" ہی سے تو ہے، اور یہ ایسا فرض ہے کہ جس کے انکار سے کفر واقع ہو جاتا ہے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مانعینِ زکوٰۃ سے جہاد کیا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی کا یہ باب کس قدر روشن ہے کہ حضورؐ نے خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھانا کھلایا۔ کسی سائل کو ناکام نہیں پھیرا، مدینہ کی لونڈیاں حاضر ہو کر عرض کرتیں کہ "یا رسول اللہ میرا یہ کام ہے" حضورؐ اسی وقت اٹھ کھڑے ہوتے اور ان کا کام کر دیتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لئے کھڑے ہو چکے ہیں، ایک بدوی آ کر حضورؐ کا دامن پکڑ کر کہتا ہے "میرا

"تھوڑا سا کام رہ گیا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ میں بھول جاؤں، پہلے اس کام کو کر دو۔" حضورؐ اس بدوی کے ہمراہ اسی وقت مسجد سے باہر تشریف لے آئے۔ اور اس کا کام پورا کر کے نماز پوری کی!

مدینہ میں بیماروں کی مزاج پرسی کے لئے حضورؐ ان کے گھروں پر تشریف لے جاتے، جنازوں میں شریک ہوتے، آپ بے کسوں، ضعیفوں کے ملجا اور یتیموں کے والی تھے۔ "خدمتِ خلق" کے لئے یہ ایک مثالی کردار ہے۔ حضورؐ کا یہ ارشاد "خیر الناس من ینفع الناس" "خدمتِ خلق" کی کتنی بڑی شہادت ہے۔

خلفائے راشدین کی زندگیوں میں "خدمتِ خلق" کا مستقل باب ملتا ہے۔ خاص طور سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تو اللہ کی مخلوق کے لئے سراپا ایثار تھے۔

مسلمان بادشاہوں نے مدرسے قائم کئے ہیں، سرائیں اور سڑکیں تعمیر کی ہیں اور مریضوں کے لئے ہسپتال بنوائے ہیں۔ بغداد کے بعض ہسپتالوں کی تفصیل پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مریضوں کی دیکھ بھال، ٹہل، تیمارداری اور راحت و آرام کے جو انتظامات تھے ایسے اچھے انتظامات آج یورپ کے ہسپتالوں کو بھی نصیب نہیں ہیں!

امراء اور صوفیاء کے تذکروں میں یہ بھی ملتا ہے کہ بہت سوں کے یہاں بھوکوں اور نوواردوں مہمانوں کے لئے لنگر بٹتے تھے۔ (رحمۃ اللہ علیہم اجمعین)

اسلام میں جائداد کے "وقف" کا جو قانون ملتا ہے، اس کی بنیاد "خدمتِ خلق" ہی تو ہے! مثال کے طور پر جناب سر محمد سعید خاں، آف چھتاری کے دادا نواب محمود علی خاں صاحب بڑے دیندار اور خداترس رئیس تھے۔ انھوں نے اپنی جائداد کا خاصا بڑا حصہ "خدمتِ خلق" کے لئے وقف کر دیا تھا۔ تقسیم ہند سے قبل اسی موقوفہ جائداد کی آمدنی سے سال کے سال ریاست چھتاری میں باڑہ بٹتا تھا اور سینکڑوں فقیروں اور محتاجوں کو روئی کے لحاف، کمبل اور روپے ملتے تھے۔

دلی کے شریفی خاندان کے اطباء جو والیانِ ملک، رؤسا اور سیٹھ ساہوکاروں سے علاج معالجہ کے ہزاروں کی فیس وصول کرتے تھے۔ شہر دلی میں کسی مریض کو دیکھنے جاتے، تو فیس کا ایک روپیہ بھی نہ لیتے!

پاکستان کی (سابق) جماعت اسلامی نے پاکستان میں متعدد شہروں اور قصبوں میں شفاخانے کھول دیے تھے جن میں روزانہ ہزاروں مریضوں کو دوا دی جاتی تھی۔ مفت بھی اور قیمت سے بھی! مگر قیمت بہت ہی واجبی تھی! اس جماعت کے یہاں "خدمتِ خلق" کے نام سے باقاعدہ ایک شعبہ قائم تھا، نادار طلباء کے لئے اسی شعبہ سے کتابوں کے علاوہ فیس وغیرہ کا بھی بندوبست کیا جاتا تھا!

"خدمتِ خلق" ——— صرف "کوڑھی گھر" ہی کا تو نام نہیں ہے۔ یہ تمام باتیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے "خدمتِ خلق" ہی کی مختلف صورتیں ہیں ——— اور "کوڑھی گھر" کی مثال دیکھنی ہو تو ریاست حیدرآباد دکن میں خاصے بڑے پیمانے پر دار المجذومین (کوڑھی گھر) بھی قائم تھا۔

مسلمانوں کی تاریخ اللہ تعالیٰ کے فضل سے "خدمتِ خلق" کے معاملہ میں تسلسل رکھتی ہے۔ یہ تسلسل بعض اوقات مضمحل ضرور ہو گیا ہے مگر ٹوٹنے نہیں پایا! انفرادی اور اجتماعی طور پر خدمتِ خلق کا کام ہوتا ہی رہا ہے۔ "خدمتِ خلق" کی یہ اسپرٹ مسلمانوں میں اسلام ہی کی تعلیمات نے پیدا کی ہے اور اس کا مقصد بھی "عبادت" کی طرح اللہ تعالیٰ کی منشا کا

حاصل کرنا ہے۔

یہ بات اس زمانہ میں خواص کیا معمولی لکھے پڑھے لوگ بھی جانتے ہیں کہ تمدن و تہذیب نے مسلمانوں کے دور میں بھی ترقیاں پیدا کی ہیں، کوئی شک نہیں کہ عیسائیوں کی "مشنری اسپرٹ" قابل قدر ہے مگر مسلمانوں کے دور میں عیسائیوں کے یہاں اندھوں کے ہسپتال اور کوڑھی گھر کہاں موجود تھے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ شیکسپیر کے زمانے تک بھی "اپاہج گھروں" کا وجود نہیں ملتا ——————— اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس زمانے میں کوڑھیوں کی اتنی تعداد کہاں تھی۔ جتنی آجکل ہے۔

میں اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ مسلمانوں میں جہاں بہت سی کمزوریاں آئی ہیں، ان میں کی ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ "خدمتِ خلق" اور "حقوق العباد" کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے مقابلہ میں ثانوی درجہ کی چیز سمجھ کر اس کی طرف سے بے پروائی برتی جاتی ہے! "حق اللہ" اور "حق العباد" دونوں اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں، اور ان میں سے کسی کے حق کو بھی گھٹایا جائے گا، انسانی زندگی اور معاشرے میں ابتری رونما ہو جائے گی۔ جو عبادت گزار، عارف اور مبلغ دین اللہ کے بندوں کے دکھ درد کا احساس نہیں رکھتا، وہ اللہ کی محبت اور عبادت کا بھی حق ادا نہیں کر سکتا، ورایسے بے حس اور سنگدل آدمی کی عبادت بے روح ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کی محبت اور عبادت کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ دل میں گداز اور رقت پیدا ہو، اور دل کا یہ گداز اللہ کے بندوں کی خدمت کے کام آئے! "ایثار" انسانی زندگی کا بہت بڑا شرف ہے، وقت کا، مال کا، آرام و راحت اور تمنا و خواہش کا ایثار! خود غرض آدمی، جس کی تمام تگ و دو کا مرکز صرف اپنی ذات ہوتی ہے، صرف عبادت، اور وظائف کی کثرت کے سبب اللہ کا پیارا نہیں ہو سکتا! اللہ تعالیٰ تو احسان کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔

خالص "ترکِ دنیا" کی تعلیم جوگیانہ اور راہبانہ تعلیم ہے، ہاں! "ترکِ دنیا" سے جہاں "فواحش و منکرات" کا ترک و اجتناب مراد و مقصود ہے، وہ ہر آئینہ مستحسن ہے! ایسا شب بیدار زاہد جس کے پڑوس میں بیمار کراہ رہے ہوں اور وہ ان کے کام نہ آکر، نوافل پڑھنے اور "ذکر و شغل" کرنے میں مشغول ہو۔ ایک سنگدل انسان ہے۔ اس کی ایسی عبادت اس کے منہ پر مار دی جائے گی!

فاضل مضمون نگار کی طرح ہم بھی ایسے مجاہدے، ریاضت اور تزکیۂ نفس کو غیر مستحسن سمجھتے ہیں جس میں اللہ کے بندوں کی خدمت کا خانہ خالی ہو، جن لوگوں نے قوم کو مجاہدہ و ریاضت اور ذکر و شغل کی اس راہ پر ڈالا ہے، انھوں نے "خدا رسیدگی" اور "واصل باللہ" ہونے کی حقیقت ہی کو نہیں سمجھا۔ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی تو ان نیک لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو عمر فاروق کی طرح رات کی تاریکی میں پیٹھ پر آٹے کی بوری لاد کر، کسی بھوکے اور نادار گھرانے کی طرف جا رہے ہوں! لوگوں کے راستے سے کانٹے، کانچ کے ٹکڑے اور نکیلے پتھر اور ٹھیکرے ہٹا دینا، نفل عبادت سے کہیں بڑھ کر ثواب کا کام ہے!

دنیا کے جس ملک میں بھی جو کوئی فرد، جماعت، ادارہ، حکومت یا قوم "خدمتِ خلق" کا کام کر رہی ہے، اسکی افادیت کا ہم اعتراف کرتے ہیں، اور مسلمانوں کو ان کا فرض یاد دلاتے ہیں کہ "خدمتِ خلق" کا عملی مبلغ تو انہیں ہونا چاہیے یہ تو ان کے کرنے کا کام ہے!

تصویر کا دوسرا رُخ

"خدمت خلق" کے موضوع پر اپنے نظریا ور اعتقاد کو ہم وضاحت کے ساتھ اوپر ظاہر کر چکے ہیں اس لئے آگے چل کر جو کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں اسے پڑھ کر کسی قسم کی غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہئے

مسلمانوں میں "خدمت خلق" کے جذبہ کی کمی اس وجہ سے بھی ہے کہ ان کا دین سے لگاؤ کم ہوتا جا رہا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں تو وہ عبادت الٰہی کے فرائض کو زیادہ ادا کرتے ہیں مگر خود ان کی غالب تعداد نماز، روزے اور حج و زکوٰۃ سے غافل ہے! آپ کسی جلسہ میں، دعوت میں، ہوائی جہاز، ریل کے ڈبے اور پانی کے جہاز میں اندازہ لگا سکتے ہیں کہ نماز پڑھنے والوں کی تعداد بہت ہی کم ملے گی: حالانکہ نماز کو دین کا ستون فرمایا گیا ہے، جس نے نماز کو چھوڑا اس نے گویا دین کو ڈھا دیا، قرنِ اول میں کسی مسلمان کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ تارکِ صلوٰۃ ہو سکتا ہے ـــــــ

تو جہاں امتِ مسلمہ کی یہ کمی دل میں کھٹک پیدا کرتی ہے کہ وہ "خدمت خلق" سے غافل ہے، وہاں اس کی اس حالت پر بھی دل کو ملال ہونا چاہئیے کہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد "ترکِ صلوٰۃ" جیسا بڑا گناہ کر رہی ہے کہ جس کا ڈانڈا کیا جانا "دین کے انکار" (کفر) تک مسلمان کو پہنچا دیتا ہے۔

کوئی شخص نماز پڑھ کر مطمئن ہو جائے کہ میں نے اپنا فرض منصبی ادا کر لیا، اور وہ اللہ کے بندوں کی خدمت سے کوئی سروکار نہ رکھے، تو یہ شخص معاشرے کے لئے وبال ہے، اسی طرح کوئی شخص "خدمتِ خلق" کر کے یہ سمجھ بیٹھے کہ نماز، روزہ کی اس کے لئے ضرورت باقی نہیں رہی، تو اس ذہنیت و مزاج کا "خادمِ خلق" اللہ کے دین کا باغی ہے ـــــــ

یہ دونوں غلط "کردار" ہیں۔ ایک مسلمان کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ خدمتِ خلق اور "خدمتِ خلق" کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی کرنی چاہئیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بندوں کی خیر خواہی کا پورا حق ادا فرمایا مگر اس حق، ادا کرنے میں حضورؐ کی ایک وقت کی نماز بھی قضا نہیں ہوئی۔

اس مسئلہ کا ایک پہلو اور بھی ہے ـــــــ وہ یہ کہ ایک خوبصورت مکان میں بڑی صفائی ستھرائی نظر آتی ہے، ہر چیز صاف ستھری اور قرینے سے رکھی ہوئی، مگر ایک بصیر اور ناظر ([illegible]) کی نگاہ خوبصورت مکان کی صفائی ستھرائی ہی کو خراجِ تحسین ادا کر کے اگر رہ گئی، تو یہ بڑا ناقص مشاہدہ ہوا، اُسے یہ بھی تو دیکھنا چاہئیے کہ اس صاف ستھرے گھر کا پورا ماحول اخلاقی گندگی میں ستھڑا ہوا ہے! کوئی شک نہیں کہ یورپ میں "کوڑھی گھر" قائم ہیں جہاں جسمانی کوڑھیوں کا علاج ہوتا ہے، لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ تمام یورپ فسق و فجور کے جذام اور گناہوں کے کوڑھ میں مبتلا ہے۔

کوئی شک نہیں کہ ہم سب اصلاح کے محتاج ہیں، پوری قوم کو سُدھارنے کی ضرورت ہے اور افراد و معاشرہ کی اصلاح کے سلسلہ میں جو کوئی ایک قدم بھی اٹھاتا ہے، اُس کے لئے ہمارے دل میں تشکر و تحسین کے جذبات اُمڈ آتے ہیں مگر یہ "اصلاح" اسلام کے نظامِ اخلاق کے حدود میں رہ کر ہونی چاہئیے، جو اصلاح پسند اس حقیقت کو سمجھ لے گا۔ وہ اپنی کوششوں سے قوم کو فائدہ پہنچائے گا!

ضروری تصحیح :- فاران ماہ اگست ۵۹ء ـــــ صفحہ ۳ ـــــ سطر ۲۲ ـــــ کے جملہ کو اس طرح درست فرما لیا جائے۔

"اللہ تعالیٰ شدید العقاب ہونے کے ساتھ حلیم بھی ہے مگر اُس کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے"

(بسلسلہ نقشِ اول)

محمد مسعود احمد (ایم۔ اے)

غمگین دہلوی

نام میر سید علی، تخلص غمگین اور لقب خدا نما* تھا۔ ۱۱۶۶ھ/۱۷۵۲ء میں آپ دہلی میں پیدا ہوئے۔ اپنے دور کے بڑے عالم، محقق، متبحر و ولی کامل تھے۔ ایک صوفی شاعر کی حیثیت سے ممتاز تھے۔ اپنے عم بزرگوار میر فتح علی شاہ سے بیعت تھے۔ بعد میں چشتیہ کے ایک بزرگ شاہ ابوالبرکات سے استفادہ کیا۔ چنانچہ اپنے دیوان رباعیات مکاشف الاسرار کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں :—

"یہ فقیر بارہ برس کا تھا کہ حضرت والد ماجد کا انتقال ہوگیا۔ اس زمانہ میں زیادہ تر میں اپنی جدہ شریفہ مطہرہ ... بنت خواجہ آل الٰہی ابن خواجہ بہاؤالدین، ابن خواجہ باقی باللہ الحسینی تخلص بہ بیرنگ قدس اسرارہم کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ جناب مکرمہ نے ایک دن مجھے نصیحت فرمائی کہ تجھے چاہیے کہ تحصیل علوم کرے اور راہ حق میں نظر اپنی رکھے ——

جب میرا سن پچیس سال کا ہوگیا تھا، اس وقت میں تحصیل علوم میں مشغول ہوا اور ایک خواب کی تعبیر کے سلسلہ میں اپنے عم محترم واقف اسرار خفی و جلی جناب سید میر فتح علی شاہ صاحب کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر شرف بیعت سے سرفراز ہوا

بارہ سال بعد حضرت شاہ ابوالبرکات صاحب کی خدمت میں گوالیار پہنچا اس حالت میں پہنچا جب کہ میرا ... وجع مفاصل کی وجہ سے معذور تھا —— اور جو دلی مدعا تھا خدا کی عنایت سے حاصل ہوگیا۔" ——

(سیرت الصالحین: ابراہیم بیگ چغتائی)

حضرت غمگین ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء میں بسلسلۂ رشد و ہدایت دہلی سے گوالیار تشریف لے گئے تو مہاراجہ دولت راؤ اس قدر معتقد ہو گیا کہ پھر آپ کو وہاں سے کہیں جانے نہیں دیا۔ چنانچہ آپ وہیں اقامت گزیں ہوگئے۔ آخر عمر میں شغل شعر و شاعری بھی بیشتر رہا۔ ۱۳ صفر المظفر ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۰ء کو آپ نے اکیاسی سال کی عمر طویل پا کر یہیں انتقال فرمایا۔ آپ کا مزار ... گوالیار کے ... دامن کوہ میں ہے۔

حضرت غمگین نے ابتدا جوانی سے شاعری شروع نہیں کی، بلکہ جب آپ کی عمر ۶۰ سال کی تھی اس وقت اشعار موزوں ہونے لگے اور مزید قابل حیرت بات یہ ہے کہ آپ نے اس عمر میں شعر گوئی شروع کی اور یہ کمال پیدا کیا کہ آپ کے کلام کا مطالعہ کرنے والا آپ کے ہاں کہنہ مشق اساتذہ کی سی صفائی زبان اور بلندی تخیل پاتا ہے۔ اور تصوف کی چاشنی نے تو کلام میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ دراصل یہ سب کچھ شیخ کی نظر دل کا ایک کرشمہ تھا۔ غمگین خود تحریر فرماتے ہیں :-

"یک روز در باغچہ نشستہ بودند کہ مہاراجہ دولت راؤ عالی جاہ بہادر تیر کمانیدہ بود۔ حضرت پیر و مرشد شاہ ابوالبرکات سخنے فرمودند کمال بارکیب۔ و از حاضران فرمودند کہ معنی ایں بیان کنید؟ ہر یک از یاراں موافق استعداد خود عرض نمودند۔ فقیر را ہم گفتند کہ تو ہم چیزے بگو؟ من ہم موافق استعداد خود چیزے عرض نمودم۔ دیدم کہ بہ چہرۂ مبارک شاں بشاشتے پیدا آمدہ در آں بشاشت فرمودند 'عنقریب مثل طوطی گویا خواہی شد'۔ پس بعد پنج سال اسرار را در دل فقیر جوش آورد، کہ طاقت تحمل ...

---

* یہ لقب دینی اعتبار سے حد درجہ قابل اعتراض ہے۔ (فاران)

مگر اسی کے ساتھ ساتھ غمگین نے یہ بھی پیشین گوئی کر دی تھی کہ:-

زمانے خواہد آمد کہ رباعیات ہم رفتہ خواہد شد۔ حالا ہمین [illegible]

(رقعی مکتوب غمگینؒ۔ خط ۳۰ جلد ۲ مکتوب ۱۵۔ نقیب [illegible] گوالیار)

چنانچہ یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ اردو کا دیوان جو حضرت غمگین رح نے مرتب کیا تھا ناپید [illegible] جامع مسجد دہلی کے ایک کتب فروش سے مولانا محمد یونس خالدی کو نہایت خستہ حالت میں دستیاب ہوا اور اس طرح یہ یادگار [illegible]

اصناف سخن میں صنف غزل کے بعد رباعی نہایت مشکل ہے۔ بلکہ اس کے شرائط اور قیود چند ایسی ہیں [illegible] ہر کس کو تو اس کو چھونے کی بھی جرأت نہ ہو۔ مگر غمگین رح نے رباعی گوئی کا حق ادا کیا۔ اختصار اور جامعیت [illegible] دی۔ خود تحریر کرتے ہیں:-

رباعی

عارف کرے کس طرح نہ ہر اک کو پسند	غمگین ہیں رباعیات تری جو یہ چند
ذرے میں کیا ہے مہر کو پوشیدہ	دریا کو کیا ہے کوزے میں بند

بقول شفا گوالیاری غمگین کی رباعیات میں وہ تمام آرٹ اپنی تمام رنگینیوں اور رعنائیوں کے ساتھ موجود ہے جو رباعی کے لیے مخصوص ہے۔ عرفان اور حقیقت کا ایک طوفان ہے جو امنڈا آتا ہے۔ فلسفہ، حکمت کا ایک سیلاب [illegible] رواں دواں ہے۔ پند و نصائح کا درس ہے۔ اور فقر و تصوف کے انوار کے باغ کھل رہے ہیں۔ تصوف کے [illegible] پیچیدہ مسائل بصیرت و حکمت اور سوز و محبت کی آنچوں سے پگھلا پگھلا کر حل کیے ہیں۔ عبد و معبود، اخلاق، انسانیت کا درس بڑی خوبی [illegible] تحسین اور ایمائیت سے دیا ہے۔ خمریات میں آپ نے زاہد و واعظ پر بڑے تیکھے تیکھے طنز فرمائے ہیں۔ مگر اتنے بڑے ذخیرہ کلام میں کہیں عریانی یا ابتذال نہیں ہے۔ ہر جگہ متانت و تہذیب کا دامن مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہے ہیں۔ جس طرح آپ غزل میں کسی کے پیرو یا مقلد نہیں اسی طرح رباعیات میں بھی خاص اپنا رنگ، اپنا انداز، اپنا اسلوب رکھتے ہیں۔ آپ کے روحانی استادان حضرت مولانا روم، [illegible] تصوف کے روحانی رہنما رباعی گو عمر خیام، سرمد اور ابوسعید ہیں۔ انھیں اکابر شعرا کا کلام آپ کے مطالعہ میں رہا۔ نیز دوسری متصوفانہ [illegible] آپ کے شعور میں رچ بس گئی ہیں۔ سب کے اجزائے لطیف کے مرکب سے علیحدہ رنگ نکھرا۔ جس طرح گلاب، مشک، موتیا، تمام عطریات کو ملا کر سونگھا جائے تو ان سب کی الگ الگ خوشبو نہیں آئے گی، بلکہ ایک بے نام اور خاص کیفیت کی خوشبو اور رنگ ہوگا۔ یہی کیفیت کلام غمگین رح کی ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

رباعیات

دے مشرب عشق مجھ کو سب دینوں میں	دنیا میں رکھ ہمیشہ غمگینوں میں
بس یہی دعا ہے تجھ سے غمگین کی میرے	محشر میں اٹھائیو تو مسکینوں میں

درویشی نہ خرقہ کہن ہے غمگین!	[illegible] نہ زہد ہے نہ فن ہے غمگین!
بیداری شب ہے کچھ نہ ہے صوم دوام	خلوت لیکن در انجمن ہے غمگین!

ہر چند بلائے ناگہانی ہے موت — ایک نہ ایک روز آنی ہے موت
مرنے سے اگر پہلے مرے جواں غمگیں — واللہ کہ اس کی زندگانی ہے موت

گر مے کا نشہ نہ ہو تو مستی ہے ہیچ — اور عشق نہ ہو تو بت پرستی ہے ہیچ
غمگیں یہ بات یاد رکھیو میری — جب تک کہ فنا نہ ہو یہ ہستی ہے ہیچ

ایک غزل

کون جیتا ہے شب ہجر سحر ہونے تک — عمر اک چاہیے یہ عمر بسر ہونے تک
خون ہو کے دل بیتاب ہیں قربان تیرے — صدف چشم میں اشکوں کے گہر ہونے تک
خانہ برباد کہیں دیکھ نہ ہو گھر برباد — دل میں اس بت کی وفا کا ترے گھر ہونے تک
مثل شبنم نہیں کچھ ہستی موہوم اپنی — کہ ترے مہر کی تعقیب پہ نظر ہونے تک
آئے بھی اور گئے دل ہی دل رہے کہ غمگیں
ہائے کیا کیا نہ ہوا ہم کو خبر ہونے تک

متفرق اشعار

آخر بھر آگئے اپنے ہی دل میں ملا سراغ — ہم ڈھونڈ آئے اس کو کہاں سے کہاں تلک

اس ساز دل سے نکلے ہے ہر نالہ سوز کے — محتاج میں نہیں ہوں کسی سوز ساز کا

ساقی! وہ دم کہاں ہیں؟ کہاں ہے وہ ناؤ نوش؟ — بارے کشتی کے بس میں رہے ہیں حواس و ہوش؟

نئی طرح سے اب ستاتے ہیں آہ! — بھلاتے ہیں مجھ کو نہ آتے ہیں آپ!

ایک غمگیں ہی کچھ نہیں صدقے، — ترے زباں سے دو جہاں اے شوخ

شب وصل میں شمع ساں مجھ کو آہ! — جلاتے، ہنساتے، رلاتے ہیں آپ

المختصر غمگین رہنے گو غزلیں بھی کہیں ہیں مگر رباعی گو شاعر ہونے کی حیثیت سے آپ اردو رباعی گو شعرا میں اول ہیں۔ اکثر تذکرہ نویسوں نے آپ کی شاعری اور حالات پر تبصرہ کیا ہے مثلاً٭ ان تذکروں میں آپ کا ذکر ملتا ہے :۔

سخن شعرا، طبقات الشعرا، یادگار شعرا، مجالس رنگین، مجموعہ نغز، کلیات نثر غالب، بحر التصوف، عیار الشعراء، کیفیۃ العارفین، گنجینۂ صغریٰ، اور لسبۃ العاشقین وغیرہ۔ مگر سب تبصروں میں مرزا غالب کا تبصرہ حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے، وہ تحریر کرتے ہیں

انچہ در دیوان فیض عنوان دیدہ کا فر باشم اگر در غنوی مولانا روم
و دیگر کتب تصوف ایں را دیدہ باشم۔ خاصہ در رباعیات کہ ہر گزیدہ رباعیے
وہر ذرہ آفتابے دارد واگر حیات باقی ست زیں سپس حال رباعیات
نگاشتہ خواہد شد

(قلمی مکتوب غالب۔ کتب خانہ نقیب منزل۔ گوالیار)

٭ اس مقالہ کی زیادہ اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ حضرت غمگین دہلوی کی ذات کو اعتبار سے میرتقی میر کے ہم عصر ہیں ——— [illegible]
جو چند نمونے مقالے میں دیے گئے ہیں اُنھیں پڑھ کر ارباب ذوق فیصلہ کر سکتے ہیں کہ غمگین کس پایہ کے شاعر [illegible] قدیم شعرا [illegible] صف میں وہ کیا مقام رکھتے ہیں؟ ——— ([illegible])

مقامِ حدیث

اسد ملتانی

زاشتباہ نہ باشد، زِ احتیاط بود
اگر بایں روایت بہ اَو دُکما قال اَست

شک آوردن بحرفش کم نگاہی است
زپیغمبرؐ بہ قولِ حق گواہی است
یقین کردیم بر قولِ محمدؐ
کہ او فرمود، ایں قولِ الٰہی است

نمی دانیم او حرف از کجا گفت
شنیدیم آنچہ پیغمبرؐ بما گفت
بود محذوف مِن قِبَل ہر آیت
"پیمبر گفت ما، ایں یا مِن خدا گفت"

حدیثِ مصطفےٰؐ را صورت این است
کہ ظنی بود نش بنیادِ دین است
اسد، خوش گفت مولانائے ایوب
عمل بر ظنّ و ایماں بر یقین است

انقلاب

میر حسّان الحیدری

جوں لاکھ سلام اس آقا پر بت لاکھوں جس نے توڑ دیئے
دنیا کو دیا پیغامِ سکوں طوفانوں کے رُخ موڑ دیئے
اس جانِ جہاں کی باتوں میں کچھ لطف ہی ایسا ہمنفسو!
جس دن سے چھڑا ہے ذکرِ نبیؐ سب فکرِ جہاں کے چھوڑ دیئے
یہ فیضِ نگاہِ ساقی ہے۔ اک کیف سا دل میں باقی ہے
کیا ذکر ہے جام و مینا کا۔ ہم نے تو سبو بھی توڑ دیئے
گو ظاہر اُجلا اُجلا ہے پہ من کا درپن میلا ہے!
اِن بوالہوسوں کا کیا کہنا آدابِ محبت چھوڑ دیئے
ہر آنکھ ہے نم ہر دل ہے حزیں کوئی بھی چمن میں شاد نہیں
قمری کو کوکو یاد نہیں، بلبل نے بھی نغمے چھوڑ دیئے
بدنام برہمن ہے ورنہ کچھ شیخ بھی اس سے کم تو نہیں
خواہش کے صنم کی پوجا کی۔ گو پتھر کے بت توڑ دیئے
اُس محسنِ عالم نے حسّاں کیا کیا نہ دیا انسانوں کو
منشور دیا۔ دستور دیا۔ کچھ راہیں دیں کچھ موڑ دیئے

دو غزلیں

تسکین قریشی

غم دل اور اتنا راحت انجام
خوشا اے بیدلیِ عشق ناکام

محبت آہ و زاری کا نہیں نام
مگر بے بس کے بھی بنتا نہیں کام

ہجوم شوق، بیحد عشق، ناکام
نجانے دل کا کیا ہونا ہے انجام

ستم ہوں کیوں نہ تیرے دور میں عام
خموشی جرم ہے فریاد الزام

محبت بھی ہے رسوائی کا ڈر بھی
اسے نام محبت کر نہ بدنام

تکلف برطرف اے دشمن دل
وفا کا تجھ پہ آجائے نہ الزام

یقین، ذوقِ جنوں کی شرط اول
جنوں، خود آگہی کا دوسرا نام

عذاب ہجر برحق، لیکن اے دوست
ملے گا تیرے دل کو بھی نہ آرام

میں کس عالم کو سمجھوں اپنا عالم
کہ ہر آغاز ہے، آغاز انجام

نہیں اتنا تو اہل دل بھی تسکین
جہانِ حسن میں جتنا ہے بدنام

عبدالمجید حیرت

وہ کیا صبح آتے، وہ کیا شام آتے
اگر آ بھی جاتے، تو کس کام آتے

سبھی کچھ سہی اُن کی سرکار، لیکن
وہاں جا کے بھی ہم تو ناکام آتے

اگر وہ نگاہ کرم ہم پہ ہوتی
خیالات ہی دل میں کیوں خام آتے

قدم کوئے الفت میں اک بار رکھ کر
کسی پر کہاں تک نہ الزام آتے

اگر داستانِ وفا کوئی لکھتا
تو فہرست میں چند ہی نام آتے

ہمیں میں نہ تھی تاب ورنہ اُدھر سے
ابھی اور بھی تلخ پیغام آتے

ہمیں کوئی اول تو کیوں مول لیتا
اگر بک بھی جاتے، تو کیا دام آتے

یہ اربابِ نخوت، غریبوں کی خاطر
کبھی چل کے خود بھی تو دو گام آتے

کوئی کاش میخانہ ایسا بھی ہوتا
جہاں بے طلب جام پر جام آتے

فلاکت کے مارے ہوؤں پر الٰہی
کبھی تو فراغت کے ایام آتے

اگر ہم فلک پر بھی ہوتے تو حیرت
وہاں بھی، یہی پیش آلام آتے

روحِ انتخاب

جن لوگوں نے کائنات کے نظم اور ملکوت ارض و سماء پر غور کیا ہے وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ کائنات علیحدہ علیحدہ مستقل الوجود اجزاء پر مشتمل نہیں ہے بلکہ وہ ایک کل ہے جس کے تمام اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔ زمین کا ایک ذرہ مریخ اور عطارد کے ذرات سے ویسا ہی تعلق رکھتا ہے جیسا میرے سر کا ایک بال میرے ہاتھ کے ایک رونگٹے سے رکھتا ہے۔ گویا پوری کائنات ایک جسدِ واحد ہے اور اس کے اجزاء میں باہم ویسا ہی ربط ہے جیسا ایک جسم کے اجزاء میں ہوتا ہے۔ پھر جس طرح کائنات کے اجزاء میں ربط اور تسلسل ہے۔ اسی طرح ان واقعات میں بھی ربط و تسلسل ہے جو اس کائنات میں پیش آتے ہیں۔ دنیا کا کوئی چھوٹا یا بڑا واقعہ بجائے خود ایک مستقل واقعہ نہیں ہے، بلکہ وہ تمام کائنات کے سلسلۂ واقعات کی ایک کڑی ہے اور اس کلی مصلحت کے تحت صادر ہوتا ہے جس کو پیش نظر رکھ کر خداوند عالم اپنی اس غیر محدود سلطنت کو چلا رہا ہے۔ اب یہ امر قابل غور ہے کہ جس شخص کی نظر پوری کائنات پر نہیں، بلکہ اس کے ایک نہایت ہی حقیر حصے پر ہو جس کو کل کے ساتھ اتنی نسبت بھی نہیں جتنی ایک ذرہ کو آفتاب کے ساتھ ہوتی ہے۔ اور جس شخص کے سامنے واقعات عالم کا پورا سلسلہ نہیں ہے بلکہ اس سلسلہ کی بے حد و حساب کڑیوں میں سے محض ایک دو یا چند کڑیاں ہیں، اور جو شخص کائنات کے اس حقیر حصے اور واقعات کی ان چند کڑیوں میں بھی صرف ظاہری سطح کو دیکھ رہا ہے، باطنی حقائق تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ اس کے پاس نہیں ہے، کیا ایسا شخص کسی جزئی واقعہ کو دیکھ کر اس کی حکمت و مصلحت کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے کا اہل ہو سکتا ہے؟ اور اگر وہ کوئی رائے قائم کرنے کی جرأت کرے تو کیا اس کی رائے صحیح ہو سکتی ہے؟

کائنات کا نظام اور خدا کی خدائی تو خیر اس قدر وسیع ہے کہ اس کے تصور ہی سے ہمارا ذہن تھک جاتا ہے۔ آپ ایک چھوٹے پیمانہ پر کسی انسانی سلطنت ہی کو لے لیجیے۔ جو شخص کرسیٔ وزارت یا تخت شاہی پر بیٹھا ہوا ایک بڑی سلطنت کا انتظام کر رہا ہے، وہ بھی اگرچہ ہماری ہی طرح کا ایک انسان ہے اور فطری استعداد کے لحاظ سے ہمارے اور اس کے درمیان کچھ زیادہ فرق نہیں ہے، نیز اس کے جتنے معاملات ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کو سمجھنے اور انجام دینے کی قوت و استعداد ہم میں نہ ہو، لیکن محض یہ فرق کہ وہ کرسیٔ حکومت پر سے تمام سلطنت کے نظم و نسق کو دیکھ رہا ہے اور ہم ایک گوشے میں اس نظم سے یک گونہ بے تعلق بیٹھے ہوئے ہیں، ہمارے اور اس کے درمیان اتنا عظیم تفاوت پیدا کر دیتا ہے کہ ہم بالفعل اس کے معاملات کو نہیں سمجھ سکتے۔ اور اگر کوئی جزئی واقعہ ہمارے سامنے آتا ہے تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی غایت و مصلحت کیا ہے؟ پھر جب انسان اور انسان کے درمیان محض پوزیشن کے فرق سے اتنا تفاوت واقع ہو جاتا ہے، تو غور کیجیے کہ انسان اور خدا کے درمیان کتنا تفاوت ہوگا؟ درآں حالیکہ یہاں پوزیشن کا نہیں حقیقت کا فرق عظیم ہے وہ تمام عالم پر سلطنت کر رہا ہے اور ہم اس کی سلطنت کے ایک نہایت ہی حقیر گوشے میں بیٹھے ہیں۔ اس کی دانش و بینش سارے عالم پر حاوی ہے اور ہماری دانش و بینش کی رسائی خود اپنے جسم کی باطنی حقیقتوں تک بھی نہیں۔ اس کی طاقتیں بے پایاں ہیں اور ہمارے پاس ان میں سے کوئی طاقت بھی نہیں، اگر اس تفاوت عظیم کے باوجود اس کے کاموں پر ہم تنقید کریں، اور ان کی حکمت و مصلحت کے متعلق کوئی رائے قائم کریں تو کیا یہ تنقید اس تنقید سے کرو ڑ درجہ زیادہ جاہلانہ نہ ہوگی، جو ایک گنوار اپنی جھونپڑی میں بیٹھ کر سلطنت برطانیہ کے معاملات پر کرتا ہے۔

اس سے زیادہ واضح ایک اور مثال لیجیے۔ فرض کیجیے کہ آپ ایک باغبان ہیں۔ جو باغ آپ نے بڑی محنت سے لگایا ہے اور جس کی ترتیب و تزئین میں آپ نے اپنی پوری مہارت صرف کر دی ہے، اس کے درختوں اور پودوں اور بیلوں سے یقیناً آپ کو محبت ہو گی۔ آپ ان کی حفاظت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے۔ ان کو بے ضرورت کاٹنا، چھانٹنا یا اکھاڑ پھینکنا آپ کبھی پسند نہ کریں گے۔ اور اگر کوئی غیر آکر ان پر تیشہ چلائے، تو آپ کو سخت ناگوار ہو گا۔ پھر آپ کو علمی طریق سے یہ بھی معلوم ہے کہ نباتات میں راحت اور اذیت، رنج و خوشی کا احساس ہوتا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ اگر درختوں اور پودوں پر قینچی یا کلہاڑی چلائی جائے تو ان کو بھی تکلیف ہوتی ہے [illegible] اور اپنے بچوں (پھلوں) سے جدا ہو جانے کا انھیں بھی رنج ہوتا ہے۔ لیکن اس محبت اور علم کے باوجود آپ ضرورت اور باغ کی مصلحت کا لحاظ کر کے اپنے باغ میں تراش خراش کرتے ہیں۔ ٹہنیوں اور شاخوں کو کاٹتے چھانٹتے ہیں، پودوں کو تراش کر قلمیں لگاتے ہیں، سبزی کو کاٹ کر ہموار کرتے ہیں۔ کچے اور پکے پھل حسب ضرورت اتار لیتے ہیں، کچھ ادھ کھلے پھول توڑ لیتے ہیں، غیر ضروری پودوں کو کھود ڈالتے ہیں، سوکھے ہوئے پودوں کو کاٹ پھینکتے ہیں۔

اگر درختوں اور پودوں اور بیل بوٹوں کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ سب کچھ سراسر ظلم ہے۔ اگر ان میں گویائی ہوتی تو وہ کہتے کہ یہ باغبان کیسا بے درد اور ظالم ہے۔ ہمارے اعضا کی قطع و برید کرتا ہے۔ ہمارے بچوں کو ہم سے چھین لیتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے پودوں کو جنھوں نے ابھی زندگی کی ایک بہار بھی نہیں دیکھی تھی اکھاڑ پھینکتا ہے۔ ننھی ننھی کلیوں کو توڑے جاتا ہے۔ بڈھوں کو دیکھے نہ بچوں اور جوانوں کو۔ بس کاٹنے سے کام ہے۔ اور کبھی تو ظالم ایک مشین لے کر اس طرح پھراتا ہے کہ ہماری برادری کے ہزاروں فرد ایک وقت صفایا کر ڈالتا ہے۔ کیا ایسا شخص شفیق و مہربان ہو سکتا ہے؟ کیا اس کے دل میں محبت اور رحمت و رافت کے پاکیزہ جذبات ہو سکتے ہیں؟ ہم تو اس کاٹ چھانٹ اور اکھیڑ پچھاڑ میں کوئی مصلحت بھی نہیں دیکھتے۔ ہمیں تو یہ ایک اندھا بے حس، سنگ دل وجود معلوم ہوتا ہے جو بغیر کسی علم و حکمت اور غرض و غایت کے کبھی ہم کو پانی دیتا ہے اور کبھی ہم پر قینچی چلاتا ہے، کبھی ہم کو کھاد بہم پہنچاتا ہے اور کبھی ہمیں کلہاڑی سے کاٹ پھینکتا ہے۔ کبھی دوسروں سے ہماری حفاظت کرتا ہے اور کبھی ہمیں خود اپنے ہاتھوں اکھاڑ ڈالتا ہے۔ کبھی بیماریوں میں ہمارا مداوا کرتا ہے اور کبھی خود ایک مشین لے کر ہمارا قتل عام کر دیتا ہے۔

اگر درخت آپ کے انتظام پر نکتہ چینی کریں تو آپ کیا کہیں گے؟ یہی نا کہ ان کی نظر محدود ہے۔ وہ صرف اپنے وجود اور اپنے قریبی متعلقات کو دیکھتے ہیں، مگر میری نظر وسیع ہے۔ میں باغ کی کلی مصلحت کو دیکھتا ہوں۔ وہ صرف اپنے پھل پھول، پتوں اور شاخوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ بہت بڑھے تو آس پاس کے پودوں اور درختوں سے محبت اور ہمدردی کے تعلقات پیدا کر لیے۔ مگر میرے پیش نظر پورے باغ کی بہتری ہے اور میں مجموعی طور پر سب کی اصلاح حال کے لیے عمل کر رہا ہوں۔ یہ نادان درخت، اور بیوقوف پودا یہ سمجھ رہا ہے کہ سارا باغ صرف اسی کی ذات اور اس کے دوستوں اور عزیزوں کے لیے لگایا گیا ہے اور ان کی ذات سے ہم کو جو کچھ دلچسپی ہے اپنے باغ کی خاطر ہے۔ جس حد تک باغ کی بہتری کے لیے مناسب اور ضروری ہے میں ہر درخت اور ہر پودے اور ہر بیل بوٹے کی حفاظت اور پرورش کرتا ہوں۔ مگر جب باغ کی مصلحت متقاضی ہوتی ہے تو میں اس میں کاٹ چھانٹ، تراش خراش اور اکھیڑ پچھاڑ سب کچھ کرتا ہوں کیونکہ باغ کا مجموعی مفاد میرے نزدیک ایک ایک پودے اور ایک ایک درخت اور بیل بوٹے کے شخصی مفاد سے زیادہ قیمت رکھتا ہے۔ یہ گمان کرتے ہیں کہ میں دشمنی کی راہ سے ان پر ہاتھ صاف کر رہا ہوں لیکن یہ محض ان کی نادانی اور تنگ خیالی ہے۔ ان میں یہ صلاحیت نہیں کہ باغ کے معاملات اور اس کے مصالح کو سمجھ سکیں۔ ان کے پاس صرف اپنی تکلیف کا احساس اور اپنی راحت اور زندگی کی خواہش ہے۔ جب ان کی خواہشات اور احساسات کو صدمہ پہنچتا ہے تو یہ بے صبر ہو جاتے ہیں اور مجھ پر ظالم ہونے کا شبہ کرنے لگتے ہیں مگر حقیقت ان کے گمان کی تابع نہیں ہے

ان کے سمجھنے سے ہیں درحقیقت ظالم نہیں ہو سکتا اور ان کی خاطر ہیں اپنے باغ کے انتظام کو بھی نہیں بدل سکتا۔ اس چھوٹی سی مثال کو جب آپ پھیلا کر دیکھیں گے تو آپ کو اپنے بہت سے گلوں شکووں کا جواب مل جائیگا۔

کائنات کے نظم پر جب ہم غور کرتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اس زبردست کارخانے کو بنانے اور چلانے والا یقیناً ایک ایسا وجود ہونا چاہئے جو کمال درجہ حکیم و دانا اور علیم و خبیر ہو جس نے ہم میں خواہشات پیدا کی ہیں ممکن نہیں کہ وہ ہماری خواہشات سے بے خبر ہو۔ جس نے ہم میں احساسات پیدا کیے ہیں ممکن نہیں کہ وہ ہمارے احساسات سے ناواقف ہو۔ جس نے بچے کو پیدا کیا ہے اور بچے کی پرورش کے لئے ماں باپ کے دل میں محبت پیدا کی ہے وہ ضرور جانتا ہے کہ بیماری اور موت سے بچے کو کیا تکلیف ہوتی ہے اور ماں باپ کے دل کو کیا صدمہ پہنچتا ہے۔ لیکن جب یہ سب کچھ جاننے اور ہم سے زیادہ جاننے کے باوجود اس نے بچے اور ماں باپ کو یہ اذیت دینا گوارا کیا۔ جب ہمارے احساسات سے باخبر ہونے کے باوجود اس نے ان کو پامال کرنا پسند کیا۔ جب ہماری خواہشات کا علم رکھنے کے باوجود اس نے ان کو پورا کرنے سے انکار کیا۔ تو ہم کو سمجھنا چاہیے کہ ایسا کرنا یقیناً ناگزیر ہی ہوگا اور اس علیم و خبیر کے علم میں اس سے بہتر کوئی دوسری صورت ہوگی ورنہ وہ اس بدتر صورت ہی کو اختیار کرتا۔ کیونکہ وہ حکیم ہے اور حکیم کے حق میں یہ گمان نہیں کیا جاسکتا کہ اگر بہتر تدبیر ممکن ہو تو وہ اسے چھوڑ کر بدتر اختیار کرے گا۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی حکمتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور نہیں آسکتیں، اس لیے کہ ہماری نظر پورے نظام عالم پر نہیں ہے اور ہم نہیں جان سکتے کہ نظام عالم کے مصالح کیا ہیں اور ان کے لیے کس وقت کونسی تدبیر ضروری ہے۔ لیکن اگر اجمالی طور پر ہم اللہ تعالیٰ کی حکمت و دانائی اور اس کے علم کامل پر صحیح اعتقاد رکھتے ہوں تو ہر آفت کے نزول پر ہم سمجھ لیں گے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اسی کی متقاضی ہوگی اور اس کے علم میں ایسا ہی مناسب ہوگا۔ اور ہمارے لیے بجز تسلیم و رضا کے اور کوئی چارہ نہیں۔

پھر ایک دوسری بات جو غور و فکر سے ہم کو معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جو ہستی کائنات کے اس نظام کو چلا رہی ہے اسکے پیش نظر خیر کلی ہے اس کے کاموں میں جو امور ہم کو شر اور فساد نظر آتے ہیں وہ دراصل اعتباری شرور ہیں، یعنی افراد و اشخاص کی طرف قیاس کرتے ہوئے ان کو شرور کہا جاسکتا ہے۔ مگر حقیقت میں وہ سب خیر کلی ہی کے لئے ہیں اور ان کا وقوع دراصل خیر کلی کے حصول کا ایک ناگزیر وسیلہ ہے۔ اگر یہ شرور ناگزیر نہ ہوتے اور انکے بغیر خیر کلی کا حصول ممکن ہوتا تو خدائے حکیم و علیم ان کو اختیار نہ کرتا، اور کوئی دوسرا انتظام تجویز کرتا۔ خود ہم اپنی کمزوری اور نارسائیوں کے باوجود جب گہری نظر سے دیکھتے ہیں، تو ہماری عقل حکم لگاتی ہے کہ اس کائنات کیلئے اس سے بہتر نظام ممکن نہیں ہے کوئی دوسرا انتظام ایسا تجویز نہیں کیا جاسکتا جو ان جزوی و اعتباری شرور سے یکسر خالی ہو۔ بلکہ اگر یہ شرور واقع نہ ہوں تو حقیقت میں انکا عدم ایک بڑا شر ہوگا کیونکہ وہ ایک خیر جزئی کی خاطر بہت سے خیرات کے حصول کو روک دیگا۔ مثال کے طور پر موت ہی کو لے لیجئے جسپر انسان سب سے زیادہ داویلا کرتا ہے۔ ایک شخص کی موت کتنے اشخاص کیلئے زندگی کا راستہ صاف کرتی ہے۔ اگر ایک شخص کو زندگی مل جائے تو اسکے معنی یہ ہیں کہ بہت سے اشخاص پر زندگی کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ اسکی دائمی زندگی اگر خیر ہے تو صرف اسکی ذات کے لئے ہے لیکن خیر کلی کے لئے وہ شر ہوگی بخلاف اس کے اس خاص شخص کی موت صرف اس کیلئے ایک جزئی شر ہے، لیکن یہی شر بہت سے جزئی خیرات کے حصول کا ذریعہ بھی ہے۔ رہا خیر کلی تو اس خاص شخص کے مرجانے سے اس میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔ کیونکہ نظام عالم میں اس کی موت سے کوئی خلل نہیں آتا۔ اسی مثال پر قیاس کرکے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اشخاص پر جتنے مصائب نازل ہوتے ہیں وہ سب ایک اعتبار سے شر ہیں اور دوسرے اعتبار سے وسیلۂ خیر۔ اور خیر کلی کیلئے ان کا وقوع ناگزیر ہے۔ بسا اوقات ہم خود غور کرکے انکے وسیلۂ خیر ہونے کی جہت کو سمجھ لیتے ہیں۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تجربہ سے ہم پر ثابت ہو جاتا ہے کہ جس چیز کو ہم نے شر سمجھا تھا، وہ حقیقت میں سبب خیر تھی۔ لیکن اگر کبھی کسی شر کی جہت خیر ہماری سمجھ میں نہ آئے، تب بھی ہمکو محض اس حقیقت پر ایمان رکھنا چاہیے کہ اللہ جو کچھ کرتا ہے بہتر کرتا ہے اور ہماری خیریت اسی میں ہے کہ اسکی قضا کے آگے سر جھکا دیں، خواہ اسکے فعل کی علت ہماری سمجھ میں نہ آئے۔ (سید ابو الاعلیٰ مودودی۔ تفہیمات)

ہماری نظر میں

تشبیہاتِ رومی از:- ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم، ضخامت ۶۰۵ صفحات (مجلد، خوشنما ٹائپ گرد پوش کے ساتھ) قیمت آٹھ روپے - ملنے کا پتہ:- ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، ۲ کلب روڈ، لاہور۔

فارسی زبان کی چار کتابوں ـــــــ مثنوی مولانا روم، گلستاں، شاہنامہ اور دیوانِ حافظ ـــــــ کو ہر زمانہ میں قبولِ عام حاصل رہا ہے اور بادشاہوں کے قصر و ایوان اور وزراء کے درباروں سے لے کر دانش گاہوں اور کارواں سراؤں تک میں اُن کے چرچے رہے ہیں! ان کتابوں میں دینی اور علمی اعتبار سے مثنوی مولانا روم کا درجہ سب سے ممتاز ہے، اس شہرۂ آفاق کتاب نے اہلِ علم کے افکار پر اثر ڈالا ہے اور یہ کتاب آسمانی صحیفہ کی طرح اربابِ وجد و حال کے مطالعہ میں رہی ہے!

اردو زبان میں مثنوی کا منظوم ترجمہ ہوا ہے اور اس کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں، مگر ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے جس انداز میں مثنوی کے مطالب اور فلسفہ کو پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ ایک منفرد کوشش ہے، ڈاکٹر صاحب مرحوم کا شاعرانہ ذوق وسعتِ مطالعہ، فلسفیانہ تبحر، اس پر علامہ اقبالؒ کے ساتھ برسوں ہم نشینی، یہ تمام خوبیاں "تشبیہاتِ رومی" میں گھل مل کر بڑی دل نشین اور پُرسوز بن گئی ہیں۔ پچھلے شارحین اعتزال، ماتریدیت اور اشاعرہ کے مسلک پر تو مثنوی کی شرح میں گفتگو کر سکتے ہیں۔ مگر برگساں، ڈارون اور نطشہ الماآوی کے بعض نظریوں کا حکمتِ رومی سے کیا تعلق ہے، اس کی خلیفہ عبدالحکیم مرحوم ہی نے نشاندہی کی ہے اور ان مسائل پر عالمانہ انداز میں گفتگو فرمائی ہے! یہ جو تصوف میں ذات بحث کے تنزلات اور نورِ الٰہی کے "مدارج تجلیات" کی بحث ملتی ہے، جس کا ذکر مولانا روم نے بھی اپنی مثنوی میں کیا ہے، اُس پر یہ تبصرہ "تشبیہاتِ رومی" کے علاوہ شاید ہی کہیں اور مل سکے کہ یہ تصورات اسکندریہ کے مشہور حکیم فلاطینوس کی تعلیمات سے اخذ کئے گئے ہیں، ان مباحث نے اس کتاب میں بڑی جدت اور تازگی پیدا کر دی ہے۔

منطق و فلسفہ سے حقائق کی گتھی سلجھنے کے بجائے اور الجھ جاتی ہے، اس پر خلیفہ مرحوم کے یہ جملے کتنے وقیع ہیں:-

> "جس قدر زیادہ منطق بگھارو اسی قدر حقیقت رُوپوش ہوتی جاتی ہے، مقدمات سے نتائج پیدا ہوتے ہیں، اور پھر نتائج خود مقدمات بن جاتے ہیں، آخری نتیجہ کہیں نہیں نکلتا۔ نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم - بیچ میں پیچ پڑتا چلا جاتا ہے۔" (صفحہ ۱۲)

اس اقتباس سے "تشبیہاتِ رومی" کی ادبی اور علمی خوبیوں کا تھوڑا بہت اندازہ کیا جا سکتا ہے:-

> "مظاہرِ کائنات کی مثال ایسی ہے کہ خس و خاشاک بے بسی میں ہوا سے اڑ رہے ہیں، صفحۂ ہستی پر تحریریں نظر آتی ہیں اور قلم بھی معروفِ رقم دکھائی دیتے ہیں، لیکن جو ہاتھ قلم چلا رہا ہے وہ نظر نہیں آتا۔ حوادثِ حیات کے گھوڑے دوڑ رہے ہیں، لیکن سوار نظر سے پنہاں ہیں، تیر پرّاں نظر آتے ہیں لیکن جن کمانوں سے وہ نکل رہے ہیں وہ

نگاہوں سے اوجھل ہیں۔" (صفحہ ۲۱۰)

مولانا روم کے اشعار کی شرح و ترجمانی کے دو نمونے:۔

"انسان اس مادی اور جسمانی عالم کو اس زور شور کے ساتھ کیوں پکڑے ہوئے ہے؟ اس کی مثال مولانا کے نزدیک کچا میوہ ہے، جو شاخ کو بڑی قوت کے ساتھ پکڑے رہتا ہے جب پوری طرح پک جائے گا تو خود بخود شاخ سے اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی، ثمر پختہ کو آسانی سے توڑ سکتے ہیں اس لئے کہ درخت اور شاخ سے اس کو جو کچھ حاصل کرنا تھا وہ کر چکا۔ اب اُس کی فطرت اس پہلی وابستگی سے نجات چاہتی ہے، انسان بھی جب تک روحانی زندگی میں خام یا نیم خام ہے تب تک مادی اور مالی زندگی کا قبضہ چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتا، اگر باطنی پختگی پیدا ہو جائے تو ان چیزوں سے بے تعلق میں اس کو کوئی دریغ نہ ہوگا۔" (صفحہ ۳۲۶)

"فرماتے ہیں کہ تم کو مردِ عارف کی لذت دید پر کیوں تعجب ہوتا ہے؟ جس ہستی نے پھول کے گوشِ فطرت میں کچھ بات کہی اور وہ خنداں ہو گیا۔ جس نے سرو کے قد کو راست بلند کیا، جس نے نرگس و نسرین میں رنگ و بُو اور جمال کی جنت پیدا کر دی، جس نے ایک سرکنڈے میں شیرینی بھر کر اس کو نیشکر بنا دیا، جس نے خاک سے مہرویانِ چگل بنائے۔ جس نے زبان میں جادو کی تاثیر پیدا کی، جس نے کان میں زر و جواہر کی آفرینش کی، کیا وہ کسی عاشق کے اندر عشق و ذوقِ دیدار پیدا کرنے سے عاجز ہے؟ کیا وہ اس اشرف المخلوقات میں بلند درجے کا عرفان پیدا نہیں کر سکتا! کیا اس کی خلاقی موجودات کی حسن آفرینی میں ختم ہو چکی ہے؟"

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم نے افکارِ رومی کو جس دل نشین عالمانہ اور شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ انہی کا حصہ ہے۔ اردو زبان و ادب میں "تشبیہاتِ رومی" نہایت ہی گرانقدر اضافہ ہے اور ادارۂ ثقافت اسلامیہ اس بلند پایہ کتاب کی اشاعت پر تبریک و تحسین کا مستحق ہے۔

خلیفہ مرحوم کی زبان شستہ اور اندازِ نگارش دل نشین ہے مگر ان کی تحریر میں زبان و بیان کی کہیں کہیں غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں:۔

(صفحہ ۲۶۷) "اُس کو کہہ دو"۔۔۔۔۔۔۔ متعدد مقامات پر انھوں نے "سے" کی جگہ "کو" استعمال کیا ہے جو کہیں کہیں تو گوارا کیا جا سکتا ہے مگر بعض جملوں میں وجدان کو خاصہ کھٹکتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ انھوں نے "نہ ہی" بھی استعمال کیا ہے حیرت ہے کہ اُن کا ذوقِ بلند روشِ عام سے کس طرح متاثر ہو گیا۔۔۔۔۔۔۔ "اُس میں بُور پڑ جائے گی" (صفحہ ۲۱۵) "اس میں بور پیدا ہو جائے گی" لکھنا چاہیے تھا۔۔۔۔۔۔۔ "دریا کی جھاگ" (صفحہ ۲۲۶) "جھاگ" بالاتفاق مذکر ہے "اپنے مربی کی پہچان میں کچھ غلطی نہ لگے" (صفحہ ۲۳۰) "غلطی لگنا" روز مرہ نہیں ہے۔۔۔۔۔۔۔ "اور تیرا دل دیگ کا تلا بن گیا ہے" (صفحہ ۲۶۰) "تلا" تو جوتے کے نچلے حصہ کو کہتے ہیں، دیگ کا پیندا بولتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ "تم نے

میرا گھر بھرشٹ کر دیا" (صفحہ ۲۰۶) "تم نے میرا گھر ناپاک یا اپوتر کر دیا" لکھنا تھا۔ "بھرشٹ" ـــــ "دھرم" کے ساتھ بولا جاتا ہے ـــــ "رئیس نے، اچھل کر اس کو گریبان سے پکڑا" (صفحہ ۲۱۲)، "کو" اور "سے" یہاں بالکل غلط استعمال ہوئے ہیں، اس مفہوم کو یوں ادا کرنا تھا ـــــ "اور رئیس نے اچھل کر اس کا گریبان پکڑا" ـــــ "نہ ناپ تول سکیں" (صفحہ ۲۲۱) یہ دکھنی اردو ہے کہ وہاں "ناپ تول" کو "ماپ تول" بولتے ہیں (ناپ کو ماپ "م" کے ساتھ)

"اس کی آبشار مستعار ہے" (صفحہ ۵۱۸) "آبشار" مذکر ہے ـــــ "ایسے لوگ بے دھڑک دینی زندگی کی راہوں پر گامزن ہوتے ہیں،" (صفحہ ۲۹۴) "بے کھٹکے" لکھنا تھا اور اسی طرح بولا بھی جاتا ہے ـــــ "یہ خوش رو عورت کے ساتھ ٹال مٹول لگاتا ہے" (صفحہ ۵۹۶) فاضل شارح "ٹال مٹول" کے مفہوم و معنی ہی سے بے خبر معلوم ہوتے ہیں!

کہیں کہیں طباعت کی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں ـــــ "من کنتم مولاہ" (صفحہ ۲۵) "من کنت مولاہ" کی جگہ، صفحہ ۹۱ پر "علم را بر جاں زنی یارے شود" کی جگہ "...... مارے شود" چھپ گیا ہے (صفحہ ۱۶۲) پر "ان تکرھوا شیئا" میں ایک نقطہ کے چھوٹ جانے سے "ان نکرھوا ..." بن گیا ـــــ (صفحہ ۱۷۹) پر "امر" وغیرہ میں "ض" کا نقطہ غائب ہے۔ "اگر ہوا مزاہم نہ ہو" (صفحہ ۲۲۸) "مزاحم" کو کمپوزیٹر صاحب نے "مزاہم" بنا دیا۔ صفحہ ۳۲۰ پر جلی عنوان کے ساتھ "دی" کو "دہی" چھاپا گیا ہے، صفحہ ۴۵۰ پر قرآن پاک کی آیت "کانتا رتقا" ـــــ "کانتا اتقا" چھپ گئی! اسی طرح صفحہ ۴۹۴ پر "الدنیا جیفة" کو "الدنیا جینة" (ف کی جگہ ن) کمپوز کیا گیا۔

"صفحہ ۴۹۹ پر "صبح کو راز مہ واختر کھلا" کی جگہ "صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا" پڑھنا پڑا ـــــ صفحہ ۵۰۰ پر "الصلوٰة تنهیٰ عن الفحشا" کی جگہ "عن الفحشاء" چھپ گیا۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم "وحدت ادیان" پر ایمان رکھتے تھے، یہ نہایت ہی گمراہ کن عقیدہ ہے۔ اگر کوئی شخص عیسائی رہ کر پاکبازی کی زندگی گزارے مگر اس کا ایمان نہ تو قرآن کریم پر ہو اور نہ نبی آخر کی نبوت و رسالت پر، تو ایسا شخص غیر مسلم اور دین اسلام سے یکسر خارج ہے، خلیفہ صاحب نے "وحدت ادیان" کے عنوانات قائم فرما کر، مولانا روم کے اشعار سے "وحدت ادیان" کے گمراہ کن نظریہ میں جان ڈالنے کی جو کوشش کی ہے، وہ مولانا روم کے دینی افکار کی غلط ترجمانی ہے، مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ "وحدتِ ادیان" کے معاذاللہ قائل نہ تھے، اور کوئی صحیح الفکر مسلمان اس گمراہی میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔

حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کے احترام و عقیدت سے ہمارا قلب معمور ہے۔ ان کی مثنوی کی دینی اور روحانی بلندی کے بھی ہم قائل ہیں، مثنوی شریف کے مطالعہ نے لاکھوں مسلمانوں میں جذب و سوز اور عشق بھی پیدا کیا ہے، مولانا نے کتنی نفسیاتی حکایتیں منظوم کی ہیں، ان سے کیسے کیسے دل میں اتر جانے والے نکتے پیدا فرمائے ہیں۔ کس قدر ایمان افروز نتائج نکالے ہیں، عمل، اخلاص اور اللہ و رسولؐ کی محبت کے لئے کس کس انداز سے ابھارا ہے، ریاکار زاہدوں اور دنیا پرست عالموں اور واعظوں کے دلوں کی کیسی کیسی چوریاں پکڑی ہیں، مثنوی بلاشبہ مولانا روم کا عظیم الشان تجدیدی کارنامہ ہے، مگر ان کی مثنوی میں، بعض ایسے مباحث و مضامین بھی آ گئے ہیں، جن پر محض عقیدت کی بنا پر آنکھ بند کر کے "آمنا و صدقنا" نہیں کہا جا سکتا! جو باتیں ہمیں کھٹکی ہیں، ان کا اظہار ہمارے ایمان کا تقاضا ہے!

"مولانا فرماتے ہیں کہ مخالفت صرف موسیٰ اور فرعون میں نہیں بلکہ ایک ہادی بھی دوسرے ہادی سے الگ راستہ اختیار کر سکتا ہے، اصول میں نہ سہی لیکن

اللہ تعالیٰ نے اعمال حسنہ پر انعام و جزا کی جو خوشخبریاں سنائی ہیں، اور ثواب کا جو وعدہ فرمایا ہے اور اعمال بد پر عذاب و عقوبت کی جو دھمکیاں دی ہیں وہ سب واقع ہو کر رہیں گی، اُن کے مکتب و مدرسہ کی ... بات ... تک نہیں پہنچی!

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

یہ نری مسخرانہ شوخیاں اور نکتہ بازیاں ہیں، جنت ایک حقیقت ہے چاہے اس سے کسی کا دل بہلے یا نہ بہلے!

"مولوی معنوی کے نزدیک ابلیس مادہ پرستی اور جبریت کا نام ہے" (صفحہ ۲۶۲)

حالانکہ "ابلیس" حرارت و برودت اور ظلمت و نور کی طرح کوئی صفت نہیں ہے بلکہ ایک مستقل وجود ہے۔ قرآن پاک کی صریح آیتوں کے مقابلہ میں یہ جرأت ....! ؎

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے!

"مولانا نے کئی جگہ اپنے اس عقیدے کا اظہار کیا ہے کہ قیامت، انکشاف حقیقت کا دوسرا نام ہے اور وہ نفس انسانی ہی کی ایک کیفیت ہے، یہ کہ پہاڑ اور آسمان قیامت میں شق ہو جائیں گے اس کا مفہوم مولانا کے نزدیک یہ ہے کہ حقیقت واشگاف ہو جائے گی۔" (صفحہ ۳۶۶)

یہ صحیح ہے کہ قیامت کے دن حقیقت ظاہر ہو جائے گی اسی لئے تو کافروں اور مشرکوں کو اپنے کفر و شرک پر پچھتاوا اور بُروں کو اپنی غلط کاریوں پر ملال ہوگا مگر "قیامت" صرف نفس انسانی کی کیفیت کا دوسرا نام نہیں ہے، اُس دن کائنات کا پورا مادی نظام ریزہ ریزہ ہو جائے گا آسمان پھٹ جائیں گے پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کی طرح ہو جائیں گے، اور وہ سب کچھ ہوگا جس کی تفصیل اللہ اور اللہ کے رسولؐ نے بیان فرمائی ہے، ہم اس تفصیل پر ایمان لاتے اور اس کی تصدیق کرتے ہیں، اور عقلی تاویلوں کو قبول نہیں کرتے۔

"فرعون نے اپنی ظلمانی خودی کو حق اور حقیقت سمجھ لیا، اس لئے اس حالت میں اس کا انا الحق کہنا کفر ہو گیا، لیکن جب منصور نے اپنی خودی کو خدا سے ہم کنار کر کے انا الحق کہا تو وہ عین حقیقت تھی۔" (صفحہ ۵۱۰)

منصور کے "انا الحق" کی تصویب "تصوف" پر اتنا کھلا ہوا الزام ہے، کہ تنہا یہی ایک الزام تصوف کو کتاب و سنت اور توحید خالص کا مخالف قرار دیتا ہے! منصور حلاج اور "انا الحق" سے صوفیہ کے اس شغف کو دیکھ کر، طبیعت کو بڑی وحشت ہوتی ہے۔

مولانا روم رحمتہ اللہ علیہ بلاشبہ بہت بڑے آدمی ہیں مگر اللہ اور رسولؐ سے کم تر ہی ہیں، اسی طرح ان کی مثنوی حقائق و معارف کا صحیفہ سہی، لیکن کتاب و سنت سے درجہ میں بہرحال کمتر ہے۔ دین و شریعت کی اصل کسوٹی "کتاب و سنت" ہے، اس پر جب کسی کا بھی قول و عمل پورا نہ اترے گا، اُسے رد کر دیا جائے گا! مولانا روم کی مثنوی سے بہت بڑے دینی اور روحانی فوائد پہنچے ہیں مگر اُن کے اس قسم کے خیالات جن پر ابھی ابھی گرفت کی گئی ہے، اُن کی مضرت بھی ظاہر ہے!

ثقافت و انتشار

ترجمہ:- انعام عظیم برنی (ایم۔ اے) اخلاص حسین (ایم۔ اے) ضخامت ۵۰۰ صفحات مجلد، قیمت چھ روپے، ملنے کا پتہ:- آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔ سعیدہ منزل، متصل سر سید گرلس کالج، ناظم آباد، کراچی۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی "اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ" فن تعلیم کی تحقیقات و اشاعت کے سلسلہ میں بڑی مفید خدمات انجام دے رہی ہے، مشہور ماہر تعلیم مسٹر میتھو آرنلڈ کی مشہور کتاب (CULTURE + ANARCHY) کا اردو ترجمہ اسی اکیڈیمی کے اہتمام و نگرانی میں شائع ہوا ہے، جس پر یہ علمی ادارہ علمی دنیا کی طرف سے مبارک باد کا مستحق ہے :

اس کتاب کا ترجمہ مجموعی طور پر شستہ اور رواں ہے، مگر کہیں کہیں ترجمہ میں خاصہ جھول بھی پیدا ہو گیا ہے مثلاً :-

"اس نقاد کی وجہ سے جس کو کبھی ارفع اور کبھی رقت انگیز انداز میں دُہرایا جاتا ہے"۔ (صفحہ ۱۴۸)

اس میں "ارفع" کس قدر بے ربط اور عجیب سا لگتا ہے۔

"ایک غالب پروردگار پر عقیدت مندانہ لیکن اعتدال سے متجاوز بھروسہ کیا جائے"۔ (صفحہ ۲۰۳)

مفہوم تو سمجھ میں آ گیا مگر اس "اعتدال سے متجاوز" کی ترجمانی کے لئے ایک مستقل جملہ کی ضرورت تھی۔

" وہ وہ عبرانیت کو یونانیت کی آب و تاب بڑھانے کے لئے بطور مزوج اور تضاد کے استعمال کرتے ہیں" (ص ۲۰۵)

یہ کیا بات ہوئی !

اصل کتاب ۱۸۶۹ء میں شائع ہوئی تھی، اس کے بعد اس کے جو ایڈیشن شائع ہوئے، ان میں فاضل مصنف (آرنلڈ) نے نظر ثانی کے بعد حذف و ترمیم کر کے اس کتاب کو اور زیادہ نکھار دیا۔ اس کتاب کے زیر تنقید اُردو ترجمہ مرزا علی اظہر برلاس نے فاضلانہ تعارف لکھا ہے۔

آرنلڈ نے اس کتاب میں جو تصورات و خیالات پیش کئے ہیں، ان کا محور مذہب و اخلاق ہے، وہ کلچر کی تعریف ان لفظوں میں کرتا ہے۔

"میں نے جس کلچر کا ذکر کیا تھا، اس کا مقصد مشاہدہ، مطالعہ اور غور و فکر کے ذریعہ عقلِ سلیم اور رضائے الٰہی تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے"

اور

"کلچر کا مقصد و منتہیٰ تکمیل انسانیت ہے اور یہی مذہب کا مقصد ہے"۔

آرنلڈ کے زمانہ میں مادیت پرستی، کومت اگست (Comte August) اور ثبوتیت پرستی (Positivism) نام کی جو انقلابی اور مادی تحریکیں شروع ہوئی تھیں، ان تمام تحریکوں کو آرنلڈ نے ناقص اور حقیقی ثقافت کے خلاف قرار دیا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ آرنلڈ "نام نہاد ترقی پسندی" کا بہت بڑا مخالف ہے اور وہ کسی بھی تحریک تخیل و عمل کو انسانی معاشرے کے لئے کسی اعتبار سے بھی فائدہ مند خیال نہیں کرتا جس میں اخلاقی قدروں کو نظر انداز کر دیا گیا ہو۔

آرنلڈ عملی طاقت کو "عبرانیت" (Hebraism) سے اور غور و فکر کی طاقت کو "یونانیت"........ (Hellenism) سے تعبیر کرتا ہے، یہ کتاب گہرے غور و فکر اور عمیق تجربہ و مشاہدہ کی آئینہ دار ہے، اس کا فلسفہ .... مقامات پر ایک بیدار ضمیر کی آواز بن گیا ہے۔

وہ لوگ جو اشتراکیت اور مغرب زدگی سے مرعوب ہو کر مذہب سے بیگانہ ہوتے چلے آ رہے ہیں اُن کے لئے یہ کتاب بہت مُفید ثابت ہوگی، اس کتاب کے پڑھنے سے انہیں پتہ چلے گا کہ دنیا کے بڑے بڑے مفکرین نے سب کچھ پڑھنے اور غور و فکر کرنے کے بعد "مذہب و اخلاق" ہی کو انسانیت کے ہر دکھ درد کا مداوا سمجھا ہے۔

مقاصدِ تعلیم

ترجمہ:۔ سید محمد تقی ایڈیٹر جنگ، ۲۱۴ صفحات (مجلد) قیمت - پانچ روپے۔
ملنے کا پتہ:۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، سعیدہ منزل۔
متصل سرسید گرلز کالج، ناظم آباد، بی روڈ، کراچی۔

مسٹر اے، این، وائٹ ہیڈ کی معرکۃ آلارا کتاب (AIMS OF EDUCATION) کا ترجمہ جناب سید محمد تقی مدیر اعلیٰ روزنامہ "جنگ" نے کیا ہے، سید محمد تقی صاحب تجربہ کار صحافی ہی نہیں ہیں، بلکہ ایک فلسفی و مفکر انشاء پرداز بھی ہیں، اس قدر دقیق فلسفیانہ کتاب کا ترجمہ ہر انشاء پرداز اور مصنف و مترجم کے بس کا نہ تھا۔ سید صاحب موصوف اہل قلم ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفہ کا بھی خاص ذوق رکھتے ہیں، اس لئے ان کے ترجمہ پر اعتماد کیا جاسکتا ہے! فاضل مترجم نے جگہ جگہ تشریحی نوٹ بھی دیئے ہیں اور بعض مقامات پر مُصنف کے خیالات سے اختلاف بھی کیا ہے۔

"مسٹر وائٹ ہیڈ اس مکتبۂ خیال کے نمائندے بلکہ مبلغ ہیں، جس کا تعلق "تجریدی فکر" سے ہے۔ اور تجریدی فکر رکھنے والے فلسفی عام طور پر جدت پسند ہوتے ہیں"

چنانچہ اس کتاب میں بھی فاضل مُصنف نے قدیم منطق کی تکرار نہیں فرمائی بلکہ جدید منطق کی خصوصیات پیش کی ہیں اور اس کی "جوہری روح" کو واضح فرمایا ہے، وہ منطق کی ضرورت اور افادیت کے قائل ہیں اور اس کو بے سُود نہیں سمجھتے

کتاب کے چند اہم ابواب:۔

مقاصدِ تعلیم ــــ تعلیم کا نشیب و فراز ــــ تکنیکی تعلیم اور سائنس و ادب ــــ
اس کا رشتہ ــــ ریاضیاتی نصاب تعلیم ــــ یونیورسٹیاں اور
اُن کے فرائض ــــ مکان، زمان اور اضافیت!

اس کتاب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اردو ادب میں فلسفۂ تعلیم پر اپنے انداز کی یہ پہلی کتاب ترجمہ ہوئی ہے، مگر اس کو کیا کہیئے کہ فاضل مصنف کا ذہن صاف نہیں ہے، اس لئے ان کی فکر بہت الجھی ہوئی ہے اور ان کے بعض دقیق افکار جن کو ہم جیسے عامی "ژولیدہ" کہنے پر مجبور ہیں۔ بیان و اظہار میں آکر بہت زیادہ مشکل و پیچیدہ بن جاتے ہیں! مفہوم کا انداز بیان پیچیدہ غیر الفہم ہونا، خوبی نہیں کمزوری ہے! اس قسم کے افکار سے پڑھنے والا مرعوب تو ہو جاتا ہے مگر مانوس نہیں ہوتا مفہوم کا گنجلک ہونا، طبیعتوں میں بیزاری اور توحش پیدا کرتا ہے۔ مسٹر وائٹ ہیڈ کے دوست برٹنڈر رسل نے اس کی شہادت دی ہے کہ "وائٹ ہیڈ" الجھا ہوا دماغ رکھتا ہے"! اسی لئے ان کی کتابیں دوسری زبانوں میں منتقل نہ ہو سکیں۔

وائٹ ہیڈ کے افکار میں تضاد بھی پایا جاتا ہے، ایک طرف وہ "حال" ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، اور ایام تاریخی کی یاد کو "عالمانہ تبختر" سے تعبیر کرتے ہیں (جس سے دھوکا نہ کھانا چاہیئے) (صفحہ ۱۴) دوسری طرف وہ قدما کی حکمت کو اولیٰ حکمت کہتے ہیں اور نصابی علم کی کامیابی کو جدید عہد کی، ناکامی سمجھتے ہیں (صفحہ ۹۰)

وائٹ ہیڈ کا یہ نظریہ بھی کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے کہ باہر سے آنے والے ممتحن کو طالب علم سے کوئی سوال پوچھنے کا حق ہی

نہیں ہونا چاہیے، طالب علم سے سوال وہی شخصیت دریافت کرے، جو اس کا اُستاد و معلم بھی ہو (صفحہ ۴۳) اور یہ تو وہ ایسی بات کہتے ہیں جس پر عمل کرنا بہت دشوار ہے کہ ہر اسکول کو "اکائی" خیال کیا جائے، اس کا اپنا نصاب ہو۔ جو اسکول کی ضرورت کے مطابق، وہاں کے اسٹاف نے خود مُرتب کیا ہو (صفحہ ۶۳)

مسٹر وائٹ ہیڈ اس کے قائل نہیں ہیں کہ آسان مضامین کو مشکل مضامین سے پہلے آنا چاہیے اور وہ اس کے لئے دلیل یہ دیتے ہیں کہ "پہلا فکری فرض جو بچہ کے سامنے آتا ہے، بولی جانے والی زبان کا حصول کتنا ڈراؤنا کام ہے"۔ (صفحہ ۶۹) مگر ہم سب بچے رہے ہیں اور ہم نے زبان کے حصول کو خوفناک کام نہیں سمجھا! اور تعلیم کا آغاز آسان مضامین کی جگہ مشکل مضامین سے کرنا، یہ بھی ایک عجیب جدت ہے!

> "یہ بالکل صحیح ہے کہ ایک نومولود بچہ ذہنی ترقی کے اعتبار سے ایک سب سے زیادہ غیر اُمید افزا شے ہے"۔ (صفحہ ۸)

یہ فلسفیانہ کلیہ، انسانی نسل کی اُمنگوں کو کس قدر مجروح کرنے والا ہے! ———— اور سنیئے!

> "میں جو کچھ کہتا ہوں اس سے مراد یہ ہے کہ آپ سوچنے سے پہلے تجربہ کریں، تفکر سے پہلے تجربہ تاکہ نئے تصورات پیدا کئے جا سکیں" (صفحہ ۱۵۲)

ایسا "تجریدی تجربہ" جس میں سرے سے غور و فکر شامل ہی نہ ہو، کس قدر عجیب ہوگا!

ایک اقتباس :-

> "اب مثلاً اس ہنگامۂ زمان کیجئے، زمان —— یک بُعدی —— ہوتا ہے کہ جب یہ —— یک بعدیت —— کی خصوصیت اُن شرائط کے ذریعہ جن کا یہاں ذکر نہیں کیا گیا ہے، ظاہر کی جاتی ہے تو سلسلہ احاطہ کا ایک میل کلی والا مجموعہ جس پر اس حیثیت سے غور کیا جائے کہ وہ قریب قریب ایک راستہ ہے، لازماً ایک ممتاز زمانی لمحہ کی جسے اقلیدسی تعریف کے معمولی انداز میں سمجھا جائے، خصوصیات ظاہر کرے گا۔ نظر بریں حصول میل الی التسہیل کے زمان پر اطلاق کے ذریعہ جو بھی، تسہیل پیدا کی جا سکے اسے لازمی طور پر ناپ ہونا چاہیے، مرتب کے کسی بھی لمبے راستہ کی خصوصیات ہیں:" (صفحہ ۲۵۲)

اس کتاب کا خاصہ بڑا حصہ اسی قسم کی عسیر الفہم عبارتوں پر مشتمل ہے، کوئی شک نہیں لائق و فاضل مصنف نے بڑے دقیق نکتے بیان کئے ہیں اور ان کی فکر عمیق ہے، لیکن نکتۂ دقیق اور فکر عمیق کے لئے جب گنجلک پیرایۂ بیان بھی اختیار کیا جائے تو بات "معمہ" ہو کر رہ جاتی ہے جس کے بوجھنے کے لئے دماغ کو مسلسل جمناسٹک کرنی پڑتی ہے! اس قسم کی دقیق و پیچیدہ کتابوں سے بہت ہی کم لوگ خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں!

اس کتاب —— مقاصد تعلیم —— سے تعلیمی فوائد حاصل کرنے کے لئے، سب سے پہلے اس کی ضرورت ہے کہ ماہرین تعلیم اور فلسفیوں کا ایک بورڈ غور و فکر اور مشورت کے بعد بتلائے کہ مصنف کی فلاں عبارت کی اصل مراد کیا ہے؟ مسٹر وائٹ ہیڈ نے "مقاصد تعلیم" کو ٹھیٹ "فلسفہ و منطق" بنا دیا ہے۔

ہم ایسے ملتے ہیں کہ علمی مسائل اور خاص طور سے فلسفہ و منطق کے مباحث افسانوں اور ناولوں کی طرح سہل اور دلچسپ نہیں ہوتے، ان میں دماغوں کو غور و فکر سے کام لینا ہی پڑتا ہے ——— مگر علمی مسائل کی دشواری اور فلسفیانہ مباحث کی دقت و تعمق کی آخری کوئی حد و نہایت بھی ہے! فلسفہ کو خیالات کی دلدل بنا دینا، علم و تفکر کی زیادہ سودمند خدمت نہیں ہے۔

حضرت بہاء الدین زکریاؒ

از:- مولانا نور احمد خاں فریدی، ضخامت ۳۳۶ صفحات، قیمت مجلد [illegible] چھ روپے، خاص ایڈیشن سات روپے

ملنے کا پتہ:- منیجر قصر الادب، جگو [illegible]، ضلع ملتان

مولانا نور احمد خاں فریدی مورخ بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی ہیں، موصوف [illegible] لکھتے رہتے ہیں، ان کی بعض کتابیں سررشتہ تعلیمات مغربی پاکستان میں "منظور" ہو چکی ہیں۔ زیر تنقید [illegible] بڑی محنت و کاوش کے ساتھ مرتب فرمایا ہے! یہ کتاب خاصے اہتمام کے ساتھ چھپی ہے، چکنا سفید کاغذ، خوب صورت جلد! کتاب کے شروع میں نواب مخدوم مرید حسین قریشی سجادہ نشین آستانہ زکریا کا فوٹو ہے، جن کے ایماء سے یہ تذکرہ مرتب ہوا ہے اور جن کی سخاوت کی بدولت یہ کتاب منظر عام پر آئی ہے۔

یہ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ ہے جن کی نسبت سے ملتان کی سرزمین کو شرف و شہرت حاصل ہے اور جن کی ذات سے علم و معرفت اور روحانیت کے چشمے جاری ہوئے ہیں، آپ خانوادۂ سہروردیہ کے چشم و چراغ ہیں۔ اس کتاب میں صاحب سیرت کے علاوہ متعدد سہروردی شیوخ (رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کے بھی مختصر حالات ملتے ہیں، فٹ نوٹ میں جن کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہیں، ان کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فاضل تذکرہ نگار نے اس ایک کتاب کی ترتیب و تدوین کے لئے نہ جانے کتنی بہت سی کتابوں کا مطالعہ فرمایا ہے اور اس خرمن کے لئے کہاں کہاں سے خوشہ چینی کی ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ کے دوران میں جگہ جگہ طبیعت کو کھٹک پیدا ہوئی بلکہ سخت انقباض ہوا، صفحہ ۲۰/۱۹ پر یہ عبارت نظر آئی:-

"سید احمد کبیر رحمۃ اللہ نے شیخ عبداللہ مطری رحؒ سے استفسار کیا کہ فرمائیے، افراد، ابدال، غوث، قطب وغیرہ کے مدارج میں کیا فرق ہے، اور ان کی تعداد کس قدر ہوا کرتی ہے۔ شیخ نے فرمایا بھائی جان! ہر ایک زمانہ میں دنیا بھر کا غوث صرف ایک ہوتا ہے، عرش سے لے کر فرش تک تمام مخلوق پر خداوند کریم اسے تصرف عطا کرتا ہے.... اس غوث کی وجہ سے تمام برکات اور رحمتوں کا نزول ہوتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ نظام کائنات ہی غوث کے دم قدم سے قائم ہے۔"

اگر ہر زمانہ میں دنیا بھر کے لئے اللہ کے حکم سے ایک "غوث" مقرر ہوتا ہے تو بتایا جائے کہ صحابہ کرام کے دور میں کون غوث تھا۔ پھر تابعین کے عہد میں کیا کسی "غوث" کی نشاندہی کی جا سکتی ہے؟ پھر "غوث" کو عرش سے لے کر فرش تک جو تصرف کا حق دیا جاتا ہے، تو کیا یہ "غوث" نبی سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے؟ پھر "غوث" کے دم سے نظام کائنات کا قائم

ہوتا یہ کتنی غلط بات ہے، اللہ تعالیٰ بلا شرکت غیرے نظام کائنات کو چلانے ہوتے ہے اور اس کے سوا کوئی "حی و قیوم" نہیں ہے!
ملتان میں حضرت بہاء الحق والدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر لوگ کس طرح حاضری دیتے ہیں، اس کا نقشہ تذکرہ نگار نے ان لفظوں میں کھینچا ہے :۔

"ڈیوڑھی میں دہنی جانب حضرت غوث پاک کے ایوان کا دروازہ ہے، نقیب اور چاؤش
رہ رہ کر پکار اٹھتے ہیں "مدد بہاؤ الحق" زائر کی حالت اُس وقت ایسی ہوتی ہے جیسے کوئی
مجرم کسی بڑے جرم پر تائب ہو کر معافی طلب کرنے کے لئے ایک جلیل القدر بادشاہ کے دربار
میں باریاب ہو رہا ہو۔۔۔۔!
وہ اپنے دونوں ہاتھ مرقد مبارک پر رکھ کر انتہائی ادب و احترام سے بوسہ دیتا ہے، غلاف
کو اپنی آنکھوں سے لگاتا، اور چومتا ہے، پھر ذرا پیچھے ہٹ کر بائیں جانب کو پشت کر کے
حضور کی خدمت میں فاتحہ کا تحفہ پیش کرتا ہے۔۔۔۔" (صفحہ ۵۰)

"مدد بہاؤ الحق" یہ نہایت غلط نعرہ ہے، صحابہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کو نہ کبھی چوما اور نہ "یا نبی المدد" کا نعرہ لگایا۔ توحید کے مدعی، اور ان کے یہ اعمال و معتقدات! اللہ کی پناہ!

"سندھیوں کے اعتقاد کا تو یہ عالم ہے کہ وہ اس شہر میں جوتا پہن کر چلنا بھی سوء
ادبی سمجھتے ہیں۔" (صفحہ ۵۲)

اور کوئی خدا کا بندہ ان سندھیوں کو نہیں بتاتا کہ صحابہ کرام مدینہ منورہ میں جوتا پہن کر بلا تکلف چلتے تھے، اور دین میں اس قسم کے غلو سے منع فرمایا گیا ہے۔

"۔۔۔۔ اس کے بعد مجھے حج کعبۃ اللہ کا شوق ہوا اور ہر قدم پر دوگانہ ادا کیا۔" (صفحہ ۹۲)

اس صورت میں، ملتان سے مکہ مکرمہ تک کا پا پیادہ سفر کہ ہر قدم پر دوگانہ ادا کیا جاتے۔ سو سال میں بھی تمام نہیں ہو سکتا۔
صفحہ ۹۸ اور ۹۹ پر شیخ الشیوخ کے حوالے سے ان کے ملفوظات کے ایک اقتباس کا ترجمہ دیا گیا ہے کہ :۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج میں دیکھا کہ عرش کے نیچے فرشتگانِ قدسی کے
جھرمٹ میں کلاہ و پیراہن رقص میں ہیں۔۔۔۔۔۔ اس وقت ندا آئی! کہ اے
محمد صلی اللہ علیہ وسلم؛ یہ کلاہ و پیراہن ہمارے خاص بندے کے ہیں، جو آپ کی امت
سے ہے، روزِ میثاق نعرہ "الست بربکم" سُن کر شوقِ وصال میں مستغرق در
عالم وجد میں ہے، اسی کی روح سے اللہ ہو کی یہ آواز آ رہی ہے، اس کا نام شیخ العالم
غوث بہاؤ الدین زکریا ہے۔"

ہم نے دل پر بڑا جبر کر کے، یہ عبارت لکھی ہے اور اللہ سے پناہ مانگی ہے! ان "واردات و مکاشفات" کے ہوتے ہوئے "تصوف" کی کوئی کہاں تک مدافعت کرے گا۔ استغفر اللہ!
شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے۔

"بیس سال کامل مدینہ منورہ میں بڑی مستعدی سے عبادت کی ہے، اس عرصے میں نہ

وقت کو سوتے نہ دن کو آرام کیا، ہر رات دو ہزار رکعت نماز پڑھتے، اور یک مرتبہ قرآن
شریف ختم کرتے تھے دن بھر روزے سے رہتے تھے اور شام کو پان کے دو پتوں سے
افطار کرتے۔۔۔"

جاڑے کی طویل سے طویل ایک رات میں بھی دو ہزار رکعتوں کا ادا ہونا کسی طرح ممکن نہیں؛ پھر حجاز میں پان کہاں پیدا ہوتا ہے۔
اس کے بعد لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شیخ الشیوخ کو اپنا خرقہ عطا فرمایا، اور کہا کہ جو اس خرقہ کو پہنے گا، اُسے اللہ تعالیٰ دس کرامتیں عطا کریں گے، اُن میں سے دو کرامتیں یہ ہیں:۔

(۱) اُسے لوح محفوظ کا مخفی علم حاصل ہوگا اور (۲) عرش سے فرش تک کی تمام پوشیدہ
چیزیں اس پر ظاہر ہو جائیں گی۔

یہ کیا "عجائبات" ہیں! کیا کہیں اور کیا نہ کہیں!

"حضرت فرید الملت نے سلوک کی منازل طے کرنے میں بڑی بڑی ریاضتیں کیں
ان کا اپنا بیان ہے کہ وہ بیس سال تک عالم تفکر میں کھڑے رہے، اُن کے پاؤں
متورم ہو گئے، اور ان سے خون بہنے لگا، اس دوران میں انہیں یاد نہیں کہ کچھ کھایا
پیا ہو۔ (صفحہ ۱۰۱)

صحابہ کرام اور تابعین عظام کے حالات میں یہ عجیب و غریب باتیں نہیں ملتیں جن سے عقل حیران ہے اور وجدان ششدر!
لعل شہباز قلندر جو حضرت شیخ کے حلقہ ارادت میں داخل تھے، ان کے حالات میں لکھا ہے:۔

"۔۔۔۔ چوں جذب و مستی بغایت داشت، پابند احکام شرع نبود۔"

اور ایسے جذب اور مستی جو "پابند احکام شرع" نہ ہوں، دین میں کوڑی کی برابر بھی وقعت نہیں رکھتے۔
صفحہ ۲۰۶ پر حضرت شیخ زکریا ملتانی کی ایک کرامت یہ بھی لکھی ہے کہ، آپ ایک غار میں تھے:۔

"جب کچھ رات گزری تو عذاب کے فرشتے مُردے کو عذاب دینے کے لئے آپہونچے، لاش
حرکت میں آئی اور مردہ اٹھ کر حضرت کے قدموں میں آپڑا، اسی وقت ایک غیبی آواز
سُنی گئی کہ اُسے چھوڑ دو، ہم نہیں چاہتے کہ اس شخص کو عذاب کریں جو شیخ الاسلام
بہاء الحق ابو محمد زکریا کی حمایت میں آچکا ہو۔" (فرشتے اُسی وقت واپس لوٹ گئے)

ہائے! یہ "دیومالا" کی قسم کی روایتیں!

صفحہ ۲۶۷ پر لکھا ہے کہ شیخ کے مریدوں میں ایک صاحب بدر سجستانی تھے، انھوں نے عید کی نماز کے بعد آسمان کی طرف منہ اٹھا کر دعا مانگی کہ:۔

"خداوندا! ہر غلام اپنے مالک سے عیدی مانگتا ہے، اور میں تجھ سے عیدی مانگتا ہوں"۔

اس پر ایک حریر کا ٹکڑا سبز خط سے لکھا ہوا، آسمان سے نازل ہوا، کھول کر دیکھا تو اس پر لکھا تھا:۔

"ہم نے اس عید سعید کی خوشی میں تجھ پر دوزخ کی آگ حرام کی۔"

؎ ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے!

"محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں کہ شیخ الاسلام بہاؤ الدین زکریا حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح کی خدمت میں حاضر ہوئے اسی وقت مجلس سماع ترتیب دی گئی۔ دونوں بزرگوار وجد میں آئے کہتے ہیں کہ آٹھ پہر تک رقص میں معروف رہے۔" (صفحہ ۲۱۰)

صحابہ کرام نے نہ اس طرح سماع سنا اور نہ رقص فرمایا، اور اُمت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرام کی اُسوۂ ہی معتبر ہے، پھر آٹھ پہر تک جو مسلسل رقص ہوتا رہا، تو پانچوں وقت کی نمازوں کے فوت ہونے کا وبال کس کے سر رہا! اُس رقص و سماع کو کیا کہئے جو آدمی کو نماز سے غافل کر دے!

"اور ایسی حالت میں سالک اکثر اوقات قانونِ شریعت اور ادب سے بھی باہر ہو جاتا ہے" (صفحہ ۲۳۰)

یہ حالت قابلِ تعریف نہیں بلکہ لائق نفرت و ملامت ہے!

اور صفحہ ۲۹ پر جو یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کی گئی ہے:-

"الشیخ فی قومہ کالنبی فی اُمتہ ومَنْ لا شیخ لہٗ فشیخہ الشیطان"

درایت اور روایت کی کسوٹی پر پوری نہیں اتر سکتی۔

اس قسم کے تذکروں سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچتا ہے، تذکرہ نگاروں کو چاہیئے کہ بزرگوں کے ملفوظات و حالات پر تنقیدی نگاہ ڈال کر، ایسی باتوں کو چھانٹ لیں، جو کتاب و سنّت کے مطابق ہوں، جن کو عقل سلیم قبول کر سکے جو انسانی فطرت کے مطابق ہوں!

تذکرہ نگار کی تحریر میں سالہا سال کی مشق و ممارست کے بعد بھی کوئی قابل ذکر بات پیدا نہیں ہو سکی، ایک مختصر سا اقتباس:-

"..... یہاں تک کہ مراکش سے جاوا اور سماٹرا تک زمین کا گوشہ گوشہ فیضان سرمدی سے سرشار اور نورِ محمدی کی روشنی سے مالا مال ہو گیا، حضور کی جاری کردہ نہروں سے فیض اور نور کے بے شمار چشمے آج تک جاری ہیں۔" (صفحہ ۲۲۴)

زمین کے گوشوں کو فیضان سرمدی سے "سرشار" اور نور محمدی کی روشنی سے "مالا مال" کہنا، تحریر کی سطحیت کو ظاہر کرتا ہے "جاری کردہ نہروں" دفتری زبان ہے ——— پھر "حضور" اور "سرکار" کے الفاظ عام طور سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تحریر میں استعمال کئے جاتے ہیں!

"بڑی انتظار کرائی" (صفحہ ۹۰) "انتظار" بالاتفاق مذکر ہے ——— "اوج شریعت کے مقام پر قبا چڑھے ٹکر لگائی" (صفحہ ۱۲۴) "ٹکر لگائی" یہ کیا زبان ہے؟ "ٹکر لی" روزمرہ ہے ——— "پہاڑ کی ایک غار میں چھوڑ آیا ہوں" (صفحہ ۱۶۳) "غار" مذکر ہے ——— "اگرچہ حضور ۹۶ سال کی لیل و نہار کی سے الٹتے بدلتے دیکھ چکے تھے" (صفحہ ۳۱۱) اول تو "لیل و نہار" جمع بولا جاتا ہے پھر ۹۶ سال کی لیل و نہار اور لیل و نہار کے سے "شب لیلۃ القدر" کی رات سے کم مضحکہ خیز نہیں ہے۔ کئی جگہ "بیچ" "بیچی" لکھا ہے!

آویزے

از:- نثار احمد نور، ضخامت ۱۰۶ صفحات، مجلد (حسین و رنگین گرد پوش کے ساتھ) قیمت تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) ملنے کا پتہ:- قریشی پبلشرز۔ ۸۰ سے محلہ سرسید سٹریٹ مزنگ، لاہور۔

یہ جناب نثار احمد انور کے کلام کا مجموعہ ہے، جس میں انھوں نے خود اپنا تعارف نامہ لکھا ہے۔ دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں:۔

"اس کتاب پر ایک سے زیادہ دیباچے مشہور ادبا کی طرف سے لکھے گئے ہیں اور وہ میرے پاس محفوظ ہیں، میں نہیں چاہتا کہ اپنی تعریف سے اس کتاب کے حسن کو زائل اور آپ کے وقت کو ضائع کروں۔"

یہ جذبہ شاعر کی خود اعتمادی کی دلیل ہے!

نثار احمد انور کے اشعار میں شعلوں کی سی بھڑک پائی جاتی ہے۔ جو بلند ہونا بھی چاہتے ہیں اور ماحول کو [illegible] کا عزم رکھتے ہیں، چند منتخب اشعار:۔

زلفیں کھلیں تو محفلِ انجم سنور گئی — اس اہتمام سے شبِ ہجراں گزر گئی

رات کی بے ہوشیوں کا صرف اتنا ہوش ہے — اور اک گردش بھی تھی، گردش میں پیمانوں کے ساتھ

افلاک کے تارے ٹوٹیں گے، آفاق پہ ذرے چمکیں گے
ایسا بھی زمانہ آئے گا، جب گردشِ دوراں یوں ہوگی

ترے میکدے میں ساقی! وہ شراب اب نہیں ہے — کبھی جس کی تلخیوں میں تھا سرورِ جاودانہ

جہاں پہنچ کے سفر ترک کر دیا تو نے — وہیں پہ آج بھی سحر نوردِ منزل ہوں

ستم شعار کہاں تک مجھے بھلائے گا — میں کچھ نہیں ہوں مگر پھر بھی گردِ منزل ہوں

داد خواہ کون ہو، بارگاہِ عدل میں — قاضی دہن خموش، شہریار محوِ خواب

منحصر ہیں چشمِ ساقی پر یہ دونوں صورتیں — پینے والے گر بھی سکتے ہیں سنبھل سکتے بھی ہیں

دوسرا رُخ:۔

"... اور جب یہ عشق عرفان و سلوک کے مدارج ثلاثہ ناسوت، جبروت و ملکوت تک پہنچ جاتا ہے تو عالم لاہوت کا پردہ خود بخود اٹھ جاتا ہے اور خدا کی ہستی بندے کے عشق سے اتنی متاثر ہوتی ہے کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں رہتا۔" (صفحہ ۴)

عجمی تصوف کی اس قسم کی "ہوائی باتوں" کو شاعر نے بلاوجہ دُہرایا ہے، اس کی کوئی ضرورت نہ تھی! پھر خدا کی ہستی کا متاثر ہونا! اس پر مُستزاد!

یہ سچ کہا کہ عشق کی دنیا میں خبط ہے — اے یار کچھ تری بھی نظر میں فتور ہے (صفحہ ۱۷)

بالکل نو مشقوں کا سا شعر ہے! "عشق کی دنیا میں خبط ہے"۔ یہ کیا زبان ہے اس شعر میں "تقابل ردیفین" کس قدر کھٹکتا ہے!

تمہیں آگئے دلبری کے قرینے — مرا عشق صادق ہے باور تو کیجئے (صفحہ ۲۱)

اگر محبوب کو دلبری کے ڈھنگ نہ آتے تو عشق کاذب ٹھہرتا ——— یہ کیا کُلیّہ اور نظریہ ہے!

نظر آبشارے ، دل کوہسارے زمیں بر نظرے ، زماں بر زمینے

محبوب کی نگاہ کو "آبشار" اور دل کو "کوہسار" کہنا ہے ایک عجیب تشبیہ ہے ! مصرعہ ثانی کی شرح شاعر ہی کر سکتا ہے کہ اس میں اس نے کیا فلسفہ بیان کیا ہے !

تورات کھل گئی ہے ، سبق پڑھ رہا ہوں میں اک طور بھی ہے زلفِ مزمل کے ساتھ تھا (صفحہ ۲۳)

"تورات" سے شاید محبوب کا "مصحفِ رُخ" مراد ہو مگر یہ "زلفِ مزمل" کیا چیز ہے ! اول تو "مزمل" کا میم مشدد ہے (اس کی یہ تاویل ہو سکتی ہے کہ شاعر نے ضرورتِ شعری کے لئے تشدید کو حذف کر دیا ہے) لیکن زلف کو نسبت و تشبیہ سورۂ مزمل سے نہیں "سورۂ والیل" سے دیتے ہیں ! زلف کے ساتھ "مزمل" ذہن میں آیا ، جھٹ سے نظم کر دیا ۔

پھرتی ہیں جب تمہاری نگاہوں میں گردشیں چلتا ہے دورِ جام بھی محفل کے ساتھ ساتھ (صفحہ ۲۴)

"نگاہوں میں گردش کا پھرنا" عجیب زبان ہے ۔ گردش ہوا کرتی ہے ، پھرا نہیں کرتی !

خلق تھا ، اخلاص تھا ، تمیز ایمانوں میں تھی وہ مروت اب کہاں جو پہلے انسانوں میں تھی (صفحہ ۲۰)

"ایمان میں خلق" کا پایا جانا ، یہ کیا اندازِ بیان ہے !

جس پہ جی جی کے مرے ، مر کے بھی جی جی کے اٹھے وہ اداؤ شرم و حجابات سے آگے نہ بڑھی (صفحہ ۲۹)

مصرعہ اولیٰ میں شاعر نے اپنے نزدیک کوئی بہت بڑی لفظی صنعت پیدا کی ہے ، حالانکہ اسی "لفظی صنعت" نے پورے شعر کا لطف غارت کر دیا ۔

قبر میں بھی مرے جذبات بجے جلتے ہیں یہ بھی شاید ترے پازیب کی جھنکار نہیں (صفحہ ۳۰)

ایسے شعر بھلا کسی شاعر کو اپنی ذات سے منسوب کرنے چاہئیں !

مجھے بھی ہوش میں دیکھو شرابِ ناب ہو جاؤ مگر جب ہوش اُڑ جائیں تو لطفِ خواب ہو جاؤ (صفحہ ۳۲)

شعر سے مفہوم تو پیدا کیا جا سکتا ہے مگر اندازِ بیان کس قدر گنجلک ہے !

وہ وداعِ حسن کا مرحلہ ، اے خدائے عشق مجھے بچا مری کائنات بچھڑ گئی ، تیری بندگی کو سلام ہے (صفحہ ۳۸)

ایسے شعر شاعر کو چھانٹ دینے چاہئیے تھے !

کہیں پہ بکھرے ہیں بال و پر اور کہیں پہ ٹکڑے ہیں قینچیوں کے

قفس یہاں پر ضرور ہوگا ، کوئی مرے آشیاں سے پہلے (صفحہ ۴۳)

"ٹکڑے ہیں قینچیوں کے" اس نے شعر کو مضحکہ بنا دیا ۔

گناہ تو نے بھی اے دل بہت کئے ہوں گے مرے گناہ کا لیکن کوئی جواب نہ تھا (صفحہ ۴۸)

شعر میں کوئی لُطف اور ندرت نہیں ! نرا سپاٹ شعر ! پھر یہ کس گناہ کی طرف اشارہ ہے ، اس کا کوئی اتا پتا شعر میں نہیں ملتا

پھر حریمِ ناز کے پردے ہلے پھر رضائے پردہ دار آنے لگی (صفحہ ۵۲)

یہ "رضائے پردہ دار" کیا ہوتی ہے ۔ شاید یہ کتابت کی غلطی ہو کہ "صدائے پردہ دار" کی جگہ "رضائے پردہ دار" چھپ گیا

بدل لے باغباں خود ہی اب طرزِ عمل اپنا کہیں ایسا نہ ہو ، بلبل ہی شاخِ گل کتر ڈالے (صفحہ ۵۰)

انتہائی سطحی بلکہ بچکانہ شعر !!

ہیں للچائی ہوئی نظریں سراسر اہل محفل کی — کہیں یہ مسلم ہندی نے محفل نہ بن جائے (صفحہ ۶۲)

یہ تو شاعری کے ساتھ ایک طرح کا مذاق ہوا۔ توبہ!

شام کی سرمئی فضاؤں میں — کچھ حسین لوگ مسکرا بیٹھے
ہم بچے دبنے سے پھرتے تھے — اپنے پہلو میں دل دبا بیٹھے

اس قطعہ کو پڑھتے ہوئے وجدان چیخنے لگا ———— !

بادہ خواروں کے درمیاں ساقی — کچھ مسائل الجھ گئے ہونگے
جب تری زلف کھل گئی ہوگی — سب یقیناً سلجھ گئے ہونگے

قطعہ خوب ہے، مگر مصرعہ ثانی میں "یقیناً" کس قدر کھٹکتا ہے، کاش یہ مصرعہ یوں ہوتا:—

سب مسائل سُلجھ گئے ہونگے

شب ماہ میں مجھے لے گیا مرا دل نواز سوئے چمن
وہ چمن کہ بقعہ نور تھا، تھی درخشاں تاروں کی انجمن (صفحہ ۸۰)

دل نواز کے ساتھ "مرا" اچھا نہیں لگتا ———— مصرعہ ثانی میں "تھی" کی 'ی' اور درخشاں کے آخری حروف جس بری طرح دب گئے ہیں، اس سے سامعہ کو تکلیف ہوتی ہے۔

ان خلاؤں سے نامانوس میں اور مجھ سے تو یہ — ڈر رہا ہوں، کہیں جلوؤں سے نہ دیں مجھ کو جلا (صفحہ ۱۰۰)

مصرعہ ثانی کس قدر بے رس ہے!

اس مجموعے میں سب سے اچھی نظم "جنت وادی" ہے۔ کاش جناب انور جالندھری دوسری نظموں میں بھی اس آہنگ کو قائم رکھ سکتے! انور جالندھری کو اپنا کلام سخت کڑے انتخاب کے بعد شائع کرنا چاہیئے تھا، اس صورت میں کلام میں ناہمواری باقی نہ رہتی اور بلندیوں کی آغوش میں پستیاں نہ پائی جاتیں!

ماہنامہ "نقش"

مدیر — مولانا انظر شاہ کشمیری، نائب مدیر:— مولانا ظہور الباری اعظمی، فی پرچہ آٹھ آنے، سالانہ پانچ روپے، ملنے کا پتہ:— دفتر "نقش" دیوبند۔

پاکستانی خریداروں کے لئے:— قاری شریف احمد صاحب، دھنی مسجد، گرین بلڈنگ فلیٹ ۱۳/۵ نارائن اسٹریٹ، آوٹ رام روڈ کراچی۔

ماہنامہ "نقش" بڑی آب و تاب سے منظر عام پر آیا ہے، اس کے مضامین میں خاصہ تنوع پایا جاتا ہے، لکھنے والوں میں بعض مشاہیر اہل قلم بھی شامل ہیں، مقصود دین کی تبلیغ و اشاعت اور اسلامی انداز پر فکر و نظر کی تربیت ہے! اس ظلم زدہ دور میں کسی دینی و علمی جریدے کا مالی اعتبار سے خود مکتفی (Self Independent) ہونا بہت دشوار ہے "نقش" کے منتظمین کو مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا، اللہ کرے یہ مشکلیں خیر و خوبی سے دور ہوتی رہیں اور "نقش" جریدۂ عالم پر "نقش دوام" بن کر رہ جائے، ہم اس کی کامیابی کے لئے دل سے دعا کرتے ہیں۔

سوامی درشن

از:— سوامی مارہروی، ضخامت ۱۵۴ صفحات (ہاتھ کے سائز)، مجلد، رنگین گرد پوش کے ساتھ، قیمت درج نہیں، ملنے کا پتہ:— نظامی بک ایجنسی بدایوں (بھارت)

سوامی مارہروی کے نام سے دھوکا ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی "شرمان ہندو کوی" ہونگے، مگر یہ "حضرت" مارہرہ شریف

کے معزز و محترم خانوادۂ سادات کے چشم و چراغ ہیں، اور ہندی میں کوِتا کہتے ہیں اور اپنے گیتوں، دوہوں اور نظموں کے سبب بھارت میں خاصے مقبول اور مشہور ہیں۔

سوامی مارہروی کی شاعری میں موجوں کے ہلکورے بھی ملتے ہیں اور آگ کے شعلے بھی! ان کی کوِتاؤں میں غم جاناں سے زیادہ غم دوراں پایا جاتا ہے سماج کے خلاف اُن کے جذبات شاعری کے پیکر میں ڈھل کر کہیں کہیں "آتش صحرا" ([illegible]) بن گئے ہیں ان کی شاعری میں مذہب پر بھی طنز ملتی ہے، اور مذہب سے یہ بیزاری اپنے گھر کے "خانقاہی ماحول" کو دیکھ کر پیدا ہوئی ہے۔

اُن کی کوِتا کے چند چُنے ہوئے بول، دوہے اور چھند:۔

من ہی بُوند اور من ہی ساگر، من ہی اہلا من آتی موج
من ہی نیّا، من ہی کھویّا، اُچھرے ڈوبے من کی موج
من ہی پھنسیا، من ہی پنچھی، من ہی دانہ، من ہی جال
من ہی بجلے، من ہی پھنسائے، سب سے نیاری من کی چال

اس میں صیاد کا ترجمہ "پھنسیا" بہت خوب ہے!

من ہی میں ہیں رام جھروکے، من ہی میں بٹھا کر دولے
من کے بھیتر جوت اجیتے، من کے شوالے گھپ اندھیارے

"اور چلا چل تھکے مسافر"

آنکھ سے اوجھل دور ہے منزل، خطروں سے ڈر جانا کیا
کانٹے تو بھرپور ملیں گے، کانٹوں سے گھبرانا کیا،
ناحق میں ہلکان نہ ہو، اب دُبدھے جی بھٹکانا کیا
بوجھل پاؤں اٹھا چل سوامی روکھ ہرے للچانا کیا
مڑ مڑ کر مت دیکھ مسافر! پردیس جی للچانا کیا
اور چلا چل تھکے مسافر پل بھر کا ستانا کیا

کر کے بیبر میری باکھر تم نے اونچے محل بنائے!
جگ مگ میرے دیئے بجھا کر اپنے گھر کے دیپ جلائے

کاہو من سنتوش نہیں ہے　　　دیپ بجھے کچھ ہوش نہیں ہے
کانٹوں ہی کا دوش نہیں ہے　　　پھول بھی اب نردوش نہیں ہے

کچھ تو بھی جا، کچھ کاٹ بھی لے، اس جیون کا پھل لیتا چل
اک ہاتھ سے لپنے دیتا جا، اک ہاتھ سے لپنے لیتا چل
یہ بھگتوں کا بھنڈارا ہے، تو جھولی اپنی بھرتا چل
ہر موج میں پیار سے بہتا جا، ہر بوند میں ساگر لیتا چل

یہ سوامی کی کٹیا ہے
بھگوان یہیں پر ملتے ہیں

بالی رُت کو ملتا کھوئی   مات پتا کی ممتا کھوئی
بھولے روپ سندرتا کھوئی   گھونگٹ اوٹ مدھرتا کھوئی
دل کی گھڑی، اُبلے بھیس
چل رے پنچھی! اپنے دیس

جب امبر چھاؤں گھنیری ہو
جب ماوس رین اندھیری ہو
جب مدھ کی لہر سنہری ہو
جب کنج گلی میں پھیری ہو

تب چپکے سے تم آجانا
تم من کے دیپ جلا جانا

اوگھٹ رستہ، گھپ اندھیاری، جیون بوجھ سماسم بھاری
ڈگ مگ ہارے نربل ناری، جوت اجیتے گھپ سنسان
من میں آئے بسو بھگوان

ہری مایا، ہری رام   کیا پیپ اور چھدام
رام بھرے من کو تھام   ہری بنائے بگڑے کام
چاروں کھونٹ ایک ہی نام   بچ لے پنچھی! ہر کا نام

دوسرا رخ :-

داؤ گھات کی سُوجھت لاگی، بھاؤ کریں بیو پاری
کہیں سونے روپے کے ڈھیر لگے، کوئی پران کرے بلہاری

دوسرے "بول" میں شبدوں کی اونچ نیچ نے نغمگی کو بہت کچھ کم کر دیا۔ اس انداز کا مصرعہ ہونا چاہیئے تھا:- ؟
بنگلا بن کے پالنے پہ بیٹھے کتنے اتیا چاری

ریت، پریت کے ناتے جوڑے، کتھا لمبی پریم کہانی
سپنے میں بن کے کملا پاتی جھوٹی سیجوات اتراتی (صفحہ ۷)

دوسرے مصرعہ میں بڑا تکلف پیدا ہو گیا، اس کو پڑھنے میں زبان ٹھوکر کھاتی ہے۔

ایک کٹھن پربت سے بھاری، الجھی کو سلجھائے کون
کاغذ لیکھا سب کوئی بانچے، من کی الجھن بانچے کون (صفحہ ۸)

"کٹھن" توصفت ہے، یہاں "کٹھنائی" کا محل تھا! دوسرے مصرعہ میں "سب کوئی" کی جگہ "ہر کوئی" ہونا چاہیئے۔

پھانس سی دل میں چبھتی ہوگی   آستا میری دکھتی ہوگی (صفحہ ۲۰)

"تا" پڑھنے میں جھٹکا سا لگتا ہے۔

کنارا

ع میری نس نس دکھتی ہوگی

سامنے کا مصرعہ تھا!

"پنچوں ہاتھ پتا دوا" بہت اچھی نظم ہے، لیکن افسوس ہے اس کا آخری حصہ کمزور ہے!

.... ہر علم کے دریا بہتے ہیں، وہ دوان یہیں پر ملتے ہیں (صفحہ ۳۷)

"ہر علم" کتنا بے جوڑ لگتا ہے۔ "ہر علم" کی جگہ کاش! "یان گیان" ہوتا۔

اب اپنے گھر کا راج ملا، اب سورگ بنا یہ دیش اپنا
سب چھل چنتا، اب دور بھئی، اب دیش میں ہی سوراج اپنا
اب ظلم کی ٹہنی سوکھ گئی، اب شانت ہو ہر مَن اپنا
اب پریم کا ساگر لہر اٹھا، اب پریم بنا کیوٹ پنا (صفحہ ۳۹)

اس بند میں "اپنا" ہی ردیف ہے اور "پنا" ہی قافیہ ہے، اس نے بڑی بدنمائی کی پیدا کر دی! "چھل" فریب کو کہتے ہیں اور چنتا "فکر" (anxiety) کو! چھل کے ساتھ چنتا نہیں "کپٹ" یا "فریب" بولتے ہیں۔

"اب ظلم کی ٹہنی سوکھ گئی" کا یہاں کیا جوڑ تھا؟

جو تھا ایک سماجی پھوڑا رستا سا ناسور
آج زمین پر راج اُسی کا، وہی اکیلا سور (صفحہ ۴۸)

"سماجی پھوڑے" نے اس پورے "بند" کی سُندرتا کو مٹی میں ملا دیا ——— توبہ!

"من کی دیپ" (صفحہ ۸۳) کے تیسرے بند میں بحر دوسری ہو گئی!

زور چلے بھنگ موس کے کھاؤں ڈشٹوں کا منہ نوچ کے کھالوں (صفحہ ۹۱)

"ظالموں کا منہ نوچ لینا" تو ٹھیک ہے مگر "منہ نوچ کر کھا لینا" یہ خود مردم خوری اور سنگدلی کی دلیل ہے! توبہ

جس نے کر دیا درس تھا مومن کو خودی کا یزداں بکمند کرنے کو پھیلائے بہت جال (صفحہ ۱۲۹)

تقطیع میں "یزداں" یہ کمن، آتا ہے! دوسرے مصرعہ میں یوں بھی کوئی لطف نہیں!

کسانو! تم اپنے مہرباں تو دیکھو خدا کا کرم، اس کا احساں تو دیکھو (صفحہ ۱۴۲)

"مہرباں کو" "مہرباں" د مہر۔ بروزن "اَرِش" نظم کیا ہے۔

حیرت ہے کہ "جوت" کو "جیوت" "سیس" کو "شیش" "ساون" کو "ساونڑ" "ترسول" کو "ترشول" اور "بھاگ" کو "بھاگیہ" کتابت کیا گیا ہے!

تعلیمات امام اہل سُنّت

از:۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ، ضخامت ۸۰ صفحات (سرورق رنگین) قیمت:۔ ساڑھے سات آنے۔ ملنے کا پتہ:۔

شیخ عبدالکریم اینڈ سنز تاجران کتب و پبلشرز بیرون بوہڑ گیٹ، ملتان شہر۔

اس کتابچہ میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس اللہ سرہٗ کے ایک سو ارشادات اصل عبارت اور اس کے اُردو ترجمہ کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں، ترجمہ سادہ اور عام فہم ہے! فاضل مترجم اور مرتب نے اس کا انتخاب

کیسا ہے کہ :-

"بایں ہمہ یہ ملحق شدہ خطوط بعض جگہ مخدوش معلوم ہوتے ہیں اور آخری مکتوب تو بندہ کے نزدیک جعلی اور مصنوعی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس میں بعض باتیں خلاف شرع و خلاف مشرب مجدد صاحبؒ معلوم ہوتی ہیں۔"

——— اور ———

"ابھی اوپر گزرا کہ حضرت مجددؒ سے بھی غلبۂ حال میں بعض جگہ کچھ الفاظ نکلے ہیں جن کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں ہے، ہاں! اس جگہ صرف یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ بعض جگہ خود انھوں نے ان امور کا اعتراف کیا ہے اور اپنے بعض کشوف و الہامات کے آخیر میں غلط ثابت ہونے کا اظہار فرمایا ہے اور یہ بھی ان کی کمال درجہ کی دیانت و تقویٰ کی دلیل ہے، ورنہ لاکھوں میں کوئی ایسا ہوگا، جو بلا تاویل اپنی غلطی سے رجوع کرے اور پھر اس کا اعلان کرے۔"

حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کے چند اقتباسات :-

"جن حیوانوں کو لوگ مشائخ کی نذر کرتے ہیں اور ان مشائخ کی قبروں پر ان کو ذبح کرتے ہیں، فقہ اسلامی کی روایات کی رُو سے فقہاء نے اس عمل کو شرک میں، داخل کیا ہے۔"

"محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام درکار ہے نہ کہ شیخ محی الدین ابن عربی کا کلام، یا ان کے شاگرد صدرالدین قونوی کا یا عبدالرزاق کاشی کا، ہم کو نص کلام اللہ و نص کلام رسول درکار ہے نہ کہ فص (فصوص الحکم ابن عربی کی کتاب)"

"یہ فقیر ان بدعات میں سے کسی بدعت میں بھی حسن اور نورانیت مشاہدہ نہیں کرتا و بجز ظلمت و کدورت کے کچھ اور محسوس نہیں کرتا ——— اور دین نام ہے خیرخواہی اور متابعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اتباعِ سنّتِ عالیہ اور اجتناب از بدعت غیر مرضیہ کا، خواہ بدعت صبح صادق کی طرح نظر آئے، کیونکہ فی الحقیقت اس میں نہ کوئی نور و ضیا ہے، نہ علیل کے لئے کوئی شفا اور نہ کسی مرض کے لئے کوئی دوا۔"

"بلکہ اس طریقۂ عالیہ (نقشبندیہ) کے بعض خلفاء متاخرین نے بھی اس طریق میں بدعتیں پیدا کی ہیں اور اکابر کی اصلی روش کو ہاتھ سے کھو بیٹھے ہیں۔"

"اور صوفیہ کی ایک کثیر جماعت ہے ...... جنھوں نے دائرہ شریعت سے باہر قدم رکھا ہے اور (اپنے خیال میں) پوستِ شریعت کو چھوڑ کر مغز طریقت کو پہنچ گئے ہیں۔ یہ مقام صوفیوں کی لغزشوں کا ہے، اس طریق سے بہت سے ناقص لوگ

لی دوزندقہ تک پہنچ گئے ہیں، اور شریعت روشن کے حلقے سے سرنکال لیا ہے، پس وہ گمراہ ہوئے، اور اوروں کو گمراہ کیا۔"

"ریاضات و مجاہدات جو تقلید سنت نبوی کے سوا اختیار کرتے ہیں، معتبر نہیں کیوں کہ ہندو جوگی برہمن اور فلاسفۂ یونان بھی اس امر میں شریک ہیں مگر وہ ریاضات ان کے حق میں بجز ضلالت کے اور کچھ نہیں بڑھاتے!"

"کوئی ایسی ضروری بات نہیں کہ شریعت کے سوا اس کی ضرورت پڑے، طریقت و حقیقت جس کے ساتھ صوفیاء ممتاز ہیں، ہر دو خادم شریعت ہیں"۔ ......

شریعت کی مخالفت اگرچہ بال برابر ہی کے ہوتے ہوئے اگر وجد و حال حاصل ہو تو وہ استدراج میں داخل ہے، انجام کار یہ چیزیں اُسے رسوا کریں گی، محبوبؐ رب العالمین کی اتباع کے بغیر خلاصی ناممکن ہے۔

"گانا سننے بجانے سے بھی اجتناب ضروری ہے، کیوں کہ یہ لہو ولعب میں داخل ہے جو کہ حرام ہے!"

اللہ تعالیٰ حضرت مجدد صاحب کی قبر پر اپنی رحمت کے پھول برسائے کہ وہ ماحی بدعت اور حامی سنت تھے اور انہوں نے حق بات کہنے میں کسی کی رورعایت نہیں کی!

اصلاحُ الرسوم

از افادات مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم، ضخامت ۱۹۲ صفحات، قیمت ۔ ایک روپیہ دو آنہ

ملنے کا پتہ:۔ شیخ عبدالکریم اینڈ سنز تاجران کتب و پبلشرز بیرون بوہڑ گیٹ ملتان شہر

حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کتاب اب سے ساٹھ سال قبل (۱۳۱۶ھ) لکھی تھی، اس مدت میں اس کتاب کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں، مسلمانوں میں شادی اور غمی کی جو ہزاروں رسمیں چل پڑی ہیں، اس کتاب میں ان کی برائیاں ظاہر کی گئی ہیں، ایک ایک رسم و رواج کا بڑی تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے، فقہ کے بہت سے ضروری مسائل ان مباحث کے درمیان آگئے ہیں، یہ کتاب زیادہ سے زیادہ اشاعت کی مستحق ہے تاکہ مسلمانوں کے عقائد و رسوم کی اصلاح ہو سکے، مکتبہ کریمیہ نے یہ کتاب چھاپ کر دین کی مفید خدمت انجام دی ہے۔

قصیدۃ الزہراء والجندل

...:۔ شیخ فضل حسین حیدرآبادی، ترجمہ:۔ ایم عباس اورنگ آبادی، ضخامت ۔ صفحات

قیمت:۔ ایک روپیہ آٹھ آنے ۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر "منصف" کراچی۔

فرقہ داؤدیہ (بوہرہ) کے ایک بہت بڑے عالم شیخ فضل حسین صاحب گزرے ہیں، جو علمی تبحر کے علاوہ عربی شعر گوئی میں بڑی قدرت رکھتے تھے، ان کا عربی دیوان ۱۳۳۸ھ میں شائع ہوا تھا اس دیوان کے ایک عربی قصیدہ کو ترجمہ کے ساتھ جناب ایم، عباس اورنگ آبادی نے شائع فرمایا ہے، اردو ترجمہ میں روانی اور ادبیت پائی جاتی ہے! یہ قصیدہ حضرت سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی منقبت میں ہے! ــــــــــ دو شعر:۔

مشکاۃ نور اللہ والزجاجہ — جناب سیدہ قندیل خداوندی کا چمکتا ہوا نور ہیں۔ اور

منہا مصابیح الہدی وھنجہ — ہدایت کی شمع نورانی ہیں۔

قال لنبی ذوالعلی والوعد — صاحبِ معراج محمد المصطفےٰ نے فرمایا ہے کہ فاطمۃ الزہرا
فاطمۃ الزهرا امنی بضعۃ" — میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔

صفحہ (۱) پر نویں شعر میں "حجۃ المولیٰ" کا ترجمہ "مشکل کشا کی حجت تمام" کیا گیا ہے حالانکہ "مولیٰ" کا ترجمہ "مشکل کشا" کسی طرح
سے بھی درست نہیں ہے، اور دینی اعتبار سے اللہ کے سوا کسی کو "مشکل کشا" نہیں کہنا چاہیئے!

یہ روایت کہ حضرت سیدہ فاطمہ شکمِ مادر میں بحالتِ جنین اپنی والدہ (حضرت خدیجہ) سے گفتگو کرتی تھیں۔
اور آپ کی پیدائش کے وقت حضرت سارہ، حضرت حوا، حضرت آسیہ اور حضرت مریم جنت الفردوس سے آئی تھیں۔
یہ شعروا فسانہ کے قبیل کی روایت ہے!

صفحہ "۴۹" پر حضرت علی کو "رسول خدا کا ثانی" قرار دیا گیا ہے، یہ مبالغہ آمیز منقبت ہے۔ اور اسے نہ چھپنا چاہیئے!
اس کتابچہ میں دوسرا قصیدہ "قصیدۃ الجدل" ہے، جسے تاریخ ابن جریر کے حوالے سے حضرت عمرو بن ...
کا بتایا گیا ہے: اس قصیدہ میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے خطاب ہے اور اس میں انہیں بہت برا بھلا کہا گیا ہے!
یہ قصیدہ ایک مشاق اور پُر جوش عرب کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے اور ہماری نظر سے کبھی شعرائے مخضرمین میں نظر نہیں
آیا، یہ ہمارا قیاس تھا۔ پھر ہم نے کراچی کے ایک بڑے کتب خانہ میں جانچ کی۔ وہاں کے مہتمم نے جو عربی کے عالم ہیں، دو
دن کی تلاش اور ورق گردانی کے بعد بتایا کہ ابن جریر طبری کی مشہور تاریخ میں تو اس قصیدے کا پتہ نہیں ملتا۔ فاضل مترجم
کے ہم شکرگذار ہوں گے۔ اگر وہ اس عربی قصیدہ کے بارے میں ہمیں مطلع فرما دیں کہ وہ ابن جریر کی کس جلد میں ہے۔
شعروں اور قصیدوں میں بعض لوگوں نے اس قسم کے بہت سے الحاق اور اضافے کئے ہیں۔ شیخ شرف سید چھوٹی
کی کتاب "ریاض الجنان" کے تنہا حوالہ پر کامل اعتماد نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ اصل ماخذ (ابن جریر) کو نہ دیکھ لیا جائے۔
یہ مباحث جن کا اس قصیدے سے تعلق ہے بہت نازک اور پیچیدہ ہیں، جن کا یہاں چھیڑنا اس وقت ہمیں مقصود
نہیں تھا۔ فرصت ملی اور حالات سازگار رہے تو ہم اس موضوع پر تفصیل سے بتائیں گے کہ ان قصیدوں کا اصل ذمہ دار کون
تھا؟ اور "سبائیوں" نے کس طرح دین کو پارہ پارہ اور ملت کو متفرق کرنے کی کوشش کی ہے

رومن رسم الخط اور پاکستان

از:۔ سید عبدالقدوس ہاشمی ندوی، ضخامت ۵۲ صفحات، قیمت آٹھ آنہ
ملنے کا پتہ:۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، سرسید گرلز کالج، ناظم آباد، کراچی

اپنے موضوع پر یہ مقالہ "حرفِ آخر" ہے! علمی اور فنی نقطۂ نگاہ سے فاضل مقالہ نگار نے یہ ثابت کیا ہے کہ پاکستان
کے لئے "رومن رسم الخط" کسی عنوان سے بھی مناسب نہیں ہے اور اس سے سہولت کی بجائے طرح طرح کی دشواریاں پیدا
ہو جائیں گی ———— اس کتابچہ میں اعداد و شمار کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے کہ اردو رسم الخط کے مقابلہ میں "رومن ٹائپ"
میں کاغذ، روشنائی اور وقت زیادہ صرف ہوگا، اور "اردو حروف میں" جہاں سو روپے خرچ ہوں گے، "رومن حروف" میں
ان پر دو سو اٹھتر روپیہ (تقریباً تین گنا زائد) لاگت آئے گی!

یہ کتابچہ اس قابل ہے کہ اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے اور خاص طور سے انگریزی میں ترجمہ کرکے شائع کیا جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ :-

(۱) رومن حروف میں یہ صلاحیت نہیں کہ اردو زبان کی آوازیں ان سے ادا ہو سکیں۔

(۲) رومن حروف ناقص، غیر سائنٹفک اور غلط قسم کی لکیروں کے مرکبات ہیں۔

(۳) رومن حروف ہماری روزمرہ کی تحریری ضروریات کے لئے کارآمد نہیں ہیں۔ یہ مشتبہ تحریریں پیدا کرتے ہیں، اور بمشکل تمام لکھے اور پڑھے جاتے ہیں۔

(۴) اردو زبان کی طباعت کے لئے رومن حروف بالکل نامناسب ہیں، کتاب کا حجم بہت بڑھ جائے گا، لاگت بہت زیادہ آئے گی، حتیٰ کہ سو روپیہ کی چھپائی ۲۰۰ روپیہ کی پڑے گی۔

(۵) رومن حروف پاکستانیوں کے مابین قومی اتحاد پیدا کرنے میں کسی طرح معاون نہیں ثابت ہو سکتے، بلکہ ان حروف کی وجہ سے وہ باہمی اتحاد جو دینی کتب اور دینی تعلیم کی بدولت قائم ہے غارت ہو جائے گا، اور بین الاقوامی تعلقات میں بھی ان حروف سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔

(۶) رومن حروف کو رواج دینے سے ہم اب تک کے وسیع علمی و ادبی سرمایہ عموماً قرآن و دینیات سے خصوصاً بالکلیہ محروم ہو جائیں گے۔

اس کتاب کے مصنف اور ناشر دونوں علمی دنیا کی طرف سے ستائش و تبریک کے مستحق ہیں۔ (فجزاہما اللہ خیر الجزا)

سید الکونین

تالیف: حکیم مولانا محمد صادق سیالکوٹی، ضخامت ۵۲۸ صفحات (قیمت درج نہیں)
ملنے کا پتہ:- ادارۂ تبلیغ چوک میراں، سیالکوٹ شہر۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ جناب حکیم مولانا محمد صادق صاحب سیالکوٹی نے سادہ و عام فہم انداز میں مدون کی ہے۔ ذاتِ رسالت مآب سے فاضل مؤلف کی عقیدت و محبت ایک ایک سطر سے نمایاں ہے، مسلم گھرانوں کو اس کتاب کے مطالعے سے بیش از بیش فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

اگرچہ حسن فروشاں بجلوہ آمدہ اند ‏ ‏ ‏ کس بحسن و ملاحت بیار ما نرسد ‏ ‏ ‏ (صفحہ ۱۶)

کتابت میں "کسے" کی جگہ "کس" چھپ جانے سے، مصرعہ ناموزوں ہو گیا۔

صفحہ ۴۲ پر "ووجدک ضالاً" کا ترجمہ "اور پایا تجھ کو راہ بھولا ہوا" کیا گیا ہے، اس کا ترجمہ یوں ہونا چاہیئے:-

"اور تجھ کو حیران (یعنی ہدایت کے لئے شدید منتظر و سراسیمہ) پایا"

"جب آخری دو آیتوں پر پہنچے تو پتہ پانی ہو گیا" (صفحہ ۱۰۸) "پتہ پانی ہو گیا" اس محاورے کے استعمال کا یہاں کوئی محل نہ تھا۔ "اور لوگوں کو کہتے جاتے" (صفحہ ۲۹) میں "سے" کی جگہ "کو" دسیوں بیسیوں جگہ استعمال ہوا ہے اور بہت سے مقامات پر کھٹکتا ہے۔ صفحہ ۱۲۷ پر "غیظ" کو "غیض" لکھا ہے۔

(صفحہ ۱۸۵) "آپ کے بستر پر لیٹنے کا یہ فعل کہہ رہا تھا":-

مرکب داستم انداختم بجائے حیف
کہ نیستم سر دیگر مرا بجائے دگر

اس شعر سے پہلے جو جملہ لکھا گیا ہے وہ کس قدر غیر ادبی اور نو مشقوں کا سا ہے!

(صفحہ ۲۲۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لاتے ہی لوگ زیارت کے لئے پل پڑے:

"پل پڑے" یہاں بالکل غلط استعمال ہوا ہے۔ "ٹوٹ پڑے" لکھنا تھا۔ ـــــــــ "وہ لوگ مجھے مارنے کے لئے پل پڑے" ـ یہ ہے "پل پڑے" کا محل استعمال! (صفحہ ۵۰۸) "اگر (دین کے سلسلہ میں) آپ کو غصہ آجاتا تو وہ منبعد ور وش پر وایسا ـ ہیبت ناک بن جاتا تھا" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ اقدس کو حالت غضب میں بھی "ہیبت ناک" نہیں "پر ہیبت" کہنا چاہئے ـــــــــ "دین کے سلسلہ میں" کتنا کمزور ٹکڑا ہے۔ (صفحہ ۵۰۹) "معاشرتی ماحول میں آپ کی عادت مشغلی راہ ہیں" ـــــــــ یہ کس قدر کمزور اور سطحی انداز بیان ہے۔

"غار ثور پر کبوتر کے انڈے دینے اور مکڑی کے جالا تننے" کی روایتیں بعض کتابوں میں ضرور ملتی ہیں، مگر مستند نہیں ہیں۔

"جب جور و ستم کے تاریک بادل گھر آئے، اور مہبط وحی والہام پر زور سے برسنے لگے" (صفحہ ۱۳۹)

"چاروں طرف مخالفت کا سمندر بن گیا۔ جو ساعت بساعت تندی و تیزی سے اچھلتا تھا اور اس کی خونی موجیں شاہ اُمم کی طرف لپکتی تھیں (صفحہ ۱۶۸)" قبل نبوت کے چالیس سال اپنے شہر و ایام کی صباحت و ملاحت سے گرہ کشائے قلب و نگاہ ہیں اور بعد نبوت کے شموس آوان ظلمت ربائے جور و جہل ہیں، حیات اطہر کا ہر لمحہ قندیل ہدیٰ بن کر دنیا کے چپے چپے پر ضو فگن ہے اور اپنی لمحہ لمحہ میں جگنو کا تو حسین اور ایمان فروز ہے" (صفحہ ۵۱۲)

اس قسم کی عبارتیں نہ صرف یہ کہ ادبیت کی روح سے خالی ہیں، بلکہ لکھنے والے کے اسلوب تحریر و نگارش کے بارے میں اچھی رائے قائم نہیں ہونے دیتیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "افصح العرب" اور "جوامع الکلم" تھے۔ اس لئے حضورؐ کی سیرت اس کی مستحق ہے کہ وہ اُن قلموں سے لکھی جائے جو قرآن و حدیث اور تاریخ و سیرت کے علاوہ زبان و ادب فصاحت و بلاغت اور ادب و انشاء کی نزاکتوں سے واقف ہوں اور ان کے تقاضوں کو پہچانتے ہوں!

عقائد علمائے دیوبند

از:۔ مولانا خلیل احمد مہاجر مدنی مرحوم، ضخامت ۴۴ صفحات، قیمت نو آنہ۔۔
ملنے کا پتہ:۔ شیخ عبدالکریم، اینڈ سنز تاجر کتب بیرون بوہڑ گیٹ، ملتان شہر۔

"حسام الحرمین" کے جواب میں مولانا خلیل احمد مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتابچہ "المہند علی المفند" مرتب فرمایا اور اس کی تصویب و تائید میں مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور مصر و شام کے علماء کی رائیں حاصل کیں، جو اس رسالہ میں درج کر دی گئی ہیں رسالہ عربی زبان میں اب سے پچاس سال قبل لکھا گیا تھا اب اس کا اردو ترجمہ مکتبہ کریمیہ ملتان کے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔

اس روشن حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ دیوبند نے اللہ کے دین کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے اور تقریباً ایک صدی سے تشنگان علم دین اسی چشمہ فیض سے سیراب ہو رہے ہیں۔

علماء دیوبند کے عقائد حق ہیں اور ان سے اہل بدعت نے غلط باتیں منسوب کر دی ہیں، جو بظاہر بڑی وحشتناک لگتی ہیں لیکن جب ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے، تو یہ وحشت دور ہو جاتی ہے، مثلاً "امکانِ کذب" کا عقیدہ ایک خالص "کلامی مسئلہ" ہے، "جھوٹ بولنے کے فعل سے علماء دیوبند اللہ تعالیٰ کی ذات کو قطعاً پاک اور ... سمجھتے ہیں، بحث صرف "امکان" اور "قدرت" کی ہے......!

اس کتابچہ میں بعض باتیں کھٹکیں" ایک تو علماء کرام کے ناموں کے ساتھ القاب و خطابات دیکھ کر:-

رہنا چاہیے ـــــــ یہ کہ بدظنی نہ کریں، ایک دوسرے کا مذاق نہ اڑائیں، آپس میں کسی سے کوئی غلطی ہو جائے تو کھلے دل سے معاف کردیں، خیر خواہی اور ایثار و اعتمادیت کا م لیں، ایک دوسرے کو حقیر نہ سمجھیں، محبت اور خوش اخلاقی سے پیش آئیں۔ غرض ـــــــ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ۔

کی مجسم زندہ تفسیر بن جائیں! ـــــــ لیکن مقامِ حسرت و افسوس ہے کہ یہ "ٹریجڈی" ان لوگوں میں نہ ہو ائی گئی جو اس کتابچہ کے صحیح مخاطب و مصداق تھے!

کتاب کا دیباچہ جناب خورشید احمد (ایم۔اے) نے لکھا ہے اور پوری دردمندی کے ساتھ لکھا ہے! یہ کتاب اپنی افادیت واہمیت کے اعتبار سے، مسلمانوں کے ہر طبقہ میں بار پانے کی مستحق ہے کہ انتشار و فتراق امت کہ ہر طبقہ میں پایا جاتا ہے اور "اتحاد و اتفاق" کے نسخہ کیمیا کی سب کو جستجو ہے!

قانون بین الممالک

از:۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، ضخامت ۲۶۲ صفحات (قیمت درج نہیں، خلد گرد پوش کیساتھ)
ملنے کا پتہ:۔ اسلامک بک سینٹر۔ مسجد چوک حیدرآباد دکن (بھارت)

یہ کتاب اب سے تقریباً پچیس سال قبل لکھی گئی تھی اور طلبائے قانون اور اہل علم میں خاصی مقبول ہوئی تھی۔ پھر دس سال بعد جب کہ دوسری جنگ عظیم جاری تھی۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ کتاب اپنے موضوع پر بہت خوب ہے معلومات آفریں ہے اور قابل اعتماد و استناد ہے! اس میں بتایا گیا ہے کہ زمین، سمندر، ہوا، نوآبادیات، سفارت، جنگ مال غنیمت، تجارت، جاسوسی، جانبداری اور غیر جانبداری وغیرہ میں مملکتوں کے درمیان کن "قوانین" کو تسلیم کیا گیا ہے اور ان کی نوعیت کیا ہے؟

بعض معاہدات و قوانین کے سلسلہ میں حیدرآباد دکن، گوالیار، بڑودہ، بھوپال اور کروائی وغیرہ کا ذکر کیا ہے مگر یہ ذکر اب "تقویم پارینہ" بن چکا ہے! ؎

وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

ممکن ہے کہ اس کتاب کی اشاعت سے لے کر اب تک بعض "بین الاقوامی قوانین" میں رد و بدل ہو گیا ہو بہر حال یہ کتاب[1] "قانون بین الممالک" کے سلسلہ میں مفید کارآمد اطلاعات فراہم کرتی ہے۔

اردو نثر کا تاریخی سفر

از:۔ محمد زبیر۔ ضخامت ۲۴ صفحات، قیمت چھ آنے، ملنے کا پتہ:۔ ابی دنیا، ڈگی روڈ، علی گڑھ ۶ یو۔ پی۔ پاکستان میں:۔ محمد حسین زبیری نشیمن ۱/ ۲-C/۱۰ ناظم آباد، کراچی ۱۸

اس کتابچہ میں اردو نثر کا تاریخی جائزہ لیا گیا ہے، چند ورقوں کی کتاب ہے مگر بڑے کام کی کتاب ہے۔ اس کتابچہ سے پڑھنے والوں کو معلوم ہوگا کہ اب سے ساڑھے چھ سو سال قبل ۱۳۰۸ء میں حضرت خواجہ سید اشرف سمنانی رحمۃ اللہ علیہ نے "اخلاق و تصوف" پر ایک رسالہ اردو میں لکھا تھا، جو آج کل ناپید ہے ـــــــ اردو کی سب سے پہلی کتاب جو طبع ہوئی وہ حضرت خواجہ محمد گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ (۱۴۲۲ء) کی کتاب "معراج العاشقین" ہے افسوس ہے کہ علامہ شبلی نعمانی کی کسی تصنیف کا سرسید اور حالی کی کتابوں کی طرح ذکر نہیں کیا گیا، اردو نثر نگاروں

[1] صفحہ ۲۹ پر "تمانچہ" کو "ت" کے ساتھ ـــــــ "تمانچہ" لکھا ہے ـــــــ صفحہ ۱۰ پر "ساحل کے کنارے" پڑھ کر حیرت ہوئی!

میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا نام چھوڑ دینا اگر غفلت کے سبب ہوا ہے تو یہ افسوسناک غفلت ہے۔ مودودی صاحب کی نثر نے اردو زبان و ادب کو چار چاند لگائے ہیں!

دیوان داؤد اورنگ آبادی

مرتبہ:۔ خالدہ بیگم (ایم۔اے) ضخامت ۱۴۴ صفحات، قیمت ایک روپیہ پچاس نئے پیسے
ملنے کا پتہ:۔ سب رس کتاب گھر، خیریت آباد، حیدرآباد دکن۔

یہ کتاب ادارۂ ادبیات اردو نے شائع کی ہے، جس کے سلسلہ مطبوعات کی تعداد ۲۴۰ تک پہنچ چکی ہے، اس ادارے کی ادبی و علمی خدمات دیکھ کر، زبان سے بے ساختہ دعا نکلتی ہے!

داؤد اورنگ آباد کے مشہور شاعر گزرے ہیں، سراج کے ہم عصر، ان کا سنہ پیدائش ۱۱۰۰ھ اور وفات کا سال ۱۱۶۸ھ ہے۔ ان کی شاعری تقریباً ڈھائی سو سال قبل کی یادگار ہے، جب کہ اردو زبان گھٹنیوں چل رہی تھی، داؤد کے کلام میں دکنی زبان کی ذرا سی جھلک ملتی ہے مگر اتنی نہیں کہ مفہوم سمجھنے میں زیادہ دشواری پیش آئے! مثلاً:۔

سینہ صافی سوں مثل درپن کر　　شمع فانوس دل کی روشن کر

"سوں" کے معنیٰ کسی کو نہ بھی معلوم ہوں، تو بھی شعر کا مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے ——— اور جہاں کلام کا یہ رنگ ہے، وہاں طبیعت لطف لیتی ہے۔

مجھے لکھنا ہے وصف اس گلبدن کا　　اگر کاغذ ملے برگِ چمن کا
جامِ شراب دیکھ کے دل بے خبر ہوا　　شاید تری نگاہ کا مے میں اثر ہوا
حسن اس شمع کا ہے گل رنگ　　کیوں نہ بلبل جلے مثال پتنگ
گاہ سیرِ بوستاں کرتا ہوں، گاہے سیرِ بزم　　گاہ تیرے عشق میں بلبل ہوں، گہ پروانہ ہوں
چہرہ اُس پری رُو کا کیا عجب کتابی ہے　　کسر ابروان جس میں بہت انتخابی ہے

صحیح ادویہ اور مناسب علاج کی فراہمی کی غرض سے

ہمدرد دواخانہ

کی

بنیاد ہند میں ۱۹۰۶ء میں ——— اور ———

پاکستان میں ۱۹۴۸ء میں رکھی گئی

ہمدرد کے کاروبار کی وسعت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ آج اس کی تیار کردہ ادویہ
...ک کے طول وعرض میں ہر جگہ مل سکتی ہیں لیکن اس وسعت سے زیادہ اس کی کامیابی کا معیا
...ہ احتیاط ہے جو ہمدرد کے معملوں اور دواسازی کے کارخانوں میں دواؤں کی چھان پھٹک
...صفائی ستھرائی تحقیق وتفتیش اور قدم قدم پر فنی جانچ پرکھ میں برتی جاتی ہے۔ ان چیزوں
...ے ہمدرد کا اصلی نام اور خالص ہونے کی ضمانت ہے۔

یہ وہ طریق علاج ہے جس سے ملک کے اسی فیصدی باشندے معالجہ کیلئے رجوع کرتے ہیں

ہمدرد دواخانہ پاکستان، کراچی؛ طبِ یونانی کا علمبردار ہے

لوہے کی ہر قسم کی ضرورتوں اور پورٹ لینڈ سیمنٹ کے لئے
مارش اینڈ کمپنی
کارنر ہاؤس
صدر، کراچی
سے مشورہ کیجئے
اور اسکی خدمات سے فائدہ اٹھائیے:
گلفام ٹوائیلٹ سوپ
للی کریم سوپ
للی سوپ فلیکس پوڈر
ریشمی اور اونی کپڑے دھونے کا خاص
اجزا سے مرکب صابن
آل رائٹ میڈ کمیٹیڈ کاربالک صابن
کپڑے دھونے کا بہترین صابن
(۱) ہرن برانڈ (۲) ملٹری
(۳) ۵۵۵ بار
غسل کے لئے بہترین صابن
صنعت پاکستان کے بہترین نمونے
صابن خریدتے وقت
ذوالفقار انڈسٹریز
جو اچھے صابنوں کی ضمانت ہے
جدید ترین ولایتی مشینری سے تیار کردہ
پاکستان میں ہر قسم کے صابن کی ضروریات کیلئے
ذوالفقار انڈسٹریز
ڈی ۱۹ منگھو پیر روڈ، کراچی

ماہر القادری

جلد نمبر ۱۱ — اکتوبر ۱۹۵۹ء — شمارہ نمبر ۷

سالانہ چندہ چھ روپے — فی پرچہ آٹھ آنے

ترتیب

مقامِ اشاعت :- دفتر "فاران" —— کیمبل اسٹریٹ —— کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

آپ کا ایک ملازم ہے، آپ اس سے کہتے ہیں کہ "پینے کے لئے پانی لے کر آؤ" آپ کے اس حکم کو سن کر وہ ملازم تقریر شروع کر دیتا ہے کہ:

"پانی ..... ایک استعارہ ہے جس کے پردے میں حکم یہ دیا گیا ہے کہ خشکی و تری اور بحر و بر کو مسخر کرو، نوامیس فطرت کی گرہ کھولو، بادلوں کو کھینچ کر کہساروں کو اپنی گرفت میں لو، آکسیجن اور ہائیڈروجن کے اسرار کی تہوں میں گھستے ہوئے چلے جاؤ، یہاں تک کہ عناصر کا انتشار مٹ کر ایک مرکز پر آ جائے اور زندگی کا ہر جوہر "پانی" ہو کر رہ جائے! پہاڑوں کے اوراق کو موڑ دو، دریاؤں کی موجوں پر حکومت کرو، پانی کے بلبلوں کو ٹوٹنے سے بچاؤ، اور سطحِ آب کی ہر شکن اور جبینِ جبیں کو ہموار کر دو ——— یہ ہے "پانی لانے" کے حکم کا اصل مقصود، حقیقی غرض و غایت اور صحیح منشا! اس حکم میں اصل تسخیرِ کائنات کی معجز نمائیاں سموئی ہیں، یہ موجِ دریا کی طرح مضطرب و متحرک بننے کی بشارت ہے اور ..... اور ......"

آپ کا وہ ملازم اسی انداز کی تقریر کئے جاتا ہے "مگر" پینے کے لئے پانی نہیں لاتا" اس قسم کے ستم ظریف بلکہ عجیب و غریب ملازم کی حیثیت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ آپ کی شخصیت اور آپکے حکم کے ساتھ وہ مذاق بلکہ توہین کر رہا ہے، وہ پرلے درجہ کا کام چور اور نافرمان ملازم ہے، اس انداز کی حسین تشبیہات اور خوبصورت استعاروں کے ذریعہ گھر کے تمام ملازموں میں وہ آپ کے احکام کے خلاف نافرمانی، حکم عدولی اور بغاوت کی فضا پیدا کرنا چاہتا ہے کہ گھر کے نوکر تعمیلِ حکم کرنے کے بجائے الفاظ کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ جائیں اور نافرمانی اور حکم عدولی ہی کو تعمیلِ حکم کا عین مقصود سمجھتے رہیں۔

اللہ تعالیٰ کے احکام کے اسی قسم کے شارحین اور قرآنِ کریم کے مفسرین آج کل پیدا ہو گئے ہیں، جو نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، قربانی اور دوسرے فرائض و واجبات سے گریز و فرار کی راہیں مسلمانوں کو بتاتے ہیں، جن کے افکار کا سرمایہ شعر و ادب کی چند تشبیہات اور استعاروں سے عبارت ہے، جسے وہ الٹ پھیر کر اپنے مقالات اور تحریروں میں لاتے رہتے ہیں! یہ "روشن خیال مفکرین" (؟) قرآنی افکار کی ترویج و احیاء کا دعویٰ لیکر اٹھے ہیں مگر یہ دراصل قرآن کے مفہوم و معنی کی تغیر و تحریف کا کارنامہ انجام دے رہے ہیں! قرآنی آیات کی یہ (ضرورت سے زیادہ) ذہین افراد ایسی عجیب و غریب شرح و تاویل کرتے ہیں کہ خود "قرآن" زبانِ حال سے چیخنے لگتا ہے کہ:

"مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ"

قرآن کچھ کہتا ہے، یہ کچھ بتاتے ہیں! میر و غالب کے شعروں کی شرح میں شارحین جس ذمہ داری اور احتیاط سے کام لیتے ہیں، یہ تجدد پسند شارحین اللہ کی کتاب کی شرح و تفسیر میں اتنی ذمہ داری کا ثبوت بھی نہیں دیتے، نہ خدا کا خوف نہ بندوں کی شرم، من مانی تاویل، جو دل میں آیا لکھ مارا اور جس آیت کو جس طرح چاہا توڑ مروڑ کر پیش کر دیا۔ وہ جو علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

احکام ترے حق ہیں مگر تیرے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا دیتے ہیں پاژند

تو یہ شارحین قرآن کریم کے ساتھ سچ مچ بہی دردناک سلوک کر رہے ہیں' ہم کہتے ہیں کہ "پاژند" کا پھر بھی فکر و دانش کے اعتبار سے کوئی مقام ہے مگر انہوں نے تو اللہ کی کتاب کو شرح و تاویل کے ذریعہ طلسم ہوشربا بنا کر رکھ دیا ہے۔

قرآن کریم دو ٹوک انداز میں کہتا ہے کہ نبی آخر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کو اللہ تعالیٰ نے کتاب اللہ کی تلاوت اور ساتھ ہی کتاب و حکمت اور تزکیۂ نفس کے لئے مبعوث فرمایا تھا، اور اس بات کو ایک عامی سے عامی آدمی اور غبی سے غبی طالب علم بھی جانتا ہے' دُنیا کا کوئی قدیم و جدید معلم کسی کتاب کی اس طرح تعلیم نہیں دیتا کہ کتاب کے اصل متن ہی کی بس تلاوت کرتا رہے' خود نہ کسی لفظ کی لغوی تشریح کرے اور نہ کسی اجمال کو تفصیل کے ساتھ طول کر بتائے! قول و عمل سے کسی کتاب کے متن کی شرح و تفسیر و توضیح ہی کا نام "تعلیم" ہے ــــــ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اللہ تعالیٰ تو اپنے نبی کو تلاوت کے ساتھ کتاب اللہ کی تعلیم پر مامور فرمائے، اور نبی اس کی صرف تلاوت کر کے رہ جانے اور اس خوف سے کہ کہیں اصل کتاب اور شرح و تفسیر گڈمڈ ہو کر نہ رہ جائیں، کتاب الٰہی کی تعلیم کے فرض ہی کو ادا نہ کرے! حالانکہ نبی اپنے کسی فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کر ہی نہیں سکتا' وہ تو اللہ تعالیٰ کے ایک ایک جزئی حکم کی تعمیل کرتا ہے اور اس تکمیلی شان سے کرتا ہے کہ اس میں ذرہ برابر کوکسر نہیں رہ سکتی۔

پھر جن افراد کو کسی کتاب کی تعلیم دی جاتی ہے وہ خود بھی معلم سے متن کے مشکل مقامات کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ "تعلیم" نام ہی اس افہام و تفہیم اور شرح و تفصیل کا ہے اور پھر یہ نکتہ نہیں بلکہ حقیقت بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ کتاب اللہ اس معلم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں قرآن کہتا ہے ــــــ "وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحٰى" (یہ نبی، اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں کہتا' بلکہ جس کی اُسے وحی کی جاتی ہے اُسی بات کو بیان کرتا ہے) ــــــ تو کیا ذہن اس بات کو قبول کر سکتا ہے کہ قرآن کی تلاوت و قرأت کے وقت تو نبی "نطقِ وحی" سے بولتا ہو مگر جوں ہی قرآن کی تعلیم دینے لگے، اُس کے نطق سے "صفتِ وحی" کو جدا کر دیا جائے!

دوپہر کے وقت چمکتا ہوا سورج اپنی روشنی اور حرارت سے جس طرح اپنے وجود کی شہادت خود ہوتا ہے اور کوئی مادر زاد اندھا بھی اس شہادت میں شک نہیں کر سکتا ــــ تو آفتاب جہاں تاب کے وجود سے ہزار درجہ بڑھ کر یہ شہادت میرہن اور ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تلاوت کے ساتھ ساتھ اس کی تعلیم بھی دی کہ حضور کی بعثت ہی اس "تعلیم" کے لئے ہوئی تھی! سوال یہ ہے کہ وہ تعلیم کہاں ہے! کیا اسے ضائع کر دیا گیا؟ کیا نبی آخر اور مہبط وحی و کتاب کی تعلیم شاعروں کے اشعار، فلسفیوں کے اقوال اور بادشاہوں اور سپہ سالاروں کی سوانح حیات سے بھی (معاذ اللہ) زیادہ غیر معتبر اور کم کار آمد چیز تھی جسے لوگوں نے سرے سے یاد ہی نہیں رکھا اور یاد رکھا تو اُسے آپ کی وفات کے بعد بھلا دیا! ایسا نہ تو ہوا اور نہ ہو سکتا تھا اور بر فرض محال ہو بھی جاتا تو دنیا ایسے شخص کے لائے ہوئے دین و قرآن کو کب مان سکتی تھی، جس کی "تعلیم" کو خود اس کے ماننے والوں نے بے وزن سمجھ کر فراموش کر دیا ہو یا پس پشت ڈال دیا ہو! حالانکہ پوری اسلام کی تاریخ اس کی گواہ ہے کہ ایمان، اسلام اور اخلاق نکوکاری کے پھیلانے اور اللہ تعالیٰ کے دین کی اقامت میں کتاب اللہ کے دوش بدوش تعلیمات رسول (سنت) نے معجزنما کارنامہ انجام دیا ہے! صحابہ کرام کی مقدس سیرتیں قرآن کو پڑھ کر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر، اخلاق کے سانچے میں ڈھلی تھیں ان صحرانشینوں کے دلوں کے آئینوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صیقل فرما کر، انہیں چمکایا تھا، اور یہ تمام

کام تنہا قرآن کریم انجام دے سکتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی کیا ضرورت تھی، لکھا لکھایا قرآن بوقبیس کی چوٹی یا کعبہ کی چھت پر نازل ہوسکتا تھا، مگر اللہ تعالیٰ کی مشیت کاملہ اور حکمت بالغہ نے ایک انسان کو نزول قرآن کے لئے منتخب فرمایا جن کا نام محمدؐ اور احمدؐ تھا جس کی دیانت و پاکبازی کا قریش تجربہ کرچکے تھے، پھر قرآن ہی میں اللہ تعالیٰ نے اس نبی امیؐ کی بعثت کا ذکر فرماکر، اس بعثت کو دنیائے انسانیت پر "احسان" سے تعبیر کیا۔ ایک طرف رافت و رحمت اور اعزاز و تکریم کا یہ عالم کہ اللہ تعالیٰ صحابۂ کرام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محفل مقدس میں بیٹھنے اٹھنے اور بات کرنے کے آداب بتاتا ہے دوسری طرف اس انسان کامل کو "سراج منیر" اور "رحمۃ للعٰلمین" جیسے عظیم الشان خطابات سے نوازتا ہے اور محامد و مناقب کا یہ سلسلہ صرف اس قدر ستائش ہی پر ختم نہیں ہوجاتا، اللہ تعالیٰ اپنے محبوب نبی اور عالمین کے سردار کے اسوۂ حسنہ کو انسانیت کے لئے "معیار" قرار دیتا ہے اور ساتھ ہی حضورؐ کی "اطاعت" کے منصوص ہونے کی قرآن پاک میں بار بار تاکید کی جاتی ہے ——— یہ کہ:-

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ ——— مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ	اطاعت کرو اللہ کی اور اللہ کے رسولؐ کی جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا اس کے سوا کوئی اور طریقہ اور ذریعہ نہیں ہے کہ حضورؐ کے قول و فعل کی اطاعت کی جائے، اس لئے قرآن کریم کے ساتھ ساتھ امت نے حضورؐ کی "سنت" کی پوری پوری حفاظت کی، اور اسے حرز جاں بنائے اور کلیجے سے لگائے رکھا، ایک انسان کے قول و فعل کی حفاظت، صحت، جانچ پڑتال، نقد و تنقیح اور چھان پھٹک کی... جتنی کوششیں، اس دنیا میں ممکن ہوسکتی تھیں وہ سب کی سب احادیث کی حفاظت و تدوین میں استعمال کی گئیں! ایک مکمل فن جس کی نظیر دنیا کے کسی قوم کے علم و ادب میں نہیں ملتی، اس مقصد کے لئے وجود میں آیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی صحت کے جانچنے کے لئے کس قدر دقت نظر، تعمق فکر، کس درجہ حزم و احتیاط اور کیسی کیسی نزاکتوں اور باریکیوں سے کام لیا گیا ہے! احادیث کی علتیں اور کمزوریاں بھی متعین کردی گئی ہیں کہ روایت میں فلاں علت کے پائے جانے سے، حدیث اس قسم (category) کے تحت آتی ہے اور اس درجہ اور پایہ کی شمار کی جاتی ہے! احادیث کے راویوں کے بارے میں کس قدر تفحص و تدقیق سے کام لیا گیا ہے، جس میں جو سقم پایا گیا اسے ظاہر کردیا گیا! فن حدیث کی علمی شان و عظمت کو دیکھ کر مستشرقین حیران ہیں بلکہ مرعوب و ششدر رہیں اور تحسین و ستائش پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں!

دنیا میں کسی نبی، رسول، مصلح، رشی منی، مہاتما، قسیس و راہب، شاعر و فلسفی اور فاتح و کشورکشا کے قول و فعل کو اس سعی و تفحص، تدقیق و تحقیق اور احتیاط و ذمہ داری کے ساتھ محفوظ و مدون نہیں کیا گیا، یہ خصوصیت اور شرف و امتیاز صرف نبیؐ آخر کے اقوال (احادیث) کو حاصل ہے!

یہ بات سوچنے اور سمجھنے کی ہے کہ دنیا میں صرف نبیؐ امی، محمد عربی، رسول ہاشمی (فداہ ابی و امی) ہی کے قول و عمل کے ساتھ یہ خصوصیت کیوں برتی گئی کہ حضورؐ کے قول و فعل، حرکات و سکنات، لب و لہجہ اور تبسم و اشارت تک کو محفوظ کرلیا گیا! پوری زندگی اور اتنی مفصل کہ حضورؐ شب میں کس کروٹ استراحت فرماتے تھے، پانی کتنے گھونٹوں میں پیتے تھے۔ کھانے میں کتنی انگلیاں کس ہیئت سے استعمال فرماتے تھے، حضورؐ کا پیالہ کس وضع کا تھا، نعلین مبارک میں کے تسمے تھے جلال کے وقت چہرۂ مبارک کا کیا رنگ ہوتا تھا۔ فلاں بات کہی تو صرف مسکرا کر رہ گئے، فلاں بات پر ہنسے اور دندان مبارک ظاہر ہوگئے، حضورؐ چلتے کس طرح تھے، بیٹھنے میں عام طور پر کیا نشست ہوتی تھی، فتح مکہ کے دن جب کو کبۂ نبوت نے

شہر مکہ میں نزول اجلال کیلئے تو حضورؐ ناقہ مبارک پر کس ہیئت کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ بدر میں جو دعا کی تھی اس کے کیا الفاظ تھے، قیصر روم کو جو فرمان مبارک بھیجا تھا اس کی عبارت کیا تھی؟ صلح حدیبیہ کن شرائط پر مشتمل تھی؟ ——— حضورؐ کی تلواروں اور سواریوں کے کیا نام تھے! قرآنی احکام کو حضورؐ نے کس طرح برت کر اور جاری کر کے دکھایا کہ "قرآن کے فلاں حکم کی تعمیل یوں ہونی چاہیئے، اس آیت کا یہ مفہوم ہے" غرض، عبادت و اخلاق، معاشرت و معیشت، تجارت و زراعت صلح و جنگ، حکمت و سیاست کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و عمل پوری تفصیل کے ساتھ موجود نہ ہو! یہ حقائق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ انسانیت کے لئے وہی زندگی "نمونہ کامل" بن سکتی ہے جس کا کوئی گوشہ چھپا ہوا اور گمنام نہ رہ جائے ——— جو زیادہ سے زیادہ مفصل، واضح، مشہود، مکتوب، معمول اور موجود ہو! یہ کیسے ممکن تھا کہ قرآن تو محفوظ رہے مگر اس کی "تعلیم" محفوظ نہ رہے! ایسا نہ ہوا نہ ہونا چاہیئے تھا اور نہ ہو سکتا تھا، جس نبی کی بعثت ہی کتاب اللہ اور (دین و دنیا کی) حکمت کی تعلیم کے لئے ہوئی تھی، یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ اس کی بعثت کے "مقصد" ہی کو ضائع کر دیا جائے! کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ اس کی "تعلیم" کو بھی محفوظ رہنا چاہیئے تھا

یہ بات آفتاب و ماہتاب سے زیادہ روشن شواہد و دلائل سے ثابت ہے کہ وحی الٰہی کے مخاطبین اولین ——— یعنی صحابہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل کو نہ صرف یہ کہ یاد رکھا بلکہ اسے اپنی زندگیوں کا موضوع، در وظیفۂ عمل بنایا، وہ بات بات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل کی سند تلاش کرتے تھے!

سازش اللہ تعالیٰ کا دین کتاب و سنت کے دو ستونوں پر قائم ہے۔ اور ان میں ایک ستون دوسرے ستون کو سہارا دیئے ہوئے ہے، ——— پس جو کوئی احادیث نبوی ؐ کو "عجمی سازش" سے تعبیر کرتا ہے، وہ پورے دین کو ڈھا دینا چاہتا ہے، احادیث رسول ؐ کو "عجمی سازش" کہنا، کتاب اللہ اور دین متین کے خلاف بہت بڑی سازش ہے، مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے کہ وہ اس سازش کو چلنے نہ دیں، اس سازش کو ایک ایک اسٹیج سے بے نقاب کر دینے کی ضرورت ہے: خاص طور سے تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلام کے خلاف اس سازش کے زہر کو پھیلنے سے روکنا چاہیئے۔

مسلمانوں کو موثر و دل نشین انداز میں بتایا جائے کہ "اطاعتِ رسول" کی فرضیت نہ تو کسی فقیہ کا اجتہاد ہے، نہ کسی صوفی کا کشف ہے اور نہ کسی متکلم کا کلمۂ حکمت ہے بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، اطاعتِ رسول کی فرضیت تو قرآن کریم نے متعین کی ہے اطاعت رسول ؐ کا منکر در اصل قرآن کا منکر اور رسالت کا منکر ہے، قرآن کریم کی طرف دعوت دینے والا "اطاعت رسول" سے انکار کر ہی نہیں سکتا، اور جو کوئی ایسا کرتا ہے وہ لوگوں کو قرآن کی طرف نہیں بلکہ اپنی ذات اور شخصیت کی طرف بلاتا ہے، وہ داعیٔ کتاب اللہ نہیں بلکہ داعیٔ نفس ہے! اس ظلم و جہالت، ہٹ دھرمی اور دھاندلی کی بھلا کوئی حد و نہایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے کتاب اللہ کی جو قولی و عملی شرح فرمائی اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق تعلیم دی تھی وہ تو نا قابل حجت قرار دی جائے، اُس کی حیثیت ایک تاریخی نوشتہ سے بڑھ کر نہ ہو، مگر اسی چودھویں صدی کے ایک انشا پرداز کو اس کا حق حاصل ہو کہ وہ قرآن کی تشریح و تفسیر میں کتابیں تصنیف کر کے انبار کے انبار لگا دے، اور تمام دنیا سے وہ اس کی توقع رکھے بلکہ دعوت دے کہ لوگ اس کی کتابوں کو پڑھیں اور اس کے افکار کو قبول کریں، اور یہ شخص اس طنطنہ کے ساتھ لکھے کہ اب تک تو اسلام عجم کے سازشیوں اور کٹھ ملاؤں کے ہاتھوں میں کھلونا بنا رہا، اسلام کے معارف و حقائق کی صحیح ترجمانی تو میرے زبان و قلم سے ہو رہی ہے! ایک طرف وہ دعویٰ کہ "قرآن خود اپنی تفسیر کرتا ہے" دوسری طرف یہ عمل کہ قرآن کی شرح و تفسیر میں کتابوں پر کتابیں لکھی جا رہی

ہیں۔ ـــــــــ یعنی یہ صاحب جو کچھ لکھ دیں وہ تو "عینِ قرآن" ہے یا یوں سمجھئے کہ ان کے زبان و قلم سے "قرآن خود اپنی تفسیر" کرتا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور تابعین عظام نے قرآنِ کریم کی جو شرح و ترجمانی کی ہے، وہ قرآن پر افترا ہے، عجمی سازش ہے اور اس ترقی یافتہ دور میں (معاذ اللہ) پیش کرنے کے قابل نہیں ہے۔

پھر سب سے بڑا دھوکا "عشقِ رسول" کے نام پر یہ دیا جا رہا ہے کہ جس رسول کی اطاعت کا انکار کیا جائے، جس کے قول و عمل کو دین میں ناقابلِ حجت قرار دیا جائے، اسی کے مناقب شعر و ادب کی زبان میں بیان کئے جائیں، یہ نرالی محبت عجیب و غریب عقیدت اور ثنا خوانی ہے کہ اپنے ممدوح کے رتبہ و منصب کا انکار اور لوگوں کو اس کے "اسوۂ حسنہ" اور "سنت" سے بیزار بنانے اور دور رکھنے کی دعوت و ترغیب، مگر اس کی شان میں وہ منقبت خوانی اور زمزمہ پیرائی کہ جیسے یہ صاحب "عشقِ رسول" میں ڈوبے ہوئے ہیں! حقیقت میں "سنتِ رسول" سے بیزار کرنے کے توحش کو مسلمانوں کے دلوں سے دور کرنے کے لئے منقبت نگاری اور نعت خوانی کا یہ بہروپ اختیار کیا گیا ہے! اطاعتِ رسول کے انکار کے بعد، حضور کی تعریف و توصیف ایک مضحکہ اور مذاق کے علاوہ اور کیا ہے؟

یہ چالیں!!! نو وقت مسلمانوں کو بہکانے، ور انہیں مرعوب کرنے کے لئے سب سے پہلے اس حربہ سے کام لیا گیا کہ احادیث کے اسقام و علل اور راویوں کی کمزوریاں خوب زور شور کے ساتھ بیان کی گئیں۔ لوگوں کو یہ تاثر دیتے ہوئے کہ جیسے منکرینِ حدیث نے یہ ریسرچ کی ہے اور اسلامی ادب و تاریخ میں سب سے پہلے یہ انکشافات فرمائے گئے ہیں، حالانکہ یہ تمام باتیں حدیث کی کتابوں ہی سے لی گئیں ہیں، اور یہ دلیل ہے محدثین کے کمال دیانت و ثقاہت اور احساسِ ذمہ داری کی کہ اگر وہ (معاذ اللہ) غیر مخلص اور دھوکہ باز ہوتے تو اس قسم کی حدیثوں کی کمزوریوں کو چھپا جاتے اور ان کا ذکر ہی نہ کرتے! قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو، انھوں نے تو لعل و گہر اور خزف ریزوں کو چھانٹ کر بتا دیا، اور وضاعین و جعل سازوں کا پول کھول کے رکھ دیا!

گلستانِ جہاں میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی
مگر جو گل کے جویا ہیں انہیں کیا خار کا کھٹکا

احادیث کا قرآن کریم سے کس قدر گہرا ربط ہے، قرآن کریم کے احکام کی عملی تفصیل احادیث میں کس جامعیت کے ساتھ ملتی ہے، احادیث کی روشنی میں قرآنی احکام کی تعمیل کس سہولت اور احساس ذمہ داری کے ساتھ ہو سکتی ہے، احادیث کی اس تمام اہمیت، ضرورت اور افادیت کو دانستہ چھپا کر، انہیں عجمی سازش کے نام سے یاد کیا گیا۔ اور یہ چال اس لئے چلی گئی کہ قرآن کریم کی شرح و تفسیر میں "ہوائے نفس" کے لئے پہلے سے میدان صاف اور زمین ہموار ہو جائے؛ یہ صاحبان جس آیت کو جو چاہیں معنی پہنا دیں اور جس قرآنی حکم کی جس طرح جی میں آئے تاویل کر دیں، ان کے زبان و قلم پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہ ہو، کوئی ٹوکے کہ فلاں قرآنی حکم سنتِ رسول میں تو اس طرح متشکل نظر آتا ہے۔ فلاں آیت کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان وحی ترجمان نے اس طرح شرح فرمائی ہے ـــــــــ تو اس کے جواب میں چھوٹتے ہی کہہ دیا جائے کہ یہ تو سب ظنی باتیں اور عجمیوں کی سازش ہیں، یہ نہ قابلِ حجت ہیں اور نہ قابلِ استناد! (نعوذ باللہ)

اللہ تعالیٰ اس فتنہ سے اُمتِ مسلمہ کو محفوظ ہی نہیں، باخبر بھی رکھے اور "سنتِ رسول" ہماری زندگیوں میں روح کی طرح جاری و ساری رہے!

از مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی

شمع رسالت کے پروانے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

اَلمَرءُ مَعَ مَن اَحَبَّ ۔ ہر شخص کا حشر اس کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا ہے

"گل ناچیز" گر ایک مدت گل کی ہمنشینی کرے تو "جمال ہمنشیں در من اثر کرد" کا مصداق بن جائے۔ لوہا [illegible] سے چھو جائے تو سونا ہو جائے۔ قطرہ دریا میں مل جائے تو گویا خود بھی دریا ہو جائے پھر وہ جس کی صفت قرآن کریم میں "سراج منیر" بتائی گئی ہے جو خود سراپا نور ہے اور جس کے مبارک ہاتھوں میں نور کی قندیل بھی ہے جو بیک وقت دلوں کو ایمان کی روشنی، دماغوں کو افکار صحیح کی تابانی اور نگاہوں کو ہدایت ربانی سے سرفراز کرتی ہے۔ اگر اس آفتاب عالمتاب سے کسب فیض کرنے والے اصحاب [illegible] بایّھم اقتدیتم اھتدیتم کے معزز القاب سے پکارے جائیں تو تعجب کی بات نہیں۔ ان میں کا ہر فرد آسمان ہدایت کا روشن ستارہ اور انسانی معاشرہ کا گوہر شب چراغ تھا۔ اگر یہ نفوس قدسیہ نہ ہوتے یا دوسرے لفظوں میں شمع رسالت کے یہ پروانے نہ ہوتے تو جن غلاموں کو آقا سے بُعد زمانی و مکانی تھا کس سے یہ سوال کرتے۔ ع

گو ہمیں یک سخن راست کہ جاناں چون است

سیاست و معیشت کے چہرے کو انھوں نے نکھارا۔ تہذیب و تمدن کی زلفوں کو انھوں نے سنوارا۔ خدا ترسی اور انسان دوستی کی مثالیں انھوں نے قائم کیں، جہالت کی اندھیاری، رسم و رواج کی تاریکی، کفر و شرک کی سیاہی ختم کرنے میں آفتاب رسالت کے ساتھ ان ستارگانِ درخشاں کا بھی بڑا حصہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ جانباز ساتھی نہ ہوتے تو دنیا میں یہ نظام حق کیونکر برپا ہوتا، اللہ کی آخری کتاب، زندگی کا مکمل ضابطہ، انسان کے دکھوں کا نسخۂ شفا ہمارے ہاتھوں میں کیوں کر پہنچتا؟ گلہائے حدیث اور حدیث گل سے ہم کیسے واقف ہوتے اور کون بتاتا کہ عاشقان رسولؐ، اس کے متبعین، محبین، صادقین اور رسولؐ کے نام کا کلمہ پڑھنے والے یوں جیا کرتے ہیں۔ ع

بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم

اس میں شک نہیں کہ قدرت بے شمار طریقوں سے اپنے ارادے کو پورا کر سکتی ہے، مگر اصحاب رسولؐ کی فضیلت کے لئے یہی کیا کم ہے کہ چننے والے کی نظر انتخاب نے انہیں کو اس کا اہل پایا۔ نکہت جاں بخش کی امین ذات گل تھی مگر نکہت گل کو پھیلانے والی نسیم پیدا کی گئی۔ کبھی نسیم کو نکہت گستری کی اجازت دی گئی۔ کبھی تلمذوں کو بوئے گل میں بسنے کا شرف بخشا گیا۔ کتاب الٰہی یوں بھی بغیر کسی وسیلہ و ذریعہ کے پھیل سکتی تھی مگر اس کی عملی صورت کے لئے نمونہ عمل درکار تھا۔ اسوۂ حسنہ پر چلنے کے انداز کی ضرورت کو محض ذوق سلیم پر نہیں چھوڑا گیا بلکہ اس کی اہمیت و ضرورت کے لحاظ سے اس کے لئے امر بھی فرمایا گیا۔ مگر ختم نبوت کے بعد یہ بھی ضروری تھا کہ نمونہ محبوب بعد میں آنے والی نسلوں تک بھی اپنے انداز کامل میں پہنچایا جائے۔ اس کے لئے صحابہ کرام ہی موزوں ہو سکتے تھے اور قدرت نے انہیں کو چنا۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ۔

دنیا میں خدا کا پیغام پہنچانے کے لئے بیشمار خدا کے برگزیدہ بندے آئے مگر ان کی دعوت و تحریک پر لبیک کہنے والے بس اسی قدر پیدا ہوئے کہ انہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ مگر محبوب دو جہاں پیغمبر آخر الزماں نے جب آخری بار خدائے واحد کی طاعت و بندگی کا اعلان کیا تو اس کی سعی جمیل کا نتیجہ یوں بیان فرمایا گیا وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا (قرآن)

چنانچہ حضور کے جاں نثاروں اور شمع رسالت کے پروانوں کا جب شمار کیا گیا تو غزوۂ بدر میں تین سو چودہ۔ حدیبیہ میں پندرہ سو فتح مکہ میں دس ہزار، حنین میں بارہ ہزار، حجۃ الوداع میں چالیس ہزار، غزوۂ تبوک میں ستر ہزار۔ اور جب آپ انتقال فرماتے ہیں تو ایک لاکھ چوبیس ہزار کی تعداد تھی۔ (مجمع بحار الانوار)

دوسرے پیغمبروں پر آپ کو صرف یہی فضیلت نہیں کہ آپ کے اصحاب کی تعداد سب نبیوں سے زیادہ ہے، بلکہ آپ کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ آپ کے نور ہدایت نے جن ذروں کو درخشاں کر دیا تھا وہ اب تک اسی آب و تاب کے ساتھ چمک رہے ہیں۔ اور گم گشتگان راہ انہی ستاروں کی روشنی میں اپنی منزل مقصود کا پتہ لگا رہے ہیں۔

کتاب الٰہی کے اوراق میں۔ احادیث کے صفحات میں۔ تاریخ و سیرت کی کتابوں میں ان کے تذکرے ہیں، صرف تذکرے نہیں بلکہ دنیا والوں کے لئے انہیں مثال میں پیش کیا گیا ہے۔ کیوں؟ کیا بات ہے؟ وہ کیا خصوصیات ہیں جن کی بنا پر انہیں یہ بقائے دوام کا خلعت نصیب ہوا۔ ان کا جواب تلاش کرنا ہو تو خود ہی کتابیں بتا دیں گی مگر ان سب کے خلاصہ اور لب لباب پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ وہ در اصل خدا اور اس کے رسول سے لگاؤ، دلچسپی، عشق اور والہانہ شیفتگی تھی۔

محبت و شیفتگی کی بنیاد عام طور سے کسی نہ کسی وصف پر ہوتی ہے، حکماء کا قول ہے کہ محبت و شیفتگی کے محرکات تین ہوتے ہیں، کمال، جمال اور نوال۔ دنیا میں محبت کی جاتی ہے تو اس لئے کہ وہ صاحب جمال ہے اور جمال سے متاثر ہونا انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ کسی سے عقیدت و احترام کا برتاؤ کیا جاتا ہے تو اس لئے کہ کمال ہر انسان کو مرغوب ہے۔ کسی کی مدح و ثنا کی جاتی ہے تو اس لئے کہ اس پر اس کا احسان ہے اور احسان کے سامنے جھکنا شرافت کی شان ہے۔ حاتم سے لوگ محبت کیوں رکھتے ہیں اس لئے کہ انہیں جود و سخا پسند ہے۔ نوشیرواں عادل کا نام لوگ کیوں لیتے ہیں اس لئے کہ انہیں عدل و انصاف پسند ہے۔ دنیا رستم و اسفندیار کی داستانوں کو پڑھتی اور سر دھنتی ہے اس لئے کہ انہیں صفت مردانگی محبوب ہے۔ بیشمار لوگ سقراط و افلاطون کے نام کو پیار کرتے ہیں اس لئے کہ وہ علم و حکمت کے دلدادہ ہیں، سینکڑوں جالینوس و ابن سینا کے قدر دان و فریفتہ ہیں اس لئے کہ علاج معالجے سے انہیں دلچسپی ہے بہتیرے شکسپیر و ہومر، فردوسی و سعدی، تلسی داس و بھرتری ہری کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس لئے کہ انہیں فصاحت و بلاغت، ادب و شاعری کا ذوق ہے، لیکن جو ذات اقدس ملے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت وادم۔ ہو۔ جو جمال و کمال و نوال تینوں اوصاف کی جامع ہو اور جس کی شان "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری"۔ وہ ذات پاک جس کے حسن و جمال کا ترانہ سلیمان و داؤد نے گایا۔ جس کا مژدہ جانفزا موسیٰ علیہ السلام و مسیح ناصری نے سنایا جس کے خیر مقدم کے لئے کروبیان عالم صف آرا ہو گئے جس کے پیچھے ملائکۂ آسمانی نے نگہبانی کے فرائض بجا لائے۔ وہ قدسی صفات جس نے خشک میدانوں میں علم و معرفت کے دریا بہائے۔ سنگلاخ زمینوں میں دانش و حکمت کے گوہر ہائے آبدار لٹائے۔ نبیوں میں رحمت کا لقب پانے والا۔ غریبوں اور محتاجوں کی مرادیں بر لانے والا۔ یتیموں اور بیکسوں کا "رکھو" محنت کشوں اور غلاموں کا والی۔ جس نے خود غرضوں کو محبت و اخوت کا درس دیا۔ جس نے دشمنوں کو اپنا جگر بند ٹھہرایا۔ غریبی و امیری کی تفریق اس نے مٹائی۔ دنیا سے رسم بندگی اس نے ختم کی۔ بڑے بڑے فرعونوں کو سرنگوں اور کجکلاہوں کو واژگوں کر دیا۔ جس کی تعلیم نے درندوں کو چوپانی بھیڑیوں کو گلہ بانی، رہزنوں کو جہانبانی، غلاموں کو سلطانی اور بادشاہوں کو اخوانی سکھائی۔ جو محبوب بھی

ہے۔ وہ محمود بھی مصطفیٰ بھی ہے اور مرتضیٰ بھی۔ حبیبِ کبریا بھی اور حبیبِ عالم بھی، رسولوں کا سرتاج بھی ہے، وہ انسانوں کا تاجدار بھی ایسے مرکزِ محبت پر دل و جان سے فدا ہونا، اس کے چشم و ابرو کے اشاروں پر چلنا، اس کے پیغام کو ساری دنیا میں پھیلانا اور اس کے دین کے غلبہ کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دینا عین کمال اور انسانیت کی معراج نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟

کتنے خوش نصیب اور مبارک تھے وہ نفوسِ پاک جنھوں نے اس جمالِ جہاں آرا کا نظارہ کیا۔ اس نوالِ سرمدی سے فیضیاب ہوئے، اور اس کمالِ محمدیؐ پر نثار ہوئے، اردو کے ایک ہندو ادیب گوردت سنگھ دارا لکھتے ہیں:۔

جس کسی نے اُسے پریم کی انکھڑیوں سے دیکھا اس کی تمنائے زندگی پوری ہو گئی جس کی نگاہ
شوق اس پر پڑ گئی اسے منہ مانگی مراد مل گئی جس بشر کو اس منوہن نے اپنا درشن دیا اس کے
جنم بھر کا پاپ کٹ گیا۔
(رسولِ عربیؐ)

کوچۂ محبت بڑی قربانیاں چاہتا ہے، شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہر کسی کا کام نہیں، محبوب جتنا بلند و ارفع ہوتا ہے اتنی ہی قدر محبت کے مدارج بھی مختلف ہوا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ اِقْتَرَفْتُمُوْھَا وَتِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَھَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَجِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِہٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ۔ (توبہ)

سب لوگوں سے کہدو کہ اگر تم کو ماں باپ بیٹے، بیٹیاں، بہن، بھائی زن و شوہر، قوم قبیلہ اور مال جو تم نے جمع کر رکھا ہے اور تجارت جس کے خسارے کا تمہیں ڈر لگا رہتا ہے اور وہ محل جن میں بسنا تم کو اچھا معلوم ہوتا ہے وہ سب پیارے ہیں، خدا اور رسولؐ سے اور راہِ خدا میں جہاد کرنے سے تب تو تم منتظر رہو کہ خدا تمہارے لئے اپنا کوئی حکم دے۔ (توبہ)

اس آیت میں جن اشخاص و اشیاء کا ذکر کیا گیا ہے ان کی طرف میلان انسانی فطرت کا خاصہ ہے، اسی لئے ان کی نفی نہیں کی گئی مگر ہاں یہ ظاہر کر دیا گیا کہ ان محبتوں سے بلند بھی ایک محبت ہے اور وہ محبت خدا اور اس کے رسولؐ کی محبت ہے۔ سی لئے ان تمام محبتوں کو اس محبت کا تابع ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس محبت پر نچھاور کر دینا چاہیئے، یہی وہ راز ہے جسے اس محبوبِ دوجہاں نے یوں فاش فرمایا ہے۔

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ۔ (صحیحین)

کوئی شخص تم میں سے مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اسے رسولؐ کے ساتھ ماں باپ، اولاد اور باقی لوگوں سے بڑھ کر محبت نہ ہو۔

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ اَھْلِہٖ وَمَالِہٖ (زرقانی)

کوئی مومن نہیں بن سکتا جب تک میں اس کے اہل اور مال سے زیادہ محبوب نہیں ہوتا۔

رسولؐ کے فرمان کی تصدیق ان دلدادگانِ محبت اور شیفتگانِ رسولؐ نے اپنے عمل سے جس طرح کی دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ آپ کے عاشقوں اور فدائیوں نے کیا کچھ مصائب و آلام برداشت کئے۔ کبھی آگ کے شعلوں اور گرم ریت سے تپائے گئے تو کبھی پتھر کی سلوں کو ان کے سینوں پر رکھا گیا۔ ماں باپ کو چھوڑا۔ کنبہ و خاندان کو خیرباد کہا۔ بیوی بچے سے جدائی اختیار کی۔ گھر بار لٹایا اور عزیز جان کو رسولؐ کے قدموں پر ڈال دیا۔ رسولؐ کے دین کی سربلندی کے لئے کس کس رنج و الم کو دعوت دینی پڑی

کن کن رسوائیوں کو برداشت کرنا پڑا اور کیا کچھ پاپڑ نہیں بیلنا پڑے۔ عشق صادق ہو تو ایسا ہو کہ جب گلے میں رسیاں ڈال کر گھسیٹے گئے اور پوچھا گیا تو وہی محبوب دلنواز کا نام زبان پر تھا۔ جناب خباب کو کافروں نے دہکتے ہوئے کوئلوں پر لٹایا یہاں تک کہ یہ کوئلے ان کی پیٹھ کے نیچے ٹھنڈے ہو گئے۔ بلال حبشی رض دوپہر کی جلتی ہوئی ریت پر لٹائے جاتے ہیں اور سینہ پر بھاری سِل رکھدی جاتی ہے مگر عشق محمدیؐ کا نشہ ہے کہ اترتا ہی نہیں۔ رسولؐ کی محبت کی راہ میں ابوفکیہؓ کے گلے میں رسی باندھی جاتی ہے اور زمین پر گھسیٹا جاتا ہے اور پھر ان کے سینہ پر بھاری پتھر رکھدیا جاتا ہے، تکلیف کی شدت سے زبان نکل پڑتی ہے مگر دعوئ عشق و محبت سے دست بردار نہیں ہوتے۔ عمارؓ جلتی ہوئی ریت کے فرش پر لٹائے جاتے ہیں اور ان کو پیٹا جاتا ہے۔ زبیرؓ کو ان کا چچا چٹائی میں لپیٹ کر ناک میں دھواں دیتا ہے۔ سعید بن زید رض کو باندھ کر لہولہان کیا جاتا ہے۔ عثمان غنی رض کو زدوکوب کیا جاتا ہے۔ مگر رسول خداؐ کی صہبائے تند و تیز کا جو نشہ چڑھ گیا ہے اترتا ہی نہیں۔

محبوب دوجہاں کا اعجاز دیکھئے جس انسان نے ایک مرتبہ اس کو نگاہِ شوق سے دیکھ لیا پھر وہ مشتاق نگاہِ غیر نہ رہا جس کے دل کے نہاں خانے میں اس کی محبت کی شمع روشن ہو گئی پھر وہ بجھائے نہ بجھی۔ جس متوالے نے ساقئ کوثر کا جام پی لیا اسرارِ فطرت کا سرمایہ دار بن گیا اور دنیا و آخرت کا تاجدار بھی ؎

غلام نرگس مست تو تاجدارانند
خراب بادۂ لعل تو ہوشیارانند

زیدؓ بن دثنہ کو لڑائی میں کفار پکڑ لیتے ہیں اور قریش چاہتے ہیں کہ انہیں خرید کر قتل کر دیں۔ جب ان کو پھانسی کے تختے پر لے چلے تو ابوسفیان بن حرب نے ان سے کہا۔ زید تجھ کو خدا کی قسم ہے بتا کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمہارے بدلے میں محمدؐ کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے اور تم اپنے گھر پر آرام کرو۔ لیکن بادۂ توحید کا سرشار اور خمخانۂ محمدیؐ کا متوالا جواب دیتا ہے:-

"کیا کہتے ہو میں تو یہ بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ میری رہائی کے بدلے میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے مبارک میں ایک کانٹا بھی چبھے"

ابوسفیان نے یہ والہانہ جواب سُنا تو حیران رہ گیا اور بے اختیار پکار اٹھا:-

"میں نے کسی کو بھی نہیں دیکھا: دوسرے سے ایسی محبت رکھتا ہو جیسا محمدؐ کے اصحاب محمدؐ سے کرتے ہیں۔"

(رحمۃ للعالمین)

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے فدائی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا اعلان کیا تو ہر طرف سے لوگ ان پر ٹوٹ پڑے۔ ہر ایک نے زدوکوب کیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بے جان نعش کی طرح زمین پر پڑے تھے ناک اور چہرے میں کوئی فرق باقی نہیں رہا تھا۔ بنو تیم کے لوگ آتے ہیں اور ہم قبیلہ ہونے کی وجہ سے کفار کے ہاتھ سے چھڑا لیتے ہیں اور گھر لے جا کر بستر پر لٹا آتے ہیں۔ جب افاقہ ہوتا ہے تو پوچھتے ہیں کہ بتاؤ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے۔ (اسد الغابہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صدقہ کا حکم دیا تو یہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنا سارا اثاثہ اور مال لے کر پہنچ جاتے ہیں اور رسولؐ کے قدموں پر ڈال دیتے ہیں۔ پوچھا جاتا ہے کہ اپنے اہل و عیال کے لئے کیا چھوڑا؟ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ جواب دیتے ہیں:-

"اللہ اور اللہ کا رسول": ؎

پروانے کو چراغ ہے، بلبل کو پھول بس
صدیق کو خدا اور خدا کا رسول بس

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمہاری محبت کیسی ہوتی تھی؟ فرمایا "خدا کی قسم حضور ہم کو مال واولاد اور ماں باپ سے پیارے تھے اور اس سے زیادہ محبوب جتنا ٹھنڈا پانی ایک پیاسے کو ہوتا ہے"۔

سینکڑوں دلدادگان عشق ومحبت کے قصے پڑھے ہوں گے لیکن شمع رسالت کے پروانوں کی دل سوزی وجاں گدازی الگ ہی شان رکھتی ہے۔ اُحد کے معرکہ میں جب قریش کے تیغ زنوں نے آپ پر یورش کی اور مسلمانوں کی صفیں درہم برہم ہونے لگیں تو آپ نے آواز دی ——— "کون مجھ پر جان دیتا ہے"۔ ——— اس آواز کا سننا تھا کہ دفعتاً سات انصاری نکل آئے اور ایک ایک نے جانبازی سے لڑ کر اپنی جانیں فدا کر دیں۔

اسی جنگِ اُحد کا ذکر ہے کہ ایک انصاری خاتون کے باپ، بیٹے، بھائی، شوہر سب قتل ہو جاتے ہیں، وہ مدینہ سے نکل کر میدانِ جنگ میں پہنچتی ہے تو یہ نہیں پوچھتی کہ میرے، باپ، بیٹے، بھائی اور شوہر کا کیا حال ہے بلکہ پوچھتی ہے تو پوچھتی ہے کہ بتاؤ شہنشاہ کونین کس حال میں ہیں، لوگوں نے کہا تیرا لختِ جگر مارا گیا۔ تیرے بھائی کو قتل کیا گیا، تیرے باپ کو تہ تیغ کیا گیا۔ تیرے رفیق زندگی نے بھی جامِ شہادت نوش کیا اور تو ان میں سے کسی کے متعلق دریافت نہیں کرتی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو بخیریت ہیں، بولی نہیں مجھے دکھا دو تو تسکین ہوگی۔ اتنے میں سرور عالم کے روئے زیبا پر نگاہ پڑ جاتی ہے اور چہرہ فرطِ مسرت سے کھل اٹھتا ہے۔ بے اختیار پکار اٹھتی ہے:۔ کل مصیبۃ بعدك جلل یارسول اللہ

"اگر آپ سلامت ہیں تو تمام مصائب ہیچ ہیں"۔

دنیا کے ایک مذہب کو صرف ایک سولی پر ناز ہے، لیکن دیکھو اسلام میں کتنی سولیاں، کتنے مذبح اور کتنے مقتل ہیں۔

رسالہ کے بارے میں خط وکتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور لکھیے، تاکہ تعمیل ارشاد میں تاخیر کا امکان ہی نہ رہے۔ (ادارہ)

یہ کتابیں آپ کے یہاں ضرور رہنی چاہئیں

فردوس ماہر القادری کی غزلوں، نظموں، رباعیات اور قطعات کا شاہکار مجموعہ، حقیقی ترقی پسند شاعری کا سدابہار گلدستہ۔ قیمت: تین روپے

کاروانِ حجاز مکہ مدینہ میں کیا دیکھا اور کیا محسوس کیا، اس کی تفصیل اور ماہر القادری کا قلم، بس یوں سمجھئے کہ خدا اور رسولؐ کی محبت کاغذ پر مصور ہوتی چلی گئی ہے، ادب و انشا کے اعتبار سے بھی اس کتاب کا مقام بہت بلند ہے۔

نقش توحید فاران کا توحید نمبر اب کسی قیمت پر نہیں ملتا مگر اس کا معرکہ آرا "نقش اول" کتابی صورت میں چھپوا گیا ہے۔ نقش توحید کا ایک ایک حرف عقائد کو درست کرتا اور شرک و بدعت کی جڑ کاٹتا ہے۔

نوٹ: ان تینوں کتابوں کی قیمتیں جو درج کی گئی ہیں، محصول ڈاک علاوہ ہیں۔ } قیمت مجلد ایک روپیہ چھ آنے۔ غیر مجلد ایک روپیہ

مکتبہ فاران، کیمبل اسٹریٹ، کراچی نمبر ۱

ملا محمد واحدی دہلوی

روزہ

(ملا واحدی دہلوی کی زیر ترتیب کتاب "حیات سرور کائنات" حصہ سوم کا ایک مضمون)

اسلام کے پانچ رکن ہیں۔ (۱) توحید۔ (۲) نماز۔ (۳) زکوٰۃ (۴) روزہ (۵) حج۔

معبود کو واحد ماننے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں کہلا سکتا۔ باقی چاروں رکنوں پر عمل کرنا معبود پر ایمان ہونے کا اعلان ہے۔ ایمان سے عمل جدا نہیں رہا کرتا۔ ایمان اور عمل لازم و ملزوم ہیں۔ قرآن مجید میں جہاں ایمان کا ذکر آتا ہے وہیں عمل کا ذکر ہے۔ آمنوا و عملوا الصالحات ساتھ ساتھ ہیں۔

نماز کسی حالت میں معاف نہیں ہے۔ ہوش و حواس بجا رہیں تو مرتے مرتے پابندی وقت کے ساتھ ادا کرنی چاہیے۔ میدان جنگ میں بھی قضا نہیں کی جا سکتی، جب تک اتنا گھمسان کا رن نہ پڑ جائے جیسا ایک مرتبہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پڑا تھا۔ یا خواتین کو بعض حالات میں رعایت دے دی گئی۔ روزہ قضا کر سکتے ہیں اور نہایت بڑھاپے میں بالکل چھوڑ سکتے ہیں۔ لیکن نماز کی نسبت دیر میں فرض ہونے اور سال میں محض انتیس، تیس دن کے واسطے فرض ہونے اور زیادہ موقع پر قضا کر سکنے کا مطلب یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ روزہ نماز سے کم اہم ہے۔ روزے کی بابت اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ فرماتا ہے۔ الصوم لی و انا اجزی بہ روزہ میرے لئے ہے اور میں اس کی جزا دوں گا۔ روزے کی اہمیت جتانے کی غرض سے ایسا فرمایا گیا ہے، ورنہ جزا تو ہر کام کی اللہ دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ روزہ میری (خاص) عبادت ہے اور میں اس کی (خاص و بے حساب) جزا دوں گا۔

فرضیت کے اعتبار سے پانچوں رکن برابر ہیں جس طرح معبود کو واحد ماننا اور اس کے سوا کسی کو معبود نہ ماننا ضروری ہے اسی طرح معبود کی منشا کے مطابق نماز پڑھنی، روزہ رکھنا، زکوٰۃ دینی اور حج کرنا ضروری ہے۔ جن عبادت اللہ کی منشا کی تعیین ہے۔ اور اللہ اس عالم میں اور عالم آخرت میں کامیاب انہیں کرتا ہے جو عمل سے اپنے ایمان کو ثابت کر دیتے ہیں۔ والعصر ان الانسان لفی خسر الا الذین امنوا و عملوا الصالحات زمانہ اس بات کا شاہد ہے کہ فوز و فلاح کے دروازے نہیں کھلتے جب تک انسان حقائق کا یقین نہ کرے اور اس یقین کے زیر اثر نیک عمل نہ ہو جائے۔ فمن کان یرجوا لقاء ربہ فلیعمل عملا صالحا ولا یشرک بعبادۃ ربہ احدا لہٰذا جو اپنے رب سے ملنے کی آس لگائے بیٹھا ہو اُسے چاہیے کہ نیک عمل بنے اور کسی کو اپنے رب کا شریک نہ جانے۔ ایمان و عمل دونوں مل کر کامیابی سے ہم کنار کرتے ہیں۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں کسی صاحب نے، جنھیں روزے کی تاریخ کا محقق مانا جاتا ہے، روزہ (Fasting) پر مضمون لکھا ہے۔ ان کے مضمون کی دو سطریں ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں:۔

"روزے کے اصول اور طریقے گو آب و ہوا، قومیت و تہذیب اور
اختلاف حالات کی وجہ سے مختلف ہیں لیکن روزے سے خالی کوئی مذہب
نہیں ہے۔ روزہ مذہبی حیثیت سے ہر جگہ موجود ہے۔"

اور اب پڑھئے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ

مسلمانو! تم پر روزہ اُسی طرح فرض کیا جاتا ہے جس طرح تم سے قبل کی قوموں پر فرض کیا گیا تھا۔

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود بھی بے پڑھے لکھے تھے اور پیدا بھی بے پڑھی لکھی قوم میں ہوئے تھے روزے کی تاریخ جاننے کا حضورؐ کے متعلق گمان ممکن نہیں ہے۔ پھر حضورؐ کو کیسے معلوم ہو گیا کہ پہلی قوموں پر روزہ فرض تھا کیا اللہ کے سوا پورے عرب میں کوئی اور اس تاریخی حقیقت کا اظہار کر سکتا تھا۔

روزے کی غرض وغایت انسان کو پرہیزگار اور متقی بنانا ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (روزہ تم پر فرض کیا جاتا ہے) تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ۔ روزے میں ناجائز اعمال ہی سے نہیں چند جائز اعمال اور جائز خواہشات سے بھی رُکا جاتا ہے۔ روزے کے لئے قرآن مجید نے کہیں کہیں صبر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ صبر کے معنی ہیں ضبطِ نفس، ثابت قدمی اور استقلال روزہ مہینہ بھر مشق کرا کر اپنے آپ کو قابو میں رکھنا۔ ثابت قدم رہنا اور مستقل مزاج بننا سکھاتا ہے۔ ظاہری خواہشوں اور برائیوں سے بچنے کے علاوہ باطنی خواہشوں اور برائیوں سے بھی دل و دماغ کو بچانا روزے کے علاج میں داخل ہے۔ روزہ ہماری روح کے بگاڑ کا علاج ہے۔ جو روزہ روزے کی طرح رکھے گا اسے انشاء اللہ شیطان ڈگمگا نہیں سکے گا۔

روزوں کا مہینہ رمضان ہے۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ رمضان، وہ مہینہ جس میں قرآن (پہلی بار) اُترا۔ (اور عالم کی رہنمائی اور انسانیت کی دست گیری کا کام حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سپرد ہوا) رمضان میں حضورؐ آبادی سے دور غارِ حرا میں یکہ و تنہا اور بھوکے پیاسے سر جھکائے بیٹھے تھے کہ حضرت جبریلؑ نے آکر اقرأ پڑھائی۔ لہٰذا یہی مہینہ بھوکا پیاسا رہنے۔ اعتکاف میں بیٹھنے اور راتوں میں جاگنے کا مہینہ قرار دیا گیا۔

اس مہینے میں بہ حدِ امکان اُسی کیفیت کے حصول کی سعی کی جاتی ہے جو ہمارے آقا و پیشوا پر نزولِ قرآن شروع ہوتے وقت طاری تھی۔

عُرفِ عام میں روزہ فاقہ کشی کا نام ہے۔ فقط فاقہ کشی قابلِ تعریف شے ہوتی تو فاقہ کشی کی سعادت سے اقتصادی کمزوری کے باعث عرب کے مشرک محروم نہیں تھے پھر اسلام آیا تو مسلمانوں کو کسبِ معاش کے معمولی طریقوں سے بھی بے اطمینان کر دیا گیا۔ روزہ مکہ کے دور میں فرض ہو جاتا تو دشمن طعن کر سکتے تھے کہ افلاس پر پردہ ڈالا ہے۔ لیکن اسلامی عبادات امراضِ روحانی کی دوائیں ہیں۔ دوا اُسی وقت دی جاتی ہے جب مرض سر اٹھانے لگے۔ امراضِ جسمانی اور امراضِ روحانی دونوں میں یہی صورت ہے۔ روزے سے علاج کرنے کی مکہ معظمہ میں حاجت نہیں تھی۔ مدینہ منورہ میں بھی مرض پھیلا نہیں تھا۔ موسم بدلنے کے زمانے میں جو حالت ہوا کرتی ہے وہ حالت تھی۔ تداخل کا زمانہ تھا۔ تداخل کے زمانے میں پرہیز کرایا جاتا ہے۔ روزہ پرہیز تھا جو ۲ھ ہجری میں فرض ہوا تاکہ دنیا کی لذتیں جو اب مسلمانوں کو حاصل ہونے لگی تھیں مسلمانوں کو اپنا فریفتہ نہ کر سکیں۔ پرہیز پرہیز کی طرح کرایا۔ سال میں انتیس یا تیس دن۔ پورے سال نہیں۔ ورنہ مسلمان دنیا سے بے تعلق اور رہبان ہو جاتے۔ اور دو چار دن بھی نہیں کہ دو چار دن کا پرہیز ناکافی تھا۔

پھر یہ علاج ایک ساتھ کرنے کا حکم ملا تاکہ ساتھ ساتھ اسلام کے نظامِ وحدت کا مظاہرہ ہو جائے۔ الگ الگ روزہ رکھنے سے نیکی کی وہ لہر نہیں دوڑ سکتی جو رمضان میں آج بھی بجلی کی طرح دوڑ جاتی ہے۔

مسلمان دنیا کے گوشے گوشے میں موجود ہیں۔ گوشے گوشے کے مسلمان رمضان کے روزے ایک ساتھ رکھتے ہیں۔ کہیں چاند نہ دکھائی دے تو ایک آدھ دن کا فرق پڑ جاتا ہے، یا کہیں دن بارہ گھنٹے کا ہے اور کہیں اٹھارہ گھنٹے کا۔ باقی رمضان کے روزوں میں اپنی طرف سے فرق نہیں برتا جاتا۔ جہاں دن لمبے ہیں وہاں موسم ٹھنڈا ہوتا ہے، وہاں ٹھنڈا موسم روزے کو قابل برداشت بنا دیتا ہے۔ روزے رکھنے والے وہاں بھی روزہ ترک نہیں کرتے۔

نماز مریض اور مسافر قضا نہیں کر سکتے لیکن روزہ قضا کرنے کی مریضوں اور مسافروں کو اجازت ہے، بشرطیکہ مرض یا سفر قضا کرنے پر مجبور کر دے اور بڑھاپے کے غیر معمولی ضعف میں روزے کی قضا بھی معاف ہے۔ نیز دائم المرض کو قضا معاف ہے۔ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ جسے روزہ رکھنا بالکل مشکل ہو جائے وہ فدیہ ادا کر دے۔ فدیہ کیا۔ ایک مسکین کا پیٹ بھر دینا۔ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ مگر جو (مشکل کے باوجود) روزہ رکھے تو روزہ اس کے حق میں بہتر ہے گویا قضا اور کفارے کی اجازت کے باوجود روزہ رکھنا مستحسن ہے۔ قضا اور کفارے سے فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ کی تعمیل افضل ہے۔ فمن شہد کے معنی ہیں جو رمضان کے مہینے میں بقید حیات ہو وہ رمضان کے روزے رکھے۔

دین کی تکمیل، نبوت کے اختتام اور تعلیم محمدیؐ کی صداقت کی یہ بھی بڑی دلیل ہے کہ پچھلی امتوں نے اپنے اپنے پیغمبروں کی تقلید اور پیروی کے جس سبق کو چند روز میں بھلا ڈالا تھا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت اب تک اسے سینے سے لگائے ہوئے ہے اور اپنے آقا و پیشوا کی پیروی میں رمضان بھر... دن کو کھانے پینے اور دوسری نفسانی خواہشوں سے باز رہتی ہے اور رات کو تراویح میں اللہ کی کتاب پڑھتی اور سنتی ہے۔

دل کی وہ کیفیت جسے حاصل کر کے انسان گناہوں سے جھجکنے لگے اور نیکیوں سے رغبت کرنے لگے تقویٰ کہلاتی ہے۔ اسی کیفیت اور اسی تقویٰ کو حاصل کرنے کا روزہ ذریعہ ہے۔ روزے کا مقصد صاف بتا دیا گیا ہے لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ تاکہ تم تقویٰ شعار ہو جاؤ۔

روزہ پیٹ بھروں کو بتاتا ہے کہ بھوک پیاس کی تکلیف کیا ہوتی ہے اور پیٹ بھرے لوگ فاقے سے نڈھال بھائیوں کی تکلیف کا احساس کرتے ہیں۔ سوز جگر کے سمجھنے کے واسطے خود سوختہ جگر ہونا لازمی ہے۔ روزہ اس احساس کو زندہ اور ہمدردی کے جذبے کو بیدار کرتا ہے۔ علاوہ ازیں روزہ سختیاں برداشت کرنے کی طاقت بخشتا ہے۔ جو انسان روزہ نہیں رکھ سکتا وہ جہاد کیا کرے گا۔ جہاد میں بھوک پیاس کے تحمل اور صبر و ضبط سے آشنا ہونے کی اشد ضرورت ہے۔ میدان جنگ میں بھوک پیاس کی تکلیف کو سچا مسلمان ہنسی خوشی برداشت کر لیتا ہے۔ عیش و راحت کے خوگر کسی خطرے کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے روزہ گویا جبری ورزش ہے جو ہر مسلمان سے سال میں ایک مہینے کرائی جاتی ہے تاکہ مسلمان جسمانی مشکلات اور خطرات کو اٹھانے اور سہارنے کے لئے تیار رہیں اور دنیا کی کشمکشوں سے گھبرائیں نہیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی رح لکھتے ہیں:-

"فلسفہ تاریخ جس طرح سیاسی واقعات کی تکرار اور حوادث کے بار بار اعادے سے اصول اور نتائج تک پہنچ کر ایک عام تاریخی قانون بنا لیتا ہے، بعینہٖ ہی طرح انبیاء علیہم السلام کے سوانح بھی اپنے واقعات کے بار بار اعادے سے خصائص نبوت کا اصولی قانون ہمارے لئے مرتب کرتے ہیں۔

پیغمبرانہ تاریخ کے انہی اصول و قوانین میں سے ایک یہ ہے کہ نبی جب اپنے کمال انسانیت کو پہنچ کر فیضان نبوت کے

قبول اور استعداد کا انتظار کرتا ہے تو وہ کچھ مدت کے لئے عالم انسانی سے الگ ہو جاتا ہے اور ملکوتی خصائص میں جلوہ گر ہوتا کہ اُسی وقت سے اس کے دل و دماغ میں وحی الٰہی کا سرچشمہ موجیں مارنے لگتا ہے۔ کوہ سینا کا پُرجلال پیغمبر (حضرت موسیٰ) جب تورات لینے جاتا ہے تو چالیس شبانہ روز بھوکا اور پیاسا رہتا ہے۔ کوہ سعیر کا مقدس آنے والا (حضرت عیسیٰ) اس سے پہلے کہ اس کے منہ میں انجیل کی زبان گویا ہو، چالیس شب و روز بھوکا اور پیاسا رہا۔ اسی طرح فاران کا آتشیں شریعت والا پیغمبر (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) نزول قرآن سے پہلے پورے ایک مہینے حراء نامی مکہ کے ایک غار میں ہر قسم کی عبادتوں میں مصروف رہتا ہے اور بالآخر اُسی اثنا میں ناموس اکبر اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ کا مژدہ جانفزا لے کر نمودار ہوتا ہے۔

یہ واقعہ کس ماہ مبارک کا تھا؟

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ رمضان، وہ مہینہ جس میں قرآن اترا۔

یہ کس شب اقدس کی داستان ہے؟

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُبَارَكَةٍ ہم نے قرآن کو برکت والی رات میں اتارا۔

اس مبارک رات کو ہم کس نام سے جانتے ہیں؟

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ہم نے قرآن کو شب قدر میں اتارا۔

ان آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ رمضان وہ مقدس مہینہ ہے جس میں قرآن سب سے پہلی مرتبہ دنیا میں نازل ہوا، اور پیغمبر اُمّی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عالم کی رہنمائی اور انسانوں کی دستگیری کے لئے دستور نامۂ الٰہی کا سب سے پہلا صفحہ عنایت کیا گیا۔

قرآن کا حامل اور اس وحی الٰہی کا مہبط اُن دنوں غار حرا کے کونے میں یکہ و تنہا، بھوکا اور پیاسا سر بزانو تھا۔ اسی بنا پر اس ماہِ مقدس میں بھوکا اور پیاسا رہنا (یعنی روزہ رکھنا) اور کسی عبادت گاہ میں یکہ و تنہا رہنا (یعنی اعتکاف)، اور نزول وحی کی خاص رات (لیلۃ القدر) میں بیدار اور سربسجود رہنا تمام پیروانِ محمدیؐ کے لئے ضروری ہے کہ:۔

إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ اگر تم اللہ کو محبوب رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اللہ تمہیں محبوب رکھے گا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ روزہ، اعتکاف اور لیلۃ القدر کی حقیقت کیا ہے اور رمضان میں روزوں کی تخصیص کس بنا پر ہے۔ اس ماہ میں بقدر امکان اُن ہی جذبات سے متکیف ہونے کی سعی کرنی چاہیئے جن میں وہ حامل قرآن غرق تھا، تاکہ دنیا کی رہنمائی اور ہدایت یابی کی یادگار قائم رہے۔

یہ جذبات اور کیفیات جنہیں قرآن کے مبلغ کی پیروی میں ہم اپنے اوپر طاری کرتے ہیں، یہی اُس ہدایت کے ملنے پر ہماری شکر گزاری اور اللہ کی بڑائی ہے۔ ویسے اسلام میں مسنون اور مستحب روزے اور بھی ہیں، اور تعزیری روزے بھی ہیں

پروفیسر اسرار احمد (ایم-اے)

خدا اور ایٹمی دور

کچھ دن ہوئے مسٹر خروشیف نے خدا پر یقین رکھنے والوں کا مذاق اڑایا تھا کہ ہمیں بتائیں ان کا خدا کہاں ہے۔ ہمارے اسپتنک نے اس کو تمام خلا میں تلاش کیا ہے لیکن وہ کہیں نہیں ملا۔ مسٹر خروشیف کو خدا کا پتہ بتانے سے پہلے میں یہ چاہتا ہوں کہ ان سے یہ عرض کروں کہ انھوں نے خدا سے متعلق ہمارے عقیدے کو ہی نہیں سمجھا اور اپنے عقیدے پر ہی ہمارے عقیدے کو قیاس کر لیا ورنہ ان کو یہ غلط فہمی پیدا نہ ہوتی کہ ان کا اسپتنک ہمارے خدا کو کہیں خلا میں تلاش کر سکتا ہے۔ خدا پر ایمان لانے والوں نے کب یہ کہا ہے کہ ان کا خدا زمانی اور مکانی ہے۔ ان کا اعتقاد تو ہمیشہ سے یہ ہے کہ وہ زمانے سے محصور ہے نہ مکان سے وہ زمان و مکان دونوں سے ماورا ہے۔ البتہ وہ لوگ جو خدا کو زمان و مکان میں محدود سمجھتے ہیں ان کے ایمان میں شاید خروشیف صاحب کچھ کمزوری پیدا کر سکیں۔

ایک دوسری غلطی جو خروشیف صاحب کے بیان میں ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ہمارا اسپتنک تمام خلا میں خدا کو تلاش کر آیا ہے اور اس نے کہیں کوئی چیز خدا کے قسم کی نہیں پائی۔ خروشیف صاحب کے ملک کے اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے تمام چوٹی کے سائنسداں اس بات کو علی الاعلان کہہ رہے ہیں کہ خلا نامتناہی ہے ابھی ہم تمام فضا اور خلا میں سفر کرنے کا تصور بھی ذہن میں نہیں لا سکتے۔ یہاں اس روایتی بڑھیا کا سا حال ہوا کہ ایک پونی کاتی اور بازار میں لے جا کر فروخت کر آئی جس سے یہ مثل بن گئی کہ کاتا اور لے دوڑی، نہ معلوم صاحب موصوف اس اعلان یا چیلنج کے لئے اس قدر بیقرار کیوں ہو گئے۔ جب پوری خلا کو وہ چھان ماریں اور سائنسداں یہ اعلان کر دیں کہ اب خلا کا کوئی حصہ ہماری نظر سے باہر نہیں اس وقت اس قسم کا اعلان کچھ مناسب بھی ہو سکتا ہے۔ ابھی تک تو یہ اندازہ بھی نہیں ہو سکا کہ خلا میں وسعت کتنی ہے۔ خلا کی وسعت کی پیمائش کرنے کے لئے اور اس کا اندازہ لگانے کے لئے ابھی تک تو ہمارے اعداد و شمار ہی کام نہیں دے رہے ہیں اس قسم کا دعویٰ بالکل قبل از وقت ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ انسان نے ہر زمانے میں دولت و طاقت کے نشے سے بیخود ہو کر اس قسم کے دعوے کر ڈالے ہیں۔ اب لوگ اس قسم کے دعووں کے عادی ہو چکے ہیں اور ان کا کوئی خاص اثر پڑتا بھی نہیں ہے بہر حال یہ دعویٰ اس قابل ضرور ہے کہ اس کا نوٹس لیا جائے اور اس کی حقیقت کو واضح کیا جائے تاکہ سادہ لوح لوگ احساس کمتری کے ذریعہ سے غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ کیوں کہ یہ دعویٰ دنیا کی ایک بڑی طاقت کے سربراہ کی طرف سے کہا گیا ہے۔ اسی وجہ سے اس کی اہمیت کچھ زیادہ ہو گئی ہے۔

دراصل ہر مسئلے کو مختلف نقطۂ نظر سے دیکھا جا سکتا ہے۔ چونکہ مسٹر خروشیف پہلے سے یہ طے کئے بیٹھے ہیں کہ ہم ہر سائنسی فتح سے خدا کا عدم وجود ثابت کریں گے اس لئے ان کا ذہن اسی طرف کام کرتا ہے لیکن جو لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں ان کے لئے یہ سائنسی فتوحات بھی خدا کی ربوبیت اور قدرت کاملہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ مسٹر بیرن نے اپنے ایک مضمون میں جو کہ جنوری ۱۹۵۹ء کے "ریڈرز ڈائجسٹ" میں شائع ہوا ہے لکھتے ہیں "انسانی جسم کا ہر قطرہ - زمین کا ہر ذرہ پہلے خلا میں عدم سے

وجود میں آیا ہے۔ بہترین سائنسی دماغ ہمیں بتاتے ہیں کہ ہماری زمین سورج کا ایک ٹکڑا ہے جو کسی وجہ سے اس سے علیحدہ ہو کر اپنے موجودہ مقام پر آگیا ہے۔ وہ قادرِ مطلق جس نے یہ کھیل کھیلا ہے اس کو زندگی کے آغاز سے غور سے دیکھ رہا ہے اور اب یہ کھیل اپنی انتہا کو پہنچنے والا معلوم ہوتا ہے۔ اب غالباً وہ وقت آپہنچا ہے کہ انسان کی یہ کوشش کامیاب ہو جائے کہ وہ ہستی اعلیٰ سے جا کر مل جائے"۔ اسی بات کو قرآن میں بیان کیا ہے یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝

"یعنی ایک ہی بات سے بہت سے گمراہ ہو جاتے ہیں اور بہت سے راہِ راست پر آجاتے ہیں۔ لیکن گمراہ صرف فاسق ہی ہوتے ہیں"۔

مسٹر خروشیف نے اپنے اس تاریخی اعلان میں اس بات کا بھی مطالبہ کیا ہے کہ خدا پر ایمان رکھنے والے لوگ ہمیں یہ بتائیں کہ ان کا خدا کہاں ہے تاکہ اس کو ہم اسی مقام پر تلاش کریں۔ ان کے اس سوال کا جواب بھی نہایت سادہ اور آسان ہے اگر انسان کو دیدۂ بینا حاصل ہے تو وہ خدا کا جلوہ ہر جگہ دیکھ سکتا ہے کسی خاص مقام کی تحقیق کی ضرورت نہیں ہے ہمارے وجود کا ہر ذرہ کائنات کا ہر ایک گوشہ اس کی موجودگی کا اعلان کرتا ہے۔ بشرطیکہ دیکھنے والی آنکھ اور سننے والے کان ہوں۔ گوشِ سخن شنو کجا۔ دیدۂ اعتبار کو؟ لیکن اگر آنکھوں پر پردے پڑ جائیں پھر واقعی اس کو تلاش کرنا ممکن نہیں اور اسپٹنک اس کو سارے خلا میں بھی تلاش نہ کر سکے گا اگر یہ پردے اٹھا دیئے جائیں تو وہ ہر انسان کے دل میں۔ اس کی ہستی میں اور اس کی روح میں موجود ہے اصغرؔ گونڈوی مرحوم نے خوب کہا ہے ؎

ہمہ تن ہستیٔ خوابیدہ مری جاگ اٹھی　　ہر بُنِ مو سے میرے اس نے پکارا مجھکو

بابا فغانی کا بھی بے مثال شعر اسی طرف اشارہ کرتا ہے ؎

مشکل حکایتے است کہ ہر ذرہ عینِ اوست　　لیکن نمی تواں کہ اشارت بآو کنند

خدا کو عقل کے ذریعہ سے نہ سمجھ سکنے کی شکایت کچھ تنہا مسٹر خروشیف کو ہی پیدا نہیں ہوئی بلکہ ابتدائے آفرینش سے ایسے لوگوں کو پیدا ہوتی رہی ہے جو اسے محض عقل کے بل بوتے پر سمجھنا چاہتے ہیں اور وجدان یا اعتقاد کو قطعی کام میں لانا نہیں، جانتے لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو انتہائی فاضل اور عقلمند ہونیکے باوجود عقل کی نارسائی کا اعتراف کرتے رہے ہیں مثلاً ڈاکٹر کیرل لکھتے ہیں۔ "آخر سائنسداں بھی انسان ہیں۔ وہ بھی ایسی بہت سی باتوں پر اعتقاد رکھتے ہیں جن کو موجودہ نظریات ابھی تک پوری طرح ثابت نہیں کر سکے ہیں (یعنی اعتقاد سے صرف مذہب میں ہی نہیں۔ سائنسی تحقیقات میں بھی بعض اوقات کام لینا پڑتا ہے) ہمارے تحقیقاتی اصول ان چیزوں کو بھی تک اپنی گرفت میں نہیں لاسکے ہیں جو وزن یا اطراف کے حامل نہیں ہیں۔ ان کی رسائی صرف ان چیزوں تک ہے جو زمانی اور مکانی ہیں۔ (لامکانی نہیں ہیں) وہ ان ذرائع کو بھی گرفت میں نہیں لاسکے جن کے ذریعہ سے ایک عارف کی روح خدا کی طرف پرواز کرتی ہے۔ یقینی کسی چیز کا گرفت میں نہ آنا یہ معنی نہیں رکھتا کہ اس کا وجود ہی نہیں۔ درصل سائنس کوئی نقصان دہ چیز نہیں لیکن جب وہ اپنی حدود سے تجاوز کر کے ماورائی اور روحانی حدود میں قدم رکھ کر مداخلت بیجا کی مرتکب ہوتی ہے تو ضرور خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہے"۔ مٹ

اس کے علاوہ وہی سائنسداں جن کے حوالے سے مسٹر خروشیف نے اپنا دعویٰ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے ان کا قول ہے کہ فی الحال تمام خلا میں سفر کر لینا ممکن ہی نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ یہ خلا اور اس کے اجرام تو لاکھوں میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہم

سے دور بھاگ رہے ہیں اور زیادہ پھیلتے جا رہے ہیں۔ ایسی حالت میں تمام فضا کا کھنگال ڈالنا کس طرح ممکن ہو سکتا ہے لیکن غالباً مسٹر خروشیف نے خدا کو اس دنیا سے بے دخل کرنے کے شوق میں سائنسداں کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ مثلاً اسٹینفورڈ یونیورسٹی۔ امریکہ کے جیولوجی کے پروفیسر کو نریڈ بیلیس اپنی کتاب میں لکھتے ہیں "ستاروں کے درمیان جو فاصلہ ہے اس کے مقابلہ میں نظام شمسی کی تو کوئی اہمیت ہی نہیں رہتی۔ ان کا فاصلہ کروڑوں یا اربوں میں شمار نہیں کیا جاتا بلکہ کھرب اور اس سے بھی بڑے اعداد و شمار میں کیا جاتا ہے۔ ہمارا سورج ستاروں کے بہت سے مجموعوں میں سے ایک مجموعہ ایک فرد ہے۔ بعد میں ہم کو معلوم ہوگا کہ ایسے ایسے لاتعداد مجموعے اور ہیں جو ایک دوسرے سے لاتعداد فاصلوں پر واقع ہیں اور ان کے درمیان کے خلا کو کسی طرح پایا نہیں جا سکتا۔"[1] یہی سائنسداں مذکورہ بالا کتاب کے صفحہ ۳۶۰ پر لکھتا ہے "اس کے علاوہ ہم یہ نتیجہ نکالنے پر بھی مجبور ہیں کہ ہر نظام ہم سے دور بھاگ رہا ہے اور ان کی رفتار سینکڑوں میل فی سیکنڈ ہے اور بعض کی رفتار تو کوئی ہزار میل فی سیکنڈ ٹھہرتی ہے اس لحاظ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کائنات بڑی تیز رفتاری سے پھیلتی چلی جا رہی ہے۔" ان حالات میں ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ مسٹر خروشیف کا دعویٰ کس قدر قبل از وقت اور مبالغہ آمیز ہے اور کائنات کی وسعت کے مقابلے میں سائنسی فتوحات اب بھی سمندر اور قطرے کی مناسبت رکھتی ہیں۔

اس کے علاوہ بعض اور معاملات کی طرف بھی اشارہ کیا جا سکتا ہے جہاں سے خدا کے وجود کو آسانی سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے تو تخلیق کائنات ہی کو لیجئے کہ معمولی سی سمجھ بوجھ کا آدمی بھی بشرطیکہ تعصب سے کام نہ لے، نہایت آسانی سے یہ سمجھ سکتا ہے کہ اتنی بڑی کائنات جس میں کہ محیر العقول طریقہ سے باقاعدگی موجود ہے۔ جس کے ذرے کو ہم اس کی جگہ سے نہیں ہٹا سکتے بغیر کسی پیدا کرنیوالے کے اور بغیر کسی مقصد کے کس طرح پیدا ہو سکتی ہے۔ اور یہ میرا ہی قول نہیں بلکہ بڑے بڑے سائنسداں بھی آج اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں سب کے نام گنانے میں اور ان کے اقوال پیش کرنے میں تو بڑی طوالت ہوگی میں یہاں صرف ڈارون کے دو ایک قول پیش کئے دیتا ہوں جو کہ اس دنیا میں زندگی کے آغاز اور اس کے ارتقا پر سند مانا جاتا ہے اپنی مشہور عالم کتاب میں لکھتا ہے "میں یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوں کہ جتنے اب دنیا میں جاندار پیدا ہوئے ہیں وہ ایک ہی ذات سے پیدا ہوئے ہیں جس میں ہمارے پیدا کرنیوالے نے سب سے پہلے جان ڈالی۔"[2]

(۱) خدا پر اعتقاد نہ رکھنے والے یہ تو کر سکتے ہیں (اگر ممکن ہو) کہ کسی ایسے پیدا کرنیوالے کی نشاندہی کریں جو ہمارے خدا سے بہتر ہو یا آفرینش کائنات کی کوئی ایسی غرض بتائیں تو ہماری غرض سے بہتر ہو۔ یا توجیہہ کائنات ہم سے بہتر طریقہ سے کریں۔ لیکن یہ تو انتہائی کم عقلی کی بات معلوم ہوتی ہے کہ سرے سے کسی پیدا کرنیوالے کو نہ مانیں اور کائنات کی بھی کوئی توجیہہ نہ کریں اور اس کو پیدا کرنے کی کوئی غرض و غایت بھی تسلیم نہ کریں۔ ضد میں آکر تو ایسی نامعقول باتیں کی جا سکتی ہیں لیکن انصافاً یہ باتیں کرنا ممکن نہیں۔

اس کے علاوہ خدا کو پہچاننے اور اس کی بالادستی تسلیم کرنیکا ایک اور ذریعہ انسان کی مجبوریاں ہیں اس کی ناکامیاں، بعض اوقات مصائب کا ہجوم۔ اس کی بے بسی کی موت یہ اور بہت سی دوسری چیزیں صاف طور پر اس طرف اشارہ کرتی ہیں کہ انسان سے بڑی کوئی طاقت اور بھی کوئی موجود ہے۔ جس کا حکم اس کائنات میں علی الرغم خواہشات انسانی چلتا ہے اور انسان اس

---

(1) Fundamentals of Phy- Science P. 619-20

(2) Origin of Species P. 66 By DARWIN

کے سامنے مجبور ہے۔ حضرت علیؓ کا قول اس بارے میں بہت مشہور ہے عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ یعنی میں نے خدا کو اپنے ارادوں کی ناکامی سے پہچانا۔ کیا دنیا میں کوئی انسان ایسا ہو سکتا ہے جس کو فسخ عزائم کی تکالیف کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو اور اس کو اپنی مجبوری کا احساس نہ ہوا ہو۔ مسٹر خروشیف دور کیوں جائیں۔ اسٹالین کی آخری وقت کی مجبوری کو ہی دیکھ لیں۔ ساری دنیا میں جس کی عظمت کا ڈنکا بجتا تھا موت کے سامنے کیسا بے بس ہو گیا۔ مقررہ وقت سے ایک لمحہ زیادہ زندہ نہ رہ سکا حالانکہ کتنے سائنسدان اور کتنے ڈاکٹر اس کی جان بچانے کے لئے کوشاں رہے وَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ جب موت آجائے تو نہ ایک پل کی تقدیم ہوتی ہے نہ تاخیر وقت مقررہ پر ہر شخص کو حکم سفر مل جاتا ہے اور اس حکم کی بے چون و چرا پابندی کرنی پڑتی ہے سرتابی کی کسی کی مجال نہیں۔

یہ انسانی مجبوریاں ہمیں انفرادی زندگی میں ہی نظر نہیں آتیں بلکہ اجتماعی زندگی میں ان کا مظاہرہ بڑے واضح طریقے پر ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً اشتراکیوں نے بانگ دُہل یہ دعوے کئے تھے کہ ہم دنیا سے طبقاتی زندگی کو مٹا دیں گے، ہر شخص کو ایک سطح پر لے آئیں گے اس طرح زندگی پُرسکون ہو جائیگی اور جب مالی تقسیم میں مساوات برتی جائے گی تو پھر کوئی کسی کو نہیں ستائیگا کوئی مقابلہ اور مسابقت نہیں ہوگی۔ ہر قسم کی رقابت کا خاتمہ ہو جائیگا۔ حد یہ ہے کہ حکومت کے انتظام کے لئے پولیس وغیرہ کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔ لیکن آج نتائج ہر شخص کی نظر کے سامنے ہیں کہ اس مزعومہ جنت ارضی کا کیا حشر ہے۔ یہ جنت جنتِ حمقا بن کر رہ گئی ہے۔ انسان کی عقل بھی اتنی طاقتور اور ہمہ گیر نہیں ہے کہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر بیک وقت غور کر سکے اور ایسے نتائج نکال سکے جو ہمہ صفت موصوف ہوں۔ ہوتا یہی ہے کہ کسی ایک طرف توجہ زیادہ ہو جاتی ہے اور زندگی کے دوسرے پہلو تشنہ رہ جاتے ہیں۔ کونسی ایسی مصیبت ہے جو آج اشتراکی علاقے کے رہنے والوں پر نازل نہیں۔ ان کی زندگی متوازن نہیں۔ مشین کی سی زندگی بن گئی ہے۔ آزادیٔ رائے، آزادیٔ گفتار اور آزادیٔ عمل کا وہاں جنازہ نکل چکا ہے۔ اکثر انسانوں کو پیٹ بھر کر روٹی ضرور مل جاتی ہے لیکن اور تمام پہلو ویران پڑے ہیں۔ یہاں بہتر ہوگا اگر کسی اشتراکی کی زبانی ہی وہاں کی زندگی کی تصویر پیش کی جائے۔ اس اقتباس سے معلوم ہوگا کہ اشتراکیت کس طرح رحمت کی بجائے ایک زحمت بن کر رہ گئی ہے۔ بلکہ بعضوں کا تو خیال ہے کہ یہ ایک خون آشام شیطان ہے جس نے لاکھوں انسانوں کا خون بلا تکلف پیا ہے۔ ایک خوفناک وبا ہے جو کروڑوں انسانوں پر مسلط ہو گئی ہے اور اس عالمگیر وبا نے سب سے زیادہ خون اپنی ہی اولاد یعنی اشتراکیوں کا پیا ہے اور ایسے اشتراکیوں کا جو کہ پارٹی کے وفادار تھے اور جنھوں نے بڑی قربانیاں کی تھیں۔ یہاں میں ایک ایسے اشتراکی کی آپ بیتی پیش کرونگا پیش کروں گا جس نے کہ اپنا سب کچھ پارٹی کے لئے قربان کر دیا تھا لیکن جس کو پارٹی کی بے انصافیاں، مظالم اور خونریزی دیکھ کر اس کو چھوڑنا پڑا:

”صرف مجھی کو ذلیل نہیں کیا گیا بلکہ نوجوان عورتوں اور مردوں کا ایک ہجوم ہے جن کو رسوا کیا گیا ہے جو کہ اپنی دانست میں آسمان کی بلندیوں پر چڑھنے کے لئے نکلے تھے۔ لیکن بلندیوں پر پہنچ کر انھوں نے دیکھا کہ یہ جنت کی بلندیاں نہیں بلکہ جہنم کی پستیاں ہیں۔ سب سے بڑی غلطی جو ہم نے کی وہ یہ تھی کہ ہم نے اپنی روح کو تباہ کر لیا۔ ہم نے اپنا سب کچھ پارٹی کے حوالے کر دیا حتیٰ کہ اپنی آزادی اور ضمیر بھی فروخت کر ڈالا اور پھر ہماری مجبوریوں کی بنا پر پارٹی ایک آلۂ بربادی بن کر رہ گئی“

اس کے بعد مصنف ایک نہایت اونچے درجے کے اشتراکی کی مظلومانہ زندگی کے متعلق کچھ واقعات بیان کرتا ہے۔ جبکی صرف

یہ خطا تھی کہ اس نے جو کچھ محسوس کیا اس کو صاف صاف بیان کر دیا تھا اور پارٹی کے دیوتاؤں کے وقار کا لحاظ نہ کیا تھا۔ اس کو طرح طرح سے ستایا گیا اور پارٹی قید کیا گیا اور زندگی میں جو کچھ قابل قدر چیزیں تھیں اس سے چھین لی گئیں۔

"میں قید خانے چلا گیا اور جبکہ میں وہاں سے واپس آیا تو انتہائی خوف کی زندگی بسر کرنے لگا۔ خوف ہر وقت مجھ پر مسلط رہتا اب مجھے گرفتاری کا خوف تھا۔ حملہ ہونے کا خوف تھا۔ بیوی بچوں کو نقصان پہنچنے کا خوف تھا؟ خوف بھی تھا کہ کوئی جھوٹے الزام نہ لگا دے اور میری جان مصیبت میں گرفتار ہو جائے۔ جیل اور اس کے سپاہیوں نے ہم سے بغیر کئے ہوئے جرموں کا اعتراف کرنے کے لئے اس قدر ستایا تھا کہ ہم ان کے قدموں میں لیٹ گئے تھے اور ہم کو اعتراف کرنا پڑا تھا ان جرموں کا اعتراف جنکا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اور جن کی فہرست وہ تیار کر کے ہم سے دستخط کرانے کے لئے لایا تھا۔ آئندہ اس قسم کی مصیبت برداشت کرنے کا حوصلہ نہ رہا تھا۔"

مسٹر خروشیف نے خود اپنے ایک ساتھی کیڈرو کا حال بیان کیا ہے جن کو کہ اسٹالن نے اذیت دے کر قتل کر دیا تھا کیڈرو اپنی ڈائری میں لکھتا ہے:-

"میری تندرستی غارت ہو چکی ہے۔ میرے قویٰ مضمحل ہو رہے ہیں اور میری موت تیزی سے قریب آرہی ہے اپنے وطن میں غدار وطن بنکر قید خانے میں زندگی گزارنا ایک عذاب الیم ہے جس سے بڑھ کر ایک ایماندار آدمی کے لئے دوسری کوئی ذلت نہیں ہو سکتی۔ اور یہ ناکردہ گناہ کی سزا اور اس کی ذلت کی تلخی کس قدر شدت سے میرے دل و دماغ پر مسلط ہے اور کس قدر مجھے ستا رہی ہے کچھ میں ہی جانتا ہوں۔" [1]

اچھا اب اشتراکیت کو چھوڑیئے۔ اب یہ سوچئے کہ سائنسی ایجادات مثلاً ایٹم بم، ہائیڈروجن بم، کوبالٹ بم اور اسپٹنک وغیرہ سے کس قسم کی انسانی خدمات متوقع ہیں۔ بلا شبہ ان سے انسانیت کی زبردست خدمت لی جا سکتی ہے، اور شاید ان کے موجدوں نے انسانی فلاح و بہبود کے لئے ہی ان کی بے پناہ طاقتوں کو معلوم کیا ہو۔ لیکن عملی طور پر کیا ہو رہا ہے؟ یہی کہ ان تمام طاقتوں کو انسانیت کو تباہ کرنے کی تیاریوں میں صرف کیا جا رہا ہے اور مہذب قومیں اس خودکشی اور انسان کشی کی دوڑ میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لئے بے قرار ہیں۔ تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ۔ یہیں سے خدا کی مصلحتوں اور انسان کی مجبوریوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آج ہر شخص امن۔ امن پکار رہا ہے اور ہر شخص اپنی جگہ پر کانپ رہا ہے کہ اگر عالمگیر جنگ چھڑ گئی تو اس دنیا پر ایک جاندار بھی زندہ نہ رہ سکے گا۔ ایک مغربی سائنسدان اس سلسلے میں لکھتا ہے:-

"نسلاً بعد نسلاً اس قسم کے بچے پیدا ہوتے رہیں گے جو ذہنی اعتبار سے مفلوج اور جسمانی اعتبار سے ناکارہ ہونگے اس گرمی کا درجہ دس کروڑ ڈگری ہوگا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کتنے شہر اور کتنے آدمی اس قسم کے دھماکے سے اور ریڈیائی شعاعوں سے تباہ ہو جائیں گے۔ آگ کی تپش ہر چیز کو جلا کر خاک سیاہ کر دے گی۔ ریڈیائی شعاعیں پینتالیس ہزار مربع میل تک لوگوں کو متاثر کریں گی۔ ان حالات میں انسان سوائے اس کے اور کیا کر سکتا ہے کہ خدا سے بھلائی کی دعا کرے۔ اس قسم کی جنگ میں فاتح اور مفتوح دونوں مکمل طریقے سے تباہ ہو جائیں گے۔ یہ خطرہ اور زیادہ اس لئے بڑھ جاتا ہے کہ نہ تو خبردار کیا جائیگا اور نہ اعلان کیا جائیگا کیوں کہ جو پارٹی پہلے حملہ کرے گی اس کو دوسری پارٹی پر بہت بڑی فوقیت حاصل ہو جائیگی"

1, The Naked God — By Howard Fast P. 4.

2, Peace or atomic war By Schweitzer P 12, 22.

دراصل یہ نقطۂ نظر کا فرق ہے۔ اگر ہم پہلے سے یہ فرض کرلیں کہ ہم خدا کو نہیں مانیں گے تو یہ تمام ایجادات ہمیں ایسی باتیں کرنے میں مدد دیں گی جن سے یہ شبہ پیدا ہو جائے گا کہ آیا خدا کا وجود ہے یا نہیں۔ لیکن اگر ہم خدا پر ایمان رکھتے ہوں تو یہ تمام چیزیں خدا کے وجود اور اس کے قادر مطلق ہونے پر دلالت کریں گی۔ یہ بذات خود نہ تو خدا کے وجود کا پورا ثبوت ہیں نہ اس کے عدم کا۔ ہم اپنے ذہن اور فکر سے جو چاہیں کام لیں۔ خدا کے وجود اور اس کی ربوبیت کے اور بہت سے ثبوت ہیں جن میں سے چند مثال کے طور پر ہم نے بیان کردیئے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے بڑا ثبوت کائنات میں باقاعدگی اور ہر چیز کا اپنی جگہ پر بامقصد اور مکمل ہونا ہے۔ اسی دلیل کو قرآن کریم میں بھی اکثر مقامات پر استعمال کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ کائنات کو غور سے دیکھو ہر چیز میں تمہیں خدا کی ربوبیت کی شان نظر آئے گی۔ سورج کے طلوع و غروب ہونے میں۔ بادلوں کے آنے اور پانی برسانے میں۔ خشک زمین سے سبزہ اور درخت اگنے میں۔ پانی کی سطح پر کشتی کے چلنے میں۔ انسان کی پیدائش اور موت میں۔ غرضیکہ جتنے مظاہر قدرت ہیں وہ سب کی سب نشانیاں ہیں خدا کی عظمت اور اس کے خالق کل ہونے کی۔ اسی وجہ سے اس نے خود کو "احسن الخالقین" کے خطاب سے یاد کیا ہے۔ پھر اس نے چیلنج کیا ہے کہ اگر تمہیں ہماری خلقت میں کوئی کمی نظر آتی ہو تو بتاؤ۔ خوب غور سے دیکھو کہیں کوئی خلا ہے۔ یقیناً تمہاری نکتہ چیں نظر ناکام ہو کر واپس لوٹے گی۔

خدا کے تصور کو ختم کر کے کوئی اچھا معاشرہ آج تک پیدا نہ ہو سکا اور نہ غالباً آئندہ ہو سکے گا۔ کیوں خدا کا تصور اس کی تمام صفات کے تحت انسان کی فطرت کا ایک جزو لاینفک ہے اسی وجہ سے کانٹ کو با وجود خدا کا قائل نہ ہونے کے یہ اعتراف کرنا پڑا کہ خدا کا وجود ہو یا نہ ہو لیکن ایک متوازن۔ پرسکون اور باوقار اور باانصاف معاشرہ پیدا کرنے کے لئے اور اخلاقی قدریں برقرار رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اس کے تصور کو اپنالیں ورنہ اخلاقی قدریں زندگی میں کبھی باقی نہیں رہ سکتیں اور یہ ظاہر ہے کہ جس معاشرے میں اخلاقی قدریں نہ رہیں وہ انسانی معاشرہ کہلائے جانے کا مستحق نہیں بلکہ وحشیوں اور جنگلی جانوروں کا ایک سرکش مجموعہ یا گروہ ہوگا۔ چنانچہ آپ نے دیکھ لیا کہ روس میں اشتراکی انقلاب آتے ہی خدا کے تصور کو خیرباد کہہ دیا گیا تو سارا ملک ایک قید خانے میں تبدیل ہو گیا اور ہر جگہ بڑے بڑے تعزیری کیمپ قائم کردیئے گئے۔ خصوصاً سیاسی حریفوں کو تو کہیں پناہ نہ ملتی تھی۔ ان کا حال کامریڈ روستو کی زبانی ذرا سن لیجئے۔

"پولیس کو انقلاب کا دست راست بنایا گیا اور غیر معتمد سیاسی لوگوں کے لئے کیمپ قائم کردیئے گئے۔ ان قید خانوں اور جبری کام لینے کے مراکز کے چار فوائد تھے۔

۱۔ عوام الناس میں خوف اور دہشت پیدا کرنے کے لئے ان کی بڑی ضرورت تھی۔

۲ سیاسی پارٹیوں کی طاقت ختم کرنے کے لئے ان کا وجود ضروری تھا۔

۳ بڑے بڑے کام کرنے کے لئے سستے محنت کاروں کی ضرورت پوری کی جاتی تھی۔

۴۔ اس کے علاوہ حکومت کے سربراہوں کو ان سے مختلف فائدے حاصل ہوتے تھے۔

میرا اندازہ یہ ہے کہ تقریباً ساڑھے تین ملین (۳۵ لاکھ) آدمی اس وقت ان مراکز میں قید ہیں"[1]

دراصل مسٹر خروشیف نے اپنے دعوے میں بڑی جلد بازی سے کام لیا ہے ابھی تک کسی بڑے سائنسدان نے

1, The Dynamics of Soviet Society — Rostow.

یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ہم نے کائنات کے تمام راز معلوم کر لئے ہیں بلکہ ہر شخص یہی کہتا ہے کہ ہم ایک پردہ اٹھاتے ہیں تو لاتعداد پردے اور نظر آجاتے ہیں اور ہم پھر حیران رہ جاتے ہیں مسٹر رسّل کا قول اس بارے میں سن لیجئے۔

"یہ سائنسدانوں کے لئے بالکل عام اور واضح سی بات ہے کہ ابھی تک کائنات کے متعلق بہت کم معلومات حاصل ہو سکی ہیں اتنی کم کہ درحقیقت لائق اعتنا بھی نہیں۔ لاتعداد ادوار زمانہ ہماری جہالت پر گزر گئے ہیں اور شاید ابھی مستقبل میں طویل زمانے اس جہالت پر گزر جائیں گے۔ اور یہ بھی مسلمہ ہے کہ سائنس کے نکالے ہوئے نتائج یقینی نہیں بلکہ محض امکانات ہیں"۔ [1]

غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کائنات کے اور آفریدگار کائنات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے متعلق ایک سائنسداں ہونے کے لحاظ سے جو وزن رسّل کی بات کو حاصل ہو سکتا ہے وہ مسٹر خروشیف کی بات کو حاصل نہیں ہو سکتا وہ دنیا کی ایک بڑی سلطنت کے حاکم ضرور ہیں لیکن بڑے سائنسداں نہیں ہیں۔ جب دنیا میں ابھی لاتعداد راز ایسے پڑے ہیں جن کو ابھی تک کوئی شخص ہاتھ نہیں لگا سکا تو خدا کی ذات کے راز کو وہ اس قدر آسان کیوں سمجھتے ہیں کہ اسپتنک خلا میں چھوٹتے ہی وہ اس کو معلوم کر لیں گے۔ ابھی تو اس کے پیدا کئے ہوئے راز وہ معلوم کریں جب تمام عقدے کھل جائیں اور تمام راز آشکار ہو جائیں پھر مناسب ہوگا کہ اس "راز آفریں" کے متعلق وہ سرگرم جستجو ہوں اور پھر اس کے عدم وجود کے متعلق کوئی فیصلہ کریں۔ ابھی ان کا فیصلہ وقت سے بہت پہلے ہے۔ ہر کام اپنے وقت پر ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

1, Human Knowledge By Russell

ابو علی اعظم گڈھ

علامہ سید سلیمان ندوی

مولانا ابوالکلام آزاد کی نظر میں

بدل گفتم کہ ایں شیوہ دشوار است در عالم نفس در خوں تپید و گفت پاسِ آشنایہا

مولانا سید سلیمان کا ندوہ میں آخری سال تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد ۱۵ - ۱۶ برس کی عمر میں مولانا شبلی کے تھا بمبئی سے ندوہ میں آگئے، اور مولانا شبلی کے یہاں مقیم ہوئے۔ اسی بزم قدس میں مولانا سید سلیمان کا جو ابھی طالب العلم اور مولانا شبلی کے زیر تربیت تھے مولانا ابوالکلام سے تعارف ہوا۔ اس تعارف نے بعد میں دوستی، پھر رفاقت اور ہم عنانی کی صورت اختیار کر لی۔ مولانا ابوالکلام نے ۱۹۱۲ء میں کلکتہ سے الہلال نکالا تو اس کی ادارت میں مولانا سید سلیمان کو دارالعلوم ندوۃ العلماء سے بلوا کر جہاں وہ فراغت تعلیم کے بعد ادب کے استاد ہو گئے تھے۔ شریک کیا۔ اور یہیں ان کو سید صاحب کی غیر معمولی علمی و عملی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ ہوا۔ سید صاحب الہلال میں کبھی نام کے ساتھ اور کبھی بغیر نام کے مضامین لکھا کرتے تھے۔ ان کے علمی اور تاریخی مضامین تو زیادہ تر نام کے ساتھ شائع ہوئے، لیکن سیاسی مضامین اور فنی اور ہنگامی اداریئے اور شذرات زیادہ تر بلا نام کے تھے اور چونکہ بیشتر مولانا ابوالکلام کے صحافتی رنگ میں ہوتے تھے۔ اس لئے وہ مولانا ابوالکلام ہی کے جادو نگار قلم کے سمجھے جاتے تھے اور بعد کو انہی سے منسوب ہو کر ان کے مضامین کے مجموعوں کے ساتھ شائع ہوئے۔ ان ہی میں الہلال کا وہ پر زور اور ولولہ انگیز اداریہ بھی تھا۔ جو مچھلی بازار کانپور کی مسجد کی شہادت کے سلسلہ میں "مشہد اکبر" کے عنوان سے شائع ہوا تھا جس کا ایک ایک جملہ محشر خیز اور قیامت آگیں تھا۔ بعد میں گورنمنٹ بنگال نے الہلال کی اس پوری اشاعت کو ضبط کر لیا۔ الہلال کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں ملک کے اور بہت سے نوجوان مشاہیر اہل قلم جمع ہو گئے تھے، جن میں مولانا عبداللہ العمادی بھی تھے۔ جو کبھی لکھنؤ سے عربی وار دو میں البیان نکالا کرتے تھے۔ جس میں سید صاحب بھی عربی میں مضامین لکھا کرتے تھے، اسٹاف میں باہم بڑی کش مکش رہتی تھی۔ جو سید صاحب کے مزاج اور طبیعت کے بالکل خلاف تھی۔ اس لئے وہ الہلال کی ادارتی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئے اور علامہ شبلی اور پونہ کے پروفیسر عبدالقادر کی سفارش سے ان کا تقرر پونہ کالج میں فارسی کی چیر پر ہو گیا۔

الہلال سے علیحدہ ہو جانے کے باوجود بھی مولانا ابوالکلام اور سید صاحب کی دوستی، اخوت، مودت میں فرق نہیں آیا اور باہم خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری رہا، جو ۱۹۴۲ء تک قائم رہا۔ اس کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد قلعہ احمد نگر میں محبوس، اور قلعہ کے باہر کی دنیا سے ان کے علائق منقطع ہو گئے۔ جہاں سے وہ جیل کی پابندیوں کی وجہ سے نہ کسی کو خط لکھ سکتے تھے، نہ دوسرے کا خط ان تک پہنچ سکتا تھا۔ اس قید و بند میں اعزا و اقربا کے علاوہ احباب میں ان کو جو بزرگ یاد آتے ہے وہ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی تھے اور انہی کو عالم خیال میں مخاطب کر کے خط لکھتے رہے، جیل کے انہی خطوط کا وہ مجموعہ ہے، جو مولانا کے پرائیوٹ سکریٹری اجمل خاں

کے اصرار سے غبار خاطر کے نام سے بعد میں شائع ہوا، اور اسی مطبوعہ صورت میں یہ سارے خطوط مکتوب الیہ تک پہنچائے گئے ان کے علاوہ مولانا نے اہل علم و ادب میں سے کسی کو خط نہیں لکھا، اگر لکھا ہوتا تو اس کا ذکر غبار خاطر میں یا اجمل خاں کے طویل مقدمہ میں ضرور آتا
انھوں نے بلا شبہ کچھ سیاسی خطوط بھی لکھے تھے۔ جو یقیناً سیاسی ادیبوں کے نام سے ہوں گے۔ لیکن شملہ کی دیول کانفرنس کے موقع پر شملہ میں جہاں یہ سارے خطوط صاف کئے گئے، اور ترتیب دیئے گئے، علیحدہ کر لئے گئے۔ جو شاید پھر کبھی مناسب وقت پر شائع ہوں گے، اور یقیناً یہ ان کی انگریزی سوانح عمری "انڈیا ونس فریڈم" سے کم اہم نہ ہوں گے۔ غبار خاطر شائع ہوئی، اور دار المصنفین میں ریویو کے لئے آئی، تو سید صاحب کو اسے دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ اس میں سارے خطوط شروع سے آخر تک ایک ہی بزرگ کے نام ہیں اور کسی کے نام کا کوئی خط نہیں ہے۔ حالانکہ اپنے دیرینہ اور عمیق تعلق و عقیدت کی بنا پر مولانا شروانی سے کسی طرح کم، مولانا کی مخاطبت کے وہ اہل نہ تھے۔ اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر معارف کے شذرات میں اس کا تعارف کرایا، تو اس میں اپنے دلی رنج اور رشک کا بھی اظہار کر دیا، لکھتے ہیں، ۔

"لیکن بعض ان کے ایسے "صدیق عزیز" بھی زندہ ہیں جن کو گو دوستی کا دعویٰ نہیں مگر نیاز مندی کا تو بہرحال ہے اور جس کی مدت اس چالیس سال کے تعلق سے بھی زیادہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ لسان الغیب حافظ نے اس واقعہ کی پیشن گوئی صدیوں پہلے اپنے اس شعر میں فرما دی تھی۔

چو با "حبیب" نشینی و بادہ پیمائی
بیاد آر "حریفان بادہ پیما" را

شدت تعلقات کی بنا پر سید صاحب کا یہ رشک بجا تھا۔ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ مولانا ابوالکلام نے ایک مرتبہ سید صاحب کو بہت مفصل خط لکھا جو بہت سے اہم امور پر مشتمل تھا لیکن سید صاحب کو جواب دینے میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی، تو انکو لکھتے ہیں،

"تعجب ہے کہ جواب سے اب تک محروم ہوں
برمن منگر بر کریم خویش نگر"

ایک خط میں اپنی محبت کا اظہار عربی کے ان دو شعروں سے کیا ہے،

بینی و بینک فی المحبۃ نسبۃ　　مستورۃ من اہل ھذا العالم
نحن الذان تعارفت ارواحنا　　من قبل خلق اللہ طینۃ آدم

پھر لکھتے ہیں،

"آپ نے بھوپال سے جو خط لکھا تھا۔ اس کے جواب میں ایک نہایت مفصل خط جس میں متعدد ضروری امور تھے، اعظم گڑھ کے پتہ سے لکھا اور آج تک اس کے جواب کے لئے ترستا ہوں"۔

"بہرحال مجھے ہر حال میں اپنا رفیق و ہم عناں یقین کیجئے، اور ہر دم خدمت گذاری کے لئے تیار ہوں"۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں،

اتحاد مشرب و فکر کا رشتہ ایسا قوی ہے کہ اگر ہم میں سے کوئی کسی کو بھولنا بھی چاہے تو نہیں بھول سکتا۔

ادید لانسی ذکرھا فکانما
تمثل لی لیلیٰ بکل سبیل

اسی خط میں پھر آگے چل کر لکھتے ہیں،

"اگر میں یہ کہوں تو کیا آپ اسے سچ سمجھیں گے کہ میرا جی آپ سے ملنے کو بہت چاہتا ہے اور آپ کی یاد ہمیشہ اس طرح آتی ہے گویا میں اپنے حقیقی بھائی کی نسبت سوچ رہا ہوں

قضاھا لغیری وابتلانی بحبھا

ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"میں بہت سوچتا ہوں لیکن آپ کے سوا کسی کو نہیں پاتا جس سے امید رکھوں"۔

ایک خط میں اپنے تعلق کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:۔

آپ کا خط "ینزل الغیث من بعد ما قنطوا" کا مصداق تھا۔

اذا کتبکم لم تدن منی نشوقا
بعثت لکم کتبی لشوقی الیکم

مولانا ابوالکلام کے لئے سب سے پر کیف صبح کا وقت ہوتا تھا، اسی وقت سید صاحب کو ایک خط لکھتے ہیں، ذرا اس کا کیف دیکھئے گا۔

"اب مجھے مہلت ملی، تو سب سے پہلے آپ کے خط پر نظر پڑی۔ سحری کا وقت ہے چائے کا دور چل رہا ہے، اور آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ آپ بھولے نہ ہوں گے کہ رمضان میں یہی دور میرے لئے جام صبوحی کا کام بھی دیتا ہے اور سفرۂ افطار کا بھی"۔

خجلت نگر کہ در ساحت ما ترینیا فتند
جز روزۂ درست بہ صہبا کشودہ

مولانا ابوالکلام کو سید صاحب کے کسی ضروری خط کا انتظار تھا جس کا سید صاحب نے وعدہ بھی کیا تھا۔ لیکن وہ پورا نہیں ہوا تو ان کو لکھتے ہیں۔

"بہر حال آج میں اپنے شورش قلبی سے مجبور ہو کر ایک بار اور کوشش وصل کرتا ہوں لیکن ہجر مقدر ہو چکا ہے۔ تو غیر از صبر چارہ نہیں"۔

سید صاحب نے الہلال سے علیحدہ ہو جانے کے بعد، پونہ فرگوسن کالج میں پروفیسری قبول کر لی تھی۔ جس کو مولانا ابوالکلام نے ان کی فطری صلاحیتوں کی بنا پر ان کے لئے کچھ زیادہ مناسب نہیں سمجھا، لکھتے ہیں،

"آپ نے پونہ میں پروفیسری قبول کر لی، حالانکہ خدا نے آپ کو درس و تعلیم مدارس سے زیادہ عظیم الشان کاموں کے لئے بنایا ہے، خدا کے لئے میری سنئے اور مجھے اپنا ایک مخلص

بھائی تصور کیجئے، میں آپ کی عزت کرتا ہوں اور خدا شاہد ہے کہ آپ کی محبت اپنے دل میں
رکھتا ہوں ...... کیا حاصل اس سے کہ آپ نے چند طالب علموں کو فارسی و عربی سکھلا دی
آپ میں وہ قابلیت موجود ہے کہ آپ لاکھوں نفوس کو زندگی سکھلا سکتے ہیں۔"

سید صاحب کے خلوص کی ان کی نگاہ میں کیا اہمیت تھی، اس کا اندازہ اس سے کیجئے، کہ سید صاحب نے ایک مرتبہ ان کو لکھا کہ:-
"غضب ہے کہ آپ ضروری باتوں کا بھی جواب نہیں دیتے" تو لکھتے ہیں:-
"میں سوچ رہا ہوں کہ آپ کے خط میں غیر ضروری بات کونسی ہوتی ہے"۔

اپنے شوق ملاقات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں،

"قلبی عید تنی بانک ستلقی

ایسا معلوم ہوتا کہ معارف میں اس رشک حسرت کے اظہار کے باوجود بھی پھر خط وکتابت کا سلسلہ باہم جاری نہ ہو سکا۔ نہ مولانا ابوالکلام صاحب نے ان کو خط لکھا، اور نہ سید ہی صاحب کو ان کے نام کوئی خط لکھنے کی نوبت آئی جس کے بظاہر اسباب غالباً یہ تھے۔

مولانا ابوالکلام کے قلعہ احمد نگر جیل سے نکلنے کے ساتھ ہی ہندوستان کے سیاسی حالات میں بڑی تیز رفتاری بلکہ برق رفتاری کے ساتھ تبدیلیاں شروع ہو گئیں اور مولانا کانگرس کی مسند صدارت پر فائز ہونے کی وجہ سے ان میں ایسا مشغول ہوئے کہ دوست احباب، اعزا و اقارب سے خط وکتابت تو درکنار کسی اور غیر سیاسی کام کی طرف ان کو متوجہ ہونے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ قلعہ احمد نگر جیل سے رہا ہوئے تو ورکنگ کمیٹی کا پورا قافلہ ان کی رہنمائی میں ویول کانفرنس کی شرکت کے لئے شملہ روانہ ہو گیا، وہاں کانفرنس کا سلسلہ ویول صاحب کی صدارت میں ہفتوں جاری رہا۔ مگر کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا اور ویول کانفرنس ناکام ہو گئی۔ اس کے بعد انٹرم گورنمنٹ کی تجویز آئی جس کو کانگرس نے قبول کر لیا اور کچھ دنوں کے حیص بیص کے بعد مخالف جماعت بھی شریک ہو گئی۔ لیکن یہاں بھی کش مکش جاری تھی۔ ایک فریق کچھ کہتا تھا، اور دوسرا فریق کچھ۔ اسی درمیان میں لندن سے کرپس مشن آیا جس نے دونوں فریقوں کے سامنے ہندوستان کے مسائل کا ایک نیا حل پیش کیا جو کرپس پلان یا ۱۶ مئی کے پلان کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں ہندوستان کو ایک مرکز کے ماتحت تین بڑے حصوں یا زون میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ یعنی پنجاب، سرحد، بلوچستان اور سندھ کا ایک زون، بنگال اور آسام کا ایک زون، بیچ کے بقیہ تمام صوبوں کا ایک زون، یہ زون، آبادی، رقبہ، تعلیم، دولت، تجارت اور سیاسی اہمیت کے اعتبار سے سب سے بڑا زون تھا جس کو دونوں نے بطیب خاطر تسلیم کر لیا۔ لیکن آسام کا بنگال کے تحت آ جانا یا دونوں سے مل کر ایک زون بن جانا گاندھی جی کو کچھ زیادہ پسند نہیں آیا، اور ہمیں خوب یاد ہے، کہ کچھ دنوں کے بعد گاندھی جی نے بیان بھی دیدیا کہ چاہے کچھ ہو آسام کی آتما کو دبایا نہیں جا سکتا۔ اس بیان کا نکلنا تھا کہ فریق مخالف پھر شک و تذبذب میں مبتلا ہو گیا اور اس نے اس تجویز کے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس تجویز پر اگر دونوں فریق قائم رہتے تو یقیناً ہندوستان کا نقشہ کچھ اور ہوتا اس کے بعد وہ تجویز سامنے آئی جو ۱۶ رجون کے پلان کے نام سے مشہور ہے، جس کو مسلم لیگ نے خوش آمدید کہا، اور اس پر بعد میں کانگرس بھی کوئی متبادل تجویز نہ ہونے کی وجہ سے بادل ناخواستہ راضی ہو گئی اور اس کے بعد جو کچھ ہوا اور جو حالات پیش آئے وہ حالات کا نہایت "المیہ" ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان حالت میں خطوط لکھنے کا کہاں موقع تھا۔ کہ مولانا اس کی طرف توجہ فرماتے۔ اور شاید معارف کے وہ آرزومندانہ شذرات بھی مولانا کی نظر سے نہیں گذرے کہ تلافی مافات کی کوئی صورت پیدا ہوتی۔

دوسری طرف سید صاحب بھی طرح طرح کے افکار و آلام و مصائب میں گرفتار ہوگئے، جس کا سلسلہ زندگی کے آخر تک رہا۔ اور ان کو وہ سکون و طمینان اور یکسوئی حاصل نہ ہو سکی۔ جو دارالمصنفین کے زمانہ قیام تک ان کو حاصل تھی۔ مولانا شبلی اور ان کے بعد دارالمصنفین سے بھوپال کے دیرینہ تعلقات کی بنا پر، والی بھوپال نواب حمید اللہ خان نے کچھ دنوں کے لئے باصرار تمام انکی خدمات بھوپال میں علمی احیاء و تجدید کی خاطر مستعار لے لیں، اور وہاں کے ناظم تعلیمات اور قاضی القضاۃ ہوگئے۔ اسی درمیان میں وہ اپنے اہل خاندان کے ساتھ حج کو گئے۔ جہاں سعودی حکومت کے مہمان ہوئے وہاں سے لوٹے تو بمبئی پہنچکر بیمار ہوگئے۔ علالت کا پورا زمانہ یہیں گذرا۔ بھوپال پہنچے تو انقلاب اس کے دروازہ پر دستک دے رہا تھا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد ہندوستان کی ساری ریاستیں آن واحد میں ختم کردی گئیں، اور ریاست بھوپال کا الحاق مدھیہ پردیش سے ہوگیا، اور اس طرح سے ریاست کی علمی ترقی کا خواب جو والی بھوپال نے دیکھا تھا ہمیشہ کے لئے پریشان ہوگیا۔ اور سید صاحب وہاں سے واپس چلے آئے۔ سید صاحب پاکستان گئے تھے تو درحقیقت اپنی بڑی صاحبزادی اور ان کے بچوں کو دیکھنے، مگر ہندوستان میں بدقسمتی سے اس کے طرح طرح کے معنی پہنائے گئے اور بات کا بتنگڑ بنا دیا گیا۔ ہندوستان آنے کے لئے جیسا کہ مولانا عبدالباری ندوی کی روایت ہے بار بار ان کا بستر بندھا اور بار بار کھلا مگر ہندوستان کے سفارت خانہ کراچی سے بصد ہزار سعی و کوشش ان کو نہ ویزا ملا اور نہ وہ واپس آسکے اس میں بہت کچھ دخل مقدر ہی کا ہے۔

طرفین کے ان دوگونہ غیر متوقع متضاد حالات کی بنا پر باہم دوبارہ سلسلۂ مراسلت کی نوبت نہ آسکی اور بڑی حد تک دونوں حضرات ایک دوسرے کے حالات سے بے خبر رہے۔ سید صاحب کا ۱۹۵۳ء میں کراچی میں انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد بہت عرصہ کے بعد جب مولانا ابوالکلام کو بعض بزرگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ آخر زندگی میں اس طرح کی کش مکش میں مبتلا ہوگئے تھے۔ تو انکو بہت افسوس ہوا۔

بہرحال ۱۹۲۰ء کی تحریک سے پہلے تک مولانا ابوالکلام نے ان کو جو خطوط لکھے تھے وہ سب دارالمصنفین میں محفوظ ہیں اور وہ علم و ادب کا بہت بیش قیمت سرمایہ ہونے کے علاوہ دونوں بزرگوں کے غیر معمولی تعلقات کے آئینہ دار بھی ہیں۔ سید صاحب کی وفات کے بعد، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے افادۂ عام کے خیال سے ان خطوط کی ایک بڑی تعداد اکتوبر ۱۹۵۹ء سے فروری ۱۹۶۰ء تک کے معارف میں باقساط شائع کردی ہے، ان میں سے جو خطوط دارالمصنفین، اس کے رفقاء مصنفین، اس کی علمی و ادبی خدمات، اور رسالۂ معارف سے متعلق تھے۔ ان کا ذکر ابھی ابھی ہم اخبار مدینہ بجنور میں کر چکے ہیں، آج کی صحبت میں ان بزرگوں کے ذاتی تعلقات و روابط کی داستان آپ کو سنانی ہے۔

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

پہلے خطوں میں بڑے لمبے چوڑے خطابات لکھے جاتے تھے۔ اس کے بعد اصل خط شروع ہوتا تھا، وہ بھی اتنا مسجع و مقفیٰ، کہ خدا کی پناہ، سب سے پہلے اس کو مرزا غالب نے ترک کیا اور اسی کا تتبع بعد کے لوگوں نے کیا۔ لیکن مولانا کی عربیت پسندی نے عربی کے نئے نئے خطابات ایجاد کئے اور وہی لوگوں کو لکھتے تھے، مولانا شبلی کو یا مولی الجلیل، یا مولی الکریم، مولانا شروانی کو صدیق کرم

—— سید صاحب کو صدیق العزیز، اخ العزیز الاجل، اخ الجلیل الاعز- اور دوسرے لوگوں کو حبی فی اللہ وغیرہ لکھا کرتے تھے۔

سید صاحب کے نام جو خطوط ہیں وہ زیادہ تر کاروباری یا علمی ہیں، یعنی یا تو کسی ضرورت کے لئے لکھے گئے ہیں۔ یا کسی کتاب یا کسی علمی مسئلہ، یا کسی قومی خدمت اور کارنامے کے متعلق ہیں۔ غبار خاطر کے خطوط کی طرح طویل اور انشا پردازانہ نہیں، بلکہ بہت سادہ اور مختصر ہیں۔ جو بات جس طرح زبان قلم پر آگئی بے تکلف صفحۂ کاغذ پر منتقل ہوگئی۔ ان میں کہیں تصنع اور بناوٹ نام کو بھی نہیں ہے۔ ہم ذیل میں مولانا کے دوسری قسم کے خطوط کا ذکر کریں گے۔

مولانا سید سلیمان ندوی سے خط و کتابت کا سلسلہ ندوہ کی مدرسی کے زمانہ ہی سے شروع ہو چکا تھا۔

اسی زمانہ میں سید صاحب مولانا شبلی کے زیر نگرانی درس و تدریس کے علاوہ اور جو کام کر رہے تھے، ان میں ایک کام غالباً یونیورسٹی کے نصاب تعلیم میں تاریخ اسلام کے داخلہ کی جدوجہد کا تھا۔ جس میں ان کو کامیابی ہوئی، اور تاریخ اسلام یونیورسٹی کے نصاب میں بطور ایک ضروری سبجکٹ کے داخل ہوگئی، اس کی اطلاع سید صاحب نے اردو کے تمام موقت الشیوع اخبارات کو بھی بھیجدی تھی۔ جن میں گورکھپور کا مشہور ہفتہ وار اخبار مشرق بھی تھا۔ یہ اخبار حبل المتین کے دفتر میں نظر آیا۔ تو مولانا لکھتے ہیں

"میں اخبارات دیکھتا نہیں، اتفاق سے آج حبل المتین کے یہاں مشرق نظر سے گذرا آپ
کی تحریر تاریخ اسلام داخل نصاب کی نسبت پوری پڑھی۔ جی خوش ہوا کہ آپ کام کر رہے
ہیں، حالانکہ مولانا (شبلی) کو خوف تھا کہ یہ کام نہ ہوگا۔ اس کے لئے لوگوں سے اپیل کرنے
کی ضرورت نہیں۔ ندوہ کو براہ راست یونیورسٹی سے خط و کتابت کرنی چاہیئے۔ اگر ممبرانِ
سنڈیکیٹ اور فیلوز کچھ مفید ہو سکتے ہیں، تو اُسے بھی اخبار میں لکھنے کی ضرورت نہیں۔ (۲۳ جولائی ۱۹۱۰ء)

الرد علی المنطقیین علامہ ابن تیمیہ کی مشہور کتاب ہے۔ اس وقت تک ہندوستان میں چھپ کر نہیں آئی تھی۔ سید صاحب کو حیدرآباد دکن میں اس کے ایک قلمی نسخہ کی نقل مل گئی تھی۔ اس کا ذکر سید صاحب نے ایک خط میں کیا تو مولانا نے لکھا کہ:-

"الرد علی المنطقیین ابن تیمیہ کا نامکمل نسخہ آپ کے پاس منقول حیدرآباد موجود ہے۔ کیا آپ
اس کی ایک نقل دے سکتے ہیں۔ نقل کی اجرت دیدی جائیگی، اور اگر ممکن ہو تو ایک ماہ
کے لئے وہ نسخہ میرے پاس بھیجدیں۔"

مگر معلوم ہوتا ہے سید صاحب کو مولانا کے پاس بھیجنے، یا اس کی دوسری نقل لینے کا موقع نہیں مل سکا تو مولانا لکھتے ہیں:-

"اگر وہ نقل قابل اشاعت ہو اور آپ خود شائع کر سکتے ہوں، تو بہتر ہوگا۔ شیخ محمد منیر
ازہری کے حوالہ کردی جائے، وہ ابن تیمیہ کی بقیہ تمام مصنفات شائع کرنا چاہتے ہیں
الرد علی المنطقیین کے بھی خواہش مند ہیں۔ میں نے انہیں قاضی شوکانی کی تفسیر فتح القدیر
کی نسبت لکھا تھا۔ اور انھوں نے شائع کردی۔"

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ الرد علی المنطقیین کے طبع و اشاعت کی تجویز اس سے آگے نہیں بڑھ سکی، اور وہ بہت زمانہ تک قلمی ہی رہی اور اس کے قلمی نسخوں ہی سے لوگ فائدہ اٹھاتے رہے۔ اس کے تقریباً تیس برس کے بعد کہیں جا کر بمبئی کے مشہور تاجر کتب عبدالصمد شرف الدین الکتبی نے اپنے اہتمام میں اس کو طبع کرایا۔ جس کے اخراجات حکومت حجاز نے ادا کئے۔ اور معارف ۱۹۴۳ء میں مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب رفیق دارالمصنفین کے قلم سے بہت مفصل ریویو نکلا۔

سید صاحب نے اپنی مشہور کتاب "خیام" میں، خیام کو ایک منجم، ہیئت دان، اور فلسفی وحکیم کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور آپ کے متعدد فلسفیانہ رسائل کو از سر نو ایڈٹ کرکے کتاب کے ساتھ شامل کر دیا ہے، ان میں ایک رسالہ الکون والتکلیف بھی ہے۔ جس سے مولانا ابوالکلام کچھ ناآشنا سے تھے، لکھتے ہیں :-

"ایک مجموعہ رسائل جرمنی یا ہالینڈ کا ہے جس میں بوعلی سینا کے رسائل ہیں، اس مجموعہ میں الکون والتکلیف بھی ہے۔ یہ مجموعہ میرے پاس ہے، لیکن دہلی میں ہے، ہفتہ عشرہ میں جا رہا ہوں پھر آپ کو اطلاع دوں گا۔ ممکن ہے میرا حافظہ غلطی کر رہا ہو، الکون والتکلیف اور کلیات الوجود دونوں مجھے آشنا معلوم ہوتے ہیں۔

کچھ یہ بات بھی یاد آتی ہے کہ الکون والتکلیف بہت مختصر ہے۔ زیادہ سے زیادہ چار پانچ صفحے ہوں گے اور غالباً کسی مسائل کے جواب میں ہے۔

یہ بھی یاد ہے کہ اس میں کوئی قابل اعتنا بات نظر نہیں آئی تھی۔"

یہ رسالہ واقعتاً ایک سائل کے جواب میں ہے۔ اور اس کی ضخامت مع تتمہ کے ۹ ورق سے زیادہ نہیں ہے۔ ابو علی سینا کے شاگردوں میں ایک صاحب جن کا نام ابو نصر محمد بن عبدالرحیم نسوی تھا اور جو نواح فارس میں قاضی تھے۔ انھوں نے ۴۷۳ھ میں خیام سے دو سوال پوچھے تھے۔

۱۔ خدا نے یہ دنیا اور خصوصاً انسان کو کیوں بنایا۔

۲۔ اور انسانوں کو عبادات بجالانے کی تکلیف کیوں دی۔

انہی دو سوالوں کی وجہ سے اس رسالہ کا نام رسالہ کون وتکلیف پڑ گیا۔

اور چونکہ سائل بوعلی سینا کا شاگرد تھا۔ اس لئے یہ رسالہ بھی بوعلی سینا اور دوسرے فلاسفہ کے رسائل کے مجموعہ کیساتھ چھپ گیا۔ سید صاحب نے اپنی کتاب خیام میں اس کا بہت مفصل تعارف کرایا ہے، تفسیر فتح القدیر کا ایک نسخہ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا یمن کے دارالسلطنت صنعا میں موجود تھا، اس کی نقل چھپی تو مولانا سید صاحب کو لکھتے ہیں :-

"میں نے اس کی پہلی جلد مدت ہوئی نواب علی حسن خاں کے یہاں دیکھی تھی ; مگر بالاستیعاً دیکھنے کا اب موقع ملا۔ اور بہت مایوسی ہوئی، کوئی خصوصیت ایسی نہیں جس کی بنا پر اسے ممتاز تصور کیا جاتا ہے۔"

مولانا کتابوں کے معاملہ میں اکثر و بیشتر اپنے حافظہ پر اعتماد کرتے تھے، اور بے تکلف ان کا حوالہ دیدیتے تھے، غبارِ خاطر کے بعض خطوط جو تاریخی واقعات پر مشتمل ہیں محض اپنے حافظہ کے اعتماد پر لکھے ہیں۔ لیکن بعض وقت ان کا حافظہ غلطی بھی کرتا تھا جس پر بعد میں ان کو افسوس ہوتا تھا۔ انھوں نے کسی مسئلہ کے متعلق ایک مضمون سید صاحب کو بھیجا تھا جس میں لکھا تھا کہ نپولین کے قیام مصر کے زمانہ میں بھی یہ مسئلہ چھڑا تھا۔ (غالباً غیر مسلموں کے دخول مساجد کا جو اس وقت معارف میں چھپ رہا تھا) اور شیخ اسماعیل زرقانی نے فتویٰ دیا تھا۔ بعد کو یہ بات ان کو کھٹکی۔ تو سید صاحب کو لکھتے ہیں،

"اس وقت تحفۃ الناظرین پاس نہیں تھی۔ مسٹر فضل دین نے میرے کلکتہ کے ذخیرۂ کتب میں سے ڈھونڈ کر بھیجی تو معلوم ہوا کہ حافظہ نے ایک سخت غلطی کی ہے یعنی مصر

میں فتویٰ شیخ جبرتی صاحب تاریخ نے دیا تھا اور اس کی بنا زرقانی کا ایک فتویٰ تھا۔
پس براہ عنایت مضمون میں تصحیح کر دیجئے۔ اسماعیل زرقانی شارح موطا و مواہب کی
جگہ "شیخ عبدالرحمٰن جبرتی صاحب تاریخ عجائب الآثار" بنا دیجئے۔ نپولین کے داخلۂ
مصر سے کئی سال پہلے زرقانی کا انتقال ہو چکا تھا۔ کہیں لوگ پڑھ کر ابن مبارک
والی بات نہ کہہ بیٹھیں"۔ (معارف خط ۵۱)

"اکتفا القنوع": ابن ندیم کی الفہرست کی طرح کتابوں کی علمی فہرست ہے جو مصنفین اور اہل تحقیق کے لئے بڑی کارآمد ہے۔ اور جس سے مضمون نگاروں کو کتابوں کا حوالہ دینے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس کو یورپ کے ایک مستشرق ڈاکٹر ایڈورڈ بیک نے کئی جلدوں میں از سرِ نو ایڈٹ کر کے شائع کیا تھا۔ خیام کے مذکورہ بالا رسالوں کے متعلق سید صاحب کو لکھا کہ اس میں دیکھئے، نہ ہو تو شرف الدین اینڈ سنس بمبئی کے یہاں سے منگوا لیجئے۔ لکھتے ہیں:۔

"مطبوعات عربیہ کے لئے بہت حد تک یہ اب مکمل فہرست ہو گئی ہے۔ خصوصاً مطبوعاتِ یورپ کا پورا استقصا کیا ہے"۔

الہلال کی شرکت ادارت کے زمانہ میں سید صاحب کی صلاحیتوں کا مولانا ابوالکلام کو جو اندازہ ہو گیا تھا اس کی بنا پر ان کی ہمیشہ خواہش رہی کہ وہ پھر کلکتہ آئیں اور ان کے ساتھ کام کریں، اس کے لئے مولانا ان کو طرح طرح سے ترغیب دیتے تھے، کبھی کچھ لکھتے کبھی کچھ۔ لیکن سید صاحب کی طبیعت دوبارہ کلکتہ جانے اور مولانا ابوالکلام کی صحافتی و ادبی و لسانی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لئے آمادہ نہ ہو سکی، دارالمصنفین کے قیام کے بعد بھی مولانا کا اصرار قائم رہا، یہاں تک لکھ دیا کہ:۔

"البلاغ کے علاوہ ایک روزانہ اخبار اقدام بھی جاری ہوا ہے، وہ بھی آپ کے ماتحت ہو جائیگا اور ایک بڑا اسٹاف اپنے ماتحت آپ پائیں گے، امید ہے کہ دارالمصنفین وغیرہ اس میں مانع نہ ہوں گے، کیونکہ اس کو تو بہرحال قائم رہنا ہے"۔

لیکن یہ آخری ترغیب بھی سید صاحب کو آمادہ نہ کر سکی، اور وہ دوبارہ کلکتہ نہیں گئے، اور پھر دارالمصنفین کے قائم ہونے کے بعد جس کے لئے وہ پونہ کی گرانقدر پروفیسری چھوڑ کر آئے تھے، کلکتہ جانے کا امکان بھی کہاں باقی رہ گیا تھا۔ اس کے باوجود بھی بحمد اللہ دونوں بزرگوں کے تعلقات میں سرِ مو فرق نہیں آیا اور پھر سید صاحب نے دارالمصنفین کو جس کامیابی کے ساتھ چلایا۔ اور جس طرح دنیا کے سامنے اہل علم کی توجہ اس کی طرف مبذول کرا دی، اس کے اعترافات سے مولانا کے سارے خطوط لبریز ہیں۔

دارالمصنفین میں مولانا شبلی کے تمام احباب اور مخلصین جو اس وقت تک زندہ تھے یکے بعد دیگرے آ چکے تھے۔ مثلاً مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری، نواب علی حسن خاں بھوپال، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علیخاں اڈیٹر زمیندار، خواجہ سید رشید الدین صاحب مترجم۔ سیاحت قسطنطنیہ مؤلفہ میکس طر وغیرہ وغیرہ لیکن مولانا ابوالکلام جو دارالمصنفین کی تجویز اور پھر اس کے قیام و تاسیس کے مشوروں میں شریک تھے، اور جن کے اخبار الہلال میں اس کا خاکہ سب سے پہلے مولانا شبلی کے قلم سے شائع ہوا تھا، وہی اب تک نہیں آئے تھے، اور انہی کے آنے کی سید صاحب اور دوسرے کارکنان دارالمصنفین کو بڑی تمنا تھی جس کے لئے سید صاحب کو بار بار ان کو لکھتے رہے، اور بار بار وہ وعدوں پر ٹلتے رہے، ایک مرتبہ تو یہ تمنا پوری ہوتے ہوتے رہ گئی۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کا دوسرا جلسہ دستار بندی بڑی عظمت و شان کے ساتھ ہونے والا تھا۔ اس کی صدارت

کے لئے مولانا ابوالکلام کا انتخاب ہوا۔ اور مولانا حمید الدین کے چھوٹے بھائی، حاجی رشید الدین صاحب ناظم مدرسہ نے بہ ہزار سعی و کوشش ان کی منظوری بھی حاصل کرلی۔ اس کو اب مولانا کی زبان ہی سے سنئے:۔

"مجھے ہمیشہ خیال رہا کہ اعظم گڈھ کے لئے وقت نکالوں اور ہمیشہ یہی ہوا کہ قدم نہ اٹھ سکا مگر مشکل یہ ہے کہ مجھے میرٹھ کے لئے کون بلانا چاہتا ہے۔ جو بلاتا ہے کسی جلسہ کے لئے اور مدرسہ کے لئے اور وعظ و تقریر کے لئے اور میرا یہ خیال ہو گیا ہے کہ کوئی بات بھی طبیعت پر اس درجہ گراں نہیں گزرتی جس قدر جلسوں کی شرکت اور فرمائشی تقریریں، اگر میں اعظم گڈھ آؤں تو وہاں بھی یہی مصیبت ہوگی، آپ تک اس کے خواہش مند ہونگے کہ جلسہ اور تقریر ضرور ہونی چاہئے"۔

"اس بارے میں، میں تمام دنیا کو ایک شاکی پاتا ہوں۔ مگر میں بھی اس صورت حال پر قانع ہو گیا ہوں"۔

"مدرسہ سرائے میر کے لئے مولوی رشید الدین صاحب نے اصرار شروع کیا ہے اور اصرار کو حد آخر تک پہنچا دیا ہے جس کی وجہ سے میرے لئے بہت دشوار ہو گیا کہ ان کے اصرار کے مقابلہ میں اپنی عذر خواہی پر قائم رہ سکوں۔ بہرحال اس کے سوا چارہ نہیں کہ تعمیل کروں بڑی بات یہ ہوگی کہ اعظم گڈھ آنے اور آپ لوگوں سے دار المصنفین میں ملنے کا قدیم ارادہ پورا ہو جائے گا"۔

لیکن افسوس کہ مولانا عین وقت پر اپنے قدیم مرض عرق النسا میں مبتلا ہو گئے اور سید صاحب کی آرزو پوری نہ ہو سکی

مدت سے لگ رہی تھی لب بام ٹکٹکی
تھک تھک کے گر گئی نگہ انتظار آج

سید صاحب کا جب تک دار المصنفین میں قیام رہا، ان کی دعوت اور مولانا کی عذر خواہی کا سلسلہ برابر جاری رہا، ان کو اپنی بے پناہ مشغولیتوں، سیاسی سرگرمیوں، پھر اس کے بعد وزارتی مصروفیتوں سے نہ کبھی فرصت ملی، اور نہ وہ دار المصنفین آئے۔ اور سید صاحب یہ حسرت اپنے ساتھ کراچی لے گئے۔ مولانا شبلی کے تلامذہ و وابستگان دامن میں تنہا یہی بزرگ تھے جو مولانا شبلی کے دار المصنفین کے خواب کی تعبیر، اور اس کی علمی ترقیوں کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھ سکے، لیکن ان کا دلی اور روحانی تعلق ہمیشہ اس کے ساتھ قائم رہا۔ اور سید صاحب کے پاکستان چلے جانے کے بعد تو کارکنان دار المصنفین کی امیدوں اور تمناؤں کے وہی تنہا مرجع ہو گئے تھے اور اس دور میں دار المصنفین کو ان سے بڑی گرانقدر امداد ملی۔

حدیث عشق خوش بود است و شبلی خوش رنگ کردہ است
شنیدن می تواں زیں حرف رنگیں داستانے را

ایس۔ ایم۔ یوسف
ترجمہ
ن، عین

اسلامی ثقافت کے چند پہلو

ثقافت کیا ہے؟

ثقافت ان چند الفاظ میں سے ایک ہے جنھیں معنی اور مفہوم سمجھنے کی کوئی دیانتدارانہ کوشش کیے بغیر بڑی بے تکلفی سے گفتگو میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر اس لفظ کی تعریف اور تشریح دریافت کی جائے تو اکثر لوگ صرف سر پکڑ کے رہ جائیں گے۔ لیکن جو لوگ اس سوال کا سامنا کرنے سے گریز کرتے ہیں وہ اکثر اوقات اپنی گفتگو میں ثقافت اور تہذیب کے مابین فرق کرنے میں ذہنی انتشار کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس بات کو ایک انگریز نے بڑی اچھی طرح واضح کیا ہے جب کمال اتاترک نے ترکی میں سر کے لئے یورپی لباس نافذ کیا تو اس نے نہایت برہمی کے عالم میں کہا "دراصل جو چیز اہمیت کی حامل ہے وہ لباس نہیں بلکہ سر ہے" ثقافت بنیادی طور پر ذہن کی ایک صفت ہے۔ بالفاظ دیگر یہ کائنات اور اس میں اپنے مقام کے بارے میں انسانی نقطۂ نظر انسانی زندگی کے تصور، غم اور مسرت کے تصورات، تنگدستی اور خوشحالی میں انسانی رویہ اور روزمرہ کی زندگی کے مسائل میں انسانی طرزِ عمل کا مجموعہ ہے۔ اقبال مردِ مومن کی صفت "چوں مرگ آید تبسم برلب اوست" اسی انداز میں بتاتے ہیں۔ ثقافت کا تعلق پگڑی، ترکی ٹوپی، یا اس کا ہیٹ سے نہیں ہے جس پر اتاترک بُری طرح فدا تھے۔ یہ اندازِ فکر اور طرزِ عمل بعض بنیادی اقدار کے شعور کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جو ذہن انسانی کی کاوش کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ جب یہ شعور ہر طرح کے شبہ سے بالاتر ہو کر واضح اور اتنا مضبوط ہو جاتا ہے کہ کسی بھی مخالفت کا حملہ برداشت کر سکے تو یہی شعور "یقین" اور "ایمان" کہلاتا ہے۔ اس بات سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ وہ ایمان جس کی تعمیر ایسے عقائد پر ہو جن کو محض تحکمانہ انداز میں پیش کر دیا گیا ہو اور ذہن انسانی کی کاوش پر جس کی بنیاد نہ اٹھائی گئی ہو، انسانی وقار کی توہین کے مترادف ہے اور وہ محض جادوگری یا سحر کی کوئی شکل ہے۔ چونکہ کسی بھی بنیادی قدر کا سب سے اہم معیار یہ ہے کہ وہ آفاقی ہو اور انسانوں پر اس کا اطلاق زمان اور مکان کی قیود سے بالاتر ہو کر مساوی طور پر ہو سکے اس لئے ایسے تمام مذاہب جو مقامی خداؤں اور دیوتاؤں۔ کی اطاعت کا مطالبہ کرتے ہیں ہماری توجہ کے مستحق نہیں رہتے۔ وطنیت جس نے حال ہی میں "اجتماعی خود غرضی" اور "اصولِ عنادِ باہمی" کی شکل اختیار کر لی ہے اور جو اپنی بہترین شکل میں بھی اقدار کی نہیں بلکہ انسانوں کی اطاعت کا مطالبہ کرتی ہے۔ ہمارے مطالبے سے خارج ہے۔ اسی طرح دنیا کے تمام نظریہ ہائے حیات یہاں تک "غیر مذہبی نظریہ ہائے حیات" (جیسے ہمارے زمانے میں کمیونزم) بھی اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ انہیں مذہب کے ساتھ مساوی حیثیت میں موضوعِ بحث بنایا جائے۔ مارکس کے اقتصادی نظام پر توجہ مرکوز کرنا تو محض ایک چال ہے (جو کہ اُن ممالک میں اختیار کی جاتی ہے جہاں اب بھی مذہب غالب ہے اور جہاں اسے طاقت سے دبانے کے ذرائع پر ابھی قابو حاصل نہیں ہوا ہے) دراصل وہاں بھی بنیادی اقدار anti metaphysical metaphysics (جن پر اس نظام کی بالائی عمارت استوار ہوتی ہے) پر غور کرنا۔ قبول کرنا یا رد کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر ثقافت اور اس کے

سرچشمے کے بارے میں مندرجہ بالا اصول صحیح تسلیم کرلیا جائے تو نتیجتاً یہ بات سامنے آئے گی کہ ثقافت کے اصل اجزا میں جغرافیہ نسل۔ رنگ۔ زبان یا کسی بھی مقامی (جو کہ آفاقیت کے مخالف ہو) عنصر کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ کم از کم اسلام کا نقطہ نظر یہی ہے۔ اسلام چند بنیادی اقدار کو اپنے پیروؤں کے ذہن میں راسخ کرنے اور ان کی روزمرہ کی زندگی اور کردار میں ان اقدار کے مظاہرے پر بہت زور دیتا ہے۔ اس کے علاوہ باقی ساری چیزوں کو وہ محض غیر اہم قرار دیتا ہے اور ان کو افراد کی سہولت۔ ذوق اور پسند کے مطابق طے ہونے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ تہذیب کے مظاہر محض تاریخی ارتقاء سے متعلق ہیں اور انہیں سائنس اور فنون کی ترقی اور مادی حالات کی ارتقائی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ تبدیل ہونا اور ترقی کرنا چاہیے

مثال کے طور پر لباس ہی کو لیجئے اس سلسلے میں اسلام محض ایک سادہ اور عام اصول پیش کرتا ہے یعنی لباس ایسا ہونا چاہیے جو ایک مرد کا ناف سے لے کر ٹخنے تک، اور ایک عورت کا سارا جسم ڈھک سکے، لیکن یہ لباس اتنا تنگ نہیں ہونا چاہیے کہ جسم کے نشیب و فراز کی طرف خواہ مخواہ توجہ مبذول ہو۔ یہ بات اسلامی تصورِ حیا کے تقاضوں کے عین مطابق بھی ہے۔ اسی وجہ سے مختلف ممالک میں اور مختلف ادوار میں لباس کی بے شمار شکلیں پیدا ہوئیں۔ یہ سب شکلیں مساوی طور پر اسلامی تھیں اور ہیں۔ تغیر، ارتقاء اور ہنر کے نشوونما کی بے چین روح ان لباسوں سے نمایاں ہے۔ مشینی دور کے تقاضوں کی مطابقت یا ذوق کی مزید تبدیلیاں شجرِ ممنوعہ کی حیثیت نہیں رکھتیں۔ ابتدائی اور قدیم وضع کے لباس کی دائمی تقدیس توہم پرستی ہے۔ البتہ نیچے گلے کی قمیصیں اور چھوٹے سکرٹس کی طرح کے لباس غیر قانونی ہیں۔

کچھ ایسا ہی معاملہ ثقافت کے لباس یعنی زبان کے ساتھ بھی ہے۔ ایک مسلمان آنے والی نسلوں کو اسلامی ثقافت منتقل کرنے، اسلامی طرز زندگی سکھانے اور دوسرے لوگوں کو اسلامی خیالات سے متعارف کرنے اور سمجھانے کے لئے مضطرب رہتا ہے وہ شخص احمق ہی ہوگا جو ان خیالات کو منتقل کرنے کے لئے آسان ترین ذریعہ اختیار نہیں کرے گا۔ یہ بات کہنا کافی ہے کہ ایک مسلمان کے لئے کوئی زبان بھی ناپاک نہیں ہے۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ بہت سی وہ زبانیں جنہیں آج اسلامی سمجھا جاتا ہے ان زبانوں کے بولنے والوں کے قبول اسلام کے بعد ہی اسلامی ہوئی ہیں۔ لیکن روح کی طرح زبانیں ایک دن میں نہ تو بنتی ہیں اور نہ ایک دن میں ان کی ترقی ہوتی ہے۔ کسی زبان کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا کہ وہ واقعی اسلامی خیالات کا ذخیرہ رکھتی ہے یا نہیں محض ایک فرد یا چند افراد کا کام نہیں ہے بلکہ اس کا انحصار باصلاحیت مصنفین، فلسفیوں اور شاعروں کی ان سنجیدہ اور مستقل کوششوں پر ہے جو کئی نسلوں بلکہ کئی صدیوں تک کی گئی ہوں۔ اس لئے اگر کسی ایسی ہی زبان سے مسلمان لگاؤ محسوس کرتا ہے تو نہ صرف یہ بات قابل معافی ہے بلکہ دوسرے افراد کی طرف سے ہر طرح کی رواداری کی مستحق بھی ہے۔

اسلام کا فارمولا

(۱) انکار

اسلام کا فارمولا "لا الٰہ الا اللہ" ہے۔ اس کا پہلا حصہ (لا الٰہ) انکار اور دوسرا حصہ (الا اللہ) اقرار پر مشتمل ہے انکار ہی در اصل اقرار کے لئے زمین ہموار کرتا ہے۔ سب سے پہلے انکار کی اہمیت کا اندازہ لگائیں۔ جونہی کسی بچے کی جسمانی صلاحیتیں نشوونما پا جاتی ہیں وہ اپنے گرد و پیش کی دنیا کے فطری مظاہر کا مشاہدہ کرنا شروع کر دیتا ہے۔ سورج۔ چاند۔ ستارے، پہاڑ

سنگ ریزے، صدف، جانور، گھونگے، چیونٹیاں۔ غرضیکہ ہر ایک چیز اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرتی ہے۔ کھیل جو کہ دراصل فطرت کے ساتھ ایک خوشگوار طریقے پر تجربات کا دوسرا نام ہے) کے دوران میں وہ مختلف اشیا کی خصوصیات اور اُن پر جاری و ساری قوانین کے بارے میں اپنے ابتدائی تصورات حاصل کرتا ہے۔ اس سے اگلے مرحلے میں وہ فطرت کے اس علم کو اپنے وجود کی ضروریات کے ساتھ متعلق کرتا ہے۔ اس کوشش میں اس سے خوف، وہم، جوش اور والہانہ پن کا اظہار ہوتا ہے۔ ان میں سے اکثر باتوں کا اظہار دراصل اُسے اپنی ظاہری اور پوشیدہ قوتوں اور صلاحیتوں کے پورا پورا اندازہ نہ ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر، بچہ کو ایک بنیادی مسئلہ (یعنی کائنات میں اس کی اپنی حیثیت) سے سابقہ پڑتا ہے اسی طرح بچے کو سب سے پہلے گھر میں اور آخر کار انسانی معاشرہ میں بحیثیت مجموعی اپنی حیثیت کا صحیح تعین کرنا پڑتا ہے۔ اس دائرے میں بھی اُسے مختلف غلط تعصبات اور نفسیاتی مزاحمتوں سے گذرنا پڑتا ہے تب جاکر اُسے وہ ہم آہنگی میسر آتی ہے جو اُسے ماحول میں اپنے محفوظ ہونے کا احساس بخش سکے۔ دونوں صورتوں میں بچے کو بہت سخت جد و جہد کرنی پڑتی ہے جس کا نتیجہ اکثر اوقات ناکامی یا محدود کامیابی ہوتا ہے۔ جدید نفسیات نے بھی یہ مزید واضح کر دیا ہے کہ ہم میں سے اکثر بلوغت کے بعد بھی بچپن کے خوف اور وہموں سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے۔ بچے کی کہانی دراصل نوع انسان ہی کی کہانی ہے، وہ "نیکی و بدی کے ماخذ" (اسلامی فارمولے میں لفظ ماخذ کو اسی معنوں میں سمجھا جائے) تلاش کرنے کی ابتدائی کوششوں میں جن چیزوں سے مرعوب ہوا وہ ماہ و سال، ستارے، روشنی اور پانی جیسی ضروریات کے ماخذ، اپنے پیشے مثلاً زراعت وغیرہ تھے یا پھر غیب کے بارے میں داخلی تاثرات تھے جنہیں تخیلات نے اسی دنیا کی مادی اشکال میں تبدیل و تحویل کر دیا تھا۔ فطرت کے مقابلے میں اپنے پر اس عدم اعتمادی یا بالفاظ دیگر فطرت کی غلامی کے اس رویے سے ایک انسان کے دوسرے کے مقابلے میں محکومی کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ وہ شخص جو فطرت کے مقابلے میں ذاتی قوتوں کو "بروئے کار" نہیں لا سکا وہ اپنی ہی طرح کے دوسرے انسانوں سے مقابلے میں ان سے دست بردار ہونے پر تیار ہو گا۔ اسی لئے بُت پرستی (جو کہ مذکورہ بالا ذہنی رویہ کے علاوہ اور کچھ نہیں یہ بت پرستی کسی بت کی موجودگی یا غیر موجودگی دونوں صورتوں میں ہو سکتی ہے۔ موخرالذکر شکل آجکل کے بعض انحطاط پذیر مسلمانوں میں رائج ہے) کے لازمی متعلقات، برہمنیت، رسومات کے روز افزوں لوازمات اور ذات پات میں بٹی ہوئی سوسائٹی ہے۔ ان سب وجوہات کا مجموعی تاثر اخلاقی احساسِ ذمہ داری کی موت کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ "انکار" کی صحیح اہمیت اس بات میں مضمر ہے کہ اس کی وجہ سے انسانوں کو فطرت کے متعلق وہ واحد صحیح رویہ حاصل ہو جاتا ہے جو سائنٹفک ترقی کے لئے ناگزیر ہے۔

مسلمان اس لحاظ سے بہت خوش قسمت ہیں کہ وہ انتہائی سازگار حالات میں سائنس کے حصول میں دل و جان سے لگے رہے یہاں تک کہ پوری تین یا چار صدیوں تک انہیں سائنس کے نمایاں نمائندہ کی حیثیت حاصل رہی۔ تاریخ نے ابھی یہ بات فراموش، نہیں کی ہے کہ یہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے یورپ میں اس وقت جدید سائنس کی شمع روشن کی تھی جب وہ جہالت اور وہم کی تاریکیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ یہ بات اس لحاظ سے اور بھی قابل ذکر ہے کہ اس کامیابی کو حاصل کرنے میں، انہیں مذہب سے رشتہ توڑنے کی ضرورت پیش نہیں آئی بلکہ خود مذہب کی طرف سے اس کی تحریک ہوتی۔ پس "انکار" دراصل ایک بنیادی ثقافتی رویہ ہے اور درجہ اول کی اہمیت کا مستحق ہے اور ہر طالب علم کو تجربہ گاہ میں داخل ہونے سے پہلے یہ رویہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ چاہے وہ اسے شعوری طور پر قبول کرے یا نہ کرے اور چاہے وہ انہیں الفاظ میں اس حقیقت کا اظہار کرے یا نہ کرے۔

آخر میں ہمیں اینگلز کی مذہب پر تنقید کو بھی یاد رکھنا چاہیے (Anti Duhring.) اس نے کہا ہے

"تمام مذاہب کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ انسانی ذہنوں میں ان بیرونی قوتوں کے خیالی انعکاس ہیں جو ان کی روز
زندگی پر تسلط رکھتی ہیں۔ یہ انعکاس ایسا ہوتا ہے جس میں ارضی طاقتیں، مافوق الفطری قوتوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔" یہ
الزام بالکل صحیح ہے اور اس حد تک تاریخی صداقت کا اظہار کرتی ہے بشرطیکہ اسے "تمام مذاہب" کے خلاف نہ سمجھا جائے! د
میں ایسے مذہب بھی گزرے ہیں جنھوں نے اس قسم کے مذاہب کے خلاف بغاوت کی ہے جو الحاد کے حامیوں کے پیش نظر تھا۔ یہ
قابل توجہ ہے کہ کمیونسٹ لٹریچر نمایاں طور پر اسلام کو نظر انداز کرتا ہے۔ بہرصورت مسلمان وہ ہے جس کے آگے یہ مادی کائنات
بھی تمام فطری قوتوں اور خدائی ترغیبات کے ساتھ دستبردار ہو چکی ہے۔ ارضی قوتوں کو مافوق الفطری قوتوں کی شکل اختیار
کرنے کی اجازت دینا ہی دراصل بت پرستی ہے جسے صحیح طور پر اسلام میں ایک لعنت تصور کیا گیا ہے۔

(ب) اقرار

اسلام فطرت کے دائرے سے آگے بڑھتا ہے اور اس سوال کا ایک جامع، مانع اور واضح جواب مہیا کر کے اخلاق کے لئے
بنیاد مہیا کرتا ہے جو انسانی ذہن، فکر اور عقل سلیم تک فطری طور پر آتا ہے اور جسے بعض اوقات محض شعوری کوششوں ہی سے
انسان دبا سکتا ہے [illegible]۔ یہ سوال انسان کے عام مذہبی فکر کی تاریخ میں اگر مستقل طور پر موجود نہیں ہے تو تب
بھی کثرت سے بار بار سامنے آتا رہا ہے۔ اسلام اس سوال کو ابھارتا اور توانائی بخشتا ہے اس سوال کو وہ نمایاں طور پر سامنے لاتا
ہے اور انسانی ذہن پر اسے اگر برابری کی حد تک مسلط کر دیتا ہے اور اس طرح وہ جواب حاصل کرتا ہے تاکہ زمین پر انسانی
زندگی کے پورے دائرہ کار پر اس کا مکمل اور موثر کنٹرول ہو سکے۔ جو شخص بھی احساس اور ذہن رکھتا ہے اور انہیں استعمال
کرنے کا شائق بھی نہیں ہے اسلام اس کے بارے میں یہ فرض کر لیتا ہے کہ اس سوال سے اس کا سابقہ پڑنا ناگزیر ہے ایک طرح
سے تمام ... سمجھتے ہیں کہ یہ وجدان سے تعلق رکھتا ہے اور بظاہر کوئی وجہ ایسی نہیں کہ اسے ناقابل اعتبار ٹھیرایا جا سکے۔

آئیے اب ہم اسلام کی بنیادی دلیل دیکھیں:۔

"کائنات کا مشاہدہ کرو اور اس مشاہدے میں اپنی ذات کو بھی نہ بھولو۔ یہ بات غور سے دیکھو کہ ہر شے فانی اور
ہر دم تغیر پذیر ہے۔ یہ تغیرات ایک نظم اور ترتیب کا پتہ دیتے ہیں کیا یہ اس کائنات کے ایک ہمیشہ اور خود سے موجود
خالق، کائنات کو ترتیب دینے اور کائنات کو سنبھالے رکھنے والی ہستی کی واضح نشانیاں نہیں ہیں؟" اس طرح اسلام میں
دینی سلسلہ کی ترتیب یوں ہو جاتی ہے:۔ کائنات۔ کائنات کا خالق۔ خالق کی رضا۔ خالق کی اطاعت۔

اس طرح اسلام تخلیق سے خالق کی طرف ذہن کو منتقل کرتا ہے۔ کائنات کو قرآن میں "آیت الٰہی" کہا گیا ہے۔
"مرئی اشیاء سے انعکاسی ربط انسانی ذہن کو غیر مرئی اشیاء کے فکری مشاہدے کے لئے تیار کرتا ہے۔" (اقبال) یہاں یہ بات
قابل ذکر ہے کہ قیاسی فلسفہ جس میں سلسلہ ترتیب مرئی اشیاء سے شروع ہو گیا ہو، اور غیر مرئی اشیاء (غیب) کے مشاہدہ کی
بلاواسطہ کوشش کی جائے اسلام سے مطابقت نہیں رکھتا۔ بعینہٖ اس نقطۂ نظر سے اقبال نے ان یونانی مفکرین پر تنقید کی
ہے جو انسان، انسانی فکر اور فطرت میں صحیح رشتہ قائم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ یہ استقرائی طریقہ جو یورپ میں مسلمانوں
کے ذریعہ پہنچا اور جس نے موجودہ سائنس اور تہذیب کو جنم دیا۔ بنیادی طور پر اس اسلامی ذہن کی پیداوار تھی جس کی پرورش
رسول کریم ؐ کی اس حدیث کی روشنی میں ہوئی تھی:۔

"اللہ پر نہیں بلکہ اس کی تخلیق پر غور کرو۔"

اس سے جو اہم نتیجہ ثقافت اور تہذیب کے لئے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ اخلاقی ترقی میں مادہ بذات خود کوئی رکاوٹ نہیں ہے اسلام انسانی زندگی کی دو خانوں (مادی اور روحانی) میں مصنوعی تقسیم کو (جو محض ظنی اور قیاسی ہے) بالکل تسلیم نہیں کرتا۔ ایک مکمل سرگرم اور مسرت (ایک مناسب حد تک جسمانی مسرتیں بھی اس مفہوم میں شامل ہیں) اور غوغے بھرپور زندگی میں اپنا اخلاقی شعور زندہ رکھ کر ہی کوئی مسلمان کسی جزا کا مستحق ہو سکتا ہے۔ دنیا سے ترک تعلق کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم اس نکتے کی وضاحت بعد میں کسی جگہ کریں گے۔

ذہن کا فوری طور پر فن سے فنکار کی طرف منتقل ہونا ایک مسلمان کی روزمرہ کی زندگی میں کئی دلچسپ طریقوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایک کسی حسین شے کو دیکھ کر بے ساختگی میں سبحان اللہ کا مخصوص کلمہ ہی زبان سے نکلتا ہے۔ موجودہ دور کی کوئی حسینہ جو ہر طرح کے برجستہ اور غیر سنجیدہ تحسین کے کلمات اپنی ذات کے بارے میں سننے کی عادی ہو، شاید اس سے ناراض ہی ہو جائے۔ ایک مسلمان قدردانی حسن اور حسن سے "باادب محبت" کرنے میں کبھی پیچھے نہیں ہے بات صرف اتنی ہے کہ وہ دنیا کی کسی بھی دلچسپی میں حصہ نہیں لے گا جب تک کہ وہ اس خالق کو یاد نہ کرے اور اس کی مناسب تعریف نہ کرے۔ خالق کا یہ تصور جس کے ساتھ ہے اس کی رضا کے احکامات اور اس کے ممنوعہ حدود کا تصور بھی لازمی طور پر آتا ہے اُس اخلاقی مقصد کے حصول میں، ایک موثر ضمانت کے طور پر نمایاں حیثیت سے کام دیتا ہے جو دوسرے بہت سے اخلاقی نظاموں کے پیش نظر ہو جاتا ہے اور جس کی وجہ سے وہ مختلف درجوں میں ترک دنیا کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی بدھ راہب اپنے دوپہر کا سادہ سا کھانا (جو اس نے کسی ساتھ والے قصبہ سے اپنے کشکول میں جمع کیا ہو) کھاتا ہے کسی مسلمان کو (جو بظاہر کسی نفس کشی کے بغیر دوپہر کے کھانے سے لطف اندوز ہوتا ہے (جو ایسی بیٹھ غیر معتدل یا زندگی کے اخلاقی مقصد سے غافل قرار دے تو یہ صحیح طور پر منشائے اسلام نہ سمجھنے کا نتیجہ ہوگا۔ جس وقت بدھ راہب خوراک کو خاک سمجھتے ہوئے ایک ایک لقمہ لیتے ہوئے اور اپنے آپ سے یہ کہتے ہوئے کہ میں خاک کو خاک ہی کے سپرد کر رہا ہوں۔ اپنا کھانا کھاتا ہے اس وقت مسلمان کو قرآن کی وہ آیت یاد آتی ہے جس میں کہا گیا ہے۔ "کیا یہ غذا ہم نے پیدا کی ہے یا تم نے؟" اگرچہ اس کی کوئی رسم تو نہیں ہے پھر بھی مسلمان کھانے کا اختتام "...... " پر کرے گا۔ خوراک کو خالق کی طرف سے انعام سمجھنے کی وجہ سے عاجزی کا رویہ پیدا ہوتا ہے جو ایک ثقافتی رویہ ہے اور محض ذہن کی ایک صفت ہے اور جو دولت مندوں اور بڑے آدمیوں میں غرور اور خود پسندی کے لئے کافی حد تک روک کا کام دیتا ہے۔

دولت

آیئے دیکھیں کہ یہی رویہ دوسرے حالات میں کس طرح کام دیتا ہے، یہ بات نہایت آسانی سے فرض کر لی جاتی ہے کہ غربت اور مشقت انسان کی اخلاقی ترقی میں مدد دیتی ہے۔ لیکن ان کا انحصار دراصل اس ثقافتی رویہ پر ہے جو کسی شخص نے پہلے ہی سے اختیار کر لیا ہو اور جس میں مصائب اور برے حالات کا سامنا کرنا بتایا گیا ہو۔ یہ ایک عام تجربہ ہے کہ بدقسمتی ناکامی اور مایوسی کے مواقع پر لوگ چیخ و پکار کرتے یا کفریہ کلمے بکتے ہیں بلکہ بعض لوگ تو پاگل ہو جاتے ہیں۔ اگر ایسے حالات میں کوئی شخص خاموشی اور معتدل مزاجی کا ثبوت دیتا ہے اور مصائب اور تنگدستی کو ذہنی سکون کے ساتھ برداشت کرتا ہے تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ اس نے پہلے ہی سے اسی طریقے پر عمل کرنا سیکھ رکھا ہے اور اس طریقہ کو اپنے لئے پسند کر لیا ہے۔ اس ثقافتی رویہ کے لئے وہ اپنے مذہب۔ فلسفے۔ نظریہ حیات یا پھر اپنی فکر اور قوت ارادی کا احسان مند ہے نہ کہ اُن حالات کا

جن میں اسی سے اس رویہ کا اظہار ہوتا ہے۔ اس مفروضہ میں وہی مغالطہ ہے جس کا مشاہدہ ہم ایمان حاصل کرنے کے لئے عبادت کی تجویز کے سلسلہ میں کر چکے ہیں۔ (ملاحظہ ہو حاشیہ ۱) چنانچہ جب کوئی مسلمان عزیز و اقربا میں سے کسی کی موت کی خبر سنتا ہے تو صرف "انا للّٰہ" کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے چیخنا۔ چلانا۔ ماتم کرنا۔ سیاہ ماتمی لباس پہننا بلکہ پریشان صورت بنانا بھی ممنوع ہے۔ مختصر یہ کہ بے صبری کی کوئی بھی حرکت اصل منبع "خیر و شر" کی یاد میں فروگزاشت متصور کی جاتی ہے۔ چنانچہ تنگدستی میں صبر اور خوشحالی میں ضبط دراصل ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں اور یہ دونوں دراصل اسی ثقافتی رویے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ تنگدستی اور خوشحالی دونوں ہی اس رویہ کو نشو و نما دے سکتی ہیں۔

غربت کو اسلام میں ارفع مقام نہ دینے کی وجہ (اسلام میں غربت کو انسانی جسم کی بیماری کے مماثل قرار دیا گیا ہے جو مرغوب اور مطلوب نہیں ہے بلکہ انسانوں کو اپنے نفس اور معاشرے کو اس سے بچانے کے لئے اس کے "علاج" کی سنجیدہ کوشش کرنی چاہیئے) صرف یہ ہے کہ اسلام نے خوشحالی اور دولت مندی کو "آقرب" کی ایک سخت آزمائش میں تبدیل کر دیا ہے۔ غربت کو تقویٰ کا معیار قرار دینے کی بجائے اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ غربت پر قناعت کرنا دراصل رب العالمین پر ایمان نہ ہونے کے مترادف ہے "تحفہ دینے والا ہاتھ وصول کرنے والے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے"۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ کسی انسان کا مادی ذرائع پر اختیار اسے اپنی انسان دوستی کی اخلاقی حس کو تسکین دینے اور معاشرے کی بہبود سے لگاؤ کو عملی شکل دینے کے بہتر مواقع میسر آتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت کا اعتراف ہے کہ ہندوستان کے اُن سادھوؤں نے جنہیں کبھی پنڈت نہرو قوم پر بار ہونے کے سبب سے لعن طعن کیا کرتے تھے حال ہی میں فیصلہ کیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک سوسائٹی کی شکل میں منظم کریں گے اور حکومت ہند کے دوسرے پنجسالہ پلان کی کامیابی کے لئے کام کریں گے۔ پریس نے اس فیصلہ کو ماضی کے مقاصد زندگی سے بنیادی انحراف قرار دیتے ہوئے خوش آمدید کہا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بات بھی ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی امید بھی کی جاتی ہے کہ یہ بات اسلامی نقطۂ نظر کو سمجھنے میں اُسی طرح مددگار ثابت ہو جس طرح مکمل امتناع شراب کے پروگرام سے مسٹر گاندھی کے لگاؤ نے ایک صحیح اسلامی نیکی کو ایک غیر مسلم معاشرہ میں رواج دینے میں مدد کی تھی۔ چنانچہ کسی مسلمان کے بارے میں کوئی رائے اُس دولت کی مقدار سے نہیں قائم کی جائے گی جسے وہ جائز ذرائع سے حاصل کرتا ہے۔ (اسی سلسلے میں جو قوانین ہیں انہیں بالکل بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا) بلکہ جو رائے بھی قائم کی جائے گی وہ اس دولت کے استعمال کی روشنی میں کی جائے گی۔ ماہرین اقتصادیات پر یہ حقیقت واضح ہوتی جا رہی ہے کہ سوشلزم زیادہ تر احساس کا مسئلہ ہے اور اس کی اصل بنیادیں دراصل محرکات کی تہذیب و تربیت اور دوسروں کے بارے میں اپنی ذمہ داریوں کے احساس کا دل نشین ہونا ہے اگرچہ انسان کی اقتصادی سرگرمیوں کو قابو میں رکھنے والے قوانین کی بالائی عمارت بھی اپنی جگہ برابر کی توجہ کی مستحق ہے کمیونزم نے اس مسئلے کو محض ریاضی اور اعداد و شمار کا مسئلہ سمجھنے میں بنیادی غلطی کی ہے۔ اسلام میں انسانوں کی جسمانی، ذہنی اور مزاجی صلاحیتوں کے ناقابل تردید، ناقابل محو اور فطری اختلافات کی وجہ سے تقسیم دولت میں اختلاف کے باوجود اگر کوئی طبقاتی منافرت نہیں ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مذہب ایک خواب آور چیز ہے بلکہ یہ ہے کہ عملی دنیا میں مذہب نسبتاً زیادہ دولت رکھنے والے لوگوں میں شقاوت قلبی اور نسبتاً کم دولت رکھنے والے لوگوں میں حسد کی بنیادوں ہی کو ختم کر دیتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں "محرومین" (وہ طبقہ جو روزی کے کم سے کم معیار سے بھی محروم کر دیا گیا ہو) تو بالکل ہی ناقابل تصور ہیں یہ صورت حال جو اشتراکی مفکرین کا موضوع فکر تھی یعنی یورپ میں ایک صنعتی انقلاب جو جاگیردارانہ نظام کی متزلزل بنیادوں پر استوار ہو رہا تھا جبکہ عیسائیت کے تمام مفید اثرات صرف ذاتی زندگی اور

اتوار کی عبادت تک محدود ہو کر رہ گئے تھے لازمی طور پر آفاقی نہیں ہے اور اس کی کوئی مذہبی یا تاریخی ضرورت بھی نہیں ہے اس صورت حال کو پھیلا کر سب جگہ اس کا اطلاق کرنا اگر بد دیانتی نہیں تو تنگ نظری تو ضرور ہے۔ آخر میں ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ایک مسلمان کے لئے تمام تر رحمت کی علامت "اقرار" ہے ("لا" کی نفی کے بعد "الا اللہ" کا اقرار)

فن تعمیر کے بارے میں بھی اسلام میں ایسی ہی آزادی ہے۔ مسلمان جس خیمۂ افلاک کے نیچے نماز ادا کر سکتا ہے اسی طرح کسی بھی انسان کی بنی ہوئی چھت کے نیچے سر بسجود ہو سکتا ہے خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب یروشلم پر قبضہ کیا تو انھوں نے گرجا کے اندر بھی نماز پڑھنے میں کوئی ہرج نہ سمجھا۔ اگرچہ عملاً انھوں نے یہ نہ کیا اور وہ اس لئے کہ بعد کے مسلمان اسے مثال بنا کر گرجوں میں نماز ادا کرنا نہ شروع کر دیں کیوں کہ اس طرح عیسائیوں کے حقوق پر ضرب پڑتی تھی۔ مسلمانوں نے پورے اعتماد کے ساتھ رومیوں سے سیکھا اور اس طرح فن تعمیر میں نئے نئے اضافے کئے۔ مغرب میں، اسپین میں اور مشرق میں ہندوستان میں یہ نیا فن اپنے عروج کو پہنچا۔ اور اسے بجا طور پر مسلمانوں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ مسلمان انہیں پسند کرتے ہیں لیکن انھوں نے اس سے کبھی کوئی تقدس وابستہ نہیں کیا، یہ عمارتیں فن تعمیر کا شاہکار ہیں لیکن معاند نہیں۔ مسلمان اس بات کو پوری دیانتداری سے تسلیم کرے گا کہ اسلام میں مقبروں کا کوئی مقام نہیں اور عمارتوں میں سونے اور ہیروں کی آرائش (بالخصوص مساجد میں) اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں ہے

جہاں تک رنگ و نسل کا تعلق ہے، اسلام میں فی الواقع ان کے لئے کوئی مقام نہیں۔ لیکن یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ زبان، لباس اور دیگر ظواہر کی اہمیت اس صورت میں بہت بڑھ جاتی ہے جب [illegible] نہیں [illegible] احساس کمتری یا اصحاب اقتدار (مراد لازماً سفید فام لوگوں سے نہیں) تک حصول جاہ کے جذبے سے اختیار کی جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قومی زندگی کے اسی پہلو کو سمجھ کر فرمایا تھا کہ "جو شخص جس کی نقالی کرتا ہے وہ انہی میں سے ہے" (یعنی اپنے گروہ سے علیحدہ ہے)۔ لیکن اس مسئلے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جسے اکثر اوقات نظر انداز کر دیا جاتا ہے، اور وہ یہ کہ یہی [illegible] (احساس کمتری) [illegible] سے بڑھتے ہوئے حساس رویہ کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور بڑھتے بڑھتے شیخی خوری تک پہنچ جاتا ہے۔

یہ رویہ رفتہ رفتہ نہایت بے بنیاد اور شدید تعصب کو جنم دیتا ہے جو فنی ترقیوں اور زندگی کی آسائشوں کے بڑھتے ہوئے وسائل سے فائدہ اٹھانے سے روک دیتا ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں گاندھی جی نے لیسی عجیب و غریب چیزیں پیدا کیں جو آج بھی مشہور علمائے تاریخ کے لئے معمہ بنی ہوئی ہیں حالانکہ مسٹر گاندھی عوام تو کیا نہیں ہندو پیروی کے دانشوروں میں بڑا اثر رکھتے ہیں۔ عدم تعاون کی تحریک کے زمانے میں کچھ ایسا حال تھا کہ لوگ چمچوں اور پلیٹوں کے استعمال سے نفرت کرنے لگے تھے۔ کرسیوں کی بجائے فرش کا استعمال، اور آرام دہ جوتوں و چھوٹے جسم پر لباس کو ترک کر دیا گیا تھا۔ البتہ پبلک جلسوں میں مائیکروفون کا استعمال اور اپنے قدامت پرستانہ پیغام کو جا بجا پہنچانے کے لئے ریلوں، موٹروں سے فائدہ اٹھانا عام تھا۔ اس کے برخلاف اسلام فنون، سائنس، صنعت اور ٹیکنک کی تمام ترقیوں کو اپنے معاشرے میں بڑی خوشی اور اعتماد کے ساتھ جذب کرنے کے لئے تیار ہے اور اس میں کسی مصنوعی فخر یا غرور کو دخل انداز ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ ایام جاہلیت میں عربوں کی ریگستانی زمین میں تہذیب و تمدن کی جھلکیاں بہت کم ملتی تھیں لیکن انھوں نے بڑی خوشی اور تشکر کے ساتھ علمی و فنی لحاظ سے دوسروں سے فائدہ اٹھایا۔ ان سے بھی جنھوں نے اسلام قبول کیا تھا اور ان سے جنھوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا ——— بلکہ ان سے بھی جو ہمیشہ اسلام کے معاند و مخالف رہے تھے اسلام کی طویل تاریخ میں کوئی ایسا موقع نہیں آیا کہ ان میں معاندانہ قدامت پرستی یا جھوٹے غرور نے جڑ پکڑی ہوں۔ وہ ہمیشہ انصاف

کی ترقی میں سائنسی اور تہذیبی اعتبار سے مدد کرنے کے خواہش مند رہے ہیں۔ ان کی کامیابی کسی اعتبار سے معمولی اور بے حیثیت شمار نہیں کی جا سکتیں۔ بلکہ جیسا کہ جارج سارٹن نے کہا ہے۔

قرون وسطیٰ کے تقریباً تین چار سو سال، ..... سائنس کی تاریخ میں اسلام کا عہد زریں کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ مختصر یہ کہ کسی مخصوص دور کے ذرائع پیداوار اور دیگر ظواہر کو زندہ کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہ اب بہت پیچھے دور میں رہ گئے ہیں جن علوم و فنون نے انہیں چھوڑا تھا جذباتی انداز میں ان کی عظمت کا پرچار۔ محض رجعت پسندانہ حرکت ہے جس کا انجام ناکامی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ سائنس اور تہذیب رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہیں اور ان پر کسی ایک گروہ یا کسی ایک قوم کا اجارہ نہیں ہے۔ تمام انکشافات اور ایجادات بشمول جوہری توانائی کے سربستہ راز کے انسانیت کا مشترکہ سرمایہ بن کر رہیں گے (کاش! انسانیت کا یہ مشترکہ سرمایہ اخلاق و روحانیت کی قدروں کا بھی حامل ہو سکے م۔ ق)

فضل احمد کریم فضلی

شعلہ و شبنم

دل سے خود پوچھ کہ تو جنسِ گراں ہے کہ نہیں
فکر کیا کوئی خریدار یہاں ہے کہ نہیں

ملال کا ہے کا فضلی ذرا یہ سوچ تو
تمہیں نہیں تو وہ کیا آزمائیں غیروں کو

حوصلہ میرا بڑھاتے ہیں وہی آ آ کر
وہ مصائب جو کیا کرتے ہیں ہمت شکنی

اجنبی سے نظر آتے ہیں ہم اپنے گھر میں
ساتھ رہتی ہے وطن میں بھی غریب الوطنی

ب مصائب سے بھی گھبراتے ہوئے ڈرتا ہے دل
وہ بڑھاتے ہوں نہ میری حوصلہ مندی کہیں

و قفس میں اور بھی شورِ عنادل بڑھ گیا
فطرتِ آزاد پر چلتی ہیں پابندی کہیں

برق گرتی ہے گرے اور آگ لگتی ہے لگے
اس طرح رکتا ہے کار آشیاں بندی کہیں

وہ سنگ سخت حوادث وہ شیشۂ احساس
یہ سخت تر ہے کہ تم ہیں اس پہ ہوش و حواس

بہار کے لئے دل خون کردیا لیکن
ہوا بہار کی آئی نہ عندلیب کو راس

کھلا یہ مجھ پہ بڑی تلخکامیوں کے بعد
کہ تلخیوں میں بھی ہوتی ہے اک طرح کی مٹھاس

کریں وہ مجھ پہ کرم یا ستم خوشی ان کی
مری زباں پہ نہیں کچھ سوائے شکر و سپاس

نہ زندگی میں سہی میرے بعد ہی وہ سہی
کبھی تو ہوگا زمانہ مرا بھی قدر شناس

اب ظرف کی یہ بات ہے جو بھی جسے مل جائے
دنیا میں خوشی بھی ہے بہت غم بھی بہت ہے

اچھا برا ہزار کہے غیر ہم کو کیا
اچھا تو بس وہی ہے وہ اچھا کہیں جسے

اپنے بھی اب تو مصلحت اندیش ہوگئے
فضلی یہی وہ چیز ہے دنیا کہیں جسے

ہر طرف میرا خیر مقدم ہے • ہر طرف دام ہر طرف صیاد

پھیر ہیں قسمت کے ورنہ • جیسے تم ہو ویسے ہم

وہ شانِ بے گناہی وہ آن بھولا ہی • ہم راہِ امتحاں میں کس بانکپن سے نکلے

کرم ہی سے ترے پھولوں سے دامن بھر گیا اپنا
کرم ہی سے ترے کچھ اور گنجائش نکل آئی

کس غریب کی کشتی غرق کی ہے موجوں نے
بج رہے ہیں طوفاں میں آج شادیانے سے

زندگی میں پہلے بھی کس قدر گراں جانی
روح ہو گئی ہلکی بارِ غم اٹھانے سے

کون سی تھی وہ بلا جو میرے گھر آئی نہیں
شکر ہے لیکن طبیعت میری گھبرائی نہیں

چوٹ کب ٹوٹے ہوئے دل نے مرے کھائی نہیں
یعنی کس دن میرے ہونٹوں پر ہنسی آئی نہیں

بارشِ سنگِ حوادث سر پہ ہوتی ہی رہی
میرے ماتھے پر بحمداللہ شکن آئی نہیں

یک قلم ہیں عظمتِ کردار انساں جی اٹھی
کون کہتا ہے حوادث میں مسیحائی نہیں

زندگی میں اب جو رعنائی ہے وہ پہلے نہ تھی
غم کی انگڑائی ہے یہ عشرت کی انگڑائی نہیں

غمزدوں کا صبر دیکھیں دیکھنے کی چیز تھی
آپ نے لیکن کبھی تکلیف فرمائی نہیں

کیا کریں ان کے تلون کا گلہ
حال پہلا سا ہمارا بھی نہیں

صرصرِ غم سرنگوں تو کیا بھلا کرتی مجھے
اور بھی کچھ میری شانِ کجکلاہی بڑھ گئی

تم کو فضلی گر اسی میں لطف آتا ہے تو لو
ان نگاہوں کی ادائے کم نگاہی بڑھ گئی

امتحاں اور بھی ہونا ہے تو ہاں اور سہی
سینکڑوں غم ہیں جہاں ایک وہاں اور سہی

اور ہو طوقِ گراں اور ہو زنجیر کڑی
ناز برداریِ آشفتہ سراں اور سہی

اور اے پھول مہک اور چہک اے بلبل
اک ذرا خاطرِ خونیں جگراں اور سہی

شدتِ غم میں بھی لازم ہے وسیع النظری
ساتھ ساتھ اپنے خیالِ دگراں اور سہی

محض شاعر ہی رقیبوں نے مجھے ٹھہرا دیا
اک مصیبت ہے مرا ذوقِ سخن میرے لئے

شاملِ حالِ غریباں جب ہے خود ان کی خوشی
پھر کہاں فضلی مجالِ دم زدن میرے لئے

اس نے اس انداز سے دیکھا مجھے
دیکھ کر میں دیکھتا ہی رہ گیا

وہ وقت آپڑا ہے کہ اوروں کو کیا کہیں
ہم سے بھی چاک اپنا گریباں نہ ہو سکا

فضلی اور حال اس کے سوا اور کیا کہیں
وہ اک چراغ تھا جو فروزاں نہ ہو سکا

جذبات و واردات

شفقت کاظمی

رابطہ اُن سے عقدۂ مشکل رہا
اک حجاب درمیاں حائل رہا

ہم اُسی کی یاد ہی میں کھو گئے
جو ہمیشہ ہم سے غافل رہا

روکشِ جنت مری محفل رہی
کوئی جب تک رونقِ محفل رہا

میں کہاں آسودگیٔ منزل کہاں
عمر بھر آوارۂ منزل رہا

درپئے دل بھی تھا وہ یادش بخیر
جو بظاہر غمگسارِ دل رہا

میرے اُٹھ آنے پہ شفقت دیر تک
ایک سناٹا سرِ محفل رہا

ڈاکٹر اختر

حقیقت تلخ تر ہوتی ہے جب اظہار ہوتا ہے
ابھی اک گھونٹ کا پینا بہت دشوار ہوتا ہے

کسی پر دوستی کی آڑ میں جب وار ہوتا ہے
تو انساں دوستوں کے نام سے بیزار ہوتا ہے

یہ سب کہنے کی باتیں ہیں یہ سب دعوے ہی دعوے ہیں
مصیبت میں کسی کا کب کوئی غمخوار ہوتا ہے

ہمارا تجربہ کچھ اور ہے اس دور میں لیکن
سنا کرتے تھے ہم شاعر بڑا خوددار ہوتا ہے

کبھی لفظوں سے بھی دل کی خلش ظاہر نہیں ہوتی
خموشی سے بھی دردِ عشق کا اظہار ہوتا ہے

جسے دیوانہ کہتے ہیں وہ دیوانہ نہیں اختر!
کہ دیوانہ بہ کارِ خود بڑا ہشیار ہوتا ہے

اشرف رفیع

رہِ حیات کے دشوار مرحلوں کی قسم
بجز ضمیر کوئی اب دلیلِ راہ نہیں

انہیں چمن پہ تصرف کا حق نہیں ہے جنہیں
گلوں سے ربط کہ کانٹوں سے رسم و راہ نہیں

ارشد امروہوی تو سہ

شانِ محمدؐ

حقیقت نشاں ہے زبانِ محمدؐ بیانِ خدا ہے بیانِ محمدؐ
بہاریں چمن در چمن بانٹتا ہے بہارآفریں گلستانِ محمدؐ
بنا سرمۂ چشم اہلِ دو عالم غبارِ رہِ کاروانِ محمدؐ
حقیقت تو یہ ہے سوائے خدا کے نہیں ہے کوئی رتبہ دانِ محمدؐ
سناتا رہے کوئی صبح ابد تک میں سنتا رہوں داستانِ محمدؐ
نہ ہو ہمنوا کیسے سازِ دو عالم خدا خود ہے جب ہمزبانِ محمدؐ
اگر امن چاہو تو اے دہر والو چلو تم پسِ کاروانِ محمدؐ
بڑی سونی سونی سی ہے بزمِ ہستی کہاں ہو تم اے عاشقانِ محمدؐ
خدا سے یہ اقرار کرتا ہوں ارشد
رہوں گا میں اب مدح خوانِ محمدؐ

ماہر القادری

شہادتِ معتبر

السلام اے صداقت کے پیغامبر
السلام اہلِ ذکر اور اہلِ خبر
السلام اے سکونِ دلِ فاطمہؓ
السلام اے محمدؐ کے نورِ نظر
ہے سعادت کی منزل ترا نقشِ پا
ہے ہدایت کا رستہ تری رہگذر
اک غریب و تہی دست کی نذر کیا
بس یہی اشک ہیں میرے لعل و گہر
اس طرف حق پسندی بہ ایں سادگی
اس طرف بادشاہی بصد کر و فر
اے قتیلِ جفا اے شہیدِ وفا
فتحمندی کا سہرا رہا تیرے سر
جان دی اور اس شان سے جان دی
خاک پر تھی جبیں عرش پر تھی نظر
نقش کرب و بلا اور ابھرا اور ابھر
بجھ نہ جائیں کہیں زندگی کے شرر
چھپ گئے خاک میں کتنے شمس و قمر
دیکھتے دیکھتے لٹ گیا گھر کا گھر
"العطش" بھی کہا اور "الحمد" بھی
غازیوں نے لبوں پر زباں پھیر کر
چند تیغیں تھیں اور جاں نثارانِ حق
زرہ و جوشن کہاں . کیسے خود و سپر
اور اس پر قیامت کی تھی تشنگی
کر دیا پھر بھی فوجوں کو زیر و زبر
یہ جوانانِ جنت کا سردار ہے
کربلا! اپنی قسمت پہ تو ناز کر
اس بہادر کی تو بے کسی پر نہ جا
اس کی نخوت کریہہ قربان فتح و ظفر
اس کا غم ہر زمانہ کی آسودگی
اس کی مظلومیت دہر کی چارہ گر
ہم بھی تاریخ کو ایک نظر دیکھ لیں
سامنے آئیں اربابِ نقد و نظر
ہر روایت غلط، ہر درایت غلط
یہ شہادت نہیں ہے اگر معتبر

ــــہ بہ تصرف شاعرانہ

روحِ انتخاب

بخاری و مسلم نے حضرت ابوہریرہؓ کی زبانی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بڑی معنی خیز حدیث ان الفاظ میں نقل کی ہے:-

ان مثلی ومثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل بنی بیتاً فحسنہ واجملہ الا موضع لبنۃ من زاویۃ فجعل الناس یطوفون بہ ویعجبون لہ ویقولون ھلا وضعت ھذہ اللبنۃ؟ فانا تلک اللبنۃ؟ وانا خاتم النبیین

میری اور مجھ سے پہلے کے انبیاء کی مثال یوں ہے کہ جیسے ایک شخص نے ایک نہایت عمدہ اور خوبصورت عمارت بنائی ہو اور اس کے کسی کونے میں ایک اینٹ کی جگہ خالی رکھی ہو۔ لوگ اس کو چاروں طرف دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں مگر یہ بھی کہتے ہوں کہ یہ اینٹ کیوں نہ رکھی گئی؟ بس سمجھ لو کہ وہ اینٹ میں ہی ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔

یہ فرمان نبوی ایک طرف تو ایک بڑی سچی حقیقت کو بیان کر رہا ہے اور دوسری جانب اسی سے بعض شکوک بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ سچی حقیقت تو یہ ہے کہ حضورؐ نے اپنی بالکل صحیح پوزیشن واضح فرما دی ہے اور شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس حدیث کے پیش نظر حضورؐ کی خدمات یہ پوزیشن اتنی ہی رہ جاتی ہے جتنی پوری عمارت میں ایک اینٹ ہو۔ اس وقت ہم انہی دو نکتوں پر گفتگو کریں گے

اپنی ذات ہو، یا کسی دوسرے کی شخصیت، صحیح پوزیشن کو واضح کرنے میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔ اصل حقیقت کے اظہار میں یا تو کچھ مبالغہ ہوتا ہے یا کمی۔ زیادتی ہو تو کبر ہو جاتا ہے اور خاکساری و انکسار کیا جائے تو کمی ہو جاتی ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک کسی سے کہتا ہے کہ "سبحان اللہ آپ تو بڑے عالم، متقی، پرہیزگار، ایسے اور ویسے ہیں۔ آپ جیسا انسان تو ہم نے آج تک نہیں دیکھا" وغیرہ وغیرہ اور وہ اس کے جواب میں کہے "نہیں جی میں تو کچھ بھی نہیں۔ تمہاری جوتیوں کی خاک بھی نہیں۔ مجھ سے زیادہ گناہگار تو دنیا میں کوئی نہ ہوگا" وغیرہ وغیرہ۔ تو ظاہر ہے کہ دونوں ہی جھوٹ بول رہے ہیں۔ حقیقت سے دونوں دور ہیں۔ ایک افراط میں پڑ گیا اور دوسرا تفریط کا شکار ہو گیا۔ صحیح پوزیشن کی وضاحت بڑی مشکل ہے۔ مگر صراط مستقیم کا تقاضا یہی ہے کہ اپنی یا دوسرے کی صحیح پوزیشن بیان کرنے میں نہ زیادتی ہو نہ کمی۔ اس کی ایک مثال قرآن پاک سے سن لیجیے۔

قل انما انا بشر مثلکم یوحی الی انما الٰھکم الٰہ واحد

کہہ دیجیے کہ میں تمہارے ہی جیسا بشر ہوں اور فرق صرف یہ ہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے کہ تمہارا الٰہ ایک ہی ہے۔

دیکھیے کتنی صحیح پوزیشن ہے جس میں نہ کوئی مبالغہ ہے نہ غلط خاکساری۔ جس طرح چاہیے اسے ٹھونک بجا کر دیکھ لیجیے۔ غلط بیانی کا ادنیٰ سے ادنیٰ شائبہ بھی اس کے اندر موجود نہیں۔ بس ایک سچی حقیقت اور ایک سراپا صداقت ہے جس کا اظہار ہو رہا ہے۔

عام طور پر انسانوں کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ وہ ان باتوں کا بھی کریڈٹ لینا چاہتا ہے جن میں اس کا کوئی حصہ نہ ہو۔ قرآن پاک نے انسان کی اس نفسی کیفیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ:-

یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا

وہ لوگ ان باتوں کے عوض بھی اپنی ستائش کے خواہش مند رہتے

.... ہیں جو انھوں نے سرے سے کی ہی نہ ہوں۔

اور یہ مرض تو بہت عام ہے کہ اپنی خدمات کو خواہ وہ بہت تھوڑی کیوں نہ ہوں۔ انسان بڑھا چڑھا کر مشہور کرتا ہے جسے موجودہ زبان میں "پروپیگنڈا" کہتے ہیں اور جو آجکل سب سے بڑا ہنر ہے۔ اگر اسے کہیں اس سے زیادہ خدمت نظر آئے تو وہ یہ کہتا ہے کہ یہ ہمارے ہی لگائے ہوئے پودے کے ثمرات ہیں گویا اس کے عوض بھی ستائش کے اصل مستحق ہم ہی ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اگر آپ کوئی نئی قابل قدر بات یا کام کریں تو بہت سے لوگ کہنے لگتے ہیں کہ:۔ ہم تو عرصہ دراز سے یہی کہتے چلے آئے ہیں، یا ہم اسے پہلے ہی لکھ چکے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام دعاوی کے اندر اصل نفسیاتی جذبہ یہی ہوتا ہے کہ ہر چیز کا کریڈٹ ہم کو ملے ایسے اونچے لوگ آپ کو بہت کم ملیں گے جو دوسروں کے فضل یا خدمات کا بھی اعتراف کریں اور اپنے لئے اتنی ہی ستائش پر قناعت کریں جتنی کہ وہ واقعی مستحق ہیں۔ اور ایسے لوگ تو بہت ہی خال خال نظر آئیں گے جو اپنے استحقاق سے زیادہ ستائش کو دیکھ کر یہ برملا کہدیں کہ اس کا اصل مستحق فلاں ہے۔ اور میرا حصہ اس میں اتنے سے زیادہ نہیں۔

ہماری صحافت میں تو یہ مرض بہت عام ہے کہ ہر صحافی کی اندرونی خواہش اور اس کے ساتھ دعویٰ بھی یہ ہوتا ہے کہ جو معقول بات ہو وہ میری زبان سے نکل سکتی ہے اور ہر غیر معقول بات دوسروں کی زبان سے نکلنی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی پر تنقید کرتے وقت اس کے صرف نامعقول حصے کو سامنے رکھتے ہیں اور اس کی خوبیوں کا کبھی اعتراف نہیں کرتے۔ تنقید کا یہ گھٹیا معیار ہمارے ہاں بہت ارزاں ہے اور عام ہے۔ اس کا نفسیاتی تجزیہ کیجئے تو اندر سے صرف یہی آرزو نکلے گی کہ ہر خوبی کا کریڈٹ ہمیں ملنا چاہیے۔

لیکن اعلیٰ کردار اور پختہ سیرت جس کے حصے میں آئی ہو اور اس کا دل ایسی غلط آرزوؤں سے بالکل پاک ہوتا ہے، وہ ہر حقیقت کا اظہار اس کے اصلی رنگ میں کرتا ہے۔ اس میں نہ زیادتی ہوتی ہے نہ کمی۔ نہ اپنے حق میں مبالغہ آمیز دعاوی اور نہ دوسروں کے اعتراف میں کوتاہی۔

اسی روشنی میں زیر بحث حدیث کو دیکھئے۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ:۔

> میری اور مجھ سے پہلے کے انبیاء کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک شخص ایک عمدہ اور حسین عمارت بنائے اور اس میں ایک اینٹ کی جگہ خالی رکھے لوگ اسے ہر طرف سے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں اور یہ کہہ رہے ہوں کہ اس اینٹ کی جگہ کیوں نہ پُر کی گئی۔ وہ اینٹ میں ہی ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔

اللہ اللہ! اس اعتراف حقیقت کو دیکھئے اور بار بار دیکھئے۔ کس طرح تمام انبیاء کی خدمات (Contributions) کا کھلے دل سے اعتراف ہے کہ دین کی عمارت میں تعمیر کرنے میں سب کا حصہ ہے۔ میرے ہاتھوں صرف دین کی تکمیل عمارت ہوئی ہے۔ اگر حضورؐ یہ فرماتے کہ عمارت کا آدھے سے زیادہ حصہ میں نے تعمیر کیا ہے تو مادر گیتی کا کونسا فرزند اسے جھٹلا سکتا تھا۔ کونسی تاریخ اس کی تکذیب کر سکتی تھی؟ اور اہل اسلام میں کون بدبخت اس سے انکار کر کے اپنے ایمان کو برباد کر سکتا تھا آج صحف آسمانی اور تاریخ انسانی میں انبیاء کی جو خدمات موجود ہیں انہیں دیکھتے ہوئے حضورؐ کا بڑے سے بڑا دعویٰ بھی تسلیم کر لیا جا سکتا تھا اور نوے فیصدی کریڈٹ حضورؐ کے حصے میں بہ آسانی آ سکتا تھا۔ لیکن عدل، اعتراف حق اور اظہار حقیقت کا کتنا اعلیٰ نمونہ ہے کہ نہ کسی کے فضل کے اعتراف میں کوئی کوتاہی ہے نہ اپنی خدمات کے اظہار میں کوئی مبالغہ۔

اس حدیث میں بڑی حقیقت یہ پوشیدہ ہے کہ تکمیل دین میں بھی ارتقائی منازل طے ہوتی رہی ہیں۔ عقل انسانی کے ساتھ ساتھ دینی تصورات میں ارتقا ہوتا رہا ہے۔ جب ایک عمارت بنتی ہے تو بنیاد ڈالنے سے لے کر تکمیل عمارت تک ہر قدم ارتقائی قدم ہی ہوتا ہے۔ عمارت دین کی تکمیل میں بھی یہی صورت رہی ہے۔ ہر پیغمبر نے ایک اینٹ رکھ کر اس مقصد کو آگے بڑھایا اور اسے تکمیل سے قریب تر کر دیا۔ لیکن پوری تکمیل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں سے ہوئی۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا

آج میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنا انعام پورا کر دیا اور تمہارے لئے بحیثیت دین کے اسلام کو پسند کیا۔

یہ اسلام ایک دین اور نظام زندگی کی حیثیت سے تمام انبیاء کا واحد دین تھا۔ سب کا دین اسلام ہی تھا اور سب نے اس عمارت کو پروان چڑھانے میں اپنی استطاعت بھر حصہ لیا مگر تکمیل و اختتام و اس نعمت کا اتمام محمد عربی ؐ کے حصے میں آیا اور نبوت کا مقصد پورا ہو گیا۔ لہٰذا نبوت بھی ختم ہو گئی۔ وَلٰکِنْ خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ

گویا معمار تو سب ہی پیغمبر ہیں لیکن آخری معمار خاتم النبیین ہیں۔ اب رہا یہ شک کہ حضور ؐ کی خدمات تو بس پوری عمارت میں ایک اینٹ کے برابر ہوئی، تو اسے اس طرح فرض کر لیجئے کہ اس تعمیر میں ایک لاکھ چوبیس ہزار (اگر اتنے ہی پیغمبر گزرے ہوں) معماروں نے حصہ لیا۔ کسی نے ایک روڑا رکھ دیا، کسی نے آدھی اینٹ اور کسی نے پوری اینٹ۔ خاتم الانبیاء نے پوری اینٹ رکھی اور وہ بھی ایسی جس کے بغیر پوری عمارت ہی ناقص تھی اور اس اینٹ کے رکھتے ہی پوری عمارت ہمیشہ کے لئے مکمل ہو گئی۔ حضور ؐ کی خدمات کی کمی کے متعلق تو اس وقت یہ شبہ کیا جا سکتا تھا جبکہ کسی اور نے حضور ؐ سے زیادہ پختہ اور بڑی اینٹ رکھی ہوتی۔ لہٰذا حضور ؐ کی رکھی ہوئی اینٹ کو پوری عمارت کی نسبت سے دیکھنا صحیح نہیں۔ بلکہ اسے دوسری اینٹوں ہی کی نسبت سے دیکھنا چاہیے۔ اور اسے اس نقطۂ نظر سے بھی دیکھنا چاہیے کہ یہ ساری اینٹیں مل کر بھی تکمیل عمارت نہیں کرتیں۔ اور حضور ؐ کے ہاتھوں جو اینٹ رکھی گئی وہ تکمیل دین کا سبب بنی۔

(گلستان حدیث ۔ مولانا شاہ محمد جعفر پھلواری)

*

ہماری نظر میں

ریاض الصالحین (جلد اول) مرتبہ:- امام ابن شرف نوویؒ۔ ترجمہ و فوائد:- مولانا عبدالرحمٰن صدیقی کاندھلوی۔ ضخامت ۴۰۲ صفحات (بڑا سائز) مجلد رنگین و حسین گرد پوش کے ساتھ، قیمت دس روپے۔

ملنے کا پتہ:- محمد سعید اینڈ سنز، قرآن محل مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی۔

مشہور محدث حافظ محی الدین ابی زکریا یحییٰ بن شرف نووی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۶۷۶ھ) کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، زہد و تقویٰ، علم و عمل، دینی بصیرت اور خاص طور سے تفقہ فی الحدیث میں آپ اپنے دور کے "امام" تھے۔ محدث نوویؒ نے احادیث رسول ﷺ کا ایک بے نظیر مجموعہ ــــــ ریاض الصالحین ــــــ کے نام سے مرتب فرمایا تھا، اس مجموعہ میں یہ التزام کیا گیا ہے کہ احادیث کے ہر باب کے آغاز میں قرآنی آیات جو اس موضوع سے متعلق ہیں درج کی گئی ہیں۔ اس طرح "ریاض الصالحین" چار سو تینتیس آیات قرآنی اور ایک ہزار آٹھ سو اکانوے احادیث نبوی ﷺ پر مشتمل ہو کر، دین و ایمان اور اخلاق و عمل کا بیش بہا ذخیرہ اور ایمان افروز مجموعہ بن گئی ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے "ریاض الصالحین" میں صحیح حدیثوں کا التزام فرمایا ہے اور صحاح ستہ سے باہر احادیث کے دوسرے مجموعوں میں جو صحیح احادیث ملی ہیں، ان کو بھی لے لیا ہے۔

اردو ترجمہ آسان اور سہل ہے، .... فاضل مترجم نے ضروری فوائد و حواشی بھی درج کئے ہیں، اردو زبان میں "ریاض الصالحین" کا منتقل ہونا، اردو جاننے والوں کے لئے بیش بہا نعمت ہے! اس کتاب کی ایک ایک سطر عنوانِ عمل، نظامِ زندگی اور حرزِ جان بنائے جانے کی مستحق ہے کہ دین نام ہی "اتباعِ رسول ﷺ" کا ہے ــــــ آج جو مفسدین "اطاعتِ رسول ﷺ" کو طرح طرح سے مشتبہ بنا رہے ہیں، ان کی مفسدہ پردازیوں کا توڑ اسی طرح سے ہو سکتا ہے کہ احادیث نبوی ﷺ کا زیادہ سے زیادہ تذکرہ کیا جائے، اور نہ صرف اشاعت و تذکرہ بلکہ "عمل" بھی!

مقالاتِ احسانی از:- مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم، ضخامت ۲۹۶ صفحات (مجلد، گرد پوش کے ساتھ) قیمت چار روپے آٹھ آنے، ملنے کا پتہ:- ادارہ مجلس علمی، پوسٹ بکس ۶۸۰۳ نذیری ویدر ناور کراچی

یہ کتاب حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے "تصوف و احسان" پر چند بلند پایہ اور روح پرور مضامین کا مجموعہ ہے، کتاب کے شروع میں فاضل مصنف کی زندگی کے مختصر حالات جناب غلام محمد صاحب حیدرآبادی نے قلمبند کئے ہیں۔ "مقالاتِ احسانی" کے موضوعات حسب ذیل ہیں:-

تصوف کے دو طریقے ــــــ طریقۂ غزالیہ ــــــ اختلاف سلاسل کی حیثیت ــــــ طریقۂ اشغال متعلقہ بالاطلاق تصوف ــــــ ابن تیمیہؒ کا "نظریۂ مخدومیت" ــــــ اور، "مجالس نشینیں یا دل کا چین"!

مولانا گیلانی قدس سرہٗ کوئی شک نہیں ایک عالم باعمل تھے، اور ان کی زندگی میں بڑا جذب و سوز پایا جاتا تھا، اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی کا موصوف اپنے اندر بے پناہ جذبہ رکھتے تھے، ان کی شخصیت معلومات کا لق و دق صحرا تھی کہ لکھتے ہیں

بعض اوقات وہ خود بھی نہ جانے کن وادیوں میں نکل جاتے تصوف سے انہیں خاص لگاؤ تھا، اس کتاب کے تمام مقالات میں لگاؤ اور ربط و تعلق کا مظہر ہیں۔

مولانا گیلانی کے یہ تمام مقالات ادب و انشا کے اعتبار سے بلند پایہ، معلومات کے لحاظ سے بہت وزنی اور دینی نقطۂ نگاہ سے مفید ہیں! تصوف کی جو تعلیمات کتاب و سنت کے مطابق ہیں، اور تصوف کے جن اشکالات اور رموز و غوامض کی شریعت کے مطابق تاویل و توجیہہ ہو سکتی ہے، ان کی مخالفت کوئی حق پسند نہیں کر سکتا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ پر مولانا گیلانی کا مقالہ مفصل ہی نہیں معلومات آفریں بھی ہے، شبلی کی "الغزالی" میں بھی تصوف کے موضوع پر اتنا مواد نہیں مل سکتا! مولانا گیلانی نے اسلام کی چھٹی صدی کو "امام غزالی کی صدی" کہا ہے اور ثابت کیا ہے کہ اس دور کے علماء، صوفیا، سلاطین، وزراء، غرض تمام خواص و عوام کسی نہ کسی حیثیت سے افکارِ غزالی سے ضرور متاثر ہوتے ہیں۔

مولانا گیلانی، حضرت امام غزالی کے بہت بڑے مداح اور عقیدت مند ہیں مگر غزالی کے یہاں احادیث کے بارے میں جو عدم احتیاط اور تساہل پایا جاتا ہے، اس کو انھوں نے چھپایا نہیں بلکہ ظاہر کر دیا ہے۔

> "سب سے زیادہ حدیثوں کے باب میں ان کی کتابیں بدنام ہیں، لیکن یہ اُن کا نہیں ابو طالب مکی کا قصور ہے، "قوت القلوب" میں جن رطب و یابس روایتوں کو اس شخص نے استعمال کیا تھا، آنکھیں بند کر کے امام ان کو نقل کرتے چلے گئے"

مولانا گیلانی نے یہ بھی لکھا ہے کہ "اخلاق کی تقسیم میں امام (غزالی) ارسطو کے قاعدۂ توسط سے متاثر ہیں"۔

امام غزالی کے افکار و خیالات کی مقبولیت اور اثر آفرینی کے ساتھ، ان کے خلاف آوازیں اُٹھیں اور قاضی عیاض نے تو یہ فتویٰ تک دیدیا کہ "غزالی کی کتابیں جلا ڈالی جائیں"۔

مولانا گیلانی نے المحاسبی کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے کہ ان کی کتابوں نے ہل چل پیدا کر دی، حارث (المحاسبی) کی شخصیت کیا تھی، اس کا حال فاضل گیلانی کی زبان سے سنئے:-

> "جہاں تک میرا خیال ہے، تصوف اور صوفیت کا وہ خاص طریقہ جس کی نمائندگی امام احمد کے زمانے میں حارث اور حارث کے اصحاب کر رہے تھے، بعد کو امام غزالی نے اسی طریقہ کا اختیار فرمایا"

اس کتاب کا آخری مضمون ——— مجالس الشیخین یا دل کا چین ——— ان تمام مقالات کی جان ہے، اس مقالہ میں مولانا گیلانی نے شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا روم قدس سرہٗ کے افکار کی بڑے ہی دل نشین اور موثر انداز میں ترجمانی کی ہے، فتوحات مکیہ اور مثنوی کے بعض مقامات کی یہ تشریحات روح کو وجد میں لاتی ہیں۔ شیخ اکبر نے کتنی سچی اور سلجھی ہوئی بات کہی ہے۔

> "موجودات میں غور و فکر اس لئے کرنا کہ وہ خود کیا ہیں! یا کن حقائق پر مشتمل ہیں آدمی اس کا مکلف نہیں ہے، بلکہ کس چیز پر دلالت کر رہے ہیں اور ان سے راہ نمائی کس مسئلہ کی طرف ہوتی ہے، موجودات کے متعلق یہی فکر مطلوب ہے"

مولانا گیلانی مرحوم اللہ کے فضل سے کتاب و سنت پر عامل تھے، اس لئے وہ تصوف کے مخالف علماء اور اہل فکر کا بھی احترام

کرتے ہیں، اس کتاب میں انھوں نے علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے "نظریہ مجذوبیت" پر گرفت کی ہے مگر حرم کو ملوظ رکھا ہے۔

"بلا خوف تردید یہ دعوی کیا جاسکتا ہے کہ صوفیہ کے مختلف طرق و سلاسل میں جن اشغال اور ان کے نتائج و ثمرات کا تذکرہ کیا جاتا ہے، نہ صرف ان کے کلیات بلکہ جزئیات تک کی تائید قرآنی نصوص اور آثار و روایات سے ہوتی ہے۔" (صفحہ ۲۲۲)

مولانا گیلانی کا یہ دعویٰ بہت کچھ مبالغہ آمیز ہے، اس قدر قطعیت کے ساتھ حتمی انداز میں اُن جیسے محقق و مبصر کو ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی، صوفیاء کرام کے نہ جانے کتنے احوال، مکاشفات، اشغال و معمولات ایسے ہیں جن میں سخت اضطرابات پائے جاتے ہیں اور کتاب و سنت سے ان کی پوری طرح تصدیق و تائید نہیں ہوتی،

صفحہ ۴۰۶ پر شیخ اکبر کے حوالے سے جو یہ لکھا ہے:-

"اللہ کے بندوں میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے کہ ترقی کرتے ہوئے حق تعالیٰ کی تخلیقی صفت یعنی "کُن" کے ذریعہ سے چیزوں کو پیدا کرنے کی قدرت جو حق تعالیٰ میں پائی جاتی ہے، اس کمال تک پہنچنے میں وہ کامیاب ہوئے، حالانکہ خلاق کمالات میں یہ آخری کمال ہونے کی حیثیت رکھتا ہے (جنت کی زندگی میں اللہ کے نیک بندوں میں یہ کمال ظہور پذیر ہوگا")۔

عبد و معبود کے کمالات میں اس طرح "مماثلت" پیدا کرنے کی کوشش اور اس طرح سوچنے کا انداز ہی خطرناک ہے، "تصوف" کو اسی انداز فکر نے بدنام کیا ہے۔

"اور یہی حال مجذوبیت کا بھی ہے بلکہ "مجذوبیت" تو ولایت ہی کی راہوں میں سے ایک عام اور مسلّمہ راہ ہے، خاکسار نے آج سے تیس سال قبل حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی سوانح عمری میں اپنا یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ مسلمانوں میں "مجاذیب و بہالیل" فقراء کا جو یک سلسلہ پایا جاتا ہے، عہد صحابہ میں اس طبقہ کے خصوصی آثار کا بہت بڑا حصہ حضرت ابوذر صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ملتا ہے" (صفحہ ۳۴)

مسلمانوں میں "مجاذیب و بہالیل" کیا "مسلا سہاگن" قسم کے فقراء بھی پائے جاتے رہے ہیں، اور ملنگوں کے بہت سے تکیوں پر گانجے، سلفے اور چرس کا بھی اہتمام رہتا ہے! مگر "اسلام" کو نہ اس قسم کے بہروپ، سوانگوں اور ڈھکوسلوں سے کوئی تعلق ہے اور نہ اسلام میں "مجذوب و بہلول" قسم کی شخصیتوں کا کوئی وجود ملتا ہے! مسلمانوں میں بعض دیندار لوگ انگریز کے دور میں "فری میسن" بھی رہے، تو کیا ان "مسلم فری میسنوں" کے عقائد و اعمال کی "اسلام" سے تصویب کرائی جائے گی! جذب و سوز کا اپنی جگہ ایک مقام ہے مگر ایسا جذب و سوز جو آدمی کو غیر مکلف بنا دے، اسلام میں پسندیدہ نہیں ہو سکتا!

افسوس ہے کہ ایسے غیر مکلف اور لایعقل لوگوں کو، جو نہ نماز پڑھیں، نہ روزہ رکھیں، عورتوں کے سامنے برہنہ ہو کر پیشاب کر دیں، اول فول باتیں بکیں مگر کبھی کبھی کچھ "رموز" بھی ان کے منہ سے نکل جائیں، انہیں مسلمانوں میں "مجذوب" سمجھا گیا ہے، اور نہ جانے کتنے عقیدت مندان "مجاذیب" کو دیکھ کر شرعی پابندیوں سے بے پرواہ ہو گئے ہیں ـــــــ

ان مجاذیب کے سلسلہ کا پیوند حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے جوڑ دینا، بہت بڑی جسارت ہے اور مولانا گیلانی مرحوم

کی اس دماغی اپج کی کسی عنوان تحسین نہیں کی جاسکتی !

ہندوستان کے مشہور صوفی بزرگ مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ میں جو "جذب و سوز" پایا جاتا تھا وہ شریعت کا پابند تھا ——— اس قسم کے جذب و سوز پر کون حرف گیری کرسکتا ہے مگر بھارت کے ایک مشہور مجذوب کے جو احوال ان کے تذکروں میں ملتے ہیں، ان سے دین و اخلاق کی مطابقت نہیں ہوتی، افسوس ہے کہ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم اس قسم کے "مجذوب" کو بھی محترم سمجھتے تھے۔

گلستانِ حدیث

از:- مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی، ضخامت ۲۰۰ صفحات (مجلد گرد پوش کے ساتھ) قیمت دو روپے آٹھ آنے

ملنے کا پتہ:- ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ۲ کلب روڈ، لاہور۔

مولانا شاہ محمد جعفر ندوی پھلواروی، ادارۂ ثقافت اسلامیہ (لاہور) میں شامل ہونے سے قبل بھی علمی اور دینی حلقوں میں معروف تھے مگر "اسلام اور موسیقی" جیسی معرکہ آراء (؟) کتاب لکھنے کے بعد ان کی شہرت میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا ہے، مولانا موصوف نے اپنے ذوق کے مطابق چند احادیث منتخب فرماکر، ان کی تشریح کی تھی، یہ تشریحات مجلہ "ثقافت" (لاہور) کے متعدد شماروں میں شائع ہوتی رہیں اور ان کو پسند کیا گیا ——— ان مضامین کو اب یکجا کر کے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔

یہ کتاب ——— گلستانِ حدیث ——— چالیس منتخب احادیث کی تشریح و ترجمانی پر مشتمل ہے، تشریح میں فاضل شارح نے قرآنی آیات کے ساتھ اسی موضوع و مفہوم کی دوسری احادیث کو بھی پیش نظر رکھا ہے!

مولانا شاہ محمد جعفر پھلواری صاحب فکر و نظر عالم ہیں اور ان کی ذات دینی افکار کے اعتبار سے قدامت و جدت کا سنگم ہے، احادیث نبوی کی جس دل نشین انداز میں انھوں نے تشریح کی ہے، وہ انہی کا حصہ ہے! عربی مدارس میں بندھے ٹکے نصاب کی جو تعلیم دی جاتی ہے، وہاں طلباء کو احادیث نبوی کی یہ باریکیاں کہاں بتائی جاتی ہیں، مولانا موصوف کتاب و سنّت میں سالہا سال کے تفکر و تدبر کے بعد ارشادات نبوی کی ان وسعتوں اور گہرائیوں تک پہنچے ہیں! تشریح احادیث کرتے ہوئے عصر حاضر کا ذہن مولانا کے سامنے رہا ہے! ادب و انشاء کے اعتبار سے بھی یہ مضامین بہت بلند ہیں۔ ان احادیث کا زیادہ تر تعلق انسانی معاشرے سے ہے، تشریح میں ان اخلاقی کمزوریوں کو بھی گنایا گیا ہے۔ جو ہم مسلمانوں میں عرصہ سے چلی آرہی ہیں اور جن کی اصلاح کی طرف عوام کیا خواص کی بھی کم ہی نظر جاتی ہے! ان تمام مضامین کا محور یہ تخیل ہے کہ ایک دیندار مسلمان کو انسانی معاشرے کا مفید و کارآمد فرد ہونا چاہیے ——— ایمان و اسلام کے ساتھ ساتھ ——— خیر الناس ——— من ینفع الناس ——— کا عملی پیکر!

عبادات اور معاملات، حق اللہ اور حق العباد، دونوں اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں، ایسی عبادت، جو بندوں کے حقوق سے غافل کردے اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول نہیں ہوسکتی، اسی طرح بندوں کے حقوق کی ادائگی میں ایسا انہماک، جس میں حق اللہ سے غفلت پیدا ہوجائے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہوسکتا! عبادت و معاملات اور حق اللہ اور حق العباد ——— یہ وہ دوراہا ہے جس پر بعض پچھلے متقشف اہل فکر نے جس طرح ٹھوکر کھائی ہے، اسی طرح کی ٹھوکر

۱ "نعوذ باللہ حضورؐ حضرت عائشہ رضؓ کے ساتھ شیطانی فعل دیکھتے ہیں اور شیطانی گیت سنتے ہیں" (صفحہ ۲۰) اس جملہ کے ابتدائی حصہ میں نادانستہ طور پر ذم کا پہلو پیدا ہوگیا، آئندہ ایڈیشن میں اس جملہ کو درست کر دینا چاہیے (م - ق)

(اس دور کے "تجدد پسندوں" کو بھی لگی ہے ——— یہ کہ معاشرت و معاملت میں اس قدر توسع پیدا کیا گیا ہے کہ اسلامی
کی قدریں مجروح ہو گئی ہیں)۔

دینی مسائل میں ہم اجتہاد کے قائل ہیں، یہ بھی درست ہے کہ مسائل کے اجتہاد میں زمانہ کے تقاضوں کو ضرور ملحوظ
رکھنا چاہیے، یہ بھی صحیح ہے کہ حالات کی تبدیلی کا احکام پر بھی اثر پڑتا ہے مگر اس "اجتہاد وارتقاء" میں اس قدر غلو کہ اس کا ڈانڈا بہائیت
سے جا کر مل جائے، اسلام اور امت مسلمہ کے لئے کسی اعتبار سے بھی مفید نہیں ہو سکتا! "بہائی تحریک" اسی قسم کی تجزیر، فکر، رو
خیالی، توسع اور اجتہاد وارتقاء کی مدعی اور مظہر ہے! مثلاً عصر حاضر کے ذہن کو مطمئن کرنے کے لئے "بہائی فکر" نے "چار نکاح
کی اجازت" کو یکسر منسوخ کر کے، اس تعدد کو "توحد" تک محدود کر دیا۔ ——— "اسلامی اخوت" پر خط تنسیخ کھینچ کر
"انسانی اخوت" کو ابھارا ——— عوام کے ذوق کے مطابق "حجاب" کی قید کو اٹھا کر "بے حجابی" کی تعلیم دی ———
ملحدانہ تحریک اللہ کے فضل سے کامیاب نہ ہو سکی اور زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی لاکھ انسانوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ مگر خود
مسلمانوں کے بعض ذہین اور تجدد پسند افراد غیر شعوری طور پر اس تحریک سے متاثر ہو گئے، یا یوں کہیے کہ "بہائی افکار" سے ان کے
افکار کا توارد ہو گیا! یہ رقص و سرود اور سود کی اباحت، تعدد ازدواج کی مخالفت، عورتوں کی بے حجابی اور آرٹ کے نام پر تعل
کشی اور بت گری کی طرف میلان ——— اس کو اگر "بہائی افکار" کے مشابہ قرار دیا جائے تو یہ کوئی خلاف واقعہ بات
نہیں ہے۔

مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی کے افکار میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ میں شامل ہونے کے بعد جو تبدیلی پیدا ہوئی ہے
اور جو "تجدد" کا رنگ آیا ہے، اس کی جھلکیاں اس کتاب میں بھی ملتی ہیں! حیرت ہے کہ ایک طرف مولانا جعفر شاہ پھلواروی
حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی شان فقر وغنا اور زہد و ورع کے انتہائی مداح ہیں اور دوسری طرف تقدس کی اس بلندی
کے بعد مادی پستی کی اس انتہا تک پہنچ جاتے ہیں کہ "کمرشیل انٹرسٹ" (تجارتی سود) کے جواز میں ایک کتاب تصنیف فرماتے
صفحہ ۱۹۰ پر اس حدیث سے:-

جُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ طَهُوْرًا وَّمَسْجِدًا ——— میرے لئے ساری زمین مطہر اور مسجد بنا دی گئی ہے۔

یہ مفہوم پیدا کرنا کہ:-

"مسجد کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی، پس ساری زمین کو مسجد قرار دینے کا بھی یہی مطلب
ہے کہ معاشرے میں زمین کی انفرادی ملکیت کا تصور ختم کر کے اسے عام فائدے کے لئے
کھلا رکھا جائے......"

کس قدر غلط استنباط اور کس درجہ بعید از قیاس نکتہ آفرینی ہے جس کے پڑھنے سے بڑی اذیت ہوئی! اس حدیث میں "زمین
کی ملکیت یا عدم ملکیت" کے لئے کوئی بعید ترین اشارہ بھی نہیں پایا جاتا، اس حدیث کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ پچھلی شریعتوں میں
"صلوٰۃ" کے لئے معابد و مساجد کی قید[1] تھی۔ نبی آخر کی شریعت میں اس قید کو اٹھا کر، تمام روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کے حضور
سجدہ کرنے کی اجازت دیدی گئی! مدینہ منورہ میں جب پہلی مسجد (یعنی مسجد نبوی) تعمیر ہوئی ہے تو حضورؐ نے زمین کے مالکوں کو
اس زمین کی (اور غالباً یہ زمین افتادہ تھی) قیمت ادا فرما کر، زمین کی "انفرادی ملکیت" کے جواز کا عملاً اعلان فرما دیا، اور

---

[1] یا لوگ مساجد کے مقابلہ میں دوسرے مقامات پر سجدہ کرتے ہوئے کراہت محسوس کرتے تھے۔

ہماری نظر سے کوئی ایسی آیت یا حدیث نہیں گزری جس سے حضورؐ کے اس عمل کو منسوخ قرار دیا جائے ۔ ــــــ اور ایسی ناسخ آیت و حدیث نہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر کوئی ایسا قول ہوتا تو مولانا پھلواری صاحب اُسے چھوڑ کر، حدیث کی معنوی تحریف کی زحمت کاہے کو گوارا فرماتے ۔

"آپ نے بے اجازت کسی گھر میں گھس جانے کے متعلق یہ احکام سن لئے، اب ذرا اپنے قومی کردار کا اس سے مقابلہ کیجئے، ہمارے ہاں یہ عام رواج ہے کہ کسی کے ہاں جانا ہو تو نہ پہلے سے کوئی اطلاع دی جاتی ہے اور نہ اجازت لی جاتی ہے .... اس کے مقابلہ میں ذرا مغربی قوموں کو دیکھیں تو ان کے ہاں یہ اخلاقی آداب پوری شدت سے برتے جاتے ہیں اور بے تکلف سے بے تکلف دوست کے ہاں بھی بے اطلاع و بے اجازت نہیں گھس پڑتے، سوال یہ ہے کہ اسلام کے حکم پر وہ چل رہے ہیں یا ہم ......" (صفحہ ۱۹۲)

بلاشبہ مغربی اقوام میں بعض اخلاقی خوبیاں پائی جاتی ہیں ــــــ وقت کی پابندی، کسی کے گھر میں بے اجازت داخل نہ ہونا، اپنے ذاتی مفاد کے لئے قوم و وطن سے غداری نہ کرنا ــــــ مگر ان چند خوبیوں کے ساتھ ان کی پوری زندگی میں اخلاق و اسلام کی قدروں کی نفی بلکہ بغاوت پائی جاتی ہے، لہٰذا ان کی بعض خوبیوں کے اعتراف میں ایسا رنگ اختیار نہ کرنا چاہیے کہ ان کو اسلام کا متبع ہی ثابت کر دیا جائے! مسلمان گھرانوں میں عورتوں کی آپس کی لڑائیوں کو بند کرنے کے لئے کیا... "مولفوں کے "اخلاق" کی مثال دینا مناسب ہے؟؟

من اطلع فی بیتِ قومٍ بغیرِ اذنِہم فقد حل لہم ان یفقئوا عینہ　　　اگر کوئی شخص کسی گھر میں بغیر اطلاع اچانک گھس جاتے تو گھر والوں کو اس کی آنکھ پھوڑ دینی چاہیے ۔ (صفحہ ۱۹۱)

اسی دوسری حدیث میں "اطلع" سے "جھانکنا" مراد ہے (یعنی کسی کے گھر میں جھانکتے ہوئے، گھر والے اگر جھانکنے والی کی آنکھ، پھوڑ دیں، تو ایسا کرنے پر (غالباً) فقہی نقطہ نگاہ سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا ۔

صفحہ ۱۸۳ پر امام عبدالغنی نابلسی کے قول کو جو پیش کیا گیا ہے :-

"جو بدعت حسنہ مقصود شرع کے مطابق ہو، اس کا نام بھی سنت ہی ہے ۔"

یہ بالکل غلط ہے، "بدعت" اپنی فطرت سے ضلالت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی، ہم نے انہی نابلسی صاحب کے بعض دوسرے اقوال بھی دیکھے ہیں، جو سنت خلجان میں ڈالنے والے ہیں! اکثر اہل بدعت انہی حضرت نابلسی کے اقوال سند میں لاتے رہیں ۔

ذہنی تربیت　مرتبہ:- سید شوکت علی (بی ملے، ایل، ٹی) ضخامت ۹۶ صفحات (رنگین، جاذب نظر سر ورق) قیمت ۱۲ ار (پانچ نئے پیسے) ملنے کا پتہ:- مرکزی جماعت اسلامی ہند، رام پور (یوپی)

اس کتاب میں بچوں کی دلچسپی اور دلچسپی کے ساتھ ذہن و فکر کو تیز کرنے کے لئے ایسے سوالات اور ان کے جوابات درج کئے گئے ہیں، جو ہلکے پھلکے معمے، چٹکلے بلکہ لطیفے بن گئے ہیں ــــــ مثلاً :-

کون سا درخت بڑا ہونے پر بھی آدھا ہی رہتا ہے ــــــ جواب :- نیم!

بیماری سے کون خوش ہوتا ہے؟ ــــــ جواب :- ڈاکٹر!

عینک میں "عین" کے بعد کون سا حرف ہے! ——— جواب :۔ ک!

بے ایمان بننے کی "تمانرو" الٹ دو تو کیا ملے ——— جواب :۔ وزارت!

انگریزی زبان میں تو اس قسم کی کتابیں ملتی ہیں مگر اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو بچوں کی تشحیذ فکر اور ذہنی تربیت کے لئے لکھی گئی ہے، گھروں میں اس کتاب کے سوالات بچوں ہی نہیں جوانوں اور بڑے بوڑھوں کو کئی دن کی طویل صحبتوں کی دلچسپی کے لئے کافی ہیں!

رُوحِ قرآن یا اصل اسلام

از :۔ عبداللہ یقین حسنی، ضخامت ۹۲ صفحات (بڑا سائز) قیمت ایک روپیہ۔
ملنے کا پتہ :۔ حسن لائبریری، اقبال روڈ، ٹنڈو آدم۔

اس کتاب میں قرآنی آیات کی تشریح و ترجمانی کے ذریعہ قرآن کی صداقت اور اس کے فوائد پر دلیلیں لائی گئی ہیں! یہ کتاب بیسیوں دینی اور قرآنی عنوانات پر مشتمل ہے۔

(۲) اسی کتاب کا دوسرا حصہ، جس کی ضخامت ۴۸، صفحات اور قیمت ڈیڑھ روپیہ ہے (ملنے کا پتہ :۔ آستانہ ویسٹ ماڈل کالونی، کراچی ۱۵) اس میں بھی قرآنی آیات اسی انداز پر پیش کی گئی ہیں۔ چند عنوانات :۔

عظمت پیغمبر اسلام ——— حق اور باطل ——— اللہ کیلئے ہے! ——— انسان کی زندگی کا مقصد ——— خدا کا قانون اٹل ہے ——— عمل تولے جائیں گے.......!

یہ دونوں کتابیں بڑے اخلاص اور محنت و کاوش سے مرتب کی گئی ہیں، اللہ تعالیٰ فاضل مرتب کو دارین میں جزائے خیر عطا فرمائے کہ اس دور میں اللہ اور رسول کی باتیں جو کوئی جس طرح بھی دوسروں تک پہنچا رہا ہے، وہ بہت بڑی نیکی کا کام انجام دے رہا ہے۔

صدق مقال

از :۔ ڈاکٹر عبدالمجید صدیقی مرحوم، ناشر :۔ ڈاکٹر محمود احمد صدیقی۔ ضخامت ۹۶ صفحات،
ملنے کا پتہ :۔ گارڈن ویسٹ کراچی ۳ (ٹیلی فون ۲۱۹۵۰) سے مفت مل سکتی ہے۔

ڈاکٹر عبدالمجید صدیقی ایک درد مند، باوضع اور دیندار مسلمان تھے، مرحوم اُمت مسلمہ کی اصلاح اور بہبودی کا دردمندانہ جذبہ اپنے اندر رکھتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے انہیں بے پناہ عشق تھا! طبیعت موزوں اور ذہن رسا پایا تھا، شعر و سخن سے بھی ان کو لگاؤ تھا، اور اس لگاؤ کا سب سے بڑا ثبوت اُن کا مجموعہ کلام ——— صدقِ مقال ہے!

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن مرحوم نے اپنی زندگی ہی میں چھپوایا تھا، اب ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے ڈاکٹر محمود احمد صدیقی نے اس کا دوسرا ایڈیشن چھاپا ہے! ڈاکٹر صاحب مرحوم کے کلام میں سادگی کے ساتھ سوز بھی ملتا ہے! بعض نظمیں اخلاقی بھی ہیں، جن کے مطالعہ سے ذہن و فکر کو پاکیزگی حاصل ہوتی ہے!

عام معلومات حصہ چہارم

مرتبہ :۔ سید منظور الحسن ہاشمی، ضخامت ۱۲۶ صفحات (سرورق حسین و رنگین)
قیمت ایک روپیہ، تیس نئے پیسے،

ملنے کا پتہ :۔ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند رام پور (یو۔پی)

اس کتاب میں طلبہ کے جسم، سوسائٹی اور فطری ماحول کے متعلق "عام معلومات" جمع کی گئی ہیں

ہوا، پانی، مقناطیس، برق، غذا، پھول اور پھل، صحت اور صفائی ——— اس کتاب کے خاص عنوانات

ہیں، جو تفصیل میں جاکر بیسیوں ذیلی عنوانات میں بٹ جاتے ہیں! یہ کتاب طلبہ کے لئے لکھی گئی ہے مگر بڑی عمر کے لوگ بھی اس کے مطالعہ سے مستفید ہو سکتے ہیں، لکھنے کا انداز انتہائی سادہ اور عام فہم ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کتاب میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور خلاقیت کا ذکر کیا گیا ہے جس سے کتاب کی قدر و قیمت میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔

طب یونانی

مولف:۔ حاذق الحکما حکیم ڈاکٹر محمد یعقوب خان جنجوعہ، ضخامت ۵۰۴ صفحات (مجلد) قیمت درج نہیں
ملنے کا پتہ:۔ فیڈرل فارمیسی مٹ آرام باغ روڈ، کراچی۔

یہ کتاب "طب یونانی" کا چھوٹا موٹا انسائیکلو پیڈیا ہے، بدن کے حرارت اور نبض سے لے کر بول کے لون و وزن تک ہر چیز کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے، امراض کی تشریح کے ساتھ ساتھ ان کے اسباب علاج معالجہ کی ترکیب اور نسخہ جات بھی درج کئے گئے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ نسخے درج کرتے ہوئے بخل یا کسی "سینہ بہ سینہ" رمز و اشاریت سے کام نہیں لیا گیا۔

ایسے طبیب جو اردو زبان کے علاوہ کوئی اور زبان نہیں جانتے اور جن کی طبی معلومات بہت ہی قلیل ہیں، صرف تجربہ اور اٹکل پر کام چلتا ہے اور جنھوں نے کسی طبی درسگاہ میں تعلیم نہیں پائی ان کے لئے یہ کتاب "نعمت غیر مترقبہ" ہے! وہ امراض جو سادہ ہیں اور پیچیدہ نہیں ہیں، ان کے ازالہ کے لئے عوام بھی اس کتاب کے نسخوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں! فاضل مولف نے بڑے کام کی کتاب تالیف کی ہے!

حقیقت حال

از:۔ عبدالمجید بٹ، ضخامت ۱۲۸ صفحات، قیمت ایک روپیہ۔ (رنگین و خوبصورت سرورق)
ملنے کا پتہ:۔ اسٹینڈرڈ پبلشرز، مشن روڈ، کراچی۔

اس کتاب میں مسلمانوں کے معاشرے کی عام حالت دکھائی گئی ہے کہ علماء، پیر و مشائخ، ائمہ مساجد، دینی ادارے، مغربی علوم اور سائنس سے متاثر طبقہ، سیاسی لیڈر، زمیندار و جاگیردار اور ملازم پیشہ طبقہ، یہ سب کے سب اصلاح کے محتاج ہیں اور ان میں طرح طرح کی خرابیاں پائی جاتی ہیں! کتاب اخلاص و دردمندی کے ساتھ لکھی گئی ہے، مصنف نے خود اپنا ذاتی واقعہ لکھا ہے کہ ایک پیر صاحب کے ایک مقرب مرید سے تبادلۂ خیال کا موقع ملا، باتوں باتوں میں انھوں نے فرمایا:۔

"جب حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم معراج پر تشریف لے گئے تو آسمانوں پر ایک مقام پر کیا دیکھا کہ ایک فقیر ننگا دھڑنگا، سر منڈا لنگوٹی پہنے ہوئے بیٹھا ہے حضورؐ نے جبریلؑ سے دریافت کیا کہ یہ کون ہے؟ تو جبریل امین نے جواب دیا کہ:۔

"حضرت! آپ اُس کو اس کے حال ہی میں مست رہنے دیجئے، آپ کو ایسے لوگوں کے متعلق علم ہی نہیں دیا گیا۔"

عوام مسلمانوں کی کتنی بڑی تعداد ہے، جن کو ایسے جہلاء نے ان ہفوات و لغویات میں پھانس رکھا ہے!! استغفراللہ!

ردِ باطل

از:۔ مولوی ابوالنذیر مظفر نگری، ضخامت ۶۴ صفحات، قیمت ایک روپیہ۔
ملنے کا پتہ:۔ توحیدی جماعت، نوآباد کراچی، خیراتی مسجد، کراچی۔

اس کتابچہ میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "بشر" تھے، اور حضورؐ کی "بشریت" کا انکار، قرآن کا انکار ہے کہ واضح لفظوں میں فرمایا گیا ہے:-

قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ

(اے نبی! کہہ دے کہ میں تمہارا جیسا (ایک) بشر ہوں)

اور اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی حاضر و ناظر نہیں ہے! وسیلہ کا کیا مفہوم ہے؟ اولیاء اللہ کسے کہتے ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں کس لئے تشریف لائے تھے؟ اس کتابچہ میں ان موضوعات سے بحث کی گئی ہے۔ مصنف توحید خالص کی تبلیغ و اشاعت کا بڑا جوش و ولولہ رکھتے ہیں۔

جب میں طالب علم تھا

از:- شاہ خیاش، ضخامت ۱۶ صفحات، قیمت ۵ آنے پیسے،
ملنے کا پتہ:- ادارۂ ادبیات اردو خیریت آباد، حیدرآباد دکن (آندھرا پردیش)

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن نے بچوں کے لئے ہلکی پھلکی کہانیوں کا سلسلہ شروع کیا ہے، جس کی ایک کہانی "جب میں طالب علم تھا" کتابی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ یہ ایک سبق آموز کہانی ہے، زبان آسان ہے اور انداز بیان بچوں کی نفسیات کے مطابق ہے!

"اور ڈر کے بڑے کی آنکھوں میں بہا جکے تھے۔ (صفحہ ۵) "جھٹکنے" یہاں بے محل استعمال کیا گیا ہے، یہ نام نہاد "ترقی پسندوں" کا انداز نگارش ہے۔ ———— "بنک میں ستارہ، یہ ترجمہ ہے کہ ان کو تو گنتی بھی دشوار ہوگی" ترجمہ میں خاصہ تکلف پیدا ہو گیا ہے ———— "گلہری کی طرح پہاڑوں کی چوٹی پر بھاگتے پھرے" (صفحہ ۶) "دوڑتے پھرے" لکھنا تھا۔

یادگار حسینؓ عرف بہار محرم

از:- مولانا صلاح الدین نوری آسی (رنا نہارہ) ضخامت ۴۰ صفحات۔
قیمت تین آنے، ملنے کا پتہ:- شعبۂ نشر و اشاعت انجمن حنفیہ خدام علما کرنل گنج، ضلع گونڈہ (یو۔پی)

یہ ایک منظوم کتابچہ ہے، جس میں عشرۂ محرم کی رسموں اور کھیل تماشوں پر تنقید کی گئی ہے۔ ———— یہ کہ دسویں محرم کی رات میں مسلمان عورتیں خوب بن سنور کر "تبرج جاہلیت" کا مظاہرہ کر رہی ہیں، اور تماشائی آنکھیں سینک رہے ہیں، یہ بانس کی کھپچیوں کا تعزیہ ہے جس کو لوگ چوم رہے ہیں اور اس پر چڑھاوے چڑھا رہے ہیں، یہ نقارے اور ڈھول بج رہے ہیں، یہ ایک گھوڑا ہے جسے "دُلدُل" فرض کر کے، لوگ اس سے مرادیں مانگ رہے ہیں، یہ سر بازار پردہ نشینان حرم اہل بیت کا نام لے لے کر ماتم ہو رہا ہے ———— یہ دیکھئے جس تعزیہ کی ابھی تک پرستش ہو رہی تھی، اسی کو توڑ پھوڑ کر اپنے ہاتھوں سے زمین میں دفن بھی کر دیا!

اس کتابچہ کے آخر میں چند علماء کے فتاویٰ کے اقتباسات درج ہیں، جن میں اس قسم کی تمام باتوں کو بدعت اور ناجائز بتایا گیا ہے۔

آنکھوں کا تارا — مستقبل کا سہارا

بچے والدین کی آنکھوں کا تارا اور مستقبل کا سہارا ہیں کیونکہ آگے چل کر یہی قوم کے
دست و بازو بنیں گے۔ ان کی صحت و توانائی اور صحیح تربیت پر ملک کی بہتری کا انحصار ہے
کیا مرد اور کیا عورتیں اب تو سب کو مل کر اپنے ملک کو عروج پر پہنچانا ہے۔ اس
مقصد کے پیش نظر معالجوں اور دواساز اداروں پر بھی فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ قوم کے
ہر فرد کو امراض سے نجات دلانے میں پوری پوری کوشش کریں۔
ہمدرد اس فریضے کو ادا کرنے میں مقدور بھر کوشاں ہے۔ اس کے
ماہرین جو قدیم تجربات اور جدید تحقیقات سے بہرہ ور ہیں، دن رات اسی دھن میں
لگے رہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ اور نئی نئی دوائیں کم سے کم قیمت پر مہیا
کریں تاکہ ہر خاص و عام کو فائدہ پہنچے۔

ہمدرد دواخانے نے اپنے آپ کو نوعِ انسانی کی خدمت کے لئے وقف کر رکھا ہے تاکہ بہتر سے بہتر طبی سہولتیں میسر آسکیں۔

ماہر القادری

رکن: انجمن ادبی رسائل، پاکستان

جلد نمبر ۱۱

شمارہ نمبر ۸

ماہنامہ

فاران کراچی

ایڈیٹر
ماہر القادری

ماہ
نومبر ۵۹ء

ترتیب

مقام اشاعت

دفتر "فاران" کیمبل اسٹریٹ کراچی

سالانہ: چھ روپے

فی پرچہ: آٹھ آنے

مطبوعہ: مطبع سعیدی۔ کراچی

پرنٹر پبلشر: مسرور حسین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

نہ تو ہم تمدن و تہذیب کی ترقیوں کے منکر ہیں اور نہ سائنس کی ایجادات کو ناقدری کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، انسان فطری طور پر مدنی الطبع واقع ہوا ہے، اُس کی طبیعت کا یہی جوہر ایجادات واکتشافات کے رُوپ دھارتا رہتا ہے! انسان کو اللہ تعالیٰ نے مترکِ دُنیا کے لئے نہیں بلکہ دُنیا کو برتنے کے لئے پیدا کیا ہے، اس کائنات کی ایک ایک مادّی توانائی سے انسان کو پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہئے اور تسخیرِ کائنات کی مُہم جاری رہنی چاہئیے۔ انسان کو اس کا پورا حق حاصل ہے کہ وہ مہر و ماہ پر کمندیں ڈالے اور کہکشاں کو اپنا فرشِ راہ بنا دے

یہ تو جوگیوں، سنیاسیوں اور راہبوں کا شیوہ ہے کہ وہ دنیا سے بھاگتے ہیں اور تمدن و تہذیب کی بوقلمونیوں اور سائنس کی ایجادات میں اُنہیں شیطان دکھائی دیتا ہے! جس طرح ہوس پرستیٔ دنیا کے لئے ایک عذاب ہے اسی طرح طرح رہبانیت بھی بہت بڑی گمراہی ہے! روحانی ترقی کے نام پر اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی قوتوں کو معطل و مفلوج بنا دینا، ایک طرف فطرت کے خلاف جنگ ہے اور دوسری طرف کفرانِ نعمت ہے!

حقیقت یہ ہے کہ یہ انسان کا ذوقِ جمال تھا جس نے تمدن کو بوقلمونی اور تہذیب کو رنگارنگی عطا کی اور اس کی بے چین طبیعت نے ایجادات واکتشافات کا پیچ پیچ ایک طلسم کھڑا کر دیا!

اس اعتراف کے بعد عرض کرنا یہ ہے کہ انسان کا شرف کیا صرف ایجادات واکتشافات سے وابستہ ہے! جو کوئی مُوجد و مکتشف ہے، وُہی دنیا کا بڑا آدمی ہے، اُسی کی عقل معتبر اور اسی کا مسلک دُنیا کے لئے لائقِ تقلید واتباع ہے!

اگر ایسا ہوتا ——— تو ———

گلیلیو، کوپرنیکس اور ایڈیسن جیسے مُوجد، مخترع اور سائنس داں ہی دُنیا کے سب سے بڑے آدمی سمجھے جاتے، اور ان کی زندگیوں سے لوگ روشنی حاصل کرتے ——— حالانکہ یہ واقعہ ہے ان مشاہیر صاحبانِ ایجاد واختراع کو دنیا نے خراجِ تحسین و قدر شناسی تو پیش کیا ہے مگر اُن کی زندگیوں کو قابلِ اتباع اور سعادتِ خیر کا منبع نہیں سمجھا! اور یہ لوگ خود بھی اپنے کو دنیا کی امامت و پیشوائی کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔

انسان نے تحت البحر کشتیاں نکال کر یقیناً بڑی ذہانت اور نُدرتِ فکر کا ثبوت دیا، مگر انسانی زندگی کے تمام دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز کر کے، صرف اسی ایجاد پر وہ فخر کرنے لگے۔ تو اس کی اس بیجا تعلّی پر کہا جائیگا کہ مگرمچھ، مچھلیاں اور دوسرے دریائی جانور، انسان کی اس صنعت وایجاد سے ہزاروں میل آگے ہیں کہ وہ کسی آلہ اور بیرونی حفاظت وامداد کے بغیر پوری زندگی دریاؤں اور سمندروں میں گزار دیتے ہیں، اور خوفناک طوفانوں اور پُرشور موجوں میں گشت کرتے رہتے ہیں۔

ہوائی جہاز کی ایجاد یقیناً سائنس کا بہت بڑا کارنامہ ہے، اس کی افادیت اور اہمیت سے کوئی مخبوط الحواس ہی انکار

کر سکتا ہے مگر اس ایجاد میں بھی انسان پرندوں سے ابھی تک پیچھے رہا ہے کہ جو کسی آلہ اور مشین کے بغیر گھنٹوں فضائے آسمانی میں پرواز کرتے ہیں، نہ اُن کے اترنے اور چڑھنے کے لئے دوڑنے کے راستوں (Runways) اور طیران گاہوں کی ضرورت پیش آتی ہے، نہ پٹرول کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، نہ وہ لاسلکی کے ذریعہ سگنل کے محتاج ہیں اور نہ ان کی دیکھ بھال، صفائی اور مرمت کے لئے فیکٹریاں اور کارخانے بنے ہوئے ہیں ——— تو سمندروں کی تہوں میں کشتیاں چلا کر اور ہوائی جہازوں کے ذریعہ فضا میں پرواز کر کے انسان، مچھلیوں، گھڑیالوں، کبوتروں، چیلوں اور چکوروں کی بھی برابری نہیں کر سکا۔ اور اگر ان کی برابری کر بھی سکتا ہے تو انسان کا مچھلیوں اور چیلوں کی صف میں آ جانا۔ اس کے لئے کوئی شرف کی بات نہیں ہے۔

اگر صرف مادی ترقیاں ہی انسان کے شرف کا باعث ہیں تو گدھ انسان سے اشرف و افضل ہے کہ وہ کسی آلہ کی مدد کے بغیر بہت دور تک دیکھ سکتا ہے اور اس کی عمر سینکڑوں برس کی ہوتی ہے حالانکہ آج کا ترقی یافتہ انسان دوربین کے بغیر میل ڈیڑھ میل کی چیزوں کو بھی صاف طور پر نہیں دیکھ سکتا اور طب و جراحت کی تمام سائنسی ترقیوں کے باوجود اپنے جینے کی مدت (age) کو گدھ کی چوتھائی عمر کی برابر بھی طویل نہیں کر سکا جس انسان نے فضائے آسمانی کو روند ڈالا ہے، اس کی درماندگی کا یہ حال ہے کہ چیونٹی کی قوت شامہ اُس سے بہت زیادہ تیز ہے اور ذرا سے نزلہ و زکام سے اُس کے سونگھنے کی قوت معطل سی ہو جاتی ہے، جنسی قوتوں کو اُبھارنے کے لئے ڈاکٹر وارنف جیسے سائنسدانوں کی تحقیق و اکتشاف اور طرح طرح کی دواؤں، مالشوں، ضمادوں، بھپاروں اور انجکشنوں کی ایجاد کے باوجود انسان اس وصف میں بندروں اور ریچھوں سے بہت پیچھے ہے!

ایک طرف انسان نے چاند تک راکٹ اڑا دیئے ہیں، دوسری طرف اس کی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ کسی سخت سے سخت حادثہ سے بچنے کے لئے وہ چلتی ہوئی ریلوے ٹرین کو بریک لگا کر ایک دم نہیں روک سکتا! ایک طرف انسان نے آرام و آسائش عیش و راحت اور تزئین و آرائش کے لئے ہزاروں چیزیں بنا ڈالی ہیں، یہ طرح طرح کے عطر، تیل، غازے، نرم و گداز بستر، دیدہ زیب لباس، لذیذ کھانے، خنک مشروبات، گرمی اور سردی سے بچانے کے لئے درجہ حرارت کو معتدل رکھنے کی مشینیں، اور پھر آرام طلبی اور راحت پسندی کا یہ طلسم کہ ذرا بٹن دبایا اور کھانے کی میزیں سامنے آ کر لگ گئیں، دوسری طرف انسان کی بیچارگی کی یہ حالت ہے کہ وہ بیت الخلاء میں بادل ناخواستہ جانے کے لئے مجبور ہے، اور بادشاہ و گدا، اعلیٰ حکام اور چپراسی، فلسفی و سائنس داں اور وحشی جاہل، سب پر ایک ہی عالم گزرتا ہے!

چاند پر راکٹ کا اُتر جانا اُن قوموں کو مرعوب کر سکتا ہے، جن کا ماضی و حال صرف مادیت سے عبارت ہے، مگر جس قوم کی تاریخ میں یہ واقعہ ملتا ہو کہ اب سے پونے چودہ سو سال قبل ایک انسان ؑ نے انگلی کے اشارے سے چاند کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے ——— اور یہ بھی کہ اُس مقدس انسان نے "شب اسریٰ" میں اُن فضاؤں کی سیر کی تھی کہ جہاں زمین و زمان (Time and Space) کا قانون بھی اپنا کام نہیں کرتا، گردشِ ایام کی پرچھائیں بھی جہاں دکھائی نہیں دیتی اور مہر و ماہ کی بلندیاں تو اُس کے توسنِ آفاق گیر کا قدمِ اولین تھیں، وہ قوم اس قسم کے راکٹوں اور سائنس کی بلند پروازیوں سے مرعوب نہیں ہو سکتی!

علم و فن، تہذیب و تمدن اور سائنس کی ہزارہا ہزار سال کی ترقی، تجربہ اور ریاضت و محنت کے بعد صرف ایک راکٹ

کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ چاند پر اتر چکا ہے، مگر فوق و سماک (Height and Altitude) کا اس کرۂ ارضی کے اعتبار سے کوئی بلند سے بلند تصور کیا جا سکتا ہے ——— تو مہر و ماہ اور عطارد و مشتری سے بھی وراء الورا ——— (اور افسوس ہے کہ یہ لفظ بھی اُس رفعتِ بے نام، عالمِ گو مگو، اور "ماورائیت" کی ٹھیک طور پر ترجمانی نہیں کر سکتا) ——— سے ایک قاصد زمین پر آکر، حرا کے غار میں ایک انسان کو پیغام دیتا ہے، اور پیام رسانی کا یہ سلسلہ تیئیس سال تک جاری رہتا ہے

——— تو ———

جس قوم کی تاریخ میں چاند سورج سے بھی اور بہار ب کوس بلند بلکہ اس بلندی سے بھی وراء الورا فضا سے پیغام رسانی کا سلسلہ ملتا ہو وہ چاند پر راکٹ بھیجنے والوں کے فخر و ناز سے مرعوب تو کیا ہوگی ہاں! اُنکی تنگ ظرفی پر قہقہہ لگا سکتی ہے! اس قومیت پر کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہم ایسی باتوں کو درست تسلیم نہیں کر سکتے یہ تو مذہب و روحانیت کے ناقابلِ فہم معمے ہیں ———

مگر ہم ذکر اُن لوگوں کا کر رہے ہیں، جو ان تمام باتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کو سائنس کی یہ معجز نمائیاں حیرت میں نہیں ڈال سکتیں! وہ نوخیز بچے جو مٹی کے سکوروں پر جھلی منڈھ کر اور ان میں ڈورا باندھ کر، ٹیلیفون کا ابتدائی تجربہ کر رہے ہوں۔ اُن کی سمجھ میں اگر وسلکی کا نظام نہ آئے۔ تو اُن کی اس ناسمجھی کے سبب لاسلکی کا نظام تو بے بنیاد اور غلط قرار نہیں پا سکتا۔

سوچئے! جہاں تک حیرت و استعجاب اور مرعوبیت کا تعلق ہے تو اس کے لئے پوری کائنات موجود ہے، اگر آدمی ایک دانہ کے زمین میں بوئے جانے سے لے کر، اُس کے برگ و بار لانے تک کے فطری نظام پر غور و خوض کرے تو اسے فطرت کے اس نظام کے آگے اعترافِ عجز کرنا پڑیگا کہ ایک دانہ چند ہفتوں میں کیا سے کیا بن گیا؟ آفاق پر غور کرنے سے پہلے انسان خود اپنے نفس پر غور کرے تو اُسے ایک ایک عضو کی ساخت پر حیرت ہوگی! آنکھ کس طرح دیکھتی ہے اس کے پردوں میں بینائی اور بصارت کہاں سے آتی ہے، میلوں کی فضا اور اس کا ماحول آنکھ کی ذرا سی پتلی میں کس طرح سما جاتا ہے، یہ غور و فکر اُسے حیرت میں غرق کر دے گا! سائنس کی تمام ایجادات سے ہزار درجہ عجیب تر انسان کا دماغی نظام ہے! دماغ کے اس ذرا سے حجم میں کیا کیا محفوظ رہتا ہے۔ اشیاء کے نام ان کی صورتیں، اشعار، عبارتیں، واقعات اور پھر کمال یہ ہے کہ تمام چیزیں گڈمڈ نہیں ہونے پاتیں، اُن میں ترتیب اور امتیاز قائم رہتا ہے! ناول نگاروں اور انشا پردازوں نے ہزاروں صفحے صرف دماغ سے سوچ کر لکھ ڈالے ہیں، یہ لاکھوں الفاظ آخر کہاں محفوظ تھے، دماغ کو آپریشن کے ذریعہ دیکھنے والوں نے دیکھا ہے، اس میں تو ایک یاد، ایک حرف اور ایک واقعہ کا بھی نقش نظر نہیں آتا۔ یہ جو سینما کی فلمیں بنتی ہیں تو ایک فلم کے لئے ہزاروں فٹ کی ریل تیار ہوتی ہے جس کا مجموعی وزن بیسیوں پونڈ ہوتا ہے۔ اس چیز کو ذہن میں رکھ کر یہ سوچئے کہ انسان اپنے دماغ کے ذرا سے حجم میں بے شمار فلمیں لئے پھرتا ہے ——— تو یہ دریا کا سیپ کے کونے میں سما جانا اور صحرا کا ذرے میں سمٹ آنا، راکٹوں کی ایجاد سے بہت زیادہ حیرت انگیز ہے! انسان کا وجود خود اپنی جگہ قدرت کا عظیم الشان معجزہ ہے!

سائنس و فلسفہ اور شعر و ادب کی زبان میں انسانوں کی صنعت کے لحاظ سے تخلیق، ایجاد اور صنعت کے لفظ اور اصطلاحیں بولی جاتی ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو صرف ترکیب دے دیتا ہے وہ انہیں نہ تو تخلیق کرتا ہے اور نہ ایجاد! اشیاء کو تخلیق کرنا اور انہیں وجود بخشنا یہ صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ صانع، فاطر، خالق اور واجب الوجود اُسی کی ذات ہے، جن سائنس دانوں نے یہ "ماہ شکار راکٹ" بنائے ہیں۔ اُن

راکٹوں میں استعمال کئے ہوئے خام و پختہ میٹریل کا ایک ذرہ بھی اُن کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے۔ انھوں نے تو اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی اشیاء کو، اللہ تعالیٰ ہی کے بنائے ہوئے دماغ کے زور سے ترکیب دیدیا ہے ——— تو یہ سائنس داں حقیقت میں صانع و خالق نہیں ہیں بلکہ اشیاء میں ترکیب و ترتیب دینے والے ہیں!

روس کے سائنس دانوں کے سوچنے کی یہ بات تھی کہ یہ چاند جس تک پہنچنے کے لئے برسوں سے کیا کیا جتن کئے جارہے ہیں، اتنی بڑی حکومت کے تمام ذرائع جن راکٹوں کی تیاری میں صرف ہورہے ہیں اور اربوں روپیہ ٹھیکریوں کی طرح بکھیرا جارہا ہے، وہ جس ذات کا بنایا ہوا ہے، وہ ذات کس قدر عظیم اور قدرت والی ہوگی! اگران سائنس دانوں اور ان کے سرپرستوں کے دل و دماغ میں رمق برابر بھی حق شناسی کا جوہر ہوتا، تو وہ سائنس کے ہر انکشاف و ترقی پر

فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ

کا نعرہ بلند کرتے! مادّے کی توانائیوں کا پتہ لگا کر، کواکب و سیارگان کے اتھاہ نظام کو دیکھ کر، یہ معلوم کر کے کہ اشیاء کو ترکیب دیدینے کے بعد کیا چیز ظہور میں آتی ہے؟ اُنھیں اس نتیجہ پر پہنچنا چاہیے تھا کہ جس قادر و برتر ذات نے ان کو خلق فرمایا ہے، اُس کی عظمت و قدرت کا بھلا کوئی ٹھکانا ہے! اور وہ واقعی:

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

ہے! جس راکٹ کو چاند کی طرف اُڑایا گیا ہے، جب وہ آپ ہی آپ نہیں بن گیا، تو یہ چاند خود بخود کیسے بن سکتا ہے! مگر اس جہالت، بے دانشی اور ہٹ دھرمی کی کوئی انتہا ہے کہ خالق کے وجود کا اقرار کرنے کے بجائے، یہ اشتراکی سائنس داں اور رُوسی دانشور اللہ کے وجود کی نفی کا دُنیا کو چیلنج دے رہے ہیں، اور اس طرح سائنس کی ترقی و ایجاد کی آڑ میں، کھلی ہوئی گمراہی کی طرف دُنیا کو بلا رہے ہیں! جو لوگ ان سے مرعوب ہونگے یہ تو وہ جانیں ہماری نگاہ میں تو اب سے ہزاروں سال پہلے جو لوگ پتھروں کو رگڑ کر آگ نکالتے تھے اور پہاڑوں کے غاروں میں رہتے تھے مگر اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے تھے ان کے مقابلے میں رُوس کے یہ عظیم سائنسداں، جو اللہ تعالیٰ کا انکار کرتے ہیں۔ زیادہ جاہل اور کم ترقی یافتہ ہیں۔ ان ملحد سائنسدانوں اور منکرِ خدا سیاست دانوں کا حال اُس چیونٹی جیسا ہے جو کھلیان سے غلہ کا دانہ لے کر اپنے بل میں پہنچ جائے اور وہ اس اپنی کامیاب جدوجہد پر اس انداز میں فخر و ناز کرنے لگے، جیسے نہ اس دانہ کو کسی نے بویا تھا اور یہ دانہ جس پودے کے خوشہ سے نکلا ہے نہ اس پودے کو کسی نے سینچا تھا۔ کاشتکار کے وجود سے لے کر کھیتی کے نشو و نما کے پورے نظام تک سے وہ بے خبر بلکہ منکر ہوا

کائنات کی حقیقتِ کبریٰ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، جس نے اس سب سے بڑی حقیقت کا انکار کیا۔ اُس کی جہالت میں جو شک کرتا ہے وہ خود فہم و دانش سے بے بہرہ ہے ——— واقعہ یہ ہے کہ رُوس کے چند اونچے درجے کے جہلاء نے راکٹوں کی مہم شروع کر رکھی ہے، مقصود دُنیا کو مرعوب کرنا اور اپنی دہشت انسانوں کے دلوں میں بٹھانا ہے کہ ہم چاہیں تو اپنی سائنسی ایجادات سے دُنیا کی بہت بڑی آبادی کو قبرستان بنا سکتے ہیں، ہمارا ایک ذرا سا بم نہ صرف یہ کہ انسانوں کو ہلاک کر دیگا بلکہ جہاں جہاں تک اُس کے اثرات پہونچیں گے وہاں کی زمین شور اور بنجر ہو جائیگی اور اس میں روئیدگی کی قوت باقی نہیں رہے گی! یہ دھمکیاں ہیں، یہ مرعوب کن اعلانات ہیں۔ یہ اپنی طاقت کے مظاہرے ہیں، یہ اُس درندگی اور بربریت کا مظاہرہ ہے جس پر ان مرد مُرخوں نے انسانی کھال پہن رکھی ہے! امریکہ کے لوگ بنئے کا مزاج رکھتے

ہیں، وہ روس کی ان دھمکیوں کو سن کر تشویش محسوس کر رہے ہیں۔ وہ اس تصور سے کانپ رہے ہیں کہ جنگ ہوئی اور ہمارا ملک تباہی وغارت گری سے بچ بھی گیا، پھر بھی ہمارے آرام وراحت میں تو کھنڈت پڑ جائیگی، ہمارا عیش تو مکدر ہو جائیگا! اور ایک امریکہ ہی پر کیا منحصر ہے، جس کسی کے سامنے کوئی بلند مقصد نہ ہوگا، اور جو دُنیا کی لذت وراحت اور عیش وہوس کے لئے ہی جینا چاہیگا، وہ روس کی ان دھمکیوں سے مرعوب ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا! اور خدا ہمارے اس اندیشہ کو کبھی سچا نہ ہونے دے، ہمیں خوف ہے کہ کمزور ایمان والے بھی کہیں راکٹوں اور اسپٹنکوں کی اس پرواز کو دیکھ کر ڈگمگا نہ جائیں۔ روس کے اس چیلنج سے وہ لوگ البتہ مرعوب اور دہشت زدہ نہیں ہو سکتے جو خدا اور رسولؐ پر ایمان رکھتے ہیں، جو مادی ترقیوں اور راحتوں ہی کو حاصل زندگی نہیں سمجھتے، اُن کا آخرت پر ایمان ہے اور وہ دنیا کو اس طرح برتتے ہیں کہ "یہ اُن کی آخرت کی کھیتی ہے"۔ اس ایمان، اعتقاد، عزیمت ویقین رکھنے والوں کے ہاتھ میں چاہے لوہے کی ایک کیل بھی نہ ہو، پھر بھی ایک ہزار ہائیڈروجن بم اُن کے پائے استقامت کو متزلزل نہیں کر سکتے!

ہم نے اس سے پہلے بھی عرض کیا تھا اور اس فرصت میں پھر اسی حقیقت کو دہراتے ہیں کہ جہاں بھی تشکیک، بے یقینی، خدا سے بے خوفی آخرت کی باز پرس سے غفلت اور ہوس پرستی پائی جاتی ہے، وہاں کمیونزم کو پاؤں جمانیکا بڑی آسانی سے موقعہ مل سکتا ہے! کمیونزم سب سے پہلے اخلاق کی پاکیزگی پر چھاپہ مار کر، انسان کو شرم وحیا سے کورا اور اللہ تعالیٰ سے بے خوف بنا دیتا ہے! افغانستان کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ وہاں ایک زمانہ میں عوام کی دینی غیرت کا یہ عالم تھا کہ بادشاہ امان اللہ خاں کی مغرب زدگی اور آزاد خیالی کو وہ برداشت نہیں کر سکے، یہاں تک کہ شاہ موصوف کو تخت وتاج کو خیر باد کہنا پڑا، اور اب کمیونزم کی ذرا سی پرچھائیں وہاں پہنچی ہے کہ پردہ نشینان حرم کے چہروں سے نقاب اُٹھ رہے ہیں اور بات صرف چہروں کی بے نقابی پر جاکر تھوڑی ٹھہر سکتی ہے، یہ تو تبرج جاہلیت کا پیش خیمہ ہے! یہ بے حجابی رفتہ رفتہ مرد وزن کے بیباکانہ اختلاط کی حد تک پہنچے گی، اور وہ سب کچھ ہوگا، جو اللہ اور رسولؐ کی قائم کی ہوئی حدود کو توڑ کر ہوا کرتا ہے۔

افغانستان سے سینکڑوں نوجوان علوم وفنون کی تعلیم وتربیت کے لئے روس بھیجے گئے ہیں کوئی شک نہیں کہ فوجی ٹریننگ سے لے کر صنعت اور سائنس کی تعلیم تک، ہر چیز انہیں بڑی محنت وشفقت کے ساتھ سکھائی جائیگی، مگر ساتھ ہی انہیں شراب نوشی اور بدکاری کی راہ پر بھی لگایا جائیگا وہ فیشن کے طور پر کلب گھروں میں جُوا بھی کھیلیں گے، مذہب کے خلاف اُن کے ذہن میں شکوک بھی پیدا کئے جائیں گے، یہاں تک کہ وہ روس سے شرابی، بدکار، قمار باز، مذہب سے متنفر یا کم سے کم مشکوک بن کر واپس ہوں گے! انہی نوجوانوں کے ہاتھوں میں افغانستان کے نظم ونسق کی باگ ڈور ہوگی، اور یہ خود "ترقی وتہذیب" کے نام پر جن بُرائیوں میں مبتلا ہیں، اُن کو افغانستان کے طول وعرض میں رواج دیں گے! ان اشتراکیت زدوں کے اثر وطاقت سے افغانستان میں ایک ایسا معاشرہ وجود میں آئیگا جہاں پاکبازی اور نکوکاری پر ملائیت اور قدامت پرستی کی پھبتیاں چُست کی جائیں گی، جہاں اسکولوں اور کالجوں میں مسلمان لڑکیوں کو گانا بجانا، تھرکنا اور ناچنا سکھایا جائیگا، جہاں حُسن کے عُریاں مقابلے ہونگے، جہاں شراب نوشی روشن خیالی اور تہذیب وترقی کی علامت سمجھی جائیگی، جہاں دینی تصور اس قدر مسخ ہو چکا ہوگا کہ وہاں کے نوجوان بدکاری میں مبتلا ہونے کو تو معیوب نہ سمجھیں گے مگر "تعدد ازدواج" پر اُن کی زبانِ طعن دراز ہوگی، دینی بے حسی کا یہ عالم ہوگا کہ عین مغرب کے وقت وہاں

کے بڑے آدمی اسلام کی تعریف میں خطبہ ارشاد فرماتے ہونگے مگر پورے جلسہ میں سے ایک شخص بھی نماز ادا کرنے کے لئے اٹھ کر نہ جائیگا! ایسے ماحول میں مسجدوں اور خانقاہوں کے ہوتے ہوئے اور قرآن کریم کی تلاوت کے باوجود، کیمونزم کو غلبہ حاصل ہوگا اور کیمونزم کا غلبہ ایمان واخلاق کی موت ہے۔

یہ مسئلہ تنہا افغانستان کا نہیں بلکہ ان تمام مسلمان ملکوں اور سلطنتوں کا ہے، جہاں کیمونزم ابھی تک داخل نہیں ہوا! ایسے ملکوں کے عوام وخواص سب کو سوچنا ہے کہ جن باتوں کو اللہ اور رسول ؐ ناپسند کرتا ہے، کیا ان کو قانونی طور پر ممنوع قرار دیا گیا ہے اور جو باتیں اللہ اور رسول ؐ کے نزدیک پسندیدہ ہیں، کیا ان کو معاشرے میں قبولِ عام حاصل ہے! اور ایسے ملکوں میں اخلاق ونکوکاری اور غیرت وپاکیزگی کی فضا قائم کرنے کے لئے کس پیمانہ پر جدوجہد ہو رہی ہے؟؟؟ اگر نہیں ہو رہی ہے، تو ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر اس کام کا آغاز ہو جانا چاہیئے، اور اگر یہ نیک کام ہو رہا ہے تو اس کی رفتار کو تیز تر بنانے کی ضرورت ہے کہ ایک کیمونزم ہی پر کیا موقوف ہے، ہر لادینی فتنہ کا مقابلہ ایمان واخلاق ہی کی قوت سے کیا جا سکتا ہے!

اصلاح وانقلاب کی جدوجہد ہر ملک کے بھی خواہ کرتے ہیں چاہے وہ کافر ہوں یا مسلمان، مگر مسلمانوں کی اصلاح وانقلاب کی جدوجہد، کافروں سے ممتاز ہوتی ہے ——— کہ اس کا مقصود اللہ اور رسول ؐ کی رضا جوئی ہوتی ہے اور مسلمانوں میں بھی مصلحین کے دو کردار ملتے ہیں ایک حضرت عمر ابن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کا اور دوسرا مصطفےٰ کمال پاشا کا کردار ہے ایک کے دورِ حکومت میں اخلاق ونیکوکاری کو وہ غلبہ حاصل ہوا اور معاشرے کو اس قدر پاکیزگی میسر آئی کہ لوگ محسوس کرنے لگے کہ یہ تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے مبارک دور کی بہارِ رفتہ لوٹ آئی ہے، اور دوسرے مصلح کے دورِ اقتدار میں اصلاح وانقلاب کا وہ رنگ دنیا نے دیکھا کہ مسلمانوں کے کان عربی زبان میں اذان سننے کو ترس گئے تھے! جو کوئی ان دونوں کرداروں کے نقطۂ اختلاف کو سمجھ کر، اصلاح وانقلاب کے اسلامی خطوط کو متعین کر سکے گا، اُسے حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق نصیب ہوگی اُسے دارین میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور نصرت میسر آئیگی، اور جس کسی کو یہ دولت میسر آگئی، قرآن کریم اس مزاج وکردار کے لوگوں کو

أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ

کی بشارت دیتا ہے! (اللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنَ الْمُفْلِحِينَ آمین)

مُلّا محمد واحدی دہلوی

حکمت کے موتی

سرورِ کائنات حصّہ چہارم کے چند اوراق

حدیث

تَرَکْتُ فِیکُمْ اَمْرَیْنِ ۔ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا کِتَابَ اللہِ وَسُنَّۃَ رَسُوْلِہٖ ——— میں تمہارے واسطے دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں انہیں جب تک تھامے رہو گے کبھی غلط راستے پر نہیں پڑو گے۔ (وہ چیزیں کیا ہیں) ایک اللہ کی کتاب۔ دوسرے اللہ کے رسولؐ کے اقوال و افعال۔

موطا امام مالکؒ

پہلی صدی ہجری کے وسط تک ایسے حضرات بہ کثرت موجود تھے، جنھوں نے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو آنکھوں سے دیکھا تھا اور حضورؐ کی باتیں کانوں سے سنی تھیں۔ حضورؐ کے اقوال و افعال اُن سے بہ آسانی معلوم کیے جا سکتے تھے جب وہ حضرات ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے تو خیال آیا کہ اب اقوال و افعال اہتمام کر کے لکھ لینے چاہئیں[1]۔ یہ پہلی صدی ہجری کے آخر زمانے کا واقعہ ہے۔ اقوال و افعال کو جمع کرنے اور لکھنے کا سلسلہ تیسری صدی ہجری تک جاری رہا۔ مختلف اوقات میں، مختلف علما اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اقوال و افعال جمع کرتے اور لکھتے رہے۔ انسان باپ دادا اور عام بزرگوں کی باتیں جاننے کا شوق ہوتا ہے، حضورؐ کی باتیں تو حضورؐ کی باتیں تھیں۔ ان پر تو دین کا انحصار ہے، ان کی تلاش اور تحقیق میں مسلمانوں نے کوشش اور محنت و مشقت کی انتہا کر دی۔ بعد کی تمام نسلیں بزرگانِ سلف کی ہمیشہ زیر بار احسان رہیں گی۔ آنے والی نسلیں احادیث کے بعض مطالب

---

[1] بعض صحابہ کرام کے پاس احادیث کے نوشتے بھی موجود تھے۔

اُبھار سکتی ہیں جنھیں اُبھارنے کی پہلے ضرورت نہیں تھی اور آج ضرورت ہے، لیکن احادیث میں اب اضافہ ناممکن ہے۔ اضافہ چوتھی صدی ہجری میں ناممکن ہو گیا تھا۔ بزرگانِ سلف نے تلاش و تحقیق میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

مطالب البتہ اس وقت وہی اُبھرے تھے جو تیسری صدی ہجری میں ابھرنے چاہئے تھے۔ چودھویں صدی کی ضروریات کے مطابق احادیث سے فائدہ اٹھانا چودھویں صدی کے مسلمانوں کا کام ہے۔ چودھویں صدی کے مسلمان تیسری صدی کا تصور کئے بیٹھے رہیں اور چودھویں صدی کا احساس نہ کریں تو اسے ناعاقبت اندیشی کہا جائے گا۔ اسلام نے نئے تقاضوں کی طرف سے آنکھیں موند لینے کی ہدایت نہیں کی ہے۔

یہی سوچ کر حیاتِ سرورِ کائناتؐ کا چوتھا حصہ میں احادیثِ نبوی کے لئے مختص کرتا ہوں ملاحظہ فرمایئے اور آجکل کی چھلنی میں چھان کر اور آجکل کی کسوٹی پر کس کر ملاحظہ فرمایئے کہ حضورؐ نے کیا کیا نایاب موتی عطا کئے ہیں اور زندگی کی الجھنوں کے کیسے کیسے حل بتا دئے ہیں۔

اس کتاب کو احادیث کا مجموعہ نہ سمجھئے، حیاتِ سرورِ کائناتؐ کا حصہ چہارم سمجھئے حضورؐ کے اقوال اور افعال کی صرف ایک لڑی پیش کر رہا ہوں، جس میں موتی تو حتی المقدور ہر قسم کا پرو دیا ہے، لیکن ایسی لڑیاں بے شمار بن سکتی ہیں۔ یہ پورے موتی نہیں ہیں۔ پورے موتی احادیث کے مجموعوں ہی میں ملیں گے۔

میں نے موتی صحیح بخاری سے چنے ہیں۔ بخاری احادیث کا مستندؒ ترین مجموعہ ہے احادیث کی ترجمانی کی گئی ہے، احادیث کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔ مفہوم اپنی زبان میں لکھ دیا ہے۔ مفہوم اگر کہیں غلط نظر آئے تو اہلِ علم حضرات مطلع فرما دیں۔

بعض احادیث کے صرف اجزا لئے گئے ہیں۔ مثلاً کسی نشست میں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت سی باتوں پر روشنی ڈالی ہے، یہاں اُس نشست کی ایک دو باتیں لی ہیں۔ مقصود حضورؐ کے اقوال و افعال کی جھلک دکھانی ہے۔ احادیث کا مجموعہ پیش کرنا نہیں ہے۔ (واحدی)

ؒ مستند کے معنی معصوم نہیں ہیں۔ علامہ شیخ محمد بن اسمٰعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ سید المحدثین تھے، امام المحدثین تھے، امیر المومنین فی الحدیث تھے لیکن معصوم نہیں تھے۔ معصوم فقط انبیا ہوتے ہیں۔ حضرت بخاری کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے احادیث کی صحت و عدم صحت پر بے حد غور و فکر کیا ہے اور حدیثوں کے ذخیرے میں سے صرف چھ ہزار حدیثیں قبول کی ہیں۔ مگر چونکہ وہ نبی نہیں تھے۔ انتہائی فہیم اور نیک نیت ہونے کے باوجود بالکل ممکن ہے کہ انتخاب میں کچھ ایسی حدیثیں آگئی ہوں جو نہ آنی چاہئے تھیں اور کچھ ایسی حدیثیں رہ گئی ہوں جو نہ رہنی چاہئے تھیں۔ بخاری مستند ترین مجموعۂ احادیث ہے۔ اصح الکتاب بعد کتاب اللہ ہے، تاہم کتاب اللہ نہیں ہے۔ احادیث کے مستند مجموعے پانچ اور بھی ہیں جنھیں کتب احادیث صحاح ستہ کہا جاتا ہے جن میں نمبر ایک بخاری کا ہے۔ لیکن حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی "موطا" اور حضرت امام احمد بن محمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی "مسند" کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ "مسند" امام احمد حنبل رحمؒ میں بخاری سے کہیں زیادہ حدیثیں ہیں۔

سرورِ کائنات ؐ کے چند اقوال و افعال

(۱) حضورؐ کا ارشاد ہے کہ ہر عمل میں نیت ضروری ہے[1]۔ اعمال کی جزا و سزا نیتوں کے مطابق ملے گی۔ جس نے ہجرت کسی عورت کی خاطر یا دنیا حاصل کرنے کی غرض سے کی ہے اُس کی ہجرت اُنہی باتوں کے لئے سمجھی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کی خوشنودی کے نہیں سمجھی جائے گی۔ (ہجرت کی مثال آپ تمام کاموں پر منطبق کیجئے)

(۲) وحی کی ابتدا سچے خوابوں سے ہوئی تھی۔ حضورؐ جو خواب دیکھتے تھے وہ ہو بہو پورا اترتا تھا۔ پھر حضورؐ نے غارِ حرا میں تنہا بیٹھنا شروع کیا۔ کئی کئی دن کا کھانا ساتھ لے جاتے تھے اور وہاں یکسوئی سے عبادت کرتے رہتے تھے۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ فرشتہ آیا اور بولا "پڑھو" حضورؐ نے فرمایا میں پڑھنا نہیں جانتا۔ فرشتے نے حضورؐ کو دبوچ لیا اور خوب بھینچا اور دوبارہ کہا "پڑھو" حضورؐ نے دوبارہ بھی وہی جواب دیا کہ میں پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ تین مرتبہ اسی طرح دبوچا اور بھینچا گیا۔ تیسری مرتبہ فرشتے نے کہا اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ (اے محمدؐ! جو تمہیں پڑھایا جاتا ہے اُسے) اپنے رب کا نام لے کر پڑھو جس نے (کل مخلوقات کو) پیدا کیا ہے) خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ (اور) جس نے انسان (جیسی اشرف مخلوق) کو خون کے لوتھڑے (جیسی حقیر شے) سے بنایا ہے اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ پڑھو اور (یاد رکھو) تمہارا رب بڑا کریم ہے۔ اُس نے قلم سے لکھنے اور علوم کو محفوظ رکھنے کی تعلیم دی اور (وحی کے ذریعہ) انسان کو وہ باتیں سکھائیں جنہیں وہ نہیں جانتا تھا۔ فرشتہ گیا تو حضورؐ فوراً گھر تشریف لائے اور فرمایا مجھے چادر اُڑھا دو۔ اس وقت حضورؐ کا دل دھڑک رہا تھا۔ دھڑکن اور گھبراہٹ کم ہوئی تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ماجرا کہا اور فرمایا میری جان خطرے میں ہے۔ حضرت خدیجہؓ نے عرض کیا کہ آپ جیسے انسان کو اللہ تعالیٰ خوار نہیں کرے گا۔ آپ صلہ رحم کرتے ہیں لوگوں کے کام آتے ہیں، ناداروں اور مفلسوں کا پیٹ بھرتے ہیں۔ مہمان نواز ہیں اور سب کے مصائب دور کرنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اپنے حالات ظاہر کر کے حضرت خدیجہؓ حضورؐ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو ان کے چچا زاد بھائی تھے اور عیسائی تھے۔ مشرک نہیں تھے۔ ورقہ نے کہا۔ یہ تو وہ ناموس ہے جو موسیٰ (علیہ السلام) پر نازل ہوا کرتا تھا۔ کاش میں اس زمانے تک زندہ رہتا جب ان کی قوم انہیں ملک سے نکال دے گی[2]۔ حضورؐ نے پوچھا کیا میری قوم مجھے شہر بدر کر دے گی۔ ورقہ نے کہا۔ ہاں جتنے حضرات تمہاری مانند دین اور کتاب لیکر آئے ہیں ایک ایک پر ظلم توڑے گئے ہیں۔ میں تمہارے زمانۂ نبوت میں ہوا تو انتہائی مدد کروں گا۔ وحی کچھ دنوں کے واسطے رکی رہی، حتیٰ کہ ورقہ کا انتقال ہو گیا۔

---

[1] اپنے افعال کو تو ظاہر ہے حضورؐ نے خود بیان نہیں فرمایا۔ دوسروں نے انھیں بیان کیا ہے۔ لیکن حضورؐ کے اقوال بھی من و عن حضورؐ کے الفاظ میں نہیں ہیں۔ صرف چند ہی کی بابت کہا جاتا ہے کہ حضورؐ ہی کے الفاظ ہیں، ان میں ایک حدیث یہ ہے۔ اس کی جامعیت دیکھئے جسنو کے سوا انما الاعمال بالنیات کے کوزے میں مضمون کا دریا اور کون بھر سکتا تھا ــــــــــ ان تین لفظوں کی کیفیت اردو میں منتقل کرنی کم از کم میرے لئے محال ہے

عربوں کے حافظے لاجواب تھے۔ انھوں نے کوشش بے حد کی ہے کہ حضورؐ کے اقوال حضورؐ کے الفاظ میں ادا کریں، تاہم قال ذکرہ قال کہنا پڑا ہے یعنی حضورؐ نے یوں فرمایا یا اس سے ملتا جلتا فرمایا۔ افعال کا جب ذکر کرتے ہیں تو پورا نقشہ کھینچ دیتے ہیں کہ فلاں موقع تھا یہ صاحب حاضرِ خدمت تھے حضورؐ اس طرح بیٹھے تھے یا چل رہے تھے، یا کھڑے تھے، یا اونٹ پر سوار تھے [2] ورقہ بہت معمر تھے۔

(۳) حضورؐ ایک دفعہ کہیں جا رہے تھے یا کہیں سے آ رہے تھے، غرض راستے میں تھے کہ اچانک آسمان کی طرف سے آواز آئی حضورؐ نے نگاہ اوپر کی تو وہی فرشتہ کرسی پر بیٹھا دکھائی دیا جسے غارِ حرا میں دیکھا تھا۔ کرسی آسمان اور زمین کے درمیان معلق تھی۔ حضورؐ سراسیمہ ہو گئے اور لوگوں سے کہنے لگے۔ مجھے چادر اڑھاؤ۔ مجھے چادر اڑھاؤ۔ اس وقت فرشتے نے حسب ذیل وحی سنائی یٰاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ ۙ قُمْ فَاَنْذِرْ ۙ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۙ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۙ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۙ اے چادر اوڑھنے والے! اٹھو، دوسرے گناہ گاروں کو عذاب الٰہی سے، ڈراؤ۔ اور اپنے پروردگار کو تعظیم و تکریم سے یاد کرو اور اپنے کپڑے پاک صاف رکھو اور (ہر) ناپاکی سے دور رہو ——— اور اب وحی کا راستہ کھل گیا۔ وحی پے درپے اترنے لگی۔

(۴) ابتدا میں جب وحی نازل ہوتی تھی تو حضورؐ اسے نازل ہوتے وقت دوہرانے تھے اور فوراً یاد کرنا چاہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۞ اے رسولؐ! ہمارا کلام جب جبریلؑ تمہیں سنایا کریں تو جبریلؑ کے ساتھ آیت، قرآن (کے پڑھنے) میں تم اپنی زبان کو حرکت نہ دینے لگا کرو (کہ ابھی وہ آیت ختم نہ کرنے پائیں اور تم اسے پڑھنا شروع کر دو۔ اس خیال سے) کہ (آیت ذہن سے نکل نہ جائے) اُسے جھٹ پٹ یاد کر لو۔ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۞ قرآن کا (تمہارے سینے میں مجتمع (اور ذہن و دماغ میں مرکوز) کر دینا اور (تمہاری زبان سے تمہارے امتیوں کے روبرو جوں کا توں) پڑھوا دینا، یہ ہمارا کام ہے فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۞ لہذا جب ہم (بذریعہ جبریلؑ) اس کو پڑھیں تو تم ہمارے پڑھنے کو سنا کرو اور ہمہ تن اُدھر متوجہ ہو جایا کرو۔ تاوقتیکہ ہم ختم نہ کر لیں تم اس کا ایک لفظ زبان سے ادا نہ کیا کرو۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۞ (ذرا سوچو تو، جب ہم اُسے تم پر نازل کرتے ہیں تو پھر) اس کو تمہارے ذہن نشین کر دینا اور لوگوں کے سامنے اس کا واضح کر دینا اور پڑھوا دینا (ہمارے لئے کونسا دشوار ہے۔ یہ بھی) ہمارا ہی، کام ہے۔

اس حکم کے بعد سے حضورؐ نے یہی کیا کہ جبریلؑ آتے تو ان کی بات کامل توجہ سے کان لگا کر سنتے تھے اور جبریلؑ چلے جاتے تو آیت خوب یاد رہتی تھی اور حضورؐ اسے حاضرین کو سنا دیتے تھے۔

(۵) وحی کا نادرہ خصوصیت ہے جس سے انبیا اور دوسرے انسانوں کا فرق معلوم ہوتا ہے

وحی کے نزول کی کیفیت صدیقین بھی نہیں جان سکتے۔ جنہیں وحی سے سابقہ پڑتا رہا وہی نزول وحی کی کیفیت سے واقف تھے تاہم جب بعض نے سمجھنے کی خواہش ظاہر کی تو حضورؐ نے اتنا بتا دیا کہ عموماً فرشتہ انسانی شکل میں آتا ہے اور کبھی کبھی گھنٹی کی گونج سی سنائی دیتی ہے جو مجھے نڈھال کر دیتی ہے۔ بہرحال دونوں صورتوں میں کلام اللہ یاد قطعی رہ جاتا ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے سخت سردی کے موسم میں دیکھا ہے کہ وحی آتی تھی تو پیشانی مبارک پسینے سے تر ہو جاتی تھی۔

(۶) حضورؐ کا ارشاد ہے کہ اسلام کے پانچ رکن ہیں۔ ایک اس حقیقت کا اقرار کرنا کہ بس اللہ معبود ہے، اللہ کے علاوہ یہ حق اور کسی کو نہیں پہنچتا اور محمدؐ اس کے رسول ہیں۔ دوسرے نماز کو نماز کی طرح ادا کرنا۔ تیسرے زکوٰۃ دینا۔ چوتھے ماہ رمضان میں مسلسل روزے رکھنا۔ پانچویں حج کرنا۔

(۷) حضورؐ کا ارشاد ہے کہ ایمان کی ساٹھ سے زیادہ شاخیں ہیں۔ حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔

(۸) حضورؐ کا ارشاد ہے کہ سچا مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور جس کی زبان سے مسلمانوں کو اذیت نہ ہو۔ اور اصل مہاجر وہ ہے جو برائیوں سے ہجرت کرے۔ جن باتوں کو چھوڑنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے۔ انہیں چھوڑ دے۔

(۹) حضورؐ کا ارشاد ہے کہ شناسا اور غیر شناسا سب کو سلام کرنا اور سب کو کھانا کھلانا مسلمان کی صفت ہے۔

(۱۰) اسلام نام ہے ان باتوں کے ماننے اور ان باتوں پر عمل کرنے کا جنھیں حضورؐ نے ہم تک پہنچایا ہے۔ بات اسی کی مانی جاتی ہے اور بات پر عمل اسی کی کیا جاتا ہے جس سے دلی تعلق ہوتا ہے۔ جس کی دل میں جتنی جگہ اتنا ہی اس کے کہنے کے مطابق ایمان و عمل۔ لہذا حضورؐ نے فرمایا تم مومن کہلانے کے مستحق نہیں بن سکتے جب تک میں تمہاری نظر میں تمہارے ماں باپ اور تمہاری اولاد اور جملہ انسانوں سے بڑھ کر عزیز نہ ہو جاؤں۔ یعنی جب تک سب کی محبت و عظمت پر میری محبت و عظمت غالب نہیں آئے گی۔ تم میری بات کو سب کی باتوں پر ترجیح نہ دے سکو گے[1]

(۱۱) حضورؐ کا ارشاد ہے کہ ایمان کی حلاوت تین چیزوں پر موقوف ہے۔ ایک یہ کہ اللہ اور رسول تمام ماسوا سے زیادہ محبوب ہوں دوسرے جس سے دوستی رکھی جائے اللہ کے لیے رکھی جائے۔ تیسرے اللہ اور رسول کا دامن پکڑ لینے کے بعد دامن کو چھوڑنا یعنی مسلمان سے کافر جانا ایسا بُرا خیال کرے جیسا آگ میں گرنا بُرا ہے۔

(۱۲) حضورؐ کا ارشاد ہے کہ انصار سے محبت کرنی علامت ایمان ہے اور انصار سے دشمنی کرنی علامت نفاق ہے۔
(انصار مدینہ کے اخلاص کا جو مسلمان نمونہ ہو اس پر یہ حدیث صادق آئے گی۔)

(۱۳) ایک روز حضورؐ کے پاس کچھ صحابہ بیٹھے تھے حضورؐ نے فرمایا۔ مجھ سے وعدہ کرو اور میرے ہاتھ پر بیعت کرو کہ آئندہ کسی کو اللہ کا شریک نہیں گردانو گے چوری اور زنا نہیں کرو گے۔ اولاد کو قتل نہیں کرو گے تہمت تراشی نہیں کرو گے اور اوامر کی تعمیل میں پس و پیش نہیں کرو گے جس نے ان باتوں کی پابندی کر لی اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے اور جو شخص ان گناہوں کا ارتکاب کرے گا۔ اسے دنیا میں سزا مل گئی تو خیر اور اللہ نے راز افشا نہ ہونے دیا تو پھر وہ شخص اللہ کے حوالے ہے۔ اللہ خواہ معاف کرے۔ خواہ عذاب دے

(۱۴) حضورؐ کا ارشاد ہے ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ انسان اپنی بکریاں پہاڑ کی چوٹیوں پر اور ان مقامات پر جہاں بارش سے بچاؤ کی شکل ہو گی لیے لیے پھرے گا تاکہ اپنا دین فتنوں کی زد سے محفوظ رکھے۔ یعنی فتنوں اور فتنہ پردازوں سے بچنا اور دور بھاگنا چاہے گا۔

(۱۵) ایک دفعہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اپنے غلام پر بگڑ رہے تھے۔ بگڑتے بگڑتے ان کی زبان سے گالی نکل گئی۔ حضورؐ نے گالی دیتے سن لیا۔ فرمایا۔ ابوذر تم میں زمانہ جاہلیت کا اثر ابھی باقی ہے۔ تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں۔ مسلمانوں کو چاہیے جو خود کھائے وہی غلام کو کھلائے اور جو خود پہنے وہی غلام کو پہنائے۔ اور غلاموں سے اسی قدر کام لے جسے وہ کر سکیں۔ کام زیادہ ہو تو اس میں ان کا ہاتھ بٹائے

(۱۶) ایک روز حضورؐ نے فرمایا، دو مسلمان تلواریں لے کر آپس میں بھڑ جائیں اور ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو قتل کر دے تو قاتل بھی دوزخی ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پوچھا۔ یا رسول اللہ مقتول کیوں دوزخی ہے۔ فرمایا قصد تو اس کا بھی قتل کرنے ہی کا تھا۔

(۱۷) ایک روز فرمایا منافق کی چار چیزیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ جھوٹ بولتا ہے۔ دوسرے وہ وعدہ خلاف ہوتا ہے۔ تیسرے امانت میں خیانت کرتا ہے۔ چوتھے کسی سے جھگڑ پڑے تو گالیاں بکتا ہے۔

(۱۸) دین آسان شے ہے جو دین میں غلو اور شدت برتتا ہے اور اسے دشوار بناتا ہے وہ آسانی اور دشواری دونوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ درمیانی چال چلو اور صبح شام اللہ سے مدد مانگو۔

(۱۹) ایک روز کوئی خاتون ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ہاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ حضورؐ نے دریافت فرمایا کون خاتون ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے کہا۔ وہ ہیں جن کی کثرت نماز کا بڑا چرچا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ عبادت کا بوجھ اپنے اوپر اتنا ڈالنا چاہیے جو اٹھایا جا سکے۔ اللہ تمہیں تکلیف میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ حضورؐ کو وہی عبادت پسند تھی جسے انسان نباہ سکے اور جس پر کاربند رہ سکے[2]

---

[1] بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست ۔ اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست [2] آپ نے دیکھی ہو گی مینہ دھواں دھار برستا ہے تو تھوڑی دیر بعد پانی بہہ جاتا ہے لیکن نل بند ہونے کے بعد ٹپکنے لگے تو پانی نل کے نیچے کے پتھر میں سوراخ ڈال دیتا ہے (باقی نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

(۲۰) ایک دیہاتی کو حضورؐ نے تلقین کی کہ پانچ وقت کی نماز فرض ہے اور رمضان کے روزے رکھنے لازمی ہیں۔ دیہاتی نے سوال کیا۔ پانچ وقت کے علاوہ نمازیں اور رمضان کے علاوہ روزے کیا اور بھی ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ ہاں ہیں۔ مگر وہ نفلی ہیں۔ لازمی نہیں ہیں۔ دیہاتی نے کہا۔ میں فرض نمازوں اور فرض روزوں میں نہ اضافہ کروں گا اور نہ کمی کروں گا اور یہ کہہ کر چل دیا۔ حضورؐ نے فرمایا اگر اس نے سچ کہا ہے تو اسے فلاح نصیب ہو گئی۔

(۲۱) ایک مرتبہ حضور گھر سے باہر تشریف لائے تاکہ اعلان کر دیں کہ شب قدر رمضان کی فلاں تاریخ کو ہے۔ یا۔ دیکھا کہ دو مسلمان آپس میں لڑ رہے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ میں شب قدر کی خبر دینے نکلا تھا۔ لیکن ان دو مسلمانوں کی لڑائی کی وجہ سے خبر واپس لے لی گئی اب پچیس، ستائیس اور انتیس تین تاریخوں میں اسے تلاش کرنا۔

(۲۲) ایک صحابی نے پوچھا۔ عبادت کس طرح کرنی چاہیے۔ عبادت کی خوبی اور عبادت کا حسن کیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ عبادت اس طرح کیا کرو گویا اللہ تمہارے روبرو ہے اور تم اسے دیکھ رہے ہو یا کم از کم وہ تو تمہیں ضرور دیکھ رہا ہے۔ پھر ان ہی صحابی نے پوچھا۔ قیامت کب ہو گی۔ فرمایا جس سے پوچھا ہے، اس کا علم اس بارے میں پوچھنے والے سے زیادہ نہیں ہے۔ ہاں میں تمہیں قیامت کی علامتیں بتا سکتا ہوں۔ جب باندیوں کے بطن سے آقا جنم لیں اور جب اونٹوں کے چرواہے اونچی اونچی عمارتیں بنائیں تو سمجھ لو کہ قیامت قریب ہے۔ باقی قیامت ان چیزوں میں سے ہے جنہیں صرف اللہ جانتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَة

(۲۳) جو باتیں حلال ہیں وہ بھی عیاں ہیں اور جو باتیں حرام ہیں وہ بھی عیاں ہیں۔ لیکن ان کے درمیان کچھ مشتبہات ہیں جو ان سے بچتا رہا، اس نے اپنے دین کو بچا لیا۔ اور ان میں پھنس گیا وہ اس جانور کی مثل ہے جسے چراگاہ کی باڑھ ہی کے آس پاس چرنے کا شوق ہے تمام بادشاہوں کے قوانین کی ایک باڑھ ہوا کرتی ہے۔ اللہ کے قوانین کی باڑھ ممنوعات ہیں۔ یاد رکھو جسم میں ایک ٹکڑا ہے۔ اگر وہ درست ہے تو سارا جسم درست ہے اور وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ سنو جسم کا وہ ٹکڑا دل ہے

مطلب یہ ہے کہ ذہنیت خراب نہ ہونے دو۔

(۲۴) حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا۔ میں اسلام پر بیعت کرتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ ہر مسلمان کی بہی خواہی پر بھی بیعت کرو۔

(۲۵) ایک روز ارشاد فرمایا۔ جو شخص اپنے بال بچوں پر ثواب کی نیت سے روپیہ خرچ کرتا ہے اُسے ثواب ملتا ہے۔

(۲۶) حضورؐ ہمہ وقت وعظ و نصیحت نہیں فرماتے رہتے تھے، کسی کسی دن فرماتے تھے۔ کیوں کہ حضورؐ لوگوں پر زیادہ بار ڈالنا پسند نہیں کرتے تھے۔

(۲۷) حضورؐ کا ارشاد ہے، آسانی پیدا کرو۔ دشواری پیدا نہ کرو۔ خوش خبریاں سناؤ۔ نفرت نہ دلاؤ۔

(۲۸) حضورؐ کا ارشاد ہے، اللہ جس کی بہتری اور بھلائی چاہتا ہے اُسے دین کو سمجھنے کی قابلیت عطا فرماتا ہے۔

(۲۹) حضورؐ کا ارشاد ہے، حسد اگر جائز ہوتا تو دو قسم کے آدمیوں سے کیا جاتا۔ ایک جنہیں اللہ نے مالدار بنانے کے ساتھ مال کو اپنی راہ میں خرچ کرنے کی توفیق دی ہے۔ دوسرے جنہیں اللہ نے حکیمانہ عقل بخشی ہے۔ جس سے وہ لوگوں کو اچھی تعلیم دیتے ہیں

بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ

یہی حال عبادت کا ہے۔ عبادت وہ مفید ہے جو پابندی سے کی جائے کبھی کبھار کی بے تحاشا عبادت بالکل دھواں دھار مینہ کے مانند ہے اس سے دل پر اثر نہیں اور انسان کی سیرت نہیں بنتی۔ انسان کا کیرکٹر اور کردار نہیں بنتا۔ ؎ ہمارے زمانے کے راجاؤں، نوابوں اور بادشاہوں کی طرف تو اشارہ نہیں ہے؟

اور لوگوں کے اچھے فیصلے کرتے ہیں۔

(۳۰) حضورؐ کا ارشاد ہے:۔ میں جو علم اور ہدایت لے کر مبعوث ہوا ہوں اُس کی مثال موسلا دھار بارش کی سی ہے۔ زرم زمین پانی جذب کر لیتی ہے اور وہاں کچھ نہ کچھ اُگ آتا ہے اور سخت زمین میں پانی جذب نہیں ہوتا۔ رُک جاتا ہے۔ وہ بھی کام دیتا ہے۔ لوگ اسے پیتے ہیں اور اس سے آب پاشی کرتے ہیں۔ لیکن بنجر زمین نہ پانی کو روکتی ہے اور نہ جذب کرتی ہے۔ یہی حال علم و ہدایت کا ہے جسے اللہ میرے علم اور میری ہدایت سے فائدہ پہنچانا چاہتا ہے وہ خود بھی سیکھتا ہے اور دوسروں کو بھی سکھاتا ہے اور جسے ان کو سننے کی توفیق نہیں ملی وہ محروم رہ جاتا ہے۔

(۳۱) حضورؐ کا ارشاد ہے:۔ علم[1] کی کمی۔ جہالت[2] کی فراوانی اور زنا کی کثرت قربِ قیامت کی علامتیں ہیں۔ قیامت کے قریب عورتوں کی تعداد مردوں سے بہت زیادہ ہو جائے گی۔

(۳۲) حضورؐ کا ارشاد ہے:۔ قیامت کے قریب علم مفقود ہو جائے گا۔ جہالت عام ہو جائے گی اور فتنہ و فساد اور قتال بڑھ جائے گا۔

(۳۳) حضورؐ کا ارشاد ہے: قبر میں ہر شخص کے سامنے میری شبیہ لائی جائے گی اور ہر شخص سے پوچھا جائے گا کہ بتاؤ یہ کون ہیں۔ ان کے بارے میں تم کیا جانتے ہو۔ مسلمان فوراً کہے گا۔ محمد رسول اللہؐ ہیں۔ جو ہمارے پاس بیّن آیات اور ہدایات لے کر آئے تھے۔ ہم نے انہیں قبول کیا تھا اور ان کی اتباع کی تھی۔ یہ محمدؐ ہیں۔ یہ محمدؐ ہیں۔ یہ محمدؐ ہیں۔ (تین بار دوہرائے گا) حکم ہوگا۔ اچھا۔ آرام سے سوتے رہو۔ لیکن منافق اور متشکک کہیں گے۔ ہم نہیں پہچانتے۔

(۳۴) ایک روز کسی صحابی نے عرض کیا۔ یا رسول اللہؐ! فلاں امام نماز کو طول دیتے ہیں۔ اس وجہ سے میں جماعت میں شریک نہیں ہوتا۔ میں بہت کمزور ہوں۔ نماز کی طوالت برداشت کرنا میرے لئے دشوار ہے۔ حضورؐ اس وقت وعظ فرما رہے تھے حضورؐ نے بے حد غصے سے کہا۔ لوگ اسلام سے اکتاہٹ اور نفرت پیدا کرنی چاہتے ہیں۔ جو شخص نماز پڑھائے اُسے چاہئیے کہ نماز کو ہلکا رکھے۔ لمبی لمبی سورتیں نہ تلاوت کرے۔ مقتدیوں میں بیمار، ضعیف اور مصروف سب ہی قسم کے لوگ ہوتے ہیں اس بات سے آنکھیں نہیں بند کر لی جا ہئیں۔

(۳۵) ایک روز کسی عربی نے عرض کیا۔ یا رسول اللہؐ! انسان پڑی ہوئی چیز پائے تو اس کا کیا کرے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ سال بھر تک اس کے مالک کے منتظر رہو۔ شہرت دو کہ اس نوعیت کی چیز مجھے ملی ہے۔ مالک اتہ پتہ بتائے اور لے جائے۔ سال بھر بعد تمہیں اس کے استعمال کا حق ہے۔ انہی صحابی نے سوال کیا۔ یا رسول اللہ! لاوارث اونٹ مل جائے تو کیا کیا جائے۔ حضورؐ کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا۔ فرمایا۔ تمہیں اونٹ کی کیوں فکر ہوئی۔ اس کا مشکیزہ اور اس کی جوتیاں اس کے ساتھ ہیں۔ وہ اپنے پیٹ کے جمع شدہ پانی سے پیاس بجھائے گا اور درختوں کے پتے کھائے گا۔ لہٰذا اُسے ہاتھ مت لگاؤ۔ پھرنے دو۔

(۳۶) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک روز پوچھا۔ یا رسول اللہؐ! قیامت کے دن آپ کی شفاعت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہوگا۔ حضورؐ نے فرمایا۔ ابوہریرہ! میں جانتا تھا کہ تم یہ بات اوروں سے پہلے معلوم کرنی چاہو گے۔ کیونکہ باتیں معلوم کرنے کا تمہیں بڑا شوق ہے۔ خیر میری شفاعت مقدم اس کے لئے ہوگی جو سچے دل سے لا الٰہ الا اللہ کہے گا[3]۔

---

[1] علم سے مراد علم دین ہے اور دین سے تعلق۔ [2] جہالت سے مراد جہالت دین ہے اور دین سے بے تعلقی۔ [3] کس قدر بلیغ جواب ہے۔ سچے دل سے لا الٰہ الا اللہ کہنے کے بعد عمل میں بس وہی کمی رہ سکتی ہے جو بشریت کی وجہ سے رہ جائے لہٰذا ایسا مسلمان جس کے اعمال میں کم سے کم خرابی ہو شفاعت کا سب سے پہلے مستحق ہے۔

(۳۷) حضورؐ کا ارشاد ہے :۔ ایک زمانہ آئے گا کہ اللہ علم کو اٹھا لے گا اور جب عالم نہیں رہیں گے تو لوگ جاہلوں کو پیشوا بنا لیں گے اور اُن سے فتوے لیں گے ۔ وہ غلط سلط فتوے دیں گے اور خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے ۔

(۳۸) ایک دفعہ حضورؐ نے فرمایا ، جس سے حساب لیا گیا وہ عذاب میں مبتلا ہوا۔ حضرت عائشہ ؓ کہتی ہیں ۔ میں نے عرض کیا ۔ قرآن میں ہے کہ "عنقریب اس سے آسان حساب لیا جائے گا" تو کیا آسان حساب والے کو بھی عذاب میں مبتلا ہونا پڑیگا۔ حضورؐ نے فرمایا۔ آسان حساب سے مراد صرف اعمال کا پیش کرنا ہے ۔ اعمال تو ہر نیک و بد کے پیش کئے جائیں گے ۔ لیکن جن کے اعمال پر نکتہ چینی شروع ہوگی وہ عذاب سے نہیں بچیں گے ۔

(۳۹) حضورؐ کا ارشاد ہے : مکہ کو اللہ نے حرمت بخشی ہے ، مگر اُس حرمت کا خیال نہیں رکھا گیا ۔ اب جس کا اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان ہو وہ وہاں خون ریزی کبھی نہ کرے ۔ نہ وہاں کے درخت کاٹے ۔ اگر کوئی کہے کہ رسول اللہؐ نے جو مکہ میں قتال کیا ہے تو اس سے کہدو کہ رسول اللہؐ کو اجازت تھی ۔ تمہیں اجازت نہیں ہے اور مجھے بھی ایک دن بلکہ ایک ساعت کے لئے اجازت ملی تھی مکہ کی حرمت ویسی ہی رہے گی جیسی اللہ نے قرار دی ہے ۔ یہ حکم حاضرین کو پہنچ گیا ۔ حاضرین اسے اُن تک پہنچادیں جو حاضر نہیں ہیں ۔ (تا قیام قیامت یہ حکم ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو پہنچائے)

(۴۰) حضورؐ کا ارشاد ہے : جس نے میری طرف سے وہ باتیں کہیں جو میں نے نہیں کہی ہیں ، اور مجھ سے وہ باتیں منسوب کیں جو میں نے نہیں کہی ہیں اس کا ٹھکانہ جہنم ہے ۔

(۴۱) حضورؐ کا ارشاد ہے : میرے نام پر نام رکھ سکتے ہو ۔ مگر میری کنیت اختیار نہ کرو ۔

(۴۲) حضورؐ کا ارشاد ہے :۔ جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے مجھے ہی دیکھا ، کیونکہ شیطان میرا ہم شکل نہیں بن سکتا

(۴۳) ایک روز عشا کا سلام پھیر کر حضورؐ نے فرمایا :۔ سوچو تو آج کی رات روئے زمین پر جو لوگ چل پھر رہے ہیں سو سال بعد اُن میں سے کوئی باقی نہ رہے گا ۔

(۴۴) حج وداع کے موقع پر حضورؐ نے فرمایا : میرے پیچھے کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کو قتل کرنے لگو ۔ (مسلمان کا مسلمان کو قتل کرنا ایسا ہے جیسے کافر ہو جانا)

(۴۵) ایک صحابی نے حضورؐ سے عرض کیا ، بعض مسلمان کفار سے اس لئے لڑتے ہیں کہ اُن کے خلاف کچھ ذاتی جذبہ اور غصہ ہوتا ہے اور بعض کے دل میں جذبۂ حمیت کار فرما رہتا ہے ۔ کیا ایسے مسلمانوں کا جہاد ، جہاد کہلانے کا مستحق ہے ۔ حضورؐ نے فرمایا ۔ جہاد صرف وہ ہے جو اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے کیا جائے ۔

(۴۶) ایک روز حضورؐ نے فرمایا ، خضر اور موسےٰ (علیہما السلام) جب کشتی میں سوار چلے جا رہے تھے تو ایک چڑیا کشتی کے کنارے پر آ بیٹھی اور اس نے اپنی چونچ سمندر میں ڈال کر پانی پیا ۔ خضر (علیہ السلام) نے کہا ۔ میرا اور آپ کا علم اللہ کے علم کے مقابلے میں بس اتنا ہے جتنا وہ پانی سمندر کے مقابلے میں جو چڑیا کے پیٹ میں گیا ہے [۱]

(۴۷) حضورؐ کا ارشاد ہے : وضو کرتے رہنے کی وجہ سے قیامت کے دن میری اُمت کی پیشانیاں روشن ہوں گی ۔ تم میں

---

[*] ایک اور حدیث میں کانٹوں کو کاٹنے سے بھی منع فرمایا ہے ۔ صرف اذخر (گھاس) کو مستثنےٰ کیا ہے ، جو گھروں میں استعمال ہوتا ہے اور تدفین کے وقت کام آتا ہے ۔

[۱] انبیاء کے علم کو اللہ کے علم سے یہ نسبت ہے ، لہٰذا غیر انبیاء کا علم تو اللہ کے علم کے مقابلے میں کوئی چیز ہی نہیں ہے ۔

سے جو شخص اپنی پیشانی کی روشنی بڑھا سکتا ہے وہ بڑھالے (یعنی زیادہ سے زیادہ باوضو رہے)

(۴۸) حضورؐ کا ارشاد ہے: جب کسی چیز کو پیو تو اس چیز پر پھونکیں مت مارو[1]

(۴۹) حضورؐ کا ارشاد ہے: سو کر اٹھنے کے بعد پانی کے برتن میں ہاتھ بے دھوئے مت ڈالا کرو۔ ہاتھ دھو لیا کرو۔

(۵۰) حضورؐ جوتا پہلے دائیں پیر میں پہنتے تھے، پھر بائیں پیر میں۔ کنگھا بھی دائیں ہاتھ سے کرتے تھے اور تمام (پاکیزہ) کام دائیں طرف سے شروع فرماتے تھے۔

(۵۱) حضورؐ دو قبروں کے پاس سے گزر رہے تھے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ دونوں مُردے عذاب میں مبتلا ہیں۔ ایک اس لئے کہ پیشاب کرتے وقت حجاب کی ضرورت نہیں سمجھتا تھا بے حجاب پیشاب کرنے بیٹھ جاتا تھا۔ دوسرا اس لئے کہ اُسے چغلیاں کھانے کی عادت تھی۔

(۵۲) ایک دن کوئی دیہاتی آیا ہوا تھا اُسے پیشاب لگا۔ اس نے مسجد ہی میں کھڑے کھڑے پیشاب کر دیا۔ لوگوں نے پکڑ لیا۔ حضورؐ نے فرمایا۔ اسے چھوڑ دو۔ پیشاب پر پانی بہا دو۔ تم آسانی پیدا کرنے والے ہو۔ دشواری پیدا کرنے والے مت بنو۔

(۵۳) حضورؐ رات کو جب سو کر اٹھتے تھے تو مسواک سے دانت ضرور صاف کرتے تھے۔

(۵۴) حضورؐ کا ارشاد ہے، سونے کے لئے لیٹو تو وضو کر کے لیٹو اور یہ دعا پڑھو۔ سوتے وقت انہیں آخری الفاظ بناؤ۔ یعنی پھر بولو نہیں۔ اُس رات میں اگر تم مرجاؤ گے تو باایمان مرو گے۔ دعا یہ ہے اَللّٰھُمَّ اَسْلَمْتُ وَجْھِیْ اِلَیْکَ وَاَلْجَاْتُ ظَھْرِیْ اِلَیْکَ رَغْبَةً وَّرَھْبَةً اِلَیْکَ لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَاءَ مِنْکَ اِلَّا اِلَیْکَ اَللّٰھُمَّ اٰمَنْتُ بِکِتَابِکَ الَّذِیْ اَنْزَلْتَ وَبِنَبِیِّکَ الَّذِیْ اَرْسَلْتَ۔

(۵۵) حضورؐ نے تین دن سے زیادہ سوگ کرنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ صرف شوہر کی موت پر بیوی کو چار مہینے اور دس دن کے سوگ کا حکم ہے۔ اس عرصے میں عورت نہ سرمہ لگا سکتی ہے، نہ خضاب لگا سکتی ہے اور نہ عصب کے سوا کوئی رنگین کپڑا پہن سکتی ہے لیکن عورت جنازے کے ساتھ شوہر کے بھی نہیں جا سکتی۔

(۵۶) حضورؐ کا ارشاد ہے، پانچ چیزیں مجھے ایسی عنایت ہوئی ہیں جو پہلے کسی کو نہیں ملیں۔ ایک یہ کہ مہینہ بھر کی مسافت کے فاصلے تک کے لوگوں کے دلوں میں رعب ڈال کر اللہ نے میری مدد فرمائی ہے۔ دوسرے میرے لئے اور میری امت کے لئے ساری زمین مسجد ہے اور ذریعہ طہارت ہے۔ تیسرے میرے لئے اور میری امت کے لئے اموال غنیمت حلال ہیں۔ چوتھے مجھے شفاعت کا حق دیا گیا ہے۔ پانچویں یہ کہ میں تمام عالم کے لئے مبعوث ہوا ہوں۔ پہلے کل نبی اپنی اپنی قوم کے لئے مبعوث ہوتے تھے۔

(۵۷) حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔ میں مکہ میں تھا۔ میرے مکان کی چھت شق ہوگئی اور جبریل ؑ نازل ہوئے انھوں نے میرا سینہ چاک کیا اور آبِ زمزم سے دھویا۔ پھر وہ ایک سونے کا طشت لائے جو ایمان و حکمت سے بھرا ہوا تھا اُسے میرے سینہ پر بہایا گیا اور سینہ ملا کر بند کر دیا گیا۔ پھر جبریل ؑ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے آسمان دنیا کی سمت لے گئے جب میں وہاں پہنچا تو جبریل ؑ نے آسمان دنیا کے داروغہ سے کہا۔ کھولو۔ داروغہ نے پوچھا۔ کون ہے۔ جبریل ؑ نے کہا میں ہوں جبریل اور میرے ساتھ محمد رسول اللہ ؐ ہیں۔ داروغہ بولا۔ کیا محمد رسول اللہ ؐ کو بلایا گیا ہے۔ جبریل ؑ نے جواب دیا ہاں۔ داروغہ نے آسمان کا دروازہ کھول دیا اور ہم آسمان کے اوپر چڑھے۔ وہاں ایک صاحب بیٹھے تھے جن کے دائیں بائیں روحیں ہی روحیں تھیں وہ

[1] پھونکیں مارنے سے سانس کے جراثیم اس چیز میں جا ملتے ہیں۔ چودہ سو برس پہلے نبی کے سوا یہ بات کون جان سکتا تھا۔

بائیں طرف دیکھتے تھے تو ہنسنے لگتے اور بائیں طرف دیکھتے تھے تو رونے لگتے تھے۔ مجھے دیکھ کر ان صاحب نے کہا۔ خوش آمدید اے نیک نبی اور اے نیک بیٹے۔ میں نے جبریئل ؑ سے دریافت کیا۔ یہ کون ہیں۔ جبریئل ؑ نے بتایا۔ یہ آدم ؑ ہیں اور ان کے دائیں بائیں انہی کی اولاد ہے۔ دائیں جانب جنتی ہیں اور بائیں جانب جہنمی ہیں۔ جب یہ دائیں جانب نظر کرتے ہیں تو ہنستے ہیں اور بائیں جانب دیکھتے ہیں تو روتے ہیں۔ اس کے بعد جبریئل ؑ مجھے دوسرے آسمان پر لے گئے۔ دوسرے آسمان کے داروغہ سے بھی وہی گفتگو رہی اور دروازہ کھلا۔ حضور ؐ فرماتے تھے کہ میں نے آسمانوں میں آدم ؑ۔ ادریس ؑ۔ موسیٰ ؑ۔ عیسیٰ ؑ اور ابراہیم ؑ کو دیکھا۔ جب میں ادریس ؑ کے پاس سے گزرا تو ادریس ؑ نے اے نیک نبی اور اے نیک بھائی کہہ کر خوش آمدید فرمایا۔ موسیٰ ؑ اور عیسیٰ ؑ کی زبان پر بھی اے نیک نبی اور اے نیک بھائی کے الفاظ تھے۔ لیکن ابراہیم ؑ نے آدم کی طرح اے نیک نبی اور اے نیک بیٹے کے الفاظ سے مخاطب کیا۔

ابن عباس رضؓ اور ابو حبۃ الانصاری رضؓ کا بیان ہے کہ حضور ؐ نے فرمایا۔ جبریئل مجھے اور اوپر لے گئے، جہاں قلمیں چلنے کی آواز سنائی دیتی تھی۔

میں واپس ہونے لگا تو موسیٰ ؑ نے مجھ سے سوال کیا کہ اللہ نے تمہاری امت پر کیا فرض کیا ہے۔ میں نے کہا۔ پچاس وقت کی نماز۔ موسیٰ ؑ نے دو دفعہ مجھے لوٹایا کہ روزانہ اتنی نماز پڑھنی بہت شاق ہوگی۔ میں نے جا جا کر نمازوں کی تعداد کم کرائی حتےٰ کہ پچاس کی بجائے پانچ وقت کی نماز رہ گئی۔ موسیٰ ؑ پانچ کو بھی کم کرانا چاہتے تھے۔ لیکن مجھے شرم آئی کہ میں اللہ تعالیٰ سے پانچ نمازوں میں بھی کمی کے لیے عرض کروں۔

جبریئل ؑ مجھے اور اوپر سدرۃ المنتہیٰ تک لے گئے تھے، جسے مختلف رنگوں نے محیط کر رکھا تھا۔ مجھے جنت میں بھی لے جایا گیا، وہاں میں نے مشک کی مٹی دیکھی [1]

اس حدیث کے راوی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت ابوذر اور حضرت بن عباس اور حضرت ابو حبہ انصاری رضی اللہ عنہم سے سن کر معراج کا یہ تھوڑا سا حال انھوں نے بیان کیا ہے۔ معراج کا بہت سا حال دوسری حدیثوں میں ہے

[1] اس حدیث کو پڑھتے وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مندرجہ ذیل واقعہ یاد رکھئے: حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صبح ہوتے ہی معراج کا حال سنانا شروع کیا تو کفار حضرت ابوبکر رضؓ کے گھر پہنچے اور طنزاً کہنے لگے۔ لیجئے صاحب! آپ کے پیغمبر آسمان کی سیر کر آئے۔ حضرت ابوبکر رضؓ نے پوچھا۔ کون کہتا ہے۔ کفار نے جواب دیا۔ کہنے گا کون، وہی کہہ رہے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضؓ بولے۔ وہ کہہ رہے ہیں تو ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ وہ جھوٹ نہیں کہہ سکتے۔

میرا اور آپ کا، اور کل عام مسلمانوں کا بس اتنا ہی جذبہ بخشش کے لئے کافی ہے کہ "اگر اُن کا کہنا ہے تو بالکل ٹھیک ہے۔ اور" اگر انھوں نے ایسا کیا تھا تو بالکل ٹھیک کیا تھا۔"

اس حدیث کو میں نے اپنی لڑی میں دانستہ پرو دیا ہے، تاکہ یہ جذبہ پیدا کرا دوں۔ ورنہ میں لڑی میں حضور ؐ کے صرف ذاتی اقوال و افعال پرو رہا ہوں۔ اس حدیث کا ذاتی اقوال و افعال سے تعلق نہیں ہے، یہ تو اللہ کے ایک غیر معمولی انعام اور اکرام کا تذکرہ ہے۔

حضرت ابوبکر رضؓ نے ایک اور بات بھی کہی تھی۔ وہ بھی دلنشین کر لینے کے لائق ہے، انھوں نے کہا۔ "ہم اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ اپنا ایلچی حضور ؐ کے پاس بھیج رہا ہے پھر کسی دن اللہ نے انہیں اپنے پاس بلا لیا تو یہ کون سے اچنبھے کی بات ہے"۔ سوچنے کی چیز فقط ایک ہے کہ حضور ؐ سچے تھے یا نہیں اور سوچنے کی چیز بس اتنی ہے کہ اس کردار کا جو نبوت سے قبل اور نبوت کے بعد حضور ؐ کا تھا، جھوٹ بول سکتا ہے۔ جس نے دنیا کو اخلاق سکھایا ہو، وہ اپنے ہم جنسوں پر نہیں، اپنے خالق پر بہتان باندھ سکتا ہے؟

(۵۸) حضورؐ کا ارشاد ہے: جو شخص ہماری طرح ہمارے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے اور ہمارا ذبیحہ کھائے وہ مسلمان ہے۔ اللہ اور اللہ کا رسولؐ اس کا ذمہ دار ہے۔ تم اس ذمہ داری کو مت توڑو۔

(۵۹) ایک دفعہ حضورؐ بھول کر نماز کی رکعتیں کم یا زیادہ پڑھ گئے۔ صحابہ نے خیال کیا شاید رکعتوں کو کم یا زیادہ کرنے کا حکم ہو گیا ہے۔ لیکن حضورؐ نے فرمایا۔ نہیں۔ میں انسان ہوں۔ میں بھی بھول سکتا ہوں۔ میں بھول جایا کروں تو یاد دلا دیا کرو۔ اسی موقع پر حضورؐ نے سجدہ سہو کی تعلیم دی۔

(۶۰) ایک دفعہ بحرین سے اتنا مال و زر آیا کہ اتنا پہلے کبھی کہیں سے نہیں آیا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا اسے مسجد میں رکھو۔ نماز کے وقت حضورؐ نماز کے لئے تشریف لائے اور نماز سے فارغ ہو کر مال و زر کو تقسیم کرنا شروع کیا اور ایک ایک حبہ تقسیم کر دیا اپنے لئے کچھ نہیں رکھا۔

(۶۱) حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ ایک بدوی صحابی تھے۔ انھوں نے حضورؐ سے کہا کہ میں اپنے قبیلے کی امامت کیا کرتا ہوں۔ لیکن اب نابینا ہو گیا ہوں۔ اس وجہ سے بارش میں مجھے یہ دقت پیش آتی ہے کہ میرے اور میرے قبیلے کے درمیان نالہ ہے وہ پانی سے بھر جاتا ہے اور میں نماز پڑھانے نہیں جا سکتا۔ آپ اگر ایک بار میرے گھر پر تشریف لے آئیں اور وہاں نماز پڑھ لیں تو پھر مجھے امامت کرنے نہیں جانا پڑے گا۔ قبیلہ نماز پڑھنے میرے گھر آ جایا کرے گا۔ حضورؐ نے فرمایا۔ میں آؤں گا چنانچہ حضورؐ تشریف لے گئے اور جہاں کہا گیا وہاں نماز پڑھ لی۔ نماز کے بعد حضرت عتبان ؓ نے خزیرہ (ایک قسم کا کھانا) پیش کیا اور لوگ بھی موجود تھے۔ کسی نے کہا۔ مالک بن دخشن کہاں ہے۔ دوسرے نے کہا۔ وہ منافق ہے۔ حضورؐ نے فرمایا ایسا نہ کہو اُس نے لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کر لیا ہے اور اس اقرار میں اللہ کی ذات کے سوا کچھ اور مقصود نہیں ہے۔ حاضرین نے عرض کیا۔ اللہ اور اللہ کے رسولؐ زیادہ واقف ہیں۔ لیکن وہ منافقوں کی خیر خواہی کی طرف ڈھلا رہتا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ نہیں۔ جو شخص لا الٰہ الا اللہ کہے اور اس سے مقصد رضائے الٰہی کے سوا کچھ اور نہ ہو اُسے اللہ نے دوزخ پر حرام کر دیا ہے۔

(۶۲) حضورؐ کی وفات کا وقت قریب تھا۔ حضورؐ نے سیاہ چادر اوڑھ رکھی تھی اُسے چہرہ مبارک پر سے ہٹا کر فرمایا یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو۔ انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو معبد بنا رکھا ہے۔

(۶۳) حضورؐ کا ارشاد ہے: ۔جماعت کی نماز گھر کی نماز سے پچیس گنی فضیلت رکھتی ہے۔

(۶۴) حضورؐ کا ارشاد ہے: ایک مومن دوسرے مومن کے لئے عمارت کے مانند ہوتا ہے جس طرح عمارت کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو سنبھالتا ہے اسی طرح مومن مومن کو سنبھالتا ہے۔ حضورؐ نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں گانٹھ کر دکھایا کہ اس طرح مومن کو مومن سے گتھا رہنا چاہیے۔

(۶۵) حضورؐ عشاء سے قبل سونے کو اور عشاء کے بعد باتیں کرنے کو بُرا سمجھتے تھے۔

(۶۶) ایک روز حضورؐ نے فرمایا: جس دن اللہ کے سایہ (رحمت) کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا اس دن اللہ سات قسم کے آدمیوں کو خاص طور پر اپنے سائے کے نیچے جگہ دے گا۔ ایک حاکم عادل کو۔ دوسرے جوان عابد کو۔ تیسرے ایسے لوگوں کو جن کا دل مسجد کی طرف کھنچتا ہو۔ چوتھے ایسے باعزت لوگوں کو جنہیں خوب صورت عورتیں خود بلائیں مگر وہ کہہ دیں کہ ہم اللہ سے ڈرتے ہیں پانچویں ایسے لوگوں کو جو اس قدر چھپا کر خیرات کریں کہ ان کے ایک ہاتھ کی دوسرے ہاتھ کو خبر نہ لگے۔ چھٹے اور ساتویں ایسے دو آدمیوں کو جن کی باہمی دوستی خالص اللہ کے لئے ہے۔

(۶۷) وفات سے قبل حضورؐ کے مرض نے شدت پکڑی تو اس وقت حضورؐ حضرت عائشہ ؓ کے ہاں تھے۔ وہاں سے حضورؐ

نے دوسری ازواج مطہرات کو کہلایا کہ میں چل نہیں سکتا، تم سب مجھے اجازت دو تو اب میں یہیں رہوں۔ حضورؐ باری باری کرکے بیویوں کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ بیویوں نے اپنی باریاں چھوڑ دیں اور حضرت عائشہ رضؓ کے ہاں قیام رکھنے کی اجازت دے دی۔

(۶۸) حضورؐ جب گھر کے اندر ہوتے تھے تو گھر کے کام میں بیویوں کا ہاتھ بٹاتے تھے۔

(۶۹) حضورؐ مرض وفات میں بھی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنی چاہتے تھے۔ لیکن جا نہ سکتے تھے۔ ایک دفعہ گئے بھی تو دو آدمیوں کے سہارے اور پاؤں کو گھسیٹتے ہوئے گئے۔ حضرت ابوبکرؓ امامت کر رہے تھے۔ انھوں نے پیچھے ہٹنا چاہا لیکن حضورؐ نے اشارے سے روک دیا اور حضرت ابوبکرؓ کے برابر بیٹھ کر نماز ادا کی۔

(۷۰) وفات سے کچھ دیر پہلے حضورؐ نے حجرے کا پردہ ہٹا کر مسجد کی طرف نگاہ کی۔ جماعت کھڑی تھی۔ لوگوں کو نماز پڑھتے دیکھ کر حضورؐ کے چہرہ پر بشاشت اور مسرت کے آثار آگئے۔ حضورؐ مسکرائے۔ لوگ سمجھے کہ حضورؐ تشریف لائیں گے۔ حضرت ابوبکر رضؓ پیچھے ہٹ کر جماعت میں جاملے۔ لیکن حضورؐ نے اشارے سے کہا کہ نماز پوری کرلو اور پردہ چھوڑ دیا۔ یہ آخری دن کی بات تھی۔

(۷۱) ایک اور موقع پر (مرض وفات کے بہت پہلے) کسی جگہ حضرت ابوبکرؓ امامت کر رہے تھے کہ وہاں حضورؐ تشریف لے آئے۔ لوگوں نے تالیاں بجا کر حضرت ابوبکر رضؓ کو متوجہ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ پہلی صف میں آکھڑے ہوئے۔ حضورؐ نے اشارہ فرمایا کہ نماز پڑھائے جاؤ لیکن حضرت ابوبکر رضؓ آگے نہ بڑھے اور حضورؐ نے نماز پڑھائی۔ نماز سے فارغ ہو کر حضورؐ نے حضرت ابوبکر رضؓ سے کہا۔ جب میں نے حکم دے دیا تھا تو تم نے امامت کیوں نہیں کی۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا۔ ابن ابی قحافہؓ [2] سے یہ ممکن تھا کہ آپ کے آگے کھڑا ہو۔ پھر حضورؐ نے فرمایا۔ نماز میں ایسی ضرورت پیش آیا کرے تو سبحان اللہ کہا کرو۔ تالیاں مت بجایا کرو۔ تالیاں بجانا عورتوں کا کام ہے۔

(۷۲) حضورؐ نے ایک روز فرمایا:۔ جو شخص نماز میں سجدہ کرتے وقت اپنا سر امام سے پہلے اٹھا لیتا ہے اُسے کیا اس بات کا خوف نہیں ہے کہ اللہ کہیں اس کے سر کو گدھے کا سا نہ کر دے [3]۔

(۷۳) حضورؐ کا ارشاد ہے: تم پر کسی ایسے حبشی کو حاکم بنا دیا جائے جس کا سر کالے انگور جیسا سیاہ ہو تو اس کی بھی اطاعت کرو۔ (مسلمان حاکم اپنی اطاعت تھوڑا ہی کراتا ہے، اللہ کے احکام کی اطاعت کراتا ہے)

(۷۴) حضورؐ نے ایک روز فرمایا۔ میں نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہوں تو نماز کو طویل کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن کسی بچّے کے رونے کی آواز آجاتی ہے تو مجھے اچھا نہیں لگتا کہ اُس کی ماں بے چین ہو۔ لہٰذا نماز کو مختصر کر دیتا ہوں۔

(۷۵) حضورؐ کا ارشاد ہے، فرض نمازوں کے علاوہ نماز پڑھنی ہو تو گھر میں پڑھا کرو۔

(۷۶) حجرہ چونکہ چھوٹا تھا حضورؐ نے رات کے نفل حجرے سے باہر نکل کر پڑھنے شروع کر دیئے۔ صحابہؓ نے بھی حضورؐ کی اقتدا کی۔ دو تین راتیں اسی طرح گزر گئیں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ رات کی نماز کہیں فرض نہ ہو جائے۔ اور پھر حجرے ہی میں رات کے نفل پڑھنے لگے۔

(۷۷) حضورؐ نماز میں قرات اور تکبیر تحریمہ کے درمیان توقف فرمایا کرتے تھے اور چپکے چپکے یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔

---

[1] حجرہ حضرت عائشہ رضؓ کا دروازہ مسجد میں کھلتا تھا اور دوسری ازواج مطہرات کے حجرے بھی مسجد سے متصل تھے۔

[2] ابوقحافہ رضؓ حضرت ابوبکر رضؓ کے والد کی کنیت تھی۔

[3] مقتدیوں کو امام کی پوری اقتدا کرنی چاہیئے۔ گھبراہٹ نہ برتنی چاہیئے۔

اللّٰھُمَّ باعد بینی وبین خطایای کما باعدت بین المشرق والمغرب۔ اللھم نقنی من الخطایا کما ینقی الثوب الابیض من الدنس۔ اللھم اغسل خطایای بالماء والثلج والبرد۔

الٰہی مجھ سے گناہوں کو اتنا دور رکھ جتنا مشرق سے مغرب سے دور ہے۔ الٰہی مجھے گناہوں سے اس طرح پاک صاف کر دے جس طرح سفید کپڑا میل کچیل سے پاک صاف ہوتا ہے۔ الٰہی میری خطاؤں کو (اپنی رحمت کے) پانی (رحمت کی) برف اور (رحمت کے) اولوں سے دھو ڈالا۔

(۷۸) حضور کا ارشاد ہے: معراج کی رات میں نے جنت کو بھی دیکھا اور جہنم کو بھی دیکھا جہنم میں ایک بلی کسی عورت کو نوچ رہی تھی۔ فرشتوں نے مجھے بتایا کہ اس عورت نے بلی کو باندھ دیا تھا۔ اور اسے بھوکا مار ڈالا تھا۔ نہ آزاد کرتی تھی اور نہ خود کچھ کھلاتی تھی۔

(۷۹) ایک روز حضور نماز پڑھا رہے تھے۔ حضور رکوع کر کے اٹھے تو فرمایا: سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ مقتدیوں میں سے کسی نے باآواز بلند کہا: ربنا لک الحمد حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔ حضور نے سلام پھیرنے کے بعد پوچھا۔ یہ کس کی آواز تھی۔ ان صحابی نے عرض کیا۔ حضور میں بولا تھا۔

حضور نے فرمایا۔ (تمہارے الفاظ بہت اچھے ہیں) میں نے دیکھا کہ تیس سے زائد فرشتے انہیں لکھنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانی چاہتے تھے۔

(۸۰) ایک دفعہ حضور نے عصر کی نماز پڑھائی لیکن سلام پھیرنے کے بعد بیٹھے نہیں اور دعا وغیرہ نہیں کی بلکہ عجلت کے ساتھ ازواج مطہرات میں سے کسی کے حجرے میں تشریف لے گئے اور پھر فوراً واپس آگئے۔ صحابہ اس بات سے کچھ سراسیمہ اور حیران سے تھے۔ حضور نے اسے محسوس کیا اور فرمایا۔ کسی قدر سونا بچا رکھا تھا۔ مجھے اچھا نہیں معلوم ہوا کہ اللہ کی عبادت میں اُس کا خیال رہے لہٰذا میں یہ کہنے گیا تھا کہ اُسے جلد از جلد تقسیم کر دیا جائے۔

(۸۱) حضور فرمایا کرتے تھے کہ کچا لہسن یا کچی پیاز کھا کر میرے قریب مت آیا کرو بلکہ مسجد میں بھی مت آیا کرو۔ گھر میں بیٹھے رہا کرو۔

(۸۲) حضور کا ارشاد ہے کہ جمعہ کے دن غسل کرنا ہر بالغ پر واجب ہے[1] اور عطر لگانے کی مقدرت ہو تو عطر لگانا بھی واجب ہے۔

(۸۳) حضور کا ارشاد ہے کہ جو شخص نماز جمعہ کے لئے مسجد جائے اور دو آدمیوں میں تفریق نہ کرے یعنی دو آدمیوں کے درمیان زبردستی گھس کر اور ٹھنس کر نہ بیٹھے اور خطبہ خاموشی کے ساتھ سُنے تو پچھلے جمعہ سے اس جمعہ تک کے اُس کے گناہ اللہ معاف فرما دے گا۔

---

[1] اسلام صفائی اور پاکیزگی کو اتنی اہمیت دیتا ہے کہ ہفتہ میں ایک دفعہ کا غسل اُس نے واجب قرار دیا ہے۔ جو روز غسل کرے اُس کے کیا کہنے ہیں۔

محمد مسعود احمد
ایم - اے

سماع

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام
حرام میری نگاہوں میں نَے و چنگ و رباب

مسئلہ سماع ایک مابہ النزاع معرکہ آرا مسئلہ رہا ہے ۔ اس پر بہت کچھ لکھا گیا، کچھ موافق، کچھ مخالف، کچھ انتہا پسندانہ، کچھ جانبدارانہ، کچھ متعصبانہ، کچھ متشددانہ، مگر ساتھ ہی کچھ منصفانہ بھی، لیکن زیادہ سماع کے موافق خیالات کی ترویج ہوئی ۔ کیونکہ طاؤس و رباب کے چٹخاروں کے جو لوگ خوگر ہو چکے ہیں وہ ان چٹخاروں ہی کو دل کی زندگی سمجھتے ہیں ـــــــ اس میں شک نہیں ـــــ

کھل تو جاتا ہے مغنی کے بم و زیر سے دل
لیکن ـــــــــ نہ رہا زندہ و پائندہ تو کیا دل کی کشود

ایک طبقہ تو ایسا ہے جس کی نظر میں شعر گوئی ہی مذموم ہے ۔ یہ طبقہ اپنے دعوے کے لئے اس آیت سے استدلال کرتا ہے

وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُنَ ، اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ و
اَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ ـ

مگر آگے جو استثنا کر دیا گیا ہے اس کو چھپا لیا جاتا ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے :-

اِلَّا الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

قرآن پاک نے عظمت کردار کے لئے معیار یہ رکھا ہے کہ اس میں دو خوبیاں ہوں ۔ ایمان اور عملِ صالح ، اگر یہ دونوں خوبیاں ہیں تو ایسے شخص کی شاعری ملت کے لئے پیغامِ حیات اور دشمنانِ دین کے لئے مقامِ مرگ ہے

وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو دربارِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم میں جو مقام حاصل تھا وہ اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں شاعری دلی احساسات و جذبات اور روحانی واردات و تاثرات کی موزوں ترجمانی ہے اور اسلام نے انسان کے فطری جذبات کو نہیں دبایا بلکہ ابھارا ہے ۔ ہاں ان کو ایک صحیح نہج پر لگا دیا ہے کہ ترقی بغیر اس کے ممکن نہ تھی ۔ اس لئے شاعری و شعر گوئی اسلامی نقطۂ نظر سے مذموم نہیں بشرطیکہ اس سے تعمیرِ حیات ہوتی ہو ۔

اس مضمون میں شعر گوئی کے حسن و قبح سے بحث مقصود نہیں بلکہ لفظ "سماع" کی تحقیق مقصود ہے ۔ سماع کے لغوی معنی تو "سننے" کے ہیں ، عرفِ عام میں مزامیر کے ساتھ جو کلام پڑھا جائے اس کو سماع کہا جاتا ہے ۔ قدیم اہلِ تصوف و شیوخ کے ہاں اس سے ہرگز یہ مراد نہ تھی بلکہ دینی اور روحانی مجالس میں صرف نعتیہ ، حمدیہ یا عاشقانہ کلام پڑھنے کو سماع سے تعبیر کیا جاتا تھا ۔ متانس

نے جو غلو اختیار کیا اور فروعات کو شامل کیا یہ انھیں کی ایجاد ہے۔

نام نہاد صوفیا نے جو خلاف شریعت روش اختیار کی اس کا اصل سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے طریقت کو شریعت سے علیحدہ تصور کر لیا ہے حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے۔ شریعت و طریقت میں تو باہم کچھ فرق نہیں۔ چنانچہ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :-

"طریقت و شریعت عین یک دگر اند، سر موئے از مخالفت درمیان ایشان واقع نیست
فرق اجمال و تفصیل ست و استدلال و کشف، ہرچہ مخالف شریعت است مردود است
کل حقیقۃ ردّ الشریعۃ فھو زندقۃ [1]

طریقت و شریعت بالکل ایک ہی ہیں۔ ان میں ذرہ برابر فرق نہیں، اگر کوئی فرق ہے تو اجمال و تفصیل اور استدلال و کشف کا ہے جو باتیں مخالف شریعت ہیں مردود ہیں، ہر وہ حقیقت جس کو شریعت نے رد کر دیا ہو وہ زندقہ الحاد ہے۔

اسی غلط فہمی کی بنا پر نکلسن[2]، میکڈانلڈ[3] وغیرہ نے اسلامی تصوف کو عیسائی رہبانیت کا مرہونِ منت قرار دیا ہے اور ڈاکٹر تارا چند جیسے فاضل شخص نے یہ لکھدیا ہے کہ :-

"تصوف ایک ایسا مسلک ہے جس میں انتہائی خود سپردگی ہے اور جس کا جذبہ "عشق" ہے شاعری اور رقص و سرود ذریعہ عبادت ہے[4]"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں :-

"چشتی اور سہروردی دونوں سلسلے رقص و سرود کو ذکر کا لازمی عنصر قرار دیتے ہیں[5]"

اور نکلسن کے ترجمے پر قناعت کرکے سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ پر یہ الزام لگا دیا ہے :-

"حضرت ہجویری علیہ الرحمۃ سماع کے جواز کے لئے احادیث اور اقوال صوفیا پیش کرتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ سماع مذہب میں ایک اہم کردار انجام دیتا ہے[6]"

خدا بھلا کرے پروفیسر گب[7] کا کہ انہوں نے اسلام اور شریعت مسلمہ کو ہی تصوف کی اساس ٹھہرایا ہے

بہرحال غیر مسلم اگر حقیقت کے خلاف لکھتے ہیں تو اس میں ان کا کوئی قصور نہیں، جو کچھ دیکھتے ہیں، وہ ہمارے اعمال ہی کو اپنے لئے دلیل و برہان سمجھتے ہیں۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے کردار کو شریعت اسلامیہ کا آئینہ دار بنائیں تاکہ غیروں کو اصل حقیقت کا پتہ چلے۔ سماع کا جو موجودہ طریقہ رائج ہے اور جس کو نام نہاد صوفیا شریعت کے مطابق اور عمل صوفیا کے موافق سمجھتے ہیں اس کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے اور اس کی صحیح نوعیت کو پیش کرنا ہے تاکہ غلط فہمی کا ازالہ ہو۔

---

1. شیخ احمد سرہندی، مکتوبات شریف، ج ۱، ص ۹۰
2. Nicholson : The Legacy of Islam P-213
3. Macdonald : The Development of Muslim Theology — Jurisprudence and Constitutional Theory P-13

4، 5، 6. تمدن ہند پر اسلامی اثرات، ڈاکٹر تارا چند (مترجم) محمد مسعود احمد

7. H. A. R. Gibb : Mohammadanism P-10

جیساکہ عرض کیا گیا کہ "سماع" کے لغوی معنی سننے کے ہیں مگر متصوفہ کی اس سے مراد:-

"مجرد صوت القوال مع الاشعار المشعرۃ کماصنعہ اللہ تعالیٰ"[1]

ہے۔ بعد کے آنے والوں نے اس میں زوائد کی آمیزش کردی اور آلات موسیقی کو شامل کرلیا اور اب عام طور پر سماع اسی عام طریق کو کہا جانے لگا۔ سید علی ہجویری علیہ الرحمۃ نے خوب فرمایا ہے:-

"آنانکہ صوت داؤد شنیدند بدو گروہ شدند، یکے آنکہ اہل شقاوت بودند ودیگر اہل سعادت

آن گروہ بمزامیر ابلیس مائل شدند واین گروہ باصوت داؤد بماندند"[2]

جن لوگوں نے نغمۂ داؤدی سنا وہ دو گروہ پر تقسیم ہو گئے، اہل شقاوت اور اہل سعادت۔ اول الذکر تو شیطانی آلات موسیقی کی طرف مائل ہو گئے اور موخرالذکر نے صرف نغمۂ داؤدی پر اکتفا کیا۔

ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں، اس کو ہونا تھا۔ کیونکہ مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:-

لیکونن فی اُمتی اقوام یستحلون الحر والحریر والخمر والمعازف[3]

میری امت میں ایسی جماعتیں پیدا ہونگی جو زنا، ریشمی کپڑوں، شراب اور آلات موسیقی کو اپنے لئے حلال کرلیں گی۔

اکابرین سلسلۂ چشتیہ پر جو یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ انھوں نے مزامیر کے ساتھ سماع کو جائز قرار دیا تھا۔ ہرگز صحیح نہیں ہے حضرت سلطان نظام الدین علیہ الرحمۃ نے صراحتاً فرما دیا تھا:- "مزامیر حرام است"[4]

آلات موسیقی کا استعمال حرام ہے

اور مولانا محمد بن مبارک بن محمد علوی کرمانی علیہ الرحمہ جو حضرت خواجہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے اکابر مریدین میں تھے۔ فرماتے ہیں:-

"بخدمت سلطان المشائخ عرضداشت کہ روز ہا بعضے از درویشاں آستانہ دارد در مجمعے کہ چنگ ورباب ومزامیر بود، رقص کردند، فرمود، نکو نہ کردہ اند، آنچہ نامشروع ست، ناپسندیدہ است، بعدازاں یکے گفت چوں ایں طائفہ ازاں مقام بیروں آمدند۔ بہ ایشاں گفتند کہ شما چہ کردید؟ دراں جمع مزامیر بود سماع چگونہ شنیدید؟ ورقص کردید؟ ایشاں جواب دادند کہ ماچناں مستغرق سماع بودیم کہ ندانستیم کہ ایں جا مزامیر ست یا نہ، حضرت سلطان المشائخ فرمود: ایں جواب ہم چیزے نیست، ایں سخن در ہمہ معصیتہا بیاید شد"[5]

حضرت سلطان المشائخ (خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی دہلوی) کی خدمت میں لوگوں نے عرض کیا کہ "آپ کے چند مریدین ایک ایسی محفل میں شریک تھے جس میں آلات موسیقی بھی تھے، اور وہ وہاں رقص کر رہے تھے" آپ نے فرمایا "انہوں نے اچھا نہیں کیا، جو چیز خلاف شریعت ہے وہ ہمیں پسند نہیں" جب یہ مریدین اس محفل سے فارغ ہو کر حضرت کی خدمت

---

[1] سید علی ہجویری رح: کشف المحجوب، ص ۲۵۱، مطبوعہ مطبع پنجابی، لاہور

[2] فخر الدین رازی رح: کشف القناع عن اصول السماع، بحوالہ مولانا احمد رضا خاں صاحب، احکام شریعت ج ۱، ص ۲۷

[3] صحیح بخاری شریف

[4] نظام الدین محبوب الٰہی رح: فوائد الفواد، بحوالہ احمد رضا خاں صاحب: احکام شریعت، ج ۱، ص ۲۷

[5] محمد بن مبارک بن محمد علوی کرمانی رح: سیر الاولیاء، بحوالہ مذکور ج ۱، ص ۲۷

میں حاضر ہوئے، تو آپ نے ان سے فرمایا "یہ تم نے کیا کیا؟ اس محفل میں تو مزامیر تھے۔ پھر تم نے قوالی کیسے سنی؟ اور رقص کیوں کیا؟" انہوں نے جواب دیا "ہم تو سننے میں اس قدر محو ہو چکے تھے کہ ہمیں یہ احساس بھی نہ رہا تھا کہ وہاں مزامیر ہیں بھی یا نہیں۔" حضرت سلطان المشائخ علیہ الرحمۃ نے فرمایا "یہ جواب کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ ایسی باتیں تو معصیت پر معصیت ہیں"

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مخدوم شیخ نصیر الدین محمودؒ ایک محفل میں تشریف لے گئے۔ جب آپ نے دیکھا کہ وہاں مزامیر کے ساتھ سماع ہو رہا ہے تو آپ فوراً واپس چلے آئے۔ لوگوں نے حضرت سلطان نظام الدین محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کو خبر کی تو آپ نے فرمایا:-

"خوب کرد و حق بجانب اوست"[1]

انہوں نے اچھا کیا، وہ حق پر ہیں

حضرت شیخؒ، مریدان مخدوم نصیر الدین علیہ الرحمۃ کے متعلق لکھتے ہیں:-

"و منتسبان سلسلۂ مخدوم شیخ نصیر الدین محمود قدس اللہ تعالیٰ سرہ، غایت باجتناب و احتراز از شنیدن مزامیر دارند و ایشاں می گویند کہ شیخ فرمودند کہ ہر کہ سماع مزامیر کند از عقد بیعت و مریدی ما برآید"[2]

مخدوم شیخ نصیر الدین محمود (روشن چراغ دہلیؒ) قدس اللہ تعالیٰ کے مریدین و معتقدین آلات موسیقی کے سننے سے غایت درجہ اجتناب کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ شیخ نے فرمایا تھا "جو شخص مزامیر کے ساتھ سماع سنتا ہے، وہ ہماری بیعت سے خارج ہے"

جس طرح آج عامۃ الناس نے سماع مزامیر کو سلسلۂ چشتیہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ اسی طرح خود حضرت سلطان نظام الدین محبوب الٰہیؒ کے زمانے میں بھی منسوب کیا تھا، چنانچہ آپ نے اپنے مرید خاص حضرت مولانا فخر الدین زرادی رحمۃ اللہ کو حقیقت سماع پر ایک رسالہ لکھنے کی ہدایت کی، حسب ارشاد رسالہ لکھا گیا۔ اور عرف عام میں سماع سے جو مفہوم لیا جاتا تھا۔ اس سے مشائخ چشتیہ کی برأت کا اعلان کر دیا۔ تحریر فرماتے ہیں:-

"اما سماع مشائخنا رضی اللہ تعالیٰ عنہم فبری عن ھذہ التھمۃ وھو مجرد صوت القوال مع الاشعار المشعرۃ من کمال صنعۃ اللہ تعالیٰ"[3]

لیکن ہمارے شیوخ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا طریقہ سماع (تو اس کے متعلق صاف صاف عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ) وہ اس تہمت (سماع مزامیر) سے بری ہیں (ان کے نزدیک مفہوم سماع، محض الفاظ و اشعار موزوں کے ساتھ قوال کی فطری آواز ہے۔

محض سماع میں بھی ذم کا پہلو موجود تھا۔ اس لئے متصوفہ نے اس کی تصریح کر دی ہے چنانچہ ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"السماع وارد الحق یزعج القلوب الی الحق فمن اصغی الیہ بحق تحقق ومن

---

[1] عبدالحق محدث دہلوی: کتاب المکاتیب و الرسائل الی ارباب الکمال و الفضائل ص ۲۰ مجتبائی، مطبوعہ ۱۲۹۶ھ

[2] کتاب مذکور، ص ۳۹

[3] فخر الدین زرادی: کشف القناع عن اصول السماع

اصغی الیہ بنفس تزندق[1]

سماع وارد حق ہے۔ دلوں کو خدا کی طرف مائل کرتا ہے پس جو شخص توجہ الی الحق کے ساتھ اس طرف مائل ہوا تو اس نے حق کو پایا اور جو شخص جذبۂ نفسانی کے ساتھ مائل تو اس نے کفر و الحاد کیا۔

اور حضرت ابو بکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

السماع ظاہرہ فتنۃ وباطنہ عبرۃ فمن عرف الاشارۃ حل لہ السماع العبرۃ والا فقد استدعی الفتنۃ وتعرض البلیۃ[2]

سماع کا ظاہر تو فتنہ ہے مگر باطن عبرت ہے۔ پس جس شخص نے عبرت کی رمزیت و اشاریت کو سمجھ لیا اس کے لئے اس کا سننا حلال ہو گیا ورنہ وہ فتنے اور بلا کو دعوت دے رہا ہے

متوقع خطرات کے پیش نظر حضرت علامہ سید علی ہجویری علیہ الرحمۃ نے سماع کے لئے اس اہتمام کی تاکید شدید کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

دباید تا چوں سماع کنی پیرے آں جا حاضر بود و جائے از عوام خالی باشد، و قوال بحرمت، و دل از اشغال خالی، و طبع از لہو نفور و تکلف از میاں برداشتہ[3]

اور یہ چاہیئے کہ جب قوالی ہو تو شیخ وہاں موجود ہو عوام سے محفل خالی ہو۔ قوال کے دل میں حرمت ہو اور مشاغل دنیا کی سے خالی ہو طبیعت میں وساوس شیطانیہ کا گذر نہ ہو اور پڑھنے میں کسی قسم کا تکلف یا تصنع بھی نہ ہو۔

حضرت مولانا محمد بن مبارک بن محمد علوی کرمانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مرشد حضرت خواجہ نظام الدین علیہ الرحمۃ کے متعلق تحریر کرتے ہیں کہ

"حضرت سلطان المشائخ قدس اللہ سرہ العزیز می فرمود کہ چند ایں چیز باید تا سماع مباح شود۔ مسمع، و مستمع، و مسموع، و آلۂ سماع۔ مسمع یعنی گوینده، مرد تمام باشد، کودک نباشد و عورت نباشد مستمع آں کہ می شنود، از یاد حق خالی نباشد، و مسموع آنچہ بگویند، فحش و مسخرگی نباشد، و آلۂ سماع مزامیر است، چوں چنگ و رباب و مثل آں می باید کہ درمیاں نباشد، ایں چنیں سماع حلال است"[4]

حضرت سلطان المشائخ (خواجہ نظام الدین اولیاءؒ دہلوی قدس اللہ سرہ العزیز) فرمایا کرتے تھے کہ جب یہ چیزیں موجود ہوں تو کہیں سماع جائز ہوتا ہے یعنی کلام سنانے والا، کلام سننے والا، کلام، اور آلۂ سماع۔ تو کلام سنانے والا بالغ مرد ہو، لڑکا یا عورت نہ ہو۔ کلام سننے والا خدا کی یاد سے خالی نہ ہو اور جو کلام سنایا جائے اس میں فحش و مسخرگی نہ ہو اور یہ بھی ضروری ہے کہ مزامیر نہ ہوں تو اس قسم کا سماع حلال ہے۔

صوفیاء چشتیہ نے تو تالی بجانے تک کو مذموم قرار دیا ہے چنانچہ موصوف خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھتے ہیں

"حضرت سلطان المشائخ فرمود من منع کردہ ام کہ مزامیر و محرمات درمیاں نباشد و در یں باب

---

[1] سید علی ہجویری رح: کشف المحجوب، ص ۲۵۷

[2] کتاب مذکور، ص ۲۶۹

[3] کیونکہ — تو ذکر کرتا ہے مرج نفس سے زہر آلود — وہ نے نواز جس کا ضمیر پاک نہیں

[4] محمد بن مبارک بن محمد علوی کرمانی رح: سیر الاولیاء بحوالہ مولانا احمد رضا خان صاحب رح: احکام شریعت، ج ۱، ص ۲۷

بسیار غلو کرد تا بحدیکہ گفت اگر امام را سہو افتد مرد بتسبیح اعلام کند و زن سبحان اللہ نہ گوید زیرا کہ نشاید آواز آں شنودن، پس پشتِ دست برکفِ دست زند و کفِ دست برکفِ دست نزند کہ آں بلہو می ماند تا ایں غایت از ملاہی وامثال آں پرہیز آمدہ است پس در سماع بطریق اولیٰ کہ ازیں بابت نباشد یعنی در منع و سلک چندیں احتیاط آمدہ است پس در سماع مزامیر بطریقِ اولیٰ منع است[1]

حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء دہلوی نے فرمایا کہ "میں نے منع کر دیا ہے کہ محفل میں، مزامیر اور محرمات نہ ہوں۔ آپ نے اس سلسلے میں بڑا غلو فرمایا ہے۔ یہاں تک فرمادیا کہ اگر نماز میں امام سے سہو ہو جائے تو مقتدی "سبحان اللہ" کہے مگر عورت نہ کہے۔ کیونکہ اس کی آواز سننا جائز نہیں۔ اس لئے وہ اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ کی پشت پر مارے، تالی نہ بجائے۔ کیونکہ اس کا شمار لہو میں ہے تو دیکھئے حضرت شیخ علیہ الرحمۃ کے یہاں لغویات سے پرہیز و اجتناب آیا ہے اور سماع میں تو بطریق اولیٰ اس قسم کی حرکت نہیں ہونی چاہیئے۔ تالی سے اجتناب میں جب اتنی احتیاط آئی ہے تو پھر سماع مزامیر تو بطریقِ اولیٰ منع ہے۔

اہل تصوف کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کے ہاں رقص جائز ہے۔ حالانکہ اس کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔ حضرت علامہ سید علی ہجویری علیہ الرحمۃ نے صراحتاً لکھ دیا ہے:-

بدانکہ اندر شریعت و طریقت مر رقص را ہیچ اصل نیست از آنچہ آں لہوے بود باتفاق ہمہ عقلا چوں بجد باشد، و لغوے چوں بہزل بود و ہیچ کس از مشائخ آں را نہ ستودہ است و اندر آں غلو نکردہ و ہر اثر کہ اہل حشو اندر آں بیارند آں ہمہ باطل بود[2]

معلوم ہونا چاہیئے کہ شریعت و طریقت میں رقص کی کوئی اصلیت نہیں۔ تمام عقلاء کے نزدیک اس کا شمار لغویات میں ہے۔ شیوخ میں سے کسی نے بھی اس کی تعریف و تائید نہیں کی ہے اور نہ اس میں غلو اختیار کیا ہے اہل حشو اپنی طرف سے اس میں جو کچھ شامل کرتے وہ سراسر باطل ہے

علامہ اقبال نے رقص کے متعلق بہت خوب کہا ہے، وہ کہتے ہیں۔

چھوڑ یورپ کے لئے رقص بدن کے خم و پیچ — روح کے رقص میں ہے ضرب کلیم اللّٰہی
صلہ اس رقص کا ہے تشنگی کام و دہن — صلہ اس رقص کا درویشی و شاہنشاہی

رقص و مزامیر کی طرف صوفیانِ خام کا رجحان ہے اس کا جائزہ لیتے ہوئے حضرت شیخ احمد سرہندی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

از علوم آگاہی حقیقت نماز است کہ جم غفیر ازیں طائفہ تسکین اضطراب خود را از سماع و نغمہ و وجد و تواجد جستند و مطلوب خود را در پردہ ہائے نغمہ مطالعہ نمودند لاجرم رقص و رقاصی دیدن خود گرفتند با آنکہ شنیدہ باشند جعل اللہ فی الحرام شفاء ... العریق یتعلق بکل حشیش وحب الشئ یعمی ویصم اگر شمہ از حقیقت کمالات صلاتیہ

---

[1] محمد بن مبارک بن محمد علوی کرمانی: سیر الاولیاء، بحوالہ۔ احمد رضا خاں صاحب: ارد و شریعت، ج ۱، ص ۲۸
[2] سید علی ہجویری رح: کشف المحجوب، ص ۲۹۵۔

برایشاں منکشف شدے ہرگز دم از سماع و نغمہ نزدندے و با وجد و تواجد نکردندے

ع چوں ندید ند حقیقت، رہ فسانہ زدند[1]

نماز کی حقیقت سے عدم واقفیت کی وجہ سے متصوفہ کا ایک گروہ اپنے اضطراب روحانی کی تسکین کا سامان قوالیوں، نغموں اور وجد و تواجد میں تلاش کرتا ہے۔ یہ لوگ اپنے مطلوب و مقصود کو نغموں کے پردوں میں ڈھونڈتے ہیں بے شک ان لوگوں نے ناچنے اور ناچ دیکھنے کو اپنا شعار بنالیا ہے۔ باوجودیکہ ان کو معلوم ہے کہ خدا نے حرام میں شفا نہیں رکھی ہے۔ اگر نماز کی حقیقتوں کا ذرہ برابر بھی ان پر انکشاف ہوجاتا تو ہرگز قوالیوں، نغموں اور وجد تواجد میں منہمک نہ ہوتے۔

مسلمانوں کے لئے تو حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی، اسوۂ حسنہ ہے:۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ

(مسلمانو!) بلاشبہ تمہارے لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی میں (تعمیر حیات، کے لئے بہترین نمونہ ہیں) اور ان کی اتباع، اتباع حق، ان کی رضا، رضائے حق، ان سے محبت، حق سے محبت:۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔

(اے حبیب! مسلمانوں سے) آپ فرما دیجئے کہ اگر ان کو خدا سے محبت ہے تو وہ تمہاری اطاعت کریں۔ (بس یہی اتباع) ان سے ہماری خوشنودی اور محبت کا سبب ہوگی۔

اس لئے دیکھنا یہ ہے کہ آیا سماع کا جو طریقہ فی زمانہ رائج ہے وہ مطابق سنت ہے؟ ہرگز نہیں مزامیر کا استعمال تو سراسر خلاف شریعت نبوی ہے۔ اس کی حرمت میں اکثر احادیث وارد ہوئی ہیں۔ شیخ احمد سرہندی علیہ الرحمۃ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے واضح الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

آیات و احادیث و روایات فقہیہ در حرمت غنا بسیار است بحدیکہ احصائے آں متعذر است۔ معذلک اگر شخصے حدیث یا روایت شاذہ را در اباحت سرود بیارد اعتبار نباید کرد، زیرا کہ ہیچ فقیہے در ہیچ وقتے در زمانے فتویٰ بہ اباحت سرود نداده است۔ و رقص و پاکوبی را جائز نداشتہ۔ چناں کہ در ملتقط رسالہ امام ہمام ضیاء الدین شامی مذکور است۔ و عمل صوفیہ در حل و حرمت سند نیست .... ایں جا قول امام ابوحنیفہ، و امام ابی یوسف و امام محمد معتبر است نہ عمل ابی بکر شبلی، و ابی حسن نوری .... صوفیان خام ایں وقت عمل پیران خود را بہانہ ساختہ سرود و رقص را دین و ملت خود گرفتہ اند و طاعت و عبادت ساختہ

اولئک الذین اتخذوا دینہم لہواً و لعباً[2]

غنا کے بارے میں قرآنی آیات، احادیث اور روایات فقہیہ اس قدر وارد ہوئی ہیں کہ ان کا احصا مشکل ہے۔ اب اگر ان کے ہوتے ہوئے بھی کوئی شخص حدیث منسوخ یا روایت شاذہ سماع مزامیر کی حلت کے لئے بیان کرے تو اس کا ہرگز یقین نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ کسی بھی فقیہہ نے کسی بھی عہد یا زمانے میں سماع مزامیر کی حلت کے بارے میں کوئی فتویٰ نہیں دیا

---

[1] شیخ احمد سرہندی رح، مکتوبات شریف دفتر اول، مکتوب نمبر ۲۶۱، ص ۹۰۔ مطبوعہ مطبع مجددی، امرتسر، ۱۳۲۹ھ

[2] شیخ احمد سرہندی رح، مکتوبات شریف، دفتر اول، مکتوب نمبر ۲۶۶، ص ۱۲۶

اور رقص کی پاکوبی کو جائز قرار نہیں دیا۔ جیساکہ حضرت ضیاءالدین شامی رحمۃ اللہ علیہ کے رسالے میں مذکور ہے۔ سماع مزامیر کی حلت وحرمت کے لئے صوفیا کا عمل دلیل وبرہان نہیں۔ یہاں تو حضرت امام ابوحنیفہ، امام ابی یوسف اور امام محمد رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا قول معتبر ہے نہ کہ ابی بکر شبلی اور ابی حسن نوری کا عمل .... اس زمانے کے خام صوفیانے اپنے شیوخ کے عمل کو بہانہ بناکر رقص وسرود کو اپنا دین وایمان بنا لیا ہے اور طاعت کو عبادت سمجھ لیا ہے "یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے دین کے ساتھ تمسخر واستہزا کیا ہے۔"

یہ ہے "سماع ومزامیر" کی حقیقت اور اس کے بارے میں بعض اکابر صوفیا کے آرا، صوفی کامل کا عمل سنتِ مصطفوی کے خلاف نہیں ہو سکتا اور نہ ہونا چاہیئے۔ بعض بزرگوں کے بارے میں لوگوں نے افسوس ہے کہ غلط باتیں منسوب کردی ہیں۔

فاران :- اسلام نے خوش الحانی کو نہ صرف یہ کہ جائز رکھا ہے بلکہ اُسے پسند کیا ہے۔ اسلام آدمی کی فطری نغمگی پر کوئی پابندی عائد نہیں کرتا ——— رہے مزامیر جن پر گٹکری اور تال سُر کے ساتھ گایا جاتا ہے، اس کو اسلام مزاج عفیف وسادہ گوارا نہیں کرتا کہ عام طور پر گانے بجانے سے انسان کے سفلی جذبات اُبھرتے ہیں۔

کسی ضعیف سے ضعیف بلکہ موضوع روایت سے بھی یہ ثابت نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے لئے "سماع" کی محفلیں جمی ہوں اور شعر سن کر سننے والے اس طرح وجد میں آگئے ہوں کہ وہ بے اختیار کھڑے ہو گئے ہوں اور رقص کرنے لگے ہوں۔ مزامیر کے ساتھ گانے والوں کا تالیاں بجا کر ہاتھ لچکا کر اور تانیں لگا کر گانا اور گانا سنتے سنتے کچھ صاحبانِ وجد و حال (؟) کا اُٹھ کھڑے ہونا اور ناچنے لگنا ——— یہ تمام باتیں اسلام کے مزاج سے مطابقت نہیں کرتیں اور کتاب وسنت سے ان کی تائید نہیں ہوتی۔ اس قسم کے اشغال بہ شبہ لہو ولعب میں داخل ہیں۔

یہ اشغال رقص وسرود، چاہے کسی بڑے سے بڑے مشہور صوفی کے یہاں ہی کیوں نہ ملتے ہوں "کتاب وسنت" کے مقابلہ میں ان کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں کتاب وسنت کی اتباع اور صحابہ کرام کے اسوہ مبارکہ کی اقتدا کا حکم دیا گیا ہے، اس کسوٹی پر جس کا بھی کوئی طریقہ، معمول اور مسلک پورا نہ اترے گا، اُسے کسی تامل کے بغیر چھوڑ دیا جائے گا۔

سید حسن امام وارثی

سترھویں صدی عیسوی

صبحے بنال، راہِ فلک بر نہ بستہ اند
ہر چند دیر آمدہ، در نہ بستہ اند

؏ بیکارم و باکارم چوں مد بحساب اندر۔ میں جتنی بکار آمد حقیقت، دریا بکوزہ، کردی گئی ہے اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر عبرت گوش و نظر دو سرے مصرعے میں بھری پڑی ہے۔ ؏ گویائم و خاموشم چوں خط بکتاب اندہ۔ لگے ہاتھوں نظیری نیشاپوری کا بھی ادعا ملاحظہ فرمایئے ؎

تاریخ واقعات شہاں نانوشتہ ماند
افسانۂ کہ گفت نظیری کتاب شد

واقعہ یہی ہے کہ لکھا بے لکھا، سب ایک، جب حاصل ہی فوت ہوتا چلا جاتا ہو۔ بیکار و باکار، گویان و خاموش، نانوشتہ و کتاب شدہ میں تضاد نہیں ہے بلکہ طرح طرح سے کہنا یہی مقصود ہے کہ آنکھیں ہیں تو دیدہ و دربن کر بیکار کو باکار دیکھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ کانوں سے معذور نہیں ہو تو ؏ اٹھ رہے سناٹا آواز نہیں آتی" کی چیخیں سماعت کیوں نہیں کرتے؟ کتابوں کے بین السطور سے تم آس کی توفیق کیوں نہیں پاتے کہ ؎

باور نہ کنم گرچہ انا الحق زدہ، کہ عشق
صد راز دگر در دل منصور نماند است؟

جتنے افسانوں کے متعلق کبھی تو سوچ لیا ہوتا کہ ؏ تا نبا شد چیزکے مردم نگویند چیزہا۔ دیکھتے نہیں کہ اسی پر کاربند ہو کر نظیری کو انعام سعی کیا ملا؟ اگلوں کو خدا جزائے خیر دے۔ انھوں نے بہت کچھ کر کے دھر دیا ہے مگر ان کے زمانے اور تھے، اُس وقت کے مطالبے اور تھے۔ مصلحتیں اُس وقت جن باتوں کی پردہ پوشی پر مجبور کر رہی تھیں آج مصلحت یہی ہے کہ انکی نقاب کشائی کی جائے، دنیا بدل گئی۔ "بر آسمان نیز پرداختی" کا طنز اب مضحکہ خیز ہے۔ "آسمان میں تھگلی لگانا" اب کوئی اندھیر کی بات نہیں رہی ہے۔ بصارت فی سماعت مجاہدوں اور کشف و کرامت کے بغیر ہی آج کہاں سے کہاں دیکھ سکتی ہے اور کہاں کی کہاں سن سکتی ہے۔ ریڈیو سٹ بزبان حال کہہ رہا ہے۔ ؏ گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست!

پسِ منظر

شمع بجھی، سحر ہوئی، بزم تمام ہو چکی
دَور ہے اب خمار کا گردشِ جام ہو چکی

منزل ابھی دور ہے، راہرو تھکے ہارے نہیں ہیں، ہمتوں کی جوانیاں قائم ہیں، امنگوں کی جولانیاں دائم ہیں۔ دنیا گرشتی

درگذاشتنی ہے اس لئے وہ سب کچھ ہوتا چلا جا رہا ہے جو فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے۔ وقت پورا کر لینے والے زمین پکڑ رہے ہیں
ڈھیروں پر فاتحہ پڑھ پڑھ کر، محو ذوقِ فردا، چلے ع ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں، اللہ نے اپنا راستہ پکڑ رہے ہیں
ازل سے یہی ہوتا آیا ہے، یہی ہوتا رہیگا۔ کارواں پر کارواں گزرتا چلا جاتا ہے اور گزرتا چلا جائیگا۔ مگر ع جو دین بڑی دھوم سے نکلا
وطن سے۔ اس کے کلمہ پڑھنے والوں کو ذرا دیکھئے گا ؎

بسومنات خیالم درآئی تا بینی
رواں فروز برودوش ملے زناری

اللہ! میری توبہ ہے۔ سجدہ و سجادہ والے توحیدیوں پر جنیو کا ہاتھ صاف کر دیا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ مگر شاید
کے آگے نہ عقل ٹھیرتی ہے نہ عقیدت۔ ہاں! اس کے امکان سے انکار نہیں کہ آنکھوں نے غلط بینی کی ہو تو عجب کیا ہے۔ لیکن
غیبی اشارے کو کیا کہئے کا جو پندرھویں صدی کے عین خاتمے کے قریب اتنے واضح طریقے سے ہوا تھا کہ آج تک دلوں کو ہلا سکتا
اور آنکھوں کو طوفان اٹھانے پر لا سکتا ہے۔

تاریخیں اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ دوسری جنوری کا دن اور ۱۴۹۲ء عیسوی کا سال شروع ہی ہوا تھا کہ غرناطہ کا فیصلہ ہو گیا۔
ہفت صد سالہ دولتِ اسلامیہ اندلس لٹ گئی انا اللہ پڑھ کر صبر نہ کیجئے تو کیا کیجئے۔ آج ہو بھی کیا سکتا ہے۔ حیف ہے کہ یہی
اگلے بھی کہ کے رہ گئے تھے حالانکہ وہ سب کچھ کر سکتے تھے اگر توفیقِ خیر رفیقِ حال ہوتی۔ ایسے ایسے نئے اندلس، ایک نہیں جتنے
بسا سکتے تھے۔ مگر زبانِ حال کی شہادت جو یہ تھی کہ ؎

زمن حذر نکنی گر لباس دیں دارم
نہفتہ کافرم وبت در آستیں دارم

مسلمانانِ عالم کی اس بے حسی کو ہم نے آج دیکھا تو کیا دیکھا۔ قضا و قدر نے صدیوں کی مہلت دے دیکر دیکھ لیا۔ جب حکم نا
کر دیا۔ ہم سے دنیا کا ایک ٹکڑا ہی لیکر رقیب کے حوالہ نہیں کر دیا گیا بلکہ زوالِ اندلس کے ٹھیک تین مہینے دس دن کے بعد
ع سمندِ شوق کو ایک اور تازیانہ لگا۔ اطالوی جہاز راں کرسٹوفر کولمبس نکلا تھا ہندِ شرقی کا پتہ لگانے۔ ناپیدار کنار سمندر
نشانِ قدم نہ سنگِ میل نہ منارہ راہ داری۔ موجوں کے تھپیڑے جس کا جاہیں جدھر منہ کر دیں۔ اس گرداب سے قسمت والے
ہی نکلا کرتے ہیں۔ ایک کوہ تن بتانے والوں کی کوئی ادا تو پسند آگئی یہی ہو گی کہ ۱۲ مئی ۱۴۹۲ء کو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت
جس گھاٹ جا لگے وہ نئی دنیا یعنی امریکہ کا ساحل مراد تھا ع

ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں!

اگر مسلمان نصیبہ ور ہوتے تو شہادت عثمان غنی رضی اللہ عنہ، گنج شہیدان کربلا رضوان اللہ علیہم اور زوالِ بغداد
وغیرہ قسم کے حوادث ہی ان کو بیدار نہ کر دیتے مگر وہاں تو یہ حال رہا کیا ؎

لکد کوبِ حوادث کی بڑی برداشت ہے ہم کو
کہ موجِ بادۂ رنگین میں بہہ جاتا ہے غم اپنا

قدرتِ کارساز نے ہوشیار کر دینے کا جو بھی صور پھونکا ہے کو اس کان سنا اُس کان اڑا دیا۔ اللہ کے یہاں دیر ہے
اندھیر نہیں ہے۔ البتہ طویل طویل مہلتیں دے کر اتمامِ حجت کر دینے کا دستور پہلے بھی تھا۔ اب بھی ہے۔

پیش رَوصدی

سولھویں صدی کا جائزہ سرسری سے سرسری بھی صاف صاف دکھا دیتا ہے کہ ہم فتح و نصرت پر قابض ذلیل تو ہیں مگر یہاں بھی جھنڈے گاڑ کر جے وہیں کنوئیں کے مینڈک بن کر رہ گئے۔ حرم سرائیں آباد کرلیں۔ ظل الٰہی کو باوا کی میراث باور کر کے دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر دعوت دینے لگے کہ آ بیل مجھے مار۔ اسی صدی میں مغلوں کے قدم جمے۔ ہندوستان جنت نشان بنا۔ بابر اور ہمایوں تک خیر و عافیت رہی مگر تیسرے خانے میر دیوانے ہو ہی جاتے ہیں۔ مہابلی اکبر اعظم نے مذاہب کو چوں چوں کا مربّہ بنا کر دیوانی ہنڈیا پکانے کی ٹھانی۔ دین الٰہی عطیہ جہاں پناہی نے یہاں کا رکھا نہ وہاں کا۔ ما ناکہ کام برا نہ تھا۔ نیت بخیر ہی ہو تو میٹھے چاولوں میں شکر پر شکر ملاتے چلے جانے سے خوش ذائقگی بڑھتی نہیں ہے بلکہ لقمہ لقمہ نوالہ نوالہ حلق سے اتارنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اسلام خود حلوائے تر تھا اس کو موہن بھوگ بنانے کے لئے اس میں گڑ ہیت پیدا کرتے کرتے زہر مار کے قابل بھی نہ رہنے دینا جل جلالہ! ایشیا کا یہ لطیفہ بھی از آدم تا ایں آدم یادگار ہے کہ ناکام خدائی کے دعویدار مسند زرنگار پر لن ترانیاں ہانکا کرتے رہے، انہیں کے فیض سے انجام خراب مصلحین بھی ؎

شبلی از ممبر دہد آواز عشق
شاہ ما بر تخت گوید راز عشق

دشت از بام کرتے رہے۔ بات یہ ہے کہ تقدیر الٰہی کی گرفت کسی کو دکھائی تھوڑے ہی دیتی ہے۔ اپنا گڑھا آپ کھودنے والے یہ بن جانتے ہیں کہ چاہ کن را چاہ در پیش۔ الملک و الحمت کے ہر دو نشان کو حرف غلط بتانے والے منہ کی کھانے کے سوا بھی کسی جوگ کے کبھی ہوئے ہیں؟ ؎

برو مپیچ کہ فکر فراغ من غلط است
غلط مکن کہ علاج دماغ من غلط است

اس مطلع کو نظم کرنیوالے جوانمرگ عرفی نے "دین الٰہی" والا دور دیکھا برتا تھا۔ کون جانے اسی سے اثر لے کر تو نہیں لکھ گیا ہر فرعونے را موسیٰ کی مثال ہر مہابلی کے لئے مجدد کی ضرورت آخر پوری ہو کر رہی۔ لائے آمدنت باعثِ آبادیٔ ما

اس کے برخلاف یورپ کا طائرانہ جائزہ لیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس سے کام سرانجام ہو سکتا تھا اسی نے اس کو کر دکھا دیا۔ ۱۵۴۶ء میں دنیا سے اٹھنے والے مارٹن لوتھر نے پوپ کی بنا کی پول کھول کر رکھ دیا جس کی اشد ضرورت تھی۔ نہیں تو یورپ کا تخل پیڑا سفر وسیلۃ الظفر پر چل پڑنے کے بجائے عرقاب ہو کر رہ جاتا۔ امریکہ کی دریافت پر غش ہو کر کریں کھول نہیں دی گئیں بلکہ "تو چل میں آیا" تابڑ توڑ مہمیں چھوٹنے لگیں۔ ابھی برازیل کی نشاندہی ہوئی۔ امنگوں والے نئے نئے بھی نہیں تھے کہ پیر دکا پتہ پاکر تلوے کھجانے لگے سائے لو آسٹریلیا، ہند، وغیرہ وغیرہ کہاں کہاں نہیں جا پہونچے۔ پھر یہ نہیں کہ اندھی بھیڑ طبیعت جدھر آئی ادھر آئی۔ بھیڑیا دھسان جو تھے وہ اسی رُخ بھاگ کھڑے ہوتے۔ سائنس سے غفلت جائز رکھی گئی نہ صنعت و حرفت سے، مذہب و معاشرے کے عیوب منظر عام پر آ ہی گئے تھے۔ رہ گئی تھی سیاست مدن اس کا مصلح بھی اسی صدی میں جنم لے چکا تھا۔ میرا مطلب ہے ادلیور کرامویل سے!

سترہویں صدی

ستم کہ یافتہ ام ذوق صحبت غم را
بصبح عید دہم وعدہ شام ماتم را

مسلمانوں نے اس نئی صدی میں نحوست کے آثار کہیں سے بھی نہیں دیکھے۔ جاہ وجلال روز افزوں نہ سہی مگر پھر بھی طفل دل کی تسلی کے لئے کافی تھا۔ باب عالی پر سر جھک ہی رہے تھے۔ ایران میں رستمی دم خم نہ سہی مگر صفوی سطوت کی طرف کوئی بے محابا دیکھنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ ہندوستان کا تو کہنا ہی کیا ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر، گھر میں بیٹھے ہی بیٹھے، بخت واقبال کی بدولت، جہانگیر، شاہجہاں، عالمگیر بنتے چلے جا رہے تھے۔ مہابلی کے پوت تو دیوتا سروپ تھے انکا نور جہاں میں ایسا پھیلا کہ یہ خود اس کے سرور سے سرخوش رہا کرتے تھے۔ سراپردۂ شاہی سے حکم احکام اجرا پاتے تھے۔ پچھلوں کی بنائی اگلوں کے کام آتی ہی ہے، یہی ہو بھی رہا تھا۔ امن چین سے دنیا تھی۔ قسمت ہو تو شاہجہاں کی کہ ان کے سر پر آرا ہونے کا سان گمان بھی نہ تھا مگر تخت طاؤس پر طوطی بولا تو انہیں کا۔ آج ان کی نسل میں کوئی صاحب افسر و دیہیم نہیں ہے تو نہ سہی۔ آگرے کا تاج دنیا پر بھاری بھرکم ان کی شاہنشہی کو سنگین حقیقت باور کرانے کے لئے سرافراز ہے۔ لال قلعے پر پرچم ادل بدل کر لگتے چلے آئے ع ہر کہ بیخ زد نوبت اوست" مگر تم ٹھیکری ٹھیکری سے پوچھ لو۔ آج کیا رہتی دنیا تک جواب میں انہیں کا نام سنو گے۔ وہ تو حساب پر آ گئے۔ ریڈیو کا بھی عجیب پھیر ہے۔ پھر وہی تیسرے خانے پر گنتی آگری۔ خدا خیر کرے۔ مگر سچ کہا کیا دیدار وجوان رعنا سے صلاحیتوں کا پتلا نظر کے سامنے ہے۔ اس کے تیور کہہ رہے ہیں کہ اس سے جو ٹکرائیگا وہ پاش پاش ہو جائیگا۔ میرے اللہ سلیم کنہ دو سرا تو ہی جانتا ہے لیکن اس کو بادشاہی کے بلوے میں کیوں ڈالا۔ دادا چھوڑ پر دادا کے نقوش قدم پہ الٹے پاؤں چل پڑا۔ آخر کار، وہ تو کہئے تیرا ہی فضل و کرم شامل حال تھا کہ پیر سرہندی آڑے آئے مگر شاہ و گدا کے ارتباط کا نتیجہ کیا نکلا؟ — ادھر سلطنت پا برکاب ہونے لگی اُدھر خانقاہ و پیری مریدی پر قناعت کے سوا اور کیا رہا؟ عالمگیر اورنگزیب اس سرے پر اور مہابلی اکبر اعظم اس سرے پر۔ مگر دونوں پر وہی پھبتی جچتی ہے "کرگہ چھوڑ گونٹتی جے ناحق مار جلاہہ کھائے"۔ ہمارے زمانے میں امیر امان اللہ خاں بیچارے کو بھی یہی ہوا آخر لے اڑی۔ شہنشاہ اورنگزیب کو اور بہت سی الجھنوں سے نجات نہ ملی تھی کہ تسخیر دکن کی ادھوری مہم توجہ بانٹنے لگی۔ اس میں جا الجھے تو پھر جھاڑ کے کانٹوں سے دامن چھڑا ہی نہ سکے۔ زمین ناپتے ناپتے وہیں کی خاک کا پیوند ہو گئے۔ بعد والوں کے لئے اپنی سی سب کچھ کر کے اطمینان کر لیا تھا مگر وہی سوچ نہ پائے جس کو اول دھیان میں لانا تھا کہ جو سعادت مند بیٹا اور بھائی نہ بن سکا وہ باپ بن کر کیا دکھا سکے گا۔ راہ للہ کام کرنے کی بھی ایک ہی رہی سہی کہنے کو تو ہر تیس مار خاں جہاد ہی کئے پھرتا تھا مگر محی الدین سے بڑھ کر کون جانتا تھا کہ اعلاء کلمۃ اللہ کے جذبے کے تحت حکومت کا قیام کبھی مغلوں کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔

انگلستان والوں نے جہانگیر ہی سے اجازت لی تھی۔ قسمت کا الٹ پھیر دیکھئے شاہجہاں کی چہیتی جہاں آرا سے شعلۂ آتش گ[illegible] کرتا ہے۔ کمپنی سے باؤٹن نامی سرجن بھیجا جاتا ہے۔ اس کو مسیحائی بخشدی جاتی ہے۔ انعام میں اپنی قوم والوں کے لئے مراعات حاصل کر لیتا ہے شاہی فرمان لے کر راج محل پہنچتا ہے۔ وہاں شاہزادہ شجاع متعین ہے۔ باؤٹن صاحب وہاں بھی وہی دم مسیحا پھونکتے ہیں اور شہزادے سے تحریر مل جاتی ہے جس سے فرمان شاہی میں جو کور کسر تھی وہ بھی نکل جاتی ہے۔ اپنی ذات کے لئے حبہ بھی طلب

ہیں کرتا ہے۔ قومی مفاد ہی مدنظر ہے۔ اب یہ تو جملۂ معترضہ کیوں کہ وقت سے پہلے کہنا پڑ رہا ہے مگر بات ہے جاے لہٰذا
سُن ہی لیجئے۔ روس کے ہاتھوں پیٹر اعظم سے فاش شکست کھا کر چارلس دوازدہم شاہ سویڈن نے سلطان المعظم کے یہاں پناہ لی
سلطان نے لشکر جرار دے کر روس پر چڑھائی کے لئے وزیر اعظم کو ساتھ کردیا۔ حملہ ہوا اور پیٹر کو دن میں تارے نظر آنے لگے۔ اگر وزیر
نے رشوت لے کر صلح منظور نہ کر لی ہوتی تو پیٹر کا اعظم و عظیم بننا کھٹائی میں نہ پڑ جاتا بلکہ روس کی ترقی کم از کم صدی بھر کے لئے
دھری رہ جاتی۔ مگر وزیر اعظم بھی کوئی باوطن سا وطن تھوڑے ہی تھے کہ "ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست" کو بے موقعہ
بھوں کر حب الوطن من الایمان کا وظیفہ پڑھنے لگتے۔ ایسی حماقتیں انگریزوں کو مبارک ہیں۔ پھر بات انصاف کی یہ بھی تو ہے
وطن ہو تو لاج رکھی بھی جائے۔ ہمارے ہاں بادشاہوں کی جنس ہی عجیب ہوتی تھی۔ بر خود غلط ہونا ان کی گھٹی میں پڑا ہوتا
فاع اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں۔ ادھر اُدھر سے پڑے پڑائے بٹور کے لے آئے اور معتمد الملک والملۃ بنا کر چین پاتے
تھے۔ یہ وزیر اعظم بھی ہونگے ابن علقمی کے ہی بھائی بند کوئی۔ پھر ان سے وطن دوستی کا مطالبہ بے معنی ہی تو ہے۔

حسن اتفاق کہ اس صدی کے یورپ سے میں نے جن دو شخصیتوں کا انتخاب کیا تھا وہ دونوں کسی نہ کسی پہلو سے مذکور
ہو چکیں یعنی کرومویل اور پیٹر اعظم۔ سچ پوچھیے تو دونوں کی دونوں اتنی عظیم اور ایسی دل چسپ ذاتیں ہیں کہ انکا مختصر تذکرہ
نہ تو ان کے ساتھ انصاف کہا جا سکتا ہے نہ اپنے کو مطمئن کر سکتا۔ دونوں پر علیحدہ علیحدہ مقالوں کے بغیر ان کے حق سے ادا نہیں
ہو سکتے۔ بہرکیف موجودہ خامہ فرسائی کے مطالبوں کو بھی پورا کرنا لازم ہی ہے تو جس تس کچھ کہہ ہی گزرنا ہے۔

کرومویل سولھویں صدی کے آخر ۱۵۹۹ء میں پیدا ہوا تھا۔ اور سترھویں صدی کے وسط ۱۶۵۸ء میں سر دیگر قید عناصر
سے گو خلاصی حاصل کر سکا۔ ۱۴ جون ۱۶۴۵ء کو چارلس اول شاہ انگلستان پر فتحیاب ہوا۔ دوبارہ ۱۶۵۱ء میں چارلس دوم کو
شکست دے کر فرانس میں پناہ لینے پر مجبور کردیا۔ تاج و تخت کی پیش کش کو شرف قبول نہ بخش کر اپنی علوئے ہمت اور خلوص
نیت کا سکہ بٹھا دیا۔ یہ تو کہا نہیں جا سکتا کہ ان کے اعمالنامے میں سو فیصدی نیکیاں ہی نیکیاں ہیں۔ بیدردی و مظالم کے
داغ چھپائے نہیں جا سکتے مگر طرف ثانی کا دامن بھی کم آلودہ نہیں ہے۔ من حیث المجموع بلا خوف تردید دعویٰ کیا جا سکتا
کہ کرومویل نے بڑا کام کیا اور ملک و قوم نے بھی پوری رفاقت کی۔ تفصیلات کے لئے تواریخ سے رجوع کرنا چاہیئے سبق آموز
شخصیت اور کارنامے دونوں ہیں۔

پیٹر اعظم بے حد دلچسپ آدمی تھا۔ کچھ مشابہت اکبر اعظم سے ملتی ہے مگر دونوں میں بعد المشرقین بھی ہے اور کافی واضح
ہیں۔ اس لئے ان کا موازنہ غیر متوازن ہوگا۔ لیکن پیٹر کو اکبر پر فوقیت اس اعتبار سے دی جا سکتی ہے کہ اکبر کو جتنی سہولتیں میسر
تھیں اتنی ہی پیٹر غریب کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اکبر بہادر تھا پیٹر کو بچپن سے بزدلی کی مشق کرائی گئی تھی۔ کم
سواد ہونے پر بھی اکبر مہذب و متین تھا اور پیٹر اجڈ جٹ گنوار کی لٹھ۔ اکبر کی قوم کبھی بادیہ نشین صحرائی رہی ہوگی مگر اکبر کے
کئی پشت اوپر والوں ہی نے معاصرین میں شرف و امتیاز حاصل کر لیا تھا۔ پیٹر کے وقت تک اس کی قوم کی قوم ایشیٹی سمجھی جاتی تھی
پیٹر نے شادی والی بیوی کو راہبہ بنا کر گرجے کی نذر کردیا تھا اور ایک بالکل نیچ قسم کی عورت کو شریک حیات بنا لیا تھا۔——
۹ مئی ۱۶۷۲ء کا پیدا۔ ۲۷ اپریل ۱۶۸۲ء کو تخت نشین ہوا مگر ۲۳ مئی کو بغاوت سے مجبور ہو کر سوتیلے بھائی آوان نامی
کو شریک حکومت کرنا پڑا۔ ۱۶۸۹ء میں آوان نے خدا کو پہچانا اور مستعفی ہو کر دستبردار ہو گیا۔ پیٹر کو خبط کہئے شوق نام دیجئے
بہر حال جنون تھا تو اسی بات کا کہ قوم کو جیسے بنے اٹھا کر کھڑا کرے اور عزت و حرمت منوا کر رہے کہ ۱۶۹۷ء میں خود اپنے سفیر کے

ہمراہیوں میں شامل ہوکر یورپ کے صنعتی شہروں میں جہاز سازی کا کام سیکھتا پھرا اپنے درجہ اور وقار کو ذرا سا بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ لوہاروں، بڑھئیوں سے مساوات اور یارانہ برت برت کر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔ بدویت اس کی اس حد کو پہنچی ہوئی تھی کہ ایمسٹرڈم میں اس نے قیام کے لئے جس سرائے میں انتظام کیا گیا تھا اس میں تکلفات کو بھی دخل تھا۔ دن تو کام میں کٹ گیا۔ رات کو مخملی توشک تکیہ اس کے لئے صحبت ناجنس ثابت ہوتے۔ نیند آنکھ کا نام ہی نہیں لیتی تھی آخر گئے بکل کھڑا ہوا۔ ایک معمولی بوسیدہ سی سرائے تاکی اور وہاں دیکھا تو اپنا ہی کوئی سائیس ریچھ کی پرانی کھال بچھائے زمین خراٹے لے رہا تھا۔ لات مار کر اس کو تو پرے کیا اور اسی کھال پر گھوڑے بیچ کر سو رہا۔

سائیس نے مالک کو شناخت کر لیا تھا۔ دم نہ مار سکا۔ رات بھر چوکسی کرتا رہا۔ آج جس شہر کو لینن گراڈ کہا جاتا ہے۔ اس کا موجودہ نام ۱۹۲۴ء میں رکھا گیا۔ پہلے اس کو سنٹ پیٹرسبرگ کہتے تھے۔ ۱۶ مئی ۱۷۰۳ء میں سپاہیوں سے دو تلواریں لیکر زمین پر صلیب کی شکل از کر دو بھالے گاڑ کر پیٹر نے حلف اٹھایا تھا کہ یہیں پر شہر بسایا جائیگا چنانچہ بھی کر دکھایا۔ دلدل پر شہر بسا۔ اور لوگ آباد کئے گئے۔ گرجا بھی تعمیر ہوا۔ مگر سب سے بڑی جو یہاں ہے وہ کہیں اور جا بسیں۔ بادشاہ وحشی، کسی کی سنتے نہیں۔ پادریوں نے اشتعال چھوڑا۔ بی بی مریم کی مورتی کی آنکھیں بہنے لگیں۔ تعبیر سامنے نظر آتی کہ مائی جی کا دل دکھا ہے۔ امت کی تکلیف پر آنسو نکل رہے ہیں سب نے دیکھا تو یہ قصہ بنتا ہی تھی۔ او وحشت بھرا وحشی پیٹر بھی بھاگا ہوا آیا۔ دیکھا تو واقعی من و عن پہلے روسی عادت ہوئی جو ہیں پڑھ لکھ مہذب متین ہوتا تو گھٹنے ٹیک کر رو ہی پڑتا اور پادری پیچھے پیچھے خوب ہنستے۔ گنوار تو تھا ہی حماقت سے مورتی اتروا دیا۔ اب جو دیکھتا ہے تو مورتی کے سر میں جوف اور اس جوف میں تیل بھرا ہوا۔ دیدوں میں سوئی سے سوراخ جن سے رس رس کر تیل نکل نکل کر رخساروں کو تر کر رہا تھا۔ مورتی ضبط کر کے ساتھ لے گیا۔ عوام کو پہلے دکھا کر ان کا اطمینان کر دیا۔ پادریوں کے منہ پر کالک ملی۔ آج روس جب عروج کو پہنچا ہے وہ اسی دیوانے پیٹر کا صدقہ ہے۔ ترکوں کو پہلی شکست اس نے دی تھی حالانکہ اس کی سلطنت میں آپ تنہا تھا۔

عقیدت کے پھول

ارشد امروہوی۔

کش مکش زیست میں اے بے خبر — عشقِ محمدؐ ہے حریم پناہ
تیری نبوت پہ ہیں محبوب حق — دستِ ابوجہل میں پتھر گواہ
ڈال دو اس پر بھی شفاعت کی ضو — نامۂ اعمال ہے میرا سیاہ
عشقِ محمدؐ میں ہی جینا ثواب — اس کے سوا زیست سراسر گناہ
کاش یہ نظارہ کروں حشر تک — گنبدِ خضریٰ سے نہ پلٹے نگاہ
نازِ محمدؐ کی غلامی پہ ہے — ہم کو نہیں طلبِ عزّ و جاہ
عرشِ معلّیٰ پہ گئے مصطفےٰ — آسماں شاہد ہے ستارے گواہ

یوگیندر پال صابر (ایم۔اے)

(۱)
ترکِ دنیا و کارِ دنیا کا — ایک مجموعۂ حسیں ہیں رسولؐ
رہے دنیا میں دور دنیا سے — جھیل میں جس طرح کنول کا پھول

(۲)
جو بتاتے ہیں مصطفےٰؐ کو خدا — اصل میں آشنائے حال نہیں
تم محمدؐ کو آدمی ہی کہو — پھر بھی ان کی کوئی مثال نہیں

یوسف اقبال (آگرہ)

آسان ہے منکرِ خدا ہو جانا — مشکل سہی غیب پر شہادت لانا
انکار رسولؐ کا عیاذاً باللہ — ممکن نہیں آفتاب کا جھٹلانا

انسان نئے روپ بدلتا ہی رہا — ہر گام پہ گر گر کے سنبھلتا ہی رہا
اسلام وہ نخلِ جاوداں ہے اے دوست! — جتنا بھی تراشا گیا پھلتا ہی رہا

بھٹکا ہوا عقل کے اندھیرے میں ہے تو — جکڑا ہوا فلسفے کے گھیرے میں ہے تو
دل تیرا ہے نورِ مصطفےٰؐ سے محروم — غافل ابھی رات کے بسیرے میں ہے تو

تیرا وجود ہے محرمِ سوز و سازِ حیات — تری نظر کو نہیں آئینۂ جلوۂ ذات
بھٹک رہا ہے روایات کے اندھیرے میں — تو کر رہا ہے ابھی تک طوافِ لات و منات

دو غزلیں

تسکین قریشی

کھوئے ہوئے رہتے ہیں، نہ دنیا ہے نہ دیں یاد — اے دوست! تری یاد میں کچھ ہم کو نہیں یاد

اک سجدہ ہماری بھی طرف سے، سرِ منزل — اے اہلِ طلب! آئیں جو ہم خاک نشیں یاد

کہنے کو تو کہہ آئے غمِ دل! مگر اب تک — وہ نیم نظر یاد ہے، وہ چینِ جبیں یاد

ہو کوئی بھی عالم، نظر آتے ہیں ہمیں ہم — اللہ رے اک حسنِ سراپا کی حسیں یاد

یہ کیسی محبت ہے کہ آنسو ہیں نہ آہیں — جیسے کہ ہمیں کوئی اب آتا ہی نہیں یاد

کیا کیا میں غمِ عشق کو دیتا ہوں دعائیں — جب آتی ہے وہ کشمکشِ وہم و یقیں یاد

رسوائیِ ناموسِ جنوں، آہ نہ پوچھو — کیا کیا ہمیں آیا ہے کوئی پردہ نشیں یاد

کہتے تھے کہ تسکیں کو نہ بھولیں گے کبھی ہم
سنتا ہوں مرا نام بھی اب اُن کو نہیں یاد

عشرت جلالی

اب کہاں وہ آزادی، تھی جو ہم نفس پہلے — ہائے کیا زمانہ تھا اب سے کچھ برس پہلے

پھول ہوں کہ ہوں کلیاں سب خزاں کی زد میں ہیں — کوئی اک نفس پیچھے، کوئی اک نفس پہلے

کچھ بتا تو کیا گزری تجھ پہ ہم نفس پہلے — ذکرِ آشیاں پیچھے، قصۂ قفس پہلے

کیوں ہنسی اڑاتے ہو اپنی نا سمجھ غنچو! — گُل بھی قہقہہ زن تھے ایک دو نفس پہلے

آشیاں کی نسبت سے زیبِ دوشِ گلشن ہیں — بارِ صحنِ گلشن تھے ورنہ خار و خس پہلے

خون سے نکھرتی ہے ہر بہارِ آزادی! — وہ کلی نہیں کھلتی جس میں ہو نہ رس پہلے

خواہش و تمنا کا فرق یوں سمجھ لیجئے — عشق بے طلب آخر، شوق بوالہوس پہلے

ایک اجنبی سے ہو کوئی بے تکلف کیوں — نطق تا ضروری ہے کچھ تو پیش و پس پہلے

موت و زندگانی میں فاصلہ ہی کیا عشرت
یاس اک نفس آخر، آس اک نفس پہلے

شرارے

نازش پرتاب گڑھی

غم بہار کیا ذکر روزگار کیا
یہ کیوں کہوں کہ فقط تیرا انتظار کیا

شاداں جو غم میں ہوں تو خوشی میں اداس ہوں
میں داستانِ دل کا عجب اقتباس ہوں

مل جائے لمحہ بھر کے لئے خلوتِ نشاط
مجھ کو یہ سوچنا ہے کہ میں کیوں اداس ہوں

آنکھوں سے تو گرنے پہ دامن کا سہارا ہو
نظروں سے جو گر جائے وہ اشک کدھر جائے

ملتا ہے آپ کے قد و گیسو سے سلسلہ
دیتے ہیں جان ہم رسن و دار پر کہاں

اس قتل گاہِ عشق میں بٹتی ہے زندگی
پھیلائے ہاتھ آتی ہے اے موت ادھر کہاں

اک اک سے پوچھتا ہے کوئی خانماں خراب
اب کے چمن میں تم نے بنایا ہے گھر کہاں

ہمراہ چلے میرے یہ کہہ کے خرد والے
ممکن ہے کہ رستے میں دیوانہ بہک جائے

ساقی کے تغافل کا کچھ تو ہو جواب آخر
یا جام ہی اُڑ جائیں یا مے ہی چھلک جائے

محفل کا یہ سناٹا توڑے تو کوئی نازشؔ
ساغر ہی چٹک جائے، آنسو ہی ٹپک جائے

کوثر نیازی

اپنوں کی شکایت ہے، نہ غیروں کا گلا ہے
ہر حال میں خوش ہوں کہ یہی اُس کی رضا ہے

ذرے میں بھی ہے وسعتِ صحرا کہیں جسے
اُس چشمِ خاص کے لئے بینا کہیں جسے

ہم سرکشوں سے دیکھئے سرزد ہوا تو ہے
وہ ایک جرم تیری تمنا کہیں جسے

اے مبتلائے عشرتِ امروز! ہوشیار
ہے کھیل دھوپ چھاؤں کا دنیا کہیں جسے

نوائے قمری و صوتِ ہزار کی باتیں
چمن چمن ہیں نگارِ بہار کی باتیں

رہِ حبیب میں سود و زیاں کا ذکر نہ چھیڑ
روا نہیں ہیں یہاں جیت ہار کی باتیں

بے آسرا ہیں لوگ سہاروں کے باوجود
تاریکیاں ہیں چاند ستاروں کے باوجود

غم بھی ہیں ناگزیر مسرت کے ساتھ ساتھ
کانٹے بھی اُگ رہے ہیں بہاروں کے باوجود

کوثرؔ یہ خاص رحمتِ پروردگار ہے
پھولوں سے کھیلتا ہوں شراروں کے باوجود

آپ کی یاد عناں گیر نہ ہو جائے کہیں
غمِ منزل مری تقدیر نہ ہو جائے کہیں

ضبط میں بھی ہے سلیقے کی ضرورت اے دل
خامشی شوق کی تفسیر نہ ہو جائے کہیں

میرے تخیل نے وہ رنگ بھرے ہیں اب ہمیں
تجھ سے بڑھ کر تیری تصویر نہ ہو جائے کہیں

فرق کچھ بھی نہ رہا عشق و ہوس میں کوثرؔ
حسن یہ دیکھ کے دل گیر نہ ہو جائے کہیں

کلیم احمد آبادی

یہ بات سمجھ میں مری کچھ آ تو گئی ہے
وہ حسن ہے اور حسن کی سب جلوہ گری ہے
اب دیکھئے کیا ہو دلِ بیتاب کا عالم
اس نے مری آواز پہ آواز تو دی ہے
گل ہو کہ گلستاں ہو خزاں ہو کہ بہاریں
جو کچھ بھی ہو سب حسن کی شعلہ نفسی ہے
مر کر بھی تو تکمیل محبت نہیں ہوتی!
پھر کونسی منزل میں، حیاتِ ابدی ہے
جاتا ہے کہاں مرکزِ ہستی سے نکل کر
اے پیکرِ انساں، تری دنیا تو یہی ہے
کہنے کو کلیمؔ اور تو کچھ کہہ نہیں سکتے
لیکن یہ غزل آپ کے کہنے سے کہی ہے

عنوان چشتی

ان کے جلووں سے ہے اک ربط ازل سے مجھ کو
یاد ہے خوب انہیں پہلے بھی دیکھا تھا کہیں
چٹکیاں لیتی ہے بے نام خلش سی دل میں
سوچتا ہوں کہ یہ آغازِ محبت تو نہیں

منظر کلیمی

نہیں ہے بات کوئی اور کوئی بات بھی ہے
غرورِ حسن بھی ہے حسنِ التفات بھی ہے
جہانِ عشق و محبت کو آہ کیا کہئے
تباہ موت بھی ہے رائیگاں حیات بھی ہے

دل و نگاہ کا بھی کچھ تو واسطہ ہے ضرور
براہِ راست مری اُن سے رسم و راہ نہیں
بڑھنے لگا ہے دردِ محبت کے ساتھ ساتھ
ملنے لگی جزا بھی عبادت کے ساتھ ساتھ
کیوں ملی عشق کو بقائے دوام
کیوں نہیں حسن کو ثبات نہ پوچھ
کب سے الجھے ہیں کس نے الجھائے
میرے اُن کے معاملات نہ پوچھ
اِک دلِ بے خبر کی لغزش سے
ہو گئی کیا سے کیا حیات نہ پوچھ
جامِ رنگیں تو سامنے ہی تھا
کیوں نہ پہنچے ہمارے ہاتھ نہ پوچھ

جمیل کلیمی احمد آبادی

آ غمِ ہجر تجھے دل سے لگا کر رو لوں
کل ترے ساتھ مری رات بسر ہو کہ نہ ہو
ٹھہر اے دل، نہیں اک اور نظر دیکھ ہی لوں
شاید اس راہ سے پھر میرا گزر ہو کہ نہ ہو

حیرت لدھیانوی

میری فریاد سے بد دل نہ ہوں سننے والے
شکرِ بیداد ہے یہ شکوۂ بیداد نہیں
اللہ اللہ رے! وارفتگیٔ شوق کا رنگ
کیا تمنا تھی مری خود یہ مجھے یاد نہیں
تو نے مضرابِ نظر سے جسے چھیڑا تھا کبھی
یہ اسی ساز کی آواز ہے فریاد نہیں

وہی ٹکڑا تھا میری داستاں کا جانِ افسانہ
جہاں کچھ کہتے کہتے رُک گیا افسانہ خواں میرا

ماہر القادری

یہ ساقی چھیڑ اور مجھ تشنہ لب سے
نہ بڑھ جاؤں کہیں حدِ ادب سے
جسے تم دیکھ کر چشمِ غضب سے
یہ اندازِ کرم سیکھا ہے کب سے
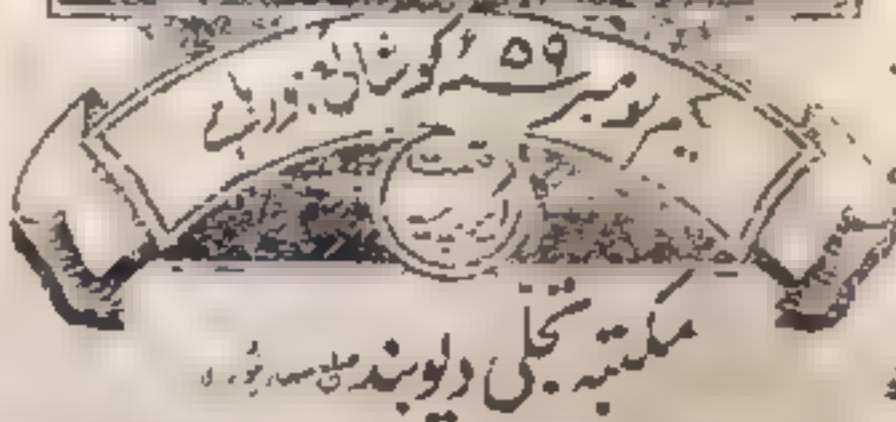
اٹھا ہوں غم زدہ بزمِ طرب سے
مری توبہ اُدھر جاؤں جواب سے
ترے کوچے میں اے جانِ بہاراں
نسیمِ صبح چلتی ہے ادب سے
وہ کوئی رند ہو یا پارسا ہو
فقیروں کا تو یارانہ ہے سب سے
اے ماہرؔ نہیں کہتے بھٹکنا
میں خود کترا گیا راہِ طلب سے

دردِ سر دوسرے ہر قسم کے درد اور
نزلہ و بخار کیلئے
انالجین ٹکیاں
Opal
ہر قسم کی کھانسی
سے فوری
نجات
کیلئے
کفنسول شربت
صحت اور
توانائی
کیلئے
اوپل لیبارٹریز لمیٹڈ کراچی

روح انتخاب

انگلستان میں کچھ عرصہ قیام کے بعد اخلاقی لحاظ سے صرف دو طبقے رہ جاتے ہیں۔ صالح اور غیر صالح۔ ان دونوں طبقوں کے درمیان کے سارے طبقے غائب ہو جاتے ہیں۔ بیشتر طلبا کو پہلی دفعہ مکمل آزادی نصیب ہوتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ اپنے شناساؤں میں سے کوئی قریب نہیں ہوتا بلکہ اپنے معاشرے کے غیر محسوس بندھنوں سے بھی مکمل آزادی نصیب ہوتی ہے دوسری طرف گناہ کے بیشمار مواقع نہ صرف موجود ہوتے ہیں بلکہ فرش براہ ہوتے ہیں۔ ایسے حالات میں دو ہی راستے کھلے ہوتے ہیں۔ زہد یا رندی۔ جو افراد وطن میں ماحول کی وجہ سے زاہد بنے ہوئے تھے وہ اپنے سارے لبادے پھینک کر اپنی فطرت رندانہ کو پوری طرح کھل کھیلنے کا موقع دیتے ہیں۔ لیکن جنھوں نے شعوری طور پر زہد کی راہ اختیار کی ہوئی تھی وہ الاماشاء اللہ یہاں بھی اپنی اصلی روش پر قائم رہتے ہیں۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص یہاں آنے کے بعد دو تین سال تک نیک رہا۔ پھر اچانک کسی دن معلوم ہوا کہ حضرت سارے بندھن توڑ کر بگٹٹ تحت الثریٰ کی طرف بھاگے جا رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جنھوں نے پاکیزہ ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں۔ جنہیں اچھی تعلیم اور تربیت نصیب ہوئی اور یہاں آکر بھی انھوں نے اچھے لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اپنا شیوہ بنایا لیکن وہ اپنے نفس کو زیر نہ کر سکے تھے۔ وطن میں چھوٹے گناہوں سے بچنے کا اہتمام نہ کرتے تھے۔ یہاں آئے تو صغائر سے اجتناب کی کوشش نہ کی۔ نفس پلٹ گیا اور ایک دن انہیں چاروں شانے چت گرا دیا۔ ایسے کئی ایک سانحات آنکھوں کے سامنے گذرے ہیں۔ ایک صاحب بڑے شریف ماں باپ کے فرزند ہیں کبائر سے نفرت ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھی۔ لیکن غضِ بصر کو ملائیت سمجھتے تھے۔ کلاس میں بیٹھے ہوئے ہیں لیکن نگاہ لڑکیوں کے حسن پر ہے۔ اپنی ہم جماعت لڑکیوں سے ہنس بول لینا بھی گناہ نہیں سمجھتے تھے۔ جب بھی یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی کہ یہ چیزیں انسان کو زنا کی طرف لے جاتی ہیں۔ تو قدامت پرستی اور ملائیت کا طعنہ ملا۔ پہلے کالج میں کسی لڑکی سے ہنس بول لیتے تھے پھر کبھی کبھار تھا سینما جانے لگے لیکن دعویٰ پھر بھی یہی رہا کہ شراب اور زنا کے قریب نہیں پھٹکوں گا۔ ایک سال کے اندر اندر شراب اور زنا میں ملوث ہو گئے۔ ملامت کرنے پر نادم ہونے کے بجائے بڑی ڈھٹائی سے کہنے لگے۔

"تم میری جگہ ہوتے تو تم بھی یہی کرتے۔"

ایک نوجوان کی سب سے بڑی کمزوری عورت ہے، وہ لوگ جو وطن میں روایتی دینداری پر عامل ہوتے ہیں اور نیکی پر قائم رہنے کے عزائم لے کر یہاں آتے ہیں وہ پہلے ہی میدان میں شیطان سے مات کھاتے ہیں۔ وطن سے دوری، ماحول کی اجنبیت، تنہائی اور نیم برہنہ حسن کی قیامت خیزیاں انہیں پاگل بنا دیتی ہیں۔ ملنے جلنے والے انہیں مشورہ دیتے ہیں کہ وحشت دور کرنے کا سب سے اچھا ذریعہ گرل فرینڈ ہے (Girl Friend) گناہ نہ کرنا۔ بات ملاقات میں کیا حرج ہے۔ تنہائی دور ہو جائیگی۔ بعض خیر خواہ خود ہی گرل فرینڈ بھی مہیا کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک صاحب پاکستان میں کچھ لوگوں کو جانتے ہیں وہ لوگ انگلستان تعلیم کے لئے آئے وہ حضرت بھی کچھ دنوں بعد آئے اور انہی لوگوں کے ہاں ٹھہرے۔ دیکھا کہ ان کے ملاقاتی اپنا

دل ساقی و مینا کے حوالے کر چکے ہیں۔ مینا سے تو کچھ دن پرہیز رہا لیکن ساقی کے آگے جلد ہی سپر ڈالدی۔

غرض ابتدا گرل فرینڈ سے ہوتی ہے۔ یہ لفظ بڑے وسیع معنی رکھتا ہے۔ عام مغربی نوجوان کی بھی گرل فرینڈ ہوتی ہے لیکن ضروری نہیں کہ تعلق ناپاک ہو۔ اس گئے گذرے دور میں بھی نوجوان انگریز لڑکوں اور لڑکیوں کی خاصی تعداد کی دوستی پاک ہے ان کی دوستی شادی کے راستے پر پہلا اور انتہائی ضروری قدم ہوتی ہے لیکن غیر ملکی طلباء کے ساتھ جو لڑکیاں نکلتی ہیں ان میں سے شاذ و نادر کوئی اچھی ہوتی ہے۔ زیادہ تر وہ ہوتی ہیں جنہیں اپنا کوئی ہم وطن لڑکا نہیں ملتا۔ لہٰذا اپنی جوانی کنوارے پن میں گھلانے کی بجائے وہ غیر ملکیوں کے ساتھ داد عیش دینے نکلتی ہیں۔ دو چار دن پاکستانی صاحب صرف لب و نگاہ کے گناہ تک محدود رہتے ہیں۔ لیکن تابہ کے؟ ایک بھلا چنگا آدمی کہنے لگا۔ یہ آگ ناقابل برداشت ہے۔ میں اب ضبط نہیں کر سکتا۔ شراب سے ضرور پرہیز کروں گا لیکن جوان مرد اور عورت کا تعلق عین فطرت ہے۔ یہ کوئی گناہ کی بات نہیں ہے، اسلام دین فطرت ہے۔ یہ صاحب یہاں اسلامیات میں ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں۔

جب زنا جیسے گناہ سے لوگ باز نہیں آتے تو دوسرے حدود کیا اہمیت رکھتے ہیں۔ زنا کرتے ہیں تو شراب بھی پینے لگتے ہیں، کیونکہ ان کی آشنائیں شراب پیتی ہیں۔ ان کی خوشنودی حاصل کرنا ضروری ہے۔ پھر سؤر کا گوشت بھی کھانے لگتے ہیں۔ کیونکہ قدامت پرست کہلانا نہیں چاہتے۔ نیز اپنی آشناؤں کو کس منہ سے کہیں کہ سور کا گوشت حرام ہے۔ پھر وہ شراب کے بارے میں پوچھے گی نہ صرف یہ کہ حرام کھانا اور پینا شروع کر دیتے ہیں بلکہ اپنی روش کو درست ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ گوشت بہرحال گوشت ہے خواہ وہ کسی چیز کا ہو۔ کوئی کہتا ہے کہ سور کو اس کی غلاظت کی وجہ سے حرام کیا گیا تھا۔ یہ سور آدمیوں سے زیادہ صاف رہتے ہیں۔ لہٰذا اب ان کی حرمت باقی نہیں رہی۔ اسی طرح شراب کو جائز ثابت کرنے کے ہر قسم کی تاویلیں کرتے ہیں۔ بہت سے حضرات کہتے ہیں کہ قرآن میں یہ لکھا ہے کہ اگر شراب سے اجتناب کرو تو تمہارے لئے بہتر ہے، صرف سفارش ہے، کہیں حکماً حرام قرار نہیں دی گئی۔

بے شرمی کی کوئی حد نہیں ہے جسے لوگ نہ توڑتے ہوں۔ زنا کا فخریہ تذکرہ عام ہے۔ اس بات پر مقابلہ ہوتا ہے کہ کون زیادہ خوب صورت لڑکی حاصل کرتا ہے۔ ایک دوسرے کی آشناؤں پر ڈورے ڈالے جاتے ہیں۔

ذہن و فکر

انگلستان میں تھوڑے عرصہ قیام کے بعد مختصر سے اسلام پسند گروہ کو چھوڑ کر سارے طلبا شدید ذہنی مرعوبیت یا شدید قومی عصبیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اسلام پسند بھی ماحول سے بالکل بے نیاز نہیں رہتے بلکہ کسی نہ کسی حد تک ضرور متاثر ہوتے ہیں۔ جو لوگ شدید مرعوبیت کا شکار ہو جاتے ہیں وہ مغرب پرست دہریئے بن جاتے ہیں یا اشتراکی۔ انہیں اپنے ملک میں اپنے معاشرے میں اور اپنی روایات میں سوائے جہالت، تنگ نظری، دقیانوسیت اور تاریکی کے کچھ نظر نہیں آتا البتہ ہندوستان کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ یہ لوگ شراب اور عورت کے رسیا بن جاتے ہیں۔ اور بالعموم مغرب میں ہی مستقل سکونت اختیار کر لیتے ہیں۔

طالبات

طالبات بالعموم طلباء سے بھی جلدی بدل جاتی ہیں۔ بہتوں کو بدلنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی کیونکہ بہت کم شریف

حکمرانوں کی لڑکیاں تنہا لمبے دور دراز کا سفر اختیار کرتی ہیں۔ جو پاکستان چھوڑتے وقت ہی میم صاحب نہیں ہوتیں وہ جہاز پر ہی اپنے بال انگریزی طرز پر کٹوا لیتی ہیں اور جہاز کے غیر ملکی عملہ سے ناچ سیکھنے لگتی ہیں۔ کراچی بلدیہ کی ایک مشہور خاتون لیڈر جہازوں کے عملہ کے ساتھ عیاشی کرنے میں بہت بدنام ہیں۔

مغربی لباس بالعموم اختیار نہیں کیا جاتا۔ غالباً اس لئے کہ سانولی چمڑی پر سایہ بہت بدنما معلوم ہوتا ہے ۔۔ لیکن نوجوان لڑکیاں جلد انگریزی لباس اختیار کر لیتی ہیں۔ پاکستانی سفارت خانوں کی عملہ کی صاحبزادیاں کم ہی پاکستانی لباس میں نظر آتی ہیں۔

چونکہ وطن میں طالبات طلباء کی نسبت زیادہ پابند زندگی بسر کرنے کی عادی ہوتی ہیں، لہٰذا ان کے لئے یہاں کی آزادی بہت نئی چیز ہوتی ہے۔ اس نئی آزادی کا نشہ بیشتر کے سر میں چڑھ جاتا ہے اور وہ فحاشی کی طرف تیزی سے لپکتی ہیں۔

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

عبدالمجید سالک مرحوم

اب سے تقریباً بینتیس ۳۵ سال قبل مہر و سالک کا نام سُنا تھا کہ یہ دونوں اہل قلم مولانا ظفر علیخاں مرحوم کے دستِ راست ہیں اور روزنامہ "زمیندار" کی ادارت انہی کے سپرد ہے! پھر چند سال کے بعد سُنا کسی بات پر مولانا ظفر علیخاں سے ان دونوں صاحبوں کی اَن بن ہو گئی، اور انھوں نے "زمیندار" کو خیرباد کہہ کر، خود اپنا ذاتی اخبار "انقلاب" نکالا اور بہت تھوڑی مدت میں اس نوطلوع جریدے نے مقبولیت حاصل کر لی!

اُس دور میں ایک صحافی کی حیثیت سے جن چند اخبار نویسوں سے دُور کی شناسائی اور غائبانہ تعارف تھا۔ اُن میں زیادہ مشہور اور ممتاز سید جالب دہلوی، مولانا ظفر علیخاں، غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، سید حبیب، (مدیر روزنامہ سیاست) اور عارف ہسوی تھے!

تقسیم ہند سے قبل میرا قیام دلّی میں تھا۔ انہی دنوں پنجاب میٹرک کے نصاب کی ایک کتاب نظر سے گذری جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہونے کے عیسائی عقیدے کو ایک واقعہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا، اس عبارت کو پڑھ کر طبیعت مکدر ہوئی میں سوچنے لگا کہ پنجاب میں کس شخصیت کو اس سلسلہ میں لکھوں، غور و فکر کے بعد آخر نگاہِ انتخاب عبدالمجید سالک مرحوم پر جا کر ٹھہری کہ وہ اس کام کے لئے بہت موزوں ہیں، چنانچہ میں نے انہیں خط لکھا اور ان کا جواب ہاتھ کے ہاتھ آ گیا کہ آپ کی گرفت مناسب اور بجا ہے، میں محکمۂ تعلیمات کو اس خصوص میں توجہ دلاؤں گا! زندگی میں پہلی بار سالک صاحب سے میری خط و کتابت ہوئی تھی اور وہ بھی بس اتنی کہ میرے ایک لفافہ کے جواب میں انھوں نے کارڈ بھیجدیا، یہ سلسلہ پھر آگے نہ چل سکا۔

عبدالمجید سالک مرحوم سے پہلی بار ملاقات کراچی میں ہوئی، بڑی گرمجوشی اور تپاک سے ملے، جیسے بہت دنوں کی شناسائی ہے! اس کے بعد برابر ملنا ہوتا رہا، دعوتوں اور جلسوں میں، مشاعروں اور پارٹیوں میں، سرِ راہ ریلوے پلیٹ فارم پر! کراچی میں اُن کا سب سے زیادہ دوستانہ مجید لاہوری مرحوم سے تھا۔ اُن کے ساتھ اکثر و بیشتر موٹر رکشا میں آتے جاتے نظر آتے اور اشاروں ہی اشاروں میں علیک سلیک ہو جاتی، دو بار لائل پور کے مشاعرے سے واپسی میں لاہور تک اُن کے ساتھ سفر کرنے کا بھی اتفاق ہوا۔

کراچی میں غالباً دو سال مرحوم کا قیام رہا۔ حکومت کے کسی خاص فنڈ سے اُن کو بھاری تنخواہ ملتی تھی، اس کے معاوضہ میں وہ نام بدل کر "ابورشید وجدانی" کے قلمی نام سے مراسلے اور مضامین لکھتے تھے، مسٹر غلام محمد متوفی گورنر جنرل پاکستان سے اُن کے خاصے مراسم تھے، غلام محمد صاحب ایک بار انجمن ترقی اُردو کے ایک اجلاس میں آ گئے تو سالک مرحوم اُن کے استقبال میں پیش پیش تھے میں نے "فاران" میں اُن کی اس روش پر "نقاب پوش صوفی" کے عنوان سے خاصی گرفت کی۔ میری یہ تحریریں اُن کی نگاہ سے بھی گزریں مگر کسی ملاقات میں انھوں نے اس کا ذکر تک نہیں کیا، جب بھی ملے کشادہ پیشانی کے ساتھ ملے، اُن کی جگہ کوئی اور ہوتا تو کم سے کم کھنچ کر تو ملتا۔

کراچی کے قیام کے دوران میں سالک مرحوم کی ماہانہ آمدنی سرکاری فنڈ، ریڈیو اور انگریزی کتابوں کے تراجم سے پندرہ سو روپیہ ماہوار سے کیا کم ہوگی؟ مگر میں نے انہیں موٹر ٹیکسی میں کبھی نہیں دیکھا، موٹر رکشا اُن کی پسندیدہ سواری تھی، وہ بڑے قاعدے قرینے کے ساتھ زندگی گزارتے تھے، آمدنی سے مصارف ہر حال میں کم! اس لئے مالی پریشانی اُن کے پاس بھی نہ پھٹکتی تھی! اعتدال اور میانہ روی اُن کے کردار کی خصوصیت تھی!

عبدالمجید سالک مرحوم اپنی ذات سے ایک انجمن واقع ہوئے تھے، ہنس مکھ، بذلہ سنج، خوش مزاج جہاں بیٹھتے، لطیفوں، چٹکلوں اور فقروں کی پھلجھڑیاں چھوٹتے رہتے! باتوں باتوں میں علمی نکتے، شعر وسخن کی باریکیاں، اور سیاست کے رموز بیان کرتے! اردو اور فارسی ہی نہیں عربی کے قدیم شاعروں کے شعر سناتے اور زبان وادب پر عالمانہ گفتگو فرماتے! انھوں نے پاک وہند کی بڑی بڑی شخصیتوں کو دیکھا تھا، اُن کے ہم نشین رہے تھے، ہندوستان کی سیاسیات کے تمام مدوجزر اُن کی نگاہ سے گزرے تھے اس لئے علمی افکار کے دامن میں وہ بہت سے قیمتی تجربات بھی رکھتے تھے!

اہل صحافت اور اخبار نویسوں کی تحریروں میں ادبیت کم ہی پائی جاتی ہے مگر سالک کی تحریریں ادبیت سے لبریز ہوتی تھیں، طنز و مزاح میں اُن کا رنگ منفرد تھا، جہاں دوسرا طنز نگار نشتر چبھوتا، وہاں وہ چٹکیاں لیتے، سلجھا ہوا انداز بیان، دل کش اسلوب نگارش، منجھی ہوئی زبان، تحریر کے دروبست سے کمالِ مشاقی کا اظہار! ادب وشاعری کی ہر وادی میں اُن کا قلم پھول برساتا تھا، خاصے اچھے شاعر تھے مگر اُن کی شاعری دوسرے کمالات کے سامنے دب کر رہ گئی!

جناب عبدالمجید سالک کی ذات علم وادب کی بہت سی خصوصیات کی جامع تھی، شعر وادب میں وہ ناقدانہ بصیرت رکھتے تھے اور "ادبیت" کے مزاج شناس تھے، اُن کی تحریروں نے اردو ادب میں اضافہ کیا ہے اور اس قافلہ کو آگے بڑھایا ہے کہنے کو تو ہر شاعر اور ادیب کی وفات پر رسماً یہی کہا جاتا ہے کہ "علم وادب کو بڑا نقصان پہنچا" مگر عبدالمجید سالک مرحوم کی موت واقعی شعر وتنقید اور علم وادب کا بہت بڑا نقصان ہے، وہ ہمارے درمیان سے ایک خلا چھوڑ کر اُٹھے ہیں! اللہ تعالیٰ اُن کی قبر کو شبنم رحمت سے خنک وپر بہار رکھے اور آخرت کی منزل بھی اُن کے لئے آسان ہو جائے　(آمین)

ہفت روزہ
زیر ادارت
عبدالرحیم اشرف
زر تبادلہ
سالانہ
چار آنے
المنبر
لائلپور
منیجر ہفت روزہ المنبر لائل پور

ہماری نظر میں

آئینہ حقیقت نما (جلد اول و دوم) از:- مولانا شاہ اکبر خان نجیب آبادی۔ ضخامت ۶۲۴ صفحات (مجلد گردپوش کے ساتھ) قیمت: بارہ روپے۔ ملنے کا پتہ: نفیس اکیڈیمی، بوہرس اسٹریٹ کراچی۔

مولانا شاہ اکبر خاں نجیب آبادی مرحوم کو "مورخ اسلام" کا خطاب سچ مچ زیب دیتا ہے۔ اُن کے قلم نے اسلامی تاریخ کی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں! وہ ایک وقائع نگار نہیں بلکہ صاحب فکر و تحقیق مورخ تھے۔ یہ کتاب (آئینہ حقیقت نما) اُن کی مورخانہ تحقیق و بصیرت کی بولتی ہوئی شہادت ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن اسے تقریباً چالیس سال قبل (۱۹۲۰ء میں) شائع ہوا تھا۔ یہ کتاب کمیاب نہیں نایاب ہو چکی تھی۔ نفیس اکیڈیمی کے مالک چوہدری محمد اقبال سلیم گاہندری نے فاضل مصنف کے حقیقی ورثا سے اس کی طباعت و اشاعت کے حقوق خرید کر، بڑے اہتمام سے اس گرانقدر تاریخی کتاب کو شائع کیا ہے جس پر وہ مبارکباد کے مستحق ہیں!

انگریزوں کی اپنے دورِ حکومت یہ پالیسی رہی تھی:

"پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو"

سرکاری مدرسوں اور کالجوں کے کورس میں ایسی کتابیں داخل تھیں، جن میں جان بوجھ کر تاریخی واقعات کو مسخ اور محرف کیا گیا تھا اور یہ تحریف اس لئے کی گئی تھی کہ ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان نفرت پیدا ہو، اُن کے دل ایک دوسرے سے بدگمان رہیں اس کے ساتھ ہی خود مسلمانوں کی نسلیں اپنے اسلاف کے کارناموں کو سقارت کی نگاہ سے دیکھتی رہیں! مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے تحریف و افترا کے ان پردوں کو چاک کر کے، حقائق کو بے نقاب فرمایا ہے۔ اور اسی رعایت سے اپنی کتاب کا نام "آئینۂ حقیقت نما" رکھا ہے۔

اس کتاب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ رسالت ہی میں ملابار کے راجہ نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اور محمد بن قاسم کے سندھ میں داخل ہونے سے بہت پہلے ملابار میں مسلمانوں کی آبادی موجود تھی! خود سندھ میں اسلام مقبول ہو چکا تھا عرب، قوم جن کو زط کہتی ہے، یہ وہ نو مسلم جاٹ تھے، جو اپنا آبائی مذہب ترک کر کے مسلمان ہو گئے تھے، اور ان کی بہت بڑی تعداد عراق میں جا کر آباد ہو گئی تھی ——— تو اسلام کا ہندوستان میں تعارف محمد بن قاسم کی تلوار نے نہیں بلکہ خود اسلام کی صداقت نے مبلغین کے ذریعہ کرایا تھا! زیادتی راجہ داہر کی طرف سے ہوئی کہ اس کی فوج نے مسلمان حاجیوں کے جہاز لوٹ لئے، اور یہی واقعہ محمد بن قاسم کے سندھ میں آنے کا سبب ہوا۔

محمد بن قاسم کی رواداری کا تو یہ عالم تھا کہ تین روپیہ فیصدی مندروں کے لئے خزانہ سرکاری میں حصہ مقرر کر دیا اس کے بعد اس نے برہمنوں کے سب سے بڑے پنڈت کو رآنہ کا خطاب دے کر اُن کے امور مذہبی کا مہتمم اور افسر مقرر کر دیا (صفحہ ۱۳۱) "محمد بن قاسم اور اس کے بعد مسلمان گورنروں نے ملک سندھ میں ہندوؤں کے مندروں کے لئے بڑی بڑی جاگیریں

وقف کیں۔" (صفحہ ۱۳۴) محکمہ مال کا تمام انتظام برہمنوں کے سپرد کر دیا گیا (صفحہ ۱۳۶)

محمود غزنوی کو انگریز مورخین نے کس قدر بدنام کیا ہے، اور اس کی تصویر کس قدر مسخ کر کے پیش کی ہے، اس کتاب پر ان حقائق کو بے نقاب کیا گیا ہے کہ سب سے پہلے حملہ محمود غزنوی نے نہیں، بلکہ جے پال نے کیا تھا •کیا دنیا میں اس سے بڑھ کر بھی سفید جھوٹ ہو سکتا ہے کہ محمود کو ظالم اور جے پال کو مظلوم بنایا جاتا ہے اور جے پال کی یورش کو محمود کا حملہ قرار دیا گیا ہے (صفحہ ۱۹۷) — — اور — —

"محمود غزنوی اگر واقعی لوگوں کو مسلمان بنانے اور جو انکار کرے اسے فوراً قتل کر ڈالنے کا شوقین تھا، تو تعجب ہے کہ جے پال آٹھ مہینے تک اس کے پاس رہا اور مسلمان نہ ہوا بلکہ ہندو کا ہندو ہی بنا ہوا صحیح سلامت واپس آیا۔ محمود نے اس سے خراج گزاری اور فرمانبرداری کا اقرار تو لیا مگر مسلمان ہونے کی فرمائش نہ کی، اور اگر فرمائش کی بھی تھی تو اس کے انکار پر اس کو قتل کیوں نہیں کیا (صفحہ ۱۹۷)

ہندوستان میں قرامطہ و ملاحدہ کا ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا جو مسلمانوں کو بے دریغ قتل کرتا تھا۔ ان زندیقوں کے عقائد کتاب و سنت کے خلاف تھے اور مسلمانوں کے قتل و غارت گری کے علاوہ باطنی حقائق اور محبت اہل بیت کے نام پر امت کے عقائد کو بگاڑنا بھی ان کی تحریک کا سب سے بڑا مقصد تھا — ان زنادقہ کی پشت پناہی ہندوستان کے ہندو کھل کر کرتے تھے محمود غزنوی کو انہی قرامطہ کی سرکوبی کے لئے ہندوستان کی طرف متوجہ ہونا پڑا اور شہاب الدین غوری کے حملہ کا سبب بھی ملاحدہ کی مسلم کش تحریک کو ختم کرنا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کی لپیٹ میں قرامطہ و ملاحدہ کے پشت پناہ بھی آ گئے!

سلطان محمد تغلق پر مورخین نے جو الزامات لگائے ہیں، اس کتاب میں ایک ایک الزام کو تاریخی دلائل کے ساتھ رفع کیا گیا ہے۔ فاضل مصنف کی نگاہ میں محمد تغلق ایک عالم متبحر، اعلیٰ درجہ کا پابند مذہب نہایت دانشمند معاملہ فہم اور سیاست داں فرمانروا تھا۔ بہت سی باتیں اس کی طرف یا تو غلط منسوب کر دی گئی ہیں، یا ان میں بہت مبالغہ کیا گیا ہے مولانا اکبر شاہ خاں مرحوم نے کھل کر لکھا ہے کہ سلطان محمد تغلق شرک و بدعت اور عجمی تصوف کا سخت مخالف تھا، اس لئے اہل تصوف نے اس کے بدنام کرنے میں بہت بڑا پارٹ انجام دیا ہے اس کے برخلاف فیروز شاہ تغلق کی نیک نامی میں اہل خانقاہ کی روایتوں کا بہت کچھ دخل ہے — کہ فیروز شاہ قبر پرستی کی طرف مائل تھا۔ اس نے اپنے بیٹے فتح خاں کا سر بہرائچ کی ایک قبر پہ جا کر منڈوایا تھا — — اور — —

"اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں فیروز تغلق ہی کے چلن سے طرز عمل نے گور پرستی کے مراسم کو ایسا پائدار و استوار بنایا کہ آج تک اس نے مسلمانوں کا پیچھا نہیں چھوڑا" (صفحہ ۵۸۶)

یہ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی جیسے محقق ہی کے کرنے کا کام تھا کہ انھوں نے مشہور مورخین ضیاء برنی اور شمس سراج عفیف پر سخت گرفت کی ہے اور ان کے تاریخی نوشتوں کی کمزوریاں دکھائی ہیں!

مولانا اکبر شاہ مرحوم کو شبلی نعمانی جیسا شگفتہ اور معجز نما قلم تو نہیں مل سکا مگر ان کی تحریر خاصی رواں اور دلچسپ ہے ان کی زبان بھی سلیس ہے اور مورخانہ بصیرت ان سب پر فائق!

ملہ "اپنا عمل دخل بٹھایا" (صفحہ ۳۰) عمل دخل کے ساتھ "بیٹھنا" محل نظر ہے "سلطان حسین نے وزیر خواجہ کی تہ (دیتیوٹ) کے صفحہ

سفرِ حجاز — از:- عبدالکریم ثمر، ضخامت ۲۰ صفحات (خوشنما ٹائپ ——— نفیس، ورق) قیمت دو روپے
ملنے کا پتہ:- مکتبہ عرفان، اچھرہ، لاہور

جناب عبدالکریم ثمر اردو زبان کے جانے پہچانے شاعر ہیں، گزشتہ سال اللہ تعالیٰ نے انہیں حرمین شریفین کی زیارت کی توفیق عطا فرمائی، یہ کتاب اُن کے اس مبارک سفر کی یادگار ہے! "سفرِ حجاز" کے "پیش لفظ" میں فاضل مصنف نے بتایا ہے کہ اس کتاب کے بعض مضامین متعدد رسائل و اخبارات میں چھپے اور بہت زیادہ پسند کیے گئے!

"سفرِ حجاز" ایک دلچسپ سفرنامہ ہے جس میں مذہبی شغف اور خاص طور سے عشقِ رسول بہت نمایاں ہے، مقاماتِ مقدس کی تاریخی اور جغرافیائی تفصیل اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

"...... یہ شرف شاید دنیا بھر میں پنجاب ہی کو حاصل ہے کہ پنجابی ہر زبان کا صحیح تلفظ ادا کر سکتا ہے۔" (صفحہ ۵) تو پھر پنجابی "ق" کو "ک" (اقبال کو اکبال) کیوں بولتے ہیں۔ "مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ ہوائی جہاز سے صرف ایک گھنٹہ کی مسافت ہے۔ (صفحہ ۹) مگر ہوائی اڈہ مکہ معظمہ میں نہیں جدہ میں ہے ——— "مکہ معظمہ کی آبادی تقریباً آٹھ لاکھ ہے" (صفحہ ۲۰) مکہ مکرمہ کی اتنی آبادی نہیں ہے، شاید اس تعداد کی نصف بھی نہ ہو۔ "گرمیوں میں جدہ کا درجہ حرارت ۱۴ رہتا ہے" (صفحہ ۲۱) جدہ کے درجہ حرارت کا یہ عدد بالکل غلط ہے!

"مکہ معظمہ کے کبوتر نسبتاً لاپرواہ اور کھردرے مزاج کے ہیں، لیکن مدینہ منورہ کے کبوتر مودب اور محبت اپنے والے ہیں۔" (صفحہ ۱۷) مکہ اور مدینہ کے کبوتروں کے درمیان مزاج و طبیعت کا یہ فرق پیدا کرنا، نازک زری خیال آرائی ہے اس قسم کے توہمات اور عقیدت کی باریکیوں نے افکار دعقائد میں بڑے پیچ ڈال دیئے ہیں، اسی صفحہ پر مدینہ منورہ کے کتوں کے لئے لکھا ہے کہ وہ پیشاب کے لئے حدودِ حرم سے باہر چلے جاتے ہیں۔ فاضل زائر نے نہ جانے کتنے دن اس ریسرچ میں صرف کئے ہونگے کہ مدینہ کے کتے کہاں پیشاب کرتے ہیں؟ ——— آج تک کسی دوسرے زائر اور سفرنامہ لکھنے والوں کو تو اس کشف کی توفیق نصیب نہیں ہوئی!

"غیر ملکی بھی یہاں عام ہیں" (صفحہ ۸) "عام" آسا یہاں کس قدر کھٹکتا ہے، یوں لکھنا چاہیے تھا ——— کہ "غیر ملکی یہاں ہر طرف نظر آتے ہیں یا ان کی خاصی تعداد یہاں پائی جاتی ہے۔" "انگریزی اور فارسی میں بھی تفہیم اور ادراک رکھتے ہیں"۔ (صفحہ ۱۳) "ادراک" کی جگہ "درک" لکھنا چاہیے تھا ——— "حجاج اپنے عزیز و اقارب، اعزہ احباب اور متعلقین کے لئے دعا کرتے ہیں"۔ (صفحہ ۵۰) "عزیز" کے بعد "اعزہ" کی پھر کیا ضرورت تھی۔ "سر جھینک کے اور کان دبا کر ادب سے گزر جاتے ہیں گے"۔ (صفحہ ۱۰) "سر جھینکنا" یہ کہاں کی زبان ہے! سر کو جھکایا جاتا ہے جھٹکا دیا جاتا ہے، سر جھینکا نہیں جاتا!!

"یہ لوگ خواجہ کون و مکاں کے اجلال و احترام کے سامنے فی الفور جھک جاتے ہیں"، (صفحہ ۱۲۵) "احترام" کا استعمال یہاں بالکل غلط ہوا ہے، "احترام کے لئے جھکا جاتا ہے" "احترام کے سامنے نہیں جھکا جاتا"۔

صفحہ ۱۲۵ پر یہ مصرعہ نظر آیا: لذیذ بود حکایت دراز تر کفتم ——— آخر اس مشہور مصرعہ ...

(بقیہ نوٹ صفحۂ گزشتہ) جو حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے ہمشیرزادے تھے۔ (صفحہ ۱۳۱) لکھنا یوں چاہیے تھا "خواجہ زکی جو حضرت خواجہ حسن بصری کی ہمشیرہ کی اولاد میں تھے"۔

لذیذ بُود حکایت دراز تر گفتم ——— میں اس بے معنی تصرف کی کیا ضرورت تھی! "وِلے" کی جگہ "بلے" ہوتا تو مصرعہ کی چول کسی حد تک سیدھی بیٹھ سکتی تھی۔

صفحہ ۸۲ پر "حضرت دحیہ" کو "حضرت دصیہ" پڑھنا پڑا۔ مئذنہ کو صفحہ ۹۰ پر "مندنہ" کپوز کیا گیا ہے حضرت مصعب بن عمیرؓ تاپ میں "مصعب بن عمرؓ" (صفحہ ۹۹) چھپ گیا ——— "مواجہ شریف" کو ہر جگہ "ماجہ شریف" لکھا گیا ہے ——— صفحہ ۹۴ پر "قاش" کا املا "کاش" کیا گیا ہے!

قمر صاحب کو بڑی تمناؤں اور آرزوؤں کے بعد زندگی میں سب سے پہلی بار زیارتِ حرمین کی سعادت نصیب ہوئی تھی ——— مگر صفحہ ۱۱۱ پر حرم کعبہ کی حاضری کی کیفیت صرف چھ سات سطروں میں بیان کی ہے اور اس میں بھی کوئی خاص تاثر نہیں ہے حالانکہ جذبات کی عکاسی اور واردات وکیفیات کی ترجمانی کا یہ بہترین موقعہ تھا!

سبزہ خودرو چمن کی ڈالیاں روئے فطرت پر حسینوں کا گماں (صفحہ ۱۳۷)

مصرعہ ثانی کس قدر کمزور ہے!

مصطفیٰؐ وہ صاحبِ خلقِ عظیم دودمانِ ہاشمی، دُرِ یتیم (صفحہ ۱۴۱)

"دودمان" تو خاندان اور کنبہ کو کہتے ہیں ——— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "دُودمانِ ہاشمی" نہ تھے بلکہ "اندُودمانِ ہاشمی" اور "فخرِ دُودمانِ ہاشمی" تھے۔

مصطفیٰؐ وہ وجہِ لُطفِ ذوالمنن اک بہارِ جاوداں باغ و چمن (صفحہ ۱۴۱)

مصرعہ ثانی نوشتوں کے کہنے کا تھا!

مصطفیٰؐ روحِ نظر، جانِ غزل مظہرِ ذاتِ جمالِ لم یزل

"جانِ غزل" کی مناسبت سے "روحِ ادب" لانا تھا "روحِ نظر" بے معنی ترکیب ہے!

سنگِ اسود، بابِ کعبہ اور حطیم یہ صفا، یہ مروہ یہ سعیِ قدیم

"حطیم" کے لئے قافیہ کی ضرورت تھی "قدیم" ذہن میں آیا اور اس پر "سعی" کا جوڑ لگا کر، شعر تیار کردیا۔

کوہِ رحمت میں ہیں عرفانی حروف اور مزدلفہ میرے لازم وقوف (صفحہ ۱۴۳)

"عرفانی حروف" لانے کی یہاں کیا تُک تھی۔

دم بخود انسان کے فکر و قیاس جامۂ احرام جنت کا لباس (صفحہ ۱۴۳)

مصرعہ اولیٰ کو مصرعہ ثانی سے آخر کیا ربط ہے!

میں چلا ہستی کے زینے کی طرف باوضو ہو کر مدینے کی طرف (صفحہ ۱۴۳)

"ہستی کے زینے" سے مفہوم تو پیدا کیا جاسکتا ہے مگر شاعری میں سارا لطف لفظوں کی مناسبت و بندش اور حسن و خوبی کا ہے!

اللہ اللہ! یہ مدینہ کا سفر سخت راہیں، منزلیں دشوار تر (صفحہ ۱۴۳)

مدینہ کی حاضری کا وہ ذوق و شوق ——— اور اس پر "آمادہ طلبی" کا یہ عالم کہ موٹر بس کے ذریعہ پختہ سڑک کے سفر کو "سخت راہ" اور "منزلِ دُشوار تر" محسوس کیا جارہا ہے۔

راہ مکہ نسبت آسان تھی ! 　　 شرحِ بیضا زیست کا سامان تھی 　　 (صفحہ ۱۴۲)

مصرعہ ثانی مہمل ہے !

راہِ بطحا حسرت تعبیر کر 　　 خاکپائے مصطفےٰؐ اکسیر ہے 　　 (صفحہ ۱۴۳)

مصرعہ اولیٰ سے آخر کس خیال کا اظہار مقصود ہے ۔

سہل حق کی معرفت کا ادعا 　　 اور مشکل ہے مقامِ مصطفےٰؐ

اول تو دینی نقطۂ نگاہ سے یہ بات سخت قابلِ اعتراض ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کا دعویٰ کرنا تو آسان ہے مگر مقامِ مصطفیٰؐ کا پہچاننا مشکل ہے 　　 پھر مصرعہ ثانی میں "مقامِ مصطفےٰؐ" کے ساتھ "عرفان" جیسی کوئی ترکیب ضروری تھی یا مصرعہ ثانی اس انداز کا ہوتا ۔ ؎

اور مشکل ہے شعورِ مصطفےٰؐ

حسن کبر و ناز کا شہکار ہے 　　 عشق کی منزل مگر دشوار ہے 　　 (صفحہ ۱۴۴)

دونوں مصرعوں میں آخر مناسبت کیا ہے ؟ "مگر" لانے کا یہاں کیا محل تھا اور حسن کو کبر و ناز کا شاہکار کہنا بھی ایک عجیب سی بات ہے ۔

ایک غریبِ شہر کا پہنچے سلام 　　 احترام اے خانۂ بے ننگ و نام 　　 (صفحہ ۱۴۷)

مصرعہ ثانی میں اہمال کے سوا اور کیا دھرا ہے ؟

گلستاں میں بس رہی ہے بوئے دوست 　　 ہے نظر افروز گویا کوئے دوست 　　 (صفحہ ۱۴۷)

"گویا" نے "کوئے دوست" کی تابانی اور عظمت کو کس قدر مجروح کر دیا ۔

السلام اے ساکنِ عرشِ علیٰ 　　 ذرۂ شمس الضحیٰ بدر الدجیٰ 　　 (صفحہ ۱۴۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ساکنِ عرش نہیں زائرِ عرش کہہ سکتے ہیں ! "استواء علی العرش" کا تعلق اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہیں ہے !

السلام اے برتر از وہم و گماں 　　 مونس خفتہ سراں خستہ دلاں 　　 (صفحہ ۱۵۰)

"خفتہ سراں" کی ترکیب بہت کچھ محلِ نظر ہے 　　 "خفتہ نصیب" کی ترجمانی غالباً مقصود تھی ۔

بے نواؤں کو گل افشاں کر دیا 　　 تو نے کانٹوں کو گلستاں کر دیا 　　 (صفحہ ۱۵۰)

"زرافشاں" کا محل تھا ۔

اے ذہین و زیرک و بالغ نظر 　　 حق شناس و حق نواز و حق نگر 　　 (صفحہ ۱۵۱)

پہلا مصرعہ شاعر کے ذوق، وجدان اور فکر و خیال اور قوتِ اظہار کا برا نمونہ پیش کرتا ہے ! ایک طرف وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "برتر از وہم و گماں" کہتا ہے اور دوسری طرف ذہین و زیرک اور بالغ نظر جیسے عامیانہ القاب سے خطاب کرتا ہے ! توبہ ! یہ کیسی شاعری اور کیا اسلوب ہے کہ جو لفظ ذہن میں آیا ، بے سوچے سمجھے نظم کر ڈالا ! حیرت ہے سالہا سال کی مشقِ سخن کے بعد بھی بعض لوگوں کے کلام میں اس قدر ناپختگی پائی جاتی ہے ۔

سہل کر دے آیۂ تسخیر کو 　　 روشنی دے کوکبِ تقدیر کو 　　 (صفحہ ۱۵۲)

"آیۂ تسخیر کا حل کرنا" یہ آخر کیا بات ہوئی؟

شہرتِ جاوید ہے تیری کنیز　　میرے حرفِ شوق پر پڑے دبیز　　(صفحہ ۵۳)

دونوں مصرعوں میں کوئی ربط نہیں ہے۔ اقبال کی تقلید کے لئے وسیع مطالعہ، عمیق تفکر، مد بڑے نکھرے ہوئے ذوق کی ضرورت ہے۔

سلام تجھ پر کہ تو نے ہی سازِ ہستی کو　　بساطِ ارض و سما میں نواطراز کیا　　(صفحہ ۱۵۸)

"فضائے ارض و سما" کہنا چاہیے تھا کہ ساز "بساط" میں نہیں "بساط" پر یا "فضا میں" نواطراز ہوتا ہے۔

سلام تجھ پہ کہ تیرے ہی ظرفِ عالی نے　　نگاہِ شوق و محبت میں امتیاز کیا　　(صفحہ ۱۵۸)

"شوق و محبت کی نگاہ میں امتیاز کرنا" ہی کم عجیب بات نہ تھی کہ "ظرفِ عالی" نے اس اچھوتے پن میں ابہام بلکہ اہمال پیدا کردیا۔

مجھے بخشا گیا فقر و غنائے بوذر و خیبر　　کہ میں اب دین و ایماں کی دولت لیکے آیا ہوں

اسی کا نام ہے چھوٹا منہ اور بڑی بات!

بہت ارفع و اعلیٰ ہیں مدارج عشق و مستی کے
فسانے کے حجابوں میں حقیقت لیکے آیا ہوں

"ارفع" کو "رفیع" پڑھا جائیگا تو مصرعہ موزوں ہو گا، دوسرے مصرعہ کو چاہنا چاہیں گوارا ہی کیا جا سکتا ہے

تہی داماں گیا تھا اے شرِ دکن میں طیبہ سے
نگاہ و دل میں جلوہ زارِ عظمت لیکے آیا ہوں

"جلوہ زار عظمت" ایک مہمل ترکیب ہے!

یہ صحنِ حرم اور روضہ کی جالی　　بخ ہیں کبھی ہیں یاد رضوان اللہ
حریم پاک میں ہیں سب برابر　　گدا ابن گدا اور شاہزادہ
اب قدم ہیں منزلِ مقصود پر　　اور سفینہ ساحلِ مقصود پر
اے ظہورِ نغمۂ کیف و سرور　　اے کہ تیرا ذکر ہے شرحِ صدور
تیری رحمت ہے محیطِ بحر و بر　　میرا دامانِ تمنا مختصر

کاش! نعت و منقبت میں شروع سے آخر تک یہی رنگ قائم رہتا۔

حیاتُ المسلمین | از:- مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم، ضخامت ۲۹۴ صفحات۔ قیمت: ایک روپیہ آٹھ آنہ
ملنے کا پتہ:- مکتبہ کریمیہ بیرون بوہڑ گیٹ، ملتان شہر۔

یہ کتاب پچیس ابواب پر مشتمل ہے، جس کے چند ابواب یہ ہیں:

تقدیر پر یقین اور اللہ پر بھروسہ رکھنا ——— مسلمان بھائیوں کے حقوق ادا کرنا ——— نکاح اور اولاد کی فضیلت ——— گناہوں سے بچنا ——— کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا ———

پوری کتاب اسلامی اخلاق و عبادات اور معاملات کے وعظ و تذکیر اور ضروری نصائح اور ہدایتوں سے بھرپور ہے۔ ہر باب احادیثِ رسول سے مزین اور موکد کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اللہ اور رسول کی اطاعت کا جذبہ ابھرتا

ہے اور دین سے شغف پیدا ہوتا ہے، حضرت حکیم الامت کی یہ کتاب واقعی مسلمانوں میں دینی زندگی پیدا کرتی ہے۔

دو نبی ـــــ نبی صادق اور نبی کاذب

مصنف: مولانا محمد بشیر اللہ مظاہری، ضخامت ۱۰۴ صفحات
قیمت: دو روپے۔

ملنے کا پتہ: شعبہ نشر واشاعت مرکزی جمعیۃ علماء برما۔ ۲۵۱ - ۲۵۳ گلی نمبر ۲۶، رنگون

اس کتاب کے شروع میں "تحریکِ قادنیت" کا پس منظر پیش کیا گیا ہے کہ انگریزی حکومت کی سرپرستی کے سہارے یہ تحریک ابھری ہے اور اس کے داعی نے کتنے چولے بدلے ہیں! اس کے بعد "سچے نبی" (سیدنا محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے مقدس حالات پیش کئے ہیں اور پھر "نبی کاذب" (مرزا غلام احمد قادیانی) کے سوانح حیات درج کئے گئے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ لوگ دونوں زندگیوں کے قول وفعل میں موازنہ کرکے دیکھ لیں کہ سچے نبی اور جھوٹے نبی کے کردار اور قول وعمل میں کس قدر نمایاں فرق ہوتا ہے۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام اور حضرت سیدتنا مریم سلام اللہ علیہا کی شان میں مرزائے قادیان نے جو گستاخیاں کی ہیں انہیں پڑھ کر طبیعت میں سخت انقباض پیدا ہوتا ہے، حالانکہ ہر سچے نبی نے پچھلے نبیوں کی تصدیق اور تعریف ہی کی ہے کہ وہ سب ایک ہی پیغام کے حامل ومناد تھے، اور ان کے درمیان معاذ اللہ کسی قسم کی چشمک نہ پائی جاتی تھی۔

یہ کتاب قادیانیوں کی کتابوں کے مستند حوالوں کے ساتھ لکھی گئی ہے، اور ہر بات نقلی وعقلی دلیل کے ساتھ کہی گئی ہے اس کے مطالعہ سے حقیقی نبوت اور مصنوعی نبوت کا فرق واضح ہوتا ہے! اللہ تعالیٰ اس کے مرتب کو دارین میں اجر جزیل اور ثواب عظیم عطا فرمائے گا۔

اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس قسم کے فتنوں سے محفوظ رکھے، ہم اللہ تعالیٰ کو حاضر وناظر جان کر اور مان کر نبی آخر سیدنا محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد کے ہر مدعیٔ نبوت سے اپنی کامل بیزاری کا اظہار کرتے ہیں اور اسی عقیدہ پر اپنا خاتمہ چاہتے ہیں! (اللّٰھم صلّ علیٰ من قال "لا نبی بعدی")

ہدایت کے ستارے

از:- خادم کیتھلی، ضخامت ۱۳۶ صفحات (مجلد، رنگین گردپوش کے ساتھ) قیمت: ایک روپیہ آٹھ آنہ
ملنے کا پتہ: مکتبہ غنچۂ ادب، حرم گیٹ، ملتان۔

جناب خادم کیتھلی کو شعر وادب کی دنیا میں بہت کم لوگ جانتے ہیں، انھوں نے اپنے تعارف کے لئے جدوجہد بھی نہیں کی خاموشی کے ساتھ شعر وادب کی خدمت کرتے رہے، شاید پہلی بار ان کے افکار کتابی صورت میں منظر عام پر آئے ہیں۔

خادم کیتھلی دین وملت کی ترقی کے لئے مضطرب دل اپنے پہلو میں رکھتے ہیں۔　　حساس اور غیرت مند دل کی یہی دردمندی نظم ونثر کے قالب میں ڈھل کر خاصی اثرانگیز بن گئی ہے، انھوں نے حمد ونعت، اصلاحی نظموں، مکالمات اور تمثیلوں کا ایک خوشنما گلدستہ مرتب کیا ہے جس سے نوخیز نسل کا کردار مہک سکتا ہے!

"حسنِ نظر" خادم صاحب کی مترنم وروان نظم ہے جس کا یہ شعر کتنا اچھا ہے۔

دیکھ! آہستہ چل نسیمِ چمن　　لالہ وگل ہیں بس چراغ سحر

ان چند منتخب شعروں سے شاعر کے کلام کی خوبیوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:-

بڑھتا ہی عنایت کے لئے دستِ مشیت　　ہوجاتے ہیں جب ختم زمانے کے سہارے

آپ جب تشریف لائے نور نے پایا ظہور　　وہ جو تھا پردوں میں پنہاں آشکارا ہوگیا

تم نے موجوں کی طرف دیکھا سفینہ بن گئیں　　تم نے طوفاں پر نظر ڈالی کنارہ ہوگیا

ہے بہت بلند ان سے مری زندگی کی منزل　　یہ بیانِ چشم و عارض، یہ حدیثِ زلف و شانہ

وہ ایک قطرہ جو ہے جذبِ ریگِ ساحل میں

میں اُس کو موجۂ طوفاں بنا کے چھوڑوں گا

جس نظم (دُعا) سے کتاب کی ابتدا کی گئی ہے، وہ کمزور نظم ہے ——— "جو سپاہی ایک دُشمن کو قتل کریگا، وہ ایک قوم کے وجود میں شگاف پیدا کریگا" (صفحہ ۵۰) یہ نو مشقوں کا سا اندازِ بیان ہے ——— "جب کوئی شخص ہی بات کے لئے ملازم رکھا ہوا ہے"۔ (صفحہ ۶۹)، توقع ہے کہ مشق و مطالعہ کے بعد آئندہ چل کر خادم صاحب کی تحریروں میں پختگی پیدا ہو جائے گی۔ اس وقت اس قسم کے جملوں کی سطحیت اُنہیں محسوس ہو گی ——— "کرے کی سیاہیت" (صفحہ ۹۲) "سیاہیت" کو پڑھ کر وجدان "ملاتا" ہے ——— "مسلمانو! تم حسینؓ کا سوگ مناتے ہو مجھے انکار نہیں۔۔۔" ——— "انکار" کا یہاں کیا محل تھا۔

جو نظر آتی ہے افسردہ و مغموم و حزیں

ہاں! اُسی دُنیا میں تو حُسنِ نظر پیدا کر　　(صفحہ ۹۸)

"دُنیا" کا اسقاط بُری طرح دب رہا ہے! "حُسنِ نظر" بھی اس شعر میں بے محل استعمال ہوا ہے! "حُسنِ نظر" سے کیا غم و حزن اور افسردگی دُور ہو جاتی ہے؟!

اس کتاب پر جناب عبدالمجید سالک مرحوم کی یہ رائے بہت وزن رکھتی ہے:-

"جناب خادم کیتھلی نے چند نظموں، ڈراموں اور تقریروں کو مسلمان بچوں کے لئے بڑے سلیقہ سے مُرتّب کیا ہے، اگر مدارس کے ہیڈ ماسٹر اس کتاب کو اپنے ہاں رائج کریں، بچوں کو نظمیں حفظ کرائیں، بچوں سے ڈرامے کرائیں اور تقریروں کی مشق کرائیں، تو اس تربیتِ ذہنی کا اثر بہت مُبارک ہوگا"

آفتابِ نبوّت ——— جلد اوّل

از: مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند، ضخامت ۱۶۰ صفحات۔ قیمت: مجلد مع گرد پوش: دو روپے ملنے کا پتہ: ادارہ تاج المعارف، دیوبند (بھارت)

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کو اللہ تعالیٰ نے سحر آفریں زبان، خوش رقم قلم اور حکمت شناس فہم عطا فرمائی ہے، قاری صاحب موصوف کی زندگی تبلیغِ دین کے لئے وقف ہے اور اُن کی ذات سے مسلمانوں کو بڑا دینی نفع پہنچ رہا ہے۔ یہ کتاب اُن کے علمی تبحر اور ذاتِ رسالت مآب سے عقیدت و شغف اور نسبتِ محبت کی آئینہ دار ہے! اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ قدسی صفات ہدایت و سعادت کا آفتاب تھی جس نے تمام کائنات کو منور کر دیا اور قیامت تک یہ اُجالا باقی رہیگا! فاضل مصنف کی زبان شیریں، قلم شگفتہ اور فکر بلند ہے، شروع سے لے کر آخر تک کتاب دلچسپ ہے!

لے "اور دین بسط کے ساتھ نہیں پھیل سکتا جب تک خود اس میں "پھیل پڑنے کی" صلاحیتیں موجود نہ ہوں (۔)" "پھیل پڑنا" اس عبارت میں محل نظر ہے۔　　وہ مارنے کیلئے پھیل پڑتا۔ یہ ہے اس "فعل" کا صحیح استعمال!

اس کتاب میں سب سے زیادہ کھٹکنے والی بات یہ ہے :-

"چنانچہ بہ تصریح قرآن جبرئیل علیہ السلام نے ایک کامل الخلقۃ اور بالفاظ قرآن بشر سوی کی صورت میں نمایاں ہو کر مریم پاک کے گریبان میں پھونک ماری جس سے وہ حاملہ ہوئیں تو اس وقت جبرئیل صورتِ محمدی میں تھے (جیسا کہ روح المعانی میں اس کے بارے میں بعض آثار و روایات منقول ہیں) اور ہر صورت اپنے مناسب ہی حقیقت کا تقاضا کرتی ہے۔ اس لئے یہ صورتِ محمدی، کمالاتِ محمدیہ ہی کی نوعیت کی متقاضی تھی۔ اگرچہ وہ صورت جبریل کا چولہ ہی ہوئی تھی، اور انھوں نے گویا اس صورت میں حقیقتِ محمدیہ ہی کی نوعیت کو لے کر مریم پاک کے گریبان میں پھونک ماری جس سے مسیح علیہ السلام کا ماں کے پیٹ میں وجود ہوا جس کے یہ معنی ہوئے کہ گویا مسیح علیہ السلام، حقیقت میں بواسطۂ شبیہ محمدی خود حقیقتِ محمدیہ کی نوعیت شامل تھی"۔

صاحب روح المعانی کی یہ دماغی اُپج اس قابل نہ تھی کہ مولانا قاری طیب صاحب جیسے سنجیدہ اور متبحر عالم اس کا اثر قبول فرماتے یہ نری شاعری اور افسانہ سازی ہے اور عجمی تصوف کا وہ تاریک ترین پہلو ہے جس نے "باطنیت" کو فروغ دیا ہے! دین کو اس قسم کی دور از کار دکتوں اور عجیب و غریب نکتہ آفرینیوں سے نقصان ہی پہنچا ہے!

"بلکہ آپ کا اصل امتیازی وصف یہ ہے کہ آپ نورِ نبوت میں سب انبیاء کے مُربّی، اُن کے انوار کمال کی اصل ہیں، اس لئے اصل میں نبی آپ ہیں اور دوسرے انبیاء علیہم السلام اصل نہیں بلکہ آپ کے فیض سے نبی ہوئے ہیں ...." (صفحہ ۹۶)

"مُربّی" کے معنی ہیں　　پرورش کرنے والا، تربیت دینے والا، محافظ و سرپرست　　تو سیدنا محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام افضل الانبیاء، اشرف الرسل اور خاتم النبیین تھے مگر انبیاء کے نگہبان و محافظ اور اُن کی تربیت دینے والے نہ تھے۔ دوسرے انبیاء کرام کے بارے میں یہ کہنا کہ "وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض سے نبی ہوئے ہیں، اصل سے نبی نہیں ہیں اصل میں نبی آپ (سیدنا محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام) ہی تھے"۔ واقعہ کے خلاف ہے، کتاب و سُنّت کے خلاف ہے! (توبہ) تمام انبیاء کرام، نبیٔ آخر ہی کی طرح اصلی اور حقیقی نبی تھے، اُن سب کو اللہ تعالیٰ نے براہِ راست نبی بنایا تھا، اور ان کی تربیت، نگہبانی اور محافظت اللہ تعالیٰ نے فرمائی تھی، کسی دوسرے کے "نور" نے نہیں کی تھی! ہمیں تعلیم دی گئی ہے کہ انبیاء کرام کے درمیان تفریق پیدا نہ کریں مگر یہ کیا ہو رہا ہے کہ "نور" کے پردے میں حقیقی و غیر حقیقی نبی اور اصل و فرع کی تفریق پیدا کی جا رہی ہے۔ —— استغفراللہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی تھی :

اِنّی لا ارید ان ترفعونی فوق منزلتی　بے شک میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے میرے رتبہ سے زیادہ بڑھاؤ

حیرت ہے کہ دیوبند میں فرمانِ رسول ؐ کے ساتھ یہ افسوسناک سلوک کیا جا رہا ہے! قاری صاحب قبلہ کی خدمت میں ہماری گزارش ہے کہ وہ اپنی اس کتاب پر نظرِ ثانی فرما کر، اس قسم کے تمام مباحث کو یا تو نکال دیں، یا اُن کی تصحیح فرما دیں —— حضور بلاشبہ "آفتابِ نبوت" تھے مگر حضورؐ کی مدحت اس انداز میں کرنا کہ —— اس آفتاب کے مقابلہ میں دوسرے انبیاء ڈوبتے ہوئے دیئے یا دھندلے تارے نظر آئیں —— سخت ناپسندیدہ اندازِ بیان ہے!

پیاری نظمیں۔ حصہ اوّل ضخامت ۳۲ صفحات۔ قیمت ۱۵ نئے پیسے، (۲) پیاری نظمیں حصہ دوم ضخامت ۲۴ صفحات قیمت ۲۵ نئے پیسے (۴۰) —— (۳) ہمارے نغمے (حصہ اول) ضخامت ۴۰ صفحات قیمت (۴) "ہمارے نغمے" (حصہ دوم) قیمت چھ آنے — ملنے کا پتہ: مکتبہ جماعت اسلامی ہند، رامپور (بھارت)

جناب مولوی فضل حسین صاحب (ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی) ناظم درس گاہ مرکزی جماعت اسلامی ہند رامپور۔ نے، بچوں کیلئے نظموں کے یہ کتابچے مرتبہ کئے ہیں۔ زیادہ تر نظمیں ہلکی پھلکی، دل چسپ اور بچوں کی نفسیات سے مطابق ہیں؛ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اخلاق و تہذیب کے حدود کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے! یہ نظمیں ایک طرف شاعری کا صحیح ذوق پیدا کرتی ہیں۔ دوسری طرف اللہ اور رسول اور آیاتِ الٰہی (مناظرِ فطرت) کے بارے میں یقین آفریں تصور دیتی ہیں! کتابت و طباعت خوب اور سرورق حسین و جاذبِ نظر اور رنگا رنگ ہیں۔۔

"ہمارے نغمے" (حصہ اول) صفحہ ۷ پر نرگس میری کے معنی "غریبی" بیان کئے گئے ہیں، جو صحیح نہیں ہیں صفحہ ۳۳ پر نظیر اکبر آبادی کی مشہور نظم "ہنس" کا ایک مصرعہ اس طرح درج ہوا ہے:۔ ع

لو یار ہم سب چلتے ہیں کل اپنے وطن کو

اس میں "ہ" تقطیع سے گرتی ہے، اصل مصرعہ غالباً اس طرح ہوگا: ع

لو یار ہم سب چلتے ہیں ہم اپنے وطن کو

اسی کتابچے کے حصہ دوم کے صفحہ ۱۵ پر "رعنائی" کے معنی "خود آرائی" بیان کئے گئے ہیں، حالانکہ "رعنائی" "خود آرائی" کو نہیں کہتے صفحہ ۲۶ پر "بے نیل مرام" کو "بے نیل و مرام" لکھا گیا ہے، یہ بڑی فاحش غلطی ہے۔ اس کی اصلاح ضروری ہے! "فاران" میں اس غلطی پر شاعروں اور ادیبوں کو بار بار ٹوکا گیا ہے!!

فکر و نظر مرتبہ:۔ ایس منتی۔ ضخامت ۱۲۸ صفحات خوبصورت سرورق، قیمت ایک روپیہ پچاس نئے ملنے کا پتہ: حلقہ فکر و نظر کیپیٹل بک ہاؤس پیسوی مینشن جمشید روڈ، کراچی۔

"حلقہ فکر و نظر" (کراچی) قابلِ مبارکباد ہے کہ اس نے اپنے یہاں پڑھے جانے والے مضامین کا انتخاب اس سلیقہ سے شائع کر کے ارباب ذوق کو مستفید ہونے کا موقع دیا —— اس انتخاب میں —— علمی مضامین —— نیز ڈرامہ، نظمیں، افسانے، غزلیں شخصیات، جرعات اور حلقہ کی ایک نشست کی روداد بھی شامل ہے۔ یہ انتخاب دلچسپ اور متنوع ہے!

"انسان ہنسنے والا جانور ہے، اور ہنسی کسی جاندار یا بے جان چیز کے بے ڈھنگے پن اور عدم تکمیل احساس کا نتیجہ ہے" —— یہ آخر بات کیا ہوئی! —— جب انسان کو اللہ تعالیٰ نے "حیوانِ ضاحک" بنایا ہے تو اس کے ہنسنے کی عادت کو "بے ڈھنگا پن" تو نہیں کہہ سکتے —— "جس میں چار پہلوانوں کی جوڑیاں مقابل ہو چکی تھیں"۔ (صفحہ ۶۱) جوڑیاں تو "مگدروں" کی ہوتی ہیں "پہلوانوں کے جوڑ" کہے جاتے ہیں۔ —— اس طرح:

"آج شاہ کوٹ کے دنگل میں پہلوانوں کے چار جوڑوں کی کشتیاں ہوئیں"۔

حضرت جگر مراد آبادی کی نظم —— "غالب" —— کو "غیر مطبوعہ" بتایا گیا ہے، حالانکہ یہ نظم متعدد رسالوں میں چھپ چکی ہے صفحہ ۱۵ پر "منظفہ ملا محسوی" پڑھ کر بے اختیار ہنسی آئی اگر مظفر صاحب ہمارے مخلصانہ مشورہ کو قبول کر سکیں تو بہتر ہو کہ وہ "ملا محسوی" اپنے نام کے ساتھ نہ لکھا کریں! کیا ضرورت ہے کہ ہر شاعر کے نام کے ساتھ اس کے وطن کا دُم چھلا لگا رہے!

چاہیے وہ کتنا ہی ثقیل اور غیر شاعرانہ کیوں نہ ہو۔ ایک نوخیز ادیب نے ہمارے کہنے پر "مالیر کوٹلوی" اپنے نام کے ساتھ لکھنا چھوڑ دیا۔ رسالوں میں
ںجو ہی —— بھیم خوی، ساڑھودی —— جیسی وطنی نسبتیں پڑھ کر، وجدان کس قدر تکدر محسوس کرتا ہے۔

مری منزل! مری مشعل! مری رشکِ مہتاب!
ایک مبسم کے سوا اور میں کیا دیتا جواب! (صفحہ ۱۸)

مصرعہ اولیٰ میں "مری" کی تکرار بھلی نہیں لگتی ——— اس مصرعہ کی نثر کی جائے گی ——— کہ اے میری وہ محبوبہ جو رشکِ مہتاب
ہے، جو میری محبت کی مشعل اور میرے طلب و جستجو کی منزل ہے ——— تو کہیں جا کر بات واضح ہوتی! "میری رشکِ مہتاب"
کے بعد "موصوف شخصیت" کا نام لانا ضروری تھا۔

کسقدر توبہ شکن یہ تری انگڑائی ہے خود بخود ہاتھ بڑھا جاتا ہے ارمانوں کا (صفحہ ۱۹)

دوسرا مصرعہ بہت کمزور ہے! اس "سانیٹ" میں اس مصرعہ: ع

دقت کی بات ہے اے دوست مری تشنہ لبی

کا کوئی محل نہ تھا، جب کہ اس سے پہلے: ع

پی رہا ہوں تری آنکھوں سے مئے روح افزا

کہا جا چکا ہے: ———

ہے زخمِ نگہ سے رگوں کا نظام شل پیکر گری کا سلسلہ ناتمام شل

پورا شعر "ابہام و اہمال" سے لبریز ہے!

حمایت علی شاعر کی دوسری اچھی نظموں کو چھوڑ کر، ان کی ایک کمزور اور سطحی نظم اس مجموعہ میں آخر کیوں لی گئی ہے شاعر
نے "مدقوق و مفلوج انسانوں" کے پردے میں "ازل کے مصور" (اللہ تعالیٰ) پر طنز کی ہے، حالانکہ دنیا میں مدقوقوں اور مفلوجوں کی تعداد
مشکل سے ایک فیصدی بھی نہ نکل سکے گی! دنیا میں مجموعی طور پر کمیت و کیفیت کے اعتبار سے "صحت" "امراض" پر غالب ہے!
اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے، نہ کہ طنز!

سہیل اپنے فسانوں میں پیش کرتا ہے بقول میرے فقط اس ادا پہ مرتا ہے (صفحہ ۳۳)

یہ کس قدر بے رس اور سپاٹ موزوں الفاظ ہیں جو جوڑ دیئے گئے ہیں۔

یہ اعجاز ہے حسنِ آوارگی کا! جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے (صفحہ ۵۷)

"حسنِ آوارگی" کیا ہوتا ہے! "اپنی آوارگی" کہنا چاہیے تھا!

نام نہاد "ترقی پسند ادب" نے زبان و ادب میں جو بے راہ روی پیدا کر دی ہے، افسوس ہے کہ نوخیز نسل اس سے بری طرح
متاثر ہے! اس کی اصلاح کی یہی شکل سمجھ میں آتی ہے کہ نئے شاعروں اور نثر نگاروں کو اقبال و اکبر جیسے شاعروں اور حالی و شبلی
جیسے ادیبوں کی کتابیں پڑھنے کا شوق دلایا جائے کہ اظہارِ خیال اس سلیقہ سے کیا جاتا ہے، الفاظ یوں برتے جاتے ہیں اور شاعری
اس طرح سحرِ حلال بنتی ہے۔

سبیل الرشاد فی تفریق التبادلہ والشغار | مرتبہ: مولانا فضل حق ہاشمی السلفی، ضخامت ۸۰ صفحات
قیمت: ایک روپیہ ملنے کا پتہ: جمعیت اہل حدیث، میانوالی

اس کتاب میں نکاح شغار کی حرمت اور بٹہ مروجہ کی حلت پر علماء کرام کے فتاویٰ اور فیصلے درج ہیں اور ساتھ ہی احادیث اور صحابہؓ و تابعین کے اجماع کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا ہے ——— کہ نکاح شغار کی ممانعت آئی ہے یعنی ایسا نکاح جس میں مہر نہ مقرر کیا گیا ہو۔ اور اس میں یہ شرط لگائی گئی ہو ——— کہ میری لڑکی کا تمہارے لڑکے سے اور تمہاری لڑکی کا میرے لڑکے سے نکاح ہوگا ——— تو ایسا نکاح درست نہیں ——— لیکن مہر مقرر کیا گیا ہو اور اس کے ساتھ چاہے مذکورہ بالا شرط بھی لگا دی گئی ہو، تو ایسا نکاح جائز ہے کہ اس پر "نکاح شغار" کا اطلاق نہیں ہوتا۔

تفہیم الکلیات

از:۔ حکیم محمد یحییٰ خاں (صدر مرکزی ادارہ طبیہ پاکستان راولپنڈی) ضخامت ۸۰ صفحات، قیمت فی جلد: دو روپے ملنے کا پتہ: دفتر ارمغان ۲۶۲/R جلگی اسٹریٹ، راولپنڈی

اس کتاب میں امور طبیعیہ، ارکان عناصر، مزاج، اخلاط، اعضائے رئیسہ، ارواح، تعداد قویٰ، حالاتِ بدن، تقسیم امراض، اسباب، حرکت و سکون بدنی، خواب و بیداری، نبض، قارورہ، ریاضت وغیرہ طبی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ یہ بحث در تشریح سوال و جواب کے انداز میں ہے، اس لئے آسان ہے، جو دماغ طب و فلسفہ سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے یہ بڑے کام کی چیز ہے! افادۂ عام کے لئے کتاب کی قیمت کم رکھنی چاہیے تھی!

سیرت طیبہ

مرتب کرنے والے: اکرام احمد خاں ——— محمد مسلم، ضخامت ۲۴۰ صفحات، قیمت ایک روپیہ پچاس نئے پیسے ملنے کا پتہ: ——— سہ روزہ "دعوت" محلہ کشن گنج دہلی (بھارت)

سہ روزہ "دعوت" بڑی استقامت اور ایمانی جرأت کے ساتھ بھارت میں کلمۂ حق بلند کر رہا ہے، ماہ ربیع الاول میں اس نے خاص اہتمام کے ساتھ "سیرت النبیؐ" پر "شمارۂ خاص" مرتب کیا ہے جس کے قریب قریب تمام مضامین بلند اور مفید ہیں! یہ ایمان افروز شمارہ (سیرت طیبہ) اس کا مستحق ہے کہ اردو داں گھرانوں میں زیادہ سے زیادہ پڑھا جائے اور اس گلدستۂ اخلاق کی خوشبو سے مسلم معاشرہ مہک جائے!

فضائل نماز

تالیف:۔ مولانا محمد زکریا (شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور) ضخامت ۱۶۰ صفحات قیمت: ساڑھے تیرہ آنے (۱۳؍) ملنے کا پتہ: مکتبہ زکریا بیرون بوہڑ دروازہ، ملتان شہر

اس کتاب میں نماز کے فضائل آسان اور سلیس زبان میں بیان کئے گئے ہیں، اس کے مطالعے سے نہ صرف یہ کہ نماز کی فرضیت کا احساس قوی ہوتا ہے، بلکہ نماز کو جماعت کے ساتھ، خشیت و یکسوئی کے ساتھ اور اعتدالِ ارکان کے ساتھ پڑھنے کی ترغیب ہوتی ہے، احادیث نبویؐ اور صلحائے امت کے ذوق و شوق عبادت کی حکایتوں سے پوری کتاب معمور ہے! اس قسم کی کتابوں پر مصنفہ اور تصنیف نہیں بلکہ مؤلفہ اور تالیف لکھنا چاہیے کہ اس کا غالب حصہ جمع و تالیف کیا ہوا ہوتا ہے۔

ماہر القادری

رکن۔ انجمن ادبی رسائل پاکستان

جلد نمبر ۱۱

شمارہ نمبر ۹

فاران کراچی

ایڈیٹر۔ ماہر القادری

ماہِ دسمبر ۱۹۵۹ء

فی پرچہ آٹھ آنے

ترتیب

سالانہ چھ روپے

مقامِ اشاعت: ۔ دفتر "فاران" ـــ کیمبل اسٹریٹ ـــ کراچی

مطبوعہ: مطبع سعیدی۔ کراچی

پرنٹر و پبلشر: مسعود حسین

نقشِ اوّل

جو حضرات باقاعدگی کے ساتھ "فاران" پڑھتے رہے ہیں، وہ دین و دنیا کے بارے میں ہمارے مسلک و موقف سے ضرور واقف ہوں گے! ہمارے قلم سے ایک لفظ بھی ایسا نہیں نکلا، جس میں رہبانیت یا ترکِ دُنیا کا پیمار پایا جاتا ہو۔ اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے، اس لئے وہ اپنی نہایت سے دین و دنیا کا جامع واقع ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو چھوڑنے کے لئے نہیں بلکہ برتنے کے لئے خلق فرمایا ہے، جس کسی نے بھی دنیا کو "شجرِ ممنوعہ" سمجھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی جائز نعمتوں سے محروم رہا، یہ محرومی کوئی قابلِ فخر بات نہیں ہے ———— یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی باغ میں رہ کر پھلواری کے نظارے سے نگاہوں کو بچاتا رہے، ناک بند کر لے کہ پھولوں کی خوشبو سے اس کی قوت شامہ مستفید نہ ہونے پائے اور کانوں میں انگلیاں دے لے کہ پرندوں کی چہکار اس کی سماعت کو نہ چھو سکے! باغ میں رہ کر جائز لذتوں سے یہ محرومی اگر نفس کا کوئی مجاہدہ ہے تو یہ غیر فطری مجاہدہ ہے جس کی صاحبانِ ہوش اور اربابِ نظر بلکہ اہلِ دل بھی تحسین نہیں کر سکتے۔

تمدن وایجادات کے تنوع اور اس کی رنگا رنگی سے گریز و فرار اور دامن کشی کا نہ تو ہم مشورہ دیتے ہیں اور نہ لوگوں سے یہ کہتے ہیں کہ تمدن و تہذیب اور ایجاد و اختراع کے تمام کارخانہ کو درہم برہم کر کے ہزاروں سال پیچھے کی طرف لوٹ جاؤ۔ بجلی کے قمقموں کو توڑ کر، ان کی جگہ مٹی کے دیئے استعمال کرو، موٹروں اور دوسری تیز رفتار سواریوں کے بجائے چھکڑوں میں بیٹھنے لگو، تار برقی اور لاسلکی کو چھوڑ کر کبوتروں کے ذریعہ پیغام رسانی کا کام لیا کرو ———— تمدن وایجادات کے مقابلہ میں ایسا رجعت پسندانہ موقف وہی شخص قائم کر سکتا ہے جس کی مت ماری گئی ہو اور جو ہوش و حواس کھو بیٹھا ہو۔ سائنس کی ایجادات اور دین کے مابین کوئی نزاع اور کسی قسم کا تضاد نہیں ہے، اس لئے ایک دیندار آدمی سائنس کی ایجادات پر اپنے اندر کسی قسم کا تکدر اور وحشت محسوس نہیں کرتا، اسی طرح تہذیب و تمدن کی وہ بوقلمونیاں جو روح و اخلاق سے متصادم نہیں ہوتیں، اُن کو دین نہیں ٹوکتا۔

تصویر کا یہ روشن پہلو تھا، اس کا دوسرا تاریک رُخ یہ ہے کہ سائنس کی ان ایجادات سے بہت کچھ غلط کام لیا جا رہا ہے اصل خرابی یہ ہے کہ ان ایجادات کو جو طاقتیں استعمال کر رہی ہیں اُن کے سامنے جائز و ناجائز، حرام و حلال اور گناہ و ثواب کا سوال ہی سرے سے پیدا نہیں ہوتا ———— مثلاً بجلی کی مشین مذبح میں ذبح ہونے والے پرندوں اور جانوروں کی گردنیں اڑاتی چلی جاتی ہے! بجلی کی مشینوں سے گھوڑ دوڑ کی قمار بازی کے علاوہ طرح طرح کے جوے کے کھیلوں میں کام لیا جاتا ہے، متحرک و متکلم فلموں نے پورے انسانی معاشرے کے ذوق کو "فلم زدہ" بنا دیا ہے، فلم کے پردے پر جو ہوس کے جو مناظر دکھائے جاتے ہیں، اُن کو عام زندگیوں میں دہرایا جاتا ہے، یوں سمجھئے کہ فلم انڈسٹری ہوس و آوارگی کی یونیورسٹی کا فرض انجام دے رہی ہے ———— ریڈیو کس قدر مفید ایجاد ہے مگر دُنیا بھر کے ریڈیو اسٹیشنوں کے پروگراموں کا اوسط نکالا

جلائے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آئے گی کہ ایجاد و سیاست بازی، گھٹیا ادب اور سرود و غنا کے چٹخاروں کا آرٹ بن کر رہ گئی ہے ——۔
فنِ طباعت کی ترقی اپنے شباب پر ہے مگر اس صنعت کا شباب عریاں تصویروں اور فحش و ہوسناک لٹریچر کے ذریعہ قائم ہے۔

—— اور ——

یہ بالکل کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اختراع و ایجاد کی یہ رنگارنگی اور تہذیب و تمدن کی یہ جگمگاہٹ انسانی کردار کو تاریک تر بناتی چلی جا رہی ہے! انسان نے کوئی شک نہیں مادی اعتبار سے بہت کچھ ترقی کی ہے مگر اخلاقی لحاظ سے وہ بہت کچھ پست ہو گیا ہے انسان کی اصل ترقی اخلاق و کردار کی ترقی ہے اگر اس منزل میں وہ پیچھے رہ گیا، اور زندگی کی دوسری مادی راہوں میں آگے بڑھ گیا تو اس کی ان مادی ترقیوں کا حال اُس دق کے مریض کے ناخنوں جیسا ہے، جو بڑھتے چلے جا رہے ہیں مگر اُس کے تمام اعضاء رئیسہ کو گھن لگ چکا ہے —— اب اگر یہ مدقوق شخص اُن اپنے بڑھے ہوئے ناخنوں کو تیز، چمکیلا اور رنگین بنانے لگتا ہے، اور اپنے جان لیوا مرض کے علاج سے غافل ہو جائے —— تو اس کا نتیجہ یہ نکل کر رہے گا کہ اُس کی موت واقع ہو جائے گی! آج تمدن و تہذیب کی دُنیا میں بعینہٖ یہی صورت پیش آرہی ہے، انسانی معاشرے پر اخلاقی امراض کے ہاتھوں نزع کا عالم طاری ہے، مگر وہ اپنی مادی ترقیوں کے نشہ میں سرشار ہے —— آہ۔ وہ نادان مریض جسے امراض نے لبِ گور پہنچا دیا ہو مگر وہ ناخنوں اور بالوں کی آرائش میں اُلجھا ہوا ہو اور اسی کو زندگی کی علامت اور آثارِ صحت سمجھ رہا ہو۔

اخلاق کی پاکیزگی شرافتِ نفس اور کردار و سیرت کی صحت مندی کی نشانی ہے، جس کسی کے اخلاق بگڑے ہوئے ہیں، اس کی سیرت داغدار ہے، اس کا کیریکٹر مرض میں مبتلا ہو چکا ہے اور اس کی شرافتِ نفس کو روگ لگ چکا ہے! اگر کوئی شخص اخلاق و تقویٰ کو قدامت پرستی، تاریک خیالی، دقیانوسیت اور مُلّائیت کی علامت سمجھتا ہے اور اس ذکر سے اُسے وحشت ہوتی ہے —— تو اس قسم کے بے غیرت اشخاص نہ ہمارے مخاطب ہیں اور نہ اُن کی طرف ہمارا روئے سخن ہے! ہمارا خطاب اُن افراد سے ہے جو اخلاقی اقدار کو پہچانتے اور پاکیزگی و تقویٰ کی افادیت کا احساس و شعور رکھتے ہیں، جو بشری کمزوریوں میں تو ضرور مبتلا ہیں مگر اُن کی فطرت اللہ کے فضل سے مسخ نہیں ہوئی، جن کے اندر شرافت کی حس نہ صرف موجود ہے بلکہ بیدار ہے! زمین و آسمان کا فرق ہے اُن دو آدمیوں کے سیرت و کردار میں —— جن میں سے ایک شخص برائی کرکے اس پر فخر کرتا اور اُس کے جواز کے لئے طرح طرح کی دلیلیں تراشتا اور منطق چھانٹتا ہے اور وہ مردِ غلط کار سب سے بڑا ظلم یہ کرتا ہے کہ جس برائی میں وہ گرفتار ہے اُسے معاشرے میں پھلتا پھولتا دیکھنے کا خواہشمند رہے اور اس کی ترویج و اشاعت کے لئے منصوبے بناتا ہے، اسلامی نقطۂ نگاہ سے اس مزاج و کردار کا آدمی چوپایہ کی مانند (کالانعام) ہے بلکہ چوپایہ سے بھی بدتر اور زیادہ بے راہ (بل اضل) ہے —— دوسرے کردار کا وہ آدمی ہے جو اپنے نفس کی کمزوری کے لئے کوئی دلیلِ جواز تلاش نہیں کرتا، جو اپنی غلطی پر سخت ندامت محسوس کرتا ہے اور نہیں چاہتا کہ وہ جس برائی میں مبتلا رہ چکا ہے یا بشری کمزوری کا جو ذہول اُس پر طاری ہے، اس کی پرچھائیں بھی کسی دوسرے پر پڑنے پائے معاشرے کے یہی وہ افراد ہیں جن پر نصیحت و موعظت کارگر ہو سکتی ہے۔ جو اصلاح و تعمیر کے سانچوں میں ڈھل سکتے ہیں اور جو نیکی کے ہر مشورے کو قبول کرنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتے ہیں!

نیکی و پرہیزگاری اور اخلاق و تقویٰ کی اس گفتگو سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس طرح ہم اپنی پارسائی لوگوں پر جتانا چاہتے

ہیں، خدا دلوں کا حال جانتا ہے کہ پند و نصیحت کا جب بھی کوئی لفظ زبان و قلم سے نکلتا ہے تو ضمیر چٹکی لیتا ہے ـــــ کہ تم اپنے گریبان میں تو منہ ڈال کر دیکھو" ـــــ مگر اپنی تمام غلط کاریوں اور نفس کی دراز دستیوں کے باوجود اللہ کے فضل سے دل کا یہ حال بھی ہے کہ "منکر" کو دیکھ کر دل کو اذیت اور "معروف" کے نظارے سے دل کو مسرت ہوتی ہے! ہم اپنے دل کی اس حالت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں اور اپنے رب سے قول و عمل کی ہم آہنگی کی بھیک مانگتے ہیں۔

یہ تہذیب!! قرآن کریم میں جگہ جگہ مختلف پیرایوں میں طرز ادا بدل بدل کر تقویٰ اور عمل صالح کی تعلیم دی گئی ہے، "اتقوا اللہ" ہی وہ محور ہے جس کے ارد گرد قرآنی تعلیمات گردش کرتی ہیں! فسق و فجور کی زندگی گزارنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی کتاب میں شدید وعیدیں، دھمکیاں اور ڈراوے آئے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَاۗءُ سَيِّئَةٍۢ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۭ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ

اور جن لوگوں نے برائیاں کمائی ہوں گی، انہیں برائی کا بدلہ اس کے برابر ملے گا اور ان کو رسوائی ڈھانک لے گی۔ اور ان کو اللہ تعالیٰ سے کوئی بچانے والا نہیں ہے۔

یہ بات کسی ثبوت و برہان کی محتاج نہیں ہے کہ مغرب کی پوری تہذیب اپنی چمک دمک اور تمام نظر فریبیوں کے باوجود فسق و فجور میں ڈوبی ہوئی ہے اور تمدن و ثقافت کا یہ قافلہ بڑی تیزی اور پھرتی کے ساتھ آخرت کی اس خوفناک رسوائی کی سمت دوڑا چلا جا رہا ہے، جس کی طرف مندرجہ بالا آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ مغربی ممالک کے ہوٹل اور آرام گاہیں بدکاری کے اڈے بنی ہوئی ہیں، وہاں کے برہنہ کلب گھروں میں ایسی ایسی .... کی حرکتیں ہوتی ہیں کہ بندر اور سور بھی دیکھیں تو شرما جائیں! مرد و زن کا بے باکانہ اختلاط فحاشی اور بے حیائی کی ذلیل ترین پستی تک پہنچ چکا ہے۔ "عصمت و دوشیزگی" کے لفظ یورپ، امریکہ، اور روس کی ڈکشنریوں ہی میں بس مل سکتے ہیں عملی دنیا میں ان کا وجود "النادر کالمعدوم" بن چکا ہے! ان ملکوں میں پاک دامن اور عصمت مآب وہ عورت سمجھی جاتی ہے جو چھیڑ چھاڑ، لمس و اختلاط و بوس و کنار کے ہر تجربے اور مرحلے سے گزر جائے، بس "مقاربت صحیحہ" کی نوبت نہ آنے دے! خدا کا خوف، نہ بندوں کی شرم، نہ اپنے کئے پر ندامت! ہوسکاریوں کے تمام لوازم کے ساتھ عیش کرنا، یہ ہے وہاں کے عوام و خواص کا مطمح نظر اور مقصدِ حیات! ان کے دن دفتروں، فیکٹریوں اور تجارت گاہوں میں گزرتے ہیں اور راتیں ان مقامات پر بسر ہوتی ہیں جہاں فسق و فجور خود رو گھاس کی طرح اگتے ہیں!

ان لوگوں کی خوشحال زندگیوں اور ان کی مادی کامیابیوں کو دیکھ کر، دوسرے لوگ دھوکے میں آجائیں تو آجائیں مگر ایک مسلمان دھوکا نہیں کھا سکتا کہ، اس کو اس قسم کی گہما گہمی کی زندگیوں کے بارے میں پہلے سے خبردار کر دیا گیا ہے ـــــ کہ

فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ

(دیکھنا) ان لوگوں کی شہروں میں چلت پھرت تجھے کہیں دھوکے میں نہ ڈال دے۔

ـــــ اور ـــــ

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ

اے لوگو! آگاہ ہو جاؤ تمہاری شرارت کا وبال تمہاری جانوں پر ہی پڑے گا (بس) تم دنیا کی زندگانی کا نفع اٹھا لو۔ پھر تمہیں ہمارے پاس ہی لوٹ کر آنا ہے، اس وقت ہم تمہیں بتلا دیں گے، جو کچھ کرتوت تم کرتے تھے۔

اور

ان خدا کے باغیوں نے اپنی عشرت گاہوں اور بدکاری کے اڈوں کے ساتھ خیراتی ہسپتال، زچہ خانے، اندھوں کے اسکول اور کوڑھی گھر جو بنوا دیئے ہیں ــــــــ ان کے بارے میں قرآن کریم یہ کہتا ہے :-

قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ۭ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝

ان سے کہہ دیا جائے کہ تم مال چاہے خوشی سے خرچ کر دیا نا خوشی سے تمہیں (اللہ تعالیٰ کے یہاں) قبول نہیں کیا جائے گا (اس لئے کہ) تم بے شک نافرمان لوگ ہو۔

روس تو ڈنکے کی چوٹ خدا کا انکار کر رہا ہے، جہاں خدا کا انکار ہو، وہاں آخرت کا تصور ہی سرے سے پیدا نہیں ہو سکتا چین بھی روس کے نقش قدم پر چل رہا ہے اور اسی لے میں لے ملا رہا ہے، یورپ اور امریکہ میں متشککین، مادیین اور دہریوں کی خاصی تعداد پائی جاتی ہے رہے وہ لوگ جو روایتی طور پر مذہب کو مانتے ہیں، اُن کی زندگیاں تصور آخرت سے اس قدر بیگانہ ہیں گویا کہ وہ آخرت پر ایمان ہی نہیں رکھتے، اس عقیدہ و کردار کے لوگوں کے لئے قرآن کریم کا ناطق فیصلہ یہ ہے :-

وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا

اور یہ کہ جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے، ان کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے!

ارباب تقویٰ اور اہل فسق و فجور کے بارے میں یہ ہے قرآن کریم کا فیصلہ اور امتیازی رویہ! اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اور نافرمان بندوں کے درمیان قرآن خطِ امتیاز کھینچتا ہے! وہ سوسائٹی جس کی گھٹی میں معصیت پڑی ہو قرآنی نگاہ میں گھاس کی مرجھائی ہوئی پتی اور ٹوٹے ہوئے ٹھیکرے کی برابر بھی وقعت نہیں رکھتی، چاہے ایسی فسق پرور وہ اور خدا ناشناس سوسائٹی نے سائنس کے زور سے چاند اور سورج پر اپنی فوجیں کیوں نہ اُتار دی ہوں۔

ہر قوم اور ملک کے بہی خواہ پوری نیک نیتی اور خلوص کے تقاضے سے ملت کی ترقی و استحکام چاہتے ہیں اور اپنی سمجھ اور بساط کے مطابق اس کے لئے جدوجہد کرتے ہیں، مگر اصلاح و انقلاب اور تعمیر و ترقی کی کوششوں کو صرف خلوص و نیک نیتی کے پیمانوں سے نہیں ناپا جا سکتا، اس کے لئے صحیح پیمانہ اور سچی کسوٹی اس قوم کا مزاج، روایات اور وہ بنیادی معتقدات و افکار ہیں جن سے وہ قوم ترکیب پاتی ہے ــــــــ تعمیر و اصلاح کی کوشش چاہے وہ کتنے ہی اخلاص و خیر اندیشی کے تقاضے کیوں نہ ہو۔ اگر قوم کے اساسی معتقدات اور فطری مزاج سے مطابقت نہیں کرتی، تو اس قسم کی کوشش سے قوم کی اصل توانائی اور حقیقی مقصد کو نقصان پہنچ کر رہے گا، ایک طبیب پوری نیک نیتی اور تمام و کمال ہمدردی کے ساتھ اگر مرض کی غلط تشخیص کر کے علاج معالجہ شروع کر دیتا ہے تو اس کی نیک نیتی اس کی غلط تشخیص کی تلافی نہیں کر سکتی، یہ کوئی باریک بات نہیں ہے، جس کے سمجھنے میں دقت و دشواری پیش آئے اور نہ یہ نکتہ ہمارے ذہن نے پیدا کیا ہے، یہ ایک ایسی سامنے کی بات ہے، جسے ہر کوئی جانتا اور سمجھتا ہے!

پس جو کوئی اصلاح پسند

اور ملک و قوم کا بہی خواہ مغربی تہذیب و تمدن کی نقالی اور تقلید کو ملت کے حق میں بہتر سمجھتا ہو گا جس کے پیش نظر صرف مادی ترقی ہو گی، اپنی قومی روایات میں جسے فرسودگی اور قدامت نظر آتی ہو گی، وہ اصلاح و تعمیر کے قافلہ کو مغربیت کی اس منزل کی طرف لے جائے گا جہاں فسق و فجور پر "آرٹ" کی چھاپ لگا کر، برائیوں کو دیدہ زیب بنا دیا گیا ہے۔

ممکن ہے کہ ہمارے اس احتساب پر کوئی مرد "روشن خیال" (؟) یہ پھبتی چست کر بیٹھے کہ خشک مذہبیت اور دینی عصبیت کی بنا پر ہم ایسی باتیں کہہ رہے ہیں ——— مگر اس کو کیا کیجیے گا کہ خود یورپ کے اونچے درجے کے مفکرین اپنی تہذیب سے نالاں ہیں، اور وہ اس تہذیب کا اچھی طرح تجزیہ کرنے کے بعد اس سے نفرت و بیزاری کا اظہار کر رہے ہیں! ——— مسٹر سوروکن (P. O. SOROKIN) مشہور مفکر ہیں، وہ اپنی بلند پایہ کتاب (The crisis of our age) کے صفحہ ۱۳ پر رقمطراز ہیں :-

Every important aspect of life organisation and the culture of western socity is in the extraordinary crisis. Its body and mind are sick and there is hardly a spot on its body which is not sore; nor any nervous fibre which functions soundly.

ترجمہ: "مغربی زندگی کی ہر اہم تنظیم اور مغربی کلچر کا ہر رخ غیر معمولی بحران سے دوچار ہے۔ اس کے جسم و دماغ دونوں مریض ہیں، اور اس کے جسم پر مشکل ہی سے کوئی ایسا داغ ہوگا جسے ناسور نہ کہا جاسکے اور نہ اس کے اعصاب کا کوئی ایسا رگ و ریشہ ہے، جو ٹھیک طور پر کام کر رہا ہو"

اس ذرہ واضح نشاندہی کے بعد بھی کسی کو مغربی تہذیب و تمدن کے داغ اور ناسور دکھائی نہ دیں تو ایسے شخص کو قومی مسائل پر غور و خوض کرنے سے پہلے اپنی بینائی کا علاج کرانا چاہیے!

اصلاح و تعمیر

ملک و ملت کی اصلاح و تعمیر کا کام خلوص و دیانت کے ساتھ ساتھ دینی بصیرت اور دنیوی معاملات کی سوجھ بوجھ بھی چاہتا ہے! ایک تو تعمیر و اصلاح کی وہ کوشش ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ ملت کو مغربی تہذیب کے سانچوں میں ڈھال کر اور ملت کے افراد کو "صاحب لوگ" بنا کر دم لینا ہے! اس کوشش سے کوئی شک نہیں ملت کو مادی فوائد پہنچ سکتے ہیں مگر دین و اخلاق کا اتنا بڑا خسارہ ہوگا کہ اگر تمام مسلمانوں کے مکان چاندی سونے کے بھی ہو جائیں تو بھی یہ دولت و ثروت اس خسارے کے ہزارویں حصہ کی بھی تلافی نہیں کر سکتے!

ملت اسلامیہ کی اصلاح و تعمیر کا صحیح نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ جن خطوط پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین نے امت کو استوار کیا تھا، انہی خطوط کو سامنے رکھ کر امت کی اصلاح و تعمیر کی جانی چاہیے، کسی دوسرے تمدن و تہذیب سے مرعوب ہونے کی ضرورت اور کسی کے قانون و دستور سے روشنی حاصل کرنے کی حاجت نہیں! اللہ کا قانون، رسول کا اسوۂ حسنہ، روشن و پاک تہذیب، بلند روایات اور حیات بخش علوم، غرض کیا چیز ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے! یہ دوسری بات ہے کہ خود ناشناسی کی بدولت ہم خود اندھیرے میں ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ اصل روشنی تو ہمارے پاس ہے ——— وہ روشنی جو سب سے پہلے حرا کے غار میں چمکی تھی اور پھر چمکتی رہی، یہاں تک کہ اللہ کی زمین اس نور سے سچ مچ جگمگا اٹھی!

ملّتِ اسلامیہ کے پاس جو روشنی اور سرمایہ ہے، وہ کوئی خیالی خاکہ یعنی (utopian concept) نہیں ہے [...]ے دنیا نے آزماکر اور برت کر دیکھا ہے، اس روشنی کی بدولت جہالت و وحشت کے اندھیرے دور ہوئے ہیں اور اس سرمایہ نے [...]لاق کے افلاس اور یقین و ایمان کی تہی دستی کو ترفہ و خوشحالی عطا کی ہے! یہ سنیاسیوں اور راہبوں کا نہیں کشورکشا و[...] [...]وں کا تمدن تھا جن کے سامنے کوئی بڑی سے بڑی باطل قوت ٹھہر نہ سکتی تھی، یہ وہ خداشناس، پاکباز، حق آشنا و قدسی [...]ج فاتح تھے، جو فتح کے نشہ میں کبھی سرشار نہیں ہوئے، انھوں نے کسی فتح کا جشن جام و مینا چھلکا کر اور رقص و سرود کی [...]لیں رچا کر نہیں منایا۔ ان کا جشن اپنے رب کے حضور شکر کے سجدے پیش کرنا تھا ———— کہ شکر کرنے [...] اللہ تعالیٰ ـ نعمت میں اضافہ فرماتا ہے!

اللہ تعالیٰ کے آخری اور سب سے بڑے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جاہلیت کے یکسر مخالف خطوط پر اُمّتِ اسلامیہ [...]ا اور اُستوار فرمایا تھا۔ اس لئے کہ کفر و جاہلیت اور اسلام کے خوب و ناخوب کے پیمانے بالکل مختلف ہوتے ہیں اور [...]ے جانتے ہیں کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں، عرب کی جاہلیت، فخریہ فحش شاعری، قماربازی، شراب نوشی [...]خواری اور مرد و زن کے بے باکانہ اختلاط کے سہارے پروان چڑھتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم [...] جاہلیت کے تمام آثار کو مٹاکر، تقویٰ اور نیکوکاری کی اساس پر ملّت کی تعمیر فرمائی! کفر و جاہلیت میں عورت کی بے حیائی [...] عالم تھا کہ کعبۃ اللہ کا طواف نیم برہنہ حالت میں کیا جاتا تھا، اسلام نے عورت کو شرم و حیا اور وقار و تمکن کا شرف [...]، یہاں تک کہ کھلے ہوئے چہروں پر "جلباب" اور آنچل آگئے!

دورِ حاضر کے تمدن و تہذیب میں کفارِ قریش کی جاہلیت کے تمام آثار پائے جاتے ہیں، یوں سمجھئے، جاہلیتِ اولیٰ نے [...]یت ثانیہ کا روپ دھار لیا ہے، وہی رنگ رلیاں، ہوسکاریاں اور خرمستیاں، خدا سے پوری طرح بے خوفی، آخرت کے تصور [...] دور پتہ نہیں! اسی دنیائے عیش کو سب کچھ سمجھنا اور شہوت و شکم کے محور پر پوری زندگی کو چکر کھانے کے لئے آزاد چھوڑ دینا

———— اور ————

[...]ت کے ساتھ تو یہ معصیت پروردہ تہذیب وہ حقارت آمیز برتاؤ کر رہی ہے جسے دیکھ کر شرم و غیرت کے ماتھے سے پسینہ [...]گتا ہے! دکان ہو، ہوٹل ہو، دفتر ہو، ہوائی جہاز ہو، ہسپتال ہو، غرض ہر جگہ عورت کو مرد کے ہوسناک جذبات [...] برائی کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے، مرد کی ہوسکاری کا کھلونا جس بُری طرح اس دور میں عورت کو بنایا گیا ہے شاید تاریخ کے کسی [...] سے بڑے دور میں بھی اسے یہ ذلت نصیب نہیں ہوئی، اسٹیجوں پر وہ ناچتی ہے، ڈرامے وہ کھیلتی ہے، سرکس میں [...]رح کے کرتب وہ کرتی ہے جن [illegible] میں اس کے جسمانی اعضا کی نمائش ہوتی ہے، یہاں تک کہ اس سے پریڈ [...] جاتی ہے! قوم کے نونہال مدرسوں، کالجوں اور دانش گاہوں میں ادب و تہذیب سیکھنے کے لئے جاتے ہیں، اس ماحول [...] قدر پاکیزہ اور معصوم ہونا چاہیے مگر اس ظالم مغربی تہذیب نے وہاں بھی لڑکوں اور لڑکیوں کو یکجا کر کے، جوان و [...]جذبات کی بارود بچھا دی ہے۔

ہم نے اوپر کی سطروں میں کسی گہرے بھید کو بے نقاب نہیں کیا، یہ تو کھلی ہوئی باتیں ہیں، جو ہر شخص کو دکھائی دے [...]ہیں! جب یہ حالت، آثار اور علائم ہوں، تو ملک و ملت کا کوئی سمجھدار خیرخواہ اور مصلح ملت کی تعمیر کے لئے مغربی [...]یب کو نمونہ نہیں بنا سکتا، ملتِ اسلامیہ کو تو ایسی جاہلانہ تہذیب کی پرچھائیں سے بھی کوسوں دور رہنا چاہیے کہ اس

تہذیب کی چلتی پھرتی پرچھائیں بھی بڑے نقش چھوڑ جاتی ہے!

ہم مغرب سے سائنس کے فارمولے، مشینیں، اسلحہ اور دوسری ضرورت کی چیزیں شوق سے لے سکتے ہیں، مگر ان کا استعمال ہم اپنے اخلاقی اصولوں کے مطابق کریں گے، زمین و آسمان کا فرق ہے اُن کے اور ہمارے افکار و نظریات میں، یہ لوگ ہر چیز اور کام کو خالص دنیوی افادیت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ہم ہر بات میں سب سے پہلے یہ سوچتے ہیں کہ اللہ اور رسولؐ کا اس بارے میں کیا حکم ہے، ایسا کرنے سے اللہ کی خوشنودی اور رضامندی حاصل ہوگی یا نارضامندی! ہم اللہ کے فرمانبردار بندے کی حیثیت سے دُنیا کے بڑے سے بڑے فائدے اور منفعت کو اللہ تعالیٰ کی خاطر ٹھکرا سکتے ہیں اور ٹھکرا دینا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی ہی ہماری زندگی کا مقصد ہے!

آخر میں ایک چھوٹی سی بات ہم عرض کرنا چاہتے ہیں، سوچا جائے تو یہ چھوٹی نہیں، بہت بڑی بات اور کام کی بات ہے، اس کے سمجھ میں آجانے سے بہت سے مسائل کی گرہیں کھل سکتی ہیں ——— سنیئے! ہاکی، کرکٹ، فٹ بال بیڈمنٹن وغیرہ یورپ کے ایجاد کئے ہوئے کھیل ہیں، انہیں شوق سے کھیلا جاسکتا ہے کہ ان میں کوئی دینی قباحت نہیں پائی جاتی، دین اس قسم کی جائز تفریحات پر قدغن نہیں لگاتا، مگر اس تصویر کا ایک یہ پہلو بھی ہے کہ کرکٹ کا میچ دیکھنے میں اگر مسلمانوں کی نمازیں قضا ہو جائیں تو ایسا میچ ایک وبال ہے اور یہ تفریح بڑے گھاٹے کی تفریح ہے! ملّت کی تعمیر اس انداز پر کرنی ہے کہ قوم کے کھلاڑی بڑے شوق اور چاؤ سے انگریزی کھیل کھیلیں اور ان مقابلوں میں خوب نام پیدا کریں مگر کھیل کے دوران میں نماز کا وقت آجائے تو کھیلنے والے اور تماشا دیکھنے والے کھیل کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے حضور سربسجود ہو جائیں، یہی وہ اسلامی فکر اور دینی بصیرت ہے، جس کو عام کرنے کی ضرورت ہے، جہاں نہیں ہے وہاں پیدا کی جائے اور جہاں ہے اُسے عملی طور پر برتا جائے ——— "دنیا دین کے تحت رہے، دین پر غالب نہ ہونے پائے"۔ جو کوئی اس نکتہ کو سمجھ لے گا اس کی ہر جدوجہد اپنی ذات کے لئے، ملک و ملت اور عام انسانی معاشرے کے لئے مفید اور بابرکت ثابت ہوگی، اور فساد و تخریب خیر و تعمیر سے بدل جائیں گے! اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیک بننے اور نیکی کو پھیلانے کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے (آمین)

ماہر القادری

ماہر القادری

ایک خط کے جواب میں

جناب مکرم! السلام علیکم!

آپ کا مفصل مکتوب ملا، پڑھ کر افسوس ہوا، افسوس اس بات کا کہ میں جس دردمندی، خلوص، جذبۂ اصلاح[1] اور دینی خیرخواہی کے ساتھ آپ کو مخاطب کرتا رہا ہوں، آپ نے ہمیشہ اُس کا الٹا اثر قبول کیا ہے! آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں نے بھی آپ ہی کی طرح اپنے گاؤں میں پرورش پائی ہے، اور وہاں آپ لوگوں کو جو کچھ کرتے دیکھا، آپ کے پاس جو کتابیں تھیں اُن میں جو کچھ پڑھا اور اس نواح میں آنیوالے باہر کے علماء سے جو سُنا اُسی کو حق جانا، میں بھی پہلے آپ کی طرح یہی سمجھتا تھا کہ جو کوئی مُردے کا تیجا، دسواں، اور چالیسواں نہیں کرتا، مزاروں پر چادریں نہیں چڑھاتا، وہاں جاکر مرادیں نہیں مانگتا، اذان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی سُن کر انگوٹھا نہیں چومتا، محفل میلاد میں قیام نہیں کرتا، حضورؐ کو عالم الغیب نہیں مانتا وہ بے دین اور وہابی ہے! مگر جب میں نے اللہ کی کتاب کو، رسول اللہؐ کی احادیث کو، اور صحابہ کرام کے حالات کو پڑھا تو میری آنکھیں کھلیں، کہ جن چیزوں کو ہمیں "دین" بتایا گیا تھا، اور جن کے نہ کرنے والوں کو "وہابی" اور بے دین کہا جاتا تھا، اُن کا کتاب و سُنّت اور آثارِ صحابہ میں کہیں نام و نشان تک نہیں ملتا۔ اس کے بعد دینی کتابوں کا جتنا زیادہ مطالعہ کرتا رہا یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہوتی چلی گئی کہ "شرک و بدعت" کی رسموں پر "عقیدتِ رسولؐ" اور "بزرگانِ دین کی محبت" کی غلط چھاپ لگادی گئی ہے، ایسی باتیں کرنے سے اللہ اور رسولؐ کی اور بزرگانِ دین کی خوشنودی تو حاصل کیا ہوگی، بلکہ ان کی ناخوشی کا الٹا وبال سر آئیگا۔

میں نے مُشرکانہ رسوم اور بدعات کو کسی انگریز یا یہودی کے کہنے سے نہیں چھوڑا اور نہ کسی "بے دین" نے مجھے بہکادیا ہے، میں نے ان خرافات سے اس لئے کنارہ کشی اختیار کی ہے کہ "قرآن و حدیث" اور "آثارِ صحابہ" ان باتوں کی تائید نہیں کرتے بلکہ ان کی مخالفت ہی کرتے ہیں! اور اللہ اور رسولؐ ہی کی بات سو فیصدی حق ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر دین کے ہر مسئلہ کو جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے۔

آپ نے اپنے مکتوب میں جن باتوں کو لکھا ہے "فاران" کے "توحید نمبر" میں ایک ایک بات کا تفصیل کے ساتھ جواب موجود ہے جتنے خلجانات اور اضطرابات آپ نے اپنے خط میں ظاہر کئے ہیں۔ اُن سب گرہوں کو "توحید نمبر" میں کھولا گیا ہے۔ مگر آپ نے یا تو ان مضامین کے مطالعہ کی زحمت گوارا نہیں فرمائی اور اگر انہیں پڑھا ہے تو پہلے سے اس بات کو دل میں جما کر پڑھا ہے کہ ہم جس روش و مسلک پر قائم ہیں، اُس سے بال برابر تجاوز نہ کریں گے، چاہے ہمارے سامنے کتاب و سُنّت سے کیسی ہی محکم دلیلیں کیوں نہ پیش کی جائیں! اس رویہ کے بعد آپ کا سینہ قبولِ حق کے لئے کیسے کھل سکتا تھا، حالانکہ "فاران" کے "توحید نمبر" کو جن لوگوں نے تحقیق حق کی نیت سے پڑھا ہے، انہیں بڑا فائدہ پہنچا ہے، دفتر "فاران" میں کتنے بہت سے خطوط آئے ہیں جن میں بہت سوں نے اپنے غلط عقائد سے توبہ کی ہے اور کتاب و سُنّت اور اسوۂ صحابہ ہی کو دلیل و حجت مانا ہے اور اُن کے مقابلہ میں بعد کی نکالی ہوئی رسموں کو رد کر دیا ہے۔

آپ نے "شرح سفر سعادت" "روح البیان" اور "مغیث الحرمین" وغیرہ کتابوں کے اقتباسات اپنے مکتوب میں پیش کئے ہیں! لیکن ان

---

[1] کسیر کلاں، ضلع بلند شہر (بھارت)

کتابوں کے مقابلہ میں بہت سے علماء کی کتابوں کے ایسے حوالے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ جو ان کے مخالف واقع ہوئے ہیں۔ مثلاً ابن جوزی ابن تیمیہ، ابن قیم وغیرہ جیسے اکابر علماء کے اقوال وافکار! ایک بات کو ایک گروہ درست سمجھتا ہے اور دوسرا نادرست۔ تو ایک بات کے دو پہلو نہیں ہو سکتے کہ وہ درست بھی ہو اور نادرست بھی! اب اس کا فیصلہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ہم دونوں گروہوں کے علماء کے اقوال کو کتاب و سنت کی کسوٹی پر جانچ کر دیکھیں اور جس کی بات اس کسوٹی پر پوری اترے اُسے درست مانیں اور دوسرے گروہ کی بات کو رد کر دیں۔ آپ اس کسوٹی پر عرس، فاتحہ، قیام میلاد، تیجا، دسواں، چالیسواں اور اسی قبیل کی دوسری رسوم کو پرکھتے جائیے، اور جو اس کسوٹی پر پوری نہ اترے اُسے بلا تامل رد کرتے جائیے ——————— یہ طریقہ ہے علماء کے اختلافات کو جانچنے اور پرکھنے کا! اور یہ معلوم کرنے کا کہ "حق" کس کے ساتھ ہے!

——————— پھر ———————

جن بزرگوں کی کتابوں کے حوالے آپ نے اپنے مکتوب میں دیئے ہیں۔ ان کے دوسرے اقوال پر آپ کی نظر کیوں نہیں گئی، مثلاً حضرت شاہ ولی اللہ "فوز الکبیر" میں لکھتے ہیں:۔

"مشرکین مکہ بتوں کو روحوں کی توجہ کا مرکز قرار دیتے تھے اور آج مسلمان قبروں کو سمجھتے ہیں"۔

اور "البلاغ المبین" میں شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔

"انبیاء و اولیاء ہمہ بندگانِ خداوند دخلے و تصرفے در کارخانہ جات الٰہی نہ دارند نہ در حیات نہ در ممات"

(انبیاء و اولیاء سب کے سب اللہ کے بندے ہیں۔ اور وہ نہ زندگی میں اور نہ مرنے کے بعد، اللہ تعالیٰ کے کارخانہ میں کسی قسم کا کوئی دخل و تصرف رکھتے ہیں) "ترجمہ"

کہیئے اس اقتباس کو پڑھ کر کیا شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ پر بھی بزرگانِ دین کی توہین کرنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس کو گھٹانے کا فتویٰ لگایا جائے گا!

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:۔

"دفع شر یا دفع بلا کے لئے غیر اللہ کو پکارنا اور ان کو صاحب اختیار سمجھنا شرک ہے"۔ (تفسیر عزیزی)

مالا بد منہ فقہ کی مشہور کتاب ہے، اس میں یہ لکھا ہے۔

"انبیاء و اولیاء کی قبروں کو سجدہ کرنا، طواف کرنا، ان سے مراد مانگنا، نذر و نیاز کرنا یہ سب حرام و ناجائز ہے"۔

سلطان العارفین قاضی حمید الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ اس مرتبہ کے بزرگ اور عالم دین گزرے ہیں کہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کو ان کی شاگردی کا شرف حاصل تھا، وہ اپنی مشہور کتاب "تو شیح" میں لکھتے ہیں:

منھم الذین یدعون الانبیاء والاولیاء عند الحوائج والمصائب باعتقادان ارواحھم تسمع الدعاء وتعلم الحوائج ذالک شرک قبیح وجھل صریح قال اللہ تعالیٰ ومن اضل ممن یدعوا من دون اللہ۔

ترجمہ:۔ "وہ لوگ جو انبیاء و اولیاء کو حاجتوں اور مصائب میں اس اعتقاد کے ساتھ پکارتے ہیں کہ

اُن کی رُوحیں حاضر ہوتی ہیں اور پکارنے والوں کی ندا سنتی ہیں، ان کی حاجتیں جانتی ہیں، تو یہ شرک قبیح اور جہل صریح ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ جو لوگ غیر اللہ کو پکارتے ہیں اُن سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا۔

حنفی فقہ کی مشہور اور مقبول ترین کتابوں ——— فتاویٰ عالمگیری اور دُرِّ مختار میں صاف لفظوں میں لکھا ہے۔

"جو نذریں اموات کے واسطے ہوں از روئے تقرب کے وہ باطل اور حرام ہیں"۔

اور بحرالرائق بھی حنفی فقہ کی مستند کتاب ہے، اس میں مرقوم ہے:-

"نذر عبادت ہے اور مخلوق عبادت کے لائق نہیں۔ اگر نذر ماننے والے کا یہ خیال ہے کہ میت کو اختیارات حاصل ہیں تو یہ عقیدہ صریحاً کفر ہے"۔

——— اور ———

"غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کرنا یا غیر اللہ کی نذر ماننا شرک ہے"۔

ان اقوال و فتاویٰ سے آپ کی یہ غلط فہمی دور ہو جانی چاہیئے کہ جمہور علماء کا وہ مسلک کسی دور میں بھی نہیں رہا جو آپ کا یا آپ کے چند بزرگ علماء کا ہے، علماء حق نے اہل بدعت کے ان خود ساختہ عقیدوں پر ہر دور میں نکیر کی ہے، اور اس کی ہزاروں مثالیں مفسرین، محدثین اور فقہاء کی کتابوں سے پیش کی جا سکتی ہیں۔

اس ہمارے زمانے میں پاکستان اور ہندوستان میں بے شمار علماء ایسے ہیں، جو ان مسائل میں آپ کے مسلک سے بالکل مختلف اور متضاد مسلک رکھتے ہیں اور یہ وہ علماء کرام ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک سُنّت پر جان دیتے ہیں، نجد و حجاز، شام، مصر، الجزائر اور عراق کے متعدد علماء و صلحاء سے میری ملاقات ہوتی رہی ہے، اُن سب کو ان مشرکانہ رسوم و بدعات سے جن کو آپ دین بنائے ہوئے ہیں متنفر و بیزار پایا۔ یہ آپ نے اپنے گھر میں بیٹھ کر فرض کر لیا ہے کہ آپ کے جو عقائد ہیں، وہی عقائد جمہور علماء اُمت کے ہیں، آپ کا یہ مفروضہ کسی عنوان درست نہیں ہے، آپ شدید غلط فہمی میں مبتلا ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ بڑے اندھیرے میں ہیں! علماء اہل سُنّت کے عقائد کتاب و سُنّت کے خلاف نہیں ہو سکتے۔ اور نہ ہونے چاہئیں "بدعت" کو ہر عالم حق نے مردود و مبغوض ہی سمجھا ہے اور کسی عالم نے "بدعت" پر حاشیے چڑھائے ہیں اور مسلمانوں کی نگاہوں میں اُسے "محبوب و پسندیدہ" بنانے کی سعی کی ہے... بدعت سے "حسن و نور" اور "خیر و خوبی" کو منسوب کیا ہے، اس نے دین کو سنوارا نہیں بگاڑا ہے، اس مزاج کے عالموں اور درویشوں کے "افکار و خیالات" کی جس پر پرچھائیں بھی پڑ جائے گی، وہ عقائد و اعمال کے خطروں میں پڑنے سے بچ نہیں سکتا۔

دینی مسائل پر غور و فکر کرنے کا جو طریقہ آپ نے اختیار کیا ہے وہ اللہ اور رسول اللہ کے بتلائے ہوئے طریقہ سے بالکل مختلف ہے، آپ دینی مسائل میں اپنے بزرگوں اور عالموں کے اقوال و ملفوظات اور اعمال و عقائد کو "کسوٹی" بناتے ہیں، حالانکہ کتاب و سُنّت کو کسوٹی بنانا چاہیئے؟ آپ اپنے چند بزرگوں اور عالموں کی بات کو سچ ثابت کرنے کے لئے کتاب و سُنّت تک میں دور از قیاس تاویلیں کرنے سے بھی نہیں چوکتے، اور سیدھی سچی بات کو تاویلات اور قیاسات کا گورکھ دھندا بنا کر رکھ دیتے ہیں، یہی اصل وہ خرابی ہے جس نے آپ کی دینی فکر میں کجی پیدا کر دی ہے، یہ کجی جب تک دُور نہ ہوگی، آپ بھول بھلیوں میں اسی طرح بھٹکتے رہیں گے۔

سو فیصدی سچی بات جس میں ذرہ برابر کور کسر نہیں رہ سکتی ——— اللہ اور رسول کی بات ہے، اسی لئے کتاب و سُنّت کو دین میں حجت اور معیار حق قرار دیا گیا ہے، مگر آپ نے یہ عقیدہ بنا لیا ہے کہ کسی اپنے بزرگ یا عالم کے قول و عمل کو آپ نے

چھوڑ دیا یا اُسے غلط سمجھا، تو ایسا کرنے سے آپ کا ایمان جاتا رہے گا! آپ زبان سے نہیں کہتے مگر دل میں اپنے بزرگوں کو "معصوم" سمجھتے ہیں، عا
عصمت انبیاء کرام کی صفت ہے، انبیاء کرام کے علاوہ کوئی "معصوم" نہیں ہے! آپ اپنے اندر یہ ایمانی جرأت پیدا کیجئے کہ آپ کے بزرگ
عالم یا پیر کے کسی قول و عمل کے مقابلہ میں آپ کو اللہ اور رسول کا قول یا صحابہ کا عمل مل جائے تو اپنے بزرگ کے قول و عمل کو بلا دریغ رد کر دیں
ایسا کرنے سے آپ کے سر کسی بزرگ کی توہین یا شان گھٹانے کا الزام ہرگز ہرگز نہیں آئیگا؟ مگر ہاں! اس کے برخلاف آپ نے اپنے
کسی بزرگ یا عالم کے قول کو کتاب و سنت کے مقابلہ میں ترجیح دی، یا اس قول کو درست ثابت کرنے کے لئے کتاب و سنت کے
احکام میں موشگافیاں اور تاویلیں کیں، تو آپ بہت بڑی معصیت کے مرتکب ہوں گے! آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ امام اعظم ابوحنیفہ
رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں ——— امام ابویوسفؒ اور امام ابومحمدؒ ——— نے امام اعظم کے اجتہاد و استنباط کئے ہوئے
سینکڑوں فقہی مسائل سے اس لئے اختلاف کیا کہ انہیں اقرب الی الصواب نہیں پایا۔

سمیع الدعا اور مشکل کشا ——— اللہ تعالیٰ ہے!

قرآن کریم ہی وہ کتاب ہے جس میں ذرہ بھر اور سوئی کی نوک کی برابر بھی شک و شبہ نہیں ہے، دین کی اساس اولین کتاب اللہ ہے
قرآن کریم میں جتنی بھی دعائیں ملتی ہیں، وہ سب اللہ تعالیٰ کے حضور کی گئی ہیں۔ قرآن کریم میں ایسی کوئی آیت نہیں ملتی جس سے یہ
ثابت ہوتا ہو کہ حضرت شیثؑ نے مصیبت کے وقت حضرت آدمؑ کو، حضرت نوحؑ نے حضرت شیثؑ کو، حضرت اسمٰعیلؑ نے
حضرت ابراہیمؑ کو اور اسی طرح حضرت موسیٰؑ اور عیسیٰ (علیہم السلام) نے وفات پائے ہوئے پیغمبروں کو پکارا ہو۔ اگر وفات پائے
ہوئے بزرگوں، ولیوں اور نبیوں سے استمداد جائز ہوتی، تو اللہ کی کتاب میں اس کا کہیں نہ کہیں کوئی ذکر تو آتا!

اس کے برخلاف قرآن کریم میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ یہ چیلنج کرتا ہے کہ میرے سوا تمہارے دُکھ درد کو کون دور کر سکتا ہے؛ میں ہی رب
ہوں، رازق ہوں، پالن ہار ہوں، مصیبتوں کا دور کرنیوالا ہوں، اور ساتھ ہی "غیر اللہ" کی دہائی دینے اور اللہ کے سوا دوسروں کو
پکارنے کی متعدد مقامات پر ممانعت اور وعید آئی ہے ———!

اِنَّ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ عِبَادٌ اَمۡثَالُکُمۡ فَادۡعُوۡھُمۡ فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ

(پ ۹ ع ۱۴)

تم خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہو وہ بندے ہیں تم جیسے۔ سو تم اُن کو پکار کر دیکھو، کہ تمہارے پکارنے کو قبول کریں (یعنی تمہارا کہا کر دیں) اگر تم سچے ہو!

اس آیت سے صاف طور سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشرکین بعض اولیاء، انبیاء اور فرشتوں کو بھی امداد و اعانت کے لئے پکارا کرتے
تھے، اس لئے مشرکین کو زجر و تنبیہ کے انداز میں فرمایا گیا کہ جن کو تم امداد کے لئے پکارتے ہو، وہ بھی تمہارے جیسے بندے ہیں! اس آیت کا اگر
صرف اصنام و اوثان پر اطلاق کیا جائے تو "عباد امثالکم" (تم جیسے بندے ہیں) کا مفہوم کس طرح ٹھیک بیٹھے گا، اس لئے کہ بُت
انسانوں جیسے تو نہیں ہوا کرتے!

قُلِ ادۡعُوا الَّذِیۡنَ زَعَمۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِہٖ فَلَا یَمۡلِکُوۡنَ کَشۡفَ الضُّرِّ عَنۡکُمۡ وَلَا تَحۡوِیۡلًا ۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ یَبۡتَغُوۡنَ اِلٰی رَبِّھِمُ الۡوَسِیۡلَۃَ اَیُّھُمۡ اَقۡرَبُ وَیَرۡجُوۡنَ رَحۡمَتَہٗ وَیَخَافُوۡنَ عَذَابَہٗ اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ کَانَ مَحۡذُوۡرًا

(یعنی، تم جن کو اللہ کے سوا قرار دے رہے ہو، اُن کو پکار دو سہی، وہ تم سے نہ تو تکلیف دور کرنیکا اختیار رکھتے ہیں، نہ اُن کے بدل ڈالنے کا! یہ لوگ جن کو مشرکین پکار رہے ہیں وہ خود ہی اپنے رب کی طرف ذریعہ ڈھونڈ رہے ہیں کہ ان میں کون زیادہ مقرب

بتلاہے، اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار ہیں اس کے عذاب سے
ڈرتے ہیں، اور تیرے رب کا عذاب ڈرنے ہی کی چیز ہے "

اس آیت میں اگر "من دون اللہ" اور "پکارے جانیوالوں" سے بُت مراد لئے جائیں، تو پتھر کے بُت اللہ تعالیٰ کے قرب اور اُس کے مُقرب و مقبول ہونے کی تمنا کہاں کرتے رہیں! اس آیت سے یقیناً بندگانِ صالحین ہی مُراد ہیں کہ جو اللہ کے تقرب کی تمنا رکھتے ہیں اُنہی کو یہ مُشرکین امداد و اعانت کے لئے پکارا کرتے تھے! ــــــــ اس آیت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وفات پائے ہوئے مُقربین بارگاہِ الہٰی اور مقبول بندے یعنی انبیاء و اولیا کسی مظلوم فریادی اور پکارنے والے کی تکلیف دور کرنیکا اختیار نہیں رکھتے اور جو انکو مصیبت میں پکارتا ہے وہ شرک کا مُرتکب ہوتا ہے۔

قرآن کریم کی صرف ہی ایک آیت پر آپ غور و تدبر سے کام لیں، تو آپ پر حق پوری طرح واضح ہو سکتا ہے، اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جن کو یہ مُشرکین (امداد و اعانت، دفعِ بلا اور حصولِ مقاصد) کے لئے پکار رہے ہیں........ وہ تو خود اپنے رب کی طرف ذریعہ ڈھونڈ رہے ہیں کہ اُن میں کس کو زیادہ تقرب حاصل ہوتا ہے، اور وہ اللہ کی رحمت کے اُمیدوار ہیں اور اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہیں ــــــــ تو زندہ اور مردہ مخلوق اور ارواح جو اللہ کے قرب اور رحمت کی امیدوار ہوں اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتی ہوں ــــــــ وہ ان "احتیاجات" کے رکھتے ہوئے اس قدرت و اختیار کی مالک اور حامل کس طرح ہو سکتی ہیں کہ دُنیا کے لاکھوں کروڑوں انسان اُن کو پکاریں اور وہ سب کی نہ صرف یہ کہ آوازوں کو سُن لیں بلکہ اُن کے دُکھ درد بھی دور کر دیں یہ صفت تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہو سکتی ہے اور ہے ــــــــ کہ جو ہر قسم کے احتیاج و ضرورت سے پاک ہے، جو نہ کسی سے اُمید رکھتا ہے اور نہ کسی سے ڈرتا ہے! اس آیت میں ہی بات کو تو کھول کر بیان کیا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کو اس کا اختیار نہیں دیا کہ وہ تمام دُنیا کی فریاد کو سُن سکے اور سب کی مصیبتوں کو کھول سکے!

اگر کسی نبی اور ولی کو اللہ تعالیٰ کسی مخلوق کی بہت دُور کی آواز سُنوا دے، تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کسی طرح درست نہیں ہے کہ انبیاء اور اولیاء کو اللہ تعالیٰ نے مستقل طور پر طاقت بخش دی ہے کہ اُن کو دُنیا کے پردے پر جہاں سے بھی پکارا جائیگا، پکارنے والوں کی ہر پکار کو سُن لیں گے! اور دُنیا میں یہ جو ہر لمحہ کروڑوں قسم کی آوازیں ہوتی رہتی ہیں، ان کو سب انبیاء اور اولیاء سُن رہے ہیں ــــــــ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ وہ ہر آن ہر آواز کو سُن رہا ہے، اور جو ہر آواز کو سُن سکتا ہے، اُسی کے یا اختیار میں بھی ہے کہ سارے جہاں کی مُصیبتوں کو کھول دے اور اُن کی مُشکل کشائی فرمائے!

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جو صحابۂ کرام مدینہ سے باہر ہوتے تھے، وہ مصائب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں پکارتے تھے کہ یا رسول اللہ! آپ کو خدا نے مشکل کشائی کا منصب عطا فرمایا ہے، آپ ہماری مشکل کو دور فرما دیجئے۔ یا کم سے کم اللہ تعالیٰ ہی سے ہمارے لئے دُعا کیجئے ــــــــ صحابۂ کرام نے ایسا کبھی نہیں کیا، وہ جانتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دور و دراز کی آوازوں کو نہیں سُن سکتے، ہاں! وہ حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا کی درخواست کرتے تھے۔

تو جو کوئی

انبیاء و اولیاء کے بارے میں یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کی قدرت دی ہے کہ وہ سارے زمانہ کی پکار سُن کر سب کی مشکلوں کو آسان بنا سکتے ہیں یا ان کے لئے دعا کر سکتے ہیں، وہ قرآنی تعلیمات کے خلاف عقیدہ رکھتا ہے، اور ایسا عقیدہ "توحید" کو مجروح کرتا ہے!

ایک اور آیت: ــــــــ

قُلْ اَرَءَيْتُمْ شُرَكَاءَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ

کہہ دو کہ ذرا اپنے شریکوں کو تو دیکھو جنہیں اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر تم پکارتے ہو مجھے دکھاؤ کہ انھوں نے زمین کا کونسا حصہ پیدا کیا ہے یا آسمانوں میں اُن کا کوئی ساجھا ہے۔

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی نبی، ولی، پیر اور غوث (؟) و قطب نے زمین کا بالشت بھر ٹکڑا بھی خلق نہیں کیا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ ایک کلیہ اس آیت میں بیان فرماتا ہے، زمین و آسمان کا خالق ہی سارے جہان کی حاجت روائی فرماتا ہے اور مخلوق میں یہ قدرت نہیں ہے۔ کیوں کہ "خلق" کرنے کی صفت اُن میں نہیں پائی جاتی اور یہ کام خالق کا ہے کہ سارے جہان کی خبر گیری فرمائے اور اُنکی پکار کو سُنے!

قرآنِ پاک میں کسی نبی اور رسول کے بارے میں یہ نہیں آیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قدرت کے سبب دُنیا کے سارے کارخانہ کو سنبھالے ہوئے ہے، اور اُسے جہاں سے بھی پکارا جائیگا، استغاثہ کرنے والوں کی فریاد سُن لے گا، یا تمام جہان کے لوگوں کو اولاد دینا، مریضوں کو اچھا کرنا اور اُن کو روزی دینا، کسی نبی سے متعلق کیا گیا ہے! بلکہ اس کے برخلاف خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ وحی ترجمان سے یہ کہلایا جاتا ہے:۔

قُلْ لَّا اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ ۝

(اے نبیؐ) کہہ کہ میں مالک نہیں ہوں خود اپنی جان کیلئے بُرے کا نہ بھلے کا، مگر جو اللہ چاہے!

قرآن کی اس کھلی ہوئی شہادت کے بعد کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات کے لئے نفع و نقصان کی قدرت نہ رکھتے تھے، کون مسلمان ایسی جرأت کر سکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس آیت کو اس طرح جھٹلائے کہ ایک ایک وفات پائے ہوئے ولی اور مردِ صالح کے نام کی دہائی دے، اُنہیں مدد کے لئے پکارے، اور یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے اولیاء اللہ کو ایسا کرنے کی قدرت دے دی ہے۔! حالانکہ قرآنِ پاک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک کے بارے میں اس "قدرت" کی نفی کرتا ہے!

سورۃ "الانفال" کی ایک آیت ہے:۔

وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّا اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ

اور الفت ڈال دی اُن کے دلوں میں اگر (اے نبیؐ) تو خرچ کر دیتا یہ جو کچھ زمین میں ہے سارے کا سارا تو نہ الفت ڈال سکتا اُن کے دلوں میں، لیکن اللہ نے الفت ڈال دی اُن میں!

یہ جاہل عربی جن کے دلوں سے خاندانی عداوتیں، نفرت اور حسد و کینہ نکل کر، اُن کے دلوں میں باہمی الفت پیدا ہو گئی تھی اور وہ بھائی بھائی بن گئے تھے، تو اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں فرما رہا ہے اے نبیؐ! ان لوگوں کے دل آپ نے نہیں، ہم نے جوڑے ہیں، آپ زمین کے تمام خزانے بھی خرچ کر دیتے تو بھی عرب کے دلوں میں الفت نہ ڈال سکتے تھے۔ اُن کے درمیان ہم نے اخوت و مودت پیدا کی۔ پس اس آیت سے صریحی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں باہمی اُلفت ڈالنے کی قدرت اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دی تھی!

حیرت ہے لوگ قرآنِ کریم میں اس قسم کی محکم آیتوں کو پڑھتے ہیں اور پھر بھی اللہ تعالیٰ کے علاوہ نبیوں، ولیوں، پیروں اور شہیدوں کو کائنات میں متصرف سمجھتے ہیں، اس قسم کی بیسیوں قرآنی آیات بتاتی ہیں کہ قدرت و اختیار کا رشتہ صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، اور اس نے اپنی جیسی قدرت اور اختیار کسی نبی اور ولی کو عطا نہیں فرمایا۔ اس کے حکم کے بغیر کسی نبی اور رسول نے ایک سانس بھی اپنے اختیار سے نہیں لی، اللہ تعالیٰ کو جب منظور ہوتا تھا انبیاء کرام سے معجزے صادر کرا دیتا تھا اور جب منظور نہ ہوتا

تھا تو انبیاء کرام کی تمناؤں اور دعاؤں کے باوجود کچھ نہ ہو سکتا تھا۔

قرآن کریم میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں کہ انبیاء کرام کی خواہش و تمنا کے باوجود بعض اوقات وہی ہوا جو اللہ تعالیٰ کو منظور تھا، اور ان کی تمنائیں پوری نہ ہو سکیں ——— مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کی باپ کی نظروں کے سامنے غرقابی حضرت یوسف علیہ السلام کا برسوں حضرت یعقوب علیہ السلام سے دور رہنا، اور اس غم میں آپ کا نڈھال ہو جانا!

کوئی شک نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول و مستجاب ہوتی تھیں۔ لیکن قرآن ہی یہ بتاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا بھی بعض اوقات قبول نہیں ہوتی:۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (التوبہ)	اے نبی! تم ایسے لوگوں کے لئے معافی کی درخواست کرو یا نہ کرو اگر تم ستر مرتبہ بھی اُنکے معاف کر دینے کی درخواست کروگے تو اللہ انہیں ہرگز معاف نہ کریگا۔

جب امام الانبیاء اور افضل الرسول (علیہ الصلوٰۃ والسلام) تک کی دعا بعض اوقات اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول نہیں ہوتی ——— تو پھر دنیا کے پردے پر کون ایسا انسان اور عالمِ برزخ میں کون ایسی روح ہو سکتی ہے جس سے ہم استغاثہ کرتے ہوئے یہ عقیدہ رکھیں کہ اللہ تعالیٰ اُن کے کسی کہے کو ٹال ہی نہیں سکتا!

قرآن بتاتا ہے کہ ہدایت کا دینا اور سیدھی راہ پر چلانا، یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی صفت اور اُسی کا کام ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضۂ اختیار سے یہ فریضہ اور کام باہر تھا:۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ	(اے نبی) تو راہ پر نہیں لاتا۔ (یعنی ہدایت نہیں دیتا) جس کو تو چاہے۔ بلکہ اللہ راہ پر لاتا ہے جس کو وہ چاہے، اور وہی (اللہ) خوب جانتا ہے کہ کون راہ پر آئیں گے (یعنی ہدایت پائیں گے)

پورا قرآن اسی قسم کی آیتوں سے لبریز ہے، جن میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی فریادرس اور مشکل کشا نہیں ہے، وہی ساری کائنات کا دستگیر اور مخلوق کا داتا ہے، اسی کو مصیبت میں پکارو، اسی کے نام کی دہائی دو، اُسی کو مالک، رازق اور حلالِ مشکلات سمجھو! قرآن کریم میں کسی ایک جگہ بھی یہ نہیں کہا گیا کہ ہم نے انبیاء کو سارے جہان کے دُکھ دور کرنے اور دنیا کو رزق، اولاد، صحت دینے اور تقسیم کرنے کا اختیار دیا ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف بہ تقاضائے بشریت انبیاء کے عجز و درماندگی کے کتنے ہی واقعات اور اس عالم میں اُنکی تضرع آمیز دعائیں ملتی ہیں مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حضور فریاد کرتے ہیں:۔

——— رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ (پ ۲۰، ع ۶)	اے میرے پروردگار! جو نعمت بھی آپ مجھ کو بھیجدیں میں اُس کا محتاج (فقیر) ہوں! [1]

---

[1] ایک توحید شناس شاعر (مولوی خرم علی بلہوری مرحوم) نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے:۔

خدا فرما چکا قرآں کے اندر   مرے محتاج ہیں پیر و پیمبر

اے مولانا صاحب! آپ اس سچے اور قرآن کے عین مطابق شعر پر طنز فرمایا کرتے تھے۔ اور آپ کی زبانی ہم نے اپنے بچپن میں یہ طنز سُنی تھی کہ اس شعر میں "وہابیت" پائی جاتی ہے! اس کج فہمی کو کیا کہئے کہ جو چیز کتاب و سنت کے عین مطابق اور آپ کے زعم و عقائد کے خلاف آکر پڑتی ہے اس پر آپ "وہابیت و دیوبندیت" کی چھاپ لگا کر اصل حقیقت کو گاؤں کے سیدھے سادے مسلمانوں کی نگاہوں میں مشتبہ بنا دیتے ہیں!

انبیاء کرام تک اللہ کے حضور جب اپنے کو محتاج و فقیر کی حیثیت سے پیش کریں، تو پھر ہم کس ولی و پیر کے بارے میں یہ عقیدہ رکھیں کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم و عطا سے عالم کا مالک و مختار بنا دیا ہے!

آپ حضرات نے "ذاتی" اور "عطائی" کی تفریق نکال کر اور نکتہ پیدا کر کے شدید گمراہیوں اور غلط اندیشیوں کا دروازہ کھول دیا ہے! جب کوئی آیت یا حدیث پیش کی جاتی ہے، جس میں اللہ کی قدرت کا اظہار اور بندوں کی قدرت کی نفی ہوتی ہے، تو آپ جھٹ سے کہہ دیتے ہیں کہ اس آیت اور حدیث سے تو صرف "قدرت بالذات" کی نفی مقصود ہے، "قدرت بالعطاء" کی نفی نہیں ہوتی ـــــــ تو اس آپ کے نکالے ہوئے نکتے کی بنیاد پر کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں بھی "اللہ" آیا ہے اس سے "ذاتی اللہ" مراد ہے مگر اس کائنات میں اللہ ہی کے اذن و اختیار سے "عطائی اللہ" بھی پائے جاتے ہیں! جب آپ کے عقیدے کے مطابق اولیاء و انبیاء خدا کے حکم و عطا سے ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں، تمام جہان کی دستگیری فرماتے ہیں، دُنیا کو رزق، اولاد اور صحت بخشتے ہیں، ہر شخص کے دلوں کی تمناؤں اور چھپے ہوئے ارادوں سے واقف ہیں ـــــــ تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ حقیقی اور ذاتی اللہ نے اپنے حکم سے بیشمار "عطائی اور صفاتی اللہ" بنا دیئے ہیں (اس عقیدہ اور فکر سے کروڑ بار اللہ کی پناہ! توبہ! استغفر اللہ!)

قرآن کی اس واضح اور محکم آیت :-

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِىْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ـ

(اے نبی!) کہہ کہ میں مالک نہیں ہوں، خود اپنی جان کے لئے بُرے کا نہ بھلے کا، مگر جو اللہ چاہے!

میں کیا یہ "نکتہ" پیدا کرنے کی ذرا سی بھی گنجائش موجود ہے کہ اس میں "قدرت بالذات" کی نفی کی گئی ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ کہلوایا گیا ہے کہ میں ذاتی طور پر تو اپنے بُرے بھلے کا مالک نہیں ہوں مگر عطائی طور پر اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قدرت کی بنا پر اپنے نفس کے لئے بُرائی اور بھلائی کا مالک ہوں ـــــــ ـــــــ قرآنی آیت میں اس قسم کی معنوی تحریف کی جرأت بھلا کوئی صاحب ایمان کر سکتا ہے؟

آپ جو قدرت و اختیار کے مسئلہ میں ذاتی اور عطائی کا نکتہ پیدا کرتے رہتے ہیں۔ تو قرآن کریم کی یہ آیت :-

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِىْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ ـ

تو کہہ میں، میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خزانے ہیں اللہ کے (دیئے ہوئے) اور نہ میں غیب جانتا ہوں!

اس نکتہ کو بھی باطل کر دیتی ہے، اللہ کا نبی کہہ رہا ہے کہ "میرے پاس اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے خزانے بھی نہیں ہیں"۔ جب نبی کے پاس بھی اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے خزانے نہیں ہیں، تو پھر اور کس کے پاس ہو سکتے ہیں، کہ بڑے سے بڑا ولی، نبی سے رُتبہ میں گھٹ کر ہی ہوتا ہے ـــــــ مولانا! اس کو کیا کیجئے گا کہ پورا قرآن ان عقائد کی تائید کرتا ہے جن کو آپ نے "وہابیت" کا نام دے رکھا ہے، اور ان عقائد کی تردید و نفی کرتا ہے، جن پر آپ نے "عشقِ رسول" اور احترام بزرگانِ دین کا ٹھپہ لگا رکھا ہے!

یہ تو ہے "قدرت و اختیار" اور "استعانت و استغاثہ" کے بارے میں قرآن کی شہادت بلکہ دو ٹوک فیصلہ! اب رہیں احادیث تو ظاہر ہے کہ کوئی صحیح حدیث کتاب اللہ کی مخالف نہیں ہو سکتی اور ہو گی، تو وہ وضعی اور جعلی حدیث ہو گی۔ جس کو رد کر دیا جائیگا، اس لئے کہ نبی کا کوئی قول و عمل کتاب اللہ سے متضاد و مخالف ہو ہی نہیں سکتا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو دُعائیں منقول و ماثور ہیں اُن کی تعداد غالباً سینکڑوں تک پہنچتی ہے، وہ سب کی سب دُعائیں اللہ تعالیٰ ہی کے حضور کی گئی

ہیں! اور حضورؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے سارے جہان کا قدرت و اختیار دے رکھا ہے، لہٰذا مصیبت کے اور حاجت کے وقت مجھے پکارا کرو، میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے جہاں سے بھی تم مجھے پکاروگے، تمہاری التجا سن لوں گا اور تمہاری مصیبت دور کر دونگا! خود حضورؐ کی زندگی میں صحابہ کرام جو مکہ میں، طائف میں اور دوسری بستیوں میں رہتے تھے، مصیبت کے وقت حضورؐ کو نہیں پکارا کرتے تھے، بلکہ جو کچھ کہنا ہوتا تھا مدینہ میں حاضر ہو کر کہتے تھے۔ حضورؐ کی وفات کے بعد صحابہ کرامؓ کو مصر و شام اور ایران میں کافروں سے کیسی کیسی جنگیں لڑنی پڑی ہیں، اور بڑے بڑے نازک اور مصیبت کے، وقت آئے ہیں مگر کسی صحابی نے رسول اللہؐ سے استغاثہ نہیں کیا، بلکہ مصیبت میں اللہ تعالیٰ ہی کو پکارا، یہی صحابہ کرام کو تعلیم دی گئی تھی، وہ توحید خالص کے مبلغ اور فدائی اس شرک کا ارتکاب کس طرح کر سکتے تھے۔

حضورؐ کی زندگی میں متعدد واقعات ایسے ملتے ہیں کہ کوئی سائل آیا اور آپ کے پاس کچھ دینے کو نہ تھا، تو آپنے کسی صحابی کے پاس اسے بھیجدیا۔ یا گھر میں صرف بکری کا دودھ، تھوڑی سی کھجوریں یا تھوڑے سے ستو تھے، حضورؐ نے اس سائل کو وہی دیدیا اس سے زیادہ کا بندوبست نہ ہو سکا!

کفار قریش نے مکہ معظمہ میں بنو ہاشم کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ حضورؐ اور تمام آل ہاشم تین برس تک شعب ابی طالب میں پناہ گزین رہے، وہاں کے مصائب کا یہ عالم تھا کہ ہاشمی قبیلے کے چھوٹے چھوٹے بچے بھوک کے مارے روتے اور بلکتے تھے۔ بعض صحابہ درخت کی پتیاں کھا کھا کر بسر کرتے تھے۔ حضرت سعد وقاص کا بیان ہے کہ رات میں سوکھا چمڑا ان کو مل گیا، اور اسے دھو کر، آگ پر بھون کر اور پانی میں ملا کر کھایا ——— ان دردناک حالات کو دیکھ کر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل کس قدر دکھتا تھا مگر حکم الٰہی کے آگے مجبور اور راضی برضا تھے اور حالات کو نہیں بدل سکتے تھے!

مکہ میں صحابہ کرام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں کے سامنے کیسے کیسے مظالم ہوئے ہیں مگر آپ اُن کو تسلی دیتے اور صبر کی تلقین فرماتے تھے مگر ان کو اس تعذیب سے چھڑا نہیں سکتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کو ـــ اور صحابہ کرام کو ہجرت کرنی پڑی، اور ہجرت کے بعد اللہ تعالیٰ نے حالات کو بدلا!

اس قسم کے واقعات جہاں مشیت الٰہی کے سامنے نبی بھی مجبور نظر آتا ہے۔ سیرت نبویؐ میں بکثرت ملتے ہیں، اور ایسے واقعات کے پائے جانے سے نبی کی شان گھٹ نہیں جاتی کہ نبی "بشر" ہوتا ہے "خدا" نہیں ہوتا، اور "بشر" کو غم و مصائب اور دکھ درد کے حالات بھی پیش آتے رہیں، اس قسم کے تمام عوارض سے پاک تو بس اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے!

ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو معجزات عطا فرمائے ہیں، مثلاً حضرت سلیمان علیہ السلام جانوروں کی بولیاں سمجھ لیا کرتے تھے، لیکن اس معجزے کی بنا پر کوئی صاحب فہم و شعور یہ تو نہیں کر سکتا کہ اس کی زبان میں اگر لکنت ہو، تو وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی روح کو مخاطب کر کے استغاثہ کرے کہ آپ تو جانوروں کی بولیاں سمجھ لیا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو منطق الطیر کا علم دیا تھا، اس لئے یا نبی اللہ! میری زبان کی لکنت کو دور فرما دیجئے ——— حضرت عیسٰی علیہ السلام اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ اور بیماروں کو تندرست فرما دیا کرتے تھے، لیکن اس معجزے سے یہ قیاس تو قائم نہیں کیا جا سکتا کہ دنیا میں جہاں جہاں بھی مریض پائے جاتے تھے، اُن سب کا حضرت عیسٰیؑ کو علم تھا۔ اور ان کو صحت آپ ہی اللہ کے حکم سے عطا فرمایا کرتے تھے۔ سیدھی صاف بات یہ ہے کہ جو مریض آپ کے سامنے آتے تھے ان کو آپ اچھا کر دیتے تھے، اور آپ کے آسمان پر اٹھا لئے جانے کے بعد، کوئی صاحب ہوش اور اہل ایمان بیماری کی حالت میں حضرت عیسٰیؑ سے استغاثہ کرنے کی حماقت نہیں کر سکتا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے بیماروں کو اچھا کرنے کا معجزہ عطا فرمایا تھا، اس لئے میری بھی فریاد سنیئے اور میری بیماری کو دور کر دیجئے! ہاں! عیسائی یہی شرک

عقیدہ رکھتے ہیں!

تفسیر بیضاوی میں "قل ادعوا الذین زعمتم من دونہ" کی شرح یوں کی گئی ہے :-

"کالملائکۃ والمسیح وعزیر لا یملکون فلا یستطیعون کشف الضر عنکم کالمرض والفقر ولا تحویلاً، ولا تحویل ذالک منکم الی غیرکم

(یعنی ملائکہ، مسیح اور عزیر تک کشف ضر یعنی مرض وفقر ومصائب کے دور کرنے کی طاقت نہیں رکھتے اور نہ اس کو بطور خود پھیر سکتے ہیں)

جب انبیاء کرام تک کا یہ عالم ہے کہ وہ نہ مرض ومحتاجی کو صحت وتونگری سے بدل سکتے ہیں اور نہ مصائب کو ٹال سکتے ہیں تو ان سے کم درجہ کے لوگ ـــــ اولیاء وصلحا ـــــ سے اس کی کیسے توقع کی جا سکتی ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے بہت سے معجزات عطا فرمائے تھے، آپ کے دست مبارک میں کنکریاں کلمہ پڑھنے لگیں، آپ کی انگلی کے اشارے سے چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ آپ کی انگلیوں سے پانی کی دھاریں جاری ہو گئیں، آپ کی دعا اور برکت سے تھوڑی سی چیز (کھانا، کھجور، دودھ وغیرہ) بہت ہو جاتی تھی۔ آپ کے اشارے سے درخت چلنے لگا۔ آپ کی دعا سے لوگوں کے مرض دور ہو گئے۔ آپ صاحب معراج ہیں، رحمۃ للعالمین اور سراج منیر ہیں۔ آپ افضل الرسول اور امام الانبیاء ہیں، اللہ تعالیٰ کے بعد مخلوقات میں آپ ہی افضل واشرف ہیں، آپ خاتم النبیین ہیں، آپ کی اتباع واطاعت کے بغیر کوئی نیک عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول نہیں ہو سکتا، آپ شافع یوم محشر اور ساقی کوثر ہیں، جس دل میں آپ کی محبت نہیں وہ بے نور ہے۔ آپ کی محبت ایمان کی جان ہے (آپ پر درود وسلام ہوں، اور آپ پر ہماری جانیں قربان ہوں) حضورؐ کے ان تمام فضائل ومعجزات پر ہم ایمان لاتے ہیں اور ان میں ذرا سا بھی شک نہیں کرتے ـــــــــ مگر مصیبت کے وقت ہم اللہ کو پکارتے ہیں، حضورؐ کو نہیں پکارتے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اور حضورؐ نے ہمیں اس کا حکم نہیں دیا، اور ایسا کرنے سے روکا ہے، صحابہ کرام جو حضورؐ کے تربیت یافتہ تھے، انھوں نے بھی اللہ تعالیٰ ہی سے استغاثہ کیا کہ وہی سمیع الدعا اور حلال مشکلات ہے، قرآن پاک نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد بتایا ہے ـــــــ یہ کہ آپ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں اور لوگوں کا تزکیہ نفس فرماتے ہیں ـــــــ اس دنیا کے کارخانہ کو چلانا اور تمام مخلوقات کی خبر گیری کرنا اور انہیں روزی پہنچانا، یہ رسول اللہؐ کے فرائض میں داخل نہیں ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے کہ اسی کی ذات حی وقیوم ہے، اور اس کے سوا ہر شے "ہالک" ہے! یہ صرف اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ کائنات کا کوئی ذرہ اس سے پوشیدہ نہیں ہے اور پاتال میں رینگنے والی چیونٹی کے پیر کی دھمک بھی وہ سن لیتا ہے، پتھر کے کیڑے کو بھی وہی رزق دیتا ہے اور کون ومکان کے نظام کو تنہا اس کی قدرت تھامے ہوئے ہے۔ اور اس میں اس کا کوئی شریک اور مددگار نہیں ہے!

اللہ تعالیٰ نے چاہا تو حضورؐ کو مکہ سے سدرۃ المنتہیٰ بلکہ اس سے بھی بلند تر فضا تک سیر کرائی گئی، حضورؐ کو جنت ودوزخ کی دکھائی گئی اور افلاک کی سیر کرائی گئی، اور ان عجائبات کا حضورؐ نے مشاہدہ کیا جن کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے اور ایک رات کی کم مدت میں یہ سب کچھ ظہور میں آگیا، مگر جب اللہ نے نہ چاہا تو حضورؐ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرماتے ہیں تو اس سفر میں کئی دن صرف ہو جاتے ہیں اور راستہ بتانے کے لئے ایک کافر (عبداللہ بن اریقط) سے مدد لینے کی ضرورت پیش آتی ہے ـــــــ

ایسا بھی ہوا ہے کہ حضورؐ نے دعا کی اور ایک نابینا کی گئی ہوئی بینائی لوٹ آئی مگر حضورؐ کی سیرت میں یہ بھی ملتا ہے کہ حضرت سعد بن معاذ

رضی اللہ عنہ کے زخم کو حضور خود اپنے دست مبارک میں مشقص لے کر دو بار داغتے ہیں مگر زخم اچھا نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ کئی دن کے بعد اسی زخم کے اثر سے حضرت سعدؓ کی وفات واقع ہو جاتی ہے۔

قرآن نے ہر نبی کے لئے بار بار "بشر" اور "عبد" کا لفظ استعمال کیا ہے، اور ہمیں نمازوں میں "اشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ" پڑھنے کی تعلیم دی گئی ہے، کہ نبی کا رسول کے ساتھ "بندہ ہونا" نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جائے ——— اس حقیقت کو "عشق رسولؐ" کے نام پر بھلا دیا گیا ہے، اور اسی ذہول و نسیان نے عقائد میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا کی ہیں!

قرآن کریم میں آیا ہے:۔

فَإِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُّوسَىٰ

پس یکایک ان کے جادو سے ان کی لاٹھیاں اور رسیاں دوڑتی ہوئی محسوس ہوئیں اور موسیٰؑ اپنے دل میں ڈر گیا۔

موسیٰ علیہ السلام کتنے جلیل القدر پیغمبر ہیں، مگر جادوگروں کے جادو کے زور سے لاٹھیوں اور رسیوں کو دوڑتا دیکھ کر ڈر جاتے ہیں:۔ کیوں؟ اس لئے کہ حضرت موسیٰ خدا نہ تھے، بشر تھے، اور بشر کو چاہے وہ نبی ہی کیوں نہ ہو۔ بشری عوارض سے بھی سابقہ پڑ جاتا ہے اور انبیاء کا بشری عوارض میں مبتلا ہونا اُن کے لئے کوئی توہین کی بات نہیں ہے! خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بشری عوارض و حادثات پیش آتے رہے ہیں، آپ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کا انتقال ہونا اور اس غم سے حضورؐ کی آنکھوں میں آنسو بھر لانا، آپ پر جادو کا اثر ہو جانا، طائف میں کافروں کی سنگ باری سے زخمی ہو کر زمین پر گر پڑنا۔ غزوۂ احد میں ایک کافر کی تلوار کا آپ کو زخمی کر دینا! وفات سے ایک دن پہلے نقاہت کا یہ عالم تھا کہ لوگوں نے حضورؐ کو دوا پلانی چاہی، اور آپ نے انکار فرمایا۔ اسی حالت میں غشی طاری ہو گئی۔ صحیح مسلم کی روایت ہے کہ مرض الموت میں اس قدر جسمانی ضعف تھا کہ آپ حجرہ شریف کے پردے کو بھی اچھی طرح نہ ہٹا سکے ——— اور دن جیسے جیسے چڑھتا جاتا آپ پر غشی طاری ہوتی تھی، اور پھر افاقہ ہو جاتا تھا، حضرت فاطمہ بار بار یہ دیکھ کر بولیں "واکرب اباہ" ہائے! میرے باپ کی بے چینی" آپ نے فرمایا، تمہارا باپ اب کے بعد بے چین نہ ہوگا یہ تو صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے کہ اُسے نہ نیند آتی ہے اور نہ اونگھ اور نہ کوئی مرض لاحق ہوتا ہے! اولیاء اور صلحاء کا تو کیا ذکر ہے۔ انبیاء کرام تک کو سہو و نسیان ہو گیا ہے، صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہر قسم کے تغیر اور عارضہ سے پاک ہے اور صرف اسی کی ذات اس کی مستحق ہے کہ اُس سے استغاثہ اور فریاد کی جائے! اسی کے بارے میں یہ عقیدہ رکھا جائے کہ وہی دلوں کا حال جانتا ہے اور ہر جگہ کے پکارنے والے کی فریاد سنتا اور مشکلیں کھولتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا یہ معاملہ اور کسی کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا! یہی وہ صحیح عقیدہ ہے جس کی تصدیق و تائید کتاب و سنت اور آثار صحابہ سے ہوتی ہے!

مولانا صاحب! یہ جو آپ فرمایا کرتے ہیں کہ تم طبیب کے پاس علاج کے لئے کا ہیکو جاتے ہو، اُس سے مدد کیوں چاہتے ہو، اس طرح غیر اللہ سے مدد چاہ کر تم "شرک" میں مبتلا ہوتے ہو ——— تو صحیح عقائد کو بگاڑنے والے یہ آپ لوگوں کے مغالطے ہیں، جن میں گاؤں کے لوگ بڑی آسانی سے مبتلا ہو جاتے ہیں، ہم طبیب کے پاس علاج کے واسطے، اس لئے جاتے ہیں کہ ایسا کرنے کا حکم آیا ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا کے کاموں میں صحابہ سے مدد لیا کرتے تھے، قرآن پاک میں اس کی سینکڑوں مثالیں ملتی ہیں کہ بندے ایک دوسرے کے کاموں میں مدد لیتے ہیں، یہاں تک کہ بے جان چیزوں ——— دوات قلم، چاقو، مسطر، کوشک، لحاف، چارپائی، میز، کرسی وغیرہ ——— سے کام لیا جاتا ہے! اور اس طرح کام اور مدد لینے کی کوئی ممانعت وارد نہیں ہوئی، ——— پھر یہ کوئی عقیدہ نہیں رکھتا کہ وہ طبیب جس کے پاس ہم علاج کرانے کو

جاتے ہیں، وہ سارے جہان کے مریضوں کو جانتا ہے، ہم اس کے پاس چل کر نہ جاتے تو بھی وہ گھر بیٹھ کر ہی ہمارے مرض سے واقف ہو جاتا اور نہ ہم یہ کرتے ہیں کہ وہ طبیب مر جائے تو اس کی قبر پر جا کر کہیں کہ اے حکیم صاحب! آپ اپنی زندگی میں ہمارا علاج معالجہ کیا کرتے تھے۔ اللہ نے آپ کو مریضوں کے علاج معالجہ کرنے کی قدرت دی تھی۔ تو ہم آپ کی قبر پر حاضر ہوئے ہیں، ہمارا علاج کر دیجئے۔

غزوۂ احد میں حضورؐ کے پیارے چچا حضرت سید الشہداء حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کس بیدردی کے ساتھ شہید اور ان کی لاش کا مثلہ کیا گیا، حضورؐ کو اس واقعہ کا انتہائی صدمہ ہوا، ظاہر ہے کہ آپ کے اختیار میں ہوتا، تو آپ اپنے پیارے چچا کو شہید ہونے دیتے

نبی کا معجزہ اور ولی کی کرامت ——— "خرقِ عادت" ہے اور "خرقِ عادت" مستقل عادت نہیں بن سکتی! مثلاً کسی ولی کو اللہ تعالیٰ یہ قدرت دے سکتا ہے کہ کوئی اس کے پاس آئے اور وہ اس کے دل کا حال بتا دے ——— مگر اس سے یہ کلیہ مرتب کرنا بالکل غلط ہے کہ وہ ولی جس پر ایک شخص کے دل کا حال منکشف ہو گیا تھا، وہ سارے جہان کے انسانوں کے دلوں کا حال جانتا ہے اور جو کوئی بھی اس کے پاس آتا ہے اس کے دل کے حال سے باخبر ہو جاتا ہے ——— "علیمٌ بذات الصدور" اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

مولانا صاحب! آپ نے خود اپنے محترم پیر و مرشد اور دوسرے مشائخ، پیروں اور بزرگوں کو دیکھا ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں کس قدر "احتیاج" رکھتے ہیں، ماں باپ اور عزیزوں، دوستوں اور مریدوں کا حال ڈاک کے ذریعہ معلوم کرتے ہیں اگر گھر بیٹھے اُن پر سب کے حالات منکشف ہو جاتے تو ڈاک کی زحمت کیوں برداشت کرتے۔ اُن کے بچے بیمار ہوتے ہیں تو علاج معالجہ کے لئے دوڑے دوڑے پھرتے ہیں، ان کے بہت سارے ارادے ناکام ہو جاتے ہیں، اُن کی متعدد دُعائیں پوری نہیں ہوتیں۔ اسٹیشن دیر سے پہنچتے ہیں تو ٹرین نکل جاتی ہے آنکھیں کمزور ہو جاتی ہیں تو عینک کے بغیر پڑھ نہیں سکتے سردی سے بچنے کے لئے گرم کپڑوں کا بندوبست کرتے ہیں، کسی بیماری کے سبب کمزور ہو جاتے ہیں تو دوسرے آدمیوں کے سہارے کے بغیر ایک قدم چل نہیں سکتے! ذرا بارش ہونے لگے تو چھتری یا سائبان کی پناہ ڈھونڈنے لگتے ہیں، تو زندگی میں جن کے احتیاج کا یہ عالم ہو، اُن سے مرنے کے بعد استغاثہ و فریاد کرنا اور امداد و اعانت کی توقع رکھنا، کتنی کھلی ہوئی جہالت اور بے دانشی ہے!

مولانا صاحب! آپ خود بھی تو بڑے بڑے بزرگوں کے تربیت یافتہ اور اُن سے فیض پائے ہوئے ہیں، اور آپ کی زندگی کے کم سے کم پچاس سال عبادت و ریاضت ہی میں گزرے ہیں، آپ کے حالات بھی اللہ کے فضل سے نیک لوگوں کے سے رہے ہیں۔ آپ نے عرسوں میں بھی شرکت کی ہے، بزرگوں کی قبروں پر مراقبے بھی کئے ہیں، نذر و نیاز اور فاتحہ کے معمولات کا آپ کس قدر اہتمام فرماتے رہے ہیں ——— تو اس ریاضت و مجاہدہ، بزرگوں کے فیض صحبت اور صالحیت کے بعد آپ میں بزرگوں کی کچھ نہ کچھ۔ تو کرامات کی جھلک آنی چاہیے۔ آپ اپنی حالت پر غور کیجئے کہ آپ مسجد میں ہوتے ہیں اور چار قدم پر آپ کا مکان ہے مگر وہاں کی حالت کی آپ کو ذرہ برابر خبر نہیں ہوتی۔ آپ کس قدر مالی پریشانیوں میں مبتلا ہیں اور اُن پریشانیوں کے دور ہو جانے کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور کیسی کیسی دعائیں کرتے ہیں مگر آپ کی دُعا تک قبول نہیں ہوتی۔ آپ اپنے پریشان حال عزیزوں کی کوئی مدد نہیں کر سکتے، آپ اپنے لڑکے کو اپنی مرضی کے مطابق نہیں چلا سکتے۔ جب زندگی میں آپ کی مجبوری، احتیاج اور بے اختیاری کا یہ عالم ہے تو آپ کے وفات پانے کے بعد آپ کا کوئی مرید یا معتقد یہ عقیدہ

سمجھے کہ آپ قبر سے اس کی امداد کر سکتے ہیں اور اس کی مشکلوں کو کھول سکتے ہیں اور آپ کے مزار پر "یا مولانا فیاض ـــ المدد" کا نعرہ لگانے لگیں تو ان کا ایسا کرنا کتنی کھلی ہوئی حماقت ہے!

انبیاء، اولیاء، علماء یعنی جو اللہ تعالیٰ کے محبوب و مقرب بندے ہوتے ہیں، اُن کا سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، حلال روزی کماتے اور کھاتے ہیں، اگر کسی کام میں انہیں کروڑوں روپیہ ملنے کی توقع ہو، اور وہ آمدنی یا تجارت ناپاک نہیں، مشتبہ بھی ہو، تو اسے چھوڑ دیتے ہیں، بہ تقاضائے بشریت اُن سے بھول چوک ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے حضور تضرع و زاری کے ساتھ توبہ کرتے ہیں، اُن کے دل اللہ تعالیٰ کی خشیت سے لبریز ہوتے ہیں۔ وہ دن رات عبادت کر کے بھی یہی سمجھتے ہیں کہ ہم سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کا ذرا سا حق بھی ادا نہیں ہو سکا، اللہ تعالیٰ کے یہاں جو جتنا زیادہ مقرب ہے اتنا ہی زیادہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور عجز و نیاز پیش کرتا اور جلالِ و خشیتِ الٰہی سے لرزتا رہتا ہے! حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نیک اعمال کی کسی نے تعریف کی تو آپ نے فرمایا، بھائی! "قیامت کے دن برابر سرابر ہی چھوٹ جاؤں تو غنیمت ہے۔"

یہ ہے اللہ کے پیاروں اور محبوبوں کی حقیقی سیرت جن میں ہمارے لئے اچھا نمونہ ہے!

سردارِ دو عالم، اشرف الانبیاء، سیدنا محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عرفات میں جو دعا کی تھی، اور جو "کنز العمال" میں بہ روایت ابن عباس رضی منقول ہے، اس کو پڑھیے اور "عبدیت و بشریت" کے کمال کی ایک جھلک دیکھئے۔

"اے اللہ! تو میری بات کو سنتا ہے اور میری جگہ کو دیکھتا ہے، میرے پوشیدہ اور ظاہر کو جانتا ہے، تجھ سے میری کوئی بات چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی، میں ـــــــ مصیبت زدہ ہوں، محتاج ہوں، فریادی ہوں، پناہ ڈھونڈنے والا ہوں"۔ ہراساں ہوں، اپنے گناہوں کا اقرار کرنیوالا ہوں، اعتراف کرنیوالا ہوں، تیرے آگے سوال کرتا ہوں جیسے بیکس سوال کرتے ہیں، تیرے آگے گڑگڑاتا ہوں جیسے گناہگار ذلیل و خوار گڑگڑاتا ہے اور تجھ سے طلب کرتا ہوں جیسے خوف زدہ آفت رسیدہ طلب کرتا ہے اور جیسے وہ شخص طلب کرتا ہے جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہو اور اس کے آنسو بہ رہے ہوں اور تن بدن وہ تیرے آگے گرے ہو، اور تیرے سامنے اپنی ناک رگڑ رہا ہو۔"

زیارتِ قبور

اب رہا "زیارتِ قبور" کا مسئلہ تو اس پر گفتگو کرنے سے قبل چند باتیں عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ کہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے دفن کو بھی "قبر" ہی کہا گیا ہے اور صحابہ کرام بلا تکلف "قبر نبی" بولتے تھے مگر اُردو زبان میں بزرگوں کے مدفنوں کو "قبر" بولتے ہوئے لوگ جھجکتے ہیں اور ان کے لئے "مزار" کا لفظ بولتے ہیں بزرگانِ دین جہاں وفات پانے کے بعد دفن ہوئے ہیں اُن کے لئے اُردو میں "قبر" کی جگہ مزار، آستانہ، درگاہ اور دربار وغیرہ الفاظ بولے جاتے ہیں، مگر اس کے مقابلہ میں عام مسلمانوں کی جائے دفن کو "قبر" ہی کہتے ہیں ـــــــ اسی طرح جب یہ مسئلہ بیان کیا جاتا ہے کہ "زیارتِ قبور" کی دین میں اجازت آئی ہے، تو لفظ "زیارت" کے ساتھ اُن تمام اشغال و تقریبات اور رسوم کا تصور ذہن میں گردش کرنے لگتا ہے، جاہل بدعتی بزرگوں کی قبروں پر بجا لاتے ہیں! عوام "زیارتِ قبور کے جواز" کا حکم سن کر یہی سمجھتے ہیں کہ ان تمام رسوم و اشغال کا جواز بھی "زیارتِ قبور کے جواز" میں مضمر ہے! ہر قبر پر جانے کو عربی میں "زیارت" ہی بولتے ہیں مگر اردو میں ان لفظوں کے درمیان امتیاز کیا جاتا ہے ـــــــ اس طرح :-

"میں نے حضرت شاہ ولایت کے مزار پر حاضری دی تھی یا زیارت کی تھی"

اور

"میں کل اپنے والد کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لئے گیا تھا۔"

یہ تمام امتیازات بعض تکلفات کے پیدا کئے ہوئے ہیں: اسلام کی سادگی ان تکلفات سے ناآشنا ہے! ان لفظی تکلفات اور امتیازات نے عقائد کو خاصا متاثر کیا ہے۔

مولانا صاحب! "زیارت قبور" کا ذکر آتے ہی آپکے ذہن میں اُس عُرس کا خیال آتا ہے جو الفت شاہ شکور گنج میں کیا کرتا تھا، یا گڈ بائی اور قادری باغ میں "روشنی" ہوتی ہے، یا پیرانِ کلیر شریف اور اجمیر شریف کے عُرسوں میں جو باتیں ہوتی ہیں، اس خیال کے بعد آپ اس مسئلہ میں کسی تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھتے، اور جو کوئی اللہ کا بندہ آپ کو اس مسئلہ کی اصل حقیقت بتانا چاہتا ہے اس کے متعلق آپ پہلے سے یہ فیصلہ کئے ہوئے ہیں کہ وہ گمراہ اور بے دین ہو گیا ہے اور وہ ایسی باتوں سے "وہابیت" پھیلانا چاہتا ہے ——— دینی مسائل میں غور و فکر کی "یہ الٹی تدبیر ہے، جو آپ پر حق واضح نہیں ہونے دیتی!

دین کے جس مسئلہ میں بھی کوئی نزاع واقع ہو، یا شک پیدا ہو، یا اس کی تحقیق مطلوب ہو، تو سب سے پہلے اللہ کی کتاب میں اس کی تلاش کرنی چاہیئے کہ کائنات میں یہی وہ تنہا کتاب ہے، جو ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک اور "لاریب فیہ" ہے "قرآن پاک میں تو "زیارتِ قبور" کا کوئی حکم نہیں ملتا، اور اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ قبروں کی زیارت دین کی ناگزیر ضرورت ہوتی اور بہت بڑے ثواب کا کام ہوتا تو قرآن کریم میں اس کا ذکر آنا چاہیئے تھا ——— کتاب اللہ کے بعد ہم احادیث میں تفحص کرتے ہیں، تو یہ ملتا ہے:۔

کُنتُ نھیتکم عن زیارۃ القبور فزوروھا فانھا تزھد فی الدنیا وتذکر الاخرۃ

میں نے تمہیں زیارتِ قبور سے منع کیا تھا، سواب قبروں کی زیارت کیا کرو کہ یہ چیز دنیا سے بے رغبتی کرتی اور آخرت کو یاد دلاتی ہے۔

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر جانے کی علت یہ بتائی ہے کہ وہاں جا کر اور قبروں کو دیکھ کر دنیا سے بے رغبتی پیدا ہوتی ہے اور آخرت کی یاد آتی ہے! اس کے علاوہ بعض روایتوں میں مُردوں کے لئے دُعا کے الفاظ ملتے ہیں اور کسی حدیث میں کوئی اشارہ تک نہیں ملتا کہ قبروں پر جاکر عرض معروض کیا کرو، اہل قبور سے امداد و اعانت چاہو، قبروں کو چومو، ان کے قریب بیٹھکر اعتکاف و مراقبہ کرو، ان پر چادریں چڑھاؤ، صندل ملو، چراغ جلاؤ ——— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی قبر کے بارے میں یہ ہدایت فرمائی:۔

"لا تجعلوا قبری عیدا" ——— میری قبر کو "عید" مت بناؤ ——— یعنی اس پر میلہ نہ لگاؤ، اس حدیث سے قبروں پر "عرس شریف" کے نام سے میلے لگانے جھگڑے کرنے اور جمع ہونے کی صریحی ممانعت نکلتی ہے۔

بخاری و مسلم دونوں نے بروایت حضرت عائشہ رضہ یہ حدیث نقل کی ہے:۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فی مرضہ الذی لم یقم منہ لعن اللہ الیھود والنصاریٰ اتخذوا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیماری میں جس سے آپ اٹھے نہیں فرمایا کہ لعنت ہو اللہ کی یہود و نصاریٰ پر کہ انھوں نے

قبور انبیاءِ ھم مساجد — اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مساجد بنالیا۔

اور

عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعن اللہ زائرات القبور والمتخذین علیھا المساجد والسرج (مشکوٰۃ)

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لعنت کی اللہ نے اُن عورتوں پر جو زیارت کریں قبروں کی اور اُن لوگوں پر لعنت خدا کی، جو بنائیں قبروں پر مسجدیں اور روشن کریں (قبروں پر) چراغ۔

اور

اخرج مسلم عن جابر قال نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یجصص القبر وان یبنی علیہ وان یقعد علیہ۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ منع کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے کہ قبر پختہ کیا جائے اور اس پر عمارت بنائی جائے اور اس پر بیٹھا جائے۔

"یقعد علیہ" کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ "قبروں پر چڑھ کر بیٹھنے سے روکا گیا ہے"۔ اس لئے کہ قبروں پر چڑھ کر بیٹھنے کا کبھی رواج نہیں رہا، یہاں حدیث کا سیاق و سباق بتا رہا ہے کہ "یقعد علیہ" کا مطلب یہ ہے کہ قبروں پر مراقب ہو کر اور مجاور بن کر بیٹھنے کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی ہے۔

بخاری اور مسلم کی روایت ہے کہ حضرت اُم حبیبہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے حبش کے دو ایسے گرجاؤں کا ذکر رسول اللہ کے حضور کیا جس میں انھوں نے تصاویر دیکھی تھیں، اس پر حضورؐ نے فرمایا:۔

ان اُولئک اذا کان فیھم الرجل الصالح فمات بنوا علی قبرہ مسجداً وصوروا فیہ تلک الصور اولئک شرار الخلق عند اللہ یوم القیامۃ

ان لوگوں کا یہ طریقہ ہے کہ جب ان میں سے کوئی مرد صالح مر جاتا ہے تو اس کی قبر کو سجدہ گاہ بنا لیتے ہیں اور صالحین کی تصویریں نقش کر لیتے ہیں، یہی لوگ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک بدترین مخلوق ہوں گے۔

موطا امام مالک کی روایت ہے:۔

اِنّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اللھم لا تجعل قبری وثناً یعبد اشتد غضب اللہ علی قوم اتخذوا قبور انبیائھم مساجد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے اللہ! میری قبر کو بُت نہ بننے دینا جسے پوجا جائے اللہ کا سخت غضب آئے اس قوم پر جو اپنے نبیوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنالے۔

یہ جو "وثن" (بُت۔ صنم) کا لفظ حدیث شریف میں یہ آیا ہے، اس کی روشنی میں سوچیے کہ کفار و مشرکین، مندروں معبدوں اور دھرم شالاؤں میں بُت کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں، اس کے سامنے ڈنڈوت، سجدہ اور اس کے اردگرد طواف کئے جاتے ہیں اس پر پھولوں کے ہار ڈالتے ہیں، چندن ملتے ہیں، لوبان اور چراغ جلاتے ہیں، اس کو قیمتی لباس پہناتے ہیں۔ چڑھاوے چڑھاتے اور اس بُت کے سامنے اپنی التجائیں پیش کرتے ہیں، تو حضورؐ نے "وثن" فرما کر جن باتوں سے روکا تھا، آج مسلمانوں کی کتنی بڑی تعداد قبروں کے معاملہ میں انہی خرافات میں مبتلا ہے، اور صدیوں سے اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دے رہی ہے، اور جو خدا کا بندہ ان برائیوں پر حرف گیری کرتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات یاد دلاتا ہے

تو اسے اتنا مطعون کیا جاتا ہے، بزرگوں کی قبروں پر عُرس نذر و نیاز اور احترام و عقیدت کے نام پر جو باتیں ہوتی ہیں، انکا دین سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہے بلکہ ایسا کرنے کی سخت ممانعت آئی ہے۔

اے مولانا! جب آپ کے سامنے قرآنی آیات اور احادیثِ رسولؐ پیش کی جاتی ہے تو آپ اس کے جواب میں کسی شاعر کا کوئی شعر، یا کسی صوفی یا عالم کی کسی کتاب کا کوئی اقتباس پیش فرما دیتے ہیں۔ حالانکہ کتاب و سنت کے مقابلہ میں کسی کے شعر کی، ملفوظات کی، اور مکاشفات کی کوئی حیثیت نہیں ہے [یا پھر آپ یہ کہہ دیتے ہیں .... کہ "جمہور اہل سنت" کا یہ مسلک ہے!] یہ تو بڑی ہی عجیب بلکہ مضحکہ انگیز بات ہے کہ جو لوگ "سنت" کے مقابلہ میں "بدعات" پر عمل کریں، اور بدعات کے جواز کے لئے طرح طرح کے نکتے اور حیلے تراشیں۔ وہ "اہل سنت" ہونے کے مدعی ہوں ـــــ برعکس نہند نام زنگی کافورا

سنیئے امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

انهم وضعوا هذه الاصنام والاوثان على صور انبيائهم واكابرهم وزعموا انهم متى اشتغلوا بعبادة هذه التماثيل فان اولئك الاكابر تكون شفعاء لهم عند الله تعالى ونظيره في هذا الزمان اشتغال كثير من الخلق بتعظيم قبور الاكابر على اعتقاد انهم اذا عظموا قبورهم فانهم يكونون شفعاء لهم عند الله۔

یعنی بت پرستوں نے یہ اصنام و اوثان اپنے انبیاء اور اکابر کی صورتوں پر تراشے تھے، اور (وہ) یہ خیال کرتے تھے کہ جب ہم انکی عبادت میں مشغول ہوں گے، تو یہ اکابر اللہ کے پاس ہماری شفاعت کریں گے ـــــ اس کی نظیر اس زمانہ میں اکثر لوگوں کی اپنے بزرگوں کی قبروں پر مشغولیت اس اعتبار سے ہے کہ اگر ہم قبروں کی تعظیم کریں گے تو یہ اللہ کے نزدیک ہمارے شفیع ہونگے۔

ہر دور میں، اسی طرح ان مشرکانہ رسوم اور بدعات پر علماء حق نے گرفت کی ہے اور عوام کی گالیاں کھانے اور ان میں اپنے غیر مقبول ہونے کی پروا نہیں کی اور جس مسلک پر آپ قائم ہیں، حق شناس علماء اور صلحاء کا یہ مسلک کبھی نہیں رہا۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب "موضوعات" میں لکھا ہے کہ بغداد میں ایک واعظ نے یہ حدیث بیان کی کہ قیامت میں خدا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ساتھ عرش پر بٹھائیگا۔ امام ابن جریر طبری نے سنا تو بہت برہم ہوئے اور اپنے دروازے پر رقعہ لکھ کر لگا دیا کہ "خدا کا کوئی ہم نشین نہیں"۔ اس پر بغداد کے عوام سخت برافروختہ ہوئے، اور امام موصوف کے گھر پر اس قدر پتھر برسائے کہ دیواریں ڈھک گئیں[1] ـــــ تو اس قسم کی بے اصل روایتوں اور چرب زبان واعظوں کے خود ساختہ مناقب و فضائل کی "راسخون فی العلم" نے جرأت کے ساتھ ہمیشہ تردید کی ہے اور اس حق گوئی پر عوام کی گالیاں کھائی ہیں اور ان کی خفگی کے نتائج بھگتے ہیں!

علم غیب

"غیب" کا مسئلہ قرونِ اولیٰ میں مختلف فیہ نہیں رہا، صحابہ کرام "تابعین" تبع تابعین، فقہاء اور محدثین یہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو عالم الغیب نہیں جانتے تھے اور جب وہ "عالم الغیب" بولتے تھے، تو ان کے ذہن میں یہ تفریق نہ ہوتی تھی کہ اللہ تعالیٰ تو "ذاتی عالم الغیب" ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "عطائی عالم الغیب" ہیں!

اللہ تعالیٰ دو ٹوک انداز میں فرماتا ہے:۔

قُل لَّا يَعْلَمُ مَن فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ — (اے نبیؐ) کہہ دو کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں (ان میں

[1] سیرۃ النبی۔

إِلَّا اللّٰهُ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ
سے کوئی بھی) اللہ تعالیٰ کے سوا غیب کو نہیں جانتا اور وہ اس کی بھی خبر نہیں رکھتے کہ کب اٹھائیں گے؟

اس قسم کی متعدد آیتیں قرآن پاک میں ملتی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کے "عالم الغیب" ہونے کی شدومد کے ساتھ نفی کی گئی ہے! "غیب" کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ کسی کا دیا ہوا نہ ہو، ذاتی ہو اور جزوی نہ ہو "کلی" ہو! بعض اوقات انسان کے قلب پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ کسی ہونے والی بات کا اشارہ مل جاتا ہے، اسی طرح، رمل، جفر اور علم نجوم کے، بعض کے حسابات (زائچے، پانسے اور نقشے) جب اتفاق سے ٹھیک نکل آتے ہیں، تو مستقبل کے بارے میں مطابق واقعہ حکم لگا دیا جاتا ہے — اسے "غیب" نہیں کہہ سکتے! انبیاء کرام کو اللہ تعالیٰ نے بے شک غیوب کی اطلاع دی ہے۔ مگر اطلاع کے بعد غیب، غیب نہیں رہتا ہے، ورنہ اس طرح تو ساری اُمت کے لوگ "عالم الغیب" قرار پائیں گے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کی خبروں پر مطلع کیا اور حضورؐ نے "انباءِ غیب" کی اُمت کو اطلاع دی!

قرآن کریم ہی میں غور و تدبر کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ نبی "غیب داں" نہیں ہوتا۔ یہ علم جو انبیاء کو عطا کیا گیا ہے "اظہارِ غیب" اور اطلاعِ غیب ہے مگر اس "اطلاع و اظہار" کے یہ معنی نہیں کہ کائنات کی کوئی چیز انبیاء کرام کی نگاہوں سے چھپی نہیں رہتی اور ان کو ہر بات کا علم حاصل ہو جاتا ہے، اس عقیدے کی خود قرآن نفی کرتا ہے:-

فَقَالَ أَحَطْتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهِ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَإٍ بِنَبَإٍ يَقِينٍ (النمل)
کہا میں تیرے پاس سبا سے ایک ایسی خبر لے کر آیا ہوں جس کی مجھ کو خبر نہ تھی۔

یہ ہُدہُد کا قول ہے، یعنی وہ حضرت سلیمان علیہ السلام سے یہ کہہ رہا ہے کہ "میں ایسی ایک خبر لایا ہوں جس کی آپ کو خبر نہ تھی" ملک سبا کے حالات کا علم نہ رکھنے سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی منزلت میں ذرہ برابر کمی نہیں آجاتی کہ سارے جہان کے حالات کا علم رکھنا نبوت کا لازمہ ہرگز ہرگز نہیں ہے۔

فَلَمَّا رَأَى أَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ إِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً قَالُوا لَا تَخَفْ
پھر جب دیکھا کہ اُن کے ہاتھ کھانے تک نہیں آتے تو وہ کھٹکا اور دل میں ڈرا، وہ بولے مت ڈر ہم بھیجے ہوئے آئے ہیں، قومِ لوط کی طرف!

حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے کتنے برگزیدہ نبی اور جلیل القدر پیغمبر ہیں، مگر اُن کا یہ عالم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے فرشتوں کو نہیں پہچان سکتے اور دل میں خوف محسوس کرنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ فرشتے خود بتلاتے ہیں کہ آپ خوف نہ کیجئے۔ ہمیں تو لوط کی بدکار قوم کی طرف اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے!

وَمِمَّنْ حَوْلَكُم مِّنَ الْأَعْرَابِ مُنَافِقُونَ وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ
تمہارے آس پاس بادیہ نشینوں میں منافق ہیں اور بعض اہل مدینہ بھی نفاق پر اڑے ہوئے ہیں (مگر) تو نہیں جانتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہو رہا ہے "ان منافقین کو تو نہیں جانتا ہم جانتے ہیں ———— اور آپ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری کائنات کے ماضی، حال اور مستقبل کا علم تھا، اور اللہ تعالیٰ یہ فرما رہا ہے کہ آپ کو منافقین کا بھی (پوری طرح) علم نہیں ہے! ———— اور ————

وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ
یعنی ہم نے داؤد کو زبور دی! ہم نے اُن رسولوں پر وحی نازل

عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ (النساء ع) — جنکا ذکر اس سے پہلے تجھ سے کرچکے ہیں اور اُن رسولوں پر بھی جن کا ذکر تجھ سے نہیں کیا۔

یہ آیت واضح طور پر بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض رسولوں تک کے حالات کی اطلاع نہیں دی! اس آیت کے مقابلہ میں حضورؐ سے "ماکان وما یکون" کے علم کی نسبت، قرآن کے کس قدر خلاف آگر پڑتی ہے!

ان دو آیتوں سے قبل قرآنی آیتوں کے ذریعہ واضح اور ثابت ہو چکا ہے کہ انبیاء "عالم الغیب" نہ تھے، اس حقیقت کو ذہن میں رکھ کر اس آیت کو پڑھیے!

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ — تو کہ میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں اور مجھے نہیں معلوم کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے، اور تمہارے ساتھ بھی کیا ہونے والا ہے۔

کیا اس کا ترجمہ آپ کے عقیدہ کے مطابق اس طرح کیا جا سکتا ہے:۔

"تو کہ میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں اور مجھے ذاتی طور پر تو معلوم نہیں ہے رہاں۔! عطائی طور پر معلوم ہے کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے"

قرآن پاک کے سے ترجمہ و تفسیر کا ایسا مذاق کون صاحب ایمان کر سکتا ہے (نعوذ باللہ)

ذیل کی آیت نے تو مسئلہ کو اس قدر واضح کر دیا کہ اب گفتگو کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں رہی۔

قُلْ لَّا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَّبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُونَ — (اے نبی) کہہ میں اختیار نہیں رکھتا، اپنی جان کے کسی نفع نقصان کا، مگر جو کچھ اللہ چاہے اور جو میں جانتا غیب تو بیشک بہت سی لے لیتا بھلائی اور نہ چھوتی مجھے کوئی پریشانی میں تو فقط ڈرانیوالا اور خوشخبری سنانے والا ہوں، اُن لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں۔

آپ نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ تفسیر خازن میں اس آیت کی شرح یوں کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ از راہ تواضع کہا ہے! اگر تفسیر خازن میں ایسی بات کہی گئی ہے تو انتہائی کمزور اور لغو بات کہی گئی ہے! یہ تو ہم اہل دنیا کا خاصہ ہے کہ گفتگو میں تواضع سے کام لیتے ہیں، یعنی اصل حقیقت کو کم کر کے بیان کرتے ہیں ———— جیسے کوئی مشاق شاعر از راہ تواضع کہے ———— "جی! میں تو تک بند ہوں، شاعری واعری مجھے یوں ہی سی آتی ہے"۔
مگر اللہ اور رسولؐ سے اس خلاف حقیقت تواضع کی نسبت کس قدر گستاخی، جسارت بیجا، اور ایمان کو ڈبو دینے والی حرکت ہے۔ (استغفر اللہ)

اس آیت نے حقیقت کو رائی برابر بھی غیر واضح اور مبہم نہیں رہنے دیا، اس میں "ذاتی غیب" اور "عطائی غیب" کی تفریق کا کوئی پہلو نہیں نکل سکتا اس میں صاف طور پر اللہ تعالیٰ نبی کی زبان سے کہلوا رہا ہے کہ ———— میں غیب جانتا ہوتا تو مجھے کوئی پریشانی، عارضہ اور حادثہ کاہیکو چھوتا، پھر تو میرے دامن میں خیر ہی خیر ہوتا ———— غیب نہ جاننے کے سبب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر جو تہمت لگائی گئی ہے، تو آپ کو پریشان و ملول رہنا پڑا، آپ پر جادو کا اثر ہوا، خیبر میں ایک یہودیہ نے کھانے میں حضورؐ کو زہر کھلا دیا اور مرتے دم تک آپ اس زہر

[فخ]ر کو محسوس کرتے رہے۔" ـــــــ غزوۂ احد میں صحابہ کرامؓ کے مورچے سے ہٹ جانے کے سبب لڑائی کا پانسہ بھی پلٹ گیا [یہا]ں تک کہ حضورؐ کے سرِ مبارک پر زخم آئے ....!

[ا]ن قرآنی آیات، اور سیرتِ مقدسہ کے مستند وقعات کے بعد بھی کوئی حق کو مشتبہ بنانے کے لئے پھر یہ نکتہ پیدا کرے کہ یہ [ز]مانے کی باتیں ہیں جب تک حضورؐ کو مکمل علمِ غیب نہیں دیا گیا تھا تو اس نکتہ کو باطل کرنے کے لئے مسلم (جلد اول) کی یہ حدیث [نق]ل کی جاتی ہے :-

"ایک بار حضورؐ نے بیماری کی حالت میں نماز عشاء پڑھنے کے لئے مسجد میں جانے کا ارادہ کیا جب چلنے لگے تو غش آگیا، جب افاقہ ہوا تو گھر والوں سے دریافت کیا گیا کہ مسجد میں لوگوں نے نماز پڑھ لی؟ گھر والوں نے جواب دیا کہ نہیں، آپ کا انتظار کر رہے ہیں، کئی مرتبہ اسی طرح ہوا۔"

[مر]ض الموت کا واقعہ معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ اس سے پہلے اتنے بیمار کبھی نہیں ہوئے کہ غش آجائے، تو اگر "علمِ غیب" آپ کو اس وقت [د]یا گیا ہوتا تو آپ گھر والوں سے یہ کاہے کو دریافت فرماتے ـــــــ کہ کیا مسجد میں لوگوں نے نماز پڑھ لی!

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کی باتوں کی اطلاع دی تھی، عالمِ مثال [میں ح]ضورؐ کو جنت و دوزخ کے آنے والے واقعات بھی دکھائے گئے تھے، حضورؐ نے آثارِ قیامت بھی بتائے ہیں اور بعض اشخاص [اور و]اقعات کی نسبت جو پیش گوئی فرمائی گئی ہے وہ حرف بہ حرف ٹھیک ثابت ہوئی ہے! یہ بھی درست ہے کہ مکہ میں کچھ [لوگ س]رگوشی کرتے ہیں اور مدینہ میں حضورؐ اُس پر مطلع ہو جاتے اور حضورؐ کی برابر کسی کو علم نہیں دیا گیا ـــــــ اس قسم کے [واقعا]ت پر ہمارا ایمان ہے ـــــــ مگر ان معجزات و واقعات کے لکھنے والی کتابوں میں یہ بھی ملتا ہے کہ :-

"حضرت ابوسعید رضؓ سے روایت ہے کہ ایک سیاہ فام عورت جو مسجد میں جھاڑو دیا کرتی تھی ایک رات کو وہ مر گئی، جب صبح ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی گئی، آپ نے فرمایا تم نے مجھ کو اس کی خبر کیوں نہیں کی، پھر آپ صحابہ کو لے کر باہر تشریف لے گئے اور اس کی قبر پر کھڑے ہو کر تکبیر فرمائی اور اس کے لئے دعا کی اور واپس تشریف لے آئے۔"

(ابن ماجہ و ابن خزیمہ)

[یہ و]اقعہ صاف بتا رہی ہے کہ مسجدِ نبوی کی جاروب کش عورت مر جاتی ہے اور حضورؐ کو خبر نہیں ہوتی اور سرکارِ دو عالمؐ صحابہؓ سے [فرما]تے ہیں کہ تم نے مجھے اس کی موت اور کفن دفن کی اطلاع کیوں نہیں دی ـــــــ غزوۂ بدر میں جیشِ اسلام [کی فتحِ م]بین کے بعد حضورؐ حکم دیتے ہیں ـــــــ کہ کوئی شخص جا کر خبر لائے کہ ابوجہل کا کیا انجام ہوا؟ چنانچہ حضرت [عبداللہ] ابن مسعود رضی اللہ عنہ زخمیوں کے درمیان جا کر ابوجہل کا سر کاٹ لاتے ہیں ـــــــ غزوۂ احد میں حضورؐ [کی شہا]دت کی خبر سن کر صحابہؓ بدحواس ہو گئے - اسی عالم میں اگلی صفیں پچھلی صفوں پر ٹوٹ پڑیں اور دوست دشمن کی تمیز نہ [رہی۔] حضرت حذیفہؓ کے والد حضرت یمانؓ اس جھپٹ میں آگئے، ان پر تلواریں برس پڑیں، حضرت حذیفہؓ چلاتے ہی [رہے کہ] میرے باپ ہیں ـــ لیکن کون سنتا تھا، اور وہ شہید ہو گئے ـــــــ (صحیح بخاری)

اگر حضورؐ کو عطائی ہی سہی علمِ غیب ہوتا تو حضرت یمانؓ کے معاملہ میں صحابہ کو روکنا اور ٹوکنا آپ پر فرض ہو جاتا

جب صحابۂ کرام جو انبیاء کے بعد سب سے افضل ہیں، اُن کا یہ عالم ہو کہ نظروں کے سامنے کے آدمی کو کش مکش میں نہ پہچان سکیں اور اس نہ پہچاننے کے سبب قتل واقع ہو جائے ـــــــ تو پھر ہم کسی ولی، قطب، غوث اور ابدال کے بارے میں یہ حسنِ ظن قائم کر لیں کہ اُس پر سارے دُنیا کے احوال و کوائف ہر وقت منکشف ہوتے رہتے ہیں اور اس کو جہاں سے بھی پکارا جائے، وہ پکارنے والے کی پکار کو سن لیتا ہے اور اس کی مصیبت کو دور کر دیتا ہے!

بیعتِ رضوان میں حضور مکہ معظمہ سے چند میل کے فاصلہ پر حدیبیہ میں صحابۂ کرامؓ کے ساتھ قیام فرماتے ہیں، کفارِ قریش سے صلح کی گفتگو کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مکہ بھیجا جاتا ہے اور یہ خبر مشہور ہو جاتی ہے کہ حضرت عثمان قتل کر دیئے گئے۔ اس خبر کو سُن کر حضورؐ ایک ببول کے درخت کے نیچے صحابۂ کرام سے قصاصِ عثمان لینے کے لئے بیعت فرماتے ہیں۔ حالانکہ عثمان قتل نہیں ہوئے تھے اور کئی دن تک حضورؐ اور تمام صحابۂ کرام اصل واقعہ سے بے خبر رہے!

۵ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ بنی المصطلق سے مدینہ واپس تشریف لا رہے تھے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اس سفر میں حضورؐ کے ساتھ تھیں، اُن کی سواری کا ناقہ علیحدہ تھا۔ وہ ناقہ کے ہودے پر پردے چھوڑ کر بیٹھ جاتیں، اور جمال اس ہودے کو اٹھا کر اونٹ کی پیٹھ پر رکھ دیتے اور رسیوں سے کس کر باندھ دیتے، ایک منزل پر قافلہ پڑاؤ ڈالے ہوا تھا کہ حضرت عائشہ قضائے حاجت کے لئے جنگل کی طرف تشریف لے گئیں، وہاں! اُن کا ہار ٹوٹ کر گر پڑا، اس کے تلاش کرنے میں تاخیر ہو گئی اُدھر قافلہ روانہ ہو گیا، جمالوں نے ہمیشہ کی طرح ہودہ اونٹ پر باندھ دیا، حضرت عائشہؓ ہلکے پھلکے بدن کی تھیں، جمالوں کو اس کا احساس تک نہ ہو سکا کہ وہ اس میں نہیں ہیں! حضرت عائشہؓ لوٹ کر آئیں تو دیکھا کہ قافلہ کوچ کر چکا ہے، بڑا نازک وقت تھا مگر انھوں نے بڑے استقلال سے کام لیا اور وہیں ٹھیری رہیں اور اسی عالم میں انہیں نیند آگئی، حضرت صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ پیچھے سے آئے، جو گری پڑی چیزوں اور بھٹکے ماندے اہلِ قافلہ کی حفاظت پر مامور تھے، انھوں نے حضرت عائشہؓ کو دیکھا تو گھبرا کر "انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھا جسے سُن کر حضرت صدیقہؓ کی آنکھ کھل گئی، انھوں نے چہرے پر چادر ڈال لی۔ صفوانؓ نے حضرت عائشہؓ کے قریب اپنا اونٹ لاکر انہیں بٹھایا اور اونٹ کی نکیل تھام کر روانہ ہوئے اور دوپہر کے وقت یہ اونٹ قافلہ سے جا ملا! اس واقعہ سے منافقین نے ناجائز فائدہ اٹھایا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی نسبت واہیات باتیں پھیلا دیں اور سوءِ اتفاق سے چند بھولے بھالے صحابی بھی منافقین کے اس شرارت آمیز چکّے میں آگئے، اور وہ بھی اسی قسم کے تذکرے کرنے لگے، ان افواہوں کا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر اتنا اثر ہوا کہ اُن کے آنسو نہ تھمتے تھے یہاں تک کہ وہ بیمار پڑ گئیں، حضورؐ، صحابۂ کرام اور خاص طور سے حضرت صدیقِ اکبرؓ اور اُن کے گھرانے کے لوگوں کا ملال ناقابلِ بیان تھا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے برأت کی آیتیں نازل ہوئیں جب جا کر غم و الم کے یہ بادل چھٹے! یہ سارا واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہؓ اور صحابۂ کرام کی کثیر جماعت سے علمِ غیب کی نفی کرتا ہے اگر حضورؐ کو عطائی علمِ غیب بھی ہوتا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ آپ اُسی قافلہ میں ہوں اور آپ کی حرمِ محترم عائشہ صدیقہؓ قافلہ سے چھوٹ کر جنگل میں تنہا رہ جائیں اور آپ اُس کا نوٹس تک نہ لیں!

تاریخِ اسلام کا کس قدر مشہور و مستند واقعہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مکان پر شورش پسند چڑھ آئے ہیں، وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے صاحبزادوں حسنؓ و حسینؓ کو مدافعت کے لئے بھیجتے ہیں مگر حضرت علیؓ شیرِ خدا، حسن و حسینؓ اور دوسرے صحابہ حضرت عثمانؓ کو نہیں بچا سکتے، یہاں تک کہ اُن کو شہید کر دیا جاتا ہے! صحابۂ کرام تک کو زندگی میں یہ مجبوریاں پیش آئی ہیں کہ

بعض اوقات نہ اُن کی دعائیں کارگر ہوتی ہیں اور نہ تدبیریں چلتی ہیں!

شہادتِ عثمان کے بعد صحابہ کے اختلافات کے جو دردناک واقعات رونما ہوئے ہیں، وہ اس کے شاہد ہیں کہ صحابہ کرام جو انبیاء کرام کے بعد اُمت میں سب سے افضل ہیں، وہ تک آپس کی غلط فہمیوں سے محفوظ نہ رہ سکے جس کے نتیجہ میں ہزاروں صحابیوں کو خاک و خون میں لوٹنا پڑا! صحابہ کرام کی بہت بڑی جماعت اس غلط فہمی میں مبتلا تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ قاتلانِ عثمان کے پکڑنے میں ڈھیل برت رہے ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ عالم کہ انہیں حضرت عثمان رض کے قاتلوں کا علم ہی نہ تھا!

جب

ہزاروں صحابہ کرام حضرت عثمان رض کے قاتلوں تک کا پتہ نہ لگا سکیں اور آخر تک بے خبر رہیں، اور آپس کی خانہ جنگی کو نہ روک سکیں تو پھر ہم کسی ولی کے بارے میں یہ حسنِ ظن رکھیں کہ وہ قبر یا برزخ سے ہماری مدد کر سکتا ہے اور ہمارے احوال و کوائف کی خبر رکھتا ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

اِنِّی لَا اُرِیْدُ اَنْ تَرْفَعُوْنِیْ فَوْقَ مَنْزِلَتِی الَّتِیْ اَنْزَلَنِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی اَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰہِ عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ	بے شک میں نہیں چاہتا کہ بڑھاؤ تم مجھ کو زیادہ اس رتبہ سے جو اللہ نے مجھے بخشا ہے، میں تو وہی محمد ہوں بیٹا عبداللہ کا اللہ کا بندہ اور اس کا رسول!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ "مجھے خدا نہ کہو" کیوں کہ مشرکین تک اپنے بتوں کو "خدا" نہیں کہتے تھے، اور کوئی گمراہ سے گمراہ عقیدے کا مسلمان بھی رسول اللہ ؐ کو کھل کر "خدا" نہیں کہتا ——— حضور ؐ کو آپ کے رتبہ سے بڑھانا یہی کہ الوہی صفات آپ سے منسوب کی جائیں، یہ کہ آپ عالم الغیب ہیں، حاضر و ناظر ہیں، ساری دُنیا کے مالک و مختار ہیں، سارے جہان کے لوگوں کی دستگیری اور خبر گیری فرماتے ہیں "احمد بلا میم" ہیں۔

تو سلطان صاحب سریر آمدی
علیٰ کل شیٔ قدیر آمدی

آپ کی شان ہے ——— آپ بشر نہیں ہیں، نور ہی نور ہیں ——— ! اس قسم کی عقیدت و محبت سے دین و ایمان کے خسارے کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا!

اس نوبت پر کہا جا سکتا ہے کہ بعض بزرگوں کے ملفوظات اور شعروں میں اس قسم کی مبالغہ آمیزیاں پائی جاتی ہیں، تو اس کے جواب میں عرض ہے کہ "کتاب و سنت" کے مقابلہ میں کسی کی بات نہیں مانی جا سکتی، حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے تقویٰ، علمی شان اور دینی مرتبت کا بھلا کوئی ٹھکانا ہے! لیکن آپ نے فرمایا کہ میرا قول کتاب و سنت کے خلاف پاؤ تو اسے دیوار پر مار دو! "کتاب و سنت" کے مخالف ہر کسی کے قول و فعل کے ساتھ یہی سلوک کرنا چاہیے کہ ہر شخصیت وہ چاہے کتنی ہی عظیم کیوں نہ ہو، اللہ اور رسول ؐ سے گھٹ کر ہی ہے۔ تصوف میں جہاں محبت بلکہ بعض مقامات پر باطنیت آگئی ہے وہاں "شطحیات" ملتے ہیں، اُن کو بلا دریغ رد کر دینا چاہیے! تصوف کی بعض کتابوں میں تو جعلی اور وضعی حدیثیں تک پائی جاتی ہیں۔

بعض صوفی شعراء کے یہاں واقعی اس قسم کے شعر ملتے ہیں، جن میں "غیر اللہ" سے استغاثہ کیا گیا ہے اور اعانت چاہی گئی ہے، ظاہر ہے کہ "کتاب و سنت" کے مقابلہ میں کسی کی "شاعری" "ذرہ برابر" بھی حجت اور لائق استناد نہیں ہے، ہم اُن بزرگوں کو "نورِ اخلاق" نہیں بلکہ ایسا نور جو بشریت کے صفات سے پاک ہو۔

کی طرف سے اس طرح مدافعت کی جاسکتی ہے کہ شاعری میں بے جان چیزوں کو جاندار فرض کرکے، اُن تک سے مخاطبت کی جاتی ہے، حافظ شیرازی کا مشہور شعر ہے ؎

صبا! بلطف بگو آں غزال رعنا را
کہ سر بکوہ وبیاباں تو دادۂ مارا

ظاہر ہے بادِ صبا بے شنتی ہے، نہ بولتی ہے اور نہ شاعر کا پیغام اُس کے محبوب کو پہنچا سکتی ہے، مگر شاعر نے ذوق و شوق کے عالم میں بادِ صبا کو مخاطب بنایا ہے، اسی طرح سے ان بزرگوں کا یہ عقیدہ ہرگز نہ ہوگا کہ ارواح ان کی امداد کرسکتی ہیں، یہ دلی جذبہ اور باطنی جوش ہے جو شعر کے قالب میں ڈھل گیا ـــــــــــ پھر اس توجیہ و تاویل کے بعد بھی یہی گزارش ہے کہ اس قسم کے غیر محتاط شعروں سے احتراز ہی اولیٰ ہے! ذوق و شوق اور شاعرانہ چٹخاروں سے توحید خالص کو غبار آلود نہیں کیا جاسکتا۔ اس قسم کی شاعری نے عقائد کو بڑا نقصان پہنچایا ہے!

شعر و تصوف کی کتابیں دین میں ذرہ برابر حجت نہیں ہیں، اُن میں بڑی بڑی بے اعتدالیاں پائی جاتی ہیں! اگر کسی شاعر اور صوفی کے بارے میں کوئی یہ ثابت کردے کہ اس کا یہی عقیدہ بھی تھا جو اُس نے شاعری اور مضامین وجد و حال میں بیان کیا ہے تو "کتاب و سُنّت" کے مقابلہ میں ایسے اشعار اور تصوف آمیز تحریریں رد کردی جائیں گی!

قبروں کو پختہ نہ صحابہ کرامؓ نے بنایا، نہ تابعین نے اور نہ ائمہ فقہاء و محدثین نے! قبروں پر گنبد، بارہ دریاں، مجرے، زیادہ تر بادشاہوں کے جنوائے ہوئے ہیں، یہاں تک کہ بعض قبروں پر سونے اور چاندی کے پتر منڈھ دیئے ہیں! چراغاں، عود و گل، نذر و نیاز، مجاوروں اور سجادہ نشینوں کے مصارف کے لئے روپئے اور جاگیریں بادشاہوں کی وقف کی ہوئی ہیں اور ان "بدعات" کے ذمہ دار بزرگانِ دین نہیں، یہ بادشاہ اور اُمراء ہیں ــــــــــ مگر کسی بزرگ کے بارے میں یہ ثابت ہوجائے کہ اس نے اپنی زندگی میں اپنی قبر پر گنبد خود تیار کرایا تھا، اور اس کی یہ خواہش بھی کہ اُس کے مرجانے کے بعد اس کی قبر پر میلہ لگے چراغاں اور گانا بجانا ہو، چادریں چڑھیں اور لوگ وہاں مرادیں مانگنے کے لئے آئیں ــــــــــ تو اس مزاج و ذوق کے بزرگ سے آخرت میں سخت ترین مواخذہ ہوگا۔

قیامت کے دن بزرگانِ دین اپنے ان عقیدت مندوں سے جنھوں نے "احترام و عقیدت" کے نام پر "بدعات" کو فروغ دیا ہوگا سخت بیزاری کا اظہار فرمائیں گے مثلاً حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کریں گے کہ بارِ الٰہا میں نے یہ تعلیم نہیں دی تھی کہ تیرے میرے عقیدت مند! یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ کا تم ورد کیا کرنا، اور صلوٰۃ الغوثیہ پڑھ کر، سات قدم بغداد کی طرف چلا کرنا! میں اس قسم کے عقائد و اعمال سے اپنی برات و بیزاری کا اظہار کرتا ہوں!

بدعت!! آپ نے اپنے خط میں "بدعت" پر گفتگو کی ہے! اور اس سلسلہ میں عجیب و غریب باتیں بیان فرمائی ہیں، صحیح مسلم کی حدیث ہے:-

خیر الحدیث کتاب اللہ و خیر الھدیٰ ھدی محمدٍ شر الامور محدثاتھا و کل بدعۃٍ ضلالۃ

بہترین کلام خدا کی کتاب ہے، اور راستوں میں بہترین راستہ محمدؐ کا ہے اور بدترین باتیں (دین میں) نئی نکلی ہوئی باتیں ہیں اور (دین میں) ہر نئی نکلی ہوئی بات گمراہی ہے۔

اس حدیث میں "بدعت" کی کوئی تقسیم نہیں کی گئی کہ یہ سیئہ اور یہ حسنہ ہے! "بدعت" اپنی ذات سے ہر حال میں ضلالت

واقع ہوئی ہے، اس کو "ضلالت" قرار دینے والے پر درود و سلام ہوں! حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی قبر پر اللہ کے رحمت کے پھولوں کی بارش ہو، انھوں نے سو فیصدی ٹھیک بات کہی ہے کہ "بدعت میں حسن اور نور کہاں!

آپ نے مسلم کی جس حدیث کا حوالہ دیا ہے، اس میں "بدعت حسنہ" کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ "نیک کام کرنے سے" یا کسی مٹی ہوئی اور بھولی ہوئی "سنت" کا احیاء مراد ہے، یا پھر ایسا کام جس کی کتاب و سنت میں سند موجود ہو، یا وہ کام جو دین کے کسی اصول سے معارض نہ ہو۔ اس کام کے لئے سہولت پیدا کی گئی ہو، جیسے قرآن کریم پر اعراب لگانا، دین کی تعلیم کے لئے مدرسے بنانا۔۔ مسافروں کے ٹھیرنے کے لئے کارواں سراؤں کی تعمیر، احادیث رسول کو پرکھنے اور جانچنے کے لئے روایت و درایت اور اسناد کے اصول مقرر کرنا!

"بدعت" تو دین و ایمان کے لئے بہت بڑا وبال ہے، فاسق و فاجر کو توبہ کی توفیق نصیب ہو جاتی ہے مگر "بدعتی" اس سے محروم رہتا ہے کہ وہ "بدعت" کو کارِ خیر ہی سمجھتا رہتا ہے اس لئے توبہ کا کوئی داعیہ اس کے اندر پیدا نہیں ہوتا۔

آپ نے انتہائی غلط بات کہی ہے کہ پہلے جو چیزیں "مکروہ" تھیں وہ "بدعت حسنہ" کے اصول کے تحت بعد میں جا کر "پسندیدہ" سمجھی جانے لگیں! اس فکر و عقیدہ سے ہزار بار توبہ! اللہ اور رسول کے نزدیک جو شے ناپسندیدہ ہو ملے کوئی گمراہ و جاہل ہی "پسندیدگی" سے بدل جانے پر یقین لا سکتا ہے! آپ قبروں پر چراغ جلانے کو "دین کی عظمت" سے تعبیر کرتے ہیں اور "بدعت حسنہ" کی آڑ میں اس برائی کو جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "لعنت" سے تعبیر کیا ہے۔ جواز و استحباب کی سند دیتے رہیں! (استغفر اللہ)

تنگ کی نا مسلمانی سے فریاد!

"بدعت" تو اللہ اور رسول کے بارے میں یہ بدگمانی پیدا کرتی ہے کہ خیر و ثواب کی بہت سی باتیں اللہ اور رسول ﷺ سے بتانے سے رہ گئی تھیں، جن کا کئی صدی کے بعد بعض مشائخ و علماء پر انکشاف ہوا! (توبہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر سے زیادہ مقدس و محترم کس کی قبر ہو سکتی ہے، صحابہ کرام نے کیا اُس پر چادریں چڑھائیں، چراغ جلائے، سماع کی محفلیں منعقد کیں؟ خلفاء راشدین کی اولاد میں سے کسی نے اپنے بزرگ کے "کونڈے" کئے! فقہ کے چاروں اماموں اور اُن کے شاگردوں میں سے کسی کے یہاں بھی ان "بدعات" کا کوئی ذکر ملتا ہے، محدثینِ کرام کیا ان رسوم سے واقف تھے؟ حامیانِ کتاب و سنت کے لئے یہ منطق کس قدر اذیت دہ ہے کہ جب ان خرافات کے لئے کوئی دلیل یا سند نہ ملی تو اُن پر "بدعت حسنہ" کا لیبل لگا کر مباح و مستحب قرار دیدیا گیا! ع

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے!

ترمذی میں حضرت نافع رضی سے روایت ہے کہ حضرت ابن عبداللہ ابن عمر نے ایک شخص کے چھینکنے پر اُس کے منہ سے "الحمد للہ والسلام علیٰ رسول اللہ" سنا، تو اس پر کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اس طرح نہیں سکھایا ہے بلکہ یوں سکھایا ہے کہ ہر حال میں "الحمد للہ" کہا کریں ـــــ آپ نے دیکھا یہ ہے صحابہ کا دینی مزاج اور اتباعِ سنت کا ذوق و شوق کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیم کئے ہوئے جملہ (الحمد للہ) پر "والسلام علیٰ رسول اللہ" جیسے بے ضرر اور پاکیزہ جملہ کا اضافہ انہیں کھٹکا اور اس کو پسند نہیں فرمایا!

توحید کے معاملہ میں صحابہ کرام کا تو یہ ذوق رہا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اُس درخت کو کٹوا دیتے ہیں، جس کے نیچے حضور ﷺ نے صحابہ سے "بیعتِ رضوان" لی تھی، کیوں؟ صرف اس لئے کہ لوگ اس درخت کی زیارت کی غرض سے آنے لگے تھے، اور اندیشہ تھا یہ عقیدت کہیں بڑھ کر بدعت اور مشرکانہ رسوم تک نہ پہنچ جائے۔

مولانا صاحب! خط بہت طویل ہو گیا، آغاز میں اتنی تفصیل کا ارادہ نہ تھا مگر بات پھیلتی چلی گئی، اگر آپ نے تحقیقِ حق کے جذبہ سے اس خط کو پڑھا، تو آپ کا سینہ انشاء اللہ قبولِ حق کے لئے کھل جائیگا، اور اگر یہی تصور کار فرما رہا کہ اس خط کا لکھنے والا

(باقی مضمون صفحہ ۳۹ پر دیکھئے)

مولانا ابوالجلال ندوی

ترتیب نزول قرآن کا ایک باب

سورۂ سبا (مکیہ)

(۱) سورہ سبا کے نزول تک حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم صرف ان لوگوں کے درمیان تبلیغ پر مامور تھے جن کی بابت اس سورہ کے اندر فرمایا کہ "ہم نے ان کو کوئی کتاب نہیں دی ہے جس کو یہ لوگ پڑھتے ہوں اور نہ ان کے پاس تجھ سے پہلے ہم نے کوئی رسول بھیجا ہے" (آیت ۴۴) مگر اس صورت میں فرمایا کہ "نہیں بھیجا ہم نے تم کو لیکن سب کے سب لوگوں کی طرف بشیر و نذیر بنا کر" (آیت) اس سورہ میں ایک طرف آل داؤد کو مخاطب کیا گیا ہے (آیت ۱۳) دوسری طرف وہ لوگ مخاطب ہیں جن کے پاس کوئی الٰہی دین نہیں بھیجا۔ وہ جنوں کو پوجتے تھے۔ (آیت ۴۱) جنات کو ملائکہ خیال کرتے تھے (آیت ۴۰) ان کو خدائی میں شریک خیال کرتے تھے (آیت) ان کو اپنے شفعاء اور کرتے تھے (آیت ۲۳) قیامت کے قائل نہ تھے (آیت ۲۹) ان کا خیال تھا کہ انسان کا بہت مال اور کثیر الاولاد ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اللہ کو محبوب ہے۔ اللہ اس کو بھلائیاں پہنچانے میں بڑی تیز دستی سے کام لیتا ہے (مومنون ۵۵-۵۶) اس لئے کہا کرتے تھے کہ "ہم لوگ بہت مال اور بہت اولاد والے ہیں اور ہم عذاب پانے والے نہیں ہیں"۔ (آیت ۳۵) ہمارے پاس الساعۃ نہیں آئے گی (آیت ۳) ہم نہ تو اس قرآن پر ایمان لائیں گے اور نہ اس (تورات۔ زبور۔ انجیل) پر (ایمان دیں گے) جو اس کے آگے سے ہے (آیت ۳۱) اور جب تبلیغ حق کی غرض سے ان کو قرآن سنایا جاتا تھا تو کہنے لگتے تھے کہ "نہیں ہے یہ مگر ایک مرد جو چاہتا ہے کہ تم کو اس چیز سے باز رکھے جس کو تمہارے باپ دادا پوجتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ (ترک شرک کی تعلیم) نہیں ہے مگر ایک گھڑا ہوا جھوٹ اور جو لوگ کافر ہیں حق کی بابت جب وہ ان تک پہنچ جاتا (یعنی ان کے دل سے انکار کی کوئی معقول دلیل دیتے) تو کہنے لگتے کہ نہیں ہے مگر یہ کھلا جادو" (آیت ۴۳) یعنی اس نے ہم کو معقول دلائل کی بجائے اپنے جادو کے زور سے لاجواب کر دیا ہے ورنہ یہ ماننے کی بات نہیں ہے۔ یہ لوگ دن رات اس میں لگے رہتے تھے کہ لوگ اللہ کی ناقدری کریں اور اس کے لئے انداد تسلیم کرتے رہیں (آیت ۳۳) اور اس غرض کے لئے مسلمانوں اور اسلام کی طرف مائل اشخاص کے ساتھ معاجزہ کرتے تھے (آیت ۵، آیت ۳۸) معاجزہ کے معنی ہیں ایسی بحث جس کا مقصد نہ تو احقاق حق ہو! نہ ابطال باطل بلکہ مقصد صرف یہ ہو کہ فریق مخالف عاجز آ جائے اور اپنی بات کسی اور سے منوانے کی خواہش اور ہمت سے محروم ہو جائے اس لئے وہ جس سے ملتے تھے اس سے کہتے تھے کہ کیا ہم تم کو ایک انسان کی خبر دیں جو تم کو بتائے گا کہ جب تم ریزے ریزے ہو چکے ہو گے اس وقت تم ایک نیا جسم پا رہے ہو گے (بتاؤ) اس شخص نے اللہ پر افترا باندھا ہے یا اس میں باولا پن ہے" (آیت ۷، ۸) یعنی مُردوں کے جی اٹھنے کا تصور پیش کرنے والا یا تو محض مفتری ہو سکتا ہے یا اس میں باولا پن ہے۔ کوئی سچا آدمی جو صحیح الدماغ ہو اس تصور کو پیش نہیں کرتا۔ ان دلائل سے وہ لوگ اسلام کو مسترد کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

جن خیالات کی اس سورۃ میں تردید کی گئی ہے ان میں سے اکثر قریش کو بھی تسلیم تھے مگر قریش جنات کو ملائکہ قرار دے کر ان کی پرستش نہیں کرتے تھے یہ سورہ جنات کو ملائکہ سمجھ کر ان کی بندگی کرنے والوں اور آل داؤد کے ایک فریق کو مخاطب کرتی ہے۔ یہ سورہ کل چون (۵۴) آیتوں کا مجموعہ ہے اس سورہ کے ابتدائی نو آیتیں یعنی پہلا رکوع اور چوتھے رکوع کی پہلی آیت سے پانچویں کے خاتمہ

[..]پندرہ آیتیں لوگوں سے بغرض معاجزہ بحثیں کرنیوالوں کا جواب دیتی ہیں۔ آیت نمبر ۸ میں جو سوال کیا گیا تھا اس کے تین ہی [..]ممکن تھے۔

۱:۔ یہ شخص نہ باؤلا ہے اور نہ جھوٹا بلکہ سچی اور معقول بات بولتا ہے یہ جواب مسلمانوں اور اسلام کی جانب مائل افراد دہ ہو سکتا [..] اس سورہ کے ابتدائی مخاطب ایسے لوگ نہیں

۲:۔ یہ شخص اچھا خاصہ ہوشمند ہے اور جو بات کہتا ہے صریحاً جھوٹ ہے اس لئے اسے مفتری ہی کہا جا سکتا ہے۔ یہ جواب ان ہی [..]ں کرنے والوں کے بعض افراد دے سکتے تھے جن کو ۱۱ تا ۱۹ و ۲۲ تا ۴۵ آیتوں میں دیا گیا (۳) سورہ انعام کی آیت ۳۳ میں اس زمانہ کے مکذبین آخرت کی بابت خدا نے فرمایا کہ:۔

"وہ تجھے جھوٹا نہیں کہتے مگر یہ ظالم لوگ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں تو آپ کو سچا مگر آپ کی بات کو جھوٹی باور کرنے والے [..]ت ۸ کے سوال کا جواب صرف یہ دے سکتے تھے کہ یہ شخص بذات خود سچا ہے مگر جو بات کہتا ہے وہ عقل سے بعید ہے اس لئے اسے باؤلا [..]خیال کرنا پڑتا ہے پانچواں رکوع ان لوگوں کی فہمائش کرتا ہے یہ رکوع نو آیتوں کا مجموعہ ہے۔

سورہ کی ۵۴ آیتوں میں سے ۳۳ آیتوں کے مخاطب وہ لوگ ہیں جن کے پاس کوئی الہامی کتاب، نہ تھی اور نہ آپ سے پہلے انکے [..]میان کوئی نبی مبعوث ہوا تھا۔ ۲۱ آیتوں کے مخاطب آل داؤد ہیں جو کہ بنی اسرائیل کی ایک شاخ ہیں۔ آل داؤد کے ایک حصہ کا یہ [..]ل تھا کہ حضرت سلیمان ؑ نے جن لوگوں سے محرابیں، مورتیں، لگنیں اور دیگیں بنوائی تھیں وہ جنات تھے اور علمائے غیب سے تھے [..]ت ۱۴ میں خدا نے انکے اس خیال کی تردید کی۔ چونکہ جنات پرستوں اور جنات کو علمائے غیب جاننے والوں میں ایک ہم خیالی پائی [..]ی ہے اس لئے جنات پرستوں کے ساتھ آل داؤد کو مخاطب کیا گیا ہے۔ سورہ کے ابتدائی مخاطبوں کو سمجھنے کے بعد اب مضامین سورہ پہ [..]لیجیے۔

۳:۔ سبا ۱ تا ۹ میں خدا نے سب سے پہلے اپنی بابت حکیم و خبیر اور رحیم و غفور ہونا ثابت کیا پھر جو لوگ یہ کہتے تھے کہ وہ [..]ی نہیں آئے گی ان کو جواب دیا گیا کہ وہ "ساعۃ ضرور آئے گی تاکہ جو لوگ ایمان لا کر اچھے کام کرتے ہیں ان پر انعام و اکرام فرمایا جائے [..] اللہ کی آیتوں میں معاجزہ کی کوشش کرنیوالوں کو سزا دی جائے اس کے بعد بتایا کہ جن کو علم دیا گیا ہے ان کی رائے میں یہی تعلیم برحق [..]من جانب اللہ ہے جو قرآن مجید میں دی جا رہی ہے اور حیات بعد ممات کی تعلیم دینے والے کو جو مفتری یا باؤلا سمجھتے ہیں وہ عذاب میں اور [..]لے درجے کی گمراہی میں ہیں"

۴:۔ یہ بات سمجھنا آسان تھا کہ "منکرین قیامت پرلے درجے کی گمراہی میں ہیں" لیکن یہ بات کہ "جو لوگ آخرت کے [..]ر ہیں وہ عذاب میں مبتلا ہیں" آسانی سے سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی اس لئے ان آیتوں کے بعد حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کا [..]ذکر کے آل داؤد کو مخاطب فرمایا اور کہا کہ:۔

اِعْمَلُوْا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا وَقَلِيْلٌ مِّنْ [..]بَادِيَ الشَّكُوْرُ (آیت ۱۳) اے آل داؤد شکر گزاری کو عمل میں لاؤ اور شکر ادا کرنیوالے میرے بندوں میں تھوڑے ہی رہ گئے ہیں۔

شکر گزاری کے ترک کا مآل سمجھانے کے لئے سبا کا ذکر کیا جن کو حکم دیا گیا تھا کہ "اللہ کی دی ہوئی روزی سے کھاؤ اور اس کا [..]ر ادا کرتے رہو" (آیت ۱۵) لیکن انہوں نے اس پر عمل نہ کیا اس لئے سیل عرم کی آفت بھیجی گئی "یہ مخفی سزا انکے کفران نعمت کی [..]ہم نے ان کو دی تھی" (آیت ۱۷) پھر کچھ عرصہ بعد ایسا ہوا کہ "ہم نے ان کو باتیں ہی باتیں بنا دیا اور ان کو اچھی طرح پھاڑ کے پھاڑے

کرکے بکھیر دیا۔" (آیت ۱۹) لیکن ایک فریق کے ماسوا تمام لوگوں پر ابلیس نے اپنا تسلط جما لیا حالانکہ اسے ان پر غالب آنے کی تاب نہیں دی گئی تھی لیکن ہم چاہتے تھے کہ جو آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے اس سے الگ دیکھیں جس کو اس میں شک ہے یہ تذکرہ بھی ثابت کرنے کے لئے کیا کہ جو لوگ آخرت کے منکر ہیں وہ نہ صرف پرلے سرے کی گمراہی میں ہیں بلکہ عذاب میں مبتلا ہیں۔ جنوبی عرب کی قومیں سب کی سب عرق کے جو لخم شام کے سو غسان مکہ مکرمہ کے اور مدینہ کے اوس و خزرج یہ سب کے سب عمرو بن عامر مزیقیا کی نسل سے تھے جو سبا کی بربادی کے وقت اس قوم کا لیڈر تھا۔ قوم کا بڑا حصہ عرب کے علاوہ دیگر ممالک میں جا بسا تھا۔ وہاں ممالک کی اقوام میں گم ہو گیا تھا ان آیتوں کے نزول کے وقت جنوبی عرب پر اور عراق پر خسروان ایران کی حکومت تھی شام پر قیصروں کی حکومت تھی قدیم شان و شوکت سے قوم محروم ہو کر افسانہ بن گئی تھی کچھ قبائل جو عرب میں تھے وہ فقر و فاقہ اور دنیا کے مقابلہ میں ذلیل و حقیر زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ تھا وہ عذاب جس کے اندر آخرت پر ایمان نہ لانے والے مبتلا تھے آیت ۸ میں اسی عذاب کا ذکر ہے۔ آیت ۹ میں منکرین آخرت کو ایک اور عذاب کی دھمکی دی لیکن تہدید کے پیرایہ بیان کی بجائے تفہیم کا انداز اختیار کیا۔ فرمایا:۔

"کیا ان لوگوں نے اس کی طرف نظر نہیں کی جو آسمان سے اور زمین سے ان کے
آگے اور پیچھے ہے۔ اگر ہم چاہیں گے تو ان کو زمین میں دھنسا دیں گے
یا ان پر آسمان سے ٹکڑے گرا دیں گے۔ بیشک اس میں توجہ کرنے
والے ہر بندہ کے لئے ایک نشان ہے۔" (آیت ۹)

اس آیت کا مقابلہ ملک ۱۶ نحل ۴۵ اور اسرائیل ۶۸، ۶۹ سے کرو تو معلوم ہوگا کہ سورۂ سبا ان سورتوں سے قدیم ہے۔ کیونکہ وہ آیتیں اسی آیت پر اعتراضوں کے جواب میں اتریں۔

۵۔ آیت ۲۲ و ۲۳ میں ان لوگوں کی تردید کی جو اپنے دیوتاؤں کے بارے میں کہتے تھے کہ "یہ ہیں ہماری سفارشیں کرنے والے اللہ کے پاس۔" (یونس) ہم ان کی نہیں بندگی کرتے لیکن اس لئے کہ وہ ہم کو اللہ کے قریب کر دیں بہت قریب۔" (زمر: ۳) ان آیتوں میں بتایا کہ تمہارے دیوتا کسی شے پر کچھ اختیار نہیں رکھتے۔ اللہ کے پاس شفاعت اسی کی کام آئے گی جس کی شفاعت کرنے کی وہ اجازت دے گا۔

۶۔ منکرین قیامت جس شفاعت کے قائل تھے اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ بروز قیامت ان کے دیوتا ان کے گناہ بخشوا دیں گے بلکہ مطلب یہ تھا کہ ہمارے دیوتا خدا سے جب سفارش کرتے ہیں تب ان کو اجازت ملتی ہے اور وہ ہماری روزی کا انتظام کرتے ہیں۔ اس لئے آیت ۲۴ میں خدا نے فرمایا کہ:

"پوچھ (ان سے کہ) آسمانوں سے (پانی برسا کر) اور زمین سے (خورش
اگا کر) تم کو روزی کون دیتا ہے۔ (پھر خود ہی جواب دے اور ان سے
بول کہ اللہ ہی روزی دیتا ہے) اور یقیناً ہم یا تم ہدایت پر یا گمراہی
میں ہیں۔"

کہنا یہ ہے کہ ہم ہدایت پر ہیں اور تم گمراہی میں ہو لیکن (دعوت بالحکمت) کے اصول پر غور کرو۔ پیغمبر کو حکم دیا گیا ہے اور ان سے خطاب کرنے کو فرمایا گیا ہے جن کو خود خدا نے "پرلے سرے کی گمراہی میں ہیں" بتایا ہے لیکن پیغمبر کو اپنی زبان سے یہ کہنے کو نہیں فرمایا:

ہم ہدایت پر ہیں اور تم گمراہی میں ہو" بلکہ یوں فرمانے کی (ہم یا تم دو میں سے ایک ہدایت پر یا گمراہی میں ہے) ہدایت دی۔ تاکہ مخاطب بھی اسی انداز میں سوچے کہ ہم دو میں سے ایک ضرور غلطی پر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میری غلطی ہو اس لئے کہ دوسروں کو گمراہ بتانے سے پہلے اپنی بابت فیصلہ کرنا چاہیئے کہ میں حق پر ہوں یا نہیں۔

۷۔ حضرت رسول خدا ﷺ نے جب یہ فرمایا ہوگا "ہم یا تم ہدایت پر یا گمراہی میں ہیں" تو قدرتاً یہ سوال کیا جا سکتا تھا اور شاید کیا بھی گیا کہ فرض کرو ہم ہی گمراہی پر ہیں تو پھر تم کو کیا ڈر ہے۔ کیا ہمارے گناہ تم پر لادے جائیں گے اس ممکن یا واقعی سوال کا جواب آیت ۲۵ دیتی ہے۔ کسی کے عمل کا جوابدہ کوئی اور نہ ہوگا۔

۸۔ آیت ۲۴ کی بنا پر یہ سوال بھی پیدا ہو سکتا تھا کہ اور شاید اٹھایا گیا کہ ہم حق پر ہیں یا تم اس کا فیصلہ کون کرے۔ اس کا جواب آیت ۲۶ دیتی ہے کہ یہ فیصلہ خدا کرے گا۔

۹۔ آیت ۲۶ پر یہ سوال بھی کیا جا سکتا تھا کہ کیا یہ فیصلہ وہ فرشتے نہیں کر سکتے جن کو ہم پوجتے ہیں اس کے جواب میں خدا نے فرمایا "کہہ کر اچھا مجھے دکھاؤ جن کو شرکاء قرار دے کر تم نے اس کے ساتھ ملحق کیا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ وہ ہے جو توانا ہے دانا ہے" (آیت ۲۷) سورہ کے مخاطب جنات کو فرشتے سمجھ کر پوجنے والے لوگ تھے اس لئے اس آیت سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ مطلب یہ ہے کہ تمہارے دیوتا کوئی وجود نہیں رکھتے۔ یہ لوگ مانتے تھے کہ ان کے دیوتا کبھی کبھی اپنا جلوہ بھی دکھایا کرتے ہیں اور انہیں دیوتاؤں کی ہدایت کے مطابق ہم ان کو پوجتے ہیں۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ اچھا ہے دیوتاؤں کا دیدار کرا دو تاکہ وہ فیصلہ کر دیں کہ کون حق پر ہے مگر تم ایسا نہیں کر سکتے۔

۱۰۔ اس سورہ کے مخاطب آلِ داؤد بھی ہیں۔ اس سورہ کے نزول سے پہلے تک آپ صرف غیر اہل کتاب کی ہدایت پر مامور تھے۔ اس لئے یہ سوال بھی ابھرا کہ آلِ داؤد کے قضیہ جھگڑا چھیڑنے کی وجہ کیا ہے۔ آیت ۲۸ میں اس سوال کا جواب دیا گیا آپ کی بعثت کا مقصد سارے لوگوں کی اصلاح ہے۔ یہ تو مصلحتِ تبلیغ تھی کہ پہلے ان کو مخاطب کیا جائے جن کے پاس کوئی ایسی کتاب نہیں جو ان کو اللہ کی راہ پر لگا سکے۔

۱۱۔ آیت نمبر ۲۶ کی بنا پر کچھ لوگوں نے کہا "یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟ اگر تم لوگ سچوں میں سے ہو" (آیت ۲۹) اس کے جواب میں آیت نمبر ۳۰ نازل ہوئی۔

۱۲۔ آیت نمبر ۳۱ تا ۳۴ میں قرآن اور سابق کتابوں پر ایمان لانے سے انکار کرنیوالوں اور شب و روز لوگوں کو دین اشراک پر قائم رکھنے کی کوشش کرنیوالوں کو اس عذاب کی خبر دی جس کے وہ حقدار تھے اور آنحضرت ﷺ کو تسکین دی کہ آپ سے پہلے بھی مترفین اپنے رسولوں سے یہی کہتے رہے ہیں "تم کو جس (تعلیم) کے ساتھ بھیجا گیا ہے ہم اس کے منکر ہیں"۔

۱۳۔ آیت ۳۵ تا ۳۸ میں کثرت مال و کثرت اولاد پر ناز کرنیوالوں کو بتایا کہ یہ چیز تقرب الی اللہ کی دلیل نہیں۔

۱۴۔ مشرکین اپنے دیوتاؤں کو روزی رسانی پر موکل مانتے تھے نمبر ۳۹ تا ۴۲ میں خدا نے بتایا کہ جن کو تم ملائکہ خیال کرتے ہو وہ ملائکہ نہیں بلکہ جن ہیں کسی کو زیادہ اور کسی کو کم روزی دینا اور جو کچھ تم خرچ کر ڈالتے ہو اس کی بجائے نئی روزی دینا خدا ہی کا کام ہے۔ روزی رسانی میں کوئی اس کا شریک نہیں۔

۱۵۔ نمبر ۴۳ تا ۴۵ میں حق کو سحر مبین بتانے والوں کو سابق مکذبین کے انجام یاد دلائے

۱۶: انسان خواہ کتنا ہی ہوشمند ہو مجمعوں میں وہاں کی گفتگو سے متاثر ہو جاتا ہے، چرب زبان مجمع ایک مہمل

بات بولتا ہے۔ اس کے سامعین کی توجہ اس بات کی حماقت کی طرف مبذول ہو۔ وہ کچھ اور کہنے لگتا ہے اس طرح پورا مجمع عام مہملات کو گوارا کرتا جاتا ہے اور اسے خوش بیان فریب کار کی غلطیوں کا احساس نہیں ہوتا۔ لیکن مجمع سے اٹھ آنے کے بعد وہ تنہائی میں یا دو ایک شخص دوستوں کے ساتھ مل کر جب سنی ہوئی تقریر کا جائزہ لیتا ہے تو اکثر اوقات اپنی عقل پر لاحول پڑھنے لگتا ہے کہ کیسی بے سرو پا باتوں نے مجھے مسحور کر دیا تھا اس لئے خدا نے ان لوگوں کو جواب دینے کے بعد جو گمراہ کرتے تھے ان کے سامعین کی طرف رخ کیا اور فرمایا:

"کہدو کہ میں تم کو ایک واحد بات کی نصیحت کرتا ہوں خدا کے لئے دو دو
اور ایک ایک کر کے اٹھو پھر غور کرو (جان لوگے) کہ تمہارے صاحب
میں پاگل پن نہیں ہے۔ وہ تو کچھ نہیں ہے مگر ایک خبر کرنیوالا ایک
عذاب شدید کے آگے (آیت ۴۶)

۱۷۔ سب سے پہلے خدا نے سورہ شوریٰ میں فرمایا تھا کہ: "کہدے کہ میں تم سے اس کام پر (المودۃ فی القربیٰ) کے علاوہ کوئی اجر نہیں مانگتا"۔ (القربیٰ) کے دو معنی ہیں (قرابت مندی) اور (تقرب الی اللہ) اس لئے اس کی تین تفسیریں کی جاسکتی ہیں۔

۱۔ میرا اجر بس یہ ہے کہ تم اللہ سے مقرب ہونا پسند کر لو۔
۲۔ میرا اجر یہ ہے کہ میرے درمیان اور تمہارے درمیان جو قرابت ہے اس کا لحاظ کرو۔
۳۔ میرا اجر یہ ہے کہ میرے قرابت مندوں کا لحاظ کرو۔

چونکہ اس جملے کے بعد ہی یہ جملہ ہے کہ:

"اور جو شخص کوئی (نیکی) کمائیگا اس کے لئے اس میں ہم اور خوبی کا اضافہ کرینگے یقیناً اللہ غفور ہے شکور ہے"۔ اس سے ظاہر ہے المودۃ فی القربیٰ سے مراد نیکی کما کر مقرب ہونے کی خواہش ہے مگر بعض روایات کی بنا پر اکثر سنی علماء دوسری تفسیر کرتے ہیں یہ روایتیں صحابہ کرام ہی کے اس وقت کا خیال پیش کرتی ہیں جو انھوں نے بحالت کفر اس آیت کو سن کر اپنے ذہنوں میں قائم کیا تھا۔ تیسری تفسیر شیعہ مفسرین کی ہے ان کا خیال بھی بعض صحابہ کے اس خیال کا چربہ ہے جو انھوں نے ایام کفر و ارتیاب میں اس آیت کو سن کر قائم کیا تھا اس تیسری تفسیر پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اگر آیت کا مطلب یہ ہے تو جن پیغمبروں نے کہا تھا کہ "میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا اس کام کا، نہیں ہے میرا اجر مگر اللہ پر"۔ (شعرا ۱۰۹، ۱۲۷، ۱۴۵، ۱۶۴، ۱۸۰) انکی بے غرضی کا مرتبہ (نعوذ باللہ) حضرت رسول خدا کی بے غرضی سے بلند تھا لیکن سورۂ سبا جن لوگوں کے جواب میں اتری انکے نزدیک آیت کا مطلب وہی تھا جو شیعی علماء بتاتے ہیں اس لئے غالباً آپ سے کہا گیا کہ نوح، ہود، صالح، لوط اور شعیب (علیہ السلام) تو اس کام کا اپنے معاصرین سے کوئی اجر نہیں مانگتے تھے تم کیسے پیغمبر ہو کہ (المودۃ فی القربیٰ) کی صورت میں اس کام کا اجر مانگتے ہو اس سوال کے جواب میں خدا نے فرمایا۔

جواب دے کہ میں نے (شوریٰ ۲۳ کے مطابق) تم سے جو کچھ اجر
مانگا ہے وہ میرے لئے یا میرے اقربا کے لئے نہیں بلکہ) تمہارے
ہی لئے ہے۔ نہیں ہے میرا اجر مگر اللہ پر وہ ہر چیز پر نگاہ رکھنے
والا ہے۔ (آیت ۴۷)

۱۸۔ آیت نمبر ۴۹ درحقیقت ان لوگوں کی فہمائش کے لئے اتری جن لوگوں نے گمراہ کن مرطوں کی یہ بات مان لی تھی کہ

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات دلوں میں اس لئے اتر جاتی ہے کہ یہ شخص ایک جادوگر ہے۔ اس کی بات صریح جادو ہے۔ خدا نے ان کو سمجھانے کے لئے فرمایا،

"کہہ دے کہ واقعہ یہ ہے کہ میرا رب حق کو باطل پر دے مارتا ہے ۔۔۔ وہ
غیبوں کا خوب جاننے والا ہے۔"

۱۵۔ حضور صلعم جو تعلیم دیتے تھے وہ صحف انبیاء کے مطابق تھی سورۂ سبا جن لوگوں کے جواب میں ہے وہ اس حقیقت کو جانتے تھے اس لئے کہتے تھے کہ ہم نہ اس قرآن پر ایمان لائیں گے نہ اس پر جو اس کے آگے سے ہے اس لئے مشرکین کہتے تھے کہ یہ شخص سابق معلمین باطل کی باتیں دھرا رہا ہے، اس کا جواب یہ دیا کہ :۔

"کہہ دے کہ (تمہارے پاس) حق آگیا۔ وہ نہ تو باطل کو پہلے پہل پیش کرتا
ہے اور نہ (قدیم باطل) کو دوبارہ پیش کرتا ہے۔ کہہ دے کہ اگر میں
گمراہ ہوگیا ہوں تو اپنے نفس (کے بل) پر گمراہ ہوا ہوں اور اگر میں
ہدایت پر ہوں تو اس چیز کی بدولت ہدایت پر ہوں جس کی وحی
میرا رب میری طرف فرما رہا ہے، وہ سننے والا ہے قریب ہے۔"

۲۔ سورہ کے آخری آیتوں کا سبب نزول سمجھانے کے لئے ان آیتوں کی تفسیر ضروری ہے اس لئے ہم ان آیتوں کو نقل کرکے ایک ایک لفظ کی تشریح کریں گے پھر ترجمہ پھر وہ بات معلوم کرنے کی کوشش کریں گے جس کے جواب میں یہ آیتیں اتریں۔

۱۔ وَلَوْ تَرٰىٓ اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَاُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ۝ وَّقَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖ

۲۔ وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ ۝ وَّقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ وَيَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ ۝

۳۔ وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ۔

۴۔ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ۝

آیت ۵۱ پر نشان "لا" ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ قافیہ تو پورا ہوگیا مگر بات پوری نہ ہوئی اس لئے وقف نہیں کرنا چاہئے۔ آیت ۵۲ کے پہلے فقرہ پر "ج" ہے جس کے معنی ہیں کہ بات اس حد تک پوری ہوگئی کہ یہاں وقف جائز ہے اس لئے ہم نے "قد لو" سے "من" کر بد تک کو مابعد سے الگ کر دیا۔ آیت ۵۳ پر (صلے) کا نشان ہے جو کہ الوصل اولیٰ کا مخفف ہے اس کا مفاد یہ ہے کہ بات تو پوری ہوگئی مگر وقف سے زیادہ بہتر اسے ملا کر پڑھنا ہے کیوں کہ اس سے مضمون واضح تر ہو جاتا ہے۔ آیت ۵۳ کے فقرہ اولیٰ پر وقف مطلق کا نشان ہے جو اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ آگے نئی بات کہی جاتی ہے۔ یہ چار آیتیں چار باتیں بیان کرتی ہیں۔

آیت ۵۲ میں وقد اور ویقذفون کا واو ۔۔۔ واو حالیہ ہے لیکن آیت ۵۴ وحیل کا واو ۔۔۔ واو عطف ہے اور حیل معطوف ہے اخذوا پر۔ اب الفاظ پر غور کیجئے۔

۱۔ وفزعوا۔ صورت لفظ صیغہ ماضی کی مگر معنی کے لحاظ سے مستقبل۔ فزع کا مفہوم کسی غیر متوقع حالت کے اچانک احساس سے خوفزدہ ہو جانا ہے۔ نمل ۸۹ میں ہے کہ ہم من فزع یومئذ آمنون۔ انبیاء ۱۰۳ میں لا یحزنہم الفزع الاکبر میں فزع سے مراد وہ خوف ہے جو قیامت کے دن نیک اور بد ہر ایک پر طاری ہوگا۔ اس لئے بعض کے نزدیک اس آیت میں

بھی قیامت کے فزع کا ذکر ہے۔ لیکن آیت میں کوئی اشارہ اس بات کی طرف نہیں کہ یہاں وہ خوف مراد نہیں ہے جو دنیاوی عذاب کے احساس سے طاری ہو جاتا ہے اور اس بات کی طرف بھی کوئی اشارہ نہیں ہے کہ اس جگہ اخروی فزع مراد نہیں ہے۔ ہم آیت کے فزع کو دنیا اور آخرت دونوں کے لئے عام سمجھتے ہیں۔

۲۔ فوت۔ مصدر۔ فات کا۔ اردو میں تو فوت ہونا وفات پانے کے مرادف لیکن قرآن میں ما فاتکم مقابل ہے ما اصابکم کا (آل عمران ۱۵۳) اور ما اٰتٰکم کا (حدید ۲۳) ان دونوں آیتوں میں ما فاتکم سے مراد ہے "وہ چیز جو تمہارے ہاتھ نہ آئی"۔ آیت زیر بحث میں فوت کے مین بعد اخذ وارد ہے اس لئے فوت کا مطلب گرفت کے باہر ہونا ہی ہو سکتا ہے بعض مترجموں نے اس کا ترجمہ بھاگنا کیا ہے اسے ترجمہ کی بجائے صحیح تفہیم سمجھنا چاہیئے۔

۳ مکان قریب] جہاں تک مکان، بعید اور قریب کے لغوی مفہوم کا تعلق ہے ان الفاظ کے عربی میں بھی وہی معنے

۴ مکان بعید] ہیں جن کے لئے یہ اردو میں مستعمل ہیں لیکن بعض مفسرین کی تفسیر و ں نے آیت کو واضح کرنے کی بجائے دو مشکل بنا دیا ہے یہ بعض مفسرین معمولی لوگ نہیں وہ نہ صرف ایمان وتقوی کے چیتے جاگتے پیکر تھے بلکہ دینیہ کے علم اور فہم سے بھی خدا نے ان کو ایسا نوازا تھا جیسی نوازش کم لوگوں پر کی ہے۔ ایسے مقدسین اور قابل عظمت بزرگوں کی تفسیر سے اختلاف رکھنے والے کو عوام سے تو نہیں لیکن خدا سے ڈرتے ڈرتے اختلاف ظاہر کرنا چاہیئے، کیوں کہ ان بزرگوں کی خطا ہمارے صواب سے بہتر اجر کی حقدار ہوتی ہے، ان سے خطا بھی ہوئی تو اس میں انکی نفسانی خواہش کو دخل نہ تھا۔ ہمارا صواب ممکن ہے "خطائے بزرگان گرفتن" سے زیادہ بکروہ حقیقت رکھتا ہو۔ لیکن جس تفسیر کو میں خود حق سمجھتا ہوں اسے حق، اور جسے میں خود باطل سمجھتا ہوں اسے باطل بتانا بھی ضروری ہے۔ ان آیتوں میں دو بار مکان بعید آیا۔ دونوں آیتوں پر حاشیے دے کر ایک مترجم نے لکھا ہے :۔

یعنی ایمان لانے کی جگہ بوجہ دار العمل ہونے کے دنیا تھی جو بڑی دور ہو گئی
اب آخرت میں جو دار الجزاء ہے ایمان مقبول نہ ہو گا (حاشیہ ۱) دور
کا مطلب کہ اس کی تحقیق سے دور رہتے تھے یعنی دنیا میں تو کفر کرتے رہے اب
ایمان سوجھا ہے اور اس کے مقبول ہونے کی آرزو ہے (حاشیہ ۲)

مکان قریب اور مکان بعید کی یہ تفسیر اگر درست ہے تو مطلب ان الفاظ کو حذف کرنے کے بعد بھی پورا ہو جاتا ہے۔ اور غیر ضروری الفاظ کا عبارت میں وجود کوئی اچھا ادیب پسند نہیں کرتا۔ ایسے غیر ضروری لفظ کو ائمہ علم بیان کی اصطلاح میں حشو کہا جاتا ہے۔ معاملہ قرآن کا نہ ہوتا تو میں وہ لفظ استعمال کر سکتا تھا۔ مگر میں قرآن کی تفسیر میں صرف اس غیر ادبیت کو نقل کر سکتا ہوں جو خود قرآن میں منقول ہے یا قرآن نے اس کی تردید کی ہے۔ مکان بعید اور مکان قریب کے ٹھیک مفہوم کو اخذ و۔ اتناوش اور قذف کے ساتھ سمجھنا چاہیئے۔

اخذ کا مطلب ہے دھر لینا۔ تناوش کا مطلب ہے کسی چیز کو حاصل کرنے کے لئے ہاتھ لپکانا۔ آیت ۵۲ میں عین گرفت کے وقت ایمان لانے کا اعلان کو خدا نے "کسی چیز کے لینے کے لئے مکان بعید سے ہاتھ لپکانا" قرار دیا ہے اور اردو بول چال میں "ہاتھ بڑھا کر چاند کو پکڑنا" جو مطلب دیتا ہے وہی مطلب "مکان بعید سے تناوش" کا ہے یعنی ان کا ایمان اس وقت ایسی ہی بے سود کوشش ہو گی جیسی کوشش اس ننھے بچے کی ہوتی ہے جو چندا ماموں کو پکڑنے کو ہاتھ لپکاتا ہے۔

۵۔ قذف کا لغوی مفہوم کسی چیز کو کسی چیز پر مارنا ہے۔ چنانچہ سورۃ انبیاء میں ہے کہ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ

یدلُ مَعۡمَعُہٗ (انبیاء ۱۸) ہم حق کو باطل پر مارتے ہیں تو وہ اس کا بھیجا پھوڑ دیتا ہے۔ اس سورہ کی ۴۸ ویں آیت میں جس طرح
یقذف بالحق فرما کر یقذف بالحق علے الباطل مراد لیا ہے اسی طرح چونکہ الغیب مقابل ہے الشہادۃ کا اس لئے آیت ۵۳
ذفون بالغیب فرما کر یقذفون بالغیب علے الشہادہ مراد لیا ہے۔

۶ مایشتھون : وہ غرض جس کے لئے آمنا بہ بولیں گے۔

۷. اشیاعھم : سے وہی لوگ مراد ہیں جن کو قرآن میں اشیاعکم کہا ہے مراد قدیم ہم مذہب لوگ۔

اب آیت کا ترجمہ مع تفسیر پڑھیے :-

"اور کاش (اے محمدؐ) تو دیکھ سکتا کہ جب وہ سہم جائیں گے پھر نہ ہوگا گرفت سے بچنا
اور ان کو مکان قریب سے دھر لیا جائیگا تو کہنے لگیں گے کہ ہم اس پر ایمان لائے
اور کہاں سے (مفید) ہوگا ان کے لئے ہاتھ لپکانا یا مکانِ بعید سے حالانکہ (اس
سے) پہلے وہ کفر کر چکے ہونگے اس حال میں کہ وہ مکان بعید سے (جانی بوجھی بات
پر) انجانی بات دے مارتے تھے اور انکے درمیان اور اس چیز کے درمیان (اتنا
بول کر) جسے وہ چاہتے ہونگے (دیوار) حائل کردی جائے گی جیسے کہ ان کے
پرانے ہم مذہبوں کے ساتھ کیا گیا۔ یہ لوگ شک فریب میں تھے"۔

کے پرانے ہم مذہبوں نے عین عذاب آنے پر ایمان کا اعلان کیا جو مفید نہ ہوا۔ مجھ سے بہتر علم والوں اور تقویٰ والوں نے
آیتوں کو قیامت والے فزع اکبر سے اس لئے متعلق مانا ہے کہ جس فزع کا اس میں ذکر ہے دنیا فزع آج کی تاریخ تک پیش
آیا لیکن عبارت اس انداز کی ہے کہ جن لوگوں کو جواب میں اتری انھوں نے اسے ویسے ہی عذاب کی دھمکی بھی ہوگی جیسا
ب سابق قوموں پر آیا۔

قی مضمون صفحہ ۳۱ سے آگے :-

ی اور بے دین ہو گیا ہے، اور ہم اپنے مسلک سے بال برابر ہٹنے والے نہیں ہیں، تو میرے یہ کلمات حق آپ کی برہمی میں اور اضافہ
یں گے، آپ مجھے خوب صلواتیں سنائیں گے اور گاؤں والوں میں میرے عقائد کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیاں پھیلائیں گے
ں تک کہ اُن کی نگاہ میں حق مشتبہ اور مستورمحض ہو جائے اور وہ فاسد عقائد اور بدعات کے چکر سے کسی طرح نکل ہی نہ سکیں۔

والسلام علےٰ من اتبع الھدیٰ

آپ کی دنیا کی عافیت، دین کی سلامتی اور آخرت کی فلاح کا چاہنے والا :-

منظور حسین (ماہر القادری)

اسعد ملتانی

شہرِ نبیؐ

از مدینہ نزدم رحمتِ عام است اینجا — ہمہ تسکینِ دل و امن و سلام است اینجا
من چہ گویم کہ چہ حال و چہ مقام است اینجا — تربیت درخورِ ہر پختہ و خام است اینجا
ہر قدم وقفِ نماز است بہ راہِ طیبہ — جان و دل مقتدی و شوق امام است اینجا
ہر قدم پیش تراز حدِ نظر می افتد — ہر نفس بیش تراز عمرِ دوام است اینجا
مثلِ شب وجہِ سکوں صبح چہ صبحے باشد — رشکِ انوارِ سحر شام چہ شام است اینجا
اثرِ کیفِ دوام است بہ ہر موجِ ہوا — گوئی از کیفِ دوام است ہوا ست اینجا
مگر از معجزہ شیریں شدہ خرماؔ و عنب — ظاہر و باطن ما شہد بہ کام است اینجا
قبلتین، و اُحد و خندق و آثارِ قبا — یادِ ایامِ نبیؐ گام بہ گام است اینجا
ہر زماں محوِ تلاوت صفِ اربابِ صفا — چہ عجب صفۂ اصحابِ کرام است اینجا
مہبطِ وحیِ الٰہی چہ منارے است بلند — گوئی از عرش ہم امروز پیام است اینجا
اللہ اللہ دو رکعت بہ ریاضُ الجنۃ — روضۂ خلد بریں راہِ دو گام است اینجا
ایستادم بہ ادب پیشِ ضریحِ اقدس — چہ قیام و چہ سلام و چہ کلام است اینجا
ہیچ آواز نیاید، بجز ایں نغمہ بہ گوش — کہ درود است و صلوٰۃ است و سلام است اینجا
سربسر سلسلۂ راز و نیاز است سکوت — ہر زباں بر لبِ خاموش کلام است اینجا
ہم ز تقویٰ ادبِ عشق فزوں تر باشد — آں کہ بر شیخ حلال است حرام است اینجا
رفتم از مکہ و منزل بہ مدینہ کردم — آنچہ آنجا بہ نظر بود بہ جام است اینجا
کششِ دامنِ لطف است کہ بے دانہ و دام — دلِ آوارہ و وحشت زدہ رام است اینجا
کہ ازاں خیرہ شود چشم کہ نور است لطیف — چہ بود تیرہ شبی، ماہِ تمام است اینجا
کعبہ را قبلۂ مقصود جز ایں شہر نہ بود — زائر راحت کدۂ فخرا نام است اینجا
کیست آں شوم کہ محرومِ عنایت ماند — مژدۂ لطف و کرم تام بہ نام است اینجا
"قسمت[1] بادہ باندازۂ جامے" چہ بود — کہ بہ مقدارِ طلب وسعتِ جام است اینجا
حاصلِ زیست بود حاضریِ شہرِ نبیؐ — زندگی عینِ مراد و ہمہ کام است اینجا
دل بہ ہر گردشِ ایام سکوں می یابد — آسماں[2] از ادب آہستہ خرام است اینجا

شادم از بخت کہ اینجا برسانید مرا
اے اسعد بے اثرِ فیض کدام است اینجا

لہ غزالی لہ اقبال

شعرِ و نغمہ

عروج زیدی

ماورائے لفظ و معنی ہے بیانِ آرزو
صرف دل کی دھڑکنیں ہیں ترجمانِ آرزو
حسن کو ہونا پڑے گا قدر دانِ آرزو
عشق اٹھائے تو قدم شایانِ شانِ آرزو
آپ ہیں ہاں آپ ہیں روحِ روانِ آرزو
آپ ایمانِ تمنا، آپ جانِ آرزو
ظرفِ دل کی داد دے اک دن تو جانِ آرزو!
بند اس کوزے میں ہے بحرِ روانِ آرزو
اب بہاریں گھر بنائیں یا خزاں آمیں بسے
میں خدا کو سونپتا ہوں گلستانِ آرزو
آرزو کے دم قدم سے زندگی رنگین ہے
کاش اس منزل تک آئیں منکرانِ آرزو
اشک بن کر آنکھ میں تھا آنکھ سے دامن پہ تھا
منزلِ دل میں نہ ٹھہرا کاروانِ آرزو
آرزو کے بعد ترکِ آرزو دشوار ہے
ناشناسِ آرزو ہیں ناقدانِ آرزو
اب جہاں بھی ہے وہیں رک جائے دورِ صبح و شام
حسن کی سرکار میں ہیں مجرمانِ آرزو
ہر قدم پہ ہے شکستِ آرزو کا سامنا
ہر قدم پر ہو رہا ہے امتحانِ آرزو
کتنا ظاہر فرق عشق و حسن میں ہے اے عروج
میں زمینِ آرزو، وہ آسمانِ آرزو

شفقت کاظمی

کتنے احباب کتنے ہمسائے
ہم کو تجھ سے بچھڑ کے یاد آئے
دشمنوں کی عنایتوں سے ہمیں
دوستوں کے سلوک یاد آئے

رہ کر تیرے قرب میں جو دیکھے
وہ خواب تھے کس قدر سہانے
راہوں کا غبار ہو گئے ہیں
جن کو نہ ملے ترے ٹھکانے
اٹھ کر تیرے در سے جانیوالے
لوٹ آئیں گے پھر کسی بہانے
بھولا نہیں روٹھنا کسی کا
ہر چند گزر گئے زمانے
آئی تری وادیوں سے ہو کر
اتنا تو کرم کیا صبا نے
چونکے ہیں کیا اہلِ بزم شفقت
جب ختم پر آ گئے فسانے

طالب بدایونی

کبھی آپ نے نہ پوچھی مرے درد کی کہانی
نہ یہ رسم دوستی ہے نہ طریقِ مہربانی
مرا حال سنتے سنتے نہ کرو گریز مجھ سے
نہیں کچھ دراز ایسی مرے شوق کی کہانی

ترا غم خرید کر میں غمِ دو جہاں سے چھوٹا
ترے غم کا شکر یہ ہے ترے غم کی مہربانی

آئی ہے ناز کرتی ہوئی کوئے یار سے
آئی ہے لوٹ کے دوست نسیم بہار سے
مجھ کو نہیں ہیں تم سے ستم کی شکایتیں
دیکھو نہ اس طرف نگہ شرمسار سے
اس گلشن حیات میں مثلِ نسیمِ گل!
بیٹھے نہ ایک دن بھی کبھی ہم قرار سے
بے مہریٔ بہار کا شکوہ اگر کروں
بلبل کبھی نہ دل کو لگائے بہار سے
طالب غمِ خزاں کی تلافی نہ ہو سکی
دل کی کلی کھلی نہ ہوائے بہار سے

انوار ظہوری

(اپنے مجموعہ شہرِ غزل سے)

فطرتاً غم پسند ہے لیکن
آدمی چاہتا ہے خوش رہنا
کہہ گئے اور وہ بھی تاکیداً
مسکراتے ہوئے جفا سہنا
دل کو ساماں نئے بہم ہوں گے
شوق کے حوصلے نہ کم ہوں گے
ہو جو احساس بُعدِ منزل کا
اور بھی لوگ تازہ دم ہوں گے

گزرے جور و فلک کے مرحلوں سے
کیا جانئے لٹ گئے کہاں ہم
یہ ہے صلۂ غمِ محبت
ہیں خاطرِ یار پر گراں ہم
دل میں یوں تو ہیں کتنے منصوبے
تم کو فرصت ملے تو بات کروں
اور کیا ہو کوئی اخلاصِ محبت کی مثال
نام جس کا ہے زباں پر اسے دیکھا بھی نہیں
یہ سوچتے تھے نظامِ چمن بدلتا ہے
گلوں کی فکر میں دامن بھی تار تار ہوا

عمرآن انصاری

دل میں پیدا طلبِ خام نہ ہونے دیں گے
عشق کو موردِ الزام نہ ہونے دیں گے
کر دیا دل نے جو آغازِ محبت تو کیا
ہم ہلاکِ غمِ انجام نہ ہونے دیں گے
ہم سے ہو جائے اگر سارا جہاں برگشتہ
دل کو برگشتہ اسلام نہ ہونے دیں گے

مُشاہدہ

مشرق سے ابھرتا ہوا، نیّر نظر آیا
چہرہ متغیّر، متغیّر نظر آیا
عمرآن ادھر سے جو ادھر میں نے نظر کی
مغرب متحیّر، متحیّر نظر آیا

آپ سے التماس ہے کہ :-
دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر لکھنا نہ بھولئے
(منیجر)

روحِ انتخاب

دہریے خدا کے منکر ہیں، سوفسطائیوں کو شک ہے فلسفی استدلال کے محتاج ہیں، لیکن اربابِ حال کے نزدیک استدلال کی ضرورت نہیں، تمام عالم، زمین، آسمان، آفتاب، ماہتاب، ثابت سیارے، دشت وچمن، گل وخار، برگ وبار، سب اس کی شہادت دے رہے ہیں!

کیا یہ ممکن ہے کہ معلول ہو، علت نہ ہو، اثر ہو اور موثر نہ ہو، ذرہ ہو آفتاب نہ ہو، سایہ ہو اور دھوپ نہ ہو۔

عالم اثر است ذاتِ یکتائی را   روزے کہ درو نہ آفتاب است کہ دید؟

سارا جہاں اسی ذاتِ یکتا کی نشانی ہے، ورنہ دن ہو اور آفتاب نہ ہو، یہ کس نے دیکھا؟

معرفتِ باری میں عقل بیکار ہے، عقل کے تمام ادراکات حواس کے مدرکات پر مبنی ہیں، یعنی حواس جو ادراک کرتے ہیں عقل انہیں تحلیل، یا ترکیب، تعمیم یا تفرید کا عمل کرتی ہے، لیکن ذاتِ باری حواس کے مدرکات سے بالاتر ہے، اس لئے عقل کی دسترس سے باہر ہے، اسی بنا پر اربابِ حال کے نزدیک عقل کے مدرکات ادنیٰ مرتبہ کی چیزیں ہیں۔

عقلِ جزوی کے تواند گشت بر قرآں محیط   عنکبوتے کے تواند کرد سیمرغے شکار

یعنی عقل معارفِ قرآنی کا احاطہ نہیں کر سکتی، ایک مکڑی سیمرغ کا کیوں کر شکار کر سکتی ہے۔

شیخ سعدیؒ آرام طلب اور عیش پسند بادشاہوں کو خطاب کر کے کہتے ہیں۔

تو کے بشنوی نالۂ دادخواہ   بہ کیواں برت، کلۂ خوابگاہ

"تم مظلوموں کی فریاد کیا سنوگے، تمہاری خوابگاہ کی چھت تو آسمان سے ٹکراتی ہے"۔

شنیدم کہ فرماں دہے دادگر   قبا داشتے ہر دو رُو آستر

میں نے سنا ہے کہ ایک عادل بادشاہ ایسی قبا پہنتا تھا جس کے دونوں طرف استر ہوتا تھا۔

یکے گفتش اے خسروِ نیک روز   قبائے ز دیبائے چینی بدوز

کسی نے کہا کہ حضور چینی کمخواب کی قبا بنوائیں۔

بگفت ایں قدر ستر و آسائش است   وزیں بگذری زیب و آرائش است

بولا کہ پردہ پوشی اور آرام کے لئے اتنا ہی بس ہے، باقی بناؤ سنگھار ہے۔

مرا ہم ز صد گونہ آز و ہوا است   ولیکن نہ تنہا خزانہ مرا است

"میرے دل میں بھی بہت سی خواہشیں پیدا ہوتی ہیں، لیکن خزانہ صرف میرا مال نہیں ہے"۔

بوستاں میں لکھا ہے ——— کہ ایک شخص نے کسی بادشاہ کے سامنے کوئی بات کہی جو اس کو ناگوار گزری، بادشاہ نے اس کو

قید کردیا۔ لوگوں نے اُس شخص سے کہا کہ ایسے موقعوں پر حق گوئی مصلحت کے خلاف تھی۔ اُس نے کہا سچ بولنا خدا کا حکم ہے، قید خانہ سے میں نہیں ڈرتا۔ یہ دو دن کی تکلیف ہے۔ بادشاہ نے کہلا بھیجا کہ دو دن نہیں بلکہ تمام عمر قید خانہ میں رہنا ہوگا۔ اس شخص نے کہلا بھیجا:۔

کہ دُنیا ہمیں ساعتے بیش نیست　　غم و خرمی پیش درویش نیست

دُنیا گھڑی دو گھڑی کی ہے، فقیر کے آگے غم اور خوشی، کوئی چیز نہیں۔

بہ دروازۂ مرگ چوں در شویم　　بہ یک ہفتہ باہم برابر شویم

جب موت کے دروازے پر جائیں گے، تو ایک ہفتہ میں ہم تم برابر ہو جائیں گے۔

کلیم کہتا ہے:۔

روشندلاں خوشامدِ شاہاں نہ گفتہ اند　　آئینہ عیب پوشِ سکندر نمی شود

جو روشن دل ہیں، وہ بادشاہوں کی خوشامد نہیں کرتے، آئینہ نے کبھی سکندر کا عیب نہیں چھپایا۔

سکندر فوج و حشم کے ساتھ جارہا تھا۔ ایک ویرانہ میں ایک بڈھا نظر آیا، سکندر اس کے پاس گیا لیکن وہ خبردار نہ ہوا۔ سکندر نے اُس کو ڈانٹ کر کہا کہ تو جانتا نہیں میں سکندر ہوں میری تعظیم کیوں نہیں کی۔ بڈھے نے جواب دیا:۔

دو بندۂ من کہ حرص و آزند　　بر تو ہمہ روز سر فرازند

با من چہ برابری کنی تو　　چوں بندۂ بندۂ منی تو

یعنی:۔ میرے دو غلام ہیں لالچ اور حرص (یعنی ان دونوں کو میں نے مغلوب کرلیا ہے) یہ دونوں تجھ پر حکومت کر رہے ہیں، جب تو میرے غلاموں کا غلام ہے، تو میری کیا برابری کر سکتا ہے!

سعدیا۔ چنداں کہ می دانی بگو　　حق نشاید گفتن الا آشکار

اے سعدی! جو کچھ جانتا ہے سب کہدے، سچ علانیہ ہی کہنے کی چیز ہے۔

ہر کرا خوف و طمع در کار نیست　　از خطا باکش نباشد و ز تتار

جس کے دل میں خوف اور طمع نہیں ہے، نہ اس کو ختا کا ڈر ہے نہ تتار کا۔

ایک دفعہ کسی نے حضرت علیؓ سے کوئی مسئلہ پوچھا، آپنے جواب دیا، حاضرین میں سے ایک نے کہا یہ مسئلہ یوں نہیں ہے، آپ نے فرمایا، اچھا تم بتاؤ، اُس نے نہایت خوبی سے مسئلہ کو بیان کیا، حضرت علیؓ نے فرمایا "بے شبہ میں نے غلطی کی تھی۔ تم نے صحیح جواب دیا۔"

عاشقی رنج ست مرداں راولیکن راحت است　　سلسلہ بند است و شیراں را بگردن زیور است

یعنی عشق میں اگرچہ تکلیف اور نہایت مصائب پیش آتے ہیں، لیکن مردانِ خدا کے لئے وہ راحت و آرام ہے، جس طرح شیر کی گردن میں جو زنجیر پڑی ہوتی ہے، وہ اُس کا زیور ہے۔

ابن یمین نے کہا کہ ہل اور کھیتی اس سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ کسی کے آگے سر تسلیم خم کیا جائے۔

ہزار بار از اں بہ کہ از پئے خدمت　　کمر بہ بندی و ہر صبح سلام کنی　　(شعر العجم حصہ دوم - علامہ شبلی)

ہماری نظر میں

QURANIC SUFISM

از :- ڈاکٹر میر ولی الدین (ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی) پروفیسر شعبہ فلسفہ عثمانیہ یونیورسٹی ۔
ضخامت ۲۲۶ صفحات ، قیمت :- دس روپیہ ۔ (مجلد ، رنگین گردپوش)
ملنے کا پتہ :- موتی لال بنارسی داس پبلشرز ، بنگلہ روڈ ، جواہر نگر ، دہلی ملا (بھارت)

ڈاکٹر میر ولی الدین کا نام اور اُن کا علمی مقام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے ، علمی حلقوں میں وہ خاصی شہرت رکھتے ہیں ، ڈاکٹر صاحب موصوف قدیم و جدید فلسفہ کے عالم ہیں ، دینیات اور خاص طور سے روحانیات (تزکیہ و تصوف) سے اُن کو بڑا لگاؤ ہے ، یہ کتاب اُن کے اسی شغف کی آئینہ دار ہے ، بلکہ اُن کی شاہکار تصنیف ہے !

ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کی کتاب "قرآن اور تصوف" کئی سال ہوئے ندوۃ المصنفین دہلی سے چھپ کر مقبول ہو چکی ہے یہ انگریزی کتاب جو اس وقت ہمارے سامنے ہے ، اسی اُردو تصنیف کا عکس ہے ، کتابوں کے اصل اقتباسات اور انڈکس کے ساتھ ! انگریزی اور اُردو کی دونوں کتابیں ہمارے پیش نظر ہیں !

فاضل مصنف نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ اشراقیت تصوف میں داخل ہو گئی جس کے نتیجہ میں "شے کی غیریت ذاتیہ کا انکار کر دیا گیا" حالانکہ یہ تصور قرآن کے مخالف ہے کہ قرآن خلق کی غیریت کو واضح طور پر پیش کرتا ہے ، یہ ایک زندقہ تھا جو مصر کے مشہور فلسفی فلاطینوس (متوفی ۲۶۹ء) کی تعلیمات کے اثر سے ظہور میں آیا ——— یہ کہ "حق ہی حق ہے ، غیر حق ذاتاً ووجوداً معدوم ہے ۔"

ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب نے تصوف کی اصطلاحات کو کس قدر سلجھا کر بیان کیا ہے ، اس کی ایک جھلک اس اقتباس میں نظر آسکتی ہے ——— "اعیان ثابتہ کیا ہیں ؟" اس کے جواب میں وہ یہ فرماتے ہیں :-

> "حق تعالیٰ ازل سے علیم ہیں ، صفت علم سے متصف ہیں ، صفتِ علم حق تعالیٰ کی ذات میں سدا جاوداں ہست و بود و خواہد بود ۔ علم بغیر معلومات کے ممکن نہیں ، عالم کو کسی "علوم" ہی کا علم ہوگا ، لہٰذا حق تعالیٰ کے ان تین اعتبارات عالم ، علم ، علوم میں ابتدا ہی سے تمیز قائم کی جاسکتی ہے ، اب معلوماتِ الٰہیہ کیا ہیں ؟ حقائق ممکنات ہیں ، ذواتِ اشیاء ہیں ، یعنی حق تعالیٰ کے سوا جتنی چیزیں مخلوق ہیں ، حق تعالیٰ اُن کے خالق ہیں ۔ مخلوقات کو وہ جان کر پیدا کرتے ہیں ، پیدا کر کے نہیں جانتے ، ورنہ جہل لازم آئے گا ۔ تعالیٰ اللہ عن ذالک علواً کبیراً مخلوقات کو جو ازل سے حق تعالیٰ کے علم میں ہیں ، بالفاظ دیگر جو ازل سے معلوماتِ حق ہیں ، اور حقائق یا ذواتِ اشیاء ہیں جن کے مطابق اشیاء کی تخلیق ہوتی ہے ، "اعیان ثابتہ" کہتے ہیں ، یہ "صور علمیہ" بھی کہلاتے ہیں ، یہ علم الٰہی

کے تعینات ہیں، اُن کو اعدامات یا معدومات حق بھی کہتے ہیں"۔

ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کے دوسرے مضامین ہم نے پڑھے ہیں، وہ شرک و بدعت کے سخت مخالف ہیں، اس کتاب میں بھی انھوں نے جگہ جگہ اس کا اظہار فرمایا ہے کہ ہر حال میں اللہ اللہ رہتا ہے اور بندہ بندہ ———— کہ "ذاتِ خلق اور ذاتِ حق، عبد و رب سے اور وجود کی تمیز قائم کرنی ضروری ہے، جس نے یہ تمیز قائم نہیں کی وہ بد تمیز ہے، ملحد ہے، زندیق ہے"، مگر دوسری طرف وہ اسی کتاب میں یہ بھی فرماتے ہیں :-

"..... اس استغراق و محویت کی حالت میں جب عبداللہ گم ہو جاتا ہے تو اللہ ہی رہتا ہے اس وقت یہ کہا جاتا ہے کہ نہ خالق ہے نہ مخلوق نہ عارف ہے نہ معروف، نہ طالب ہے نہ مطلوب، نہ عاشق ہے نہ معشوق"۔

———— اور ————

"اس مراقبہ کی مداومت و مواظبت سے اگر حق تعالیٰ چاہیں تو ایک خود فراموشی بھی پیدا ہو جاتی ہے، اب ناظر و منظور ایک ہو جاتے ہیں، حجاب اُٹھ جاتا ہے اور وصالِ حق ہو جاتا ہے۔ اسی کو غلبہ ہو الباطن یا "فنا الفنا" کہتے ہیں، یہی معنی ہیں :- ؎

"الفقر اذا تم ہو اللہ این است" کے!

"یہ محویت ہے" سرِ ذوالامانت "ہے، اب عبداللہ ختم ہو جاتا، عبد اب رہتا ہی نہیں، اللہ ہی اللہ رہتا ہے"۔
اس قسم کی عبارتیں ذہن کو کس قدر الجھن میں مبتلا کرتی ہیں! اور سنیئے :-

"جب عبد کا قیام ذاتُ اللہ میں ہو جاتا ہے، تو چونکہ اللہ کی ذات سرورِ محض ہوتی ہے۔ اس لئے عبد اپنے اندر ایک ایسا سرور محسوس کرتا ہے، جو ناقابلِ بیان ہوتا ہے"۔

(صفحہ ۹۴ - قرآن اور تصوف)

اوپر کے ان دونوں اقتباسات میں کس قدر تضاد پایا جاتا ہے، پہلے اقتباس میں یہ کہا گیا ہے "عبد اب رہتا ہی نہیں"۔ دوسرے اقتباس سے یہ ثابت ہوتا ہے "عبد رہتا ہے اس صفت کے ساتھ کہ وہ سرور بھی محسوس کرتا ہے" ———— پھر ذاتِ اللہ میں عبد کا قیام - یہ کس قدر فتنے میں ڈالنے والا فلسفہ ہے!

"خوب سمجھ لو کہ، خلق کا وجود حق تعالیٰ کے ظہور یا تجلی و تمثل کے بغیر ناممکن ہے"۔ (صفحہ ۷۰)

آگے چل کر صفحہ ۷۷ پر حق تعالیٰ کے اس "ظہور و تجلی" کی دلیل میں قرآن پاک کی یہ آیت پیش کی ہے کہ :-

فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا

تو جب خلق و کائنات "حق تعالیٰ کے ظہور و تجلی" ہی سے عبارت ہیں، اس صورت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تمنائے دید پر "لن ترانی" کے بجائے اللہ تعالیٰ کو یہ فرما دینا چاہیے تھا کہ یہ ساری کائنات ہی میری "تجلی و ظہور" ہے، اور تم خود میری تجلی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے یہ پھر "تجلی" کیوں فرمائی! ———— اور پھر کوہِ طور بھی اللہ تعالیٰ کی تجلی تھا، حضرت موسیٰ بھی اسی کی "تجلی" تھے تو یہ کیا عجوبہ پیش آیا کہ تجلی (فلما تجلی ربہ) کی "تجلی" (کوہ طور) ہی تاب نہ لا سکی، اور "تجلی" ہی (کوہ طور) ریزہ ریزہ ہو گئی اور تجلی (حضرت موسیٰ) ہی کو غش آگیا۔

کاش! "تصوف" تزکیۂ نفس ہی تک محدود رہتا، مگر یہ جو "اشراقیت و مشائیت" اور "ویدانت و مائویت" کے طرز پر ایک پورا فلسفہ اور عجیب و غریب مصطلحات کا طلسم وجود میں آگیا ہے، اس کی نہ زبان کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ سے ملتی ہے اور نہ مزاج! اس کو ہم نے کر بیٹھے بٹھائے کیوں خلجان میں ہوں، جب کہ ان حقائق کے جاننے کا ہمیں مکلف ہی نہیں بنایا گیا۔

اللہ اور رسول ﷺ نے اس کی کہاں تعلیم دی ہے اور صحابۂ کرام نے اس قسم کے مشاہدات کی کب مشق کی ہے کہ "عروج علمی کے وقت عارف کی نگاہ (پہلے) عالمِ کثرت پر پڑتی ہے، پھر تفصیل و تعدد سے وہ اجمال کی طرف رجوع کرتی ہے (پھر) کثرت میں وحدت (جو مرتبۂ اجمال ہے) کا ملاحظہ کرتی ہے، جب عارف کو شہودِ وحدت میں استغراق تام ہوتا ہے، تو اس پر ذات کی تجلی ہوتی ہے، اور یہ تجلی مستہلک ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے علم و شہود جو باعثِ امتیاز ہے فنا ہو جاتا ہے، اور یہ غائب ہو جاتا ہے، فانی از خویش ہو جاتا ہے، جب حالتِ شعور میں لوٹ آتا ہے تو یہ اعتبار فنائے شعور، اس کا نام غیب الغیوب رکھتا ہے، یہی مرتبہ احدیت ہے، جو سلبِ علم کے اعتبار کی رُو سے اعتبار شہود سے غائب ہوتا ہے، عارف اپنے اس شہود و غیب کے اعتبار سے مراتبِ الٰہیہ میں بھی امتیاز کرتا ہے، اور ان میں وہ آن و زمان، تفصیل و اجمال، حضور و غیبت کو داخل کرتا ہے، لیکن حقیقت ان تمام اعتبارات سے منزہ ہے، وہ ایک ہی ذات ہے، جو ان تینوں تجلیات سے ہر وقت متجلی ہے جس میں آن و زمان کو مطلق دخل نہیں۔" (۱۱۵ - ۱۱۶)

یہ کن حقائق کی ترجمانی ہے، یہ کیا لغز و معمہ ہے، یہ کیا واردات و کیفیات ہیں! اس فلسفہ کو کون سمجھے گا! اس پر عمل کرنے کے لئے کہاں کی مخلوق آئے گی ——— "متشابہات" جن کے پیچھے پڑنے سے قرآنِ کریم میں روکا گیا ہے "فلسفۂ تصوف" کے رموز و حقائق کا ٹھیک یہی مزاج ہے!

ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب نے تصوف کی گتھیوں کے سلجھانے کی بہت کوشش کی ہے، اور بعض مقامات پر وہ خاصے کامیاب بھی رہے ہیں مگر مجموعی طور پر ان کی کتاب خود ایک بہت بڑی الجھن بن کر رہ گئی ہے!

اسلامی افسانے

(جلد اول) از:- مولانا نور احمد خاں فریدی، ضخامت ۲۲۴ صفحات، قیمت خاص ایڈیشن دو روپیہ - لائبریری ایڈیشن ایک روپیہ دس آنہ - جلد دوم - ضخامت ۲۴۸ صفحات قیمت چار روپے، لائبریری ایڈیشن تین روپے (سفید چکنا کاغذ، روشن و جلی کتابت، سرورق رنگین)

ملنے کا پتہ:- قصر الادب، جگو والا، براہ لودھران، ضلع ملتان۔

مولانا نور احمد خاں فریدی متعدد کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں، فنِ تاریخ سے موصوف کو خاص شغف ہے، ملتِ اسلامیہ کی اصلاح و ترقی کا وہ اپنے اندر بڑا ولولہ اور درد رکھتے ہیں! یہ تاریخی افسانے انھوں نے اسی غرض سے لکھے ہیں کہ مسلمان اپنے اسلاف کے کارناموں کی قدر و قیمت کو پہچانیں اور ان سے عبرت و موعظمت حاصل کریں، بعض افسانے ایک حد تک دل چسپ اور تاریخی لحاظ سے معلومات آفریں ہیں، ان کی مقبولیت کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان افسانوں کے پے در پے پانچ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

اس تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ مولانا نور احمد خاں فریدی افسانہ نگاری کی ٹیکنیک سے واقف نہیں ہیں! افسانے کا آغاز کس طرح ہوتا ہے، پلاٹ کو کس انداز میں پھیلایا جاتا ہے، افسانے کے کردار پلاٹ کے ساتھ کس طرح چلتے ہیں! افسانے کے کرداروں اور مکالموں کے درمیان ہم آہنگی کس طرح پیدا کی جاتی ہے، افسانوں کا اختتام کہاں ہونا چاہیے ———

ان نزاکتوں سے وہ بے خبر معلوم ہوتے ہیں!

"زنجیرِ عدل" جس افسانہ کا عنوان ہے، اس کا اختتام ان جملوں پر ہوتا ہے:-

"شہنشاہ نے مسکرا کر سامع سے فرمایا کہ کوتوال نے کچھ نہیں کیا، اگر تجھے حوالات میں ڈال کر اپنے سپاہیوں سے پٹواتا، تو بڑہ مزہ آتا۔ اس فقرے سے خوب لطیفہ ہوا، اور ہنسا ہوا دربار ایک بار پھر گرم ہو گیا۔" (صفحہ ۷۷ - جلد اول)

اول تو ایسی گفتگو شہنشاہ جہانگیر کو زیب نہیں دیتی اور اس کے شایانِ شان نہیں ہے، پھر اختتامی جملے کس قدر بے رس اور غیر افسانوی ہیں! یہی باتیں، نہایت موثر اور دلچسپ افسانوی انداز میں کہی جا سکتی ہیں!

"تمباکو" بھلا کوئی افسانہ ہے، نہ اس میں کوئی پلاٹ ہے اور نہ کردار نگاری ہے، نہ عبرت و موعظت کا کوئی خاص پہلو ہے، حیرت ہے اس واقعہ کو فریدی صاحب نے افسانوی قالب میں ڈھالنے کے لئے منتخب کیوں کیا؟ پھر اسی کتاب میں وہ ایک طرف جہانگیر کی "زنجیر عدل" کو پیش فرماتے ہیں اور دوسری طرف اسی کتاب کے دوسرے افسانے میں جہانگیر کے مزاج و طبیعت کی اس قدر ظالمانہ تصویر کھینچتے ہیں۔

"جہانگیر نے حقہ نوشی کو روکنے کے لئے سخت احکام صادر کئے، بلکہ اس جرم میں لاہور شہر کے اندر بعض کے ہونٹ بھی کاٹے گئے۔" (صفحہ ۲۰۵)

ہمیں یقین نہیں آتا کہ حقہ نوشی کی پاداش میں جہانگیر کے حکم سے حقہ نوشوں کے ہونٹ کاٹے گئے ہوں ——— اس افسانہ کی دو سطروں کے سوا اور کوئی شخص نہیں دے سکتا۔ اگر یہ واقعہ ظہور میں آچکا ہے، تو اسے افسانوی انداز میں نمایاں کرنے کی ضرورت کیا تھی؟

"محدث دہلوی مرشد کے حضور میں" اور "مسجد نواب وزیر خاں" کو افسانہ کہنا اور افسانوی کتاب میں درج کرنا فنِ افسانہ نگاری کا مذاق اڑانا نہیں تو اور کیا ہے، جس مضمون میں فارسی کا وصیت نامہ ترجمہ کے ساتھ درج ہو اور مسجد کی دکانوں کی تفصیل دی گئی ہو اسے افسانہ کون کہہ سکتا ہے!

"دیکھا کہ ایک پیرِ مرد نورانی شکل کے ساتھ لاکھوں روپے کا قیمتی لباس پہنے اور ہیروں کا تاج سر پر دھرے عجب متانت سے فریادیوں کی دادرسی کر رہا ہے۔" (صفحہ ۴۸) یہ مبالغہ ہے لاکھوں روپے کا لباس کوئی بادشاہ نہیں پہنا کرتا اور شیر شاہ نے تو اس قدر قیمتی لباس ہرگز نہیں پہنا ——— "انھوں نے بتایا کہ دیوالئے نو لاکھ اور تیس ہزار سوار دس سے کئی میل کیمپ لگائے پڑا ہے۔" (صفحہ ۱۲۳، جلد اول) فوج کی یہ تعداد بہت زیادہ مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے (اس جملہ میں "سے" نے پوری عبارت کا حسن غارت کر دیا)! "اپنے ملک کا جو مالیہ وصول ہوتا، اس سے افیون خرید لیتا تھا، کوٹھے کے کوٹھے افیون سے پٹے پڑے رہتے" (صفحہ ۱۷۹ - جلد اول) "کوٹھوں کا افیون سے پٹنا" یہ خود "افیونیوں کی گپ" سی معلوم ہوتی ہے ——— اسی جلد کے صفحہ ۱۸۰ پر مغلیہ بادشاہوں کے "جھروکہ درشن" کے معمول کو صرف "درشن" لکھا ہے!

"اس کے بعد آپ نے اشرفیوں سے بھری ہوئی کئی تھیلیاں، بے شمار زنانی پوشاکیں، قسم قسم کے زیور جمع کر کے اپنے معتمد خاص یوسف کے حوالے کئے۔" (صفحہ ۲۸، جلد دوم) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جدِ امجد ہاشم اتنے دولت مند نہیں ہو سکتے اور زنانی پوشاکوں کا تاریخ عرب کے اس دور میں "بے شمار" ہونا، تو کسی عنوان درست نہیں ہے ——— "میں نہیں

یجاتا کہ آج میرے بیٹے سے زیادہ کوئی خلافت کا اہل ہو، اس میں جو خوبیاں ہیں، وہ دوسروں میں نہیں ہیں، وہ السنہ شرقیہ کا عالم اور قرآن کا بہترین قاری ہے۔" (صفحہ ۱۱۸ جلد دوم) حضرت امیر معاویہ کی زبان سے یزید کے بارے میں اف نہ نگار کا یہ کہلوانا کہ "یزید السنہ شرقیہ" کا عالم ہے، کتنی بے تکی بات ہے، ——— "وزیر اعظم کی فٹن محل میں داخل ہوئی" (صفحہ ۲۵۹ جلد دوم) نظام الملک طوسی کے دور میں "فٹن" کہاں پائی جاتی تھی، جس دور کے تمدن کو افسانہ نگار بیان کر رہا ہو، اُس دور کے لوازم تمدن پر افسانہ نگار کی نگاہ رہنی چاہیے، اسی طرح اورنگ زیب کے عہد میں بادشاہ کو "شیروانی کے بٹن کھولتے ہوئے" (جلد دوم۔ صفحہ ۳۱۶) دکھایا گیا ہے۔

"عمر خیام نے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر فلسفیانہ شاعری میں وہ نام پیدا کیا کہ دُنیا کے طول و عرض میں اس کا ڈنکا بجنے لگا۔" (صفحہ ۲۶۱) یہ کسقدر بچکانہ اندازِ بیان ہے، عمر خیام کی زندگی میں اس کی شاعری کی شہرت کو "دُنیا کے طول و عرض میں ڈنکے بجنے" سے تشبیہ دینا، خلافِ واقعہ ہے۔

صفحہ ۲۶۳ پر حسن بن صباح کا ذکر تحسین و ستائش کے انداز میں کیا ہے، حالانکہ اس شخص کی باطنی تحریک نے اُمتِ اسلامیہ کو بے اندازہ نقصان پہنچایا ہے، یہ شخص ایک فتنۂ عظیم کا بانی تھا!

"اتنے ہی فوج کے ہاتھی ان کے پاس سے گزرنے لگے" (صفحہ ۱۱ جلد اول) "اتنے میں" لکھنا تھا۔ ——— "میں نے ان سے ضروری ملنا تھا" (صفحہ ۱۳) "نے" کا اس طرح استعمال روزمرہ کے خلاف ہے ——— "وہ لعل اپنی بھاوج کو دے چکا تھا" (صفحہ ۳۲) بھائی کی بیوی کو "بھاوج" کہتے ہیں، یہ "بھاوجہ" کیا بلا ہے ——— "گویا وہ کسی باغ کی گل گشت کر رہے ہیں" (صفحہ ۴۴) کی "نہیں" میں "کا محل تھا۔ "بادشاہ نے تیوری پر بل چڑھاتے ہوئے کہا۔ (صفحہ ۵۰) "تیوری چڑھاتے ہوئے" یا "تیوری پر بل ڈالتے ہوئے" لکھنا تھا۔

"اب بادشاہ کا دامنِ صبر و ضبط چاک چاک ہو گیا، اس نے اتنے زور سے چلا کر کہا کہ آواز پھٹ گئی اور منہ سے کف نکلنے لگا" (صفحہ ۵۳) یہ کیا اندازِ بیان ہے، شاہزادہ کی غلطی پر بادشاہ کے جلال و غضب کے اظہار کے لئے موزوں الفاظ استعمال کرنے چاہیے تھے۔ "منہ سے کف نکلنے لگا" کا تو یہاں کوئی محل ہی نہ تھا ——— "صحن میں کرسی پر کوتوال صاحب بیٹھے ایک پٹھان سے گرم ہو رہے تھے" (صفحہ ۶۴) "پٹھان پر گرم ہو رہے تھے" حروفِ جار کے استعمال میں ایسی کھلی ہوئی غلطیاں کم سے کم ایک افسانہ نگار کو زیب نہیں دیتیں ——— "اس الفاظ نے کوتوال کی آتشِ غضب پر مہمیز کا کام کیا" (صفحہ ۶۷) "توسنِ غضب" لکھنا تھا۔ "آتشِ غضب" کو بھڑکایا جا سکتا ہے، اُس پر تیل ڈالا جا سکتا ہے مگر اسے "مہمیز" کوئی نہیں لگاتا۔ "لیکن وہ پاک دامنہ برابر انکار کرتی رہی" (صفحہ ۸۱) عورت کے لئے بھی "پاک دامن" ہی بولتے ہیں، اس قسم کی "پاک دامن، خوش نظر، بدباطن وغیرہ" ترکیبوں کو مؤنث بنانے کے لئے "ہ" نہیں لگایا کرتے ———

"ایک دن ہم ماں بیٹا کو نکی نجابت چودھری گردھاری رام کے ہاں گئے ہوئے تھے" (صفحہ ۹۶) "ایک دن ہم ماں بیٹے" روزمرہ ہے ——— "تم گھر پہنچ کر گندھاری محل کو فارغ کرو" (صفحہ ۱۱۰) "محل کو فارغ کرو" یہ کہاں کی زبان ہے!

"یمانی تلوار ہاتھ میں لئے" (صفحہ ۱۲۶) یمن کی تو "چادریں" مشہور ہیں اور اصفہان کی تلواریں ——— "اور تالاب و پہاڑ کو دیکھتا" (صفحہ ۱۷۹) خالص اُردو کے دو لفظوں کے درمیان واوِ عطف لانا درست نہیں ——— "سوتویں ناک" (صفحہ ۲۴۳) ستواں ناک کو "سوتویں ناک" پڑھ کر وجدان چیخ اٹھا ——— توبہ! ——— "انھوں

نے بریک وقت باڑھ لگائی " (صفحہ ۲۴۰) " باڑھ مارنا " بولتے ہیں!

.... زیتون اور نقدی سے وہاں ایک انبار لگ جاتا۔ (صفحہ ۱۹ جلد دوم) "سے" "نہیں" "کا" لکھنا چاہیے تھا۔ "بڑی بڑی سیاہ آنکھیں وقفِ اشکبار تھیں" (صفحہ ۲۲) یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے کہ "وقفِ اشکباری" کی "ی" کاتب صاحب نے غائب کردی۔ "ایک دن وہ انہی غم انگیز اور روح فرسا حسرت ساعات میں گھری بیٹھی تھی"۔ (صفحہ ۲۲) یہ کیا اندازِ بیان ہے؟ ———— "سلمیٰ حسن و جمال، شکل و صورت اور عقل و دانش کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتی تھی، اس نے عنترت کے دل کو فولادی زنجیروں سے جکڑ کر اپنا بنالیا تھا" (صفحہ ۱۵) "کے لحاظ سے" کی جگہ صرف "میں" کافی تھا، "فولادی زنجیروں" کا یہاں کیا محل تھا ———— "اے راحتِ روح! اسبابِ معیشت کے بغیر آدمی بڑا لگتا ہے"۔ (صفحہ ۵۶) اس جملہ میں کس قدر ناپختگی پائی جاتی ہے ———— "جس کپڑے کی چلت زیادہ دیکھو وہی خریدو" (صفحہ ۶۰) "بکری" "چلن" یا "مانگ" لکھنا تھا ———— "ان کو اہلیہ نے زہر دی تھی" (صفحہ ۱۲۳) "زہر" بالاتفاق مذکر ہے ———— "جب اذان کی آواز سامعتِ علیا میں پہنچی" (صفحہ ۱۲۷) ایک تو "سماعتِ عُلیا" ہی اعجوبہ سے کم نہیں، پھر اُس کے ساتھ "میں پہنچی" "حیرت و استعجاب کے بحرِ عمیق میں غرق عجب بے نیازی سے لاٹھی ٹیکتا چلا جا رہا تھا" (صفحہ ۵۵) یہ افسانہ کی زبان ہی نہیں ہے ———— "اکبرِ اعظم کی عمر ۲۶ برس کی ہو چکی تھی۔ لیکن ابھی تک اس کی گود تاج و تخت کے وارث سے محروم تھی" (صفحہ ۱۰۷) "گود" کا لفظ مرد کے لئے نہیں عورت کے لئے بولا جاتا ہے ———— "کنارے پر پھلواری کے درخت تھے" (صفحہ ۲۲۶) کنارے پر پھولوں کے درخت تھے، یا پھلواری تھی، لکھنا چاہیے تھا۔ "پھلواری کے درخت" درست نہیں، "پھلوار یا پھلواری" میں "پھولوں کے پودوں یا درختوں" کا مفہوم شامل ہے ———— "نصرانی کی زبانی جو سوکھ کر کانٹا ہو رہی تھی، اس کے پینے سے درست ہوئی (صفحہ ۲۴۰) "درست ہوئی" یہاں وجدان کو کس قدر کھٹکتا ہے "اُس کے پینے سے تر و تازہ ہوگئی"، لکھنا تھا ———— "رجعتِ قہقری" اس ترکیب کو بار بار استعمال کیا گیا ہے، اور بعض مقامات پر اس کا استعمال خاصہ محلِ نظر ہے۔

"مرض میں آرام ہوگیا" (صفحہ ۲۴۲ جلد دوم) "میں" کا اس قدر غلط استعمال! صفحہ ۲۱۳ پر صاحب الاغانی — "ابوالفرج اصبہانی" کو "ابوالفرج اصفہانی" لکھا ہے ———— "میں یہ پانچ دینار قبول کرکے اس کا نام میلا کرنا نہیں چاہتا" (صفحہ ۲۱۳) "نام میلا کرنا" یہ کہاں کا محاورہ ہے؟ ———— "خوب صورت مناظر کا اس قدر فقدان درپیش تھا" (صفحہ ۱۹۱) "درپیش" یہاں کس قدر مہمل بے جوڑ لگتا ہے۔

عصائے موسوی

از:- پروفیسر منظور حسن عباسی، ضخامت ۳۲ صفحات، قیمت تین آنہ (چار آنہ کے ٹکٹ بھیج کر یہ رسالہ منگوایا جا سکتا ہے) ملنے کا پتہ: ادارہ اصلاحِ نفس ۳۔ ادبکار روڈ، کرشن نگر، لاہور

مسٹر پرویز نے "اندھے کی لکڑی" کے نام سے ۹ صفحہ کا ایک رسالہ لکھا تھا، جس میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے اسلاف میں شروع سے کر اب تک اندھی تقلید کا دور دورہ رہا ہے اور پوری امت اندھوں کی مانند ٹھوکریں کھاتی رہی ہے۔ اس رسالہ میں "اسلاف پرستی" کی آڑ میں صحابہ کرام، تابعینِ عظام، فقہائے امت اور محدثین و مفسرین سب پر چوٹ کی گئی ہے کہ معاذاللہ یہ لوگ اندھے کی لکڑی کے سہارے چل رہے تھے ———— پروفیسر منظور احسن عباسی نے ان خرافات کا اپنے رسالہ میں تار و پود بکھیر کر رکھ دیا ہے اور پرویز صاحب کی تعلّیوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ "قرآن

کے نام پر اللہ کے دین کو مسخ کرنے کا جو فتنہ پاکستان میں اٹھ کھڑا ہوا ہے، اس کے سدِ باب کی ہر کوشش اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہوگی۔

اختلافات روایات سیدنا شعبہ رحمۃ اللہ علیہ

از:- ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ حسینی، ضخامت ۴۸ صفحات (قیمت درج نہیں)

ملنے کا پتہ:- قاری عبدالرحیم استاد دارالقرآن الکلیمیہ قریب گیٹ بلدیہ، بازار، نورالامرا، حیدرآباد دکن۔

حضرت عاصم کوفی رحمۃ اللہ علیہ تجوید و ترتیل کے بہت بڑے امام گزرے ہیں، ان کے دو شاگرد تھے شعبہ اسدی کوفی اور حفص کوفی (رحمہما اللہ تعالیٰ) ان دونوں میں حضرت حفص کوفی کی روایت قرآت سبعہ و عشرہ میں سب سے زیادہ آسان اور سہل ہے، اور قرآن مجید کی کتابت انہی کی روایت پر کی گئی ہے! اس کتابچے میں حضرت شعبہ اور حضرت حفص کی قرآت کے اختلافات دکھائے گئے ہیں ــــــ مثلاً شعبہ کی قرآت میں متداول قرآت کا "عُیُوْن" "عِیُوْن" پڑھا جاتا ہے! ــــــ مگر قرآت کے ان اختلافات پر کتاب لکھنے کی کیا ضرورت تھی کہ عوام خواہ نخواہ "ذہنی خلجان" میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔

ارشادات حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ

تالیف:- حکیم مولانا محمد صادق سیالکوٹی، ضخامت ۷۲ صفحات۔

ملنے کا پتہ:- دائرۃ التبلیغ۔ پورہ ہیراں سیالکوٹ!

حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ طریقت کے امام اور توحید کے بہت بڑے مبلغ گزرے ہیں مگر اُن کے معتقدین نے اُن کی تعلیمات میں اس قدر غلو کیا ہے جس کے سبب حضرت شیخ کی تعلیمات ہی الٹ کر رہ گئی ہیں۔ اس کتاب میں مولانا محمد صادق صاحب نے حضرت شیخ جیلانی کی کتابوں سے اقتباسات پیش کر کے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ شیخ کا کیا مسلک تھا، اور معتقدین نے اسے کیا بنا ڈالا ــــــ مثلاً غنیۃ الطالبین میں حضرت شیخ فرماتے ہیں:-

لا معین الا اللہ ــ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مددگار نہیں۔

مگر اُن کے معتقدین کہتے ہیں:- ؎

مرادوں کے بر لانے والے دُہائی ــ نہیں تاب رنج والم غوث الاعظم

شیخ کا قول ہے:- بہ یکشف کل غمۃ وبلیۃ (خدا ہی کے پکارنے سے سب رنج و غم اور مصائب دور ہوتے ہیں) لیکن مرید کہتا ہے:- ؎

ترا نام لے کر جو نعرہ لگایا ــ ہم مر ہوئی ایک دم غوث اعظم

یہ کتاب اصلاحِ عقائد کی کامیاب و مفید کوشش ہے، اللہ تعالیٰ مولف کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

لہ فاضل مؤلف کو فقہی مسائل کی بحث چھیڑنی نہیں چاہیے تھی ــــــ کتاب کو شرک و بدعت کے رد ہی تک محدود رکھنا تھا۔

محمد قلی قطب شاہ کی جیون کہانی

مرتبہ :- وقار خلیل - ضخامت ۳۲ صفحات - قیمت ۵۰ نئے پیسے -
ملنے کا پتہ :- ادارۂ ادبیات اردو خیریت آباد، حیدرآباد دکن -

محمد قلی قطب شاہ اردو زبان کا بہت بڑا شاعر تھا، اردو کا سرپرست تھا - اردو کا شیدائی تھا ـــــــ تھا ہی تعمیر و چمن بندی کا اچھا ذوق رکھنے والا، رنگین مزاج مگر ہاتھ کا سخی اور دل کا صاف و سادہ! اسی شاعر بادشاہ اور اُردو کے محسن فرمانروا کی مختصر سوانح حیات آسان زبان میں بچوں کے لئے وقار خلیل صاحب نے مُرتب کی ہے! قلی قطب شاہ میں کردار و عقائد کی کمزوریاں بھی پائی جاتی تھیں ــــــ اس کتاب میں یہ جو لکھا گیا ہے :-

"اس نے اپنے زمانہ میں کبھی بھی کسی کے قتل کا حکم نہیں دیا"

تو یہ اس نے اچھا نہیں کیا، کیونکہ قرآنِ پاک میں "قصاص" کو "حیات" سے تعبیر کیا گیا ہے! اس قسم کی رحم دلی تحسین کی مستحق نہیں ہے

مسئلہ تسمیہ

از :- عبدالواحد صاحب! ضخامت ۱۶ صفحات (قیمت درج نہیں)
ملنے کا پتہ :- دارالتجوید، محلہ گھیر سیف الدین خاں - رامپور (بھارت)

اس کتابچہ میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ نماز میں بسم اللہ بالجہر پڑھنا حنفی مذہب کے خلاف نہیں ہے! مولانا حسین احمد مدنی مرحوم اس بارے میں فرماتے ہیں :-

"میں تراویح میں حفص کی قرأت پڑھتا ہوں، اُن کی یہ تحقیق ہے کہ بسم اللہ ہر سورت کا جزو ہے، اس لئے میں اس کی پابندی کرتا ہوں، لیکن چونکہ بہرحال مسئلہ مختلف فیہ ہے اس لئے میں فرائض میں ایسا کرنے سے احتیاط کرتا ہوں، مگر نوافل میں حفص کی تحقیق پر اس لئے عمل کرتا ہوں کہ ان کے نزدیک پورا قرآن ختم ہو جائے، ورنہ خواہ مخواہ ایک ایک آیت ہر سورت میں تلاوت سے رہ جائے گی"

یہ ایسا اختلافی مسئلہ ہرگز نہیں ہے کہ اس میں نزاع کی جائے - ہر سورت کے ساتھ جہر سے "بسم اللہ" پڑھنے سے بھی نماز میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا، اس مسئلہ میں حضرت حفص رحمۃ اللہ علیہ کی رائے بہت وزن رکھتی ہے کہ قرآن کریم انہی کی "روایتِ قرأت" پر پڑھا جاتا ہے

سرگزشت غزالیؒ

از :- مولانا محمد حنیف ندوی، ضخامت ۱۹۲ صفحات (مجلد، گرد پوش کے ساتھ) قیمت - تین روپے -
ملنے کا پتہ :- ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، ۲ کلب روڈ - لاہور -

سرگزشت غزالیؒ ـــــــ حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی شہرۂ آفاق تصنیف عربی "المنقذ" کا اردو ترجمہ ہے، جس پر مولانا محمد حنیف ندوی نے فاضلانہ مبسوط مقدمہ تحریر فرمایا ہے، یہ مقدمہ اصل کتاب سے زیادہ مفصل اور طویل ہے، بلکہ اپنی جگہ خود ایک مستقل کتاب ہے! اس مقدمہ کے پڑھنے سے "کلام و فلسفہ" میں غزالی کا مرکزی نقطۂ نظر سمجھ میں آتا ہے! اس مقدمہ میں فرقہ باطنیہ (تعلیمیہ) کی اجمالی تاریخ اور اس کے عقائد و نظریات خاصے شرح و بسط کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں! فاضل مقدمہ نگار کی اس وسعتِ ظرف کی داد دینی چاہیئے کہ انھوں نے اس فرقے کے گمراہ کن عقائد کا جہاں ذکر کیا ہے، وہاں فراخدلی کے ساتھ فاطمین کی ثقافتی اور علمی ترقیوں اور اسمٰعیلی تاریخ کے تعمیری پہلو سے صرفِ نظر نہیں کیا، بلکہ ایک دیانت دار مورخ کی طرح اُس کا

اظہار کردیا ہے!

"فلسفہ غزالی کی خصوصیات" اس مقدمہ کا نہایت اہم باب ہے، دوسرے اکابر مسلم فلاسفہ اور غزالی میں کیا فرق ہے، اس فرق کو فاضل مقدمہ نگار نے کس شانِ ایجاز کے ساتھ ظاہر فرمایا ہے:۔

"زیادہ سے زیادہ غزالی کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں کہ انکے فلسفہ پر تکلم کا پہلو غالب ہے جس کے یہ معنیٰ ہیں کہ وہ متکلم فلسفی ہیں اور ابن سینا، فارابی یا ابن رشد کی طرح فلسفی متکلم نہیں جو فلسفی تو زیادہ ہوں مگر علم الکلام میں جن کا حصہ افسوسناک حد تک کم ہو۔ مزاج و اسلوبِ استدلال کے فلسفیانہ ہونے کے علاوہ غزالی کی یہ خصوصیت بھی مسلّم ہے کہ انھوں نے خالص فلسفیانہ مسائل سے بھی بحث کی ہے اور فکر و نظر کے سامنے کچھ نئے پیمانے بھی لائے ہیں۔"

غزالی کی عظمت اور شخصیت پر مقدمہ نگار کے یہ جملے کتنے قیمتی ہیں:۔

"ان کی بڑائی کا راز دراصل اس میں پنہاں ہے کہ یہ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے تلاشِ حقیقت میں سفر بادیہ پیمائی کی زحمتیں برداشت کیں، مروجہ علوم و فنون کا از سرِ نو جائزہ لیا، تقالید و رسوم کو پھر سے پرکھا، مذاہب و فرق کی دقتِ نظر سے چھان بین کی، شک و ریب کے دروازوں پر جرأت سے دستک دی اور بالآخر اس سچائی کو پالینے میں کامیاب ہوئے جس کا کھوج لگانے کے لئے انھوں نے مسندِ درس کو چھوڑا تھا، اہل و عیال سے علیحدگی اختیار کی تھی اور جبہ و عبا کے بجائے دلق و حصیر کو اوڑھنا بچھونا بنایا تھا۔"

امام غزالی کے اندر شک و ریب کے دواعی کیوں کر ابھرے؟ تصوف کی طرف وہ کس طرح رجوع ہوئے! زمان و مکان، جہات و اطراف اور قانونِ تعلیل کے بارے میں اُن کا نقطہ نظر کیا ہے! غزالی اور ہیوم میں کیا فرق ہے؟ غزالی نے تعلیل کا کیوں انکار کیا؟ ہیوم کی تشکیک کا پس منظر کیا ہے! یہ اس قسم کی تمام نازک بحثیں اس مقدمہ میں ملتی ہیں! اس کتاب کا ترجمہ اور مقدمہ شہادت دیتا ہے کہ مولانا محمد حنیف ندوی علم کلام اور فلسفہ میں خاصہ درک رکھتے ہیں اور قدیم ہی نہیں جدید فلسفہ سے بھی وہ باخبر ہیں ——— برکلے کی تصوریت اور لاک کی تجربیت کا ہیوم نے کیا اثر قبول کیا، اس کو ایک جملہ میں کس قدر شاعرانہ انداز میں ظاہر کیا ہے:۔

"چنانچہ ہیوم نے اس مصرع طرح کو لیا اور اس پر تشکیک سے متعلق ایک نظم کہہ ڈالی"

امام غزالی قدس سرہ العزیز نے تعلیل کا کیوں انکار کیا؟ اس طویل الذیل بحث کا خلاصہ فاضل مقدمہ نگار نے چند جملوں میں پیش کر دیا ہے:۔

"اور اشاعرہ کا خیر و شر کے بارے میں جانا بوجھا عقیدہ ہے کہ اس میں امتیاز عقلی خصوصیات کی وجہ سے نہیں بلکہ شارع کی وجہ سے ابھرتا ہے۔ اس لئے اخلاق کی حد تک گویا علت معلول کا سلسلہ معتبر نہیں، سرِ دست اس عقیدہ کے صحیح یا غلط ہونے پر بحث نہ کیجئے

کہنا یہ ہے کہ غزالیؒ کی فلسفیانہ تشکیک کا مبنیٰ یہی عقیدہ ہے، یہیں سے اُن کا ذہن سلسلۂ تعلیل کے ابطال کی طرف منتقل ہوا، اور انھوں نے سوچا جو بات اخلاق کے دائرہ میں درست ہے، وہ طبیعات کے دائرے میں درست کیوں نہیں "

مولانا محمد حنیف ندوی فقہی مسلک کے اعتبار سے اہل حدیث ہیں، مگر اُن کے قلم سے یہ حقیقت بھی بے اختیار صفحۂ قرطاس پر آگئی :-

"اس میں شبہ نہیں کہ عوام کے لئے ایک طرح کی تقلید ہی سازگار ہے، بلکہ یہ اگر تقلید کی حد کو سے آگے بڑھیں گے، تو اس میں نہ صرف ان کے لئے خطرہ ہے، بلکہ نفسِ دین کے لئے بھی خطرات ہیں . . . " (صفحہ ۹۲)

فلسفہ و کلام پر عالمانہ انداز میں گفتگو کرنے کے بعد، لائق مقدمہ نگار اس کا بھی کھل کر اعتراف کرتے ہیں :-

"دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ جب مسلمان متکلمین نے خالص دینیاتی حقائق کو فلسفہ کی کسوٹی پر جانچنے کی کوشش کی تو خود اسلام جیسے صاف اور اُستوار مذہب کا کیا انجام ہوا؟ کیا وہ پہلا سا ایمان، وہ پہلی سی وابستگی اور وہ پہلا سا جوشِ عمل واپس آسکا، اور فلسفہ و حکمت کا ضرورت سے زیادہ استعمال مذہب و دین کے کسی عقدے کو بھی حل کرنے میں کامیاب ہو سکا؟ "

اصل کتاب کا ترجمہ نہایت شستہ اور رواں ہے، زبان منجھی ہوئی ہے! ترجمہ کے بارے میں خود فاضل مترجم نے کیا اسلوب اختیار فرمایا ہے، یہ داستان اُنہی کی زبان سے سنیئے :-

"ہمارے سامنے اس سلسلہ (یعنی ترجمہ) میں ہمیشہ سے اصل اصول یہ رہا ہے کہ اگر مصنف اُردو میں اپنے افکار قلمبند کرتا تو اس کا کیا انداز ہوتا "

مولانا محمد حنیف ندوی اگر امام ابن تیمیہ، ابن قیم اور شاہ ولی اللہؒ جیسے اکابر علماء کی خاص خاص کتابیں اُردو میں منتقل فرما دیں، تو ان کا علم و ادب پر بڑا احسان ہوگا! احیاء العلوم اور حجۃ اللہ البالغہ کے ترجمے اُردو میں ہوئے ہیں مگر کس قدر بے مزہ اور بے روح ہیں ـــــــ ایک مقام پر یہ عبارت کھٹکی :-

"اگر کوئی شخص بُرہان و دلیل کی وساطت سے کسی نتیجہ تک پہونچتا ہے تو یہ علم ہے اگر ان کے نتائج سے رُو برو دو چار ہے تو یہ ذوق ہے، اگر انہیں نتائج و معارف کو سنتا اور تجربے سے دریافت کرتا ہے تو اسے ایمان کہتے ہیں " (صفحہ ۱۶۳)

"اگر ان کے نتائج سے رو برو دو چار ہے تو یہ ذوق ہے " یہ ترجمہ گنجلک سا ہے، مصنف کے مفہوم کو پھیلا کر بیان کرنا چاہیئے تھا! پھر "ذوق" اور "ایمان" کی جو تعریف امام غزالیؒ نے کی ہے وہ خود اپنی جگہ اُلجھی ہوئی ہے!

"سرگزشت غزالیؒ" کی تصنیف و اشاعت پر صاحبِ کتاب اور ادارہ ثقافتِ اسلامیہ دونوں علمی دُنیا کی طرف سے مُبارکباد کے مستحق ہیں!

دہلی اور اُسکے اطراف انیسویں صدی کے آخر میں از :- مولانا حکیم سید عبدالحئی مرحوم، ضخامت ۲۰۹ صفحات - مجلد رنگین گرد پوش، قیمت . دو روپے ملنے کا پتہ : مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

مولانا حکیم سید عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ کا نام علم و ادب کی دنیا میں آفتاب کی طرح روشن ہے، "گلِ رعنا" اور "نزہۃ الخواطر" کے مصنف کو، کون نہیں جانتا حکیم صاحب مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے بڑی جامعیت عطا فرمائی تھی، ایک طرف وہ بلند پایہ ادیب، تاریخ اور تذکرہ نگار تھے، دوسری طرف صاحبِ تقویٰ اور اہلِ دل تھے!

مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب نے اب سے (۶۳) تریسٹھ سال قبل ۱۸۹۶ء میں دلی اور نواحِ دلی کا سفر کیا تھا، اس سفر کے واقعات کو انھوں نے "ارمغانِ احباب" کے نام سے مرتب فرمایا تھا، جو ۱۹۲۱ء میں بالاقساط مجلّہ "معارف" (اعظم گڑھ) میں علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے تشریحی نوٹ اور حواشی کے ساتھ شائع ہوئے تھے! اب یہ سفرنامہ کتابی صورت میں منظرِ عام پر آیا ہے، جس پر "تعارف" علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے قلم سے ہے اور "پیش لفظ" صاحبِ سفرنامہ کے قابلِ فخر فرزند حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے تحریر کیا ہے! صاحبِ سفرنامہ کے مختصر سوانحِ حیات اُن کے فرزندِ اکبر ڈاکٹر سید عبدالعلی کے لکھے ہوئے ہیں۔ اور مولانا علی میاں نے "اختصار و اضافہ" کے ساتھ اس سوانحِ حیات کے فٹ نوٹ درست کئے ہیں، ڈاکٹر صاحب موصوف ایک باخدا بزرگ ہیں، سراپا خیر و برکت ——— حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ پورا خانوادہ ہی چندے آفتاب اور چندے ماہتاب ہے۔

یہ سفرنامہ بڑا دلچسپ اور معلومات آفریں ہے! لکھنے والے کا دینی شغف ایک ایک سطر سے نمایاں ہے! منظر کشی، ادبی چٹخارہ اور زبان کا لطف سبھی کچھ اس کتاب میں ہے! لکھنؤ اور دلی کی چیزوں کے نرخ میں دوگنے کا فرق تھا، اس مفہوم کو صاحبِ سفرنامہ اس انداز میں ادا کرتے ہیں:—

"لکھنؤ میں اور یہاں دُونے کا بَل ہے"۔

اہلِ زبان کے لئے کان اور آنکھیں اب ترستی ہی رہتی ہیں۔

اب سے ستر سال قبل دلی کا کیا تمدن تھا؟ یہ سفرنامہ اس کی تھوڑی بہت جھلکیاں نمایاں کرتا ہے مثلاً یہ کہ شہر کے بڑے لوگ ڈولیوں میں آتے جاتے تھے ——— چائے دلی میں رواج پا چکی تھی۔ صاحبِ سفرنامہ کو کسی جگہ چائے کی دعوت میں مدعو کیا ——— بارش میں دلی کی سڑکیں بہت خراب ہو جاتی تھیں غالباً پختہ سڑکیں پورے شہر میں نہیں بنی تھیں۔ جامع مسجد دیکھنے کے لئے جو انگریز آتے تھے وہ بلا تکلف جوتوں سمیت مسجد میں پھرتے تھے ——— لال قلعہ کی سیر کے لئے ٹکٹ اس وقت بھی لگتا تھا مگر اتنا کہ ڈھائی آنے میں ایک ٹکٹ آتا تھا جو چار آدمیوں (VISITORS) کے لئے ہوتا تھا ——— عربی کی کتابیں دلی میں کمیاب تھیں۔ بعض اوقات ایک ہی کتاب کو کئی کئی طلباء مل کر پڑھتے تھے

آخری دور کے مشہور محدث مولانا سید نذیر حسین سے مولانا حکیم عبدالحی مرحوم کی جو ملاقاتیں ہوئی ہیں، اس کی تفصیل بڑی دلچسپ ہے، اس میں یہ بھی ملتا ہے کہ میاں نذیر حسین صاحب احناف کے ساتھ بہت تعصب رکھتے تھے "اثنائے سبق میں بیضاوی کی نسبت بھی الفاظ نا ملائم کہے کہ وہ فلسفی تھا۔ کچھ نہیں سمجھتا تھا، آیاتِ بینات کو اپنی قابلیت جتانے کی واسطے مہمل کر دیا ہے"۔ یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا نذیر حسین خوش مزاج ہیں۔ مزاح بھی فرماتے ہیں مگر بہت جلد خفا ہو جاتے ہیں اور ——— طالب علموں کو الفاظ سخت و درشت کہتے ہیں۔

---

* جنوری کے "فاران" میں ان شاء اللہ اس کتاب کے اقتباسات "روحِ انتخاب" کے ذیل میں دیئے جائیں گے۔
* صفحہ ۸۴ پر "استفادہ حاصل کروں"، حکیم صاحب مرحوم کے قلم سے رَو میں نکل گیا!

اس سفرنامے سے یہ تکلیف دہ اطلاع بھی ملی کہ اُن دنوں دلّی میں احناف اور اہلِ حدیث کے تعلقات سخت کشیدہ تھے۔ یہاں تک کہ ایک اہلِ حدیث مولوی کی زبان سے صاحبِ سفرنامہ نے یہ الفاظ سنے :۔

"یہ لوگ یعنی حنفی مستحل الدم ہیں، ان کا مال، مالِ غنیمت ہے ان کی بیویاں ہمارے واسطے جائز ہیں"

اور دلّی کی جامع مسجد تو واعظوں کا دنگل بنی ہوئی تھی، جمعہ کی نماز کے بعد جامع مسجد میں چار مقامات پر وعظ ہوتے تھے اور خوب خوب چوٹیں چلتی تھیں۔

مولانا حکیم عبدالحیؒ صاحب نے کسی محدثین سے "مسلسل بالاوّلیہ" کی اس سفر میں سند لی ہے ——— مگر مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ نے اُن کے اس التماس کے جواب میں فرمایا :۔

"تبرک کے واسطے لوگ سند لیتے ہیں، ورنہ گڑیوں کا یہ کھلونا ہے مجھ کو کبھی ان کا خیال تک نہیں ہوا، اصل مقصود کی طرف توجہ رہی، اصل مقصود یہ ہے کہ اشکالِ حدیث کا حل کیا جائے، تعارض دفع کیا جائے۔ مسئلہ ثابت کیا جائے، تفقہ حاصل ہو"

صاحبِ سفرنامہ کتاب و سنّت کے عالم اور عامل تھے، بدعت اور اہلِ بدعت سے اُن کو ربط نہ تھا۔ مگر تصوف کا ذوق رکھتے تھے، اسی کا یہ اثر تھا کہ قریب قریب ہر جگہ بزرگوں کے مقام دفن کو قبر نہیں "مزار" کہتے ہیں، یہاں تک کہ سرمد کی قبر کو بھی "مزار" ہی کہا ہے، حالانکہ صحابہ کرام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدفن کو بلا تکلف "قبر" کہتے تھے! صفحہ ۸۹ پر خواجہ محمد صبغۃ اللہ سرہندی کو "قیوم الزماں" لکھا ہے! "قیوم" اللہ تعالیٰ کا خاص صفاتی نام ہے، بندوں کے لئے وہ کتنے ہی محترم کیوں نہ ہوں اس نام کی نسبت درست نہیں! اپنے بعض اکابر کے لئے مجددیوں نے یہ لقب اور منصب تراشا ہے!

صاحبِ سفرنامہ بزرگانِ دین کی قبروں پر جاتے ہیں، مگر اُنکے گنبدوں، بارہ دریوں، جھاڑ فانوسوں اور قبروں کے غلافوں کو دیکھ کر ایک حرف بھی نہیں لکھتے کہ دین ان باتوں کے بارے میں کیا حکم دیتا ہے؟ اور تعظیم و احترام کے ان غلط تکلفات نے مسلمانوں کے عقائد کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے، یہاں تک کہ شاہ بُوعلی قلندرؒ کے مزار پر سب مزاروں سے زیادہ دھوم دھام اور دونوں وقت نوبت بجتی دیکھ کر بھی اُنکے اندر دینی کراہت پیدا نہیں ہوتی۔ اگر ہوتی تو قلم کے ذریعہ کاغذ پر گر رہتی۔

صفحہ ۶۳ پر حضرت شاہ عبدالعزیز کو "مولی الکل" لکھا ہے شاید اسی کے توڑ پر اہلِ حدیث میاں نذیر حسین صاحب کو "شیخ الکل" کہتے ہیں! مفرطِ عقیدت اسی قسم کے رُوپ دھارتی ہے!

حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں اُن کے بعض غالی معتقدین نے جو "غیبوبت و ظہور" کا عقیدہ گھڑ لیا تھا، اس کا کئی جگہ اس کتاب میں ذکر ملتا ہے! مولانا علی میاں کو چاہیئے تھا کہ وہ اس عقیدے کی تردید میں فٹ نوٹ لکھتے! توحید کے علمبرداروں کے یہاں یہ "باطنیت" کی جھلک! توبہ!

سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی مجاہدانہ شخصیت کو "پراسرار اور معمہ" بنانے کی کوشش کوئی اچھی بات نہیں ہے! حکیم عبدالحی صاحب مرحوم عقیدت کے جوش میں انہیں "سیدنا روحی فداہ" (صفحہ ۱۲۲) لکھ گئے۔ حالانکہ "روحی فداہ" رسول اللہ کے اسمِ گرامی کے ساتھ لکھنا مخصوص ہو گیا ہے!

اس سفرنامہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُس دور کے متعدد علماء اور صلحاء کے حالات اور اُنکے تکلم و ملاقات کے واقعات اس میں آگئے ہیں

ماہر القادری

فاران
کراچی

رکن انجمن ادبی رسائل، پاکستان

جلد ــــ ۱۱ شمارہ ــــ ۱۰

ایڈیٹر:- ماہر القادری

جنوری سنہ ۱۹۶۰ء

ترتیب

قیمت سالانہ چھ روپے فی پرچہ آٹھ آنے

مقام اشاعت:- دفتر فاران کیمبل اسٹریٹ، کراچی ۱

پرنٹر پبلشر، مسرور حسین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

انسان کے تمام جوارح واعضاء کا نام جسم ہے، جسم کے کسی ایک عضو کو جسم نہیں کہتے، انگلی جسم کا ایک جزو ہے، جسم نہیں ہے، اسی طرح آنکھ، ناک، کان، پاؤں وغیرہ جسم کے حصے ہیں "کل جسم" نہیں ہیں! اگر کسی شخص کی انگلی کاٹ دی جائے، تو انگلی کے کٹ جانے سے جسم زندہ رہے گا، موت واقع نہیں ہوگی، اس کے بعد اُس آدمی کا کان تراش دیا جائے، کان کے بعد اُس کی آدھی ناک قطع کر دی جائے اور پھر اُس کا پیر کاٹ دیا جائے، تو ان تمام اعضاء کے کٹ جانے سے آدمی مر نہیں جائیگا اور جسم زندہ رہے گا مگر ایک ایسا جسم جسکی انگلیاں سرے سے غائب ہوں، جس کا کان ترشا ہوا ہو، ناک کٹی ہوئی اور پیر قطع کر دیا گیا ہو، جسم تو ہے لیکن ایک کریہہ المنظر اور ناکارہ جسم ہے، جس کے تصور سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں!

کوئی آدمی اس طرح زندہ رہنا نہیں چاہتا کہ اُس کے اعضاء کو کاٹ چھانٹ دیا جائے اور اُس کے سینہ میں بس سانس آتی جاتی ہو اور یہ لُنجا، ناکارہ اور کٹا چھٹا جسم زندہ ہے، ایسے بیکار، اپاہج اور اعضا بریدہ جسم کے مقابلہ میں آدمی مرجانا پسند کرے گا! کوئی شخص لاکھوں روپیوں کے بدلے اپنی آنکھیں نکلوانے کے لئے تیار نہ ہوگا اور آنکھیں تو بڑی چیز ہیں، کوئی شخص اس کو گوارا نہیں کر سکتا کہ اُس کے ہاتھوں اور پیروں کے تمام ناخنوں کو اس طرح چھیل دیا جائے کہ گوشت نظر آنے لگے!

ان مثالوں کا قیاس اسلام پر کیجئے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دوسرے واجبات و سُنن، ان میں سے کوئی چیز "کل اسلام" نہیں ہے، مگر ان کو ترک کر دینے سے ایک شخص کے اسلام کا وہی حال ہوگا، جو ایک دست و پا بریدہ اور ناک کان کٹے جسم کا ہوتا ہے! ایک مسلمان جو اسلام کی حقیقت کو پہچانتا ہے، جو اسلام کو عزیز رکھتا ہے، جس کے دل میں خدا کا خوف پایا جاتا ہے، جو جسم کی طرح ایمان کی صحت و بیماری اور زندگی و موت سے باخبر ہے، وہ اسلام کے کسی رکن، حکم اور تقاضے کا نقصان خوشی سے گوارا نہیں کر سکتا، ہاں! ذہول و غفلت اور نفس کی سرکشی کی اور بات ہے، لیکن اس عالم میں بھی اس کا ضمیر اندر اندر ہی چٹکیاں ضرور لیتا رہے گا یہاں تک کہ اسے توبہ و انابت کی توفیق میسر آجائے۔

جس طرح کوئی آدمی اپاہج، ناکارہ اور اعضا بریدہ جسم کو پسند نہیں کر سکتا، اس طرح اللہ تعالیٰ کو بھی کسی مسلمان کا "مفلوج و ناقص اور ناکارہ اسلام" مطلوب نہیں ہے ——— ایسا اسلام، جس میں نماز اور روزے کا اہتمام نہ ہو، جس میں معروف کی جگہ منکر پھولتا پھلتا نظر آئے، جس میں اقامتِ دین کی جدوجہد کا سرے سے داعیہ ہی نہ ہو، اُس جسم کی مانند ہے، جس میں بس تارِ نفس تو متحرک ہو، باقی تمام جسم ماؤف ہو گیا ہو ——— اسی "کل اسلام" کو صحت مند اور توانا رکھنے کی خاطر حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسلام کے ایک جزو ——— زکوٰۃ ——— کے لئے مانعینِ زکوٰۃ کے ساتھ اس طرح جہاد کیا، جس طرح مرتدین سے جہاد کیا جاتا ہے!

جس طرح انسانی جسم کے تمام اعضاء یہاں تک کہ انگلی کی پور بھی، اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے، اور اس کا نقصان پورے جسم ہی کا

نقصان ہے، اور جسم کے کسی حصہ میں ذرا سی پھانس چبھ جائے تو پورا جسم بے چین ہو جاتا ہے اور جسم کا ہر عضو دوسرے عضو کے ساتھ مربوط ہے اور اعضا کے بھی باہم مربوط مرکب اور جڑے رہنے کا نام "جسم" ہے، اسی طرح دین اسلام کے تمام احکام کا اسلام سے جسم کے اعضا کی طرح تعلق ہے، اور کسی ایک حکم کے دانستہ چھوٹ جانے سے اسلام کا نقصان واقع ہوتا ہے! جس طرح انگلی کی ذرا سی کور کے زخمی ہو جانے اور کچھ ٹوٹ جانے سے جسم اپنا نقصان محسوس کرتا ہے، اسی طرح سیدھے ہاتھ کے بجائے الٹے ہاتھ سے اور تین سانسوں کی جگہ ایک ہی سانس میں غٹ غٹ پانی پینے سے، سنّتِ رسولؐ کی خلاف ورزی ہوتی ہے اور یہی دین کا نقصان ہے۔

اوپر کہا جا چکا ہے کہ جسم کا چھوٹے سے چھوٹا عضو یہاں تک کہ انگلی کی پور بھی بہت کچھ اہمیت رکھتی ہے اور اس کی حفاظت بھی ضروری ہے اور اس کا نقصان بھی جسم ہی کا نقصان ہے، مگر اس اعتراف کے ساتھ، اس حقیقت کو بھی سمجھ لینا چاہیے کہ جسم کے تمام اعضاء و جوارح جسم کی زندگی کے لئے بالکل ایک جیسے نہیں ہیں! ہاتھوں اور پیروں کی انگلیوں کے مقابلہ میں آنکھوں کو جسم میں زیادہ اہمیت حاصل ہے! اگر ایسا کوئی جبر یا ناگزیر صورتِ حال درپیش آجائے کہ ہاتھ پیروں کی انگلیوں اور آنکھوں میں سے کسی ایک کا ضیاع اور نقصان گوارا کرنا پڑے، تو ترجیحی فیصلہ آنکھوں کے حق میں ہوگا کہ آنکھوں کا نقصان، انگلیوں کے مقابلہ میں زیادہ شدید نقصان ہے

انسانی جسم میں دل کی اس قدر اہمیت ہے کہ دل کی بیماری سے زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے، دل کے شدید دورے کی حالت میں ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے کہ زندگی جواب دے رہی ہے، اسلام میں یہی حالت نماز کی ہے، کہ عمداً نماز کے چھوڑ دینے کو "فقد کفر" سے تعبیر کیا گیا ہے، گویا کہ "انکار" کی سی کیفیت پیدا ہو گئی، جس نے بے نمازی کے دین ہی کو خطرے میں ڈال دیا، ایک ایسے مریض کا تصور کیجئے، جس پر دل کے دورے پڑتے ہوں، اس مریض کو جب تک اس کے بدن میں سانس باقی ہے، مُردوں کی طرح زمین میں دفن تو نہیں کر سکتے، مگر حقیقت میں وہ زندہ درگور ہے، یہی حال اس شخص کا ہے جو مسلسل نمازیں قضا کر رہا ہو، کہ اس پر کفر کی موت گو واقع نہیں ہوئی مگر اس کے ایمان و اسلام پر بے یقینی، نافرمانی اور انکار کا عالم سکرات طاری ہو چکا ہے۔

یہ جو کہا گیا ہے کہ انسانی جسم میں تمام اعضاء جوارح کی بالکل ایک جیسی حیثیت نہیں ہے تو اس سے کسی کو یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہیئے کہ سر کے زخمی ہونے اور آنتوں کے کٹ جانے سے تو بے شک آدمی کے مر جانے کا قوی اندیشہ ہے مگر انگلی کے کٹ جانے سے، صرف تکلیف ہو کر رہ جاتی ہے! بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انگلی کٹنے سے اتنا خون نکل جاتا ہے، یا انگلی کی چوٹ اس درجہ مسموم ہو جاتی ہے کہ اس کے اثر اور صدمہ سے موت واقع ہو جاتی ہے، اسی طرح سنّتِ غیر مؤکدہ اور فروعی احکام و مستحبات سے بے پروائی اور غفلت برتنے اور انہیں بے وقعت و غیر اہم سمجھنے سے بھی ایمان و اسلام کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے، اور رفتہ رفتہ پوری زندگی مسموم و ماؤف ہوتی چلی جاتی ہے۔

کوئی انسان صرف زندہ رہنا نہیں چاہتا بلکہ صحت و توانائی اور آرام و آسائش کے ساتھ زندہ رہنا چاہتا ہے، جسم کے ایک ایک عضو کو قیمتی سمجھ کر اس کی حفاظت کی جاتی ہے، اور صرف حفاظت ہی نہیں کی جاتی بلکہ جسم کے بناؤ سنوار کے لئے اہتمام ہوتا ہے سر کے بال جنہیں کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے، ان تک کا آدمی اس قدر خیال رکھتا ہے کہ جب تک کہ وہ سر پر رہیں، قرینہ کے ساتھ رہیں۔ ناخنوں کی کوروں تک کو ناہموار نہیں رہنے دیا جاتا، اور انگلی پر ذرا سا دھبہ لگ جائے تو وہ آنکھوں میں کھٹکتا اور چبھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اُسے صاف کر دیا جاتا ہے ——— دینی زندگی کے ساتھ بھی ایک مسلمان کا یہی برتاؤ اور سلوک ہونا چاہیئے کہ اس کے معمولی سے معمولی جزو کو بناؤ سنوار کر رکھا جائے، دامنِ کردار پر ذرا سی چھینٹ دیکھ کر بھی دل میں بے چینی پیدا ہو اور جب تک یہ چھینٹ دور نہ ہو جائے دل میں کھٹک سی ہوتی رہے! فرائض و واجبات تو اسلام کی جان ہیں، مگر دینی زندگی کے حسن و

آلائش کے لئے نوافل تک کا اہتمام کرنا چاہئیے ! اور دینی زندگی کو بڑے صدموں اور بھاری نقصانوں ہی سے نہیں بلکہ بے کیفی سے بچانے کے لئے مکروہات اور لایعنی باتوں سے بھی اجتناب ضروری ہے۔ انسان زبان کے ذائقہ کے تقاضے پورا کرنے کے لئے کیا کیا جتن کرتا ہے، اور ذائقہ ذرا سا بھی خراب ہو جائے تو زندگی کیسی بے مزہ اور طبیعت گری گری سی معلوم ہوتی ہے ــــــ تو دینی زندگی بھی ایک ذائقہ رکھتی ہے، اس کے بھی کچھ تقاضے ہیں اور اس ذائقہ میں ذرا سا بھی فرق واقع ہو جائے تو اس کی دُرستی کی تدبیر کرنی چاہئیے ؟ دینی زندگی کے ذائقہ کا خراب ہو جانا یہ ہے کہ اللہ اور رسول ؐ کے نزدیک جو باتیں مکروہ اور جو افعال ناپسندیدہ ہیں، ان کی کراہت کا احساس کمزور ہو جائے اور اُن کی نفرت کا جذبہ سرد پڑ جائے ! جس طرح جسمانی کمزوریوں کے علاج کے لئے آدمی دوڑ دھوپ کرتا ہے، اسی طرح دینی زندگی کی سُستی اور اعصاب کے ڈھیلے پن کو دور کرنے کے لئے تگ و دو کرنی چاہئیے، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس شخص کی حالت پر افسوس کے ساتھ حیرت کا بھی اظہار کیا ہے جو اپنے جسم کو چست و توانا رکھنے کے لئے تو سب کچھ کرتا ہے مگر دینی صحت مندی سے غفلت برتتا ہے !

اسلام

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد :۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً

(اے ایمان والو، اسلام میں پورے داخل ہو جاؤ)

کی شرح و تفسیر ہے ! عیسائیت، ہندو مت اور دوسرے مذہبوں کی طرح اسلام کوئی پرائیوٹ مذہب نہیں ہے، مسلمان کی زندگی مختلف خانوں میں بٹی ہوئی نہیں ہو سکتی کہ کچھ خانوں کا تو اسلام احاطہ کئے ہوئے ہو، اور کچھ خانے اسلام سے مستثنیٰ قرار دے لئے جائیں، اسلام ہر دو رنگی، دوعملی اور نفاق کو گوارا نہیں کرسکتا، ایک مسلمان چاہے وہ فیکٹری میں ہو، یا میدانِ جنگ میں، تجارت کی منڈی میں ہو، یا پارلیمنٹ میں، دفتر میں ہو یا کھیت میں، کالج میں ہو یا چوپال میں، خلوت میں ہو یا جلوت میں، عدالت کی کرسی پر ہو یا گواہوں کے کٹہرے میں، غرض ہر جگہ وہ "مسلمان" کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اُسے ہر ماحول میں اللہ اور رسول ؐ کے احکام کی پابندی کرنی ہے ! اسلام کے حدودِ عمل سے نہ سیاست باہر ہے اور نہ فوجی ڈسپلن، نہ کارخانوں اور تجارتی منڈیوں کو اس سے مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے، اور نہ دفاتر اور دانش گاہیں اس سے باہر ہو سکتی ہیں، اسلام دینِ فطرت ہے اور فطرت کو پوری زندگی پر غالب ہونا چاہئیے !

پورے کا پورا قرآن مجید، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّتِ مطہرہ اور صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے آثار یہ سب کے سب اسلام ہی کی تعریف (Dafination) اور تشریح کرتے ہیں ! اسلام آفتاب کی طرح روشن حقیقت ہے، اس کے مفہوم میں ذرا سی بھی پیچیدگی اور الجھاؤ نہیں ہے، اس لئے اسلام کسی جدید تشریح کا محتاج نہیں ہے ! یہودی اور عیسائی مستشرقین تک نے اسلام کے بارے میں اپنی ایسی کوئی اُلجھن پیش نہیں کی، جس سے یہ واضح ہوتا ہو کہ اسلام اُن کی سمجھ میں نہیں آیا، اور وہ اسلام کے بارے میں کسی تشریح و وضاحت کی ضرورت محسوس کرتے ہیں ! اسلام ایک کھلی ہوئی کتاب ہے جسے ہر کوئی پڑھ سکتا ہے ! اُس کی کسی نئی تشریح اور جدید تعریف کی نہیں بلکہ درحقیقت عمل کی ہے۔ ہم مسلمانوں کی عملی کوتاہیوں اور غفلتوں نے اسلام کو اجنبی اور مغریب العیاذ بنا دیا ہے ! اسلام کے پاس درایت و روایت اور عقل و نقل کے اتنے ذخائر موجود ہیں کہ وہ فکر و نقل کی جدت آفرینیوں سے قطعاً بے نیاز اور ماوراء ہے ! بو علی سینا سے بڑھ کر فلسفی و مفکر اور کون ہو سکتا ہے اُس کے فلسفیانہ افکار تک نے اسلام کی تشریحات میں کوئی اضافہ نہیں کیا، بلکہ اپنی عقلی موشگافیوں سے اس اُجالے میں کچھ دھندلاہٹ

ہی پیدا کر دی، اسی لئے تو علامہ اقبال بے اختیار پکار اٹھے۔ ۶

بو علی اندر غبارِ ناقہ گم

اسلام کو اپنی تشریح کے لئے کسی فارابی، بو علی سینا اور ابن رشد کی نہیں بلکہ تفہیم کے لئے امام ابو حنیفہؒ، احمد بن حنبلؒ، اور ابن تیمیہؒ کی ضرورت ہے، جن کے پاس یقین و تقویٰ کے علاوہ فکرِ مستقیم اور جرأت بیباک بھی ہو ——— اور یہ جو برسوں سے اسلامک ریسرچ کا شور مچا ہوا ہے، تو یہ ریسرچ اسلامی علوم اور اسلامی تاریخ میں ہو سکتی ہے، اور وہ بھی اسلام کی عظمت و صداقت لوگوں کے دل میں بٹھانے کے لئے، جہاں تک اسلام کے احکام و قوانین کا تعلق ہے ایک کروڑ ریسرچ اسکالر بھی مل کر اسلام کے کسی حکم میں رد و بدل نہیں کر سکتے! سود اور قمار بازی حرام ہی رہیں گے، چاہے سارے جہان کے مسلم مفکرین اور اہل الکشاف ملت کی اقتصادی حالت سدھارنے کے خیال سے اُن کے جواز کے لئے دلیلیں فراہم کر دیں، اس قسم کی دلیلیں ایسے مفکرین و مکتشفین کے منہ پر ماردی جائیں گی!

اسلامی ثقافت کے احیاء کی اہمیت میں کس کو شک ہو سکتا ہے اور جہاں تک جائز تفریحات کا تعلق ہے اُن کی ضرورت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے مگر کوئی ثقافت کے مسائل کو اس زاویۂ نگاہ سے سوچے اور تفریحات کی لے اس حد تک بڑھا دے کہ رقص و سرود ثقافت کا ایک شعبہ قرار پائیں اور تمدن و تہذیب کی علامت بھی جائیں، تو اس غور و فکر اور تعمیر و ترقی کی کوشش میں چاہے کتنا ہی خلوص شامل اور ملت کی کیسی ہی دردمندی کیوں نہ شریک ہو۔ دین و اخلاق کے حق میں ایسی کوششوں کا نتیجہ اچھا نکل ہی نہیں سکتا۔ اس سے طرح طرح کے اخلاقی مفاسد پیدا ہوں گے اور یہ بات ہم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے ہیں، کتاب و سُنت میں رقص و سرود کی محفلوں کے لئے کوئی دلیل جواز نہیں ملتی اور خلفاء راشدین کے یہاں بھی اس قسم کی محفلیں نہیں جمتی تھیں، اسی پر دوسرے مکروہات، کھیل تماشوں اور ناجائز تفریحات کا قیاس کیا جا سکتا ہے، ہاں! بعض مسلمان بادشاہوں کے قصر و ایوان میں طاؤس و رباب، جام و مینا اور رقص و سرود کے مناظر ضرور نظر آتے ہیں، اور اسی نقطہ سے ملّتِ اسلامیہ کا زوال شروع ہو جاتا ہے!

دینی نظام

اس حقیقت سے انکار اور فرار کی جرأت کون کر سکتا ہے کہ اللہ کے دین کو پورے کا پورا قائم ہونا چاہیے؟ اور اقامتِ دین اور نظامِ حکومت لازم و ملزوم ہیں! اسلام کا نام لینا آسان اور اس کی شان میں قصیدہ وسناد ہنا آسان تر ہے مگر اسلام کے تقاضوں کو پورا کرنا دشوار ہے، دشوار اس اعتبار سے ہے کہ اس کے لئے نفس کی بہت سی خواہشوں کو قربان کرنا پڑتا ہے، اور اپنی مرضی اللہ اور رسولؐ کی رضا کے تابع کئے بغیر اسلام کے تقاضے پورے نہیں ہوتے!

یہ کوئی نہیں کہتا کہ جہاں کہیں بھی مسلمان موجود ہوں اور اس جگہ دینی نظامِ حکومت نہ پایا جائے، وہاں اسلام ہی سرے سے موجود نہیں ہے اور ایسے مسلمان جو غیر دینی نظامِ حکومت کے تحت زندگی گزار رہے ہیں، ان کا اسلام اور ایمان ہی غیر معتبر ہے اور وہ کفر کا ارتکاب کر رہے ہیں! امریکہ اور آسٹریلیا میں جو اللہ اور رسولؐ کے ماننے والے بستے ہیں اور روس میں جو اہلِ ایمان رہتے ہیں، وہ مسلمان ہیں۔

دینی نظام کو برپا کرنے، معروف کو قائم اور منکر کو مٹانے کا بہت کچھ تعلق مردِ مومن کے قلب سے ہے، اگر کوئی مسلمان ایسے ماحول میں گھرا ہوا ہے، جہاں دینی نظام کو عملاً برپا کرنے کے لئے حالات سازگار نہیں ہیں، تو اُس کے دل کو تو کم سے کم لادینی نظام کی کراہت محسوس کرنی چاہیئے! اگر مسلمان کا دل بھی لادینی نظام کو قبول کر لے، تو اس کا حال اس شخص کے دل کا سا ہے

جو "ترک صلوٰۃ" پر (معاذاللہ) رضامند ہوجائے! اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کے قلب وضمیر کو اس حالت سے محفوظ رکھے، جو ضعفِ ایمان سے بھی نیچے کا درجہ ہے۔

اسلامی ریاست یا دینی نظامِ حکومت کوئی ایسی اصطلاح نہیں ہے، جسے چند مولویوں نے اپنے فائدے یا "بڑے آدمیوں" کے حقوق فرمانروائی سے بے دخل کرنے اور ان کا اقتدار چھیننے کے لئے اپنے دل سے گھڑ لی ہو، یہ نظامِ حکومت وہ "خلافت موعودہ" ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہے:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ۔

اللہ تعالیٰ نے مومنین اور نیکوکاروں سے وعدہ کیا ہے، کہ وہ ان کو زمین میں حاکم بنائے گا جس طرح تم سے پہلے لوگوں کو خلافت تفویض کی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اقامت دین کے لئے جو جدوجہد فرمائی تھی، اور حضورؐ نے اور آپ کے صحابہ کرامؓ نے جو محنتِ شاقہ برداشت کی تھی، اس کا ثمرہ امت کو "خلافتِ الٰہی" کی شکل میں ملا، اور حضورؐ نے اپنے بعد ایک ایسی حکومت چھوڑی، جس کے حدود میں کتاب وسنّت کا حکم چلتا تھا۔ جہاں نیکی اور پاکبازی خودرو سبزے کی طرح اُگتی تھی اور جس کی سوسائٹی شریف اور نیک لوگوں پر مشتمل تھی!

خلافت علیٰ منہاج النبوت، اسلامی ریاست اور دینی نظامِ حکومت کا نام سن کر تو ایک مسلمان کی آنکھوں میں چمک آجاتی ہے اور اس کے دل میں ولولے جاگ اٹھتے ہیں، جیسے اس کی سب سے زیادہ قیمتی متاع گم گشتہ اُسے مل رہی ہے! سوائے اُس شخص کے جو نفاق میں مبتلا ہو، ہر مسلمان کی یہی تمنا ہے اور ہونی چاہیئے کہ اللہ اور رسولؐ نے جن باتوں کو حرام ٹھہرایا ہے اُن کو عملاً قانون وطاقت کے زور سے بھی حرام قرار دیا جائے اور جن نیکیوں کو پھیلانے کا حکم دیا ہے اُن کو قائم کیا جائے!

وہ خطہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو، اگر وہاں کے مسلمان اللہ کے دین کو پورے کا پورا قائم و برپا نہ کرسکیں، تو اس سے بڑی ان کی بدنصیبی اور بدتوفیقی اور کیا ہوسکتی ہے اسلامی ریاست اور دینی نظامِ حکومت اسلام کو اجتماعی طور پر عملاً متشکل کرنے کا ذریعہ ہے! اسلامی ریاست صرف رفاہی اسٹیٹ نہیں ہوتی بلکہ ایسی ریاست بھی ہوتی ہے، جہاں اسلامی اخلاق کا چلن ہوتا ہے اور نیکی اور تقویٰ جہاں کے معاشرے میں اس طرح جاری وساری رہتے ہیں جیسے جسم میں روح!

پاکستان ترقی وتعمیر کے دوراہے پر کھڑا ہے، نئی امنگیں اخلاص کے تحت ابھر رہی ہیں، اور صبحِ نو کے آثار نظر آرہے ہیں، دستور و آئین کا مرحلہ بھی درپیش ہے، اور جمہوریت بھی نئی بنیادوں پر استوار کی جارہی ہے! اس کا بھی عوام وخواص سب کو اقرار ہے کہ پاکستان کی تخلیق "اسلام اور صرف اسلام کی رہینِ منت ہے، مسلم لیگ کی رہنمائی اور مسٹر محمد علی جناح مرحوم کی قیادت کو مسلمانوں نے صرف اس لئے قبول کیا کہ اُن سے پاکستان میں اسلامی نظامِ حیات کی تجدید واحیاء کا وعدہ کیا گیا تھا۔

لہٰذا

پاکستان کو جس اسلامی نظریہ نے وجود بخشا ہے، اُسی نظریہ کو پاکستان میں متشکل کیا جانا چاہیئے۔

جس طرح مسجد کی تعمیر نماز پڑھنے کے لئے ہی ہوتی ہے، اسی طرح مسلمانوں کی غالب اکثریت کے ملک میں، دینی نظام اور اسلامی آئین ہی نافذ ہونا چاہیئے! انتخاب طریقِ کار کیا ہونا چاہیئے؟ حکومت کے دارالخلافت کے لئے کون سا مقام موزوں ہے؟ صوبوں میں علیحدہ علیحدہ اسمبلیاں ہوں۔ یا صرف مرکز میں ایک پارلیمان ہو؟ اس قسم کے مسائل میں اربابِ حل وعقد کے سیاسی

اجتہاد بلکہ شخصی رجحان تک کو گوارا کیا جا سکتا ہے کہ ملک کے نظم و نسق کی بہتری اور اُسے ابتری سے بچانے کے لئے ایسے فیصلوں کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے ہی میں سلامتی ہے۔

مگر

کسی بڑے سے بڑے آدمی کا ذاتی ذوق اور شخصی رجحان اگر اسلامی اقدار سے مطابقت نہ کرتا ہو، تو اُسے بے دریغ رد کر دیا جائیگا کہ دین کے معاملہ میں اصل کسوٹی کتاب و سنّت ہے۔

مصطفےٰ کمال پاشا کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ اُس نے خلوص و دردمندی کے ساتھ ترکی کو نئے قالب میں ڈھالا، اور اس کا مقصد تعمیر کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ اُس کی لغزشوں سے درگزر فرمائے کہ کمال پاشا اصلاح و تعمیر کے جوش اور انقلاب کے نشہ میں سرشار ہو کر بہت دور نکل گیا، کوئی شک نہیں مصطفےٰ کمال تاریخ کی بہت بڑی شخصیت ہے، مگر ملک و ملت کی اصلاح و تعمیر میں کمال پاشا کو ہم "نمونہ" نہیں بنا سکتے! کمال اتاترک کے قبضہ میں طاقت تھی، اقتدار تھا، ملک کے نظم و نسق کی باگ ڈور تھی، اس لئے ترکی کے اخباروں نے اس کے اصلاحی کارناموں کو سراہا، بعض شاعروں اور ادیبوں نے اُسے مسیحی نفس تک کہا، اس کے مجسمے شہروں کے چوراہوں پر نصب کئے گئے، مگر آج ترکی میں اسلامی بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں، لادینی رجحانات کا غبار رفتہ رفتہ چھٹ رہا ہے، اور دینی غیرت نے اتاترک کے اُن قدِ آدم مجسموں، اور مجسموں کے لئے اپنے ہاتھوں میں تیشے اُٹھا لئے ہیں!

یہ طنز اور یہ چالیں!

لادینی ذہن و مزاج رکھنے والوں اور خاص طور سے کمیونسٹوں کی زبانوں سے یہ طنز سُنی جاتی ہے کہ اتنی بہت سی مُسلم حکومتیں دُنیا میں پائی جاتی ہیں، بتاؤ کس مسلم حکومت میں "دینی نظام" موجود ہے: ہم ان معترضین اور بُتانِ طنّاز سے کہتے ہیں کہ ساری دُنیا اگر جھوٹ بولنے لگے اور سچائی کا چلن ہی زمانہ میں نہ رہے، تو ایسا ہو جانے سے سچائی کی افادیت اور ضرورت تو کم نہیں ہو سکتی! لوگوں کے بُرے ہو جانے سے اچھائی تو بُری نہیں ہو جاتی بلکہ یقین اور انسان کے بجائے تم کمیونزم کی افادیت پر یقین رکھتے ہو، اس لئے تمہیں تو اس کا حق حاصل ہے کہ جہاں کمیونزم سے بیزاری اور نفرت پائی جاتی ہے، وہاں کمیونزم کے لئے فضا کو سازگار بنا دو، مگر اللہ اور رسول کے ماننے والوں پر طنز کرتے ہو اور اُن سے اس حق کو چھین لینا چاہتے ہو کہ وہ جس نظام کو حق اور عالمِ انسانیت کے لئے مفید سمجھتے ہیں، اُس کو نافذ اور برپا کرنے کے لئے کسی قسم کی کوئی جدوجہد نہ کریں!

اے سُرخ سویرے کے خواب دیکھنے والو! اس غفلت میں نہ رہو کہ تمہاری باریک چالوں کو کوئی نہیں سمجھتا، اس دُنیا میں ایسے لوگ بھی اللہ تعالیٰ کے فضل سے موجود ہیں، جو تمہاری رگ رگ سے واقف ہیں، کسی حکومت، آئین، دستور یا ادارے سے "اسلام" کی لفظی نسبت کو بھی دور کر دیا جائے، تو اے اشتراکیو! تم اُسے اپنے مشن کی بہت بڑی کامیابی سمجھتے ہو ——— اور آرٹ اور ثقافت کے نام پر رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوں، عورتیں حُسن کے مقابلہ میں شریک ہوں، مرد و زن کے بے باکانہ اختلاط کے مواقع مہیا ہوں، جام و مینا چھلکائے جائیں، بدکاریوں کے اڈّے قائم ہوں، قمار بازی کی گرم بازاری ہو، فحش لٹریچر سے لوگوں میں ذوق پیدا ہو ——— ان تمام فواحش و منکرات میں تمہیں اپنی کامیابی اس لئے نظر آتی ہے کہ ایسی خرافات سے اسلامی اخلاق کی نفی ہوتی ہے، دلوں میں خدا کا خوف باقی نہیں رہتا اور دینی غیرت کمزور ہوتی چلی جاتی ہے۔

اے کمیونسٹو! مذہب کی دُشمنی تمہاری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے مگر مسلمانوں میں صرف انتشارِ فکر پیدا کرنے کے لئے تمہارے قلم پر دین کے انکار اور "منیر رپورٹ" سے پیدا کی ہوئی ذہنیت کی تائید میں بھی متحرک ہو سکتے ہیں! ... اس قسم کے معاملات

اور مسائل میں "اشد البلیتین" (GREATER EVIL) کو تم ترجیح ہی نہیں شہ بھی دیتے ہو، صرف اس لئے کہ ایسا کرنے سے اسلام کو صدمہ پہنچتا ہے!

امید و یقین

یہ ایک تاثر تھا جو مضمون لکھتے میں اس طرح ابھرا جیسے بیٹھے بٹھائے کسی کے دل میں ہوک اٹھتی ہے کہنے کی اصل بات یہ ہے کہ پاکستان میں پچھلے دور میں جو کش مکش ہوتی رہی ہے، اس کا سبب یہ تھا کہ پاکستان جس نظریہ کی بنیاد پر وجود میں آیا ہے، یہاں کے عوام اس نظریہ کا عملی نفاذ چاہتے تھے اور ارباب کار اس نظریہ کے عمل دخل سے گھبراتے اور کتراتے تھے، انھوں نے عوام کے دباؤ سے مجبور ہو کر ایک دستور بنا بھی دیا، مگر اُسے نافذ نہ کر سکے، پچھلے سیاست دانوں کا زیادہ تر وقت کرسیوں کی ادلا بدلی اور منصب و اقتدار کی رسّہ کشی میں صرف ہوتا تھا، قریب قریب ہر شخص یہی چاہتا تھا جو ایک بار اقتدار کی کرسی پر بیٹھ گیا ہے، مرتے دم تک کرسی سے چمٹا رہے! اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ چشم زدن میں وہ بساط الٹ گئی گئی۔ قلموں کی جگہ تیغ و سناں نے لے لی، مگر اس خاموشی اور سکون و وقار کے ساتھ کہ کسی کے جسم پر ذرا سی خراش بھی نہیں آئی اور خون کا ایک قطرہ بھی نہیں بہا ——— پچھلے سیاست داں منصب و اقتدار کی کرسیوں سے اٹھا دیئے گئے مگر عوام امید و یقین کی جس منزل میں تھے وہیں ہیں۔ امید اس کی کہ پاکستان جس مقصد کے لئے بنا ہے، اس مقصد کو پورا کیا جائے، یقین اس پر کہ اللہ کا دین ایک نہ ایک دن غالب و سربلند ہو کر رہے گا!

ماہرالقادری ۲۷ دسمبر سنہ ۶۸ء

دفتر دارالعلوم دیوبند ضلع سہارنپور

مکتوبِ گرامی

مکرمی و محترمی زید مجدکم السامی

سلام مسنون نیاز مقرون ۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا، سفر افریقہ و مصر سے واپسی پر "فاران" نومبر ۹ء میں "آفتاب نبوۃ" پر جناب کا تبصرہ پڑھا، ابتدائی حصہ تقریظ کی صورت میں ہے جو حسنِ ظن اور جذبات حوصلہ افزائی پر مشتمل ہے جس کے لئے ممنون ہوں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے الفاظ کو واقعہ بنا دے، تبصرہ کا دوسرا حصہ تنقیدی ہے جو خیر خواہی اور دردمندی کی شان لئے ہوئے ہے۔ اور سب سے بڑی خیر خواہی یہی ہے کہ آدمی کو اس کی غلطی اور فروگزاشت پر متنبہ کر دیا جائے اس کے لئے شکرگزار ہوں۔ دعا ہے کہ حق تعالیٰ توفیق دے اور حق کو حق اور باطل کو باطل دکھلائے۔

تنقید کے سلسلہ میں جہاں تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے "اصل نبی" اور مربی انبیاء ہونے کا تعلق ہے مناسب ہے کہ میں پہلے اپنی مراد واضح کردوں۔

مربی کے لفظ سے میری مراد پرورش کنندہ یا محافظ و سرپرست یا ترتیب دہندہ نہیں جو تین معنی جناب نے مربی کے تحریر فرمائے ہیں بلکہ نقطۂ فیض اور مرکزِ فیضان ہے۔ ایسی ہی دوسرے انبیاء علیہم السلام کی نسبت سے آپ کے "اصل نبی" ہونے اور دوسروں کے غیر اصل ہونے کے معنی میرے ذہن میں یہ نہیں ہیں کہ حضورؐ کے نور نے اور انبیاء کو نبی بنایا ہے یا آپ نبوۃ بخشندہ ہیں اور دوسروں کی نبوتیں عطاءِ خداوندی نہیں ہیں بلکہ سب فیض اور ذریعہ ایصال کمالات کے ہیں، اس کا حاصل یہ ہے کہ اور انبیاء علیہم السلام کو بلاشبہ حق تعالیٰ ہی نے نبی بنایا، اُن کی نبوتیں حضورؐ کے نور نے نہیں بنائیں بلکہ عطاءِ خداوندی ہیں مگر بواسطہ نورِ محمدی ہیں ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے افعال خواہ مادی سلسلہ کے ہوں یا روحانی سلسلہ کے اُن سب میں براہِ راست تخلیق و عطاء تو اللہ تعالیٰ ہی کی ہوتی ہے مگر بواسطہ اسباب نمایاں ہوتی ہے اولاد کے خالق بلاشبہ حق تعالیٰ ہی ہیں مگر بواسطہ والدین، شاگردوں کے علم کے معطی وہی ہیں مگر بواسطہ فیض استاد، مریدوں کے مقامات و احوال و کمالات کے معطی و خالق وہی ہیں مگر بواسطہ فیضانِ شیخ، سی طرح انبیاء علیہم السلام کے پاک ظروف میں نبوتوں کے رکھنے والے اور انہیں نبی بنانے والے براہِ راست حق تعالیٰ ہی ہیں مگر بواسطۂ فیضانِ خاتم النبیین۔ مضمون کی یہ نوعیت منقول بھی ہے اور معقول بھی۔ اس موقعہ پر لفظ "اصل" اور "مربی" سے میری مراد یہی ہے اور واسطۂ تربیت پر مربی اور اصل کا اطلاق عرف عام میں شائع و ذائع ہے جیسے ماں باپ کو مربی، اور اولاد کی اصل استاد کو مربی اور تلامذہ کی اصل۔ اور شیخ کو مربی اور مسترشدین کی اصل بے تکلف کہا جاتا ہے اور اس سے کسی کو بھی معطی اور خالق حقیقی کے فاعل مختار ہونے میں شبہ نہیں پڑتا، اس لئے آپ کی ذات بابرکات پر جو "اصل نبی" یا "مربی انبیاء" ہونے کا اطلاق کیا گیا ہے وہ بے علاقہ یا بے معنی یا بے اصل نہیں اور اب

اس حقیقت کا مفہوم وہی ہو جاتا ہے جو "اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰهُ یُعْطِی" کا ہے۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ اس حقیقت کی تعبیر کے تفریعی جملے جو بڑھائے تو گئے تھے ایضاح مراد کے لئے مگر وہی ذریعہ بن گئے ابہام مراد کا تو یہ تفریعی تعبیر خواہ وہ صحیح اور صحیح مطلب بھی ہو جبکہ اس سے آپ کو خلافِ مراد کا خیال گذر گیا تو اوروں کو بھی گذر سکتا ہے اس لئے آپ کی مخلصانہ تنبیہ سے متاثر ہو کر مناسب معلوم ہوا کہ اصل عبارت میں سے یہ تفریعی جملے حذف کر دیئے جائیں تاکہ لفظ "اصل" اور لفظ "مربی" کی مراد صاف ہو جائے۔ ذیل کی عبارت میں (جو جناب نے آفتاب نبوۃ سے فاران میں نقل فرمائی ہے) حذف کردہ جملوں پر خط کھینچ دیا گیا ہے۔

"بلکہ آپ کا اصل امتیازی وصف یہ ہے کہ آپ نورِ نبوۃ میں سب انبیاء کے مربی اور ان کے انوار کی اصل ہیں اس لئے اصل میں نبی آپ ہیں اور دوسرے انبیاء علیہم السلام اصل سے نبی نہیں بلکہ آپ کے فیض سے نبی ہوتے ہیں۔"

ان خط کشیدہ جملوں کے حذف کر دینے سے یہ ابہام جاتا رہا کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام اصل نبی نہیں یا حضور کے نبوت نے انہیں نبی بنایا ہے ان کی نبوتیں براہ راست عطاء خداوندی نہیں ہیں ظاہر ہے کہ یہ مضمون غلط بھی ہے اور میری مراد بھی نہیں اب باقی۔ نہ عبارت کا مطلب حسب مراد واضح ہو گیا۔

رہا یہ کہ ہمیں تعلیم دی گئی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے درمیان تفریق پیدا نہ کریں تو اس کی مراد عدم تفریق فی الایمان ہے کہ کسی پر ایمان لائیں اور کسی پر نہ لائیں نہ کہ عدم تفریق فی المراتب کیوں کہ فرق مراتب اور درجات میں انبیاء کا تفاضل منصوص ہے، تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ

اسی طرح حدیث لَا تَرْفَعُونِی "کہ بیشک میں نہیں چاہتا کہ تم میرے رتبہ سے زیادہ مجھے بڑھاؤ" اپنی جگہ حق ہے لیکن اس میں مناقب ماثورہ داخل نہیں کہ ان میں خود آپ ہی نے اور انبیاء پر اپنا بڑا ہوا ہونا باذن الٰہی بیان فرما دیا ہے تاکہ خاتم نبوۃ کی افضلیت سب پر نمایاں ہو جائے ادھر اس افضلیت کے بیان سے خودستائی کا شبہ ہو سکتا تھا تو ایسے مواقع پر "ولا فخر" کا کلمہ بھی تواضعاً استعمال فرمایا گیا ہے جو یقیناً عالم خلق میں آپ کی افضلیت مطلقہ کی ایک مستقل دلیل ہے، حاصل یہ ہے کہ منصوص تفضیل محض تفضیل ہوتی ہے دوسروں کی تنقیص نہیں ہوتی کیونکہ اس تفضیل میں افضل و فاضل کا تقابل ہوتا ہے فاضل و ناقص کا نہیں ہوتا، پھر اس حدیث کا فائدہ صرف یہ ہے کہ آپ کو بشریت کی حدود سے نکال کر خدائی حدود میں نہ لایا جائے جو یہود و نصاریٰ نے اپنے انبیاء کے ساتھ کیا نہ یہ کہ نوع بشر میں آپ کو افضل البشر اور بالفاظ دیگر افضل الخلائق نہ کہا جائے جو آپ کا صحیح مقام ہے جس کی تعبیر "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" سے کی گئی ہے

رہا تنقید کا دوسرا حصہ یعنی تمثل جبریل بصورت محمدی کو صاحب روح المعانی کے دماغ کی اُپج فرمانا میرے خیال میں تجاوز ہے، جہاں تک صاحب روح المعانی کا تعلق ہے ان کا رتبہ علماء میں مسلم ہے وہ کم از کم ہم آپ سے تو علم و فہم میں اونچے ہی ہیں ہم ان سے مستفید ہیں لئے معلم و مربی نہیں، پھر یہ کہ وہ ایک نقل پیش کر رہے ہیں اسے دماغ کی اُپج سے تعبیر کرنا زیادتی ہے اور وہ بھی باطنیت کے نزغے سے ملا کر۔ کہاں باطنیت کے ملحدانہ عقائد اور کہاں

کسی تفریعی مضمون کے سلسلہ میں بیان لطائف؟ یہ مضمون لطائف کے درجہ کی چیز ہے جو علم اعتبار سے تعلق رکھتا ہے اسے کسی منصوص یا مستنبط مضمون کے لئے بطور تائید لایا جا سکتا ہے نہ بطور دلیل کے و ما سی حد تک وہ پیش بھی کیا گیا ہے۔

ضروری نہیں ہے کہ اسے قبول ہی کیا جائے لیکن یہ ضروری ہے کہ اس کی وجہ سے اکابر مفسرین کو ہدف تہمت نہ بنایا جائے کہ ان کا سرا باطنیت کے ملاحدہ سے جوڑ دیا جائے۔ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ اس قسم کے مضامین کا عوام کے سامنے آنا مفید نہیں تو یہ مشورہ صحیح ہوگا مگر یہ کوتاہی مصنف "آفتاب نبوۃ" کی ہوگی نہ کہ صاحب روح المعانی یا شیخ عبد الغنی نابلسی کی، اور اگر عوام کو یہ مشورہ دیا جائے کہ فلاں بات گو اپنے دائرہ میں صحیح ہے مگر تم اس میں غور نہ کرو وہ تمہارے لئے نہیں خواص کے لئے ہے تو پھر اس میں مصنف آفتاب نبوۃ کی بھی کوتاہی نہ رہے گی۔

آپ کا مکرر شکریہ عرض کرتا ہوں کہ نصیحت فرمائی الدین النصح لکل مسلم للہ ولرسولہ ولائمتہم فجزاکم اللہ خیرا لجزاء مگر اس نصیحت کے لئے تو فاران جیسی بلند و بالا پہاڑی پر چڑھ کر آواز دینے کی ضرورت نہ تھی خط کا ایک معمولی پرزہ بھی کافی ہو سکتا تھا تاہم جب فاران میں تنقید آگئی تو ایضاح مراد بھی اگر خلاف مصلحت نہ ہو تو فاران ہی کی کسی قریبی اشاعت میں آجانی چاہیے۔

امید ہے کہ مزاج سامی بعافیت ہوگا۔ والسلام

(محمد طیب مدیر: دار العلوم دیوبند)

فاران:— ماہ نومبر ۵۹ء کے فاران میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند کی تصنیف "آفتاب نبوۃ" (جلد اول) پر جو تبصرہ کیا گیا تھا، مندرجہ بالا مکتوب اسی سلسلہ میں لکھا گیا ہے جو علمی وقار و سنجیدگی اور اعتراف حق کی ایک مثالی تحریر ہے! قاری صاحب مدظلہ کے اس خط نے مجھ جیسے ہیچمداں، مفلس علم اور تہی دست عمل کی آبرو بڑھائی ہے، بزرگوں کی شفقت و رافت کی یہی شان ہوتی ہے (فجزاہ اللہ خیر الجزاء)

"فاران" میں پوری ذمہ داری اور حزم و احتیاط کے ساتھ کتابوں پر تبصرہ کیا جاتا ہے، جس کی جو بات کھٹکتی ہے، اُس کا اظہار کر دیا جاتا ہے، اور محاسن کے اعتراف میں ہم کبھی کوتاہی نہیں کرتے! اگر اکابر کی فروگزاشتوں پر اسی انداز سے گرفت کی جاتی اور ان کی بزرگی اور زمانی تقدم اظہار حق کی راہ میں مانع نہ ہوتا، تو نہ جانے کتنے مسائل کی الجھنیں دور ہو گئی ہوتیں اور غلط فہمیوں کے کتنے بادل چھٹ گئے ہوتے!

اس مکتوب میں پہلی بات تو یہ کھٹکی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث:

"إِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰهُ يُعْطِي"

کو دفتر دار العلوم دیوبند کا "مونوگرام" بنایا گیا ہے ——— اہل بدعت کا یہ شعار ہے کہ وہ اپنے خطوں اور تحریروں کو اس قسم کے "لفظی و معنوی ابہامات" سے مزین کرتے ہیں، مثلاً سلسلہ قادریہ کے بعض علماء کے خطوں پر بسم اللہ الرحمن الرحیم کی جگہ "ہو القادر" اور سلسلہ چشتیہ معینیہ کے منتسبین کے یہاں "ہو المعین" دیوہ کے حاجی وارث علی شاہ کے معتقدین کے یہاں "ہو الوارث" لکھا ہوا ہم نے دیکھا ہے! "قادر" "معین" اور "وارث" اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ہیں، اور ان کو خطوں کے سرناموں پر لکھا جانا خیر و برکت

کی دلیل ہے، مگر یہ لوگ اس "پردے" میں اُن بزرگوں کے ناموں کی رعایت بھی ملحوظ رکھتے ہیں، جو حد درجہ قابلِ اعتراض بات ہے!

چونکہ دارالعلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم رحمتہ اللہ علیہ ہیں، اس لئے اس حدیث (انا قاسم) کو دفتر دارالعلوم دیوبند کے سرنامہ پر خاص طور سے درج ہونے سے، اُسی قبیل اعتراض ایہام کا پہلو نکلتا ہے! اللہ اور رسول کی ذات و صفت کے ساتھ لفظی رعایت، ایہام در تجنیس کے پیرایہ میں بھی دوسرے مردوں کے ناموں کی "شرکت" دینی اعتبار سے ناپسندیدہ فعل ہے! پھر وہ ادارہ جو "شرک و بدعت" کے رد و استیصال اور توحید خالص اور سُنتِ رسول کی تبلیغ و اشاعت کے لئے وجود میں آیا ہو، اس کے یہاں اس قسم کی بات، اور زیادہ کھٹکتی ہے! ہم دارالعلوم دیوبند کے فاضل مہتمم اور دوسرے رجال کار سے اس کی توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس کھٹک کو باقی نہ رہنے دیں گے، کہ بے خبری کی اور بات ہے مگر کسی فروگزاشت کا علم ہونے کے بعد معاملہ کی نوعیت سنگین ہو جاتی ہے۔

آیاتِ قرآنی اور احادیث نبوی سے اس قسم کے ایہام، ذو معنویت اور رمز و اشاریت کی نسبتوں پر علماء حق نے بڑی شدید نکیر کی ہے اور ایسی شاعرانہ نکتہ آفرینیوں کو گوارا نہیں کیا گیا، علامہ ذہبی نے "میزان الاعتدال" میں بہ روایت عبداللہ ابن محمد عابد ایک واقعہ بیان کیا ہے ———— کہ ایک دفعہ بارگاہِ خلافت سے ولی عہد کے نام ایک فرمان آیا جس میں یہ آیت لکھی ہوئی تھی۔

وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا

سلطان نے یہ فرمان اس لئے بھیجا تھا کہ اُسے لوگوں کے سامنے پڑھ کر سُنایا جائے! امام ابو مطیع رحمتہ اللہ علیہ (راوی فقہ اکبر) نے سُنا تو گورنر کے پاس پہنچے، اور اس سے کہا:۔

"اب دُنیا کی اہمیت اتنی بڑھ گئی ہے کہ اس کے سبب ہم کفر تک کا ارتکاب کرلیں"۔

امام موصوف نے بار بار والی صوبہ سے یہی کہا، یہاں تک کہ امیر رو پڑا اور کہنے لگا کہ میں تو آپ کے ساتھ ہوں مگر میں کچھ کہہ نہیں سکتا ہاں! آپ کو میری طرف سے امان ہے! اس کے بعد امام ابو مطیع جمعہ کے دن جامع مسجد کے منبر پر چڑھ گئے اور کہا:۔

"اے مسلمانو! کیا اب دُنیا کی اہمیت اتنی بڑھ گئی ہے کہ اُس کے سبب ہم کفر تک کا ارتکاب کرلیں، جو شخص حضرت یحییٰ علیہ السلام کے سوا اور کسی کے بارے میں اس آیت کو استعمال کرے وہ کافر ہے"۔

اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ لوگ مسجد میں دھاڑیں مار کر رونے لگے!

احتیاط و احترام کا یہی تقاضا ہے کہ آیاتِ قرآنی اور احادیثِ رسول کو شعر و ادب کی صنعتوں اور رعایتوں کے ساتھ استعمال نہ کیا جائے!

گزارشیں خود قرآن کریم کہتا ہے کہ ہم نے بعض رسولوں پر بعض کو فضیلت دی ہے، اس پر ہمارا ایمان ہے، اور یہ بات بھی سو فیصدی صحیح ہے کہ حضور ختمی مرتبت سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام نبیوں اور رسولوں میں افضل ہیں اللہ تعالیٰ کے بعد حضور ہی کا درجہ ہے، سرکار افضل البشر ہیں، اشرف خلق ہیں، عزت و کمال میں اپنی آپ مثال ہیں۔

دونوں جہان آئینہ دکھلا کر رہ گئے
لانا پڑا تمہیں کو تمہاری مثال میں

مگر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا یا حضور کی مدح و منقبت میں یہ انداز اختیار کرنا کہ جس طرح استاد کا فیض شاگردوں

ہو، شیخ کا فیض مُرید کو پہنچتا ہے، یا ماں باپ اولاد کی تربیت کرتے ہیں ———— تو حضورؐ بھی اس درجہ میں انبیاءِ کرام کے مُربّی
ہیں، درست نہیں ہے، اس قسم کے غلو سے بچنا چاہیئے! قرآنِ کریم میں اس قسم کا کوئی اشارہ تک نہیں ملتا، اور نہ رسول اللہؐ نے
یہ فرمایا ہے کہ تمام انبیاءِ کرام کو جو نبوتیں اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہیں وہ میرے "نور" کے واسطے سے دی گئی ہیں! قرآنِ کریم اور احادیث تو
یہ بتاتی ہیں کہ بعثت نبوت سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اپنے نبی ہونے یا نبی بنائے جانے کا علم ہی نہ تھا، اور حضورؐ کی
"بعثت" کو اللہ تعالیٰ مومنین پر احسان سے تعبیر فرماتا ہے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضانِ تربیت کا سلسلہ حضور صلی اللہ
علیہ وسلم کی بعثت کے بعد شروع ہوتا ہے!

قاری صاحب قبلہ پر اپنے الفاظ کی کھٹک تو ظاہر ہو گئی ہے، اور انھوں نے اپنے دو جملوں پر اس کھٹک کو محسوس فرما کر،
خطِ تنسیخ بھی کھینچ دیا ہے، مگر اُن کا یہ فرمانا۔۔

". . . . . اس لئے آپ کی ذات بابرکات پر جو "اصل نبی" یا "مربی انبیاء" ہونے کا اطلاق
کیا گیا ہے، وہ بے علاقہ، یا بے معنی یا بے اصل نہیں ہے اور اب اس حقیقت کا مفہوم
وہی ہو جاتا ہے، جو "انما انا قاسم واللہ یعطی" کا ہے۔

اس "کھٹک" کو خواہ مخواہ باقی رکھتا ہے، جس کھٹک کا احساس فرما کر، انھوں نے بعض الفاظ اپنی عبارت سے خارج کر دیئے ہیں،
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام انبیاء پر فضیلت اپنی جگہ درست ہے مگر آپ کو "اصل نبی یا حقیقی نبی" اور "مربی انبیاء" کہنا
یہ غلو کی اُس حد تک پہنچ جاتا ہے، جس کی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "اِنِّیْ لَا اُرِیْدُ اَنْ تَرْفَعُوْنِیْ فَوْقَ مَنْزِلَتِیْ" کے تحت
تحذیر فرمائی ہے تمام انبیاءِ کرام اپنی اپنی جگہ مستقل اور حقیقی نبوت کے حامل رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی　دوسرے کے "نور"
نے اُن کی تربیت نہیں کی! اور رہی یہ حدیث "انما انا قاسم واللہ یعطی" تو صاحبِ مکتوب نے یہ حدیث بے محل استعمال فرمائی ہے
اس حدیث کا مفہوم تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضورؐ کو کتاب و حکمت اور دین کا علم و فہم عطا فرماتا تھا اور آپ اس کو دوسروں تک پہنچاتے تھے۔
اس اعتبار سے حضورؐ اللہ کے دیئے ہوئے علوم دین کے "قاسم" تھے اور اب حضورؐ کی رحلت کے بعد کتاب و سنّت یہ فرض انجام دے رہی
ہیں! بعثت سے قبل آپ کی روح یا آپ کا نور علم دین کی تقسیم کا فریضہ انجام نہیں دیتا تھا، اب رہیں ———— "اول
ما خلق اللہ نوری" اور "کنت نبیاً و آدم بین الماء والطین" جیسی حدیثیں تو وہ اس قدر کمزور ہیں کہ اُن کی بنیاد پر کوئی عقیدہ قائم نہیں کیا
جا سکتا۔ جن اقوال سے خلجان و اضطراب پیدا ہوتا ہو، اور وہ ضعیف و مشتبہ بھی ہوں۔ تو ایسے اقوال سے محتاط علماء کا صرفِ نظر کرنا ہی
اولیٰ ہے، اگر کسی شخص کو تفحص و تحقیق کے بعد اس قسم کی حدیثوں کی کوئی سند بھی ہاتھ آجائے، تو قرآنی آیاتِ متشابہات کی طرح ان
"متشابہ احادیث" پر گفتگو کرنے اور اُن کے پیچھے پڑنے سے طبیعت اور ذوق کو روکنا چاہیئے!

صوفیاءِ کرام نے تنزلاتِ ستہ کے تحت "حقیقتِ محمدیؐ" کا جو عنوان قائم کیا ہے، خود اُس میں بڑی اُلجھنیں پائی جاتی ہیں
کشف و ذوق کی ان چیزوں کی دین میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔

محترم قادری صاحب مدظلہ نے اپنی کتاب "آفتابِ نبوت" میں صاحبِ روح المعانی کی جو عبارت درج فرمائی تھی کہ جبریل
نے صورتِ محمدیؐ میں نمایاں اور متمثل ہو کر مریمؑ پاک کے گریبان میں پھونک ماری جس سے وہ حاملہ ہو گئیں۔ [illegible]
ہے، اسی کو "فاران" میں صاحبِ روح المعانی کی "دماغی اُپج" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

علامہ آلوسی کو اگر اس قسم کی کوئی روایت ملی تھی، تو ایسی روایت کسی اعتبار سے بھی قابلِ اعتناء نہ تھی، انہیں اس نقل و روایت

کو اہمیت ہی دینی نہیں چاہیئے تھی، کہ اس انداز کی روایتیں زیادہ تر باطنیوں کی وضع کی ہوئی ہوتی ہیں۔ صاحب روح المعانی نے اس روایت کو نقل کر کے جو خلجان پیدا کیا تھا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ نے اس خلجان کو اور زیادہ موکد کر دیا، فرماتے ہیں۔:-

"... انھوں (جبریل) نے گویا اس صورت میں حقیقت محمدی ہی کی
نوعیت کو لے کر مریم پاک کے گریبان میں پھونک ماری، جس سے مسیح
علیہ السلام کا ماں کے پیٹ میں وجود ہوا جس کے یہ معنی ہوئے گویا
مسیح علیہ السلام کی حقیقت میں بواسطہ شبیہ محمدی خود حقیقت محمدیہ کی
نوعیت شامل تھی"

ایک طرف صاحب روح المعانی اور قاری صاحب کی یہ خلجان میں ڈالنے والی تفسیر ہے، دوسری طرف مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

"إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ
أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ"

کی شرح کس قدر محتاط انداز میں کرتے ہیں:-

"اصل میں لفظ "کلمہ" استعمال ہوا ہے، مریم کی طرف کلمہ بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مریم علیہا السلام کے رحم پر یہ فرمان نازل کیا کہ کسی مرد کے نطفہ سے سیراب ہوئے بغیر حمل کا استقرار قبول کر لے۔ عیسائیوں کو ابتداءً مسیح علیہ السلام کی پیدائش بے پدر کا یہی راز بتایا گیا تھا، مگر انھوں نے یونانی فلسفہ سے گمراہ ہو کر، پہلے لفظ کلمہ کو "کلام" یا "نطق" (Logos) کا ہم معنی سمجھ لیا، پھر اس کلام و نطق سے اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفت کلام مراد لے لی پھر یہ قیاس قائم کیا کہ اللہ کی ذاتی صفت نے مریم علیہا السلام کے بطن میں داخل ہو کر وہ جسمانی صورت اختیار کر لی، جو مسیح کی شکل میں ظاہر ہوئی اس طرح عیسائیوں میں مسیح علیہ السلام کی الوہیت کا فاسد عقیدہ پیدا ہوا، اور اس غلط تصور نے جڑ پکڑ لی کہ خدا نے خود اپنے آپ کو یا اپنی ازلی صفات میں سے نطق و کلام کی صفت کو مسیح کی شکل میں ظاہر کیا۔"

"یہاں خود مسیح کو "روح منہ" (خدا کی طرف سے ایک روح) کہا گیا ہے، اور سورۃ بقرہ میں اسی مضمون کو یوں ادا کیا گیا ہے کہ "أَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ" (ہم نے پاک روح سے مسیح کی مدد کی) دونوں عبارتوں کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مسیح علیہ السلام کو وہ پاکیزہ روح عطا کی تھی جو بدی سے ناآشنا تھی، سراسر حقانیت اور راست بازی تھی اور سرتاپا فضیلت اخلاق تھی، یہی تعریف آنجناب کی عیسائیوں کو بتائی گئی تھی مگر انھوں نے اس میں بھی غلو کیا "روح من اللہ" کو عین روح اللہ قرار دے لیا، روح القدس (Holy Ghost) کا مطلب یہ لیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اپنی روح مقدس تھی جو مسیح کے اندر حلول کر گئی تھی، اس طرح اللہ اور مسیح کے ساتھ ایک تیسرا خدا روح القدس بنا ڈالا

گیا۔ یہ عیسائیوں کا دوسرا زبردست غلو تھا جس کی وجہ سے وہ گمراہیوں میں مبتلا ہو گئے"
(تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۴۲۷، ۴۲۸)

عیسائیوں کا "روح منہ" سے یہ مراد لینا کہ اللہ تعالیٰ کی رُوح مقدس مسیح کے اندر حلول کر گئی تھی۔ کتنی بڑی گمراہی کا سبب بن گیا اور عقیدتِ مسیح کا غلو کہاں سے کہاں پہنچ گیا (استغفر اللہ)

تو دوسری طرف

"روح منہ" کی یہ تفسیر کہ یہ روح "حقیقتِ محمدی" تھی جو مریم پاک کے گریبان میں پھونک دی گئی تھی، کس قدر خطرناک تفسیر ہے جس کا قرآنی الفاظ میں کہیں دور کا اشارہ تک نہیں پایا جاتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شان میں بھی قسم کی مبالغہ آمیز یاں اور نکتہ آفرینیوں سے روکا تھا۔

صاحب رُوح المعانی کے علم و فضل کے مقابلہ میں یقیناً ہماری کوئی علمی حیثیت نہیں ہے، مگر اس تفسیر کی غلطی ہم پر اس طرح واضح ہو گئی ہے، جیسے علم حساب کے کسی بہت بڑے پروفیسر کے اس قول کو ——— "دو اور دو (۲+۲) ز دیو منفرجہ کی حقیقت کا ظہور ہیں"؛ کوئی مبتدی اور معمولی طالب علم یہ کہہ کر رد کر دے کہ پروفیسر صاحب نے بڑی بہکی ہوئی بات کہی ہے۔

صاحبِ روح المعانی نے قرآن کی تفسیر میں جس فکر و نظر کا مظاہرہ کیا ہے، اُس سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا، ایسی خطرناک قیاس آرائیاں اور نکتہ آفرینیاں اس کی مستحق ہیں، کہ ان پر کسی لاگ لپیٹ کے بغیر خوب کھل کر بلکہ کس کر تنقید کی جائے۔ ہم حفظِ مراتب کی اہمیت اور اس کے حدود سے ناواقف نہیں ہیں، لیکن ایسے مقامات پر کتاب و سنّت کی عظمت اور دینی غیرت اس مصنوعی احترام کا ساتھ نہیں دے سکتی۔

صاحبِ روح المعانی نے اس سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے نہ وہ خواص سے کہنے کا ہے اور نہ عوام کے سامنے بیان کرنے کے قابل ہے! اگر یہ بات خاص سے کہنے کی تھی اور وہی ان "اسرار و رموز" کی شدت کا تحمل کر سکتے تھے، تو انہیں اپنی تفسیر میں اس بات کو درج نہیں کرنا چاہیے تھا کہ جو چیز کتاب میں آجاتی ہے وہ عام ہو جاتی ہے! تصوف کی خطرناکیوں بلکہ بعض شدید کمزوریوں کی مدافعت کا یہ عجیب اسلوب اختیار کیا جاتا ہے ——— کہ فلاں بات خواص سے کہنے کی تھی، عوام اس کو نہیں سمجھ سکتے ——— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی، اخلاق کی اور تزکیہ نفس کی تعلیم میں اہل ظاہر اور اہل باطن، عوام اور خواص کا کوئی امتیاز قائم نہیں کیا، اور نہ صحابہ کرام نے اس قسم کی کوئی حدِ فاصل قائم کی، قرنِ اول کے مسلمانوں میں یہ ذوق ہی نہیں پایا جاتا تھا، "ہر ظاہر کا ایک باطن ہوتا ہے" اس فلسفہ کو "باطنیوں" نے تراشا اور ظالموں نے اللہ کے دین کو مسخ کر کے رکھ دیا! پورا دین ان کم بختوں کے ہاتھوں "مجموعہ لطائف و ظرائف" بن کر رہ گیا، اسی گمراہ کن تحریک نے انسان کے ذاتی "وجدان و ذوق" کو کتاب و سنّت کے مقابلہ میں بہت کچھ اہمیت دی اور اُسے حریفِ مقابل بنا دیا۔

کتاب و سُنّت کی شرح و تفسیر میں جو کوئی "لطائف" کا ذوق رکھتا ہے، وہ چاہے کتنا ہی بڑا شیخ وقت اور مُفسر کیوں نہ ہو، علمارِ حق کا فرض ہے کہ وہ اس کی تفسیر کو خوب پرکھ کر اور جانچ کر قبول کریں، اگر وہ ان "لطائف" پر نقد و احتساب کی جُرأت نہیں کر سکتے۔ تو کم سے کم اس قسم کے لطائف و عجائب کو اپنی کتابوں میں نقل کرنے سے تو اجتناب فرمائیں، چہ جائیکہ ان خطرناک لطائف کی مدافعت کی جائے۔

اکابر کی فروگزاشتوں کے بارے میں "فاران" کی یہ روش رہی ہے کہ ایک صاحب نے ہم سے دریافت کیا کہ مولانا روم

کی مثنوی کے ایک شعر پر یہاں نزاع برپا ہے۔ (اصل شعر ہمیں یاد نہیں رہا، اس کا مفہوم ذہن میں رہ گیا ہے، یہ کہ فرشتوں نے آدم کے جسد میں ذاتِ حق کی تجلّی کو دیکھ کر سجدہ کیا تھا) ———— ہم نے جواب میں لکھا کہ فرشتوں نے صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں آدم کو سجدہ کیا تھا، اسی خیال کو درست سمجھئے اور مولانا رومؔ کی ذات پر طعن نہ کیجئے!

آخر میں ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ علماء، صوفیاء اور دوسرے اکابر کے احترام کے احساس سے ہم خدانخواستہ بے پروا نہیں ہیں مگر اللہ کے دین کی عزت و عظمت پر یہ احترام غالب نہیں آسکتا!

پروفیسر اسرار احمد سہاروی

عقل واجتہاد کے دوراہے پر

سرسید کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر کسی زمانہ میں بہت کچھ لکھا گیا تھا لیکن بعد میں لوگوں کی دلچسپی اس موضوع سے ہٹ گئی۔ دوسرے نئے موضوعات پیدا ہوتے رہے اور لوگوں کی توجہ اس طرف مرکوز رہی۔ اب کچھ عرصہ سے بعض حضرات نے سرسید کے اعتقادات کی طرف پھر توجہ فرمائی ہے اور اس التفات کی وجہ یہ نہیں معلوم ہوتی کہ ان صاحبان کو سرسید کی ذات یا ان کے مذہبی خیالات سے کچھ دلچسپی پیدا ہوگئی ہے یا سرسید کے نام کو وہ لوگوں کی فراموش کاری یا نسیان سے بچانا چاہتے ہیں۔ بلکہ اصلی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کے اعتقادات اور خیالات ان حضرات کے لئے بڑی حد تک مفید ثابت ہو سکتے ہیں اور اسلام کی نئی تدوین میں شیرازہ بندی کا کام دے سکتے ہیں۔ اس طرح سے کچھ رخصتیں حاصل ہو سکتی ہیں اور کسی حد تک مغربی اعتقادات اور تصورات کے زیادہ قریب ہونے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ تجدید واحیائے دین کا طرۂ امتیاز حاصل کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ صرف مذہبی اعتقادات ہی نہیں بلکہ سرسید کی زندگی کے عام حالات۔ معاشرتی خیالات اور اصلاحی تجاویز کی طرف بھی توجہ مبذول ہو رہی ہے۔ میرے خیال سے یہ مناسب وقت ہے کہ سرسید کے خیالات کا نئے سرے سے جائزہ لیا جائے اور ان حالات کو پیش نظر رکھ کر جن سے مجبور ہو کر انھوں نے بعض اوقات غیر فطری طریقے سے کام لیا ان کے فیصلوں پر روشنی ڈالی جائے۔ یہ ضرورت خصوصاً اس وجہ سے محسوس ہوئی کہ سرسید مرحوم کے زمانے کے حالات آج موجود نہیں ہیں اور مغرب سے بیجا مرعوبیت کے لئے کوئی معذرت بھی پیش نہیں کی جا سکتی۔ اب ہمیں ایک آزاد قوم اور خود مختار ملت کی حیثیت سے سوچنا اور اپنی زندگی کے تمام مسائل کو حل کرنا چاہیے۔ سرسید مرحوم کی جو مجبوریاں تھیں وہ خدا کے فضل و کرم سے اب ہم پر مسلط نہیں ہیں۔ اب ذہنی مرعوبیت اور احساسِ کہتری میں مبتلا ہو کر دوسروں کی خاطر دینی عقائد۔ معاشرتی اصول و دینی تصورات میں کمزوری پیدا کرنا ایک مجرمانہ حرکت ہوگی جس کے لئے ہم کوئی معقول عذر بھی پیش نہ کر سکیں گے۔

سرسید تقلید کے قائل نہ تھے لیکن اس سلسلہ میں وہ اعتدال پر قائم نہ رہ سکے۔ مغربی تہذیب و تمدن سے چونکہ بہت زیادہ مرعوب ہو گئے تھے اس لئے انگریزوں کو خصوصاً اور یورپ کے دوسرے باشندوں کو عموماً مطمئن اور خوش کرنے کے لئے انھوں نے بہت سے ایسے اعتقادات اختیار کر لئے جن کی مسلمانوں میں اس دور میں اشاعت ممکن نہ تھی اور جن کا عدمِ جواز تقریباً متفق علیہ تھا۔ اور اسی خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے انھوں نے قرآن کریم کی ایک تفسیر بھی لکھ ڈالی جس میں بعض باتیں بڑی مضحکہ خیز آ گئی ہیں۔ مثلاً معجزات سے قطعی انکار۔ جنات کے وجود سے انکار اور ان کو ایک پہاڑی وحشی قوم سمجھنا۔ یہ چیزیں قرآن شریف میں اس قدر تکرار سے وارد ہوئی ہیں کہ ان کا معتقد نہ ہونا یا اس بارے میں تاویلیں کرنا عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا انکار دوسری بہت سی مافوق چیزوں سے انکار پر منتج ہو سکتا ہے۔ مثلاً پھر یہ تسلیم کرنے کو کس کا دل چاہے گا کہ قرآن خدا کا کلام ہے اور رسول کریمؐ پر براہ راست نازل ہوا۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ سرسید نے اپنی ایک تصنیف میں ایک چیز کو تسلیم کیا ہے لیکن دوسری تصنیف میں اس سے صاف انکار کر گئے ہیں۔ مثلاً ہابیل اور قابیل کے قصہ میں ہابیل کی قربانی اس طرح قبول ہوئی کہ آسمان سے ایک آگ اتری اور اس کو اٹھا کر لے گئی۔ اس روایت کو انھوں نے اپنی کتاب "تبیان الکلام" میں جو بائبل کی تفسیر ہے قبول کر لیا ہے[1] لیکن اپنی تفسیر قرآن

[1] تبیان الکلام ج ۲۰ - ص ۱۳ - ۲۱۲ -

میں اس کو خلافِ عقل سمجھ کر اس سے انکار کر گئے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ یہودیوں کی خرافات ہیں جن کو ہمارے مفسرین نے قبول کر کے اپنی تفسیر میں درج کر دیا ہے۔ اسلام کو ایسی خرافات سے مبرا رہنا چاہیئے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ کے بن باپ کے پیدا ہونے سے انکار کر گئے ہیں اور لکھا ہے کہ یوسف نجار ان کا باپ تھا۔

سرسید نے روایات کو پرکھنے کا ایک معیار قائم کر لیا تھا اور یہ معیار کسی واقعہ کا موافقِ فطرت یا خلافِ فطرت ہونا تھا اور اس کی خاص وجہ نئی مغربی تہذیب و تعلیم سے مرعوبیت تھی۔ نیچر یا فطرت کی حدود کار کو انھوں نے بعض اوقات تو اس قدر بڑھایا ہے کہ خدا اور نیچر ایک ہی سطح پر آ جاتے ہیں، اسی وجہ سے ان کے زمانہ میں اور بعد تک لوگ انہیں نیچری ہی کہتے تھے۔ انھوں نے نیچر کا لفظ انگریزی کی کتابوں میں پڑھا اور انگریزوں کی زبانی سنا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے دانستہ اپنی کچھ تفسیری مشکلات کو حل کرنے کے لیے اس کے معنی کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا اور مظاہر فطرت کو خالقِ فطرت کے مفہوم میں استعمال کیا۔ انگریزوں نے لفظ نیچر کو خالقِ فطرت یا خدا کے معنی میں کہیں استعمال نہیں کیا۔ بعض جگہ تو یہ لفظ مظاہر فطرت یعنی باغ۔ سبزہ۔ چشمہ۔ پہاڑ وغیرہ قسم کی چیزوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ بعض جگہ کسی چیز کی فطرت یا عادت یا خمیر وغیرہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ بعض جگہ نیچر سے مطلب واقعات و حادثات میں مخصوص اسباب کا وجود ہے یعنی ہر واقعہ کے کچھ اسباب ہوتے ہیں اور یہ کہ مخصوص اسباب کے بغیر ایک خاص نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ سرسید احمد خاں نے شاید غلط فہمی میں سبب کو مسبب الاسباب سمجھ لیا۔ اپنے مجموعہ مضامین میں کسی مذہب کو پرکھنے کی کسوٹی نیچر کو ہی قرار دیتے ہیں "اگر وہ مذہب انسانی فطرت یا عام نیچر کے مطابق ہے تو سچا ہے"۔

غرضکہ سرسید نے اپنی زندگی کا یہ مقصد بنا لیا تھا کہ ہر طرح وہ اسلام کو ایک فطری مذہب کے رنگ میں پیش کریں اور وہ ہر مسئلہ کو اسی رنگ میں حل کرتے کہ اس کا حل فطرت کے قوانین کے مطابق ہوتا۔ آخر میں وہ نیچر کو تقریباً عقل اور معقولیت کے معنی میں بھی استعمال کرنے لگے تھے، یعنی وہ ہر اس اعتقاد اور واقعہ کو رد کر دیتے جو ان کے نزدیک ماورائے عقل ہوتا۔ حالانکہ خالص عقل کو مذہب کی کسوٹی بنانا کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ یہاں کبھی کبھی ہمیں عقل کو رخصت بھی کرنا پڑتا ہے اور دل و دماغ کی ایمانی وجدانی کیفیت کا سہارا لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ عقل کے ساتھ جذبات کو بھی بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ تب کہیں جا کر مذہب کا صحیح خمیر تیار ہوتا ہے۔ عقل و وجدان۔ دل و دماغ دونوں ہی ناگزیر اجزا ہیں ایک جز سے یہ مرکب تیار نہیں ہو سکتا۔ خالص عقل کو بنیاد بنا لینے سے مذہب کی مادرائیت ختم ہو جاتی ہے۔ معتزلہ اور اخوان الصفا نے اس بارے میں بہت زور مارا ہے۔ متکلمین بھی پوری طاقت آزمائی کر چکے ہیں۔ لیکن وہ بھی کچھ عاجز ہی ہو کر رہ گئے تھے۔ اس معاملہ میں ایک حد تک مافوقیت اور اعتقادیت کو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔

مقامِ رسالت کی تعیین کے بارے میں بھی سرسید بڑی کمزوری دکھا گئے ہیں۔ حضرت جبریل کی پیغام رسانی کے بھی منکر ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ رسول میں خدا کی مرضی معلوم کرنے کی فطری صلاحیت ہوتی ہے اور اس کا دل ایک آئینہ ہوتا ہے جس میں خدائی تجلی ریزی ہوتی ہے کوئی فرشتہ خدا اور رسول کے درمیان پیغام رسانی کا کام نہیں کرتا۔ میرے خیال میں سرسید کی اس ترجمانی سے وہ انکار جبریل سے الہام کی کیفیت اور مافوقیت یا مافوق الفطرت ہونے میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ رسول کو بہرحال وحی رسالت کے اعتبار سے عام انسانوں سے برتر و افضل اور مافوق الفطرت ماننا ہی پڑتا ہے۔ رسول کو رسالت کا حامل تو خدا ہی بناتا ہے۔ ہر انسان تو رسول بن نہیں سکتا۔ جس نے دل کو انوار الٰہی کا آئینہ دار آخر کس نے بنا دیا۔ جو خدا یہ سب کچھ کرنے کی قدرت رکھتا ہے وہ سب

۱۔ تفسیر القرآن ج ۲ ص ۱۶۔ ۱۵

The Reformist Religious Ideas of Sir Syed by Mazhar

عقیدے میں کیا قباحت ہے کہ وہ فرشتوں کو پیدا کرے اور ان سے پیغام رسانی کا کام لے۔ بات تو یہ ہے کہ جب پہنچ جاتی ہے وحی، رسالت،
الہام ۔ وغیرہ عام انسانی افعال سے علیحدہ ہو جاتے ہیں یعنی فطرت یا نیچر کے مطابق نہیں رہتے، یہ سر سید ان سب کا انکار کر دیتے ہیں
اور اسی کو سر سید خلاف فطرت یا خلاف نیچر کہتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نیچر کے خلاف کوئی واقعہ ظہور پذیر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے
وہ آگے جا کر معجزات کے منکر ہو جاتے ہیں اور فرشتوں اور جنات کی حقیقت سے بھی انکار کر جاتے ہیں۔

یہی تفسیر قرآن میں لکھتے ہیں۔ خدا اور رسول کے درمیان کوئی پیغام رساں سوائے ملکہ نبوت کے موجود نہیں ہوتا
کو شریعت کی اصطلاح میں ناموس اکبر کہا جاتا ہے۔ وحی کا نام جبریل رکھا گیا ہے۔ رسول کا دل بیک تنبہ جو ملکہ نبوت سے
تجلی ریز ہوتے ہیں۔ یہ ایک آلہ ہے جس میں کلام خداوندی کا عکس ہے اور جبریل آواز الہٰی ظاہر ہوتی ہے ... نتیجہ صاف
فرمایا کہ سر سید باوجود کوشش کے رسالت اور الہام کو نیچر کے مطابق ثابت کرنے میں ناکام ہو گئے ہیں۔ رسول اور نبی کی
ہونا جو بے سدا الفاظ کو گرفت میں لے آئے کوئی عام بات تو ہرگز نہیں ہے۔ نیچر کی حدود سے تو معاملہ آگے نکل ہی گیا۔

سر سید کو اس بات کا بڑا شدید احساس تھا کہ اسلام کو سائنس اور مغربی تہذیب کے حملوں سے بچانے کے لئے مدافعت کی
کی سخت ضرورت ہے، وہ اس مدافعت کو اپنا مذہبی فریضہ خیال کرتے تھے اور اس جوش ایمانی اور مذہب کے خلوص میں کہیں کہیں اپنی
حدود سے تجاوز کر گئے ہیں اور جہاں کچھ مدافعت کی وہاں کچھ کمزوریاں بھی پیدا کر گئے۔ اپنی ایک تقریر میں کہتے ہیں کہ یہ میرا مقدس
فرض ہے کہ میں اسلامی عقائد کی حفاظت کروں خواہ میرا طریقہ صحیح ہو یا غلط مجھے اس کی کچھ پروا نہیں۔ اسی جوش کی وجہ سے ان کے یہاں
میں افراط و تفریط پیدا ہو گئی ہے۔ اپنی ایک لاہور کی تقریر میں جو ۱۸۸۴ء میں کی گئی تھی کہتے ہیں "آج ہم کو ایک نئے علم کلام کی
سخت ضرورت ہے جس کے ذریعہ سے ہم اسلامی اعتقادات کو موجودہ سائنسی ایجادات کے مطابق ثابت کر سکیں۔ اب جبکہ میں
مغربی علوم کے ذریعہ سے ان ایجادات کو مسلمانوں میں شائع کرنے کی کوشش کر رہا ہوں تو یہ بھی میرا فرض ہے کہ ان سے جو بد نتیجے یا
نقصانات اسلامی عقائد کو پہونچ سکتے ہیں ان سے مسلمانوں کو بچانے کی بھی کوشش کروں۔ اس معاملہ میں خواہ غلط طریقہ اختیار کروں یا
صحیح ۔ میں بہرحال اسلامی عقائد کی مدافعت کروں گا اور لوگوں کو اسلام کا ابتدائی روشن چہرہ دکھلانے کی کوشش کروں گا۔ میرا ضمیر کہتا
ہے کہ اگر میں نے اپنا یہ فرض ادا نہیں کیا تو میں خدا کے نزدیک مجرم ٹھہروں گا۔"[2]

سر سید نے دراصل یہاں اپنے دل کی بات کہہ دی ہے۔ مغربی تمدن اور تعلیم کو مسلمانوں میں پھیلانے سے ان کو اس بات کی
سخت پریشانی تھی کہ کہیں نوجوان مذہب سے بیزار نہ ہو جائیں اسی وجہ سے انکی انتہائی کوشش یہ رہی کہ جہاں مغربی لوگوں کے
سامنے اسلام کی معقول (RATIONAL) ترجمانی کی جائے وہاں نئے تعلیم یافتہ نوجوان کی تسکین کا سامان بھی فراہم کر دیا جائے
اسی خواہش کے زیر اثر انھوں نے عقائد میں عقلیت کو دخل انداز کیا اور اسی کو جائز و ناجائز اور صحیح و غلط کا معیار بنا لیا۔ حالانکہ
خالص عقلیت مذہب ۔ ایمان اور اعتقاد کے بارے میں زیادہ دور تک ساتھ نہیں دے سکتی۔ جیسا کہ علامہ اقبال مرحوم نے اپنے
خطبات میں فرمایا ہے کہ عقلیت اعتقاد کی معاون تو ہو سکتی ہے لیکن راہبر نہیں بن سکتی۔ کافی دور تک اس کے ساتھ چل سکتی ہے لیکن
آخر تک ساتھ نہیں دے سکتی۔ آخر میں تھک کر بیٹھ جاتی ہے۔ سر سید سے کچھ اضطراری طور پر یہ کوتاہی ہو گئی کہ انھوں نے اعتقاد
کو عقلیت سے مغلوب کر دیا لیکن علامہ اقبال کی تیز نگاہ نے اس کمزوری کو دیکھ لیا تھا اور انھوں نے اسی وجہ سے اعتقاد کو غالب
اور عقل کو مغلوب رکھا۔ اس میں شک نہیں کہ علامہ اور سید مرحوم دونوں اپنے اپنے زمانہ کے بہترین نبض شناس تھے۔

---

[1] تفسیر اص ۲۹-۲۶ بحوالہ بیلجون ۔ [2] مجموعہ ۔ ج ۱ ۔ ص ۲۱ ۔ بحوالہ بیلجون ۔

سید صاحب نے جو موقف اختیار کیا وہ ان کے دور کے لحاظ سے مفید اور ضروری تھا۔ ان کے حق میں یہ کہنا ضروری ہے کہ اگر انھوں نے زمانہ کی رفتار کو صحیح طور پر نہ سمجھا ہوتا اور ان کی دور رس نگاہوں نے یہ اندازہ نہ کرلیا ہوتا کہ آئندہ دور مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی علوم و فنون کا ہوگا، اور اس کے حصول کی پوری کوشش نہ کرڈالی تو آج مسلمان موجودہ علوم میں بہت پیچھے رہ گئے ہوتے۔

اس کے علاوہ وقت کے لحاظ سے یہ بات بھی غلط ہوتی اگر سرسید انگریزوں کی اتنی ہی مخالفت کرتے رہتے اور ان کی تالیف قلب کی کوشش نہ کرتے جتنی بعض علما اس وقت کر رہے تھے۔ اس وقت انگریزوں سے ٹکرانا مصلحتِ وقت کے خلاف تھا۔ اور بعض دفعہ مسلمانوں نے اس قسم کے ٹکراؤ سے بہت نقصان اٹھایا اور ہندوؤں کو بہت فائدہ حاصل ہوا۔ اس کے برخلاف علامہ اقبال کا زمانہ اس بات کا متقاضی تھا کہ وہ مسلمانوں کو مغرب کی مرعوبیت سے نکالیں۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ مسلمان مرعوبیت کی وجہ سے کورانہ تقلید کی طرف مائل ہو رہے ہیں اور مغرب سے جو چیز آتی ہے خواہ مفید ہو یا مضر، مطابق اسلام ہو یا خلافِ اسلام آنکھیں بند کرکے "آمنا و صدقنا" کہہ دیتے ہیں اور اس طرح سے اپنی روایت کو ترک کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اسی وجہ سے علامہ کو قوم اور ملت کو متنبہ کرنا پڑا اور وہ بڑی حد تک لوگوں کو اس بے راہ روی سے بچائے جانے میں کامیاب ہوئے۔ قوم دونوں بزرگوں اور مصلحوں کی رہین منت اور شکر گزار ہے۔

سرسید کی زندگی میں ہی لوگوں نے ان کی اجتہادی غلطیوں پر ٹوکنا شروع کر دیا تھا۔ رسالہ تہذیب الاخلاق میں نواب محسن الملک سید مہدی علی صاحب کے نام ان کے ایک دوست کا خط شائع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے ان الزامات کو دہرایا ہے۔ جو سرسید پر عام طور سے اس زمانہ میں لگائے جاتے تھے۔ نواب صاحب سے سوال کرتے ہوئے مراسلہ نگار لکھتے ہیں: "کیا آپ کے نزدیک خدا کی جگہ نیچر کو قائم کرنا۔ ملائکہ اور شیاطین کے وجود کو نہ ماننا۔ دوزخ و جنت سے انکار کرنا۔ آدم و حوا کے قصہ کو افسانہ سمجھنا معجزات کی ہنسی اڑانا کفر نہیں ہے اور کیا وہ تفسیر بالرائے کی وعید میں داخل نہیں ہیں"۔[1] اس سوال کے جواب میں نواب صاحب نے سرسید کی کتاب "النظر فی بعض مسائل الاسلام" سے ایک عبارت نقل کر دی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید ان تمام چیزوں کے قائل ضرور ہیں لیکن ان عقائد کا اظہار ذرا نیچر کے مطابق جدید طریقے پر کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ خلاف نیچر کوئی بات کہنے میں انگریزوں کا خوف تھا اسی وجہ سے تاویلی رنگ اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً "النظر" میں لکھتے ہیں: "جو لوگ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ جنت و دوزخ برحق ہے مگر ان کے نزدیک دلیل سے ثابت ہوا ہے کہ جنت و دوزخ منوآ مالی کا سا باغ اور کلوا لوہار کی سی بھٹی نہیں ہو سکتی اور اس لئے وہ اس کا وجود شبہی قرار دیتے ہیں پھر وہ کیوں کافر ہیں۔ وہ لوگ جن کے نزدیک کسی دوسرے غیر مرئی جسم کا مادی انسان ہونا محال ثابت ہوا ہے اس لئے وہ شیطان یا ملائکہ کے وجود خارجی کے منکر ہو کر اس کا وجود فی نفس الانسان تسلیم کرتے ہیں کیوں کافر ہیں۔ جو لوگ کہ وحی من اللہ میں کسی دوسرے کے واسطے کو بدلائل محال سمجھتے ہیں اور اس قوت کو جو انبیاء میں ہے جس کے سبب ان پر نزول وحی ہوتا ہے اور جس کو ملکۂ نبوت سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے جبریل تسلیم کرتے ہیں کیوں کافر ہیں"۔[2]

سرسید کے مذکورہ بالا جملوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ معتزلہ یا متکلمین یا اخوان الصفا کی زبان سے بول رہے ہیں۔ جن کی انتہائی کوشش یہ ہوتی تھی کہ کوئی اسلامی عقیدہ عقل، منطق اور یونانی فلسفہ کے خلاف نہ ہو، اگر کوئی مسئلہ خلاف عقل نظر آتا تو اس کو سرے سے ترک کر دیتے۔ گویا ان کے نزدیک کلام الٰہی سے فلسفہ یونان زیادہ وقیع تھا۔ کچھ اسی قسم کا رویہ سرسید کا مغربی افکار کے بارے میں تھا۔ وہ بھی بعض اوقات نیچر کو کلام الٰہی پر فوقیت دینے پر مائل نظر آتے ہیں۔ اس حد تک تو بات

---

[1] تہذیب الاخلاق۔ ج ۱، ص ۳۲۱۔ [2] تہذیب الاخلاق ج ۱، ص ۳۲۲۔

ٹھیک تھی کہ ہر کام نیچر یا فطرت کے قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ اس میں اکثر و بیشتر فرق نہیں ہوتا۔ لیکن یہ کہہ کر اس میں فرق نہیں
عقیدے کی بہت سی قباحتوں کا باعث بن جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ہم دن رات دیکھتے ہیں کہ قانون فطرت کے خلاف ستنیٰ کے طور پر بھی
سے واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں اور اگر یہ کہیں کہ یہ تو ستنیٰ بھی قانونِ فطرت کے مطابق ہی لیکن ہماری [illegible]
کے اسباب ہماری نظر سے پوشیدہ ہیں۔ تو عقل تو بہرحال عاجز ہو ہی گئی۔ اگر اس بات کو یوں کہہ [illegible] فطرت [illegible]
ہ ہالیا تو اس میں کیا ایسی قباحت پیدا ہو جاتی ہے۔ خدا کے قادرِ مطلق ہونے کے تصور و در حقیقت [illegible]
برخلاف اگر اسی بات پر ضد کریں کہ یہ ستنیٰ نہیں ہے تو پھر خدا کے قادرِ مطلق ہونے کے اعتقاد میں بڑی حد تک ضعف پیدا ہو جاتا ہے جو
ایک قسم کا ایمانی نقصان ہے اور جس کی وجہ سے آگے چل کر بہت سی اعتقادی کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ [illegible]
اس قسم کا ہو جاتا ہے کہ خدا چاہے تب بھی قانونِ فطرت میں، [illegible] اسباب میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکتا [illegible]
معجزات کی بنیاد ختم ہو جاتی ہے اور اسی وجہ سے سرسید معجزات کا انکار کرتے تھے اور ان کے لئے عقلی دلائل تلاش کرنے تھے۔
اور کبھی کبھی ایسے دلائل پیش کرتے جو مضحکہ خیز ہو کر رہ جاتے۔ [۲۹۶] ۱۲۹۳ ہجری کے تہذیب الاخلاق میں نیچر پر ایک مضمون میں [illegible]
کسی نے خدا کو اور کسی طرح نہیں جانا۔ اگر جانا تو نیچر ہی سے جانا۔ موسیٰ نے رب ارنی کے جواب میں کیا سنا [illegible]
پہاڑ پر کیا تھا، وہی نیچر۔ یعنی قانونِ قدرت کا نمونہ تھا۔ خود خدا نے آپ کو کچھ نہ بتا سکا [illegible] کو [illegible]

یہاں سرسید حد سے تجاوز کر گئے ہیں۔ اور ان کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت خدا کا نور جو پہاڑ پر ظاہر ہوا [illegible]
تسلیم نہیں کرتے بلکہ ان کا عقیدہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے صرف نیچر کی طرف اشارہ کر دیا پھر نہ معلوم وہ اس کی توجیہہ کس طرح
کریں گے کہ حضرت موسیٰ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ کیا پہاڑ کو یا اس کے سبزے کو اور درختوں کو دیکھ کر حضرت موسیٰ بیہوش ہو گئے تھے۔
ان کے نزدیک خدا کا نور پہاڑ پر نظر آنا ممکن نہیں اور اسے خلافِ عقل سمجھتے تھے تو خدا کا حضرت موسیٰ سے ہم کلام ہونا۔ نہیں [illegible]
ربیت ان کے حوالہ کر دینا یہ کونسی چیز عقل میں آسانی سے آجانے والی ہے۔ یہ تمام باتیں بھی تو ماورائے عقل ہی ہیں۔ یہاں تو پھر قرآن کریم کی
یہی بات صادق آتی ہے "أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ" یہاں میں محسن الملک کے (جو سرسید کے رفیق کار
تھے) ایک خط کی تھوڑی سی عبارت نقل کرتا ہوں جس میں انھوں نے سرسید کی اجتہادی افراط و تفریط پر بڑی اچھی بحث کی ہے
خط تہذیب الاخلاق میں جلد اول صفحہ ۳۸۹ پر شائع ہوا ہے "میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ بعض جگہ تسامح کے درجہ سے گزر کر آپ
مبالغہ میں پڑ گئے ہیں اور جس حد پر پہنچ کر آپ کو ٹھہرنا چاہیئے تھا اس سے گزر گئے ہیں۔ آپ نے ان باتوں کو جو اس زمانہ کے علم و سائنس
نے پیدا کی ہیں بغیر کسی شک و شبہ کے صحیح اور یقینی مان لیا اور جو باتیں قرآن میں بظاہر اس کی مخالف معلوم ہوئی اس میں ایسی تاویلیں
کرنی شروع کر دیں کہ قرآن کا مقصود ہی فوت ہو گیا۔ اور اس پر ستم ظریفی آپ کی یہ ہے کہ آپ کے نزدیک تاویل کفر ہے اور اپنی
تفسیر کو قرآن کے الفاظ میں۔ سیاق۔ محاورے اور مقصد کے مطابق بتلاتے ہیں۔ لیکن اس سے بھی آپ کا مقصود کوسوں دور رہا۔
اس لئے کہ اگر نیچر، و "لا آف نیچر" وہی ہے جو اس زمانہ کے یوروپین حکیم بتاتے ہیں تو خدا کی خدائی اور رسول کی رسالت اور عذاب و ثواب
اقرار آبائی تقلید اور بچپن کی سنی سنائی باتوں کا اثر سمجھا جائیگا اور قرآن باوجود انکار معجزات اور خرقِ عادات اور رد دعا اور اجابت
دعا اور فرشتوں اور جنات کے نیچر اور لا آف نیچر کے خلاف ہی رہے گا ...... پس اگر یہ مسئلہ نیچر کا مان لیا جائے اور یہ "لا آف نیچر"
تسلیم کر لئے جائیں تو فرمایئے کہ وہ خدا جو خالق اور قادر اور سمیع اور علیم وغیرہ وغیرہ مانا جاتا ہے کہاں باقی رہے گا۔ اور جب تک کوئی

[۲۹۶] تہذیب الاخلاق۔ ج ۱۔ ص ۳۴۰

ڈروِن کا ہم خیال، وہ ہیگل کا ہم صفیر نہ بنجائے کیوں کر (بقول آپ کے) دانشمند کہا جا سکتا ہے۔"

بشیر احمد صاحب ڈار نے حال ہی میں ایک کتاب سرسید کے مذہبی خیالات پر لکھی ہے۔ ایک جگہ سرسید کے استدلال کے متعلق ان کو یہ لکھنا پڑا ہے "سرسید دلائل میں اُس جگہ منطقی ربط کی بھی پروا نہیں کرتے جہاں کہ وہ کسی مسئلہ میں اپنے پسندیدہ نتائج بر آمد کرنے کا ارادہ کرلیں۔" ۱؎ اسلام کو عین نیچر کے مطابق ثابت کرتے وقت بھی سرسید کے طریق استدلال پر ڈار صاحب کا یہ محاکمہ پوری طرح چسپاں ہوتا نظر آتا ہے خصوصاً معجزات اور خوارقِ عادت کے باب میں ان کے دلائل بہت پوچ اور کمزور ہو جاتے ہیں۔ اسلام کو نیچر کے مطابق ثابت کرنے کے لئے دیکھئے کس حد تک آگے بڑھ گئے ہیں "اسلام ایک اتنا سادہ مذہب ہے کہ لا مذہبیت بھی اس میں شامل ہے۔ ہر مذہب میں کچھ ایسے رسومات و اعتقادات ہوتے ہیں جن سے وہ دوسرے مذاہب سے ممتاز ہوتا ہے۔ لیکن اصل مذہب ان رسومات اور اعتقادات سے پاک ہوتا ہے۔ وہ ایسا ہی مذہب اسلام ہے جسے ہم نیچر یا فطرت بھی کہہ سکتے ہیں وہ شخص جو کسی ... وقت ... الہامی کتاب میں یا اعتقادی رسومات میں یقین نہ رکھتا ہو بلکہ صرف خدائے واحد پر ایمان لائے صحیح معنوں میں مسلمان ہے۔"

اب آپ خود ہی سوچ لیں کہ رسول اور الہامی کتاب پر ایمان نہ لاکر اسلام کس حد تک باقی رہ سکتا ہے حالانکہ قرآن کریم میں کتنی جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کو رسول اللہ کی اطاعت کے ساتھ مشروط قرار دیا ہے مثلاً اَطِیعُوا اللّٰهَ وَاَطِیعُوا الرَّسُولَ۔ دوسری جگہ مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ یعنی جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔ اور اسی قسم کی بہت سی مثالیں قرآن اور احادیث سے نکال کر پیش کی جاسکتی ہیں۔ دوسرے رسولوں کے متعلق بھی ان کی رائے کچھ زیادہ صاف نہیں مثلاً ان کو معمولی انسان کی حیثیت دینا اور ان کے معجزات سے انکار کرنا بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ مثلاً حضرت عیسیٰ کے متعلق یہ کہنا کہ وہ یوسف نجار کے بیٹے تھے یا یہ کہ مسیح کا مُردوں کو زندہ کرنا غلط ہے۔ لیکن وہ اس واقعہ کی معقول توجیہہ نہیں کرتے کہ لوگوں نے حضرت مریم کو طعنہ دیا کہ تیری ماں اور بھائی ایسے نہیں تھے۔ تیری ماں بدکار نہیں تھی۔ پھر حضرت مریم نے حضرت عیسیٰ کو جبکہ وہ چند دن کے ... بچے تھے ہی عصمت کی گواہی میں پیش کیا اور انھوں نے بولنے سے لیٹے لیٹے کہ کہ میں اللہ کا بندہ ہوں وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح خدا کا تصور پیش کرنے میں وہ بھٹک کر رہ گئے ہیں یہاں دو عوامل برابر کی طاقت سے کام کر رہے ہیں ایک تو ان کا اپنا مذہبی اعتقاد دوسرا مغربی تصور جو نیچریت کی طرف مائل ہوتا چلا جارہا تھا۔ اسی وجہ سے ان کی تحریر میں کہیں کہیں تضاد پیدا ہو جاتا ہے "ایک جگہ تو وہ خالص مذہبی رنگ میں بات کرتے ہیں لیکن دوسرے مقام پر اس طرح گفتگو کرتے ہیں جیسے خدائے واحد کے تو قائل ہیں لیکن الہامی مذہب کے قائل نہیں اور کہیں ان دونوں اعتقادات کو یک جگہ جمع کرتے نظر آتے ہیں۔" ۲؎

اسی طرح جہاد کے معاملہ میں سرسید نے انگریزوں کے عہد کی مصلحت کو ملحوظ رکھا ہے ان کے نزدیک جہاد صرف دو صورتوں میں جائز ہے۔ ایک تو ایسی صورت میں جبکہ کفار اسلام کو مٹانے کے لئے مسلمانوں پر حملہ کردیں۔ اور دوسرے اس وقت جبکہ مسلمان کسی کافر کی حکومت میں رہتے ہوں اور انہیں مذہبی فرائض ادا کرنے کی اجازت نہ ہو یا اس میں حکومت کی طرف سے رکاوٹ ڈالی جاتی ہو۔ پہلی شق میں یہ شرط کہ اگر کفار صرف اسلام دشمنی سے حملہ کریں تو جہاد جائز ہے لیکن اگر توسیع حکومت کے لئے حملہ کردیں تو جہاد جائز نہیں کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ غلام بن جانے کے بعد کسی قوم کی کونسی چیز محفوظ رہ سکتی ہے۔ ذہنی غلامی مسلط ہو جاتی ہے۔ جو سب سے زیادہ خطرناک صورت ہے۔ پھر فاتح قوم چاہتی ہے کہ اس کی تہذیب و تمدن بالا دستی اختیار کرے اور مفتوح قوم مرعوب ہو کر خود بخود فاتح ...

(1) Religious Thoughts of Syed Ahmed Khan P. 152

(2) Ibid P. 156 (3) Ibid P. 177

ہمارے چند مطبوعات

اساس التعلیم مجلد	عبدالحیٔ سب جج	فن تعلیم	۳ - ۰
امداد باہمی مصور	اظہر علی علوی	تاریخ	۵ - ۰
باغ فردوس	ولایت علی فردوس	منظوم فسانۂ عجائب	۱ - ۴
تاریخ امریکہ	یحییٰ تنہا بی اے	تاریخ	۲ - ۸
تاریخ اندور	امیر احمد علوی	″	۱ - ۰
خسرو کی پہیلیاں	مرتبہ شاہین ظفر	پہیلیاں	۰ ۸
سفر سعادت	امیر احمد علوی	سفرنامہ حج	۱ - ۸
قواعد المنتخب (نیا ایڈیشن)	جدل لکھنوی	اردو قواعد	۰ - ۸
مولانا شبلی (نیا ایڈیشن)	سعید انصاری	تنقید	۱ - ۸
واقعات کربلا	مرتبہ: منظور علی علوی	مراثی انیس	۲ - ۸
ہنسانے فسانے	ابوتمیم فرید آبادی	افسانے	۲ - ۸

بغیر اُستاد شاعری سیکھئے!

عشرت لکھنوی کی معروف ترین

شاعری کی چار کتابیں (پانچواں ایڈیشن)

جو ہزاروں اشخاص کو شاعر کامل بنا چکی ہیں اور جنکی ضرورت اساتذہ اور شاگرد دونوں کو محسوس ہوتی ہے

قیمت :- تین روپیہ - محصولڈاک : ایک روپیہ

ہر فن کی اردو، فارسی، عربی کتابوں کے لئے ہمیں یاد رکھئے (پاکستانی خریدار رقم پاکستان ہی میں جمع کر سکتے ہیں)

ناشر الناظر بک ایجنسی ــــ لکھنؤ ــ (بھارت)

میں ایک نعت کہوں

نعیم صدیقی

ہے دل میں جوشِ عقیدت کہ ایک نعت کہوں
میں اپنے زخموں کے گلشن سے تازہ پھول چنوں
پھر ان پہ شبنمِ اشکِ سحر گہی چھڑکوں
پھر ان سے شعر کی لڑیاں پرو کے نذر کروں
میں ایک نعت کہوں، سوچتا ہوں کیسے کہوں

میں تیرہ صدیوں کی دوری پہ ہوں کھڑا حیراں
یہ میرا ٹوٹا ہوا دل، یہ دیدۂ گریاں
یہ منفعل سے ارادے، یہ مضمحل ایماں
یہ اتنی نسبتِ عالی، یہ اپنا حال زبوں
میں ایک نعت کہوں، سوچتا ہوں کیسے کہوں

نہ سامنے کوئی منزل، نہ راستا معلوم
نہ رہزنوں کی خبر ہے، نہ رہنما معلوم
یہ کیا مقام ہے، اپنا نہیں پتا معلوم
یہ کیا زمین ہے آخر یہ کون سا گردوں
میں ایک نعت کہوں، سوچتا ہوں کیسے کہوں

شراب کی ہیں رواں ندیاں جہاں میں ہوں
سرودِ عیش ہے تسکینِ جاں جہاں میں ہوں
یقیں پہ چھائے ہیں وہم و گماں جہاں میں ہوں
خیال سحر زدہ، فکر و آگہی مفتوں
میں ایک نعت کہوں، سوچتا ہوں کیسے کہوں

پہن کے تاج بھی فکر و نظر غلام رہے
فلک پہ اُڑ کے بھی شاہیں اسیرِ دام رہے
یہ کیا ستم ہے کہ ساقی شکستہ جام رہے
دل و نگاہ پہ طاری فرنگیوں کا فسوں
میں ایک نعت کہوں، سوچتا ہوں کیسے کہوں

یہاں کہاں سے مجھے رفعتِ خیال ملے
کہاں سے شعر کو اخلاص کا جمال ملے
کہاں سے "قال" کو "گم گشتہ" رنگِ حال ملے
حضور! ایک ہی مصرعہ یہ ہو سکا موزوں
میں ایک نعت کہوں، سوچتا ہوں کیسے کہوں

عاصی کرنالی

نذرِ رسالت

حضورؐ کی تشریف آوری سے پہلے :-

جب دشنہ دشنہ مژگاں تیز تھا
جب شعلہ شعلہ شعلۂ برقِ ستیز تھا
جب خیمہ خیمہ خیمۂ مرگ و فساد تھا
جب قریہ قریہ قریۂ کفر و عناد تھا
جب فتنہ فتنہ فتنۂ شدادِ وقت تھا
جب نالہ نالہ نالۂ بیدادِ وقت تھا
جب عقدہ عقدہ عقدۂ تقصیرِ فہم تھا
جب حلقہ حلقہ حلقۂ زنجیرِ وہم تھا
جب گوشہ گوشہ گوشۂ فسق و فجور تھا
جب بندہ بندہ بندۂ عیش و سرور تھا

حضورؐ کی تشریف آوری کے بعد

اب نغمہ نغمہ نغمۂ سازِ حیات ہے
اب نشہ نشہ نشۂ عرفانِ ذات ہے
اب جرعہ جرعہ جرعۂ جامِ الست ہے
اب ذرہ ذرہ ذرۂ توحید مست ہے
اب قطرہ قطرہ قطرۂ اشکِ نیاز ہے
اب توبہ توبہ توبۂ قلبِ گداز ہے
اب غنچہ غنچہ غنچۂ زلفِ نگار ہے
اب لالہ لالہ لالۂ رخسارِ یار ہے
اب جلوہ جلوہ جلوۂ سروِ چمن ہوا
اب خندہ خندہ خندۂ صبحِ چمن ہوا
اب جذبہ جذبہ جذبۂ عشقِ رسول ہے
اب شیوہ شیوہ شیوۂ عدل و اصول ہے
اب لمحہ لمحہ لمحۂ اُمید بن گیا
اب نعرہ نعرہ نعرۂ توحید بن گیا

مسجد نبویؐ

راسخ عرفانی

قرارِ قلبِ فیِ جاں ہے لالہ زارِ مسجدِ نبوی
زیارت گاہِ عالم ہے دیارِ مسجدِ نبوی
ضیائے رحمتِ یزداں سے ہر گوشہ منور ہے
ہیں فردوس نظر بیل و نہارِ مسجدِ نبوی
جو سچ پوچھو تو یہ خطہ بھی اک جنت کا خطہ ہے
بہارِ باغِ رضواں ہے بہارِ مسجدِ نبوی
جو پھر اُسکی زمیں بوسی کا ہو مجھکو شرف حاصل
کروں پھر صاف پلکوں سے غبارِ مسجدِ نبوی
دعا یہ ہے کہ مدفن ہو مرا ارضِ مدینہ میں
مری مٹی ہو یا رب ہمکنارِ مسجدِ نبوی
متاعِ دل کو یثرب میں لٹا آیا ہوں اے راسخ
کچھ آنسو رہ گئے ہیں یادگارِ مسجدِ نبوی

صلِ علیٰ محمدؐ

عفت موہانی ۔

جلوہ نما شد آفتاب صلِ علیٰ محمد
مہر برآمد از سحاب صلِ علیٰ محمد
شد بمدینہ جلوہ گر ساقیِ بزمِ خشک و تر
ریخت بجامِ دل شراب صلِ علیٰ محمد
زلفِ تو عنبریں نقاب بوئے تو خوشتر از گلاب
اے عرقِ تو مشک ناب صلِ علیٰ محمدؐ

علہ . اس آہنگ اور التزام کے ساتھ اُردو میں یہ پہلی نظم کہی گئی ہے ۔

پیام و جذبات

نازش پرتاب گڑھی

مسلماں وہ تری عالی مقامی
کہ "تھا" سیدی، سروری، امامی

تجھے اللہ کا بندہ کہے کون
کہ تو کرتا ہے بندوں کی غلامی

غبارِ راہ بن کر رہ گیا ہے
کہاں کھوئی گئی محشر خرامی

یہ کس منزل میں ہے نیرنگِ دوراں
کہ اب ساقی ہے وقفِ تشنہ کامی

تجھے معلوم کیا اپنی بلندی
کہ تجھے روح الامیں تیرے پیامی

چمن والوں کو چلنا آگیا ہے
نہ ہے سروِ رواں کی خوش خرامی

زکی ناکانی

غمِ رشکِ صد بہار ہے، دل رشکِ صد چمن
تجھ سے سوا ہے تیری تمنا کا بانکپن

جلوے ہیں میرے حسنِ طلب کے چمن چمن
میں روحِ کائنات ہوں میں جانِ انجمن

گلشن میں چھڑ گیا جو مری وحشتوں کا ذکر
ہنس ہنس کے چاک کر لئے پھولوں نے پیرہن

چھیڑو نہ جوئے شیر کے لانے کا تذکرہ
ساغر بکف ہیں میرے زمانے کے کوہ کن

عروج زیدی

غزل کے نام سے افسانۂ دلِ محزوں
کوئی کہے تو سُنا دوں، کوئی سُنے تو کہوں

جہاں سوالِ "من و تو" نہیں وہاں ہیں ہم
خوشا مقامِ محبت زہے عطائے جنوں

فروغِ محفلِ ہستی ہوں تو کیسے ہوں!
نہ دل میں "نورِ یقیں" ہے نہ دل میں "سوز دروں"

فریبِ جادۂ منزل میں وہ نہیں آتے
جنہیں خدا نے بنایا ہے صاحبانِ جنوں

ق

ترے خلوص کی بنیاد ہے سیاست پر
جو ناگوار نہ گزرے تو ایک بات کہوں

جہاں خلوص و سیاست میں کوئی فرق نہ ہو
وہاں ضمیر فروشی سے کیوں نباہ کروں

اس التفاتِ گریزاں سے مجکو یہ ڈر ہے
بنا نہ دے کہیں آوارۂ حدودِ سکوں

جمالِ دوست میں رنگِ وفا نہیں نہ سہی
مری مجال کہ فطرت پہ اعتراض کروں؟

بس اس دعا کے نتیجے میں خار پائے ہیں
"چمن کی گود میں رنگِ بہار بن کے رہوں"

مری نگاہ میں یہ پست ہمتی ہے عروج
غمِ حیات کو میں دور سے سلام کروں

ماہر القادری

سنہ ستاون کی جنگِ آزادی

ان آنکھوں نے یہ بھی دیکھا جمنا کے اُس پار
گوروں نے کالوں کے آگے ڈال دیئے ہتھیار

آزادی کی جوالا بھڑکی، دیس میں چاروں اور
چوروں کو مت جانے دیجیو شور مچا تھا شور
تھر تھر تھر تھر کانپ رہی تھی انگریزی سرکار
ان آنکھوں نے یہ بھی دیکھا جمنا کے اُس پار
بھیس بدل کر چھپتے دیکھے کتنے صاحب لوگ
لندن کے شاہی محلوں میں سوگ بپا تھا سوگ
بر کھارت میں جیسے کوئی گرتی ہو دیوار
ان آنکھوں نے یہ بھی دیکھا جمنا کے اس پار

لاٹ پادری، کرنل جرنل، لفٹنٹ اور کپتان
ایک اک کی سٹی گم تھی، غائب تھے اوسان
کب تک آخر چلتا رہتا دھوکے کا بیوپار
ان آنکھوں نے یہ بھی دیکھا جمنا کے اُس پار

ہرن ہوئے تھے شیر کے بچے، اور ممولے باز
جنگ کا نقارہ بجتے ہی، توڑ دیئے سب ساز
پھول کی پتی بن جاتی ہے ایسے میں تلوار
ان آنکھوں نے یہ بھی دیکھا جمنا کے اُس پار

ہرتی بازی دیکھ کے اپنی چال چلا انگریز
سازش کا رُخ بھی کچھ بدلا، اور بنایا تیز

رشوت دے کر، لالچ دے کر، توڑ لئے سردار
ان آنکھوں نے یہ بھی دیکھا جمنا کے اس پار

اپنوں نے غیروں سے مل کر کھول دیئے سب بھید
ملاحوں نے کشتی میں خود ڈال دیئے تھے چھید

توڑ جوڑ کا شیش محل تھا، دلی کا دربار
ان آنکھوں نے یہ بھی دیکھا جمنا کے اُس پار

شاہ ظفر قلعہ سے نکلے چھوڑ کے تخت اور تاج
مرتے مرتے پھر جاگ اٹھا ہائے! فرنگی راج

ادھ بھر میں جب نیا پہنچی ٹوٹ گئی پتوار
ان آنکھوں نے یہ بھی دیکھا جمنا کے اُس پار

توپوں میں بارود کے بدلے راکھ بھری تھی راکھ
فوج بچاری بھی کیا کرتی، بگڑ گئی جب ساکھ

غداروں نے سازش کر کے جیت بنا دی ہار
ان آنکھوں نے یہ بھی دیکھا جمنا کے اُس پار

گوروں نے سنگینیں لے کر وار کئے بھرپور
چھوٹے چھوٹے پھول سے بچے زخموں سے تھے چور

گھوڑوں کی ٹاپوں نے روندی مُغلوں کی پھلوار
ان آنکھوں نے یہ بھی دیکھا جمنا کے اُس پار

دلی، میرٹھ، جھانسی، پلول اور فرید آباد
ایک ایک بستی میں پہنچے قاتل اور جلاد

پھانسی گھر آباد ہوئے، ویران ہوئے گھر بار
ان آنکھوں نے یہ بھی دیکھا جمنا کے اُس پار

کلمہ گو جن جن کے مارے داد نہ کچھ فریاد
پھانسی کے پھندے لیکر ٹوٹ پڑے صیاد
کیسی بھاگم بھاگ مچی تھی، کیسی مارا مار
ان آنکھوں نے یہ بھی دیکھا جمنا کے اس پار

سنہ ستاون نکلا آخر کتنا خوش انجام
یہ قربانی رفتہ رفتہ آئی ہمارے کام
بیچ کے چھوڑا افرنگی کو سات سمندر پار
ان آنکھوں نے یہ بھی دیکھا جمنا کے اُس پار

طورِ آزادی کا جلوہ ہے یہ پاکستان
جسکی بنیادوں میں شامل سنّت اور قرآن
جس کے کانٹے پھول سے اچھے جس کے بن گلزار

....

شاہ ظفر کی روح نے ماہر بھیجا ہے پیغام
پاکستان کے رکھوالوں کو، اور جنتا کے نام
سانٹھ گانٹھ سے، توڑ جوڑ سے رہنا تم ہشیار

....

بغلی گھونسے جانے کر دیں کس دن چھپ کر وار
چوک نہ کرنا، ہر دم رہنا چوکس اور تیار
جو ہیں دھن دولت کے ساتھی وہ ہیں کس کے یار

....

کانپ رہی ہے مظلوموں کے ہونٹوں پر اب آہ
دُنیا کب سے دیکھ رہی ہے راہ تمہاری راہ
کب نکلے گی، کب چمکے گی، خیبر کی تلوار
یہ آنکھیں یہ بھی دیکھیں گی.... کے اُس پار

روحِ انتخاب

لال قلعہ

آج بیشتر سے ہم نے لال قلعہ کی سیر کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس لیے کالے خاں کو قبل نماز کے کہہ دیا تھا کہ ....
ٹکٹ لے رکھنا۔ جب ہم نماز سے فارغ ہوئے تو انہوں نے ٹکٹ پیش کیا۔ یہ ٹکٹ چار آدمیوں کے واسطے کافی تھا۔ دو آنے
ان کے حصول میں صرف ہوئے۔ مسجد سے براہ راست قلعہ گئے۔ یہ قلعہ بالکل سنگ سرخ کا بنا ہوا ہے۔ پر شوکت و ستحکم ہے۔
دروازہ پر ایک گورہ ٹہل رہا تھا اس نے ٹکٹ لے لیا اور ہم اندر داخل ہوئے۔ قلعہ کے اندر جانے کے بعد متعدد دروازے ... ڈیوڑھیاں
... ملتی ہیں ان میں اب آج کل گورہ بازار ہے۔ اس سے نکل کر پھر بالکل ویران اور غیر آباد ہے۔ کہیں کہیں انگریزی عمارتیں اور بنی ہیں۔
... ہیں۔ شاہی عمارتیں بالکل مستاصل کر دی گئی ہیں۔ ان کے نشانات اب صرف دربار عام کے ایک درجہ سے اور دربار خاص و حمام و مسجد
... برج سے معلوم ہوتے ہیں جن کے دیکھنے سے ایسی عبرت و رقت ہوتی ہے جو کسی طرح بیان میں نہیں آسکتی۔ سبحان اللہ۔ یہ وہ مکانات
... تھیں جہاں ہر کس و ناکس کے پہنچنے کی مجال نہ تھی۔ بڑے بڑے امرا ہفت ہزاری و پنج ہزاری دربار عام تک پہنچنے کو فخر و سعادت سمجھتے تھے وہی تخت
... کے سامنے دربار اکبری و جہانگیری میں سجدہ کرتے تھے اور دربار شاہجہانی و عالمگیری میں اس کے پائے کو بوسہ دینے کو فخر سمجھتے تھے۔ آج
... ادنے گورہ جوتہ پہنے ہوئے اس کو روندتا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

مالک الملک وَالامرُ لِلّٰہ وَالارضُ لِلّٰہ یُورِثُھَا مَنْ یَشَاء

آں شاہ خویش را ہما کو می گفت ... ز کبر دمی سخن بہ بردمی گفت
بر کنگرۂ سرائے او فاختۂ ... امروز نشستہ بود کو کو می گفت

ناظرین مجھ کو معاف کیجیے گا۔ ان مکانوں کے دیکھنے سے میرا دل ایسا بے قابو ہے کہ میں ان کے حالات بیان کرنے سے بھی قاصر ہوں
... جو شخص ان درباروں کی ہسٹری اور قلعہ کی جاگرفی سے ماہر ہے وہ کیا ممکن ہے کہ ان کو دیکھ کر آٹھ آٹھ آنسو روئے اس کا دل بے چین نہ
... ہوئے۔ اس کے بدن پر رونگٹے نہ کھڑے ہو جائیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے خدا کی سچی عظمت و ہیبت نمودار نہ ہو جائے۔ دنیا کے
... ہونے کا پردہ نہ اٹھ جائے۔ ذرا تھوڑی دیر کے واسطے آپ حدیقۃ الاقالیم میں محمد شاہی دربار کا سماں دیکھ لیجیے۔ پھر عالم شاہی دربار کا
... ملاحظہ فرمائیے۔ پھر ان ٹوٹی پھوٹی دیواروں کو درِ شہنشاہی کے آثار دیکھیے اللہ اللہ ولا موجود الا اللہ

از نقش و نگارِ در و دیوار شکستہ ... آثار پدید است صنادید عجم را

اب نہ وہ زمانہ ہے، نہ وہ لوگ ہیں، نہ بادشاہ ہیں، نہ ان کے درباری، یہ ٹوٹی پھوٹی عمارتیں ہیں جو زبان حال سے مسلمانوں کے
... اقبال و ادبار ترقی و تنزل کا بیان کر رہی ہیں۔ بڑا سنگدل ہے وہ شخص جو ان کو دیکھ کر نہ روئے۔ بڑا قاسی القلب ہے۔ وہ مرد جو ان کو دیکھ کر متاثر
... نہ ہو بڑا بے حمیت ہے۔ وہ مسلمان جو مسلمانوں کے اقبال و ادبار کی ان حقیقی تصویروں کو دیکھ کر خاموش رہے۔ بڑا بے غیرت ہے۔ وہ نیچری
... جو قسمت کی ان نیرنگیوں کو دیکھ کر اپنے عقیدہ پر نادم نہ ہو۔

خلیلی ھل ھاتان دائرۃ جلجل ... ود سرہ سکے فی تقاف عقنقل

کیا یہ وہی دربار خاص ہے جس میں بڑے بڑے سلاطین ہند علی قدر مراتب کھڑے رہنے کو فخر سمجھتے تھے۔ کیا یہ وہی تخت ہے جس کے سا
بڑے بڑے مہاراجہ سر جھکانے کو ہنادین و ایمان جانتے تھے۔ یہ سب کارخانۂ قدرت کی نیرنگیاں ہیں، فانی ہے اصل تمام کائنات، اور باقی ہے
وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں تمام عالم کی موت و حیات ہے جس کی قدرت اور بقا پر عالم کے نشیب و فراز، گرم و سرد تلخ و شیریں تغیرات
حوادث بآواز بلند گواہی دے رہے ہیں کل شیٔ ھالک الا وجہہ

ہر کرا بینیم دریں عبرت سرائے
بہر مردن زندگانی می کند

میں ان باقی ماندہ عمارتوں کی بعینہ حالت کیا دکھا سکتا ہوں۔ اس کی واقعی کیفیت بھی کیا بیان کر سکتا ہوں البتہ یہ بتانا چاہتا ہوں
کہ اب کیا کیا عمارتیں باقی ہیں گویا بقول شاعر

آمادہ گشتہ ام دگر اینک نظارہ را   پیوند کردہ ام جگر پارہ پارہ را

ہر چند کہ جو عمارتوں کے بقیۃ النہب دبے باقی ہیں۔ ان سے یہ بھی پتہ نہیں چل سکتا کہ پوری پوری عمارتوں کا گذشتہ زمانہ میں کیا
نقشہ تھا تاہم بمصداق بعرۃ تدل علے البعیر و نقش القدم علی المسیر پر عظمت و جلال کا نمونہ دکھاتی ہیں۔ ان مسلسل ڈیوڑھیوں
سے نکل کر ایک پرتاب تیر کے فاصلے پر پھر ایک ڈیوڑھی ملتی ہے۔ لیکن صرف ڈیوڑھی ہی ڈیوڑھی ہے۔ چار دیواری قائم نہیں ہے نہ یہ معلوم ہو
کہ کسی مکان کی ڈیوڑھی ہے۔ لیکن گمان غالب یہ ہے کہ شاہی محلات کی ڈیوڑھی ہے۔ کیونکہ اس کے محاذی کچھ دور پر دربار عام کا ایک دالان
یہ سنگ سرخ کی عمارت ہے۔ بہت بڑے بڑے دالان اور بہت مضبوط کھمبوں پر قائم ہیں۔ غالباً یہ وہی ستون ہیں جن کے پاس مہاراجہ و امیر
علی قدر مراتب کھڑا ہوتا تھا۔ کنارے پر تخت ہے سنگ مرمر کا۔ اس پر سنگ موسیٰ عقیق و نیلم کے نقش و نگار منقش ہیں۔ شنیدہ اس تخت
کے گرد جو کٹہرہ ہے۔ شاید حفاظت کی غرض سے اب بنا دیا گیا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر کچھ دور جا کر ان عمارتوں کے نشان ملتے ہیں جن کی
نظیر چار دانگ عالم میں نہیں بتایا جاتا، یعنی دربار خاص و مثمن برج و حمام وہاں جا کر عقل دنگ ہو جاتی ہے اور چکا چوند سے آنکھوں کو چکا
چوند ہونے لگتی ہے سبحان اللہ۔ اے صانع کائنات یہ انسانی کاریگری کا نمونہ ہے یا بہشت بریں کا ٹکڑا۔ اگر بہشت بریں کا ٹکڑا ہے تو اس کے
رہنے والے کون ہیں۔ کیا جنت میں جانے کے بعد نکال بھی دئے جاتے ہیں۔ وہ کہاں گئے۔ یہ کیوں غیر آباد ہے؟ پھر ان کے ساتھ ان نشانات کو
بھی کیوں باقی رکھا گیا۔ کیا ہم لوگوں کے رونے کے واسطے، اے کاش اب بھی عبرت حاصل کریں۔ بڑے ظرف تھے، ان کے جو اس میں رہتے تھے
اور پانچ وقت خدا کے سامنے سجدہ کرتے تھے۔ تف ہے فرعون پر جس نے صرف مصر کی ان گڑھے بے جڑ عمارتوں پر خدائی کا دعوے کیا۔ آفرین
شاہجہاں پر جس نے تخت طاؤس پر چار کروڑ روپیہ صرف کر کے بنایا اور اس پر بیٹھتے ہی خدا کے سامنے نہایت عاجزی و فروتنی کی راہ سے
سر جھکا دیا۔ یعنی دو رکعت نماز ادا کی۔ وہی ہے ؎

تواضع ز گردن فرازاں نکو است   گدا گر تواضع کند خوئے او ست

اے ناظرین، عبرت، عبرت، عبرت!!! کل شیٔ ھالک الا وجہہ۔ یہ عمارتیں بالکل سنگ مرمر کی ہیں۔ چھت اور ستونوں
پر نقش و نگار ہیں جن پر نگاہ نہیں ٹھہرتی، آنکھوں کے سامنے چکا چوند آ جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کاریگروں نے اس وقت اس کی تعمیر
فرصت پائی ہے۔ فرش پر مختلف قسموں کے پتھروں کی مینا کاری قابل دید ہے۔ شنیدہ وہ لطافت و پاکیزگی، وہ باریکی، وہ سادگی ہے
جو کسی طرح بیان نہیں کی جا سکتی۔ دربار خاص میں کنارے پر سنگ مرمر کی ایک چوکی ہے غالباً اسی پر تخت طاؤس رہتا ہوگا۔ اب خالی پڑی
ہے۔ نہ تخت طاؤس ہے، نہ تخت نشین، نہ وہ مکان ہے نہ مکین ہے۔ عبرت کے واسطے ایک ٹکڑا اس کا باقی چھوڑ دیا گیا جس کو دیکھ کر

سیاحانِ گیتی نورد کے ہوش اڑتے ہیں آیہا الناس اعتبروا بالقیاس۔ کہاں ہیں۔ شاہجہاں اور عالمگیر کدھر ہیں۔ اکبر اور جہانگیر کہاں ہیں۔ وہ ہفت ہزاری امرا کدھر ہیں۔ مشائخ اور علما کہاں ہیں۔ وہ چاؤشوں کی آوازیں، کدھر ہیں نقیبوں کی صدائیں، کہاں ہیں وہ نگاہ روبرو کہنے والے کدھر ہیں وہ نظر بر قدم رکھنے والے۔ کہاں ہے شعرا کی قصیدہ خوانی، کدھر ہے وہ امرا کی لن ترانی کہاں ہے وہ لال پردہ کدھر ہے وہ نقرئی طلائی کٹہرہ۔ سچ یہ ہے کہ جو کچھ ان لوگوں نے دیکھا وہ خواب تھا، جو کچھ ہم سنتے ہیں وہ افسانہ ہے۔ بقول خواجہ درد

وائے نادانی کہ بعد از مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

اے دلی اب ہم تجھ سے رخصت ہوتے ہیں، اے مرقعِ عبرت، اے تازیانۂ غیرت، اے فسانۂ حسرت، اے آئینۂ عبرت اے مسلمانوں کی گذشتہ اقبال مندیوں کے نمونے، اے لق و دق صحرا، اے مسلمانوں کی گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندے ہوئے میدان، اے درحقیقت مسلمانوں کی خاکِ پاک تیرا وہ پرانا جاہ و جلال کہاں، وہ لوگ کہاں ہیں جو تیری زیب و زینت کے باعث تھے جو تیرے آسمان کے ستارے تھے۔ تیرے وہ دلاور کہاں ہیں جو راجپوت اور مرہٹہ بہادروں کی صفیں درہم برہم کر دیتے تھے۔ تیرے وہ بزرگانِ دین کہاں ہیں جن سے روحانیات اور ملائکہ مستفید ہوتے تھے وہ اہلِ کمال کہاں ہیں جن سے استفادہ کرنے کو سارے جہان کے لوگ آتے تھے ہائے دلی ہائے مردہ قوم کی یادگار، تو تو وہی ہے جس میں قطب الدین ایبک کا تہور، شمس الدین التمش کی اولوالعزمی، غیاث الدین بلبن کی تدبیر مسلمانوں کے ظفر و اقبال کا نمونہ تھی۔ تو وہی دلی ہے جس نے خلجی و تغلق فرمانرواؤں کی سطوت تمام عالم میں ضرب المثل تھی۔ تو وہی دلی ہے جس کے لعل و گوہر دربار اکبری کے زیب و زینت تھے۔ اے خاکِ پاک دلی تجھ میں سینکڑوں خانقاہیں اور مدرسے تھے۔ ان بزرگوں کو تو ہی نے اپنے آغوشِ تربیت میں پالا تھا جن کی جوتیوں کی خاک ہماری آنکھوں کا سرمہ ہے۔ ہائے دلی یہ تیرا مرثیہ نہیں ہے قوم کا مرثیہ ہے۔ اے ہماری شامتِ اعمال کی برباد شدہ دلی! کیا پھر ہم تیرا پچھلا جاہ و جلال دیکھ سکتے ہیں۔ ہم میں وہ فدوی جلادت، خالدی جرأت، قومی اتفاق، اسلامی جوش، انسانی ہمدردی اب کہاں آسکتی ہے

افسوس کہ گلرخان کفن پوش شدند — وز خاطر یک دگر فراموش شدند
آنانکہ بصد زبان سخن می گفتند — آیا چہ شنیدند کہ خاموش شدند

ان میں تہور تھا ہم میں جبن ہے۔ ان میں جرأت تھی ہم میں نامردی ہے۔ ان میں قومی اتفاق تھا ہم میں نفاق، وہ پرجوش تھے، ہم خاموش ان میں انسانی ہمدردی تھی۔ ہم میں بیدردی وہ دین و دنیا کو توام سمجھتے تھے، ہم برہم وہ غیور تھے، ہم بے غیرت، ان میں فخر نہ تھا۔ ہم میں کبر ہے ؎

فریب حسن سے گبرو مسلماں کا چلن بگڑا
خدا کی یاد بھولا شیخ، بت سے برہمن بگڑا

اے ناظرین! کیا ایسی قوم جو متصف بصفاتِ بالا ہو کبھی گر سکتی ہے۔ اور کیا ایسی قوم جس میں یہ نقائص ہوں کبھی ابھر سکتی ہے کیا مردہ بدن میں روح عادہ کر سکتی ہے۔ کیوں نہیں کہتے۔ جب تک ہم بھی دین و دنیا کو توام نہ سمجھیں۔ دنیاوی کاموں کے ساتھ دینی اغراض متعلق نہ کریں، نہیں کر سکتی۔ ہاں کر سکتی ہے۔ اے اللہ! اے منشی و معید تجھ میں سب قدرت ہے۔ تو نے عزیر علیہ السلام کی ویران قریہ کو از سر نو سرسبز کر دیا۔ تو نے عزیر کے مردہ بدن میں روح پھونکی۔ تو نے حمار کے عظام رمیم پر اکسا لحم کیا۔ تو نے اصحاب کہف کے صدہا سال کے مردہ بدنوں میں روح اعادہ فرمائی تو نے طیور اربعہ کو متفرق الاجزا ہو جانے پر زندہ کر کے اپنی قدرت کا تماشا دکھایا۔ تو نے مسیح کو بے باپ کے پیدا کیا۔ تو نے مسیح کو یہ قوت دی کہ وہ تیرا نام لے کر مردہ کو زندہ کر دیتے تھے۔ تو نے عرب کی مردہ اور جاہل قوموں کو دین ابراہیمی

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

اسد ملتانی مرحوم

جناب اسد ملتانی مرحوم سے میری ملاقات سب سے پہلے دلّی میں ہوئی تھی اسے بھی سولہ سترہ سال ہونے کو آئے! اُن کے لب و لہجہ وضع قطع سے میں شروع شروع میں یہ سمجھا کہ اُن کی سنجیدگی خشکی لئے ہوئے ہے مگر اُن سے جب بار بار ملنا ہوا تو مجھ پر میرے اندیشہ کی غلطی کھلی، وہ سنجیدہ ضرور تھے مگر خشک اور بے لچک نہ تھے۔

اسد صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کے مواقع تو کراچی میں میسر آئے۔ بعض دفعہ اُن کے یہاں کئی کئی گھنٹے کی صحبتیں ادبی و علمی گفتگو رہے ہیں مگر طبیعت نے گرانی محسوس نہیں کی، نہ اُن کی محفل سے کبھی ملول، مکدر اور دل برداشتہ ہو کر نہیں اٹھا۔ چلتے وقت سا لگتا جیسے تشنگی اس بزم میں پھر کشاں کشاں لے کر آئے گی اور یہ جانا دوبارہ آنے کی تمہید ہے!

حسنِ اتفاق دیکھئے کہ حرمین شریفین کے سفر میں اُن کا ساتھ ہو گیا۔ پانی کے ایک ہی جہاز سے ہم روانہ ہوئے، عرشہ پر دیر دیر تک اُن سے گفتگو اور ساتھ ساتھ اٹھنا بیٹھنا رہتا۔ حرم کعبہ میں کتنی بہت سی نمازیں اُن کے دوش بدوش پڑھی ہیں، دو زانو سے زانو ملا کر صحن حرم میں ہم دونوں اس انداز سے بیٹھے ہیں کہ سامنے کعبۃ اللہ ہے اور زائرین ذوق و شوق سے طواف کر رہے ہیں، کعبہ کی مقدس دیواروں کو اسد مرحوم اور میری نگاہوں نے نہ جانے کتنی بار ساتھ ساتھ چوما ہے۔ اس مقدس سفر کی رفاقت کہیں بھلائی جا سکتی ہے، وہ تو دل پر نقش ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کیا بعید ہے کہ جس نے حرم کعبہ میں ہم دونوں کو یکجا کر دیا تھا جنت کے باغوں میں بھی وہ ہمیں یکجا کر دے، کہ وہاں ساتھ ساتھ مل کر گل گشت کریں، نہروں کے پانی کو ایک دوسرے پر اچھالیں پھولوں سے کھیلیں۔ جھولوں میں جھولیں، اپنے شعر سنا سنا کر حور و غلماں سے داد لیں، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں۔ (آمین)

اسد مرحوم کے بنگلہ پر حضرت مولانا محمد ایوب دہلوی مہینہ میں دو بار وعظ فرمایا کرتے تھے۔ مولانا موصوف کے وعظ پر آج کل کے مولویوں کے بیان و تقریر کا قیاس نہ کیا جائے، مولانا ایوب صاحب سچ مچ علوم و معارف کے دریا بہاتے ہیں، اُن کی بات ذہنوں کو مطمئن بناتی اور دلوں میں گھر کرتی ہے، مولانا کا وعظ ختم ہونے کے بعد، ہم دو چار آدمی اسد صاحب کے یہاں رُک جاتے۔ بڑے سلیقہ کے ساتھ چائے اور بسکٹوں سے ہماری تواضع کی جاتی اور ڈیڑھ دو گھنٹے دین و اخلاق پر گفتگو رہتی۔ اس مذاکرے میں میں سب سے زیادہ بولنے والا میں ہوتا۔

پاکستان کا دارالسلطنت کراچی سے راولپنڈی تبدیل ہوا تو اسد ملتانی مرحوم کو بھی کراچی سے پنڈی جانا پڑا۔ اُن کے جانے سے دو ہفتہ قبل میری اُن سے ملاقات ہوئی تھی۔ اپنی فارسی نعت "فاران" کو عطا کرنے کا وعدہ فرمایا، اور اس وعدہ کو اسی ہفتے پورا بھی کر دیا۔ خیال نہیں یقین تھا کہ پنڈی کی روانگی کے وقت اُن سے پھر ملنا ہوگا مگر میں ایک مشاعرے کے چکر میں باہر چلا گیا اُن سے ملنا نہ ہو سکا، اسد مرحوم "فاران" بڑے شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھتے تھے، پنڈی جا کر انھوں نے خط بھیجا کہ "نومبر کا فاران نہیں ملا، اب میرے راولپنڈی کے پتہ پر رسالہ بھیجا جائے" اس کا تو سان گمان بھی نہ تھا کہ پنڈی کا یہ سفر اُن کا آخری

سفر ہے اور پنڈی کی آب و ہوا جس کو صحت مند بتایا جاتا ہے، پاکستان کے اس قابل فخر شاعر کو موت کی نیند سلا کر دے گی! اہل صحافت کی اس بے ذوقی، قدر ناشناسی اور بے خبری کی انتہا ہے کہ کراچی کے اخباروں میں حضرت اسد ملتانی کی موت کی خبر اس حادثہ کے کئی دن بعد شائع ہوئی اور وہ بھی غیر نمایاں انداز میں! حالانکہ اسی کراچی کے اخبارات میں بعض ایسے ادیبوں اور شاعروں کا جو اسد ملتانی سے ہر لحاظ سے گھٹ کر تھے کئی کئی دن تک مسلسل ماتم کیا گیا اور سوگ منایا گیا ہے، مجھے تو میرے ایک جاننے والے نے بتایا کہ میں نے ریڈیو سے اسد ملتانی کے انتقال کی خبر سنی ہے، اس خبر کے سنتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے فضا میں ایکا ایکی دھند سی چھا گئی یقین نہ آتا تھا کہ ایسا ہوا ہوگا، مگر بعد میں اس "المیہ" کی تصدیق ہو گئی!

اسد ملتانی کے اس فخر کا کیا پوچھنا کہ علامہ اقبال مرحوم کی صحبتوں سے انھوں نے استفادہ کیا تھا، غالباً ان کی دو چار غزلوں اور نظموں پر اقبال نے اصلاح بھی دی تھی۔ اسد صاحب انگریزی دور میں ایک سینیئر کلرک کی حیثیت سے ملازمت میں داخل ہوئے اور اپنی غیر معمولی قابلیت کی بدولت درجہ بدرجہ ترقی کر کے حکومتِ پاکستان میں اسسٹنٹ سکریٹری ہو گئے! وہ اس سے زیادہ ترقی کے مستحق تھے مگر اس کو کیا کیجئے کہ مرحوم کو توڑ جوڑ نہ آتا تھا اور نہ بڑے آدمیوں میں گھس بیٹھنے اور ان کا دم چھلا بنے رہنے کو وہ پسند کرتے تھے، پھر بھی ان کی تنخواہ الاؤنس وغیرہ مل ملا کر ۵۰۰ سو روپے سے کیا کم ہوگی، بنگلہ میں رہتے تھے، موٹر نشین تھے، صاف ستھری زندگی اور بڑے چلن کی زندگی، اخراجات آمدنی کی حدود میں رہ کر!

اسد ملتانی مرحوم کے ساتھ اُن کے چھوٹے بھائی اسلم بال بچوں سمیت رہتے تھے، دونوں بھائیوں میں حد درجہ محبت تھی، سچ مچ یک جان دو قالب، کہیں دعوت میں، مشاعرے میں جلسہ اور وعظ میں جانا ہوتا، تو دونوں بھائی ساتھ ساتھ جاتے! ایسے شفیق و مخلص بھائی کی موت کا اسلم صاحب کو جتنا بھی صدمہ ہوا ہو کم ہے! میں پرسا دینے کے لئے اُن کے یہاں گیا تھا مگر معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک ملتان ہی میں ہیں!

اسد مرحوم نہایت فرض شناس اور بے غرض سرکاری نوکر اور بڑے قابل دیانت دار اور مستعد عہدیدار تھے پاکستان کو اس قابلیت اور سیرت کے کر دس افسر میسر آجائیں تو دفتری نظم و نسق آئینہ کی طرح مجلا ہو جائے! اوپر کے بڑے لوگ اسد صاحب کو جانتے تھے مگر اس شناسائی سے فائدہ اٹھانے کا خیال تک اُن کے دل میں نہیں آیا، حج کے موقعہ پر منیٰ میں مسٹر غلام محمد سابق گورنر جنرل نے اسد ملتانی مرحوم کو راستہ میں دیکھا تو اپنی کار میں بٹھا لیا اور انہیں لے جا کر سلطان سعود سے ملایا، اسد نے اس واقعہ کو نظم بھی کیا ہے۔

اسد ملتانی کا مطالعہ غیر معمولی تھا۔ کتابیں ان کا اوڑھنا بچھونا تھیں، ملتان اُن کا وطن اور مولد و منشا رہا مگر اردو زبان پر اتنی قدرت تھی کہ دلی اور لکھنؤ کے زبان دانوں سے وہ آنکھیں ملا کر اور سر افتخار بلند کر کے، زبان و محاورہ اور مصطلحات اور روزمرہ پر گفتگو کر سکتے تھے، اردو اور انگریزی کا کس قدر پاکیزہ خط تھا۔ اردو تحریریں کتنی شستہ اور دل کش و سادہ ہوتی تھیں! دفتری ملازمت کے بجائے اگر کوئی علمی ادارہ اُن کو سونپ دیا جاتا، تو اسد ملتانی کی قابلیت کے جوہر وہاں کھلتے!

اسد ملتانی بڑے نستعلیق آدمی تھے، شریف، وضعدار، مہذب اور مودب! انھوں نے بڑے معرکہ کی طویل مزاحیہ نظمیں کہی ہیں مگر گفتگو بڑی سنجیدہ اور باوقار کرتے، بازاری مذاق کی، نہیں ہوا بھی نہ لگی تھی، ہنسی اور گھٹیا بات ان کے منہ سے نکلتی ہی نہ تھی! صوم و صلوٰۃ کے پابند، دینداری اُن کے مزاج و طبیعت میں رچی ہوئی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے فدائی اور شیدائی صوفیائے کرام کے عقیدت مند مگر شرک و بدعت سے کوسوں دور اور انتہائی بیزار! پاکستان کو کتاب و سنت کی بنیاد پر صحیح اسلامی حکومت دیکھنے کے تمنائی! سابق جماعت اسلامی جن دنوں اسلامی دستور سازی کے لئے جد و جہد کر رہی تھی، اس مسئلہ پر اُن سے گفتگو آتی، تو بڑی

خوشی کا اظہار کرتے!

ماہنامہ طلوعِ اسلام میں اسدؔ ملتانی کی برسوں نظمیں چھپتی رہی ہیں، اس لئے اوروں کا کیا ذکر کیجئے، خود میں اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ اسد صاحب منکرین حدیث کے ہم نوا معلوم ہوتے ہیں مگر ان سے ملنے کے بعد یہ غلط فہمی دور ہوئی کہ وہ تو انکار حدیث کو دین کا سب سے بڑا فتنہ سمجھتے ہیں اور سنّتِ رسول کے دین میں حجت ہونے کا محکم عقیدہ رکھتے ہیں۔ مسٹر پرویز سے وہ بہت مخالف تھے در نکوہ کرتے تھے کہ یہ شخص علامہ اقبال کو اپنے مسلک کی تائید میں غلط طور پر پیش کرتا ہے۔

اسد ملتانی کو اپنے وطن ملتان سے بڑی محبت تھی اور ان کا اس طرف میلان تھا کہ شاہانِ سبق کے دور میں شہر ملتان کو جو مرکزی حیثیت حاصل تھی، پاکستان میں بھی اس شہر کی وہی مرکزی حیثیت ہونی چاہیے!

اسد ملتانی نے عاشقانہ غزلیں بھی کہی ہیں، جو شخص غزل کا یہ مطلع کہہ سکتا ہو ؎

رہیں نہ رند یہ زاہد کے بس کی بات نہیں
تمام شہر ہے دو چار دس کی بات نہیں

اس کے کہ بہ غزل گوئی سے کون انکار کر سکتا ہے! مگر انھوں نے اس انداز پر غزلیں کہنا بہت دنوں سے چھوڑ دیا تھا، ان کی شاعری دین و اخلاق کی ترجمان اور اسلام کے مقدس پیغام کی حامل بن کر رہ گئی تھی۔ مقصدیت ہی مقصدیت ...... مگر ترنم شاعرانہ خوبیوں کے ساتھ! فرماتے ہیں:۔

کی فرنگی نے ترقی جو مسلماں بن کر
یہ فرنگی کی ترقی ہے مسلماں کی نہیں

وہ ایک مُصلح اور صاحبِ پیغام شاعر تھے! اُن کی شاعری میں زبان کی سادگی و سلاست، بندش کی چُستی در صفائی کے ساتھ جذبہ اخلاص، اور فکر کی بلندی پائی جاتی ہے! علامہ اقبال سے وہ شدید متاثر تھے مگر اُن کی شاعری میں خود اپنا رنگ بھی نمایاں طور پر جھلکتا ہے! اسد ملتانی کے اٹھ جانے سے اخلاق و شرافت اور شعر و ادب کو اتنا بڑا نقصان پہنچا ہے، کہ اس کی تلافی کے لئے ایک نیک شاعر پر نگاہ جاتی ہے، اور لوٹ آتی ہے! اللہ تعالیٰ اسد ملتانی کی قبر کو مجلہ عرد سی بنادے کہ وہ "عروس" کی طرح قیامت تک چین کی نیند سوتے رہیں اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور رسول اللہ صلعم کی شفاعت سے حصہ وافر پائیں۔

(آمین ـــــ یارب العالمین ـــــ دغافر المذنبین)

ہماری نظر میں

تذکرہ حضرت صدر الدین عارف رحمۃ اللہ علیہ

(جلد اول) از: - مولانا نور احمد خاں فریدی، ضخامت ۲۹۶ صفحات - قیمت دس روپے

ملنے کا پتہ: - قصر الادب جگر والا، براہ لودھران - ضلع ملتان -

مولانا نور احمد خاں فریدی نے حضرت شیخ الاسلام صدر الدین عارف ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ بڑی محنت سے مرتب کیا ہے، اس تذکرہ پر تقریب مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے اور تقریظ[1] حضرت اسد ملتانی مرحوم نے لکھی ہے، کتاب دیدہ زیب سفید کاغذ پر، خوش نما ٹائپ میں چھپی ہے!

اس کتاب میں دینی اعتبار سے اس قدر سقم اور مکروہ باتیں ہیں کہ لفظ و بیان کی لغزشوں کی طرف دھیان ہی نہیں گیا مؤلف کو جس کتاب، اور تذکرے سے جو مواد بھی ملا ہے، اسے انھوں نے جانچے اور پرکھے بغیر نقل کر دیا ہے، تحقیق و تنقید کا کام اُن کے بس کا بھی نہ تھا کہ وہ خالص خانقاہی ذوق رکھتے ہیں اور مورخانہ بصیرت کی اُن کی تحریروں اور نوشتوں میں خاصی کمی محسوس ہوتی ہے!

"صاحب مرآت المناقب لکھتے ہیں کہ جب سالک صدق دل سے شیخ کی رہنمائی میں کثرتِ عبادت اور ریاضت سے مقامِ ناسوت طے کر لیتا ہے اور مقامِ ملکوت میں داخل ہوتا ہے، تو اس سے بشری صفات دور ہو جاتی ہیں۔" (صفحہ ۲۶)

"صاحب منہاج الواصلین لکھتے ہیں کہ جب سالک مقامِ ملکوت پر پہنچتا ہے، تو اس میں یہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ ایک آنِ واحد میں بلا تکلف ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر لیتا ہے، گویا زمین اس کی محکوم بن جاتی ہے..." (صفحہ ۲۷)

صحابہ کرام سے بڑھ کر راہِ سلوک اور منزلِ یقین و معرفت کا طے کرنے والا اور مجاہدۂ نفس کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے، مگر اُن کے حالات میں یہ نہیں ملتا کہ فردِ صحابی سے بشری صفات دور ہو گئی تھیں، اور صحابہ کرام اگر مقامِ ملکوت پر فائز ہوتے تو وہ چلچلاتی دھوپ میں ہفتوں، گھوڑوں، اور اونٹوں پر مسلسل سفر کی صعوبتیں کاہے کو اٹھاتے!

"... چنانچہ جس روز حضرت نے اس دارِ ناپائدار سے سفر اختیار کیا، حضرت عارف باللہ"

---

[1] حضرت اسد ملتانی مرحوم کے انتقال سے چند ماہ پیشتر میں نے اُن سے اس تذکرہ کا ذکر کیا کہ اس میں تو دینی نقطۂ نگاہ سے بہت کمزوریاں ہیں، آپ نے اُس پر تقریظ کس طرح لکھ دی! بولے، آپ "فاران" میں اُس پر جی کھول کے تنقید کیجئے اور یہ کہتے ہوئے انھوں نے اس تذکرے کی ذرا سی بھی تحسین نہیں فرمائی بلکہ اندازِ گفتگو معذرت آمیز ہی سا تھا۔

(م - ق)

حجرہ شریف کے باہر موجود تھے۔ ملک الموت انسانی لباس میں حاضر ہوا، اور ایک لفافہ دے
کر عرض کی کہ اسے شیخ الاسلام کی خدمت میں پہنچا دیجئے، خط کا ملاحظہ کرنا تھا کہ ۔۔ حضرت
غوث العلمین نے سر مبارک سجدے میں رکھدیا اور روح صادقہ اعلیٰ علیین کو پرواز
کرگئی۔ حجرے کے چاروں کونوں سے آواز آئی " بدوست رسید" (صفحہ ۴۳)

اولیاء کرام کی کرامات حق ہیں، مگر ملک الموت کا انسانی لباس میں آکر لفافہ دینا، عجیب سے عجیب تر ہے!

کوئی بزرگ شیخ احمد گزرے ہیں، جن پر ہر وقت جذب و سُکر کا عالم طاری رہتا تھا، اُن کا ایک مکالمہ اس کتاب میں درج کیا ہے، جو اللہ تعالیٰ اور انہی مجذوب کے درمیان ہوا ہے، اس کا ایک اقتباس یہ ہے:۔

" اے شیخ احمد! تمام طالبانِ حقیقی نے اپنے آپ کو میرا عاشق بنایا ہے، لیکن میں تجھے
سرفراز کرتا ہوں اور اپنا معشوق بناتا ہوں" (صفحہ ۴۳)

اس طرح تو شیخ احمد صاحب کو دوسرے اکابر اولیاء اللہ، اور صحابہ کرام بلکہ انبیاء و رسل پر بھی فضیلت حاصل ہو جاتی ہے! اسے نرم سے نرم الفاظ میں مدح و منقبت اور عقیدت کا غلو نہ کہیں تو اور کیا کہیں!

پھر یہی شیخ احمد صاحب مجذوب جن کو تمام طالبانِ حقیقی میں اللہ تعالیٰ نے منتخب فرما کر اپنا "معشوق" بنایا اُن کے بارے میں اسی تذکرے میں لکھا ہے کہ وہ نماز تک ادا نہیں کرتے تھے۔ جب لوگوں نے بہت اصرار کیا تو وہ نماز پڑھنے کے لئے تو تیار ہو گئے، مگر فرمایا:۔

" اچھا اگر مجبور کرتے ہو، تو تمہاری خاطر نماز پڑھ لیتا ہوں، لیکن سورۂ فاتحہ نہیں پڑھوں گا"

یہ وہ بزرگ ہیں جن کو صاحبِ تذکرہ کے بقول اللہ تعالیٰ نے اپنا معشوق بنایا ہے، اور ان "معشوقِ الٰہی" کی زبان سے۔ ایسے نادر جملے نکلتے ہیں، (نعوذ باللہ!) یعنی "صلوٰۃ" جس کے عمداً ترک پر " فَقَدْ کَفَرَ " کی وعید آئی ہے، اُسے یہ "معشوقِ الٰہی صاحب" لوگوں کے مجبور کرنے پر اُن کی خاطر پڑھتے ہیں ______ اور پھر

" ...... اور نماز شروع کی، لیکن جب ۔ ایاک نعبد ۔ پر پہنچے اُن کے ہر بُنِ مُوسے
خون جاری ہو گیا، یہاں تک کہ آپ کی تمام پوشاک خون سے تر بتر ہو گئی، آپ نے
نماز توڑ ڈالی، اور فرمایا بزرگو! اب میں زنِ حائضہ کے حکم میں ہوں، مجھ پر نماز
فرض نہیں رہی" (صفحہ ۴۴)

یہ خرافات اگر پچھلے تذکروں میں ملتے بھی ہیں، تو کیا وہ نقل و قبول کئے جانے کے قابل تھے (استغفر اللہ)

"شیخ محمد یوسف گردیزی قدس سرہٗ العزیز کو دارِفانی سے پردہ کئے تقریباً ڈیڑھ سو
برس گزر چکے تھے، لیکن اب تک ان کی یہ کرامت برابر کار فرما تھی کہ جو شخص مزار
پر بار بار جا کر سلام عرض کرتا، حضرت اپنا ہاتھ باہر نکال دیتے ...:" (صفحہ ۵)

یہ "دارِفانی سے پردہ کرنا" کیا ہوتا ہے، اور اولیاء اللہ سے "موت و وفات" کی نسبت کرتے ہوئے کیوں جھجک محسوس ہوتی ہے جب کہ قرآنِ کریم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک کے لئے "میّت" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے ______ ان بزرگ کی جس عجیب و غریب کرامت کو بیان کیا گیا ہے، اس کے بارے میں ہم حیران ہیں کہ کیا کہیں اور کیا نہ کہیں!

اس کتاب میں ایک بہت بڑے صوفی اور شیخ کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ انھوں نے حسن نامی قوال کو، جو نہایت خوش گلو اور خوب صورت تھا "اپنی بغل میں لے کر خوب بھینچا" (صفحہ ۱۱۹) ——— انہی مولانا فخرالدین عراقی کا، ایک دوسرا واقعہ بھی اس کتاب میں نظر سے گذرا۔

"..... ایک دن موچیوں کے بازار میں پھر رہے تھے، کہ دفعتاً ایک قبول صورت لڑکے پر نظر پڑی۔ پس دل دے بیٹھے" (صفحہ ۱۲۶)

ہمیں یقین نہیں آتا کہ صوفیا جو "تزکیۂ نفس" کے عامل اور داعی ہوتے ہیں، اس قسم کی شنیع و قبیح باتوں کا شوق رکھتے تھے، اور اگر ان سے اس قسم کی باتیں ظہور میں بھی آگئی ہوں، تو ان کا تحسین آمیز انداز میں اظہار اور زیادہ بری بات ہے!

جو بچہ پیدا ہوتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا خلق کیا ہوا اور بخشا ہوا ہوتا ہے، اس کی خلقت میں کسی غیر کی بخشش و عطا شریک نہیں ہے، مگر اس کتاب میں کچھ بزرگوں کے نام "غلام بخش" اور "حسین بخش" (صفحہ ۱۴۹ و ۱۵۰) بھی نظر آئے! توحید کے نقطۂ نظر سے یہ نام کس قدر قابلِ اعتراض ہیں! (توبہ)

ایک بزرگ (مولانا خواجہ محمد حسین بخش) کے نام کے ساتھ "مدظلہ" لکھا ہے جو بقید حیات ہیں، ان صاحب کا یہ عالم ہے کہ

"رمضان کے آخری دن جب کہ ملتان کا سارا شہر روزے سے ہوتا ہے آپ اور آپ کے دو تین سو متعلقین بے تکلفی سے کھاتے پیتے اور احباب کے یہاں سویاں بھجواتے ہیں۔" (صفحہ ۱۵۱)

اور انہی "مولانا خواجہ مدظلہ" نے اذان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کے ساتھ اپنے حکم و جہاد سے "سیدنا" کا اضافہ کردیا ہے۔

کوئی صاحب اندھڑ کے رئیس ہیں، ان کے اس کارنامہ کو اس تذکرے میں بہت کچھ سراہا گیا ہے کہ انھوں نے حضرت نواب الاولیاء[1] کے مقبرہ پر ایک لاکھ روپیہ صرف کردیا ہے، اور سنگ مرمر کا کٹہرا لگایا ہے (صفحہ ۱۶۲) حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کو پختہ بنانے کی ممانعت فرمائی ہے ——— انہی زمیندار صاحب اور ان کے صاحبزادوں کی اس تذکرے میں بہت کچھ مدح و منقبت کی گئی ہے، یہ بابِ مناقب اس تذکرہ میں بے جوڑ سا لگتا ہے مگر ہر انسان کے ساتھ ذاتی اغراض لگی ہوتی ہیں، تذکرہ نگار بھی اس عام سطح سے اپنے کو بلند تر نہ رکھ سکا۔

"حاجی عبدالوہاب صاحب کی ایک تفسیر مشہور ہے، اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تمام قرآن کو سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ نعت یا ذکر سے متعلق ثابت کیا گیا ہے، علاوہ ازیں عشق و محبت کے بے شمار اسرار و رموز اس صحیفۂ صدق میں درج ہیں۔" (صفحہ ۳۰)

پورے قرآن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "نعت و منقبت" ثابت کردینا، قرآن کریم کے ساتھ مذاق ہے! ایسی غلط تفسیر کو تذکرہ نگار "صحیفۂ صادق" سے تعبیر فرماتے ہیں ——— یہ کیا اندازِ فکر ہے؟! ؎

مقتدائے دیں قبول خاص و عام	وہ نقش گفتہ تو ئی خیر الانام	(صفحہ ۲۱)
چوں بگردش نمی رسد جبریل	چہ عجب گر نماندش بزمیں	(صفحہ ۹۲)
منزلش صحن قاب قوسین است	مجلس او بساط او دنیٰ است	(صفحہ ۹۷)

---

[1] یہ "نواب الاولیاء" کی ترکیب بھی عجیب ہے! (م-ق)

گردِ خاک درش، نگردد ہیچ　　زن کہ جبریل پر سباں دارد　　(صفحہ ۱۱۰)

خط کشیدہ الفاظ جو صوفیا کی مدح میں کہے گئے ہیں، یہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس کو زیب دیتے ہیں: اس مبالغہ آمیز عقیدت کو کیا کہیے، جو اولیاء کو انبیاء کا ہم پایہ بنادے!

"غوث العلمین کی مدح میں عراقی کا یہ کہنا:-

دیدہ باید کہ جاں تواند دید　　ورنہ او در ہمہ جہاں پیداست　　(صفحہ ۹۸)

مبالغہ کی بُری مثال ہے، "ورنہ او در ہمہ جہاں پیداست" یہ صرف اللہ تعالیٰ کی شان ہے!

"خزینۃ الاصفیا کی روایت کی بموجب ستر لاکھ اشرفی نقد ما سوائے دیگر اسباب از قسم ظروف پارچہ جات و مکانات وغیرہ حضرت غوث العلمین کے ہر صاحبزادے کے حصہ میں آئے تھے" (صفحہ ۳۶)

کوئی کہے تو کیا کہے، ایک طرف فقر و تصوف اور توکل و قناعت کی ان بزرگوں سے نسبت اور دوسری طرف مال و دولت کی یہ فراوانی!

کسی صحابی نے یہ نہیں فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ سے مجھ پر ساری کائنات روشن ہو گئی، مگر اس تذکرے میں یہ ملتا ہے کہ فلاں بزرگ کی توجہ سے مُرید پر سارا جہان روشن ہو گیا ــــــــــ سسّی پنوں کی قبر پر شیخ سماعیل نام کے ایک بزرگ جاتے ہیں تو سسّی ــــ بنی سنوری ہوئی زندہ ہو کر شیخ کے سامنے آجاتی ہے، اور شیخ کے اصرار پر اپنے عاشق پنوں کو بھی قبر سے کمر تک باہر نکال لاتی ہے ــــــــــ ایک درویش کے بارے میں لکھا ہے وہ ظاہری باطنی تصرف کی قدرت رکھتا تھا اور ایک بار جو درویش بھی اس کو راستہ میں ملا۔ اس کی درویشی سلب کرلی۔ (صفحہ ۱۴۹) ــــــــــ اسی درویش کو ایک دوسرے بزرگ سید جلال صاحب نے غیظ و غضب کی نگاہ سے دیکھا تو جل کر خاک ہو گیا، لوگوں نے اس کو دفن کرنا چاہا، تو زمین سے اس کی جلی ہوئی لاش باہر نکل آتی تھی، سات دن تک لاش زمین سے باہر پڑی رہی۔ آخر کار سید جلال صاحب نے کرم فرما کر اجازت دی تو "اس سوختۂ جلال کو بڑی مشکل سے سپردِ خاک کیا گیا۔" (صفحہ ۱۶۹)

خرقِ عادت و کرامات کے عجیب و غریب واقعات اس تذکرے میں ملتے ہیں، ایک شاہ صاحب، دوسرے شاہ صاحب پر اپنے کمال کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں کہ مُردہ بلّی کے خشک ڈھانچے پر نگاہ کرتے ہیں، اور بلّی زندہ ہو جاتی ہے، دوسرے شاہ صاحب اس کے توڑ پر ایک جاہل برہمن کو منبر پر بٹھا کر، توجہ ڈالتے ہیں اور وہ اَن پڑھ کافر نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ "بسم اللہ" کے چودہ معنی بیان کرتا ہے۔

اس قسم کے تذکروں نے مسلمانوں کو دینی اعتبار سے فائدہ کے بجائے نقصان ہی پہنچایا ہے، ان تذکروں کے پڑھنے والوں پر پہلا تاثر تو یہ ہوتا ہے کہ طریقت کے مقابلہ میں شریعت گھٹیا درجہ کی چیز ہے! پھر اس طرف توجہ جاتی ہے کہ مجاہدہ نفس کا مطلوب تقویٰ اور سیرت سازی نہیں، بلکہ کشف و کرامات کا ظہور اور اسرارِ غیوب کا اتا پتا لگانا ہے! انہی تذکروں کو پڑھ کر اور سُن کر بعض لوگوں کا یہ مزاج بن گیا ہے کہ وہ احکامِ شریعت کی پابندی نہیں کرتے اور کسی مردِ کامل اور بزرگ عارف کی تلاش میں رہتے ہیں کہ وہ جب توجہ ڈالے گا، تو اُس کی نگاہِ کیمیا اثر سے ان کے اندر تبدیلی پیدا ہوگی، بلکہ چودہ طبق روشن ہو جائیں گے! صحابہ کرام کے مزاج و ذوق، اُن کی تعلیمات و ارشادات اور سوانح حالات سے جب ہم ان تذکروں کا مقابلہ کرتے ہیں، تو ان کے درمیان بین فرق محسوس ہوتا ہے!!

صوفیا کے حالات و واقعات کو وہی شخص صحیح طور پر مرتب کر سکتا ہے جو دین کے صحیح تقاضوں کو جانتا اور کتاب و سنّت کے مزاج

کو پہچانتا ہو، ملفوظات و مکتوبات اور تذکروں میں بہت سی ایسی باتیں ملتی ہیں جن کو جُوں کا توں نقل کر دینے سے طرح طرح کے خلجانات پیدا ہوتے ہیں! پچھلے تذکروں میں خاصی مُبالغہ آمیزیاں پائی جاتی ہیں، تذکرہ نگار جب تک ان کمزوریوں سے واقف نہ ہوگا، اس وقت تک اُس سے کسی ایسے تذکرے کی ترتیب و تدوین کی توقع نہیں کی جا سکتی، جو احترام و عقیدت کے ہجوم میں وہ اعتدال قائم رکھ سکے، جو دین میں مستحسن ہے!

ATIQ'S ENGLISH GUIDE	انگلش گرامر (پہلا حصہ) از:- سعید رضا خاں، انگلش کمپوزیشن۔ (دوسرا حصہ) از:- ایس۔ آر۔ خاں، انگلش ٹرانسلیشن۔ (تیسرا حصہ) از:- کے۔ آر طرزی، ضخامت ۴۸۸ صفحات،

مجلد (رنگین گرد پوش کے ساتھ) قیمت:- پانچ روپیہ بارہ آنے،

ملنے کا پتہ:- رحمٰن برادرس، پوسٹ بکس ۳۳۵، فریر روڈ، کراچی ۱

دُنیا کی کوئی زبان گرامر کے بغیر نہیں آسکتی، اس لئے اس کتاب (انگلش گائڈ) کا آغاز "انگلش گرامر" ہی سے ہوتا ہے کتاب کے اس پہلے حصہ کو جناب سعید رضا نے مرتب فرمایا ہے، اور بڑے آسان اور فہم انداز میں حرف (Letter) سے لے کر (Punctuation marks) تک کے (process) اور تمام مراحل کو پیش کر دیا ہے!

اس اقتباس سے فاضل مُرتب کی کاوش اور تعلیمی تجربہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:-

1. | NOUNS | VERBS | ADJECTIVES |
|---|---|---|
| Rebellion | Rebel | Rebellious |
| laughter | laugh | laughable |

2. | NOUNS | VERBS |
|---|---|
| Content | contain |

3. | NOUNS | ADJECTIVES |
|---|---|
| Art | Artistic |

4. | ABSTRACT NOUN | COMMON NOUN |
|---|---|
| Hermitage | Hermit |

5. | WORDS | ANTONYMS |
|---|---|
| offer | withdraw |
| Zigzag | straight |

الفاظ سازی (word building) کی یہ فہرست خاصی طویل ہے اور انگریزی سیکھنے والے کے لئے بڑی کام کی چیز ہے، انگریزی حروف جار (prepositions) کے استعمال کرنے میں غیر اہل زبان بڑی بڑی ٹھوکریں کھاتے ہیں، کتاب کے اس پہلے حصہ میں خاص طور سے حروف جار کے استعمال کی مثالیں دی گئی ہیں...... مثلاً:-

He is heir of his uncle
He is heir to his father's property

(تشریح:۔ اگر heir کے بعد آدمی مذکور ہو تو of آئیگا اور اگر جائداد ہو تو "to")

دوسرا حصہ (ENGLISH COMPOSITION) جناب ایس۔ آر خان کا ترتیب دیا ہوا ہے، جس پر جناب مظفر احمد خاں سدوزئی نے نظر ثانی کی ہے۔ اس حصہ میں انگریزی لکھنے کا صحیح طریقہ، انداز اور اسلوب بتایا گیا ہے، سب سے پہلے ان لفظوں کی فہرست دی گئی ہے، جن کے املا میں لوگوں کو عام طور پر دھوکا ہو جاتا ہے۔ مثلاً:۔

CORRECT	INCORRECT
Referred	Refered
Schedule	Skedule
Seize	Seize
Element	Eliment

اس کے بعد جملوں اور پیراگراف کے construction کا بیان ہے! اس حصہ کے سب سے زیادہ اہم ابواب وہ ہیں جن میں غلط اور صحیح جملوں کا فرق ظاہر کیا گیا ہے، فاضل مرتب نے بڑے پتہ کی بات کہی ہے کہ تقریر و تحریر کی غلطیوں کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہم اردو کے مفہوم کی انگریزی زبان میں ترجمانی کرتے ہیں! مثلاً "کیا تم نے گھڑی میں کنجی دی ہے" اس کا اردو جاننے والے، انگریزی میں یوں ظاہر کرتے ہیں:۔

Have you given key to the watch

مگر صحیح انگریزی یہ ہے:۔ Have you wound up the watch

—اور—

اسی طرح ہم عام طور پر "MONEY BAG" بولتے ہیں مگر ایک انگریز صرف "PURSE" بولے گا

فاضل مرتب نے بڑے سلیقہ و دلنشین انداز میں انگریزی جملے کی ہیئت، لفظوں کی نشست، دروبست اور جملوں کے باہمی ربط و تعلق کو سمجھایا ہے! انھوں نے طلبہ کو مشورہ دیا ہے کہ وہ پیراگراف میں اختصار کو مدِنظر رکھیں، اس طرح وہ لفظوں کے "انجام" پر قابو رکھ سکتے ہیں، جہاں تک پیراگراف کے پھیلاؤ کا تعلق ہے تو مسٹر طامس راؤنے:۔

THE HISTORY OF KING RICHARD THE THIRD

میں صرف ایک پیراگراف میں تقریباً ایک ہزار الفاظ استعمال کئے ہیں، اور میکالے اور ملٹن بھی طویل جملے لکھا کرتے تھے!

کتاب کے اس دوسرے حصہ میں انگریزی کے چھوٹے چھوٹے جملوں سے لے کر خطوں، درخواستوں، مقالوں، مکالموں اور کہانیوں تک کے نمونے دیئے گئے ہیں، ایک ایک صفحہ کارآمد اور معلومات آفریں ہے!

کتاب کے آخری حصہ (TRANSLATION) کے مصنف جناب کے، آر، مرزا ہیں، اس میں اردو سے انگریزی ترجمہ کی ترکیب بلکہ نکات بیان کئے گئے ہیں ——— یہ کہ اردو جاننے والے کس مفہوم کی ترجمانی میں کیا غلطی کرتے ہیں، اور انگریزی گرامر کی بنیاد پر صحیح ترجمہ کیا ہونا چاہئے!

اس حصہ میں بہت سے انگریزی الفاظ، جو ایک دوسرے کی ضد (ANTONYMS) ہیں اردو ترجمہ کے ساتھ
دئے گئے ہیں، مثلاً:۔

WORDS		ANTONYMS	
Accept	قبول کرنا	Reject	رد کرنا
Advance	پیش قدمی کرنا	Retreat	پسپا ہونا

کتاب کا آخری حصہ "مخففات" و "مقطعات" (ABBREVIATIONS) پر مشتمل ہے، مثلاً۔

P.O.D.	Pay on delivery
NATO	North Atlantic Treaty organi…
f.p.	freezing point

انگریزی سیکھنے، بولنے اور لکھنے کے لئے "عتیق انگلش گائڈ" ایک اچھے اتالیق اور تجربہ کار معلم کا فرض انجام دیتی ہے، جو کوئی اس
کو سمجھ کر پڑھے گا اور اس میں دی ہوئی مشقوں (EXERCISE) کے عملی تجربے سے گذرے گا، انگریزی بول چال اور لکھنے پڑھنے
میں بھی خاصی استعداد پیدا ہو جائے گی، کتاب کے حجم اور get up کے اعتبار سے قیمت کم رکھی گئی ہے، اس گائڈ کے مرتبین
ناشرین (رحمٰن برادرس) نے ایک مفید تعلیمی خدمت انجام دی ہے، جس کے لئے وہ تبریک و تحسین کے مستحق ہیں:

…وحکمت از:۔ نیر واسطی، ضخامت ۱۶۰ صفحات (دیدہ زیب جلد، کاغذ، کتابت و طباعت ہر چیز خوب سے خوب تر)
قیمت:۔ تین روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ مطبوعات مجلس بوعلی سینا، بیرون مستی گیٹ، لاہور۔

جناب حکیم نیر واسطی کی شخصیت گوناگوں خوبیوں کی حامل ہے، وہ عربی کے عالم ہیں، طبیب حاذق ہیں، عربی، فارسی اور
…کے علاوہ موصوف ترکی بھی جانتے ہیں، مشرق و مغرب کے ملکوں کی سیر بھی انھوں نے کی ہے، مشہور مستشرق پروفیسر براؤن
…"ARABIC MEDICINE" کا انھوں نے "طب العرب" کے نام سے ترجمہ کیا ہے، اور اس پر تشریحی نوٹ بھی لکھے
…و ہند کی مشہور شخصیتوں کی ہم نشینی اور اُن کی صحبتوں سے بھی انھوں نے استفادہ کیا ہے، اور سب سے بڑی یہ کہ وہ ایک نغز گو شاعر

…کتاب کا یہ حصہ نظر ثانی کا محتاج ہے، بعض انگریزی لفظوں کا اردو ترجمہ خاصہ محل نظر ہے! "famine" کا ترجمہ
…"درست نہیں ہے، VICIOUS "بدکار" کو نہیں "برے" کو کہتے ہیں، "Rude" کا ترجمہ "ترش" بھی محل غور ہے
Rude ایک غیر مہذب اور جاہل آدمی کو کہتے ہیں، اور "ترش" اردو میں اُس آدمی کے لئے بولا جاتا ہے، جس کے مزاج میں
…پائی جائے، وہ زیادہ ملنسار بھی نہ ہو۔ ایک مہذب اور لکھا پڑھا آدمی بھی "ترش مزاج" ہو سکتا ہے ——
RECO… کا صحیح ترجمہ "حاصل کرنا" نہیں بازیابی ہے، "optimist" کا ترجمہ "خوش باش" بالکل
…"پُر اُمید یا رجائی" لکھنا چاہیے تھا، "EXIT" کا ترجمہ "روانگی" بھی درست نہیں ہے! RECKLESS
…نڈر" بھی نادرست ہے! —— صفحہ ۷۷ پر DESPAIR کمپوزر نے DISPAIR اور صفحہ ۷۷ پر
DIFFIDE… کی جگہ DIFFERENT چھپ گیا۔ آئندہ ایڈیشن میں چاہے دو چار صفحات کا اضافہ ہو جائے مگر انگریزی الفاظ
…سمجھا کر اور پھیلا کر لکھنے چاہئیں مثلاً "RAW" کے معنی "کچا" لکھے ہیں، تو MATERIAL کے ساتھ تو RAW
…ہو سکتا ہے، مگر پھلوں کے لئے "RAW" کا استعمال غلط ہوگا!

بھی ہیں ۔

اپنے اس مجموعہ کلام (شعر و حکمت) کا مقدمہ خود جناب نیر واسطی نے لکھا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں نثر نگاری کی بڑی اچھی صلاحیت موجود ہے، یہ مقدمہ بہت دل چسپ ہے، اس میں انھوں نے اپنی زندگی کے واردات و وقائع بیان کئے ہیں! اپنے حالات خود اپنے قلم سے لکھنا بہت ہی مشکل اور نازک مرحلہ ہے، مگر نیر صاحب نے اس منزل کو اس خوبی سے سر کیا ہے کہ جو کچھ اپنے بارے میں کہنا تھا کہہ بھی دیا اور خودستائی کا رنگ پیدا نہیں ہونے پایا! صاف گوئی کا یہ عالم ہے کہ اکبر میرٹھی سے انھوں نے تعلیم غزلوں پر اصلاح لی ہے، تو اس کو بھی چھپایا نہیں ہے، ظاہر کر دیا ہے ۔

یہ مقدمہ در اصل ہے تو شاعر کی "آپ بیتی" مگر اس میں مشاہیر کے حالات کے ساتھ ساتھ، اس زمانہ کی تاریخ اور سیاسی ماحول کی بھی جھلک آگئی ہے!

یہ تو ہم نے سنا تھا کہ اختر شیرانی مرحوم سے حکیم نیر واسطی کے بڑے گہرے تعلقات اور اخلاص و محبت کے روابط تھے، مگر اس مقدمہ کو پڑھ کر اس کا علم ہوا کہ نیر واسطی اس شاعر شباب و مستی کے بہت سے "رومانی واقعات" کے رازدار و امین بھی ہیں ۔

یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے، ان ابواب کے نام کس قدر شاعرانہ ہیں ——— حکایت جنوں (مقدمہ) محراب حرم، یاد رفتگاں، تیر نیم کش، اشارات، حکایت لذیذ اور شہر غزل!

حکیم نیر واسطی کی نظموں میں خاصی روانی اور دل کشی پائی جاتی ہے، رومانی نظموں میں وہ بڑے نظر باز اور عاشق مزاج نظر آتے ہیں، جیسے کہ ؎

روئے تو معالجہ عمر کوتاہ است
این نسخہ از بیاض مسیحا نوشتہ ام

پرُن کا سچ مچ عمل ہے! عشقیہ نظموں میں نیر واسطی کی شاعری کے جوہر پوری طرح کھلتے ہیں! مناظر کی عکاسی بھی انھوں نے خوب خوب کی ہے، جس وادی میں ان کا توسن خیال نکل گیا ہے، پھول بکھیرتا ہوا گیا ہے! اس کے برخلاف قومی نظموں میں سنجیدگی اور تقدیس فکر جھلکتی ہے "مولانا ظفر علی خاں"، اور "حسین بی بی" ان کی بڑی اثر انگیز نظمیں ہیں، کاش! شاعر کی یہ لے اور تیز ہو سکتی!

جناب نیر واسطی کو نظموں سے زیادہ دل چسپی ہے، اس پورے مجموعہ میں کل چوبیس غزلیں شامل ہیں جن میں تغزل کا لطف تو ضرور ملتا ہے مگر "نظموں" کی کچھ اور ہی بات ہے ——— چند منتخب اشعار :- ؎

قاب قوسین کا غل عرش سے تا فرش ہوا	جھک گئی توسن گردوں کی رکاب اے ساقی
دل نازک پہ ہے طوفان حوادث کی نگاہ	موج کے ہاتھ میں ہے جام حباب اے ساقی
عظمت فقر ہے ہر حال میں تابندہ جمال	لالہ صحرا میں بھی شاہانہ قبا رکھتا ہے
مست جب جھوم کے تا باب سلام آتے ہیں	عرش سے عشق و محبت کے پیام آتے ہیں
بس اک داغ کو دے کر بہار لالہ و گل	چمن کے سینہ پہ زخم بہار چھوڑ گیا
جس میں آتش گل نے چمن کو پھونک دیا	چمن کے شعلہ عذاروں کا سوگوار ہوں میں
مدت ہوئی کہ خانۂ راحت ہے بے چراغ	وہ روشنی وحشت تمنا کب آئے گی
عنبر افشاں ہو تصور میں بھی یک شانہ مو	پھر وہ لہراتی ہوئی زلف دوتا یاد آئی

گل خود رو کی غم انگیز کہانی سُن کر — غنچۂ دل کے چٹکنے کی صدا یاد آئی

نسرین و نسترن کی قطاروں میں کھو گیا — ان سے نکل گیا تو چناروں میں کھو گیا

دعنہ ہائے خاک پہ قوسِ قزح کا رنگ — ہر ذرہ گزر پہ حسنِ دل آرا کہ ہائے ہائے

وہ سبزۂ حسیں پہ طاؤس کی طرح — دامن پہ ساریوں کا تھلانا کہ ہائے ہائے

وہ جھانجنوں کے شور میں عرضِ نیازِ عشق — وہ التفاتِ حسنِ خود آرا کہ ہائے ہائے

سانسوں کی مشکبار لطافت کہ واہ واہ — زلفوں کی بوئے عنبر سارا کہ ہائے ہائے

پیرحرم کی لغزشِ مستانہ کے لئے — نازک کلائیوں کا سہارا کہ ہائے ہائے

شبنم کو ترس رہے ہیں غنچے — کانٹوں پہ برس رہی ہے برسات

بہر ایران یک دلِ آتش بجاں آوردہ ام — تحفۂ زخاکِ پاکستانیاں آوردہ ام

شیرو از خمخانہ سعدی کہ در شیراز بود — از دیارِ خسرو شیریں زباں آوردہ ام

اگر آں ترکِ انگورہ بدست آرد دل و جاں را — فردشم بہر چشم لطف او لاہور و ملتاں را

بہ بیروت و عراق اکثر بیا و آوردہ ام نیز — حلوۂ گرم ملتاں را فصلے سرد کا غاں را

کام آیا مے و مینا کا سہارا مجھ کو — اک پری زاد نے شیشہ میں اُتارا مجھ کو

جنوں کو سطوتِ سلطاں خراج دیتی ہے — جنوں کے پاس گریباں کا تار بھی تو نہیں

نہیں اُترے جو دریا میں، نہیں سمجھے جو موجوں سے — کبھی کشتی بدلتے ہیں، کبھی دریا بدلتے ہیں

پھر ہجر و فراق کی گھڑی ہے — عمرِ غمِ آرزو بڑی ہے

پلکوں پہ مچل رہے ہیں انجم — کس چاند سے آنکھ جا لڑی ہے

بیت چلی برسات بھی آخر — کاٹ دیں راتیں روتے، روتے

ادائے خاص سے دیکھا عطائے جام سے پہلے — ہوا ساقی کا لطفِ خاص لُطفِ عام سے پہلے

کچھ کم بھی نہیں گوشۂ زنداں سے مجھے گھر — ہر چند کہ گھر گوشۂ زنداں تو نہیں ہے

دوسرا رُخ:

رات کو ریت پہ سرسبز کھجوروں کا سماں — جیسے کمخواب میں لپٹی ہوئی حوروں کا سماں (صفحہ ۵۲)

"سرسبز کھجوروں" اور "حوروں" میں جو وجہ شبہ شاعر نے پیدا کی ہے، اس میں بڑی آورد پائی جاتی ہے۔

یوں رواں دشت میں اُونٹوں کی مہاروں کے ہجوم — جیسے دریا میں جہازوں کی قطاروں کے ہجوم (صفحہ ۵۲)

"مہاروں کے ہجوم" اور "قطاروں کے ہجوم" زبان اور روزمرہ کے اعتبار سے محلِ نظر ہیں۔

الٰہی! اس کی تربت خلد زارِ نور ہو جائے — نسیمِ شہرِ خاموشاں، شمیمِ حور ہو جائے (صفحہ ۶۰)

"خلد زارِ نور" کی ترکیب وجدان کو بہت کچھ کھٹکتی ہے، دوسرے مصرعہ میں ناپختگی پائی جاتی ہے!

پیامِ دیدۂ افسانہ کار چھوڑ گیا — حکایتِ خمِ گیسوئے یار چھوڑ گیا (صفحہ ۶۱)

مصرعہ اولیٰ افسوس ہے مصرعہ ثانی کے جوڑ کا نہیں ہے۔ پھر "دیدۂ افسانہ کار" کی ترکیب اگرچہ جدید ہے مگر اُس میں کس قدر

غرابت پائی جاتی ہے۔

بے خبر تھی دستِ نامحرم سے فطرت کی دلہن — تھا اچھوتا بادۂ رنگین گل ہائے چمن (صفحہ ۸۹)

دوسرا مصرعہ کہا نہیں گیا، جوڑا گیا ہے۔

قیس آوارہ ہوا، مجنوں ہوا رسوا ہوا — رات دن سودائی زلف و رُخِ لیلیٰ ہوا (صفحہ ۹۰)

مصرعہ اولیٰ میں "مجنوں ہوا" کی جگہ "مجنوں بنا" ہوتا تو شعر میں غالباً زیادہ روانی آجاتی، مصرعہ ثانی میں بڑا جھول پڑ جاتا ہے "رات دن" کا استعمال کس قدر بے محل ہوا ہے (توبہ!)

سحر کے خم میں تراوش کے خون کی بے تاب — فضا پہ تیر گیا کیف مستی بم و زیر (صفحہ ۱۰۸)

نری آورد ہی آورد!

مہ وشوں کے ساعد سیمیں کے گجروں کے لئے — لے کے آئے پھول پھر جوشِ بہاراں کی برس (صفحہ ۱۱۰)

"جوش" زائد استعمال ہوا ہے!

پیام دانش تو شرح حجتِ اسلام — بزیر سایۂ الوند عظمتِ اسلام (صفحہ ۱۱۷)

بوعلی سینا کوئی شک نہیں بہت بڑا فلسفی اور فنِ طب کا امام گزرا ہے، مگر علم دین اور اخلاق و تقویٰ کے لحاظ سے امام غزالی کے پاس کے پیام و تعلیم کو "حجتِ اسلام" نہیں کہنا چاہیے!

حسینؓ تجھ کو مسافر نواز کہتے ہیں — ترے حرم کو حریم نیاز کہتے ہیں (صفحہ ۱۲۱)

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے کمالات کا کیا پوچھنا، مگر ان کا یہ وصف کہ وہ مسافر نوازی کرتے تھے اور مسافر نواز کہلاتے تھے اور پڑھنے میں نہیں آیا "حریم نیاز" کی ترکیب بھی قافیہ پیمائی کے لئے دی گئی ہے۔

دلِ حزیں ہے بہت مضطر و ملول مرا — سلام اے مرے سلطانِ دیں قبول مرا

مصرعہ ثانی میں تعقید کے عیب کے علاوہ "اے مرے سلطانِ دیں" زبان کے اعتبار سے غلط ہے:

میں ان حسین نظاروں کے پاس آ نہ سکا — خزاں نصیب بہاروں کے پاس آ نہ سکا (صفحہ ۱۳۶)

غزل کا مطلع اور اس قدر بے کیف!

بہارِ صبح نے گل کو رُلا کے چھوڑ دیا — شرابِ ناب کو شبنم بنا کے چھوڑ دیا (صفحہ ۱۳۷)

شعر کا مفہوم خاصہ الجھا ہوا ہے ——————— یہ پوری غزل ہی کمزور ہے۔

مجھ کو اللہ کے بندوں نے دیئے ہیں وہ فریب — نام سنتا ہوں جب اللہ کا ڈر جاتا ہوں (صفحہ ۱۴۱)

مصرعہ ثانی میں شعریت کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

تر ہو گیا ہے گریۂ شبنم سے آشیاں — اب آشیاں کو آگ کے شعلوں کا ڈر نہیں (صفحہ ۱۴۸)

گریۂ شبنم کیا آشیاں کے تنکوں کو اپنی تری سے " FIRE PROOF " بنا سکتا ہے؟ ——————— بے جا مبالغہ ہے!

ایسا بھی ایک پھول بہشتِ حرم میں ہے — جس تک پیام بادِ صبا کا گزر نہیں

شعر کے لفظ حسین ہیں، مصرعے بھی برابر کے ہیں، مگر اس شعر میں کیا کسی تلمیح کو بیان کیا گیا ہے؟ شاعر کہنا کیا چاہتا ہے؟

پیام" کا لفظ اس میں زائد ہے!

روح کو سوز دیا، داغ جگر کو بخشا حضرت عشق عجب داد سخا دیتے ہیں (صفحہ ۱۴۹)

شعر غزل میں رہنے کے قابل نہ تھا۔

سوادِ زلف پریشاں ہے دیکھئے کیا ہو جہانِ عشق پشیماں ہے دیکھئے کیا ہو (صفحہ ۱۵۰)

لف کی سیاہی کے بکھرنے (پریشان ہونے) سے آخر جہانِ عشق کیوں پشیمان ہے!!

اللہ اللہ کشش دشت جنوں دل ہر ذرہ میں لیلائی ہے (صفحہ ۱۵۵)

لیلائی" شعر میں کس قدر اکھڑا اکھڑا لگتا ہے۔

نہ بھولنا ہمیں اے کوئے مشکبوئے حبیب متاعِ صبر و سکوں ہم یہاں لُٹا کے چلے (صفحہ ۵۶)

کوئے حبیب" کے درمیان "مشکبوئے" لاکر، اس ترکیب کو عجیب بنادیا۔

جلائے وادیٔ غربت میں جگنوؤں کے چراغ برائے جشنِ بہاراں ہم اور کیا کرتے (صفحہ ۱۵۷)

جگنوؤں" سے غالباً "آنسو" مراد ہیں! مگر "جگنو" تنہا بول کر، "آنسو" کا مفہوم پیدا نہیں ہوتا!

نیر کو سلام غم مبارک منزل مگر عشق کی کڑی ہے (صفحہ ۱۵۳)

ل تو شعر کا مفہوم "بطن شاعر" ہی میں بند ہو کر رہ گیا، دوسرے "مگر عشق" میں "ع" تقطیع سے گر رہا ہے، شاعر کو عشق

کے عین پر صوتی اعتبار سے "الف" کا دھوکا ہوا ہے، اسی سبب یہ غلطی سرزد ہو گئی!

ماہنامہ "میثاق"

زیر ادارت:۔ مولانا امین احسن اصلاحی، سالانہ چندہ چھ روپے، فی پرچہ:۔ دس آنے

ملنے کا پتہ:۔ ماہنامہ "میثاق" رحمٰن پورہ، اچھرہ، لاہور۔

مولانا امین احسن اصلاحی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، علمی اور دینی حلقوں میں وہ نہ صرف متعارف

بلکہ مشہور و مقبول ہیں، مولانا موصوف کے زبان و قلم.... سالہا سال سے دین کی خدمت انجام دے رہے ہیں!

ماہنامہ "میثاق" مولانا اصلاحی کا اپنا پرچہ ہے، اب تک اُس کے سات شمارے منظرِ عام پر آچکے ہیں، اس مجلہ کی ب

خصوصیت ہے کہ صرف دسمبر کے شمارے میں ایک دوسرے صاحب کا پانچ صفحہ کا مضمون شائع ہوا ہے، ورنہ اوّل سے آخر

مولانا موصوف ہی کے قلم نے گل کاریاں کی ہیں۔

مولانا اصلاحی نے دینی نصاب کی کتابوں کو سبقاً سبقاً پڑھا ہے، اور جو پڑھا ہے وہ بڑی حد تک مستحضر ہے، وہ عربی اور

انگریزی کی جدید کتابوں کا بھی مطالعہ کرتے رہتے ہیں، اس لئے ان کی تحریروں میں بڑی تازگی ملتی ہے، اندازِ بیان، دل نشین

عام فہم ہوتا ہے!

"تدبرِ قرآن" کے عنوان سے مولانا اصلاحی صاحب قرآن کی تفسیر لکھ رہے ہیں، جو "میثاق" میں قسط وار آرہی ہے، کوئی

شک نہیں کہ یہ تفسیر ہر اعتبار سے خوب ہے اور قابلِ اعتماد ہے، لیکن مولانا موصوف نے اپنے قابلِ فخر اُستاد مولانا حمید الدین

فراہی مرحوم کی عربی تفسیر کا ترجمہ جس انداز پر کیا تھا۔ توقع تھی کہ اسلوب بیان اور فکر کے اعتبار سے اس تفسیر میں "تفسیر فراہی" کی

جھلکیاں ضرور ملیں گی، مگر یہ توقع پوری نہ ہو سکی! مولانا کے سفرِ حج کے واقعات بھی بالاقساط چھپ رہے ہیں، جو بڑے دلچسپ

ہوتے ہیں! "بحث و نظر" کے تحت کئی مہینے سے مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کے مضامین کے جواب ہیں، جو سلسلہ مضمون چل رہا تھا

اس دسمبر کے شمارے میں اس کے ختم ہونے کا اعلان کر دیا گیا!

ماہنامہ "میثاق" اونچے درجہ کا علمی اور دینی رسالہ ہے، خدا کرے یہ نوطلوع مجلہ مالی اعتبار سے بھی خود مکتفی ہو جائے ہم اس کی ترقی اور بقا کے لئے دعا کرتے ہیں!

دسمبر کے میثاق میں سعید ملک صاحب کی کتاب "پاکستان کا مستقبل" کا اشتہار نظر سے گزرا، یہ کتاب المکتبۃ الرحمانیہ اچھرہ، لاہور سے شائع ہوئی ہے، اس اشتہار کو پڑھ کر ہم یکبارگی چونک پڑے، اور بہت سے پچھلے اندیشے جن کو حسنِ ظن کی نذر کر دیا تھا۔ خواہ مخواہ ابھر آئے!

رنگارنگ از: عابد سعید خاں فنا دوسی بدایونی ۔ بی اے (علیگ) ضخامت ۸۰ صفحات (مجلد، گردپوش کے ساتھ) قیمت: دو روپے، ملنے کا پتہ: نظامی بک ایجنسی، بدایوں (بھارت)

جناب فنا دوسی بدایونی نے شاعری ورثہ میں پائی ہے، اُن کے حقیقی نانا خاں بہادر منشی سخاوت حسین مدہوش (صاحب "وقعاتِ مدہوش") غالب کے شاگرد تھے۔ اس شرف کے علاوہ فنا کو حضرت فانی بدایونی کی ذات سے دو دو نسبتیں حاصل ہیں ایک قرابت کی اور دوسری تلمذ کی!

اس کتاب کے مقدمہ سے پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ ۔

"فانی نے فنا کی تربیت اپنے ذمہ لی اور آخر تک مشورۂ سخن دیتے رہے"

ورنہ ہم نے تو یہی سُنا تھا کہ مختار بدایونی کے علاوہ فانی کا کوئی شاگرد نہیں ہے! واقعہ بھی یہ ہے کہ فانی "استاد قسم کے شاعر" تھے ہی نہیں "شاگرد سازی" کے جھمیلے سے وہ ہمیشہ دامن کشاں رہے!

"رنگارنگ" کا مقدمہ پروفیسر ضیا احمد بدایونی (ایم اے) نے لکھا ہے، اور خوب لکھا ہے، صاحبِ موصوف نے فنا بدایونی کو ان لفظوں میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے ۔

"فنا صاحب کا کریڈٹ یہ ہے کہ انھوں نے غزل کے پامال میدان میں اپنی سلامتِ طبع اور حسنِ ذوق سے کامیابی حاصل کی ہے"

جناب فنا کی غزلوں میں عشق و محبت کی دھیمی لے ملتی ہے۔ شعر و سخن سے اُن کا شغف والہانہ ہے، اور یہی رنگ ان کی زندگی کی توانائیوں کا ضامن ہے۔ چند منتخب اشعار:۔

تیرا فریب اب نہ چلے گا نگاہِ ناز — اُس مرتبہ تو میں ترے دھوکے میں آگیا

کوئی گزرا ہے فنا رہ کے جبا اور سے ضرور — آج منزل کا نشاں راہگذر دیتی ہے

واعظ کے سر پہ ہوگا تو ہوگا وہ حشر میں — ہم پر تو اُن کا سایۂ داماں ابھی سے ہے

پردے سے نکلنا ہی بس اُن کا قیامت ہے — اے حسنِ نظر، تو بھی پردے میں ذرا ہو جا

ہو چکے پابندِ زنداں جب تو پھر کیسا چمن — بھول جا اے دل چمن اور آشیاں بھول جا

کہو تو کھول ڈالوں راز سارے — تمہارے راز ہیں میری زباں پر

مست رہتا ہوں یاد میں اُن کی — بے پئے ہے شراب کا عالم

ان سے شکوہ نہ کر دل اُن کے نہ ملنے کا کبھی — اے فنا! وہ بھی ہیں مجبور تمہیں کیا معلوم

کہہ رہے ہیں نگاہ کے انداز   اب یہ بجلی گری کہیں نہ کہیں

دل جو پہلو میں ہے تو اے واعظ!   ہو گی دل بستگی کہیں نہ کہیں

چل رہی ہے مست ہو ہو کر چمن میں یوں ہوا   جیسے آئے کوئی جھولا جھول کر برسات میں

یہی نہیں کہ نشیمن جلائے جاتے ہیں   چمن میں روز نئے گل کھلائے جاتے ہیں

برق کیا چمکے گی میرے سوزِ دل کے روبرو   ابر کیا برسے گا میری چشمِ تر کے سامنے

ہجومِ غم سے قیامت سی دل میں برپا ہے   خدا ہی ہے جو محبت کا راز، راز رہے

یہ کلیوں کا تبسم کہہ رہا ہے   نہ جانے پھر بہار آئے نہ آئے

پریشانی میں جب اُفتاد پڑتی ہے کوئی دل پر   تو کچھ کہتا ہے انساں اور منہ سے کچھ نکلتا ہے

ہے زندگی یہی تو اُسے کیا کرے کوئی   کیا آتی جاتی شے کا بھروسا کرے کوئی

اسی سے کام بگڑے بن رہے ہیں   محبت کارسازِ دو جہاں ہے

گیا وہ زمانہ کہ تھا لطفِ نغمہ!   مگر اب یہ بے وقت کی راگنی ہے

بہت تاریکیوں میں ہے زمانہ!   ضرورت ہے تمہارے نقشِ پا کی

دوسرا رُخ :-

ناکامیوں میں تیرا تصور جب آگیا   دوزخ کے التہاب کو جنت بنا گیا   (صفحہ ۷)

مصرعہ ثانی کس قدر بے مزہ اور کرخت ہے!

سچ سچ جو پوچھتے ہو دو کام تم کو آئے   یا آگ کا لگانا، یا بجلیاں گرانا   (صفحہ ۹)

مصرعہ ثانی میں "یا آگ کا لگانا" نے استعارے کے لطف کو غارت کر دیا، دوسرا مصرعہ یہ تصور دیتا ہے جیسے محبوب سچ مچ کسی آتش گیر مادے سے آگ لگا دیا کرتا ہے!

جلوے سمٹ کے آگئے آپ ہمارے سامنے   ہم نے اگر خلوص سے سر کو کہیں جھکا دیا   (صفحہ ۱۰)

اس قسم کے سطحی شعر انتخاب میں چھانٹ دینے کے قابل تھے۔

ملنے میں مجھ سے آپ نے جیسے ہی بدلا آنکھ کو   میں نے وہیں سمجھ لیا سارا جہاں بدل گیا

اس شعر کو پڑھ کر طبیعت بے لطف ہو گئی اور وجدان تلملانے سا لگا۔

ہم خوب جانتے ہیں سوزِ جگر کی حالت   جو وقت ٹل رہا تھا، وہ وقت ٹل رہا تھا   (صفحہ ۳)

آخر یہ بات کیا ہوئی؟

ایک منزل بھی ہے ایسی عشق میں   وہ کہے جاتے ہیں، سنتے ہم نہیں   (صفحہ ۲۸)

یہ کیا فکر دقیق ہے؟ خیال میں ندرت نہ سہی، اظہار و بیان ہی میں کوئی لطف ہوتا۔

لطف تو دل کے ساتھ تھا دل ہی مگر نہیں رہا   حسن میں دلکشی سہی، عشق میں بے خودی نہیں   (صفحہ ۳۵)

"عشق میں بے خودی نہیں" نے شعر کا سارا مفہوم ہی خبط کر دیا۔

جہاں میں غم کشِ آلامِ روزگار ہوں میں   خزاں نصیب ہوں، پروردۂ بہار ہوں میں   (صفحہ ۳۰)

"غم کش آلام" یہ "شب لیلۃ القدر کی رات" جیسی بات ہے! دوسرا مصرعہ کتنا شگفتہ ہے کاش
مصرعہ اولیٰ اسی جوڑ کا ہوتا۔

موت ہی کی ابتدا ہے جلوہ گاہِ زندگی اے فنا! ہر سانس میں اعلان یہ پاتا ہوں میں (صفحہ ۳۱)

مصرعہ اولیٰ مبہم نہیں مہمل ہے! "اعلان یہ پاتا ہوں" یہ ٹکڑا بھی غیر شاعرانہ ہے۔

کسی کی جستجو ہے اور میں ہوں نظامِ آرزو ہے اور میں ہوں (صفحہ ۳۳)

مطلع میں کوئی مزہ نہیں!

محبت میں دلِ محزوں سے اپنے برابر گفتگو ہے اور میں ہوں (صفحہ ۳۴)

"برابر" نہیں یہاں "مسلسل" کا محل تھا۔ اس سے شعر کی نغمگی بھی بڑھ جاتی۔

رہائی نے بڑھا دیں وسعتیں آو ہم زنداں کی ہم ان آزادیوں کو روکشِ زنداں سمجھتے ہیں

اس شعر کا مفہوم ہمارے تو پلّے پڑا نہیں! "روکشِ زنداں" کی ترکیب نے اس شعر کے اہمال میں اور اضافہ کر دیا۔

نظروں میں بھر کے رنگِ تجلی یار کو دوں گا شکست لشکرِ فصلِ بہار کو (صفحہ ۴۰)

ناسخ لکھنوی کے اسکول کا شعر ہے!

تکمیل کی شعور کے صورت ہے اک یہی آنکھوں میں بھر کے دیکھ کر دل میں سما کے دیکھ (صفحہ ۴۲)

محبوب کے دل میں سمانے اور آنکھوں میں بھر کے دیکھنے اور "تکمیل شعور" میں آخر کیا مناسبت ہے۔

کون ہے جلوہ فگن میری خودی کے اندر یاد منصور کو یہ بر سرِ دار آئی ہے (صفحہ ۴۹)

مگر منصور کو تو "انا الحق" کہنے ہی کی پاداش میں دار پر چڑھایا گیا تھا لیکن شاعر کہتا ہے کہ اُسے اپنی خودی کا عرفان بر سرِ دار ہوا تھا
یہ کیا کہ جو خیال ذہن میں آیا اُسے نظم کر دیا۔

دُنیائے زندگی بھی کتنی ہے پیاری دنیا ہنگامِ نزع باقی ارمانِ زندگی ہے (صفحہ ۵۳)

اس شعر میں کس قدر سطحیت اور ناپختگی پائی جاتی ہے۔

جل کے رہے گا قلبِ زار، آنے تو دو ذرا بہار اُٹھ کے رہے گا یہ دھواں آج نہیں تو کل سہی (صفحہ ۵۶)

فنا کے کتنے ہی اس قسم کے شعار ہماری نظر سے گزرے ہیں جن میں مصرعہ ثانی چست ہے مگر مصرعہ اولیٰ سُست اور
بے روح ہے!

دے رہا ہے غیر شاعر کو بھی پیغامِ حیات سب کے ہو ورد زباں، فانی کا دیواں چاہیئے (صفحہ ۶۱)

یہ کیا شاعری ہے؟ اس قسم کے شعر بھلا دیوان میں رکھنے کے قابل تھے۔

کسی محفل میں جب ذکرِ دلِ ناشاد ہوتا ہے تو رگ رگ میں مری اک نشترِ فصاد ہوتا ہے (صفحہ ۶۲)

یہ بھلا کوئی خیال ہے کہ جب کسی محفل میں دل ناشاد کا ذکر کیا جاتا ہے، تو اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ میرے خون میں
سوداویت پیدا ہو جاتی ہے جس کے ازالہ کے لئے "نشترِ فصاد" میری رگ رگ میں پیر جاتا ہے اور میری وحشت بڑھ جاتی ہے۔

دلِ عشرت طلب میں کیا بتاؤں زندگی کیا ہے نکل جائے تو ارماں ہے، جو رہ جائے تو کانٹا ہے (صفحہ ۶۵)

"زندگی" کا "رہنا اور نکلنا" یہ کہاں کی زبان ہے! پھر "دلِ عشرت طلب" کا شعر کی معنویت سے کیا ربط ہے!

کہاں چھپے تھے، بتاؤ تمہاری عمر دراز　　تمہیں تو یاد کیا تھا ابھی ابھی میں نے　　(صفحہ ۶۶)

اس شعر کا ماہر القادری کے اس مشہور شعر سے توارد ہو گیا۔ ؎

تم آ گئے ہو بہ قسمت تمہاری عمر دراز　　تمہارا نام لیا تھا ابھی ابھی میں نے

گریبانِ تمنا پھاڑتے تو ہم نے دیکھا ہے　　خدا معلوم اس کے بعد دیوانوں پہ کیا گزری　　(صفحہ ۸۵)

"تمنا" بھرتی کا لفظ ہے، بالکل زائد اور غیر ضروری! دیوانہ "گریبانِ تمنا" نہیں "گریبان" چاک کیا کرتا ہے "گریبانِ تمنا" بھی آسکتا ہے مگر اس کے لئے شعر میں کوئی قرینہ ہونا چاہیئے۔

مذاقِ درد مندی ہے جُدا سارے زمانے سے　　تھپیڑوں کو ہر اک موجِ بلا کے ناخدا سمجھے　　(صفحہ ۸۴)

"مذاقِ درد مندی" شعر میں لانے کی کیا تُک تھی!

نگاہِ محبت سے ہشیار کر دے　　میں سوتا ہوں تو مجھ کو بیدار کر دے　　(صفحہ ۹۴)

اس قدر بے مزہ شعر کو، جلی حروف میں کتابت کرایا گیا ہے　　عجیب "ذوقِ انتخاب" (؟) ہے!!

اب میری جبیں اور وہ نقشِ کفِ پا ہے　　جتنی ہے قضا ایک ہی سجدے میں ادا ہے　　(صفحہ ۹۵)

مصرعہ ثانی حسن بریلوی کی مشہور نعتیہ غزل کے اس مصرعہ سے لڑ گیا ع

جتنی ہو قضا ایک ہی سجدے میں ادا ہو

اس کتاب میں شاعروں کے جو منظوم تاریخی قطعے ہیں۔ وہ زیادہ تر پست ہیں، بدایوں میں ایک سادہ لوح سے نیم مجذوب شعر گو حمزہ قادری ہیں، اُن کے نام کے ساتھ "امتیاز الشعرا اور ابوالبیان" لکھا گیا ہے، ان کی نظم کا یہ شعر کس قدر مضحکہ انگیز ہے:-

سال ہجری تیرہ سو کا ہے اکھتر واں کہو　　عیسوی انیس سو انسٹھ ہے اس کو بھی سنو

حالاں کہ بدایوں میں حضرت نوشہ موجود ہیں جو تاریخی قطعات کہنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں!

ایک فارسی قطعہ کا آخری شعر ہے ؎

شہر ہمایوں بر آں یعنی بدایوں بر آں　　ناز و تفخر کند آں چہ عجب تا البقا

یہ شاعری کے ساتھ مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟ حیرت ہے کہ صاحبِ "زنگار رنگ" نے اپنے مجموعہ کلام میں اس قسم کے قطعات کو درج کرنا کس طرح گوارا کر لیا۔

دلی کا پھیرا　　از:- ملا محمد واحدی دہلوی، ضخامت ۵۶ صفحات، قیمت دس آنہ۔
ملنے کا پتہ:- دفتر نظام المشائخ ۲۱/۸ جیکب لائن، کراچی۔

تقسیم ہند کے بعد دلی کے مسلمانوں پر جو اُفتاد پڑی، تو ملا واحدی صاحب بھی اپنے بال بچوں سمیت پاکستان چلے آئے، اپنا وطن چاہے وہ چھوٹا سا گاؤں کھیڑا ہی کیوں نہ ہو، ہر کسی کو پیارا ہوتا ہے، اور ملا واحدی کا وطن تو دلی تھا، وہ دلی جس کے بارے میں میر نے کہا ہے ؎

دلی کے نہ تھے کوچے، اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

اور مولانا حالی نے فرمایا ہے:- ؎

دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز

پاکستان آنے کے بعد دلّی کی یاد انہیں بے چین کرتی رہی، دلّی بھلا بھولنے کی چیز ہے! تقریباً بارہ سال کے بعد واحدی صاحب کا دلّی کا پھیرا ہوا، ۱۲ اپریل ۱۹۵۹ء کو کراچی سے روانہ ہوئے اور ۱۰ مئی ۱۹۵۹ء کو جہاں سے چلے تھے وہیں آ گئے! اس سفر کے حالات صاحب موصوف نے بڑے دلچسپ انداز میں قلمبند فرمائے ہیں، دلّی میں اُن کے تمام ہندو مسلمان احباب نے بڑی محبت کے ساتھ اُن کی آؤ بھگت کی، جگہ جگہ اُن کے اعزاز میں دعوتیں اور پارٹیاں ہوئیں، اس تاثر کو ملا واحدی صاحب نے خود ظاہر فرمایا ہے، اور اسی پیراگراف پر یہ کتاب ختم ہوتی ہے۔

"مجھ جیسے معمولی انسان کو خصوصاً اہلِ دہلی نے اس قدر نوازا کہ اُس کا تصور کرتا ہوں تو شبہ ہونے لگتا ہے کہ میں نے کوئی خواب تو نہیں دیکھا"

اُصولِ فارسی (حصہ اول)

مولفہ:- مولانا حبیب اللہ فاضل دیوبند، ضخامت ۹۶ صفحات، کاغذ، کتابت اور طباعت ہر چیز دیدہ زیب! قیمت ایک روپے، ملنے کا پتہ:- کتب خانہ محمودیہ دیوبند ضلع سہارنپور

"فارسی صرف" کے بنیادی اور ضروری اصول اس کتاب میں جدید انداز پر مرتب کئے گئے ہیں۔ طلباء کے لئے تو یہ کتاب ہر اعتبار سے کارآمد اور مفید ثابت ہوگی ہی، مگر اس کتاب کے مطالعہ سے خاصے لکھے پڑھے لوگوں کو بھی فائدہ ہوگا۔ اس لئے کہ بعض ساتھ کی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا صحیح علم نہیں ہوتا اور مطالعہ کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ان باتوں سے تو ہم بے خبر ہی تھے۔ مثلاً:-

موقوف:- وہ ساکن حرف جس کا پہلا حرف بھی ساکن ہو، جیسے "اسپ"

مہملہ:- جس حرف پر نقطہ نہ ہو۔

تازی:- عربی کو کہتے ہیں۔

"رُستن" ("ر" زبر کے ساتھ ——— چھوٹنا) اور "رُستن" ("ر" پیش کے ساتھ اُگنا) ان لفظوں کے تلفظ میں کم لوگ فرق کرتے ہیں ——— سپوزیدن ——— چھونا، نکالنا ——— شکوخیدن ——— ٹھوکر کھانا، گھوڑے کا الف ہونا گواریدن ——— ہضم کرنا ——— اور ذیل کے لفظوں کے معنی تو فارسی کے اچھے اچھے جاننے والوں کو شاید نہ معلوم ہوں "ناوند" ——— بدکار عورت ——— "شاماک" ——— نام غلہ، ریک ہندی ساواں ——— "شامانچہ" ——— سینہ بند، انگیا "آدنگ" ——— انگلی ——— "بخم" ——— شعلہ، چنگاری ——— "کاژ" ——— درختِ صنوبر!

امام احمد بن حنبلؒ

از:- ملک نصر اللہ خاں عزیز (بی، اے) ضخامت ۱۰۰ صفحات۔ دیدہ زیب سہ رنگی سرورق قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے، ملنے کا پتہ:- مکتبہ تعمیرِ انسانیت، موچی دروازہ، لاہور۔

جناب ملک نصر اللہ خاں عزیز کا قلم شگفتہ نگار ہی نہیں، حقیقت رقم بھی ہے، وہ تقریباً ۳۵ سال سے صحافت وادب اور دین واخلاق کی خدمت انجام دے رہے ہیں، موصوف ایک خوش گو شاعر بھی ہیں، مگر ان کی شعریت زیادہ تر نثر میں کام آ رہی ہے! انگریز کے دور میں بھی ملک صاحب موصوف قید و بند کے شدائد خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کر چکے ہیں، اور پاکستان بننے کے بعد تو ان کی تمام تحریروں کا مرکزی موضوع اقامتِ دین اور اللہ تعالیٰ کے کلمہ کی سربلندی رہا ہے!

۱۹۵۴ء میں بھی ملک صاحب موصوف کو اقامتِ دین کی جدوجہد کے جرم میں جیل جانا پڑا، وہاں جو فراغت میسر آئی تو اس میں انھوں نے حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات کا خلاصہ مرتب کیا، جسے مکتبہ تعمیرِ انسانیت نے

...ے اہتمام سے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ ملک صاحب نے اس کتاب کو لکھ کر، ایمانی جرأت اور حق گوئی کے نقوش ...بھار دیئے ہیں، یہ کتاب مسلمانوں میں زیادہ سے زیادہ اشاعت کی مستحق ہے کہ اس کے مطالعے سے نیکی اور تقویٰ کے ساتھ ساتھ دلوں میں عزیمت کا داعیہ پیدا ہوتا ہے!

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے خارجیوں اور ناصبیوں کے مقابلہ میں حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے مناقب و فضائل ...بیان کئے، فرماتے ہیں:۔

"جو شخص حضرت علی کی خلافت کو نہیں مانتا وہ گدھے سے زیادہ گمراہ ہے۔" (صفحہ ۵۵)

اور

"خلافت سے علی رض کی زینت نہیں، بلکہ علی رضی اللہ عنہ خلافت کی زینت ہے۔" (صفحہ ۰۰)

اور

"کسی صحابی کی فضیلت میں اتنی صحیح حدیثیں نہیں ہیں، جتنی حضرت علی رض کے حق میں ہیں۔"

خلافت معاویہ و یزید کے مصنف محمود عباسی اور ان کے ہم خیال لوگوں پر امام احمد بن حنبل کے یہ قوال نہ جانے کس قدر شاق ...زرے گے (موتوا بغیظکم)

مناقب امام احمد بن حنبل میں یہ عبارت کھٹکی:۔

"... ان کو اللہ تعالیٰ نے صبر ایوب، استقامت یوسف، خُلّتِ ابراہیم اور جلالِ موسیٰ عطا کیا تھا" (صفحہ ۷)

دوسرے ایڈیشن میں اس عبارت کو اس انداز پر درست کر دینا چاہیئے:۔

"..... ان کو اللہ تعالیٰ نے صبر ایوب، و استقامت یوسف ...... سے حصہ عطا کیا تھا۔"

جلالِ موسیٰ" سے، امام موصوف کی تشبیہ و نسبت میں ایک طرح کا تکلف ہی پایا جاتا ہے! اولیاء کرام اور اکابر دین کی مدح و منقبت میں انبیاء کرام کے کمالات سے نسبت دینے کی ضرورت پیش آجائے، تو یہ نسبت تام نہیں جزوی ہونی چاہیے ...س طرح۔

"فلاں بزرگ کی زندگی میں صبر ایوبی کی جھلک پائی جاتی تھی ..."

ماہر القادری

ماہ فروری سنہ ۱۹۶۰ء

ترتیب

قیمت سالانہ چھ روپے فی پرچہ آٹھ آنے

مقامِ اشاعت دفتر فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی نمبر ۱

پرنٹر پبلشر :- مسرور حسین
مطبوعہ مطبع سعیدی قرآن محل کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

فقہ کا مزاج دینی مسائل میں تنگی پیدا کرنا اور شرعی پابندیوں کو بوجھل بنانا ہرگز ہرگز نہیں ہے، فقہ نے کتاب و سُنّت اور آثارِ صحابہ
ماخذ قرار دے کر شریعت کی تفصیلات اور جزئیات کی تشکیل و تدوین کا گرانقدر کارنامہ انجام دیا ہے! "معاملات" میں جہاں کتاب
سُنّت خاموش ہیں، وہاں ائمہ فقہ نے اپنی استطاعت کی حد تک پوری ذمہ داری اور دیانت کے ساتھ اجتہاد کیا ہے! حالات بدلے
ہوئے ہوں تو کسی دینی حکمت ہی کی بنا پر ان فقہی اجتہادات میں ترمیم و تغیر کی جاسکتی ہے کہ اجتہاد ... کا دروازہ نبوت کی طرح بند نہیں
کیا گیا۔ حالات کے تقاضوں کے ساتھ ہر دور میں اجتہاد ممکن ہے، مگر فقہی مسائل میں اجتہاد کے کچھ شرائط ہیں ہر کہ و مہ کو اجتہاد کا حق
نہیں دیا جاسکتا! اجتہاد ناگزیر ضروریات کے لئے کیا جاسکتا ہے —— اس احتیاط و ذمہ داری کے ساتھ کہ دین و شریعت
کی کوئی اصل ذرہ برابر مجروح نہ ہو۔

اس اعتراف کے بعد ان حقائق سے بھی ہم بے خبر نہیں ہیں کہ جتنا زمانہ گزرتا گیا ہے اسی قدر تقلید میں جمود اور شدت پیدا ہوتی
چلی گئی ہے، اور تقلید کے اسی جمود و شدت نے کوئی شک نہیں بعض فقہی مسائل کے دائرے کو تنگ کر دیا ہے، کہیں کہیں یہ تنگی خاصی بوجھل
بن گئی ہے —— مگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہر دور میں ایسے مفکر علماء پیدا ہوتے رہے ہیں، جن کے فکر و عمل نے اس تنگی کو دور
اور اس بوجھ کو ہلکا کیا ہے، اور آج بھی بعض اہلِ فکر علماء اس فرض کو انجام دے رہے ہیں، اُن کی تحریریں اس کی نشاندہی کرتی ہیں کہ
اصابت و حق کسی ایک فقہی مکتب میں محدود نہیں ہے۔ مسائل میں مختلف ائمہ فقہ کے اقوال و اجتہادات کے مابین ترجیح دی جاسکتی ہے
کہ کس کا مسلک کس مسئلہ میں اقرب الی الصواب ہے۔

فروعی جزئیات میں جن علماء اور فقہاء کی شدت کی بدولت آسانی کی جگہ تنگی پیدا ہو گئی ہے، اُن اقوال و اجتہادات کو عام طور
پر اُمت نے قبول نہیں کیا، مثلاً عالمگیری دور کے قریب کے علماء غیر زبان میں قرآن کریم کے ترجمہ کئے جانے کو درست نہیں سمجھتے تھے
مگر اُن کی رائے کے علی الرغم قرآن کریم کے تراجم ہو کر رہے۔ اسی طرح منی آرڈر، پرامیسری نوٹوں کی زکوٰۃ اور لاؤڈ اسپیکر کے بارے میں
فقہاء کی شدت اور تنگی کو اُمت نے قبول نہیں کیا بلکہ ان شیوخ کے خلفاء اور معتقدین ہی نے اپنے عمل سے مخالفت کر کے ان
مسائل کی تنگی اور غلطی کو تسلیم کر لیا۔

فقہی مسائل میں اس تنگی اور شدت کو دیکھ کر کوئی اس ردِ عمل میں مبتلا ہو جائے کہ دین کے مسائل میں رخصتیں تراشے
اور اباحتیں پیدا کرتا چلا جائے، تو یہ ذہنیت مسائل کی شدت اور تنگی سے زیادہ مضر، خطرناک اور قابلِ پرہیز ہے! فقہی مسائل
کی تنگی گمراہی نہیں ہے ہاں! ناپسندیدہ اور تکلیف دہ ضرور ہے، لیکن "اباحیت" تو دین میں وہ زیادتی ہے جس کو گمراہی کی بجائے
اگر غیر مستحسن اور ناپسندیدہ کہا جائے، تو یہ اُس کی تحسین ہے!

"الدین یسر" یہ بات اپنی جگہ سو فیصدی صحیح ہے بے شک اللہ تعالیٰ کا دین آسان ہے، تنگ و دشوار نہیں ہے

اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے اس لئے جو چیز فطرت کے مطابق ہوتی ہے اُسے آسان و سہل ہی ہونا چاہیئے۔
دین کی آسانی کی صورت یہ ہے کہ نماز جیسا اہم فریضہ بیماری کی حالت میں بیٹھ کر، لیٹ کر بلکہ اشاروں تک سے ادا کیا جا سکتا ہے۔
جنگ کی وہ حالت جب دُشمن کے حملہ کا خوف ہو، تو اس وقت صلوٰۃ با جماعت میں آسانی پیدا کر دی گئی ہے۔ حج کے بعض مناسک
اگر آگے پیچھے ہو جائیں، تو اس تاخیر و تقدیم سے حج کی فرضیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ حج کا فریضہ بہر حال ادا ہو جاتا ہے، البتہ
بالقصد ایسا نہیں کرنا چاہیئے کہ فریضۂ حج کی ادائگی کا حُسن اسی میں ہے کہ مناسک میں ترتیب مسنونہ کا حتی الوسع لحاظ رکھا جائے۔

اسلامی معاشرے کو جن رسموں اور تقریبوں نے گراں بار بنایا ہے۔ اُن میں زیادہ تر عوام کے ذوق و پسندیدگی کو دخل ہے:
بچہ کی ولادت پر اذان و تحنیک اور عقیقہ کے سوا دین میں اور کوئی رسم سرے سے ہے ہی نہیں۔ نہ اس میں تسمیہ خوانی اور ختنہ کی
دعوتوں کے جھمیلے ہیں اور نہ شادی بیاہ کی تقریب میں طرح طرح کی رسموں کے تکلفات ہیں۔ علما نے ہر دور میں اس قسم کی فضول
اور غیر شرعی پابندیوں کے خلاف احتجاج کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان رسموں کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ ان رسموں پر تو "بدعات"
کا اطلاق ہوتا ہے۔

معاشرت و معاملات میں اس قسم کی تنگی یا زیادتی جہاں کہیں بھی جس ہیئت اور وضع میں پائی جاتی ہے، اس کی اصلاح کی ہر کوشش
مستحسن ہے! ان زنجیروں کو ٹوٹنا ہی چاہیئے۔ "اصلاح رسوم" کے عنوان پر فقہا نے مستقل کتابیں لکھی ہیں اور یہ تک بتا دیا ہے کہ نماز
پڑھنے کے بعد مُصلے کے کونے کو جو عام طور پر اُلٹ دیتے ہیں، اُس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

عقائد و عمل میں اصلاح کی ایک تو وہ کوشش ہے جو ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ (رحمہما اللہ تعالیٰ) جیسے مصلحین نے انجام دی ہے
اور دوسری کوشش سر سید احمد خاں کی تھی جو نیک نیتی کے ساتھ تھی مگر اُس میں یورپ کی مرعوبیت کا غلبہ تھا ———— یہ کہ جس
حقیقت کو یورپ کے دانشور اور سائنس داں سمجھ نہ سکتے تھے یا اُن کا ذہن جس کے قبول کرنے سے اِبا کرتا تھا، سر سید نے اُن کی ایسی تاویلیں
کیں کہ آزادیٔ فکر کا زیادہ سے زیادہ الاؤنس دے کر بھی ان تاویلوں کو جائز قرار نہیں دیا جا سکتا! جذبہ یہ کہ دین نیچر اور سائنس کے
عین مُطابق ثابت ہو جائے، چاہے اس کوشش میں وحی جبریل اور ملائکہ جیسی محکم حقیقتیں مسخ ہو کر رہ جائیں۔

ہمارے اس زمانہ میں بعض مسلم مفکرین تجدید و اصلاح اور دین کو آسان و سہل بنانے کی دُھن میں قریب قریب یہی پارٹ
انجام دے رہے ہیں اور سب سے زیادہ حیرت و افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ بعض عُلما تک اس مہم میں نہ صرف یہ کہ شریک ہیں بلکہ پیش
پیش ہیں، یہ عُلما بعض علمی اداروں میں شریک ہونے سے پہلے اس قسم کے خیالات نہیں رکھتے تھے، اداروں کی وابستگی نے ان کے ذہن و فکر
میں یہ حیرت انگیز تبدیلیاں پیدا کی ہیں! کاش! تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں بھی اُن کو کسی جامع مسجد کی امامت و خطابت کا منصب
مل جاتا!

مسلمانوں کے وہ ذہین افراد جو یورپ سے متاثر ہی نہیں مرعوب بھی ہیں اور جو اسلامی ثقافت کو "یورپین کلچر" کا حاشیہ
بردار اور خوشہ چین بنا دینا چاہتے ہیں، انہیں مرد و زن کے بے باکانہ اختلاط اور فحاشی و بیباکی کی مضرتیں تو نظر نہیں آتیں — مگر
"تعددِ ازدواج" کی اجازت ان کی طبع مغرب زدہ پر گراں گزرتی ہے ———— تو اس مزاج و ذہن کی پذیرائی و تائید و ہم نوائی
کے لئے بعض مُتَفقہ علماء نے اس سیدھے اور صاف مسئلہ کو اس انداز میں پیش فرمایا ہے جس سے تعدد ازدواج کے سلسلہ میں اللہ
تعالیٰ کی دی ہوئی اجازت شرعی کا وہ تو فیصلہ کن کردہ گئی ہے، جو برائے بیت مستعمل ہوتا ہے، حالانکہ صحابہ کرام کا عمل سب کے سامنے
ہے کہ انھوں نے اللہ کی اس عطا کردہ اجازت کا کیا مفہوم سمجھا اور اس کو کس طرح برتا بلکہ یوں کہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اجازت سے

کیا فائدہ اٹھایا؟ یہ کون کہتا ہے کہ یہ "اجازت" حکم کا درجہ رکھتی ہے کہ جو اس اجازت سے فائدہ نہ اٹھائے گا، وہ گنہگار ہوگا یا ثواب سے محروم رہے گا اجازت کو خالص و مجرد اجازت تو رہنے دیا جائے، اُسے ناقابلِ عمل فعل تو نہ بنا دیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے چار بیویوں کی شادی کی اجازت بہ "عدل" کی شرط اس لئے عائد کی کہ ایک سے زائد بیویوں کے درمیان مرد عدل کر ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا یہ اجازت سرے سے قابلِ عمل ہی نہیں ہے۔ اس قسم کی شرطیں حکومتوں کے سیاسی معاہدوں میں تو البتہ ہوا کرتی ہیں مگر اللہ تعالیٰ کی نسبت اس ڈپلومیسی کا معاذ اللہ گمان نہیں کیا جا سکتا۔

اس تضاد اور زمانہ کی لے میں لے ملانے کی بھی کوئی انتہا ہے کہ ایک طرف اس اشتراکی رجحان کو تقویت پہنچائی جا رہی ہے کہ زمین کی ملکیت اسلام میں ناجائز ہے اور دوسری طرف دُنیا کے سودی کاروبار کی وسعت و بے پناہی اور اُس کی عام مقبولیت سے مرعوب ہو کر "کمرشیل انٹرسٹ" کو سندِ جواز مرحمت فرمائی جاتی ہے! جو اہلِ فکر حضرت سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی زندگی کو زمین و دولت کی انفرادی ملکیت کے مسائل میں مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں، اگر وہ اپنی اس رائے میں مخلص ہیں تو انہیں سودی کاروبار کے خلاف جہاد کرنا چاہیئے، یہ جائیکہ اُن کے قلم کسی قسم کے بھی "انٹرسٹ" کی تائید میں رواں ہوں! یہ کیا کہ زمانہ میں جس چیز کا چلن دیکھا اُس کی تائید میں دلیلیں فراہم کرڈالیں۔

ایک شخص صاحبِ مطالعہ ہو، اپنے مفہوم کو وہ دل نشین انداز میں ادا بھی کر سکتا ہو، اُس کے قلم میں روانی بھی پائی جائے، منطقی استدلال کا بھی وہ سلیقہ رکھتا ہو ———— تو قلم کے زور سے وہ ہر غلط سے غلط بات پر دلیلوں کے انبار لگا سکتا ہے اور اُس کے اندازِ بیان اور قوتِ استدلال کو دیکھ کر کہیں کہیں تو ایسا محسوس ہوگا جیسے وہ حق کی حمایت کر رہا ہے اور اُس کا موقف غلط نہیں ہے منطقی دلیلوں، عقلی موشگافیوں اور لفظی ادب و انشاء کی قوت ہی سے برطانیہ اور امریکہ کے اربابِ اقتدار کو "مومنین صالحین" کی صف میں کھڑا کر دیا گیا تھا۔ "نگار" کے ایڈیٹر نیاز فتحپوری کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ اُس نے پرچ دقت نظر جیسی متواتر و محکم حقیقت کو عدم ثابت کرنے کی کوشش کی، اُس کے قلم نے جنت و دوزخ کا مذاق اُڑایا، اس ظالم نے یہاں تک لکھ دیا کہ قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف ہے۔ مسٹر پرویز کی قوتِ انشاء پردازی ہی نے یہ ستم ڈھایا ہے کہ بعض لوگوں کی نگاہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کو جو دین کا ستون ہے اور قرآن کے بعد دین میں سب سے بڑی حجت ہے، بے عتبار ٹھیرا دیا ہے، نبوت کے مقابلہ میں "مرکزِ ملت" کا منصب تراش کر، اُس پر دلیلیں لانا، یہ فکر و ذہن کی نکتہ آفرینیاں ہی تو ہیں، جو تحریر کا موزوں لباس پہن کر بعض لوگوں کو معقول اور دیدہ زیب نظر آتی ہیں، جس طرح تلوار سے اللہ کے راستے میں قتال بھی کیا جا سکتا ہے اور اُس سے ایک بے گناہ کی گردن بھی اڑائی جا سکتی ہے، اسی طرح دل و دماغ کی توانائیاں اور قلم و ذہن کی قوتیں بھی حق و باطل دونوں کی حمایت و تبلیغ میں استعمال ہو سکتی ہیں۔ قلم کفر کی حمایت میں بھی اُسی زور و شور سے چلتا ہے، جس زور و شور سے اسلام کی تائید میں رواں ہوتا ہے! بے دانشی، فکر و ذہن کی کجی، و ضلالت و غلط اندیشی کی حد ہو گئی کہ جھوٹی اور خود ساختہ نبوت کی تائید میں ہزاروں صفحات کا لٹریچر موجود ہے، جسے پڑھ کر بعض لوگوں نے اثر قبول کیا ہے یہاں تک کہ وہ ارتداد کی پستی تک اُتر آئے ہیں! اللہ تعالیٰ ہر کسی کے زبان و قلم کو ضلالت و کجی سے محفوظ رکھے۔ اور انہیں ایسے کاموں میں لگا دے جن کا نتیجہ دین، اُمتِ مسلمہ اور عام انسانی معاشرے کے حق میں سودمند اور نفع بخش ثابت ہو۔

مسئلہ حجاب

یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ اسلام زمانہ کی ترقی اور دُنیا کے تقاضوں کا ساتھ دیتا ہے! مگر اس حقیقت کو بھی تو سمجھ لینا چاہیئے دُنیا کے بہت سے تقاضے غلط بھی ہوتے ہیں اور بہت سی

ترقیاں اخلاقی اعتبار سے "تنزل" کے سوا اور کچھ نہیں ہوتیں، اس قسم کے غلط تقاضوں اور نام نہاد ترقیوں کا اسلام ایک قدم بھی ساتھ نہیں دے سکتا! کوئی شک نہیں اسلام کے قواعد و ضوابط میں لچک پائی جاتی ہے، مگر اسلامی اصولوں سے ہٹ کر دوسروں کے نظریوں کی تائید اور ہوائے نفس کی تکمیل و تحسین کے لئے اس لچک کو استعمال نہیں کیا جا سکتا! انسانی معاشرے کی حدود جہاں تک کا جہاں تک تعلق ہے اسلام کا قانون لچکدار ہے مگر جہاں اسلامی اخلاق کی کسی قدر پر آنچ آتی ہے، وہاں اسلام فولاد سے زیادہ بے لچک، پتھر اور شیشے سے بڑھ کر سخت اور پلاٹینم سے کہیں زیادہ ٹھوس ہے۔ دنیا نے سود، قمار بازی، لاٹری اور اسی قسم کے دوسرے ناجائز کاروبار کو اگر اپنی روزی کا ذریعہ بنا لیا ہے، تو اسلام ان جدتوں، ترقیوں اور تمدن و تہذیب اور معیشت کی رنگ آمیزیوں کو سند جواز دینے کے لئے اپنے اندر کوئی گنجائش اور لچک پیدا نہیں کر سکتا! آج کی دنیا تو یہیں کی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ رقاصاؤں کو حکومتوں کی جانب سے قدر دانی کے انعامات اور تمغے عطا کئے جاتے ہیں، مگر اسلام کی نگاہ میں آرٹ کی یہ ترقی فحاشی کی ترجمان ہے۔ اسلام کسی ادنیٰ سے ادنیٰ منکر پر اہل ہوا و ہوس سے سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

دنیا گرتی کو بلندی، تنزل کو ترقی اور فحاشی و بے حیائی کو تمدن و ثقافت کی علامت سمجھے۔ تو اسلام ان باتوں میں دنیا کے تقاضوں کے ساتھ چشم پوشی کا سلوک بھی روا نہیں رکھ سکتا۔ بلکہ وہ ان غلط کاریوں پر پوری قوت کے ساتھ احتساب کرتا ہے!

عورتوں کے "حجاب" ہی کے مسئلہ کو لے لیجئے۔ اسلام نے تبرج جاہلیت کے ایک ایک طریقہ اور مظہر پر پابندیاں عائد کی ہیں: دورِ جاہلیت میں عورتیں کھلے بندوں پھرتی تھیں، اسلام نے ان کے سینوں اور چہروں پر حجاب، اوڑھنیاں اور آنچل ڈال دیئے! ایک آئیڈیل عورت اُس کو قرار دیا گیا، جو بیرونِ خانہ کے مقابلہ میں اندرونِ خانہ کی زندگی کو ترجیح دے اور وقار کے ساتھ گھریلو زندگی میں پوری دلچسپی لے۔ غیر مردوں سے اختلاط تو ایک طرف رہا، اس آئیڈیل خاتون کو غیر مردوں سے بات چیت کی اجازت ان شرائط کے ساتھ دی گئی کہ پردے سے گفتگو کی جائے اور لہجہ میں ایسا لوچ پیدا نہ ہونے دیا جائے۔ جو سننے والے مرد کے دل میں عورت کی طرف سے کوئی امید یا گنجائش پیدا کر دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح اپنے قول و عمل سے قرآن کریم کے دوسرے احکام کی تفصیل پیش فرمائی ہے، اسی طرح عورتوں کے "حکم حجاب" کی تفصیلات بھی احادیث میں ملتی ہیں۔ عورت کی اخلاقی عظمت اور عفت و عصمت کی حفاظت کے لئے یہاں تک فرمایا گیا:-

"جو عورت خوشبو لگا کر، باہر نکلتی ہے، وہ زانیہ ہے"۔

روایتوں میں بے شک یہ ملتا ہے کہ بعض غزوات میں صحابیات نے زخمی غازیوں کی مرہم پٹی کی ہے۔ یا ٹیلے چڑھ کر مشکیں بھی ڈھوئی ہیں، خیمہ کی چوب سے دشمن کے سپاہی پر حملہ بھی کیا ہے۔ مگر کتاب و سنت کی تعلیمات صحابہ کرام کے تعامل اور اُس دورِ سعید کی عام اسلامی معاشرت جو مجموعی طور پر واضح تصویر دیتی ہے، وہ یہ ہے کہ مرد و زن کے اختلاط کو روا نہیں رکھا گیا، عورت اور مرد کی ذمہ داریاں اور ان کے فرائض یک جیسے نہیں سمجھے گئے، کسی مسلمان عورت کو کسی خطہ کا والی یا قاضی نہیں بنایا گیا۔ کسی سفارتی وفد میں کوئی عورت کبھی شامل نہیں کی گئی، قبائل اور حکومتوں کے جو وفود آتے تھے۔ ان کا خیر مقدم، ضیافت اور آؤبھگت —— (ENTERTAINMENT) کا کام عورتوں سے نہیں لیا جاتا تھا۔ لڑکیاں مردوں کے ساتھ نہ گھوڑے دوڑاتی تھیں اور نہ تفریحی کھیل کھیلتی تھیں، صحابۂ کرام کی معاشی تنگی کے باوجود، عورتوں کو مردوں کے دوش بدوش معیشت گاہوں میں نہیں بھیجا جاتا تھا!

کوئی مسلمان نفاق میں مبتلا ہو تو دوسری بات ہے ورنہ ایک مسلمان چاہے وہ کیسا ہی بے عمل کیوں نہ ہو، اگر وہ اسلام کی

قدروں پر ایمان رکھتا ہے، تو وہ دورِ نبویؐ اور عہدِ صحابہؓ کے اسلامی معاشرے کو "معیاری معاشرہ" سمجھے گا، اور مسلمانوں کی سوسائٹی میں اسی پاکیزہ معاشرے کی زیادہ سے زیادہ جھلک پیدا کرنے کی کوشش کریگا!

مگر اس کو کیا کیجئے

کہ آج کی دنیا قرنِ اولیٰ کے اس معیاری معاشرے کے بالکل خلاف راستہ پر جا رہی ہے، اخلاق و حیا کی ایک ایک حد کو بیدردی اور بے شرمی کے ساتھ پامال کیا جا رہا ہے، لباس کا معاملہ "کشفِ وجہ" تک ہی محدود نہیں رہا، اور وہ بچو کیسے سکتا تھا، اب وہ بڑھتے بڑھتے عریانی کی حد تک پہنچ چکا ہے، شرم و حیا کے معاملات بڑے ہی نازک، بال سے باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہوتے ہیں کہ ذراسی ڈھیل اور چشم پوشی بھی بہت سے جھول پیدا کر دیتی ہے، اور یہاں تو عورت کو ڈھیل ہی نہیں کھلی چھٹی دیدی گئی ہے، کہ وہ اپنی صحت کی بحالی تعلیم و تجربہ کی ترقی و وسعت اور مستقبل کو خوشحال بنانے کے لئے جس ذریعہ کو چاہے اختیار کرے، عورت کو ترقی و تہذیب اور تعلیم و تجربہ کے نام پر جو آزادی دی گئی ہے، اُس کے نتائج ہم سب کے سامنے ہیں، کوئی بات اب دلائل محتاج ثبوت نہیں رہی، یورپ جس کا احساسِ غیرت فنا ہو چکا ہے، وہاں تک کے بعض اربابِ فکر اپنی سوسائٹی کی ان خرابیوں کو دیکھ کر چیخ اُٹھے ہیں!

ان افسوسناک حالات

میں ایک مسلمان مفکر، اہلِ قلم اور مصلح کا رد عمل کیا ہونا چاہیے؟ اگر وہ سوسائٹی کی ان برائیوں کو واقعی برائی سمجھتا ہے، اگر وہ اسلام کی اخلاقی قدروں پر ایمان رکھتا ہے، اگر عورت کی عصمت و عفت اس کی نظر میں قابلِ احترام اور لائقِ حفاظت ہے ―― تو پھر "حجاب" کی بندشوں کو ڈھیلا کرنے کے بجائے وہ اُن کو سخت تر بنانے کا مشورہ دے گا، جس طرح وبائی امراض کے زمانے میں اطبا کھانے پینے اور رہنے سہنے میں عام حالات کے مقابلہ میں زیادہ سخت پابندیوں کا مطالبہ کرتے ہیں ―― تو اسی طرح اگر بداخلاقی قلب و روح کا کوئی مرض ہے اور یہ مرض جب وبا کی صورت اختیار کرلے، تو اس وقت اخلاقی پابندیوں میں زیادہ شدت کی ضرورت ہے، کسی محلہ یا شہر میں چوریوں کی وارداتیں کثرت سے ہو رہی ہوں، تو اس زمانہ میں ہر آدمی اپنے مال و اسباب کی حفاظت میں پہلے سے زیادہ محتاط اور شدید ہو جائے گا۔

اس دورِ بے حجابی میں "برقعہ" پر طنز دراصل حجاب کی اہمیت پر طنز ہے، یہ بات تو کسی خشک سے خشک مولوی نے بھی نہیں کہی کہ "حکمِ حجاب" کی تعمیل صرف "برقعہ" کے ذریعہ ہی ہو سکتی ہے اور عورتوں کے لئے یہ کوئی منصوص پہناوا ہے! کسی عورت کو برقعہ پسند نہ ہو یا وہ اس میں تنگی اور تکلیف محسوس کرے تو چادر وغیرہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کر سکتی ہے، نیت یہ ہونی چاہیئے کہ غیر مردوں کو اپنے جسم کے کسی حصہ کی نمائش سے، چال ڈھال سے، آواز سے، بناؤ سنگھار اور لباس کی دیدہ زیبی سے لبھایا نہیں جائے گا!

شریعت نے عورت پر علوم و فنون کے دروازے بند نہیں کئے، وہ سائنٹسٹ بھی بن سکتی ہے اور میکینک بھی وہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیمی ڈگری حاصل کر سکتی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ اس علمی جد و جہد اور فنی تعلیم کے دوران میں اس کی پاکبازی اور عفت و عصمت پر حرف نہ آنے پائے! یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے اسلامی اور غیر اسلامی فکر کے راستے جُدا ہوتے ہیں: غیر اسلامی فکر یہ ہے کہ عورت کے اخلاق و کردار سے بے پروا ہو کر بلکہ اُسے خطرے میں ڈال کر، دُنیوی ترقیوں کے سہرے اُس کو اونچا کیا جائے! اور اسلامی فکر یہ ہے کہ دُنیا کی بڑی سے بڑی ترقی، اور سربلندی عورت کی عصمت اور پاکبازی کی قیمت نہیں ہو سکتی۔ اسلام کی نگاہ میں ایسی عورت جو غیر مردوں

کی آغوش میں بے کر ڈانس کرتی ہو، پست و ذلیل ہے۔ وہ دو کوڑی کی برابر وقعت نہیں رکھتی چاہے وہ ارسطو سے بڑھ کر فلسفی، دا ونچی سے زیادہ مفکر اور ایڈیسن سے بلند تر سائنس داں کیوں نہ ہو!

عورت بھی صحت کی بحالی کے لئے ورزش بھی کر سکتی ہے۔ ٹینس اور بیڈمنٹن بھی کھیل سکتی ہے مگر غیر مردوں کے ساتھ نہیں کھیل کے میدانوں میں خاص طور سے اس اختلاط کے غلط نتائج بڑے نکلتے ہیں! غیر مردوں کے ساتھ کھیلوں کی مشق کر کے کوئی عورت دنیا کی چیمپین شپ حاصل کر لے، تو اسلام کی نگاہ میں اس کا یہ اعزاز قابل نفرت ہے کہ اس نے اخلاق کی دنیا کو توڑ کر دنیا کی یہ ناموری حاصل کی ہے۔

یہ درست ہے کہ خلافت راشدہ کے دور سعید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشن گوئی پوری ہو کر رہی کہ ایک عورت نے بے کھٹکے تن تنہا قادسیہ سے مکہ تک کا سفر کیا، مگر آج پانی کے جہاز سے کسی محرم کے بغیر ایک عورت کے سفر لندن پر کیجئے کہ لندن پہنچنے تک جس جہاز میں دو ہفتہ صرف ہوتے ہیں اس جہاز کا پورا ماحول فاسقانہ ہوتا ہے، رقص و سرود، شراب نوشی، کھیل کود، آزادانہ اختلاط! اس فضا میں عملاً نہ سہی ذہن و فکر اور دل و دماغ پر جو ہنگامہ بھی گزر جائے کم تھوڑا ہے! کوئی عفیفہ کردار سے تر دامن نہ ہوگا، تو بھی ایک آدھ چھینٹ اڑ کر تو اُس تک پہنچ ہی جائے گی!

یہ جو پرانے لوگوں پر طنز فرمائی جاتی ہے کہ فلاں گھرانے میں پردے کی پابندی کی یہ شدت تھی کہ "مرغا" تک گھر میں نہ آنے پاتا تھا، اگر یہ واقعہ ہے اور "اپج بندہ" نہیں ہے، تو خدا کی قسم یہ حماقت اُس دانشمندی اور روشن خیالی سے اور وہ وہم غیرت اُس بے غیرتی سے اچھا ہے، جہاں گھرانوں میں غیر مردوں کے آنے جانے اور عورتوں کے ساتھ ملنے جلنے پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے بلکہ کنواری لڑکیوں کو "کورٹ شپ" کے نام پر تنہائی کے موقعے دیئے جاتے ہیں۔

عورت کو نشانہ بازی سکھائی جا سکتی ہے مگر نشانہ باز اور قدر انداز عورتوں کی اس انداز پہ تربیت کھلی ہوئی بے حیائی ہے کہ وہ بڑے لوگوں کو سینے تان تان کر سلامیاں دیں اور پریڈ کا مظاہرہ کریں۔

علامہ اقبال نے بہت کچھ دیکھنے اور تجربہ کرنے کے بعد ہی مسلمان عورت کو یہ پیغام دیا تھا ؎

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری

عورت کو "چھپنے اور پردہ کرنے" کا درس مسجد کا کوئی مُلّا نہیں یورپ کا اعلیٰ تعلیم یافتہ عظیم مفکر دے رہا ہے، عورت کے "ظاہر و عیاں" ہونے کے شرمناک نتائج دیکھ کر ہی اقبال نے مسلمان عورت کو "پنہاں شو" کا درس دیا تھا!

مگر

آج کی دنیا میں "بتول" کی جگہ عورت کو گریٹا گاربو بنایا جا رہا ہے کہ اس کی آغوش میں "حسین" کے بجائے اودے شنکر اور بلبل چودھری جیسے ڈانسر تربیت پائیں!

عورت اور مرد کی جسمی ساخت کا تفاوت اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ ان دونوں کے فرائض اور حدودِ عمل ایک جیسے نہیں ہیں! مرد و زن کو فرائض و اعمال کی ایک ہی سطح پر لانے کی جو کوشش بھی کی جائے گی، وہ غیر فطری ہوگی اور اس کے نتائج انسانی معاشرے کے حق میں مضرت رساں ہی ثابت ہوں گے! عورت کے عورت پن کو مردانہ پن سے بدلنا عورت کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے، عورت کو بہر حال عورت ہی رہنا چاہئے! وہ کرکٹ بھی کھیل سکتی ہے اور ہوائی جہاز بھی اڑا سکتی ہے، لیکن ایسی مشقیں اُسے زیب نہیں دیتیں

عورت سے اس طرح کے کام لینے کے یہ معنی ہیں کہ اُسے ذلیل اور احساسِ کمتری میں مبتلا کیا جائے، اس لئے کہ وہ ان میدانوں میں مرد کی برابری نہیں کر سکتی۔ وہ انتہائی محنت اور جدوجہد کے بعد بھی مرد سے گھٹ کر ہی رہے گی! مردانہ قسم کی جسمانی مشقت تو ایک طرف رہی عورت اور مرد اگر ٹھیک برابر دماغی محنت کریں تو مرد کے مقابلہ میں عورت کی صحت متاثر ہو کر رہے گی!

یہ کون کہتا ہے کہ عورت کو گھر میں گڑیا بنا کر رکھا جائے، عورت گڑیا نہیں گھر کی ملکہ اور امورِ خانہ داری کی ناظم، عمل ہے! بچے کی پہلی تربیت گاہ ماں کی آغوش ہی ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے ہر صاحب اولاد عورت اپنی گھریلو یونیورسٹی کی چانسلر ہے! اُس کی ذمہ داریاں نہایت اہم اور نازک ہیں! عورت ہوائی جہاز اڑائے گی اور فوجی پریڈ کرے گی تو بچوں کی تربیت کون کرے گا! یورپ اور امریکہ میں مرد و زن کے فرائض کے اسی توازن کے بگڑ جانے سے خانگی زندگی تہ و بالا ہو کر رہ گئی ہے وہاں میاں بیوی کے تعلقات میں وہ لذت اور ربط باقی نہیں رہا جو اس رشتہ کی جان ہے! یہی سبب ہے کہ وہاں آئے دن خودکشی کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں، عیش و عشرت اور ہوس کیوشی کی شدت و فراوانی نے احساس کو اس درجہ کُند کر دیا ہے کہ زندگی وبالِ جان معلوم ہوتی ہے! اور ذرا ذرا سی بدمزگیوں پر وہاں لوگ خودکشی کر گزرتے ہیں!

یورپ نے بے شک سائنس، صنعت اور علوم و فنون میں غیر معمولی ترقی کی ہے، اُن کی اس جدوجہد کی افادیت کا ہم کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں بلکہ احسان مانتے ہیں، لیکن جہاں تک سیرت و کردار اور اخلاق و اعمال کا تعلق ہے، یورپ کی گراوٹ کی کوئی حد نہیں رہی! صحیح توازن اُسی وقت قائم رہ سکتا ہے کہ یورپ کے علوم و فنون کی تو ہم قدر کریں مگر اس کی معاشرت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھیں! ہمارے تجدد پسند اہلِ فکر افسوس ہے کہ یہی توازن قائم نہیں رکھ سکتے، یورپ کے علوم و فنون کی ترقی اُن کو اس قدر مرعوب کر دیتی ہے کہ تصویر کا تاریک پہلو انہیں دکھائی ہی نہیں دیتا۔

مغربی تعلیم یافتہ حضرات میں تجدد کا پایا جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔۔۔ کہ ع

شبِ مہ سایہ کی ظلمت کو فزوں کرتی ہے

مگر بعض علماء میں تجدد کا ذوق و شوق دیکھ کر بڑی اذیت ہوتی ہے! صوفیوں کے "سماع" کو آجکل کے راگ رنگ سے کوئی نسبت نہیں ہے صوفیوں کے "سماع" کی آڑ میں راگ رنگ کی حمایت میں ایک کتاب تصنیف کر دینا، ذیابیطس کے مریض کو مٹھاس کھلانے کے مرادف ہے! وقت ہے اخلاقی گرفت کو مضبوط اور تنگ کرنے کا اور دی جا رہی ہے ڈھیل! کیوں؟ اس لئے کہ زمانہ رخصتیں اور اباحتیں چاہتا ہے، اور زمانہ کے ذوق کی تسکین کر کے، اور اُس کے تقاضوں کا ساتھ دے کر ہی، قبولِ عام حاصل کیا جا سکتا ہے۔

شیطان کے فریب بڑے ہی نازک اور پُرپیچ ہوتے ہیں۔ وہ 'دین کو آسان بنانے' کے نام پر دین کے حدود کو علماء ہی کے ہاتھوں پامال کراتا ہے، اور ساتھ ہی تجدد پسند علماء کے کانوں میں یہ افسوں بھی پھونک دیتا ہے کہ فلاں عالمِ دین کی مخالفت کر کے ہی تمہاری شخصیت اُبھر سکتی ہے، اُس نے "ضبطِ ولادت" پر اپنی کتاب میں تنقید کی تم اُس کے رد میں "ضبطِ ولادت" کے محاسن کو اُبھار دو اور خوب کس کر طنز کرو کہ جسے "قتلِ نفس" کہا جاتا ہے وہ تو عین فطرت ہے! اُس نے اپنی تصنیف میں ہر قسم کے "سود" کو ناجائز ٹھہرا دیا، تم اس کے جواب میں "کمرشیل انٹرسٹ" کو سندِ جواز عطا کرو، وہ بے پردگی کی مخالفت کرتا ہے، تم اس مسئلہ کو اس انداز میں سامنے لاؤ کہ عورت کے اخلاق و کردار اور عصمت و عفت کی اہمیت تو تسلیم کی جائے مگر تحریروں کا رنگ ایسا ہو کہ اُن کو پڑھ کر "بے پردگی" کی کراہت دلوں سے نکل جائے۔ یہ بات ہم کسی کشف کی بنا پر نہیں کہہ رہے ہیں، یہ ایک نفسیاتی مطالعہ

ور ذہنی تجزیہ ہے، اگر اس مزاج و فکر کے اہلِ علم اپنے دلوں کو ٹٹولیں گے، دب تحت الشعور کا دیانت داری کے ساتھ جائزہ لیں گے
لاں کا ضمیر اس کی گواہی دے گا اور تصدیق کرے گا کہ اشارہ کرنے والے نے، اسی طرف اشارہ کیا تھا جب یہ بات عرض کی گئی تھی،
یہ جذبہ بھی اچھے خاصے آدمی کو بعض اوقات جادۂ عدل و راستی سے کسی نہ کسی حد تک ہٹا دیتا ہے کہ فلاں شخص کی حسنات سے
صرفِ نظر کر کے، ہمیں اس کی غلطیوں پر احتساب کرتا ہے، اور تنقید کی خوردبین سے اس کی تحریروں کے عیوب ڈھونڈ کر دکھاتا ہے!
عیب بینی اور نکتہ چینی کا یہ جذبہ رفتہ رفتہ اس شخص کی ذات سے نفرت و بیزاری ہی نہیں بلکہ دشمنی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔
یہاں تک کہ اس سے وہ باتیں بھی منسوب کر دی جاتی ہیں، جو اس نے نہیں کہیں، اس کی تحریروں کو غلط معنی پہنائے جاتے
ہیں اور یہ جذبہ ابھرتا ہے کہ فلاں شخص نے جن مسائل پر جو کچھ لکھا ہے، ان کا کسی نہ کسی عنوان سے رد کیا جائے۔

عزیمت و رخصت

ان "تلمیحات" میں بعض دماغ الجھن محسوس کریں گے کہ "فلاں" اور "کس" سے کون مراد ہے؟ تجزیہ
گفتگو میں بعض اوقات ایسی باتیں بھی نکل آتی ہیں جو اصل موضوع سے کچھ ہٹی ہوئی سی معلوم
ہوتی ہیں! اگرچہ موضوع سے ان کا ربط ہوتا ہے! ہاں! تو بات "مسئلہ حجاب" سے چلی تھی، اس گفتگو کی آخری کڑی یہ ہے کہ
... کے ہر خطہ میں ہوا و ہوس کا جو طوفان اُمڈ رہا ہے، اور سارا عالم اس طوفان میں خوشی خوشی غرق ہو رہا ہے، اور لوگ بڑے
اطمینان کے ساتھ اخلاقی خودکشی کا ارتکاب کر رہے ہیں اور جو اموات واقع ہو رہی ہیں ——— اس کثرت کے ساتھ
... ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا!

تو ———

ایسے عالم میں، اربابِ عزیمت اور اہلِ فکر کا کیا فرض ہے، کیا وہ اس طوفانِ بدتمیزی کے آگے ہتھیار ڈال دیں اور ہاتھ پاؤں توڑ کر
بیٹھ جائیں کہ ہم جب اس طوفان کا مقابلہ کرنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے تو ہاتھ پاؤں مارنے سے کیا فائدہ؟ یا پھر ان برائیوں
سے سمجھوتہ کر لیا جائے، ان کی ہاں میں ہاں ملائی جائے کہ جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہو رہا ہے، بدلتے ہوئے زمانہ کے تقاضوں
کا ساتھ نہ دینا قدامت پرستی کی دلیل ہے، دنیا کیا کہے گی؟ معاشرے کا ذہین طبقہ ہمارے بارے میں کیا رائے قائم کرے گا
یا پھر ان ہوسناکیوں اور نفس کی دراز دستیوں کے درمیان کوئی بیچ کا راستہ نکالا جائے کہ کوئی بات اہلِ تقویٰ کی مان لی، کوئی
بات اہلِ ہوس کی قبول کر لی، کسی کے برے نہ بنیں کسی سے بگاڑ کی نوبت نہ آنے پائے، زاہد و گنہگار اور شیخ و رند سبھی سے
یارانہ اور صاحب سلامت رہے!

شیطان ہر آدمی کے رجحان، خیالات و معتقدات اور نفسی کیفیت کو خوب دیکھ بھال کر، اپنا داؤں چلتا اور اچھر
کرتا ہے، دیندار آدمی کو وہ "تقرب الی اللہ" کا جھانسا دے کر، نافرمانی پر آمادہ کرتا ہے، یا پھر ملک و ملت کی خیر خواہی کی آڑ میں
یہ کھیل کھیلتا ہے ——— وہ یہ بات سمجھتا ہے کہ فلاں کام دینی اعتبار سے ہے تو ناپسندیدہ مگر جب ساری دنیا اسی
راستہ پر چل پڑی ہے، تو اس سے اہلِ ایمان کے لئے بھی مفر ممکن نہیں، پھر اس کام سے بچے رہنے میں ملت دنیوی فائدوں سے
محرومی قبول کر رہی ہے، یہ بات بھی تو اپنی جگہ قابلِ غور ہے؟

——— اور ...... ہاں! ———

دین آسان ہے ——— حالات جب بدلتے ہیں تو شریعت کے تقاضے احکام بھی بدل جاتے ہیں۔
... کو دین میں تنگ کیا نہیں گیا ہے ——— اس کے مفاد کی بڑی اہمیت ہے ——— ملت یوں ہی مفلس و درماندہ ہے، فلاں

فلاں باتوں کے چھوڑ دینے سے اور زیادہ فلاش ہو جائے گی، اور فلاں آدمی کو کفر کے قریب پہنچا دیتا ہے ——— تو پھر ملت ہی کے فوز و فلاح کے لئے فلاں فلاں ناپسندیدہ باتوں کو عقلی و نقلی براہین اور شرعی دلیلوں کے ساتھ اباحت کا رنگ دیدینا چاہئیے

قوم کی اصلاح و ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے جب ذہن اس طرح کا بن جاتا ہے، تو پھر "اباحت" کے دروازے کھٹ کھٹ کھلتے جاتے ہیں۔ اور دماغ احتیاط و تقویٰ کا مسلک چھوڑ کر، رخصتوں پر اتر آتا ہے! اباحت و رخصت کا حال ایسا جیسے ایک بچہ کی دلدہی اور تفریح کے لئے اس کے والدین کسی مکان کی منڈیر پر اسے چند قدم چلنے کی اجازت دے دیں، مگر وہ بچہ اس وقتی رخصت کو مثال بنا کر مکانوں، اور کنوؤں کی منڈیروں اور دریاؤں کے کگاروں پر مستقل سیر گشت شروع کر دے ایسا کرنے سے کیا عجب ہے کہ وہ ایک دن پھسل کر گر پڑے اور اس طرح یا تو وہ ہلاک ہو جائے یا اس کا ہاتھ پیر ٹوٹ جائے!

پاکستان بن گیا، بچشم ما روشن دل ما شاد، وہ قائم ہے اور انشاء اللہ رہتی دنیا تک قائم رہے گا، اس کی حفاظت ہمارا دین ایمان! مگر اس طرف کسی کی نظر شاذ و نادر ہی جاتی ہے کہ مسلم لیگ کی اس جدوجہد میں مسلمانوں کی قیادت و رہبری کے لئے "دینداری اور تقویٰ" کا تصور ہی ذہنوں سے نکل گیا! یہ ذہول و غفلت اب ہمیں اس پستی تک لے آئی ہے کہ پاکستان کے بعض اہم جلسوں کا آغاز تو قرآن کریم کی تلاوت سے ہوتا ہے، مگر عین نماز مغرب کے وقت جلسوں کی کارروائی جاری رہتی ہے اور بھرے جلسہ میں اکا دکا کو نماز پڑھنے کی توفیق نصیب ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ تماشے کی بات یہ ہے کہ پاکستان کا ترانہ جب گایا جائے۔ اس وقت کوئی تعظیم کے لئے نہ اٹھے تو اس کے اس نہ اٹھنے پر احتساب کیا جائے مگر نماز کے وقت لوگ جلسوں اور پارٹیوں میں بیٹھے رہیں، تو ان سے ذرہ برابر باز پرس نہ ہو!

جہاں تک دنیوی ترقیوں کا تعلق ہے ارباب کار کو، ملت کو اہل ملک کو مبارکباد دیجئے، خوشی کے شادیانے بجائیے، جلوس نکالئے، جشن منائیے، شاندار مستقبل کی پیش گوئیاں کیجئے اور ایک دوسرے کو مژدہ سنائیے کہ ہر طلوع ہونے والی صبح ہزار امیدوں کے ساتھ طلوع ہوگی، خزاں کے دن بیت چکے، یہ بہار کا زمانہ ہے ——— مگر جہاں تک ہماری دینی حالت کا تعلق ہے اس کا یہ عالم ہے کہ ہماری بہت بڑی تعداد "صلوٰۃ" جیسے اہم ترین فریضہ سے غفلت برت رہی ہے۔ اس کے اہتمام کے لئے کوئی منصوبہ تیار نہیں ہوتا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سعادت مہد میں کسی مسلمان کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ ایک وقت کی بھی نماز عمداً ترک کر سکتا ہے! ملت کی صرف مادی خوشحالی اور دنیوی ترقی کسی کو مقصود ہو تو پھر انگلستان جرمنی، جاپان، امریکہ، چین اور روس کے زندہ نمونے موجود ہیں، جن کو سامنے رکھ کر، اور ان کے قدم بہ قدم چل کر دنیا کی خوشحالی و ترقی حاصل کی جا سکتی ہے، اور اگر قوم کی صحیح تعمیر مطلوب ہو تو پھر اس کے لئے عہد رسالت اور دور خلافت راشدہ ہی کو نمونہ بنانا ہوگا۔ یہ تعمیر عوام و خواص سبھی سے قربانی کا مطالبہ کرے گی، اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی کی خاطر ہمیں اپنی نہ جانے کتنی خواہشوں کی قربانی دینی پڑے گی! یہاں تک کہ حکومتوں کے آمد و خرچ کے ذرائع کو اس کسوٹی پر جانچنا اور اس پیمانے سے ناپنا ہوگا جس کو قرآن میں "ما احل اللہ" اور "ما حرم اللہ" کے نام سے بیان کیا گیا ہے۔

حرفِ آخر تمہید کی طرف مراجعت کرتے ہوئے آخری گذارش یہ کی جاتی ہے کہ اہل علم کو عوام کے مقابلہ میں بہت زیادہ صاحب عزیمت ہونا چاہیے ان کی عزیمت کسی مصلحت اور طاقت سے لچک گئی تو عوام کا کیا حشر ہوگا؟ فتنہ بے حجابی ہو یا دوسرے فتنے اور بلائیں ہوں اگر خدا نخواستہ ساری دنیا ان میں مبتلا ہو جائے پھر بھی علماء کی زبان و قلم کو اعلان حق ہی کرتے رہنا چاہئیے: ؎

آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

ماہر القادری ۳ فروری سنہ ۱۹۶۰ء

...ر سول احمد

جبر و قدر

اگر حقائق سے چشم پوشی اور واقعات سے گریز کو اتنا دخل نہ ہونے دیا جائے تو مسئلہ جبر و قدر کو دین و دانش کے ہم مسائل میں سے تسلیم کر لینے کے بعد ہی غیر جانبداری کا کوئی ثبوت فراہم کیا جا سکتا ہے۔ یوں تو یہ مسئلہ اس کائنات کے وجود کے ساتھ ہی وجود میں آ چکا تھا مگر عقل انسانی کے اس ابتدائی دور میں جب کہ انسان مشاہدہ کی قوتوں اور بالغ نظری کی نعمتوں سے محروم تھا تو یہ سوال بھی اس کے ذہن نارسا میں کروٹیں لینے سے محروم رہا۔ اس وقت کا انسان اپنے اطراف و جوانب پر نظر ڈالتا تو حیران رہ جاتا۔ وہ اپنے گرد و پیش میں پھیلے ہوئے تمام مظاہر فطرت اور قدرت کی پوشیدہ قوتوں کو جو موقع بہ موقع ظہور پذیر ہوتی تھیں محض شخصی تصور کرتا تھا۔ بادل کی گرج، بجلی کی چمک، بارش کے کرشمے، چشموں کے فیض، دریاؤں کے ترانے، آبشاروں کا شور، پہاڑوں کی جسامت، طوفانوں اور سیلابوں کی بربادیاں، زمین کی روئیدگی، غرضیکہ جن جن مظاہر فطرت سے وہ دوچار ہوتا اسے اپنے نفس پر ہی قیاس کرتا اور اس کائنات رنگ و بو میں وقوع پذیر ہونے والا ہر حادثہ اسی کے نفس کی کسی نہ کسی کیفیت کا آئینہ دار ہوتا۔ اس دنیا میں بسنے والی جملہ اقوام کے قدیم مذاہب کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تمام قدیم اقوام عالم مختلف دیویوں دیوتاؤں اور مظاہر فطرت کی پرستش کرتی تھیں۔ اس معاملے میں یونانی تمام قوموں سے سبقت لے گئے تھے۔ یونانی دیویوں اور دیوتاؤں کے بارے میں بڑی عجیب عجیب اور دلچسپ روایات مشہور تھیں جنہیں اندھے شاعر ہومر نے اپنی نظم (Ilead) ایلیڈ میں اور (Odyssey) میں اور ہیزیوڈ نے (Theogony) تھیوگنی میں بیان کیا ہے۔ ان کے یہاں مناظر فطرت کی پرستش بڑے زور شور سے ہوتی تھی اور مناظر فطرت میں سب سے زیادہ پرستش آسمان کی ہوتی تھی اس کے بعد زمین کی۔ یورانس آسمان کا دیوتا تھا اور گے زمین کی دیوی تھی۔ یہ دونوں آپس میں میاں بیوی تھے اور ان کے ملاپ سے جو بچے پیدا ہوئے وہ بھی معبود ہی بنے۔ جن میں خاص دیوتا کرانس اور ریا دستور دیوی تھی۔ کرانس اور ریا کا بیٹا زیوس یونانیوں کا معبود اکبر اور آسمان کا بادشاہ تھا۔

آسمان کے بعد سورج کی پرستش ہوتی تھی اور سورج کی گاڑی کو کھینچنے کے لئے اسپارٹا کے لوگ گھوڑوں کی قربانی دیا کرتے تھے مظاہر فطرت کے بعد جنسی معبودوں کی بھی پرستش ہوتی تھی اور اہل یونان زمانہ سلف کی دیگر اقوام کی طرح قوائے تولید کی بھی پرستش کرتے تھے اور ان کے معبودوں کا تعلق جنسی جذبات سے تھا۔ ان کا خاص دیوتا ڈایونیس (Dionysus) تھا جس کے نام یونانیوں کا سب سے عظیم تہوار () ڈائیونیزیا منایا جاتا تھا۔ اس تہوار میں مردانہ عضو کی مورتوں کا جلوس نکالا جاتا تھا۔ اور مرد عورت سب دانستہ جمع ہو کر ایک دوسرے سے مختلط ہوتے تھے۔ اسی طرح ہرمیز () دیوتا اور (Aphrodite) دیوی کا تعلق بھی جنسی اعضا کی پوجا سے تھا بلکہ اپریل کے آغاز میں افروڈسیا دیوی کے نام ...

لہٰذا اس سے کسی کو یہ غلط فہمی پیدا نہ ہو جائے کہ انسان بت پرستی سے ترقی کر کے خدا پرستی تک پہنچا ہے، دنیا میں پہلا انسان خدا پرست تھا۔ انسانی زندگی کا آغاز تاریکی سے نہیں روشنی سے ہوا ہے۔　(م۔ق)

پر مختلف شہروں میں ([illegible]) کا تہوار منایا جاتا تھا جس میں ہر خاص و عام کو پوری جنسی آزادی دی جاتی تھی۔ آسمانی معبودوں کی پوجا اور مظاہر فطرت کی پرستش اور جنسی دیوتاؤں کی پرستش کے علاوہ قدیم قوموں میں حیوانی معبودوں کی بھی پوجا ہوتی تھی۔ اسی طرح خانگی معبود اور شہری معبود بھی ہوا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ یونانیوں کے اعلیٰ معبود جو کوہ اولمپس پر رہتے تھے جو کہ تھسلی میں واقع ہے پوجے جاتے تھے ان اولمپیائی معبودوں کی کل تعداد بارہ تھی اس طرح عقل انسانی کے ابتدائی دور میں کائنات کے ہر گوشے میں اور زندگی کے ہر شعبے پر دیویوں دیوتاؤں اور طرح طرح کے معبودوں کی حکمرانی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر بربادی پر اور ہر بہبودی، ہر رنج اور خوشی میں ان گنت دیویوں اور دیوتاؤں کی خوشی یا ناراضی کار فرما سمجھی جاتی تھی جس کا سبب جیسا کہ ان کی مذہبی سوجھ بوجھ سے ظاہر ہو چکا ہے محض یہ تھا کہ عقل انسانی قوانین فطرت سے بے بہرہ اور انسان علت و معلول کے لزوم سے ناآشنائے محض تھا۔ عقل انسانی نے اپنے نفس ہی کی طرح تمام مظاہر فطرت کو متلون تصور کر لیا اور اس کے خیال میں یہ ایسی عاقل سبب رکھنے والی ہستیاں تھیں جن میں باہم تعاون بھی نہیں تھا اور جو عقل و اخلاق کے کسی خاص اصول کی بھی پابند نہیں تھیں انسان برسہا برس تک انہیں گتھیوں کو سلجھانے میں مصروف رہا اور جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں بھٹکتا رہا لیکن انسان کی فکری قوتیں جب بیدار ہو گئیں اور اس کے عقل و شعور نے ترقی کی منزلوں کی طرف بڑھنا شروع کیا تو اس نے ایک عقابی نگاہ سے اپنے اطراف و جوانب کا جائزہ لیا اور فطرت کا بغور مطالعہ کر کے یہ منکشف کر لیا کہ یہ فطرت ایک اٹل نظام ہے جس میں معینہ سبب اور معینہ نتائج علت و معلول کے طور پر باہم وابستہ ہیں۔ پھر اس نے اپنے اعتقادات اپنی مذہبی سوجھ بوجھ پر ایک تنقیدی نظر ڈالی تو اس نے دیکھا کہ اس کائنات میں وقوع پذیر ہونے والا ہر واقعہ ہر حادثہ پس منظر میں کوئی نہ کوئی سبب رکھتا ہے نظام شمسی کا مقررہ قوانین کے تحت متحرک رہنا آسمان کے فرضی دیوتا کے حکم کا پابند نہیں ہو سکتا۔ سورج اور چاند میں گہن کا لگنا اس لئے نہیں ہے کہ ایک دیوتا دوسرے دیوتا کا گلا گھونٹ رہا ہے بلکہ یہ زمین، چاند اور سورج کے اپنے مقررہ مدار میں حرکت کرتے ہوئے عارضی طور پر ایک دوسرے کے درمیان حائل ہو جانے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ نسیم سحر یا باد سموم کسی دیوتا کے اشاروں کی محتاج نہیں ہو سکتی۔ بارش کسی دیوی کے رحم و کرم اور خوشی یا احسان کا مظہر نہیں ہو سکتی۔ سورج کا شعلہ بار رتھ مشرق سے مغرب تک سفر کرنے کے لئے گھوڑوں کی قربانی کا محتاج یا خواہشمند نہیں، سیلاب کسی دیوتا کی طرف سے اختتام پذیر ہونے کے لئے کسی کنواری دوشیزہ کے جسم کی قربانی نہیں چاہتا؟

ان تمام مظاہر اور عوامل پر غور کرنے کے بعد انسانی عقل نے دید و دانش کی طرف پہلا قدم اٹھایا اور بڑے غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ ان تمام مظاہر کے پس منظر میں اور اس تمام نظام کے پیچھے کسی بہت بڑے ناظم کا ہاتھ ہے اور اس حکمت کے پیچھے کوئی عظیم حکیم ہے، اور یہیں اس نے توحید فطرت کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ لیکن اس کی الجھن یہاں ختم نہیں ہو گئی بلکہ اس کی الجھنوں میں اضافہ ہو گیا اور خارجی فطرت کے علاوہ اس کی اپنی فطرت اس کے لئے ایک معمہ بن کر رہ گئی، ایک گتھی تو سلجھ گئی لیکن رشتۂ دار میں سینکڑوں نئی گرہیں پڑ گئیں، وہ اس معمے کو حل کرنے کے لئے اس نے جتنی تیزی سے منزل کی طرف قدم بڑھایا منزل اسی تیزی سے اس سے دور بھاگتی رہی اور جب اس نے تھک ہار کر بحر علم کی طرف قدم بڑھایا تو اس کی وسعت پر نظر ڈالتے ہی غرق دریائے حیرت ہو گیا۔

اس نے جب قدرتی دنیا پر نظر کی تو دیکھا کہ کائنات کا ذرہ ذرہ قوانین فطرت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اس نے دیکھا کہ یہاں ایک پتے کی جنبش بھی خدا کی مشیت کی محتاج اور علت و معلول اور لازم و ملزوم کے قانون کی محکم ہے، تو اس نے خود اپنے

وجود کے بارے میں غور کیا کہ وہ خود کیا ہے؟ اس کا خالق کون ہے اور اس کی حیات اور اس کے وجود کا مقصد کیا ہے ان بنیادی سوالات کا اس نے تسلی بخش جواب بھی پایا کہ وہ خود ساختہ نہیں ہے وہ آپ اپنا خالق نہیں ہے اور قدم قدم پر قانونِ خداوندی کا پابند ہے۔ اس نے سوچا کہ ان حالات میں وہ شے کہاں ہے جسے میں اپنا اختیار کہتا ہوں اس نے دیکھا کہ اس کے افعال کی عمارت کی تعمیر اس کے طبعی ماحول کی بنیادوں پر ہوتی ہے اور یہ طبعی ماحول اس کے اپنے اختیار سے وراء کوئی شے ہے اس لئے اس کے افعال کی ذمہ داری اس پر کس طرح عائد ہوتی ہے۔ اور انہیں عقائد پر ڈارون اور رسل ویلس ([illegible]) نے ([illegible]) کی بنیاد رکھی۔

"اس قانون کی رُو سے ہر شخص کی فطرت و سیرت ایک سانچے میں ڈھلتی ہے جو اس کو اپنے اسلاف سے نسلاً بعد نسلٍ چلا آرہا ہے اور یہ موروثی سانچہ جس شکل میں فطرت و سیرت کو ڈھالتا ہے اس کو بدل دینے پر کوئی شخص قادر نہیں ہے۔ جس طرح آج ایک شخص سے جو برائی ظاہر ہوتی ہے وہ گویا ایک پھل اس درخت کا ہے جو آج سے سو برس پہلے اس کے پردادا نے [illegible] پردادا میں جو برائی تھی وہ بھی اس کو پرانی نسلوں سے ہی ملی تھی۔ اس پھل کے ظہور و عدم ظہور میں اس شخص کے ارادہ و سعی کو کچھ دخل نہیں ہے بلکہ وہ اسی طرح اس کے اظہار میں مجبور ہے جس طرح ایک آم کا درخت جو ایک آم کی گٹھلی سے نکلا ہے آم پیدا کرنے پر مجبور ہے[1]۔" اور وہ ہی نفس کے ہر ارادے کے ساتھ جسم میں حرکت پیدا کرتا ہے۔ ([illegible]) صاف صاف کہتا ہے کہ خدا ہی "فاعل خیر و شر" ہے اور اس طرح یہ [illegible] جبر کا فیصلہ دیتا ہے ([illegible]) کہتا ہے کہ انسان اپنی جبلی ساخت اور طبعی [illegible] کے ہاتھوں مجبور محض ہے۔ اسپینوزا ([illegible]) کہ انسان اپنے اندر خواہ کتنی ہی فعلیت محسوس کرتا ہو مگر در اصل وہ فاعل نہیں ہے بلکہ منفعل ہے اس لئے وہ بالکل بے قدرت ہے۔ اس نظریے کی مثال علم طبیعات کے منوّر اور غیر منوّر اجسام جیسی ہے۔ مثلاً سورج ایک منور جسم ہے اور خود اپنی روشنی خارج کرتا ہے لیکن چاند خود منور جسم نہیں ہے بلکہ وہ سورج کی روشنی منعکس کرتا ہے۔ اسپائینوزا کے فلسفے میں خدا تعالیٰ کی حیثیت سورج کی سی ہے اور انسان کی چاند کی سی۔ اسی طرح لاک (Locke) اور شوپنہاور نے (Schopenhauer) بھی انسان سے لے کر جمادات تک ہر جگہ ارادے کا فقدان دیکھا ہے اور وہ کوئی بھی ایسا کوئی نقطہ نہیں دیکھتے جو قدریت کی کتاب کا عنوان بن سکے۔

ان تمام مباحث میں بحیثیت مجموعی تمام اکابر و ارباب فکر کے نظریات پر غور کرنے کے بعد وجود میں مسئلے کا کوئی تسلی بخش حل نہیں ملتا۔ لیکن اگر ایک قدم آگے بڑھایا جائے تو محسوس ہوگا کہ دین نے محض ایک خالق کائنات، اور ناظم فطرت ہی کے انکشاف پر ہی اپنی تعلیمات ختم نہیں کر دیں، بلکہ دیدۂ بینا کے لئے یہ بات کسی بھی شک شبہ سے بالا تر ہے کہ مذہب کا بڑا مقصد اصلاحِ کردار کی تلقین اور اخلاقی قدروں کی حد بندی ہے اور اخلاق کا مدار امر و نہی پر ہے۔ مذہب نے [illegible] کر دیا کہ اچھے اور بُرے کے درمیان خط امتیاز کھینچ دیا گیا ہے اور یہ امتیاز ہمیشہ کے لئے ہے اس میں کوئی ردّ و بدل نہیں ہو سکتی اور اچھے اعمال کا نتیجہ دنیا و آخرت میں سرخروئی اور بُرے اعمال کا نتیجہ دونوں جگہوں پر ذلت و خواری کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اس طرح اچھے اور بُرے افعال کی حد بندی بھی ہو گئی اور ان کے نتائج سے بھی باخبر کر دیا گیا اور یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ مدح و ذم، تکریم و تذلیل، عذاب و ثواب سب کا دار و مدار اختیار ہی پر ہے اور اگر اختیار نہ ہو تو جبر و [illegible] بے معنی و [illegible] حد بندی کی حیثیت

[1] "جبر و قدر" مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صفحہ ۳۰ تا ۳۱

اختیار کرلیں گے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خیر و شر اللہ ہی کے پیدا کردہ ہیں لیکن اس کا حکم ہے کہ شر سے بچو، اور خیر کو اپناؤ اور اس شر سے جس کا خالق خود ہے خدا ہی سے پناہ مانگے "اعوذ باللہ من شرور انفسنا" ـــــــــــ انسان، حیوان، غرضکہ کائنات کی پیدائش سے پہلے ہی اس کا علم ہر فرد اور اس سے سرزد ہونیوالے ہر فعل سے باخبر تھا اس کا علم اور اس کی قدرت، یہ دونوں صفات ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ اگر لامحدود علم و قدرت نے حوادث اور ان کے نتائج کو، علت و معلول کے لوازم کو ازل سے ہی متعین کر رکھا ہو تو انسان اپنے اختیار سے کس طرح تجاوز کر سکتا ہے ایک قرآنی آیت کا ترجمہ ہے:۔

"تم کچھ چاہ بھی نہیں سکتے جب تک اللہ نہ چاہے۔"

اور اس طرح ایک طرف خدا کو اور اس کی قدرتِ مطلقہ کو، ماننا ضروری ہے تو دوسری طرف، خلاقی امر و نہی ضروری۔ اور یہ دین کے دو ستون ہیں جن میں سے اگر ایک بھی کمزور ہے تو دین کی عظیم عمارت مائل بہ انہدام ہو جائے گی یہی وجہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام ان دونوں ہی عقائد کو صحیح مانتے تھے اور ان کے منطقی تضاد سے خود کو پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ یہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ زندگی کے اساسی حقائق منطقی استدلال سے ماوری ہیں۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان اپنی طینت یا جبلّت کا خالق نہیں ہے بلکہ اس کی جبلّتیں ہی کو ورثے میں ملتی ہیں اور اس کے افعال اس کے اعمال، انہیں جبلّتوں کے نتیجے کے طور پر وجود میں آتے ہیں۔ جبلت کے بارے میں ایک حدیث شریف میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ:۔

"جب تم سنو کہ ایک پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل گیا ہے تو تم اس کی تصدیق کر سکتے ہو لیکن اگر سنو کہ ایک شخص اپنی طینت (جبلت) سے ہٹ گیا تو اس کی تصدیق ہرگز ہرگز نہ کرنا کیوں کہ آدمی ویسا ہی ہو کر رہتا ہے جیسا اس کا خمیر ہے۔"

اور اس جبلّت کے بارے میں یہ حقیقت واضح طور پر بیان کردی گئی ہے کہ انسان جس معاشرتی ماحول میں جنم لیتا ہے، جس ذہنیت کے والدین اور کنبے میں اس کی ولادت اور پرورش ہوتی ہے اور جس خارجی ماحول میں وہ پروان چڑھتا ہے اس کے افعال اور اس کے کردار کی عمارت بہر طور انہیں بنیادوں پر تعمیر ہوتی ہے اور آج کسے یقین نہیں ہے کہ یہ معاشرتی جبر انسان کے اپنے اختیار کی بات نہیں ہے؟ چنانچہ مادیین کا باوا آدم دیمو اطلیس ( ) جسے قدمائے مطبعین میں ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے اب سے ڈھائی ہزار برس پیشتر یہ کہہ گیا کہ عالم کی تمام اشیاء قانونِ فطرت میں جکڑی ہوئی ہیں" اور قانونِ فطرت کی گرہوں کو سلجھانے کی عقل انسانی نے جتنی کوششیں کیں وہ سب بیکار ثابت ہوئیں اور وہ اپنی اطراف و جوانب میں پھیلے ہوئے جبر و ں کے درمیان الجھ کر رہ گیا۔

جب یہ تسلیم کرلیا گیا کہ عالم کی تمام اشیاء قانونِ فطرت میں جکڑی ہوئی ہیں۔ اور دوسری طرف توحیدِ فطرت کو بھی تسلیم کرلیا گیا تو حقیقت مزید ثبوت کی محتاج نہ رہی کہ اس تمام کائنات کا خالق ایک خدائے بزرگ و برتر ہے ان تمام مظاہر کے پیچھے ایک عظیم ناظم ایک قادر مطلق ہستی کا وجود برحق ہے جو کہ تمام جن و انس، تمام مخلوقات اور حیات و کائنات کا خالق اور لاشریک حکمران ہے۔ اور اس کائنات کے طول و ارض میں، وقوع پذیر ہونیوالا ہر حادثہ ہر مظاہرہ اور ہر ہستی سے سرزد ہونیوالا ہر فعل اسی کی قدرتِ کاملہ اسی کے علمِ محیط اور اسی کی مشیت سے ظہور میں آیا ہے اب یہ حقیقت مزید ثبوت کی محتاج نہیں

رہی کہ نہ انسان اپنا خالق ہے اور نہ وہ اپنی فطری اور جبلّی ساخت کا ذمہ دار ہے نہ وہ اپنی مرضی سے پیدا ہوا ہے اور نہ اس کے افعال اس کے اپنے اختیار میں ہیں۔ اور یہاں وہ چیخ اٹھا ہے

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے خود مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

دورِ فکر کی اس ارتقائی منزل پر جہاں انسانی عقل و شعور کی پہونچ توحیدِ فطرت، توحیدِ حکمت اور توحید و میت تک ہوگئی ہے جبر و قدر کا مسئلہ اس کے لئے ایک مستقل دردِ سر کا ذریعہ بن گیا اور یہیں سے اس کے فکری باب میں ایک نئے عنوان کا باقاعدہ اضافہ ہوا۔ دورِ قدیم ارباب فکر و نظر میں ([illegible]) افلاطون اور اکثر [illegible] نظریہ جبر کے ہی حامی تھے یہی حال یورپین ارباب فکر کا ہے ([illegible]) ڈیکارٹ نے نفس اور جسم یا روح اور مادہ کی دوئی کی بنیاد پر اپنے فلسفے کی عمارت تعمیر کی یہ کہتا ہے کہ تمام مادی دنیا میں قوانینِ جبر کی حکمرانی ہے، وہ یہ بھی کہتا ہے کہ یہ تمام عناصر اور ان کی ترکیبات ایک مشین کی طرح حرکت میں ہیں جس میں ان کے اپنے ارادے کا کوئی دخل نہیں حالانکہ وہ اس کے ساتھ ہی نفس میں داخل خود اختیاری کی قوت کی بھی نفی نہیں کرتا لیکن پھر بھی اس کے مذہب کا منطقی نتیجہ جبر ہی ہے۔ چنانچہ [illegible] کے دوسرے فلاسفر جن میں میلبرانش ([illegible]) سب سے زیادہ نمایاں ہے یہ کہتے ہیں کہ خدا ہی تمام ارادت و حرکات کا حقیقی فاعل ہے۔ خود آنحضرت صلعم نے تقدیر کے معاملے پر کسی بحث سے بیزاری کا اظہار فرمایا ہے ایک حدیث شریف جو امام زہری نے امام زین العابدین کے واسطے سے نقل کی ہے وہ یہ ہے کہ:۔

"آدمی کے اسلام کی بہتری اس میں ہے کہ وہ بے فائدہ باتوں کو چھوڑ دے۔" (ترمذی)

اس کے علاوہ ایک اور حدیث اس ضمن میں پیش کی جا سکتی ہے۔

"ایک مرتبہ صحابہ آپس میں اس مسئلہ پر بحث کر رہے تھے۔ اتنے میں آنحضرت صلعم تشریف لے آئے اور یہ باتیں سن کر آپ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا آپ نے فرمایا کیا انہی باتوں کا تم کو حکم دیا گیا ہے؟ کیا اسی لئے میں تم میں بھیجا گیا ہوں؟ ایسی ہی باتوں سے پچھلی قومیں ہلاک ہوئی ہیں۔ میرا فیصلہ یہ ہے کہ تم اس معاملے میں جھگڑا نہ کرو۔"
ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا "جو شخص تقدیر کے بارے میں گفتگو کرے گا اس سے تو قیامت کے دن سوال کیا جائیگا مگر جو خاموش رہے گا اس سے کچھ سوال نہ ہوگا۔"[1]
ایک اور موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت حضرت علی اور حضرت فاطمہ علیہما السلام کے مکان پر تشریف لے گئے، اور پوچھا تم لوگ نمازِ تہجد کیوں نہیں پڑھتے حضرت علی رضی نے جواب دیا۔ یا رسول اللہ ہمارے نفس اللہ کے ہاتھ میں ہیں وہ چاہے گا کہ ہم اٹھیں تو ہم اٹھ جائیں گے۔" یہ سن کر حضور فوراً واپس آگئے اور ران پر ہاتھ مار کر فرمایا۔
اَلْاِنْسَانُ اَکْثَرُ شَیْءٍ جَدَلًا ... [2] (انسان سب سے زیادہ جھگڑالو واقع ہوا ہے)

---

[1] "جبر و قدر" مصنفہ مولانا مودودی ص ۴۴-۴۵

[2] اس حدیث کو زہری نے امام زین العابدین سے اور انھوں نے حسین ابن علی رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے (بخاری و نسائی)

یہی وجہ تھی کہ وحدت الوجود اور جبر و قدر کے مباحث آغاز اسلام میں وجود میں نہ آسکے اور عامیان دینِ محمدؐ نے ان منطقی مباحث میں پڑنے کے بجائے محض "والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ" (تقدیر اچھی اور بری اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے) کے مجمل اعتقاد پر اکتفا کیا اور اپنے دین کی تعمیر کرنے، اپنے اخلاق اور اعمال کی درستی میں منہمک رہے۔ لیکن جب قوتِ عمل و عمل پر ضعف ہوئی تو عقل و شعور نے دیدۂ حیراں کے سامنے فرضی نئی گتھیاں سلجھانے کے لئے رکھ دیں۔

'جب مسلمانوں نے شام، مصر، عراق اور عجم کو فتح کیا تو وہ یونانی فلسفہ سے واقف ہوئے کیوں کہ سکندر کی فتح کے لئے ان ممالک میں یونانی علوم و فنون کا بہت چرچا ہو گیا تھا۔ خلیفہ ابوجعفر منصور (سنہ ۷۵۴ء تا سنہ ۷۷۵ء) کے زمانے سے یونانی ادب کے ترجمے کی ابتدا ہوتی ہے اور سلسلہ خلیفہ ہارون رشید (سنہ ۷۸۶ء - سنہ ۸۰۹ء) مامون رشید (۸۱۳ء - ۸۳۳ء) کے عہد تک اور اس کے بعد بھی صدیوں تک جاری رہا۔ حکمائے یونان میں افلاطون اور ارسطو کی طرف بہت زیادہ توجہ کی گئی جن پر ابونصر فارابی (سنہ ۸۷۲ء - ۹۵۰ء) اور ابن سینا .... نے بہت کام کیا مغرب میں ابن طفیل (متوفی ۱۱۸۵ء) اور ابن رشد (۱۱۲۶ء - ۱۱۹۸ء) کے فلسفے کو فروغ دیا۔ (نگار - سالنامہ ۵۶ء)

مسلمانوں کی شاندار فتوحات اور عظیم الشان علمی ترقی نے جہاں انہیں دوسری دنیاوی دولتوں سے مالامال کیا وہاں یونانی اور عیسوی فلسفے کی بحث و تکرار میں مصروف رہنے والے معتوقین جب حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تو وہ اپنے ساتھ "جبر و قدر" کے مسئلے کا ایک بجھا چراغ بھی لیتے آئے جس کو جلانے کی کوشش میں عقل و خرد اور عقائد و ایمان کے نہ جانے کتنے دیئے تاریکیوں میں ڈوب گئے اور "جبریہ و قدریہ" دو گروہ وجود میں آگئے ایک مذہب جبر کا قائل تھا اور دوسر فلسفۂ قدر کا دونوں ایک دوسرے کے دلائل کو غلط ثابت کرنے کے لئے قرآن اور حدیث سے دلائل اخذ کرنے اور شب و روز مجلسِ مناظرہ اور محفلِ مذاکرہ برپا رہی۔

"جبریہ" اور "قدریہ" فرقوں نے جبر و قدر کے مسئلے پر دل کھول کر بحث کی۔ جبریہ مذہب کے معتقد یہ تسلیم کرتے تھے کہ تمام ارضی و سماوی حوادث، اور ہر ہستی سے سرزد ہونے والے ہر فعل کا فاعل خدا ہے۔ انسان محض قدرت کی طرف سے صادر ہونے والے احکام اور انکے نتائج کا متحیر تماشائی ہے اور کائنات میں وہی کچھ ہوتا ہے جو خدا چاہتا ہے اور اس کی مرضی کے بغیر کوئی فعل، کوئی حادثہ، کوئی جنبش اور کوئی ایجاد وجود میں نہیں آسکتی۔ اس طرح جبریہ فرقے نے تمام نباتات و جمادات کی طرح انسان کو بھی اپنے افعال کے بارے میں مجبورِ محض ظاہر کر دیا۔ اور انھوں نے اسپائینوزا کے فلسفے کی پوری طرح موافقت کی اور اجر و زجر کے بارے میں ان کا یہی نظریہ رہا کہ جس طرح افعال ایک مسلسل جبر کا نتیجہ ہیں اسی طرح ثواب و عتاب میں بھی جبر ہی کار فرما ہوگا یعنی اعمال و افعال سے قطع نظر خدا جسے چاہے بخشدے اور جسے چاہے عذاب میں مبتلا کردے۔

اس زمانے میں جب کہ نظریۂ جبر عام ہو چکا تھا اور علماء کا بڑا گروہ "جبر" کا قائل ہو چکا تھا، اس وقت "اشاعرہ" کا گروہ وجود میں آیا جس نے ایک نیا نظریہ قائم کیا۔ جو نظریۂ کسب کے نام سے مشہور ہے اور اس مکتبۂ خیال کے مشہور اماموں میں ــــــ ابوالحسن الاشعری (۸۷۳ء - ۹۳۵ء) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ الجبائی (متوفی سنہ ۹۱۵ء) کے شاگرد تھے۔ ان کے استاد اخیر وقت تک "قدر" کے قائل رہے اور وہ صفاتِ باری کو عینِ ذات قرار دیتے تھے۔ لیکن ابوالحسن اشعری نے اپنے استاد سے منحرف ہو کر "نظریۂ کسب" کی موافقت کی اور اعتزال کے خلاف متعدد رسالے تصنیف کئے۔ اشعری لکھتے ہیں کہ:

"ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ روئے زمین پر خیر و شر میں سے کوئی شے ایسی نہیں ہے جو خدا تعالیٰ

کے ارادے کے بغیر واقع ہو سکے۔ سب کچھ اس کے ارادے سے ہو رہا ہے۔ خدا کے منشاء کے
خلاف کوئی شخص کچھ نہیں کر سکتا۔ خدا کے سوا اور کوئی خالق نہیں ہے۔ اور تمام افعالِ
انسانی اس کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ اس آیۂ شریفہ سے ظاہر ہوتا ہے "خدا نے
تمہیں اور تمہارے اعمال کو پیدا کیا ہے" [1]

اسی طرح اشاعرہ حضرات یہ تسلیم کرتے تھے کہ تمام خیر و شر کا خالق خدا ہے لیکن جو انسان خیر و شر کا مرتکب ہوتا ہے وہ اس کو کسب کرتا ہے مثلاً قتل ایک فعل ہے لیکن جو شخص قتل کرتا ہے وہ اس فعل کا سبب ہے۔ اشاعرہ کے عقائد یہ تھے کہ خدا مختارِ کل ہے وہ چاہے تو بلا کسی جرم کے بندے کو سزا دے اور چاہے تو اس کے ہر جرم کو نظر انداز کر کے اس کو اپنی رحمت سے مالا مال کر دے "اشاعرہ یہ بھی مانتے تھے کہ اللہ اپنے بندوں کی مرضی کے بغیر بھی ہر وہ کام لے سکتا ہے جو وہ لینا چاہے" اشاعرہ کے عقائد کے متعلق امام غزالی نے (۱۰۵۸ء - ۱۱۱۱ء) جو اسلام کے مشہور متکلم تھے اور عظیم مفکر تھے کافی بحث کی ہے۔
وہ اپنی کتاب احیاء العلوم میں لکھتے ہیں کہ :-

"ہمارے اصحاب اشاعرہ اس بات کے قائل ہیں کہ آیاتِ قرآنی سے ثابت ہوا کہ خدا تعالیٰ
دین و دنیا کی مصلحتوں کا لحاظ نہیں رکھتا اور آدمی کے افعال میں آدمی کی قدرت کا کچھ اثر
نہیں۔ اور کافر کا کفر اور گنہ گار کا گناہ خدا نے خود چاہا تھا"

اس مکتبِ خیال اور جبریہ مذہب کے آخری وکیل امام فخر الدین رازی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں "انسان صورت مختار میں مجبور ہے" شرح فقہ اکبر صفحہ ۱۵ میں ہے کہ "اس پر اتفاق ہے کہ سب کچھ خدا ہی کی طرف منسوب کیا جائے کیونکہ تمام کائنات خدا کے ارادے سے ہے۔ بعض نے تفصیل سے منع کیا ہے اور کہا ہے کہ برعایت ادب یہ نہ کہا جائے کہ خدا کفر، ظلم اور فسق کا بھی رد کرتا ہے"

جبریہ اور اشاعرہ نے اپنی بات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے قرآنی آیات اور احادیث کا بھی سہارا لیا اور ان میں بعض ان آیات کا بھی سہارا لیا گیا جو "قدر" کی حمایت کرتی ہیں لیکن ان آیات کو بھی کسی نہ کسی پہلو سے جبر کا ثبوت بنا لیا گیا۔ حالانکہ کچھ آیات صریحاً جبر کی مخالفت کرتی ہیں اور اشاعرہ عقائد کے برعکس ہیں لیکن مناظرانہ جذبہ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ بنا دینے کی اچھی خاصی صلاحیت رکھتا ہے۔

جبریہ مذہب کے خلاف "قدریہ" گروہ اور اشاعرہ کے خلاف معتزلہ متکلمین کا گروہ کام کر رہا تھا۔ معتزلہ مذہب کے امام واصل بن عطا (۶۹۹ء - ۷۴۹ء) تھے۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ انسان اپنے افعال و عمل کا ذمہ دار ہے۔ "قدریہ" گروہ کے دوسرے امام ابو عثمان عمر بن عبید (۶۹۹ء - ۷۶۱ء) تھے۔ یہ بھی واصل کی طرح مذہب قدر کے زبردست حامی تھے۔ ایک بار ایک شخص نے آپ سے اس مسئلے پر بحث کی تو آپ نے کہا کہ خدا نے قضا و قدر کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ مسلمانوں کی تسلی و اطمینان کے لئے کافی ہے۔ خدا کہتا ہے "ہم ان کاموں کا سوال کریں گے جو وہ کرتے تھے" یہ نہیں فرمایا کہ "ہم نے جو کچھ تقدیر میں لکھ دیا تھا" اور اس سے انسان کا اپنے افعال میں خود مختار ہونا ظاہر ہے۔

---

[1] حقائق الاسلام حصہ اول صفحہ ۳۳
[2] تمدنِ روم - ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم سے ماخوذ

فلسفۂ قدر کے حامیوں نے اپنے فلسفے کو صحیح ثابت کرنے کے لئے کلام پاک کی ہر اس آیت کا سہارا لیا جس میں انسان کو اس کے اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے، اور اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ شر سے گریز کرو اور خیر کو اپناؤ۔ قدریہ گروہ خدا کو مطلق اور عادل تسلیم کرتا تھا۔ وہ "اشاعرہ" کے عقائد کے خلاف یہ کہتے تھے کہ خدا کی عادل اور بزرگ و برتر ہستی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ تمام اعمال و اخلاق اور افعال و کردار کو نظر انداز کر کے اور آئینِ عذاب و ثواب سے انحراف کر کے جسے چاہے بخش دے اور جسے چاہے عذاب سے ہمکنار کر دے۔

مسئلہ قدر کا موجد معبد جہنی تھا۔ غیلان دمشقی (پہلی صدی ہجری) اور خواجہ حسن بصری نے اس نظریہ کی اشاعت بڑے زور شور سے کی اور بعد میں یہ گروہ فرقہ معتزلہ میں ضم ہو گیا جس کے امام واصل بن عطا تھے جو خواجہ حسن بصریؒ کے شاگرد تھے۔ معتزلہ گروہ بڑی مستعدی سے اشاعرہ گروہ کے خلاف کام کرتا رہا اور فلسفۂ جبر کے مقابلے میں فلسفۂ قدر کی اشاعت کرتا رہا۔

مسلمانوں کے موجودہ انحطاطی دور پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کے بعد بیشتر مغربی مفکرین نے یہ الزام لگایا ہے کہ تقدیر کے اور قسمت کے اعتقادات نے ان سے سعی پیہم کی دولت سے محروم کر دیا ہے اور اس قوم کو بالکل بے دست و پا کر کے رکھ دیا ہے۔ لیکن اگر اس خیال کے ثبوت میں کوئی ثبوت فراہم کیا جائے تو تاریخ کوئی ایسا ثبوت فراہم کرنے سے قاصر رہے گا۔ اس نظریے کو ماننے والے مسلمان سے یہ سہا برس تک غیر قوموں پر راج کرنے والے تمدن اور سینکڑوں برس تک مسلمانوں کے سروں پر چمکتے ہوئے فتح کے تاج کو کہاں لے جائیں گے۔ یہ مانا کہ آج مسلمان ایک انحطاطی دور سے گذر رہے ہیں لیکن اگر تاریخ پر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائے تو یہی مسلمان بر سہا برس تک مصر، شام، عرب اور عجم کے علاوہ یورپ اور ہندوستان کا بھی حکمران رہا ہے۔ کیا اس زمانے کا مسلمان عقیدہ تقدیر سے منحرف تھا؟ ———— نہیں بلکہ وہ تقدیر کے اصل مفہوم سے باخبر تھے۔ اور یہی وہ ذریعہ تھا جس نے ان کی قوت عمل کو بیدار کر رکھا تھا۔ اور جب وہ تقدیر کا غلط مطلب اخذ کرنے لگا تو اس سے وہ دولت چھن گئی جو اس کا نشانِ امتیاز تھی۔ نبی کریم ؐ نے ایک بار ایک شخص کو دیکھا جس نے اپنے اونٹ کو بے حفاظت چھوڑ رکھا تھا۔ پوچھنے پر اس نے کہا "یا رسول اللہؐ، اللہ کے توکل پر چھوڑ دیا ہے۔" رسول اکرم ؐ نے فرمایا اس کے گھٹنے باندھ دو پھر توکل کرو۔

ایک بار حضرت عمرؓ ایک جگہ سے گذرے دیکھا کچھ لوگ بحث مباحثے میں مصروف ہیں۔ گفتگو کا موضوع دریافت فرمایا تو لوگوں نے بتایا کہ ہم متوکلین ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضؓ نے کہا کہ تم توکل کے صحیح مفہوم سے واقف نہیں ہو۔ توکل تو دراصل یہ ہے کہ زمین میں ہل جوتو، بیج بوؤ، خوب آبیاری کرو، اس کے بعد نتیجے کو خدا پر چھوڑ دو۔ اسی طرح صبر و شکر اور عملی جد و جہد کی تعلیم بھی رسول اکرم ؐ نے دی ہے۔ حدیث شریف میں یہ واقعہ درج ہے کہ ایک محتاج رسولِ اکرم ؐ سے کچھ خیرات طلب کرنے حاضر ہوا تو آپ نے اس سے دریافت فرمایا کہ تم کیا بالکل ہی مفلس ہو اور کیا تمہارے پاس کچھ بھی نہیں ہے تو محتاج نے بتایا کہ اس کے پاس ایک پیالہ ہے۔ رسول اکرم ؐ نے وہ پیالہ خود نیلام فرمایا اور اسی قیمت سے ایک کلہاڑی کا پھل خریدا اور خود اپنے دستِ مبارک سے اس میں دستہ لگا دیا اور اس محتاج سے فرمایا کہ جاؤ اور جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر فروخت کرو اور اسی سے گذر بسر کرو۔ وہ کچھ روز بعد پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ اب مجھ پر خدا کا فضل ہے میرا خرچ بھی اچھی طرح چل رہا ہے اور روزانہ کچھ بچ بھی جاتا ہے یہ تھا سعی اور جد و جہد اور عملی شکر کا سبق اور اس کا نتیجہ!! اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب مبدء فیض سے آدمیت حل [illegible]

علہ مگر خواجہ حسن بصریؒ نے تو اس اپنے شاگرد واصل بن عطا کے فاسد عقائد کی بنا پر اس سے اپنی بیزاری کا اظہار فرمایا تھا اور اسے اپنی مجلس سے اٹھوا دیا تھا (م۔ق)

یعنی ہاتھ پاؤں تفویض کئے گئے ہیں تو ان کا ثبوت یہی ہے کہ ان قوت کے بہت سے ... تلقین اس بات کی گئی ہے کہ وہ مسلسل
پیہم در جدوجہد کرتے رہیں۔ بلکہ یہ قوت تفویض ہی اس لئے کئے گئے ہیں کہ وہ انہیں استعمال کریں انہیں کام میں لائے نہ کہ
توکل کرکے معطل ہو کر بیٹھ رہے اور تقدیر کے عقیدہ کے سامنے جامد، بے عزیمت اور بے دست و پا ہو جائے

”جبریہ“ اور ”قدریہ“ مکتبہ خیال کے مختلف علماء نے فلسفۂ جبر و قدر پر قرآن و احادیث کا سہارا لے کر عرصہ تک بحث کی۔ اس ضمن میں بارہا خونریزی بھی ہوئی اور محض جذبات کا سہارا لے کر اس مسئلے کو بے حد الجھا دیا گیا۔ لیکن اس مسئلے پر جس ہستی نے اچھوتے انداز سے نگاہ ڈالی وہ مولانا جلال الدین رومی کی ہستی تھی۔ مولانا موصوف کے زمانے میں کثرت سے فقہاء و متکلم حضرات فلسفۂ جبر کے قائل ہو چکے تھے لیکن جس انداز سے نظریہ جبر کے خلاف آواز بلند کی وہ قابل ستائش ہے اور اسلامی فلسفے کی اور علم کلام کی تاریخ میں یادگار ہے۔ ان کی تعلیمات کا اہم جزو یہ ہے کہ خدا کی ذات ہی قادر مطلق ہے اور اس کی مشیت ہی اعلیٰ حکمت ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں، اس کائنات کے قانون کا بنانے والا اور اس سلطنت کا حکمران خدا ہی ہے وہی ہر تقدیر کا مقدر ہے ———
لیکن اختیار انسانی تقدیر کا ایک اہم جزو ہے اور اپنے اختیار سے ہیچ زندگی کو بدلنے کی سعی کرنا، فطرت اور قادر مطلق کی مشیت سے ٹکر لینا نہیں بلکہ قضائے الٰہی کے عین مطابق ہے۔

اس طرح:
مولانا رومی نے متکلمین کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا اور اس فلسفے پر غور و فکر کے لئے ایک نئے زاویہ نظر کا انتخاب کیا۔ جبریہ نظریہ کے حامی یہ حدیث پیش کرتے ہیں:-

مَا شَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ

”یعنی خدا جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا“

مولانا فرماتے ہیں یہ حدیث تو ایمان و ایقان کو اور مضبوط کرتی ہے اور جدوجہد کی ترغیب دیتی ہے۔ کہتے ہیں ”جب کوئی تم سے کہے کہ انعام و اکرام اور انتظام سب فلاں وزیر کے ہاتھ میں ہے اور امور سلطنت میں وہی ہوتا ہے جو کچھ وہ چاہتا ہے تو پھر ایک دانا آدمی تو وہی کرے گا جس سے وہ وزیر خوش ہو اور اسی کے احکام کے مطابق عمل کرنے کی سعی کرے گا۔ کوئی بیوقوف ہی کرے گا کہ اس وزیر سے بھاگنا شروع کر دے۔ اسی طرح ایک دوسری حدیث جس میں یہ کہا گیا ہے کہ جو کچھ ہونا ہے وہ لوح تقدیر میں لکھا جا چکا ہے اور اب اس میں کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتی“ مولانا اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ صحیح ہے۔ تقدیر کا لکھا اٹل ہے وہ بدل نہیں سکتا لیکن تقدیر دراصل قوانین الٰہی کا نام ہے جس میں تبدیلی کا کوئی ذریعہ نہیں۔

فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ

انسان کے لئے جو فطرت بنائی گئی وہی فطرۃ اللہ ہے اور اسی کا نام تقدیر ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ زندگی کے قوانین کے مطابق تقاضائے انسان کی فطرت اور اس کی تقدیر ہے۔ تقدیر کے قلم نے فقط یہی لکھا ہے کہ ہر کام کا انجام اس کام کی ماہیت اور نوعیت کا نتیجہ ہوگا۔ ظلم کا نتیجہ ادبار۔ عدل کا ثمرہ اقبال ہوگا۔ تقدیر کا قلم یہ لکھ کر ہمیشہ کے لئے سوکھ گیا۔ خیر و شر کی تمیز ابدی طور پر قائم ہو گئی۔ وہ خدا کی حساس ترازو ہے جو حد بندی میں ذرہ برابر فرق کو معاف نہ کرے گی۔ تقدیر کے اصلی معنی اندازہ کرنے اور پیمانہ مقرر کرنے کے ہیں۔ اگر ترازو کے پلڑے بلا وجہ اور بے سبب ادھر ادھر جھکیں تو ترازو بے اعتبار ہو جائے گی۔ تقدیر خدائی میزان ہے جس میں ذرہ بھر کمی بیشی کا کوئی سوال نہیں۔[1]

---

[1] حکمت رومی ۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم

اسی طرح مولانا نے مختلف مواقع پر یہ کہا ہے کہ زندگی جہد مسلسل اور خونِ جگر کی طلب گار ہے۔ یہاں جو جاگتا ہے وہی زندہ رہنے کا حق رکھتا ہے اور جو غافل ہوتا ہے وہ اپنی زندگی اور اپنے حقوق سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور اس نظریئے کی روشنی میں یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اگر جبر کا منطقی قائل عملی طور پر بھی جبر کا قائل ہو جائے تو اس کا ایک لمحہ زندہ رہنا محال ہے۔

کلامِ پاک کے مطالعے اور جبر و قدر کے مسئلے پر جو اشارات قرآن حکیم میں مختلف مواقع پر دیئے گئے ہیں ان پر غور و فکر کرنے سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ درحقیقت آیاتِ قرآنی میں کوئی تناقض و تعارض نہیں ہے۔ اور یہ بات بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ جزا و سزا کی بنیاد اچھے اور برے اعمال پر رکھی گئی ہے۔ ان باتوں کے واضح ہو جانے کے بعد کوئی ایسی بات اب ایسی نہیں رہ جاتی جو انسان کے اختیار کی نفی کرتی ہو۔ انسان کے اختیار کو ثابت کرنے والی بہت سی مثالیں ہمیں عام زندگی میں بھی ملتی ہیں۔ اگر ہم ایک جبری نظریئے کے حامی شخص کی زندگی کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ عملاً صاحبِ اختیار ہی ہے کیونکہ وہ کسی سے جب کہتا ہے کہ تم فلاں کام کرو اور اگر اس کے حکم کی خلاف ورزی کی جاتی ہے تو وہ ناراض ہوتا ہے اور اگر اس کے حکم کے مطابق اس کام کو سرانجام دیا جائے تو خوش ہوتا ہے اور کسی سے کہتا ہے کہ تم بڑے ذلیل و کمینے ہو تم سے فلاں کام کرنے کو کہا تھا تم نے کیوں نہیں کیا ؟ لیکن اگر وہی شخص بحث پر آئے گا تو جبری بن جائیگا۔

اختیار بدیہی وجدانات میں سے ہے اور بدیہی محسوسات کا منکر کوئی فاتر العقل ہی ہو سکتا ہے۔ یہ تو وہ حقیقت ہے جس پر حیوانات تک یقین رکھتے ہیں اور جس کی مثالیں روز دیکھنے میں آتی ہیں۔ اگر کسی کتے کو ایک پتھر سے مارا جائے تو وہ خشمگیں ہو کر مارنے والے کی طرف دوڑتا ہے اور پتھر پر کوئی توجہ نہیں دیتا حالانکہ اسے چوٹ پتھر سے لگی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ پتھر مجبور ہے اور مارنے والا مختار اس لئے اپنے اختیار کا غلط استعمال کرنے والا سزا کا مستحق ہے [1]

اسی قسم کی دوسری مثالیں بھی مشاہدہ میں آتی ہیں کہ اگر ایک اندھا آدمی کوئی چیز اٹھالے تو اسے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن یہی حرکت آنکھوں والا کرے تو وہ چوری کے جرم کا مرتکب گردانا جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کو لاٹھی سے مارتا ہے تو لاٹھی مجرم نہیں گردانی جاتی بلکہ وہ آدمی مجرم گردانا جاتا ہے۔ یہ حقائق اتنے واضح ہیں کہ ان سے کسی قیمت پر بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ اگر عملی زندگی کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو ہمیں اور بھی بہت سے ثبوت انسان کے مختار ہونے کے ملتے ہیں۔ [2]

مولانا روم فرماتے ہیں کہ تمہارا یہ تذبذب کہ میں فلاں بات کروں یا نہ کروں کیا تمہارے صاحبِ اختیار ہونے کی بیّن دلیل نہیں۔ روزمرہ کے یہی وہ عملی حقائق ہیں جن کی بدولت (　　　) کانٹ اور فشتے (　　　) کے علاوہ ——— (　　　) ہیگل جیسے عظیم مفکروں نے قدریت کی طرف میلان ظاہر کیا ہے (　　　) سقراط نے بھی آزادیٔ ارادہ کی حمایت کی ہے۔ افلاطون اور ارسطو نے بھی دبی زبان سے جبر کی نفی کی ہے۔ اور اب موجودہ دنیا کے تمام اکابر فلسفہ اس نقطۂ نظر کے ہم آواز ہوتے جا رہے ہیں کہ لازماً انسان کسی نہ کسی صورت میں اپنی تقدیر کا معمار ہے اور تعمیری صلاحیت سے بہرہ ور ہے۔

موجودہ دور کے مشہور مغربی مفکر برگساں نے ایک عرصے تک غور و فکر اور عمرِ عزیز کا بیشتر حصہ مشاہدے اور مطالعہ میں خرچ کر لینے کے بعد آخرکار وجدان کی حقیقت کو تسلیم کرکے عارفِ رومی کی آواز سے آواز ملائی اور یہ تسلیم کیا کہ وجدان اس عشق کے مرادف ہے جو انبیاء اور اولیاء کرام میں پایا جاتا ہے۔

---

[1] "حکمتِ رومی" ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم
[2] 〃　〃　〃　〃　〃

مسیحی متکلمین کا ممتاز مدرس (DUNS SCOTUS) ڈنس اسکوٹس بھی معتزلہ کی طرح قدریت کی حمایت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ انسان کو ارادہ کرنے یا نہ کرنے اور اپنے ارادہ کو اختیار میں لانے یا نہ لانے کا پورا اختیار حاصل ہے اور خدا کی قدرت انسان کی آزادی اختیار میں مانع نہیں ہے۔ ؎۱

اس لئے مشہور امریکی مفکر ولیم جیمس (۱۸۴۲ء۔ ۱۹۱۰ء) نے بھی ایک گرانقدر مقالہ مسئلہ جبر و قدر پر قلمبند کیا ہے۔ اس نے کانٹ کے خیالات کو اپنایا ہے اور اس کے بعد مولانا رومی کی طرح یہ کہدیا ہے کہ جبر و اختیار محض مختلف دو زاویہ نگاہ ہیں۔
آگے چل کر جیمز کہتا ہے کہ اختیار کے بغیر اخلاقی احساس بے معنی ہوگا لیکن چونکہ اخلاقی احساس ایک ناگزیر حقیقت ہے اس لئے اختیار کو بھی لازماً تسلیم کرنا پڑے گا۔

(مجلس فکر و نظر کی ایک نشست میں پڑھا گیا)

؎۱ "جبر و قدر" مولانا مودودی صہ۹

فاران:- جبر و قدر کے مسائل کلامی بحثوں میں بہت کچھ اُلجھ گئے ہیں! اشاعرہ نے جو "کسب" کی اصطلاح وضع کی ہے، اُس کی غرض و غایت یہی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور مشیت کے جبر پر بھی آنچ نہ آنے دے اور بندے کو اللہ تعالیٰ نے جو مکلف بنایا ہے، تو اس کی ذمہ داری بھی باقی رہے۔ جہاں تک معتزلہ کا تعلق ہے انھوں نے بے شک بڑی ذہانت اور فکری نکتہ آفرینیوں کا ثبوت دیا ہے مگر مذہب "اعتزال" کو جمہور امت نے قبول نہیں کیا!

اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل یہ ہے کہ جس مالک نے اپنے کو "علیٰ کل شئی قدیر" کہا ہے، وہی انسانوں پر اخلاقی ذمہ داریاں عائد فرماتا ہے اور ان ذمہ داریوں کے پورا کرنے اور نہ کرنے پر ثواب و عذاب کا وعدہ کرتا ہے۔

پس

ایک مسلمان کو "ان اللہ علیٰ کل شئی قدیر" پر ایمان رکھتے ہوئے اپنی ذمہ داریوں کا بھی احساس کرنا چاہیئے! اس طرح مشیت کا جبر اور انسان کا اختیار دونوں اپنی جگہ ثابت رہتے ہیں!

دو شعر:-

جنوری سنہ ۶۰ء کے "فاران" میں حضرت اسد ملتانی مرحوم کے دو شعر "یادِ رفتگاں" کے تحت جو درج ہوئے ہیں، وہ اصل میں یوں ہیں:- ؎

کی مسلماں نے ترقی جو فرنگی بن کر ۔۔۔ وہ فرنگی کی ترقی ہے مسلماں کی نہیں

رہیں نہ رند یہ واعظ کے بس کی بات نہیں ۔۔۔ تمام شہر ہے، دو چار دس کی بات نہیں

اللہ اکبر

(تاثرات مُلّا واحدی دہلوی)

کراچی کی آبادی کا کچھ ٹھکانا ہے۔ کراچی کے ایک ذرا سے کرنے کو کورنگی پہنچا کر وہاں خاصا شہر بسا دیا گیا۔ پھر کراچی جیسے اور کراچی بنے بنائے جیسے شہر ہیں۔ زمین کہاں تک پھیلی ہوئی ہے۔ بتاؤ اس طویل و عریض زمین کا مالک میں ہوں یا تم؟

میں تو اس کو رہ کا بھی مالک نہیں، جو بارہ سال سے میرے زیر تصرف ہے۔ اور دلی کا وہ گھر مجھ سے چھن گیا جسے اپنا سمجھ کر رہا۔ ساٹھ سال قیام رہا۔ تم جس کو چاہو اپنا سمجھ بیٹھو۔

اچھا اوپر نظر اٹھاؤ۔ سر پر کیسا پیارا شامیانہ تنا ہوا ہے۔ یہ شامیانہ نہ ہوتا تو زمین بے چھت کا مکان دکھائی دیتی۔ ننڈی منڈی۔ شامیانے کا نام جو جی چاہے رکھ لو۔ آکاش کہو۔ اسکائی (sky) کہو۔ حدِ نظر کہو۔ ہم تو آسمان کہتے ہیں اور آسمان کہتے ہیں اسے چھوٹا نہ ہم نے دور۔ حدِ نظر کہنے والوں نے اس کی ہیئت کیا ہے، یہ نہ ہم جانتے ہیں اور نہ حدِ نظر کہنے والے جانتے ہیں۔ اور خوشنما رنگ کا شامیانہ نظر آتا ہے۔ رنگ پکا اور پائدار ہے۔ بدلتا نہیں، اور کبھی تھوڑی دیر کے لئے برائے نام بدلتا ہے تو جی گھبرا جاتا ہے۔ رنگ اگر ہمیشہ سیاہ رہتا تو کیا بنتی۔

خیر بحث چھوڑیئے اور سوچیے کہ زمین کے سمندر، زمین کے پہاڑ، زمین کے صحرا، زمین کے درخت اور زمین کے جانور بیشک سب ہمارے لئے ہیں، مگر ہماری ملکیت نہیں ہیں۔ ہم میں کام لینے کی صلاحیت ہے تو ان سے چندروز کام لے سکتے ہیں۔ ان کے دائمی مالک نہیں بن سکتے۔ پھر اوپر کی فضا تو دور کی چیز ہے۔ اوپر کی فضا ہماری کیوں کر ہو سکتی ہے۔

آپ کی ہی تحقیق ہے کہ زمین تک چاند کی روشنی ایک سیکنڈ میں اور سورج کی روشنی آٹھ منٹ میں پہنچتی ہے۔ روشنی کی رفتار فی سیکنڈ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل ہے۔ یعنی فی منٹ ایک کروڑ سوا لاکھ میل۔

اتنی رفتار کے باوجود خلا میں ایسے ستارے بھی ہیں جن کی روشنی زمین تک پہنچنے کی مدت ہزاروں سال ہے۔

چاند کا فاصلہ زمین سے دو لاکھ اڑتیس ہزار نو سو میل ہے اور سورج کا فاصلہ تیرانوے کروڑ میل۔

اب حساب لگایئے کہ اُن ستاروں کا فاصلہ کیا ہوگا جن کی روشنی زمین تک ہزاروں سال میں پہنچتی ہے۔ پھر اُن ستاروں سے آگے کتنے جہان ہیں۔ یہ اللہ ہی بتا سکتا ہے۔

روس اور امریکہ والے چاند پر جھنڈے گاڑ دیں، یا مریخ پر۔ اُن کا وہاں پہنچ جانا ضرور قابل تعریف اور قابل قدر ہے۔ لیکن ایک وہ روس، اور امریکہ کے نہیں رہیں گے تو چاند اور مریخ کے کیوں کر رہیں گے۔ کبھی یہ شعر سنا ہے ؎

تو کارِ زمیں را نکو ساختی
کہ با آسماں نیز پرداختی

قبضہ ہوگا بھی تو عارضی ہوگا۔ مالک زمین کا اور زمین کی ہر شے کا اور آسمان کا اور آسمان کی ہر شے کا خالق زمین و آسمان ہے۔ ساتھ،

...سر، اسّی، اور نوّے برس کے فقط بچے ہمارے یا آپ کے نام لکھے جا سکتے ہیں۔ آسمان میں تحقیق لگائی جائے اور آسمان کی چیز کو مسخر کر لیا جائے، نہایت دل خوش کن کام ہے۔ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا کا مطلب ذہن نشین کر دینے کا کام۔

اللہ تو خود چاہتا ہے کہ انسان کائنات کی تسخیر کرے وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيهِمَا مِن دَابَّةٍ ...ں کی علامات شناخت میں آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا بھی ہے اور وہ جاندار بھی جو ان دونوں میں اس نے پھیلا دیئے ہیں۔ چاند میں جاندار آباد ہیں۔ آپ نے جن کا گمان آج کیا ہے مسلمان یہ بات چودہ سو برس سے جانتے ہیں۔ آپ تو وہاں سے ... کوشش اُن جانداروں کو ہمارے سامنے لائیے اور ہمارے ایمان کو تازہ کریں۔

ہماری دعا ہے کہ تسخیر کائنات کر کے آپ خود بھی خالق کائنات کی طرف دھیان دیں اور ... اللہ ... ہم پرانے مسلمان تو کسی گنتی کے نہیں رہے۔ ہماری ترقی رک گئی ہے ماشاء اللہ آج کل کی ترقی یافتہ قوموں کو ... عطا کرے اور وہ کہیں کہ ـــ

ز تو بہار عظیم نہ جوشید ز باغ ازل
نہ آسمان گل در بغل یک برگ سبز گذشت

تیرے حکم سے ایک لازوال بہار ازل کے باغ سے جوش زن ہوئی۔ (اس کی وسعت و فراخی کا یہ عالم ہے کہ) پھیلے ہوئے تو آسمان تیرے غیر محدود گلشن (کائنات) کے سامنے ایک پتے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ماہر القادری

پیغامِ عمل

یوں چمکیے زینتِ کوہ و دمن جائیے   یوں اُبھریے صبح کی پہلی کرن بن جائیے

غیر ہوں تو بن کے رہیے سنگِ خارا کی طرح   دوستوں کی بزم میں برگِ سمن بن جائیے

میکدوں نے چھین لی ہیں مسجدوں کی رونقیں   بوتلوں کو توڑیے، ساغر شکن بن جائیے

کس لیے، کس کے لیے، یہ انجمن کی ہے تلاش   آپ خود اپنی جگہ اک انجمن بن جائیے

حُسن کو ہے پھر ضرورت آج جُوئے شیر کی   عشق صادق ہے تو اُٹھیے کوہکن بن جائیے

صرف غنچوں کا تبسم ہی نہیں ہے زندگی   ہو سکے تو لالۂ خونیں کفن، بن جائیے

ظاہر و باطن کو ہم آہنگ ہونا چاہیے   اہلِ دل، اہلِ نظر کا حُسنِ ظن بن جائیے

زندگانی ہے کم آمیزی و خودداری کا نام   کون کہتا ہے بہارِ ہر چمن بن جائیے

دوسروں پر حضرت ماہر یہ کیوں طعنہ زنی
آپ ہی شائستۂ دار و رسن بن جائیے

مظفر حسن ظفر جوہری

......مگر ہائے غزل

سر میں سودائے غزل، دل میں تمنائے غزل
درد اور درد کی پُرکیف مزا پائے غزل

کیف و سرمستی و جذب و خلش و سوز و گداز
بس انھیں سے ہے کوئی انجمن آرائے غزل

آپ سے آپ جبیں دل کی جھکی جاتی ہے
غیر محسوس سہی نقشِ کفِ پائے غزل

تیری آنکھوں کا اشارہ، مرے دل کی الجھن
ایک ایمائے غزل، ایک تقاضائے غزل

حسن کا نازِ جفا، عشق کا اندازِ وفا
حاملِ روحِ غزل، حاملِ سودائے غزل

کچھ نہ کہہ سکنے کے انداز میں کہنے کا خیال
کتنی فطرت کے مطابق ہے تمنائے غزل

نہ تسلسل، نہ تسلسل کی وہ بے رنگ فضا
پھر بھی ہے ربطِ خفی حاشیہ آرائے غزل

شوق و جذبات و تمنا و شعور و احساس
انہیں شیشوں میں ڈھلا کرتی ہے صہبائے غزل

لہجہ، الفاظ، زباں، طرزِ ادا سب مخصوص
اس پہ یہ لطف کہ مخصوص نہیں جائے غزل

اس کا جو شعر ہے، عنوان ہے افسانے کا
شرح و تفصیل نہیں شاملِ اجزائے غزل

ہو جو امکان خیالات کی حد بندی کا
پھر تو ممکن ہے کہ محدود ہو دنیائے غزل

دل کی آنکھوں کی ضرورت ہے یہاں بندہ نواز
یوں نظر آ نہیں سکتا رخِ زیبائے غزل

بزمِ تخئیل کی زینت ہے، انہیں کے دم سے
ہائے کیا چیز ہیں یہ ساغر و مینائے غزل

ظفر[1]، اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ فضلی[2]
"نظم ہے اپنی جگہ خوب، مگر ہائے غزل"

[1] غالب سے معذرت کے ساتھ۔ [2] فضل احمد کریم فضلی۔

بہارِ تغزل

عروج زیدی

ہر قدم پر مجھے سرزنش کا گماں ہوتا ہے — چشم ساقی کی نوازش کا گماں ہوتا ہے

یہ جچی بات تعین مجھے منظور نہیں — فکر آزاد کو بندش کا گماں ہوتا ہے

اپنی دیوانگی دل سے ملا قربِ حبیب — اب جنوں پر مجھے دانش کا گماں ہوتا ہے

ہم سے اُمڈے ہوئے آنسو نہیں رکنے پاتے — اِک اُبھرتی ہوئی سازش کا گماں ہوتا ہے

لطف پیہم نہ سہی، جورِ مسلسل ہی سہی — ہر توجہ پہ نوازش کا گماں ہوتا ہے

بات یہ کیا ہے عروج اُن کی ہر اک بات میں آج

یونہی عرضِ گزارش کا گماں ہوتا ہے

(اپنے پہلے مجموعہ شہرِ غزل سے)

انور ظہوری

دیکھتا ہوں غبارِ رہرووں تک — جب کوئی قافلہ گزرتا ہے

مسکراتا ہوں نا پسندوں کا — آپ کو بھی گراں گزرتا ہے

اس توجہ سے نہ دیکھو مجھ کو — ورنہ احباب میں یہ چرچا ہوگا

ہم نے کاٹی ہیں جو تنہا راتیں — دل میں کیا کیا نہیں سوچا ہوگا

ہر اک گام پر اِک نئے مرحلے — مرے ساتھ کوئی کہاں تک چلے

تنہا سفری نہیں مناسب — بہتر ہے کسی کے ساتھ ہولو

راہ تمہاری تکنا کب تک — شام سے لے کر آخرِ شب تک

صرف تمہارے افسانے ہیں — زخمِ دل سے خندۂ لب تک

تنا کوری بدایونی

کیا محبت قیامت اثر ہو گئی — آگ دل میں لگی آنکھ تر ہو گئی

خیر اتنا جل سے ہوا فائدہ — دورِ درماندگی سفر ہو گئی

ہر مصیبت میں پنہاں ہے راز خوشی — رات بڑھ کر پیامِ سحر ہو گئی

ثبت جس پر ہوئے ایک نقشِ قدم — حسن افروزدہ رہگذر ہو گئی

کیفی جامپوری

غم کی جب لہر چلی ہے دل میں — زندگی جاگ اٹھی ہے دل میں

سرِ مژگاں جو ستارے چمکے — روشنی پھیل گئی ہے دل میں

کتنے معصوم حسیں چہروں کی — ایک محفل سی جمی ہے دل میں

تم نہیں کوئی تو گزرا ہوگا — ایک آہٹ تو سنی ہے دل میں

پرانوں کے دیوتاؤں کی گنتیوں کو سن کر تم قہقہے لگاتے ہو، ہنستے ہو، جب سنایا جاتا ہے کہ احمق ہندوستان خالق سے ٹوٹ کر چھتیس کروڑ دیوتاؤں اور معبودوں کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ اگر کوئی ہوتا جو ان نت نئے دیوتاؤں کی فہرست بناتا جن کے ہتھے ذائرہ معبودیت کی روح اسی طرح خالق سے بیگانہ ہو کر ڈوبی ہوئی ہے۔ آخر بتایا جائے ان دونوں نئے اور پرانے طبقہ میں کیا فرق ہے۔ خالق سے یہ بھی دور، وہ بھی دور، مخلوقات کے بوجھ سے یہ بھی دور وہ بھی دور، مخلوقات کے بوجھ سے یہ بھی چور وہ بھی چور کچھ فرق اگر ہے، تو صرف اس قدر ہے کہ پرانوں کے معبود بھی پرانے تھے۔ اور نئوں کے معبود بھی نئے ہیں۔ پرانوں کو پرانے معبودوں کے عجائب و غرائب، اور نت نئے ذاتاً نظر آتے تھے اور نئوں کو نئی مخلوقات میں عجائب و غرائب، نت نئے فوائد نظر آتے ہیں۔ منفعت اشیاء اور ہم کے پیروں کی قلبیوں کی خصوصیتوں سے اگر قطع نظر کر لیا جائے تو ناپ لیا جا سکتا ہے اگر قلبی حساسات اور ذہنی کیفیات کے ناپنے کا کوئی آلہ ایجاد کر لیا جائے تو دلوں میں پرانے معبودوں کے متعلق جو کچھ تھا، نئوں کے قلوب میں نئے معبودوں کے متعلق وہی کچھ ہو بلکہ شاید کچھ اس سے زیادہ ہو۔

پرانے ہی تنہا خدا کے نام پر چڑھ جاتے تھے۔ نئوں کے سامنے جا کر آج خدا تنہا کیا بلکہ ان کے معبودوں کے ساتھ ملا کر بھی نام لو۔ پھر دیکھو کہ ان کی پیشانی کی کھال کس طرح سکڑتی ہے اور منہ سے کیسے تو بے کف کے اڑا اڑا کر بیچارے نام لینے والے کے چہروں پر پڑتے ہیں۔ تحریروں میں، تقریروں میں، گفتگوؤں میں، تذکروں میں کیا نئوں کا یہ گروہ اپنے معبودوں کا نام لئے بغیر کبھی گزر سکتا ہے۔ برق کا، بھاپ کا، تار کا، ریل کا، سیاروں کا، طیاروں کا، فیکٹریوں کا، ملوں کا، بینکوں کا، پایوں کا، ان مختلف شکلوں مثلاً اشتراکیوں، رئیسوں اور خدا جانے کن کن خداؤں کا نام آج جس دلچسپی کے ساتھ جس ذوق و شوق کے ساتھ لیا جاتا ہے، مشکل ہے کہ خالق کے پوجنے والوں نے اتنے ذوق و شوق کے ساتھ بسم اللہ، سبحان اللہ، الحمد للہ لا الٰہ الا اللہ کا ذکر بھی کیا ہو۔

یہ حمد بھی کرتے ہیں تو انہی حدوں کی۔ نعت بھی لکھتے ہیں تو انہی کی، پھر میں کیا غلط سمجھا جب میں نے کہا کہ "جو پرانے تھے وہی نئے ہیں" چند مخلوقات کے گرد پالتیاں مارے وہ بھی بیٹھے تھے اور ٹھیک اسی طرح فطرت کے چند نوامیس و قوانین کے آگے یہ بھی محو رقص رامشگری ہیں، وہ ان کا بھجن گاتے تھے، یہ ان کا شکر کرتے ہیں، اتواصوا بہ بل ہم قوم طاغون

تم کہتے ہو کہ یہودیوں نے انسانیت کو ذلیل کیا، جو سب سے اونچی تھی وہ سب سے نیچا اور اسفل سافلین کے درجہ پر پہنچ گیا بلاشبہ یہی ہوا، یہی ہونا بھی چاہیئے کہ خالق ایک ہے اور مخلوقات لامحدود ہیں۔ پس جس نے اس ایک کو چھوڑا۔ اس کو ہر ایک سے جوڑنا پڑے گا۔ جو ایک سے نہیں ڈرے گا اس کو ہر ایک سے ڈرنا پڑے گا، جو جھکنے ہی کے لئے ہے اس کو جھکنا ہی پڑے گا لیکن ایک کے آگے جھکا تو سب اس کے آگے جھکیں گے اور جس نے ایک کے آگے سر ٹیکنے سے انکار کیا، دیکھو! وہ ہر ایک کے آگے سر ٹیکے پڑے ہیں، ملائکہ کے آگے، جن کے آگے، انس کے آگے، حیوانات کے آگے، نباتات کے آگے، جمادات کے آگے، اور میں کیا دکھاؤں کہ "جو دیکھا نہیں جا سکتا" اس کے آگے۔

یہی وہ عذاب ہے جو آخرت سے پہلے ان کو دنیا میں چکھنا پڑا، چکھ رہے ہیں، برضا و رغبت چکھ رہے ہیں۔

مگر کیا انسانیت کی یہ توہین صرف یہودیوں میں تھی۔ پرانوں نے خالق کے معبود ہونے سے انکار کیا، بے شک اس کے صلہ میں انہیں بندروں کو مسجود بنانا پڑا، لیکن جن لوگوں نے اپنے تئیں خدا کی مخلوق ہونے میں شک کیا تھا۔ آج بندر کے مولود ہونے کا اپنی زبانوں سے کیوں اقرار کر رہے ہیں، جس نے بندر کو معبود بنایا ہے کہ کیا شبہ ہے کہ اس نے انسانیت کو رسوا کیا۔

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

مولانا حافظ احمد سعید دہلوی مرحوم و مغفور

تحریکِ خلافت جب شباب پر تھی، اس وقت میری عمر بارہ تیرہ سال کی ہوگی، خلافت سے مسلمانانِ ہند کو کیا والہانہ عقیدت اور تعلق سے کتنی جذباتی وابستگی تھی اس... ملک تحریکِ خلافت کے شور سے گونج رہا تھا، مسلمانوں کی نگاہ میں خلافت کی کتنی اہمیت تھی کہ

ع ——— ہم ہی نہیں ہیں جو خلافت نہیں رہی

جیسے شہر پر ٹوٹ... میں رہتے تھے ہمارے گاؤں (کسیر کلاں ضلع بلند شہر) میں بھی خلافت کمیٹی قائم تھی اور پورے ضلع کی سب سے فعال کمیٹی تھی جس کا میں سب سے کمسن کارکن تھا۔ وہ "سمرنا فنڈ" کے چندے کے لئے گاؤں کی مسلم آبادی کے ایک ایک گھر کی پھیری، وہ ترنم، وہ جوش و خروش، وہ جوشیلی نظمیں اور وہ دلوں کو گرما دینے والے نعرے! اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ کوئی ایسا مسلمان جس کی زندگی میں مذہبیت نہ پائی جاتی ہو مسلمانوں کا لیڈر اور قائد نہیں بن سکتا تھا۔ وکیل، بیرسٹر اور پروفیسر جیلوں میں جاتے تھے اور وہاں سے چہروں پر ڈاڑھیاں رکھ کر اور گلے میں قرآن حمائل کر کے واپس آتے تھے

اس زمانے میں جن علماء کی ملک میں شہرت تھی، ان میں مولانا احمد سعید دہلوی بھی شامل تھے! اخباروں میں ان کا نام پڑھ کر اور لوگوں کی زبانی ان کی تقریروں کی شہرت سن کر مولانا مرحوم کے دیکھنے کی تمنا تھی۔ یہ وہ دور تھا جب انگریز کی مخالفت ایمان کی دلیل سمجھی جاتی تھی اور "شمس العلماء" قسم کے عالموں کی مذہبی ساکھ گرتی جا رہی تھی۔

عام طور پر یہ نہیں ہوتا کہ آدمی کے دل میں تمنا پیدا ہوئی اور ملنے کے لئے ملنے کے اسباب بھی فوراً فراہم ہو گئے۔ آدمی کو اس کے لئے انتظار کے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے! برسوں کی تمنا کے بعد مولانا احمد سعید دہلوی سے ملنے کا شرف ۱۹۲۷ء میں حاصل ہوا اور وہ اس تقریب سے کہ مولانا عبد القدیر بدایونی (سابق مفتی عدالت العالیہ حیدرآباد دکن) ان دنوں دلی آئے ہوئے تھے، میں بھی ان کے ساتھ دلی میں مقیم تھا، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سہ روزہ "الجمیعۃ" کی اڈیٹری سے غالباً اسی ہفتہ سبکدوش ہوئے تھے اور حیدرآباد دکن جانے کی تیاری کر رہے تھے، مولانا عبد القدیر صاحب نے مجھے مودودی صاحب سے ملایا۔ اور وہ مجھے لے کر مولانا احمد سعید صاحب کے مکان پر گئے۔ جاڑوں کا زمانہ تھا مولانا مرحوم اپنے مکان واقع کوچہ چیلان کے بالاخانہ پر روئی کا ٹوپہ پہنے اور رضائی اوڑھے پلنگ پر لیٹے تھے، مولانا مودودی نے میرا تعارف کرایا اور کہا کہ یہ صحافت و انشا پردازی کا شوق رکھتے ہیں، "الجمیعۃ" کی ادارت سے وابستہ ہونا چاہتے ہیں! مولانا احمد سعید مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ آپ کل یا پرسوں آئیے، چنانچہ دوسرے یا تیسرے دن میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا!

مجھے ان دنوں دردِ سر کا دورہ پڑتا تھا، یہ دورہ دو تین منٹ سے زیادہ طول نہ کھینچتا، مگر درد کی شدت کا یہ عالم ہوتا کہ میں اتنی سی دیر میں پسینہ پسینہ ہو جاتا، مولانا کا کمالِ فراست تھا کہ مجھے دیکھتے ہی بولے۔

"آپ کو کوئی بیماری ہے؟"

۲۷ مئی کو دلی ریڈیو سٹیشن پر اُن کی تقریر اور میری نظم تھی، بڑی محبت سے ملے اور ایک مجلّد کتاب مجھے عنایت فرمائی۔ مولانا موصوف نے قرآن کریم کی تفسیر و ترجمہ کے ساتھ اچھی شرح کی تھی، اس کتاب میں چند سورتیں تفسیر و ترجمہ کے ساتھ درج تھیں۔ میں نے اس کتاب کو پڑھا تو متعدد مقامات پر کھٹک پیدا ہوئی۔ میں انہیں اس سلسلہ میں ایک مفصل عریضہ لکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس دوران میں ہندوستان میں وہ خونیں ہنگامہ پیش آگیا، جس نے مسلمانوں کو منتشر ہونے اور دیس نکالا قبول کرنے پر مجبور کردیا۔ یہ کتاب اسی ہنگامہ کی نذر ہوگئی۔

اب سے چھبیس سال پہلے ہندوستان کے پانچ عالموں کی تقریر کا بڑا شہرہ تھا، ان میں سب سے اول نمبر مولانا ابوالکلام آزاد کا تھا، تقریر و تحریر میں وہ آپ ہی اپنا جواب تھے۔ اُس کے بعد مولانا آزاد سُبحانی کا نام لیا جاتا تھا۔ بلکہ یہ تک سننے میں آیا کہ بعض جلسوں میں مولانا آزاد سُبحانی کی تقریر کے سامنے مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریر پھیکی رہی! تقسیم ہند سے تین چار سال (غالباً ۱۹۴۳ء میں) قبل، ناگپور کی اردو کانفرنس میں مولانا آزاد سُبحانی سے ملاقات ہوئی، کیونکہ موصوف سے خاصے متاثر تھے، کانفرنس میں تقریر کی مگر پھیکی سی۔ وہ کچھ پراگندہ مو اور آشفتہ مزاج نظر آتے تھے، جسم پر اوپر تلے تین کرتے پہن رکھے تھے، اور اُٹھتے بیٹھتے یہاں تک کہ پاخانہ کے لیے لوٹا اٹھاتے ہوئے "نحن حنیفۃ اللہ" اُن کی زبان سے نکلتا تھا۔

مولانا عبدالماجد قادری بدایونی مرحوم بڑے سحر آفرین اور شعلہ بیان مقرر تھے۔ سیرت النبیؐ پر اس قدر ڈوب کر اور اس انداز میں تقریر کرتے کہ سامعین کے عمامے کے پیچ کھل جاتے اور چہرہ فرطِ عقیدت سے تمتمانے لگتا۔ مولانا حامد میاں مرحوم مترادف الفاظ اپنی تقریروں میں خاص طور سے بولتے تھے، ہم بے تکلف دوست، اپنی صحبتوں میں بعض شاعروں کی شعر خوانی اور لیڈروں کی تقریر کی نقل اتارتے، تو مولانا عبدالماجد بدایونی کی تقریر کی نقل ان لفظوں میں کرتے:۔

"نکلا ایک تودۂ کوہ سے، ایک چٹان سے، ایک تودۂ خشت و سنگ سے، ایک سانپ، ایک
مارِ سیاہ، ایک اژدہا، ایک افعی جو چلا کتراتا ہوا، بل کھاتا ہوا، لہراتا ہوا....."

مولانا احمد سعید دہلوی مرحوم دلی کی ٹکسالی زبان میں ایسی شُستہ و رواں تقریر کرتے کہ سننے والوں کے دلوں کو موہ لیتے۔ اُن کی تقریر میں بڑی روانی، آمد اور گھلاوٹ ہوتی تھی، لہجہ شیریں اور طرزِ ادا بانکا۔ ملّت نے انہیں "سحبانُ الہند" کا خطاب دیا اور قوم کی دی ہوئی یہ خلعت اُن کے قامتِ موزوں پر ٹھیک آئی!

شیعہ علماء میں مدرسۃ الواعظین لکھنؤ کے فاضل صدر مولانا سبط حسن صاحب جادو بیان مقرر تھے، اُن کے وعظ شعریت و ادبیت سے لبریز ہوتے تھے، چودھویں صدی میں اُن سے بہتر مقرر شیعہ کمیونٹی میں غالباً پیدا نہیں ہوا۔

ایک زمانہ میں جمعیۃ علماء ہند حضرت مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید دہلوی کی ذات سے عبارت تھی بلکہ اُن کے نام سے جانی پہچانی جاتی تھی۔ مفتی صاحب مرحوم سیدھی سادی اسلامی زندگی اور علم و تقویٰ میں منتخب روزگار تھے اور مولانا احمد سعید مرحوم کو اُن سے کوئی نسبت نہ تھی۔ مگر جمعیۃ علماء کا کاروبار زیادہ تر مولانا مرحوم ہی کی فکر و رائے سے چلتا تھا: سیاسیات کل میں مولانا مرحوم مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ہم خیال بلکہ مقلد تھے! کانگریس اور مسلم لیگ کی کش مکش میں وہ اُس کیمپ میں تھے جو تقسیم ہند کا مخالف تھا۔ اُن کی رائے کو غلط کہا جا سکتا ہے مگر اُن پر بدنیتی کا الزام لگانے کا گناہ اپنے سر نہیں لیا جا سکتا! اُن کی اس رائے میں مسلمانانِ ہند کی خیر خواہی کا جذبہ شریک تھا!

تقسیم ہند کے بعد بھارت راج میں جہاں تک سرکاری حیثیت اور بھارت کے نیتاؤں کے یہاں رسوخ و تقرب کا تعلق ہے

...ا حفظ الرحمٰن سیوہاروی سب سے بازی لے گئے، مگر مولانا احمد سعید دہلوی کی شخصیت سرکار دربار کے جاہ و جلال کے آگے کسی طرح دب نہ سکی!

مولانا احمد سعید دہلوی مرحوم خوش تقریر تھے، خوش خوراک اور خوش مزاج تھے، طبیعت میں مزاح بھی تھا اور کبھی کبھی جذبی... میں غصے سے بے تکلف ہو جاتے! انگریزی دور میں کئی بار جیل گئے! جس کے سبب اُن کی صحت میں اعتدال باقی نہ رہا تھا۔ وہ ...ا اور لیڈر ہی نہیں علمی اور دینی کتابوں کے مولف اور مصنف بھی تھے!

۱۹۴۷ء میں جب دلی کے مسلمانوں پر مصیبت پڑی اور اُن کے لئے سچ مچ "زمین سخت اور آسمان دور" ہو گیا تو حکومت کی طرف سے مولانا احمد سعید مرحوم کو پیشکش کی گئی کہ وہ کسی محفوظ ترین مقام پر چلے جائیں، جہاں سرکاری طور پر اُن کی حفاظت کا بندوبست کیا گیا مگر مولانا کی خودداری نے اس پیش کش کو یہ کہہ کے ٹھکرا دیا کہ میں دلی کے عام مسلمانوں کو غیر محفوظ حالت میں چھوڑ کر صرف اپنے گھرانے کی حفاظت گوارا نہیں کر سکتا۔

دلی میں مولانا احمد سعید مرحوم کے بعد بس ایک ترجمان، گلزار دہلوی کی ذات رہ گئی ہے۔ جو دلی کے تمدن و تہذیب ...گار ہے، گو بادشاہی کے بعد سکھ گردی کا زمانہ دیکھنا بھی دلی کی قسمت میں لکھا تھا!

موت کی دست برد سے کوئی متنفس بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ یہ قیامت تو ہر جان کے لئے مقدر کر دی گئی ہے، موت نے ...بان الہند" کو بھی ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا، وہ بڑھاپے میں دنیا سے اُٹھے مگر ملت نے جوانوں کی موت کی طرح اس صدمہ کو ...س کیا۔ اللہ تعالیٰ "جنت کی کنجی" کے مصنف کو جنت الفردوس میں صلحاء و اتقیاء کی معیت و ہم نشینی عطا فرمائے (آمین)

طالوت

اور صلح ہوگئی!

اسپین کے شہروں میں، ماردہ ایک مشہور شہر ہے۔
اور مختلف اوقات میں اسے بعض بادشاہوں کے پایۂ تخت ہونے کا شرف بھی حاصل رہا ہے۔ طلیطلہ اور اشبیلیہ کے بعد اگر کسی بڑے شہر اور مضبوط ترین قلعہ کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ ماردہ ہے یہاں کی پرانی عمارتیں، شاہی محلات، اور گرجا گھر اپنی خوبصورتی، عظمت اور شان و شوکت کے لحاظ سے بے نظیر اور بے مثال سمجھے جاتے تھے۔
یہاں کی آبادی جن لوگوں پر مشتمل تھی وہ بہادر اور جانباز قسم کے لوگ تھے۔
اسپین کا جو حصہ مسلمانوں نے فتح کر لیا تھا۔ وہاں سے بھاگ کر آنے والے تمام لوگ ماردہ میں جمع تھے مسلمانوں کے خلاف، ان لوگوں کی آمد اور عجیب و غریب داستانیں سنانے کی بنا پر، جذبات بہت بھڑکے ہوئے تھے۔ مگر ساتھ ہی خوف و ہراس بھی کچھ نہ کچھ لوگوں میں اثر کر رہا تھا۔
بہادروں کو اپنے انجام کا تو قطعاً کوئی خوف نہیں تھا مگر اس انجام کے بعد قومی ذلت کے خطرہ اور دشمن کے غلبہ کے خیال سے ان کے دل بیٹھے جا رہے تھے۔
ہر قسم کا عیش و آرام ہونے کے باوجود، پادری، خوب صورت اور آرام دہ گرجوں میں، انگاروں پر لوٹ رہے تھے۔ سازشیں اور دعائیں جاری تھیں۔ اگرچہ انہیں دعاؤں پر کم اور سازشوں پر زیادہ اعتماد تھا۔ مگر نمائش دعاؤں کی زیادہ تھی۔

اسپین کا ہیرو موسیٰ بن نصیر بذات خود ماردہ کی جنگ میں شریک تھا۔
ماردہ کے باشندے کئی بار مقابلہ کے لئے باہر نکلے، لیکن ہر بار شکست کھا کر، انہیں بھاگنا ہی پڑا۔ مسلمان گو تعداد میں زیادہ نہیں تھے۔ مگر ان کا حملہ کچھ ایسے جانبازانہ طریقہ پر ہوتا تھا۔ کہ اس کی مدافعت کرنا وہاں کے لوگوں کے بس کا روگ نہیں تھا۔
اس معرکہ میں جب کافی خونریزی ہو چکی اور بہادر بہت کچھ شکستہ دل ہو کر زخموں کی مرہم پٹی میں مصروف تھے، تو عام باشندوں نے کھلی جنگ کی بجائے شہر پناہ کے اندر بیٹھ کر مدافعت کو زیادہ قرین مصلحت سمجھا۔
ماردہ کی فصیل اپنی مضبوطی میں بے نظیر تھی مسلمانوں نے اگرچہ بہت کوشش کی، مگر وہ شہر کے اندر داخل نہ ہو سکے۔
اور اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا کہ محاصرے کو طول دیں، اور ان لوگوں کے دوبارہ باہر نکل کر جنگ کرنے کا انتظار کریں
کچھ دنوں کے بعد جب بہادر دوبارہ جنگ کرنے کے قابل ہوئے، تو پھر باہر نکل کر جنگ کرنے کی طرح ڈالی گئی۔ نئی نئی اسکیموں اور نئے جوش و جذبہ سے حملے کیے گئے۔ مگر اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

جب معرکہ نے بہت طول کھینچا اور صبر و ضبط کی حدیں ٹوٹنے لگیں تو موسیٰ سے بھی نہ رہا گیا۔ انہوں نے ایک تدبیر سوچی۔

فوراً اس پر عمل درآمد ہونے کی خاطر، رات کے اندھیرے ہی میں اپنے خیمے سے باہر نکل آئے۔

پیدل اور سوار فوج میں سے کچھ بہادر اور جانباز نوجوانوں کو الگ بلا کر انہیں فصیل کے قریب ایک چٹان کے پاس لے گئے انہیں سمجھایا کہ تم سب لوگ چٹان کے پیچھے جو گڑھا ہے اس میں چھپ جاؤ صبح کو جب شہر والے حملہ کے لئے نکلیں تو اس وقت بھی زیادہ خاموشی، اور اپنے آپ کو چھپانے کی ضرورت ہے تاکہ وہ لوگ ہمارے مقابل میں پہنچ جائیں۔

جب تکبیر کی آواز سنو، اور ہمارا ان کا مقابلہ شروع ہو جائے۔ تب اچانک باہر نکل کر پیچھے سے نعرۂ تکبیر بلند کرنا اور فوراً حملہ آور ہو جانا۔

اس تدبیر سے یقیناً وہ لوگ بدحواس ہو جائیں گے، اور ذہنی طور پر شکست کھا جانے کے بعد زیادہ دیر تک مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ اور امید ہے کہ بہت کم لوگ ہمارے نرغے سے نکل کر واپس جا سکیں گے۔

چنانچہ دوسرے دن جب اس تجویز پر عمل درآمد ہوا۔ تو نتیجہ حسبِ خواہش نکلا، موسیٰ کے آدمیوں نے آگے اور پیچھے دونوں طرف سے عیسائیوں کو نرغے میں لے لیا اور بہت کم اپنی جان بچا کر فصیل کے اندر واپس جا سکے۔

اس تدبیر کے کارگر ہو جانے کے بعد مسلمانوں کے حوصلے بلند اور عیسائیوں کے حوصلے پست ہو گئے اور بہت دنوں تک اہل شہر باہر نہ نکلے۔

اب مسلمان اس تدبیر میں لگ گئے کہ کسی طرح فصیل کو توڑ کر شہر کے اندر داخل ہو جائیں مگر فصیل کا توڑنا کچھ آسان کام نہیں تھا۔ اس مہم کو سر کرنے کے لئے مسلمانوں نے ایک دبابہ بھی تیار کر لیا۔ دبابہ کو ایک قسم کا ٹینک تصور کیجئے جس کے نیچے چھپ کر قلعہ کی دیوار میں سوراخ کیا جا سکتا تھا اور دبابہ کی آڑ لے کر مسلمان بہادروں کا ایک گروہ فصیل کے ایک برج کو توڑنے میں مصروف ہو گیا فصیل کے پتھر توڑنے کے بعد انہیں ایک ایسی سخت چٹان سے سابقہ پڑا جس پر ان بہادروں کی کدالوں کی نوکیں اور کلہاڑیوں کی دھاریں بیکار ہو گئیں۔

اُدھر دشمن بھی غافل نہیں تھا۔ اس نے کچھ ایسی تدبیر کی کہ حملہ آور جماعت کو جو دبابہ کے نیچے کام کر رہی تھی بڑے خونریز مقابلہ سے دوچار ہونا پڑا۔ گو وہ نہایت بردباری اور تحمل و تہور سے مقابلہ کرتے رہے مگر کمک کی دوری اور دشمنوں کی کثرت نے ان کی کسی چال کو کامیاب نہ ہونے دیا اور پوری کی پوری وہ جماعت وہیں برج کے پاس ہی شہید کر ڈالی گئی جس برج کے نیچے یہ معرکہ پیش آیا تھا۔ اور جہاں ان مسلمان جانبازوں نے جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ آج اتنی مدت گزر جانے، اور مدتوں سے مسلمانوں کا قبضہ وہاں سے اٹھ جانے کے بعد بھی، اس برج کا نام برج الشہداء ہی مشہور ہے۔ ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

برج الشہداء کے معرکہ کے بعد اگرچہ بظاہر عیسائیوں کو خوشی ہوئی، مگر نفسیاتی طور پر جس پستی میں اور ذہن کی شکستگی میں وہ مبتلا ہو چکے تھے اس نے انہیں اس وہم میں مبتلا کر دیا کہ اب مسلمان اپنے شہیدوں کا خوفناک انتقام لیں گے۔ اور اس خوف سے انکے دل اندر ہی اندر بیٹھے جا رہے تھے کہ مسلمانوں کی انتقامی کارروائی کا برداشت کرنا ہماری طاقت سے باہر ہو گا۔ اور اسی وجہ سے انہوں نے فوراً موسیٰ کے پاس اپنے ایلچی بھیجے، جو صلح کے پیغامبر تھے۔

شہر والوں کی طرف سے جو سربرآوردہ لوگ آئے۔ وہ سیاسی اور جنگی امور کے متعلق دیر تک تبادلۂ خیالات کرتے رہے، مگر اپنے

حسب دل خواہ صلح کی بات طے کرنے میں ناکام رہے۔ موسیٰ بھی اگرچہ برج الشہداء کے واقعہ سے متاثر تھے مگر وہ یہ نفسیاتی نکتہ بھی جانتے تھے۔ ع

کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اسی لئے ان کی گفتگو میں یاس و قنوط یا وہن و ضعف کا کوئی پہلو موجود نہیں تھا، وہ اب بھی ماردہ کے قلعہ کو بزور شمشیر فتح کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ اور مدتوں کے محاصرہ کے بعد ان کا عزم جوان، اور ان کی تدبیریں مائل بہ پرواز تھیں۔

گفتگو کی ناکامی کے بعد شہر والوں کا وفد ناکام لوٹا، مگر ان کے دل میں موسیٰ کی شخصیت اور ان کی سفید براق ڈاڑھی کی خصوصیت نقش تھی اور یہ دیکھ کر وہ حیران تھے کہ اس پیر کہن سال کے ارادے کتنے بلند اور اس کا عزم کس قدر آہنی ہے۔

یہ رمضان المبارک ۹۳ھ کا واقعہ ہے۔

عید سے ایک روز پہلے صلح کی بات چیت دوبارہ ہوئی اور پھر دیر تک ماردہ والوں کا وفد، موسیٰ سے سیاسی و جنگی معاملات میں مصروف گفتگو رہا۔ وہ برج الشہداء کی اتفاقی کامیابی سے زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کر لینا چاہتے تھے۔ مگر موسیٰ کا عزم بلند انہیں مچھلے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتا تھا۔

گفتگو تو خیر جاری تھی مگر آج وہ لوگ کچھ بدحواس بدحواس سے دکھائی دیتے تھے، ادھر موسیٰ کے چہرے پر نظر ڈالتے اور ادھر ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھتے، گفتگو بھی ہو رہی تھی اور کچھ خفیہ خفیہ اشارے بھی ہو رہے تھے، یوں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی انوکھا مشاہدہ ان کے پیش نظر ہے جس نے انہیں مضطرب و پریشان کر رکھا ہے۔

اور ان لوگوں کی حیرت زدگی کی وجہ یہ تھی کہ آج موسیٰ کی ڈاڑھی سرخ تھی۔ موسیٰ کی شخصیت سے مرعوب ہونے کی وجہ سے وہ اگرچہ زیادہ دیر تک اس کے چہرے کو غور سے دیکھ بھی نہیں سکتے تھے مگر بار بار دیکھتے بھی اور سوچتے بھی تھے کہ کل والے موسیٰ اور آج والے موسیٰ میں کتنا فرق ہے؟

کل والا موسیٰ انہیں ایک فرشتۂ رحمت نظر آتا تھا اور آج کا موسیٰ؟ خدا کی پناہ!

اس کی شکل و صورت تو شاید انہیں فرشتۂ اجل سے مشابہ نظر آتی تھی۔

گفتگو آج بھی ناکام رہی، اور وفد حیرانیوں کے ہجوم میں واپس ہوا، واپس جا کر وفد کے بزرجمہروں نے ان پختہ رائے یہ دی کہ یہ شخص (یعنے موسیٰ) آدم خور ہے۔ ورنہ اس کی ڈاڑھی پر یہ خونی رنگ نہ ہوتا۔

شہر کے لوگوں نے جب یہ سنا تو وہ بھی سب دریائے حیرت میں غرق ہو گئے۔

طے یہ ہوا کہ جس طرح بھی ہو۔ ان لوگوں سے صلح کر لی جائے۔ اور ایک بار پھر شرائط طے کرنے کے لئے گفتگو ہونی چاہئے اور تیسری بار لوگوں نے موسیٰ سے گفتگو کرنے کے لئے آئے تو اس کی ڈاڑھی جوانوں کی طرح بالکل سیاہ تھی۔ یہ نیا رنگ ان کے لئے اور بھی حیرت فزا ثابت ہوا۔

بغیر کچھ کہے سنے وہ لوگ گئے اور جا کر اہل شہر کو سمجھایا کہ یہ لوگ پیغمبر ہیں، یہ جب چاہیں بوڑھے اور جب چاہیں جوان ہو جاتے ہیں، ان سے لڑنے میں کسی طرح بھی بھلائی نہیں، اور ان سے شرائط طے کرنا بھی ہمارے بس کا روگ نہیں، کیونکہ ہم

ان سے جنگ میں فتح حاصل کر سکتے ہیں اور نہ گفتگو میں ان سے جیت سکتے ہیں۔

... لئے ہماری رائے یہ ہے کہ ان سے انہیں کی شرائط کے مطابق ہی صلح کر لی جائے۔ اہل شہر نے اُن کی بات مان لی اور انہیں اس کا پورا اختیار دیدیا کہ وہ آج ہی جائیں اور صلح کر کے واپس ہوں۔

تھوڑی سی گفتگو کے بعد صلح نامہ طے ہو گیا جس کی اہم شرائط یہ تھیں:۔

۱۔ مقتولین کا مال، اور جلیقیہ کی طرف بھاگ جانے والوں کا اثاثہ مسلمانوں کے حوالہ کیا جائیگا۔

۲۔ گرجوں کی دولت اور زیورات۔ موسیٰ کے حوالہ کئے جائیں گے۔

۳۔ باقی ہر آدمی کو امان ملے گی اور اس کا مال اس کے پاس رہے گا۔

اور عید کے دن ہی شہر کے دروازے مسلمانوں کے لئے کھول دیئے گئے۔

(ماخذ: جنوبی یورپ پر عربوں کے حملے از علامہ شکیب ارسلان)

ہماری نظر میں

التکشف عن مہمات التصوف

از :- حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، ضخامت ۴۰۲ صفحات (بڑا سائز) مجلد، رنگین گرد پوش کے ساتھ، قیمت دس روپے،

ملنے کا پتہ : اللجنۃ العلمیہ چنچل گوڑہ، حیدرآباد دکن ۲ (آندھرا - بھارت)

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت علم و تقوی، دین و دانش و فراست و حکمت کی جامع تھی، ان کی ذات سے مسلمانوں کو بہت کچھ دینی فائدہ پہنچا ہے، آج بھی ان کے تربیت کردہ خلفاء ذکر و شغل کے ذریعہ تزکیہ نفس کا فرض انجام دے رہے ہیں اور صلاح و تقوی کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے ہوئے ہیں! مولانا تھانوی نے چھوٹی بڑی نو سو کے قریب کتابیں تالیف و تصنیف کی ہیں، ان کی کتابوں کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ "بہشتی زیور" لاکھوں کی تعداد میں چھپا ہے، اور ہمیشہ اس کی مانگ رہتی ہے، انھوں نے اپنی کسی کتاب کو "بحق مصنف محفوظ" نہیں فرمایا، افادۂ عام کے لئے اپنی کتابوں کی اشاعت کی عام اجازت دیدی!

مولانا تھانوی ایک طرف علم دین کے منصب عالی پر فائز تھے تو دوسری طرف صاحب ارشاد و تصوف تھے۔ "التکشف" ان کے اسی مسلک تصوف کی ترجمان ہے! انھوں نے اپنی اس معرکہ آرا کتاب میں روح، برزخ، عینیت و غیریت، تجرد و امثال، خلق و امر، سکر و صحو، غیبت و محو، قرب و معیت، وحدت الوجود، وحدت الشہود، تصور شیخ، کشف و تصرف، قبض و بسط غرض رابطہ بین الرب والعبد جیسے سینکڑوں نازک مسائل سے بحث کی ہے اور کوئی شک نہیں کہ تصوف کی بعض نہایت ہی لطیف و نازک پیچیدگیوں کو سلجھایا ہے! ان مسائل کی تشریح میں حضرت حکیم الامت کی کوشش یہ رہی ہے کہ تصوف کے مسائل کی ایسی توجیہ و تاویل کی جائے کہ وہ دین و شریعت کے مخالف نظر نہ آئیں :- مثلاً :-

> "سمجھنا چاہیے کہ اکثر عارفین کے کلام میں حق تعالی کو مختلف چیزوں کے ساتھ جیسے آفتاب و دریا و حباب وغیرہ سے تمثیل دی جاتی ہے اور یہ تشبیہ من کل الوجوہ نہیں ہوتی، جیسا بعض لوگ خشک مزاج بھی سمجھ کر بزرگوں کو برا کہتے ہیں، یا بعض ناواقف متصوف یہی سمجھ کر اپنے عقائد کو خلاف شرع کر لیتے ہیں بلکہ کسی خاص امر میں تشبیہ ہوا کرتی ہے، مثلاً اس مقام پر ذات حق کو دریا سے صرف اس امر میں تشبیہ دی ہے کہ دریا میں بہ نسبت خشکی کے بساطت و وحدت ہوتی کہ اور وہ ہی کو اس سے سیری نہیں ہوتی، جیسے ذات حق میں وحدت ہے اور طالب کو اس سے سیری نہیں ہوتی۔ گو خود وحدت میں تفاوت ہو کہ دریا کی وحدت اضافی ہے اور ذات حق کی وحدت حقیقی مگر مطلق وحدت میں تو مناسبت ہے، اس لئے یہ تشبیہ صحیح ہو گئی اور ایسی تشبیہ کا جواز قرآن مجید سے ثابت ہے

مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْہَا مِصْبَاحٌ (الآیہ) پس مثل بفتح المیم والثاء اور مثال کی حقیقت شئ مشارکت فی وصف "مَثل" ہے۔ گو طرفین میں ہزاروں درجہ تفاوت ہو۔"

اس کتاب کے چند اقتباسات:۔

——"دل کی بات بتادینا علم غیب نہیں، بلکہ کشف ہے، علم غیب اُس علم کو کہتے ہیں، جو بلا وسائط ہو، اور یہ خاصہ خداوندی ہے، اور جو علم بذریعہ کشف ہو اُس میں کشف واسطہ ہے، اس لئے وہ علم غیب نہیں۔ (صفحہ ۱۷)

——"علم باطن خود ایک شعبہ ہے علم شریعت کا، کیوں کہ شریعت نام ہے اصلاح ظاہر و باطن کے طریقہ کے جاننے کا۔۔۔" (صفحہ ۷۳)

——"یہاں اسرار باطنیہ میں جو حیرت ہوتی ہے، اُس کا ذکر ہے، حیرت دو قسم کی ہوئی ایک بوجہ جہل محض کے اس کو حیرت مذمومہ کہتے ہیں، دوسری با وجود کثرت علوم وواردات کے (جس کو بعض توالی تجلیات کہتے ہیں) بوجہ عدم احاطہ حقائق و اسرار کے، اس کو حیرت محمودہ کہتے ہیں" (صفحہ ۷۵)

——"(مولانا روم کے شعر کی توجیہہ کرتے ہوئے)۔۔۔ مگر اس میں تین احتیاطیں ضروری ہیں، اول یہ کہ اس کو مثل عقائد منصوصہ کے داخل عقیدہ نہ کیا جائے، احتمال اُس کے غیر صحیح ہونے کا بھی رکھا جائے۔۔۔" (صفحہ ۸۵)

——"اس وجہ سے جب تک علم و فہم و عشق سب کامل نہ ہوں، یہ مراقبہ ممنوع ہوگا، فقہی قاعدہ بھی ہے کہ مستحب میں مفاسد کا اندیشہ ہو۔ وہ مکروہ ہو جاتا ہے" (صفحہ ۹۰)

"تصوف" کے وہ مسائل، ذکر و اشغال اور احوال و کوائف جو کتاب و سُنّت کے مطابق ہیں، اُن کی اہمیت و افادیت سر آنکھوں پر! مگر اس کو کیا کیجئے کہ "تصوف" کا مزاج ہی کچھ ایسا نازک و پیچیدہ اور رمزیت و اشاریت اور غموض و عمق سے لبریز واقع ہوا ہے کہ اُس کے بہت سے مسائل و واردات دل و دماغ کو سخت الجھن میں مبتلا کر دیتے ہیں! اور یہ بات ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ رہے ہیں کہ کتاب و سنّت، اور آثار صحابہ کی جو زبان اور مزاج ہے، تصوف کی زبان اور مزاج کو ہم اُس سے مختلف پاتے ہیں۔ جن نازک حقائق اور اسرار باطن کے انکشاف و جستجو کا اہل ایمان کو مکلف ہی نہیں بنایا گیا "تصوف" نے ان حقائق کی پردہ دری کی کوشش کر کے پیچیدگیوں اور الجھنوں کے جال پھیلا دیئے ہیں! یہاں تک کہ "باطنیت" کو "اسرار باطن" ہی کی آڑ میں فساد و تخریب کا موقعہ ملا ہے، اور اسی کمین گاہ سے اس خبیث تحریک نے دین کو نشانہ بنایا ہے۔

ایک طرف امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد حنبلؒ، امام بخاریؒ، (رحمہم اللہ تعالیٰ) کی دینی کوششیں ہیں اور دوسری طرف شیخ محی الدین ابن عربی اور اس ذوق و فلسفہ کے دوسرے صوفیہ کی تعلیمات ہیں، ہر شخص ان کا مقابلہ کر کے فیصلہ کر سکتا ہے کہ ملت کو کس کی کوشش سے کس قدر دینی فائدہ پہنچا کس نے دین میں سہولتیں پیدا کیں، اور کس نے الجھنیں! فی الجملہ فن تصوف، ایک قسم کی "مابعد الطبیعاتی شاعری" ہے!

حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید توحید و سُنّت کے کتنے بڑے مُبلّغ تھے، لیکن "تصوف" کا ذوق

رکھتے تھے، اس لئے اُن کی کتابوں میں بعض بہت خطرناک اور قابلِ اعتراض باتیں پائی جاتی ہیں جن سے اہل بدعت کے مسلک کو تقویت ملتی ہے!

حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اعمال وعقائد پر توحید وسُنّت ہی کا غلبہ ہے، اور وہ دوسری کو درعمرا میں زیادہ تھے مگر "تصوف" کا ذوق اُن کے قلم کو بھی "التکشف" میں لغزشوں سے محفوظ نہ رکھ سکا۔

"سمجھنا چاہیئے کہ بعض اولیا ماللہ سے بعد انتقال کے بھی تصرف وخوارق سرزد ہوتے ہیں،

اور یہ امر معنی حدِ تواتر تک پہنچ گیا ہے۔" (صفحہ ۲۵)

بعض لوگوں کے کشف وذوق یا تجربہ ومشاہدہ کے بعض نادر واقعات کو جو خود شرعی ثبوت کے محتاج ہیں، "متواتر" نہیں کہہ سکتے! اگر اس قسم کے "مشاہدات وواقعات" پر دین وشریعت کی اصطلاح "تواتر" کا اطلاق کیا جائے، تو ہندو بھی اس قسم کا "تواتر" ملتا ہے ——— کہ فلاں دیوی نے خواب میں آکر یہ بتایا کہ فلاں مکان کے اس کونے میں سونے چاندی کا زیور دفن ہے، اس جگہ کو کھودا گیا، تو زیور نکل آیا ——— فلاں شخص کو جنگل میں ایک دیوی جی نے متمثل ہوکر اور درشن دکھاکر شیر سے بچالیا۔

"کتاب وسُنّت" سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ مرنے کے بعد اولیاءاللہ کی روحوں سے تصرف وخوارق سرزد ہوتے ہیں، اولیاءاللہ پر دوسرے انسانوں کی طرح موت طاری ہوجاتی ہے، اور وہ مرنے کے بعد کسی کو دینی اور دنیوی کسی قسم کا نفع نہیں پہنچا سکتے شہدا جن کے بارے میں قرآن شریف یہ کہتا ہے کہ "انہیں مردہ مت کہو" حدیث شریف بتاتی ہے کہ اُن کی حیات بھی برزخ کی ہے کہ اُن کی روحیں "طیور سبز" کی صورتوں میں رہتی ہیں، اور اُن تک کے بارے میں یہ نہیں کہا گیا کہ شہادت کے بعد شہدا کرام دنیا میں تصرف کرتے ہیں، یا دنیا والوں کے احوال کی خبر رکھتے ہیں۔

ایک مسلمان کسی اُلجھن میں گرفتار ہے، کسی وفات پائے ہوئے بزرگ کو اس نے خواب میں دیکھا کہ اُس نے اُس الجھن کا حل بتادیا، تو اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالا نہیں نکالا جاسکتا کہ اُس مرے ہوئے بزرگ کی روح کو اس الجھن کی خبر ہوگئی تھی بلکہ اس ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اُس شخص کی اُلجھن دُور فرمادی! اسی طرح اگر کسی کو حالتِ بیداری کسی وفات شدہ بزرگ کی صورت، تمثال یا عکس نظر آجائے، تو اسے بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ظہور سمجھنا چاہیئے! یہ اعتقاد درست نہیں ہے کہ بزرگ اس دنیا کے احوال میں تصرف وتمثل کی قدرت رکھتے ہیں۔

"(عربی کا ترجمہ) بس یوں فرض کرے گویا شیخ حاضرو ناظر ہے، لیکن اُس کا صرف تصور کرے اعتقاد نہ رکھے، کیوں کہ یہ بے شک شرک ہے، اور اسی لئے عوام کو اس اعتقاد سے منع کیا جاتا ہے، اور بعض اکابر کے کلام سے یہی مراد لی جاتی ہے۔" (صفحہ ۴۳)

یہ سلسلۂ نقشبندیہ کے کسی بزرگ کے قول کا ترجمہ ہے، جس پر مولانا تھانوی مرحوم کو نکیر کرنی چاہیئے تھی، مگر انھوں نے اس قول کی یک صفحہ میں توجیہہ فرمائی ہے اور عجیب دقیق نکتے پیدا کئے ہیں! حیرت ہے کہ جو چیز اعتقاداً شرک ہے، اُس کا اس طرح تجریدی تصور کیسے ممکن ہو کہ تصور میں تو شیخ کو حاضر وناظر سمجھا جائے مگر اعتقاداً اس "تصور" کو ترک خیال کیا جائے! کیا "تصور" ایک ایسے اعتقاد کو جو "شرک" ہے، محو یا بے ضرر بنا سکتا ہے! کیا "مشرکانہ عقیدت" اس لائق ہیں کہ اُن کو قلب ودماغ کی جلا اور تزکیۂ نفس کے لئے ذریعہ بنایا جائے (استغفراللہ)

چونکہ بے رنگی اسیر رنگ شد　　موسیٰ با موسیٰ در جنگ شد

چوں بے رنگی رسی کاں داشتی　　موسیٰ و فرعون دارند آشتی

حضرت مولانا روم کے یہ شعر سخت قابل اعتراض ہیں، لیکن مولانا تھانوی ان "شطحیات" کا جواز فراہم کر دیتے ہیں، فرماتے ہیں:۔

"بیرنگی اطلاق، مراد وجود مطلق، رنگ تقید وجودات خاصہ موسیٰ مطلق ہادی مہتدی، فرعون مطلق ضال و مُضل۔ یہ ظاہر ہے کہ موجودات عالم مطلق وجود میں باہم مشترک ہیں اور اتحاد وجود میں جن کو ظہورات کہتے ہیں، باہم متمائز و متغائر ہیں .... جب تم ان وجودات متمائزہ کو نظر سے رفع کر کے (اسی اطلاق پر پہنچ جاؤ جو تم کو مرتبہ ما بہ الاشتراک میں) حاصل تھا تو ہادی و مُضل باہم مشترک و متحد نظر آئیں گے ... (صفحہ ۱۰۴، ۱۰۵)

وہ فلسفہ طریق وحدت وجود جو حضرت موسیٰ اور فرعون، حضرت ابراہیمؑ اور نمرود، حضرت محمد عربی اور ابوجہل کو اشتراک و اتحاد کی ایک ہی سطح پر سلے آئے کس قدر گمراہ کن اور ایمان کو برباد کر دینے والا فلسفہ ہے! اس کو "باطنیت" نہ کہیں تو اور کیا کہیں (نعوذ باللہ!)

اور سنیئے:

"بزرگوں کے کلام میں بعض احادیث پائی جاتی ہیں، جو کتب فن میں نہیں پائی جاتیں، اور موافق قواعد محدثین کے وہ حدیث نہیں ہیں، پس اس کی توجیہ کے دو طریق ہیں، ایک طریق یہ کہ محدثین نے جس طرح احادیث مناسبہ پر حدیث کا اطلاق کیا ہے، اسی طرح ممکن ہو کہ ان حضرات کو کشف سے ان کا حدیث ہونا ثابت ہوا ہو، اور احادیث الہامیہ پر اطلاق احادیث کا کر دیا ہو، (کذا قال مرشدی) دوسرا طریق یہ ہے کہ گو حدیث بھی نہ ہو، تب بھی مُضر نہیں کیوں کہ اس کے ایراد سے جو غرض ہوتی ہے، وہ دوسرے دلائل صحیحہ سے ثابت ہوتی ہے ......" (صفحہ ۱۰۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث دین میں حجت ہوتی ہے، اور اولیاء و صلحاء کا کشف و الہام دین میں حجت نہیں ہے اس لئے الہام و کشف کے ذریعہ کسی قول کو "حدیث" کہنا کسی عنوان درست نہیں، جب کوئی حدیث جس کا عالم خوب سے تعلق ہے اور جو فن حدیث کے مقرر کردہ اصول و معیار پر کسی عنوان نہیں اترتی، ایسے جو کوئی محدث حدیث نوم کہتا ہے، وہ خود حدیث کے اصولوں کے ساتھ کھیل کرتا ہے!

حافظ شیرازی کو کوئی عارف باللہ اور ولی کامل سمجھتا ہے، تو ہم اس کی تردید نہیں کرتے، خدا کرے وہ ایسے ہی ہوں، اور اللہ تعالیٰ اُن کے درجات میں اور ترقی عنایت فرمائے۔ ہم اُن کی ذات کے بارے میں بھی "سوء ظن" نہیں رکھتے۔ کہ انھوں نے اپنے اشعار میں رندی و سرمستی کے جو مضامین نظم کئے ہیں تو وہ واقعی بادہ نوش، شاہد باز اور "ترکان سیہ چشم" کے دلدادہ بھی تھے۔ ہمارے سامنے ریاض خیرآبادی کی مثال ہے کہ انھوں نے "جام و شراب" کو مستقل موضوع بنا کر سینکڑوں شعر کہے ہیں مگر انھوں نے شراب کو چکھا تک نہیں! ہمیں تو حافظ کی شاعری سے بحث ہے، کہ اس میں کس چیز کو پیش کیا گیا ہے۔

خواجہ حافظ کی شاعری میں دُنیا کی بے ثباتی بھی ملتی ہے، کائنات کو وہ معمہ اسرار بھی سمجھتے ہیں..... ع

کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معما را

ن کے یہاں درسِ اخلاق اور تصوف کا تذکرہ بھی پایا جاتا ہے　　مگر اُن کی شاعری میں جس چیز کی فراوانی ملتی ہے، وہ عاشقانہ
جذبات و واردات اور رندی و سرمستی اور جام و بادہ کے مضامین ہیں۔ اُن کے یہاں عشق کا عام طور پر جس پیرایہ میں ذکر کیا گیا ہے وہ خالص
مجازی ہے، اور جام و بادہ اور مستی و رندی کے مضامین کا جو انداز اختیار کیا گیا ہے، اُس سے ہوس جھلکتی ہے! مولانا تھانوی نے اسی
مجاز کو "حقیقت" اور اسی مستی و ہوس کی "کو" "عرفان" ثابت کرنے کی جو کوشش فرمائی ہے، اُس کو افسوس ہے کہ سراہا نہیں جا سکتا
جام و بادہ، قدح و مینا اور زلف و رخ کے استعاروں سے ہم واقف ہیں کہ اس پردے میں حقیقت و تصوف اور عرفان و حکمت کے
مضامین بھی بیان کئے جاتے ہیں۔ مثلاً اس شعر میں۔ ۔ ؎

در دلِ ما غمِ دُنیا، غمِ معشوق شود

بادہ چوں خام شود پختہ کند شیشۂ ما

معشوق سے اللہ اور رسول ؐ کی ذات کسی کراہت و اشتباہ کے بغیر مراد لی جا سکتی ہے، اور "بادہ و شیشہ" یہاں اس انداز سے استعمال
ہوا ہے کہ شراب انگور، در میخانہ کے جام و شیشہ کا دھیان تک نہیں آتا، مگر حافظ شیراز کے اس شعر ؎

آں تلخ وش کہ صوفی اُم الخبائثش خواند

اشہیٰ لنا و احلیٰ من قبلۃ العذارا

پڑھ کر وہ شراب جو بھٹیوں پر کشید ہوتی ہے، اور جسے شراب فروش بیچتے ہیں، اور جسے شریعت میں "اُم الخبائث" کہا گیا ہے، اُس شراب کے
علاوہ، کسی اور طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا! مگر حضرت تھانوی نے اس شعر کو بھی مجاہدہ، نفس کشی اور روحانیت و نورانیت کا آئینہ دار
بنا کر قرآن کی آیتوں اور حدیثوں تک کا اس شعر کی معنویت سے جوڑ ملا دیا ہے۔ ؎

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے

حافظ اپنے وطن شیراز، اپنے محبوب مقام مصلّا اور چشمہ رکنا باد کا، جو اُن کے زمانہ میں سیرگاہ تھی، ذکر کرتے ہیں مگر ان خالص
مادی مقامات کو بھی مولانا تھانوی نے استعاروں کا رنگ دے کر ان سے مقاماتِ عرفان و روحانیت وابستہ کر دیئے ہیں! کسی شارح
کا اپنے ذوق کے مطابق شاعر کے کلام کی ایسی دور دراز تاویلیں مضحکہ نہیں تو اور کیا ہیں! یہ تو وہی بات ہوئی کہ کسی نے کہا داغ دہلوی
ہر شعر شریعت کے عین مطابق کہتے تھے، سننے والے نے بہت سوچ کر داغ کا سب سے زیادہ رکیک مصرعہ پڑھا ؏

مٹی کی بھی نے تو ر ولے شباب میں

وہ صاحب اس پر فوراً بول اُٹھے: ۔

"حضرت داغ رحمۃ اللہ علیہ نے اس مصرعہ میں تیمم کا مسئلہ بیان فرمایا ہے"

اس پر کہا جا سکتا ہے کہ شعر کا شارح و مفسر تصوف و عرفان میں غرق ہے، اس لئے اسے ان شعروں میں عرفان و تصوف ہی کے
جلوے نظر آتے ہیں، اس کے جواب میں عرض ہے کہ کوئی شخص بازار میں ننگا کھڑا ہو، اور اُسے دیکھ کر کوئی شخص کہنے لگے، :۔

"سبحان اللہ! قربانت شوم! کیا عالمِ تجرید کا منظر پیش کیا ہے"

اس قسم کی تاویل و توجیہ کو کسی عنوان بھی نہیں سراہا جا سکتا کہ اس سے کھلی ہوئی بے حیائی کی حرکت کو سندِ جواز اور قبول پسندیدگی ملتا ہے؟۔
کسی کے فکر و نظر اور دل و نگاہ پر ایسا غلبہ ہو جائے کہ اُسے زنار تسبیح، میخانہ مسجد، شراب کی بھٹی، سخت دلوں کے پگھلانے
کا عمل اور بت خانہ، کعبہ نظر آنے لگے، تو ایسا غلبہ کس قدر گمراہ کُن ہے!

یہ تو اہل کشف و تصوف کو معلوم ہوگا اور یہ اسلامیں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہی ہوں گی کہ حافظ کی شاعری نے کتنوں کو عارف باللہ بنادیا، مگر صوفیہ کے تذکروں میں اس کے شواہد نہیں ملتے، لیکن اس کی بہ کثرت مثالیں ملتی ہیں کہ حافظ کے اس قسم کے شعروں نے رقص و سرود، شراب نوشی اور رندی و ہوسناکی کی محفلوں کی رونق اور گرمی کو بڑھایا ہے اور وہ اس لئے کہ خواجہ حافظ کے شعروں میں اس کی پوری صلاحیت پائی جاتی ہے کہ وہ ان مشاغل میں صرف ہو سکیں۔ نادر شاہ کی فوجیں سوادِ دلی تک پہنچ چکی تھیں، پرچہ نویسوں نے جب محمد شاہ رنگیلے کو اس کی اطلاع دی، تو اس نے یہ پرچہ جو در اصل مغلیہ سلطنت کا قتل نامہ تھا، شراب کے پیالہ میں بے پروائی سے ڈبوتے ہوئے حافظ کا یہ مصرعہ پڑھا ع

این دفتر بے معنی غرقِ مے ناب اولیٰ

یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ "مشاہدہ حق کی گفتگو کے لئے"

ع بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

لیکن حافظ نے بیشتر مقامات پر "بادہ و ساغر" کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ "مشاہدۂ حق کی گفتگو" کا اس میں کوئی قرینہ ہی نہیں پایا جاتا! اقبال۔ بادہ و شاہد کے استعاروں کی اس خرابی سے واقف تھا، اس نے بھی کہیں کہیں جام و ساقی کا ذکر کیا مگر اس وقار و پاکبازی کے ساتھ ؎

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی!

اقبال کو خواجہ حافظ کی عاشقانہ و رندانہ شاعری کی اخلاقی مضرتوں کا احساس تھا، اس لئے وہ ان کی شاعری کا نہ صرف یہ کہ مداح نہ تھا بلکہ مخالف تھا۔

خواجہ حافظ کے حالات تذکروں میں بہت کم ملتے ہیں! میخانہ کے مصنف عبدالنبی نے لکھا ہے کہ حافظ شروع شروع میں ناموزوں شعر کہتے تھے جن کا لوگ مذاق اڑاتے اور لطف لیتے، خواجہ حافظ ایک دن بابا کوہی کے مزار پر جاکر خوب روئے، اسی رات کو خواب میں کسی بزرگ نے ایک لقمہ انہیں کھلایا، اور فرمایا کہ جا تجھ پر علم و حقائق کے دروازے کھل گئے، خواجہ حافظ پوچھتے ہیں کہ حضرت آپ کون ہیں" جواب ملا" علی مرتضیٰ" صبح کو حافظ کی آنکھ کھلی، تو یہ غزل موزوں ہو گئی ؎

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند   وندراں ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند

اس دن سے نہ صرف یہ کہ ان کی طبیعت کی ناموزونی، موزونیت سے بدل گئی بلکہ ان کی شاعری محاسن شاعرانہ سے لبریز ہوتی چلی گئی۔

صوفیا کے تذکروں میں اس قسم کے اکثر واقعات ملتے ہیں کہ فلاں بزرگ نے توجہ ڈالی، تو مرید پر چودہ طبق روشن ہو گئے، فلاں بزرگ نے فلاں مجذوب یا سالک کی ولایت ایک نگاہ میں سلب کر لی۔ شیخ کا جھوٹا پانی پیتے ہی ولایت مل گئی، ایک بزرگ نے نگاہ بھر کر دیکھا تو فلاں صاحب نے اک آہ کی۔ اور گھر بار چھوڑ کر جنگل کی راہ لی اور بارہ سال تک درختوں کے پتے کھا کر گذار دیئے جو بات سالہا سال کی ریاضت و مجاہدے کے بعد دوسروں کو حاصل ہوتی ہے فلاں صاحب کو شیخ کے فیض و توجہ سے بات کرتے اور پلک جھپکاتے حاصل ہو گئی! اس قسم کے واقعات میں توہمات اور مفرط عقیدت کی زیادہ تر کارفرمائی ہوتی ہے اور ان واقعات نے "عرفان و تصوف" کے بارے میں ایک عجیب تصور قائم کر دیا ہے۔

خواجہ صاحب کی زندگی کے واقعات بتاتے ہیں کہ وہ بھی ایران کے دوسرے شاعروں کی طرح بادشاہوں اور امیروں کی مدح کرتے تھے
[ش]اہ یحییٰ جو لہو و لعب میں زندگی گزارتا اور خوب جی کھول کر دادِ عیش دیتا تھا، خواجہ صاحب کی غزلوں میں اُس تک کا نام آتا ہے
[مبار]زالدین مظفر ایک پابند مذہب حکمراں تھا۔ شرعی حدود کا محافظ! اُس نے جب میخانوں پر احتساب کیا اور میخانے بند ہوگئے تو
[خو]اجہ حافظ نے شراب کی بندش پر دردانگیز مرثیہ کہا: —

بود آیا کہ در میکدہ ہا بکشایند — گرہ از کارِ فروبستہ ما بکشایند
در میخانہ بہ بستند خدایا مپسند — کہ درِ خانہ تزویر و ریا بکشایند

[او]ر شاہ شجاع نے میخانوں پر سے یہ قدغن اٹھادی، تو حافظ خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتے، اور اسی عالم مسرت میں غزل
[کہ]تے ہیں: —

سحر ز ہاتفِ غیبم رسید مژدہ بہ گوش — کہ دورِ شاہ شجاع است مے دلیر بنوش

اور

جنگ در غلغلہ آمد کہ کجا شد منکر — جام در قہقہہ آمد کہ کجا شد مناع
مظہرِ لطفِ ازل، روشنیِ چشمِ امل — جامعِ علم و عمل جانِ جہاں شاہ شجاع

[ب]ادشاہ ملک کی آمدنی بڑھانے کے لئے، شراب کی خرید و فروخت سے پابندی اٹھالے، اُسے حافظ کا "مظہر لطفِ ازل
[او]ر جامعِ علم و عمل" کہنا، کیا ایک "عارف باللہ" کو کسی طرح بھی زیب دیتا ہے (؟) مولانا تھانوی نے شیراز، گلگشتِ مصلا اور
[آ]ب رکناباد کو استعارے فرض کرکے اُن سے تو مقاماتِ عرفان و تصوف کا جو مُراد دیا، مگر سلطان ابو اسحٰق، شاہ شجاع، منصور، شاہ
[من]وز کے ناموں کی وہ کوئی صوفیانہ توجیہہ نہ فرماسکے! شاید اس طرف دھیان نہیں گیا، ورنہ کہہ دیتے ان ناموں سے شیوخ طریقت،
[اہ]ل ماوتاد اور صاحبانِ خدمت مُراد ہیں!

شبلی نعمانی نے ہفت اقلیم امین رازی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ: —

"خواجہ صاحب قرآن مجید کی تفسیر میں معقول کو منقول سے تطبیق دیتے تھے، فنِ قرأت
میں کمال تھا، اس کے ساتھ خوش آواز تھے، معمول تھا ہمیشہ جمعہ کی رات کو مسجد کے
مقصورے میں تمام رات خوش الحانی کے ساتھ قرآن مجید پڑھتے۔"

[ان] حالات کے بعد اُن کے اس شعر کو پڑھ کر طبیعت خوش ہوگئی، کس قدر ایمان افروز شعر ہے: —

صبح خیزی و سلامت طلبی چوں حافظ
انچہ کردم ہمہ از دولتِ قرآں کردم

[لیکن] اس سحر خیزی، ورد و شغل اور شغفِ قرآن کے سبب اُن کی رندانہ شاعری عارفانہ شاعری نہیں بن سکتی! امیر مینائی کی مثال
[ہما]رے سامنے ہے وہ عالمِ دین تھے، صاحبِ اتقا تھے، خوش اوقات اور خوش کردار تھے، شاہ مینا رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کے
[چ]شم و چراغ تھے اور صاحبِ سلسلہ بزرگ تھے ——— مگر اُن کے چوماچاٹی کے شعروں کو اگر کوئی یہ کہے کہ ان
[اش]عاروں میں امیر مینائی نے عرفان و تصوف کے حقائق بیان کئے ہیں، تو کتنی غلط بات، دوراز کار تاویل، اور مضحکہ خیز نکتہ
[آفر]ینی ہوگی۔ حافظ کے دور میں ایران کی سوسائٹی کا جو رنگ تھا حافظ نے اُسی کی ترجمانی کی اور عیش و نشاط

کی لے میں لے ملا دی۔

حافظ کی شاعری میں مجازی معشوق کی بیوفائی کا بھی شکوہ ملتا ہے، معشوق سے وہ بدگمان بھی ہو جاتے ہیں، اس کی تمنا بھی کرتے ہیں کہ اگر قسمت نے یاوری کی اور محبوب کی قربت نصیب ہوگئی، تو وہ اُسے پھولوں سے سنواریں گے، اور تخت پر بٹھا کر اُس سے درخواست کریں گے:-

به بروده، سرو دستار عالمے یعنی　　کلاه گوشه به آئین دلبری بشکن

یہاں تک کہ

خواجہ حافظ معشوق کے بوسہ کے لطف کے ساتھ اُس کی گالیوں کے مزے کی آمیزش بھی چاہتے ہیں:-

قند آمیخته با گل نه علاج دل ماست　　بوسه چند بیامیز به دشنامے چند

اس کھلی ہوئی "ہوس" میں شاعر نے کسی استعارے کی گنجائش کہاں باقی رہنے دی ہے! ہمیں اندیشہ ہے کہ پچاس سو سال کے بعد، اس مزاج کے شارحین کہیں جگر مراد آبادی کو "عارف باللہ" اور "لسان الاسرار" نہ بنا دیں، اور عقیدت کے جوش میں ان کے اس قسم کے شعروں:-

صبر ٹوٹے ہوئے دلوں کا نہ لے　　تو یونہی دھان پان ہے پیارے
سب کو مارا جگر کے شعروں نے　　اور جگر کو شراب نے مارا

کو عرفان و تصوف کا ترجمان نہ ٹھہرا دیں۔

خوبان پارسی گو بخشندگانِ عمر اند　　ساقی بده بشارت پیرانِ پارسا را　　(صفحہ ۱۳۲)

کس قدر صاف شعر ہے، "خوبانِ پارسی" سے ایران کے حسین و خوبرو محبوب مراد ہیں، مگر مولانا تھانوی نے خوبانِ پارسی سے "سالکین" مراد لی ہے۔ اور فرماتے ہیں "گویا کہ اس شعر میں بسط کی حکمت کا بیان ہے"۔

حافظ کے شعروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا میلان عقیدۂ جبر کی طرف تھا، اس شعر میں انھوں نے اسی عقیدہ کو ظاہر کیا ہے:-

حافظ بخود نپوشید ایں خرقۂ مے آلود　　اے شیخ پاک دامن معذور دار ما را　　(صفحہ ۱۳۲)

مگر مولانا تھانوی پہلے تو "شبہ جبر" کو رفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں پھر اس شعر کی توجیہ و تحسین یہاں تک فرما دیتے ہیں کہ "بہ لسانِ معنوی خرقۂ مے آلود اشارہ ہے مشربِ ملامتی کی طرف، نہ بایں معنی کہ خلافِ شرع امور کے مرتکب ہوں، بلکہ خلافِ وضع اور خلافِ شان امور اختیار کریں بعض کے لئے شیخ کامل اس کو بعض مصالح سے تجویز کرتا ہے"۔

حد ہوگئی تاویل کی.... کہ

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دلِ ما را　　بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را　　(صفحہ ۳۰)

میں "ترک شیرازی" سے محبوب حقیقی مراد لیا ہے! ہم حیران ہیں اور ادب و احترام کے سبب خاموش ہیں ورنہ اس قسم کی شرح و تاویل سخت قسم کے احتساب و تنقید کی مستحق تھی! اچھا ہوا کہ رباعیات عمر خیام کی مولانا تھانوی نے شرح نہیں فرمائی ورنہ "زن ......" کو نہ جانے اپنی نیک نفسی اور ذوقِ تصوف سے تاویل کر کے کیا بنا دیتے!

با دلِ سنگینت آیا ہیچ در گیرد شبے　　آہ آتش بار و سوزِ نالۂ شب گیر ما　　(صفحہ ۱۴۰)

"دلِ سنگین" سے صاف ظاہر ہے کہ شاعر معشوقِ مجازی سے خطاب کر رہا ہے مگر مولانا تھانوی نے پہلے تو "سنگین" سے اللہ تعالیٰ کی

وصفِ غنج مُرادلی، اور پھر اس لفظ "سنگین" کی ذاتِ باری سے نازیبا نسبت کی رکاکت دور کرنے کے لئے یہ تک فرمادیا ۔ ع

"لفظی بے ادبی در غلبۂ عشق عفواست"

ہم اس تصور سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں! استغفر اللہ!

تیر آہ ما ز گردوں بگذرد جانِ عزیز — رحم کن بر جانِ خود پرہیز کن از تیرِ ما (صفحہ ۱۴)

اس شعر کو بھی "مجازاتِ بعیدہ" کے تکلفات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذات سے منسوب کردیا ہے، اور اس کی توجیہ فرمائی ہے۔ ــــ "چونکہ محبوب حقیقی نہایت رحیم ہے، اس کو اپنے بندے کی پریشانی گوارا نہیں ہے، اس لئے عرض کرتے ہیں کہ ہم کو فراق سے نجات دیجئے، ورنہ ہماری پریشانی سے آپ کو ایذا ہوگی۔"

حافظ کی مشہور غزل مسلسل ہے، جس کا مطلع ہے ؎

صبا بلطف بگو آں غزالِ رعنا را — کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادہ ما را (صفحہ ۱۳۰)

اس میں "غزالِ رعنا" سے "مرشد" مراد لیا ہے، ...... مگر کیا کوئی مرید اپنے مرشد سے اس طرح بھی خطاب کر سکتا ہے ؎

جز ایں قدر نتواں گفت در جمالِ تو عیب — کہ خالِ مہر و وفا نیست روئے زیبا را

حافظ کے اس شعر میں ؎

روز گارے است کہ سودائے بتاں دینِ من است — غم ایں کار نشاطِ دلِ غمگینِ من است (صفحہ ۱۸۱)

"سودائے بتاں" سے عشق و طلب کی ترغیب اور تحمل شدائد کی نصیحت مراد لے کر، مجازی معشوقوں سے دل بستگی کے مضمون کو محمود بنا دیا ہے!

صلح و توبہ و تقویٰ ز ما مجو زاہد — ز رند و عاشق و مجنوں کسے نیافت صلاح (صفحہ ۲۹)

یہ شعر ہوسناکی، اور رندی کی شدت اور گرمی کو کس قدر واضح طور پر ظاہر کرتا ہے، یہاں تک کہ تائب ہونا ہی سے توبہ کرنے کا داعیہ تک اپنے اندر نہیں رکھتا، ایسے شعر کی شرح مولانا تھانوی کس تحسین آمیز انداز میں فرماتے ہیں :۔

"...... ہر طالب کا مذاق جدا ہوتا ہے، دوسرا طریق اس کے لئے مناسب نہیں ہوتا۔"

گر غالیہ خوشبو شد در گیسوئے او آویخت — ور وسمہ کماں کش شد در ابروئے او پیوست (صفحہ ۲۰۶)

اس شعر کو بھی حضرت حکیم الامت نے "مجازی" نہیں رہنے دیا، اعیان و اعراض کا فلسفہ اس سے منسوب کردیا ہے۔

گوشم ہمہ بر قولِ نے و نغمۂ چنگ است — چشمم ہمہ بر لعلِ لب و گردشِ جام است (صفحہ ۲۱۷)

اس رندی و سرمستی اور ...... ہوسناکی کا پیوند تجلیات اور محبت الٰہی سے جوڑ دینا، صاحبِ "التکشف" ہی کا حصہ ہے!

حضرت کعب رضی اللہ عنہ غزوۂ تبوک میں جانے سے رہ گئے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن تین متخلفین سے جن میں کعبؓ بھی شامل تھے، مسلمانوں کو گفتگو کرنے سے منع فرمادیا تھا، جب اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی، اور اس بشارت کو ایک صحابی لے کر حضرتِ کعب کے پاس آئے، تو انہوں نے فرطِ محبت سے اپنے دونوں کپڑے اُتار کر اُن کو دیدیئے ــــ اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد مولانا تھانویؒ نے اس سے فائدہ اخذ کیا ہے :۔

"بعض اہل وجد میں معمول ہے کہ کسی شعر پر محظوظ ہو کر سنانے والے کو کوئی کپڑا یا کچھ نقد دیدیتے ہیں، حضرت کعب کا اس مبشر کو کپڑا دینا اُسی قبیل سے ہے۔" (صفحہ ۲۱۶)

یہ جو سماع و قوالی کی محفلوں میں لوگ قوالوں کو روپیہ یا کپڑا دیدیا کرتے ہیں، اُس کا جواز حضرت کعبؓ کے اس واقعہ سے پیدا کرنا، کم از کم مولانا تھانوی جیسے متبع کتاب و سنّت کو زیب نہیں دیتا!

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی برأت جو قرآن میں نازل ہوئی، اُس پر اُن کی والدہ نے کہا کہ اُٹھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ، اس پر حضرت صدیقہؓ نے فرمایا واللہ! میں اُٹھ کر آپ کے پاس نہ جاؤنگی اور اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کا شکریہ ادا نہیں کروں گی اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالا۔

"بعض بزرگوں سے نظماً یا نثراً بعض ایسے کلمات منقول ہیں جن کا ظاہری عنوان توہم گستاخی ہے اگر یہ غلبہ حال میں ہو تو اس کو شطح و ادلال کہتے ہیں، حضرت صدیقہ رض کا کہنا اسی قبیل سے ہے۔" (صفحہ ۲۱۸)

"ادلال" (ناز عشق و محبت) کی حد تک تو درست ہے، مگر اس سے بزرگوں کے "شطحیات" کے لئے دلیل جو لانا درست نہیں! "شطحیات" کو ناپسندیدہ ہی سمجھنا چاہیئے! حضرت صدیقہ رض سے "شطح" کہاں سرزد ہوا تھا۔ اُن کو اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ ہی کا شکر ادا کرنا چاہیئے تھا، انھوں نے اپنی والدہ کو جو جواب دیا تھا، اس پر اللہ اور رسول نے کوئی تنبیہ نہیں فرمائی!

اسی طرح صفحہ ۳۳۳ اور ۳۳۴ پر ایک مجنون زانیہ عورت کے واقعہ کی روایت سے "سکر غلبہ حال اور شطحیہ" پر "عفو و درگزر" کی جو دلیل لائی گئی ہے، وہ بھی بڑی خلجان میں ڈالنے والی تاویل ہے! یہ "سکر و غلبہ حال" کی آخر کونسی قسم ہے کہ ایک شخص جسے "مجذوب" کہا جاتا ہے وہ نماز تو نہیں پڑھتا مگر عورتوں کا مارچ دیکھتا ہے پھر حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے اس "مجنون زانیہ عورت" کو مختل الحواس کہا تھا نہ کہ رسیدہ اور مجذوب، اہل سکر اور مغلوب الحال تو نہیں فرمایا تھا مگر مسلمانوں میں وہ لوگ جن کے حواس میں اختلال پیدا ہو گیا ہے، اور جو جنون اور دماغی امراض میں مبتلا ہیں، اُن کی خلاف شرع باتوں پر "سکر و غلبہ حال" کا پردہ ڈال کر، اُن سے سوز و جذب والہانہ مستی بلکہ خدا رسیدگی تک منسوب کی جاتی ہے (توبہ!) افسوس ہے کہ مولانا تھانوی مرحوم نے "مسئلہ عنوان سکر" کے تحت جو کچھ فرمایا ہے، اُس سے اسی مزاج و عقیدہ کے لوگوں کے مسلک کو تقویت ملتی ہے جس کا ابھی ابھی ذکر کیا گیا ہے۔

"حضرت انس رض سے روایت ہے کہ مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کام کو بھیجا، مجھ کو ماں کے پاس پہنچنے میں دیر ہوئی، جب میں آیا انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ تو کہاں رہ گیا تھا، میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو ایک کام کو بھیجا تھا، کہنے لگیں وہ کیا کام تھا، میں نے کہا کہ وہ راز کی بات ہے، کہنے لگیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راز کسی سے مت کہنا"

اس حدیث سے حضرت مولانا تھانوی یہ نتیجہ اخذ فرماتے ہیں:۔

"مشائخ کے یہاں اس کی سخت تاکید ہے کہ اسرار باطنی کا کسی پر افشا نہ کریں، خواہ وہ متعلق تعلیم کے ہوں خواہ متعلق واردات کے ہوں۔ اور گو یہ اسرار اکثر مرید کے ہوتے ہیں اور حدیث میں راز شیخ کا مذکور ہے، لیکن علت مشترک ہے، یعنی اظہار کا خلاف مصلحت ہونا خواہ وہ مصلحت کسی قسم کی ہو۔" (صفحہ ۳۵۱، ۳۵۲)

اس حدیث سے "شیخ و مرید" کی "تعلیم حفظ اسرار باطن" کا کیا تعلق ہے؟! حدیث کے الفاظ اور تیور بتا رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غالباً کسی اپنے ذاتی او گھریلو کام سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا، اس کا بھی امکان ہے کہ کسی غزوہ یا سریہ کے سلسلہ کی کوئی ہدایت دی ہو، حضور نے تزکیہ نفس یا واردات قلبی کا کوئی "راز" تو حضرت انس کو نہیں بتایا تھا جس سے صوفیاء کی "تعلیم حفظ اسرار"

...ن کا پیوند ملا یا جائے! "سینہ بہ سینہ اسرار" یا تو کیمیا گر چھپاتے ہیں یا پھر "باطنیوں" کے تذکروں میں ملتا ہے کہ اُن کے یہاں "اسرار ...ن" چھپانے کی شدید تاکید تھی۔ ———— صوفیاء کرام نے غالباً یہ تعلیم دی ہوگی کہ قلب میں جو "وساوس" پیدا ہوتے ہیں ...ن کا دوسروں سے اظہار نہ کیا جائے، کہ اس طرح خلجانات اور الجھنیں بڑھیں گی ان وساوس کو ... لوگوں نے "اسرار" سمجھ لیا۔

"حضرت ابوہریرہ رضی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ پڑھا، پھر راوی نے حدیث میں یہ مضمون ذکر کیا (خطبہ سُن کر) ابوشاہ نے عرض کیا یہ مضمون مجھ کو لکھ دیجئے یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا کہ ابوشاہ کو لکھ دو۔"

...حدیث پر مولانا تھانوی "فوائد" رقم فرماتے ہیں۔۔

"اس حدیث سے زبانی تلقین وارشاد کئے ہوئے امر کے تقیید بہ کتابت کر دینے کا موافق سُنّت ثابت ہوا، اہل طریقت کی یہ سب عادتیں اس میں داخل ہوگئیں۔ ذکر وشغل کا طریقہ یاد کے لئے لکھ کر دے دینا، شجرہ لکھ کر دینا، سندِ خلافت لکھ کر دینا۔" (صفحہ ۳۶۰)

...ول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوشاہ رضی اللہ عنہ کو جو خطبہ لکھ کر عنایت فرمایا تھا، یہ تو اس کی دلیل ہے کہ خود حضور کے ...د میں جمع احادیث اور کتابت احادیث کا کام شروع ہو گیا تھا۔ سلاسلِ تصوف کے شجروں اور مرید کرنے کے لئے سندِ خلافت ...نے کا ثبوت اس حدیث سے کہاں ملتا ہے! صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین، ائمہ فقہ وحدیث نے اپنے شاگردوں کو شجرے کتابت ...ئے اور نہ زبانی اُن کا ورد کیا اور نہ اپنے شاگردوں اور تربیت یافتہ حضرات کو "سندِ خلافت" لکھ کر دی کہ تم ہمارے سلسلہ میں لوگوں ...و مرید کیا کرنا، یہ سب بعد والوں کے اضافے ہیں!

"حضرت ابوہریرہ رضی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قصہ میں فرمایا جس میں دو عورتیں (سلیمان علیہ السلام کے پاس) مقدمہ لے گئی تھیں (وہ قصہ یہ تھا کہ دو عورتیں اپنے بچوں کو لئے ہوئے جا رہی تھیں کہ بڑی کے لڑکے کو بھیڑیا لے گیا، اُس نے چھوٹی سے جھگڑا کیا کہ وہ تو تیرا بچہ تھا اور اس کے بچے پر جو بچ گیا تھا دعویٰ کیا، میرا بچہ ہے۔ مقدمہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچا۔ سلیمان علیہ السلام نے فرمایا (جب گواہ نہیں تو دونوں کا برابر ہے) چھری لاؤ دونوں میں تقسیم کر دوں (یہ سُن کر) چھوٹی (تڑپ گئی) اور عرض کیا اللہ تعالیٰ آپ کا بھلا کرے، ایسا نہ کیجئے (میں نے چھوڑا) یہ اسی کا ہے اسی کو (دیدیجئے) پس آپ نے اس چھوٹی ہی کو دیدیا (اُن کے قواعد شریعت اس کے مقتضی ہونگے)

...حدیث شریف سے مولانا تھانوی یہ نتیجہ نکالتے ہیں:—

"بعض بزرگوں کی بعض مواقع ضرورت پر عادت ہوتی ہے کہ طالب کی ارادت واعتقاد کا اس طریق پر امتحان کرتے ہیں کہ کوئی قول یا کوئی فعل ایسا کہتے یا کرتے ہیں جس کا ظاہر خلاف باطن کے ہوتا ہے، یعنی واقع میں تو وہ شریعت کے موافق ہوتا ہے اور ظاہر میں خلاف ہوتا ہے جیسا شیخ صادق گنگوہی نے ایک طالب کے سامنے کہہ دیا لا الٰہ الا اللہ صادق رسول اللہ، مقصود تو یہ تھا کہ رسول صادق فی النبوت ہیں، یکون نحو مقبول وامتثال!

موحش اور ظاہر شبہ ہوتا تھا کہ یہ خود مدعی رسالت ہیں اگر طالب کم سمجھ ہو تو بھاگ جاتا اور اگر سمجھدار ہوا تو امتحان کا تحمل ہوتا ہے ......" (صفحہ ۳۷۲)

شیخ صادق گنگوہی نے مریدوں کے تحمل، ضبط اور عقیدت کے جانچنے کی جو ترکیب نکالی تھی، وہ شریعت کے اعتبار سے بالکل غلط بلکہ لغو تھی! یہ بات تحسین کی نہیں تنقید بلکہ تردید کی مستحق ہے! چہ جائیکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے اور نبی کے فعل سے اس کے جواز کے لئے دلیل لائی جائے (توبہ!) گنگوہ کے شیخ صادق صاحب کے اس طریقہ اور مندرجہ بالا حدیث کے مابین کوئی بعید ترین مشابہت بھی تو نہیں ہے! حضرت سلیمان ؑ پر اللہ تعالیٰ کا درود و سلام ہو کہ ان دو عورتوں کے مقدمہ کا فیصلہ کرنے کے لئے آپ نے پیغمبرانہ حکمت سے کام لیا، آپ کی فراستِ ایمانی کو پورا اعتماد تھا کہ جس عورت کا یہ بچہ ہوگا، وہ اس کے لئے قیامت تک راضی نہیں ہوگی کہ اس کے لختِ جگر کے دو ٹکڑے کر دیئے جائیں، چنانچہ یہی ہوا کہ ماں کی ممتا نے چھوٹی دعویدار عورت کو بچہ دیا جانا گوارا کرلیا۔ اور اگر بالفرض بچہ کی ماں اس پر راضی ہو جاتی تو کیا حضرت سلیمان بچہ کے چھری سے دو ٹکڑے کر دیتے! ہرگز نہ کرتے۔

یہ آخر کیا ذہنیت ہے کہ کوئی "انا الحق" بکنے لگے، کسی کے منہ سے ایسے احمقانہ الفاظ:

پنجہ در پنجۂ خدا کردم
من چہ پروائے مصطفےٰ دارم

نکل جائیں، اور کوئی اپنا نام مریدوں کے جانچنے کے لئے کلمہ طیبہ میں شامل کردے، تو ان لغو و بیہودہ کلمات پر نکیر کے بجائے، ان سے رموز و اشاریت اور حکمت و تدبیر کی خوبیاں منسوب کی جائیں! (پناہ بخدا)

"حضرت عائشہ رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عثمان! اگر اللہ تعالیٰ تم کو اس حکومت کا کسی وقت اختیار دے پھر منافقین تم سے وہ پیرہن اترانا چاہیں جو تم کو اللہ تعالیٰ نے پہنایا ہو، سو تم اس کو مت اتارنا (مطلب یہ ہے کہ وہ تم سے خلافت چھوڑ دینے کی درخواست کریں تو تم خلافت مت چھوڑ دینا، چنانچہ حضرت عثمان رض قتل ہوگئے مگر اس ارشاد پر پابند رہے)

اس پر حضرت تھانوی کیا حاشیہ چڑھاتے ہیں:-

"ولی امر ہونے کو قمیص سے تعبیر کرنا جس مناسبت پر مبنی ہے اس سے اس امر کی مشروعیت بھی نکلتی ہے کہ امور دینیہ کی تولیت عطا کرتے وقت قمیص حسی پہنا دیا جائے، جیسے بعضے بزرگوں کا معمول ہے کہ وہ خلافت دینے کے وقت خرقہ و پیراہن پہناتے ہیں، ـــ اور درۃ المعارف میں طبرانی سے عمامہ باندھنے کی اصل منقول ہے کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یُوَلِّی وَالِیًا حَتّٰی یُعَمِّمَہٗ وَیُرْخِیَ سدلها من جانبه (عین بحر الاذن صفحہ ۴۴۱)

خود مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ "قمیص خلافت" سے یہ مراد نہیں ہے کہ عثمان غنی رض کو کپڑے کی بنی ہوئی قمیص پہنا دی گئی تھی بلکہ لفظ "قمیص" سے "منصبِ خلافت" مراد ہے　　　اس سے صرف لفظ "قمیص" کے حدیث شریف میں بطور استعارہ آجانے سے، اس "خرقہ و پیراہن" کے لئے دلیل لانا، جو صوفیہ خلافت عطا کرتے وقت اپنے خلفاء کو پہنایا کرتے ہیں، بے جوڑ سی بات ہے!

اگر طبرانی کی روایت صحیح ہے تو اس "سُنّت" پر عمل کرنے کا سب سے موزوں وقت وہ تھا۔ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو خلافت کے لئے اپنا جانشین مقرر کیا تھا!

پیری مریدی اور تفویض خلافت کے سلسلہ میں جو رسمیں پائی جاتی ہیں اُن کی کتاب و سُنّت اور تاریخ صحابہ میں سند نہیں ملتی خود مولانا تھانوی جب حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر رحمتہ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے ہیں، تو انھوں نے شیرینی، اُس پر عمامہ اور اُس جیسی رومیہ رکھ کر پیش کئے تھے! نہ جانے یہ رسمیں اور طریقے اہل تصوف کے یہاں کہاں سے آگئے!

مولانا تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نے کیسی کیسی مفید دینی کتابیں لکھی ہیں، حیرت ہے کہ اللجنۃ العلمیہ حیدرآباد دکن نے مولانا مرحوم کی تمام کتابوں میں اس کتاب (التکشف) ہی سے اپنی مطبوعات کا آغاز کیا، کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ:-

"ایسی نافع خلائق و مقبول عوام کتاب ایک مدت سے کمیاب ہو گئی تھی"۔

حالانکہ یہ کتاب نافع خلائق "نہیں ہے، اس لئے کہ اس کے بہت سے دقیق نکتے بیچارے عوام کی سمجھ میں آہی نہیں سکتے، بلکہ بعض مقامات پر تو خواص سراسیمہ اور حیران رہ جائیں گے!

یہ کتاب کمیاب ہو گئی تھی تو اسے کمیاب ہی بنے دینا چاہیے تھا، دینی اعتبار سے اس میں خاصہ جھول پایا جاتا ہے، جس کے چند نمونے اُوپر پیش کئے جاچکے ہیں ——— اور اگر "اللجنۃ العلمیہ" کے ارکان اس کتاب کی تجدید اشاعت پر کسی طرح صبر ہی نہیں کرسکتے تھے، تو اصل کتاب کو جوں کا توں نہیں چھاپنا چاہیئے تھا، اس کے کمزور مضامین ضرور چھانٹ دینا چاہیئے تھے!

تنقید کے آغاز میں ہم نے لکھا ہے کہ "التکشف" نے تصوف کی بہت سی الجھنوں کو سلجھایا ہے ——— مگر اتنا ہی بعض الجھنیں ڈالی بھی ہیں! اور بعض مقامات سخت قابل گرفت ہیں۔

اسوۂ حسنہ | مرتبہ:۔ صفوۃ الرحمٰن صابر۔ مدیر "الحق" ضخامت ۲۴۶ صفحات (بڑا سائز) قیمت:۔ دو روپے چار آنے۔
ملنے کا پتہ:۔ ادارہ اہل سُنّت و جماعت کمان سلطان شاہی حیدرآباد دکن ۲ (بھارت)

سرکار ختمی مرتبت سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ مولانا صفوۃ الرحمٰن صاحب صابر نے بڑے دل نشین، عام فہم، سادہ و اثر انگیز انداز میں مرتب کی ہے! فاضل مرتب نے ضعیف، کمزور اور مشتبہ روایتوں کو ہاتھ نہیں لگایا احادیث و سیر کی زیادہ سے زیادہ مستند و قابل اعتماد روایتیں اس کتاب کی زینت ہیں! ان واقعات و روایات کے تھما سا تھ لائق مؤلف شرک و بدعت اور غلط طریقوں کا بھی رد کرتے گئے ہیں! اس چیز نے کتاب کو اور زیادہ مفید اور یقین افروز بنا دیا ہے!

مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات عبادت کا ذکر کرتے ہوئے، لکھتے ہیں:۔

> "کسی روایت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات یا دن کے کسی حصہ میں بھی آنکھیں بند کر کے ذات و صفاتِ الٰہی کے مراقبہ میں بیٹھتے تھے، جیسا کہ صدیوں سے مسلمانوں میں یہ عمل رائج ہے جو غیر مسنون طریقہ ہے"۔ (صفحہ ۱۷۰)

یہ کتاب اللہ اور رسول کی محبت دل میں پیدا کرتی، پاکبازی و تقویٰ کے لئے اُبھارتی، آخرت کے محاسبہ کا احساس دلاتی اور اتباع رسول کی بجھتی ہوئی چنگاریوں کو ہوا دے کر انہیں گرم و روشن بناتی ہے۔ یہ کتاب زیادہ سے زیادہ تعداد میں اشاعت کی مستحق ہے!

"۔۔۔۔ اور بدر جو مدینہ سے ۸۰ میل پر ایک گاؤں کا نام ہے"۔ (ص ۹۳) یہ تحدیدِ مسافت کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے، بدر

(بقیہ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

اُردو علم ہجا اور علم عروض جدید

از:- خاں صاحب عبدالرحمٰن خاں، ضخامت ۲۰۴ صفحات، قیمت: ایک روپیہ آٹھ آنے
ملنے کا پتہ:- مصنف سے، محلہ ٹوبچیاں، مکان ۵۲۵، بہاولپور

اس کتاب کے پہلے حصہ میں "علم ہجا" سے بحث کی گئی ہے، اور "آواز حروف سے لے کر "اُردو رسم خط جدید تک" دسیوں فنی ابواب پر یہ حصہ مشتمل ہے! کتاب کا دوسرا حصہ "علم عروض" پر ہے۔

"اُردو شعرا نے زیادہ سے زیادہ دو سو بحروں میں شعر کہے ہیں، لیکن ہماری بحروں کی تعداد چالیس لاکھ سے زیادہ ہے" (صفحہ ۱۱۲)

یہ اطلاع معلومات آفریں بھی ہے اور وحشت ناک بھی ہے! مصنف نے عروض کی متداول و مشہور اصطلاحوں وتد، سبب وغیرہ کی جگہ دوسری اصطلاحیں تصنیف کی ہیں! مثلاً سالم اصغر، سالم متوسط، سالم اکبر! انھوں نے تجزیہ عروضی اس انداز پر کیا ہے:

عبدالکریم :- { تجزیہ لفظی :- عب ڈل کَ رِی ۔ مْ
تجزیہ عروضی :- مل مل نہ مل ۔ نہ }

یہ "مل مل نہ" انشاء اللہ خاں انشا کے "پری چہم" کے قبیل کی "جدت" ہے، جو مقبول نہیں ہو سکتی، اور اہل علم نے اُسے ایک "لطیفہ" سے زیادہ حیثیت نہیں دی۔ مصنف نے دعویٰ کیا ہے کہ ہم ایسا طریقہ درج کئے دیتے ہیں کہ ایک غیر شاعر اور ناموزوں طبع شخص بھی شعر بنا سکتا ہے!

اس کتاب میں تقطیع مروجہ کے مقابلہ میں جدید تقطیع پیش کی گئی ہے۔

مثلاً - ؏ ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا...... اس کی مروجہ تقطیع یوں ہے:

مفعول فاعلاتن　　مفعول فاعلاتن

لیکن اس کتاب میں "جدید تقطیع" یوں کی گئی ہے۔

فعلن فعول فعلن، فعلن فعول فعلن

مروجہ نام اس بحر کا ہے - رمل مثمن مشکول۔ مصنف نے جدید نام "بحر ششش رکنی، رکان چہار حرفی سالم" رکھا ہے
صفحہ ۱۲۶ پر ؏ تلخ ہے اب آٹھوں پہر مشق تصور
کی تقطیع (جدید) فعلن، فعولن، فاعلن، فعلن، فعولن، فعلن ——— اور تقطیع مروجہ، مستفعلن، مستفعلن، مستفعلن، مستفعلن کی گئی ہے، جو غلط ہے!

؏ بحر ہی جب نہ رہے کیا فیض آباد رہے (صفحہ ۱۲۷) ؏ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے کوئی ہیں معنیٰ عرفاں ہی (صفحہ ۱۲۷)
؏ ابھی بھی حلال قاضیوں کو سے سرح آب زر نہ ہوئی (صفحہ ۱۲۷) جیسے مصرعے اگر کسی طرح کھینچ تان کر عروض کے مطابق بھی ثابت کر دیئے جائیں، تو ذوقِ شاعرانہ کے نزدیک یہ ناموزوں ہی رہیں گے! حد ہو گئی! "عروضی گورکھ دھندے" کی کہ دنیا کی آرزو ۔ نہ دین کی آرزو ——— اس تک کو مصرعہ بنا کر، اس کی تقطیع کر ڈالی!

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) مدینہ طیبہ سے تقریباً اسی (۸۰) میل ہے ——— اسی طرح مکہ سے مدینہ کی مسافت تین سو میل لکھی ہے، جو اصل مسافت سے زیادہ ہے ——— "وتذھب ریحکم" کا ترجمہ "اور تمہاری ہوا بگڑ جائے گی" کے بجائے "اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی" ہونا چاہئیے۔ دو تین جگہ "واؤ عطف" کا استعمال غلط ہوا ہے ——— اس طرح "تیر و پتھر"!!

مصنف کے شاعرانہ ذوق (؟) اور موزونئ طبع کا اس سے پتہ چلتا ہے کہ صفحہ ۱۳۲ پر یک شعر اس طرح درج کیا ہے ؎

میدانِ شاعری تنگ نیست
دپائے شاعراں لنگ نیست

خس وخاشاک

از:- سبطین احمد، ضخامت ۲، صفحات (مجلد) قیمت :- ایک روپیہ چار آنے۔
ملنے کا پتہ :- نظامی پریس، بدایوں (بھارت)

یہ جناب سبطین احمد، بی ملے، بی، ٹی (علیگ) کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ سبطین کی نظموں میں خاصہ تنوع پایا جاتا ہے "دکھیا ری کی چکی" "اثر انگیز نظم ہے۔ ان کے کلام میں پختگی اور مشاقی ملتی ہے، فارسی غزلوں کا لہجہ خاص طور سے مترنم و رواں ہے۔ اس مسلسل غزل کے یہ شعر کس قدر شگفتہ اور کیف انگیز ہیں ؎

درخلوتِ شب ہم نشیں، مست شبابے نازنیں
از بادہ ہا پرجوش تر، از شیشہ ہا نازک ترے
میتو بہاے، نوسے، بالا بلندے، سرکشے
شاخ گلے نورستۂ، تازہ نہالے نو برے

چند منتخب شعر ؎

جس سے سیراب صحرا کے صحرا ہوتے　　ایسے بارانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
حق کے انعامِ آخر پہ بے حد درود　　سب کے اتمامِ نعمت پہ لاکھوں سلام
دامن ز دستِ شوق کشیدہ بھی روی　　آخر نہ بودۂ و دیدہ بھی روی
سمجھتا ہوں ترے فردا کا مطلب او وفا دشمن　　مجھے صبر آگیا، تو وعدۂ دیدار رہنے دے
لحد میں جا سوتے یا الٰہی! عزیز دغم خوار کیسے کیسے　　کہ جب کبھی یاد آگئے ہیں تو پہروں نیندیں اُچٹ گئی ہیں
آکہ میری زندگی ناکام ہے تیرے بغیر　　زندگی کیا، زندگی کا نام ہے تیرے بغیر
نگاہوں نے تیری فسوں کر دیا　　محبت کو آخر جنوں کر دیا
ڈوبنے کے واسطے گرداب کچھ لازم نہیں　　چھوٹ جاتے ہیں کبھی پتوار ساحل دیکھ کر
مجھے دنیا سے نفرت ہے مگر تم سے محبت ہے　　تمہیں بے مہر ہو جاؤ تو دنیا مہرباں کیوں ہو
عشق بھی چاہتا ہے رسوائی　　حسن ہی خود نما نہیں ہوتا
بیگانہ وار بیٹھے ہیں اس انجمن میں ہم　　اک آرزوئے پرسشِ پنہاں لئے ہوئے
وہ حرم دے جو رازِ فنا کھول دے　　جو فردا کے بندِ قبا کھول دے
اے شمعِ محبت! تو روشن ہے کہاں جانے　　دیکھ آئے یہاں گھر گھر تجھ کو ترے پروانے

دوسرا رُخ :-

شعب میں قید اور خشک چمڑا غذا　　ان کی صبر و قناعت پہ لاکھوں سلام　　(صفحہ ۲)

شعب ابی طالب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غذا خشک چمڑا نہیں تھی، ایک صحابی کے ساتھ البتہ ایک شب میں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔

ہائے مجھے ڈبو گئیں، لذتِ زیست کھو گئیں — حیف تمام ہو گئیں راز کی پردہ داریاں (صفحہ ۳)

"حیف تمام ہو گئیں راز کی پردہ داریاں" اس سے آخر کس مفہوم کی ترجمانی مقصود ہے!

کچھ تو ہو بہر دلدہی، ظلم ہو دیکھ تو سہی — میری وفا پرستیاں، اپنی جفا شعاریاں (صفحہ ۱۴)

مصرعہ اولیٰ کس قدر کمزور ہے!

بادہ کش میں، ساقی بدست میں — امتیاز یہ بھی دشوار ہے (صفحہ ۷)

خیال کے اظہار کے لئے مناسب الفاظ نہیں ملے!

اے سوزشِ پنہانی، کب تک یہ گراں جانی — تن پھونک دے آہوں سے، قسمت میں اجارہ کر (صفحہ ۸)

اگر یہ کتابت کی غلطی نہیں ہے تو "قسمت میں اجارہ کر" مہمل ٹکڑا ہے۔

حیران کر دیا ہے اسرارِ زندگی نے — شرمندہ کر رہی ہے مجھ کو زبان دہن میں (صفحہ ۱۰)

یہ آخر بات کیا کہی ہے!!

دجانِ منتظر تو مایوس ہو کے چل دی — اب بعدِ مرگ لاشہ تڑپا کرے کفن میں (صفحہ ۱۰)

جان نکل جانے کے بعد، لاشہ کفن میں کب تڑپتا ہے، آخر شاعر کیا کہنا چاہتا ہے، ہاں قتل و ذبح ہونے کے بعد لاش کچھ دیر ضرور تڑپا کرتی ہے، مگر "کفن" نے اس تاویل کے لئے بھی گنجائش نہیں چھوڑی۔

تعریفِ جمال کچھ نہ پوچھو! — آنکھوں میں سمائے جا رہے ہیں

مصرعہ اولیٰ افسوس ہے مصرعہ ثانی کے جوڑ کا نہیں ہے۔

دنیا سے تو بنتی ہے کچھ زندگانی — جہاں ٹوٹ جاتے ہیں سارے سہارے (صفحہ ۵۰)

پہلا مصرعہ نو مشقوں کے کہنے کا تھا!

صد پاش ہے دل غم سے یاں ذکرِ مسرت کیا — صہبا کو ترستے ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانے (صفحہ ۷)

"صد پاش" نہیں "صد ریش" ہوگا، کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

شادی بیاہ پر سہرے اور گھریلو تقریبوں پر جو نظمیں کہی جاتی ہیں وہ عام طور پر رسمی اور واجبی سی ہوتی ہیں۔ مگر سبطین صاحب کی ان نظموں میں شاعرانہ لطف پایا جاتا ہے۔

سراج البلاغت

از:- ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ حسینی، ضخامت ۲۱۰ صفحات۔ قیمت:- دو روپے (کاغذ، کتابت، طباعت ہر چیز خوب سے خوب تر)

ملنے کا پتہ: مصنف سے، جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن (آندھرا، بھارت) کے پتہ پر!

سراج البلاغت کا دوسرا حصہ ہمارے سامنے ہے، جسے ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ حسینی (آنریری ریسرچ پروفیسر فارسی جامعہ عثمانیہ نے) بڑی کاوش و محنت سے مرتب فرمایا ہے! اس ایک کتاب کے لئے عربی و فارسی کی تقریباً ساٹھ کتابوں سے انھوں نے استفادہ کیا ہے بلکہ اُن کا عطر کھینچا ہے۔

صنائع لفظی و معنوی اور علمِ بدیع پر یہ بہت کارآمد کتاب ہے، اطناب کے مقابلے میں ایجاز کو مدِ نظر رکھا ہے — ایک اقتباس :—

تجرید

"شاعر اس صنعت میں اپنے کو غیر فرض کر کے، مخاطب کرتا ہے، مگر اس سے مقصود اس کی ذات ہوتی ہے، اس کو عربی میں :

"خطاب الشاعر لنفسہ"

بھی کہتے ہیں ——— مثالیں :—

عربی :— لَا خَیْلَ عِنْدَکَ تُہْدِیْہَا وَلَا مَالُ
فَلْیُسْعِدِ النُّطْقُ اِنْ لَمْ یُسْعِدِ الْمَالُ

فارسی :— ——— حافظ! وظیفہ تو دعا گفتن است و بس
در بندِ آں مباش کہ نشنید یا شنید

اُردو ——— رات ساری تو کٹی سنتے پریشاں گوئی
میر جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

لف و نشر، تجنیس، توشیح، سیاقۃ الاعداد، تلمیح، تنسیق الصفات، حسنِ تعلیل، ایہام، گریز، قول بالموجب ..... جیسی صنعتوں سے اوسط درجہ کی تعلیم و قابلیت کے لوگ کسی نہ کسی حد تک مانوس اور آشنا ہیں! ——— مگر "رد العجز علی الحشو مع التکرار" ——— "ترافق" ——— "تنکیت" ——— "سوق المعلوم" ——— "تلوینِ متلون" اور "افشان" جیسی صنعتوں کے نام اچھے خاصے لکھے پڑھے لوگ سن کر کانوں پر ہاتھ دھریں گے!

کلام میں ایسے الفاظ لانا جن کا ایک حرف منقوط اور دوسرا مہمل (بے نقطہ) ہو — مثلاً : سنے ہے رُخ کر و شد چمن آبگیر (اقطار) ——— یا ایسی نثر و نظم لکھنا جس میں کوئی حرف نقطہ دار نہ ہو — مثلاً :

اور کسکا آسرا ہو، ہر گروہ اس راہ کا　　　آسرا اللہ کا آلِ رسول اللہ کا

یا ایسے الفاظ لانا جن کے سب منقوط حروف کے نقطے اوپر ہوں، مثلاً :

وہ خوں فشاں، وہ شعلۂ آتش وہ دم وہ خم
وہ قہرِ حق وہ آفتِ تازہ وہ تازہ دم　　　(فوق النقاط)

یا کلام میں ایسے حروف لانا کہ تلفظ کے وقت لب آپس میں نہ ملیں ——— مثلاً :—

جی سے کہہ دو کہ آہِ سرد کے ساتھ　　　ٹھنڈے ٹھنڈے چلے تو چل نکلے　　　(واسع الشفتین)

یا کلام میں ایسے حروف استعمال کئے جائیں کہ تلفظ میں سب آپس میں ملے رہیں، مثلاً :—

بپت من مبدم فریب مدہ　　　بلبِ من لبِ پیالہ بدہ　　　(واصل الشفتین)

اس قسم کی صنعتوں میں الجھنا، وقت اور ذہن کو ضائع کرنا ہے، ان صنائع کو عوام و خواص میں قبولیت حاصل نہیں ہوتی اور اس ہمارے دور میں تو اہلِ ادب و دانشوران کو ہاتھ تک نہیں لگاتے، اس کتاب میں اس قسم کی صنعتوں کے ذکر سے نثر و نظم

کے قدیم تکلفات کی یاد تازہ ہوگئی۔

نئے کردار

از:۔ مائل خیرآبادی، ضخامت ۱۰۲ صفحات، قیمت:۔ ایک روپیہ۔
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ فردوس، ہمایوں باغ، کان پور۔

اس کتاب میں جناب مائل خیرآبادی کے نو افسانے شامل ہیں، جو سب کے سب تعمیری، اخلاقی اور اصلاحی ہیں، زبان شستہ، پلاٹ مربوط اور طرز ادا دل نشین ہے، ان کے پڑھنے سے ایک طرف ادبی ذوق کی تسکین ہوتی ہے دوسری طرف دل و دماغ اخلاق و نیکی کے اثرات قبول کرتے ہیں، افسانہ کے محاذ پر اخلاق و شائستگی کے ان مورچوں کی سخت ضرورت تھی (فجزاہ اللہ تعالیٰ خیر الجزاء) دو افسانوں کے عنوان کھٹکے ——— "قرض کی ادائیگی" اور "قرض کی ادائیگی" ——— یہ نام دوسرے ایڈیشن میں بدل دینے چاہئیں۔ ان ناموں میں "افسانویت" نہیں پائی جاتی۔

حجۃ المصطفیٰ

از:۔ امام محب الدین الطبری (المتوفی سنہ ۶۹۴ھ) مترجم:۔ مولانا محمد جیلانی (قیمت درج نہیں)
ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ المجلس نور بھائی لوٹیا بلڈنگ، بندر روڈ، کراچی۔

جناب عبدالکریم اسماعیل مرچنٹ (ایم، اے، ایل، ایل، بی) کی سرپرستی میں "المجلس" کے نام سے ایک علمی ادارہ قائم ہوا ہے جس کا مقصد علوم اسلامی کی ترویج و اشاعت ہے، یہ کتاب اسی ادارے کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ ...... اس کتاب میں علامہ محب الدین الطبری نے رسول اللہ کے حج کی مبارک تفصیلات مستند اور صحیح حدیثوں سے جمع کی ہیں جس کا اردو ترجمہ عام فہم انداز میں مولانا محمد جیلانی (کامل فقہ میرہ) نے کیا ہے اور ترجمہ کی تصحیح ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے فرمائی ہے، کتاب شروع سے لے کر آخر تک مفید ہی مفید ہے!

خاص نمبر "رضوان"

مدیر:۔ محمد ثانی حسنی، معاون:۔ امۃ اللہ تسنیم، ضخامت ۱۴۰ صفحات، دیدہ زیب سرورق، خاص نمبر کی قیمت: ایک روپیہ چندہ سالانہ ہندوستان سے تین روپیہ۔ پاکستان سے تین روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر ماہنامہ "رضوان" ۱۴ گوئن روڈ لکھنؤ، پاکستان میں ترسیل کا پتہ:۔ ادارہ نشر و اشاعت اسلامیات متصل خیر المدارس، ملتان۔

ماہنامہ "رضوان" مسلم خواتین کا ترجمان ہے جو مسلمان عورتوں کی دینی تربیت کا اہم فریضہ انجام دے رہا ہے، یہ خاص نمبر بڑے اہتمام سے نکلا ہے نثر و نظم کے تمام مضامین خوب ہیں، جن کے مطالعہ سے اخلاق و تقویٰ کو غذا ملتی ہے۔ "رضوان" اس کا مستحق ہے کہ ایک ایک مسلم گھرانے میں اسے پہنچایا جائے۔

اسلام — ایک عظیم جدوجہد

از:۔ وحید الدین خاں، ضخامت ۳۲ صفحات۔ قیمت: ۳۲ نئے پیسے
ملنے کا پتہ: مکتبہ جماعت اسلامی ہند، رامپور۔

جناب وحید الدین خاں صاحب نے بڑی تیزی کے ساتھ ادب و انشا کی منزل میں ترقی کی ہے، اللہ تعالیٰ کا اُن کے حال پر بڑا فضل ہے کہ اُن کی یہ ترقی اور ادبی صلاحیتیں دین کے کام آ رہی ہیں، اس کتابچہ میں انھوں نے اسلام، ایمان، خوفِ خدا اور ہجرت کے تقاضوں کو اس قدر دل نشین انداز میں پیش کیا ہے کہ سخت سے سخت دل بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کتابچہ کو پڑھ کر آخرت کے محاسبہ کا احساس تیز تر ہو جاتا ہے! ...... کتاب ان جملوں پر ختم ہوتی ہے:۔

> "ہماری زندگی کی مثال برف بیچنے والے دکاندار کی ہے جس کا اثاثہ ہر لمحہ پگھل کر کم ہوتا جا رہا ہو اور جس کی کامیابی کی شکل صرف یہ ہو کہ وقت گزرنے سے پہلے اپنا سامان بیچ ڈالے ورنہ آخر میں اُس کے پاس کچھ بھی نہ ہوگا، اور دکان سے اس کو خالی ہاتھ اٹھ کر جانا پڑیگا ... ہمارے لئے سرمایہ ہماری قوتوں اور صلاحیتوں کا صحیح مصرف سوچ میں ہم سب کے ایک نازک کاشت کے سامنے کھڑا ہوتا ہے، بڑے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اپنے سب کچھ پاس اس حال میں پہنچیں کہ دنیا میں وہ حق کے لئے اپنا سب کچھ لٹا چکے تھے کیوں کہ اللہ تعالیٰ سب سے پہلے انہیں پر نظر کریگا۔"

پیامِ جاوید (حصہ اول) از:- عبدالرحیم جاوید الہ آبادی، ضخامت ۸۰ صفحات (بڑا سائز) رنگین سرورق۔
قیمت:- ایک روپیہ چار آنے۔ ملنے کا پتہ:- عالمی کتب خانہ اندرون شیر نواز دروازہ۔ لاہور

یہ جناب جاوید الہ آبادی کا مجموعۂ کلام ہے، جس پر چند سطروں کی تقریظ حضرت مولانا احمد علی (امیر انجمن خدام الدین شیر نوازہ
دروازہ لاہور) نے تحریر فرمائی ہے، اور تعارف لکھنے والے کوئی صاحب ڈاکٹر صمام گنجوی ہو میو وزیر آبادی ہیں، جن سے جاوید صاحب
کو شرفِ تلمذ حاصل ہے اس "تعارف" کا یہ رنگ ہے:-

"جاوید کو بچپن ہی سے دردِ قوم کا مرض لگ چکا تھا........ اور یہ چنگاری (یعنی شاعری
کی چنگاری) جب کسی کی فطرتِ سلیمہ میں بیٹھتی ہے تو اُسے اُسی رنگ کی جلن جلاتی رہتی ہے
اس کم عمری میں جاوید صاحب کا ایسے ایسے ناقابلِ تسخیر مقامات حاصل کر لینا، قدرت کاملہ
کی نوازشات کا بین ثبوت ہے ...."

ستاد کی نثر کے اس نمونہ سے شاگرد کے ذوقِ شعری کا تھوڑا بہت اندازہ کیا جا سکتا ہے! جاوید صاحب کے بعض اشعار سادہ و رواں بھی
ہیں، مگر مجموعی طور پر اُن کے یہاں خاصی ناپختگی اور شعریت کی کمی پائی جاتی ہے، لیکن اُن کے استاد نے انہیں یہ باور کرا دیا ہے کہ تم بہت
بڑے شاعر ہو اور شعر و سخن کے ناقابلِ تسخیر مقامات سر کر چکے ہو۔

نہ اتراؤ جہاں والو اسے مدہوش مت سمجھو دو عالم کی خبر رکھتا ہے دیوانہ محمدؐ کا (صفحہ ۲۰)

"نہ اتراؤ" کا یہاں کیا محل تھا؟ "طنز نہ کرو، مذاق نہ اڑاؤ، یا پھبتیاں چست نہ کرو" کے مفہوم کی ترجمانی "نہ اتراؤ" کہہ کر فرمائی گئی ہے۔

ہے کحل البصر اُسکی خاکِ کفِ پا جو دیکھ آیا اک بار رستے مدینہ (صفحہ ۲۱)

"رستے مدینہ" کی جگہ "کوئے مدینہ" نظم کرنا تھا، یا مصرعہ کم از کم اس انداز کا ہوتا:- ع

جو ہو آیا اک بار سوئے مدینہ

صفحہ ۲۹ پر "مرحب" کو "مرہب" کتابت کیا گیا ہے، اس غلطی کا ذمہ دار بیچارے کاتب ہی کو ٹھہرایا جائیگا۔

زنا، بیخواری، رشوت، دغابازی کا غل ہوگا یہ انساں ہی کرے گا کارِ شیطاں ہم نہ کہتے تھے (صفحہ ۳۰)

"غل ہوگا" نے پورے شعر کو چکنا چور بنا دیا! مصرعہ ثانی غنیمت ہے مگر مصرعہ اولیٰ میں شعریت کا دور دور پتہ نہیں۔

سینما ہے یا بت ان آذری کی ہے نمود! کچھ نہیں اس کے سوا ہے مرکزِ عیش و سرور (صفحہ ۳۲)

دوسرے مصرعہ کو شاعری کے ابجد خواں بھی اپنے سے منسوب کرتے ہوئے غالباً شرمائیں گے!

تجھے لاریب لے لے گا خدا آغوشِ رحمت میں
جبیں تیری ندامت سے جو عرق آلود ہو جائے (صفحہ ۴۸)

عرق کو "عرق" کے صحیح تلفظ کا بھی پتہ نہیں ہے! جاوید صاحب نے فارسی زبان پر بھی کرم فرمایا ہے۔ اُن کی غزل کا ایک مصرعہ:-

اُف لرزی کہ نبض گرفتہ طبیب گفت ایں مرض عشق ہست دوائے تو چہ کنم (صفحہ ۹)

اس "مرض" بروزن "فرض" کا بھی کوئی جواب ہے! پوری غزل فارسی زبان کے ساتھ مذاق ہے!

دور کر سودائے حق بینی کو تو جلوہ ہائے نورِ حق را می نگر (صفحہ ۵۵)

فارسی میں شعر کہنے کی ہوس ———— مگر "می" کا استعمال تک نہیں معلوم! "بنگر" کی جگہ "می نگر" لکھ مارا!
ے توبہ خبردار" اور جس نظم کی ردیف "ساقی" ہے، ان دونوں کے بعض اشعار غنیمت ہیں! دوسری نظموں میں کم سے کم یہ رنگ تو قائم رہتا!

اقسام القرآن

تالیف :- مولانا حمید الدین فراہیؒ، ترجمہ :- مولانا امین احسن اصلاحی، ضخامت ۴۳ صفحات، قیمت :- ایک روپیہ تیرہ نئے پیسے ! ملنے کا پتہ :- دائرہ حمیدیہ مدرستہ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ (بھارت)

حضرت مولانا حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ قرآنی علوم میں امامت کا درجہ رکھتے تھے، "تفسیر فراہی" جن اشخاص کی نگاہ سے گزری ہے وہ ہماری اس رائے سے ضرور اتفاق کریں گے ! مولانا مرحوم کی یہ کتاب ـــــ اقسام القرآن ـــــ بھی اپنے موضوع پر منفرد کتاب ہے انھوں نے اس کتاب میں "اقسام القرآن" سے بحث کرتے ہوئے، یہ ثابت کیا ہے کہ اللہ کی ذات اور شعائر کے علاوہ قرآن پاک میں جو دوسری قسمیں (مثلاً والتین والزیتون . . . . وغیرہ) پائی جاتی ہیں، وہ ان چیزوں کی تعظیم کے لئے نہیں ہیں، بلکہ "استدلال" و "شہادت" کے لئے لائی گئی ہیں۔ بلکہ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں انھوں نے شعراء جاہلیت کے کلام سے ثبوت فراہم کئے ہیں، اور اس مسئلہ میں مولانا فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے پر سخت گرفت کی ہے اور علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی تحسین کرتے ہوئے ان کی رائے کے ضعف کو بھی دکھایا ہے۔

"والنجم" اور "والفجر" کا عام مفسرین "اور قسم ہے "نجم" کی اور قسم ہے فجر کی" ترجمہ کرتے ہیں مگر مولانا فراہی نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے ـــــ "شاہد ہے فجر، شاہد ہے ثریا (نجم)" "اِلْعَامُ" کو وہ بھی "قسم کے مفہوم" میں داخل کرتے ہیں۔

قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّا اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ـــــ کا انھوں نے ترجمہ یہ نہیں کیا "کہ ہمارا پروردگار جانتا ہے"۔ اس کا ترجمہ انھوں نے ان لفظوں میں کیا ہے :-

"کہ ہمارا پروردگار شاہد ہے کہ ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں"۔

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ قرآن کریم کے "نظم و ربط" میں غیر معمولی بصیرت رکھتے تھے، یہ اُن کا خاص موضوع تھا۔ اسی قرآنی بصیرت کے اعتماد پر انھوں نے عام مفسرین اور اہل علم کی لغزش پر احتساب کیا ہے :-

"....نظم قرآن کے باب میں بھی ان حضرات سے یہی لغزش ہوئی قرآن میں نظم اکثر مقامات پر بالکل واضح ہے، صرف تھوڑے مقامات ایسے ہوں گے، جہاں واقعی اشکال ہے ایسے مواقع میں ان لوگوں کے لئے صحیح رائے یہ تھی کہ اپنے عجز کا اعتراف کر کے معاملہ کو علم الٰہی کے حوالے کرتے، جیسا کہ بعضوں نے کیا، لیکن ان لوگوں نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ ایسے مواقع میں نظم قرآن کی نفی کردی، ظاہر ہے کہ یہ نفی نظم کلی کی نفی تھی، لیکن عوام نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ قرآن میں نظم کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے، سارا قرآن یکسر پراگندہ و منتشر ہے"۔

یہ کتاب اپنے موضوع پر ہر اعتبار سے ممتاز و منفرد ہے، ترجمہ دل نشین اور عام فہم ہے، مولف مترجم اور ناشر ہیں ان سب کو اللہ تعالیٰ قرآن کریم کی اس خدمت پر اجر جزیل عطا فرمائے گا۔

ماہر القادری

ماہِ مارچ سنہ ۱۹۶۰ء

ترتیب

قیمت سالانہ: چھ روپے ـــــــــ فی پرچہ: آٹھ آنے

مقامِ اشاعت:- دفتر فاران کیمبل اسٹریٹ، کراچی نمبر ۱

مطبوعہ مطبع سعیدی کراچی ـــــ پرنٹر و پبلشر:- مسرور حسین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اول

جس طرح آفتاب خود اپنی ذات سے اپنے وجود پر دلیل ہے، اسی طرح اردو زبان اپنی ہمہ گیری اور قبولِ عام پر کسی خارجی دلیل کی محتاج نہیں ہے، اس حقیقت میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان میں جو زبان تمام علاقائی زبانوں سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے ـــــ وہ اردو اور صرف اردو ہے! علاقائی زبانیں تو وہ کہلاتی ہیں، جو ایک خاص خطہ میں بولی جاتی ہیں، اور اُن خطوں سے باہر نہ انہیں کوئی بولتا ہے نہ سمجھتا ہے! مثلاً ہندوستان میں تلنگو اور تامل زبانیں جنوبی ہند کے خاص خاص خطوں تک محدود ہیں، ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے لئے یہ زبانیں بالکل اجنبی ہیں، اسی طرح پشتو، سندھی، اور ملتانی مخصوص علاقوں کی زبانیں ہیں، پشتو کے علاقہ کے لئے سندھی اور سندھی علاقہ کے لئے پشتو اجنبی زبان ہے! مگر اردو پاکستان اور ہندوستان کے کسی خطہ کے لئے اجنبی نہیں ہے اس لئے اردو پاک و ہند کی علاقائی زبان نہیں بلکہ پاکستان و ہندوستان گیر زبان ہے!

انگریز کے زمانہ میں آزادی کی جنگ توپوں، بندوقوں، بھالوں اور تلواروں سے نہیں لڑی گئی، یہ عزم و ہمت اور تحریر و تقریر کی جنگ تھی، اس جنگ میں سب سے زیادہ موثر پارٹ اردو زبان نے ادا کیا ہے، کانگریس اور مسلم لیگ کے وہ تمام لیڈر بھی جن کی مادری زبان اردو نہ تھی۔ عوامی جلسوں میں اردو زبان ہی میں تقریریں کرتے تھے اردو ہی کی نظموں اور گیتوں نے ہندوستان میں آزادی کے جذبہ کو ابھارا تھا۔ اردو زبان ہماری آزادی کی زندہ یادگار ہے، اردو زبان ہم پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کی محسن ہے، اس زبان سے جو کوئی بیر رکھتا ہے، اس کا احسان نہیں مانتا، اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتا ہے اور اس کے توڑ پر کسی علاقائی زبان کو لاتا ہے وہ احسان فراموش بلکہ محسن کش ہے، پاکستان اور ہندوستان میں جو حکومت بھی اردو زبان کو اس کا جائز حق دیتے ہوئے کسمساتی ہے اور سیاسی آنکھ مچولی کھیلتی ہے، وہ حقائق سے گریز کی بڑی مثال قائم کرتی ہے!

اردو زبان کی وسعت و ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ افغانستان، ایران، عراق، حجاز، قطر، عدن، سنگاپور، سیلون اور برما وغیرہ خطوں میں بھی اردو زبان سے اظہارِ مطلب اور بول چال میں کام چل سکتا ہے، اور دنیا کے قریب قریب ہر ملک میں جہاں پاکستانی اور ہندوستانی پائے جاتے ہیں، اردو زبان بھی محدود پیمانہ پر ہی سہی مگر پائی جاتی ہے، انگلستان میں اردو زبان کے عالم موجود ہیں، روس میں اردو کی تعلیم گاہیں کھلی ہوئی ہیں، فرانس اور انگلستان کے مستشرقین نے اردو زبان و ادب کی خدمت کو اپنے لئے باعثِ شرف سمجھا ہے، انگریزوں نے اردو غزلیں کہی ہیں، اردو کو علاقائی زبان کہنا تو ایسا ہی ہے، جیسے سمندر کو کوئی نہر یا جھیل کہہ دے، مگر کسی کے کہہ دینے سے سمندر سمندر ہی رہے گا۔ نہر اور جھیل نہیں بن جائیگا! اردو تو آفاق گیر زبان ہے اور دنیا کی چوٹی کی بین الاقوامی زبانوں میں ممتاز مقام رکھتی ہے، اس زبان نے عجیب معجزہ دکھایا ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں میں اردو سب سے زیادہ کمسن ہے مگر اس کم سنی کے باوجود کسی زبان سے گھٹ کر نہیں ہے بلکہ بعض بڑی بوڑھی زبانیں اس شوخ و کمسن زبان سے کسی کسی بات میں دَب کھاتی ہیں!

جو کوئی اردو زبان کے بارے میں اس تذبذب میں مبتلا ہے کہ یہ زبان دفتروں اور عدالتوں کی زبان بننے کی پوری صلاحیت

رکھتی بھی ہے یا نہیں؟ ———— تو اس شکی اور وہمی آدمی کا حال، اُس سادہ لوح جیسا ہے، جو ایک بیس یا ئیس سالہ تنومند نوجوان کے بلوغ میں شک کرتا ہو! اردو زبان کو اگر آج پاکستان میں نافذ کر دیا جائے، تو دفتروں سے لے کر عدالتوں اور ایوانِ حکومت تک تمام کام انگریزی کے مقابلہ میں زیادہ تیزی، سلیقہ اور خوش اسلوبی کے ساتھ چل سکتا ہے، اب رہی تھوڑی بہت دُشواری تو ایک مکان سے دوسرے مکان میں اُٹھ کر جانے میں کچھ نہ کچھ دشواری تو ہوتی ہی ہے! حکومت کی دفتری زبان کی تبدیلی میں بھی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا مگر یہ دشواریاں بہت جلد سہل ہو جائیں گی! ہر خوشگوار سے خوشگوار تبدیلی بھی اپنے اندر کچھ نہ کچھ دشواریاں رکھتی ہے!

پھر جہاں تک تجربہ و آزمائش کا تعلق ہے عثمانیہ یونیورسٹی اور اس کے ماتحت مدارس و مکاتب میں ادنیٰ درجہ سے لے کر ایم۔ اے اور ڈاکٹریٹ تک اردو زبان ہی ذریعہ تعلیم تھی، حکومت حیدرآباد دکن جس کی آبادی عراق، شام، شرقِ اردن اور لبنان کی مجموعی آبادی سے بھی زائد تھی۔ وہاں تعلیم کے علاوہ دفتروں اور عدالتوں میں بھی اردو کا تجربہ کیا جا چکا ہے۔ یہ تجربہ ہر لحاظ سے کامیاب ثابت ہوا، اس زبان نے اتنی بڑی ریاست کو چلایا ہے اور تنظیم و تہذیب میں وہاں کی عدالتیں اور دفاتر انگریزی حکومت کی عدالتوں اور دفتروں کی برابری کرتے تھے! حیدرآباد اسٹیٹ میں تلنگی اور مرہٹی بولنے والوں کی خاصی تعداد تھی مگر ان لوگوں نے برٹش انڈیا کی دفتری زبان کے مقابلہ میں دفتری کاروبار اور تعلیم کے لئے اردو زبان کو قبول کیا بلکہ پسند کیا، اور اردو زبان نے ان کے دماغوں کو مجلّیٰ اور ان کے فکر و نظر کو مہذب بنا دیا۔

انگریزی زبان کی بین الاقوامی حیثیت اور اُس کی جامعیت کا ہمیں اعتراف ہے، مگر یہ بات بہت کچھ کھٹکتی ہے کہ انگریز کے چلے جانے کے بعد، اس زبان کا تسلط بھی ختم ہو جانا چاہیئے تھا، اور اس کی جگہ اردو زبان کو ملنی چاہیئے تھی کہ یہ "پاکستان گیر" زبان ہے، اپنی زبان میں علوم و فنون زیادہ آسانی کے ساتھ سمجھے جا سکتے ہیں، اور اظہارِ مفہوم و مطالب کا یہ ایسا ذریعہ ہے، جو ہماری فطرت و مزاج کے تقاضوں سے مناسبت رکھتا ہے! اگر اردو کے علاوہ کسی دوسری زبان کا تسلط ہی ناگزیر ہے، تو پھر انگریزی کے بجائے عربی کو یہ منصب ملنا چاہیئے، کہ عربی اُمّ الالسنہ ہے اور کتاب و سُنّت کی مقدس زبان ہے ———— وہ لوگ جن کی نشو و نما انگریزی ماحول میں ہوئی ہے۔ اگر وہ اُردو زبان میں کچے ہیں، تو اُن کو چاہیئے کہ اُردو کی طرف توجہ کریں، تھوڑی سی محنت کے بعد اُن کی یہ کمزوری دُور ہو جائے گی، مگر اُن کی یہ کمزوری انگریزی کی برتری اور اردو کی کمتری کے لئے وجہ جواز ہرگز نہیں بن سکتی۔

رسم الخط اور ......!

اردو رسم الخط کا مسئلہ چڑھتی ہوئی دھوپ کی طرح روشن اور واضح ہے، اس میں ذرہ برابر ابہام اور پیچیدگی نہیں ہے، پاکستان کی اکثریت رسم الخط کے حق میں اپنا فیصلہ دے چکی ہے کہ اس کا رومن رسم الخط سے بدلا جانا کسی قیمت پر گوارا نہیں کیا جا سکتا، ایک سیدھے سادے، سچے، اور صاف مسئلہ کو الجھانا نہیں چاہیئے، رومن رسم الخط اردو زبان کے مزاج و ہیئت اور صورت و معنی کے اعتبار سے قطعاً مختلف و متضاد ہے، اس رسم الخط کے اختیار کرنے سے اردو زبان کا حلیہ ہی بگڑ جائے گا! مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی زبان کا رسم الخط بدل کر جو بھیانک غلطی کی تھی، اس غلطی سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے، ایک با اقتدار شخص کے ذاتی رجحان اور شخصی پسندیدگی کی یہ بہت بڑی مثال تھی۔ پاکستان میں اُردو کو اس صدمہ سے دوچار نہ ہونے دیا جائے گا! چند اُونچے دماغ یقیناً اخلاص و نیک نیتی کے ساتھ رسم الخط کے مسئلہ پر غور کرنے کا حق رکھتے ہیں مگر "چند" کو کروڑوں کی مرضی میں اپنی مرضی کو ضم کر دینے ہی سے ناخوشگواری اور الجھنوں سے بچا جا سکتا ہے!

دوسری زبانوں کے وہ الفاظ جو اُردو زبان کے مزاج سے مناسبت رکھتے ہیں اُردو میں داخل ہوتے رہے ہیں، اور ——— ان "دخیل الفاظ" کا بہت کچھ تعلق غیر زبان والوں کے میل جول سے ہے۔ بیگم، کوکہ، آگا، توزک، اتمغا وغیرہ ترکی الفاظ مغلوں کے دورِ حکومت

کی یادگار ہیں، گوبھی، باشی، بوتام جیسے الفاظ پرتگالیوں کے میل جول کے سبب اردو میں داخل ہوئے اور اسٹیشن، کارڈ، پلیٹ فارم، سگنل انجن، مشین، کوٹ، بٹن، پنسل وغیرہ سینکڑوں الفاظ انگریزی عہد کی باقیات ہیں! پاکستان بننے کے بعد جنگی، ہاری، وڈیرے جیسے الفاظ اردو میں بولے جانے لگے ہیں، مگر نئے لفظوں کے داخل ہو جانے سے نہ زبان بدلتی ہے اور نہ اس طرح کوئی نئی زبان بنتی ہے! زبانیں لوگوں کے بنانے سے نہیں بنا کرتیں، زبانوں کا حال تو خودرو پودوں جیسا ہے جو آپ ہی آپ اگتے ہیں، ہاں! جب یہ پودے بڑے ہو جاتے ہیں، تو قواعد و ادب کی قینچیوں سے ان کی کانٹ چھانٹ کی جاتی ہے تاکہ یہ پھلواری متناسب اور حسین و دلکش ہو جائے اب سے تقریباً تیس سال قبل یورپ میں ایک بین الاقوامی زبان —— اسپرنٹو —— بنانے کی کوشش کی گئی تھی، اس پر لاکھوں روپیہ صرف کیا گیا، مگر یہ مصنوعی زبان نہ چل سکی، اور یہ بچہ غوں غاں بھی نہ کرنے پایا تھا کہ موت کی نیند سو گیا، پاکستان میں بھی نئی زبان بنانے کی کوشش میں وقت، روپیہ اور انرجی کو صرف نہیں کرنا چاہیے!

زبانوں کے مستقبل کا حال تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے مگر دنیا کی مشہور زبانوں کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو زبانیں بننا تھیں وہ بن چکیں، اردو دنیا کی آخری زبان تھی، اس کے بعد نئی زبانوں کی صنعت کا کارخانہ ہی غالباً قدرت نے بند کر دیا۔

اردو زبان فطری مرحلوں سے گزر کر گردش روزگار کے بہت کچھ سرد و گرم دیکھ کر اور بہت سی مشقتیں جھیل کر، اب جس مقام پر پہنچی ہے، وہ معیاری زبان کا مقام ہے، جو زبان ان دنوں بولی اور لکھی جا رہی ہے اس کو آسان اور سہل بنانے کی کوشش ایک غیر فطری کوشش ہوگی، آج کی اردو جو یقیناً پچانوے فیصدی مستقبل کی بھی اردو ہے، عام بول چال میں سہل ہی بولی جاتی ہے، اس سے زیادہ سہل اور کیا ہوگی!۔

"پانی پیتے میں مجھے اچھو لگا، اور میرا سانس نیچے کا نیچے اور اوپر کا اوپر رہ گیا"

—— یہ ——

عوامی بول چال ہے، اس خیال کو عربی مدرسہ کا کوئی عالم بھی یوں ادا نہیں کرتا:۔

"مجھے آب (یا ماء) نوش کرنے میں غصہ لگا، اور میرا نفس تحت کا تحت اور بالا کا بالا رہ گیا"

آسانی کے ساتھ اردو کا یہ بھی روزمرہ ہے:۔

"اس کتاب کے پہلے ورق ہی کا دوسرا صفحہ چھپائی میں خراب ہو گیا ہے"

اس جملہ میں کتاب، ورق، صفحہ، خراب عربی کے الفاظ ہیں، مگر ایک قلی اور رکشا والا بھی ان لفظوں کے معنی جانتا ہے! افسانوں اور ناولوں میں عام طور پر آسان زبان ہی استعمال کی جاتی ہے، لفظ "آسان" سے یہ دھوکا نہ ہونا چاہیے کہ اردو کے افسانہ نگار اور ناول نویس معیاری زبان کو بالقصد آسان و سہل بنانے کی کوشش کرتے ہیں اگر وہ ایسا کریں تو اُن کی تحریروں میں روانی اور بے ساختگی باقی نہ رہے اور اس کی جگہ آورد و تکلف آ جائے! ہاں! بچوں کے لئے کوشش کرکے آسان زبان میں کتابیں لکھی جاتی ہیں اور لکھی جانی چاہئیں!

جہاں تک علمی و فنی اصطلاحوں کا تعلق ہے، اُن میں وہی زبان استعمال ہوتی ہے جو اس علم و فن کے شایانِ شان ہے بلکہ یوں کہئے اس کے لئے ناگزیر ہے، مثلاً شعر و سخن کے تذکروں میں —— بحور، اوزان، قوافی، ایطاء، تنافر، ضعف تالیف، فلسفہ کا بیان کرتے ہوئے —— علت و معلول، جوہر و عرض، عینیت و غیریت —— تصوف کے ضمن میں سکر و صحو، شطحیات، وحدت الوجود، تزکیہ نفس —— حدیث و فقہ کے بیان میں —— درایت، معضل، ارسال،

باحت، استحباب، تحریم و تنزیہہ ———— فنِ طب کی تشریح میں ———— منفضج، تبرید، خیسا ندہ، تکلیس،
وغیرہ الفاظ اور اصطلاحات ضرور آئیں گی! ان اصطلاحات سے گھبرا کر اپنی ناواقفیت کے سبب کوئی زبان کو آسان بنانے کا مطالبہ
کرتا ہے، تو اسے چاہیئے کہ وہ اس غیر علمی مطالبہ کے بجائے، اپنے علم و مطالعہ کو وسیع کرے!

اردو کا ایک جملہ ہے:-

"آپ کی نبض میں اعتدال باقی نہیں رہا، آپ کو کھانا ہضم نہیں ہوتا آپ جوشاندہ پینا چھوڑ دیجئے"۔

اس جملہ کو کوئی اس طرح آسان بنائے:-

"آپ کی ناڑی برابر نہیں رہی، آپ کو کھانا نہیں پچتا، آپ "اوبلی" پینا چھوڑ دیجئے"۔

تو یہ کوشش زبان کے ساتھ ایک طرح کا مذاق بھی جائے گی! مغلق الفاظ سے بچنا اور چیز ہے اور معیاری زبان کو تکلف کے تقاضا
آسان بنانا اور چیز ہے!

طوالت، درازی اور لنبائی، یہ تینوں الفاظ اردو کے ہی ہیں، کہ اردو میں بلا تکلف استعمال ہوتے ہیں مگر اپنی اصل کے
اعتبار سے پہلا حرف عربی کا، دوسرا فارسی کا اور تیسرا اردو کا ہے! ان لفظوں کے ایک ہی معنی ہیں، مگر ان کا استعمال ایک ہی طرح
نہیں ہوتا۔

"اس مضمون میں طوالت پائی جاتی ہے"۔

اس مفہوم کو کوئی یوں ادا کرے:-

"اس مضمون میں لنبائی پائی جاتی ہے"۔

تو جو بھی سنے گا بے اختیار ہنس دے گا، اسی طرح:-

"میں تمہاری درازی عمر کی دعا کرتا ہوں"۔

———— کو ————

کوئی صاحب اس طرح آسان بنا دیں:-

"میں تمہاری عمر کی لنبائی کی دعا کرتا ہوں"۔

تو یہ زبان کے ساتھ مذاق ہوگا۔

اس مسئلہ کی اتنی تفصیل بہت کافی ہے، مقصود گزارش یہ ہے کہ جو زبان (اُردو) اس دور میں رواج پا چکی ہے، وہی
معیاری زبان ہے، اُسے آسان و سہل بنانے کی جھنجھٹ میں بیٹھے بٹھلائے نہ پڑنا چاہیئے کہ اس چکر میں پھنس کر اردو زبان کی روانی
و دلکشی جاتی رہے گی، اور زبان میں بناوٹ پیدا ہو جائے گی۔

ان چند لفظوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہی وہ حقیقت ہے جسے زبان کے لئے سند کی ضرورت کا ناگزیر ہونا کہا جاتا
ہے، اور یہی وہ زبان و روزمرہ ہے جسے "اہل زبان" سے منسوب کیا جاتا ہے! "اہل زبان" کے نام سے چڑنا یا چیں بہ جبیں نہ ہونا
چاہیئے، دنیا کی ہر زبان میں "اہل زبان" پائے جاتے ہیں، عربی کے لئے حجاز کو، فارسی کے لئے ایران کو اور انگریزی کے لئے انگلستان
کو سند سمجھنا اور وہاں کے رہنے والوں کو اہل زبان کہنا جب کسی کی دل شکستگی اور کمتری کا سبب نہیں بنتا، تو اردو کے لئے دلی اور
لکھنؤ کی زبان کو سند اور معیار اور ٹکسالی زبان ماننے سے، کوئی احساسِ کمتری میں کیوں مبتلا ہو! "اہل زبان" ایک حقیقت

سے یہ کسی پر کوئی طنز اور پھبتی نہیں ہے!

زبان اور اہلِ زبان

جو لوگ "فاران" کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں، وہ ہمارے خیالات، رجحانات اور معتقدات سے واقف ہیں کہ ہم نے نسل و رنگ اور وطن و مرزبوم کی عصبیتوں کی ہمیشہ مخالفت کی ہے، ایک مسلم کی حیثیت سے ہم امتِ مسلمہ کی وحدت پر ایمان رکھتے ہیں، اور زبان، نسل، رنگ، خطوں کی کثرتِ آبادی یا ثروت و خوشحالی کے سبب کسی کو کمتر یا برتر نہیں سمجھتے! بلکہ جہاں تک عام انسانی حقوق اور بھائی چارے کا تعلق ہے "الخلق عیال اللہ" پر ہمارا یقین ہے: ہم آگے چل کر جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، اس کا تعلق "زبان" کے خالص علمی مسئلہ سے ہے!

دنیا کی ہر زبان کا سند و حجت کے لئے کسی نہ کسی مخصوص خطۂ زمین سے تعلق ہوتا ہے انگلستان کی طرح امریکہ کی بھی زبان انگریزی ہی ہے، اور جہاں تک اخباروں، رسالوں اور کتابوں کی اشاعت کا تعلق ہے، امریکہ کے مقابلہ میں انگلستان کی کوئی حیثیت نہیں ہے مگر انگریزی زبان کے لئے آخری سند و حجت انگلستان کو ہی مانا جاتا ہے! انگریزی دور میں خود ہندوستان نے انگریزی زبان کے کیسے کیسے بلند پایہ انشا پرداز، صحافی، ادیب اور مقرر پیدا کئے ہیں کہ ان کی انگریزی دانی کا لوہا انگلستان کے ادیب و انشا پرداز بھی مانتے تھے، سید میر علی، جسٹس محمود، مولانا محمد علی جوہر اور جواہر لعل نہرو کی انگریزی تحریریں، سر سری واس شاستری اور سیتہ مورتی کی انگریزی تقریریں، سروجنی نائیڈو اور نظامت جنگ کی انگریزی شاعری، انگریزی زبان و ادب کے لئے باعثِ نازش و افتخار ہیں، جنوبی ہند کے کوچین اور ٹراونکور وغیرہ علاقوں میں تو انگریزی وہاں کی قریب قریب مادری زبان ہے مگر انگریزی زبان میں اس قدر مہارت اور تبحر کے باوجود ہندوستان اور پاکستان کے انگریزی داں انگلستان ہی کو زبان کے معاملہ میں سند مانتے ہیں، اور انگریزوں کو اہلِ زبان کہتے ہوئے نہ تو شرماتے ہیں اور نہ جذبہ کمتری محسوس کرتے ہیں۔

مسلمان بادشاہوں کے دور میں ہندوستان کی دفتری زبان فارسی رہی ہے، ہندوستان کی خاک سے ایسے ایسے فارسی شاعر اور ادیب اٹھے ہیں کہ جن پر ایران کو ناز ہے اور جن کی ادبی تخلیقات نے فارسی زبان کی آبرو بڑھائی ہے اور فارسی شاعری کو نیا آہنگ عطا کیا ہے مگر زبان کی سند خطۂ ایران ہی سے لی جائے گی! خسرو اقلیم سخن کے شہنشاہ ہیں اور انہیں ایران کے بڑے سے بڑے شاعر کے مقابلہ میں رکھا جا سکتا ہے لیکن زبان کی سند و حجت کے لئے سعدی اور خسرو کے شعروں میں سعدی ہی کو ترجیح دی جائے گی!

زبانوں کے ساتھ یہ عجیب معاملہ رہا ہے کہ زبان و ادب کی علمی خدمت زیادہ تر غیر اہلِ زبان نے کی ہے، عربی لٹریچر میں عرب نژاد شاعروں اور ادیبوں کا بہت کم حصہ ہے، عربی ادب کو عجمیوں نے صاحبِ ثروت بنایا ہے، آج پورے نجد و حجاز میں شاید ایک روزنامہ نکلتا ہے مگر قاہرہ سے عربی کے متعدد روزنامے شائع ہوتے ہیں، جن میں سے بعض تو لندن ٹائمز کی ٹکر کے ہیں، مصر، شام، عراق، لبنان، اردن وغیرہ ملکوں میں عربی کی جتنی کتابیں ایک ہفتہ میں چھپ جاتی ہیں، نجد، حجاز اور یمن میں برسوں میں بھی نہیں چھپتیں، تنہا مصر میں عربی ادب کو جو فروغ ہو رہا ہے، اس کے مقابلہ میں حجاز کی ادبی خدمات صفر کے برابر ہیں، ملک الشعراء شوقی جیسا شاعر اور شکیب ارسلان جیسا ادیب حجاز کے درجنوں شاعروں اور ادیبوں پر بھاری ہیں، جامعہ ازہر، نجد و حجاز کے تمام مجموعی مدرسوں اور دانش گاہوں سے عربی علم و فن کی خدمت میں سینکڑوں منزلیں آگے ہے، مگر اتنا سب کچھ ہوتے ہوئے، زبان کے مسئلہ میں سند و حجت مصر و شام اور اردن و عراق کو نہیں حجاز اور اہلِ حجاز کو ہی سمجھا جاتا ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ زبان پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے، جو اسے بولتا، لکھتا اور اس کے سرمایہ میں اضافہ کرتا ہے، وہی اہلِ زبان ہے؟

یہ بات اس حد تک تو صحیح ہے کہ زبان کسی کی وراثت اور ملکیت نہیں ہوتی جو جس زبان کو بولتا ہے وہ اس کی زبان ہے
ہاں تک زبان کی سند و حجت کا تعلق ہے "اجارہ داری" کا ذکر ایک طنز ہے! اور اہل علم و ادب اور صاحبان قلم سے حقائق کے
ف میں طنز اور پھبتی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ہر زبان مختلف خطوں اور علاقوں میں بولی جاتی ہے، اور یہ سب بولنے والے اس
کے محافظ و نگہبان ہوتے ہیں، مگر انہی میں سند و حجت کے لئے "اہل زبان" بھی ہوا کرتے ہیں، اور "اہل زبان" کا پایا جانا اور
زبان و روزمرہ سے سند لینا عقل و تجربہ، علم و ادب اور زبان و ثقافت کے اصولوں کے عین مطابق ہے! اس معاملہ میں بیچ

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

تعلیوں کو بھی "ظہور خودی" اور "نمود انا" سمجھ کر اس دور کے اکابر نے گوارا کیا ہے، اور اسے اپنے اوپر طنز نہیں سمجھا یہی سبب تھا
ل جیسے رفیع المرتبت شاعر اور عظیم مفکر نے اسی شاعر کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا، جس نے ؎

نہیں کھیل اے داغ! یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے!

ن کیا تھا ـــــ خود یو۔پی کے لوگوں نے دلّی اور لکھنؤ ہی کو زبان کے معاملے میں آخری سند و حجت تسلیم کیا ہے اور ایسا کرنے میں انھوں نے عار یا سبکی محسوس
جو لوگ بھی اردو بولتے ہیں، اردو ان سب کی زبان ہے، مگر دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح اس زبان کی سند کے لیے بھی
خطوں (دلّی اور لکھنؤ) کی طرف نظر جاتی ہے اور ان کی طرف بھی جو پاکستان میں دلّی اور لکھنؤ کی زبان کے امین و محافظ ہیں!
زبان و ادب، تحریر و تقریر اور اظہار و بیان میں یقیناً کسی نہ کسی جگہ زبان کی سند کی ضرورت پیش آتی ہے ـــــ اس
کے ساتھ کہ اہل زبان فلاں لفظ، محاورے اور ضرب المثل کو کس طرح بولتے ہیں؟ زبان کی سند کی تلاش نہ کوئی شرم کی بات ہے
یسا کرنے سے کوئی کمتر بن جاتا ہے، خود قرآن کریم کے الفاظ کے لئے جاہلیت کے شعروں سے سند لائی جاتی ہے!
"میں کتاب پڑھا" ـــــ "میرے کو وہاں جانا ہے" ـــــ "اس نے ہنس دیا" ـــــ پان میں چونا جاتی
ـــــ "ریل گاڑی جنکشن سے کب کھلتی ہے؟" ـــــ اس قسم کے فقرے بولنے والے اگر اس ہٹ پر اتر آئیں کہ
جو بولتے ہیں وہی ٹھیک ہے، اور ہم زبان کے معاملے میں کسی سند وند کے قائل نہیں ہیں، تو ایسا کہنے کا انہیں حق حاصل
وہ اس بول چال کو کتابوں میں بھی لکھ سکتے ہیں اور وہ لکھی بھی جائے گی کہ کاغذ اور قلم دوات کسی بات کے بھی لکھنے سے انکار نہیں
مگر ان کا یہ فیصلہ زبان و ادب کے مسلّمہ اصولوں کے خلاف ہوگا! یہ ایسی ہی بات ہوگی جیسے کچھ لوگ سیدھے ہاتھ کی جگہ الٹے
ے کھانے کی عادت ڈال لیں، یا سامنے کے بجائے پشت کی جانب چلا کریں، کھانے میں اور چلنے میں یہ عادت و فطرت کے
عمل بہر حال چل پڑے گا مگر اسے کیا سمجھا جائے گا؟
ایسا کرنے سے اردو زبان کی وحدت اور مرکزیت پارہ پارہ ہو جائے گی، کہ ہر خطہ کے لوگوں کی اپنی مخصوص گرامر بنانی
ے گی، حالانکہ ہر زبان کی گرامر صرف ایک ہی ہوا کرتی ہے،

پلا دے اوک سے ساقی جو مجھ سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

نہ دے جام کورے سکورے میں دے　　　کھنکتے ہوئے آب خورے میں دے

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

اس نے دیکھا جو اُٹھ کے سوتے سے
اُڑ گئے آئینہ کے طوطے سے

اُدک — کو رسکورا — ٹھٹکا لگانا — دکان بڑھانا — بنجارے کا لاد چلنا — طوطے اڑنا — اس زبان و روزمرہ محاورہ اور ضرب الامثال کو اگر لوگ بھول گئے یا نظرانداز کر دیا گیا، تو زبان و ادب کی یہ کتنی بڑی ٹریجڈی ہوگی!

اشارے

ہر علاقائی زبان کو ترقی کرنے، پروان چڑھنے اور پھولنے پھلنے کا حق حاصل ہے مگر کسی علاقائی زبان کو اردو زبان کے توڑ پر حریفانہ انداز میں ترقی دینے کا جذبہ مستحسن نہیں ہے کہ اسلام کے بعد اردو زبان ہی — پاکستان کے تمام خطوں اور علاقوں کی جامع و رابطہ ہے۔ اردو پر آنچ آئے گی تو پاکستان کی سالمیت اور وحدت اس آنچ سے محفوظ نہیں رہ سکتی، علاقائی عصبیت کے تحت اردو کے مقابلہ میں کسی علاقائی زبان کو لانا ایسا ہی ہے، جیسے جامع مسجد کے مقابلہ پر اس مسجد کی جماعت کو مجروح کرنے کے لئے کوئی دوسری ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر کھڑی کر دی جائے! یا کسی پہلے کی بنی ہوئی چھوٹی سی مسجد میں جمعہ کے خطبہ اور نماز کا اہتمام کیا جائے!

علاقائی زبانوں کے قدیم و جدید شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات اس کی مستحق ہیں کہ ان کو زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے اور ان ارباب فکر و اہل قلم کے وسیع تر تعارف کے ذرائع اختیار کئے جائیں! مگر اس سلسلہ میں ایک بات سوچنے کی ہے وہ یہ کہ تقسیم ہند سے قبل انگریزی دور میں کسی شاعر و ادیب کے عوام سے روشناس کرانے پر کوئی پابندی نہیں تھی، انگریز کو کوئی کتنا ہی برا کہے، مگر اس کی اس خوبی کو ماننا پڑے گا کہ اس نے اپنی تہذیب کے دشمن اور نہایت مخالف شاعروں — اکبر — اقبال — کے پیغام پر کوئی روک ٹوک نہیں کی اور ان کی تخلیقات کے عام اور مقبول ہونے کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی — اگر بعض علاقائی زبانوں کے شاعر عظیم تھے، تو انگریزی دور میں ان کی عظمت نگاہوں سے کس طرح چھپی رہی، یہ کیا بات ہے کہ پاکستان بننے کے بعد ہی لوگوں کو ان شاعروں کی غیر معمولی عظمت کا کشف ہو گیا، اور ان کی شاعرانہ رفعت و عظمت پر جو پردے پڑے تھے وہ ایکا ایکی اٹھ گئے! ہمارے اس اشارے کی روشنی میں بعض لوگ اپنے دلوں کو ٹٹول کر دیکھیں! — مقصود گزارش یہ ہے کہ تقسیم ہند سے قبل جس طرح اُردو کو سب اپنی زبان سمجھتے تھے، پاکستان بننے کے بعد بھی اُردو کے ساتھ اس شفقت و محبت کو باقی رہنا چاہئے اور کسی علاقائی عصبیت کو ذرہ برابر بھی اُردو کی ترقی و بقا کے معاملہ میں سر اُبھرنا چاہئے! اُردو کسی علاقائی زبان کی حریف نہیں ہے!

آج کی صحبت میں موضوع تو نہیں بدلا، مگر ایک ہی موضوع کے تحت زبان و ادب کے بہت سے ذیلی مسائل چھڑ گئے لیکن ہم نے اپنے دل کی بات کو اپنی بساط کے مطابق ذہنی دلائل کے ساتھ سلجھا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو کوئی ٹھنڈے دل سے ہمارے معروضات پر غور و فکر کرے گا، وہ چاہے ہماری ہر بات سے سو فیصدی اتفاق نہ کرے مگر ہمارے دل کے سوز اور درد مندی کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا، حقائق ہٹ دھرموں کے لئے تلخ ہوا کرتے ہیں مگر جو لوگ حق شناس اور صداقت کے جویا ہوتے ہیں، ان کے لئے حقائق بڑے شیریں اور نشاط انگیز ثابت ہوتے ہیں! کسی کے افہام و تفہیم سے جب دل کی گرہ کھلتی ہے تو اس وقت کی مسرت کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا! اب رہیں وہ پیشانیاں جن پر شکنیں نمودار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں، تو ان سے ہم کسی قسم کی معذرت کرنے کے لئے تیار نہیں کہ ہم نے اپنی دانست میں وہی باتیں کہی ہیں، جن کو ہم نے حق سمجھا ہے اور جن کی اصابت و صحت پر ہمارا ضمیر پوری طرح مطمئن ہو لیا ہے۔

ماہر القادری — ۲۵ فروری ۱۹۶۰ء

اسلامی برادری اور اسلام

عرب، کیس کی لڑائیوں کے باعث دنیا بھر میں بدنام تھے۔ کسی قبیلے کا کوئی آدمی قتل ہو جاتا تھا تو مقتول کا قبیلہ ... قاتل سے ... نہیں لیتا تھا، قاتل کے پورے قبیلے کے پیچھے پڑ جاتا تھا اور قاتل کا قبیلہ مقتول کے قبیلے کی مستقل دشمنی مول لے لیتا تھا۔ انتقام در انتقام کا ... سلسلہ نسلاً بعد نسل چلتا تھا۔ صدیاں انتقامی لین دین میں بیت جاتی تھیں۔

اسلام آیا تو ایک ایسا رشتہ ... لایا جو تمام رشتوں پر ... تھا۔ اس رشتے نے صرف عربوں کو شیر و شکر نہیں کیا، ساری ... شیر و شکر ہونے کی دعوت دی۔ اور جس نے اس رشتے کو قبول کر لیا وہ ... نسل و وطن کی زنجیریں توڑ کر شیر و شکر ہو گیا۔ و ... بین ...بہم، لو انفقت ما فی الارض جمیعا ما ... بین ... بینهم، انه عزیز حکیم۔

اللہ نے ان کے دل ملا دیئے (اے رسولؐ!) اگر تم ساری دنیا ... میں الفت و محبت ... پیدا کر سکتے تھے (یہ اللہ ہی کا کام تھا کہ) اللہ نے ان کے دل ملا دیئے ... والا ہے۔ واعتصموا بحبل اللہ جمیعا و لا تفرقوا واذکروا نعمت ... بین ... بکم فاصبحتم بنعمته اخوانا۔ اللہ کی رسی کو سب مضبوط پکڑو اور آپس ... نعمت (عنایت) کو یاد رکھو جو (اس نے) تم پر کی ہے کہ ایک وقت تم (ایک دوسرے کے) دشمن تھے ... (اللہ نے) تمہارے دلوں میں (ایک ... دوسرے کی) الفت ڈال دی اور ... اس کی مہربانی سے بھائی (بھائی) ہو گئے۔

اسلام اسے عظیم گمراہی قرار دیتا ہے کہ آدم ... ورحوا کے بیٹے زمین کے ٹکڑوں اور خاندان کی تفریقوں میں کھو جائیں اور آدم ... کے بیٹے ہونے کو بھلا دیں۔ جغرافیہ جس رشتے کو توڑتا ہے اسلام اسے جوڑتا ہے۔ انسانوں کا زمینوں میں پھیل جانا اور خاندانوں میں ... جانا رشتۂ خلقت کو ختم نہیں کر سکتا۔ یا ایہا الناس انا خلقنٰکم من ذکر و انثیٰ و جعلنٰکم شعوبا و ... لتعارفوا۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ اے لوگو! ہم نے (دنیا میں) تمہاری خلقت کا وسیلہ مرد اور ... کا اتحاد رکھا ہے اور تمہیں نسلوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ (محض) اس لئے کہ باہم پہچانے جاؤ (ورنہ درحقیقت یہ ذریعہ ... نہیں ہے) امتیاز اور شرف تو اسی کو حاصل ہے جو اللہ کے نزدیک زیادہ متقی ہے۔

قومیت کا مدار اشتراک وطن بن گیا تھا۔ اور آج بھی عموماً یہی مدار ہے، لیکن اسلام نے دین کے اشتراک کو بنیاد بنایا اور ... نسل، رنگ اور زبان کے امتیازات کی جگہ روحانی امتیاز کو دے دی۔ اسلام وطن، نسل، رنگ اور زبان کے وجود کا ... نہیں ہے۔ وجود سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے ومن ایاتہ اختلاف السنتکم والوانکم لیکن فقط اس لئے ہے کہ باہم پہچانے ... لتعارفوا) اسلام ایسی عالمگیر برادری کی طرح ڈالتا ہے جس کے دامن میں نوع انسانی کا ہر حصہ پناہ لے سکے۔ اللہ کی ... باہمی اتحاد کے واسطے ہے اسے نزاعات کا گھر نہ ہونا چاہیے۔ اسلامی قومیت اختلافوں اور تفریقوں کی بجائے واحد معبود کی ...

تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔

وحدت پر قائم ہے۔ تمام رشتے مصنوعی ہیں۔ اصل رشتہ وہی ہے جو مخلوق کو خالق اور پروردگار سے قریب کرے اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ...... تمہاری جماعت واحد جماعت ہے اور ہم تمہارے واحد پروردگار اور پالنے والے ہیں۔

اس رشتے کی مضبوطی اسی وقت تک ہے جب تک سب اس کو مضبوطی سے پکڑے رہیں اور دوبارہ اختلافات پیدا کر کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائیں۔ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ

اللہ اور اس کے رسول کا کہا مانو (ان کی ہدایات کی پابندی کا خیال رکھو) اور آپس میں جھگڑو مت (خود سری اور نااتفاقی وہ بلائیں ہیں کہ چند دن میں تمہاری قوت کو منتشر اور تمہارے شیرازے کو بکھیر دیں گی۔ اگر تم نے اللہ رسول کی اطاعت اور متحد رہنے کی پروا نہ کی۔ تو تم (بے ہمت اور) سست ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

دین کا رشتہ اس قسم کا رشتہ ہے کہ دین میں شامل ہوتے ہی سخت سے سخت دشمن مسلمانوں کا بھائی ہو جاتا ہے فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِى الدِّيْنِ منکرین اگر (انکار سے) باز آجائیں اور (احکام الٰہی کو واجب العمل مان لیں) نماز کو (نماز کی طرح) پڑھیں اور زکوٰۃ (کو خلوص نیت کے ساتھ) ادا کریں تو (مسلمانو! یہ) تمہارے دینی بھائی ہیں۔

دین کا رشتہ اس قسم کا رشتہ ہے کہ دین میں شامل ہوتے ہی ایسا غلام جس کے باپ تک کا پتہ نہ ہو مسلمانوں کا بھائی بن جاتا ہے۔ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْۤا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِى الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ اگر تم ان کے باپوں کو بھی نہ جانتے ہو تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور علاقہ مند۔

یہ بات کسی اور رشتے میں میسر نہیں آتی۔

مسلمان مسلمان کو قتل بھی کر دے تو قاتل مقتول کے رشتہ داروں کا بھائی ہی رہے گا۔ دین کا رشتہ ٹوٹے گا نہیں۔ فَمَنْ عُفِىَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَىْءٌ اگر قاتل کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے۔ دیکھئے بھائی کا لفظ باقی ہے۔

ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی غیبت کرے تو اسے مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے تعبیر کیا گیا ہے اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا کیا تم میں سے کوئی یہ بات پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے۔ یہ تمہیں (کبھی گوارا نہیں ہو گا (لہٰذا غیبت بھی ناگوار ہونی چاہیے۔ پیٹھ پیچھے برائی کرنا مُردے کا گوشت کھانا ہے)

ایک مسلمان بھائی کا دوسرے مسلمان بھائی پر حق ہے کہ وہ اس کے لئے دعا کیا کرے اور کہا کرے: رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں معاف فرمائے۔ وَلَا تَجْعَلْ فِىْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَاۤ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ اور ہمارے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے کینہ نہ پیدا ہونے دے۔ اے ہمارے پروردگار! تو مہربان اور رحیم ہے۔

مسلمانوں کو آپس میں رحم و شفقت رکھنی چاہیے۔ (آپس میں رحیم و شفیق) ان کی شان ہے۔ مسلمانوں کو دوسرے مسلمانوں سے جھک کر ملنا چاہیے۔ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ مسلمانوں سے جھکنے اور نرمی برتنے والے) ان کی صفت ہے۔

اتفاق سے مسلمانوں میں کسی بات پر اختلاف پیش آ جائے تو اسے دور کرنے کی صورت بھی بتا دی ہے کہ اللہ اور رسول کے حکم کی طرف رجوع کیا جائے۔ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِىْ شَىْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اگر کسی معاملے میں تمہارے (آپس میں یا تمہارے اور اولوالامر کے) درمیان اختلاف آپڑے تو اس معاملے میں اللہ اور رسول (کے احکام کی) کی طرف رجوع کرو۔

اور اگر اختلاف جھگڑے اور جدال کی حد تک پہنچ جائے تو مسلمان زیادتی کرنے والے سے لڑیں اور اُسے صلح کے لئے مجبور کردیں۔ ...ی طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ ...ی تَفِیْٓءَ اِلٰۤى اَمْرِ اللّٰهِ ۔ اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑیں تو ان کے درمیان صلح کرادو۔ اور اگر ان دونوں میں سے ...(گروہ) دوسرے (گروہ) پر زیادتی کئے جائے تو زیادتی کرنے والے گروہ سے لڑو یہاں تک وہ حکم الٰہی کی طرف رجوع کرے ...ہنگامہ و فساد چھوڑ دے)

ایک حدیث ہے:۔ اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ ظالم ہو خواہ مظلوم۔ صحابہؓ نے عرض ... یا رسول اللہؐ! مظلوم کی مدد کو تو ہم سمجھ گئے لیکن ظالم کی مدد کیوں کر کی جائے؟ حضورؐ نے فرمایا: اسے ظلم کرنے سے روک دو، یہ ...ی مدد ہے۔

حضورؐ فرماتے ہیں: مسلمانوں کو تم ایک دوسرے پر رحم، محبت اور شفقت کرنے کے اعتبار سے جسم انسانی کی مانند پاؤ گے کہ ...کے ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو جسم کے سارے اعضا بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

دوسری حدیث میں ہے کہ آنکھ دُکھے تو اور سر دُکھے تو سارا جسم دُکھ محسوس کرتا ہے۔

مقصود یہ ہے کہ اُمتِ مسلمہ ایک جسم ہے اور اس کے افراد اس کے اعضا ہیں۔ لہٰذا فردِ واحد کو تکلیف پہنچے تو ساری قوم کو وہ ...ف محسوس کرنی چاہئیے۔

ایک اور حدیث ہے: مسلمان قوم مثل دیوار کے ہے کہ اُس کا ایک حصہ دوسرے حصے سے مل کر اور جُڑ کر مضبوط ہوتا ہے۔ یعنی اکیلی اینٹ میں اور بہت سی اینٹوں کے انضمام میں بڑا فرق ہے۔ اکیلی اینٹ کو بچہ توڑ سکتا ہے اور دیوار کو پہلوان نہیں ...سکتا۔ ہاں ایک اینٹ اپنی جگہ چھوڑ دے تو پوری دیوار گر جاتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان اپنی قابلیت اور صلاحیت فقط اپنے اوپر صرف نہ کرے قوم و ملت پر بھی صرف کرے۔ وہ خود ...بھی زندہ رہ سکتا ہے جب تمام مسلمان زندہ ہوں۔ تنہا مسلمان ہزار ترقی کرلے اس کی ترقی سراب ہے۔

صحابہ نے ایک دفعہ سوال کیا، یا رسول اللہؐ! سب سے اچھا مسلمان کون ہے؟ فرمایا: جس کے ہاتھ اور جس کی زبان سے ...ان محفوظ رہیں۔

ایک حدیث ہے: "مسلمان کو گالی دینا فسوق ہے، یعنی اللہ کی نافرمانی اور اُس سے لڑنا اور قتال کرنا اللہ کا انکار ہے"۔ یعنی ... یہ اس لئے کہ اللہ نے مسلمانوں کو باہم صلح و آشتی کے ساتھ رہنے کا حکم دیا ہے۔ جو اللہ کے حکم کو نہیں مانتا وہ اللہ کا انکار نہیں کرتا تو اور ...تا ہے۔ مسلمانوں کو قتل کرنے کی سزا بھی وہی ہے جو کافر کی ہے۔ وَمَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِیْهَا ...غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِیْمًا ...... جو مسلمان (جان بوجھ کر) اور ارادتاً کسی مسلمان کو قتل کر ڈالے تو ...کی سزا جہنم ہے، جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اور اُس پر اللہ کا غضب (نازل) ہوگا اور اللہ کی پھٹکار پڑے گی اور (اللہ نے) ...کے لئے بڑا (سخت) عذاب تیار کر رکھا ہے۔

حجۃ الوداع کے خطبے میں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: دیکھو میرے بعد کافر مت ہو جانا کہ ایک دوسرے کی ...ن مارنے لگو۔

جان تو بڑی شے ہے، کسی مسلمان کی آبرو کے پیچھے پڑنا بھی گناہ عظیم ہے۔

حضورؐ کا ارشاد ہے۔ "سب سے بڑا ربا کسی مسلمان کی آبرو کی طرف بے سبب ہاتھ بڑھانا ہے" اور حضورؐ فرماتے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان ایسے مخمصے میں پھنس جائے کہ اس کی آبروریزی ہونے کا ڈر ہو تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کی آبرو بچائے۔ کوئی مسلمان کسی مسلمان کو اس قسم کے موقع پر بے مدد چھوڑے گا تو اللہ اُسے اس قسم کے موقع پر بے مدد چھوڑ دے گا اور اگر کوئی مسلمان کسی مسلمان کی اس قسم کے موقع پر مدد کرے گا تو اللہ اس کی اس قسم کے موقع پر مدد فرمائے گا۔

ایک حدیث ہے کہ تم میں سے کوئی مومن کامل نہیں ہے جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے وہی نہ چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے

دو مسلمانوں کی بول چال بند ہو جائے تو حضورؐ نے تین دن سے زیادہ بول چال بند رکھنے کو منع کیا ہے اور کہا ہے کہ بول چال بند کرنے والے دو مسلمانوں میں افضل وہ ہے جو سلام (اور ملاپ) میں سبقت کرے۔

ایک بات اور سن لیجئے۔ جب کوئی شخص اپنے تئیں مسلمان کہے اور اظہار اسلام کے لئے کسی کو سلام کرے تو اُسے یہ حق نہیں کہ سلام کرنے والے سے کہدے کہ تو مسلمان نہیں ہے۔ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰی اِلَیْکُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا جو شخص تمہیں (اسلام) سلام کرے اس سے یہ مت کہو کہ تو مسلمان نہیں ہے۔

مسلمان کو کافر کہنا خود ایک درجے کا کفر ہے۔

ایک جنگ میں کوئی مخالف کسی صحابی کی زد میں آگیا تھا۔ صحابی نے اُسے قتل کرنا چاہا تو اُس نے فوراً کلمہ پڑھ دیا۔ مگر صحابی نے اُسے چھوڑا نہیں قتل کر دیا۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو حضورؐ نے صحابی کو بلا کر فرمایا کلمہ پڑھنے والے کو تم نے کیوں قتل کیا۔ صحابی نے کہا۔ یا رسول اللہؐ! وہ دل سے تھوڑا ہی ایمان لایا تھا۔ موت کے ڈر سے کلمہ پڑھنے لگا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا۔ "تم اس کے لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ کیا کروگے" "کیا تم نے اُس کا سینہ چیر کر دیکھ لیا تھا"

مومن ہونا مشکل ہے، مسلم ہونا مشکل نہیں ہے، قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ط قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ —————— دیہاتی عرب کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے۔ (اے رسولؐ!) آپ ان سے فرمایئے کہ تم (ابھی) ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ "ہم مسلمان ہو گئے" ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔

مسلمان تو وہ ہے جس کے بل ([illegible]) پر پاکستان بن گیا۔ اور جیسے ۱۹۴۷ء میں بھارت کے غیر مسلم مسلمان کو جیسے بھارت کے اندر ٹھہرا دو بھر ہو گیا تھا۔ بادشاہوں کے درجے کے مسلمان بھی پریشان تھے اور گداؤں کے درجے کے مسلمان بھی پریشان تھے۔ بھارت کی زمین سب ہی کے پیروں کے نیچے سے نکلی جاتی تھی۔ لیکن جان بچانے کے لئے کسی ایسے شخص نے بھی جسے صحیح کلمہ تک پڑھنا نہ آتا تھا یہ نہیں کہا کہ "میں مسلمان نہیں ہوں"

ادارہ "فاران"

پردہ اُٹھنے کے بعد

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی ذہانت اور عبقریت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ کوئی شک نہیں وہ غیر معمولی ذہین آدمی تھے، اور وہ جو مشہور کہاوت ہے "کہ یک من علم را دہ من عقل باید" تو یہ ضرب المثل اُن پر پوری اُترتی ہے! مولانا آزاد تحریر و تقریر میں ہمنا آپ جواب تھے اپنے انداز تحریر کے موجد بھی اور خاتم بھی! ہندوستان کی جنگ آزادی میں وہ صف اول کے قائدین میں ممتاز درجہ رکھتے تھے، انگریزی عہد حکومت میں بار بار جیل گئے، اور قید و بند کے شدائد ان کی عزیمت پر اثر انداز نہ ہو سکے!

مولانا آزاد کی ان تمام خوبیوں کا ہمیں اعتراف ہے، مگر اُن کی زندگی کے یہ کمزور پہلو بھی ہمارے سامنے ہیں کہ وہ اپنے بارے میں تعلیم و سفر وغیرہ اور اپنے خاندان کے حالات جب بیان کرتے ہیں، تو اس میں نہ صرف یہ کہ بیجا مبالغہ سے کام لیتے ہیں بلکہ اس میں "ایجاد بندہ" کا خاصہ رنگ پیدا کر دیتے ہیں، اپنی اور اپنے خاندان کی تذکرہ نگاری کے فن میں وہ اپنے وقت کے "واقدی" ہیں! کاش! مولانا آزاد احساس کمتری کے اس مرض میں مبتلا نہ ہوتے۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی اس کمزوری کی جانب غالباً سب سے پہلے علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے سرسری اشارہ فرمایا تھا اُس کے بعد "فاران" میں مولانا آزاد کے عراق و مصر کے سفر، اُن کے آبائی وطن اور دوسرے متعلقات پر [illegible] بحث کی گئی۔ پھر صاحب موصوف کی وفات کے بعد جب "آزاد کی کہانی" شائع ہوئی، تو ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ [illegible] کے شمارے میں مولوی نسیم احمد فریدی کا ایک مبسوط اور مدلل تبصرہ چھپا جس میں مولانا آزاد کی بعض غلط بیانیوں کی [illegible] مگر ان کی مدافعت کی اُن کے کسی عقیدت مند کو جرأت نہیں ہوئی!!

مولانا ابوالکلام آزاد کی عربی دانی کا اس زور شور سے پروپیگنڈا کیا گیا، جیسے وہ عربی [illegible] لکھتے تھے، عربی کے اُونچے درجہ کے انشا پرداز تھے اور عربی زبان و ادب میں اُن کی شخصیت ہندوستان کے لئے سرمایہ [illegible] تھی [illegible] افسوس ہے اس پروپیگنڈے میں بہت زیادہ مبالغہ شامل ہو گیا وہ عربی جانتے تھے، لیکن اُن کے تبحر کی جو شہرت [illegible] وہ تبحر اُن میں نہ تھا، نہ وہ عربی کے انشا پرداز تھے اور نہ علمی مسائل پر عربی میں بے تکلفی کے ساتھ گفتگو کر سکتے تھے۔ مولانا آزاد مرحوم کے عہد وزارت میں جب ایک مصری عالم کی اُن سے گفتگو ہوئی، تو اس عالم کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی، کہ مولانا [illegible] کی عربی دانی اور عربی زبان و ادب کی تو بڑی دھوم تھی، مگر یہاں معاملہ دگرگوں نکلا۔ اگر مولانا آزاد کے بارے میں یہ شہرت [illegible] مصری عالم کو حیرت نہ ہوتی کیونکہ پاک و ہند کے بیشتر علماء کو عربی بولنا اور لکھنا یوں ہی سا، کام چلانے کی حد تک [illegible] پاک و ہند عربی ادب و انشاء میں مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی شخصیتوں پر [illegible] رکھتے ہیں!

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی ذہانت اور انشا پردازی کی سحرکاری اپنی جگہ مسلّم مگر [illegible] نہیں تھے! مزید برآں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے ان کی تحقیق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے!

مولانا آزاد مرحوم کے بارے میں جو بات سب سے زیادہ کھٹکتی ہے وہ یہ ہے [illegible] کے ساتھ ہوا تھا

مترجمہ
محمد مسعود احمد ایم اے

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد

جس کتاب سے یہ باب اخذ کیا گیا ہے اس کا عنوان ہے: "The Influence of Islam on Indian culture"
اس میں تیرہ ابواب ہیں جن میں ہندو تمدن کے مختلف پہلوؤں اور ہندوستان کے مختلف گوشوں کو سامنے رکھ کر اسلامی اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے پیشِ نظر باب اس کتاب کا دوسرا باب ہے جو بڑا محققانہ اور معلومات افزا ہے۔ اس کتاب کے مولف ہندوستان کے مشہور فاضل ڈاکٹر تاراچند ہیں۔

چونکہ یہ کتاب تقسیم ہند سے بہت پہلے لکھی گئی تھی اس لئے اس کا عنوان اسی حال کے مطابق ہے۔ اس کے علاوہ پاکستانی شہروں کا بھی اسی طرح ذکر ہے۔ میں نے جوں کا توں رہنے دیا ہے۔ البتہ حتی الامکان تحت اللفظ ترجمے سے اعراض کیا ہے۔ بعض اسماء معروفہ کا صحیح تلفظ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے انگریزی ہی میں رہنے دیا گیا ہے۔ ایک دو جگہ غیر ضروری پیرگراف حذف کر دیئے ہیں وہاں نشان "فاصل" لگا دیا ہے۔ حاشیے پر تمام حوالوں کو درج کر دیا ہے۔
(محمد مسعود احمد)

ہندوستان اور مغربی ممالک عرب، فلسطین اور مصر کے درمیان عہد قدیم سے تجارتی تعلقات چلے آ رہے ہیں۔ چنانچہ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اوفر (Ophir) یعنی موجودہ بے پور (Bey pur) سے سونا، چاندی، ہاتھی دانت، بوزنے اور طاؤس وغیرہ درآمد کیا کرتے تھے[1]۔ فونیشین (Phonicians) نے بھی ہندوستان سے تجارت کی[2]۔ (Ptolemys) نے ہندوستانی تجارت کو فروغ دینے کے لئے بحر احمر پر بندرگاہیں قائم کیں[3] اور (Salaucidus) نے بھی اسی کی پیروی کرتے ہوئے خلیج فارس میں بندرگاہیں بنائیں[4]۔ ساحل مالابار سے یونانیوں نے چاول، درکت اور دارچینی درآمد کی۔ اس کے علاوہ رومی اور یونانی مصنفین ہندوستانی جغرافیہ سے واقف تھے چنانچہ انھوں نے اپنی تصانیف میں ہندوستانی درآمد اور برآمد کا ذکر کیا ہے

ا: Hunter: History of British India, Vol I P. 25
۲: Hunter: History of British India, Vol. I, Chapt I
۳: Ibid
۴: Kennedy: J.R.A.S. 1898, P. 241 ff.
۵: Ibid

اس مقالہ میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ سیرت نگاروں نے اپنی محبوب شخصیتوں کو اپنے زورِ قلم سے حیاتِ جاوید عطا کی ہے مگر مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات کے بعد "وہ لوگ بھی جو آزاد کے ساتھ سالہا سال رہے" محض رسمی تاثر ظاہر کر کے خاموش رہے۔

تو

"کیا مولانا آزاد کی شخصیت میں دلوں میں اتر جانے والی کوئی بات نہیں تھی، کیا وہ صرف دور سے دیکھنے، سننے اور پڑھنے کے انسان تھے، کیا وہ عام انسانی سطح سے اس قدر بلند ہو چکے تھے کہ ساتھ رہنے والا بھی ان کے دل کی گرمی کو محسوس نہ کر سکا۔"

مقالہ نگار نے بڑے پتہ کی بات کہی ہے کہ جہاں تک مولانا ابوالکلام آزاد کے مذہبی رجحانات کا تعلق ہے، اس کا اندازہ اُن کے ہم نشینوں اور عقیدت مندوں قاضی عبدالغفار، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، اجمل خاں اور ہمایوں کبیر وغیرہ کے دینی تصورات سے ہو سکتا ہے! "ان میں عبدالرزاق ملیح آبادی عالمِ دین تھے، آخری وقت تک مولانا آزاد کا اور اُن کا کسی نہ کسی عنوان سے ساتھ رہا، مولانا آزاد کے مشورہ سے انھوں نے امام ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ کے بعض رسالوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا، لیکن آخر وقت میں ماہنامہ سوغات نئی دہلی میں "اردو میں نماز" - ناموسِ اسلام کی حفاظت کس طرح ہو تــــ "کیا سوشلزم اسلام کے خلاف ہے؟" وغیرہ عنوانات کے تحت ملیح آبادی صاحب کے جو مضامین چھپے، انہیں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے نیاز اور پرویز کا ہمزاد بول رہا ہو۔"

مقالہ میں مولانا آزاد کی کتاب " INDIA WINS FREEDOM " کا ایک اقتباس (صفحہ ۲۲) پیش کیا گیا ہے جس کا آخری حصہ یہ ہے:-

History has however proved that after the first few decades or at most after the first century, Islam was not able to unite all the Muslim countries into one state on the basis of ISLAM alone.

یہ بات ایک غیر مسلم مستشرق کے قلم سے تو البتہ نکل سکتی تھی، مگر مولانا آزاد کے قلم سے اس "تجدد" کی تراوش دیکھ کر، بڑا افسوس ہوا! قصور تھا مسلمان فرمانرواؤں کا کہ وہ اپنے شخصی اقتدار کے سبب ایک جھنڈے کے نیچے اور ایک مرکز پر جمع و متحد نہ ہو سکے، لیکن مولانا آزاد نے اس قصور کو بے چارے "اسلام" کے سر ڈال دیا ہے کہ (معاذ اللہ) اسلام میں تمام مسلمان ملکوں کو صرف اسلام کی بنیاد پر ایک اسٹیٹ میں متحد کرنے کی صلاحیت ہی نہ تھی!

نظر کی نامسلمانی سے فریاد

مُبالغہ سے بچئے ہر شخص کو اس کا حق حاصل ہے، جسے وہ پسند کرتا ہے، اس کو سراہے اور اس کے مناقب بیان کرے! لیکن اہلِ علم کو اس معاملہ میں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے! عقیدت کے جوش میں کسی کو احمد بن حنبلؒ اور ابن تیمیہؒ کا ہمپایہ اور مثیل ٹھیرایا جا سکتا ہے، مگر اس ممدوح کے یہاں اگر بعض انتہائی غلط اور گمراہ کن نظریات ملتے ہوں، تو یہ مبالغہ آرائیاں اور قصیدہ خوانیاں آئندہ نسلوں کو بڑی الجھن میں مبتلا کر دیں گی کہ وہ کیا کریں اور کدھر جائیں! شخصیتوں کے بارے میں غلو نے بڑا نقصان پہنچایا ہے!

...لا پہلی صدی عیسوی میں (Hippalas) اور (Pliny) دوسری صدی عیسوی میں (Periplus) چھٹی صدی عیسوی
...ں (Casma Indicopleustes) اور (Ammian Marcillani) بیان کرتا ہے کہ لنکا، مالدیپ اور
...الدیپ کے باشندے جولین (Jullian) کو ہدیہ تبریک پیش کرنے کے لئے اپنے وفود بھیجتے تھے۔ اس کے علاوہ
(Peutingerian) کی جدولوں (تیسری صدی عیسوی) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کرنگانور کے مقام پر ایک رومانی آبادی
...ی نیز یہ کہ اسکندریہ میں ہندوستانی تاجروں کی ایک نوآبادی تھی جس کو (Caracalla) نے تیسری صدی عیسوی کے آغاز میں
...ست و نابود کردیا تھا[1] آگسٹس (المتوفی سنہ ۱۴ء) سے لے کر زینو (المتوفی سنہ ۴۹۱ء) تک تمام رومانی بادشاہوں کے سکے جنوبی ہند میں پائے
...تے ہیں۔ ان سے ہندوستان اور مغربی ممالک کے درمیان تجارتی تعلقات کی مزید تصدیق ہوتی ہے

ایرانیوں[2] نے بھی رومیوں کی طرح تجارتی سرگرمیوں کا مظاہرہ کیا چنانچہ انھوں نے بصرہ کے قریب دریائے دجلہ اور دریائے فرات کے
...نگم پر اُبلّہ کی بنیاد رکھی۔ ساسانیوں نے حیرہ کو قائم کیا .... عرب مصنفین کا کہنا ہے کہ پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں
...یہاں کے باشندے ہندوستان اور چین کے جہازرانوں کو مسلسل آتا جاتا دیکھتے رہے۔ (Procopius Cosma)
...کے چند ہی سال بعد لکھتا ہے۔

> ایرانی ہندوستانی منڈیوں پر چھا گئے تھے۔ چنانچہ چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں خسرو نوشیرواں کی
> سرپرستی میں ایرانی تجارت انتہائی عروج پر پہنچ گئی تھی۔ جب (Darius) نے
> ایرانیوں کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے ایک بیڑا لنکا بھیجا تو خسرو نے وادی سندھ پر حملہ کردیا۔

(Tabary) بیان کرتا ہے کہ حکومت ساسانیہ کے بعد دریائے دجلہ میں اُبلّہ کے مقام پر ہندوستانی جہازرانوں کا
...یک بیڑا داخل ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستانی علم نجوم میں ایک فصل کے لئے "تاجیک"[3] کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ لسانی شہادت
...ی اس امر کی تصدیق کرتی ہے کہ ایران اور ہندوستان کے تعلقات وسیع تھے۔

قدرتی طور پر عربوں[4] نے مشرق اور مغرب کے[5] درمیان تجارتی تعلقات کو بڑھانے میں گہری دل چسپی لی اور بڑی گرمی دکھائی چنانچہ
...ن کے علاقوں میں کئی تجارتی مراکز قائم تھے۔ عدن، کے علاوہ شحر بھی خلیج فارس سے روانہ ہونے والے یا اس میں داخل ہونے والے جہازرانوں

---

[1] Thurston: Coins of The Madras Museum, Cat No 2
[2] Reinaud: Geographi d. Aboul Feda P. 382
[3] Cordier: Melange H. Derenbourg Notes sur les Musulmanes de Chine
Bhandarkar: Search for Sanskrit M,ss. Reports
[4] Reinaud: Relation des Voyages faits par les Arabes et les persanes dans l'Inde et à la chine dans le IXe. siecle Tome I
[5] Vincent: Periplus of the Erythraean Seas P. 154

کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ عربوں ہی کی بدولت مختلف قسم کا بیش قیمت ساز و سامان درآمد کیا جاتا تھا۔ درجل لکھتا ہے کہ ہندوستانی درعرب بہادران (Actium) کے مقام پر (Antony) اور قلوپطرہ کی قیادت میں جنگ کیا کرتے تھے۔ خان بہادر فضل اللہ لطف اللہ فریدی نے صوبہ بمبئی کے گزیٹیر میں لکھا ہے کہ چاول، کلیان اور سوپارہ کے مقامات پر مسلمانوں کی آمد سے قبل بھی عربوں کی آبادیاں تھیں۔ چنانچہ (Agatharcides) کے عہد میں ساحل مالابار پر بکثرت عرب آباد تھے۔ یہاں کے باشندوں نے ان کا مذہب تک قبول کر لیا تھا۔ (Ptolemy) نے جو ہندوستانی نقشہ بنایا تھا اس میں " Malizigeris " کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اس لفظ کا آخری ٹکڑا دراصل عربی لفظ "جزیرہ" ہے۔ یہ لسانی مناسبت بھی ہمارے قول کی تصدیق کرتی ہے ـــــ Reinaud لکھتا ہے:۔

"تمام آثار یہی بتاتے ہیں کہ پرتگالیوں کی طرح قدیم زمانے میں عرب اور ایرانی لوگ بھی چودھویں صدی عیسوی تک ان ساحلوں پر غالب رہے"

عربوں[الف] میں ملک گیری کی جد و جہد قبل اسلام ہی سے جاری تھی۔ چنانچہ ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں جب اسلام ظاہر ہوا تو اس جد و جہد میں اور اضافہ ہو گیا۔ اسلامی لشکر شام اور ایران فتح کرنے کے بعد بہت ہی جلد ہندوستانی سرحد پر آپہنچے۔ مسلمان تاجروں نے ایران کی بحری تجارت پر قبضہ کیا اور عربی بیڑوں نے ہندوستانی سمندروں کو عبور کرنا شروع کر دیا۔ عربوں کے جہاز یا تو بحر احمر کے ساحل یا پھر جنوبی ساحل سے روانہ ہوتے تھے۔ اور دریائے سندھ کے دہانے پر یا خلیج کھمبات اور ساحل مالابار پر لنگر انداز ہوتے تھے اسی طرح موسم سازگار ہونے پر کولم اور دوسری بندرگاہوں کی طرف پیش قدمی کرتے تھے۔ خلیج فارس سے روانہ ہونے والے جہاز بھی یہی راستہ اختیار کرتے تھے۔ اور مون سون کی مدد سے کولم، جزیرہ نمائے ملایا، مشرقی مجمع الجزائر اور چین پہنچتے تھے۔

مسلمانوں کا سب سے پہلا بیڑا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں بحر ہند کے اندر نمودار ہوا۔ تانا کے مقام پر سمندر پار عثمان ثقفی (گورنر عمان و بحرین) نے جو لشکر بھیجا تھا یہ بیڑا اسی سلسلے میں آیا تھا۔ گورنر موصوف کی اس حرکت پر خلیفہ عمر رضی اللہ عنہ نے سخت تہدید کی اور ملامت کی ــــــ اسی زمانے میں بھڑوچ اور دیبل کی طرف مہمات بھیجی گئیں۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مخالفت کی وجہ سے بیڑے کی سرگرمیاں اور مسلح فوجی پیش قدمی رک گئی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ہندوستان جانے والے تمام خشکی کے راستوں کا کھوج لگایا گیا۔ اس کے علاوہ اور بہت سی معلومات فراہم کی گئیں۔ چنانچہ جب آٹھویں صدی عیسوی میں محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کیا تو ان معلومات نے کافی مدد دی ـــ اس زمانے میں بحری تجارت جاری رہی۔ جنوبی ہند کے تین ساحلی شہروں اور جزیرہ لنکا میں مسلمان آباد ہو گئے۔ رولنڈسن لکھتا ہے:۔

"ساتویں صدی عیسوی کے آخر میں مسلمان عرب سب سے پہلے ساحل مالابار پر آباد ہوئے"

فرانسس ڈے بھی اس قول کی تصدیق کرتا ہے اور (Sturroch) لکھتا ہے:۔

الف:۔ یہ پورا پیراگراف محل غور ہے۔ (فاران)

Reinaud : op cit.

Elliot : History of India vol 2, pp. 115 - 116

Rowlandson : Tuhfat ul Mujahidin Preface

Day: The Land of the Perumals P. 365

Sturroch : South Kanara, Madras district manuals p. 180

"سب لوگ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ساتویں صدی عیسوی سے ایرانی اور عرب تاجر ہندوستان
کے مغربی ساحل کی مختلف بندرگاہوں پر بکثرت آباد ہو گئے تھے اور ملکی عورتوں سے شادیاں
بھی کی تھیں۔ ساحل ملابار پر ہمیشہ سے تاجروں کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی چنانچہ یہاں
عربوں کی بہت وسیع آبادیاں تھیں اور بڑی اہمیت رکھتی تھیں۔"

علامہ بلاذری[1] نے محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی مہم کا جہاں ذکر کیا ہے وہاں ہندوستان میں مسلمانوں کے پہلے سے قیام کا پتہ بھی چلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ —

"لنکا کے راجہ نے اپنے ملک کے عرب تاجروں کی یتیم بچیوں کو حجاج کی خدمت میں بھیجا۔"

جن جہازوں میں یہ لڑکیاں آرہی تھیں ان پر کچھ کے بحری ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا اور لڑکیوں کا اغوا کر کے لے گئے۔ حجاج نے راجہ داہر سے ان کی بازیابی کا مطالبہ کیا جو مسترد کر دیا گیا۔ اس پر حجاج نے محمد بن قاسمؒ کی قیادت میں ایک مہم بھیجی۔ اس مہم میں بحری بیڑا تھا جس نے دیبل پر حملہ آور ہونے میں مدد دی۔

عربوں کے جنوبی ہند میں آباد ہونے کے سلسلے میں بھی حجاج کا نام لیا جاتا ہے۔ چنانچہ جہاں رائس نے لبوں کی اصل کے مطابق ولکس کا قول نقل کیا ہے وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ:[2]

"آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں گورنر عراق حجاج بن یوسف (یوسف)۔۔۔ نے
یہ بے باک ارادہ کیا کہ خاندان ہاشم کے چند کنبوں کو ہمیشہ کے لئے مادر وطن سے نکال دیا
جائے۔ لہٰذا یہ جلاوطن کنبے کچھ تو ہندوستان کے مغربی ساحل پر کنکان کے مقام پر اتر گئے
اور کچھ لوگ راس کماری کے مشرق کی طرف اتر گئے۔ اول الذکر کی اولاد کو (آج بھی) نوائط
کہا جاتا ہے اور ثانی الذکر کی اولاد کو لبے کہا جاتا ہے۔"

آٹھویں صدی عیسوی میں عرب بیڑے نے بھڑوچ اور ساحل کاٹھیاواڑ کی بندرگاہوں پر حملہ کر دیا چنانچہ اس طرح ہندوستان میں عربوں کی تجارت اور آبادی ترقی کر گئی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے قیام کی بلاواسطہ شہادت اسی صدی میں ملتی ہے چنانچہ may yat (Kannu) کے مقام پر کولم کے قبرستان میں بہت سی قدیم قبریں ہیں۔ ایک کتبے پر یہ عبارت کندہ ہے:

"علی ابن عثمان نے ۱۶۶ھ میں اس دنیا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیر باد کہا۔"[3]

(یہ عبارت عربی میں ہے)

اس زمانے (آٹھویں صدی عیسوی) سے مسلمانوں کا اثر تیزی کے ساتھ بڑھتا گیا۔ تقریباً ایک صدی سے زیادہ مسلمان عرب ساحل ملابار پر آباد رہے۔ وہ لوگ یہاں تاجرانہ حیثیت سے آتے تھے۔ چونکہ عربوں کو یہاں آباد ہونے، زمین حاصل کرنے، اور آزادانہ مذہب پر عمل کرنے کی آزادی تھی اس لئے انھوں نے یہاں آباد ہوتے ہی تبلیغی کوششیں ضرور شروع کر دی ہونگی۔ مذہب اسلام ایک تبلیغی مذہب

[1] Elliot vol I. P. 48

[2] Rice Mysore and Coorg V. I P. 353

[3] Innes Malabar and Anjengo District Gazetteer, P. 436

ہے اور ہر مسلمان بجائے خود ایک مبلغ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمان اس علاقے میں محترم و مکرم ہوئے جس طرح عیسائی ملک بدر ہو کر
کے اندر آباد ہوئے اس طرح مسلمان یہاں نہیں آباد ہوئے بلکہ وہ نوزائیدہ مذہب کا جوش اور فتح و نصرت کا جذبہ لے کر آئے تھے۔ چنا
ابھی نویں صدی عیسوی زیادہ نہ گزری تھی کہ مسلمان، ہندوستان کے مغربی ساحل پر پھیل گئے اور انھوں نے اہل ہند میں ایک ہلچل
ڈال دی، یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ وہ محکم عقیدے اور مستحکم جذبے کے مالک تھے۔

اس زمانے میں جنوبی ہند میں مذہبوں کی باہمی کش مکش سے ایک ہیجان پھیلا ہوا تھا۔ ہندو مت، بدھ مت اور جین مت
غالب آنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ سیاسی اعتبار سے بھی بدنظمی، انتشار اور معاشرتی انقلاب کا دور تھا[1]۔ چراس اپنی طاقت کھو رہے تھے
اور نئے خاندان قوت پکڑ رہے تھے۔ لوگوں کے دماغ قدرتی طور پر پراگندہ تھے۔ اس لئے وہ کسی بھی طرف سے آنے والے مذہبی تصور
کو قبول کرنے کی طرف مائل تھے۔ ایسے مواقع پر اسلام، ایک سیدھا سادا عقیدہ لے کر ہندوستان میں جلوہ گر ہوا۔ اس کے اصول او
احکام بہت واضح تھے۔ اور اس کا معاشرتی نظام آمرانہ نہیں بلکہ جمہوریت پسندانہ تھا چنانچہ انہیں خوبیوں کی وجہ سے اس نے بہت
جلد یہاں کے باشندوں کے دلوں میں گھر کر لیا۔ اور ابھی نویں صدی عیسوی کا ربع اول بھی ختم نہ ہوا تھا کہ کوڈنگلور کا راجہ چیرومن پیرومال
خاندان کا آخری راجہ تھا، مشرف بہ اسلام ہو گیا[2]۔ روایت ہے کہ راجہ نے خواب میں "شق القمر" کا معجزہ دیکھا۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی
ایک جماعت سے اس کی ملاقات ہوئی۔ جو لنکا سے واپس آ رہی تھی۔ اس جماعت کے قائد شیخ تقی الدین سے راجہ نے خواب کی تعبیر پوچھی
چنانچہ انھوں نے تعبیر بتائی۔ شیخ موصوف نے اس کو مسلمان کیا اور اس کا نام عبدالرحمٰن سامری رکھا۔ تبدیلی مذہب کے بعد راجہ مالابار سے
عرب روانہ ہو گیا اور شحر کے مقام پر اترا۔ چار سال بعد یہیں اس نے انتقال کیا۔ روایت کے مطابق یہاں اس نے ملک ابن دینار، شرف
ابن ملک، مالک ابن حبیب اور ان کے کنبوں کو ایک فرمان دے کر مالابار بھیجا۔ اس فرمان میں نظام حکومت اور مسلمانوں کے ساتھ
حسن سلوک اور مدارات کے متعلق ہدایات تھیں۔ جب یہ مسلمان فرمان لے کر یہاں پہنچے تو ان کے ساتھ کشادہ دلی سے سلوک کیا گیا
اور ان کو مسجدیں تعمیر کرنے کی اجازت دی گئی۔ چنانچہ ان مسلمانوں نے ساحل مالابار پر گیارہ مسجدیں تعمیر کرائیں۔

راجہ موصوف کی تبدیلیٔ مذہب نے لوگوں کے دلوں پر گہرا اثر ڈالا ہوگا۔ اس امر کی اس سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ مالابار میں
اس واقعہ کی یاد ابتک قائم ہے۔ مثال کے طور پر وہاں یہ عام دستور ہے کہ (Zamorin) کی تخت نشینی کے وقت
مسلمانوں کی طرح اس کے بال منڈوائے جاتے ہیں۔ انہیں جیسا لباس بھی پہنایا جاتا ہے۔ تاج پوشی کی رسم بھی ایک موپلا (مسلمان)
سرانجام دیتا ہے[3]۔ اس کے بعد Zamorin ذات باہر سمجھا جاتا ہے۔ وہ خود اپنے کنبے کے افراد کے ساتھ نہ بیٹھ سکتا ہے نہ
کھانا کھا سکتا ہے اور نہ کوئی Nayar اس کو چھوتا ہے۔ تخت شاہی پر Zamorin سلطان کا نائب تصور کیا جاتا ہے
یہ راجہ چیرومن پیرومال کی عرب سے واپسی کا منتظر رہتا ہے۔ ٹراونکور کے مہاراجہ تو اب بھی تاج پوشی کے وقت تلوار لیتے ہوئے جو
حلف اٹھاتے رہیں اس کے بول یہ ہیں:-

"میں مکہ معظمہ سے عم محترم (چیرومن پیرومال) کی واپسی تک اس تلوار کو

---

[1] Iyer: Historical Sketches of Ancient Dekhan
[2] Logan. Malabar Vol I P. 245
[3] Qadir Husain Khan: South Indian Musalmans
Madras Christian College Magazine (1912-13) P. 241

حفاظت کے ساتھ رکھنے کا عہد کرتا ہوں[1] ـــــــــــ

اس عہد میں مسلمانوں نے بظاہر بڑی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ وہ موپلا کے خطاب سے یاد کیے جاتے تھے جس کے معنی طفل بزرگ یا کتخدا کے ہیں۔ یہ عزت کا خطاب تصور کیا جاتا تھا۔ یہ خطاب بعد میں عیسائیوں کو بھی دیا گیا تو ہم امتیاز کے لیے ان کو نصرانی موپلا کہا جاتا تھا۔ مسلمانوں کو بہت مراعات حاصل تھیں مثال کے طور پر مسلمان نمبو دری برہمن کے برابر بیٹھ سکتے تھے اور نائر کو اس کی اجازت نہیں تھی۔ موپلاؤں کے مذہبی پیشوا Thangal کو اجازت تھی کہ وہ Zamorin کے ساتھ پالکی میں سوار ہو سکتے Zamorin نے اپنے مقبوضات میں عرب تاجروں کی بڑی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کی۔ چنانچہ وہ بکثرت آباد ہو گئے۔ عربوں نے Zamorin کی قوت و دولت اور ترقی میں بڑی مدد کی۔

ایک روایت کے مطابق علی راجاؤں کے مسلم خاندان کے جو لوگ کلتری راجاؤں کے ہاں وزیر اور امیر البحر کی حیثیت سے کام کرتے تھے وہ ایک عرب ہی کی اولاد تھے جس کو راجہ چیرومن پیرومال کے ایما پر عرب سے بلایا گیا تھا۔ اسی عرب کی اولاد کو کننانور کا حاکم مقرر کیا گیا تھا۔ ایک اور روایت کے مطابق اس خاندان کا سب سے پہلا مورث اعلیٰ ایک نائر تھا جو کلتری راجہ کا وزیر تھا اور مشرف بہ اسلام ہو گیا تھا لیکن اپنی ذاتی لیاقت کی بنا پر سابقہ عہدے پر فائز رہا۔[2]

Zamorin کے دل میں مسلمانوں کی بڑی قدر و منزلت تھی حتیٰ کہ اس نے عربوں کے جہازوں میں بھرتی کرنے کی غرض سے تبدیلیٔ مذہب کی حوصلہ افزائی کی کیوں کہ عربوں ہی پر اس کی ترقی کا دار و مدار تھا۔ ایک فرمان کے ذریعہ اس نے یہ اعلان[3] کر دیا تھا کہ ماہی گیروں کا ہر خاندان اپنی نرینہ اولاد میں سے ایک لڑکے کی مسلمانوں کے انداز پر تربیت کرے۔

بعد کی صدیوں میں اسلام اور بھی ترقی کرتا گیا۔ سیاحوں اور جغرافیہ دانوں کے اقوال سے اس کی پوری پوری تصدیق ہوتی ہے مسعودی[4] (۹۱۶ء) ـــــــ جس نے دسویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہندوستان کی سیاحت کی ـــــــ

یمور یعنی موجودہ چال کے مقام پر سراف، عمان، بصرہ اور بغداد کے تقریباً دس ہزار سے زیادہ مسلمانوں کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ وہاں بے شمار ایسے بھی لوگ تھے جو عربوں کی اولاد تھے۔ اور وہیں پیدا ہوئے تھے۔ ان لوگوں کا ایک سردار تھا جس کا لقب (Hazama) (غالباً ہنرمند تھا)۔ یہ منصب وہاں کے ہندو راجہ کی طرف سے ملا تھا۔

ابوالفدا یا ملیل[5] نے یمور کی بندرگاہ پر مسجدیں دیکھیں۔ تیرھویں صدی عیسوی میں ابن سعید بیان کرتا ہے[6] کہ ہندوستان کے ساحلی علاقوں کے باشندوں کے ساتھ مسلمان بھی رہتے تھے۔ سر مارکو پولو نے اس[7] بات کا خاص طور سے ذکر کیا ہے کہ لنکا کے لوگوں کو فوجی امداد کی جب کبھی ضرورت ہوتی تھی تو وہ بیرونجات سے عرب فوجی دستوں کی کمک حاصل کر لیا کرتے تھے ابوالفدا[8] (۱۲۷۳ء–۱۳۳۱ء)

---

[1] Logan: Malabar Vol I. P. 231
[2] Innes: op cit
[3] Innes Ibid., P. 190
[4] Elliot Vol I Mas'udi
[5] Ferrand: Relation Des Voyages under Yakut
[6] Ibid., under Ibn Sa'id
[7] Yule: The book of Sir Marco Polo Vol II P. 314
[8] Ibid P. 377

کوکم کے مقام پر ایک نہایت عمدہ مسجد اور چوک کا ذکر کرتا ہے، ابن بطوطہ[1] (چودھویں صدی عیسوی) کھمبایت سے مغربی ساحل کے قریب قریب دورہ کرتا ہوا گزرتا ہے۔ اس نے تمام مغربی بندرگاہوں کو دیکھا اور ہر جگہ مسلمانوں سے اس کی ملاقات ہوئی۔ سب کو اس نے آسودہ حال پایا۔ مسلمان درباریوں نے کنڈہار کے مقام پر ابن بطوطہ سے ملاقات کی، کونکن کے مقام پر اس نے ایک قدیم مسجد دیکھی جو حضرت خضر اور الیاس علیہما السلام سے منسوب تھی اور یہیں پر وہ حیدری فقیروں کی ایک جماعت سے بھی ملا جو اپنے شیخ کی معیت میں تھی

عرب جہاز رانوں کے سرپرست سلطان جمال الدین محمد الہنوری حاکم ہنور (یعنی موجودہ اونور) کے ولی بزرگوار حسن نے سندآبور میں بغدادی طرز کی ایک مسجد تعمیر کرائی تھی۔ اونور میں مسلمانوں کا ایک اپنا حکمراں، مفتی، قاضی اور مرشد تھا ساحل مالابار کے ساتھ ساتھ سندآبور سے کوکم تک جو سڑک جاتی ہے اس کی ہر منزل پر مسلمانوں کے مکانات تھے۔ اور اس میں مسلمان آباد تھے۔ ابن بطوطہ نے یہ بھی دیکھا کہ مسلمان ملک میں سب سے زیادہ مکرم و معزز ہیں۔ بارسیکور اور فاکنور (یعنی موجودہ بیکنور) کے مقامات پر مسلمانوں کی جماعتیں تھیں۔ ان کے اپنے اپنے قاضی اور مفتی تھے۔ منگلور میں مسلمانوں کی چار ہزار کی آبادی تھی جن میں فارس اور یمن کے تاجر بھی تھے۔ ان کی مسجد کا ایک بڑا بیت المال تھا اور مسجدیں کافی تعداد میں طلب تھے۔ Fattans میں ہر جگہ مسجدیں تھیں اور فندرین (Fandarama) میں شہر کے تین چوتھائی حصے پر مسلمانوں کا قبضہ تھا اور ہر جگہ مسجدیں تھیں۔ کالی کٹ کا ممتاز تاجر مسلمان تھا جس کا نام ابراہیم شاہ بندر تھا۔ یہ بحرین کا باشندہ تھا۔ اس کے علاوہ کوکم میں بہت سے مسلمان تاجر تھے یہاں پر مسجدیں بھی بکثرت تھیں اور ایک مسجد تو فن تعمیر کے لحاظ سے قابل تعریف تھی۔ یہاں کا راجہ مسلمانوں کا بہت احترام کرتا تھا۔

عبد الرزاق (۱۴۴۲ء) جس نے پرتگالیوں کی آمد کے موقع پر ہندوستان کی سیاحت کی، کالی کٹ کے متعلق لکھتا ہے:-

"یہاں مسلمان اچھی خاصی تعداد میں آباد ہیں۔ وہ یہاں کے مستقل شہری ہیں۔ انھوں نے دو[2]
جامع مسجدیں بھی تعمیر کی ہیں جہاں ہر جمعہ دوگانہ ادا کرنے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔"

عبد الرزاق نے یہاں کی بندرگاہوں کی گہما گہمی اور دنیا کے مختلف ممالک کے تاجروں کی ہماہمی کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

مندرجہ بالا بیانات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مسلمان ابتدا ہی سے ہندوستان کے مغربی ساحل پر آباد ہو گئے تھے اور ان کی تعداد اور دولت و قوت فروغ پا گئی تھی۔ . . . . کرنگل ہی اور مسلمان باشندوں کی داستانوں میں جو روایات محفوظ ہیں ان سے اور سیاحوں کے بیانات اور کتبوں کی شہادتوں سے اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ ہندوستان سے عربوں کا قدیم تعلق تھا اور یہ کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے تھوڑے ہی عرصہ بعد مسلمان ہندوستان میں آئے، جلد ہی مالابار کے ہندو حکمرانوں کے یہاں اثر و رسوخ پیدا کر لیا اور رعایتیں حاصل کیں۔

عرب لوگ مشرقی ساحل پر شروع ہی میں آباد ہو گئے تھے، جب Assurs نے (۹۱۵ - ۷۴۴ ق۔ م) میں فرات اور دجلہ کے دریاؤں پر بند باندھے اور مصر کی تجارت کو تباہ و برباد کیا تو یمن کے تاجروں کو ان دونوں کی تجارت کا ورثہ ملا۔[3] عرب اور یہودیوں کی نوآبادیاں عہد مسیح کی ابتدائی صدیوں میں لنکا اور جنوبی ہند میں قائم ہو گئی تھیں۔ یونانی اور اوآدی، مشرقی ساحل سے

[1] Dafremery and Sanguinette: Ibn Batutah Vol III, P. 55 ff.
[2] Major: India in the Fifteenth Century
Narrative of the Voyage of Abdur Razzak
[3] Kennedy: The Early Commerce of Babylon with India J.R.A.S. 1898

[illegible] خاصی تجارت کرتے تھے چنانچہ اطالوی بادشاہوں کے سکّے کو تمبتور کے مقام پر کافی تعداد میں دریافت کئے گئے ہیں Kalkhai
[illegible] جدید Kayal سے یونانی بخوبی واقف تھے۔ PTolemy چولا خاندان کے دارالسلطنت اُریے پور کا ذکر کرتا ہے۔[1]
[illegible] اور اطالوی جہازوں میں بہت سے عرب جہازراں ہوتے تھے۔ عرب تاجر چین جاتے ہوئے ساحل کورومنڈل سے گزرتے
تھے جہاں اسلام سے قبل کے عربوں کی قبریں اب بھی کین توں میں پائی جاتی ہیں[2] مسٹر کسٹ کے الفاظ میں "یہ دعویٰ کیا جاسکتا
ہے کہ پرانے زمانے سے ہی یمن اور جنوبی ہند کے درمیان سلسلۂ تجارت جاری تھا"[3]

جو عرب تاجر اسلام سے پہلے یہاں موجود تھے مسلمان عربوں نے ان کی جگہ لی۔ عرب اور خلیج فارس کے ساحلوں سے جو عام
[illegible] چین جاتا تھا وہ[4] ان سات سمندروں سے گزرتا تھا جن میں خلیج پاک اور خلیج بنگال شامل ہیں۔ اس راستے کو عرب جہازراں اور
تاجر Kalahabar schelahath اور Kardenj کے ناموں سے یاد کرتے تھے۔ نویں صدی
عیسوی میں سلیمان اور ابو زید صیرافی اور دسویں صدی عیسوی کے آغاز میں مسعودی اس راستے کا اس طرح کا ذکر کرتا ہے۔ گویا کہ یہ عرصہ دراز
سے جانے پہچانے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اس راستے سے بکثرت سیاح گزرے ہوں گے اور ہندوستان اور اسلامی ملکوں کے
درمیان بڑے پیمانہ پر تجارتی تعلقات قائم رہے ہوں گے۔ کیوں کہ پہلے ہی آٹھویں صدی عیسوی میں کین توں میں مسلمانوں کی متعدد
آبادیاں قائم ہو گئی تھیں جن کی بغاوت نے ۷۵۸ء میں ایک سخت شورش پیدا کر دی تھی[5]

مشرقی ساحل پر ضلع تناولی میں دریائے تمرپرنی کے دہانے کے قریب Koyal Pattanam عربوں کی
خاص آبادی تھی جہاں اب بھی لبوں کی آبادی اکثریت میں ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے Cold well نے مٹی کے برتنوں
کے ٹکڑے بڑی مقدار میں دریافت کئے ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہیں سے مسلمانوں کے سکّے بھی دریافت کئے گئے ہیں جن
پر ساتویں صدی عیسوی (۶۷۸ء) سے لے کر تیرھویں صدی عیسوی تک کے سنین کندہ ہیں۔

جس قدر بھی مسلمان آباد ہوتے گئے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا سلسلہ جاری رہا جنوبی ہند کے بہت سے مسلمان خاندان اپنا
شجرہ نسب اسی عہد سے ملاتے ہیں۔ ترچناپلی اور مدورا کے Rovuttana کو یقین ہے کہ حضرت نطہر ولی رحمۃ اللہ علیہ
نے ان کو مشرف بہ اسلام کیا تھا۔ موصوف کا مزار مبارک اب بھی ترچناپلی میں موجود ہے جس کے کتبے پر سنہ وصال ۴۱۷ھ (۱۰۳۹ء)
کندہ ہے[6] حضرت نطہر ولی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ وہ سید شہزادے تھے۔ ترکی میں ان کی ایک ریاست تھی
جس کو چھوڑ کر انھوں نے فقر اختیار کر لیا تھا۔ اور اسلام کی تبلیغ شروع کر دی تھی۔ آپ نے عرب، ایران اور شمالی ہند کا دورہ کیا اور
آخر میں تری سور (یعنی موجودہ ترچناپلی) پہنچے۔ یہیں سکونت اختیار کر لی اپنی عمر عبادت اور امور خیر میں گزاری۔ بہت سے ہندو
مشرف بہ اسلام کیا۔ سید ابراہیم شہید رحمۃ اللہ علیہ آپ کے جانشین تھے۔ موصوف مدینہ منورہ میں تقریباً (۱۱۶۲ء) میں پیدا ہوئے
جب آپ کی عمر چالیس سال کی تھی تو اس وقت آپ نے ایک فوجی مشن کی قیادت کی تھی۔ یہ مشن مملکت پانڈیان کی طرف بھیجا گیا تھا

[1] Hamingway: Trichinopoly Madras District Gazetteer
[2] Edkins: Ancient Navigation in The Indian Ocean J.R.A.S. 1886. [3] Ibid, P. 4
[4] Reinaud op cit [5] Cordier op cit
[6] Qadir Husain Khan: op. cit P. 294

کہا جاتا ہے کہ آپ نے راجہ پانڈیا کو شکست دی اور بارہ سال سے زیادہ اس کی جگہ حکومت کی آخر میں آپ کو معزول کر کے شہید کر دیا گیا آپ اروڈی میں مدفون ہوئے۔ ایک اور بزرگ بابا فخرالدین رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق Dudekules کہتا ہے آپ حضرت نطہر ولی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہو گئے تھے۔ آپ نے پنوکنڈا کے راجہ کو مسلمان کیا اور وہیں ایک مسجد تعمیر کی سخر سکن کے قول کے مطابق آپ کا سنہ وصال ۱۱۶۳ء ہے۔

۱۰۵۰ء میں ملک الملوک، حضرت علی یار شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مسلمانوں کی ایک جمعیت لے کر مدورا میں تشریف لائے[1] موصوف کا مزار مبارک مدورا میں حضور کچہری کے قریب ہے۔ Goripaleiyam میں ایک مسجد ہے اس کے لئے گیارھویں یا بارھویں صدی عیسوی میں کن پانڈیے کی طرف سے چھ گاؤں وقف تھے وجے نایکین کے عہد میں اس وقف کی تحقیق ہوئی اور یہ پھر بحال کر دیا گیا[2]

مشرقی ساحل پر جو بھی مسلمان تاجر آئے یہاں کے حکمرانوں نے ان کے ساتھ حسن سلوک کیا۔ مغربی علاقوں کی یہ ایک عجیب رسم تھی کہ ناساعد حالات کی وجہ سے اگر کوئی جہاز ساحل پر آ جاتا تو وہ حکمرانوں کی ملکیت شمار ہوتا تھا لیکن اس علاقے میں مسلمانوں کے ساتھ بہتر برتاؤ کیا گیا۔ چنگی کے محاصل کے علاوہ تمام محصول ختم کر دیئے گئے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ تجارت کو فروغ ہوا۔ یہاں پر حکمرانوں کی خاص نگرانی میں تاجروں کی نو آبادیاں قائم کی گئیں[3] مسلمان تاجروں کے لئے ساحل کارومنڈل تو ایک بحری راستہ تھا۔ جو وصاف[4] کے قول کے مطابق کولم سے لے کر نلاور (یعنی موجودہ نیلور) تک تقریباً تین سو فرسنگ تک ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا تھا۔ اس علاقے کی اصطلاح میں راجہ کو "دیوار" کہا جاتا تھا جس کے معنی "شہنشاہ" کے ہیں چین وماچین کے نوادرات، وہندوستان وسندھ کی مصنوعات سے لدے ہوئے بڑے بڑے جہاز ہواؤں کے کاندھوں پر پہاڑوں کی طرح سطح سمندر پر چلتے جاتے تھے۔ بالخصوص خلیج فارس کے جزائر کی دولت اور دیگر ممالک مثلاً عراق، خراسان، روم اور یورپ سے کچھ سامان حسن و آرائش اسی راستے سے درآمد کیا جاتا تھا۔ یہ راستہ جغرافیائی حیثیت سے "کلید ہند" معلوم ہوتا تھا۔

بارھویں صدی عیسوی میں مسلمان ان علاقوں میں اچھی طرح آباد ہو گئے تھے اور کافی اہمیت حاصل کر لی تھی کیوں کہ یہ دیکھا گیا Vainyas کے ساتھ مسلمان بھی لنکا کے ایک جنرل کے پاس تحفے لائے تھے۔ اس نے (۱۱۷۲-۷۳ء) میں حکومت پانڈیے پر حملہ کیا تھا۔

تیرھویں صدی عیسوی میں خاص طور پر گھوڑوں کی تجارت نے بڑا فروغ پایا۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ Kais کے حاکم ملک الاسلام جمال الدین نے Kayal کے مقام پر ایک ایجنسی قائم کی۔ (حاکم موصوف بعد میں مرزبان فارس ہو گئے تھے) وصاف کے بیان کے مطابق فارس سے سالانہ دس ہزار گھوڑے اس راستے سے درآمد کئے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے ساحلوں سے بھی درآمد کئے جاتے تھے۔ ان گھوڑوں کی مجموعی رقم کوئی ۲،۲۰۰،۰۰۰ (۲۲ لاکھ دینار) ہوتی تھی ان مقامات پر جمال الدین کے برادر تقی الدین عبدالرحمن بن محمد الطیبی نیابت کرتے تھے۔ Kayal کے علاوہ فتن اور مالی فتن کے

---

1. Nelson: Madura. P. 86
2. Nelson: Madura P. 69
3. S.K. Aiyangar: South India and Her Mohammadan Invasion.
4. Elliot Vol III. P. 32

ساحل بھی موصوف کی نگرانی میں تھے۔

رشید الدین کے بیان کے مطابق ۱۲۹۳ء میں حاکم پانڈے کے مرنے کے بعد جمال الدین اس کا جانشین مقرر ہوا اور اس کا بھائی لفٹیننٹ کے عہدے پر فائز ہوا۔ اس زمانے میں مسلمانوں نے مدورا پر جو حملے کیے تھے ان کے متعلق نیلسن مختصر روایت نقل کرتے ہیں۔ مارکو پولو نے تقی الدین کے متعلق یہ لکھا ہے کہ وہ سندر پانڈے کا نائب وزیر اور مشیر تھے۔ ان کے بعد ان کا بیٹا سراج الدین ان کا جانشین ہوا۔ پھر ان کے بعد ان کا بیٹا نظام الدین جانشین ہوا۔ ۱۲۸۶ء میں پانڈے کا جو سفیر کبلائی خاں کے دربار میں گیا تھا وہ اسی جمال الدین کا فرزند فخر الدین احمد تھا۔ یہ چار سال چین میں رہے اور ہندوستان واپس آتے ہوئے جہاز ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ اپنے چچا ہی کے قریب ایک مقبرے میں مدفون ہیں۔ تامل کے علاقے میں مسلمانوں کی دوسری آبادیاں بھی تھیں۔ حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ، ملک کافور کی مہم کا ذکر کرتے ہوئے کند در (یعنی موجودہ کنیا نور) کے مسلمانوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ کلمہ گو تھے گو کہ گردن زدنی تھے مگر چونکہ مسلمان تھے اس لئے ان سے درگزر کیا گیا۔ ابن بطوطہ جس نے ملک کافور کے حملے کے بعد اس علاقے کا دورہ کیا تھا بیان کرتا ہے کہ اس زمانے میں غیاث الدین الدامغانی، مدورا کا حاکم تھا۔ نیز راجہ ورپلن کے پاس بیس ہزار مسلمانوں کا ایک فوجی دستہ تھا۔ ہناور کے مسلمان حکمران راجہ ورپلن کے وائسرائے ہری ہپ اودے یر کے ماتحت تھے۔

اس طرح جنوبی ہند میں ملک کافور کی مہم پہنچنے سے پہلے مسلمانوں نے تجارت کے اہم مرکزوں میں اپنی نوآبادیاں قائم کر لی تھیں اور اپنے ہمسایوں سے تعلقات پیدا کر لئے تھے۔ عربوں اور تاملوں کے اس میل جول سے مخلوط نسل نے جنم لیا۔ اسی نسل کے لوگ Ravuttan اور لبّے کہلاتے ہیں۔

مذکورہ بالا بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنوبی ہند میں مغربی ساحل پر اگر بہت پہلے نہیں تو آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز تک مسلمان آ چکے تھے اور مشرقی ساحل پر دسویں صدی عیسوی میں آئے۔ ان بیانات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مسلمان جلد ہی تمام ساحل پر پھیل گئے اور مقابلتاً بہت ہی تھوڑے عرصہ میں انھوں نے ہندوستانی سیاست اور معاشرت میں گہرا اثر پیدا کر لیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف تو عرب مسلمان وزیر، سفیر، امیر البحر اور افسر مالیات تھے اور دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کا تبلیغی مشن بڑی کامیابی سے جاری تھا اور انھوں نے بکثرت لوگوں کو مشرف بہ اسلام کیا۔ اپنی مذہبی تعلیمات کی اشاعت کی۔ مسجدیں، خانقاہیں، حظیرے تعمیر کیے۔ یہ سب علماء اور مبلغوں کے مرکز تھے اس لئے حقیقت سے تجاوز کئے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جنوبی ہند میں ساتویں صدی عیسوی کے بعد ہندو مذاہب میں جو نمایاں تبدیلیاں اور ترقیاں ہوئیں وہ اسلام ہی کے اثر کا نتیجہ ہیں۔

عیسائیت، ہندو دھرم پر کچھ اثر انداز نہیں ہوئی کیوں کہ جنوبی ہند میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے، شمالی ہند میں یہ اثر بڑھتا

Elliot: Vol III P. 32

Elliot: Vol III PP 69, 70

Nelson: Madura District Manual PP. 78

Yule: op. Cit

Elliot. op Cit Vol III P. 90

Defremery and Sanguinetty op. cit Vol III P. 199

Kennedy: J R. A. S. 1907) P. 951

شروع ہوگیا تھا۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ جنوبی ہند اور اسکندریہ کے آپس کے تعلقات تیسری صدی عیسوی کے آغاز میں عملاً ختم ہو گئے تھے اس لئے تیسری صدی عیسوی سے قبل اسکندریہ، عیسائیت کی اشاعت کا مرکز نہیں ہوسکتا تھا۔ انتونی کے عہد میں اسکندریہ میں عیسائی مذہب ممنوع قرار دے دیا گیا تھا اور اس پر پابندی لگادی تھی اس لئے عیسائیوں کے جلسے خفیہ طور پر ہوا کرتے تھے۔ جب مصر اور ہندوستان کے درمیان پھر تجارت بحال ہوئی اور عیسائی، شام اور ایران سے لے کر جنوبی ہند میں آباد ہوئے تو چونکہ ان کی جماعتیں چھوٹی تھیں اور ان کو کوئی اہمیت بھی حاصل نہ تھی اس لئے[1] ان علاقوں میں یہ لوگ خاطر خواہ اثر نہ ڈال سکے۔ ساتویں صدی عیسوی کے وسط میں شام، ایران اور مصر مسلمانوں کے قبضے میں چلے گئے اور عیسائیوں نے اپنی شہرت و حکومت کھودی اس لئے گو کہ وہ آٹھویں صدی عیسوی میں ساحل مالابار پر موجود تھے۔ مگر اس امر کی تاریخی اعتبار سے کوئی تصدیق نہیں ہوتی کہ وہ ہندوستان پر اثرانداز ہوئے۔

شمالی ہند میں حضرت عمرؓ کے زمانے سے ہی مسلمانوں نے آمد و رفت شروع کردی تھی۔ سادل اول شمالی ساحل پر کوششیں ہوئیں اور جب ایران اور مکران سلطنت اسلامیہ سے ملحق ہوگئے تو مسلمانوں نے سندھ کا رخ کیا۔ ساتویں صدی عیسوی کے دوران میں سندھ اور بلوچستان کی سرحدات پر بہت سے حملے کئے گئے اور بری رستوں کی اچھی طرح کھوج لگائی گئی۔ بالآخر خلیفہ ولید کے عہد میں گورنر عراق حجاج نے ایک مہم تیار کی جو ایک نامی گرامی نوجوان محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں بھیجی گئی[2]۔ محمد بن قاسمؒ سندھ کی مشکلات پر حاوی ہوگئے۔ سندھ کے ہندو حکمرانوں کو شکست دی، تمام وادی سندھ پر پھیل گئے اور سندھ و ملتان کے صوبوں کو اسلامی قلمرو کا باج گزار بنالیا۔ یہاں آکر مسلمانوں کی پیش قدمی رُک گئی اور تین صدیوں تک وہ ان علاقوں میں محدود رہے۔ اس عرصہ میں ان کا حلقۂ اثر سندھ اور ملتان کے علاقوں میں بڑھتا گیا کیونکہ یہ علاقے ان کے زیر نگیں تھے۔ اس کے علاوہ سندھ کے ساحلی شہر کاٹھیاواڑ، گجرات، اور کنکان (جہاں مسلمان تاجرانہ حیثیت سے آباد ہو گئے تھے) ان کے حلقۂ اثر میں آگئے۔ مگر گیارھویں صدی عیسوی تک مسلمان یہاں سے آگے نہ بڑھ سکے اور یہیں مستقل بود و باش اختیار کرلی۔ ممکن ہے کہ بعض حوصلہ مند مسلمان سالاروں نے مالوہ اور قنوج پر بھی حملے کئے ہوں۔ بہرحال دیبل، سومناتھ، کھمبات، سفدان اور چاؤل میں مسلمان آباد تھے۔ یہاں تقریباً ہر جگہ مسجدیں تھیں۔ بہت سے ہندو حکمرانوں نے اپنے اپنے مقبوضات میں مسلمانوں کے ساتھ متواضعانہ سلوک کیا چنانچہ حاکم گجرات ولبھ رائے (بلہارا) نے مسلمانوں کے ساتھ جو دوستانہ سلوک کیا تھا اس کی تمام سیاح تعریف کرتے ہیں، مسعودی، ابن حوقل، ابوزید سب ہی نے اس کو سراہا ہے، سلیمان لکھتا ہے:

"تمام حکمراں عربوں کو بلہارا سے زیادہ چاہتے ہیں۔ ان کی رعایا بھی انہیں کے نقش قدم پر چلتی ہے۔"[3]

مسعودی نے بھی مسلمانوں کو ہر جگہ آزادانہ طور پر عبادت کرتے دیکھا۔ وہ شاہ گجرات کے متعلق لکھتا ہے:-

اس کی حکومت میں اسلام کی عزت اور حفاظت کی جاتی ہے عام علاقوں میں شاندار مسجدیں بنی ہوئی ہیں جہاں مسلمان نماز پنجگانہ ادا کرتے ہیں۔[4]

---

[1] Elliot: Vol I

[2] Reinaud: op. cit Vol I. P. 26

[3] Elliot: Vol I. P. 27

اصطخری (۹۵۱ء) حکومت بلہار کے شہروں میں مسلمانوں کو دیکھتا ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے :-

"بلہار کے علاقوں میں مسلمان ہی حکمرانی کرتے ہیں" لے

ابن حوقل (۹۶۸ء) نے نہل، سندان، سیمور اور کھمبات میں جامع مسجدیں دیکھیں۔ اور گیارھویں صدی میں ادریسی بیان کرتا ہے :-

"انہلوارا میں مسلمانوں کی کثرت سے تجارت کے لئے جاتے رہتے ہیں بادشاہ اور وزراء بڑی عزت و احترام کے ساتھ ان کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ یہ لوگ یہاں امن و امان سے رہتے ہیں" لے

ہندوستان پر محمود غزنوی کے حملوں سے پہلے ہی مغربی ہند میں مسلمانوں نے معزز مقام حاصل کر لیا تھا۔ یہاں وہ اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے تھے اور یہاں کا اعزاز ہی تھا کہ ہندو حکمراں بھی اشاعت مذہب میں ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ محمد عوفی نے جو حکایت نقل کی ہے اس سے ہندو شہزادوں اور مسلمان تاجروں کے باہمی تعلقات پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

"جب کھمبات کے ہندوؤں نے مسلمان تاجروں پر حملہ کیا تو سدھ راج (۱۰۹۴ء تا ۱۱۴۳ء) نے سارے معاملے کی تفتیش کی، حملہ آوروں کو سزائیں دیں اور ایک نئی مسجد تعمیر کرنے کے لئے مسلمانوں کو رقم دی۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے ہندو راجاؤں کے ہاں مسلمان سپاہی بھی تھے مثال کے طور پر سومناتھ کے حاکم کے ہاں چند مسلم فوجی افسر تھے۔ احمد آباد کے کسباتی لوگ وغیل سرداروں کے خراسانی سپاہیوں سے اپنا سلسلۂ نسب ملاتے ہیں۔ لے

جن جن علاقوں کی طرف مسلمان فوجیں پیش قدمی کرتی گئیں اور جہاں جہاں مسلمان تاجر آباد ہوتے گئے وہاں اولیائے کرام بھی تشریف لاتے رہے۔ مثال کے طور پر حضرت ابوحفص ربیع بن صاحب الاسد البصری رحمۃ اللہ علیہ جو ایک محدث اور صوفی تھے سندھ میں تشریف لائے اور ۱۶۰ھ میں یہیں آپ نے وفات پائی ہے دسویں صدی میں منصور الحلاج بحری راستے سے ہندوستان تشریف لائے اور شمالی ہند و ترکستان ہوتے ہوئے بری راستے سے واپس تشریف لے گئے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں بابا ریحان رحمۃ اللہ علیہ بغداد سے درویشوں کی ایک جماعت کے ساتھ بھڑوچ تشریف لائے۔ آپ کے متعلق یہ روایت ہے کہ آپ نے راجہ کے فرزند کو مشرف بہ اسلام کیا .... اسی زمانے میں (۱۰۶۷ء) بوہروں کی شیعہ سوداگر جماعت کے

لے Ibid

لے Ibid p. 88

لے Ibid: Vol II. p. 164

لے Forbes: Rasa Mala (1856) Vol I 276

لے Mir Ghulam ali azad Maasir ul Kiram p. 6

لے Massignon: Kitab al Tawasin Introduction p. V

لے Campbell: Gazetteer of Gujrat, Surat and Broach, p. 558 and note

مذہبی پیشوا یمن سے گجرات آکر آباد ہو گئے [51] اور نور الدین یا نور ستاگر (۱۰۹۴ء - ۱۱۴۳ء) نے گجرات کے کنبیوں، کھروں اور کوریوں کو مشرف بہ اسلام کیا۔ [52]

محمود غزنوی کے حملوں کے بعد بھی مسلمان علما اور صوفیا، بکثرت ہندوستان تشریف لائے۔ اب سب کی ایک جامع فہرست پیش کرنا تو ناممکن ہے البتہ یہاں چند اہم شخصیتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مصنف کشف المحجوب حضرت علی بن عثمان الہجویری الغزنوی رحمۃ اللہ علیہ اسلامی ملکوں کا وسیع دورہ کرنے کے بعد لاہور آکر سکونت پذیر ہوئے اور یہیں پر ۴۶۵ھ یا ۴۶۹ھ میں آپ نے وفات پائی [53] گیارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں شیخ اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے [54] اور بارھویں صدی عیسوی میں منطق الطیر اور تذکرۃ الاولیاء کے مشہور مصنف حضرت فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے [55] ۱۱۹۰ء میں خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے اور [56] ۱۲۳۶ء میں یہیں وفات پائی۔ تیرھویں صدی عیسوی میں حضرت شیخ جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ (تلمیذ رشید حضرت شہاب الدین سہروردی بانی سلسلۂ اشراقی یا فلسفہ مشرقی) بنگال تشریف لائے [57] ۱۲۴۴ء میں سید جلال الدین بخاری رحمۃ اللہ علیہ بہاولپور میں اُچ کے مقام میں آباد ہو گئے [58] اور بابا فرید شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ پاک پٹن میں سکونت پذیر ہوئے [59] چودھویں صدی عیسوی (۱۳۰۰ء) میں ابن العربی کے شارح اور فلسفہ تصوف کی مشہور کتاب "الانسان الکامل" کے مصنف، عبدالکریم الجیلی نے ہندوستان کا رُخ کیا [60] پونا اور بلگام کے اضلاع میں سید محمد گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے بکثرت لوگوں کو مشرف بہ اسلام کیا [61]۔ پندرھویں صدی عیسوی میں خوجہ فرقہ کے بانی پیر صدر الدین [62]، مومنہ فرقے کے بانی سید یوسف الدین [63] اور پیرانا کے امام شاہ [64] بھی ہندوستان میں اقامت گزیں ہوئے۔

دوسرے قابل ذکر صوفیا جنھوں نے ہندوستان کی سیاحت کی یا یہاں اقامت کے لئے آئے۔ یہ حضرات ہیں:۔

سید شاہ میر رحمۃ اللہ علیہ [65] ابن حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ بانی سلسلۂ قادریہ، قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ

---

[51] Forbes op. cit Vol. I. P. 344
[52] Arnold: Preaching of Islam Chapt on India
[53] Nicholson: Kashful Mahjub Introduction
[54] Arnold: op Cit
[55] Nicholson: Tadhkiratul Aulia of Friddddin Attar
[56] Abdul Haq: Akhbar ul Akhiyar P. 22
[57] Ibid: P. 43　[58] Ibid. P. 60
[59] Macauliff: The Sikh Religion Vol. P. 356
[60] Nicholson: Studies in Islamic Mysticism P. 81
[61] Arnold: op. cit　[62] Bombay Gazetteer Vol IX, Part II P. 40
[63] Ibid: P. 27
[64] Ibid: P. 70
[65] Khafi Khan: Muntakhibul Lubab Vol II Part 2. P. 604

۔ بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ [۵۱] (المتوفی ۱۲۶۶ء) ملتان میں سکونت پذیر تھے۔ جلال الدین سرخ پوش رحمۃ اللہ علیہ [۵۲] (المتوفی ۱۲۹۱ء) اُچ میں اقامت گزیں تھے۔ شاہ محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ [۵۳] (المتوفی ۱۵۶۲ء) آپ شاہ ہمایوں کے اتالیق تھے۔ سلسلۂ شطاری سے آپ کا تعلق تھا۔ ان حضرات کے علاوہ شاہ مدار (گیارھویں صدی عیسوی) [۵۴] اور سخی سرور [۵۵] (بارھویں یا تیرھویں صدی عیسوی) جیسے قلندر درویش بھی ہندوستان آئے۔

مسلمانوں کی کتب سیر ہندوستان میں آنے والے بے شمار صوفیاء کے تذکروں سے لبریز ہیں۔ مشہور ہستیوں کی اتنی کثرت ہے تو غیر معروف ہستیوں کا کیا ٹھکانہ جو ان کے ہمراہ ہندوستان آئے۔ بہرکیف ان حضرات نے اپنے شخصی تعلق اور اثر سے فلسفۂ اسلام اور تصوف کو ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلا دیا۔

---

۵۱ Abdul Haq: op cit. P 24 ۵۲ Ibid: P. 26

۵۳ Abdul Haq: op cit P. 60 ۵۴ عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، ج ۳، ص ۴

۵۵ Arnold: The saints and Martyres of India

۵۶ Ibid

قطعہ تاریخ تمنا سوز

۱۹ ء ۵۹

"حادثۂ ارتحال نیک خصال"

۱۹ ء ۵۹

"شاعر پاکستان سید الادب علامہ اسد ملتانی"

۱۹ ء ۵۹

کیوں نہ دنیائے سخن میں صفِ ماتم بچھتی — کوچ فرما گئے الحاج اسد ملتانی

متعارف ہیں سب اربابِ سخن، اہلِ نظر — نہیں تعریف کے محتاج اسد ملتانی

بعدِ علامہ اقبال تھے لاریب وگماں — ادب و شعر کے سرتاج اسد ملتانی

حکمت و فلسفہ میں آپ کو تفویض ہوئی — عرش تدبیر کی معراج اسد ملتانی

تم وہ معمارِ ادب تھے کہ تمہارے غم میں — قصرِ اُردو ہوا تاراج، اسد ملتانی!

"آہ" کے ساتھ کہو مصرعِ تاریخ عزیز

عازمِ خلد ہوئے آج اسد ملتانی۔

۱۳ ھ ۷۹

"احقر العباد عزیز حاصل پوری ملتان"

۱۳ ھ ۷۹

غزلیں

حبیب احمد صدیقی

ت دنوں سے تصور میں آشیاں بھی نہیں
امید کیا ہو کہ اب سعیٔ رائگاں بھی نہیں

ب کھا نے کو ہو کچھ نہ کچھ تو وجہ فریب
نگاہ لطف ، بہ عنوان امتحاں بھی نہیں

یا کہ چشم تمنّا ہے ، یہی یہی سی
وہاں تو کوئی بجز شرم ، پاسباں بھی نہیں

اب یہ حال انہیں دیکھتے بھی ڈرتا ہوں
چھپا رہا ہوں وہ اک راز جو نہاں بھی نہیں

یوں جفائے مسلسل کے مستحق ٹھہریں
وہ جن کو حوصلۂ نالہ و فغاں بھی نہیں

ہ لطف جو ہم پر نہیں تو خیر نہ ہو
ستم یہ ہے کہ وہ مدت سے سرگراں بھی نہیں

شعاروں کو اس پر بھی ناز ہے کتنا
کہ خوش گماں جو نہیں وہ تو بدگماں بھی نہیں

دل فریب بہت یوں تو بزم اہل خرد
شعور زیست کی گلکاریاں وہاں بھی نہیں

(۲)

وں کی خوش ادائی ، یہ فسون خوش نگاہی
ہے گناہِ ناسپاسی ، مرا عذر بے گناہی!

رم نما نگاہیں مری سمت پھر اٹھی ہیں
مرے نام کی ہے اِتنی ابھی اور کچھ تباہی!!

مید ربط باہم تو ہو کس طرح کہ ہمدم
ہمیں ناز سرفروشی ، انہیں زعم کج کلاہی

ی نشتر جراحت ، کبھی گلشن لطافت
کوئی کیا بتائے کیا ہے [illegible]

یہ کوئی بتائے کیوں کہ جنہیں وہ خدا کے بندے
جنہیں ضبط کا ہے یارا نہ مجال داد خواہی

نہ خرد کے دام میں آ ، نہ گنوا اسے کہ ناداں
یہ حیات رنگ و نغمہ ، ہے سبک خرام راہی

شفیق جون پوری

شب جا چکی ہے نور سحر کا پتا نہیں
یارب مرے نصیب میں صبح ہے یا نہیں

گلچیں تری نگاہ چمن آشنا تو ہے
لیکن ترا مزاج بہار آشنا نہیں

مرکز سے جو الگ ہوا برباد ہی رہا
چھوٹا چمن تو نکہت گل کا پتا نہیں

نرگس حسین ہیں تری آنکھیں ہوا کریں
تیرے چمن میں دیدہ ور دوں کا پتا نہیں

واعظ کو جس قدر خفگی میکشوں سے ہو
اتنا تو عاصیوں سے خدا بھی خفا نہیں

یہ بھی تو اک دلیل ہے اُس کے وجود کی
جب تک نہ مانئے اُسے دل مانتا نہیں

میں حسن ظن شفیق سے رکھتا نہیں مگر
تم جتنا جانتے ہو وہ اتنا برا نہیں

اُنجم چندر چندن مُلتانی (ساکن حال ٹونک)

کون بدلیگا مجھے آپ بدل جاؤں گا
ٹھوکریں کھا کے زمانے کی سنبھل جاؤنگا

چار تنکے بھی نشیمن کے کھٹکتے ہیں اگر
باغباں تیرے گلستاں سے نکل جاؤنگا

کوئی بھی کام بھلائی کا جہاں ہو نہ سکا
لیکے کیا خاک وہاں فردِ عمل جاؤنگا

[illegible] تو کچھ کہہ نہیں سکتے
[illegible]

رونا بھی اگر آیا تو پی جائیں گے آنسو
ہم تیری ہنسی دیدۂ نم ہونے نہ دیں گے

غضب کر دیا اب یہ کیسے رکیں گے
یہ آنسو میرے تم نے کیوں پونچھ ڈالے

ماہر القادری

دیوانہ کہیں ایسی باتوں سے بہلتا ہے
وہ سامنے ہوتے ہیں دل اور مچلتا ہے

پہلے دلِ شاعر میں چشمہ سا اُبلتا ہے
پھر شعر کے سانچے میں طوفان یہ ڈھلتا ہے

اللہ رے، شبِ غم میں یہ میری خوش اندیشی
جیسے کوئی پہلو میں کروٹ سی بدلتا ہے

رخسار کے شعلوں کی زلفوں کو نہیں پروا
بجلی کے شراروں سے بادل کہیں جلتا ہے

اُس بزم میں دیکھے تو کوئی مری حیرانی
کیا سوچ کے آیا تھا کیا منہ سے نکلتا ہے

وہ شوخ بھلے ماہر پرکار بھی سادہ بھی
شرما کے بھی چلتا ہے، اٹھلا کے بھی چلتا ہے

غزل

عبدالمجید حیرت

یہ بات کہ خوبی کوئی باطل میں نہیں ہے
موضوعِ سخن کیوں کسی محفل میں نہیں ہے

کیا طفل و جواں، غنچہ و گل سب ہیں برابر
کیا فرق کوئی ناقص و کامل میں نہیں ہے

کچھ اور نہیں اس کے سوا اُن سے شکایت
جو بات زباں پر ہے، وہی دل میں نہیں ہے

موجیں بھی مخالف ہیں، ہوائیں بھی مخالف
اب امن کہیں دامنِ ساحل میں نہیں ہے

ہوتی ہے جہاں آپ ہی تقدیر معاون
تدبیر ابھی ایسے مراحل میں نہیں ہے

ایسے بھی ہیں کچھ لوگ کہ ہیں لرزہ براندام
ہر چند کہ خنجر کفِ قاتل میں نہیں ہے

اک پرسشِ اربابِ وفا ہی نہیں ورنہ
ہونے کو تو کیا آپ کی محفل میں نہیں ہے

گلشن کی طرف پھر نگہِ برق اٹھی ہے
دیکھو کہیں چشمک تو عنادل میں نہیں ہے

حیرت پہ جو مبذول نہیں چشمِ عنایت
شاید وہ سمجھتے ہیں کہ مشکل میں نہیں ہے

غزل

زکی زاکانی

اہلِ دل عشق کے اظہار تک آپہنچے ہیں
سینکڑوں سر تری تلوار تک آپہنچے ہیں

عشق کی منزلِ اظہار تک آپہنچے ہیں
ہم درِ دل سے درِ یار تک آپہنچے ہیں

ہے بہت دور ابھی فصلِ بہاراں لیکن
لوگ ذکرِ گل و گلزار تک آپہنچے ہیں

جس سے وابستہ ہے اک صبحِ مسرت کی نوید
ہم اسی مطلعِ انوار تک آپہنچے ہیں

پیچ در پیچ سہی راہِ محبت لیکن
آنے والے تری سرکار تک آپہنچے ہیں

دیکھیں کیا ہوتا ہے اب فصلِ تبسم کا مآل
راز پھولوں کے لبِ خار تک آپہنچے ہیں

سلسلہ دامنِ ساقی سے چلا تھا لیکن
ہاتھ اب شیخ کی دستار تک آپہنچے ہیں

روحِ انتخاب

آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا زمانہ ہو یا آپؐ کی وفات حسرت آیات کے بعد کا، دونوں ہی ادوار میں عام لوگ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور ابوعبیدہؓ کے اخلاق و اطوار سے جس حیثیت سے متعارف تھے۔ اس سے کسی شخص کو اس وہم میں مبتلا ہونے کی گنجائش نہیں نکلتی کہ ان حضرات نے خلافت کے معاملہ میں آنحضورؐ کی زندگی میں کوئی سازش کی ہوگی۔ ان لوگوں کی پوری زندگی اس امر کی شاہد ہے کہ انھوں نے معاملات زندگی میں سے کوئی چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا معاملہ آنحضورؐ سے چھپا کر نہیں رکھا۔

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی دوران خلافت کی زندگی بھی دیکھ جائیے، آپ کو کسی مقام پر یہ شبہ تک نہیں ہوگا کہ ان کے اندر حکمرانی یا اقتدار کی ہوس کا شائبہ تک موجود رہا ہو۔ ان دونوں کی بے داغ سیرتوں کے کسی گوشہ سے یہ دعویٰ نہیں نکل سکتی کہ انھوں نے آنحضورؐ کے اعتماد سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے خیال کو بھی ذہن میں جگہ دی ہوگی۔ اس کے برعکس یہ ضرور ملے گا کہ ان حضرات کو آنحضورؐ سے اتنا گہرا عشق تھا، جہاں شک و شبہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی ہے۔

جتنی تاریخی روایات ہم تک پہنچی ہیں، وہ سب کی سب یہ ماننے پر مجبور کرتی ہیں کہ خلافت کا معاملہ بغیر کسی سابق تدبیر یا سوچ بچار کے حالات کے اقتضاء کے مطابق خود بخود پیش آ گیا۔ اور اس معاملہ پر غور و فکر اور سوچ بچار اس وقت کیا گیا جب انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہو گئے۔ تقریباً تمام روایات میں بالاتفاق یہی آتا ہے کہ آنحضورؐ نے جس وقت حضرت بلالؓ کو حضرت ابوبکرؓ کی امامت کا حکم دیا تھا ... اس وقت حضرت ابوبکرؓ کسی قریبی مقام پر موجود نہیں تھے۔ بالفرض اگر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عائشہؓ کے مابین کوئی خفیہ بات چیت یا ساز باز ہوئی ہوتی، تو اس کو تکمیل کے مرحلہ تک پہنچانے کے لئے حضرت ابوبکرؓ کا مسجد یا آنحضورؐ کے دولت کدہ سے قریب ہونا ضروری تھا۔ ورنہ یہ سازش ناکام ہو جاتی اور معاملہ سازش کرنے والوں کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے ہاتھوں میں چلا جاتا ...

حقیقت یہ ہے کہ آنحضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ایسے وقت ہوئی جب آپ کے قریبی رفقاء کو اس کا وہم و گمان تک نہ تھا۔ آنحضورؐ کی حالت قدرے بہتر ہو گئی تھی۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے آپ سے رخصت کی اجازت طلب کرتے ہوئے کہا تھا کہ "خدا کے فضل سے اس وقت آپ کی طبیعت ہماری تمنا کے مطابق ہے آج بنت خارجہ کی باری ہے۔ کیا آپ مجھے اس کے پاس شب باشی کی اجازت مرحمت فرماتے ہیں؟"

آنحضورؐ نے ان کو اجازت دے دی اور وہ سخ (حضرت ابوبکرؓ کی بستی کا نام ہے) چلے گئے۔

رہا حضرت عمرؓ کا معاملہ، تو آنحضورؐ کی وفات کی خبر سن کر ان کے اوسان جس طرح خطا ہوئے ہیں، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں آپ کی وفات کی بالکل توقع نہ تھی اور نہ ... وہ اس جانکاہ خبر کے لئے ذہنی طور پر آمادہ تھے ورنہ وہ یہ خبر سن کر حواس باختگی کا شکار ہونے کی بجائے مزعومہ سازش کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے تیاری شروع کر دیتے۔

ان حالات میں حضرت ابوبکرؓ، اور عمرؓ کو خبر ملتی ہے کہ انصار آنحضورؐ کی جانشینی کا مسئلہ طے کرنے کے لئے سقیفہ بنی ساعدہ

ں جمع ہوگئے ہیں۔ دونوں حضرات آپس میں یہ طے کئے بغیر ہی ..... سے کون وہاں لوگوں کو پہلے خطاب کریگا، وہاں پہنچ جاتے ہیں۔
حضرت عمرؓ کو یہ اندیشہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ اپنی فطری تند مزاجی کے باعث موقع پر کوئی سخت بات نہ کہدیں جو لوگوں کے لئے موجب
اشتعال ہو۔ وہ یہ بھی فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ سے ایسا فعل سرزد ہو جائے تو معاملہ پر قابو پانے کے لئے خود ان کو
کیا کرنا چاہیئے۔ اسی طرح حضرت ابوبکرؓ کو حضرت عمرؓ کی جانب سے یہ خطرہ لاحق تھا کہ وہ اپنی معروف سخت گیر طبیعت سے مغلوب
ہوکر کہیں ..... شدت کا ارتکاب نہ کر بیٹھیں۔ اور اگر وہ اس طرح کی غلطی کر گزریں، تو ان کو بروقت ٹوک دینے کے بعد خود ان کو گفتگو کا
آغاز کس طرح کرنا چاہیئے۔ اس پوری صورت حال میں ہمیں کہیں کسی خفیہ معاہدہ وغیرہ کا پتہ نشان نہیں ملتا۔

راستے میں ان دونوں حضرات کا حضرت ابوعبیدہؓ سے مل جانا ایک اتفاقی امر تھا۔ ایک مشہور روایت میں آتا ہے کہ حضرت
عمرؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ سے ملاقات کے وقت ان سے کہا کہ "آپ اپنا ہاتھ بڑھایئے، میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں۔ رسولؐ
کے فرمان کے مطابق آپ اس امت کے امین ہیں۔"

حضرت ابوعبیدہؓ نے جواب میں کہا کہ "میں جس وقت سے اسلام لایا ہوں، میں نے آپ کی جانب سے ایسی مضحکہ خیز بات
سرزد ہوتے کبھی نہیں دیکھی۔ نبیؐ کے یارِ غار حضرت صدیقؓ کی موجودگی میں آپ میرے ہاتھ پر بیعت کرنے کا خیال کیوں کر
ذہن میں لاتے؟"

اگر یہ روایت صحیح ہے، تو ان تینوں اشخاص کی سازش کے اس مزعومہ کا کیا بنے گا۔ جو اپنی جگہ خود ایک من گھڑت سازش ہے
حضرت عمرؓ نے مذکورہ بالا گفتگو خواہ اس ارادے سے کی ہو کہ وہ فی الواقع حضرت ابوعبیدہؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتے ہوں یا
اس گفتگو کا پس منظر اس معاملہ میں حضرت ابوعبیدہؓ کا عندیہ معلوم کرنا ہو، دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت بھی ہو، ہر ایک
صورت سازش کے احتمال کی کلی طور پر نفی کرتی ہے۔

جلیل القدر صحابہ بھی آنحضورؐ کی وفات کی خبر سُن کر جب اس پریشانی میں پڑ گئے تھے اور آپ کی وفات سے پہلے مرض
کے وقت بھی جب اُن کی یہ حالت تھی تو پھر مزعومہ سازش کی کب گئی؟ کوئی بھی صاحب عقل شخص یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ یہ بلند پایہ
صحابہ، جو آنحضورؐ کی رسالت پر دل و جان سے ایمان رکھتے تھے۔ آپؐ کے مرض سے پہلے آپ کی وراثت باہم تقسیم کرنے کے لئے کسی خفیہ
سازش کا خاکہ تیار کرنے کی سوچ سکتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایسا کرنا ناممکن تھا۔ تو پھر یہ بتایا جائے کہ سازش کرنے والوں کو آخر یہ اطمینان
کیوں کر حاصل ہو گیا کہ قرآن کریم ان کے اس رازِ درون پردہ کو طشت از بام نہیں کرے گا۔ اور وحی کے ذریعہ خلافت کے مسئلہ میں انکی سازش
کے خلاف فیصلہ نہیں دے گا۔ پھر ساتھ ہی ان کو یہ اطمینان بھی کیوں کر حاصل ہو گیا کہ آنحضورؐ اپنی وفات سے پہلے خلافت کے متعلق کوئی
وصیت نہیں کر جائیں گے، جو ان کی سوچی سمجھی اسکیم کو خاک میں ملا دے گی۔

اس سلسلے کی ہر روایت کی چھان بین کرنے کا، ہر مفروضہ کا تجزیہ کرنے اور وہم و گمان کے ہر نشیب و فراز کا جائزہ لینے کے بعد
جو بات واضح طور پر سامنے آتی ہے، وہ صرف یہ ہے کہ یہ معاملہ جس صورت وقوع پذیر ہوا، اس کو اسی صورت ہونا چاہیئے تھا۔ اس کے
پس پردہ کوئی سکیم یا سازش کارفرما نہیں تھی۔ بقول حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت خود بخود اور اچانک عمل میں آئی۔ مگر اللہ
تعالیٰ نے اس کی وجہ سے پیدا ہونے والے خطرات سے اُمت کو محفوظ رکھا۔

معاملہ جس طریق پر انجام پذیر ہوا، اس کے لئے کسی تدبیر و تمہید اور اسکیم تیار کرنے کی ضرورت کیا تھی جب کہ اس کے بغیر بھی کوئی
حادثہ پیدا ہونے کا اندیشہ تھا نہ امکان؟

حضرت ابو بکر رضؓ کے علاوہ دوسرا کون شخص تھا جو خلافت کی شرائط میں اُن سے اونچا مقام رکھتا ہو یا جو ہر نقطۂ نظر سے ان کے مقابلہ میں اس منصب کا زیادہ اہل ہو؟

وہ عمر کے معیار پر پورے اترتے تھے۔ وہ قبولِ اسلام میں اوّلیت اور سبقت کا مقام رکھتے تھے۔ وہ نبی ﷺ کے یارِ غار تھے۔ اور وہ جلیل القدر صحابہ میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کے قرائن وآثار آنحضورؐ کے مرضِ موت سے چند سال بیشتر ہی نظر آتے تھے۔ آنحضورؐ نے اپنی زندگی ہی میں ان کو پہلا امیرِ حج بنا کر بھیجا اور خود مدینہ منورہ میں تشریف فرما رہے۔ یہ واقعہ سنہ ۹ھ کا ہے۔ راستہ میں ایسا اتفاق ہوا کہ حضرت ابو بکرؓ نے نمازِ صبح کے لئے لوگوں کو جمع کیا۔ عین اسی وقت انھوں نے ایک اونٹنی کی آواز سن کر نماز کچھ دیر کے لئے ملتوی کر دی اور فرمایا یہ حضورؐ کی اونٹنی کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کرنے کا ارادہ فرمالیا ہے۔ اگر واقعی آپؐ ہی کی سواری ہے تو ہم آپؐ کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔ لیکن اونٹنی کے آنے پر معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ علی ابن ابی طالبؓ ہیں جو حضورؐ کی اونٹنی پر تشریف لائے ہیں۔

حضرت ابو بکرؓ نے ان سے دریافت کیا "آپ امیرِ حج بنا کر بھیجے گئے ہیں یا قاصد کی حیثیت سے آئے ہیں؟"

حضرت علیؓ نے جواب دیا۔ قاصد بن کر آیا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو سورۂ برأت سنانے کے لئے مجھے بھیجا ہے۔"

جب لوگ مکہ معظمہ پہنچ گئے، تو حضرت ابو بکرؓ نے خطبہ دیا اور لوگوں کو مناسکِ حج بتلائے اور حضرت علیؓ نے پوری سورۂ برأت پڑھ کر سنائی۔ پھر عرفہ کا دن آیا۔ حضرت ابو بکرؓ نے خطبہ دیا، لوگوں کو مناسکِ حج کی تعلیم دی۔ اور حضرت علیؓ نے سورۂ برأت پڑھ کر سنائی۔

ایک دفعہ قبیلہ اوس کے درمیان کسی معاملہ میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم صلح وصفائی کرانے کے لئے وہاں تشریف لے گئے اور حضرت بلال رضؓ کو حکم فرما گئے اگر نماز کا وقت آجائے اور میں وقت پر نہ پہنچ سکوں، تو تم ابو بکرؓ سے کہدینا کہ وہ نماز پڑھا دیں۔

بخاری نے جبیر بن مطعم رضؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک عورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ آنحضورؐ نے اس کو دوبارہ کسی وقت حاضر ہونے کو فرمایا۔

اس عورت نے عرض کیا "اگر میرے حاضرِ خدمت ہونے کے وقت آپ نہ ہوئے، تو کیا بنے گا؟"

شاید اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر میرے آنے کے وقت خدانخواستہ آپؐ اس دنیا میں موجود نہ ہوئے تو میں اپنی عرضداشت کس کے سامنے پیش کروں گی۔

آنحضورؐ نے فرمایا "اگر میں اس وقت موجود نہ ہوا، تو ابو بکر رضؓ سے تمہارا مقصد پورا ہو جائے گا"

یہ متفق علیہ آثار اور ان کے علاوہ متعدد دوسرے شواہد جن میں کچھ صریح ہیں اور کچھ محتاجِ تاویل وتشریح، اس امر کی شہادت کے لئے کافی ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کے قرائن بہت پہلے سے نظر آرہے تھے۔

حضرت ابو بکرؓ اور اُن کے ساتھیوں نے عربی وحدت اور اسلامی شیرازہ بندی کے لئے اسی قسم کی اور بھی بہت سی کوششیں کیں۔ لیکن ان تمام کوششوں میں انھوں نے وہی تدابیر اختیار کیں جن کا اختیار کرنا ضروری تھا اور جن کے ترک کر دینے میں نقصان تھا۔

حضرت ابوبکرؓ خلیفۂ اول تھے۔
کیوں کہ وہ صدیق اول تھے۔
کیوں کہ ان کے اندر خلافت کی وہ تمام شرائط بدرجۂ اتم موجود تھیں جو ان کے معاصرین میں یا تو مفقود تھیں یا اگر پائی جاتی تھیں تو ان کا درجہ اتنا اونچا نہ تھا۔

پس حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب وہ معیاری انتخاب تھا جس کی نظیر تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس لئے کہ یہ انتخاب کسی تدبیر و تمہید کے بغیر خالص جمہوری طریقہ پر عمل میں آیا تھا۔ لیکن اگر کسی کو یہ بات تسلیم نہیں اور یہی اصرار ہے کہ یہ انتخاب سوچی سمجھی اسکیم اور تدبیر کے ماتحت عمل میں آیا تھا، تو اس کے جواب میں ہم صرف یہ کہنے پر اکتفا کریں گے کہ ایسی اسکیم اور تدبیر بھی قابل صد ستائش ہے جس نے اختلاف و پراگندگی کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا اور جس کے ذریعہ بہترین انتخاب پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

ابوبکرؓ اتنا لوکا اعلیٰ کردار تھے اور عمرؓ اجتہاد کا لافانی کردار۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے اور آپ کی اطاعت میں ان دونوں حضرات کو یکساں مقام حاصل ہے۔ آپؐ کے نقش قدم پر چلنے کی خواہش دونوں حضرات میں یکساں طور پر موجود تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان کے عشق و محبت کی راہیں جدا جدا ہیں، اگرچہ ہیں متوازی اور ایک ہی سمت کو جانے والی۔

ان دونوں راہوں کے درمیان اتنا باریک اور ہلکا فرق ہے کہ مشکل ہی سے امتیاز کیا جاسکتا ہے۔ اب ہم اس باریک فرق کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے اس فرق کی مختصر تعبیر تو یہ ہے کہ ایک جگہ موصوف کو مقدم اور صفت کو مؤخر کر دیجئے اور دوسری جگہ صفت کو مقدم اور موصوف کو مؤخر کر دیجئے یعنی یوں کہیئے کہ۔
ابوبکرؓ کو ذات محمدؐ سے پہلے عشق و گرویدگی تھی اور نبیؐ سے عشق و گرویدگی کا درجہ بعد میں تھا۔
عمرؓ کو نبیؐ سے پہلے عشق تھا اور محمدؐ کی محبت کا درجہ بعد کی چیز تھا۔
ذرا توضیح کے ساتھ یوں سمجھئے کہ ابوبکرؓ کو محمدؐ سے محمدؐ ہونے کی حیثیت سے جو گرویدگی تھی اس کا درجہ مقدم تھا۔ اور آپؐ کے نبی ہونے کی حیثیت سے جو محبت تھی اس کا درجہ بعد میں تھا۔
عمرؓ نے پہلے نبیؐ کی نبوت کے متعلق اطمینان حاصل کیا اور یہ ایمان و اطمینان محرک ثابت ہوا محمدؐ کی ذات سے عشق و گرویدگی کا
ابوبکرؓ نے محمدؐ کو اپنے ایک معتمد دوست کی حیثیت سے جانا پہچانا اور اس اعتماد کی بنا پر نبوت پر ایمان لائے۔

حضرت صدیق رضؓ شرفاء عرب میں پہلے شخص تھے جنھوں نے نبیؐ کے بعد دین اسلام اختیار کیا۔ آپ نے بہت جلد آگے بڑھ کر نبیؐ کی دعوت پر لبیک کہا اور اس طریق سے کہا جو اس دعوت کے شایان شان تھا۔ گویا کاتب ازل نے اول روز ہی یہ لکھ دیا تھا کہ اگر نبیؐ دعوت کے اول شخص ہوں تو یہ آپ کے ثانی ہوں۔ چنانچہ حضرت صدیق ہر مرحلہ میں ثانی رہے۔ اسلام لانے میں بھی ثانی غار ہجرت میں بھی ثانی، بدر کے سائبان میں بھی ثانی اور ہر اس جنگ میں ثانی جو مسلمانوں اور مشرکوں کے مابین ہوئی۔ آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ اس وقت بھی دیا جب اسلام دور ابتلا میں تھا اور اس وقت بھی جب اسلام کا ستارہ عروج پر آچکا تھا۔ خفیہ طور پر رفاقت کی اور علانیہ بھی۔

آپ اسلام کی منزل تک دین کے راستے سے پہنچے اور پھر اس راہ میں پیش آنے والی ہر آزمائش کے مقابلے میں صبر و ثبات کا پہاڑ بن کر کھڑے ہوگئے اور اس طرح کھڑے رہے کہ اگر اس مقام پر کوئی طالب دنیا ہوتا تو یقیناً بھاگ کھڑا ہوتا۔

حضرت صدیق رضؓ نے جب روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کعبہ کے اندر نماز با جماعت ادا کرنے کا مشورہ دیا مسلمانوں کی تعداد اس

وقت چالیس نفوس سے سجی و زبھی۔ پھر خود آگے بڑھ کر کعبہ کے عین بیچ لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف دعوت دی مشرکین برافروختہ ہو کر مسلمانوں پر پل پڑے۔ زدوکوب کیا۔ اذیتیں پہنچائیں اور طرح طرح کے اہانت آمیز سلوک کئے۔ عتبہ بن ربیعہ خود حضرت صدیق رض کے گرد ہو گیا اور اپنے جوتوں سے اس قدر مارا پیٹا کہ چہرے نے متورم ہو کر ناک تک کو ڈھک لیا۔

آپ کے قبیلہ بنو تیم کو وقوع کی اطلاع ہوئی تو فوراً موقع پر پہنچ گئے اور آپ کو مشرکین کے نرغے سے نکال کر خون آلود کپڑوں میں گھر لے گئے۔ سب کو یقین ہو چکا تھا کہ آپ جانبر نہ ہو سکیں گے۔ اس بنا پر آپ کے قبیلے کے کسی فرد نے اس وقت کعبہ کے اندر چیخ کر کہا تھا کہ ابوبکر نہ بچے تو ہم عتبہ کو بھی جیتا نہ چھوڑیں گے۔ غرض گھر پہنچنے کے بعد یہ لوگ آپ کا احاطہ کئے اس وقت تک بیٹھے رہے جب تک آپ کو افاقہ نہ ہو گیا۔ ہوش آنے کے بعد اس درد و کرب کی حالت میں بھی سب سے پہلے جو بات آپ کی زبان سے سنی گئی وہ یہ کہ رسول اللہ صلعم کس حال میں ہیں؟

حضرت صدیق رض نے ملکی سیاست کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کھینچے ہوئے خطوط ہی پر چلایا۔ البتہ ہر اہم معاملہ میں اصحاب رائے سے مشورہ ضرور کرتے رہے اپنی رائے صرف وہیں استعمال فرمائی جہاں ذمہ داری خود آپ سے متعلق رہی اور دوسروں سے اس کا کوئی تعلق نہ رہا۔ اس کی مثال خلیفہ ثانی کا انتخاب ہے۔ مشاورت اور غور و خوض کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہنچے کہ خلافت حضرت عمر بن خطاب رض کے حوالہ کر دی جائے۔

اختصار کے ساتھ حضرت صدیق رض کی سیاست ملکی کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے ایک مقتدر، فعال اور مقتدی انسان کا پارٹ ادا کیا اور ان لوگوں کے مشوروں کو بھی نظر انداز نہ فرمایا جو ابتدار و اجتہاد کو ترجیح دیتے تھے۔ آپ نے راستہ اتباع و اقتدا کا اختیار فرمایا مگر کمزوری یا بے اعتمادی کے ساتھ نہیں اور نہ دوسروں پر بھروسہ کر کے۔ بلکہ اپنے کس بل پر۔ آپ نے اقتدا ہی کو یہ ثابت کر دیا کہ آپ کے اندر دشوار، کٹھن اور بھاری ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت ان لوگوں سے زیادہ ہے جن کا مزاج اجتہاد و تصرف سے زیادہ قریب تھا۔

یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ حضرت ابوبکر رض جس طرح رسول اللہ صلعم کی زندگی میں اپنے عہد و پیمان پر قائم رہے اسی طرح آپ کی وفات کے بعد بھی آپ میں سر مو فرق نہیں آیا۔ جو لوگ عقل و فہم رکھتے ہیں اور انصاف پسند ہیں بلکہ وہ لوگ جو کچھ بوجھ تو رکھتے ہیں مگر انصاف پسندی سے عاری ہیں ان کے نزدیک بھی یہ بات مسلم ہے کہ حضرت ابوبکر رض کا ہر قول و فعل آخر وقت تک اس عہد و پیمان کا شاہد رہا۔

کوئی صاحب عقل و خرد حضرت صدیق رض کے متعلق بنیؐ کو اس بنیاد پر مطعون نہیں کر سکتا کہ انھوں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو میراث سے محروم کر دیا تھا۔ انھوں نے اگر حضرت فاطمہ رض کو میراث سے محروم کیا تھا تو حضرت عائشہ رض کو بھی تو وراثت میں کوئی حصہ نہیں دیا تھا۔ کیوں کہ شریعت محمدی میں انبیاء کی وراثت جائز نہیں۔ حضرت ابوبکر رض کی یہ نیت ہرگز نہ تھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث آپ کے وارثین کو نہ دیں جب کہ خود ان کی عزیز ترین صاحبزادی بھی انہیں وارثین میں شامل تھی۔ بلکہ ان کی صرف اور صرف یہ خواہش تھی کہ دین کو بصورت تمام و کمال محفوظ رکھا جائے اور یہ حفاظت و صیانت مال و اولاد کی حفاظت و صیانت سے بہر حال بہتر ہے۔

اسی طرح یہ کہنے کی گنجائش نہیں کہ حضرت صدیق رض نے حضرت علی کو حق خلافت سے محروم کر دیا۔ حضرت ابوبکر رض کے بس میں نہ تھا کہ وہ حضرت علی رض کو کسی ایسی چیز سے محروم کر دیں جس کی وصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دی ہو۔ پھر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ لوگوں نے آنحضرت صلعم کے اس سلسلے کے فرمودات پر پردہ ڈال دیا ہوگا۔ کیوں کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کسی وقت بھی آنحضرت صلعم کے سر مبارک سے جدا نہیں ہوتیں۔ خود حضرت علی رض اگر قرآن اور حدیث سے دلیل پیش کرنا چاہتے تو ان کے زور استدلال کے آگے کون ٹھہر سکتا تھا؟ یہاں

بات بھی قابلِ غور ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو وہ قوت و اقتدار کہاں حاصل تھا جس کے بل بوتے پر وہ بغیر کسی دلیل و برہان کے خلافت
کی بیعت یا انصار و مہاجرین کے ہاتھوں سے زبردستی چھین لیتے۔ ان کا بغیر حیلہ سازی، بغیر مکر و فریب اور بلا ایک قطرہ خون بہائے
خلافت کے منصب پر پہنچ جانا خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ اسلامی حکومت کی سربراہی کے ہر شخص سے زیادہ مستحق اور سزاوار تھے
اور اس کو چلانے کی ہر شخص سے زیادہ صلاحیت رکھتے تھے۔ خلافت حاصل کرنے کے بعد دین کی جڑوں کو مضبوط کر دینا اور اسلامی حکومت
کو نئی زندگی بخشنا یہ ساری باتیں اس امر کا مزید روشن ثبوت ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ کے متعلق آخری بات جو دلیل کے تھا اور واقعات کی روشنی میں کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ امین تھے بلکہ امین
سے بھی بڑھ کر اگر کوئی لفظ ہو تو اس کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ آپ امین تھے اور اس لئے امین تھے کہ جاہلیت اور اسلام کسی بھی دور میں
خیانت نہیں کی۔ امین سے بھی بڑھ کر اس لئے تھے کہ امین تو صرف امانت واپس کر دیتا ہے اور بس۔ لیکن جو شخص امانت کے ساتھ ساتھ
اس کی اجرت بھی مزید مال و دولت کی صورت میں ادا کر دے، اس کو اگر امین سے بھی بڑھ کر کوئی لقب نہ دیا جائے تو اور کیا کیا جائے

حضرت ابوبکرؓ زمانہ جاہلیت میں امانتیں ادا کرتے رہے اور اس کے ساتھ مزید مال و دولت بھی بطور احسان دیتے رہے۔
پھر امانت کبریٰ یعنی خلافت آپ کے سپرد کی گئی۔ دنیا سے رخصت ہوتے وقت اس امانت کو بھی مزید اضافہ کے ساتھ واپس کیا
اگر ہم یہ کہیں کہ آپ نے اخلاق و زندگی کی امانت کے معاملہ میں بھی امین ہونے کا ثبوت دیا تو یہ بھی حقیقت ہی ہوگی۔ آپ جس
حالت میں پیدا ہوئے اس سے بہتر حالت میں مرے۔ بقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نحیف و ناتواں ساخت پائی اور اپنی باطنی قوت
کی تکمیل کی۔ اپنی مروت سے اپنی وضعداری پر پر توڑا لا اور خود اپنے اندر سے ایسی شخصیت پیدا کر لی جو جسمانی شخصیت سے مختلف اور اس
کی ترقی یافتہ صورت تھی۔ آخر ش ہیبت و جلال کے اس مقام پر پہنچ گئے جو اس قسم کی ساخت والوں کو نہیں میسر آیا کرتا۔

لوگ آخر کیوں ایسے شخص کے حوالے اپنی امانتیں نہ کرتے جب کہ انہیں یہ یقین تھا کہ وہ جو کچھ دے رہے ہیں مزید اضافہ کے ساتھ
واپس آجائیگا۔ زندگی آخر اپنی امانت کیوں ایسے شخص کے سپرد نہ کرتی جب کہ اس کو یہ یقین تھا کہ اس کی عطا کردہ امانت اضافے کے
ساتھ واپس آجائے گی۔ ہر امانت خواہ اس کا دینے والا کوئی ہو محفوظ و مصئون تھی بلکہ نفع پر چلنے والا مال تھی۔ جو اصل مال کے ساتھ
نفع بھی لاتی تھی۔

آپ کا اجمالی خاکہ یہ ہے کہ آپ امین تھے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔
دوستی و صداقت میں امین تھے، حکومت میں امین تھے، سیرت و کردار میں امین تھے، ایمان میں امین تھے بلکہ ہر معاملہ میں امین سے بڑھ کر
تھے۔ فطری اسباب نے گمراہی کے فتنے سے محفوظ رکھا۔ شریف پیدا ہوئے، بڑوں میں عزیز بن کر رہے اور کمزوروں پر ظلم و طغیان سے واسطہ نہ رکھا۔
بڑے بوڑھے ہوئے مگر ڈکٹیٹر شپ سے دامن داغدار نہ ہوا اور نہ لوگوں پر زبردستی تسلط جمانے کی کوشش کی۔
بوڑھے ہوگئے مگر شعور کی حرارت، یقین کے جوش، مروت، وقار اور گرویدگی رسول ﷺ میں کوئی فرق نہ پڑا۔
بوڑھے ہوئے اور ہر فضیلت بڑی ہوکر اپنی انتہا کو پہنچ گئی، جب وفات پائی تو ہر پہلو سے ایک عظیم انسان کی صورت میں
وفات پائی اور اس شان کے ساتھ کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا سہرا سر پر تھا۔
نبی ﷺ کے بعد ہر چیز میں ثانی رہے۔ قبول اسلام میں ثانی۔ خلافت سنبھالنے میں بھی ثانی۔ اسلامی دعوت کو حیات نو بخشنے
میں ثانی۔ ہر معاملہ میں ثانی مگر اتباع و اقتدا اور لبیک کہنے میں اول تھے۔

"ابوبکرؓ" از :- عباس محمود العقاد

ترجمہ :- منہاج الدین اصلاحی

ہماری نظر میں

قادیانیت مطالعہ و جائزہ

از :- مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ، ضخامت ۲۲۸ صفحات (بڑا سائز) مجلد ، رنگین گرد پوش ، چکنا سفید کاغذ روشن کتابت ، دیدہ زیب طباعت ؛ قیمت چار روپے ۔

ملنے کا پتہ :- مکتبہ دینیات ۱۳۴ شاہ عالم مارکیٹ ، لاہور ۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (متع اللہ المسلمین بطول حیاتہ) نہ صرف پاکستان اور ہندوستان بلکہ تمام عالم اسلام میں شہرت اور مقبولیت رکھتے ہیں ، وہ ایک صاحب تقوی اور مفکر عالم ہیں ۔ ان کی عربی انشا پردازی کی سارے عالم عرب میں دھوم ہے ، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کی زندگی خدمت دین کے لئے وقف ہے ، سفر ہو حضر ہو ، جلوت ہو یا خلوت ، ہر عالم میں وہ اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت ہی میں کسی نہ عنوان سے منہمک رہتے ہیں !

"قادیانی مذہب" پر بہت سی کتابیں اب تک آچکی ہیں ، ان میں سب سے زیادہ مشہور اور کار آمد کتاب پروفیسر الیاس برنی مرحوم کی تالیف ہے ، جس نے قادیانیت کو پوری طرح بے نقاب کر دیا ہے ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا مشہور رسالہ (قادیانی مسئلہ) اگرچہ مختصر ہے مگر قادیانیت کے رد میں "حرفِ آخر" ہے ، یہ رسالہ ایک لاکھ سے بھی زائد تعداد میں فروخت ہوا ہے ۔

مگر

مولانا علی میاں مدظلہ کی یہ کتاب ——— قادیانیت ——— بعض خصوصیات کے اعتبار سے اپنی جگہ ممتاز و منفرد ہے انھوں نے اس کتاب میں مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے نائب اول حکیم نورالدین بھیروی کے حالات زندگی لکھے ہیں ، پھر باب دوم میں مرزائے قادیان کے عقیدہ اور دعوت کا تدریجی ارتقاء اور دعاوی کی ترتیب پیش کی ہے ، اس باب میں انھوں نے مرزا کے ایک طویل عربی الہام کو بلفظ لفظاً نقل کر کے لکھا ہے :-

"..... مرزا صاحب کے جملے ہندوستانی عربی کا ایک نمونہ ہیں ..... اس میں عربیت اور نحو کی بھی فاش غلطیاں ہیں :" (صفحہ ۵۵ ، ۵۶)

پھر انھوں نے بتایا ہے کہ حکیم نورالدین کے مشورہ سے مرزا نے مسیح موعود ہونے کا دعوی کیا ہے ، اور یہ مشورت خود اس شخص کے دعویٰ کی قلعی کھول دیتی ہے ——— کیوں کہ :-

"... انبیاء و مرسلین کا معاملہ ان خارجی تحریکات ، مشوروں اور رہنمائیوں سے بالکل الگ ہے ، ان پر آسمان سے وحی نازل ہوتی ہے اور ان کو ان کے منصب و مقام کی قطعی اور واضح طریقہ پر خبر دی جاتی ہے ، وہ اس یقین سے سرشار ہوتے ہیں اور پہلے دن سے اس کا اعلان اور اس پر اصرار کرتے ہیں ، ان کے عقیدہ اور دعوت کا سلسلہ کسی تجویز یا رہنمائی کا رہین منت نہیں ہوتا (صفحہ ۶۸)

پھر فاضل مصنف نے اس چیز کو واضح کیا ہے کہ مرزائے قادیان (علیہ ماعلیہ) اپنے دعودی کی تائید میں احادیث نبوی ؐ میں کیسی کیسی بعید از قیاس تاویلوں اور موشگافیوں سے کام لیتے تھے۔ نزول مسیح ؑ کی تفصیلات جن روایات میں بیان کی گئی ہیں، ان میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت مسیح کا نزول دمشق میں ہوگا، ساری دُنیا جانتی ہے کہ ملک شام کے ایک شہر کا دمشق نام ہو مگر مرزا نے اس سے قادیان مراد لیا، اور روایت کے اس جُز کی کہ "نزولِ مسیح ؑ کے وقت اُن پر دو زرد چادریں ہوں گی" یہ مضحکہ خیز تاویل فرمائی:۔

"میں ایک دائم المریض آدمی ہوں، اور وہ دو زرد چادریں جن کے بارے میں حدیثوں میں ذکر آیا ہے کہ ان دو چادروں میں مسیح کا نزول ہوگا، وہ دو زرد چادریں میرے شامل حال ہیں، جن کی تعبیر علم الرویا کی رُو سے دو بیماریاں ہیں، سو ایک چادر میرے اوپر کے حصہ میں ہے کہ ہمیشہ سر درد اور دورانِ سر اور کمی خواب اور تشنج دل کی بیماری دورہ کے ساتھ آتی ہے اور دوسری چادر جو میرے نیچے کے حصّہ بدن میں ہے، وہ بیماری ذیابطیس ہے کہ ایک مدت سے دامن گیر ہے اور بسا اوقات سو سو دفعہ رات کو یا دن میں پیشاب آتا ہے اور اس قدر کثرت پیشاب سے جس قدر عوارض ضعف وغیرہ ہوتے ہیں وہ سب میرے شامل حال رہتے ہیں۔"

اس قسم کی انمل بے جوڑ تاویلیں ایک بازاری آدمی (STREET WALKER) کو بھی زیب نہیں دیتیں، چہ جائیکہ ایک "مدعیٔ نبوت" کے قلم سے ان کا ظہور ہو!

مرزائے قادیان نے اپنی کتابوں میں جو اپنے مخالفین پر طنز و استہزا کیا ہے اس پر مولانا علی میاں کی یہ تنقید کتنی معقول اور منصفانہ ہے:۔

ان تینوں تصنیفات میں مرزا صاحب کی طبیعت کا جوش بہت بڑھ گیا ہے، اور ان کی تحریروں میں طنز و تعریض کا ایک ایسا عنصر اور ایسی تلخی آگئی ہے، جس کی وجہ سے یہ کتابیں "سنجیدہ بحث و نظر کی کتابوں اور اصلاحی و دعوتی تصنیفات کے بجائے ہجو و طنز کی کتابوں میں شامل ہو جاتی ہیں، ان کتابوں میں مرزا صاحب نے جو اسلوبِ تحریر اختیار کیا ہے، وہ پیغمبروں سے قطع نظر اور مصلحین و مجددین کو بھی چھوڑ کر متین و سنجیدہ مصنفین اور باوقار اہل قلم سے بھی کوئی مناسبت نہیں رکھتا، انھوں نے حیات و نزولِ مسیح کے عقیدہ کا اور اس کے ماننے والوں کا جس انداز میں مذاق اڑایا ہے، وہ ایک علمی بزم سے زیادہ امراء کے درباروں اور مصاحبوں کی فقرہ بازیوں سے مشابہ ہے، نیز اُن کے اندر جو جدلانہ روح اور وکیلانہ موشگافیاں ہیں اُن کو کلامِ نبوت اور مزاجِ نبوت سے کوئی مناسبت نہیں۔" (صفحہ ۴۸)

اور

"ان کتابوں میں مرزا صاحب نے احادیث میں آئے ہوئے الفاظ و کلمات کی تشریح و تاویل اور اُن کے مصداق تجویز کرنے میں ایسی فیاضی اور بے تکلفی سے کام لیا ہے، جو کسی مصنف اور شاعر کے لئے اپنے کلام کی تشریح میں بھی مشکل ہے، انھوں نے ان تمام الفاظ کو مجازات و استعارات قرار دے دیا ہے، اور ان باطنیہ متقدمین کی یاد تازہ کر دی ہے، جو دینی اصطلاحات

اور ان شرعی اصطلاحات کے (جن کے لفظ و معنی دونوں تواتر سے چلے آتے ہیں) ایسے دُور از کار اور
مُضحک معنی بیان کرتے ہیں، جن کے لئے نہ کوئی لغوی بنیاد تھی، نہ عقلی اور اس طرح امت میں
الحاد و فساد کا ایک بڑا دروازہ کھول دیا تھا۔ ۔ ۔" (صفحہ ۸۵، ۸۶)

اس کتاب میں مرزا غلام احمد کی خانگی زندگی کے اس رُخ کو بھی دکھایا گیا ہے کہ اُس کے ماننے والوں کی عقیدت اور فیاضی کے سبب فتوحات ہونے لگیں تو سیاسی لیڈروں اور طالع آزما رہنماؤں کی طرح، اس کی خانگی زندگی، ترفہ، تجمل اور عیش و تنعم کی زندگی بن گئی۔ مرزا کی عیش پسندانہ زندگی پر خود اس کے متبعین نے احتجاج کیا، خواجہ کمال الدین نے ایک موقعہ پر مولوی محمد علی سے کہا:

"یہ کیسے غضب کی بات ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ قوم کا روپیہ کس محنت سے جمع ہوتا ہے
اور جن اغراض قومی کے لئے وہ اپنا پیٹ کاٹ کر روپیہ دیتے ہیں، وہ روپیہ ان اغراض میں
صرف نہیں ہوتا بلکہ بجائے اس کے شخصی خواہشات پر صرف ہوتا ہے۔"

اور

"پھر خواجہ صاحب نے ایک ڈیپوٹیشن کے موقع پر جو عمارت مدرسہ کا چندہ لینے گیا تھا مولوی
محمد علی سے کہا کہ حضرت (مرزا) صاحب آپ تو خوب عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں اور
ہمیں یہ تعلیم دیتے ہیں کہ اپنا خرچ گھٹا کر بھی چندہ دو جس کا جواب محمد علی نے یہ دیا کہ ہاں!
اس کا انکار تو نہیں ہو سکتا، لیکن بشریت ہے، کیا ضرور ہے کہ ہم نبی کی بشریت کی پیروی
کریں۔"

اس کے بعد اس معرکہ آرا کتاب میں مرزا غلام احمد قادیانی کی تحریروں کے وہ اقتباسات دیئے ہیں جن میں انگریزی حکومت کی نیاز مندی اور وفاداری کا اعتراف اور فریضہ جہاد کی حرمت کا اعلان ہے، مرزائے قادیان نے اپنے عربی رسالہ "نور الحق" میں یہ تک لکھ دیا کہ ان کا وجود انگریزی حکومت کے لئے ایک قلعہ اور حصار اور تعویذ کی حیثیت رکھتا ہے۔" اور مرزا نے ۲۴ فروری ۱۸۹۸ء کو پنجاب کے لفٹنٹ گورنر کی خدمت میں جو درخواست گزرانی تھی، اس میں تحریر کیا:۔

"یہ التماس ہے کہ سرکار دولت مدار ایسے خاندان کی نسبت جس کو پچاس سال کے متواتر تجربہ
سے ایک وفادار جاں نثار خاندان ثابت کر چکی اور جس کی نسبت گورنمنٹ عالیہ کے معزز حکام
نے ہمیشہ مستحکم رائے سے اپنی چٹھیات میں یہ گواہی دی ہے کہ قدیم سے سرکار انگریزی
کا خیرخواہ اور خدمت گزار ہے اور اس خودکاشتہ پودے کی نسبت نہایت حزم و احتیاط
اور تحقیق و توجہ سے کام لے، اور اپنے ماتحت اور اخلاص کا لحاظ رکھ کر، مجھے اور میری
جماعت کو عنایت اور مہربانی کی نظر سے دیکھیں۔"

فاضل مصنف نے مرزائے قادیان کی انگریزی حکومت کے ساتھ اس نیاز مندانہ روش پر جو تبصرہ فرمایا ہے، وہ پڑھنے کے لائق ہے

"مرزا صاحب حکومت برطانیہ کا اقبال اور اُس کے وسعت و استحکام دیکھ کر یقین رکھتے
تھے کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کو کبھی زوال نہیں آئے گا۔ ان کے نزدیک وفاداری
کا تقاضا اس کی قسمت سے اپنی قسمت وابستہ کر دینا، ایک بڑی سیاسی دور بینی

اور اعلیٰ درجہ کی تدبیر کی بات تھی حقیقت یہ ہے کہ جو شخص دینی فراست اور سیاسی بصیرت دونوں سے محروم ہو، اس کا یہی فیصلہ و اندازہ ہوگا، ان کے علم و ادراک پر یہ بات بالکل مخفی رہی کہ ان کے انتقال پر نصف صدی نہ گزرنے پائے گی کہ یہ غیر متزلزل انگریزی حکومت جس کو وہ "سایہ اللہ" اور "دولت دین پناہ" سمجھتے تھے، ہندوستان سے اس طرح کوچ کر جائے گی کہ جیسے کبھی اس کا یہاں وجود نہ تھا، اور نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ساری دنیا میں اس کا ستارۂ اقبال غروب ہو جائے گا:

"مرزا غلام احمد صاحب نے اس غیر اسلامی مخالف اسلام حکومت سے جس طرح اپنی نیاز مندی کا اظہار کیا ہے، اور جس جوش کے ساتھ مسلمانوں کو محکومی اور غلامی زندگی کو نعمت سمجھنے کی تلقین کی ہے، اس کو اس منصب و مقام سے کوئی مناسبت نہیں جس کے وہ مدعی ہیں۔" (صفحہ ۱۴۱)

...ب چہارم میں، جو اس کتاب کا آخری باب ہے، یہ ثابت کیا گیا ہے کہ "قادیانیت" اسلام کے دینی نظام کے مقابلہ میں ایک ...وازی امت اور جداگانہ مذہب ہے۔ میرزا بشیر الدین محمود نے جمعہ کے خطبہ (مطبوعہ اخبار "الفضل" ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء) میں ...صاف طور پر اس کا اعلان کیا:-

"یہ غلط ہے کہ دوسرے لوگوں سے ہمارا اختلاف صرف وفاتِ مسیح یا چند مسائل میں ہے اللہ تعالیٰ کی ذات، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، غرض آپ نے تفصیل سے بتایا کہ ایک ایک چیز میں ہمیں ان سے اختلاف ہے۔"

اور یہ کہ

"حضرت خلیفہ اول نے اعلان کیا تھا کہ ان کا (مسلمانوں کا) اسلام اور ہے، اور ہمارا اور ہے۔"

(اخبار "الفضل" ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء)

...یہ باتیں مرزا قادیان کے متبعین نے عقیدت کے جوش میں نہیں کہیں بلکہ خود مرزا غلام احمد نے قادیان کو سرزمین حرم سے تشبیہ دی ...ہے، اس کا ایک شعر ہے:- ؎

زمینِ قادیان اب محترم ہے ہجومِ خلق سے ارضِ حرم ہے

...بحث چھیڑنے کا یہاں موقع نہیں ہے کہ انبیاء کرام شاعری نہیں کیا کرتے تھے شعر گوئی ان کے منصب سے فروتر ہے، اور اگر کوئی ...بہ فرضِ محال شاعری کرتا تو اس کی شاعری کیا ایسی گھٹیا ہوگی، جس کا نمونہ غلام احمد قادیانی کے مندرجہ بالا شعر میں ملتا ہے! حد ہوگئی غلط بیانی، اور دھاندلی کی کہ مرزا غلام احمد نے یہ تک کہہ دیا کہ "مسجد اقصیٰ سے مراد مسیح موعود کی مسجد ہے" اور ...ول شریف میں قادیان کا ذکر ہے۔" (تذکرہ یعنی مجموعہ وحی مقدس صفحہ ۳۴۵، ۳۴۶)

...نئے مذہب اور جدید احمدیت کے تصورات اور تعلیمات کا یہ نتیجہ نکلا کہ قادیان کے سفر کو حج بیت اللہ پر ترجیح دی جانے لگی!

خالص ہندوستانی مذہب ہونے کی حیثیت سے ہندو مفکرین نے "قادیانیت" کا کس طرح خیر مقدم کیا، اس کے اقتباسات اس ...کتاب میں دیئے گئے ہیں۔ ڈاکٹر شنکر داس مہرہ جو ایک ہندو مضمون نگار ہیں لکھتے ہیں:-

"..... جس قدر مسلمان احمدیت کی طرف راغب ہوں گے، وہ قادیان کو اپنا مکہ تصور کرنے لگیں گے اور آخر میں محب ہند اور قوم پرست بن جائیں گے، مسلمانوں میں احمدیہ تحریک کی ترقی ہی عربی تہذیب اور پان اسلام ازم کا خاتمہ کر سکتی ہے"

"جب کوئی مسلمان احمدی بن جاتا ہے، تو اس کا زاویہ نگاہ بدل جاتا ہے۔ حضرت محمد ﷺ میں اس کی عقیدت کم ہوتی چلی جاتی ہے .... یہی وجہ ہے کہ ایک مسلمان احمدیہ تحریک کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتا ہے، وہ جانتے ہیں کہ احمدیت ہی عربی تہذیب اور اسلام کی دشمن ہے، خلافت کی تحریک میں بھی احمدیوں نے مسلمانوں کا ساتھ نہیں دیا۔"

فاضل مصنف نے بڑی سچی بات کہی ہے:۔

"اسلام کے خلاف وقتاً فوقتاً جو تحریکیں اٹھیں، ان میں قادیانیت کو خاص امتیاز حاصل ہے وہ تحریکیں یا تو اسلام کے نظامِ حکومت کے خلاف تھیں، یا شریعتِ اسلام کے خلاف، لیکن قادیانیت درحقیقت نبوت محمدی ﷺ کے خلاف ایک سازش ہے وہ اسلام کی ابدیت اور اُمت کی وحدت کو چیلنج ہے، اس نے ختم نبوت سے انکار کر کے اس سرحدی خط کو بھی عبور کر لیا، جو اس امت کو دوسری امت سے ممتاز و منفصل کرتا ہے۔" (صفحہ ۱۴۳)

"قادیانیت" کے بارے میں علامہ اقبالؒ کی تحریروں کے اقتباسات بھی اس کتاب میں دیئے گئے ہیں، ہم یہاں ایک مختصر سے اقتباس کو درج کرتے ہیں۔

"پس میرے خیال میں وہ تمام ایکٹر جنھوں نے احمدیت کے ڈرامہ میں حصہ لیا ہے، زوال اور انحطاط کے ہاتھوں میں محض سادہ لوح کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔"

اس کتاب میں مرزا غلام احمد کی پیش گوئیوں کو بھی کتاب کے حوالوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ اس شخص کی ایک پیش گوئی بھی پوری نہیں ہوئی سب کی سب غلط اور جھوٹ ہی نکلیں۔

کتاب کے آخری باب کی فصل سوم میں "قادیانیت کی لاہوری شاخ اور اس کے عقیدہ و تفسیر" کو بے نقاب کیا گیا ہے کہ

"مولوی محمد علی صاحب، مرزا صاحب کو چودھویں صدی کا مجدد اعظم اور مصلح اکبر اور اس سے بڑھ کر یہ کہ مسیح موعود مانتے ہیں اور اس نقطہ پر دونوں شاخوں کا اجتماع ہو جاتا ہے۔" (صفحہ ۲۰۲)

اسی قسم کے اتحاد و اجتماع کو تو "الکفر ملت واحدہ" کہتے ہیں۔

اس کے بعد لائق مصنف نے مولوی محمد علی لاہوری کی "تفسیر قرآن" کی غلطیاں ظاہر کی ہیں کہ اُس شخص نے "تفسیر بالرائے" کا کس قدر مضحکہ انگیز ثبوت دیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے کلام کے ساتھ کس بیباکی کے ساتھ تلاعب کیا ہے۔

فاضل مصنف نے کتنے پتہ کی بات کہی ہے، سچی اور بے لاگ۔۔

"..... وہ (مرزا غلام احمد) اگر کسی چیز میں کامیاب کہے جاسکتے ہیں، تو صرف اس میں کہ

انھوں نے اپنے خاندان اور ورثا کے لئے سر آغا خاں کے اسلاف کی طرح پیشوائی کی ایک مسند اور ایک قسم کی ریاست پیدا کر دی ہے، جس کے اندر ان کو روحانی سیادت اور مادی عیش و عشرت حاصل ہے۔" (صفحہ ۲۲۳)

کتاب کا رنگ نہ جذباتی ہے اور نہ مناظرانہ، قادیانیوں کی کتابوں کے مستند حوالوں کے ساتھ تاریخی اور واقعاتی رنگ میں حقائق سے گفتگو کی ہے، یہ کتاب اس قابل ہے کہ مسلمانوں میں مولانا عبدالماجد دریابادی (مدیر صدق) جیسی ذہنیت رکھنے والے اشخاص کو مطالعہ کے لئے دی جائے تاکہ "قادیانیت" کے معاملہ میں اُن کے ذہن صاف ہو سکیں، اور خود قادیانیوں میں بھی اس کتاب کو پھیلنا چاہیئے، کیا عجب ہے کہ جن دلوں اور دماغوں میں گرد و غبار کی تہوں کے نیچے حق پسندی کے نقوش چھپے ہوئے ہیں وہ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اُبھر آئیں، اور انہیں قبولِ حق کی توفیق نصیب ہو۔

قدیم مشرق

از :- سید عین الحق، ایم اے، لکچرار شعبہ تاریخ اُردو کالج، کراچی، جلد اول ضخامت ۴۴۲ صفحات قیمت پانچ روپیہ جلد دوم ۵۶۰ صفحات، چھ روپیہ چار آنہ (دونوں حصوں کی قیمت دس روپیہ دس آنہ) مجلد۔

ملنے کا پتہ :- مکتبہ فریدی، اُردو کالج، اُردو روڈ، کراچی۔

جناب سید عین الحق ایم اے نے اس کتاب کو بڑی محنت، اور فکر و کاوش کے ساتھ مرتب فرمایا ہے، اس ایک کتاب کے لئے انہیں عربی، فارسی، انگریزی اور اردو کی درجنوں کتابیں مطالعہ کر لی پڑی ہیں لہٰذا اردو زبان میں اس موضوع پر اس قدر تفصیل کے ساتھ یہ پہلی کتاب ہے جو منظر عام پر آئی ہے! حصہ اول چار ابواب ——— مقدمہ، وادئ نیل، وادئ دجلہ و فرات، ارض شام ——— پر، اور حصہ دوم ——— سرزمین ایران، ہند و پاکستان اور ملک چین پر ——— مشتمل ہے ہر باب میں اس خطہ کے مذہب، علوم و فنون، تمدن و تہذیب، سیاسی نظام، قدیم آثار، مصنوعات، زراعت و تجارت اور دوسرے ضروری متعلقات کو خاصی تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے، یہ کتاب ہر اعتبار سے معلومات آفریں ہے، اور عوام و خواص بھی کو اس کے پڑھنے سے فائدہ ہوگا!

مصنف نے اپنے فاضلانہ مقدمہ میں "ذہن مغرب" پر کتنی نفسیاتی تنقید فرمائی ہے :-

"..... مغرب ذہن کی دوسری اہم کمزوری یہی ہے کہ اس میں ایک جانب بے بنیاد احساس برتری پایا جاتا ہے اور دوسری جانب تنگ نظری کا وہ جذبہ ہے جو اسے دوسری قوموں کے ساتھ انصاف کرنے میں مانع ہوتا ہے۔"

فاضل مصنف کے قلم سے یہ عبارت پڑھ کر، اُن کے لئے دل سے دعائیں نکلیں، کہ وہ اسلام کی ابدیت پر کتنا محکم یقین رکھتے ہیں فرماتے ہیں :-

"ظہور اسلام سے جو نتائج پیدا ہوئے، وہ بھی تاریخی اعتبار سے بے مثال ہیں : یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ دین و سیاست مل کر انسان کی پوری زندگی کا خاکہ مرتب کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دینی حیثیت سے اسلام نے آخری دین ہونے کا دعویٰ کیا اور یہ دعویٰ بہر حال ثابت ہو کر رہا دورِ قدیم کی یہ روش جس میں آئے دن نئے دینوں کا افتتاح ہوتا رہتا تھا ظہور اسلام کے بعد یک لخت ختم ہو کر رہ گئی اور اب

اس معدنِ صلاحیت میں وہ جوہر ہی باقی نہ رہے، جو اسلام سے بہتر یا اس کے متوازی کوئی
دین پیش کر سکیں۔۔۔۔" (صفحہ ۱۲)

حمورابی کے قانون کی دنیا میں بڑی دھوم ہے، مگر اس کے قانون کی سختی کا یہ حال ہے کہ عبادت گاہ کے سامان چرانے والے اور اُس سامان کے خریدنے والے، دونوں کی سزا قتل ہے اگر کوئی شخص کسی کے گھر میں نقب لگائے تو حمورابی کی تعزیرات کے مطابق اُس شخص کو نقب زدہ مقام پر ہی قتل کیا جائے اور اُسی جگہ اُسے دفن کر دیا جائے ———— اور[1] اگر کوئی مکان اچانک بیٹھ جائے اور اس کے گرنے سے مالک ہلاک ہو جائے، تو معمار کی سزا قتل ہے، اور اگر اُس حادثہ میں مالک مکان کا بیٹا مر جائے، تو بدلے میں معمار کا بیٹا قتل کیا جاتا ہے، اسی طرح اگر کوئی کسی کی لڑکی کو مار ڈالے، تو مجرم کی بے گناہ لڑکی کو بدلے میں قتل کیا جائے (صفحہ ۲۵۱)

غرقِ فرعون کے بارے میں فاضل مصنف کی تحقیق یہ ہے :۔

"۔۔۔۔۔ وہ فرعون جو غرق ہوا کون تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ اب تک لاینحل ہے،
عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ وہ رعمسیس دوم تھا، مگر رعمسیس کا عہد ۱۳۰۰ء تا ۱۲۳۲ء
قبل مسیح کے لگ بھگ ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس لئے قرین قیاس یہ ہے کہ
بنی اسرائیل کا خروج ۱۳۷۵ء یا ۱۲۷۶ء ق۔م آمن حوطف سوم کے عہد میں ہی ہوا
اور یہی وہ فرعون ہے جس نے حضرت موسیٰؑ کا تعاقب کیا اور بحیرۂ قلزم میں غرق ہوا۔
بہرحال یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے۔ (صفحہ ۳۴۵، ۳۴۶)

فرعون (PHAR ————) کے معنی اس کتاب میں "بڑے محل میں رہنے والا" بیان کئے گئے ہیں

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ "بابلی مذہب کی اساس شرک و بت پرستی پر قائم تھی۔ مختلف کاموں کی انجام دہی کے لئے مختلف دیوتا مقرر تھے اور شہروں کے معبود جُدا جدا تھے۔۔۔۔۔" بابلی کتبوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام معبودوں میں انو (ANU) سب سے قدیم طاقتور اور با اثر تھا۔ تمام دیوتا اسی کی نسل سے تھے (صفحہ ۲۵۴، ۲۵۵)

اس کتاب میں "حروفِ تہجی" کا موجد فینقیوں کو بتایا گیا ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے مصریوں کی تصویری علامات کو حروفِ تہجی میں تبدیل کیا۔

اُپنشد کے بارے میں فاضل مصنف کی یہ رائے بہت وزنی ہے :۔

"اُپنشدوں کی آخری منزل ہی عالم حیرت قرار دی جائے گی، ان کی تعلیم کو عملی زندگی سے کوئی
تعلق نہیں بلکہ اُن کا سارا زور رہبانیت اور ترکِ دُنیا پر ہے، یہ تخیلات کے جال میں پھنسا کر
انسان کو "فرار" کی دعوت دیتے ہیں۔"

"تقدیم مشرق" کے مصنف کا انداز بیان[2] سادہ اور عام فہم اور زبان منجھی ہوئی ہے، اس کتاب نے اردو ادب میں کوئی شک نہیں اضافہ کیا ہے!

نغمۂ حسرت	از۔ شفقت کاظمی، ضخامت ۱۰۴ صفحات، مجلد، رنگین گرد پوش کے ساتھ قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ :۔ علمی کتب خانہ، مظفر گڑھ۔

[1] صفحہ ۳۲۱ (جلد دوم)، پر "غیظ" کو "غیض" املا کیا گیا ہے، جو غلط ہے!

جناب شفقت کاظمی معروف غزل گو شاعر ہیں، ملک کے مشہور رسائل و جرائد میں اُن کا کلام چھپتا رہتا ہے، اُن کے پہلے مجموعۂ کلام حسرت کدہ پر فاران میں تبصرہ آ چکا ہے، اب ان کی غزلوں کا دوسرا مجموعہ منظرِ عام پر آیا ہے! شفقت کاظمی نے مولانا احمد افضل بدر (مالک علمی کتب خانہ مظفر گڑھ) کا بجا طور پر شکریہ ادا کیا ہے کہ شفقت صاحب کے دونوں مجموعے انہی نے خاص اہتمام سے شائع کئے ہیں، ورنہ آج کی دنیا میں نہ جانے کتنے شعراء اپنے کلام کے مسودے لئے بیٹھے ہیں، اور انہیں کوئی ناشر میسر نہیں آتا۔

"نغمۂ حسرت" پر ایک صفحہ کا دیباچہ (بعنوان "اشارات") پروفیسر آلِ احمد سرورؔ نے تحریر فرمایا ہے جس میں انھوں نے ان الفاظ میں شاعر کو خراجِ تحسین و ستائش پیش کیا ہے:-

> "جناب شفقت کاظمی کی غزلوں میں سوز و گداز ہے، دل سے نکلی ہوئی کیفیت ہے، حسن کا احساس ہے، عشق کی عظمت کی جھلک ہے، ان کی غزلوں میں لطیف چاندنی، دھیمی لے مدھم آواز، نازک اشارے کا لطف ہے"

جناب آلِ احمد سرورؔ صفِ اول کے انشا پرداز و ناقد ہیں، مگر "غزلوں میں لطیف چاندنی" سے نہ جانے انھوں نے کس خیال کی ترجمانی کی ہے؟ سرورؔ صاحب کے علاوہ ابو الفصاحت جوشؔ ملسیانی جیسے سن رسیدہ صاحبِ فن استاد اور ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی جیسے جدید تنقید نگار نے بھی شفقت کاظمی کی غزلوں کو بہت سراہا ہے!

کوئی شک نہیں شفقت کاظمی نے مولانا حسرت موہانی مرحوم کے اندازِ غزل کی خاصی کامیاب تقلید کی ہے اور کہیں کہیں تو حسرت کی لَے میں لَے ملا دی ہے، اُن کی شاعری چوٹ کھائے ہوئے دل کی آواز ہے، جس میں: ؎

نغمہ کم ہے زیادہ فُغاں ہے

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ استاد کی پیروی و تقلید کے ساتھ ساتھ شاگرد کے کلام میں اس کا اپنا آہنگ بھی پایا جاتا ہے، تقلید و انفرادیت کا یہ امتزاج بہت خوشگوار ہے!

چند منتخب اشعار:-

جو گزرنی تھی محبت میں سو گزری مجھ پر — اب تلافی نہ کرے حسنِ پشیماں تیرا
یہ عہدِ محبت ہے مری زیست کا ضامن — اس عہدِ محبت کو کہیں بھول نہ جانا
بہت دشوار ہے اُس کا بھلانا — تری صحبت میں گزرا جو زمانہ
تیری محفل میں رسائی تو کہاں — ہم نے پردہ در سے دیکھ لیا[1]
در خورِ شیوۂ بیداد رہا — میں بہر حال انہیں یاد رہا
بجا کہ اُن سے نہ رکھیں گے کوئی ربط مگر — وہ آپ سلسلہ جنباں ہوئے تو کیا ہوگا

---

[1] جگر مرادآبادی کا یہ شعر ہمیں بے ساختہ یاد آ گیا:- ؎
اُن کی حریمِ ناز کہاں اور ہم کہاں — نقش و نگارِ پردۂ در دیکھتے رہے

اب پریشانیوں سے کیا حاصل — کچھ کچھ کر مجھے مٹانا تھا

ہم کہاں پھر ترا دیار کہاں — کوئی دن اور ہے قیام اپنا

ہم کو اب تک ٹھکانہ میسر نہیں — جانے چھوٹا تھا کب آستانہ ترا

جیسے برباد ہوئے ہیں ہم لوگ.. — اس طرح کم کوئی اُجڑا ہوگا

تم سے جس کو نہ محبت ہوگی — وہ کوئی پیکرِ دنیا ہوگا

رابطہ اُن سے عقدۂ مشکل رہا — اک حجاب درمیاں حائل رہا

اپنی محرومیٔ قسمت کو دعا دیتا ہوں — نہ شکایت ہے کسی سے نہ گلہ تیرے بعد

نشاطِ روح کا ساماں بہم تو کیا ہوتا! — بڑھا گئے مری بے تابیاں وہ یاد آکر

جلتے ہیں حضورِ دوست لیکن — معلوم نہیں کہیں گے کیا ہم!

تم نے اچھا کیا اگر نہ سنا — دردِ دل لائقِ بیاں بھی نہیں

تری نگاہ نے کیں عذر خواہیاں کیا کیا — کبھی جو حرفِ شکایت زباں پہ لائے ہیں

اے دوست! یہ احتیاط کب تک — ہٹنے سے رہیں مری نگاہیں

چلا یاروں میں جب ذکرِ محبت — مرے قصے تری باتیں رہی ہیں

جو بیگانہ ہیں شفقت آج ہم سے — کبھی اُن سے ملاقاتیں رہی ہیں

وہاں سے اٹھ کر مجھے محسوس یہی ہوتا ہے — جیسے وہ بھی مرے ہمراہ چلے آئے ہیں

پہنچے نہ تمہیں گزند کوئی — ہر غم ہے مجھے قبول یارو

بڑا کٹھن ہے، غمِ دل کا راستہ شفقت — خیالِ یار کی لہروں سے کھیلتے جاؤ

تجھ سے اے دوست! ربطِ شوق اپنا — اک ادا تھی زمانہ سازی کی

مجھ کو پوچھا نہ کاظمی اُس نے — دھوم تھی جس کی دلنوازی کی

گرا اُن کی نگاہوں سے تو سب نے پھیر لیں آنکھیں — نہ ہوتے وہ خفا مجھ سے تو دنیا کیوں خفا ہوتی

فکرِ دنیا میں توجہ بٹ گئی! — رفتہ رفتہ اُن کی چاہت گھٹ گئی

کیوں سزاوارِ بے رُخی ٹھہرے — ہم فقیروں نے کیا خطا کی ہے

اسی امید پہ ہم دیکھتے ہیں راہ تری — کبھی ادھر کو بھی شاید اٹھے نگاہ تری

چلا تھا لے کے جہاں سے متاعِ محرومی — مری نظر میں ہے اب تک وہ بارگاہ تری

خفا رہنے لگا ہے جب سے کوئی — محبت اور محکم ہو گئی ہے

اے آنکہ بہ عیش می گزاری — از حالِ دلم خبر نہ داری

— سعدی شیرازی کا یہ شعر قارئین کے لطف کو دوبالا کر دے گا ؎

چہ خطا ز بندہ دیدی کہ خلافِ عہد کردی

مگر آں کہ ما فقیریم و تو دستگاہ داری

تجھ کو بھولے تو اور یاد آئے　　اپنے عہد وفا کے افسانے
تجھے دیکھے ہوئے اک عمر بیتی　　مگر لطفِ تماشا کم نہیں ہے
ہوچکے مجھ پہ جو دُنیا کے ستم ہونے تھے　　تو بھی لے دوست! بڑی دیر کے بعد آئی ہے
یاد آتا ہے مجھے یاد نہ کرنا تیرا　　تجھ سے اتنا تو ابھی ربطِ شناسائی ہے
ہر گام پہ کیوں مجھ سے اُلجھتا ہے زمانہ　　جب مجھ کو زمانے سے کوئی کام نہیں ہے
کوئی دن اور صبر کرنا تھا　　بیت جاتی گھڑی جُدائی کی
یاد رکھیں گے ہم کو اہلِ چمن　　ہم بھی کچھ دن یہاں گزار چلے
غنچۂ دل میں وہ نمو نہ رہی　　اب نسیم و صبا ہزار چلے
تھی کشاکش تو مرگ و زیست میں تھی　　کیوں تری یاد درمیاں آئی
زباں پہ حرفِ شکایت ضرور آئے گا　　اگرچہ آپ سے مل کر ہمیں خوشی ہوگی
دیارِ دوست میں پہنچیں گے کس طرح شفقت　　جبیں پہ گردِ رہِ عاشقی جمی ہوگی
ربط اُن سے بہ ہر حال قائم رہا　　لاکھ دُشمن لگاتے بجھاتے رہے
لتنے مایوس دفا ہیں اب ہم　　جتنے مانوس وفا تھے پہلے
جن سے ہم تھیں وفا کی رسمیں　　ہائے وہ لوگ بھی کیا تھے پہلے
یہی نہیں کہ وہ ہم کو بُلا کے پچھتائے　　حضورِ دوست میں خود ہم بھی جا کے پچھتائے
انہیں بھی اپنی طبیعت پہ اب نہیں قابو　　وہ غمزدوں سے نگاہیں ملا کے پچھتائے
ہزار بار پڑا واسطہ انہی سے ہمیں　　ہزار بار انہیں آزما کے پچھتائے
تجھ سے بیاں کروں تو نہ آئے یقیں تجھے　　جیسے ترے بغیر گزرتی ہے زندگی
دشمنوں کی عنایتوں سے ہمیں　　دوستوں کے سلوک یاد آئے
اُٹھ کر ترے در سے جانے والے　　لوٹ آئیں گے پھر کسی بہانے
غیر سے مل کے اب اتنا بھی تجھے یاد نہیں　　تھے کبھی ہم بھی ترے ناز اٹھانے والے
سننے والا خود بخود مطلب سمجھتا جائے گا　　کہنے والا اپنے غم کا حال کہتا جائے ہے

بے سبب دنیا جو تھی مجھ سے گریزاں کاظمی
رفتہ رفتہ مجھ کو بھی دنیا سے وحشت ہوگئی

دوسرا رُخ:-

کیا یاد کروں گریۂ پیہم کی بہاریں　　ہر لختِ جگر زینتِ دامانِ نظر تھا

۱؎ ممکن ہے کہ کوئی صاحب اس پر معترض ہوں کہ "اب نسیم و صبا ہزار چلیں" کہنا تھا مگر آتش اسکول میں اس کی مثالیں ملتی ہیں، دیا شنکر نسیم کہتے ہیں ؎

ذرے کا بھی چمکے گا ستارہ　　قائم جو زمین و آسماں ہے

"دامانِ چشم" کی جگہ "دامانِ نظر" لانا ہی درست نہ تھا، پھر اس میں حد سے زیادہ مبالغہ پیدا ہوگیا ہے ______ پورے دل کے تمام ٹکڑے "شکنوں" میں اور پلکوں پر کس طرح ٹک سکتے اور سما سکتے ہیں۔

شاملِ حال جو تھا فضل نمایاں تیرا   فتنۂ غم نہ ہوا بندۂ احسان تیرا   (ص۲۰)

شعر کا مفہوم کس قدر گنجلک ہے!

لذتِ غم سے آشنا نہ ہوا   جو تری راہ میں فنا نہ ہوا   (ص۲۱)

غزل کا مطلع اور اس قدر بے کیف!

ہر مرض کا علاج تھا جو وہ نام   کیوں مرے درد کی دوا نہ ہوا   (ص۲۱)

شعر میں کوئی لطف نہیں، "ہر مرض کے علاج" سے تو یہ مترشح ہوتا ہے جیسے نزلہ، زکام اور کھانسی کا علاج بھی دوست کا نام تھا! مولانا روم نے عشق کی تعریف میں جو فرمایا ہے: ؎

اے طبیب جملہ علت ہائے ما

تو اُس میں بڑا لطیف قرینہ پایا جاتا ہے۔

تری حسرت نہ چھوٹی ہے نہ چھوٹے   مرے ترکِ محبت پر نہ جانا   (ص۲۳)

حسرت کے "چھٹنے اور نہ چھٹنے" نے پورے شعر کو کمزور کر دیا۔

مامن کہاں کسی کے لئے تجھ سے چھوٹ کر   دنیا سے اٹھ گیا جو ترے در سے اٹھ گیا   (ص۲۴)

"مامن" غزل کی زبان کا لفظ نہیں ہے، "مامن" سے تو "مسکن" پھر غنیمت تھا!

منزلِ غم فراق کی نزدیک آگئی   رہنے لگا ہے پھر کوئی ہم سے خفا خفا

یہ شعر غزل سے خارج کر دینا چاہیے تھا۔

ہم سے پیمانِ شوق توڑ دیا   بے وفاؤں نے ساتھ چھوڑ دیا   (ص۲۵)

"شوق" یہاں نامناسب اور بے محل استعمال ہوا ہے! عہد و پیمان "شوق" کا نہیں "وفا اور دوستی" کا باندھا جاتا ہے۔

نالۂ دل کا اثر دیکھ لیا   تجھ کو بادیدۂ تر دیکھ لیا   (ص۲۷)

سطحی اور سپاٹ مطلع!

جاتے جاتے بھی تجھے وقتِ سفر   شوق نے ایک نظر دیکھ لیا   (ص۲۷)

محبوب کو سفر کرتے وقت یا عاشق نے محبوب سے رخصت ہوتے ہوئے، اُسے ایک نظر دیکھ لیا، تو آخر میں ایسی کیا ندرت تھی، جس کا شعر میں اظہار کیا گیا ______ حالاں کہ کہنا یہ چاہیے تھا کہ جاتے جاتے اور چلتے چلتے بھی نگاہ محبوب پر جمی رہی اور بار بار مڑ مڑ کر دیکھا ______ "شوق" یہاں بھی نامناسب منظوم ہوا ہے۔

وہ ہر کلی سے نمایاں ہوئے تو کیا ہوگا   بھری بہار کا عنواں ہوئے تو کیا ہوگا   (ص۲۹)

مصرعِ ثانی میں خاصا ابہام پایا جاتا ہے!

جن سے مانوس اک زمانہ تھا   اُن سے اپنا بھی دوستانہ تھا   (ص۳۰)

یہ جذبہ "غیرتِ عشق" کے منافی ہے ______ "بھی" نے معاملہ کو خراب کر دیا۔

اُداسیوں میں ترا نام جب لیا ہوگا — کچھ اور درد کا احساس بڑھ گیا ہوگا (ص۲۵)

آخر یہ بات کیا ہوئی؟

دل میں پھر احساسِ غم تازہ ہوا — تجھ سے مل کر اور بھی صدمہ ہوا (ص۲۶)

صدمہ نے پورے شعر کے لطف کو غارت کر دیا!

تری آنکھ ناحق گریزاں رہی — مرا شوق تحصیلِ حاصل نہ تھا (ص۲۸)

اسے کہتے ہیں "مفہوم الشعر فی بطن الشاعر"!

تیری یادوں کے نکل جانے کے بعد — اب مرے حسرت کدے میں کیا رہا! (ص۲۹)

یاد کی جمع — یادوں اور یادیں — چل پڑی ہے، اگرچہ وجدانِ صحیح اُسے مشکل ہی سے گوارا کرتا ہے
مگر اس شعر میں تو "یادوں" نے شعریت کو مجروح کر دیا۔ یاد کی "جمع" لانے کی یہاں ضرورت ہی نہ تھی۔

اُن کو احساسِ تمنا ہوگا — مطمئن ہوں کبھی ایسا ہوگا (ص۳۰)

"احساسِ تمنا" کا یہاں کیا محل تھا؟ ع اُن کو بھی پاسِ وفا کا ہوگا، اسی قبیل کا کوئی مصرعہ آنا چاہیے تھا۔

وہ گلستاں وہ چمن یاد رہا — جلوۂ سرو و سمن یاد رہا (ص۳۱)

گلستاں کے بعد پھر "چمن" کھٹکتا ہے، یوں ہو سکتا تھا:- ع

وہ بہاریں وہ چمن یاد رہا

تیری منزل کی درازی کا تصور توبہ! — شوق نے تجھ کو بہ ہر گام پکارا اے دوست (ص۴۲)

نہ معنی میں لطف اور نہ اظہار میں!

زندگی سے مجھے اتنی بھی نہ وحشت ہوتی — کوئی ہوتا جو ترے بعد سہارا اے دوست

سپاٹ سا شعر ہے!

بحالِ غیر تجھے التفات ہے اے دوست — سب اپنے اپنے مقدر کی بات ہے اے دوست (ص۴۵)

"بحالِ غیر" کس قدر اکھڑا اکھڑا لگتا ہے

دل عیش و جہاں سے اُٹھائے ہوئے ہیں — توقیر تیرے غم کی بچائے ہوئے ہیں (ص۶۱)

اس قدر سطحی اور بے نمک مطلع! توبہ! "توقیر" "آبرو" کی جگہ نظم کیا گیا ہے، مصرعہ ثانی میں "ہے" بیکار جا رہا ہے!

اس بت سے التفات کی صورت نکل چکی — آہوں کو نامرادِ اثر دیکھتا ہوں میں (ص۶۳)

"التفات کی صورت نکل چکی" یہ کہاں کی زبان ہے!

سب ہیں ناکام خویش ہوں کہ عدو — تم کسی کے بھی خیر خواہ نہیں (ص۶۳)

نو مشقوں کے کہنے کا شعر ہے! "خویش" عزیزوں اور رشتہ داروں کو کہتے ہیں۔ مگر شاعر نے "احباب" کے معنی میں استعمال کیا ہے

کیا کہوں اس جلوۂ بے نام سے — یاد پڑتا ہے کہ دیکھا تھا کہیں (ص۶۸)

جلوہ کے ساتھ "بے نام" لانے کی کیا ضرورت تھی! پھر "جلوہ" سے شاعر کہنا کیا چاہتا ہے؟

وہی ہے آپ سے ملنے کی آرزو اب تک — اگرچہ آپ نے دل سے بھلا دیا ہم کو (ص۸۰)

یہ شعر چھانٹ دینے کے قابل تھا!

مجا ہے خون اپنا بے اثر تھا — نگاہِ ناز کیوں شرما رہی ہے (ص۸۵)

بچکانہ شعر! "خون" بے اثر اور با اثر ہوا کرتا ہے، یہ پہلی بار دیکھنے میں آیا۔

اب تو راس آ ہی چکا تھا کنجِ تنہائی مجھے — یاد اس بے مہر کی ناحق کو پھر آئی مجھے

"ناحق کو" نے شعر کا سارا لطف کھو دیا۔

نہیں ایسی بھی جنسِ فقر سستی — خبردار! اے زمانِ زر پرستی (ص۹۰)

"زمانِ زر پرستی" نے شعر کو مبہم اور بے کیف بنا دیا۔

خوش نہ ہو کیوں لحد میں روح مری — بعد مدت کے اپنے گھر آئی (ص۹۶)

"لحد" تو قبر کو کہتے ہیں، اور "گوشۂ قبر" سے انسان کا پیدا ہونے سے پہلے کسی عالم میں بھی کوئی سابقہ نہیں رہا — جو اُسے "روح کا گھر" کہا گیا ہے! پھر مرنے کے بعد جسم لحد میں دفن کر دیا جاتا ہے اور روح برزخ میں رہتی ہے!

مغتنم ہے اک نظرِ دل کے عوض — شکریہ! اے دوست میزاں پٹ گئی (ص۹۸)

"میزاں پٹنا" روزمرہ کے خلاف استعمال ہوا ہے! شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ اس طرح حساب کتاب برابر ہو گیا اور لین دین کے بعد میزان ٹھیک بیٹھ گئی۔

خدا کی شان کہ جو ہم سے سرکشیدہ ہے — انھی کی یاد رہی مایۂ دل آسائی (ص۱۰۱)

"مایۂ دل آسائی" یہ کیا ترکیب ہے؟

زندگی تجھ پہ لٹا دی ہم نے — یوں تری بات بنا دی ہم نے (ص۱۰۸)

ایک مشاق شاعر کو ایسا شعر زیب نہیں دیتا۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ بایں ربطِ نہاں — مجھ سے ملنے میں ہے کیوں تجھ کو محابا باقی (ص۱۱۲)

"محابا باقی" میں "با با" کی تکرار سماعت پر گراں گزرتی ہے۔

کس کو تھا میرے بعد مری آرزو کا پاس — اچھا ہوا کہ وہ بھی مرے ساتھ مر گئی

تجھ سے گلہ نہیں کہ مری جانِ نامراد — دکھ درد جو نصیب میں لکھے تھے بھر گئی (ص۱۱۵)

ایسے پست شعر "نغمۂ حسرت" میں دیکھ کر افسوس ہوا۔

ہوائے عیشِ جاں کم ہو گئی ہے — طبیعت روکشِ غم ہو گئی ہے (ص۱۱۸)

مصرعِ اولیٰ میں نری آورد ہی آورد پائی جاتی ہے۔

ترے کوئے محترم تک جو بصد خلوص پہنچے — وہی نامراد لوٹے، وہی نامراد آئے (ص۱۱۹)

"محترم" وزن پورا کرنے کے لئے لایا گیا ہے "کوئے محترم" کی جگہ "سنگِ آستاں" کہا جا سکتا تھا۔

جب چلے تھے دیارِ دوست سے ہم — دور تک آئے لوگ سمجھانے (ص۱۲۳)

اُردو کا مشہور شعر ہے:۔

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا — دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

[ح]قیقت صاحب کو کہنا چاہیے تھا کہ ؎

جب چلے تھے دیارِ دوست کو ہم

تو

دور تک آئے لوگ سمجھانے

[گ]ر انھوں نے جو بات کہی ہے، وہ عاشق کے تجربہ کے خلاف ہے۔ "دیار دوست" سے کوئی اکتا کر مایوس ہو کر یا روٹھ کر چلا آئے، [ت]و اُسے وہاں کے لوگ بھلانے یا منانے کے لئے نہیں آیا کرتے۔

ذکر کرتے جو ہم بہاروں کا سلسلہ آپ سے مٹا دیتے (ص۱۲۷)

[ش]اعر کو بہاروں کا ذکر کرنے سے آخر کس نے روکا ہے!

پھر تصور میں نہ آؤ تو عنایت ہوگی شوق مشکل سے تمہیں آج بھلا پایا ہے (ص۱۳۱)

[ی]ہ کہنا کہ "ہماری تمنا، آرزو یا شوق نے محبوب کو بھلا دیا، اس میں بڑا تکلف پایا جاتا ہے۔

ثابت ہوا مداوا جو مری کاہشِ غم کا اس آنکھ میں ایسا کوئی پیغام نہیں ہے (ص۱۳۲)

[م]صرعہ اولیٰ پر "آورد" چھائی ہوئی ہے۔

الگ یہ بات کہ ہم کچھ نہ کہہ سکے ورنہ تری ادائے ستم درخورِ شکایت تھی (ص۱۳۶)

[ق]دیم اساتذہ ممکن ہے "الگ" کو اس طرح استعمال کرتے ہوں، مگر" یہ اور بات ہے" کی جگہ "یہ الگ بات ہے" کہنا، بجکل نامانوس ہے

جیسی گزری سو ہم گزر چلے ہر تمنائے دل کو مار چلے (صفحہ ۱۴۰)

[م]صرعہ ثانی نے پورے شعر کو ایک "مضحکہ سا" بنا دیا۔

ترے آنے کی جب جب کسی نے کہی ہم بڑی دیر تک مُسکراتے رہے (ص۱۴۸)

[ش]عر کا مفہوم تو صاف ہے مگر یہ بات دوسرے لفظوں میں کہنے کی تھی!

جہاں جہاں مجھے تیرا خیال آیا ہے قرار تام کی دولت بھی ساتھ لایا ہے (ص۱۵۱)

[ب]ندیوں کے کہنے کا شعر! وجدان بے مزہ ہو گیا۔

یہی بہار میں ہے ترے جمالوں کی اسی بہار سے تیرا سُراغ پایا ہے (ص۱۵۲)

[ا]س "جمالوں" کا بھی بھلا کوئی جواب ہے! اس قسم کے شعروں کو "نغمۂ حسرت" میں پڑھ کر یہ احساس ہوا کہ شاعر پہلے مجموعہ کلام [کے] مقابلہ میں پست کیوں ہو گیا؟

مرجع اہلِ وفا تھے پہلے تم بھی کیا نام خدا تھے پہلے (ص۱۵۵)

[ا]س شعر سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ شاعر کا محبوب شباب کے دور سے گزر چکا ہے، اس لئے وہ اہل وفا کی محبت کا مرکز نہیں رہا [م]گر محبوب کے شباب ڈھل جانے کا غزل میں اس طرح ذکر کرنا، اصولِ تغزل اور آئینِ محبت کے خلاف ہے۔

تاچند یہ بیگانگی حزمِ مسلسل اس پردۂ حائل کو ہٹا کیوں نہیں دیتے

[ا]حتیاط کی جگہ "حزم" استعمال کرکے شعر کو کس قدر بوجھل بنا دیا۔

تیری جدائیوں کو زمانہ ہوا مگر دل ہے کہ مربہ زانوئے حسرت ہے آج تک (ص۱۶۰)

[ج]دائی کی جمع "جدائیوں" — توبہ!

سبع سنابل حصہ اول

مرتبہ :- ادارۂ اشاعت تفسیر صدیقی، ضخامت ۶۰ صفحات
ملنے کا پتہ :- ۵/۸۹۶ لالوکھیت، کراچی ۱۹

اس کتابچہ میں اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی ربوبیت پر بڑے دل کش، اثر انگیز اور نفسیاتی انداز میں گفتگو کی گئی ہے، طلبا کو اس کتاب کے پڑھنے سے بہت فائدہ ہوگا!

صفحہ ۲۹ پر "آگ کا انگارہ" نظر آیا، "انگارہ" میں تو خود "آگ" کا مفہوم موجود ہے ——— "لیکن اگر ایک لمحہ بھی اُسے (آدمی کو) ہوا نہ ملے تو وہ فوراً تڑپ کر مرجائے (صـ۲۲) حالاں کہ ہوا کے بغیر آدمی چند منٹ زندہ رہ سکتا ہے۔

اولیائے قوم

از :- قاضی ابوالمعظم سید شاہ عبدالغفار، ضخامت ۱۱۲ صفحات، قیمت ایک روپیہ،
ملنے کا پتہ :- ادارۂ دبستان تصوف، جدید ملک پیٹھ ۱۳/۲ سے کلاس، حیدرآباد دکن (بھارت)

ابوالمعظم قاضی عبدالغفار صاحب حیدرآبادی ملت کی اصلاح کا درد رکھتے ہیں اور اخلاق و تصوف کے جذبے سے سرشار ہیں، وہ ایک درجن سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں، اور کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہتے ہیں، اس کتاب میں انھوں نے ڈاکٹر اقبال، اکبر الہ آبادی ابوالکلام آزاد، علامہ سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر عبدالحق (پرنسپل اسلامیہ کالج مدراس) کو "اولیائے قوم" میں شمار کرکے، ان کی دینی اور اصلاحی کوششوں پر تبصرہ فرمایا ہے اور بڑی اچھی اچھی باتیں بیان کی ہیں۔

علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کو "ولی اللہ" بنانے کی کوشش مبالغہ آمیز عقیدت ہے، اقبال کی شاعری نے بلاشبہ اسلام کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے، وہ ایک مفکر اور مصلح شاعر تھا، مگر "ولایت" کے لئے تو زندگی میں تقویٰ کا پایا جانا ضروری ہے!! اس باب میں اتنا ہی اشارہ کافی ہے ——— اب رہے مولانا آزاد تو دینی جدوجہد کے اعتبار سے ان کی زندگی کا شروع، آخر سے بہتر تھا! اور وہ "ولی اللہ" تو کسی حیثیت سے بھی نہیں تھے۔

"اقبال ہم قلب مومنی ہیں" (صـ۱۱) نبی کے ساتھ "ہمسری" کا یہ انداز بیان (ہم قلب، ہم خیال...) ناپسندیدہ ہے "اس صلائے عام کی طرف ہم آپ کو دعوت دے رہے ہیں" (صـ۲۶) "صلائے عام کی طرف دعوت" یہ تو "شب برات کی رات" والی بات ہوئی ——— "ڈاکٹر اقبال اور مولوی سلیمان ندوی میں خطوط بازی ہوئی ہے" (صـ۵۵) "خطوط بازی" میں تو طنز پائی جاتی ہے، مگر یہاں "خطوط بازی" تحسین کے لئے استعمال کیا گیا ہے ——— "ہم جو فقرہ بتانا چاہتے ہیں" (صـ۱۱) "فقرہ بتانا" یہ کیا زبان ہے!

مصنف کے نام کے ساتھ "شریعت پناہ، علامۂ عصر، قدوۃ السالکین اور زبدۃ العارفین" کے القاب و خطابات بالکل بے جوڑ لگتے ہیں، اگر قاضی صاحب کے کسی عقیدت مند کی یہ حرکت ہے، تو ایسے سادہ لوح عقیدت مند تادیب کے مستحق ہیں۔

موجِ کوثر

از :- اقبال سہیل، ضخامت ۳۲ صفحات، کاغذ، کتابت، طباعت ہر چیز معیاری اور نظر افروز، قیمت آٹھ آنے۔
ملنے کا پتہ :- مرکز ادب، جہانگیر بلیس، لکھنؤ۔

یہ حریدہ زیب اور روح پرور بیاض جناب اقبال سہیل کے دو نعتیہ قصیدوں پر مشتمل ہے، کیا شکوہ الفاظ ہے، کتنی شاداب تشبیب ہے، کس قدر زورِ بیان ہے اور پھر سب سے بڑھ کر حضور ختمی مرتبت کی ذاتِ گرامی کے ساتھ شاعر کی والہانہ عقیدت!

کبھی پھولوں کے جھرمٹ میں شعاعوں کی نظر بازی	کبھی خود جلوۂ خور سے گلوں کی چاک دامانی
کہیں دوشِ صبا پر رقص کرنا نکہتِ گل کا	کہیں شاخِ نشیمن پر عنادل کی حدی خوانی

کہیں قبل از صبوحی میکشوں کی شبِ خیزی کہیں بعد نوافل زاہدوں کی سبحہ گردانی

چمن پیرائے کُن صدقے تری نیرنگ سازی کے لبِ ہر غنچہ پر ہے کُلَّ یَومٍ فِی شَانٍ

وہ تابستاں کے بعد ابرِ سیہ کا جوشِ تردستی وہ آغازِ بہار اور رخصتِ فصلِ زمستانی

جبینِ صبح پر قشقہ ہے، یا خطِ شعاعی ہیں ایا رخِ لالہ میں شبنم ہے، یا صہبائے ریحانی

محمدؐ وہ کتابِ کون کا طغرائے پیشانی محمدؐ! وہ حریمِ قدس کا شمعِ شبستانی

محمدؐ یعنی وہ حرفِ نخستینِ کلکِ فطرت کا محمدؐ یعنی وہ امضائے توقیعاتِ ربانی

وہ رابطِ عقل و مذہب کو کیا شیر و شکر جس نے وہ فارق، زہد سے جس نے مٹایا داغِ رہبانی

وہ ناطق جس کے کھلے مہر بر لبِ بلبلِ سدرہ وہ صادق جس کی حق گوئی کا شاہد نطقِ سبحانی

وہ جامع جس نے یکجا کر دیئے بکھرے ہوئے دانے مٹادی آ کے جس نے باہمی تفریقِ انسانی

وہ گنجورِ معارف جس کے اک اک حرف میں پنہاں نکاتِ فلسفی، اسرارِ نفسی، رازِ عرفانی

وہ شاہِ بوریا مسند سکھایا جس نے دنیا کو یہ اندازِ جہانگیری، یہ آئینِ جہانبانی

وہ نساخِ مذاہب جس کے مقدم نے کیا باطل فروغِ کیشِ زردشتی، شکوہِ دینِ نصرانی

وہ سلطان الامم، فخرِ دو عالم، برزخِ کبریٰ رسالت جس کی تصدیقی، جلالت جس کی اذعانی

تراشہ جس کے ناخن کا ہلالِ آسماں منزل غسالہ جس کے تلووں کا زلالِ آبِ حیوانی

خدا جانے خدا اس سرکار کا کیا مرتبہ ہوگا غلامِ بارگہ جس کے کہیں "ما اعظم شانی"

وہ شفاف و شفق گوں رنگ جیسے لعلِ کوثر تباشیرِ سحر، سیمِ قمر، یاقوتِ رمانی

ملا خلعت سلامِ بارگاہِ بے نیازی سے نبی نے جب تحیاتِ ادب کی نذر گزرانی

ں نعتیہ قصیدہ کے چند اشعار ہیں:-

ادھر صبحِ گریباں چاک کا راہِ عدم لینا اُدھر خورشیدِ عالم تاب کا آغازِ رخشانی

صبح کا راہِ عدم لینا" روشنی کے ظہور اور اُجالا پھیلنے کے لئے اچھا اندازِ بیان نہیں ہے!

ادھر شبنم کی ہستی کا فنا فی النور ہو جانا اُدھر گل کا صبا سے ادعائے پاکدامانی

ھر" اور "اُدھر" کا دونوں مصرعوں میں منظر کشی کے اعتبار سے صحیح توازن اور ربط نہیں پایا جاتا!

چمن میں جس طرف دیکھو نظر بازوں کا جمگھٹ ہے الٰہی! کوچۂ قاتل ہے یا صحنِ گلستانی

ں شعر میں "نظر بازوں" کو "بسملوں" کے معنی میں نظم کیا گیا ہے:- پھر "صحنِ گلستاں" کو "کوچۂ قاتل" کہنا بھی محلِ نظر ہے۔

حرم سے چل کے اول مسجدِ اقصیٰ میں منزل کی وہاں سے جلوہ گاہِ قدس تک جانے کی پھر ٹھانی

م، مسجدِ اقصیٰ، جلوہ گاہِ قدس جیسے لفظوں کے ساتھ "ٹھانی" بے جوڑ سا لگتا ہے! "پھر ٹھانی" سے تو ایسا مترشح ہوتا ہے، جیسے
ور اپنے ارادے سے شبِ اسریٰ میں سفر فرما رہے تھے حالاں کہ وہاں تو آپ کو لے جایا جا رہا تھا۔

جوارِ عرش میں دیکھا یہاں صدیق اکبر کو تماشائے جمالِ لم یزل میں محوِ حیرانی

ستاں سراد اعظموں کی کوئی روایت ہے، جسے شاعر نے بلا تکلف نظم کر دیا ہے! شاید اس کے توڑ پر شیعوں کے یہاں روایت

وضع کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرش پر علیؓ کو دیکھا تھا!

دوسرے قصیدہ کے چند منتخب اشعار:-

احمد مرسل، فخر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم — مظہر اول، مرسل خاتم صلی اللہ علیہ وسلم
جسم مزکیٰ، روح مصور، قلب مجلّیٰ، نور مقطر — حسن سراپا، خیر مجسم صلی اللہ علیہ وسلم
جسکی ہراول فوج سلیماں، جسکے منادی موسیٰ عمراں — جس کے مبشر عیسیٰ مریم صلی اللہ علیہ وسلم
بزم ہلالی ظلم سے خالی بکھرے ہوئے تھے حق کے لآلی — آپ نے کئے سب آکے منظم صلی اللہ علیہ وسلم
راہ میں کانٹے جسنے بچھائے گالی دی، پتھر برسائے — اس پہ چھڑکی پیار کی شبنم صلی اللہ علیہ وسلم
وہ مصداق دنیٰ فتدلیٰ، جسکی منزل عرش معلیٰ — نکتۂ "ما اوحیٰ" کا محرم صلی اللہ علیہ وسلم
نظم میں جس کی نعت مُطہر "انا اعطینک الکوثر" — اللہ اللہ، شانِ معظم صلی اللہ علیہ وسلم
المدثر، المزمل ذات اُس کی کونین کا حاصل — خاک پہ سجدہ، عرش پہ پرچم صلی اللہ علیہ وسلم
صدر امم سلطان مدینہ وہ جس کے کعب پاک پسینہ — گل کدۂ فردوس کی شبنم صلی اللہ علیہ وسلم
جن کا پیارا نام محمد، فیض مؤبد، فوز مخلد — حسن مجرد، نور مقدم صلی اللہ علیہ وسلم
سرو سیادت، قامت سینا، صبح سیادت جلوہ سینا — طاق عبادت، ابروئے پرخم صلی اللہ علیہ وسلم
حسن ازل کا جلوۂ رنگیں، بحر قدم کی موج تحسین — اوج ابد کا نیر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم
مہر رسالت، مہر جلالت، عین عدالت، ختم دلالت — لے بہ کمالت ناطقہ ابکم صلی اللہ علیہ وسلم
مٹ گئے جو تینی لٹے، بجھ گئے جو بولہبی لپٹے — سب کی بساطیں کر دیں برہم صلی اللہ علیہ وسلم

نظم سہیل اُن کا ہی کرم ہے، ورنہ یہاں کب تاب رقم ہے
صلی اللہ علیہ وسلم — صلی اللہ علیہ وسلم!

ان دونوں قصیدوں نے اردو ادب کی آبرو بڑھائی ہے اور اردو شاعری کو تقدیس عطا کی ہے!

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا
جس کو حکمت ملی اُسے بڑی عظیم نعمت ملی (قرآن حکیم)

ہم پر الزام ہے کہ ہم اہلِ تحقیق نہیں

آیئے اسے باطل کر دکھائیں

ہمارے پاس علم و حکمت کے ایسے بیش بہا دفینے موجود ہیں جن کی تحقیق و تلاش میں ہمارے اسلاف نے اپنی زندگیاں صرف کردیں لیکن پوشیدہ ہونے کی وجہ سے وہ انسانیت کے کسی کام نہیں آرہے۔ ان کا چھپائے رکھنا انسان دشمنی کے برابر ہے آیئے انھیں ظاہر کر کے ثابت کردیں کہ ہم اب بھی دنیا کو بہت کچھ دے سکتے ہیں

آپ یا آپ کے جاننے والوں میں سے کسی کے پاس کوئی مجرب نسخہ یا جڑی بوٹیوں کے متعلق کسی قسم کی معلومات محفوظ ہوں تو انھیں تفصیلاً لکھ کر ہمیں بھیجئے۔ ہم ان پر خود بھی تحقیق و تجربات کریں گے اور دوسروں کو بھی انھیں پرکھنے کی دعوت دیں گے۔

بھیجنے والوں کے نام سے سب نسخوں کی بجنسہٖ اشاعت کا زیادہ سے زیادہ انتظام کیا جائے گا تاکہ طبی ادارے اور عوامی صحت سے دلچسپی رکھنے والے اہلِ تحقیق ان پر مزید کام کرسکیں۔

یہ پوشیدہ طبی نوادر

قوم کی امانت ہیں۔ آیئے انھیں جمع کر کے انسانیت کے نام پر عام کریں۔ وقت کا تقاضا ہے کہ قومی صحت کی حفاظت کے لئے ایک جامع کوشش کی جائے اس تقاضے کو پورا کیجئے۔

انسٹی ٹیوٹ آف ایسٹرن میڈیسن
ہمدرد منزل، نیوٹاؤن، کراچی